تفسیر قرطبی
مترجم

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن قرآن

ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور، کراچی۔ پاکستان

الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

تفسیر قرطبی

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
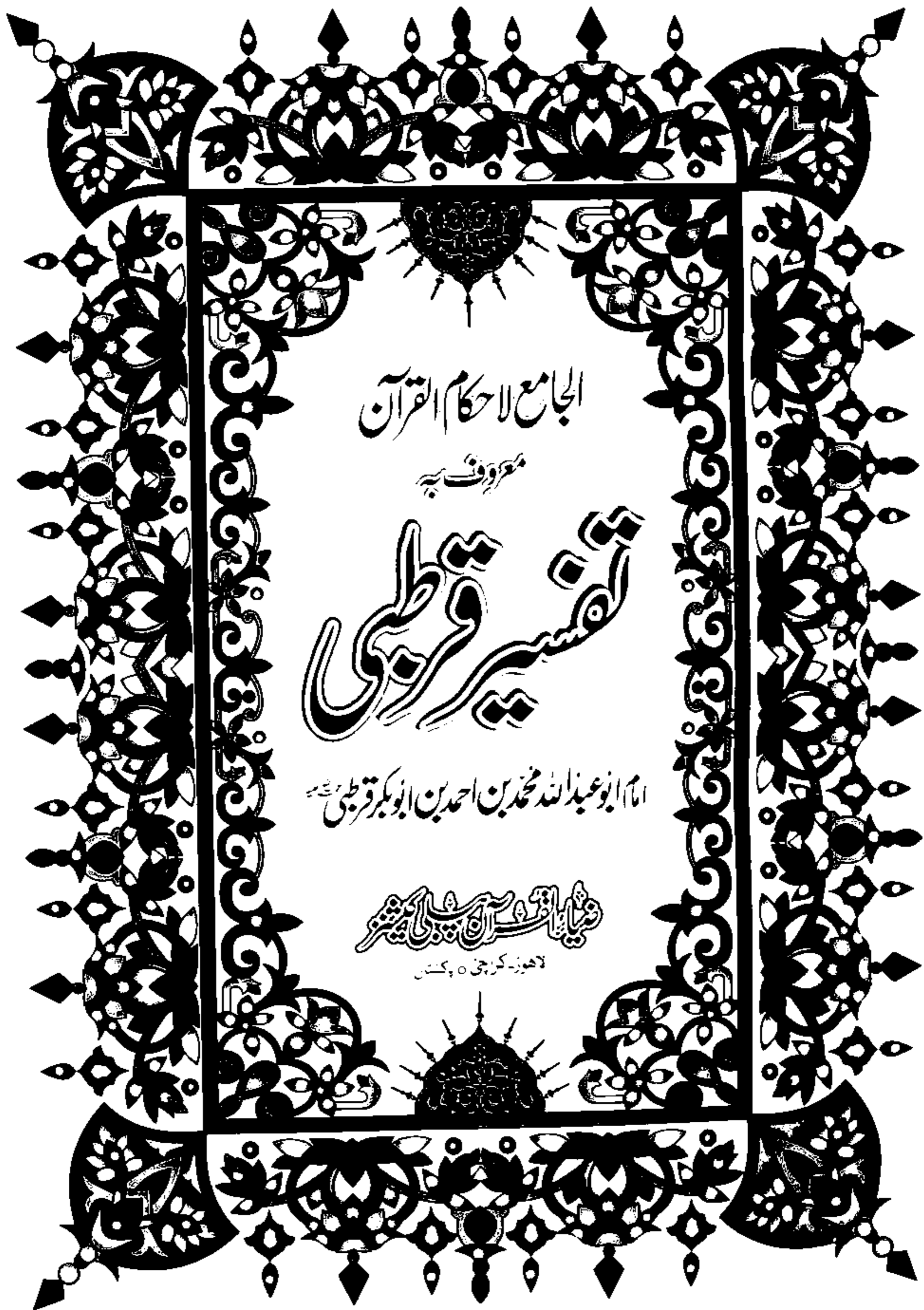
لاہور۔ کراچی ۔ پاکستان

الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

تفسیر قرطبی

جلد دوم

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین

مولانا ملک محمد بوستان　مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی　مولانا شوکت علی چشتی

زیر اہتمام

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد دوم)
مفسر	امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ
متن قرآن کا ترجمہ	حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی
	مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی
	من علماء دار العلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف
زیر اہتمام	ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	اکتوبر 2012ء، بار اول
کمپیوٹر کوڈ	QT54

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ فِيۡٓ اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِيۡ يَوۡمَيۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ۚ وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ۝

''اور (خوب) یاد کرلو اللہ تعالیٰ کو ان دنوں میں جو معدودے چند ہیں اور جو جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں (بشرطیکہ) وہ ڈرتا رہتا ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو تمہیں اس کی بارگاہ میں اکٹھا کیا جائے گا''۔

قولہ تعالیٰ: وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ فِيۡٓ اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ کوفیوں نے کہا ہے کہ معدودات میں الف اور تاعدد کی قلت کو بیان کرنے کے لئے ہیں اور بصریوں کا موقف ہے کہ یہ دونوں قلیل وکثیر کے لئے آتے ہیں اور اس پر دلیل رب العالمین کا یہ ارشاد ہے وَهُمۡ فِي الۡغُرُفٰتِ اٰمِنُوۡنَ ۝ (سبا:37) اور غرفات کثیر ہیں۔ (یعنی غرفات میں الف اور تا کثرت کے بیان کے لئے ہیں اور مَّعۡدُوۡدٰتٍ میں قلت کو بیان کرنے کے لئے۔ معلوم ہوا یہ دونوں قلیل وکثیر کے لئے آتے ہیں۔)

اور علماء کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس آیت میں اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ سے مراد ایام منیٰ ہیں اور یہی ایام تشریق ہیں، اور یہ تینوں اسماء انہی پر واقع ہوتے ہیں، اور یہی رمی جمار کے ایام ہیں، اور ان کا اطلاق ان تینوں دنوں پر ہوتا ہے جن میں حاجی یوم نحر کے بعد دو دنوں میں جلدی کر کے کوچ کر سکتا ہے۔ پس تو اس پر واقف رہ۔

ثعلبی اور ابراہیم نے کہا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ دس دن ہیں اور ایام معلومات ایام نحر ہیں۔ اسی طرح مکی اور مہدوی نے بیان کیا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ سے مراد دس دن ہیں۔ ابوعمر بن عبدالبر وغیرہ کے نقل کرنے کی بنا پر جو ہم نے اس بارے میں اجماع ذکر کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے کہ یہ (اجماع) یا تو کتابت کی غلطی کی بنا پر ہے یا پھر وہ دس دن مراد ہیں جو یوم نحر کے بعد ہیں اور یہ حقیقت سے بہت دور ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ میں اپنے بندوں کو اپنے ذکر کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور یہ یوم نحر کے بعد والے تین دن ہیں، یوم نحر ان میں شامل نہیں۔ کیونکہ اس پر لوگوں کا اجماع ہے کہ یوم النفر کو کوئی بھی (وہاں سے) کوچ نہیں کر سکتا اور یوم النفر سے مراد یوم النحر کا دوسرا دن ہے (یعنی گیارہویں ذوالحجہ کا دن)۔ اگر یوم نحر اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ میں شامل ہوتا تو پھر یہ جائز ہوتا کہ جو کوئی یوم نفر کو جلدی (وہاں سے) کوچ کرنا چاہتا وہ کر سکتا کیونکہ اس طرح وہ اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ میں سے دو دن وہاں ٹھہر چکا ہوتا۔ (لیکن ایسا کرنا درست نہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ یوم نحر اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ میں شامل نہیں۔)

دارقطنی اور ترمذی وغیرہما نے عبدالرحمٰن بن یعمر الدیلی سے روایت بیان کی ہے کہ اہل نجد میں سے کچھ لوگ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے جبکہ آپ عرفات میں تھے۔ تو انہوں نے (اس کے بارے) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منادی کو حکم ارشاد فرمایا۔ پس اس نے یہ اعلان کیا "حج تو عرفات میں ہے۔ پس جو کوئی مزدلفہ کی رات طلوع فجر سے پہلے پہلے یہاں آ گیا اس نے حج کو پالیا۔ ایام منیٰ تین ہیں پس جو کوئی جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ (1)" یعنی حاجیوں میں سے جو کوئی ایام منیٰ میں سے دو دنوں میں ہی جلدی کر کے چلا گیا تو اس کا قیام بھی منیٰ میں یوم نحر سمیت تین دن ہو گیا۔ اور اس کی مجموعی رمی انچاس کنکریاں ہو جائے گی اور تیسرے دن کی رمی اس سے ساقط ہو جائے گی اور جس کسی نے تیسرے دن کے آخر میں وہاں سے کوچ کیا تو یوم نحر کے سبب اس کے لئے چار دن منیٰ میں قیام ہو گیا اور اس نے رمی کی تعداد پوری کر لی۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ایام منیٰ تین دن ہیں اس کے بارے جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی ایک دلیل عرجی کا یہ قول بھی ہے۔

ما نلتقی الا ثلاث منی حتی یفرق بیننا النفر

ہم منیٰ کے تین دن مل کر اکٹھے ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ وہاں سے کوچ ہمیں متفرق کر دیتی ہے۔

پس ایام رمی مَّعْدُوْدٰتٍ کہلاتے ہیں اور ایام نحر معلومات کہلاتے ہیں۔ حضرت نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ اور ایام معلومات مجموعی طور پر چار دن ہیں۔ ایک یوم نحر اور تین اس کے بعد۔ ان میں سے یوم نحر (دسویں ذی الحجہ کا دن) یوم معلوم ہے معدود نہیں۔ اور بعد والے دو دن (یعنی گیارہوں اور بارہویں ذوالحجہ کا دن) معلوم بھی ہیں اور معدود بھی اور چوتھا دن (یعنی تیرہویں ذوالحجہ کا دن) فقط یوم معدود ہے معلوم نہیں۔ اور یہی حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا مذہب ہے۔

اور بلا شبہ اسی طرح ہے کیونکہ پہلا دن ان دنوں میں سے نہیں ہے جو اس ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق منیٰ کے ساتھ خاص ہیں وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ اور نہ ہی یہ ان میں سے ہے جنہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں معین فرمایا ہے کہ ایام منی ثلاثۃ کہ ایام منیٰ تین ہیں (پس اس سے معلوم ہوا کہ) پہلا دن معلوم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (الحج: ۲۸)

(اور وہ ذکر کریں اللہ تعالیٰ کے نام کا مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپائیوں پر (ذبح کے وقت) جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔) اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس سے مراد قربانی ہے اور قربانی پہلے دن ہوتی ہے اور یہی یوم الاضحیٰ ہے اور پھر دوسرے اور تیسرے دن ہوتی ہے۔ (یعنی گیارہویں اور بارہویں ذوالحجہ کے دن) اور چوتھے دن قربانی نہیں ہوتی اس پر ہمارے علماء کا اجماع ہے۔ (پس اس سے معلوم ہوا کہ) ارشاد باری تعالیٰ: فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ میں چوتھا دن مراد نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں قربانی نہیں کی جاتی اور چونکہ اس میں رمی کی جاتی ہے پس وہ رمی کے سبب ایام معدودات میں سے ہے۔ اور قربانی نہ ہونے کے سبب وہ یوم معلوم نہیں ہے۔

1۔ سنن ترمذی، باب فیمن ادرک الامام بجمع الخ، حدیث نمبر 814، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس میں حقیقت یہ ہے کہ یوم نحر ری کے سبب یوم معدود ہے اور ذبح (قربانی) کے سبب وہ یوم معلوم ہے۔ لیکن ہمارے علماء کے نزدیک قول باری تعالیٰ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ میں یہ مراد نہیں ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ سے مراد دس دن ہیں ان میں سے پہلا دن ذوالحجہ کا پہلا دن ہے اور آخری دن یوم نحر ہے۔ اس بارے میں ان دونوں کا قول مختلف نہیں اور دونوں نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت کیا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ سے مراد ایام نحر ہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔ اور یہی میرا موقف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ

اور امام کرخی نے امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ سے مراد تین ایام نحر (قربانی کے دن) ہیں۔ یعنی ایک یوم الاضحیٰ اور دو دن اس کے بعد۔

الکیا طبری نے کہا ہے(1): کہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کے قول کے مطابق مَّعْلُوْمٰتٍ اور مَّعْدُوْدٰتٍ کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں مذکور اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد بلا اختلاف ایام تشریق ہیں۔ اور اس بارے میں کوئی شک نہیں کرتا کہ مَّعْدُوْدٰتٍ ایام عشر کو شامل نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اور ایام عشر میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے جو دو دنوں (گیارہویں، بارہویں) سے تو تعلق رکھتا ہو اور تیسرے سے نہ رکھتا ہو۔ تحقیق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ معلومات دس ہیں اور معدودات ایام تشریق ہیں اور یہی جمہور کا قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ ابن زید نے کہا ہے: ایام معلومات ذوالحجہ کے دس دن اور ایام تشریق ہیں اور اس میں بہت بُعد ہے، ایک تو اس بنا پر جو کچھ ہم نے ذکر کر دیا ہے اور (دوسرا) آیت کا ظاہر بھی اس کا دفاع کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ اور مَّعْلُوْمٰتٍ میں ذکر کا بیان کیا ہے وہ بھی اس قول کے خلاف پر دلالت کرتا ہے لہٰذا اس سے مشغول ہونے کا کوئی معنی نہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ (آیت میں) اس ذکر کا مخاطب حج کرنے والا (حاجی) ہے اسے ہی رمی جمار کے وقت تکبیر کہنے کے بارے خطاب کیا گیا ہے (اور یہ کہ وہ تکبیر کہیں) مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپایوں پر (ذبح کے وقت) اور نمازوں کے بعد (تکبیر کہیں) نہ کہ تلبیہ۔ (اب سوال یہ ہے) کیا غیر حاجی بھی اس میں داخل ہے یا نہیں؟ تو وہ نظریہ جو فقہاء امصار اور مشاہیر صحابہ کرام اور تابعین نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ تکبیر کے حکم میں مراد ہر کوئی ہے (چاہے وہ حج کر رہا ہو یا نہیں) خصوصاً اوقات نماز میں، پس وہ ہر نماز کو ادا کرنے کے بعد تکبیر کہے۔ چاہے نمازی اکیلا ہو یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والا ہو۔ ان ایام میں یہ تکبیر ظاہر اور بلند آواز سے کہی جائے گی اور یہی اسلاف رضی اللہ عنہم کی اقتدا ہے۔ اور

1۔ احکام القرآن، جلد 1 صفحہ 121

مختصر میں ہے: عورتیں نمازوں کے بعد تکبیر نہ کہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے کیونکہ احرام کا حکم مردوں کی طرح انہیں بھی لازم ہے، ''مدونہ'' میں اسی طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ جو کوئی نماز کے پیچھے تکبیر کہنا بھول گیا تو وہ تکبیر کہہ لے اگر وہ قریب ہو اور اگر دور چلا جائے تو اس پر کوئی شے (کفارہ وغیرہ) لازم نہیں ہوگی۔ ابن الجلاب نے یہی کہا ہے اور حضرت امام مالک نے ''المختصر'' میں کہا ہے: وہ تکبیر کہے جب تک اسی مجلس میں رہے اور جب اپنی مجلس سے اٹھ کھڑا ہوا، تو پھر اس پر کوئی شے لازم نہیں اور مدونہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے: اگر امام تکبیر بھول جائے تو اگر وہ قریب ہی ہو تو وہ بیٹھ جائے اور تکبیر کہے اور اگر دور ہو جائے تو پھر اس پر کوئی شے نہیں اور اگر وہ چلا گیا اور اس نے تکبیر نہ کہی درآنحالیکہ لوگ بیٹھے ہوئے ہوں تو انہیں چاہئے کہ وہ تکبیر کہہ لیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ مدت تکبیر کی دونوں طرفوں میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت عمر فاروق اعظم بن خطاب، حضرت علی ابن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہے کہ (آدمی) نویں ذی الحجہ کی صبح کی نماز سے لے کر ایام تشریق میں سے آخری دن (یعنی تیرہویں ذی الحجہ کا دن) کی عصر تک تکبیر کہے گا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ یوم عرفہ کی صبح سے لے کر یوم نحر کی نماز عصر تک (ہر نماز کے بعد) تکبیر کہے گا۔

صاحبین (حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہما) نے ان دونوں سے اختلاف کیا ہے اور دونوں نے پہلا قول یعنی حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہی لیا ہے۔ پس انہوں نے ابتدائے مدت میں تو اتفاق کیا ہے لیکن انتہا میں نہیں۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ (آدمی) یوم نحر کی ظہر کی نماز سے لے کر ایام تشریق میں سے آخری دن کی نماز صبح تک تکبیر کہے گا۔ امام شافعی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اور یہی حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا بھی قول ہے۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ وہ یوم نحر کی ظہر کی نماز سے لے کر ایام تشریق کے آخر تک تکبیر کہے۔

ابن عربی نے کہا ہے کہ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ وہ یوم عرفہ کو تکبیر کا آغاز کرے گا اور یوم نحر کی عصر کے وقت ختم کر دے گا، تو ان کا یہ قول ظاہر کلام سے خارج ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ** اور یہ ایام تین ہیں۔ حالانکہ انہوں نے کہا ہے کہ وہ دو دنوں میں تکبیر کہے گا تو اس طرح انہوں نے ظاہر کلام کو بغیر دلیل کے چھوڑ دیا۔ اور رہے وہ جنہوں نے یہ کہا کہ (تکبیر کہنے کے ایام) یوم عرفہ اور ایام تشریق ہیں تو انہوں نے کہا: بلاشبہ رب کریم نے ارشاد فرمایا **فَاِذَاۤ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ** (بقرہ: 198) تو اس میں عرفات کا ذکر ایام کے ذکر میں داخل ہے۔ یہ نظریہ صحیح ہو سکتا تھا اگر وہ یہ کہتے کہ وہ عرفہ کے دن مغرب کی نماز سے تکبیر کہے گا کیونکہ عرفات سے واپس لوٹنے کا وقت تو وہی (مغرب کا وقت) ہے اور جو وقت اس سے پہلے ہے ظاہر لفظ اس کا تقاضا نہیں کرتے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ آٹھویں ذی الحجہ (یوم ترویہ) میں سے ہو جو کہ منیٰ میں اترنے کا وقت ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ تکبیر کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وہ ہر نماز کے بعد

تین بار تکبیر کہے گا۔ اسے زیاد بن زیاد نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ اور ایک مذہب میں ایک روایت یہ ہے کہ تین بار تکبیر کہنے کے بعد یہ کہا جائے گا: لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر وللہ الحمد اور المختصر میں امام مالک سے یہ الفاظ مروی ہیں۔ اللہ اکبر اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر، اللہ اکبر وللہ الحمد۔

قول باری تعالیٰ: فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ میں اکیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اس مقام پر تعجیل (جلدی کرنا) ہمیشہ دن کے آخری حصہ میں ہوگی اور اسی طرح یہ تیسرے دن ہوگی، کیونکہ ان ایام میں رمی جمار کا وقت زوال کے بعد ہے اور اس پر اجماع ہے کہ یوم نحر کو جمرہ عقبہ کے سوا کسی پر رمی نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم نحر کو اس کے سوا کسی جمرہ پر رمی نہیں کی۔ اور اس کا وقت طلوع شمس سے لے کر زوال تک ہے۔ اور اسی طرح اس پر بھی اجماع ہے کہ ایام تشریق میں جمرات پر رمی کرنے کا وقت زوال کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔ البتہ اس کے بارے اختلاف ہے جس نے جمرہ عقبہ پر رمی طلوع فجر سے پہلے کی یا طلوع فجر کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے کی۔

حضرت امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: فجر کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے جمرہ عقبہ کی رمی جائز ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ہم تک ایسی کوئی خبر نہیں پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر طلوع ہونے سے پہلے کسی کو رمی کرنے کی رخصت عطا فرمائی ہو۔ لہٰذا فجر سے پہلے اس کی رمی جائز نہیں اور اگر کسی نے فجر سے پہلے وہاں رمی کی تو وہ اس کا اعادہ کرے گا۔ اسی طرح امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ جمرہ عقبہ کی رمی (طلوع فجر سے پہلے) جائز نہ ہوگی اور اسی طرح امام احمد اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور ایک گروہ نے طلوع فجر سے پہلے رمی کرنے کی رخصت دی ہے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ رات کے وقت رمی کرتی تھیں اور یہ کہتی تھیں: بلاشبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں ایسا کرتی تھیں۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے (1)۔ اور یہی قول حضرت عطا، ابن ابی ملیکہ اور عکرمہ بن خالد سے مروی ہے۔ اور اسی طرح حضرت امام شافعی نے فرمایا ہے بشرطیکہ رمی نصف رات کے بعد ہو۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: سورج طلوع ہونے سے پہلے رمی نہیں کی جائے گی۔ مجاہد، نخعی اور ثوری نے یہی کہا ہے۔ اور ابوثور نے کہا ہے: اگر کسی نے طلوع شمس سے پہلے رمی کی تو اگر (علماء نے) اس میں اختلاف کیا، تو پھر یہ جائز نہیں ہوگی۔ اور اگر انہوں نے اتفاق کر لیا یا اس میں کوئی سنت موجود ہو تو پھر یہ جائز ہوگی۔ ابوعمر نے کہا ہے: جہاں تک ثوری اور ان کی اتباع کرنے والوں کا قول ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلوع آفتاب کے بعد جمرہ کی رمی کی اور فرمایا: خُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ (احکام حج مجھ سے سیکھ لو) اور ابن منذر نے کہا ہے: سنت یہ ہے کہ رمی جائز نہ ہوگی۔ اگر کسی نے رمی کی تو وہ اس کا اعادہ کرے۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب التعجیل من جمع، حدیث نمبر 1659، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیونکہ اس طرح کرنے والا اس طریقہ اور سنت کے خلاف کرنے والا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لئے مقرر فرمایا۔ اور جس کسی نے طلوع فجر کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے رمی کی، تو اس پر اعادہ نہیں ہے۔ کیونکہ میں کسی کے بارے نہیں جانتا کہ اس نے کہا ہو "یہ جائز نہیں ہے۔"

مسئلہ نمبر 2۔ معمر نے بیان کیا ہے کہ مجھے ہشام بن عروہ نے اپنے باپ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ یوم نحر کو مکہ مکرمہ میں صبح کرے اور یہی اس کا دن تھا۔ ابو عمر نے کہا ہے کہ اس حدیث کے بارے میں ہشام پر اختلاف کیا گیا ہے، پس ایک گروہ نے اسے ہشام عن ابیہ سے مرسل روایت کیا ہے جیسا کہ اسے معمر نے روایت کیا ہے اور دوسروں نے اسے ہشام عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے مسند روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو اسی طرح حکم ارشاد فرمایا تھا۔ اور بعض دوسروں نے اسے عن ہشام عن ابیہ عن زینب بنت ابی سلمہ عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی سند سے بھی مسند روایت کیا ہے۔ اور تمام راوی ثقہ ہیں۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے منیٰ میں فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یوم نحر کی صبح مکہ میں کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا اور یہ نہیں ہوسکتا مگر تبھی جبکہ رات کے وقت منیٰ میں فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی ہو۔ واللہ اعلم۔

اور اسے ابوداؤد نے بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہارون بن عبداللہ نے ہمیں بیان کیا کہ ابن ابی فدیک ضحاک بن عثمان نے ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے ہمیں بیان کیا ہے کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے دسویں ذی الحجہ کی رات حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی طرف حکم بھیجا، پس انہوں نے فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی، پھر چلی گئیں اور طواف افاضہ کیا۔ اور یہ دن وہی دن تھا جس میں رسول اللہ ﷺ انہی کے پاس ہوتے تھے (1)۔ اور جب یہ ثابت ہوگیا تو پھر جس کسی نے رات کے وقت رمی کی وہ جائز ہے، اور سورج طلوع ہونے سے لے کر زوال تک اختیار ہے۔

ابو عمرو نے کہا ہے: اس پر اجماع ہے کہ جمرہ عقبہ پر رمی کرنے کے بارے پسندیدہ وقت سورج طلوع ہونے سے لے کر اس کے زوال تک ہے۔ اور اس پر بھی اجماع ہے کہ اگر کسی نے نحر کے دن سورج غروب ہونے سے پہلے اس پر رمی کی، تو وہ اس کی طرف سے جائز ہوگی اور اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی۔

مگر حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے مستحب یہ ہے کہ اگر اس نے جمرہ عقبہ کی رمی چھوڑ دی یہاں تک کہ شام ہوگئی تو وہ خون بہائے (یعنی ایک جانور قربانی کرے) اور اسے وہ مقام حل سے لے کر آئے۔ اور ایسے آدمی کے بارے اختلاف ہے کہ جس نے جمرہ پر رمی نہ کی یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا، پھر اس نے رات کے وقت یا دوسرے دن رمی کی تو اس کے بارے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس پر دم واجب ہے، اور اس طرح استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمی جمار کے لئے ایک وقت مقرر فرمایا ہے، اور وہ یوم نحر ہے (2) پس جس نے غروب شمس کے بعد رمی کی، تو اس نے

1۔ سنن ابی داؤد، باب التعجیل من جمع، حدیث نمبر 1658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی رمی یوم النحر ضحیٰ، حدیث 818، ابن ماجہ، باب رمی الجمار ایام التشریق، حدیث 3043، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رمی کا وقت نکلنے کے بعد رمی کی۔ اور جو کوئی بھی حج کے دوران کوئی عمل اس کے وقت کے بعد کرے تو اس پر دم واجب ہوتا ہے۔

حضرت امام شافعی نے فرمایا ہے: اس پر دم لازم نہیں ہوگا، یہی قول حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کا بھی ہے۔ اور اسی طرح ابوثور نے بھی کہا ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سائل کو فرمایا: جب اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے شام ہونے کے بعد رمی کی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا حرج کوئی حرج نہیں ہے۔ (1)

حضرت امام مالک نے فرمایا: جو رمی جمار بھول گیا یہاں تک کہ شام ہوگئی تو پھر رات یا دن کے وقت جس ساعت میں اسے یاد آ جائے وہ رمی کر لے جیسا کہ (بھولنے والا) نماز پڑھ لے جب اسے یاد آ جائے، اور وہ رمی نہ کرے مگر صرف وہی جو فوت ہوئی (یعنی جو رمی اپنے وقت پر نہ ہو سکی) اور اگر وہ ایک جمرہ ہو تو اس پر رمی کرے پھر اس رمی کے بعد جن جمروں پر رمی کرنی ہے وہ رمی کرے گا، کیونکہ رمی جمار میں ترتیب واجب ہے۔ اور یہ جائز نہیں کہ وہ پہلے جمرہ کی رمی مکمل کرنے سے پہلے دوسرے جمرہ کی رمی میں شروع ہو جائے جیسا کہ نماز کی رکعتوں میں ایسا کرنا جائز نہیں ہوتا۔ یہی مشہور مذہب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رمی کے صحیح ہونے کے لئے ترتیب واجب نہیں ہے بلکہ جب مکمل رمی ادائیگی کے وقت کے دوران ہو تو وہ جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب رمی کے ایام گزر جائیں تو پھر کوئی رمی نہیں ہے۔ پس اس کے بعد اگر وہ اسے یاد آ جائے جو اس سے صادر ہو رہا ہے درآنحالیکہ ابھی وہ مکہ میں ہی ہو یا مکہ مکرمہ سے نکلنے کے بعد، تو اس پر ہدی (قربانی) واجب ہوگی چاہے اس نے مکمل رمی جمار چھوڑ دیا ہو، یا ان میں سے ایک جمرہ کی رمی ترک کر دی ہو، یا ایک جمرہ کی کنکری چھوڑ دی ہو، یہاں تک کہ ایام منیٰ (یعنی ایام رمی) گزر گئے تو اس پر دم واجب ہوگا۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اگر اس نے مکمل رمی جمار ترک کر دیا تو اس پر دم واجب ہوگا اور اگر ایک جمرہ چھوڑ دیا تو اس پر جمرہ کی ہر کنکری کے بدلے مسکین کو نصف صاع کھانا دینا ہوگا یہاں تک کہ وہ دم کو پہنچ جائے، پھر وہ جو چاہے کھلا دے۔ مگر جمرہ عقبہ کی رمی چھوڑنے کے عوض اس پر دم واجب ہوگا۔

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ صدقہ کرے گا اگر اس نے کنکری چھوڑ دی۔ اور امام ثوری نے کہا ہے: وہ ایک، دو اور تین کنکریوں کے عوض تو کھانا کھلائے گا اور اگر اس نے چار یا اس سے زیادہ کنکریاں چھوڑ دیں، تو پھر اس پر دم واجب ہوگا، اور فقیہ اللیث نے کہا ہے: ایک کنکری چھوڑ دینے میں دم واجب ہے، اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ اور ان کا دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ ایک کنکری میں ایک مد (2) طعام واجب ہے، دو کنکریوں میں دو مد اور تین کنکریوں میں دم واجب ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ رمی جمار میں سے جو ایام تشریق کے دوران رہ جائے یہاں تک کہ آخری یوم تشریق کا سورج غروب ہو جائے تو تمام کے نزدیک رمی کرنے کا کوئی ذریعہ اور جواز نہیں۔ (آخری یوم تشریق سے مراد) یوم نحر سے لے کر چوتھا دن ہے اور یہ ایام تشریق میں سے تیسرا دن ہے (یعنی تیرہویں ذی الحجہ کا دن) البتہ مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق دم یا کھانا کھلانا

1۔ صحیح بخاری، باب الذبح قبل الحلق، حدیث نمبر 1608، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایک پیمانہ جس کی مقدار اہل حجاز کے نزدیک 1.33 رطل اور اہل عراق کے نزدیک 2 رطل ہے

اس کی طرف سے جائز ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ ایام تشریق کی راتیں منیٰ کے علاوہ مکہ مکرمہ یا کہیں اور گزارنا جائز نہیں ہے کیونکہ تمام کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں ہے سوائے چرواہوں کے اور آل عباس کے ان افراد کے جنہیں پانی پلانے کی ولایت حاصل ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منیٰ کی راتیں (حاجیوں کو) پانی پلانے کے لئے مکہ مکرمہ میں گزارنے کی اجازت طلب کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت عطا فرما دی (1)۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ پانی پلانے بارے نگرانی کرتے تھے اور اس کے معاملے کا اہتمام کرتے تھے اور پھر ایام حج میں حاجیوں کو اس کا پانی پلاتے تھے۔ سو اسی لئے آپ کو منیٰ کی بجائے مکہ مکرمہ میں رات گزارنے کی رخصت دی گئی، جیسا کہ اونٹ چرانے والوں کو ان کی حاجت کے پیش نظر رخصت دی گئی، کیونکہ انہیں اونٹ چرانے کے لئے چراگاہ کی طرف نکلنے کی ضرورت ہوتی تھی جو کہ منیٰ سے دور تھی۔

منیٰ کا نام منیٰ اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں خون بہایا جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بلاشبہ اس کا نام منیٰ رکھا گیا ہے کیونکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو کہا: آپ تمنا اور آرزو کیجئے۔ تو آپ نے کہا: ''میں جنت کی تمنا کرتا ہوں۔'' پس اس کا نام منیٰ رکھ دیا گیا۔ اور فرمایا: اس کا نام جمع بھی رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں حضرت حوا اور حضرت آدم علیہما السلام جمع اور اکٹھے ہوئے ہیں (یعنی ان دونوں کی آپس میں ملاقات ہوئی ہے۔) اور جمع مزدلفہ کا بھی نام ہے۔ اور یہ المشعر الحرام بھی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ فقہاء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جنہیں رخصت دی گئی ہے حاجیوں کے لئے منیٰ کی راتیں منیٰ میں گزارنا حج کے شعائر اور اس کے احکام میں سے ہے۔ حج اور اس کے تمام احکام پر قیاس کرتے ہوئے عقل (نظر وفکر) حج کے احکام میں سے کسی حکم کو ساقط کرنے والے پر دم واجب کرتی ہے۔ اور مؤطا میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: حاجیوں میں سے کوئی بھی منیٰ کی راتیں عقبہ کے پیچھے نہیں گزارے گا۔ اور وہ عقبہ جس کے پیچھے رات گزارنے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا ہے یہ وہی عقبہ ہے جو اس جمرہ کے پاس ہے جس پر لوگ یوم نحر کو کنکریاں مارتے ہیں، ان میں سے ہے جو مکہ کے قریب ہیں۔ ابن نافع نے حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ''المبسوط'' میں اسے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ حضرت مالک نے فرمایا: اور جس نے منیٰ کی راتوں میں سے کوئی رات اس کے پیچھے بسر کی، تو اس پر فدیہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے منیٰ کی راتیں منیٰ کے سوا (دوسری جگہ) بسر کی ہیں۔ اور حج میں ایسا کرنا مشروع ہے لیکن اسے ترک کرنے کے سبب اس پر دم لازم ہوگا، جیسا کہ مزدلفہ کی رات کا حکم ہے۔ اور یہاں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فدیہ سے مراد ہدی (قربانی کا جانور) ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ ہدی ہے جسے حل سے حرم کی طرف ہانک کر لایا جائے گا (☆)۔

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4731

☆ ائمہ احناف کے نزدیک یہ راتیں وہاں گزارنا ری جمار کی سہولت کے لیے ہے وہاں ہی گزارے لیکن اگر کوئی وہاں نہیں رہتا تو اس پر دم واجب نہیں، ہدایہ

مسئلہ نمبر 7۔ حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کے واسطہ سے ان کے باپ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ابوالبداح بن عاصم بن عدی نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ چرانے والوں کو منیٰ سے باہر رات گزارنے کی رخصت عطا فرمائی۔ وہ یوم نحر کو رمی کرتے تھے، پھر دوسرے دن یعنی گیارہویں ذی الحجہ اور بارہویں دو دنوں کی رمی کرتے تھے، اور پھر یوم النفر (یعنی تیرہویں ذی الحجہ) کو بھی رمی کرتے تھے۔

ابوعمر نے بیان کیا ہے: حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے مقتضا کے مطابق قول نہیں کیا۔ اور وہ کہتے تھے: وہ یوم نحر کو جمرہ عقبہ پر رمی کرتے، پھر دوسرے دن یعنی گیارہویں ذی الحجہ کو رمی نہ کرتے تھے اور جب بارہویں ذی الحجہ کا دن آتا، اور یہ ایام تشریق میں سے دوسرا دن ہے، اور یہی وہ دن ہے جس میں وہ لوگ جلدی کوچ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو تعجیل (جلدی چلے جانے) کا ارادہ رکھتے ہیں، یا جن کے لئے تعجیل جائز ہوتی ہے، تو وہ اس دن گیارہویں اور بارہویں دو دنوں کی رمی اکٹھی کرتے تھے، کیونکہ اس طرح وہ اسے ادا کرتے تھے جو ان پر لازم تھا۔ اور آپ کے نزدیک کوئی بھی کسی شے کو ادا نہیں کرتا مگر اس کے بعد کہ وہ اس کے ذمہ واجب ہوتی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں اس حدیث کی جو تفسیر بیان کی ہے اس کا یہی مفہوم ہے۔ اور آپ کے سوا کوئی اور کہتا ہے: جو کچھ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں ہے اس کی بناء پر اس تمام میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ تمام کے تمام رمی کے ایام ہیں۔ البتہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چرواہوں کے لئے رمی کو مقدم کرنا جائز نہیں کیونکہ جو چرواہے نہیں ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایام تشریق میں زوال سے پہلے رمی جمار کریں۔ پس اگر کسی نے زوال سے پہلے رمی کی، تو وہ اس کا اعادہ کرے، ان کے لئے تقدیم جائز نہیں۔ بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دوسرے اور تیسرے دن (یعنی بارہویں اور تیرہویں) کی رمی کے بارے میں رخصت عطا فرمائی۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ جو کچھ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں کہا ہے وہ ابن جریج کی روایت میں موجود ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ مجھے محمد بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے اپنے باپ کے واسطہ سے خبر دی ہے کہ ابوالبداح بن عاصم بن عدی نے بیان کیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہوں کو رخصت عطا فرمائی کہ وہ واپس چلے جائیں۔ پس وہ یوم نحر کو رمی کرتے، پھر ایک دن اور ایک رات چھوڑ دیتے، پھر دوسرے دن رمی کرتے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور تیسرے جمرہ کی رمی اس سے ساقط ہو جائے گی جس نے چلے جانے میں جلدی کی۔

ابن ابی زمنین نے کہا ہے: جب کوئی جلدی چلے جانے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ نفر اول کے دن (یعنی بارہویں ذی الحجہ) اس پر رمی کرے گا۔ ابن المواز نے کہا ہے: جلدی کوچ کا ارادہ کرنے والا دو دنوں میں اکیس کنکریاں مارے گا، ہر جمرہ پر سات کنکریاں، تو اس طرح اس کی مجموعی رمی انچاس کنکریاں ہو جائے گی، کیونکہ اس نے دسویں ذی الحجہ کے دن جمرہ عقبہ پر سات کنکریاں پھینکیں ہیں۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور تیسرے دن کی رمی ساقط ہو جائے گی۔

مسئلہ نمبر 8۔ مالک نے یحییٰ بن سعید کے واسطہ سے حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے یہ ذکر کرتے ہوئے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہوں کو رخصت دی ہے کہ وہ رات کے وقت رمی جمار کریں۔ وہ کہتے

ہیں: ''زمانہ اول میں'' باجی نے کہا ہے کہ قولہ فی الزمن الاوّل حضور نبی مکرم ﷺ کے زمانہ پر اپنے اطلاق کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ وہی اس شریعت کا زمانہ اول ہے۔ پس اس بنا پر یہ روایت مرسل ہے اور وہ قول یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ اس سے مراد وہ پہلا زمانہ ہے جسے حضرت عطا نے پایا ہو تو پھر یہ روایت موقوف مسند ہو گی۔ واللہ اعلم۔

میں (مصنف) کہتا ہوں کہ یہ روایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی ﷺ کی حدیث سے مسند ہے، اسے دارقطنی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اور ہم نے اسے المقتبس فی شرح مؤطا مالك بن انس میں ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ ان (چرواہوں) کے لئے رات کے وقت رمی جمار کو مباح کیا گیا ہے، کیونکہ یہ ان کے ساتھ انتہائی نرم رویہ ہے، اور اس میں ان کے لئے انتہائی زیادہ احتیاط ہے جو وہ اونٹ چرانے کا قصد کرتے تھے۔ کیونکہ رات کے وقت نہ وہ چرتے ہیں اور نہ وہ منتشر ہوتے ہیں، پس وہ اس وقت میں رمی کرلیں۔

تحقیق ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جس کی رمی رہ گئی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا، تو اس بارے میں حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اونٹ چرانے والوں کے سوا رات کے وقت کسی کے لئے رمی جائز نہیں۔ رہے تجار، تو ان کے لئے بھی جائز نہیں۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: جس کی رمی فوت ہو گئی یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے، تو پھر اسے چاہیے کہ وہ رمی نہ کرے یہاں تک کہ دوسرے دن کا سورج طلوع ہو جائے۔ اسی طرح امام احمد اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور حضرت امام مالک نے فرمایا ہے کہ جب کوئی دن کے وقت رمی چھوڑ دے تو وہ رات کے وقت رمی کرلے اور اس پر ابن القاسم کی روایت کے مطابق دم لازم ہو گا۔ اور آپ نے موطا میں یہ ذکر نہیں کیا کہ اس پر دم ہو گا۔

امام شافعی، ابوثور، یعقوب اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب کوئی رمی بھول جائے یہاں تک کہ شام ہو جائے، تو وہ رمی کرے گا اور اس پر دم نہیں ہو گا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ رات کے وقت رمی جمار کرنے کی رخصت دیتے تھے۔

امام اعظم ابوحنیفہ نے فرمایا ہے: وہ رمی کرے گا اور اس پر کوئی شے لازم نہ ہو گی، اور اگر اسے رات کے وقت بھی رمی یاد نہ آئی، یہاں تک کہ دوسرا دن آ گیا، تو اس پر لازم ہے کہ وہ رمی کرلے اور اس پر دم لازم ہو گا، اور امام ثوری نے کہا ہے: جب کسی نے بھول کر یا بالارادہ رمی کو رات تک مؤخر کر دیا تو وہ خون بہائے (یعنی جانور قربانی کرے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: چرواہوں میں سے یا پانی پلانے والوں میں سے کسی نے رات کے وقت رمی کی، تو اس پر دم واجب نہ ہو گا۔ (یہ حکم حدیث کے مطابق ہے۔) اور اگر ان کے علاوہ کسی اور نے ایسا کیا تو عقل و نظر دم واجب کرے گی جبکہ یہ بالارادہ ہو۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوم نحر کو اپنی سواری پر جمرہ عقبہ پر رمی کی۔ اور امام مالک

وغیرہ نے مستحب قرار دیا ہے کہ اس پر رمی کرنے والا سوار ہو، حالانکہ حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر اور حضرت سالم رضی اللہ عنہم پیدل حالت میں رمی کرتے تھے اور چاہیے کہ ہر روز تینوں جمروں پر اکیس کنکریاں رمی کرے، اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہے، اور رمی کرتے وقت اس کا چہرہ قبلہ شریف کی طرف ہو، اور جمرات ترتیب کے ساتھ رکھے، نہ انہیں اکٹھا کرے اور نہ ہی انہیں متفرق کرے اور نہ انہیں اوندھا رکھے، وہ جمرہ اولیٰ سے ابتدا کرے اور اس پر سات کنکریاں مارے، وہ انہیں اس کے پاس رکھ نہیں دے گا۔ اسی طرح امام مالک، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب رائے نے کہا ہے۔ پس اگر اس نے انہیں پھینک دیا تو یہ اصحاب رائے کے نزدیک جائز ہے۔

ابن قاسم نے کہا ہے: دونوں صورتوں میں تمام کنکریاں پھینک دینا جائز نہیں ہے۔ یہی صحیح ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کنکریاں مارتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک ہی بار دو یا دو سے زیادہ کنکریاں نہیں پھینکنی چاہئے۔ پس اگر اس نے ایسا کیا، تو وہ اسے ایک کنکری شمار کرے۔ اور جب وہ ایک جمرہ سے فارغ ہو جائے تو وہ اس کے سامنے کی طرف آگے بڑھے اور طویل وقت تک دعا کے لئے کھڑا رہے اور جو میسر آئے (وہی مانگے) بعد ازاں دوسرے جمرہ پر رمی کرے اور یہ جمرہ وسطی ہے اور وہ اس سے وادی کے بطن میں شمال کی طرف پھر جائے اور اس کے پاس بھی دعا کے لئے طویل وقت تک وقوف کرے۔ پھر تیسرے جمرہ پر کنکریاں مارے اور یہ جمرہ عقبہ ہے، اس پر بھی سات کنکریاں مارے گا اور اس کے نیچے کی جانب سے اس پر کنکریاں پھینکے گا اور اس کے پاس کھڑا نہیں ہوگا۔ اگر کسی نے اس پر اس کی اوپر کی جانب سے رمی کی تو وہ بھی اس کی طرف سے جائز ہے اور وہ رمی کے دوران ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہے گا۔ رمی جمار کے دوران سنت ذکر تکبیر ہے نہ کہ اس کے علاوہ کوئی اور ذکر اور وہ پیدل رمی کرے گا بخلاف یوم نحر کے جمرہ کے۔ یہ سب کا سب (حکم) توقیفی ہے۔ نسائی اور دار قطنی نے اسے حضرت زہری سے مرفوعاً ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس جمرہ پر رمی کرتے تھے جو مسجد منیٰ کے ساتھ متصل ہے تو آپ اس پر سات کنکریاں مارتے تھے اور جب بھی ایک کنکری پھینکتے تو ساتھ تکبیر (اللہ اکبر) کہتے تھے۔ پھر اس سے آگے بڑھتے اور قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے اور آپ طویل وقت تک کھڑے رہتے تھے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے جمرہ کے پاس آتے تھے اور اسے سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے تھے۔ پھر آپ بائیں جانب اس جگہ کی طرف نیچے اترتے جو وادی کے ساتھ متصل ہے اور قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جمرہ کے پاس آتے جو عقبہ کے پاس ہے اور اس پر سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہتے، پھر واپس پھر جاتے اور اس کے پاس نہ ٹھہرتے۔ زہری نے کہا ہے: میں نے حضرت سالم بن عبداللہ کو اپنے باپ سے اور انہیں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کرتے تھے۔ یہ الفاظ دار قطنی کے ہیں۔ (1)

مسئلہ نمبر 10۔ کنکریوں کا حکم یہ ہے کہ وہ پاک ہوں، ناپاک نہ ہوں اور نہ ہی ان میں سے ہوں جو پہلے ماری جا چکی

1۔ بخاری شریف، باب رفع الیدین عند الجمرۃ، حدیث نمبر 1634، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں، سو اگر کسی نے ایسی کنکری ماری جو پہلے ماری جا چکی ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ جائز نہیں۔ تحقیق ان سے ابن قاسم نے بیان کیا ہے: اگر ایسا ایک کنکری میں ہوا تو آپ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اور میں ابن قاسم کے پاس آیا تو انہوں نے اس کے بارے فتویٰ دیا۔

مسئلہ نمبر 11۔ اہل علم نے مستحب قرار دیا ہے کہ وہ کنکریاں مزدلفہ سے اٹھائے نہ کہ وہ جو مسجد میں پڑی ہیں اور اگر کسی نے ضرورت سے زیادہ کنکریاں اٹھالیں اور رمی کرنے کے بعد وہ اس کے پاس باقی بچ رہیں تو وہ انہیں دفن کر دے، انہیں پھینکے نہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ جمہور کے نزدیک کنکریوں کو دھویا نہیں جائے گا۔ طاؤس نے اس میں اختلاف کیا ہے حالانکہ یہ روایت موجود ہے کہ اگر اس نے ناپاک کنکریوں کو نہ دھویا یا ایسی کنکریوں کے ساتھ رمی کی جو پہلے ماری جا چکی تھیں تو اس نے گناہ کیا اور آپ نے اس کی طرف سے رمی کو جائز قرار دیا۔

ابن منذر نے بیان کیا ہے: یہ مکروہ ہے کہ وہ ان کنکریوں کے ساتھ رمی کرے جن کے ساتھ پہلے رمی کی جا چکی ہو۔ اگر ایسی کنکریوں کے ساتھ رمی کی گئی تو وہ اس کی طرف سے جائز ہو گی، کیونکہ میں کسی ایک کو بھی نہیں جانتا جس نے ایسا کرنے والے پر رمی کا اعادہ واجب قرار دیا ہو اور نہ ہی ہم اخبار میں سے کوئی ایسی خبر جانتے ہیں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنکری کو دھویا ہو اور نہ ہی آپ نے اسے دھونے کا حکم ارشاد فرمایا۔ تحقیق ہم نے طاؤس سے روایت کیا ہے کہ وہ کنکریاں دھوتے تھے۔

مسئلہ نمبر 13۔ رمی جمار میں مٹی کا ڈھیلا پھینکنا جائز نہ ہو گا اور نہ ہی کوئی ایسی شی جو پتھر نہ ہو۔ امام شافعی، امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: خشک مٹی کا ڈھیلا جائز ہو گا۔ اسی طرح ہر وہ شے جو اس نے پھینکی اور اس کا تعلق زمین سے ہو، تو وہ جائز ہو گی۔

امام ثوری نے کہا ہے: جس نے مٹی کے ڈھیلے اور ٹھیکری کے ساتھ رمی کی تو وہ رمی کا اعادہ نہ کرے۔ ابن منذر نے کہا ہے: سنگریزوں کے سوا رمی جائز نہیں ہو گی۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم پر انگلیوں سے کنکریاں پھینکنا لازم ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رمی کنکریوں کے ساتھ تھی۔

مسئلہ نمبر 14۔ کنکری کی مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: وہ طولاً اور عرضاً پورے سے چھوٹی ہو گی۔ اور ابو ثور اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: ٹھیکری کی کنکری کی مثل ہو گی۔ اور ہم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ بکری کی مینگنی کے برابر کنکری کے ساتھ رمی کرتے تھے۔ اور حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ کے اس قول کا کوئی معنی نہیں ہے: اس سے بڑی میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؛ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ٹھیکری کی کنکری کی مثل کے ساتھ رمی کی سنت قائم فرمائی ہے۔ البتہ جس پر حصاۃ کا نام واقع ہو سکے اس کے ساتھ رمی کرنا جائز ہے اور سنت کی اتباع کرنا افضل ہے۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ صحیح قول (یا عمل) جس کا خلاف کرنا اس کے لئے جائز نہیں ہوتا جو ہدایت یافتہ ہو اور اقتدا کرے (وہ یہ ہے کہ) امام نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عقبہ کی صبح ارشاد فرمایا: درآنحالیکہ آپ اپنی سواری پر تھے: میرے لئے کنکریاں چن کر لاؤ۔ چنانچہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کنکریاں چنیں، وہ ٹھیکری کی کنکریوں کی مثل تھیں۔ پس جب میں نے انہیں آپ کے دست مبارک میں دیا تو فرمایا: ہاں انہی کی مثل (یعنی رمی کے لئے اتنی مقدار ہی مناسب اور موزوں ہے۔) اور تم دین میں غلو کرنے سے بچو۔ بلاشبہ جو تم سے پہلے تھے انہیں دین میں غلو کرنے نے ہلاک کر دیا(1)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد وَاِیَّاکُمْ وَالْغُلُوَّ فِی الدِّیْنِ بڑی کنکریوں کے ساتھ رمی کرنے کی کراہت پر دلیل ہے۔ بلاشبہ یہ غلو میں سے ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 15۔ وہ آدمی جس کے ہاتھ میں کنکری باقی ہو، وہ نہ جانتا ہو یہ کون سی کنکریوں میں سے ہے تو وہ اسے پہلی میں سے بنائے (یعنی اسے جمرہ اولیٰ پر مارے) اور اس کے بعد پھر وسطیٰ اور آخری پر رمی کرے۔ اور اگر زیادہ وقت گزر جائے تو پھر مکمل رمی نئے سرے سے کرے۔

مسئلہ نمبر 16۔ امام مالک، امام شافعی، عبدالملک، ابوثور اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے اس کے بارے کہا ہے جس نے ایک جمرہ پر دوسرے جمرہ کو مقدم کر دیا: وہ رمی اس کی طرف سے جائز نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ پے در پے اور لگاتار رمی کرے۔ حسن، عطا اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ اس کی طرف سے جائز ہوگی اور بعض لوگوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے استدلال کیا ہے کہ "جس کسی نے ایک حکم کو دوسرے حکم پر (جو کہ متصل اس کے بعد ہو) مقدم کر دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں"۔ اور فرمایا: یہ اس آدمی سے زیادہ نہیں ہوگا جس پر کئی نمازیں اور روزے جمع ہو گئے اور اس نے بعض کو بعض سے پہلے قضا کر لیا۔ پہلے قول میں احتیاط زیادہ ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 17۔ مریض کے رمی کرنے اور اس کی طرف سے رمی کیے جانے کے بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: ایسے مریض اور بچے کی جانب سے رمی کی جائے گی جو رمی کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور مریض ان کی رمی کے وقت کوشش کرے کہ وہ ہر جمرہ کے لئے سات تکبیریں کہے اور اس پر ہدی (قربانی) ہو گی، اور جب مریض رمی کے ایام میں تندرست ہو جائے اور وہ خود اپنی طرف سے رمی کر لے، اس کے باوجود اس پر امام مالک کے نزدیک دم واجب ہوگا۔

امام حسن، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ مریض کی طرف سے رمی کی جائے گی اور انہوں نے ہدی کا ذکر نہیں کیا۔ اور وہ بچہ جو رمی پر قدرت نہیں رکھتا اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس کی طرف سے رمی کی جائے گی۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 18۔ دارقطنی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ہم نے عرض

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3248

کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ کنکریاں جو یہاں ہر سال پھینکی جاتی ہیں تو ہم گمان کرتے ہیں کہ یہ کم ہو جاتی ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ ان میں سے جو قبول کرلی جاتی ہیں وہ اٹھالی جاتی ہیں، اور اگر اس طرح نہ ہو تو تو انہیں پہاڑوں کی مثل دیکھے (1)۔

مسئلہ نمبر 19۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ حاجیوں میں سے جو منیٰ سے نفر اول کے دن اپنے شہر کی طرف واپس جانے کے لئے نکلنے کا ارادہ کرے، درآنحالیکہ وہ (شہر) حرم سے باہر ہو اور وہ مکہ مکرمہ میں مقیم نہ ہو، تو اسے چاہئے وہ زوال شمس کے بعد کوچ کرے، بشرطیکہ وہ یوم نحر سے متصل دن میں شام سے پہلے پہلے رمی کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ترجمہ ''اور جو جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں'' پس جو وہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ کوچ کرے جب تک کہ ابھی دن موجود ہو۔ تحقیق ہم نے حضرت نخعی اور حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ ان دونوں نے کہا: ایام تشریق کے دوسرے دن جسے عصر کی نماز کا وقت منیٰ میں ہو گیا، تو وہ آنے والے دن کی صبح تک وہاں سے کوچ نہ کرے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ دونوں نے یہ قول بطور استحباب کیا ہے اور پہلا قول جو ہم کہتے ہیں وہ ظاہر کتاب وسنت کے مطابق ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ اہل مکہ کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ کیا نفر اول کے دن (منیٰ سے) جاسکتے ہیں؟ تو ہم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تمام لوگوں میں سے جو چاہے نفر اول کے دن وہ وہاں سے جاسکتا ہے سوائے آل خزیمہ کے وہ صرف نفر ثانی کے دن ہی وہاں سے کوچ کر سکتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجھے اس آدمی پر کوئی تعجب نہیں جس نے کوچ کے پہلے دن وہاں سے کوچ کیا تاکہ وہ مکہ مکرمہ میں مقیم ہو جائے۔ مزید فرمایا: اہل مکہ تو نسبتاً زیادہ جلدی کرتے ہیں۔

امام احمد اور اسحاق نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قول الا آل خزیمۃ کا معنی یہ بیان کیا ہے کیونکہ وہ اہل حرم ہیں۔

اور حضرت امام مالک اہل مکہ کے بارے میں فرماتے ہیں: جس کے لئے کوئی عذر ہو اس کے لئے تو جلدی کر کے دو دنوں میں وہاں سے چلے جانا جائز ہے۔ اور اگر کوئی امور حج میں سے کسی کے بارے میں محض اپنے لئے تخفیف کا ارادہ کرے تو پھر اس کے لئے جائز نہیں ہے۔ تو گویا آپ نے تعجیل کا حکم ان کے لئے قرار دیا جن کا علاقہ دور ہو۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: آیت اپنے عموم پر ہے، رخصت تمام لوگوں کے لئے ہے، چاہے وہ اہل مکہ ہوں یا دوسرے، کوئی منیٰ سے نکل کر مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے کا ارادہ کرے یا اپنے شہر کی طرف جانے کا قصد کرے۔ حضرت عطا نے کہا ہے: یہ آیت عام لوگوں کے لئے ہے۔ ابن منذر کا قول حضرت امام شافعی کے مذہب سے مشابہت رکھتا ہے، اور اسی کے مطابق ہم کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس، حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے ارشاد فرمایا ہے: ایام معدودات میں سے دوسرے دن جس نے منیٰ سے کوچ کیا تو اس پر کوئی حرج (گناہ) نہیں اور جو تیسرے دن تک وہاں ٹھہر گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ پس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ سب مباح ہے۔ اور اس کی اس تقسیم کو اہتمام اور تاکید سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ

1۔ سنن دارقطنی، جلد 2، صفحہ 300

عربوں میں سے کچھ تھے جو جلدی کر کے وہاں سے چلے جانے والے کی مذمت کرتے تھے اور اس کا برعکس (یعنی کچھ ایسے تھے جو تاخیر کرنے والے کی مذمت کرتے تھے) تو ان تمام سے گناہ کو اٹھانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ (یعنی جس نے جو طریقہ بھی کیا چاہے جلدی کی یا تاخیر کی کسی کے لئے بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔)

حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہم نے بھی کہا ہے: مَنْ تَعَجَّلَ کا معنی ہے جس نے جلدی کی تحقیق اسے بخش دیا گیا اور جس نے تاخیر کی تحقیق اسے بھی بخش دیا گیا، اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: ''جس نے اس بیت اللہ شریف کا حج کیا اور اس نے رفث و فسق کا ارتکاب نہ کیا تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہو گیا جیسا کہ اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا'' (1)

اور ارشاد باری ہے: فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ یہ بھی نفی عام ہے اور براءت مطلقہ ہے۔

اور مجاہد نے بھی کہا ہے: آیت کا معنی ہے جس نے جلدی کی یا جس نے تاخیر کی تو اس پر آنے والے سال تک کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اس قول میں اثر کو بیان کیا گیا ہے۔

ابوالعالیہ نے آیت کے بارے میں کہا ہے: اس پر کوئی گناہ نہیں جو اپنی بقیہ عمر متقی بن کر رہا اور حج کرنے والے کے لئے یقینی مغفرت ہے، یعنی اس کے تمام گناہ ختم ہو جاتے ہیں اگر وہ اپنی بقیہ عمر اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہا۔

ابو صالح وغیرہ نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے ''اس پر کوئی گناہ نہیں ہے جو شکار کو قتل کرنے سے بچتا رہا اور ہر اس شے سے جس سے اجتناب کرنا حج کے دوران اس پر واجب ہوتا ہے اور یہ بھی کہا: اس پر کوئی گناہ نہیں جو اپنے حج میں بچتا رہا اور اسے مکمل ادا کر دیا یہاں تک کہ وہ ہر قسم کے شبہ اور خیانت سے پاک تھا۔

مسئلہ نمبر 21۔ قول باری تعالیٰ فَمَنْ تَعَجَّلَ میں، مَنْ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ خبر ہے۔ اور قرآن کے علاوہ اسے فلا اثم علیهم پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ مَنْ جمع کے معنی کے لئے ہے، جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ (یونس: 42) میں من جمع کے لئے ہے۔ اور وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ میں بھی اسی طرح ہے اور لِمَنِ اتَّقٰى میں لام غفران سے متعلق ہے۔ اور تقدیر کلام اسی طرح ہے المغفرۃ لمن اتقٰی یعنی مغفرت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلاشبہ مغفرت اس کے لئے رکھی گئی ہے جو حج سے واپس لوٹنے کے بعد تمام گناہوں سے بچتا رہا۔

اور اخفش نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے ذلك لمن اتقى وہ اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کے لئے (مغفرت ہے) جو حالت احرام اور حرم میں شکار کو قتل کرنے سے بچتا رہا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تقدیر عبارت ہے الاباحۃ لمن اتقی اباحت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ عزوجل ولا فسوق ولا جدال فی الحج، حدیث نمبر 1691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ قول بھی ہے کہ تقدیر کلام یہ ہے: السلامة لمن اتقى سلامتی اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وَاذْكُرُوا کے متعلق ہے۔ یعنی الذکر لمن اتقی یعنی نصیحت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ اور سالم بن عبد اللہ نے فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ میں تخفیفاً الف کو ملا کر پڑھا ہے۔ اور عرب اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسا کہ شاعر کا قول ہے۔

ان لم اقاتل فالبسوانی برقعا

اگر میں نے قتال نہ کیا تو تم مجھے برقعہ پہنا دینا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور حشر و وقوف کو یاد رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝۲۰۴

''اور اے (سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو دنیاوی زندگی کے بارے میں اور وہ گواہ بناتا رہتا ہے اللہ کو اس پر جو اس کے دل میں ہے حالانکہ وہ (حق کا) سخت ترین دشمن ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ جب ان لوگوں کا ذکر کیا جن کی ہمتیں اور توانائیاں دنیا پر ہی محدود و محصور ہو گئیں (یعنی ان کی صلاحیتیں اور کوششیں فقط دنیا کے لیے ہی صرف ہوئیں) (یعنی) اس ارشاد گرامی میں فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا (بقرہ: 200) اور ان مومنین کا ذکر کیا جنہوں نے دونوں جہان کی خیر اور منفعت کا سوال کیا، تو اب منافقین کا ذکر کیا، کیونکہ انہوں نے ایمان کو ظاہر کیا اور کفر کو چھپا کر رکھا۔

سدی وغیرہ مفسرین نے کہا ہے: یہ آیت اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا نام ابی تھا اور اخنس اس کا لقب تھا۔ اس کا یہ لقب اس لئے تھا کیونکہ وہ غزوۂ بدر کے دن اپنے حلفاء میں سے بنی زہرہ کے تین سو افراد کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف جنگ کرنے سے پیچھے ہٹ گیا تھا (اور لشکر کفار سے واپس چلا گیا تھا) جیسا کہ اس کی تفصیل سورۂ آل عمران میں آئے گی۔ وہ انتہائی شیریں بیان اور حسین المنظر آدمی تھا۔ سو اس کے بعد وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور اپنا اسلام ظاہر کیا اور یہ کہا: اللہ تعالیٰ جانتا ہے میں اپنے قول میں سچا ہوں، پھر اس کے بعد بھاگ گیا۔ اس کا گزر مسلمانوں میں سے ایک قوم کی کھیتی کے پاس سے ہوا اور وہاں ساتھ گدھے بھی تھے، تو اس نے کھیتی کو جلا دیا اور گدھوں کی کونچیں کاٹ دیں۔ مہدوی نے کہا ہے: اسی کے بارے میں یہ آیات بھی نازل ہوئیں وَ لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِیْنٍ ۝۱۰ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِیْمٍ ۝۱۱ (قلم) (اور نہ بات مانیے کسی (جھوٹی) قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کی جو بہت نکتہ چین، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے) اور وَیْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝۱ (ہمزہ) (اور ہلاکت ہے ہر اس شخص کے لئے جو (روبرو) طعنے دیتا ہے (پیٹھ پیچھے) عیب جوئی کرتا ہے۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: کبھی بھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ اخنس نے اسلام قبول کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت منافقین کی ایک قوم کے بارے نازل ہوئی، انہوں نے ان لوگوں کے بارے میں باتیں کیں جو غزوۂ رجیع میں شہید کر دیے گئے یعنی حضرت عاصم بن ثابت اور حضرت خبیب وغیرہ رضی اللہ عنہم، منافقین نے کہا: ان لوگوں پر افسوس ہے کہ نہ یہ اپنے گھروں میں بیٹھے اور نہ ہی یہ اپنے صاحب (مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں) کا پیغام پہنچا سکے۔ پس یہ آیت منافقین کی صفات کے بارے میں نازل ہوئی۔ پھر غزوۂ رجیع میں جام شہادت نوش کرنے والوں کا ذکر اس طرح فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (بقرہ: 207) (اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے۔)

حضرت قتادہ، مجاہد اور علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: یہ آیت ہر اس (بندے) کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کے باطن میں کفر، نفاق، کذب یا اضرار (کسی کو نقصان اور ضرر پہنچانا) چھپا ہو اور وہ اپنی زبان سے اس کے خلاف اظہار کرتا ہو۔ پس یہ آیت عام ہے اور یہ اس حدیث سے مشابہت رکھتی ہے جو ترمذی میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض کتب میں ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک قوم ہوگی جن کی زبانیں شہد سے زیادہ شیریں ہوں گی اور ان کے دل مصبر سے زیادہ کڑوے ہوں گے۔ وہ نرمی سے بھیڑوں کے چمڑے لوگوں کو پہنائیں گے اور وہ دین کے عوض دنیا خریدیں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: کیا وہ مجھے دھوکہ دیتے ہیں اور وہ مجھ پر جرأت کرتے ہیں؟ مجھے قسم ہے میں ضرور بضرور ان پر ایسا فتنہ مسلط کر دوں گا جو ان میں سے حلیم کو حیران و ششدر کر چھوڑے گا(1)۔

ارشاد باری تعالیٰ وَيُشْهِدُ اللّٰهَ کا معنی یہ ہے کہ وہ کہتا ہے: اللہ تعالیٰ جانتا ہے بلاشبہ میں حق کہہ رہا ہوں۔ ابن محیصن نے اسے وَيَشْهَدُ اللّٰهُ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ یعنی یشھد میں یا اور ہا کو مفتوح اور لفظ اللہ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے ”اس کی بات تجھے پسند آئی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے قول کے خلاف کو جانتا ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (المنافقون) (لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت واللّٰهُ يُشْهِدُ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ اور جماعت کی قراءت مذمت میں زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اس نے اپنے نفس پر اچھا کلام لازم کرنے کی قوت رکھی اور پھر اس کے باطن سے اس کے خلاف ظاہر ہوا۔ اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے وَيَسْتَشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ پڑھا ہے۔ اور یہ جمہور کی قراءت کی دلیل ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں ان امور کے بارے میں انتہائی احتیاط برتنے پر دلیل اور تنبیہ ہے جو دین اور دنیوی امور سے متعلق ہیں اور گواہوں اور قاضیوں کے احوال کے بارے میں طلب براءت پر دلیل ہے، بلاشبہ حاکم لوگوں کے ظاہر احوال پر اور جو کچھ ان کے ایمان اور مصالح میں سے ظاہر ہو اس پر عمل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ ان کے باطن کے بارے میں بحث کر لے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے احوال بیان فرما دیے ہیں۔ اور بلاشبہ ان میں سے ایسے بھی ہیں جو بظاہر انتہائی خوبصورت اور حسین بات کرتے ہیں حالانکہ وہ نیت قبیح کرتے ہیں (یعنی ان کی نیت میں فتور اور برائی ہوتی ہے۔)

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

پس اگر کہا جائے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی اس کے معارض آتا ہے: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ قتال کروں یہاں تک کہ وہ کہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ، الحدیث۔(1)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی اس کے خلاف ہے: ''پس میں اس کے لئے اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں جو میں سنتا ہوں''(2)۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح ابتدائے اسلام میں تھا، جہاں ان کا اسلام ہی ان کی سلامتی کا باعث تھا لیکن جب فساد عام ہو گیا تو پھر یہ حکم نہ رہا۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صحیح بات یہ ہے کہ ظاہر کے مطابق عمل کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کا خلاف ظاہر ہو جائے۔ کیونکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: صحیح بخاری میں ہے: اے لوگو! بلاشبہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے، بلاشبہ اب ہم تمہیں تمہارے ان اعمال سے پکڑیں گے جو ہمارے لئے ظاہر ہوں گے۔ پس جس نے ہمارے لئے خیر اور بھلائی کو ظاہر کیا تو ہم اسے امن عطا کریں گے اور ہم اسے قرب عطا کریں گے۔ اس کے اسرار اور پوشیدہ چیزوں میں سے کوئی شے ہمارے لئے (باعث تشویش) نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس کی پوشیدہ چیزوں کے بارے میں اس کا محاسبہ فرمائے گا اور جس نے ہمارے لئے برائی کو ظاہر کیا، تو ہم نہ اسے امان دیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے، اگرچہ وہ کہے کہ اس کے دل اور ارادہ میں نیکی اور اچھائی ہے۔(3)

مسئلہ نمبر 3۔ ارشاد باری تعالیٰ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ اس میں اَلَدُّ سے مراد سخت اور شدید جھگڑا کرنے والا ہے۔ کہا جاتا ہے: ھو رجل اَلَدُّ و امرأۃ لَدَّاءُ (وہ سخت جھگڑالو مرد اور وہ سخت جھگڑالو عورت ہے۔) وھم اھل لَدَدا اور وہ سخت جھگڑا کرنے والے ہیں۔ وَ قَدْ لَدِدْتَ اس میں دال مکسور ہے (تو نے جھگڑا کیا) تَلَدُّ یہ عین کلمہ کے فتح کے ساتھ ہے۔ لَدَدًا (یعنی یہ باب سَمِعَ یَسْمَعُ ہے۔) یعنی تو سخت جھگڑالو ہو گیا۔ اور لددتُه اَلُدُّهٗ یعنی پہلے میں دال مفتوح ہے اور دوسرے میں مرفوع ہے۔ یہ تب کہا جائے گا جب تو کسی سے جھگڑا کرے اور تو اس پر غالب آ جائے۔ اور الالدُّ یہ اللَّدِیدین سے مشتق ہے۔ اس سے مراد گردن کی دونوں سطحیں ہیں یعنی جھگڑا میں جس جانب سے بھی پکڑ لیا جائے غلبہ پا لیا جاتا ہے۔

شاعر کا قول ہے:

والدّ ذی حنقٍ علیّ کأنما تغلی عداوۃ صدرہ فی مرجل

وہ بڑی شدت اور سختی کے ساتھ میرے گلے کو دبانے والا ہے، گویا کہ اس کے سینے کی عداوت ہنڈیا میں کھول رہی ہے۔

ایک دوسرے شاعر نے کہا:

ان تحت التراب عزما و حزماً و خصیما ألدّ ذا مغلاق

1۔ بخاری شریف، باب قتل من ابی قبول الفرائض الخ، حدیث نمبر 6413، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، باب اذا غصب جاریۃ الخ، حدیث نمبر 6452، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ بخاری شریف، باب الشھداء العدول، حدیث نمبر 2447، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس میں بھی خصیماً الدّ سخت جھگڑالو کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

آیت میں الخصام خاصم کا مصدر ہے۔ امام خلیل نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خَصم کی جمع ہے۔ یہ قول زجاج کا ہے، جیسا کہ کلب کی جمع کلاب، صعب کی جمع صعاب اور ضخم کی جمع ضخام ہے۔ اور اس کا معنی ہے جھگڑا کرنے والوں میں سے سخت اور شدید جھگڑا کرنے والا، یعنی سخت جھگڑالو، جب وہ تجھ سے بات کرے اور تجھ پر بات دہرائے اور تو اس کے کلام کو خوبصورت اور حسین دیکھے درآنحالیکہ اس کے باطن میں باطل ہو۔ یہ (معنی) اس پر دلالت کرتا ہے کہ جھگڑا کرنا جائز نہیں ہوتا مگر ایسے سبب سے جس کا ظاہر اور باطن برابر ہو۔ اور صحیح مسلم (1) میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سے مبغوض ترین آدمی سخت جھگڑا کرنے والا ہے۔''

وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۝۲۰۵

''اور جب وہ حاکم بن جاتا ہے تو سرتوڑ کوشش کرتا ہے کہ ملک میں فساد برپا کردے اور تباہ کردے کھیتوں کو اور نسل انسانی کو۔ اور اللہ تعالیٰ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا''۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا کے تحت کہا گیا ہے کہ تولّی اور سعی فعل قلب میں سے ہیں۔ پس تَوَلّٰی، ضَلَّ و غَضِبَ و انف فی نفسه کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی وہ گمراہ ہو گیا، غصے ہو گیا اور اس نے اپنے دل میں اسے ناپسند کیا۔ اور سعی کا معنی ہے اس نے اپنے حیلہ اور ارادہ کے ساتھ اسلام اور اہل اسلام پر مصائب لانے کی کوشش کی۔ یہ ابن جریج وغیرہ سے منقول ہے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ یہ دونوں آدمی کے فعل ہیں۔ پس تَوَلّٰی بمعنی ادبر (پیٹھ پھیرنا) آتا ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اس نے پیٹھ پھیری اور وہ آپ سے چلا گیا اور سعی کا معنی ہے: اور وہ اپنے قدموں کے ساتھ چلا اور اس نے راستہ طے کیا اور اسے پامال کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے: دونوں کوششیں فساد ہیں۔ کہا جاتا ہے: سعی الرجل یسعی سعیا۔ یعنی آدمی نے دوڑ لگائی۔ اور اسی طرح جب وہ کام کرے اور کچھ کمائے تو یہ کہا جاتا ہے: فلاں یسعی علی عیاله یعنی فلاں اپنے گھر والوں کے نفع کے لئے کام کرتا ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ وَ یُهْلِكَ یہ لِیُفْسِدَ پر معطوف ہے۔ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت میں وَ لِیُهْلِكَ ہے۔ حسن اور قتادہ نے اسے ویُهلِكُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کے رفع کے بارے میں کئی اقوال ہیں۔ اس کا عطف یُعجِبُكَ پر ہے (اس لئے مرفوع ہے) اور ابو حاتم نے کہا ہے: یہ سعی پر معطوف ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے ''وہ سرتوڑ کوشش کرتا ہے اور

1۔ بخاری شریف، قول اللہ تعالیٰ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ، حدیث نمبر 2277، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تباہ کرتا ہے۔'' اور ابو اسحاق نے کہا ہے: یہ اصل عبارت وھو یُھْلِكُ ہے یعنی وہ تباہ کرتا ہے۔ اور ابن کثیر سے وَیُھْلِكُ یعنی یاء کے فتحہ اور کاف کے ضمہ کے ساتھ مروی ہے۔

اور اَلْحَرْثُ وَالنَّسْلُ، یُھْلِكُ کے سبب دونوں مرفوع ہیں۔ اور یہی حسن، ابن ابی اسحاق، ابو حیوہ اور ابن محیصن کی قراءت ہے۔ اور عبدالوارث نے اسے ابو عمرو سے روایت کیا ہے۔

اور ایک قوم نے اسے وَیَھْلَكُ یعنی یا اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور الحرث کو رفع دیا ہے۔ اور لغوی طور پر ھَلَكَ یَھْلَكُ یہ رَكَنَ یَرْكَنُ، أبیٰ یأبیٰ، سَلَیٰ یسلی، قلیٰ یقلیٰ اور ان کے مشابہ افعال کی مثل ہے۔ اور آیت میں مراد اخنس کا کھیتی کو جلانا اور گدھوں کو قتل کرنا ہے۔ یہ علامہ طبری کا قول ہے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے مفسرین نے کہا: لیکن اب یہ آیت تمام لوگوں کے لئے عام ہوگئی ہے۔ پس جو بھی اس کے عمل کی طرح عمل کرے گا وہی اس لعنت اور سزا کا مستحق ہوگا۔

بعض علماء نے کہا ہے: بے شک جو گدھے کو قتل کرتا ہے یا اناج کے ڈھیر کو جلاتا ہے وہ مستوجب ملامت ہے اور یوم قیامت تک اسے یہ عیب لاحق رہے گا۔

مجاہد نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ ظالم زمین میں فساد برپا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بارش کو روک لیتا ہے اور وہ کھیتی اور نسل (انسانی) کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: الحرث (کھیتی) سے مراد عورتیں ہیں اور النسل سے مراد اولاد ہے۔ اور یہ اس طرح ہے کیونکہ نفاق متفرق اور متضاد گفتگو اور قتال کے وقوع تک پہنچاتا ہے اور اسی میں مخلوق کی ہلاکت ہے۔

زجاج نے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ السعی فی الارض کا معنی ہے سرعت اور تیزی کے ساتھ چلنا۔ اور یہ لوگوں کے درمیان (فساد کی) انگیخت اور فتنہ برپا کرنے سے عبارت ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: ''بے شک لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے اللہ تعالیٰ تمام کو اپنی جانب سے دی جانے والی سزا میں شامل کر لے''۔ عنقریب اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَلْحَرْثَ وَالنَّسْلَ لغةً الحرث کا معنی شق کرنا اور پھاڑنا ہے۔ اور اسی سے المحراث ہے یعنی وہ آلہ (ہل) جس کے ساتھ زمین کو پھاڑا جاتا ہے۔ اور الحرث سے مراد مال کمانا اور اسے جمع کرنا ہے۔ اور حدیث طیبہ میں ہے۔ احرث لدنیاك كانك تعیش ابداً تو اپنی دنیوی زندگی کے لئے مال کما اور جمع کر گویا تو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ (یعنی ایسا نہ ہو کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور پھر بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائے یا پھر حالات کی تلخیوں کے پیش نظر زندگی کی بازی ہار دے۔ واللہ اعلم۔

اور الحرث کا معنی کھیتی ہے اور الحراث کھیتی کاشت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ تحقیق حرث و احترث یہ زرع اور ازدرع کی مثل ہے۔ اور کہا جاتا ہے: اُحْرُثِ القرآن، ای اُدْرُسْه یعنی قرآن پڑھانا۔ اور حَرَثْتُ النَّاقَةَ و اَحْرَثْتُھَا، یعنی میں اس پر سفر کرتا رہا یہاں تک کہ وہ کمزور ہوگئی۔ اور حرثت النار ای حرکتھا میں نے آگ کو حرکت دی اور المحراث اس

لکڑی کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ تنور کی آگ کو ہلایا اور حرکت دی جاتی ہے۔ جوہری سے مروی ہے۔ کہ النسل سے مراد وہ اولاد ہے جو کسی بھی مؤنث سے پیدا ہو۔ اس کا اصل معنی الخروج (نکلنا) اور السقوط (گرنا) ہے۔ اور اسی سے ہے: نسل الشعر و ریش الطائر۔ یعنی بال اور پرندے کے پر گر گئے۔ اس سے مستقبل کا صیغہ یَنْسِلُ آتا ہے۔ اسی کے مطابق رب کریم کا ارشاد ہے: اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ (یٰسین) (اپنے پروردگار کی طرف تیزی سے جانے لگیں گے) اسی طرح یہ ارشاد بھی ہے: مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ (الانبیاء) (اور وہ ہر بلندی سے بڑی تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگیں گے)

اور امرؤالقیس کا قول ہے:

فسلی ثیابی من ثیابك تنسل

(پس تو میرے کپڑے اپنے کپڑوں سے نکال دے تو وہ نکل جائیں گے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت زمین میں ہل چلانے اور اس میں فصل کاشت کرنے پر دلالت کرتی ہے اور زمین میں درخت لگانے پر۔ یہ زراعت اور کھیتی باڑی پر ابھارنے کے لئے ہے اور طلب النسل سے مراد حیوانوں اور جانداروں کی نشوونما اور ان کا بڑھنا ہے اور اسی سے انسان کی قوت و طاقت مکمل ہوتی ہے۔ اور یہ ان کا رد ہے جنہوں نے ترک اسباب کا قول کیا ہے۔ عنقریب اسی کتاب میں اس کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ عباس بن فضل نے کہا ہے کہ فساد کا معنی خرابی اور بربادی ہے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قطع الدراھم من الفساد فی الارض (اس نے زمین میں فساد اور خرابی کے سبب دراہم ختم کر دیے۔)

اور حضرت عطا نے کہا ہے: ایک آدمی تھا جسے عطا بن منبہ کہا جاتا تھا۔ اس نے جبہ میں احرام باندھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اسے اتار دے۔ حضرت قتادہ نے کہا: میں نے حضرت عطا سے کہا: بے شک ہم تو سنتے تھے کہ وہ اسے پھاڑ دے، تو حضرت عطا نے کہا: ان اللہ لا یحب الفساد۔ بے شک اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت اپنے عموم کے سبب ہر فساد اور بربادی کو شامل ہے، چاہے وہ زمین میں ہو یا مال میں یا دین میں اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہی صحیح ہے (1)۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ کا معنی ہے وہ اسے اہل اصلاح (اصلاح کرنے والوں) سے پسند نہیں کرتا یا وہ اسے دین کے اعتبار سے پسند نہیں کرتا۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ معنی یہ ہو کہ وہ اس کا حکم نہیں دیتا۔ واللہ اعلم

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

"اور جب کہا جائے اسے کہ (میاں) خدا سے تو ڈرو، تو اور اکساتا ہے اسے غرور گناہ پر، پس اس کے لئے جہنم کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔"

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

یہ کافر اور منافق کی صفت ہے جو اپنے بارے میں خود پسندی اور تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور مومن کے لئے یہ ناپسندیدہ اور مکروہ ہے کہ گناہ اسے ان میں سے کسی میں واقع کر دے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: کسی آدمی کے لئے بطور گناہ اتنا کافی ہے کہ اسے کوئی دوسرا بھائی کہے: ''تم اللہ سے ڈرو'' تو وہ آگے سے یہ کہہ دے: تجھ پر اپنے نفس کے بارے میں وہی لازم ہے جس کی نصیحت تو مجھے کر رہا ہے (1)۔

اور الْعِزَّةُ کا معنی قوت اور غلبہ ہے۔ یہ عزّہ یَعُزُّہٗ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے: وہ اس پر غالب آ گیا۔ اور اسی سے وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ ﴿ص﴾ ہے، یعنی وہ خطاب میں مجھ پر غالب آ گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الْعِزَّةُ کا معنی حمیت ہے۔ اسی کے مطابق شاعر کا قول بھی ہے:

اخذته عزة من جهله فتولّی مغضبا فعل الضجر

اسے اس کی دور جاہلیت کی حمیت نے آلیا، پس اس نے حالت غضب میں تنگی اور نقصان کے فعل کا ارتکاب کیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الْعِزَّةُ کا معنی قوت اور شدت نفس ہے۔ یعنی اس نے اپنی ذات میں قوت و طاقت حاصل کی اور ادھر ہی جھک گیا، پس اسی قوت نے اسے گناہ میں واقع کر دیا جبکہ اس نے اسے آلیا اور گناہ کو اس پر لازم کر دیا۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ جب اسے کہا جائے رک جا، ٹھہر جا، تو وہ گناہ کا ارتکاب زیادہ کرتا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ قوت وطاقت نے اسے گناہ پر ابھارا ہے۔

اور یہ قول بھی ہے: قوت و طاقت نے اسے ایسی شے سے پکڑ لیا جو اسے گناہ میں مبتلا کر دے گی۔ یعنی اس نے قوت و طاقت اور زمانہ جاہلیت کی حمیت کے سبب کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ اور اسی کی مثل یہ بھی ہے۔ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ ﴿ص﴾ (لیکن یہ کفار تکبر اور مخالفت میں (اندھے ہو گئے) ہیں۔)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ بِالْاِثْمِ میں با بمعنی لام ہے۔ یعنی عزت و حمیت نے اسے وعظ و نصیحت قبول کرنے سے پکڑ لیا، اس گناہ کے سبب جو اس کے دل میں تھا۔ اور وہ نفاق ہے۔ اسی کے مطابق عنترہ کا قول ہے جس میں وہ ناقہ کے پسینے کی صفت بیان کرتا ہے:

و كَاَنَّ رُبًّا او كُحَيلًا مُعْقَدًا حَشَّ الْوَقودُ به جوانبَ قُمْقِمِ

تو یہ بمعنی حش الوقود له ہے۔ یعنی با بمعنی لام ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ با بمعنی مع ہے۔ یعنی حمیت نے اسے گناہ کے ساتھ پکڑ لیا۔ پس با کا معنی تاویلات کے مطابق مختلف ہوتا رہتا ہے۔

یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کسی یہودی کا ہارون الرشید کے پاس کچھ کام تھا، وہ اس کے دروازے پر سال بھر آتا رہا لیکن وہ اپنا نہ کر سکا، پس ایک دن وہ دروازے پر کھڑا تھا، جب ہارون الرشید نکلا تو وہ دوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ تو ہارون الرشید اپنی سواری سے نیچے اترا اور سجدے میں گر گیا، پس جب اس نے اپنا سر اٹھایا تو اس کے کام کے بارے حکم دیا سو وہ کر دیا گیا۔ جب وہ لوٹ کر آیا تو اسے کہا گیا: اے امیر المؤمنین! تو ایک یہودی کے کہنے پر اپنی سواری سے اترا ہے؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ بلکہ مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد آیا: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

حَسْبُهٗ کا معنی ہے کہ اسے بطور سزا اور عذاب جہنم کافی ہے۔ جیسا کہ تو کسی آدمی کو کہتا ہے کفاك ما حل بك تجھے وہی کافی ہے جو تجھے پیش آیا ہے۔ اور انت تستعظم و تُعظّم علیه ما حل تو عظمت طلب کرتا ہے اور تجھے اس پر عظمت دی جائے گی جو تجھے پیش آیا۔ اور المهاد، المهد کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جو سونے کے لئے تیار کی جائے۔ اور اسی سے مهد الصبی (بچے کا جھولا) بھی ہے۔ اور جہنم کو مہاد کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ کفار کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس لئے کہ ان کے لیے مہاد کے بدلے جہنم ہے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (آل عمران) اور اسی کی مثل عرب کلام میں ان کا یہ قول ہے: تحية بينهم ضرب وجيع (ان کے درمیان تحیہ دردناک ضرب لگانا ہے۔)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

"اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔"

اس آیت میں ابْتِغَآءَ مفعول لاجلہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ جب منافقین کی کارکردگی کا ذکر کیا، تو پھر بعد میں مومنین کی کارکردگی کا ذکر فرمایا۔

کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے آئے تو قریش کے کچھ لوگوں نے ان کا پیچھا اور تعاقب کیا۔ تو وہ اپنی سواری سے نیچے اتر پڑے اور ترکش میں موجود تمام تیر نکال لئے، اور اپنی قوس (تیر کمان) پکڑ لی اور فرمایا: تم جانتے ہو میں تم سے زیادہ تیر چلانے میں ماہر ہوں، اللہ تعالیٰ کی قسم! تم مجھ تک نہیں پہنچ سکو گے یہاں تک کہ میں اپنے ترکش کے سارے تیر پھینک دوں۔ بعد ازاں میں اپنی تلوار سے لڑوں گا جب تک اس کی کوئی شے میرے ہاتھ میں باقی رہی پھر اس کے بعد تم جو چاہو کرو۔ تو انہوں نے کہا: ہم تجھے نہیں چھوڑ سکتے کہ تم غنا اور خوشحالی کی حالت میں ہم سے چلے جاؤ حالانکہ تم ہمارے پاس محتاج بن کر افلاس کی حالت میں آئے تھے۔ لیکن اگر تم مکہ مکرمہ میں موجود اپنے مال پر ہماری راہنمائی کرو تو ہم تمہارا راستہ چھوڑ دیں گے۔ انہوں نے اسی (مال کی) شرط پر آپ سے معاہدہ کیا، تو آپ نے اسے پورا کر دیا۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، تو یہ آیت نازل ہوئی: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ الآیہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: اے ابو یحییٰ! نفع بخش سودا کیا ہے اور ان پر یہ (مذکورہ) آیت تلاوت فرمائی۔ اسے رزین نے روایت کیا ہے اور حضرت سعید بن مسیب

رضی اللہ عنہ نے اسے بیان کیا ہے(1)۔

اور مفسرین نے کہا ہے: مشرکین نے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا اور انہوں نے آپ کو بہت ستایا اور اذیت دی، تو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: بلاشبہ میں بوڑھا آدمی ہوں، تمہیں کوئی نقصان اور ضرر نہ پہنچے گا، میں تمہارے ساتھ رہوں یا تمہارے سوا کسی اور کے ساتھ۔ کیا تمہارے لئے (یہ بہتر نہیں) کہ تم میرا مال لے لو اور مجھے اور میرے دین کو چھوڑ دو؟ تو انہوں نے اس طرح کر لیا اور آپ نے ان پر سواری اور نفقہ کی شرط لگا لی تھی (یعنی میں سواری اور اپنے روزمرہ اخراجات کے لئے مناسب اپنے مال سے لے لوں گا) پس وہ مدینہ طیبہ کی طرف نکل پڑے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور کچھ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے ملے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: اے ابویحییٰ تیری بیع نفع بخش ہوئی، تو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: ''آپ کی بیع میں تو کبھی خسارہ نہیں ہوتا، سو یہ کیسی کلام ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیرے بارے میں اس طرح (آیت) نازل فرمائی ہے، پھر آپ نے ان پر یہ آیت پڑھی۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟ یہ ایک مسلمان کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو ایک کافر سے ملا اور اسے کہا: تو کہہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، پس جب تو نے اسے کہہ لیا، تو تو نے اپنے مال اور اپنی جان کو بچا لیا، لیکن اس نے یہ کلمہ کہنے سے انکار کر دیا، تو مسلمان نے اسے کہا: قسم بخدا! میں ضرور بضرور اپنی جان اللہ تعالیٰ کے لئے بیچ دوں گا۔ چنانچہ وہ آگے بڑھا اور اس کے ساتھ قتال کرنے لگا، یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ایسے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے نیکی کا حکم دیا اور منکر سے روکا۔ اسی کے مطابق حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے اس کی تاویل کی ہے۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے کہ دو آدمی باہم ایک دوسرے سے لڑے۔ یعنی مغیر (تبدیلی لانے والے) نے مفسد (فساد برپا کرنے والے) کو کہا: تو اللہ تعالیٰ سے ڈر۔ مفسد نے انکار کر دیا اور اسے حمیت نے آ لیا تو مغیر نے اپنی جان اللہ تعالیٰ سے بیچ ڈالی اور اس کے ساتھ لڑنے لگا، پس دونوں نے ایک دوسرے کو قتل کر دیا۔

اور ابوخلیل نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کسی انسان کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پڑھا: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔ وہ آدمی اٹھا اور نیکی کا حکم دینے لگا اور برائی سے منع کرنے لگا اور خود شہید ہو گیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ دو آدمیوں نے قاری کی اس آیت کی قراءت کے وقت ایک دوسرے کو قتل کر دیا، پس آپ نے ان سے اس کے بارے پوچھا تو انہوں نے اس کی یہی تفسیر بیان کی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: اے ابن عباس! تیرا مال اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت اس کے بارے میں نازل ہوئی جو جنگ میں گھس جاتا ہے، ہشام بن عامر قسطنطنیہ میں لشکر میں داخل ہوئے اور خوب قتال کیا، یہاں تک کہ شہید کر دیے گئے تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَمِنَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 591

النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ اور حضرت ابوایوب سے بھی اسی طرح مروی ہے(1)۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت غزوۂ رجیع کے شہداء کے بارے میں نازل ہوئی اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: وہ مہاجرین وانصار ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس رات (ہجرت کی رات) اپنے بستر پر آرام کرنے کے لئے فرمایا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار (ثور) کی طرف تشریف لے گئے تھے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ براءت میں آئے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت عام ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہر جہاد کرنے والے کو شامل ہے یا اپنی ذات کے بارے شہادت کی تمنا کرنے والے کو یا برائی کو تبدیل کرنے والے کو۔ اور اس کا حکم پہلے آچکا ہے جو لشکر پر حملہ آور ہو اور منکر کو تبدیل کرنے والے کا، اس کی شرائط اور اس کے احکام کا ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ آل عمران میں آئے گا۔

اور يَشْرِىْ کا معنی يبيع (بیچ ڈالنا) ہے۔ اسی معنی میں یہ ارشاد بھی ہے: وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ (یوسف: 20) یعنی انہوں نے آپ کو کھوٹے ثمن کے عوض بیچ ڈالا۔ اور اس کا اصل معنی الاستبدال (بدلہ میں لینا) ہے۔ اور اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ: 111) (یقیناً اللہ نے خرید لی ہے ایمانداروں سے ان کی جان اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لئے جنت ہے۔)

اور اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

وان کان ریب الدھر امضاك فی الألی　　شَرَوْا ھذہ الدنیا بجناتہ الخلد

اور ایک دوسرے شاعر کا قول:

و شریت بُرداً لیتنی　　من بعد بُرْدٍ کنتُ ھَامَہْ

یہاں برد غلام کا نام ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

یعطی بھا ثمنا فیمنعھا　　و یقول صاحبھا ألا فاشر

یہاں بیع النفس سے مراد اسے اللہ تعالیٰ کے اوامر (کی اطاعت) کے لئے خرچ کرنا ہے۔ اور ابتغاء مفعول من أجلہ ہے۔ کسائی نے مرضات تاء پر وقف کیا ہے، اور باقیوں نے ہاء کے ساتھ وقف کیا ہے۔ ابوعلی نے کہا ہے: کسائی نے تا کے ساتھ یا تو ان کی لغت پر وقف کیا ہے جو کہتے ہیں طلحت اور علقمت۔ اور اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

بل جَوزِ تَیْہاء کظھر الحَجَفَت

یا پھر اس لئے کہ جب ہی مضاف الیہ کلمہ کے ضمن میں ہے تو پھر تا کو ثابت رکھنا ضروری ہے جیسا کہ وہ حالت وصل میں ثابت رہتی ہے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ مضاف الیہ مراد ہے(2)۔ اور مرضاۃ سے مراد رضا ہے۔ کہا جاتا ہے: رَضِیَ یَرْضٰی

1۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 593

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 282

رِضاً و مَرْضَاۃً۔

ایک قوم نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ کہا جائے: شَرٰی بمعنی اشتری ہے اور اس صورت میں آیت کو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی طرف پھیرنے کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ انہوں نے اپنی جان کو اپنے مال کے عوض خریدا تھا، نہ کہ اسے بیچا تھا، مگر یہ کہا جا سکتا ہے: بلاشبہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا ان کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو جانا یا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے بیچنا ہے۔ پس لفظ باع (بیچنے) کے معنی پر ہی صحیح اور درست ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

''اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے پورے اور نہ چلو شیطان کے نقش قدم پر، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

جب اللہ تعالیٰ لوگوں کے مومن، کافر اور منافق ہونے کے بارے میں بیان کر چکا تو فرمایا: تم ایک دین پر ہو جاؤ اور اسلام پر جمع ہو جاؤ اور اسی پر ثابت قدم ہو جاؤ۔ پس اس آیت میں السِّلْمِ بمعنی اسلام ہے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے، اور اسے ابو مالک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور اسی کے مطابق کندی شاعر کا قول بھی ہے:

دعوت عشیرتی للسلم لما　　رأیتهم تولوا مُدبرینا

میں نے اپنے خاندان کو اسلام کی دعوت دی جب میں نے انہیں دیکھا تو وہ پیٹھیں پھیر کر واپس چلے گئے۔

یعنی میں نے انہیں اسلام کی طرف دعوت دی جبکہ اہل کندہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد اشعث بن قیس کندی کے ساتھ مرتد ہو گئے، کیونکہ مومنین کو کبھی بھی مسالمہ میں داخل ہونے کا حکم نہیں دیا گیا اور مسالمہ سے مراد صلح ہے۔ اور بلاشبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہا گیا کہ آپ صلح کے لئے مائل ہوں جبکہ وہ اس کی طرف مائل ہوں۔ اور رہا یہ کہ آپ صلح کی ابتدا کریں تو اس طرح نہیں۔ یہ قول علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں حکم دیا گیا ہے جو اپنی زبانوں کے ساتھ ایمان لائے کہ وہ اپنے دلوں کے ساتھ اس میں داخل ہو جائیں۔ طاؤس اور مجاہد نے کہا ہے کہ تم امر دین میں داخل ہو جاؤ۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تم نیکی کی تمام اقسام میں داخل ہو جاؤ۔ اور یہ لفظ سین کے کسرہ کے ساتھ السِّلم پڑھا گیا ہے۔ کسائی نے کہا ہے کہ السِّلم اور السَّلم دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور اسی طرح یہ اکثر بصریوں کے نزدیک بھی ہے۔ اور یہ دونوں لفظ اکٹھے اسلام اور صلح کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

ابو عمرو بن العلاء نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے۔ اور یہاں اسے ادخلوا فی السِّلم پڑھا ہے اور کہا ہے: اس سے مراد اسلام ہے۔ اور وہ لفظ جو سورۂ انفال اور سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں ہے۔ اسے السَّلم سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فرمایا: فتحہ کے ساتھ اس کا معنی مسالمہ (صلح) ہے۔

اور مبرد نے اس تفریق کا انکار کیا ہے اور عاصم جحدری نے کہا ہے کہ السِّلْم کا معنی اسلام، السَّلْم کا معنی صلح اور السَّلَم کا معنی الاستسلام (تابعدار ہونا) ہے۔ محمد بن یزید نے ان تفریقات (الگ الگ تعبیروں) کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: لغت اس طرح نہیں لی جاتی بلکہ یہ تو سماع کے ساتھ لی جاتی ہے نہ کہ قیاس کے ساتھ۔ اور جس نے (معانی میں) تفریق کی اسے دلیل کی ضرورت ہوگی۔ اور بصریوں نے بیان کیا ہے: بنوفلان سِلْمٌ و سَلْمٌ و سَلَمٌ تمام کا معنی ایک ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: السِّلْم کا معنی صلح ہے چاہے فتحہ کے ساتھ ہو یا کسرہ کے ساتھ اور مذکر ہو یا مؤنث۔ اور اس کا اصل معنی الاستسلام اور الانقیاد (تابعداری کرنا) سے لیا گیا ہے۔ اسی لئے صلح کے لئے سَلْم کہا گیا ہے۔ زہیر نے کہا ہے:

وقد قلتما اِنْ نُدرِكِ السِّلم واسعًا بمالٍ و معروفٍ من الأمر نَسْلَمِ

تحقیق تم دونوں نے کہا: اگر ہم نے صلح کو مال اور امر بالمعروف کے بدلے زیادہ نفع بخش پالیا تو ہم صلح کرلیں گے۔

علامہ طبری نے اس کلمہ کو اسلام کے معنی پر محمول کرنے کو ترجیح دی ہے اس وضاحت کے مطابق جو پہلے گزرچکی ہے۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے ضمن میں بیان فرمایا ہے: اسلام کے آٹھ حصص ہیں، ایک حصہ نماز ہے، ایک حصہ زکوٰۃ ہے، ایک حصہ روزہ ہے، ایک حصہ حج ہے، ایک حصہ عمرہ ہے، ایک حصہ جہاد ہے، ایک حصہ امر بالمعروف ہے اور ایک حصہ نہی عن المنکر ہے۔ تحقیق وہ خائب و خاسر ہوا جس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی اور معنی یہ ہے: اے وہ لوگو جو ایمان لائے! حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ! تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایمان لاکر مکمل طور پر اسلام میں داخل ہوجاؤ (1)۔

اور صحیح مسلم میں ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے! اس امت میں سے کوئی یہودی اور عیسائی میرے بارے میں نہ سنے پھر وہ مرجائے اور وہ اس دین پر ایمان نہ لائے جس کے ساتھ مجھے مبعوث فرمایا گیا تو وہ اصحاب نار میں سے ہوگا۔''

كَآفَّةً کا معنی ہے مکمل طور پر، ترکیب کلام میں یہ السِّلْمِ سے یا مومنین کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور یہ ان کے اس قول سے مشتق ہے: کففت ای منعت، یعنی تم میں سے کوئی بھی اسلام میں داخل ہونے سے باز نہ رہے۔ اور الکف کا معنی ہے المنع (روکنا) اور اسی سے كُفَّةُ القمیص ہے (کرتے کے دامن کے اردگرد کی گوٹ) کیونکہ یہ کپڑے کو پھیلنے اور منتشر ہونے سے روکتی ہے۔ اور اسی سے كِفَّةُ المِیْزَانِ ہے (ترازو کا پلڑا) جو کہ موزون کو جمع رکھتا ہے اور اسے بکھرنے سے روکتا ہے، اور اسی سے کف الانسان ہے (انسان کی ہتھیلی) جو کہ اس کے منافع اور نقصانات کو جمع کرتی ہے۔ اور ہر گول شے كِفَّة کہلاتی ہے، اور ہر لمبی شے كُفَّة کہلاتی ہے۔ اور آدمی مکفوف البصر ہے یعنی اسے دیکھنے سے روک دیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 282

گیا ہے۔ اور جماعۃ کو کافۃ کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ وہ متفرق اور تقسیم ہونے سے محفوظ ہوتے ہیں۔

وَ لَا تَتَّبِعُوْا یہ فعل نہی ہے اور خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ یہ مفعول ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور حضرت مقاتل نے کہا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے نماز میں تورات پڑھنے کی اجازت طلب کی۔ نیز یہ کہ وہ ان بعض احکام پر عمل کریں گے جو تورات میں ہیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ کیونکہ بلاشبہ سنت کی اتباع کرنا حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد شیطان کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے بہتر اور اولیٰ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: (اس کا معنی ہے) تم اس راستے پر نہ چلو جس کی طرف تمہیں شیطان دعوت دیتا ہے کیونکہ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ بلاشبہ تمہارے لئے اس کی عداوت بالکل ظاہر ہے۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝

''اور اگر تم پھسلنے لگو اس کے بعد کہ آ چکی ہیں تمہارے پاس روشن دلیلیں، تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ فَاِنْ زَلَلْتُمْ کا معنی ہے اگر تم صراط مستقیم سے دور ہٹنے لگو۔ دراصل زلل یعنی پھسلاہٹ قدم میں ہوتی ہے، بعد ازاں یہ لفظ اعتقادات، آراء اور دیگر چیزوں میں (سیدھی راہ سے ہٹ جانے کے لئے) استعمال کیا جانے لگا ہے۔

کہا جاتا ہے: زَلَّ یَزِلُّ زَلًّا وَ زَلَلًا وَ زُلُوْلًا، یعنی اس کا پاؤں پھسل گیا۔

ابو السمال العدوی نے زَلِلْتُم لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ حرف کی اصل الزلق سے ہے اور معنی ہے: ''تم حق سے بھٹک گئے اور بہک گئے۔''

ارشاد خداوندی مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ میں الْبَیِّنٰتُ سے مراد معجزات اور آیات قرآن ہیں۔ اگر آیت میں خطاب مومنین کو ہے اور اگر خطاب اہل کتاب کو ہے تو پھر بینات سے مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف اور آپ کے بارے وہ علامات ہیں جو ان کی شریعت میں وارد ہوئی ہیں۔

آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ گناہ کے بارے جاننے والے کی سزا اس کی سزا کی نسبت بہت زیادہ اور شدید ہوگی جو اس سے ناواقف اور جاہل ہو اور جس تک دعوت اسلام نہ پہنچی وہ احکام شرع کو ترک کرنے کے سبب کافر نہ ہوگا۔

نقاش نے بیان کیا ہے کہ حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو وہ قرآن کریم پڑھ رہے تھے، تو انہیں جو قرآن پڑھا رہا تھا۔ اس نے پڑھا یا فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تو حضرت کعب نے کہا: بلاشبہ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ یہ اس طرح ہو، پھر ان دونوں کے پاس سے ایک آدمی گزرا، تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: تم یہ آیت کس طرح پڑھتے ہو؟ تو اس آدمی نے کہا: فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝ (بقرہ) تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اسی طرح ہونا چاہئے (1)۔ اور عَزِیْزٌ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 282

کا معنی ہے (وہ زبردست ہے) یعنی جس کام کا وہ ارادہ کرتا ہے اس سے اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اور حَكِيْمٌ کا مفہوم ہے کہ وہ جو فعل بھی کرتا ہے اس میں حکمت کارفرما ہوتی ہے (اس کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔)

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

"کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آئے ان کے پاس اللہ کا عذاب چھائے ہوئے بادلوں (کی صورت) میں اور فرشتے اور (ان کا) فیصلہ ہی کر دیا جائے۔ اور (آخر کار) اللہ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے معاملات۔

ارشاد باری تعالیٰ هَلْ يَنْظُرُوْنَ یعنی اسلام میں داخل نہ ہونے والے، اور هَلْ یہاں اس سے مراد انکار ہے۔ یعنی وہ انتظار نہیں کر رہے ہیں اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ، نظرته اور انتظرته ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور النظر اور الانتظار بھی ہم معنی ہیں۔

حضرت قتادہ، ابوجعفر یزید بن قعقاع اور ضحاک نے فِي ظِلَالٍ من الغمام پڑھا ہے۔ اور ابوجعفر نے والملائكة کو الغمام پر عطف کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔ اور اس کی تقدیر عبارت ہے مع الملائكة یعنی ملائکہ کے ساتھ۔ عرب کہتے ہیں: أقبل الأمير في العسكر۔ امیر آیا لشکر کے ساتھ۔ یعنی اس میں فی بمعنی مع ہے۔ ظُلَلٍ یہ ظُلَّة کی جمع مکسر ہے، جیسا کہ ظلمة کی جمع ظلم ہے اور اس کی جمع سالم ظُلُلَات ہے۔

سیبویہ نے یہ شعر کہا ہے:

اذا الوحش ضَمَّ الوحشَ فی ظُلُلَاتِها　　سَوَاقِطُ من حَرٍّ وقد كان أظْهَرَا

اس میں ظُلُلَات ظُلَّة کی جمع سالم ذکر کی گئی ہے۔

اور ظُلَّات اور ظِلال یہ ظل کی جمع کثرت ہے اور اس کی جمع قلت اظلال ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ظِلال ظُلّة کی جمع ہے جیسا کہ قُلّة کی جمع قِلال ہے۔ جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

ممزوجةٌ بماء القِلال　　(گھڑوں کے پانی میں ملائی گئی ہے)

اخفش سعید نے کہا ہے کہ والملائكةِ مجرور ہے۔ یہ وفي الملائكة کے معنی میں ہے۔ فرمایا: اس میں رفع عمدہ ہے، جیسا کہ ان آیات میں ہے: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (الانعام: 158) اور وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ (الفجر)

فراء نے کہا ہے: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ملائکہ ان کے پاس ان کی ارواح قبض کرنے کے لئے آئیں گے۔ اور کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن (وہ آئیں گے) اور یہی زیادہ ظاہر اور واضح ہے۔

ابوالعالیہ اور ربیع نے کہا ہے کہ ملائکہ ان کے پاس چھائے ہوئے بادلوں کی صورت میں آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے

پاس آئے گا جس حالت میں چاہے گا۔

اور زجاج نے کہا ہے: تقدیر کلام اس طرح ہے فی ظلل من الغمام و من الملائکۃ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کے حق میں کلام اپنے ظاہر پر نہیں ہے، بلکہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر اور اس کا حکم ان کے پاس آ جائے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حساب و عذاب میں سے جس کا ان کے ساتھ وعدہ فرما رکھا ہے اس کے ساتھ چھائے ہوئے بادلوں میں ان کے پاس آ جائے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا (الحشر: 2) (پس آیا ان پر اللہ (کا قہر) اس جگہ سے جس کا انہیں خیال بھی نہ آیا تھا۔) یعنی اللہ نے انہیں ذلیل و رسوا کر دیا۔ یہ زجاج کا قول ہے اور پہلا اخفش سعید کا قول ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ الاتیان (یعنی آنے) کا معنی راجعًا الی الجزاء (جزا کی طرف رجوع کرتے ہوئے) ہو۔ اور جزا کو اسی طرح اتیان کا نام دیا گیا ہو جیسا کہ نمرود کے قصہ میں تخویف اور تعذیب کو اتیان کا نام دیا گیا ہے اور فرمایا ہے: فَاَتَى اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ (النحل: 26)

(پس اللہ تعالیٰ نے ان کے (فریب) کی عمارت جڑوں سے اکھیڑ کر رکھ دی۔ پس گر پڑی ان پر چھت ان کے اوپر سے۔) اور بنی نضیر کے قصہ میں فرمایا: فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا ۗ وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (الحشر: 2)

اور اسی طرح فرمایا: وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَا (الانبیاء: 47)

(اور اگر (کسی کا کوئی عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے بھی لا حاضر کریں گے۔)

بلا شبہ اتیان ان معانی کا احتمال رکھتا ہے، کیونکہ اہل لغت کے نزدیک اتیان کا اصل معنی "کسی شے کی طرف قصد کرنا" ہے۔ پس آیت کا معنی یہ ہے: کیا وہ انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جزا اور بدلہ دینے کے ارادہ سے اپنی مخلوق میں سے کسی مخلوق کے ساتھ افعال میں سے کوئی فعل ظاہر فرمائے اور ان کے امور کے بارے میں فیصلہ فرمائے جو وہ فیصلہ فرما دے؟

اور جس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کوئی فعل کیا اور اسے نزول اور استوا کا نام دیا۔ اسی طرح وہ کوئی فعل کرتا ہے اور اسے اتیان کا نام دیتا ہے اور اس کے افعال بغیر آلہ اور علت کے ہوتے ہیں کیونکہ اس کی ذات اس سے پاک ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابو صالح کی روایت میں کہا ہے: یہ ان پوشیدہ اور مخفی چیزوں میں سے ہے جس کی تفسیر بیان نہیں کی جا سکتی۔ بعض ان کی تاویل سے خاموش رہے ہیں اور بعض نے تاویل کی ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فا بمعنی با ہے یعنی یاتیھم بِظُلَل (یعنی وہ ان کے پاس آئے چھائے ہوئے بادلوں کے ساتھ) اور اسی کے مطابق حدیث طیبہ ہے: یَاتِیْهِمُ اللّٰہُ فی صورۃ ای بصورۃ امتحاناً لَهُمْ (1) (اللہ تعالیٰ ان کے پاس آئے گا ایک صورت میں، یعنی ایک صورت کے ساتھ ان کا امتحان لینے کے لئے)۔

یہ جائز نہیں کہ اسے اور جو کچھ اس کے مشابہ قرآن و حدیث میں مذکور ہے اسے وجہ انتقال، حرکت اور زوال پر محمول کیا جائے، کیونکہ یہ اجرام و اجسام کی صفات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے انتہائی بلند و برتر ہے۔ وہ ذوالجلال

1۔ بخاری شریف، باب الصراط جسر جهنم، حدیث نمبر 6088، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والاکرام ہے اور اجسام کی مماثلت سے بلند و بالا اور برتر ہے۔

الْغَمَامِ اس سے مراد ہے سفید باریک بادل، اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ ڈھانپ لیتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قُضِيَ الْأَمْرُ کو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے وَ قَضَاءُ الْأَمْرِ پڑھا ہے۔ اور یحییٰ بن یعمر نے وَ قُضِيَ الْأُمُوْرُ جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جمہور نے وَ قُضِيَ الْأَمْرُ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ جزا واقع ہو اور گناہ کرنے والوں کو عذاب دیا جائے۔

ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ صیغہ معروف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہی اصل ہے۔ اور اس کی دلیل اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْأُمُوْرُ ﴿۵۳﴾ (الشوریٰ) اور اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ (المائدہ: 48) ہے۔ اور باقیوں نے تُرْجَعُ صیغہ مجہول کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور یہ بھی قرأۃ حسنہ ہے۔ اور اس کی دلیل ثُمَّ تُرَدُّوْنَ (التوبہ: 94) اور ثُمَّ رُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ (الانعام: 62) اور وَ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ (الکہف: 36) ارشادات باری تعالیٰ ہیں۔ دونوں قراءتیں معنی کے اعتبار سے حسن اور اچھی ہیں لیکن اصل پہلی قرأت ہے۔ اور اسے مجہول پڑھنے میں توسع ہے اور یہ فرع ہے۔ اور تمام کے تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹیں گے، پہلے بھی اور بعد والے بھی۔ اور قیامت کے دن میں اس کے ذکر کے سبب اس پر تنبیہ اور آگاہ کرنا ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ملوک کے پاس ہے وہ زوال پذیر ہے۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

''آپ پوچھئے بنی اسرائیل سے کہ ہم نے انہیں کتنی روشن دلیلیں عنایت فرمائیں۔ اور جو (قوم) بدل ڈالے اللہ کی نعمت کو اس کے مل جانے کے بعد تو یقیناً اللہ تعالیٰ (اس قوم کو) سخت عذاب دینے والا ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ: سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ اس میں سَلْ السوال سے ماخوذ ہے۔ تخفیف ہمزہ کے تحت ہمزہ کی حرکت سین کو دے کر اسے حذف کر دیا، اور جب سین متحرک ہو گئی تو پھر ہمزہ وصل کی ضرورت نہ رہی (یعنی سل دراصل اسئل تھا۔ تخفیف ہمزہ کے مذکورہ قاعدہ کے تحت یہ سل ہو گیا۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام عرب میں سَلْ میں ہمزہ وصل کے ساقط ہونے اور اِسْئَلْ میں اس کے ثابت رہنے کی دو وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک میں ہمزے کو حذف کرنا اور دوسرے میں اسے ثابت رکھنا ہے۔ اور قرآن کریم میں یہ دونوں مذکور ہیں۔ پس تو ہمزے کو ثابت رکھنے اور اسے گرانے میں خط مصحف کی اتباع کر۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں استعمال ہونے والے کلام کے اختلاف کے ساتھ اسے ثابت رکھنا اور اسے ساقط کرنا بھی مختلف ہوتا ہے۔ لہٰذا ابتدائے کلام میں ہمزہ حذف ہو جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اور سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿۴۰﴾ (القلم) اور حالت عطف (مراد درمیان کلام) میں ثابت رہتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) اور وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء: 32) علی بن عیسیٰ نے یہی کہا ہے۔ اور ابوعمرو نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں اِسأَل اصل کے مطابق پڑھا ہے۔ اور ایک قوم نے اِسَلْ ہمزہ کی حرکت کو سین کی طرف نقل کر کے اور ہمزہ وصل کو باقی رکھتے ہوئے پڑھا ہے۔ ان کی لغت کے مطابق جنہوں نے کہا ہے اَلاحمر اور کَمْ یہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ اٰتَیْنٰهُمْ کا دوسرا مفعول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے۔ تقدیر عبارت ہے کم آتینا آتیناھم اور فعل کو اس سے مقدم لانا جائز نہیں کیونکہ اس کے لئے صدر کلام ضروری ہے۔ اور مِنْ اٰيَةٍ تقدیر اول کے مطابق تمیز ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور تقدیر ثانی کی بنا پر یہ اٰتَیْنٰهُمْ کا مفعول ثانی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ کَمْ مبتدا ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہو، اور اس کی خبر اٰتَیْنٰهُمْ ہو۔ اس میں کَمْ کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہوگی اور تقدیر کلام یہ ہوگی کم آتیناھموہ اور یہ (یعنی کم) معرب نہیں، بلکہ یہ اسم ہے کیونکہ یہ حروف کے قائم مقام ہے جب کہ اس میں استفہام کے معنی پائے جائیں۔

اور جب تو فرق کرنے لگے کم اور اسم کے درمیان، تو اختیار ہے کہ تو اسے مِنْ کے ساتھ لائے، جیسا کہ اس آیت میں ہے اور اگر تو اسے (من کو) حذف کرے تو پھر تو اسے نصب دے، چاہے کم استفہامیہ ہو یا کم خبریہ۔ اور خبریہ کی صورت میں جر بھی جائز ہوتی ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

کم بِجودِ مُقْرِفٌ نَالَ العُلَا و کریم بُخلُه قد وَضَعه

اس میں کم خبریہ کی تمیز حرف جر با کے سبب مجرور ہے۔

اور آیت سے مراد یہ ہے کہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بارے میں ان کے پاس کتنی آیات و علامات آئیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پہچان کراتی ہیں اور آپ پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت مجاہد اور حسن وغیرہما نے کہا ہے: یعنی وہ آیات و معجزات جنہیں لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے جیسا سمندر کا پھٹ جانا (اور اس میں راستوں کا بن جانا) بادلوں کا سایہ، عصا مبارک اور ید موسیٰ وغیر ذلک۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو ان کے سوال کے بارے حکم ارشاد فرمایا یہ زجر و توبیخ کی بنا پر ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ یہ لفظ عام ہے جو تمام عوام کو شامل ہے، اگر چہ اس کا مشار الیہ بنی اسرائیل ہیں، کیونکہ انہوں نے اسے تبدیل کیا جو ان کی کتابوں میں تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بارے میں جو تھا اس کا انکار کیا۔ لیکن لفظ کا اطلاق تو اس پر ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو بدلتا ہے۔

علامہ طبری نے کہا: یہاں نعمت سے مراد اسلام ہے اور یہ پہلے (معنی) کے زیادہ قریب ہے اور لفظ میں کفار قریش بھی داخل ہیں۔ کیونکہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان پر بطور احسان و نعمت ان میں مبعوث فرمائے گئے۔ لیکن انہوں نے اس نعمت کی قبولیت اور اس پر شکر کرنے کو کفر کے ساتھ بدل دیا۔

ارشاد باری تعالیٰ: فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ یہ جملہ خبریہ ہے جو کہ وعید کو متضمن ہے۔ اور اَلْعِقَابُ عَقِب سے ماخوذ ہے۔ گویا کہ تعاقب کرنے والا بدلہ اور جزا دینے کے لئے اس کے نشانات قدم پر چلتا ہے۔ اسی سے عُقْبَةُ الراکب (وہ جگہ جہاں

سے سوار ہوا جاتا ہے) اور عقبة القِدر (شوربے کا باقی حصہ جو ہانڈی والے کے لئے چھوڑا جائے) عقاب اور عقوبة دونوں گناہ کے بعد ہوتی ہیں۔ و قد عاقبہ بذنبہ "تحقیق اس نے اسے اس کے گناہ کی سزا دی۔"

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

"آراستہ کر دی گئی ہے کافروں کے لئے دنیا کی (فانی) زندگی اور مذاق اڑاتے ہیں یہ ایمان والوں کا حالانکہ پرہیزگاروں کی شان بلند ہوگی ان سے قیامت کے دن اور اللہ تعالیٰ روزی تو جسے چاہے بے حساب دے دیتا ہے"۔

ارشاد باری تعالیٰ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا میں الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مفعول ما لم یُسَمّ فاعلہ ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور اس سے مراد سرداران قریش ہیں (زُيِّنَ فعل مجہول ذکر کیا گیا ہے)۔ مجاہد اور حمید بن قیس نے فعل کو معروف یعنی علی بناء الفاعل پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قراءت سے شاذ ہے، کیونکہ فاعل کا پہلے ذکر موجود نہیں۔ ابن ابی عبلہ نے زُيِّنَتْ یعنی علامت تانیث کے اظہار کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی جائز ہے کیونکہ تانیث غیر حقیقی ہے۔

اور مزین کرنے والا ہی اس کا خالق اور اس کا موجد ہے اور وہی خالق الکفر بھی ہے اور اسے شیطان بھی اپنے وسوسہ اور اپنے دھوکہ کے ساتھ آراستہ کرتا ہے۔ اور یہاں خاص طور پر کافروں کا ذکر اس لئے کیا ہے کیونکہ انہوں نے تزیین (زیب و آرائش) کو مکمل طور پر قبول کر لیا ہے اور وہ دنیا کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اور اسی سبب سے انہوں نے آخرت سے اعراض کر لیا ہے۔ جو کچھ زمین پر ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے لئے زینت بنا دیا ہے تاکہ وہ مخلوق کو آزمائے کہ ان میں سے عمل کے اعتبار سے زیادہ حسین کون ہے؟

اور مومن وہ ہیں جو شریعت کے طریقوں پر گامزن ہیں زینت ان کے لئے باعث فتنہ نہیں۔ اور رہے کفار تو زینت ان کی مالک بن جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے سوا کسی کا اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جب مال لایا گیا تو انہوں نے فرمایا: اے اللہ! بلاشبہ ہم استطاعت نہیں رکھتے مگر یہ کہ ہم اس سے خوش ہوں جسے تو نے ہمارے لئے زینت بنایا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ یہ کفار قریش کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ دنیوی اعتبار سے اپنی حالت کو عظیم قرار دیتے ہیں اور وہ اس پر رشک اور اظہار مسرت کرتے تھے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں کے ساتھ تمسخر کرتے تھے۔

ابن جریج نے کہا ہے: وہ اہل ایمان کے آخرت کو طلب کرنے کے سبب ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سبب مذاق ان کا فقر اور ان کی تنگدستی تھی (یعنی ان کے فقر و فاقہ کی وجہ سے کفار ان کا مذاق اڑاتے تھے۔) جب کہ حضرت بلال، حضرت صہیب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور انہیں کی مثل دیگر جانثاران مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

پس اللہ تعالیٰ نے ان کے فعل کے قبیح اور برا ہونے کے سبب ان کے رتبہ اور درجہ کی پستی پر آگاہ کیا اور فرمایا: وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (یعنی وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ان کی شان اور رتبہ قیامت کے دن ان سے بلند ہوگا۔)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس کسی نے کسی مومن مرد یا مومنہ عورت کو ذلیل سمجھایا اسے اس کے فقر و افلاس اور قلت مال کی وجہ سے حقیر جانا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے مشہور کرے گا، پھر اسے رسوا کر دے گا اور جس نے کسی مومن مرد یا عورت پر بہتان لگایا یا اس کے بارے وہ کچھ کہا جو اس میں نہیں تھا، تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آگ کے ٹیلے پر کھڑا کرے گا، یہاں تک کہ وہ اس سے نکل جائے جو اس نے اس کے بارے میں کہا (یعنی بندۂ مومن سے اپنے قول کی معذرت کر لے اور معافی مانگ لے۔) بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندۂ مومن کی عظمت اور عزت و اکرام مقرب فرشتے سے بھی زیادہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنے والے مومن مرد اور توبہ کرنے والی مومنہ عورت سے زیادہ محبوب اور کوئی شے نہیں اور بلاشبہ مومن آدمی کی پہچان آسمان میں اسی طرح ہوتی ہے جس طرح ایک آدمی کی پہچان اس کے گھر والوں اور اس کی اولاد میں ہوتی ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ کا معنی یہ ہے کہ وہ درجہ میں ان سے بلند ہوں گے۔ کیونکہ وہ جنت میں ہوں گے اور کفار جہنم میں ہوں گے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد بلند مکان ہو۔ اس اعتبار سے کہ جنت آسمان میں ہے اور جہنم اسفل السافلین میں ہے (یعنی پرہیزگار لوگ بلند مکان یعنی جنت میں ہوں گے۔)

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ فضیلت اس پر ہو جو کچھ کافر ان کے بارے میں گمان کر رہے ہیں (یعنی قطعاً ایسا نہ ہوگا جیسا کافر گمان کرتے ہیں بلکہ ان کی شان اس سے کہیں بلند ہوگی۔)

کیونکہ کفار تو کہتے ہیں: اگر آخرت ہوئی تو اس میں ہمارے لئے حصہ (خیر و فضل) تمہاری نسبت کہیں زیادہ ہوگا۔ اسی معنی میں حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے کہ جو واقعہ انہیں عاص بن وائل کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرا عاص بن وائل پر کچھ قرض تھا، میں اس کے پاس آیا تا کہ اس سے قرض کا مطالبہ کروں، تو اس نے مجھے کہا: میں تجھے ہرگز قرض ادا نہیں کروں گا یہاں تک کہ تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفر اختیار کرے۔ میں نے اسے جواب دیا: بلاشبہ میں ہرگز ان سے کفر اختیار نہ کروں گا، یہاں تک کہ تو مر جائے اور پھر تجھے اٹھایا جائے۔ تو اس نے کہا: کیا مجھے موت کے بعد (دوبارہ) اٹھایا جائے گا؟ تو پھر میں تجھے قرض ادا کر دوں گا جب میں مال و اولاد کی طرف لوٹ کر گیا۔ الحدیث، عنقریب یہ مکمل حدیث بھی آئے گی۔ (1)

اور کہا جاتا ہے: سخِرت منه و سخرت به، ضحكت منه و ضحكت به، و هزئت منه و به۔ یہ سب الفاظ ایک معنی میں کہے جاتے ہیں۔ اسے اخفش نے بیان کیا ہے اور اسم السخرية، والسُّخرِيُّ اور السِخرِيُّ ہے۔ اور ان دونوں قراتوں کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (الزخرف: 32) اور فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا (المومنون: 110) اور رجل سُخَرَةٌ (کا معنی ہے) وہ آدمی جس سے تمسخر کیا جاتا ہو۔ اور اگر یہی لفظ خاء کے فتحہ کے ساتھ ہو یعنی رجل سُخَرَةٌ۔ تو مراد وہ آدمی ہے جو لوگوں سے تمسخر کرتا ہو۔ اور فلان سخرة فلاں کام میں تمسخر کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے: خادمه سُخرة

1۔ بخاری شریف، باب ذکر القین والحداد، حدیث نمبر 1949، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وسخّرۃ تسخیرا، یعنی فلاں نے اسے بغیر اجرت کے کام کا مکلف اور پابند بنایا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝

ضحاک نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں بغیر کسی تاوان کے عطا فرمائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان کمزور لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں بلند رتبہ عطا فرمائے گا۔ پس یہ آیت متنبہ کر رہی ہے کہ ان پر عظیم انعام ہوگا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے رزق کو بغیر حساب قرار دیا ہے اس حیثیت سے کہ وہ دائمی ہے اور لامتناہی ہے، پس وہ شمار نہیں ہو سکتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بِغَیْرِ حِسَابٍ یہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی صفت ہے۔ وہ کیسے تصرف کرتا ہے، جبکہ اس کی قدرت اتنی عظیم ہے تو وہ کسی حد و شمار کے ساتھ خرچ نہیں کرتا۔ پس اس کا سارے کا سارا فضل ہی بغیر حساب ہے۔ اور وہ جو حساب کے ساتھ ہے وہ آدمی کے اس عمل کے مطابق ہے جو آدمی نے آگے بھیجا ہوگا (یعنی ہر عمل کی جزا تو اس کے مطابق ہوگی مگر اس کا فضل اور عطا بلا حساب ہوگی) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۝ (النبا) (یہ بدلہ ہے آپ کے رب کی طرف سے بڑا کافی انعام) اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ جنہیں عطا کیا جاتا ہے (یعنی مرزوقین) وہ ان کے وہم و گمان کے بغیر ہو۔ جیسا کہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا: وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (الطلاق: 3) (اور اسے (وہاں سے) رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔)

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۚ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِیْهِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝

''(ابتدا میں) سب لوگ ایک ہی دین پر تھے (پھر جب ان میں اختلاف پیدا ہو گیا) تو بھیجے اللہ نے انبیاء خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب برحق تاکہ فیصلہ کردے لوگوں کے درمیان جن باتوں میں وہ جھگڑنے لگے تھے اور کسی نے اختلاف نہیں کیا اس میں بجز ان لوگوں کے جنہیں کتاب دی گئی تھی بعد از اس کہ آ گئی تھیں ان کے پاس روشن دلیلیں (اس کی وجہ) ایک دوسرے سے حسد تھا، پس اللہ نے ہدایت بخشی انہیں جو ایمان لائے تھے ان سچی باتوں پر جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے اپنی توفیق سے اور اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف''۔

ارشاد باری تعالیٰ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً کا معنی ہے سب لوگ ایک دین پر تھے۔

حضرت ابی بن کعب اور ابن زید نے کہا ہے کہ النَّاسُ سے مراد بنی آدم (اولاد آدم) ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں روحوں کی صورت میں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: النَّاسُ سے مراد صرف حضرت آدم علیہ السلام ہیں، (پھر اس پر یہ سوال ہوتا ہے) کہ واحد کو لفظ جمع کا نام کیوں دیا گیا ہے؟ (تو جواب یہ ہے کہ اس لئے) کیونکہ آپ ہی ساری نسل کی اصل اور بنیاد ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ النَّاسُ سے مراد حضرت آدم اور حضرت مائی حوا علیہا السلام ہیں۔

حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے کہ النَّاسُ سے مراد اس زمانے کے لوگ ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان تھا اور یہ دس صدیاں ہیں (ان میں) وہ لوگ حق پر تھے یہاں تک کہ ان میں اختلاف ہو گیا، تب اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بعد والوں کو مبعوث فرمایا(1)۔

اور ابن ابی خیثمہ نے کہا ہے: جب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا اس وقت سے لے کر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تک پانچ ہزار آٹھ سو سال کا عرصہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے زیادہ ہے اور حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے مابین بارہ سو برس کی مدت ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نو سو ساٹھ برس تک زندہ رہے اور آپ کے زمانے میں لوگ ایک ہی دین پر تھے، وہ دین کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور ملائکہ ان کے ساتھ مصافحہ کرتے تھے اور وہ اسی حال پر رہے یہاں تک کہ حضرت ادریس علیہ السلام (آسمانوں پر) اٹھا لئے گئے۔ پھر ان میں اختلاف پڑ گیا۔ یہ بات محل نظر ہے۔ کیونکہ صحیح روایت کے مطابق حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہوئے ہیں۔ کلبی اور واقدی وغیرہ ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی کشتی میں سوار ہونے والے لوگ ہیں، وہ مسلمان تھے پھر حضرت نوح علیہ السلام کے وصال کے بعد ان میں اختلاف ہو گیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کفر پر ایک امت تھے اور اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کا وہ زمانہ ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا۔

اور آپ ہی سے یہ قول بھی مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تمام لوگ ایک امت تھے اور وہ تمام کے تمام کافر تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت دور جاہلیت میں ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔

پس ان اقوال کی بنا پر کَانَ اپنے باب پر ہے یعنی زمانہ ماضی کے لئے جو کہ گزر چکا ہے اور وہ تمام جنہوں نے آیت میں النَّاسُ سے مراد مومنین لئے ہیں، انہوں نے کلام میں فاختلفوا فبعث مقدر مانا ہے۔ اور اس حذف پر دلیل یہ بیان کی ہے: وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ یعنی تمام لوگ دین حق پر تھے، پھر ان میں اختلاف ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات مبعوث فرمائے، جو انہیں بشارت دینے والے ہیں جنہوں نے اطاعت وفرمانبرداری کی اور انہیں ڈرانے والے ہیں جنہوں نے نافرمانی کی۔ اور جنہوں نے النَّاسُ سے مراد کفار لئے ہیں، تو پھر انہیں کی طرف انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 285

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ کَانَ ثبوت کے لئے ہو (یعنی تامہ ہو) اور مراد ان لوگوں کے بارے خبر دینا ہو جو تمام کے تمام ایک جنس ہیں کہ وہ شرائع سے خالی ہونے میں اور حقائق سے جاہل اور ناواقف ہونے میں ایک امت ہوتے اگر اللہ تعالیٰ ان پر احسان نہ فرماتا اور ان کی طرف اپنے رسول بھیج کر ان پر مہربانی نہ فرماتا۔ پس اس تاویل پر کَانَ صرف ماضی کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ اس کا معنی وہی ہے جو اس ارشاد میں ہے وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (النساء) اور اُمَّةٌ کا لفظ ان (عربوں) کے اس قول سے ماخوذ ہے: أممت كذا یعنی میں نے اس کا قصد کیا۔ پس امة واحدة کا معنی یہ ہوا کہ ان کا مقصد ایک تھا۔ اور واحد کے لئے امةً بولا جاتا ہے یعنی مقصده غیر مقصد الناس اس کا مقصد لوگوں کے مقصد کے سوا ہے۔ اسی کے مطابق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت قس بن ساعدہ کے بارے میں ارشاد گرامی بھی ہے یُحْشَرُ یوم القیامة امّة واحدة (قیامت کے دن اسے ایک امت (مقصد) پر اٹھایا جائے گا اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل کے بارے فرمایا والامة القامة (سیدھا اور صحیح مقصد) گویا کہ تمام بدن کا مقصد یہی ہے۔

اور الامة اگر کسرہ کے ساتھ ہو، تو اس کا معنی نعمت ہے کیونکہ لوگ اسی (نعمت) کا ہی قصد کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی امام ہے کیونکہ لوگ اسی کو کرنے کا قصد کرتے ہیں جو وہ کرتا ہے۔ نحاس سے روایت ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کان البشر امة واحدة پڑھا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کان الناس امة واحدة فاختلفوا فبعث قراءت کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ، حضرات انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، اور ان میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں اور قرآن کریم میں جن کے اسمائے گرامی مذکور ہیں وہ اٹھارہ ہیں۔ اور سب سے پہلے رسول حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے، اسے آجری اور ابو حاتم البستی نے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حدیث شفاعت کے مطابق اول الرسل حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ لوگ انہیں کہیں گے انت اوّل الرسل آپ پہلے رسول ہیں (1)۔ بعض نے کہا ہے کہ پہلے رسول حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ اس کا بیان سورۂ اعراف میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

ارشاد باری تعالیٰ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہیں اور وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ میں کتاب سے مراد اسم جنس بمعنی کتب ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے: الْكِتٰبَ پر الف لام عہد کے لئے ہے اور اس سے مراد تورات ہے۔ اور لِيَحْكُمَ جمہور کے قول کے مطابق الْكِتٰبَ کی طرف مسند ہے، اور یہ اَنْ مضمرہ کے ساتھ منصوب ہے یعنی لِاَنْ يَحْكُمَ اور یہ نسبت مجازی ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے۔ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (الجاثیہ: 29) (یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ) اور

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ عزوجل ولقد ارسلنا نوحا الی قومه، حدیث نمبر 3092، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
بخاری شریف، باب قول اللہ وعلم ادم الاسماء كلها، حدیث نمبر 4116، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے تا کہ ہر نبی اس کی کتاب کے مطابق فیصلے کرے۔ اور جب اس نے کتاب کے مطابق فیصلہ کیا تو گویا کتاب نے ہی فیصلہ کیا۔

عاصم جحدری کی قراءت میں لِيُحْكَمَ بَيْنَ النَّاسِ ہے یعنی فعل مجہول پڑھا گیا ہے۔ اور یہ قراءت شاذ ہے، کیونکہ کتاب کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے تا کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے۔ اور پہلے فیه کی ضمیر فِيْمَا میں ما کی طرف لوٹ رہی ہے اور دوسرے فیه کی ضمیر الکتاب کی طرف لوٹنے کا احتمال رکھتی ہے۔ یعنی کتاب میں اختلاف نہیں کیا مگر انہی لوگوں نے جنہیں وہ عطا کی گئی تھی۔ الذین فعل کے سبب محل رفع میں ہے اور اُوْتُوْهُ بمعنی اعطوه ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ضمیر منزل علیه کی طرف لوٹتی ہے اور وہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ قول زجاج کا ہے، یعنی نبی علیہ السلام کے بارے میں کسی نے اختلاف نہیں کیا بجز ان لوگوں کے جنہیں اس کے بارے علم عطا فرمایا گیا۔

بَغْيًا بَيْنَهُمْ یہ مفعول لهٔ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی هم یختلفوا الا للبغی انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر باہمی حسد کے سبب۔ اس کا معنی و مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے اور اس میں ان کے فعل کی سفاہت اور اس قباحت پر تنبیہ ہے جس میں وہ واقع ہوئے۔

اور ھدی کا معنی ارشد راہنمائی کرنا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی حق کی طرف راہنمائی فرمادی، اس طرح کہ ان کے لئے وہ کچھ بیان کر دیا جس میں ان سے پہلے لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے کہ سابقہ امتوں میں سے بعض نے بعض کی کتابوں کی تکذیب کی، تو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ان تمام کی تصدیق کے لئے راہنمائی فرمادی۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین کی حق کی طرف راہنمائی فرمائی ان امور میں جن میں اہل کتابین (یہود و نصاریٰ) نے اختلاف کیا۔ ان کے قول میں سے ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یا یہودی تھے یا عیسائی۔ (یعنی یہودیوں نے کہا: وہ یہودی تھے اور عیسائیوں نے کہا: وہ عیسائی تھے۔)

ابن زید اور زید بن اسلم نے کہا ہے: ان کا قبلہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے بیت المقدس کی طرف اور نصاریٰ نے مشرق کی طرف (منہ کیا) اور یوم جمعہ کے بارے میں ان کا اختلاف ہوا۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ وہ دن ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں ہماری راہنمائی فرمادی، پس یہودیوں کے لئے ہفتے کا دن ہے اور عیسائیوں کے لئے اتوار کا (1)۔ اور ان کے روزوں کے بارے جو اختلاف ہے۔ المختصر وہ تمام امور جن میں انہوں نے اختلاف کیا (ان میں اللہ تعالیٰ نے ہماری راہنمائی فرمادی۔)

ابن زید نے کہا ہے: انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا۔ پس یہودیوں نے انہیں فریبہ

1۔ بخاری شریف، باب فرض الجمعة، حدیث نمبر 827، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(حیرت انگیز شخصیت) قرار دیا اور عیسائیوں نے انہیں رب بنالیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے مومنین کی راہنمائی فرمائی تو انہوں نے انہیں اللہ تعالیٰ کا بندہ قرار دیا۔

فراء نے کہا ہے: اس عبارت میں قلب کیا گیا ہے۔ علامہ طبری نے اسے پسند کیا ہے۔ انہوں نے کہا: تقدیر عبارت یہ ہے فھدی اللہ الذین آمنوا للحق لما اختلفوا فیہ (پس اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی حق کی طرف راہنمائی فرمائی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔)

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس تقدیر عبارت کی طرف انہیں اس خوف نے دعوت دی ہے کہ لفظ یہ احتمال رکھتا ہے کہ انہوں نے حق کے بارے میں اختلاف کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے مومنین کی اس بعض کے بارے میں راہنمائی فرمائی جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور اسی (خوف) نے فراء کو فی نفسہ غیر حق (کے مفہوم) کے قریب کر دیا۔ علامہ طبری نے بھی فراء سے اسے بیان کرنے میں اسی کا قصد کیا ہے۔ اور رہا کتاب اللہ کے لفظ پر بغیر ضرورت کے قلب کا دعویٰ کرنا، تو اس کی طرف دھکیلنے والی شے عجز اور کوتاہ نظری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام اپنی ذات اور وصف پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَهَدَى تقاضا کرتا ہے کہ بلاشبہ وہ حق تک پہنچ گئے اور فیہ کے کلمہ میں معنی مکمل ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے قول مِنَ الْحَقِّ سے اس جنس کی وضاحت کی ہے جس میں اختلاف واقع ہوا۔

مہدوی نے کہا ہے: لفظ اختلاف کو اہتماماً لفظ حق پر مقدم ذکر کیا گیا ہے جبکہ مقصود صرف اختلاف کا ذکر کرنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ قوی نہیں ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے لما اختلفوا عنہ من الحق، ای عن الاسلام۔ یعنی اسلام سے اختلاف کیا۔ اور بِاِذْنِهٖ کے بارے زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے بعلمہ۔ یعنی اس کے علم کے ساتھ۔

نحاس نے کہا ہے: یہ غلط ہے۔ اور اس کا معنی ہے بأمرہ یعنی اس کے حکم کے ساتھ۔ اور جب تو نے کسی شے کے بارے اجازت دی (تو اس کا مفہوم ہے) تحقیق تو نے اس کے بارے حکم دے دیا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی راہنمائی فرمائی کہ انہیں ایسی چیزوں کے بارے حکم فرمایا جن کے مطابق ان کے لئے عمل کرنا واجب ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ میں معتزلہ کے اس قول کا رد ہے کہ بندہ اپنی ذات کی ہدایت و راہنمائی کا اہتمام خود کرتا ہے (یعنی یہ بندے کے اپنے اختیار میں ہے۔)

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ

''کیا تم خیال کر رہے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ نہیں گزرے تم پر وہ حالات جو گزرے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے ہوئے ہیں پہنچی انہیں سختی اور مصیبت اور وہ لرز اٹھے یہاں تک کہ کہہ اٹھا (اس زمانہ کا)

رسول اور جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ کب آئے گی اللہ کی مدد؟ سن لو! یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے۔"

ارشاد باری تعالیٰ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ میں حَسِبۡتُمۡ بمعنی ظننتم (تم نے گمان کیا) ہے۔ حضرت قتادہ، سدی اور اکثر مفسرین نے کہا: یہ آیت غزوۂ خندق کے دوران نازل ہوئی جب کہ مسلمانوں کو مشقت، شدت، گرمی، سردی، تلخ اور تکلیف دہ زندگی اور طرح طرح کی تکالیف اور مصائب آپہنچے اور ان کی کیفیت یہ ہوگئی جیسا کہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا وَ بَلَغَتِ الۡقُلُوۡبُ الۡحَنَاجِرَ (الاحزاب:۱۰) (اور کلیجے منہ کو آنے لگے۔)

اور بعض نے کہا ہے: یہ آیت جنگ احد کے دوران نازل ہوئی۔ اس کی مثل آل عمران میں بھی ہے۔ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَ لَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ جٰہَدُوۡا مِنۡکُمۡ (آل عمران:۱۴۲) (کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے۔)

اور ایک جماعت نے کہا ہے: یہ آیت مہاجرین کو تسلی اور حوصلہ دینے کے لئے نازل ہوئی جبکہ انہوں نے اپنے گھر اور اپنے اموال مشرکین کے ہاتھوں چھوڑ دیئے اور اللہ تعالیٰ اور رسول معظم ﷺ کی رضا اور خوشنودی کو انہوں نے ترجیح دی اور یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عداوت کا اظہار کیا اور اغنیاء اور مالدار لوگوں میں سے بعض نے اپنے باطن میں نفاق پیدا کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پاک کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

اس آیت میں اَمۡ منقطعہ بمعنی بَل ہے۔ اور بعض اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ کبھی اَمۡ الف استفہام کے بدلے بھی آتا ہے تا کہ اس سے کلام کی ابتدا کی جائے اور حَسِبۡتُمۡ دو مفعولوں کو چاہتا ہے، لہٰذا علمائے نحو نے کہا ہے: اَنۡ تَدۡخُلُوا قائم مقام دو مفعولوں کے لئے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفعول ثانی محذوف ہے: یعنی أحسبتم دخولکم الجنّۃ واقعاً اور لَمَّا بمعنی لم ہے اور مَثَلُ بمعنی شبہ ہے۔ یعنی اس طرح کے امتحان میں تمہیں نہیں ڈالا گیا جس طرح انہیں آزمایا گیا جو تم سے پہلے تھے۔ پس تم صبر کرو جیسا کہ انہوں نے صبر کیا۔

نضر بن شمیل نے بیان کیا ہے کہ مَثَلُ بمعنی صفۃ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ معنی اس طرح ہو: اور ابھی تک تمہیں اس طرح کی مصیبت اور شدت نہیں پہنچی، جس طرح کی آزمائش ان لوگوں پر آئی جو تم سے پہلے تھے۔

وہب نے کہا ہے: مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ستر انبیاء علیہم السلام مردہ حالت میں پائے گئے اور ان کی موت کا سبب بھوک اور چچڑیاں تھیں۔ اسی آیت کی مثل یہ بھی ہے: الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ۝ وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ (العنکبوت) (الف۔لام۔میم۔ کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا۔ اور بے شک ہم نے آزمایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے۔)

پس اللہ تعالیٰ نے انہیں صبر کی دعوت دی اور اس پر ان سے نصرت و مدد کا وعدہ فرمایا اور ارشاد فرمایا: اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ ۝

اور الزلزلۃ سے مراد سخت حرکت دینا ہے۔ یہ اشخاص میں بھی ہوتی ہے اور احوال میں بھی۔ کہا جاتا ہے: زلزل اللہ

الارض زلزلۃ و زلزالا یعنی بالکسر - فتزلزلت۔ جب وہ حرکت کرے اور کانپنے لگے اور زُلْزِلُوْا کا معنی ہے وہ خوفزدہ کیے گئے اور حرکت دیے گئے۔ اور الزَّلزال۔ فتحہ کے ساتھ اسم ہے۔ اور الزلزِل کا معنی شدائد اور سختیاں ہیں۔

زجاج نے کہا ہے: زلزلہ کا اصل معنی کسی چیز کا اپنی جگہ سے پھسل جانا، ہٹ جانا ہے اور جب تو کہے زلزلتہ تو اس کا معنی ہے: تو نے بار بار اپنی جگہ سے ہٹایا اور پھسلایا۔

اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ زلزل دحرج کی طرح فعل رباعی ہے۔

نافع نے حتّٰی یَقُوْلُ رفع کے ساتھ، جبکہ دوسروں نے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ حَتّٰی کے مابعد کلمہ پر دو اعتبار سے فتحہ اور دو اعتبار سے رفع آسکتا ہے۔ مثلاً تو کہتا ہے: سرت حتی أدخلَ المدینۃَ یہ منصوب ہے۔ اس شرط پر کہ سیر اور دخول دونوں اکٹھے ایک ساتھ گزر چکے ہوں۔ یعنی میں اس میں داخل ہونے تک چلتا رہا۔ ای سرت الی ان ادخلھا اور یہ غایت ہے اور اسی کے مطابق ان کی قراءت ہے جنہوں نے منصوب پڑھا ہے۔

اور آیت کے سوا میں نصب کی دوسری وجہ یہ ہے سرت حتّٰی ادخلھا۔ ای کَیْ ادخلھا (یعنی میں چلا تاکہ میں اس میں داخل ہو جاؤں۔)

اور رفع کی بھی دو وجہیں ہیں سرت حتّٰی ادخلُھا، ای سرت فأدخلھا یعنی میں چلا اور اس میں داخل ہو گیا۔ تحقیق یہ دونوں سیر اور دخول اکٹھے گزر چکے ہیں۔ ای کنت سرت فدخلت۔ اور یہاں (آیت میں) حَتّٰی ان مضمرہ کے ساتھ عمل نہیں کرتا، کیونکہ اس کے بعد جملہ ہے۔ جیسا کہ فرزدق نے کہا ہے: فَیَاعَجباً حتی کُلَیبٌ تَسُبُّنِیْ (پس کتنی تعجب کی بات ہے کہ بنی کلیب مجھے گالیاں دیتے ہیں۔)

نحاس نے کہا ہے: اس بنا پر رفع کی قراءت زیادہ واضح اور معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ ای و زلزلوا حتّٰی الرسولُ یقول اور وہ لرزاٹھے یہاں تک کہ (اس زمانہ کا) رسول کہہ اٹھا۔ یعنی یہاں تک کہ یہ اس کا حال تھا۔ کیونکہ قول زلزلہ سے منقطع نہیں ہوا اور نصب معنی غایت کی بنا پر ہے اور اس میں وہ معنی نہیں ہے۔

مقاتل کے قول کے مطابق یہاں رسول سے مراد شعیا ہیں۔ اور وہی حضرت یسع علیہ السلام ہیں۔

اور کلبی نے کہا ہے: یہ ہر رسول کے بارے میں ہے جسے اپنی امت کی طرف مبعوث کیا گیا اور اس نے خوب محنت اور مشقت اٹھائی، یہاں تک کہ وہ کہہ اٹھا: اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کب آئے گی؟ اور ضحاک سے مروی ہے انہوں نے کہا: مراد حضور نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اسی پر آیت کا نزول دلالت کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور آیت کے سوا میں رفع کی دوسری صورت یہ ہے سرت حتی ادخلُھا یہ اس بنا پر ہے کہ چلنا ماضی میں ہو اور دخول اب (یعنی زمانہ حال میں) ہو۔

اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: مرِض حتی لا یرجونَہ، ای ھو الآن لایرجی۔ یعنی وہ بیمار ہوا اور اب اس کے بارے کوئی

امید نہیں ہے۔ اور اسی کی مثل یہ بھی ہے سرت حتی ادخلها لا امنع یعنی میں چلا اور اب میں داخل ہوں گا، اس سے باز نہ رہوں گا۔

مجاہد، اعرج، ابن محیصن اور شیبہ نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن، ابو جعفر، ابن ابی اسحاق اور شبل وغیرہ نے نصب کے ساتھ قراءت کی ہے۔

مکی نے کہا ہے: یہی پسندیدہ ہے کیونکہ قراء کی ایک جماعت اسی نظریہ پر ہے۔

اور اعمش نے وزلزلوا ویقول الرسول حتی کی بجائے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ہے وزلزلوا ثم زلزلوا ویقول۔

اور تاویل کرنے والوں میں سے اکثر نے کہا ہے کہ آیت کے آخر تک کلام رسول اور مومنین کے قول میں سے ہے۔ یعنی انہیں مشقت پہنچی یہاں تک کہ وہ مدد و نصرت کو موخر اور دور سمجھنے لگے، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَآ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ اور وہ رسول کے قول میں سے ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر کہ انہوں نے مدد و نصرت کے جلدی آنے کا مطالبہ کیا، نہ کہ کسی شک اور ارتیاب کی بنا پر اور الرسول اسم جنس ہے۔

اور ایک گروہ کا کہنا ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، اور تقدیر کلام یہ ہے: حتّٰی یقول الَّذِیۡنَ آمنوا متٰی نصر الله (یعنی یہاں تک کہ ایمان والے کہنے لگے اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی؟) تو اللہ کا رسول کہتا ہے: اَلَآ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ، پس رسول علیہ السلام کو رتبہ میں بلندی اور حیثیت کی بنا پر مقدم ذکر کیا گیا ہے اور پھر مومنین کے قول کو مقدم لایا گیا ہے، کیونکہ وہ زمانے کے اعتبار سے متقدم ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ تو تحکم ہے۔ اور کلام کو اپنے ظاہر پر محمول کرنا متعذر نہیں ہے۔ اور یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اَلَآ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اخبار ہو اور یہ قول کے ذکر کے مکمل ہونے کے بعد بطور استیناف ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَتٰی نَصۡرُ اللّٰهِ۔ سیبویہ کے قول کے مطابق نصر اللہ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور ابو العباس کے قول کے مطابق یہ فعل کے سبب مرفوع ہے۔ یعنی حتی یقع نصر الله۔ اور قریبٌ۔ اِنّ کی خبر ہو۔

نحاس نے کہا ہے: غیر قرآن میں قریباً پڑھنا بھی جائز ہے یعنی مَکَانًا قَرِیۡبًا اور قریبٌ کا عرب نہ تثنیہ لاتے ہیں، نہ جمع اور نہ ہی اس معنی میں مونث۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝ (الاعراف) اور شاعر نے کہا:

له الویلُ ان اَمۡسٰی ولا اُمُّ هاشم		قریبٌ ولا بَسۡبَاسَةُ بنۃُ یَشۡکُرَا

شعر میں تثنیہ مونث کے لئے قریب لایا گیا ہے۔

اور اگر تو کہے: فلان قریب لی فلاں میرے قریب ہے، تو اس کی تثنیہ اور جمع بنانا چاہے تو پھر تو کہے گا: قریبون و اقرباء و قرباء۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۗ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

''آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرمایئے: جو کچھ خرچ کرو (اپنے) مال سے تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور مسکین ہیں اور مسافر ہیں اور جو نیکی تم کرتے ہو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَسْـَٔلُوْنَكَ اس آیت کریمہ میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اس میں اگر ہمزہ کو مخفف کر دیا جائے تو اس کی حرکت سین کو دے کر اسے مفتوح پڑھا جائے اور ہمزہ کو حذف کر دیا جائے تو تو اسے پڑھے گا: يَسَلُوْنَكَ۔

یہ آیت حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ آپ شیخ کبیر (بہت زیادہ بوڑھے) تھے۔ تو عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ میرا مال کثیر اور بہت زیادہ ہے، تو میں اسے کیونکر صدقہ کروں اور کس پر خرچ کروں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ (1)

مسئلہ نمبر 2۔ ارشاد باری تعالیٰ: مَاذَا يُنْفِقُوْنَ میں مَا مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور ذَا خبر ہے اور یہ بمعنی الذی ہے۔ اور اسم کی طوالت کے سبب اس سے ھا کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یعنی اصل عبارت اس طرح ہے: ما الذی ینفقونہ اور اگر تو چاہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما یُنْفِقُوْنَ کے سبب محل نصب میں ہو۔ اور ذا، ما کے ساتھ مل کر ایک شے کے قائم مقام ہو۔ تو (اس صورت میں) ضمیر کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور جب یہ اسم مرکب ہے تو پھر یہ محل نصب میں ہوگا۔ بخلاف شاعر کے اس قول کے:

وما ذا عسی الواشون ان یتحدثوا سوی ان یقولوا اننی لكِ عاشق

(چغلی کھانے والوں کے پاس بات کرنے کے لئے اس کے سوا کیا ہے کہ وہ کہیں: میں تیرا عاشق ہوں۔)

کیونکہ عسیٰ اس میں عمل نہیں کر رہا۔ پس مَاذَا مرکب کلمہ ہے اور محل رفع میں ہے، کیونکہ ذَا کا کوئی صلہ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ کہا گیا ہے کہ اس میں سوال کرنے والے مومنین ہیں۔ اور معنی یہ ہے: ''وہ آپ سے پوچھتے ہیں کونسی وہ وجوہ (اور اسباب) ہیں جن میں وہ مال خرچ کر سکتے ہیں اور جو مال خرچ کرنا لازم ہو وہ اسے کہاں رکھیں؟

سدی نے کہا ہے: یہ آیت زکوٰۃ فرض ہونے سے پہلے نازل ہوئی، پھر فرض زکوٰۃ نے اسے منسوخ کر دیا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: مہدوی کو سدی کے بارے میں اس مسئلہ میں وہم ہوا ہے، لہٰذا ان کی طرف یہ قول منسوب کر دیا کہ انہوں نے کہا: یہ آیت فرض زکوٰۃ کے بارے میں ہے اس سے والدین کا حکم منسوخ ہو گیا۔

ابن جریج وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت مستحب صدقہ کے بارے ہے اور زکوٰۃ اس انفاق کے سوا ہے۔

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 60

پس اس قول کی بنا پر اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور یہ نفلی صدقہ کے مصارف کو بیان کر رہی ہے۔ پس خوشحال اور غنی آدمی پر واجب ہے کہ وہ اپنے محتاج اور فقیر والدین پر اتنا مال خرچ کرے جو ان دونوں کی ان کی حالت کے مطابق اصلاح کر سکے (اور ان کے لئے نفع بخش ثابت ہو۔) مثلاً کھانا، لباس اور دیگر ضروریات حیات۔

حضرت امام مالک نے کہا ہے: بیٹے پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اپنے باپ کی شادی کرائے۔ البتہ یہ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے باپ کی بیوی کو خرچہ مہیا کرے چاہے وہ اس کی اپنی ماں ہو یا اجنبی عورت ہو۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر اپنے باپ کی شادی کرانا لازم نہیں کیونکہ آپ کے پیش نظر یہ ہے کہ وہ (باپ) اغلباً شادی سے مستغنی ہوتا ہے۔ ہاں اگر اسے اس کی شدید حاجت ہو تو پھر اس کی شادی کرانا بھی اس پر واجب ہے۔ اگر اس طرح نہ ہوتا تو پھر اس پر یہ واجب نہ کیا جاتا کہ وہ دونوں (یعنی باپ اور اس کی بیوی) پر خرچ کرے۔ اور عبادات میں سے وہ جو اموال سے تعلق رکھتی ہیں تو (بیٹے پر) لازم نہیں ہے کہ وہ اسے اتنا مال دے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو، یا جہاد پر جا سکتا ہو۔ البتہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ باپ کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرے، کیونکہ صدقہ فطر نفقہ اور اسلام کی شرط کے ساتھ ضروری ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ۔ اس میں اَنْفَقْتُمْ کی وجہ سے مَا محل نصب میں ہے۔ اور اسی طرح وَ مَا یُنْفِقُوْا میں بھی ہے۔ اور یہ شرط ہے اور جواب شرط فَلِلْوَالِدَیْنِ ہے۔ اسی طرح وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ شرط ہے اور اس کا جواب فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ ﴿۲۱۵﴾ ہے۔ یتیم، مسکین اور ابن سبیل کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اور اسی آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ (الروم: 38)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یَفْعَلُوْا یاء کے ساتھ صیغہ غائب کی صورت میں پڑھا ہے۔ آیت کا ظاہر تو خبر ہے، حالانکہ یہ جزا کے وعدہ کو متضمن ہے(1)۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

"فرض کیا گیا ہے تم پر جہاد اور وہ ناپسند ہے تمہیں اور ہو سکتا ہے کہ تم ناپسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم پسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو اور (حقیقت حال) اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ كُتِبَ اس کا معنی ہے: "فرض کیا گیا ہے۔" اس کی مثل پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قوم نے اس کی قراءت کتب علیکم القتلُ کی ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

كُتب القتل والقتال علینا　　و علی الغانیات جرّ الذیول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 279

ہمارے اوپر جنگ وقتال فرض کیا گیا ہے اور حسن و جمال والیوں پر (فقط کپڑوں کے) دامنوں کو کھینچنا۔

یہ جہاد کی فرضیت کا ذکر ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا ہے: یہ وہی ہے جس کے ساتھ انہیں آزمایا گیا ہے اور اسے جنت تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس میں قتال سے مراد کفار دشمنوں کے ساتھ لڑنا اور جنگ کرنا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کا علم انہیں قرائن احوال سے ہوا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جتنی مدت مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جہاد کی اجازت نہ دی گئی اور جب آپ ہجرت فرما ہوئے تو پھر آپ کو اجازت فرما دی گئی کہ مشرکین میں سے جو کوئی آپ کے خلاف جنگ کرے۔ آپ اس کے ساتھ مقابلہ کریں اور جنگ لڑیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (الحج: ۳۹) (اذن دے دیا گیا ہے (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی جاتی ہے اس بنا پر کہ ان پر ظلم کیا گیا) پھر آپ کو عام مشرکین کے ساتھ جنگ لڑنے کی اجازت عطا فرما دی گئی (1)۔ اور علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں مراد کون ہیں۔

تو ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس میں مراد صرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام ہیں۔ پس ان پر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں جنگ کرنا فرض عین تھا۔ پھر جب شریعت مضبوط ہوگئی اور قرار پکڑ گئی تو جہاد فرض کفایہ ہوگیا۔ حضرت عطا اور امام اوزاعی نے یہی کہا ہے۔

ابن جریج نے بیان کیا ہے کہ میں نے حضرت عطا کو کہا: کیا اس آیت کے مطابق لوگوں پر جہاد کرنا واجب (فرض عین) ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں، بلاشبہ یہ ان (صحابہ کرام) پر فرض کیا گیا تھا۔ اور امت میں سے جمہور نے کہا ہے کہ جہاد کی پہلی فرضیت ہی فرض کفایہ تھی نہ کہ فرض عین، مگر یہ کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب انہیں جہاد کے لئے نکلنے کی دعوت دیتے تھے تو ان پر اس کے لئے نکلنا لازم ہو جاتا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت و پیروی واجب (فرض عین) ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جس پر مسلسل اجماع رہا ہے وہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے ہر فرد پر جہاد فرض کفایہ ہے۔ جب مسلمانوں میں سے کچھ افراد یہ فریضہ ادا کردیں تو باقیوں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر دشمن (حملہ آور ہو کر) دارالاسلام میں داخل ہو جائے تو اس وقت جہاد فرض عین ہے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ البراءۃ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور مہدوی وغیرہ نے حضرت ثوری سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جہاد تطوع ہے (یعنی نفلی عبادت ہے اس میں رضا کارانہ طور پر شامل ہونا ہوتا ہے۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ عبارت کسی سائل کے سوال کے جواب میں کہی گئی ہے۔ تحقیق اس نے جہاد کی تعیین کے بارے سوال کیا تو اسے کہا گیا: ذلك تطوع (کہ وہ ایک ایسا عمل ہے جس میں بتکلف اطاعت کی جاتی ہے۔)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ یہ مبتدا اور خبر ہے (اور معنی ہے) اور وہ مزاجوں میں ناپسند ہے۔

ابن عرفہ نے کہا ہے: الکُرہُ کا معنی مشقت ہے۔ اور الکَرہ فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی وہ عمل ہے جس پر تجھے مجبور کیا

1۔ تفسیر رازی، زیر آیت ہذہ

جائے۔ یہی پسندیدہ مفہوم ہے۔ اور یہ بھی جائز کہ بالضم (الکُرہ) کا معنی بالفتح (الکَرہ) کی مثل ہو۔ پس یہ دونوں لغتیں ہو سکتی ہیں۔ کہا جاتا ہے: کرھت الشیء کَرْھًا و کُرْھًا و کراھۃ و کراھیۃ (میں نے شے کو ناپسند کیا) اور اکرھتہ علیہ اکراھاً (میں نے اسے اس پر مجبور کیا۔)

بلاشبہ جہاد ایک مشقت ہے۔ کیونکہ اس میں مال خرچ کرنا ہوتا ہے، وطن اور اہل وعیال کو چھوڑنا ہوتا ہے اور اپنے جسم کو زخم کھانے، اعضائے بدن کو کٹوانے اور اپنی جان کو قربان کرنے کے لئے پیش کرنا ہوتا ہے۔ سو ان کی ناپسندیدگی کا سبب یہی ہے نہ کہ یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرض کو ناپسند کیا۔

حضرت عکرمہ نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک (پہلے) انہوں نے اسے ناپسند کیا اور پھر اسے پسند کرنے لگے اور کہا: سمعنا و اطعنا، ہم نے حکم سنا اور اطاعت و پیروی کے لئے سر تسلیم خم کر لیا (1)۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کیونکہ حکم کی پیروی مشقت کو متضمن ہوتی ہے۔ لیکن جب ثواب معلوم ہو جائے تو اس کے ضمن میں مشقتوں کو برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: دنیا میں اس کی مثال اس شے کو زائل کرنا ہے جو انسان کو تکلیف دیتی ہے، درد پہنچاتی ہے، اور وہ اس سے ڈرتا ہے جیسا کہ کسی عضو کو کاٹنا، داڑھ کو نکالنا اور فصد کروانا اور پچھ لگوانا تاکہ درد اور تکلیف سے چھٹکارا حاصل ہو جائے اور صحت قائم رہ سکے۔ اور دار الخلد (جنت) میں دائمی حیات سے اور مقعد صدق میں عزت و کرامت سے افضل و اعلیٰ کوئی نعمت نہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قول باری تعالیٰ ہے: وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا۔ کہا گیا ہے کہ عَسٰى بمعنی قد ہے۔ الاصم نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے واجبۃ (یعنی ضروری اور لازم ہونا) اور پورے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے لفظ عَسٰى واجبۃ کے معنی میں ہے (یعنی جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہوتی ہے تو پھر اس میں شک کا معنی نہیں ہوتا، بلکہ بالیقین ثابت ہونے کا معنی ہوتا ہے۔) سوائے اس ارشاد گرامی کے: عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ (التحریم: ۵) (کچھ بعید نہیں کہ اگر نبی کریم تم سب کو طلاق دے دیں تو آپ کا رب تمہارے عوض آپ کو ایسی بیبیاں عطا فرما دے جو تم سے بہتر ہوں۔)

ابوعبیدہ نے کہا ہے: عَسٰى کا لفظ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایجاب کے لئے ہے اور معنی یہ ہے: ہوسکتا ہے کہ تم جہاد میں پائی جانے والی مشقت کو ناپسند کرو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو، اس اعتبار سے کہ اس میں تمہیں غلبہ دے دیا جائے، تم کامیابی سے ہمکنار ہو، تم مال غنیمت حاصل کرو اور تمہیں اجر و ثواب بھی دیا جائے گا۔ اور اس دوران جو فوت ہوا وہ شہادت کی موت فوت ہوگا۔ اور ہوسکتا ہے کہ تم جہاد چھوڑنے اور ترک کر دینے کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں برا ہو اس اعتبار سے کہ تم پر غلبہ پا لیا جائے، تمہیں ذلت و رسوائی پر مجبور کر دیا جائے اور تمہارے اختیارات اور حکومت ختم کر دی جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ صحیح اور درست ہے، اس پر کوئی غبار اور شک و شبہ نہیں۔ جیسا کہ بلاد اندلس میں اتفاق ہوا ہے،

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذہ

ان لوگوں نے جہاد چھوڑ دیا، انہوں نے جنگ سے بزدلی کا مظاہرہ کیا، اور اکثر اوقات میدان جہاد سے راہ فرار اختیار کی تو نتیجتاً دشمن وہاں کے شہروں پر قابض ہو گئے، پھر وہاں کے باسیوں کے ساتھ کیا ہوا؟ انہیں قیدی بنایا گیا، قتل کیا گیا، جلاوطن کیا گیا، اور غلام بنالیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔ یہ سب کچھ ہمارے ہاتھوں کا کیا ہوا تھا اور ان کی کمائی تھی۔

اور حسن نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے تم پیش آنے والی سختیوں اور مصیبتوں کو ناپسند نہ کرو کیونکہ بسا اوقات جس امر کو تو ناپسند کر رہا ہوتا ہے اسی میں تیری نجات ہوتی ہے اور بسا اوقات جس امر کو تو پسند کرتا ہے اس میں تیری ہلاکت اور بربادی ہوتی ہے۔

ابوسعید الضریر نے کہا ہے

رُبَّ أمرٍ تتّقِيهِ جرّ أمرًا ترتَضِيهِ خفي المحبوب منه و بدا المكروه فيه

کئی امور ہیں جن سے تو اجتناب کرتا ہے اور بچتا ہے وہ ایسے امر کو کھینچ لاتے ہیں جن سے تو راضی ہوتا ہے۔ پسندیدہ امر ان میں مخفی ہوتا ہے اور ناپسندیدہ امر ان میں ظاہر ہوتا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

''وہ پوچھتے ہیں آپ سے کہ ماہ حرام میں جنگ کرنے کا حکم کیا ہے۔ آپ فرمائیے کہ لڑائی کرنا اس میں بڑا گناہ ہے لیکن روک دینا اللہ کی راہ سے اور کفر کرنا اس کے ساتھ اور (روک دینا) مسجد حرام سے اور نکال دینا اس میں بسنے والوں کو اس سے، اس سے بھی بڑے گناہ ہیں اللہ کے نزدیک اور فتنہ (وفساد) قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور وہ ہمیشہ لڑتے رہیں گے تم سے یہاں تک کہ پھیر دیں تمہیں تمہارے دین سے اگر بن پڑے۔ اور جو پھرے تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جائے حالت کفر پر یہی وہ (بدنصیب) ہیں کہ ضائع ہو گئے ان کے عمل دنیا و آخرت میں اور یہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں (تو) یہی لوگ امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی اور اللہ بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں بارہ مسئلے ہیں:۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: یَسْـَٔلُوْنَكَ اس لفظ کے بارے گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ جریر بن عبدالحمید اور محمد بن فضیل نے عطا بن سائب سے، انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب سے زیادہ بہتر قوم کوئی نہیں دیکھی۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صرف تیرہ مسائل کے بارے سوال کیا اور وہ تمام کے تمام قرآن کریم میں موجود ہیں۔

مثلاً یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ، یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ اور یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى اور وہ سوال نہ کرتے تھے مگر ایسی شے سے متعلق جو ان کے لئے نفع بخش ہوتی تھی۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: تیرہ مسئلوں میں سے سوائے تین کے حدیث طیبہ میں کوئی نہیں ہے۔

ابوالیسار نے جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جتھہ بھیجا اور ان پر ابوعبیدہ بن حارث یا عبیدہ بن حارث کو امیر مقرر کیا۔ پس جب وہ روانہ ہونے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے، تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرط محبت سے فریفتہ ہو کر رونے لگے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو (امیر بنا کر) بھیج دیا اور انہیں ایک خط لکھ کر عطا فرمایا اور ساتھ ہی یہ حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اس خط کو کھول کر نہ پڑھیں یہاں تک کہ وہ فلاں فلاں جگہ تک پہنچ جائیں اور ارشاد فرمایا: اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو سفر پر مجبور نہ کرنا۔ پس جب وہ اس مقررہ جگہ پر پہنچے تو خط پڑھا اور اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اور کہا: سمعاً و طاعة لله و لرسوله (کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا اور خوشنودی کے لئے حکم کی تعمیل میں دل و جان حاضر ہے۔)

راوی کا بیان ہے: دو آدمی واپس لوٹ آئے اور باقی افراد ان کے ساتھ آگے چلے گئے۔ چنانچہ ان کی ملاقات ابن حضرمی سے ہوئی، تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور انہیں اس کا علم نہ تھا کہ آج رجب کا پہلا دن ہے، تو اس پر مشرکین نے کہا: تم نے شہر حرام میں قتل کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ الآیہ (1)۔

اس آیت کے سبب نزول میں یہ روایت بھی ہے کہ بنی کلابہ کے دو آدمی عمرو بن امیہ ضمری سے ملے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ دونوں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھے اور وہ دن رجب کا پہلا دن تھا۔ چنانچہ اس نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ تب قریش نے کہا: اس نے ان دونوں کو شہر حرام (حرام مہینے) میں قتل کیا ہے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔

لیکن اس آیت کے سبب نزول میں حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کا واقعہ اکثر اور زیادہ مشہور ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں نو افراد کے گروہ کے ساتھ بھیجا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آٹھ افراد کے ساتھ غزوۂ بدر سے دو ماہ پہلے جمادی الآخر میں بھیجا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رجب میں بھیجا تھا۔

ابوعمر نے کتاب الدرر میں اس کے بارے کہا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرز بن جابر کی تلاش سے واپس لوٹ کر آئے۔ اس خروج کو بدر اولیٰ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمادی الثانی کے بقیہ ایام اور رجب کا مہینہ مدینہ طیبہ میں قیام فرما

1۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 656-655

رہے اور رجب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش بن رئاب الاسدی کو بھیجا اور ان کے ساتھ مہاجرین میں سے آٹھ افراد اور بھی تھے۔ اور وہ تھے ابو حذیفہ بن عتبہ، عکاشہ بن محصن، عتبہ بن غزوان، سہیل بن بیضاء فہری، سعد بن ابی وقاص، عامر بن ربیعہ، واقد بن عبداللہ تمیمی اور خالد بن بکیر لیثی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے لئے ایک خط تحریر فرمایا اور انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اسے کھول کر نہ دیکھیں یہاں تک کہ وہ دو دن سفر کر لیں، پھر اسے کھول کر پڑھیں۔ پس آپ نے وہی کچھ کیا جس طرح کرنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا تھا۔ اور آپ اپنے اصحاب میں سے کسی کو مجبور نہ کریں اور آپ ان کے امیر ہیں۔ پس حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ایسے ہی کیا جیسے آپ نے حکم ارشاد فرمایا تھا۔ پس جب آپ نے خط کھولا اور اسے پڑھا، تو اس میں پایا کہ جب تو میرے اس خط میں دیکھے تو پھر اس پر عمل کرنا یہاں تک کہ تو مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان مقام نخلہ پر اترنا اور وہاں قریش کی تاک میں رہنا اور ہمیں ان کی خبروں کے بارے آگاہ کرنا۔ اذا نظرت فی کتابی هذا فامض حتی تنزل نخلة بین مكة و الطائف فَتَرَصَّدْ بها قریشا، و تعلم لنا من اخبارهم۔

پس جب آپ نے تحریر پڑھی تو کہا: سمعاً و طاعة (دل و جان سے تعمیل ارشاد کے لئے حاضر ہیں) پھر اپنے ساتھیوں کو بھی اس کے بارے آگاہ کیا اور اس کے بارے بھی کہ وہ ان میں سے کسی کو مجبور نہ کریں گے اور یہ کہ وہ آپ کی خوشنودی کے لئے انہیں کو ساتھ لے کر اٹھیں گے جنہوں نے آپ کی اطاعت کی اور یہ کہ اگر کسی نے بھی آپ کی اطاعت نہ کی تو پھر وہ اکیلے ہی آگے بڑھیں گے۔ پس جو کوئی شہادت کو پسند کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ (آگے بڑھنے کے لئے) اٹھے، اور جو کوئی موت کو ناپسند کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ واپس لوٹ جائے۔ تو ساتھیوں نے جواب دیا: ہم تمام کے تمام اس (کام) میں رغبت رکھتے ہیں جس میں آپ رغبت رکھتے ہیں۔ اور ہم میں سے ہر ایک یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل کے لئے دل و جان سے حاضر ہے۔ اور وہ سارے آپ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور حجاز کی طرف چل پڑے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کا اونٹ بھاگ گیا، وہ دونوں اس کا پیچھا کرتے رہے اور اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے۔ اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں سمیت آگے چلے گئے یہاں تک کہ مقام نخلہ پر جا کر اترے، تو وہاں سے قریش کا ایک قافلہ گزرا، جو کشمش اور دیگر سامان تجارت اٹھائے ہوئے تھا اور اس میں عمرو بن حضرمی تھا۔ حضرمی کا نام عبداللہ بن عباد ہے جو صدف سے تعلق رکھتا تھا اور صدف حضر موت کا ایک قبیلہ ہے اور عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور اس کا بھائی نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی اور حکم بن کیسان مولیٰ بنی مغیرہ بھی شامل تھے۔ پس مسلمانوں نے باہمی مشاورت کی اور کہا: ہم شہر حرام رجب کے آخری دن میں ہیں، پس اگر ہم ان سے قتال کرتے ہیں، تو ہم شہر حرام کی حرمت کو پامال کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں اور اگر ہم انہیں آج رات چھوڑ دیتے ہیں تو پھر وہ حرم پاک میں داخل ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ان کے ساتھ لڑنے پر اتفاق کر لیا اور واقد بن عبداللہ تمیمی نے تیر مارا اور عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو قیدی بنا لیا اور نوفل بن عبداللہ بھاگ گیا۔ پھر سامان سے لدے ہوئے اونٹ اور دو قیدیوں کو ساتھ لے آئے اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: جو مال غنیمت ہم نے حاصل کیا ہے اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خمس علیحدہ کر دو۔ پس انہوں نے ایسا ہی کر دیا۔ اسلام میں پہلا خمس

یہی تھا۔ پھر قرآن کریم نازل ہوا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الآیہ (اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو تو اللہ کے لئے ہے اس کا پانچواں حصہ الخ) (الانفال: ۴۱)

پس اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے فعل کو برقرار رکھا اور اسے پسند کیا اور یوم قیامت تک اسے امت کے لئے سنت قرار دیا۔ یہی پہلی غنیمت ہے جو اسلام میں حاصل ہوئی اور (حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ) پہلے امیر ہیں اور عمرو بن حضرمی پہلا مقتول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہر حرام میں ابن حضرمی کے قتل کو ناپسند کیا اور اس معاملہ کو قوم پر چھوڑ دیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ تا قولہ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں قیدیوں کا فدیہ قبول کر لیا۔

پھر عثمان بن عبداللہ حالت کفر میں ہی مکہ مکرمہ میں فوت ہوا اور حکم بن کیسان نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں ہی رہے یہاں تک کہ انہوں نے بئر معونہ میں جام شہادت نوش کیا اور حضرت سعد اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما صحیح سالم مدینہ طیبہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔

اور کہا گیا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما کا اپنے اونٹ کی تلاش میں جانا حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی اجازت سے تھا۔ اور عمرو بن حضرمی اور اس کے ساتھیوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا، تو وہ ان سے خوفزدہ ہو گئے، تو حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک یہ قوم تم سے خوفزدہ ہو کر گھبرا گئی ہے، پس تم اپنے میں سے ایک آدمی کا سر مونڈ دو اور پھر اسے چاہئے کہ وہ ان کے پاس چلا جائے۔ پس جب انہوں نے اسے دیکھا جس کا سر مونڈا ہوا تھا، تو وہ امن میں ہو گئے اور کہنے لگے: یہ قوم عمار ہے تم پر کوئی حرج اور خطرہ نہیں ہے اور پھر انہوں نے ان کے قتال کے بارے میں باہمی مشاورت کی۔ الحدیث۔

یہودیوں نے فال نکالی اور کہا: واقد سے مراد وقدت الحرب ہے یعنی جنگ بھڑک اٹھی اور عمرو سے مراد عمرت الحربُ ہے یعنی جنگ قائم ہو گئی اور حضرمی سے مراد حضرت الحربُ ہے جنگ شروع ہو گئی۔

اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہم ان دونوں کا فدیہ قبول نہیں کریں گے یہاں تک کہ حضرت سعد اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما آ جائیں اور اگر وہ دونوں نہ آئے تو ہم ان دونوں کو ان کے بدلے قتل کر دیں گے۔ پس جب وہ دونوں آ گئے تو ان دونوں نے فدیہ ادا کر دیا۔ پھر حکم نے تو اسلام قبول کر لیا اور مدینہ طیبہ میں ہی مقیم ہو گیا یہاں تک کہ غزوۂ بئر معونہ میں شہید کر دیا گیا۔ رہا عثمان! تو وہ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ گیا اور وہیں حالت کفر میں مر گیا اور رہا نوفل! تو اس غزوہ احزاب کے دن اپنے گھوڑے کو ایڑی لگائی تاکہ وہ خندق کو عبور کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہو سکے، تو وہ اپنے گھوڑے سمیت خندق میں گر گیا اور دونوں کے اعضائے بدن ٹوٹ گئے۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے مار ڈالا۔ مشرکین نے اس کا مردہ جسم ثمن کے عوض طلب کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم اسے اٹھا لو کیونکہ اس کا مردہ بدن بھی ناپاک ہے اور اس کی دیت بھی ناپاک ہے'' خذوہ فانہ خبیث الجیفۃ خبیث الدیۃ پس یہی اس ارشاد باری تعالیٰ کے

نزول کا سبب ہے: یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الشَّہۡرِ الۡحَرَامِ الآیہ۔

ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ عمرو بن حضرمی کا قتل رجب کے آخری دن میں ہوا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور طبری نے سدی وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ وہ جمادی الثانی کے آخری دن قتل ہوا، لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے، اس بنا پر کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ وہ رجب کی پہلی رات میں ہوا اور مسلمان اسے جمادی الثانی میں سے گمان کرتے تھے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے کہ صاحب بن عباد نے اپنے رسالہ المعروفہ بالاسدیہ میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو اس وقت امیر المومنین کا نام دیا گیا اس لئے کہ انہیں مومنین کی ایک جماعت پر امیر مقرر کیا گیا تھا۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا اس آیت کے نسخ کے بارے اختلاف ہے، پس جمہور اس کے نسخ کے قائل ہیں اور یہ کہ اشہر حرام میں مشرکین کے ساتھ قتال کرنا مباح ہے۔ البتہ اس کے ناسخ کے بارے میں ان کا اختلاف ہے۔ زہری نے کہا ہے: اسے ارشاد باری تعالیٰ وَقَاتِلُوا الۡمُشۡرِکِیۡنَ کَآفَّۃً (التوبہ: ۳۶) (اور جنگ کرو تمام مشرکوں سے) نے منسوخ کر دیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شہر حرام میں بنی ثقیف کے ساتھ جنگ کرنے نے منسوخ کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو عامر کو شہر حرام میں اوطاس کی طرف جنگ کے لئے بھیجا تھا (لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عمل اس حکم کے لئے ناسخ ہے۔)

اور ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذوالقعدہ کے مہینہ میں جنگ پر بیعت رضوان لینے نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جب مکہ مکرمہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیئے جانے کی خبر پہنچی اور یہ کہ وہ (اہل مکہ) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں سے ان کے دفاع پر بیعت لی (کہ وہ ان کا مقابلہ پوری جرأت کے ساتھ کریں گے۔) نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بیعت ان سے جنگ کی ابتدا کرنے کے لئے لی۔

اور امام بیہقی نے عروہ بن زبیر سے محمد بن اسحاق کی حدیث کے علاوہ حضرمی کے قصہ میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الشَّہۡرِ الۡحَرَامِ قِتَالٍ فِیۡہِ الآیہ۔ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتاب میں یہ بیان کیا ہے کہ شہر حرام میں قتال اسی طرح حرام ہے جیسے پہلے تھا اور جس سبب سے مومنین اسے حلال سمجھتے ہیں تو وہ اس (قتال) سے بڑا جرم ہے۔ وہ یہ کہ (کفار) انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے جائیں، وہ انہیں بیڑیاں پہنا دیتے ہیں، انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے اور ستاتے ہیں اور انہیں محبوس کر لیتے ہیں۔ وہ خود اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور مسلمانوں کو حج و عمرہ اور نماز کے لئے مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں اور وہ مسجد حرام کے باسیوں کو باہر نکالتے ہیں حالانکہ اس کے مکین مسلمان ہیں اور دین کے بارے میں انہیں طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا رکھتے ہیں اور ہم تک یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن حضرمی کے قتل کی دیت ادا فرمائی اور شہر حرام کو اسی طرح حرام قرار دیا جس طرح وہ انہیں حرام قرار دیتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖۤ (التوبہ: 1) (یہ قطع تعلق (کا اعلان) ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے) (1)

1۔ دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد 3، صفحہ 17-18

حضرت عطا کہتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے اور اشہر حرام میں قتال جائز نہ ہوگا اور اسی پر حلف اٹھایا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کے بعد وارد ہونے والی آیات زمانہ کے اعتبار سے عام ہیں اور یہ خاص ہے اور بالاتفاق عام خاص کے لئے ناسخ نہیں ہو سکتا۔

اور ابوالزبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہر حرام میں جنگ نہ کرتے تھے مگر یہ کہ آپ کے ساتھ جنگ کی جاتی۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: قِتَالٍ فِيْهِ۔ اس میں قِتَالٍ سیبویہ کے نزدیک بدل اشتمال ہے، کیونکہ سوال مہینے اور قتال دونوں پر مشتمل ہے۔ یعنی کفار مہینے کی حرمت کو توڑنے پر تعجب کرتے ہوئے آپ سے سوال کر رہے ہیں۔ پس ان کا سوال شہر (مہینے) کے متعلق ہوا، صرف اس لئے کہ اس میں قتال پایا گیا۔

زجاج نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام میں جنگ کے بارے سوال کرتے ہیں۔

اور قتبی نے کہا: وہ آپ سے شہر حرام میں جنگ کرنے کے بارے پوچھتے ہیں: کیا یہ جائز ہے؟ پس اسی وجہ سے انہوں نے قتال کو شہر سے بدل قرار دیا ہے اور سیبویہ نے ایک شعر بھی بیان کیا ہے:

فما كان قيسٌ هُلْكُه هُلْكَ وَاحِدٍ و لكنه بُنيانُ قومٍ تهدَّما

قیس کا ہلاک ہو جانا ایک آدمی کا ہلاک ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا ہلاک ہونا تو پوری قوم کے محل کے گر جانے کے مترادف ہے۔ (تو اس میں هُلْكُه قیس سے بدل ہے۔)

عکرمہ نے اس طرح قراءت کی ہے: يَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قَتْلٍ فِيْهِ قُلْ قَتْلٌ یعنی دونوں مقامات پر (قتال کو) بغیر الف کے پڑھا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام کے بارے میں اور اس میں جنگ کرنے کے بارے میں سوال کرتے ہیں (یعنی يسألونك عن الشهر الحرام و عن قتال فيه) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح قراءت کی ہے۔ پس اس صورت میں قتال، عن، مکررہ کی وجہ سے مجرور ہوگا۔ کسائی نے یہی کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ قتال مجرور ہے کیونکہ اس سے پہلے عن۔ نیۃً موجود ہے۔ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ قتال جوار کی بنا پر مجرور ہے۔ (یعنی چونکہ یہ مجرور کے پڑوس میں ہے جو کہ الشهر الحرام ہے، اس لئے اس کا اعراب اسے بھی دے دیا گیا ہے۔)

نحاس نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ کتاب اللہ میں کسی لفظ کو حق جوار کی بنا پر کوئی اعراب دے دیا جائے اور نہ ہی کسی اور کلام میں ایسا کرنا جائز ہے۔ کیونکہ محض جوار کا اعتبار غلط ہے اور جہاں کہیں ایسا ہوا ہے وہ شاذ ہے۔ جیسا کہ عربوں کا یہ قول ہے: هذا جُحْرُ ضَبٍّ خَرِبٍ اور اس کے غلط ہونے پر دلیل تثنیہ میں عربوں کا یہ قول ہے: هذان جحرا ضب خربان بلاشبہ یہ اِقواء (شعر کے قافیہ کو مختلف کرنا یعنی کسی کو رفع دینا اور کسی کو جر دینا) کے قائم مقام ہے۔ لہٰذا یہ جائز نہیں ہوگا کہ کتاب اللہ میں سے کسی شے کو اس پر محمول کیا جائے اور افصح اور اصح لغات کے سوا اس طرح نہیں ہو سکتا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اور ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ یہ حق جوار کی بنا پر مجرور ہے، ان کا یہ قول خطا ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ عن کو مضمر کرنا جائز نہیں ہے اور اس بارے میں یہ قول کرنا کہ یہ بدل ہے (بھی جائز نہیں)

اعرج نے قتال کو مرفوع پڑھا ہے یعنی یسألونك عن الشهر الحرام قتالٌ فيه

نحاس نے کہا ہے: یہ عربی میں ابہام اور پیچیدگی ہے اور اس میں معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام کے بارے سوال کر رہے ہیں، کیا اس میں قتال جائز ہے؟ اور ارشاد باری تعالیٰ يَسْـَٔلُوْنَكَ استفہام پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ امرؤالقیس نے کہا ہے:

أصاحِ ترى بَرْقًا أُرِيكَ وَ مِيضَه كلَمْعِ اليدَيْن فى حَبِىٍّ مُكَلَّل

اے میرے ساتھی! کیا تو اس بجلی کو دیکھ رہا ہے جس کی چمک تجھے دکھائی گئی اونچے بادلوں کی چمک میں دونوں ہاتھوں کی چمک (حرکت) کی طرح۔

تو اس میں ترىٰ سے پہلے الف استفہام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ أصاحِ کا الف اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اگرچہ وہ حرف ندا ہے۔ اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا ہے:

تَرُوحُ من الحيّ ام تَبْتَكِر

کیا تو قبیلے سے شام کے وقت جائے گا یا صبح کے وقت۔

تو اس میں بھی اصل عبارت أتروح ہے، ہمزہ استفہام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ ام اس پر دلالت کر رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ۔ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ یعنی اس میں قتال کرنا انتہائی ناپسندیدہ اور گناہ کا عمل ہے۔ کیونکہ شہر حرام میں قتال کو حرام قرار دینا اس وقت ثابت ہے جبکہ ابتدا مسلمانوں کی طرف سے ہو۔ آیت میں لفظ الشَّهْرِ اسم جنس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کے لئے شہر حرام کو قوام بنا دیا تھا، وہ اس دوران اعتدال برتتے تھے، وہ خون نہیں بہاتے تھے اور نہ ہی اشہر حرام میں غارتگری کرتے تھے۔ اشہر حرام سے مراد رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم ہیں۔ ان میں تین مسلسل اور لگاتار ہیں اور ایک منفرد ہے۔ اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ المائدہ میں آئے گی۔

مسئلہ نمبر 5۔ قول باری تعالیٰ: وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مبتدا ہے اور وَ كُفْرٌۢ بِهٖ، صَدٌّ پر معطوف ہے۔ اور وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا سبیل اللہ پر عطف کیا گیا ہے۔ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ بھی صَدٌّ پر معطوف ہے۔ اور مبتدا کی خبر اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ہے۔ یعنی مذکورہ اعمال کرنا شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی بڑھ کر گناہ ہیں۔ یہ قول مبرد وغیرہ نے کیا ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ اس میں لوگوں کو طویل عرصہ تک کعبہ معظمہ کا طواف کرنے سے روکنا ہے۔ اور وَ كُفْرٌۢ بِهٖ میں ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہو سکتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد ہے بالحج والمسجد الحرام۔ یعنی حج اور مسجد حرام میں کفر کا ارتکاب کرنا۔ اور وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ یعنی وہاں سے باسیوں کو نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی بڑا جرم اور گناہ ہے (اور اس کی سزا زیادہ ہے۔)

فراء نے کہا ہے: صَدٌّ کا عطف كَبِيْرٌ پر کیا گیا ہے اور وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا عطف بِهٖ کی ہا ضمیر پر کیا گیا ہے۔ پس یہ کلام عطف نسق اور متصل ہے منقطع نہیں ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ غلطی ہے کیونکہ معنی جاری رہتا ہے یہاں تک کہ او کفر بہ۔ ای باللہ کا عطف کبیر پر کر دیا جائے۔ اور اس سے یہ معنی ظاہر ہوگا کہ اہل مسجد کو مسجد سے نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کفر سے بھی بڑا جرم ہے۔ اور اس معنی کا فاسد ہونا بالکل ظاہر اور بین ہے۔

جمہور کے قول کے مطابق آیت کا معنی یہ ہے: اے کفار قریش! بلاشبہ تم ہمارے بارے میں شہر حرام میں جنگ کرنے کو بہت بڑا جرم سمجھ رہے ہو، حالانکہ جو کچھ تم کر رہے ہو یعنی جو کوئی اسلام قبول کرنے کا ارادہ کرے اسے اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنا، تمہارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور تمہارا اہل مسجد کو مسجد سے نکالنا، جیسا کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب علیہم الرضوان کے ساتھ کیا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے زیادہ اور بڑا جرم ہے (1)۔

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

تَعُدُّون قتلاً فی الحرام عظیمۃً واعظمُ منه لویَرَی الرُّشدَ راشِدُ

تم ماہ حرام میں قتل کو بڑا گناہ شمار کر رہے ہو حالانکہ اگر کوئی ہدایت یافتہ راہ ہدایت کو دیکھے تو اس سے بھی بڑے گناہ یہ ہیں:

صُدُودُکُم عما یقول محمدٌ وَ کُفرٌ به واللهُ رائٍ و شاهدُ

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات سے تمہاری مخالفت اور آپ سے کفر، اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور اس کا گواہ ہے۔

واخراجکم من مسجد الله اهله لئلا یُرَی لله فی البیت ساجد

اور تمہارا اللہ کی مسجد سے اس میں بسنے والوں کو نکال دینا تاکہ بیت اللہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی سجدہ کرنے والا نظر نہ آئے۔

فانا وان عَیّر تمونا بقتله وأرجفَ بالاِسلام باغ و حاسدُ

اگرچہ تم نے ہمیں قتل کی عار دلائی اور سرکش اور حسد کرنے والوں نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا۔

سَقَینَا من ابنِ الحَضرَمی رماحنا بِنَخلَۃَ لما أوقد الحربَ واقدُ

لیکن ہم نے وادیٔ نخلہ میں ابن حضرمی کے خون سے اپنے نیزوں کو سیراب کیا جب واقد نے جنگ کی آگ بھڑکائی

دَمًا وابنُ عبدالله عثمان بیننا یُنازعه غُلٌّ من القِدِ عانِدُ

عثمان بن عبداللہ ہمارے پاس ہے، تسمے کے خون آلود طوق نے اسے جکڑ رکھا ہے۔

زہری اور مجاہد وغیرہما نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ كَبِیْرٌ منسوخ ہے اور اس کا ناسخ یہ ارشاد ہیں وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً اور فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ (توبہ:5)۔

حضرت عطا نے کہا ہے: یہ منسوخ نہیں ہے اور اشہر حرام میں قتال نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔ مجاہد وغیرہ نے کہا ہے کہ یہاں فتنہ سے مراد کفر ہے۔ یعنی تمہارا کفر کرنا ہمارے انہیں قتل کرنے سے بڑا جرم ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 290

جمہور نے کہا ہے: یہاں فتنہ سے مراد ان (کفار) کا مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں فتنہ اور آزمائش میں مبتلا کرنا ہے یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گئے، یعنی تمہارا یہ رویہ اختیار کرنا اشہر حرام میں تمہیں قتل کرنے سے زیادہ شدید اور سخت جرم ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَزَالُوْنَ۔ یہ ابتداءً اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہے، اور اس کے ذریعہ مؤمنین کو کافروں کے شر سے ڈرانا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے: مراد کفار قریش ہیں اور یَرُدُّوْكُمْ حتیٰ کے سبب منصوب ہے، کیونکہ یہ خالصۃً غایت ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ اور جو کوئی اسلام سے کفر کی جانب لوٹ جائے۔ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ تو ان کے عمل باطل ہو گئے اور فاسد ہو گئے۔ اسی سے الحبَطَ بھی ہے۔ مراد وہ بیماری ہے جو جانوروں کے پیٹوں میں بہت زیادہ گھاس اور چارہ وغیرہ کھا جانے سے لگ جاتی ہے۔ اس کے سبب ان کے پیٹ پھول جاتے ہیں اور بسا اوقات اسی سبب سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ آیت مسلمانوں کے لئے بطور تہدید ہے تا کہ وہ دین اسلام پر ثابت قدم رہیں۔

مسئلہ نمبر 9۔ علماء کے مابین مرتد کے بارے یہ اختلاف ہے کہ کیا اسے توبہ کی ترغیب دی جائے گی یا نہیں؟ کیا نفس ردت کے ساتھ ہی اس کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ مگر یہ کہ اس کی موت کفر پر واقع ہو؟ کیا اسے وارث بنایا جائے گا یا نہیں؟ یہ تین مسائل ہیں۔

(ا) ایک گروہ نے کہا ہے: اسے توبہ کی ترغیب دی جائے گی، پس اگر وہ توبہ کر لے تو فبہا، ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ان میں سے بعض نے کہا ہے: ایک ساعت ترغیب دی جائے گی اور دوسروں نے کہا ہے: ایک مہینہ تک اسے توبہ کی رغبت دلائی جائے گی اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اسے تین (بار) توبہ کے لئے کہا جائے گا۔ اسی طرح حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ یہی قول حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا ہے جسے آپ سے ابن قاسم نے روایت کیا ہے۔

حسن نے کہا ہے: اسے سو بار توبہ کی ترغیب دلائی جائے گی اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ اسے توبہ کی رغبت دلائے بغیر ہی قتل کر دیا جائے گا۔ امام شافعی نے بھی اپنے ایک قول میں یہی کہا ہے اور یہی طاؤس اور عبید بن عمیر کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔

سحنون نے ذکر کیا ہے کہ عبدالعزیز بن ابی سلمہ ماجشون کہا کرتے تھے: مرتد کو قتل کیا جائے گا اور اسے توبہ کی ترغیب نہیں دی جائے گی اور انہوں نے حضرت معاذ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اس میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو ان کے پیچھے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ جب وہ ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: تشریف رکھیے اور ان کے لئے تکیہ وغیرہ رکھا۔ تو اس وقت ان کے پاس ایک آدمی تھا جسے بیڑیاں پہنائی گئی تھیں، تو آپ نے پوچھا: یہ کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ یہودی تھا، اس نے اسلام قبول کیا، اس نے پھر اپنے دین کو برے دین کی طرف لوٹا دیا ہے اور یہ یہودی ہو گیا ہے، تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نہیں بیٹھوں گا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا جائے، یہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ تو حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 290۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 659

بیٹھ جایئے۔ انہوں نے کہا: (ہاں) میں نہیں بیٹھوں گا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا جائے، یہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ تین بار آپ نے یہی کہا۔ چنانچہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے حکم دیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ یہ روایت امام مسلم وغیرہ نے بیان کی ہے۔(1)

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ مرتد پر اسلام پیش کیا جائے گا، اگر وہ اسلام قبول کر لے تو فبہا، ورنہ اسی جگہ اسے قتل کر دیا جائے گا مگر اس صورت میں کہ وہ مہلت کا مطالبہ کرے۔ پس اگر اس نے مہلت کا مطالبہ کیا، تو اسے تین دن کی مہلت دی جائے گی، لیکن آپ سے اور آپ کے اصحاب سے مشہور قول یہ ہے کہ مرتد کو قتل نہ کیا جائے گا یہاں تک کہ اسے توبہ کی ترغیب دی جائے، ان کے نزدیک زندیق اور مرتد برابر ہیں۔ اور امام مالک نے کہا ہے کہ زنادقہ کو قتل کیا جائے گا اور انہیں توبہ کی ترغیب نہیں دی جائے گی۔ یہ پہلے سورۃ البقرہ (ج:۱ص:۱۹۸) میں گزر چکا ہے۔

جو کوئی کفر کی ایک نوع سے نکل کر کفر کی ہی دوسری نوع میں داخل ہوا، تو اس کے بارے علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور فقہاء نے کہا ہے: اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، کیونکہ اس طرح وہ اسی کفر کی طرف ہی منتقل ہوا ہے جس پر وہ ابتدا میں تھا، لہٰذا اسے اسی پر برقرار رکھا جائے گا۔ ابن عبدالحکم نے حضرت امام شافعی سے بیان کیا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من بدّل دینه فاقتلوه جو کوئی اپنا دین بدل دے تم اسے قتل کر دو(2)۔ اور آپ نے کسی مسلمان کو کافر سے خاص نہیں کیا۔

امام مالک نے فرمایا ہے: حدیث کا معنی یہ ہے جو کوئی اسلام سے نکل کر کفر کی طرف جائے اور رہا وہ جو کفر سے کفر کی طرف نکلا تو وہ اس حدیث سے مراد نہیں۔ یہی فقہاء کی ایک جماعت کا قول ہے۔

امام شافعی سے مشہور قول وہ ہے جو مزنی اور ربیع نے ذکر کیا ہے کہ اہل ذمہ میں سے اپنا دین بدلنے والے کو امام وقت دار الحرب بھیج دے گا اور اسے اپنے شہر (ملک) سے نکال دے گا اور حربیوں کے اموال کے ساتھ اس کا مال بھی حلال ہو جائے گا اور دار الحرب پر غلبہ پالیا گیا۔ کیونکہ امام وقت نے اسے اس دین کی بنا پر ذمی بنایا تھا جس پر وہ عقد ذمہ کے وقت تھا۔

مرتدہ عورت کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے:

امام مالک، امام اوزاعی، امام شافعی اور لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: مرتد ہونے والی عورت کو قتل کر دیا جائے گا جیسا کہ مرتد آدمی کو قتل کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں برابر ہیں۔ اور ان کی دلیل ظاہر حدیث ہے من بدّل دینه فاقتلوہ اور اس میں لفظ مَن مذکر و مونث دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے۔

امام ثوری، امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ مرتدہ عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی ابن شبرمہ کا قول ہے، اسی کو ابن علیہ نے اختیار کیا ہے اور یہی حضرت عطا اور حسن کا قول ہے اور انہوں نے استدلال اس سے کیا ہے کہ

1۔ بخاری شریف، باب حکم المرتد والمرتدۃ الخ، حدیث نمبر 6412، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، باب لا یعذب بعذاب اللہ، حدیث نمبر 2794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من بدّل دینہ فاقتلوہ۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مرتدہ عورت کو قتل نہیں کیا اور جو حدیث روایت کرتا ہے وہ اس کی تاویل اور مفہوم بہتر جانتا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اور پہلے فریق نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا ہے: ''کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے ایک کے ساتھ (یعنی) ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا...... الحدیث۔'' پس یہ حکم ہر اس آدمی کو شامل ہوگا جس نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا (چاہے وہ مرد ہو یا عورت) اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ امام شافعی نے کہا ہے: بے شک وہ آدمی جو مرتد ہوا (نعوذ باللہ) پھر اسلام کی طرف واپس آگیا تو نہ اس کے اعمال ضائع ہوں گے اور نہ ہی اس کا وہ حج ضائع ہوگا جس سے وہ فارغ ہو چکا۔ بلکہ اگر وہ حالت ردت پر ہی فوت ہو گیا تب اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

امام مالک نے فرمایا ہے: مرتد ہوتے ہی اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے، اختلاف کا اظہار مسلمان میں ہوگا کہ جب وہ حج کرے، پھر مرتد ہو جائے اور پھر اسلام قبول کرلے۔ پس امام مالک نے فرمایا کہ اس پر حج کرنا لازم ہوگا، کیونکہ اس کا پہلا حج ردت کے سبب ضائع ہو چکا ہے۔ اور امام شافعی نے فرمایا: اس پر حج کا اعادہ لازم نہیں ہوگا، کیونکہ ابھی اس کے عمل باقی ہیں۔

ہمارے علماء نے اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر: 65) (کہ اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو آپ کے اعمال ضائع ہو جائیں گے)

انہوں نے کہا: یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شرعاً ردت کا پایا جانا محال ہے۔

اور امام شافعی کے اصحاب نے کہا ہے: بلکہ امت پر بطریق تغلیظ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے شرف مرتبہ کے باوجود اگر شرک کا ارتکاب کریں تو ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے، تو پھر تمہارا کیا حال ہوگا؟ لیکن آپ اپنے مرتبہ کے فضل و شرف کے سبب شرک نہیں کریں گے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (الاحزاب: ۳۰) (اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی تو اس کے لئے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا۔) اور یہ ان کے شرف مرتبہ کے سبب ہے۔ ورنہ ان سے اس قسم کے فعل کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ان کے زوج مکرم و معظم کی حفاظت و صیانت کی خاطر، یہ ابن عربی نے کہا ہے۔ (1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے یہاں اس کی دونوں شرطوں کو پورا کرنے کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس پر خلود فی النار کی جزا کو معلق کیا ہے۔ پس جو کوئی کفر پر قائم رہا اللہ تعالیٰ اس آیت کے مطابق اسے ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دے گا اور

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 147

جس کسی نے شرک کا ارتکاب کیا دوسری آیت کے مطابق اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ پس یہ دونوں آیتیں دو معنوں اور دو مختلف حکموں کے لئے مفید ہیں اور جو خطاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا گیا ہے تو وہی آپ کی امت کے لئے ہے تا کہ آپ کا اختصاص ثابت ہو جائے اور جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات کے بارے وارد ہے، تو بلا شبہ ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے تا کہ وہ یہ واضح کر دے کہ اگر ایسا تصور بھی کیا جائے تو یقیناً اس میں دو بے عزتیاں ہیں۔ اس میں ایک حرمت دین کی ہتک ہے اور دوسری حرمت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتک ہے اور ہر حرمت کی ہتک پر عقاب اور سزا ہے۔ اور یہ اس کے قائم مقام ہو جائے گا جس نے شہر حرام میں، یا بلد حرام میں، یا مسجد حرام میں گناہ اور نافرمانی کا ارتکاب کیا اور جتنی حرمتوں کو اس نے پامال کیا ان کی تعداد کے مطابق اس پر عذاب دو چند کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 11۔ مرتد کی میراث میں علماء کا اختلاف ہے:

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حسن، شعبی، حکم، لیث، ابو حنیفہ اور اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: مرتد کی میراث اس کے مسلمان ورثاء کے لئے ہے۔

امام مالک، ربیعہ، ابن ابی لیلیٰ، شافعی اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اس کی میراث بیت المال میں جائے گی۔ ابن شبرمہ، ابو یوسف، محمد اور اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے دو روایتوں میں سے ایک میں کہا ہے کہ مرتد نے ردت کے بعد جو کچھ کمایا وہ اس کے مسلمان ورثاء کے لئے ہوگا۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مرتد نے حالت ردت میں جو کچھ کمایا وہ مال فے ہے، اور حالت اسلام میں جو کچھ اس نے کمایا پھر مرتد ہو گیا تو اس کے وارث اس کے مسلمان ورثاء ہوں گے۔

لیکن ابن شبرمہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم دونوں امروں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطلق ارشاد گرامی لا وراثۃ بین اھل ملتین (دو دین رکھنے والوں کے درمیان کوئی وراثت نہیں) ان کے قول کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ سوائے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ اس کے کافر ورثاء اس کے وارث نہیں بنیں گے۔ لیکن آپ نے کہا ہے کہ وہ اس کے وارث بن سکتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 12۔ ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا الآیہ۔ جندب بن عبد اللہ اور عروہ بن زبیر وغیرہما نے کہا ہے کہ جب واقد بن عبد اللہ تمیمی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن حضرمی کو شہر حرام میں قتل کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مال کا خمس لینے سے توقف فرمایا جو آپ کے لئے مال اور دو قیدیوں کی صورت میں حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو عطا کیا گیا تھا، تو مسلمانوں نے حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں سخت رویہ اختیار کیا یہاں تک کہ وہ ان پر شاق گزرنے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے شہر حرام میں اس آیت کے ساتھ ان کی تلافی فرمائی اور ان سے غم اور پریشانی کو دور فرما دیا۔ اور یہ خبر دی کہ ان کے لئے ہجرت کرنے والے اور جہاد کرنے والے کا ثواب ہے۔ انہی کی طرف اس قول میں اشارہ فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا پھر یہ آیت ہر اس کے حق میں باقی رہی جس نے وہ عمل کیا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگرچہ انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب تو نہیں کیا لیکن ان کے لئے کوئی اجر بھی نہیں ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل

فرمائی: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا الی آخر الآیہ۔

اور ہجرت کا معنی ہے الانتقال من موضع الی موضع ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہونا اور دوسری جگہ کے لئے ایثار کرتے ہوئے پہلی کو ترک کرنے کا قصد کرنا۔ ہجر وصل کی ضد ہے۔ (کہا جاتا ہے) هَجره هَجْرا و هِجرانا (فلاں نے اسے چھوڑ دیا) اور اس کا اسم الهِجرة ہے۔ اور المهاجرة من ارض الی ارض کا معنی ہے دوسری جگہ کے لئے پہلی کو چھوڑ دینا، ترک کر دینا۔ اور التهاجُر کا معنی التقاطع (باہمی مقاطعہ کرنا، تعلق توڑ دینا) ہے۔

اور جس نے المهاجرة کی تعریف یہ کی ہے الانتقال من البادیة الی الحاضرة یعنی دیہات سے شہر کی طرف منتقل ہونا، تو اس نے اس سبب سے یہ وہم دلایا ہے کیوں کہ عرب میں اغلباً ایسا ہی ہوا ہے اور اس قول کے مطابق اہل مکہ مہاجرین نہیں ہیں۔

اور رہا جاهد تو یہ جَهْد سے باب مفاعلہ ہے، جب کوئی پوری کوشش اور محنت صرف کر دے (اس کا مصدر) مجاهدة و جهادا ہے۔ اور اجتہاد اور تجاہد کا معنی ہے بذل الوسع والمجهود پوری طاقت، صلاحیت اور محنت کو صرف کر دینا۔ اور الجَهاد بالفتح کا معنی ہے: سخت اور مضبوط زمین۔ اور یَرْجُوْنَ کا معنی ہے وہ طمع اور حرص رکھتے ہیں اور حصول قرب کے متمنی ہیں۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے یَرْجُوْنَ کا کلمہ ان کی مدح اور تعریف میں بیان فرمایا ہے کیونکہ اس دنیا میں کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ جنت کی طرف جائے گا اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں آخری حد کو پہنچا ہوا ہو، اس کے دو سبب ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کا خاتمہ کون سے عمل پر ہوگا اور دوسرا یہ ہے: تاکہ وہ اپنے عمل پر توکل اور بھروسہ نہ کرلے۔

اور رجا (امید) عام ہوتی ہے اور رجا کے ساتھ ہمیشہ خوف بھی ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری ہے، جیسا کہ خوف کے ساتھ رجا (امید) ہوتی ہے۔ گویا رجا ایک طویل اور وافر امید کا نام ہے۔ کہا جاتا ہے: رجوت فلانا رجْوا و رجاء و رجاوة (میں فلاں سے امید باندھے ہوئے ہوں) کہا جاتا ہے: ما أتیتك الا رَجَاوَةَ الخیر (میں تیرے پاس فقط خیر اور بھلائی کی امید لے کر آیا) اور ترجّیته وارتجیته اور رجّیته یہ سب رجوتُه کے معنی میں ہیں۔ بشر نے اپنی بیٹی کو مخاطب ہو کر کہا ہے:

فَرَجّی الخیرَ وانتظری اِیابی   اِذا ما القارِظُ العَنَزِیُّ آبا

اس میں ترجی امید کے معنی میں ہی مذکور ہے، یعنی تو خیر اور بھلائی کی امید رکھ اور میرے لوٹنے کا انتظار کر۔

و مالی فی فلان رجیّة۔ ای ما ارجو، یعنی میں فلاں کے بارے میں کوئی امید نہیں رکھتا۔ اور کبھی الرجو اور الرجاء خوف کے معنی میں ہوتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ (سورۃ نوح) یعنی کیا ہے تمہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کے بارے میں ڈرتے نہیں۔

ابو ذویب نے کہا ہے:

اِذا لسعته النحلُ لم یَرْجُ لَسْعَها   و خالفَهَا فی بَیت نُوبٍ عوامِلِ

اس میں لم یرجُ خوف اور ڈر کے معنی میں مذکور ہے۔

یعنی جب شہد کی مکھی نے اسے ڈسا تو اسے اس کے ڈسنے کا کوئی خوف اور پرواہ نہ ہوئی۔

اور الرجا الف مقصورہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے کنوئیں کی طرف اور اس کے دونوں کنارے اور ہر طرف اور کنارہ رَجا کہلاتا ہے(1)۔ لوگوں میں سے عوام اس قول میں خطا کر جاتے ہیں: یا عظیم الرجاء، کہ وہ اسے الف مقصورہ کے ساتھ پڑھتے ہیں نہ کہ الف ممدودہ کے ساتھ۔ (یعنی اسے مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔)

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ ؕ قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ٘ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَۙ۝۲۱۹

''وہ پوچھتے ہیں آپ سے شراب اور جوئے کی بابت۔ آپ فرمائیے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لئے اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔ اور پوچھتے ہیں آپ سے: کیا خرچ کریں؟ فرمائیے: جو ضرورت سے زیادہ ہو، اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے حکموں کو تاکہ تم غور و فکر کرو۔''

ارشاد باری تعالیٰ: **یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ ؕ قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ٘ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا** میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ یَسْـَٔلُوْنَكَ اس میں سوال کرنے والے مومنین ہیں۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور الخمر خَمَرَ سے ماخوذ ہے جبکہ وہ ڈھانپ لے، چھپالے۔ اور اسی سے خمار المرأۃ عورت کی اوڑھنی اور دوپٹہ ہے۔ اور ہر وہ شے جو کسی شے کو ڈھانپ لے تو کہا جاتا ہے: فقد خَمَرَہ اور اسی سے خَمِّرُوا آنیتکم ہے(2) (تم اپنے برتن ڈھانپ لو) اور خمر (شراب) عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور ماؤف کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے گھنے درخت کو الخَمَر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے نیچے والی شے کو ڈھانپ لیتا ہے اور اسے چھپالیتا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: اخمرتِ الأرضُ کَثُرَ خَمَرُھا (زمین نے ڈھانپ لیا اس کے درخت زیادہ ہو گئے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أَلَا یَا زَیْدُ والضحاکَ سِیرَا　　فقد جاوزتما خَمَرَ الطَّرِیقِ

خبردار! اے زید اور ضحاک! دونوں چلو (خوب تیز چلو) تحقیق تم راستے کے درختوں سے گزر چکے ہو۔

یعنی تم ہمت اور جرأت کے ساتھ چلو، تحقیق تم نے اس نشیبی زمین کو عبور کر لیا ہے جہاں بھیڑیے وغیرہ چھپے رہتے ہیں۔ عجاج ایک لشکر کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے جو جھنڈوں اور لشکروں کے ساتھ بغیر کسی کمزوری کے چل رہا ہے:

فی لامع العِقبان لایمشی الخَمَر　　یُوجِه الارضَ ویستاقُ الشجر

اسی سے ان کا یہ قول بھی ہے: دخل فی غُمار الناس و خُمارھم وہ لوگوں کی جماعت اور ان کی بھیڑ میں داخل ہوا۔ یعنی وہ خوفناک جگہ میں داخل ہو گیا۔ چونکہ شراب (خمر) عقل کو چھپالیتی ہے اور اسے ڈھانپ لیتی ہے اس وجہ سے اسے خمر کا نام دیا جاتا

1۔ الصحاح مادہ ''رجا''　　2۔ بخاری شریف، باب غمس من الدواب الخ، حدیث نمبر 3069، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خمر کو خمر کا نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اسے چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ اس نے پالیا جیسا کہ کہا جاتا ہے: اختمر العجین یعنی وہ اپنے ادراک کو پہنچ گیا۔ و خُمِر الرأی، یعنی رائے چھوڑ دی گئی یہاں تک کہ اس میں وجہ ظاہر ہوگئی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ خمر کو خمر اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ عقل کو خلط ملط کر دیتی ہے۔ یہ المخامرہ سے ہے اس کا معنی ہے المخالطۃ (باہم خلط ملط ہو جانا) اسی سے ان کا یہ قول ہے: دخلتُ فی خُمارِ الناس یعنی میں لوگوں کے ساتھ مل جل گیا۔ نتیجتاً تینوں معانی بالکل قریب قریب ہیں۔ پس خمر کو پہلے چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ اس نے (نشہ کو) پالیا، پھر اس نے عقل کو خلط ملط کر دیا، پھر اسے ڈھانپ دیا تو گویا اس میں اصل معنی الستر (ڈھانپنا) ہوا۔

اور الخمر: یہ انگور کا وہ پانی ہے جو ابل جائے یا اسے پکایا جائے اور اس کے علاوہ جو شے بھی عقل کو ماؤف کر دے گی تو وہ اسی کے حکم میں ہوگی، کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ہر قسم کا جوا حرام ہے۔ اور بلا شبہ ان میں سے ذکر صرف میسہ کا کیا گیا ہے۔ تو حکماً تمام اقسام کو میسہ پر ہی قیاس کیا گیا ہے۔ حالانکہ میسہ صرف وہ جوا ہوتا ہے جو جزر (ذبح شدہ ارٹ) میں ہو۔ تو اسی طرح ہر وہ شے جو خمر کی طرح ہوگی تو وہ اسی کے قائم مقام ہوگی (یعنی حکم تمام کا ایک ہوگا۔)

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور امت کا نظریہ یہ ہے کہ انگور کی شراب کے علاوہ ہر وہ مشروب جس کی کثیر مقدار نشہ میں مبتلا کر دے تو وہ حرام ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر ہو۔ اور اسے پینے کی صورت میں حد واجب ہوگی۔

امام اعظم ابوحنیفہ، ثوری، ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ رحمۃ اللہ علیہم اور فقہاء کوفہ کی ایک جماعت نے کہا ہے: انگور کی شراب کے علاوہ جس مشروب کی کثیر مقدار نشہ میں مبتلا کر دے تو وہ حلال ہے، لہٰذا اس کے سبب جو کوئی نشہ میں مبتلا ہو گیا جبکہ نشے کی حد تک پہنچنے کا اس نے قصد اور ارادہ نہ کیا تو اس پر حد شرب نہ ہوگی۔ یہ قول ضعیف ہے۔ عقل و خبر (نقل) اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ المائدۃ اور النحل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 3۔ بعض مفسرین نے کہا ہے: بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے عزت و کرامت اور بر و احسان میں سے کوئی شے نہیں چھوڑی مگر وہ اس امت کو عطا فرمائی ہے، اس کے احسان اور کرامت میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ان پر تمام احکام شرعیہ کو یکبارگی واجب نہیں کیا بلکہ ان پر تدریجاً اور یکے بعد دیگرے احکام نازل فرمائے، پس شراب کے حرام ہونے کا حکم بھی اسی طرح نازل ہوا۔ اور یہی پہلی آیت ہے جو شراب کے بارے میں سب سے پہلے نازل ہوئی، پھر اس کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں۔ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى (النساء: 42) (تم نماز کے قریب نہ جاؤ درآنحالیکہ تم نشہ میں ہو) پھر فرمایا اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (المائدہ) (یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعہ اور روک دے تمہیں یاد الٰہی سے اور نماز سے تو کیا تم باز آنے والے ہو؟) پھر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ (المائدہ: 90) (یہ شراب اور جوا اور بت اور جوئے کے تیر سب ناپاک ہیں شیطان کی کارستانیاں ہیں سو ان سے بچو)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَالْمَيْسِرِ اس سے مراد عرب کا جوا ہے جو تیروں کے ساتھ کھیلا جاتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی دوسرے آدمی سے اپنی بیوی اور مال کی شرط لگا دیتا تھا پھر جو کوئی جوئے میں اپنے ساتھی پر غالب آجاتا وہ اس کا مال اور اس کی بیوی لے جاتا تھا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرات مجاہد، محمد بن سیرین، حسن، ابن مسیب، عطا، قتادہ، معاویہ ابن صالح، طاؤس، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی بیان کیا ہے: ہر وہ کھیل جس میں قمار (جوا) ہو چاہے چوسر ہو یا شطرنج وغیرہ سو وہ جوا (میسر) ہی ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کا اخروٹ اور نرد کے مہروں کے ساتھ کھیلنا بھی۔ سوائے ان کے جن میں اس کو مباح قرار دیا گیا ہے مثلاً گھوڑ دوڑ میں مقابلہ اور حقوق کی تقسیم اور علیحدگی کے لئے قرعہ اندازی کرنا وغیرہ...... تفصیلی بیان آگے آئے گا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شطرنج عجم کا جوا ہے اور ہر وہ کھیل جس کے ساتھ شرط لگائی جائے وہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء کے نزدیک میسر (جوا) ہے (1)۔ اس کا بیان کچھ اضافے کے ساتھ سورۂ یونس میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

المیسر یَسَرَ سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے: کسی شے کا اپنے صاحب (جوا کھیلنے والے) کے لئے واجب اور لازم ہو جانا۔ کہا جاتا ہے: یَسَرَلی کذا جب کوئی شے کسی کے لئے واجب اور ثابت ہو جائے تب وہ یہ کہہ سکتا ہے یَسَرَلی کَذَا (میرے لئے اتنی شے ثابت ہوگئی) اس کا باب اس طرح چلتا ہے یَسَرَ یَیْسِرُ یَسْرًا و مَیْسِرًا۔ اور یاسر سے مراد تیروں کے ساتھ کھیلنے والا ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

فَأَعِنْهُمْ وَایْسِرْ بِمَا یَسَرُوا بِهِ	وَ إِذَا هُمْ نَزَلُوا بِضَنْكٍ فَانْزِلِ

اور ازہری نے کہا ہے کہ المیسر سے مراد وہ اونٹ ہیں جن پر وہ جوا میں شرط لگاتے تھے۔ ان کا نام میسر اس لئے رکھا گیا کیونکہ انہیں اجزاء کے اعتبار سے تقسیم کر دیا جاتا ہے، گویا کہ یہ محل تقسیم ہے اور ہر وہ شے جسے تو تقسیم کر دے (اس کے لئے تو کہہ سکتا ہے) یسرتہ۔ اور الیاسر کے معنی میں اصل یہی ہے۔ پھر تیروں کے ساتھ کھیلنے والوں اور اونٹوں پر شرط لگا کر جوا کھیلنے والوں کو یاسرون کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہی تقسیم کرنے والے ہیں جبکہ وہ اس تقسیم کا سبب ہیں اور الصحاح میں ہے: یَسَرَ القوم الجزور۔ یعنی قوم نے اونٹوں کو ذبح کیا اور ان کے اعضاء کو تقسیم کیا۔ سحیم بن وثیل یربوعی نے کہا ہے:

اقولُ لهم بالشِّعب اذ یَیْسِرُوننی	ألم تَیْأَسُوا أنی ابنُ فارِسِ زَهْدَمِ

میں نے انہیں گھاٹی میں جا کر کہا جبکہ وہ مجھے قیدی بنا کر لے جا رہے تھے کیا تم جانتے نہیں میں زہدم گھوڑے کے شہسوار کا بیٹا ہوں۔

اسے قیدی بنایا گیا تھا اور اسے تیر مارے گئے تھے اور جب کوئی قوم باہم شرط اور بازی لگانے لگ جائے تو کہا جاتا ہے یَسَرَ القوم اور رَجُلٌ یَسَرٌ وَ یَاسِرٌ دونوں کا ایک ہی معنی ہے (یعنی شرط اور بازی لگانے والا آدمی جواباز) اور اس کی جمع ایسار

1۔ ابن ابی حاتم فی تفسیر، جلد 2، صفحہ 390

ہے۔ جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

انی أُتمم أَیساری وامنحُھم　مثنی الأیادی واَکسُوْ الجفنۃَ الأُدمَا

اور طرفہ نے کہا ہے:

وھم أیسارُ لقمانَ إذا　أغلَتِ الشَّتْوَۃُ أبداءَ الجُزُرْ

جو اونٹوں کے ذبح کرنے کو مباح قرار دیتا وہ ان کے نزدیک قابل تعریف ہوتا تھا، شاعر نے کہا ہے:

وناجیۃٍ نحرتُ لقومِ صدقٍ　وما نادیتُ أیسارَ الجزورِ

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں داؤد بن حصین سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اہل جاہلیت کا جوا یہ تھا کہ وہ گوشت کی بیع ایک یا دو بکریوں کے عوض کرتے تھے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے جمہور اصحاب کے نزدیک اس کا اطلاق جنس واحد میں ہوتا ہے، (یعنی) ایک حیوان کی اس کے گوشت کے عوض بیع ہو اور یہ ان کے نزدیک بیع مزابنہ (☆)، غرر (☆☆) اور قمار کے باب سے ہے، کیونکہ یہ معلوم نہیں ہوتا کیا حیوان میں اس گوشت کے برابر گوشت ہے جو اس نے بدلے میں دیا ہے یا اس سے کم ہے یا اس سے زیادہ ہے اور گوشت کی بیع گوشت کے عوض متفاضلاً جائز نہیں ہوتی (یعنی جب مقدار برابر نہ ہو تو بیع جائز نہیں ہوتی۔)

پس حیوان کی بیع گوشت کے عوض کرنا اس گوشت کی بیع کی طرح ہے جو اس کی جلد میں چھپا ہوا ہے۔ بشرطیکہ یہ دونوں ایک جنس سے ہوں اور آپ کے نزدیک جنس واحد اونٹ، گائیں، ریوڑ (بھیڑ بکریاں) ہرن، پہاڑی بکرے اور تمام وحشی جانور اور وہ تمام چار ٹانگوں والے جانور جن کا گوشت کھایا جاتا ہے وہ آپ کے نزدیک ایک جنس ہیں۔ لہٰذا ان تمام اصناف و اجناس میں سے کسی حیوان کی بیع اس کے گوشت میں سے کسی شے کے ساتھ کسی بھی وجہ سے جائز نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ آپ کے نزدیک بیع مزابنہ کے باب سے ہے، جیسا کہ کشمش کی بیع کرنا انگور کے ساتھ، زیتون کی بیع کرنا اس کے تیل کے ساتھ اور تلوں کے تیل کی بیع کرنا تلوں کے ساتھ اور اسی طرح کی دیگر مثالیں۔

اور آپ کے نزدیک تمام پرندے ایک جنس ہیں اور اسی طرح تمام مچھلیاں ایک ہی جنس سے ہیں اور آپ سے یہ مروی ہے کہ اکیلے ٹکڑی ایک صنف (قسم) ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب، حضرت لیث اور ابن سعد نے کہا ہے: گوشت کی بیع کرنا حیوان کے عوض کسی حال

☆ المزابنہ: بیع مزابنہ سے مراد درخت پر لگی ہوئی کچی کھجوروں کی پکی کھجوروں کے عوض اندازے سے بیع کرنا ہے۔ امام مالک کے نزدیک ہر وہ اندازہ جس کا کیل، عدد اور وزن معلوم نہ ہو اس کی بیع کی جائے کسی معینہ کیلی، وزنی اور عددی شے کے ساتھ یا ایک ہی جنس میں سے معلوم شے کی مجہول کے ساتھ بیع کرنا یا مجہول کی بیع مجہول کے عوض کرنا جبکہ جنس ایک ہو۔

☆☆ الغرر: مچھلی ابھی پانی میں ہو اور پرندہ ابھی ہوا میں ہو اس کی بیع کرنا بیع الغرر ہے۔ المختصر ہر وہ بیع جس میں مشتری کے لئے دھوکے کا احتمال ہو وہ اسی زمرہ میں داخل ہوگی۔

میں جائز نہیں ہے، چاہے وہ ایک جنس سے ہوں یا دو مختلف جنسوں سے۔ کیونکہ حدیث طیبہ عام ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں اونٹ ذبح کیے گئے اور انہیں دس اجزاء میں تقسیم کر دیا گیا تو ایک آدمی نے کہا: تم ان میں سے ایک جز ایک بکری کے عوض مجھے دے دو تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ اس کی صلاحیت نہیں رکھتا (یعنی یہ درست نہیں ہے)۔ امام شافعی نے فرمایا: میں نہیں جانتا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں صحابہ کرام کی رائے کے خلاف عمل کیا ہو۔

ابو عمر نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے گوشت کے عوض بکری کی بیع کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ روایت قوی نہیں ہے۔

عبدالرزاق نے ثوری عن یحییٰ بن سعید کی سند سے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے یہ ذکر کیا ہے کہ آپ اسے مکروہ سمجھتے تھے کہ کسی زندہ کی بیع مردہ کے عوض کی جائے، یعنی ذبح کی ہوئی بکری کی بیع زندہ کھڑی بکری کے عوض کی جائے۔

حضرت سفیان نے کہا ہے: ہم اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتے۔ مزنی نے کہا ہے: اگر گوشت کے عوض حیوان کی بیع کے بارے میں حدیث طیبہ صحیح نہیں ہے تو پھر قیاس یہ ہے کہ وہ جائز ہے اور اگر حدیث صحیح ہے تو پھر قیاس باطل ہے اور حدیث کی اتباع کی جائے گی۔

ابو عمر نے بیان کیا ہے کہ کوفیوں کے پاس اس بارے میں قیاس اور اعتبار کی جہت سے کثیر دلائل موجود ہیں کہ حیوان کے عوض گوشت کی بیع کرنا جائز ہے، مگر یہ کہ جب حدیث صحیح ہوگی تو قیاس و نظر باطل ہوگا۔

اور مالک نے زید بن اسلم سے اور انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گوشت کے عوض حیوان کی بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: اس حدیث کے بارے میں میں نہیں جانتا کہ اس کا اتصال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہو اور اس کی اسانید میں سے احسن حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کی مرسل ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مؤطا میں ذکر کیا ہے۔ اور یہی موقف حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور اصل یہ ہے کہ آپ مرسل روایات کو قبول ہی نہیں کرتے، مگر گمان یہ ہے کہ آپ نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی مراسیل کو تلاش کیا اور انہیں پالیا یا ان میں سے اکثر کو صحیح قرار دیا۔ پس ظاہر حدیث اور عموم حدیث کی بنا پر انواع حیوان کی گوشت کی انواع کے ساتھ بیع کرنا مکروہ ہے کیونکہ کوئی ایسی حدیث نہیں جو اسے خاص کر رہی ہو اور نہ ہی اجماع ہے۔ اور آپ کے نزدیک نص کی تخصیص قیاس کے ساتھ کرنا جائز نہیں۔ اور ان کے نزدیک حیوان ہر اس جانور کا نام ہے جو خشکی یا پانی میں زندگی گزار رہا ہو اگرچہ اس کی اجناس مختلف ہیں، جیسا کہ طعام ہر اس شے کا نام ہے جو کھائی جاتی ہو یا پی جاتی ہو۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ فِيهِمَآ یعنی خمر اور جوئے میں اِثْمٌ كَبِيرٌ بہت بڑا گناہ ہے۔ شراب کا گناہ وہ ہے جو پینے والے سے صادر ہوتا ہے مثلاً باہم ایک دوسرے سے جھگڑا کرنا، گالی گلوچ دینا، فحش گوئی اور جھوٹا قول اور اس کی عقل کا زائل ہو جانا جس کے ساتھ وہ ان امور کو پہچانتا ہے جن کی ادائیگی اپنے خالق کے لئے واجب ہوتی ہے، نمازوں کو چھوڑ دینا اور اللہ

تعالیٰ کے ذکر سے رک جانا وغیرہ۔

امام نسائی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: شراب سے اجتناب کرو کیونکہ یہ ام الخبائث ہے، تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی تھا جو بڑا عبادت گزار تھا۔ پس ایک گمراہ عورت اس سے حاملہ ہوگئی۔ اس نے اس آدمی کی طرف اپنی لونڈی کو بھیجا اور اس نے اسے کہا: بے شک ہم تجھے شہادت کے لئے بلا رہے ہیں تو وہ اس لونڈی کے ساتھ چل پڑا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ جونہی وہ دروازے کے اندر داخل ہوا، تو اس نے دروازہ بند کر لیا، یہاں تک کہ وہ ایک خوبرو عورت کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے پاس ایک بچہ تھا اور ساتھ ہی شیشہ کے برتن میں شراب پڑی تھی۔ تو اس عورت نے کہا: قسم بخدا! میں نے تجھے شہادت کے لئے نہیں بلایا، بلکہ میں نے تجھے اس لئے دعوت دی ہے تاکہ تو میرے ساتھ بدکاری کرے، یا شراب کا یہ جام پیے یا پھر اس بچے کو قتل کر دے۔ اس آدمی نے کہا: تو مجھے شراب کا یہ جام پلا دے۔ چنانچہ اس نے وہ جام اسے پلا دیا۔ اس نے کہا: مجھے اور پلاؤ۔ پس وہ پیتا رہا یہاں تک کہ اس نے اس کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب بھی کر لیا اور اس بچے کو بھی قتل کر دیا۔ پس تم شراب سے بچو۔ کیونکہ قسم بخدا! ایمان اور شراب پر دوام یہ دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ قریب ہی ان میں سے ایک دوسرے کو نکال دیتا ہے، ابو عمر نے اسے الاستیعاب میں ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی روایت ہے کہ اعشی جب اسلام قبول کرنے کے لئے مدینہ طیبہ کی طرف جانے لگا تو کچھ مشرک لوگ اسے راستے میں ملے۔ انہوں نے اسے کہا: تو کہاں جا رہا ہے؟ تو اس نے انہیں بتایا کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا ہے، تو انہوں نے کہا: تو ان سے نہ مل، کیونکہ وہ تجھے نماز کے بارے حکم ارشاد فرمائیں گے۔ اس نے جواب دیا: بلاشبہ رب تعالیٰ کی عبادت کرنا واجب ہے۔ تو انہوں نے پھر کہا: بلاشبہ وہ تجھے فقراء کو مال دینے کا حکم دیں گے۔ تو اس نے جواب دیا: نیکی کا عمل کرنا واجب ہے۔ پھر اسے کہا گیا: بے شک وہ تو زنا سے منع کرتے ہیں۔ تو اس نے کہا: یہ عمل عقلاً انتہائی فحش اور قبیح ہے اور میں بوڑھا ہو چکا ہوں، مجھے اس کی کوئی حاجت نہیں۔ پھر اسے کہا گیا: بے شک وہ تو شراب پینے سے منع کرتے ہیں۔ تب اس نے کہا: کیا ایسا بھی ہے؟ میں تو اس پر صبر نہیں کر سکتا۔ پس وہ واپس لوٹ گیا اور کہا: میں ایک سال تک شراب پیوں گا پھر آپ کی طرف لوٹ جاؤں گا، لیکن وہ اپنے گھر تک نہ پہنچ سکا یہاں تک کہ وہ اونٹ سے گرا، اس کی گردن ٹوٹ گئی اور مر گیا (1)۔

قیس بن عاصم منقری دور جاہلیت میں بہت زیادہ شراب پیتا تھا پھر اس نے اپنے اوپر اسے حرام کر دیا اور اس کا سبب یہ بنا کہ اس نے نشے کی حالت میں اپنی بیٹی کے پیٹ کی سلوٹوں کو ٹٹولا اور اپنے والدین کو گالیاں دیں، اس نے چاند کو دیکھا تو اس کے بارے میں بھی کچھ (نازیبا) کلمات کہے اور شراب بنانے والے کو اپنا بہت سا مال دے دیا، جب اس کا نشہ اترا اور اسے اس کے بارے خبر ہوئی تو اس نے اپنے اوپر شراب کو حرام قرار دیا اور اس کے بارے وہ کہتا ہے:

رایت الخمرَ صالحةً و فیھا خصالٌ تُفسِد الرجلَ الحلیما

1۔ تفسیر ابی لیث، جلد 1، صفحہ 203

میں نے شراب کو اچھا دیکھا تھا حالانکہ اس میں ایسی خصال بھی ہیں جو حلیم آدمی کو خراب کر دیتی ہیں۔

فلا واللہ اشربها صحیحا　　ولا أشفی بها أبدا سقیما

قسم بخدا! میں اسے حالت صحت میں نہیں پیوں گا اور نہ ہی کبھی بیماری کی حالت میں اس سے علاج کروں گا۔

ولا أعطی بها ثمنا حیاتی　　ولا أدعو لها أبدا ندیما

میں اس کے عوض اپنی حیات بطور ثمن ادا نہیں کروں گا اور نہ میں اس کے لئے کبھی شراب پینے والے ساتھی کو بلاؤں گا۔

فإن الخمر تفضح شاربیها　　و تجنیهم بها الأمر العظیما

کیونکہ شراب اپنے پینے والے کو ذلیل و رسوا کر دیتی ہے اور انہیں بہت بڑے گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: اور ابن عرابی نے المفضل الضبی سے روایت کیا ہے کہ یہ اشعار ابو محجن ثقفی کے ہیں اس نے شراب چھوڑنے کے وقت یہ کہے تھے اور آپ رضی اللہ عنہ یہ کہہ رہے ہیں:

اذا مُتُّ فادفِنّی إلی جَنْبِ کَرْمةٍ　　تروّی عظامی بعد موتی عُروقُها

جب میں فوت ہو جاؤں تو مجھے انگور کی بیل کے پہلو میں دفن کرنا اس کی جڑیں میری موت کے بعد میری ہڈیوں کو تراوت دیں گی۔

ولا تَدْفِنَنِّی بالفَلاة فاننی　　أخاف اذا ما مِتُّ أن لا أذُوقَها

اور تم مجھے صحرا میں دفن نہ کرنا کیونکہ مجھے یہ خوف ہے کہ جب میں مر جاؤں تو اسے نہ چکھ سکوں گا۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انہیں کئی بار حد شرب کے کوڑے لگائے اور انہیں سمندر میں ایک جزیرہ کی طرف جلاوطن کر دیا، پس وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ساتھ جا ملے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف انہیں قید کرنے کا حکم نامہ لکھا۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انہیں قید کر لیا اور یہ انتہائی بہادر شہسواروں میں سے ایک تھے، جب یہ جنگ قادسیہ میں آپ کے حکم سے شریک ہوئے تو معروف یہی ہے کہ آپ نے ان کی بیڑیاں کھول دیں اور فرمایا: ہم کبھی بھی تمہیں شراب پینے پر کوڑے نہیں لگائیں گے۔ تو ابو محجن نے کہا: قسم بخدا! میں کبھی بھی شراب نہیں پیوں گا، پھر اس کے بعد کبھی بھی شراب نہیں پی۔ اور ایک روایت میں ہے: میں شراب پیتا تھا جب مجھ پر حد قائم کی جاتی تو میں اس سے پاک ہو جاتا تھا اور جب تم نے مجھ سے حد ساقط کر کے مجھے ہدر چھوڑ دیا ہے تو قسم بخدا! میں کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ ہیثم بن عدی نے بیان کیا ہے کہ اسے اس نے خبر دی ہے جس نے آذربیجان میں ابو محجن کی قبر دیکھی ہے یا کہا: جرجان کے نواح میں اس حال میں کہ اس پر بیل کی تین جڑیں اگی ہوئی ہیں۔ وہ خوب بڑھی ہوئی ہیں اور وہ پھل بھی دیتی ہیں اور وہ ان کی قبر پر بچھی ہوئی ہیں اور ان کی قبر پر یہ لکھا ہوا ہے ہذا قبر ابی محجن (یہ ابو محجن کی قبر ہے)۔ اس نے کہا کہ میں نے اس پر خوب تعجب کیا اور مجھے ان کا یہ قول یاد آ گیا اذا مت فادفنی الی جنب کرمة۔

بلاشبہ شراب پینے والا اہل عقل کے لئے تمسخر بن جاتا ہے اور وہ اپنے پیشاب اور نجاست کے ساتھ کھیلنے لگتا ہے اور بسا

اوقات وہ اپنے چہرے پر ملنے لگتا ہے حتیٰ کہ بعض کو اس حالت میں دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے چہرے کو پیشاب سے دھو رہا ہوتا ہے اور یہ کہہ رہا ہوتا ہے: اللّٰھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین اور بعض کو اس حال میں دیکھا گیا ہے کہ کتا اس کے چہرے کو چاٹ رہا ہوتا ہے اور وہ اسے کہہ رہا ہوتا ہے: اکرمك اللہ۔ اور رہا جوا! تو یہ تو عداوت اور بغض کا وارث بناتا ہے کیونکہ یہ کسی غیر کا مال باطل طریقے سے کھانے کا نام ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ شراب میں تاجروں کے لئے نفع ہے کیونکہ وہ اسے شام سے سستے داموں خرید کر لاتے تھے اور حجاز میں منافع کے ساتھ اسے فروخت کرتے تھے اور وہ اس میں کوئی تنگی نہیں دیکھتے تھے کیونکہ شراب کا طالب اسے مہنگے داموں خرید لیتا ہے۔ شراب کے منافع کے بارے جو کچھ کہا گیا ہے یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ اور اس کے منافع کے بارے یہ بھی کہا گیا ہے کہ شراب کھانے کو ہضم کرنے میں معاون ہوتی ہے، ضعف اور کمزوری کو قوت دیتی ہے، قوت مردانگی میں معاون ہوتی ہے، بخیل کو سخی بناتی ہے، بزدل کو بہادر اور دلیر بناتی ہے اور رنگ کو صاف کرتی ہے، علاوہ ازیں لذت کا کام بھی دیتی ہے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

و نشربھا فتترکنا ملوکًا وأُسْدًا ما یُنَھْنِھنا اللقاءُ

اور ہم اسے پیتے ہیں اور یہ ہمیں ایسا بادشاہ اور شیر بنا کر چھوڑتی ہے کہ حملہ آور لشکریوں کو ہم سے روک دیتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی اس کی کئی راحتیں اور خوشیاں ہیں۔ ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:

فاذا شربت فاننی ربُّ الخَوَرْنَقِ والسَّدیر

جب میں شراب پیتا ہوں تو میں خورنق اور سدیر (نعمان اکبر بن امرؤالقیس کا محل جو عراق میں تھا) کا مالک ہوتا ہوں۔

واذا صَحَوْتُ فاِننی ربُّ الشُّوَیْھَۃِ وَالْبَعِیرِ

اور جب میں نشے میں افاقہ پالیتا ہوں تو میں بکریوں اور اونٹوں کا مالک ہوتا ہوں۔

اور جوئے کے منافع میں سے یہ ہے کہ اس میں بغیر کسی کدوکاوش اور محنت کے ایک چیز انسان کی طرف لوٹ آتی ہے، پس وہ اونٹ خریدتے ہیں اور اپنے تیر ڈالتے ہیں، جس کا تیر نکل آئے گوشت سے اس کا حصہ لے لیا جاتا ہے اور اس پر کوئی ثمن وغیرہ نہیں ہوتے اور جس کا تیر آخر میں باقی رہ جائے اس پر تمام اونٹوں کی قیمت ادا کرنا ہوتی ہے اور اس کے لئے گوشت میں سے کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: جوئے کی منفعت محتاج لوگوں پر وسعت و خوشحالی کا آنا ہے کیونکہ لوگوں میں سے جو جوا کھیلتا تھا وہ اونٹوں کا گوشت نہیں کھاتا تھا بلکہ اسے محتاجوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔

جوئے کے تیر گیارہ تیر ہوتے، ان میں سے سات کے لئے حصص ہوتے اور ان میں حصوں کی تعداد کے مطابق مقررہ چیز لازم ہوتی اور وہ یہ ہیں: الفذ اس میں ایک علامت ہوتی اور اس کے لئے ایک حصہ ہوتا اور ناکامی کی صورت میں اس پر ایک حصہ لازم ہوتا۔ دوسرا التوأم ہے۔ اس میں دو علامتیں ہوتی اور اس کے لئے دو حصے ہوتے اور اس پر دو حصے لازم ہوتے، تیسرا

الرقیب ہے۔ اس میں تین علامات ہوتیں اسی ترتیب پر جو ہم نے پہلے بیان کردی ہیں۔ چوتھا الحلس ہے۔ اس کے لئے چار علامات ہوتیں۔ پانچواں النافذ ہے۔ اس کا نام النافس بھی ہے۔ اس کے لئے پانچ علامات ہوتیں۔ چھٹا المسبل ہے۔ اس کے لئے چھ علامات ہوتیں اور ساتواں المعلی ہے۔ اس کے لئے سات علامات ہوتیں۔ اس طرح یہ اٹھائیس حصص ہوتے اور اصمعی کے قول کے مطابق اونٹوں کے حصص بھی اسی طرح ہوتے اور تیروں میں سے ابھی چار باقی ہیں۔ ان پر کوئی علامت نہ ہوتی اور نہ ہی فروض اور انصباء میں سے کوئی ان کے لئے ہوتا اور وہ یہ ہیں: المصدّر، المضعف، المنیح اور السفیح۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: باقی تین تیر بغیر علامت کے ہیں وہ یہ ہیں السفیح، المنیح اور الوغد۔ اس پر تیروں کی کثرت کی وجہ سے ان تینوں کا اضافہ کیا جاتا جو انہیں حرکت دیتا اور کسی کی طرف میلان کا وہ کوئی راستہ نہ پاتا۔ اور تیروں کو حرکت دینے والے کو المفیض الضارب اور الضریب کا نام دیا جاتا۔ اور جمع الضرباء آتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حرکت دینے والے کے پیچھے ایک تاکنے والا بھی رکھا جاتا تاکہ وہ کسی کی طرفداری نہ کرے، پھر ضریب اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا اور کپڑے کے ساتھ مکمل طور پر لپٹ جاتا اور اپنا سر باہر نکالتا اور اپنا ہاتھ ربابہ (ترکش کی مانند تیر جمع کرنے کا برتن) میں داخل کرتا اور تیر نکالتا۔ اور عربوں کی عادت تھی کہ وہ موسم سرما میں وقت کے تنگ ہونے اور فقراء پر سردی اور حالات کے سخت ہونے کی حالت میں انہی تیروں کے ساتھ اونٹوں کو تقسیم کرتے تھے۔ اونٹ خریدے جاتے تھے اور خوشحال اور امیر لوگ ان کی قیمت کے ضامن ہوتے تھے اور ان کا مالک اپنے حق سے دستبردار ہو جاتا اور وہ اس کے ساتھ فخر کرتے تھے اور جوان میں سے اس طرح نہ کرتا وہ اس کی مذمت کرتے تھے اور وہ اسے البرَم کا نام دیتے تھے۔ متمم بن نویرہ نے کہا ہے:

ولا بَرَمًا تُهدِی النساءُ لعرسه　　　اذا القَشْعُ من بَرْدِ الشتاء تَقَعْقَعَا

پھر اونٹ ذبح کیے جاتے اور انہیں دس اقسام پر تقسیم کر دیا جاتا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اونٹوں کی تقسیم میں اصمعی نے خطا کی ہے۔ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ تیروں کے حصص کی مقدار کے مطابق ان کے بھی اٹھائیس حصے کیے جاتے، حالانکہ بات اس طرح نہیں ہے۔ پھر وہ دس پر تقسیم کرتا۔ پس جو کوئی ربابہ سے پہلے اپنا تیر نکالنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ اپنے حصص لے لیتا اور فقراء کو عطا کر دیتا۔ اور ربابہ سے مراد ترکش کے مشابہ (برتن) ہے جس میں جوئے کے تیر جمع کیے جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات انہوں نے تمام تیروں کو ربابہ کا نام دیا ہے۔ ابو ذؤیب نے گدھے اور گدھیوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

وکأنھن رِبابَۃٌ و کأنه　　　یَسَرٌ یُفیض علی القِداح و یَصْدَعُ

اور ربابہ کا معنی عہد اور میثاق بھی ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

وکنتُ امْرَأً أفضتْ الیكَ رِبابَتِیْ　　　وَ قَبْلَكَ رَبَّتْنِی فَضِعتُ رُبُوْبُ

اور بعض قبائل میں وہ بسا اوقات اپنی ذاتوں کے لئے جو کھیلتے پھر ثمن کی چٹی اسی پر ہوتی جو اپنے تیر میں کامیاب نہ ہوتا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اسی طریقے پر قبیلے کے فقراء زندگی گزارتے تھے۔ اسی کے مطابق اعشٰی کا قول ہے:

المطعمو الضيف اذا ماشتوا　　والجاعلو القوتِ على الياسر

اور ایک دوسرے کا قول ہے:

بايديهم مقرومة و مغالق　　يعودُ بأرزاق العفاة منيحها

اس شعر میں المنیح سے مراد المستنح (عطیہ) ہے کیونکہ وہ لوگ وہ تیر عاریۃً لے لیتے تھے جو باعث نجات ہوتا اور اس کی کامیابی وافر ہوتی۔ اس لئے یہ قابل تعریف اور پسندیدہ منیح ہے۔ اور رہا وہ منیح جو بے علامت تیروں میں سے ایک ہے تو اسے بالمکر کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اور اخطل نے اپنے اس شعر میں اسی کا ارادہ کیا ہے:

و لقد عطفن على فزارة عطفة　　كرّ المنيح و جلن ثم مجالا

اور الصحاح میں ہے: المنیح جوئے کے ان تیروں میں سے ہے جس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کے مالک کو کوئی شے عطا کر دی جائے۔ اور جوئے سے متعلق لبید کا قول ہے:

اذا يسروا لم يورث اليسر بينهم　　فواحش ينعى ذكرها بالمصايف

یہ سب کا سب جوئے کا نفع ہے مگر یہ کہ یہ باطل طریقے سے مال کھانا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا ہے کہ ان کا گناہ نفع سے کہیں زیادہ اور بڑا ہے اور آخرت میں ضرر اور نقصان کی طرف زیادہ لوٹانے والے ہیں۔ پس گناہ کبیر ان کی تحریم کے بعد ہے اور منافع تحریم سے پہلے کے ہیں۔

حمزہ اور کسائی نے کثیر ثاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے شراب پر لعنت کی ہے اور اس کے ساتھ مزید دس پر لعنت کی ہے: اسے فروخت کرنے والے پر، اسے خریدنے والے پر اور اس پر جس کے لئے خریدی جائے اور اس پر جس نے اسے کشید کیا اور اس پر جس کے لئے کشید کیا گیا، اسے پلانے والے پر، اسے پینے والے پر، اسے اٹھانے والے پر، اس پر جس کے لئے شراب اٹھائی جائے اور اس کے ثمن کھانے والے پر(1) اور یہ بھی کہ منافع کو جمع ذکر کرنے کے ساتھ جمع الآثام ہی زیادہ حسین اور مناسب ہے اور لفظ کثیر یہ معنی ادا کر سکتا ہے۔

باقی قراء اور لوگوں میں سے جمہور نے کَبِيْرٌ پڑھا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ جوئے اور شراب پینے میں جو گناہ ہے وہ کبائر میں سے ہے اور اسے کبیر کے ساتھ ہی بیان کرنا زیادہ مناسب ہے۔

اور یہ بھی کہ ان کا اکبر پر اتفاق کرنا کبیر کے لئے دلیل اور حجت ہے۔ اور لفظ اکثر کے چھوڑنے پر تمام نے اجماع کیا ہے سوائے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف کے، کیونکہ اس میں ہے: قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَثِيْرٌ۔ وَاِثْمُهُمَآ اَكْثَرُ دونوں مقامات پر با کی جگہ ثا ہے۔

1۔ ابن ماجہ، باب لعنت الخمر علی عشرۃ اوجہ، حدیث نمبر 3370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً ابوداؤد، باب العنب یعصر للخمر، حدیث نمبر 3189، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 9۔ اہل نظر میں سے ایک جماعت نے کہا ہے: شراب اس آیت کے ساتھ حرام کی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ (الاعراف: ۳۳)

(آپ فرمائیے: بے شک حرام کر دیا ہے میرے رب نے سب بے حیائیوں کو جو ظاہر ہیں ان سے اور جو پوشیدہ ہیں اور (حرام کر دیا) گناہ کو۔)

اور اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ اس میں گناہ ہے اور وہ حرام ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ نظر و فکر عمدہ نہیں ہے کیونکہ اس میں جو گناہ ہے وہ حرام ہے نہ کہ یہ بعینہا حرام ہے۔ یہ نظر و فکر اسی کا تقاضا کرتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور بعض نے کہا ہے: اس آیت میں شراب کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اثم کا نام دیا ہے اور اثم کو ایک دوسری آیت میں حرام قرار دیا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ اور بعض نے کہا ہے: اثم سے مراد خمر (شراب) ہی ہے۔ اس پر دلیل شاعر کا یہ قول ہے:

شربتُ الاِثم حتی ضَلَّ عقلی　　　كذاكَ الاِثْمُ يَذْهبُ بالعقول

میں نے شراب پی یہاں تک کہ میری عقل گمراہ ہوگئی جس طرح کہ گناہ عقلوں کو ضائع کر دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول بھی عمدہ اور جید نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خمر کو اثم کا نام نہیں دیا ہے۔ بلاشبہ اس نے کہا ہے: قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ (یعنی آپ فرمائیے: ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے) یہ نہیں فرمایا قُلْ هُمَا اثمٌ کبیر (کہ یہ دونوں بہت بڑا گناہ ہیں)

اور رہی سورۃ الاعراف کی آیت اور شعر تو ان دونوں کے بارے تفصیلی گفتگو بعد میں ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: بلاشبہ اس آیت میں شراب کی مذمت ہے اور رہی اس کی تحریم تو وہ دوسری آیت سے معلوم ہوتی ہے اور وہ سورۃ المائدہ کی آیت ہے۔ اکثر مفسرین نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۬ قُلِ الْعَفْوَ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ۝ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قُلِ الْعَفْوَ جمہور کی قراءت نصب کے ساتھ ہے اور صرف ابو عمرو نے اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر کی جانب سے اس میں اختلاف کیا گیا ہے اور حسن، قتادہ اور ابن ابی اسحاق کی قراءت رفع کے ساتھ ہے۔ نحاس وغیرہ نے کہا ہے: اگر ذا بمعنی الذی بنایا جائے تو پھر پسندیدہ رفع ہے، اس معنی کی بنا پر کہ جو وہ خرچ کرتے ہیں وہ عفو ہے اور غصب بھی جائز ہے اور اگر ما اور ذا کو ایک ہی شے قرار دیا جائے تو پھر پسندیدہ نصب ہے، اس معنی کی بنا پر کہ آپ فرما دیجئے: وہ عفو خرچ کریں۔ اور رفع بھی جائز ہے۔

اور علماء نحو نے بیان کیا ہے: ماذا تعلمت: أنحوا ام شعرا یعنی نصب اور رفع دونوں کے ساتھ۔ اس بنا پر کہ اس میں

دونوں اعراب جید اور حسن ہیں، مگر آیت میں تفسیر نصب کی بناء پر ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے کہا ہے: جب سابقہ آیت ارشاد باری تعالیٰ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ میں سوال نفقہ کے بارے ہے کہ وہ کس پر خرچ کیا جائے؟ جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے اور جواب بھی اس پر دال ہے اور جواب بھی سوال کے موافق ہی ظاہر ہوا ہے۔ اس آیت میں دوسرا سوال خرچ کرنے کی مقدار کے بارے ہے اور یہ حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کی شان میں ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ کیونکہ جب یہ آیت نازل ہوئی قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ (البقرہ:215) انہوں نے کہا: میں کتنا خرچ کروں؟ تب یہ حکم نازل ہوا قُلِ الْعَفْوَ اور عفو کا معنی یہ ہے: ما سھل و تیسر و فضل و لم یشق علی القلب اخراجہ، یعنی وہ شی جو آسان ہو، میسر ہو، اور فالتو ہو اور اس کا نکالنا دل پر شاق نہ ہو۔

اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

خُذِی العفوَ منیّ تستدیمی مودّتی　　ولا تَنطِقی فی سَوْرَتی حین اغضبُ

تو عفو لے لے میری محبت کو ہمیشہ برقرار رکھ اور جب میں غصے میں ہوں تو میرے غصے کی حالت میں تو بات نہ کر۔

پس معنی یہ ہے کہ تم اپنی حاجات سے فالتو مال خرچ کر دو اور تم اس میں اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا نہ کرو کہ تم محتاج اور فقیر ہو جاؤ۔ آیت کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں یہی معنی زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے۔ اور حضرات حسن، قتادہ، عطا، سدی، محمد بن کعب قرظی اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہم کے قول کا بھی یہی معنی ہے۔ انہوں نے کہا ہے: العفو ما فضل من العیال کہ عفو سے مراد وہ مال ہے جو اہل و عیال سے فالتو ہو۔ اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: صدقہ وہ ہے جو اس مال سے ہو جس کی حاجت نہ ہو۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ''بہترین صدقہ وہ ہے جو تو نے ضرورت سے زائد مال سے خرچ کیا اور دوسری حدیث میں ہے: ''بہترین صدقہ اس مال کا ہے جو ضرورت سے زائد ہو۔'' (1)

قیس بن سعد نے کہا ہے (2): اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے اور جمہور علماء نے کہا ہے: نہیں بلکہ یہ نفلی صدقات ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب کسی آدمی کے پاس سونا، چاندی یا اناج یا دودھ دینے والے جانور وغیرہ ہوتے تو وہ غور و فکر کرتا کہ ان میں سے کتنا مال اس کی اپنی ذات اور اس کے اہل و عیال کے خرچے کے لئے سال بھر کے لئے کافی ہوگا۔ وہ اسے اپنے پاس روک لیتا اور بقیہ تمام ساز و سامان صدقہ کر دیتا اور اگر وہ ان لوگوں میں سے ہوتا جو اپنے ہاتھ کے ساتھ کام کرتے ہیں تو وہ اپنی اور گھر والوں کی ایک دن کی ضرورت پوری کرنے کے لئے مال اپنے پاس روک لیتا اور باقی ماندہ صدقہ کر دیتا حتیٰ کہ پھر آیت زکوٰۃ نازل ہوئی اور یہ آیت منسوخ ہو گئی اور ہر وہ صدقہ منسوخ ہو گیا جس کے بارے انہیں حکم دیا گیا تھا۔

1۔ بخاری شریف، باب لا صدقۃ الا عن ظھر غنی الخ، حدیث نمبر 1337، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، بخاری شریف، باب لا صدقہ الا عن ظھر غنی الخ، حدیث نمبر 1338، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 694

ایک قوم نے کہا ہے: یہ آیت محکم ہے اور مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے اور ظاہر حال قول اول پر ہی دلالت کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ۔ مفضل بن سلمہ نے کہا ہے: مراد نفقہ کے احکام ہیں (یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ نفقہ کے بارے میں اپنے احکام تمہارے لئے کھول کر بیان کرتا ہے) لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور وفکر کرو۔ پس تم اپنے مالوں میں سے اتنے روک لو جو تمہارے لئے دنیوی معاملات میں نفع بخش اور ضروری ہوں اور باقی ماندہ ان امور میں خرچ کردو جو آخرت میں تمہارے لئے باعث نفع ہوں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں تقدیم وتاخیر ہے۔ یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے دنیا اور آخرت کے امور کے بارے میں اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا، اس کے زوال اور اس کی فنا کے بارے میں غور وفکر کرو اور تم اس میں زہد اختیار کرو اور آخرت کے آنے اور اس کے باقی رہنے کے بارے غور وفکر کرو اور اس میں تم رغبت رکھو۔

فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

''دنیا اور آخرت (کے کاموں) میں اور پوچھتے ہیں آپ سے یتیموں کے بارے میں، فرمائیے: (ان سے الگ تھلگ رہنے سے) ان کی بھلائی کرنا بہتر ہے اور اگر (کاروبار میں) تم انہیں ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے اور اگر چاہتا اللہ تو مشکل میں ڈال دیتا تمہیں، بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا حکمت والا ہے۔''

اس آیت میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (الانعام: ۱۵۲) (اور مت قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو۔) اور اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا الآیہ (النساء: ۱۰) (بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے۔) تو وہ آدمی جس کے پاس کوئی یتیم تھا اس نے اس کا کھانا اپنے کھانے سے اور اس کا مشروب اپنے مشروب سے الگ کر دیا۔ پس وہ اپنے کھانے میں سے جو کچھ بچا تا تھا وہ اسے اس کے لئے روک کر رکھ لیتا تھا یہاں تک کہ وہ اسے کھا لیتا یا وہ فاسد اور خراب ہو جاتا۔ پس یہ چیز ان پر انتہائی شاق اور تکلیف دہ ثابت ہوئی، تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس کا ذکر کیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ الآیہ۔ پس انہوں نے ان کے کھانے پینے کی اشیاء کو اپنے کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ ملا دیا۔ یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں (1)۔

اور یہ آیت ماقبل کے ساتھ متصل ہے کیونکہ اموال کے ذکر کے ساتھ یتیموں کے مالوں کی حفاظت کا امر مقترن ہے۔ اور کہا گیا

1۔ سنن ابی داؤد، باب مخالطة اليتيم في الطعام، حدیث نمبر 2487، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے کہ اس میں سائل حضرت عبداللہ بن رواحہ بنی اللہ ہیں۔

اور یہ قول بھی ہے کہ عرب اپنے کھانے پینے کی اشیاء میں یتیموں کے مالوں کو ملانے سے بدشگونی لیتے تھے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کی دیکھ بھال کے لئے خیر و بھلائی کے ارادہ سے ان کا مال اپنے مال میں ملانے کی اجازت عطا فرمادی ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یتیم کے مال میں تصرف کرنا جائز ہے اور بیع اور تقسیم وغیرہ میں وصی کا تصرف بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ یہ آیت مطلق ہے۔ جب ایک آدمی یتیم کا کفیل بن گیا اور اس نے اسے مخصوص کرلیا اور وہ اس کی زیر نگرانی رہنے لگا تو اس کے بارے اس کا عمل جائز ہوگا اگرچہ والی نے اسے اس پر مقدم نہ بھی کیا ہو کیونکہ آیت مطلق ہے اور کفالت ولایت عامہ ہے اور خلفاء میں سے کسی سے مروی نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں اپنے ہوتے ہوئے کسی کو یتیم پر مقدم کیا ہو۔ بلاشبہ وہ ان کے اپنے پاس ہونے پر ہی اقتصار کرتے تھے (یعنی ان کی جملہ ذمہ داری خود ادا کرتے تھے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ یتیم کا مال مضاربت اور تجارت کی غرض سے دینے کے بارے میں اور اس کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانے کے بارے میں روایات تواتر کے ساتھ موجود ہیں۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یتیم کے مال میں بیع و شرا کے اعتبار سے تصرف کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ خیر و بھلائی کا موجب ہو اور اسی طرح مضاربت وغیرہ کے لئے بھی دینا جائز ہے۔ ہم عنقریب تفصیل سے بیان کریں گے۔

البتہ قرض کے طور پر دینے میں اختلاف ہے۔ اشہب نے اس سے منع کیا ہے اور اسی منع پر اسے بھی قیاس کیا ہے کہ وہ ان کے لئے اپنی طرف سے کوئی شے بیچے یا کوئی خریدے۔

اور دوسروں نے کہا ہے: جب وہ قرض لے نفع کی خاص مقدار کے عوض جو کہ قرض کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو تو اسے دے دیا جائے گا، جیسا کہ وہ یتیم کے لئے پوری جانچ پڑتال کے ساتھ کوئی شے خرید لے تو یہ یتیم کے لئے بہت زیادہ اچھا اور بہتر ہوگا۔

محمد بن عبدالحکم نے کہا ہے: آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ یتیم کے لئے قرض کے عوض (ادھار) بیع کرے اگر وہ اس میں بہتری اور نفع دیکھے۔

ابن کنانہ نے کہا ہے: اس کے لئے جائز ہے کہ یتیم کی شادی کے لئے اتنا مال خرچ کرے جو اس کی ضروریات اور پاکیزگی کے لئے مفید اور نفع بخش ہو اور اس کا نفع اس کے اپنے حال اور اس کے حال جس کے ساتھ وہ اس کی شادی کر رہا ہے، کے مطابق اور اس کے مال کی کثرت کی مقدار کے برابر ہو۔ مزید فرمایا: اسی طرح وہ اس کے ختنے وغیرہ میں اس کا مال خرچ کر سکتا ہے، اگر اسے یہ خوف ہو کہ اسے سلطان کے پاس پیش کرنے کا اہتمام کیا جائے گا اور وہ اسے بالقصد اس کا حکم دے گا اور ہر وہ عمل جو اس نے گہری نظر و فکر کے ساتھ کیا تو وہ جائز ہے اور جو اس نے بطور محاباۃ (کسی دوسرے شخص کی سہولت کو پیش نظر رکھنا) اور کوتاہ نظری کی بنا پر کیا تو وہ عمل جائز نہ ہوگا۔ آیت کا ظاہر اس پر دلیل ہے کہ یتیم کا ولی اسے دنیا اور آخرت کے امور کی تعلیم دے گا اور اس کے لئے ایسا معلم اجرت پر رکھے گا جو اسے کاروبار کی تعلیم دے گا۔ اور جب یتیم کو کوئی شے ہبہ کی جائے تو وصی کے لئے اس پر

قبضہ کرنا جائز ہے کیونکہ اس میں اصلاح اور بھلائی ہے۔ اس کا مزید بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 4۔ جن چیزوں کے لئے وصی اور کفیل یتیم کا مال خرچ کر سکتے ہیں ان کی دو حالتیں ہیں: ایک وہ حالت ہے جس پر گواہ بنانا ممکن ہوتا ہے اور اس میں بینہ کے بغیر اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا اور ایک وہ حالت ہے جس پر شاہد بنانا ممکن نہیں ہوتا، تو اس پر بغیر بینہ کے اس کا قول قبول ہوگا، پس جب کسی نے زمین خریدی اور وہ جس میں توثیق کی عادت جاری ہو تو بغیر بینہ کے اس میں اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے ان کے درمیان یہ فرق بیان کیا ہے کہ یتیم وصی کے گھر میں ہو تو وہ اس پر خرچ کر سکتا ہے اور اسے اس کے نفقہ اور اس کے لباس وغیرہ مہیا کرنے پر شاہد بنانے کا پابند نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس کے لئے ہر وقت اس پر گواہ بنانا متعذر رہو گا جو اسے کھلائے اور اسے پہنائے، بلکہ جب اس نے یہ کہا: میں نے سال بھر کے لئے یہ خرچہ کیا ہے تو یہ اس سے قبول کر لیا جائے گا۔ اور اس کے درمیان کہ وہ اپنی ماں یا اپنی دایہ (پرورش کرنے والی) کے پاس ہو اور وصی یہ دعویٰ کر رہا ہو کہ وہ اس پر خرچہ کر رہا ہے یا وہ اس کی ماں یا دایہ کو نفقہ اور کسوۃ دیتا ہے تو بینہ کے بغیر ماں یا دایہ کے خلاف اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا کہ وہ اس کے لئے بطور مشاہرہ یا خاطر مدارت اس پر قبضہ کرتی رہی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ علماء کا اس آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جو اپنی زیر نگرانی یتیم بچی سے اپنا نکاح کر لیتا ہے کیا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے زیر پرورش یتیم بچے یا بچی کے مال سے اپنے لئے خرید سکتا ہے؟

پس حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کفالت اور حضانت کے سبب نکاح کی ولایت قرابت کی نسبت زیادہ قوی ہے، حتیٰ کہ ان اعراب کے بارے میں کہا جو قحط کے دنوں میں اپنے بچوں کو دوسروں کے حوالے کر دیتے تھے: بے شک وہ انہیں ان کا نکاح کرنے کا اختیار دے دیتے تھے اور رہا کفیل اور پرورش کرنے والے کا اپنے ساتھ نکاح کرنا تو اس کا تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور رہا اس سے خریدنا تو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مشہور اقوال کے مطابق وہ اس سے خرید سکتا ہے اسی طرح حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے جائز ہے کہ وہ یتیم بچے کا مال مثلی قیمت سے زیادہ کے عوض اپنے لئے خرید لے، کیونکہ یہ اصلاح اور خیر ہے جس پر ظاہر قرآن دلالت کرتا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: نکاح اور بیع میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ آیت میں تصرف کا ذکر نہیں ہے، بلکہ یہ فرمایا ہے: اِصۡلَاحٌ لَّهُمۡ خَيۡرٌ (ان کی بھلائی کرنا بہتر ہے) اس میں اس کا ذکر نہیں جس کے لئے دیکھ بھال جائز ہوتی ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں: جب بھلائی کرنا بہتر ہے تو پھر اس کی شادی کرانا بھی جائز ہوگا اور یہ بھی جائز ہوگا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ اور امام شافعی شادی کرانے میں کوئی بھلائی نہیں دیکھتے سوائے اس جہت کے کہ اس سے حاجت دور ہو جاتی ہے اور بالغ ہونے سے پہلے کوئی حاجت نہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وصی کے لئے شادی کرانے کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ بھلائی ہے اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ دادا

کے لئے جائز ہے کہ وہ بھی وصی کے ساتھ ساتھ شادی کرادے اور باپ کے لئے بھی ایسے بچے کے حق میں (یہ اختیار ہے) جس کی ماں فوت ہو چکی ہو نہ کہ اس آیت کے حکم سے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قاضی کے لئے ظاہر قرآن کے مطابق یتیم کی شادی کرانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ یہ سب مذاہب اسی آیت سے ظاہر ہوئے ہیں۔ پس اگر تزویج کا اصلاح (اور نفع بخش ہونا) ثابت ہو جائے تو پھر آیت کا ظاہر اس کے جواز کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى کا یہ معنی ہونا بھی جائز ہے کہ آپ سے یتیموں کے ذمہ دار، ان کی کفالت کرنے والے سوال کرتے ہیں اور یہ مجمل ہے اس سے معین کافل (کفالت کرنے والا) اور قیم (ذمہ دار) معلوم نہیں ہو سکتا اور جو اس میں اوصاف شرط ہوتے ہیں (وہ بھی معلوم نہیں ہو سکتے۔)

اور اگر کہا جائے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جب آدمی کو اپنے یتیم سے مال خریدنے کی اجازت دے دی ہے تو اس سے تو ان کا تہمت اور ذرائع میں اصل کو ترک کرنا لازم آتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ لازم نہیں آتا۔ بلاشبہ یہ ان میں ذریعہ اور وسیلہ بن سکتا ہے جو ممنوع افعال سے ایسے ممنوع تک پہنچانے والے ہوں جن کے بارے نص بیان کر دی گئی ہو، لیکن یہاں تو اللہ تعالیٰ نے مال باہم ملانے کی صورت میں اجازت عطا فرما دی ہے اور اس میں پرورش کرنے والوں کو ان کی امانتوں کے حوالے کر دیا ہے جیسا کہ فرمایا: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ اور ہر وہ امر جس کے بارے خوف ہو اللہ تعالیٰ نے مکلف کو اس کی امانت کے حوالے کر دیا ہے، اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ممنوع تک پہنچنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے، لہٰذا اس سے منع کر دیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اپنی شرمگاہوں پر امین بنایا ہے، اگرچہ ان کا جھوٹ بولنا ممکن ہے۔

حضرت طاؤس سے جب یتیموں کے بارے میں کسی شے سے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ یہ پڑھتے: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے)

ابن سیرین کے نزدیک یتیم کے مال کے بارے میں پسندیدہ عمل یہ تھا کہ وہ اس کے خیر خواہ لوگوں کو جمع کرے اور وہ اس کے بارے غور وفکر کریں جو اس کے لئے مفید اور بہتر ہو۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ اپنے لئے یتیم کے مال سے خریدنا جائز ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ ولی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اس مال میں سے کوئی شے خریدے جو اس کے اپنے زیر نگرانی ہو، کیونکہ اس میں اسے تہمت لگ سکتی ہے مگر یہ کہ اس میں لوگوں کی ایک جماعت میں بیع سلطان کی جانب سے ہو (یعنی نیلام عام ہو)۔

محمد بن عبدالحکیم نے کہا ہے: وہ ترکہ میں سے نہیں خرید سکتا اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ ایسے آدمی کو وسیلہ بنائے جو اس میں سے اس کے لئے خریدے، بشرطیکہ یہ معلوم نہ ہو کہ وہ اس کی طرف سے ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ یہ اختلاط اور میل جول دو ہم مثل چیزوں کے ملنے کی طرح ہے جیسا کہ کھجور کا کھجور کے ساتھ مل جانا وغیرہ۔

ابو عبید نے کہا ہے: یتیموں کو ساتھ ملانے کا مفہوم یہ ہے کہ ان میں سے کسی کا مال ہو اور اس کے کفیل کے لئے یہ امر باعث مشقت ہو کہ وہ اپنے سے اس کا کھانا وغیرہ علیحدہ کرے۔ اور وہ اسے اپنے اہل وعیال کے ساتھ ملائے بغیر کوئی چارہ نہ پائے تو وہ

یتیم کے مال سے اتنا لے لے جسے وہ غور وفکر کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کے لئے کافی ہوگا اور اسے اپنے اہل خانہ کے خرچہ کے ساتھ ملا لے اور اس میں کبھی کمی بیشی بھی واقع ہوسکتی ہے۔ اور یہ آیت ناسخہ اس میں رخصت کے لئے نازل ہوئی ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: میرے نزدیک یہی اس کی اصل ہے جو دوران سفر دوست احباب کرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی جانب سے برابر برابر خرچہ نکالتے ہیں۔ حالانکہ کھانے کی قلت وکثرت میں وہ باہم متفاوت ہوتے ہیں اور ان میں سے جس کا کھانا کم ہو وہ اپنے ساتھی کے خلاف فضل (اضافی کھانے) کا دعویٰ نہیں کرتا۔ تو جب یتیموں کے مال میں یہ وسعت موجود ہے تو ان کے علاوہ میں بدرجہ اولیٰ وسعت ہوگی۔ اگر اس طرح نہ ہو تو مجھے خوف ہے کہ لوگوں پر اس بارے میں امر انتہائی شدید اور شاق ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فَاِخْوَانُكُمْ۔ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی فهم اخوانکم ہے۔ اور فا جواب شرط کے لئے ہے اور ارشاد باری تعالیٰ: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ یہ تحذیر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ یتیموں کا مال خراب کرنے والے کو اسے سنوارنے والے سے خوب جانتا ہے، پس وہ ہر ایک کو اس کے سنوارنے اور اس کے بگاڑنے کے بدلے جزا دے گا۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ۔ حکم نے مقسم سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ فرمایا: اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا امر کر دیتا کہ تم یتیموں کے مال کے سبب ہلاک ہونے تک پہنچ جاتے۔ اور کہا گیا ہے کہ لَاَعْنَتَكُمْ کا معنی ہے لأهلککم (کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تمہیں ہلاک کر دیتا۔) یہ زجاج اور ابو عبید کا بیان ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: (معنی یہ ہے) کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تم پر معاملہ تنگ اور سخت کر دیتا، لیکن اس نے تم پر سہولت اور آسانی کے سوا کچھ نہیں چاہا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی وہ تمہیں ایسے امر کا مکلف اور پابند بنا دیتا جس کو ادا کرنا تم پر انتہائی شدید اور سخت ہوتا اور ان کا اختلاط تمہیں گنہگار کر دیتا، جیسا کہ اس نے ان کے ساتھ کیا جو تم سے پہلے تھے، لیکن اس نے تم سے تخفیف کی ہے۔

اور العنت کا معنی مشقت ہے، و قد عَنِتَ و أَعْنَتَهُ غيرُه۔ وہ مشقت میں پڑا اور غیر نے اسے مشقت میں ڈالا۔ اور جب ہڈی کو کوئی شے لگے اور وہ اسے توڑ دے تو ایسی جڑی ہوئی ہڈی کے لئے کہا جاتا ہے: قد اعنته، تحقیق اس نے اسے مشقت میں اور درد میں مبتلا کیا فهو عَنِتٌ وَ مُعْنِتٌ۔ اور عَنِتَت الدابة تعنَتُ عنتا: جب چوپائے کا پاؤں جڑنے کے بعد پھر ٹوٹ جائے اور اس کے لئے چلنا ممکن نہ ہو۔ اور اَكَمَةٌ عنوتٌ ایسا ٹیلہ جس پر چڑھنا انتہائی دشوار ہو۔ ابن الانباری نے کہا ہے: العنت کا اصل معنی تشدید (سختی) ہے۔ جب عرب یہ کہتے ہیں: فلان يتعنَّت فلاناً و يُعْنِته تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اس پر انتہائی شدت اور سختی کرتا ہے اور اسے ایسے کام کا پابند بناتا ہے جسے کرنا اس پر انتہائی مشکل اور دشوار ہوتا ہے، پھر اسے ہلاکت کے معنی کی طرف منقول کیا گیا ہے۔ اور اصل معنی وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ یعنی اس پر کوئی شے رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ حَكِيْمٌ وہ اپنی ملک میں اس کے مطابق تصرف کرتا ہے جو وہ ارادہ کرتا ہے اس پر کوئی پابندی اور رکاوٹ نہیں، وہ انتہائی عظمت وشان والا اور بزرگ وبرتر ہے۔

وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ

أَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۗ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٢١﴾

''اور نہ نکاح کرو مشرک عورتوں کے ساتھ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور بے شک مسلمان لونڈی بہتر ہے (آزاد) مشرک عورت سے اگرچہ وہ بہت پسند آئے تمہیں اور نہ نکاح کر دیا کرو (اپنی عورتوں کا) مشرکوں سے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں۔ اور بے شک مومن غلام بہتر ہے (آزاد) مشرک سے اگرچہ وہ پسند آئے تمہیں، وہ لوگ تو بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے جنت اور مغفرت کی طرف اپنی توفیق سے اور کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے حکم لوگوں کے لیے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَنْكِحُوا اس میں جمہور کی قراءت تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ البتہ شاذ قراءت میں ضمہ (پیش) کے ساتھ بھی اسے پڑھا گیا ہے۔ گویا معنی یہ ہے کہ اس کی شادی کرنے والے نے اپنے سے اس کا نکاح کر دیا۔ اور نکح کا اصل معنی جماع ہے اور شادی کرنے کے معنی میں مجازاً اور وسعۃً استعمال ہوتا ہے۔ تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گی۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانے اور (اہل کتاب کے ساتھ) نکاح کا میل جول رکھنے کی اجازت عطا فرمادی تو یہ واضح کر دیا کہ مشرکین کے ساتھ باہم نکاح کرنا صحیح نہیں ہے۔

مقاتل نے کہا ہے: یہ آیت حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مرثد بن ابی مرثد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کا نام کناز بن حصین غنوی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خفیہ طور پر مکہ مکرمہ بھیجا، تاکہ وہ آپ کے اصحاب میں سے جو لوگ وہاں ہیں انہیں نکال لائے، تو مکہ مکرمہ میں ایک عورت تھی جو زمانہ جاہلیت میں ان کے ساتھ محبت کرتی تھی۔ اسے عَنَاق کہا جاتا تھا۔ وہ آپ کے پاس آ گئی، تو آپ نے اسے فرمایا: بے شک اسلام نے اسے حرام کر دیا ہے جو کچھ عہد جاہلیت میں تھا، تو اس نے کہا: پھر تم مجھ سے شادی کر لو، تو آپ نے فرمایا: یہاں تک کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے لوں، چنانچہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ سے اجازت طلب کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے شادی کرنے سے منع فرما دیا، کیونکہ آپ مسلمان تھے اور وہ مشرکہ تھی (1)۔ اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، پس ایک جماعت نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کو حرام قرار دیا ہے، پھر ان تمام سے اہل کتاب عورتوں کو نکال دیا ہے اور انہیں سورۂ

1۔ اسباب النزول للواحد، صفحہ 67-66

مائدہ میں حلال قرار دیا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور مالک بن انس، سفیان بن سعید ثوری اور عبد الرحمٰن بن عمرو اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی یہی کہا ہے۔

اور حضرت قتادہ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: آیت کا لفظ تمام کافر عورتوں کو شامل ہے اور اس سے مراد خاص طور پر اہل کتاب ہیں اور اس خصوص کو سورۃ المائدہ کی آیت نے بیان کیا ہے۔ اور یہ عموم کبھی بھی اہل کتاب عورتوں کو شامل نہیں ہوا۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ اور پہلے قول کے مطابق عموم ان کو بھی شامل ہے پھر سورۃ المائدہ کی آیت نے بعض عموم کو ختم کر دیا ہے۔ اور یہی حضرت امام مالک کا مذہب ہے، اسے ابن حبیب نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہودیہ اور نصرانیہ کا نکاح مذموم اور ثقیل ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اسے حلال قرار دیا ہے۔

اسحاق بن ابراہیم حربی نے کہا ہے: ایک قوم نے کہا ہے کہ سورۃ البقرہ کی آیت ناسخ ہے اور سورۃ المائدہ کی آیت منسوخ ہے، لہٰذا انہوں نے ہر مشرک عورت کے نکاح کو حرام قرار دیا ہے، چاہے وہ کتابیہ ہو یا غیر کتابیہ ہو۔

نحاس نے کہا ہے: یہ قول کرنے والے کی دلیل وہ حدیث ہے جس کی سند صحیح ہے اور ہمیں محمد بن ریان نے وہ بیان کی ہے، انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن رمح نے بیان کیا کہ لیث نے حضرت نافع سے ہمیں بیان کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب کسی آدمی کے یہودی یا نصرانی عورت سے شادی کرنے کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر مشرک عورتیں حرام قرار دی ہیں اور میں اس سے بڑا شرک کوئی نہیں جانتا کہ ایک عورت کہتی ہے: اس کا رب عیسیٰ علیہ السلام ہیں یا اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کوئی بندہ یہ کہے۔ (1)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول اس جماعت کے قول سے خارج ہے جو اپنے ساتھ حجت قائم کرتے ہیں۔ کیونکہ صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت نے اہل کتاب کی عورتوں کے حلال ہونے کے بارے قول کیا ہے، ان میں سے حضرات عثمان، طلحہ، ابن عباس، جابر اور حذیفہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور تابعین میں سے حضرات سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، حسن، مجاہد، طاؤس، عکرمہ، شعبی اور ضحاک ہیں اور فقہائے امصار بھی اسی قول پر ہیں۔ اور یہ بھی کہ سورۃ البقرہ کی اس آیت کا سورۃ المائدہ کی اس آیت کے لئے ناسخ ہونا ممتنع ہے۔ کیونکہ سورۃ البقرہ ان سورتوں میں سے ہے جو پہلے پہلے مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں اور سورۃ المائدہ آخر میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔ اور بلاشبہ آخر میں نازل ہونے والی پہلے والی کو منسوخ کرتی ہے۔

رہی حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما! تو اس میں بھی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما توقف کرنے والے آدمی تھے، جب آپ نے دونوں آیتیں سنیں کہ ایک میں حلت کا ذکر ہے اور دوسری میں حرمت کا اور نسخ کی دلیل بھی آپ پر واضح نہ ہوئی، تو آپ نے توقف فرمالیا، پس آپ سے نسخ کا ذکر مروی نہیں، بلکہ صرف نسخ کی تاویل کی گئی ہے اور ناسخ و منسوخ تاویل کے ساتھ حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان بعض روایات میں کہا ہے جو ان سے مروی ہیں کہ یہ آیت بت

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ تعالیٰ ولا تنکحوا المشرکات الخ، حدیث نمبر 4877، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پرست، آتش پرست اور کتابی عورتوں کے بارے میں عام ہے اور ہر وہ عورت جو دین اسلام پر نہیں وہ حرام ہے۔ اسی بنا پر یہ سورۃ المائدہ کی آیت کے لئے ناسخ ہے اور موطا میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول اسی کی تائید کرتا ہے کہ میں اس سے بڑھ کر شرک کرنے والا کسی کو نہیں جانتا کہ ایک عورت کہے: اس کا رب عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما اور دو کتابی عورتوں کے درمیان تفریق کی اور ان دونوں نے کہا: اے امیر المومنین! آپ طلاق دلوا دیں اور آپ غصے میں نہ ہوں، تو آپ نے فرمایا: اگر تم دونوں کی طلاق جائز ہے تو یقیناً تمہارا نکاح بھی جائز ہے۔ لیکن میں تم دونوں کے درمیان انتہائی ذلت وحقارت کی تفریق کر رہا ہوں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سند کے اعتبار سے جید اور عمدہ نہیں ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کے درمیان تفریق کا ارادہ کیا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ یہ حرام ہے تو میں اس کا راستہ چھوڑ دیتا ہوں یا امیر المومنین؟ (یعنی میں اسے فارغ کر دیتا ہوں) تو آپ نے فرمایا: میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ حرام ہے، البتہ مجھے یہ خوف ہے کہ تم ان میں سے بدکار عورتوں میں مشغول ہو جاؤ (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

ابن منذر نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کتابی عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہونے کا ذکر کیا ہے اور ان صحابہ کرام اور تابعین سے بھی جن کا ذکر نحاس کے قول میں ہوا ہے (نکاح کا جواز ذکر کیا ہے) اور اپنے کلام کے آخر میں کہا ہے: اوائل میں سے کسی سے بھی یہ قول صحیح نہیں ہے کہ انہوں نے اسے حرام قرار دیا ہو۔

اور بعض علماء نے کہا ہے: جہاں تک دونوں آیتوں کا تعلق ہے ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ ظاہراً لفظ شرک اہل کتاب کو شامل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ (البقرہ: 105) (نہیں پسند کرتے وہ لوگ جو کافر ہیں اہل کتاب سے اور نہ مشرک کہ اتاری جائے تم پر کچھ بھلائی تمہارے رب کی طرف سے۔) اور فرمایا: لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِينَ (البینہ: 1) (جن لوگوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا (وہ) اور مشرکین)

پس لفظ میں ان کے درمیان فرق کیا ہے اور ظاہر عطف، معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغائرت کا تقاضا کرتا ہے اور یہ بھی کہ اسم شرک عام ہے اور یہ نص نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ کے بعد یہ ارشاد گرامی: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ (المائدہ: 5) (اور (حلال ہیں) پاک دامن مومن عورتیں اور پاکدامن عورتیں ان لوگوں کی جنہیں دی گئی کتاب) یہ نص ہے، پس جس میں احتمال ہے اور جس میں کوئی احتمال نہیں ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں۔ اور اگر کہا جائے: اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے یہ ارادہ کیا ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 297-296

کہ وہ جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور وہ اسلام لے آئے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ الآیہ (آل عمران: 199) (اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر۔) اور یہ ارشاد ہے: مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ (آل عمران: 113) (اہل کتاب سے ایک گروہ حق پر قائم ہے۔)

تو اسے کہا جائے گا: یہ اس ارشاد میں آیت کی نص کے خلاف ہے: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اور اس نظریہ کے خلاف ہے جو جمہور نے بیان کیا ہے کیونکہ ان میں سے جو اسلام لے آیا اس کی شادی کے جائز ہونے پر تو کسی کو کوئی اشکال نہیں ہے اور وہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ہو گیا ہے۔

اور اگر وہ کہیں: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ اور ان کے نکاح کے حرام ہونے میں آگ کی طرف بلانے کو علت قرار دیا ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی علت ہے: وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ کیوں کہ مشرک آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور یہ علت تمام کفار میں جاری ساری ہے، نتیجتاً مسلمان مطلقاً کافر سے بہتر اور اچھا ہے اور یہ بالکل ظاہر بات ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور رہا اہل کتاب کا نکاح جب وہ حالت جنگ میں ہوں تو نکاح حلال نہیں ہوگا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: وہ حلال نہیں، اور رب العالمین کا یہ ارشاد تلاوت فرمایا: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ (التوبۃ) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لائے اللہ پر اور نہ روز قیامت پر اور نہیں حرام سمجھتے جسے حرام کیا ہے اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ دیں وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں)

محدث نے کہا: میں نے اس کا ذکر حضرت ابراہیم نخعی سے کیا تو انہوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اور امام مالک نے اہل حرب کی شادی کو مکروہ قرار دیا ہے اور اس کی علت دار الحرب میں بچے کو چھوڑنا ہے اور اس وجہ سے کہ عورت وہاں شراب اور خنزیر میں تصرف کرے گی۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ یہ اس کی خبر دی جا رہی ہے کہ مومنہ لونڈی مشرکہ سے بہتر ہے، اگرچہ وہ صاحب حسب اور صاحب مال ہو۔ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ اگرچہ وہ تمہیں حسن و جمال وغیرہ میں بہت پسند آئے۔ یہی علامہ طبری وغیرہ کا قول ہے۔

یہ آیت حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی سیاہ رنگ کی لونڈی تھی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: اے خنساء! تحقیق اس کے باوجود کہ تو سیاہ ہے اور تو بدصورت ہے تیرا ذکر ملاء اعلیٰ میں کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تیرا ذکر اپنی کتاب میں نازل کیا ہے۔ پس حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے آزاد کیا اور اس سے شادی کر لی۔

اور حضرت سدی نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کی ایک سیاہ رنگ کی

کنیز تھی۔ انہوں نے غصے میں اسے طمانچہ دے مارا۔ پھر نادم ہوئے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کو صورتحال سے آگاہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبداللہ! وہ کیسی ہے؟ آپ نے عرض کی: وہ نماز پڑھتی ہے، روزے رکھتی ہے، اچھے طریقے سے وضو کرتی ہے اور شہادتین کی شہادت دیتی ہے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ تو مومنہ ہے۔'' تو ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں بالضرور اسے آزاد کروں گا اور پھر اس سے شادی کروں گا، پھر انہوں نے ایسا ہی کیا، تو مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے ان پر طعن کیا اور کہا: انہوں نے لونڈی سے نکاح کیا ہے؟ اور وہ یہ خیال کرنے لگے کہ وہ مشرکین سے نکاح کریں اور وہ ان کے حسب ونسب میں رغبت رکھتے ہوئے ان سے نکاح کرتے رہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ اہل کتاب کی لونڈیوں کے نکاح کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کتابیہ لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے اور اشہب نے کتاب محمد میں کہا ہے: وہ آدمی جس نے اسلام قبول کیا اور اس کے تحت کتابیہ لونڈی ہو تو ان دونوں کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ اہل کتاب کی لونڈیوں کا نکاح جائز ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: ہمیں شیخ ابوبکر الشاشی نے مدینۃ السلام کے بارے درس دیا اور کہا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے کتابیہ لونڈی کے نکاح کے جائز ہونے پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ اور آیت سے وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنہ لونڈی اور مشرکہ کے نکاح کے درمیان اختیار دیا ہے، پس اگر مشرکہ لونڈی کا نکاح جائز نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان اختیار نہ دیتا، کیونکہ بلاشبہ اختیار دو جائز چیزوں کے درمیان ہوتا ہے نہ کہ جائز اور ممتنع کے درمیان اور نہ ہی دو ضدوں کے درمیان۔ جواب یہ ہے کہ دو ضدوں کے درمیان اختیار لغۃً بھی اور قرآن کی رو سے بھی جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَىِٕذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِیْلًا (الفرقان) (اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانا ہوگا اور دوپہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہوگی۔) اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنے خط میں کہا: حق کی طرف رجوع کرنا باطل میں سرکشی اختیار کرنے سے بہتر ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ لَاَمَةٌ سے مراد وہ غلامی نہیں جو کسی کی ملکیت ہو بلکہ اس سے مراد آدمیت ہے اور عورتیں اور مرد سب کے سب اللہ تعالیٰ کے غلام اور اس کی باندیاں ہیں، قاضی بصرہ ابوالعباس جرجانی نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ مجوسی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے میں ائمہ نے اختلاف کیا ہے۔ پس امام مالک، شافعی، ابوحنیفہ، اوزاعی اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے اس سے منع کیا ہے۔ اور ابن حنبل نے کہا ہے: مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ روایت ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے ایک مجوسیہ عورت سے شادی کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: اس کو طلاق دے دو۔

ابن القصار نے کہا ہے کہ ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: دو قولوں میں سے ایک کے مطابق یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی کتاب ہے۔ لہٰذا ان کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے۔

ابن وہب نے حضرت مالک سے روایت بیان کی ہے کہ مجوسیہ لونڈی ہو تو ملک یمین کی حیثیت سے اس کے ساتھ وطی کرنا جائز

نہیں اور اسی طرح بت پرست عورتوں اور دیگر کافر عورتوں کا حکم ہے۔ یہی موقف علماء کی ایک جماعت کا ہے، مگر ایک روایت ہے جسے یحییٰ بن ایوب نے ابن جریج سے اور انہوں نے حضرت عطا اور عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے کہ ان دونوں سے مجوسی لونڈیوں سے نکاح کرنے کے بارے پوچھا گیا، تو ان دونوں نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور ان دونوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ کی تاویل کی ہے۔ وہ یہ کہ ان دونوں کے نزدیک اس کا اطلاق عقد نکاح پر ہے نہ کہ خریدی ہوئی لونڈی پر اور ان دونوں نے اوطاس کے قیدیوں سے استدلال کیا ہے۔ وہ یہ کہ صحابہ کرام نے ان میں سے لونڈیوں کے ساتھ ملک یمین کی حیثیت سے وطی کی۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول شاذ ہے، رہے اوطاس کے قیدی! تو ان میں یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی لونڈیوں نے اسلام قبول کر لیا ہو تو پھر ان کے ساتھ نکاح جائز ہے اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ سے استدلال کا تعلق ہے تو وہ غلط ہے، کیونکہ انہوں نے لفظ نکاح کو عقد کے معنی پر محمول کیا ہے، حالانکہ لغت میں نکاح کا اطلاق عقد اور وطی دونوں پر ہوتا ہے۔ پس جب فرمایا: وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ تو ہر اس نکاح کو حرام کر دیا جو مشرکات پر واقع ہوتا ہے چاہے وہ عقد نکاح ہو یا وطی ہو۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے کہ امام اوزاعی نے بیان کیا: میں نے زہری سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جو مجوسیہ لونڈی خریدتا ہے، کیا وہ اس سے وطی کر سکتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: جب وہ یہ شہادت دے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو وہ اس سے وطی کر سکتا ہے۔

یونس نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس کے لئے اس سے وطی کرنا حلال نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کر لے۔

ابو عمر نے کہا ہے کہ ابن شہاب کا قول ہے کہ اس کے لئے اس سے وطی کرنا حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کر لے اور ابن شہاب مغازی اور سیر کے بارے لوگوں سے بڑھ کر عالم ہیں۔ آپ کا یہ قول اس کے قول کے فاسد ہونے پر دلیل ہے جس نے یہ گمان کیا ہے کہ اوطاس کے قیدیوں سے وطی کی گئی اور ان عورتوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ یہ قول ایک جماعت سے مروی ہے۔ ان میں سے حضرت عطا اور عمرو بن دینار بھی ہیں۔ ان دونوں نے کہا ہے: مجوسیہ کے ساتھ وطی کرنے میں کوئی حرج نہیں اور فقہاء امصار میں سے کوئی ایک بھی اس قول کی طرف متوجہ نہیں ہوا (یعنی کسی نے اسے اہمیت نہیں دی) حالانکہ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے۔

اور وہ ان میں سے ہیں جن کی فارس اور پھر خراسان کے سوا نہ اپنی جنگ ہوئی اور نہ ان کے اطراف والوں کی جنگ ہوئی اور ان میں سے کوئی بھی اہل کتاب نہیں جو تیرے لئے یہ بیان کرے کہ ان کی عورتوں کی سیرت اور کردار کیا ہوتا جب وہ قیدی بنالی جاتیں۔ فرمایا: ہمیں عبد اللہ بن محمد بن اسد نے خبر دی ہے، اس نے کہا: ہمیں ابراہیم بن احمد بن فراس نے بتایا ہے، اس نے کہا: ہمیں علی بن عبد العزیز نے بیان کیا ہے، اس نے کہا: ہمیں ابو عبید نے بتایا ہے، اس نے کہا: ہمیں ہشام نے یونس سے اور انہوں نے حسن سے ہمیں بیان کیا ہے، اس نے کہا: ایک آدمی نے اسے کہا: اے ابو سعید! تم کیا طریقہ کرتے ہو جب تم

عورتوں کو قیدی بناتے ہو؟ تو انہوں نے کہا: ہم انہیں قبلہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ہم انہیں حکم دیتے ہیں کہ اسلام قبول کر لو اور یہ شہادت دو لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ، پھر ہم انہیں حکم دیتے ہیں کہ وہ غسل کریں۔

اور جب اس کا مالک اس سے وطی کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اس کے قریب نہیں جاتا یہاں تک کہ وہ اسے استبرا (☆) کرا لے۔ اس ارشاد باری تعالیٰ میں وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ علماء کی ایک جماعت کی تاویل اسی کے مطابق ہے کہ بلاشبہ ان سے مراد بت پرست اور مجوسی عورتیں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کتابی عورتیں اپنے اس ارشاد کے ساتھ حلال قرار دی ہیں۔ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی پاکدامن عورتیں، نہ کہ وہ مسلمان عورتیں جن کا زنا مشہور ہے۔

اور علماء میں سے بعض نے ان کے نکاح کو مکروہ قرار دیا ہے اور اسے کہ وہ ملک یمین کی حیثیت سے اس کے ساتھ وطی کرے جب تک کہ ان کی جانب سے توبہ نہ ہو۔ کیونکہ اس میں نسب کو فاسد کرنا لازم آتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تُنْكِحُوا کا معنی ہے تم کسی مسلمان عورت کا کسی مشرک آدمی سے نکاح نہ کرو۔ اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ مشرک کسی بھی وجہ سے مومنہ عورت کے ساتھ وطی نہیں کر سکتا، کیونکہ اس میں اسلام کی ذلت و رسوائی ہے۔ اور قراء نے تنکحوا میں تا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں نص کے ساتھ اس پر دلیل موجود ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔

محمد بن علی بن حسین نے کہا ہے: کتاب اللہ میں ہے کہ نکاح ولی (کی اجازت) کے ساتھ ہوتا ہے، پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا نکاح الا بولی (1) یعنی نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ۔

اہل علم نے بغیر ولی کے نکاح کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ بہت سے اہل علم نے کہا ہے: نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کے ساتھ، یہ حدیث حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، حضرت حسن بصری، حضرت عمر بن عبد العزیز، حضرت جابر بن زید، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابن ابی لیلیٰ، حضرت ابن شبرمہ، حضرت ابن مبارک، حضرت امام شافعی، حضرت عبید اللہ بن حسن، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق اور حضرت ابو عبید رحمۃ اللہ علیہم نے بھی کہا ہے۔

☆ رحم کو مادہ منویہ سے پاک کرنے کا اہتمام کرنا اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اسے حیض آ جائے۔

1۔ ابو داؤد، باب الولی، حدیث نمبر 1785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ابن ماجہ، باب لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1870، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
جامع ترمذی، باب ما جاء لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی قول حضرت امام مالک، حضرت ابوثور اور حضرت طبری رحمۃ اللہ علیہم کا بھی ہے۔

ابوعمر نے کہا ہے: جنہوں نے یہ کہا ہے کہ "ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا" ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا نکاح الا بولی۔

اس حدیث کو حضرت شعبہ اور ثوری نے ابواسحاق سے، انہوں نے ابو بردہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسل روایت کیا ہے۔ پس جو مرسل روایات قبول کرتے ہیں اس کو قبول کرنا ان پر لازم ہوگا اور رہے وہ جو مرسل روایات قبول نہیں کرتے تو ان پر بھی اسے قبول کرنا لازم ہوگا، کیونکہ وہ جنہوں نے اسے متصل ذکر کیا ہے وہ اہل حفظ اور ثقہ رواۃ میں سے ہیں اور جنہوں نے اسے متصل ذکر کیا ہے ان میں سے اسرائیل اور ابوعوانہ دونوں راوی ابواسحاق سے، وہ ابو بردہ سے، وہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں (1)۔ اور اسرائیل اور جنہوں نے ان کی اتباع کی ہے وہ سب حفاظ ہیں اور حافظ کی زیادتی قبول کی جاتی ہے اور اس زیادتی کو اصول تقویت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ (البقرہ: 232) (تو نہ منع کرو انہیں کہ نکاح کرلیں اپنے خاوندوں سے) یہ آیت حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے اپنی بہن کو اپنے خاوند کی طرف رجوع کرنے سے منع کیا۔ اسے امام بخاری نے بیان کیا ہے اور اگر ان کے لئے نکاح کرنے میں کوئی حق نہ ہوتا تو انہیں رجوع سے روکنے سے منع نہ کیا جاتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کتاب اللہ میں سے بھی جو آیات اس پر دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہیں: فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ (النساء: 25) (تو نکاح کرلو ان کے سرپرستوں کی اجازت سے) اور یہ ارشاد وَ اَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ (النور: 32) (اور نکاح کردیا کرو جو بے نکاح ہیں تم میں سے) پس اللہ تعالیٰ نے نکاح کے بارے خطاب مردوں کے سوا کسی کو نہیں کیا۔ اگر یہ خطاب عورتوں کو ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کا ذکر فرماتا۔ عنقریب اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے بطور حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف سے کہا ہے: "بے شک میں ارادہ رکھتا ہوں کہ میں تجھے نکاح کردوں" اس کی وضاحت سورۃ القصص میں آئے گی۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء: 34) (مرد محافظ و نگران ہیں عورتوں پر) پس کتاب وسنت نے اس پر قوت اور تائید فراہم کی ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔

علامہ طبری نے کہا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے جس وقت وہ غیر شادی شدہ تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا عقد نکاح کیا (2) اور انہوں نے خود نکاح نہ کیا۔ یہ اس کے قول کا بطلان ہے جس نے کہا ہے کہ بالغہ عورت اپنے نفس کی مالک ہوتی ہے اپنے ولی کے بغیر وہ اپنی شادی کرسکتی ہے اور عقد نکاح کرسکتی ہے اور اگر یہ اختیار اسے ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1870، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، باب شہود الملائکۃ بدرا، حدیث نمبر 3704، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو ان کی اپنی ذات کے بارے میں پیغام نکاح بھیجنا ترک نہ کرتے جبکہ وہ اپنی ذات کے بارے میں اپنے باپ کی نسبت زیادہ قریب تھیں اور آپ نے پیغام نکاح اس کی طرف بھیجا جو ان کے معاملے کا مالک نہیں اور نہ ان کا عقد کرنے کا مالک ہے اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وضاحت بھی ہے الایم احق بنفسھا من ولیھا (1) (بیوہ عورت اپنے ولی کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ حق رکھتی ہے۔) اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کے بارے اس میں زیادہ حق رکھتی ہے کہ وہ اس کی رضامندی کے بغیر اس پر عقد نہیں کرسکتا، یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے بارے میں یہ زیادہ حق رکھتی ہے کہ وہ اپنے ولی کے بغیر اپنا نکاح خود کرلے۔ اور دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی عورت کسی عورت کی شادی نہیں کرے گی اور نہ کوئی عورت اپنی شادی کرے گی کیونکہ زانیہ وہی ہوتی ہے جو اپنی شادی خود کرلیتی ہے۔'' فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے۔ (2)

اور ابوداؤد نے سفیان عن الزہری عن عروۃ کی سند سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی عورت کا نکاح اس کے ولی کی اجازت کے بغیر کردیا گیا تو اس کا نکاح باطل ہے۔ آپ نے یہ جملہ تین بار فرمایا۔ پس اگر اس کے ساتھ دخول کرلیا گیا تو اس کے لئے مہر ہوگا اس عمل کے عوض جو اس نے اس کے ساتھ کیا اور اگر وہ آپس میں جھگڑ پڑیں تو سلطان اس کا ولی ہوگا جس کا کوئی ولی نہ ہو (3)۔'' یہ حدیث صحیح ہے۔

اور ابن علیہ نے جو قول ابن جریج سے نقل کیا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں کہ انہوں نے کہا: میں نے اس کے بارے حضرت زہری سے پوچھا تو انہیں اس کی پہچان نہ تھی۔ اور ابن علیہ کے سوا کسی ایک نے بھی ابن جریج سے یہ قول نقل نہیں کیا، حالانکہ ایک جماعت نے حضرت زہری سے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا اور اگر زہری سے یہ ثابت ہوجائے تو بھی اس میں دلیل موجود نہیں کیونکہ آپ سے اسے ثقہ راویوں نے نقل کیا ہے، ان میں سے سلیمان بن موسیٰ ہیں اور وہ ثقہ امام ہیں اور جعفر بن ربیعہ ہیں (4) اور اگر زہری اسے بھول گئے تب بھی یہ آپ کے لئے نقصان دہ نہیں، کیونکہ نسیان سے کوئی آدمی محفوظ نہیں، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدم علیہ السلام بھول گئے تو آپ کی ساری اولاد بھول گئی (5)'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نسیان لاحق ہوجاتا تھا، تو پھر آپ کے سوا کون ہے جو نسیان سے زیادہ محفوظ ہو اور جس نے یاد رکھا تو وہ اس پر حجت ہے جو بھول گیا، پس جب ثقہ راوی خبر کو روایت کرے تو جو بھول گیا اس کا نسیان اس کے لئے نقصان دہ نہیں ہوگا۔ یہ تب ہے جبکہ وہ صحیح ہو جو ابن علیہ نے ابن جریج سے بیان کیا ہے، تو کیا حال ہوگا جبکہ اہل علم نے اس حکایت کا انکار کیا ہے اور انہوں نے اس پر اعتماد نہیں کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو ابو حاتم محمد بن حبان تمیمی البستی نے المسند الصحیح میں تقاسیم وانواع پر اس کی سند میں

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1888　2۔ ابن ماجہ، باب لانکاح الا بولی، حدیث نمبر 1871، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ابوداؤد، باب فی الولی، حدیث نمبر 1784، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　4۔ ایضاً

5۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انقطاع کے پائے جانے کے بغیر نقل کیا ہے اور اس کے ناقل میں کوئی جرح بھی ثابت نہیں یہ حفص بن غیاث عن ابن جریج عن سلیمان بن موسیٰ عن الزہری عن عروہ عن عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی سند سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ اور دو عادل شاہدوں کی شہادت کے ساتھ اور جو نکاح اس کے بغیر ہو وہ باطل ہے اور اگر وہ آپس میں جھگڑ پڑیں تو سلطان وقت اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔''

ابو حاتم نے بیان کیا ہے کہ ابن جریج عن سلیمان بن موسیٰ عن الزہری کی روایت میں سوائے تین آدمیوں کے کسی نے بھی یہ الفاظ نہیں کہے وَ شَاهِدَیْ عَدْلٍ (وہ تین افراد یہ ہیں) سوید بن یحییٰ اموی، حفص بن غیاث سے، عبداللہ بن عبدالوہاب جمحی، خالد بن حارث سے اور عبدالرحمٰن بن یونس الرقی، عیسیٰ بن یونس سے، شاہدین کے بارے میں اس خبر کے سوا کوئی صحیح نہیں ہے۔ اور جب یہ خبر ثابت ہو گئی تو کتاب وسنت نے اس بارے تصریح کر دی کہ ولی کی اجازت کے بغیر کوئی نکاح نہیں۔ اور جو ان دونوں کے خلاف ہو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

حضرت زہری اور شعبی کہتے ہیں کہ جب کسی عورت نے دو شاہدوں کی موجودگی میں اپنی شادی کفو میں کر لی تو وہ نکاح جائز ہے۔ اسی طرح حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں کہ جب کسی عورت نے دو شاہدوں کی موجودگی میں اپنا نکاح کفو میں کیا تو وہ نکاح جائز ہے، یہی امام زفر کا قول ہے۔ اور اگر کسی نے اپنا نکاح غیر کفو میں کیا، تو وہ نکاح جائز ہو گا، لیکن اولیاء کو ان کے درمیان تفریق کا اختیار ہو گا۔

ابن منذر نے کہا ہے: جو کچھ حضرت نعمان نے کہا ہے وہ سنت کے مخالف ہے اور اکثر اہل علم کے قول سے باہر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مطابق ہم کہہ رہے ہیں۔

اور امام ابو یوسف نے کہا ہے: نکاح جائز نہیں ہو گا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ اور اگر ولی تسلیم کر لے تو پھر جائز ہے اور اگر وہ انکار کر دے اور اسے حوالے نہ کرے اور زوج عورت کا کفو ہو تو قاضی اس کی اجازت دے دے۔ اور بلاشبہ جب قاضی اس کی اجازت دے دے گا تو وہ نکاح مکمل ہو جائے گا، یہی قول امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: قاضی ولی کو نکاح کی اجازت دینے کا حکم دے گا اور اگر وہ نہ دے تو (قاضی) نئے سرے سے عقد کر دے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کے درمیان اس صورت میں کوئی اختلاف نہیں جب عورت کا ولی اسے اجازت دے دے، پس اس نے اپنا نکاح خود کر لیا تو وہ جائز ہو گا۔

امام اوزاعی نے کہا ہے: جب عورت اپنے معاملے کا کسی آدمی کو ولی بنائے اور وہ اس کا نکاح کفو میں کر دے تو وہ نکاح جائز ہے، اب ولی کے لئے ان کے درمیان تفریق کرنے کا اختیار نہیں ہے، مگر یہ کہ وہ عورت عربیہ ہو اور شادی کسی مولیٰ (غلام) سے کر لے، یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی طرح ہے جو کہ آگے آئے گا۔

اور امام زہری، امام ابو حنیفہ اور شعبی رحمہم اللہ کے مذہب کے قائلین نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد: لا نکاح الا بولی کو معنی کمال پر محمول کیا ہے نہ کہ وجوب پر، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا صلوٰۃ لجار المسجد الا فی المسجد (کہ

مسجد کے پڑوس میں رہنے والے کی نماز مسجد کے بغیر نہیں ہوتی۔) اور لا حظَّ فی الاسلام لمن ترك الصلوٰۃ(1) کہ جس نے نماز چھوڑ دی اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں) (ان ارشادات میں کمال کی نفی ہے اسی طرح اس حدیث میں بھی کمال کی نفی ہے یعنی نکاح کامل نہیں ہوگا۔) اور انہوں نے اس پر ان ارشادات سے استدلال کیا ہے: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اور فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ: 234) (تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے۔) اور اس روایت سے جو دار قطنی نے سماک بن حرب سے روایت کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: ایک عورت ہے میں اس کا ولی ہوں اس نے میری اجازت کے بغیر شادی کر لی ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو کچھ اس نے کیا ہے اس میں غور و فکر کی جائے گی اور دیکھا جائے گا، سو اگر اس نے کفو میں شادی کی ہے تو ہم اسے اس کی اجازت دے دیں گے اور اگر اس نے ایسے آدمی سے شادی کی جو اس کا ہم کفو نہیں تو ہم اسے تیرے حوالے کر دیں گے(2)۔

اور موطا میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی بیٹی کی شادی کی اور وہ غائب تھے۔ الحدیث۔

اور ابن جریج نے اسے عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابی بکر سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ انہوں نے ایک آدمی منذر بن زبیر رضی اللہ عنہ کا نکاح اپنے بھائی کی اولاد میں سے ایک عورت کے ساتھ کیا۔ آپ نے ان کے درمیان پردہ لٹکا دیا، پھر گفتگو فرمائی۔ یہاں تک کہ جب عقد کے سوا کچھ باقی نہ بچا تو آپ نے ایک آدمی کو حکم دیا اور اس نے نکاح کر دیا، پھر آپ نے فرمایا: عورتوں کے پاس نکاح کرنے کا اختیار نہیں ہے (یعنی عورتوں کو ولایت انکاح حاصل نہیں) اور امام مالک کی حدیث میں وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مہر اور احوال نکاح کو پختہ کیا اور اس (عورت) کے عصبہ میں سے ایک عقد کا ولی بنا اور عقد کی نسبت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف کی گئی کیونکہ اسے پختہ کرنے کی نسبت آپ کی طرف ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے: اولیاء کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف روایات ہیں کہ وہ کون ہیں؟ پس آپ نے ایک بار فرمایا: ہر وہ آدمی جس نے عورت کو اچھے اور حسین منصب میں رکھا وہی اس کا ولی ہے، چاہے وہ عصبہ ہو یا ذوی الارحام میں سے ہو یا اجنبی ہو یا امام ہو یا وصی ہو۔ اور ایک بار فرمایا: اولیاء عصبات میں سے ہوتے ہیں، پس ان میں سے جس نے عورت کو اچھے منصب میں رکھا وہ اس کا ولی ہوگا۔

ابو عمر نے کہا ہے: امام مالک نے اس بیان میں کہا ہے جو ان سے ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ جب کسی عورت کی شادی ولی کے علاوہ کوئی اور اس عورت کی اجازت سے کر دے تو پھر اگر وہ عورت شریف ہو اور لوگوں میں اس کا کوئی مقام ہو تو اس کے نکاح کو فسخ کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں اس کے ولی کو اختیار ہوگا اور اگر وہ عورت رذیل اور کمینی ہو جیسا کہ آزاد شدہ

1۔ التمہید، جلد 19، صفحہ 91-90　2۔ سنن دار قطنی، جلد 3، صفحہ 237

لونڈی، سوداء یعنی قبطی قوم سے تعلق رکھنے والی، زناکار اور مسلمانیۃ اور وہ عورت جس کا کوئی مقام و مرتبہ نہ ہو تو اس کا نکاح جائز ہوگا اور اس کے ولی کو اختیار نہ ہوگا کیونکہ ہر کوئی اس کا کفو ہے۔

اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ عورت شریف ہو یا رذیل ولی یا سلطان کے علاوہ کوئی اس کی شادی نہیں کر سکتا۔ اس قول کو ابن منذر نے پسند کیا ہے اور کہا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے مسکین عورت اور وہ جو ذی مرتبہ اور ذی قدر ہو کے درمیان تفریق کرنا جائز نہیں، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کے بارے میں ان کے احکام کے درمیان مساوات اختیار کی ہے۔ اور فرمایا ہے: ''تمام مسلمانوں کا خون مساوی اور برابر ہوتا ہے'' (1)۔ اور جب وہ خون میں برابر ہوئے تو وہ اس کے علاوہ دیگر احکام میں بھی ایک شے ہوں گے۔

اور اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نکاح کے بارے حکم ارشاد فرمایا تو اس نے بعض مومنین کو بعض کا ولی بنا دیا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (التوبۃ: 71) (نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں) اور فی الجملہ مومنین اسی طرح بعض بعض کے وارث بنتے ہیں، پس اگر ایک آدمی مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی میراث تمام مسلمانوں کے لئے ہوگی اور اگر وہ کسی جنایت (جرم) کا ارتکاب کرے تو اس کی جانب سے مسلمان ہی دیت ادا کریں گے، پھر ایک ولایت دوسری ولایت سے زیادہ قریب ہوتی ہے اور ایک قرابت دوسری قرابت سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔

اور جب عورت ایسی جگہ میں ہو جہاں نہ سلطان ہو اور نہ اس کا ولی ہو تو وہ اپنا معاملہ پڑوسیوں میں سے اس کے حوالے کر دے گی جو قابل اعتماد ہوگا اور وہ اس کی شادی کر سکے گا اور اس حال میں وہی اس کا ولی ہوگا، کیونکہ لوگوں کے لئے شادی کرنے سے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اور بلاشبہ اس بارے میں جتنا ممکن ہو سکے وہ اچھا عمل کرتے ہیں، اسی بنا پر امام مالک نے کمزور حالت والی عورت کے بارے میں کہا ہے کہ بلاشبہ اس کی شادی وہ کر سکتا ہے جس کی طرف وہ اپنے معاملے کو منسوب کرے گی، کیونکہ وہ عورت ان میں سے ہے جو سلطان کے پاس پہنچنے سے قاصر ہوتی ہے۔ پس اسے اس کے مشابہ قرار دیا گیا ہے جس کی موجودگی میں سلطان نہ ہو، پس فی الجملہ وہ اس طرف راجع ہوئی کہ مسلمان اس کے اولیاء ہیں۔ پس جب اس نے اپنا معاملہ ایک آدمی کے حوالے کر دیا اور اپنے اولیاء کو چھوڑ دیا تو بلاشبہ اس نے بلاوجہ ایک امر کو اختیار کیا ہے اور اس نے وہ کام کیا ہے جس کے بارے حاکم اور مسلمان اس کا انکار کرتے ہیں تو وہ نکاح فسخ کر دیا جائے گا یہ معلوم کیے بغیر کہ اس کی حقیقت حرام ہے۔

جب ہم نے یہ بیان کر دیا ہے کہ مومنین بعض بعض کے اولیاء ہیں اور یہ بھی کہ اس میں اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود نکاح فسخ کر دیا جائے گا کیونکہ یہ کام بلاوجہ ہوا ہے اور اس لئے بھی کہ فروج کے بارے زیادہ احتیاط ہے اور اس لئے بھی کہ ان کی حفاظت (ضروری ہے) اور جب دخول ہو جائے اور معاملہ طویل ہو جائے اور وہ اولاد کو جنم دے لے تو پھر صحیح یہی ہے کہ فسخ

1۔ ابوداؤد، باب السریۃ ترد علی اہل العسکر، حدیث نمبر 2371، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب المسلمون تتکافأ دماءھم، حدیث نمبر 2674-2672، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائز نہیں، کیونکہ امور جب متفاوت ہو جائیں تو پھر ان سے اس حرام کے سوا کسی کا ارادہ نہیں کیا جاتا جس میں کوئی شک نہ ہو۔ اور یہ اس کے مشابہ ہو جاتا ہے جو حاکم کے حکم سے فوت ہو جائے جب کہ وہ حکماً یہ فیصلہ دے کہ اسے فسخ نہ کیا جائے مگر یہ کہ وہ ایسی خطا اور غلطی ہو جس میں کوئی شک نہ ہو (تو اس صوت میں حاکم کا فیصلہ نافذ العمل نہ ہوگا۔)

اور رہے امام شافعی اور آپ کے اصحاب! تو ان کے نزدیک بغیر ولی کے کیا ہوا نکاح ہمیشہ فسخ کیا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں بنیں گے اگر ان میں سے کوئی ایک مر جائے۔ اور ان کے نزدیک ولی نکاح کے فرائض میں سے ہے، اس لئے کہ ان کے نزدیک اس پر کتاب وسنت سے دلیل قائم ہے۔ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وانکحوا الایامی منکم اسی طرح فرمایا: فانکحوھن باذن اھلھن اور اولیاء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: لا نکاح الا بولی اور انہوں نے رذیل اور شریف عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا، کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ان دونوں کے درمیان خون کے احکام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: المسلمون تتکافؤ دماؤھم اور تمام احکام اسی طرح ہیں۔ اور ان میں سے کسی میں کتاب وسنت میں بلند مرتبہ اور گھٹیا کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس نکاح کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے جو بغیر ولی کی اجازت کے واقع ہو اور پھر ولی قبل از دخول اس کی اجازت دے دے، تو حضرت امام مالک اور عبدالملک کے سوا ان کے اصحاب نے کہا ہے: وہ نکاح جائز ہے، کیونکہ اس کے لئے اس کی اجازت قرب کے سبب ہے، چاہے دخول ہوا ہو یا دخول نہ ہوا ہو۔ یہ تب ہے جب عقد نکاح غیر ولی نے کیا ہو اور عورت نے بذات خود عقد نکاح نہ کیا ہو اور اگر عورت نے اپنی شادی خود کی اور اس نے مسلمانوں میں سے کسی قریبی یا بعیدی ولی کے بغیر عقد نکاح خود کیا ہو تو یہ نکاح کسی حال میں ہمیشہ کے لئے برقرار نہیں رکھا جائے گا اگرچہ وقت زیادہ گزر جائے اور وہ اولاد کو جنم دے لے۔ البتہ دخول کی صورت میں بچے کو اسی کے ساتھ ملحق کیا جائے گا اور حد ساقط ہو جائے گی اور ہر حال میں اس نکاح کو فسخ کرنا ضروری ہے۔ ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اس صورت میں فسخ بغیر طلاق کے ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ اولیاء کے مراتب اور ان کی ترتیب میں علماء نے اختلاف کیا ہے:

حضرت امام مالک فرماتے ہیں: اولیاء میں سے سب سے اول بیٹے ہیں اگرچہ وہ کتنے ہی نیچے کی طرف ہوں، پھر باپ، پھر وہ بھائی جو باپ اور ماں دونوں جانب سے سگے ہوں، پھر وہ جو صرف باپ کی طرف سے ہوں (علاتی بھائی) پھر حقیقی بھائیوں کے بیٹے پھر علاتی بھائیوں کے بیٹے، پھر باپ کی جانب سے اجداد (دادے) اگرچہ وہ کتنے ہی اوپر ہوں، پھر چچے بھائیوں کی ترتیب پر، پھر ان کے بیٹے بھائیوں کے بیٹوں کی ترتیب پر اگرچہ وہ کتنے نیچے ہوں، پھر آقا پھر سلطان یا قاضی۔

اور وصی یتیموں کا نکاح کرنے میں اولیاء پر مقدم ہوتا ہے اور وہی باپ کا خلیفہ اور اس کا وکیل ہوتا ہے اور یہ اس حال کے مشابہ ہوتا ہے اگر باپ زندہ ہوتا۔

اور حضرت امام شافعی نے کہا ہے: باپ کے ساتھ کسی کی کوئی ولایت نہیں ہے اور اگر باپ فوت ہو جائے تو پھر دادا، پھر دادے کے باپ کا باپ، کیونکہ یہ سب کے سب آباء ہیں۔ اور دادا کے بعد ولایت بھائیوں کی ہوتی ہے، پھر اس کے لئے جو

ان کے بعد زیادہ قریبی ہو۔

مزنی نے قول جدید میں کہا ہے: وہ جو ماں کی طرف سے منفرد ہو وہ نکاح میں زیادہ اولیٰ ہوتا ہے جیسا کہ میراث میں۔ اور قدیم قول میں انہوں نے کہا ہے کہ دونوں برابر ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ اہل مدینہ نے امام مالک سے امام شافعی کے قول کی مثل روایت کیا ہے اور یہ کہ باپ بیٹے سے زیادہ اولیٰ اور قریب ہے اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دوقولوں میں سے ایک ہے۔ اسے الباجی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: دادا بھائیوں سے زیادہ اولیٰ ہے اور مشہور مذہب وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔

امام احمد نے کہا ہے: عورت کی شادی کرنے کے لئے ان میں سے زیادہ حقدار اس کا باپ ہے، پھر بیٹا، پھر بھائی، پھر اس کا بیٹا، پھر چچا۔ اور اسحاق نے کہا ہے: بیٹا باپ سے زیادہ اولیٰ ہے: جیسا کہ حضرت امام مالک نے کہا ہے اور ابن منذر نے اسے ہی اختیار کیا ہے کیوں کہ عمرو بن ام سلمہ نے ان کی اجازت کے ساتھ ان کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے نسائی نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے اور عنوان یہ ہے انکاح الابن امه۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے کثرت کے ساتھ اس سے استدلال کیا ہے اور یہ کوئی شے نہیں ہے اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جو صحاح میں ثابت ہے کہ عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش میں بچہ تھا اور میرا ہاتھ پلیٹ میں ادھر ادھر گھومتا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے بچے! تو اللہ تعالیٰ کا نام لے اور دائیں ہاتھ سے کھا اور اس سے کھا جو تیرے سامنے ہے (1)۔''

اور ابوعمر نے کتاب الاستیعاب میں کہا ہے: عمر بن ابی سلمہ کی کنیت ابوحفص ہے، وہ سرزمین حبشہ میں ۲ ھ میں پیدا ہوئے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اس وقت ان کی عمر نو برس تھی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس کی عمر اتنی ہو وہ ولی ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، لیکن ابوعمر نے ذکر کیا ہے کہ ابوسلمہ کا ام سلمہ سے ایک دوسرا بیٹا تھا۔ اس کا نام سلمہ تھا اور یہی وہ ہے جس نے اپنی ماں ام سلمہ کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور سلمہ کی عمر اپنے بھائی عمر بن ابی سلمہ سے زیادہ تھی اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کے اعتبار سے زیادہ حافظ نہ تھے اور ان کے بھائی عمر نے ان سے روایت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس آدمی کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے جو دور کے اولیاء میں سے ہو اور وہ کسی عورت کی شادی کرے۔ اسی طرح واقع ہوا ہے اور اقرب عبارت ہے کہ کہا جائے: ایسی عورت کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے جس کی شادی اس کے اولیاء میں سے بعیدی ولی کرتا ہے درآنحالیکہ قریبی ولی حاضر ہو۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: اگر قریبی ولی نے اس میں سے کسی شے کا انکار نہ کیا اور نہ ہی اس نے اسے رد کیا تو وہ نکاح نافذ ہو

1۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 4957، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے گا اور اگر اس نے اس کا انکار کیا اور وہ ثیبہ ہو یا باکرہ بالغہ ہو، یتیم ہو اور اس کا کوئی وصی نہ ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب اور اہل مدینہ کی جماعت کا قول اس بارے میں مختلف ہے۔ سوان میں سے کہنے والوں نے کہا ہے کہ اسے رد نہیں کیا جائے گا اور وہ نافذ ہو جائے گا، کیونکہ وہ ایسا نکاح ہے جو اصول اور خاندان میں سے ولی کی اجازت کے ساتھ منعقد ہوا ہے اور ان میں سے جنہوں نے کہا ہے کہ نافذ نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا ہے: بلاشبہ اولیاء میں افضل اور اولیٰ رتبہ کا ولی موجود ہے اور وہ مستحب ہے واجب نہیں ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اکثر اصحاب کے نزدیک ان کے مذہب کا ماحصل یہی ہے اور اسے ہی اسماعیل بن اسحاق اور ان کے متبعین نے اختیار کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سلطان اس میں غور و فکر کرے گا اور وہ ولی اقرب سے اس شے کے بارے پوچھے گا جسے وہ ناپسند کر رہا ہے پھر اگر وہ اسے نافذ کرنا مناسب سمجھے تو اسے نافذ کر دے اور اگر اسے رد کرنا مناسب سمجھے تو اسے رد کر دے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ قریبی ولی ہر حال میں اسے رد کر دے گا، کیونکہ وہ اس کا حق ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لئے رد کرنے اور اس کی اجازت دینے کا اختیار ہے جب تک کہ عرصہ طویل نہ ہو اور وہ بچوں کو جنم نہ دے۔ یہ تمام اقوال اہل مدینہ کے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر ولی اقرب محبوس یا سفیہ ہو تو پھر اس کے بعد اولیاء میں سے جن کا مرتبہ ہو وہ اس کی شادی کر دے اور اسے ان میں میت کی طرح شمار کیا جائے۔ اسی طرح جب ولی اقرب غیبت بعیدہ پر غائب ہو یا اس طرح غائب ہو کہ جلدی اس کے واپس لوٹنے کی امید نہ ہو تو پھر بھی اس کے بعد والا ولی اس کی شادی کر سکتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اقرب ولی غائب ہو اور اس کے پیچھے اس کی شادی کرنے والا کوئی نہ ہو، تو حاکم اس کی شادی کر سکتا ہے۔ پہلا قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ جب دو ولی قرب میں واقع ہوں اور ان میں سے ایک غائب ہو اور عورت اپنے عقد نکاح کی ذمہ داری حاضر ولی کے سپرد کر دے تو جب غائب ولی واپس آئے تو اس کے لئے انکار کی اجازت نہیں۔ اور اگر دونوں حاضر ہوں اور عورت اپنا معاملہ ان میں سے ایک کے حوالے کرے تو وہ دوسرے ولی کی اجازت کے بغیر اس کی شادی نہیں کر سکتا اور اگر دونوں میں اختلاف ہو جائے تو پھر حاکم اس میں غور و فکر کرے اور ان دونوں میں سے جس کو عورت کے حق میں اچھا سمجھے اس کی رائے کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اسے ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ رہی نکاح میں شہادت! تو یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک رکن نہیں ہے اور اس بارے میں اس کی شہرت اور اعلان ہی کافی ہوگا اور یہ کہ وہ نکاح خفیہ اور سری ہونے سے نکل جائے۔

ابن قاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: اگر کسی نے بینہ کے ساتھ نکاح کیا اور گواہوں کو حکم دیا کہ وہ اسے چھپا کر رکھیں تو نکاح جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ نکاح سر ہے اور اگر اس نے بغیر گواہوں کے غیر سری انداز میں نکاح کیا تو وہ جائز ہے اور وہ دونوں اس میں گواہ بنا لیں جس سے وہ دو چار ہوں گے۔

ابن وہب نے امام مالک سے ایک آدمی کے بارے میں روایت کیا ہے کہ وہ ایک عورت سے دو آدمیوں کی شہادت کے ساتھ شادی کرتا ہے اور ان دونوں کو چھپانے کے لئے کہتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ان دونوں کے درمیان طلاق کے ساتھ تفریق کر دی جائے گی اور نکاح جائز نہ ہوگا اور اگر آدمی نے اس کے ساتھ دخول کیا تو اس کے لئے مہر ہوگا اور دونوں گواہوں کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔

امام اعظم ابو حنیفہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما اور ان دونوں کے اصحاب نے کہا ہے: جب کسی نے دو شاہدوں کی موجودگی میں کسی عورت سے شادی کی اور اس نے ان دونوں کو کہا: تم اسے خفیہ رکھنا تو نکاح جائز ہوگا۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ ہمارے ساتھی یحیٰی بن یحیٰی لیثی اندلسی کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: ہر وہ نکاح جس پر دو آدمی گواہ ہوں تحقیق وہ سر (خفیہ) کی حد سے نکل گیا اور میرا گمان ہے کہ اسے لیث سے ابن سعد نے بیان کیا ہے۔ امام شافعی، اہل کوفہ اور ان کے متبعین کے نزدیک سر سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ نکاح جس پر دو یا دو سے زیادہ آدمی گواہ نہ ہوں اور اسے ہر حال میں فسخ کر دیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام شافعی کا قول اس حدیث کے مطابق زیادہ صحیح ہے جسے ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: دو عادل شاہدوں اور ولی مرشد کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہے اور اس بارے میں جو کچھ میں نے جانا ہے، صحابہ کرام میں سے کسی نے آپ کی مخالفت نہیں کی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مذہب کے لئے اس سے استدلال کیا ہے کہ بیوع جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے ان میں عقد کے وقت گواہ بنانا ہے اور اس پر دلیل قائم ہے کہ گواہ بنانا بیوع کے فرائض میں سے نہیں ہے اور وہ نکاح جس میں اللہ تعالیٰ نے گواہ بنانے کا ذکر نہیں کیا ہے تو اس کے لئے زیادہ لائق اور مناسب ہے کہ گواہ بنانا اس کی شروط اور فرائض میں سے نہ ہو، بلاشبہ مقصود انساب کی حفاظت کے لئے اعلان اور ظہور ہے۔ اور اشہاد کی ضرورت عقد کے بعد تب ہوتی ہے جب دو نکاح کرنے والوں کے درمیان کوئی اختلاف یا ایک دوسرے کے خلاف کوئی دعویٰ منعقد ہو اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: اعلنوا النکاح (1) تم نکاح کا اعلان کرو۔ امام مالک کا یہ قول ابن شہاب اور اکثر اہل مدینہ کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: **وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ** اور مومن غلام **خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ** مشرک حسب والے سے بہتر ہے۔ **وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ** اگر چہ اس کا حسب اور اس کا مال تمہیں اچھا لگے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: مومن آدمی اور اسی طرح **لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ** سے مراد مومنہ عورت ہے، جیسا کہ ہم نے اسے بیان کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے تمام مرد اللہ تعالیٰ کے غلام اور تمہاری تمام عورتیں اللہ تعالیٰ کی باندیاں ہیں۔'' مزید فرمایا: ''تم اللہ تعالیٰ کی باندیوں کو اللہ تعالیٰ کی مساجد سے نہ روکو (2)۔'' اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝** (ص) (بڑا خوبیوں والا بندہ ہر وقت ہماری طرف متوجہ) یہی وہ اچھا اور حسین قول ہے جس پر اس آیت کو محمول کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ نزاع ختم ہو جاتا ہے اور اختلاف زائل ہو جاتا ہے۔ واللہ الموفق

1۔ ابن ماجہ، باب اعلان النکاح، حدیث نمبر 1884، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4655

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ میں اشارہ مشرک مردوں اور مشرکہ عورتوں کی طرف ہے۔ یَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ یعنی وہ ایسے اعمال کی طرف دعوت دیتے ہیں جو آتش جہنم کا موجب ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی صحبت اور ان کا طرز معاشرت نسل کی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی خواہشات میں سے کثیر میں انحطاط اور تنزل کا سبب بنتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ اور اللہ تعالیٰ اہل جنت کے عمل کی طرف بلاتا ہے۔ بِاِذْنِهٖ اپنے امر سے۔ زجاج نے یہی کہا ہے۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

''اور وہ پوچھتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق۔ فرمایئے: وہ تکلیف دہ ہے، پس الگ رہا کرو عورتوں سے حیض کی حالت میں اور نہ نزدیک جایا کرو ان کے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو جاؤ ان کے پاس جیسے حکم دیا ہے تمہیں اللہ نے، بے شک اللہ دوست رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے صاف ستھرا رہنے والوں کو۔''

اس میں چودہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ۔ طبری نے سدی سے ذکر کیا ہے کہ سائل حضرت ثابت بن دحداح ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ حضرت اسید بن حضیر اور حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہما ہیں اور یہی اکثر مفسرین کا قول ہے اور سوال کے سبب کے بارے میں حضرت قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ مدینہ منورہ اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے عرب لوگ حیض والی عورتوں کے ساتھ کھانے پینے اور ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنے سے اجتناب کرنے میں بنی اسرائیل کے طریقے پر چلتے تھے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: وہ حالت حیض میں عورتوں سے دور رہتے تھے اور وہ زمانہ حیض کی مدت ان کی دبروں میں وطی کرتے تھے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔

اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہودیوں میں جب کوئی عورت حائضہ ہوتی تھی تو وہ گھروں میں نہ اس کے ساتھ مل کر کھاتے تھے اور نہ ان کے ساتھ مجامعت کرتے تھے۔ پس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے پوچھا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ الی آخر الآیہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اصنعوا کل شی الا النکاح (تم ان کے ساتھ وطی کے سوا ہر معاملہ کرو) یہ خبر یہودیوں کے پاس پہنچی، تو انہوں نے کہا: یہ آدمی ہمارے امور میں سے کسی شے کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا مگر اس نے ہر معاملے میں ہماری مخالفت کی ہے۔ پس حضرت اسید بن حضیر اور حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہما دونوں آئے اور انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ یہودی اس اس طرح کہہ رہے ہیں، کیا ہم ان (عورتوں) سے جماع نہ کیا کریں؟ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا، یہاں تک کہ ہمیں یہ گمان ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں پر غصے اور ناراض ہوں گے،

پس وہ دونوں نکل گئے اور پھر ان دونوں کے سامنے رسول اللہ ﷺ کے پاس دودھ کا ہدیہ آیا، تو آپ ﷺ نے وہ ان کے پیچھے بھیج دیا اور ان دونوں نے خوب سیر ہو کر پیا اور انہیں پہچان ہو گئی کہ آپ ﷺ ان پر ناراض نہیں۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: یہودی اور مجوسی حیض والی عورتوں سے دور رہتے تھے اور عیسائی حیض والی عوتوں سے مجامعت کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان کا قصد کرتے ہوئے یہ حکم ارشاد فرمایا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: عَنِ الْمَحِيْضِ۔ الْمَحِيْضِ سے مراد حیض ہے اور یہ مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے: حاضت المرأۃ حیضا و محاضا و محیضا فھی حائض اور یہ حائضۃ بھی ہے۔ فراء نے ایک شعر میں کہا ہے:

كحائضة يُزْنَى بِها غيرَ طاهر (جیسا کہ حیض والی عورت اس سے ناپاک حالت میں زنا کیا جاتا ہے)

اور (کہا جاتا ہے) نساء حیض و حوائض اور الحَیضۃ کا معنی ہے: ایک بار۔ اور الحِیضۃ کسرہ کے ساتھ اسم ہے اور جمع الحِیَض ہے۔ اور الحیضۃ کا معنی وہ کپڑے کا ٹکڑا بھی ہے جس کے ساتھ عورت اپنی فرج کو (حیض آنے کے وقت) باندھتی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: لیتنی کنتُ حِیضۃ مُلْقَاۃً(1) (اے کاش! میں وہ کپڑے کا ٹکڑا ہوتی جسے پھینک دیا جاتا ہے۔) اسی طرح المحیضۃ ہے اور اس کی جمع المحائض ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ المحیض زمان و مکان سے عبارت ہے اور نفس حیض کو بھی محیض کہا جاتا ہے، یہ زمان و مکان میں اصل ہے اور حیض کے معنی میں مجاز ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے: المحیض حیض کا اسم (نام) ہے اور اسی کی مثل رؤبہ کا عیش کے بارے قول ہے۔

اليك أشكو شدّة المَعِيش و مرَّ أعوام نتفن ريشي

میں زندگی کی تلخی اور شدت کی تیرے پاس شکایت کر رہا ہوں اور سال ہا سال گزر گئے، انہوں نے میرے بال و پر اکھیڑ دیے۔

اور کلمہ کی اصل سیلان (بہہ پڑنا) اور انفجار (پھوٹ پڑنا) سے ہے۔ کہا جاتا ہے: حاض السیل و فاض سیلاب پھوٹ پڑا اور بہہ گیا اور حاضت الشجرۃ یعنی درخت کی رطوبت ظاہر ہو گئی بہہ گئی۔

اور اسی طرح الحیض بمعنی الحوض ہے، کیوں کہ پانی اس کی طرف بہتا ہے اور عرب یاء کی جگہ واؤ اور واؤ کی جگہ یاء داخل کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ دونوں ایک ہی حیز سے ہیں۔

ابن عرفہ نے کہا ہے: المحیض اور الحیض کا معنی اس کے محل کی طرف خون کا جمع ہونا ہے اور اسی سبب سے حوض کو بھی یہ نام دیا گیا ہے کیونکہ اس میں پانی جمع ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: حاضت المرأۃ و تحیضت، و درست و عرکت، و طمثت، تحیض حیضاً و مَحَاضاً وَ محیضاً جبکہ معلوم اوقات میں عورت کا خون بہہ پڑے۔ اور جب وہ غیر معلوم ایام میں جاری ہو اور حیض کی رگ کے سوا کہیں اور سے آئے تو پھر تو کہے گا: أستحیضت فھی مستحاضۃ کہ عورت مستحاضہ ہو گئی۔ (یہ) ابن عربی نے کہا ہے۔ اور اس کے آٹھ اسماء ہیں (۱) حائض (۲) عارک (۳) فارک (۴) طامس (۵) دارس (۶) کابر (۷) ضاحک (۸) طامث۔

1۔ مصنف عبدالرزاق، 16، 206

حضرت مجاہد نے ارشاد باری تعالیٰ: فَضَحِكَتْ کا معنی بیان کیا ہے: حاضت۔ پس وہ حائضہ ہو گئی۔ اور قول باری تعالیٰ: فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ یعنی حضن (پس جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو وہ حائضہ ہو گئیں۔) اس کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ عورت کے لئے اپنی فرج سے ظاہر بہنے والا خون دیکھنے کی حالت میں تین احکام ہیں۔ پس ان میں سے حیض معروف ہے اور خون حیض سیاہ گاڑھا ہو اس پر سرخی غالب ہو اور یہ کہ عورت اس کی وجہ سے نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا ترک کر دے گی۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور کبھی یہ خون متصل (مسلسل) آتا ہے اور کبھی منقطع ہوتا ہے (یعنی ایک دو دن کے وقفے سے آتا ہے) پس اگر یہ متصل جاری رہے تو اس کے لئے حکم ثابت ہوگا اور اگر منقطع ہو اور عورت ایک دن خون دیکھے اور ایک دن طہر یا وہ دو دن خون دیکھے اور دو دن یا ایک دن طہر تو بلا شبہ وہ خون کے دنوں میں نماز چھوڑ دے گی اور اس کے انقطاع کے وقت غسل کرے گی اور نماز پڑھ لے گی، پھر وہ خون کے ایام کو اکٹھا کر لے گی اور درمیان میں آنے والے ایام طہر کو لغو چھوڑ دے گی، اور وہ انہیں عدت اور استبرا کی صورت میں طہر شمار نہیں کرے گی۔ حیض عورتوں کی فطرت میں ہے اور ان کی معروف طبعی عادت ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (1) نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے دن عید گاہ کی طرف تشریف لائے اور آپ عورتوں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: اے عورتوں کے گروہ! تم صدقہ کرو کیونکہ اہل نار میں سے اکثر تم مجھے دکھائی گئی ہو۔ تو انہوں نے عرض کی: کیوں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو اور خاوندوں کی نافرمانی کرتی ہو۔ میں نے تم سے بڑھ کر ناقصات عقل و دین کسی کو نہیں دیکھا جو ایک محتاط آدمی کی عقل و فہم کو ختم کر دے۔ تو انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم عقل و دین کے اعتبار سے ہم میں کون سی کمی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا عورت کی شہادت آدمی کی شہادت کے نصف کے برابر نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کی: ہاں، کیوں نہیں، پھر آپ نے فرمایا: یہ ان کی عقل کی کمی کی وجہ سے ہے اور کہا: جب وہ حائضہ ہو جائے تو وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے، کیا اسی طرح نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کی: ہاں، یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ان کے دین کی کمی کی وجہ سے ہے۔"

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حائضہ عورت روزے کی قضا کرے گی اور نماز کی قضا نہیں کرے گی۔

حضرت معاذہ کی حدیث ہے انہوں نے کہا: میں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا اور کہا: حیض والی عورت کو کیا ہے کہ وہ روزے کی قضا کرتی ہے اور نماز کی قضا نہیں کرتی؟ تو انہوں نے فرمایا: کیا تو حروریہ (☆) ہے؟ میں نے

1۔ بخاری شریف، باب ترك الحائض الصوم، حدیث نمبر 293، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ حروریہ خوارج کا ایک گروہ ہے اور یہ کوفہ کے قریب ایک گاؤں حروراء کی طرف منسوب ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا۔ ان کے نزدیک دین میں انتہائی شدت اور سختی ہے جیسا کہ معروف ہے۔

کہا: میں حروریہ تو نہیں، البتہ میں پوچھ رہی ہوں۔ تو پھر انہوں نے فرمایا: چونکہ وہ ہمیں لاحق ہوتا رہتا ہے اس لئے ہمیں روزے کی قضا کا حکم دیا گیا ہے اور نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا گیا، اسے مسلم نے روایت کیا ہے(1) اور جب عورت کا خون ختم ہو جائے تو اس کے لئے اس سے پاکیزگی اور طہارت غسل ہے اس کا بیان آگے آ رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے حیض کی مقدار میں اختلاف کیا ہے:

فقہائے مدینہ نے کہا ہے: بلاشبہ حیض پندرہ دنوں سے زیادہ نہیں ہوتا اور یہ جائز ہے کہ وہ پندرہ دن اور اس سے کچھ کم ہو اور جو پندرہ دنوں سے زیادہ ہو گا وہ حیض نہ ہو گا بلکہ وہ استحاضہ ہے۔ یہ مذہب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کا ہے۔

اور امام مالک سے یہ بھی مروی ہے کہ حیض کے قلیل ہونے اور کثیر ہونے کا کوئی وقت نہیں مگر وہی جو عورتوں میں پایا جاتا ہے (یعنی ان کی عادت ہوتی ہے)۔ گویا آپ نے اپنا پہلا قول چھوڑ دیا ہے اور عورتوں کی عادت کی طرف رجوع کر لیا ہے۔

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کم سے کم طہر پندرہ دن ہے، بغداد کے رہنے والے اکثر اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہی اختیار کیا ہے اور یہی امام شافعی، امام اعظم ابوحنیفہ، ان دونوں کے اصحاب اور امام ثوری رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اور اس باب میں صحیح قول یہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیض والی عورتوں کی عدت تین حیض مقرر کی ہے اور جنہیں بڑھاپے یا صغر سنی کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو ان کی عدت تین ماہ مقرر کی ہے، گویا کہ ہر حیض ایک مہینے کا عوض ہے اور مہینہ طہر اور حیض دونوں کو جامع ہوتا ہے۔ پس جب حیض کم ہو گا تو طہر زیادہ ہو گا اور جب حیض کے دن زیادہ ہوں گے تو طہر کے دن کم ہوں گے۔ پس جب حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہو تو واجب ہے کہ اس کے مقابلے میں کم سے کم طہر کی مدت پندرہ دن ہو۔ تاکہ ایک مہینے میں حیض اور طہر دونوں مکمل ہو جائیں اور قرآن وسنت کے دلائل کے ساتھ عورتوں کی خلقت اور ان کی فطرت میں اغلباً یہی متعارف ہے۔

اور امام شافعی نے فرمایا ہے: کم سے کم حیض کی مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور اس کی اکثر مدت پندرہ دن ہے اور ان سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل بھی مروی ہے کہ اسے عورتوں کے عرف اور عادت کی طرف لوٹا دیا گیا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ حیض کی کم از کم مدت تین دن ہے اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ ان کے نزدیک جو خون تین دنوں سے کم ہو گا وہ استحاضہ ہو گا، یہ نماز کے مانع نہیں ہوتا مگر جب کہ یہ پہلی بار ظاہر ہو، کیونکہ اس کی انتہائی مدت معلوم نہیں ہوتی۔ پھر عورت پر ان اوقات کی نماز قضا کرنا لازم ہے۔ اسی طرح وہ خون جو دس دنوں سے زیادہ ہو (وہ بھی) اہل کوفہ کے نزدیک استحاضہ ہے۔ اور اہل حجاز کے نزدیک جو پندرہ دنوں سے زائد ہو گا وہ دم استحاضہ ہو گا اور جو ایک دن اور ایک رات سے کم ہو گا امام شافعی کے نزدیک وہ استحاضہ ہو گا اور یہی قول امام اوزاعی اور طبری کا ہے اور جنہوں نے کہا ہے کہ حیض کی کم سے کم مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے ان میں سے حضرت عطا بن ابی رباح، حضرت ابوثور اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔

1۔ بخاری شریف، باب لا تقضی الحائض الصلوٰۃ، حدیث نمبر 310، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

امام اوزاعی نے کہا ہے: ہمارے پاس ایک عورت صبح کے وقت حائضہ ہوتی ہے اور شام کے وقت پاک ہو جاتی ہے۔

حیض کی اکثر اور اقل مدت، طہر کی اقل مدت، احتیاط اور اس کی حجت کے بارے میں ہم نے اس باب میں وہی کچھ ذکر کیا ہے جسے علماء نے اپنایا ہے۔

پس المقتبس فی شرح مؤطا مالک بن انس میں ہے کہ اگر کسی عورت کو پہلی بار حیض آئے تو امام شافعی کے قول کے مطابق جو خون وہ پہلی بار دیکھے گی وہ پندرہ دن تک بیٹھی رہے گی پھر وہ غسل کرے گی اور چودہ دن کی نماز لوٹائے گی۔

اور امام مالک نے کہا ہے: وہ نماز قضا نہیں کرے گی اور اس کے خاوند کو اس سے روکا جائے گا۔ علی بن زیاد نے ان سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کی مقدار بیٹھی رہے گی اور یہی قول حضرت عطا اور ثوری وغیرہما کا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ ایک دن اور ایک رات بیٹھے گی، پھر وہ غسل کرے گی اور نماز پڑھے گی اور اس کا خاوند اس کے پاس نہ آئے گا۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ دس دن نماز چھوڑے رکھے گی۔ پھر غسل کرے گی اور بیس دن تک نماز پڑھتی رہے گی، پھر بیس دنوں کے بعد دس دن کے لئے نماز چھوڑ دے گی، پس اس کی یہی حالت جاری رہے گی یہاں تک کہ اس سے خون ختم ہو جائے۔ رہی وہ عورت جس کے دن معلوم ہوں تو وہ ایام معلومہ کے مطابق تین دنوں تک احتیاط کرے گی۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے: جب تک وہ پندرہ دنوں سے تجاوز نہ کرے۔ امام شافعی نے کہا ہے: جب اس کے دن گزر جائیں تو بغیر کسی احتیاط کے وہ غسل کرے گی۔

خون میں سے دوسرا دم نفاس ہے جو ولادت کے وقت ظاہر ہوتا ہے: علماء کے نزدیک اس کے لئے بھی معلوم حد ہے اور اس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔

پس کہا گیا ہے کہ وہ دو مہینے ہیں۔ یہی امام مالک کا قول ہے اور بعض نے کہا ہے: وہ چالیس دن ہیں۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ ان کے علاوہ بھی قول کیے گئے ہیں۔

اور اس سے طہارت اس کے ختم ہونے کے وقت حاصل ہوتی ہے اور اس کا غسل غسل جنابت کی طرح ہے۔ قاضی ابو محمد عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حیض اور نفاس کا خون گیارہ چیزوں سے روکتا ہے اور وہ نماز کا واجب ہونا، اسے پڑھنا، صحیح ہونا، روزہ رکھنا نہ کہ اس کا واجب ہونا (یعنی روزے کا وجوب برقرار رہتا ہے لیکن اسے عملاً رکھنا مؤخر ہو جاتا ہے) اور فرق کا فائدہ یہ ہے کہ روزے کی قضا لازم ہے اور نماز کی قضا لازم نہیں۔ فرج اور اس کے سوا میں جماع کرنا، عدت، طلاق، طواف، قرآن کریم کو مس کرنا، مسجد میں داخل ہونا، اس میں اعتکاف کرنا اور قرآن کی قراءت میں دو روایتیں ہیں۔

اور تیسری قسم کا خون وہ ہے جو نہ عورتوں کی عادت ہے اور نہ ان کی طبع اور خلقت میں داخل ہے۔ بلاشبہ یہ ایک رگ ہے جو کٹ جاتی ہے اور اس سے سرخ رنگ کا خون بہتا ہے اور یہ خون منقطع نہیں ہوتا مگر تبھی جبکہ وہ تندرست اور مندمل ہو جائے اور اس کا حکم یہ ہے کہ عورت اس کی موجودگی میں بھی پاک ہوتی ہے اور یہ اس کے لئے نماز، روزے سے مانع نہیں ہوتا۔ اس پر

علماء کا اجماع ہے اور آثار مرفوعہ کا اتفاق ہے بشرطیکہ یہ معلوم ہو کہ یہ رگ کا خون ہے، خون حیض نہیں ہے۔

امام مالک (1) نے ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: فاطمہ بنت ابی حبیش نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پاک نہیں ہوتی! کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ وہ رگ (کا خون) ہے، حیض نہیں ہے۔ جب تجھے حیض آئے تو نماز چھوڑ دے اور جب اس کی مقدار (دن) گزر جائیں تو تو اپنے آپ سے خون دھو ڈال اور نماز پڑھ لے۔'' یہ حدیث اپنے صحیح ہونے اور اپنے الفاظ قلیل ہونے کے ساتھ ساتھ حائضہ اور مستحاضہ کے احکام تفصیل سے بیان کرتی ہے۔ اس باب میں جو روایات ہیں یہ حدیث ان سے زیادہ صحیح ہے اور یہ حدیث اس کا رد کرتی ہے جو عقبہ بن عامر اور مکحول سے مروی ہے کہ حیض والی عورت ہر نماز کے وقت غسل کرے گی اور وضو کرے گی اور بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لئے قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوگی۔ اور اس میں ہے کہ حائضہ عورت نماز نہیں پڑھے گی اور اس پر تمام علماء کا اجماع ہے سوائے خوارج کے ایک گروہ کے کہ وہ کہتے ہیں: حیض والی عورت پر نماز ہے۔ اور اس حدیث میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ مستحاضہ عورت پر سوائے اس غسل کے جو وہ انقطاع حیض کے وقت کرتی ہے اور کوئی غسل لازم نہیں، اگر اس کے علاوہ بھی غسل اس پر لازم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بارے اسے حکم ارشاد فرما دیتے اور اس میں ان کے قول کا بھی رد ہے جن کا خیال ہے کہ اس پر ہر نماز کے لئے غسل لازم ہے اور ان کے قول کا بھی جن کا خیال یہ ہے کہ وہ دن کی دو نمازوں کو ایک غسل کے ساتھ جمع کرلے اور رات کی دو نمازوں کے لئے ایک غسل کرلے اور وہ صبح کی نماز کے لئے علیحدہ غسل کرے اور ان کے قول کا جنہوں نے کہا: وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے گی اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے اس قول کا بھی کہ وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے گی۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے اس قول کا بھی کہ وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے کسی شے کا حکم اسے ارشاد نہیں فرمایا۔ اور اس میں اس کے قول کا بھی رد ہے جس نے انتظار و احتیاط کی بات کی ہے۔ کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے (فاطمہ کو) یہ حکم دیا کہ جب تجھے یقین ہو جائے کہ حیض ختم ہو چکا ہے تو تو غسل کرلے اور نماز پڑھ لے، آپ نے اسے یہ حکم نہیں دیا کہ وہ حیض آنے یا نہ آنے کے انتظار میں تین دن تک نماز چھوڑے رکھے اور احتیاط نماز پڑھنے میں ہوتی ہے نہ کہ اسے چھوڑنے میں۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ هُوَ اَذًى، یعنی یہ وہ شے ہے جس کے سبب عورت اور اس کے سوا مرد کو اذیت اور تکلیف ہوتی ہے یعنی خون حیض کی بدبو کے سبب۔ اور الاذی قذر اور نجاست سے کنایہ ہے۔ اور اس کا اطلاق قول مکروہ پر بھی ہوتا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (البقرہ: 264) (مت ضائع کرو اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر اور دکھ پہنچا کر) یعنی اس مکروہ اور ناپسندیدہ قول کے ساتھ جو تم اسے سناتے ہو اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَدَعْ اَذٰىهُمْ (الاحزاب: 48) (اور پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی۔) یعنی آپ منافقین کی اذیت رسانی کی پرواہ

1۔ بخاری شریف، باب الاستحاضۃ، حدیث نمبر 295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نہ کریں آپ انہیں جزا نہ دیں مگر یہ کہ ان میں امیر بنادیں۔ اور حدیث طیبہ میں ہے: و أمیطوا عنه الأذی (1) اور اس سے اذیت کو دور کرو۔ اس میں الاذی سے مراد وہ بال ہیں جو پیدائش کے وقت بچے کے سر پر ہوتے ہیں اور ساتویں دن اس سے مونڈ دیے جاتے ہیں اور یہی عقیقہ ہے اور حدیث ایمان میں ہے و ادناھا اماطة الأذی عن الطریق راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دو۔ یعنی کانٹے، پتھر اور ان کی طرح کی دیگر چیزیں جن سے گزرنے والا کسی تکلیف میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ اور رب کریم کا ارشاد: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ (النساء: 102) اس کا ذکر آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 6۔ دم استحاضہ بہنے کے سبب جنہوں نے مستحاضہ عورت سے وطی کرنے سے منع کیا ہے انہوں نے استدلال کیا اور کہا: ہر خون تکلیف دہ (نجس) ہے، اسے کپڑے اور بدن سے دھونا واجب ہوتا ہے، پس دم حیض اور استحاضہ کے درمیان مباشرت کی حالت میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ یہ مکمل طور پر ناپاکی اور نجاست ہے۔ اور رہی نماز تو اس کی رخصت کے بارے حدیث طیبہ موجود ہے جیسا کہ سلس البول کی بیماری کی حالت میں نماز پڑھی جاسکتی ہے، یہ قول ابراہیم نخعی، سلیمان بن یسار، حکم بن عیینہ، عامر شعبی، ابن سیرین اور زہری کا ہے اور حسن کی جانب سے اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔

اور یہی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ مستحاضہ کا خاوند اس کے ساتھ صحبت نہیں کرے گا اور اسی طرح ابن علیہ اور مغیرہ بن عبدالرحمٰن نے کہا ہے اور یہ اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ میں سے اعلیٰ ترین افراد میں سے ہیں اور ابو مصعب نے بھی یہی کہا ہے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا جاتا ہے۔

اور جمہور علماء نے کہا ہے: مستحاضہ عورت روزہ رکھ سکتی ہے، نماز پڑھ سکتی ہے، طواف کعبہ کرسکتی ہے اور قرآن کریم کی تلاوت کرسکتی ہے اور اس کا خاوند بھی اس کے ساتھ مباشرت کرسکتا ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: اہل فقہ وعلم نے اسی کا حکم دیا ہے، اگرچہ اس کا خون بہت زیادہ بھی ہو اور آپ سے اسے ابن وہب نے روایت کیا ہے۔

اور امام احمد فرماتے ہیں: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ خاوند اس سے وطی نہ کرے، البتہ اگر عرصہ طویل ہوجائے تو پھر وطی کرسکتا ہے۔

اور مستحاضہ کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کا خاوند اس کے ساتھ جماع کرے اگرچہ اس کا خون اس کی ایڑیوں پر بہہ رہا ہو۔

اور امام مالک نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلا شبہ وہ رگ کا خون ہے وہ حیض نہیں ہے۔'' پس جب وہ حیض نہیں ہے تو پھر کون سی شے ہے جو خاوند کو اس کے پاس جانے سے روک سکتی ہے حالانکہ وہ نماز بھی پڑھ رہی ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مستحاضہ کے خون کے بارے میں یہ حکم فرمادیا ہے کہ وہ نماز کے مانع نہیں ہے اور وہ عورت اس حالت میں حائضہ کی عبادت کے سوا بھی عبادت کرسکتی ہے تو پھر یہ ضروری ہے کہ اس کے لئے حیض کے

1۔ بخاری شریف، باب اماطة الأذی عن الصبی فی العقیقة، حدیث نمبر 5049، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

احکام میں سے کسی شے کا حکم نہ لگایا جائے مگر وہی جس پر اجماع ہے (یعنی) تمام خونوں کی طرح اسے بھی دھونا لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ یعنی تم زمانہ حیض میں عورتوں سے علیحدہ رہو، یہ تب ہے جبکہ محیض کو مصدر بنایا جائے یا معنی یہ ہے کہ تم عورتوں سے علیحدہ رہو محل حیض میں جبکہ محیض کو اسم بنایا جائے اور اس نہی کا مقصود مجامعت ترک کرنا ہے۔

حائضہ عورت کے ساتھ مباشرت کے بارے میں اور جو کچھ اس سے مباح سمجھا جاتا ہے اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عبیدہ السلمانی سے مروی ہے کہ یہ واجب ہے کہ آدمی اپنی بیوی کے بستر سے علیحدہ رہے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو۔ یہ قول شاذ ہے اور علماء کے قول سے خارج ہے۔ اگرچہ عموم آیت اس کا تقاضا کرتی ہے لیکن سنت ثابتہ اس کے خلاف ہے اور جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ حضرت ام میمونہ رضی اللہ عنہا اس پر آگاہ ہوئیں تو آپ نے فرمایا: کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے اعراض کر رہے ہو۔

اور امام مالک، شافعی، اوزاعی، ابوحنیفہ، ابو یوسف اور علماء کی ایک بہت بڑی جماعت رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: مرد کے لئے عورت کے اس حصے سے استمتاع جائز ہے جو ازار کے اوپر ہے، کیونکہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک آدمی نے پوچھا تو آپ نے اسے ارشاد فرمایا: (سائل نے کہا) کیا حالت حیض میں میری بیوی میرے لئے حلال ہوتی ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا: چاہیے کہ وہ اپنی ازار (چادر) مضبوطی کے ساتھ باندھ لے تو پھر اس کے اوپر سے وہ تیرے لئے مباح ہے۔

اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حالت حیض میں تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ارشاد فرمایا: اپنی چادر کو مضبوط باندھ لے پھر اپنے بستر کی طرف لوٹ آ۔ (1)

اور امام ثوری، محمد بن حسن اور بعض اصحاب شافعی نے کہا ہے کہ وہ محل خون سے اجتناب کرے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''تم ہر عمل کرو سوائے وطی کے۔'' اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور یہی داؤد کا قول ہے اور امام شافعی کے قول سے یہی صحیح ہے۔

ابو معشر نے ابراہیم کے واسطہ سے مسروق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا میری زوجہ میرے لئے حلال ہوتی ہے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو؟ تو انہوں نے فرمایا: سوائے فرج کے ہر شے حلال ہے۔

علماء نے کہا ہے: حائضہ عورت کے ساتھ مباشرت (کا مباح ہونا) اس حال میں کہ وہ چادر باندھے ہوئے ہو احتیاط اور ذریعہ وسبب کو ختم کرنے کے لئے ہے، کیونکہ اگر اس کی رانوں سے استمتاع مباح ہو تو یہ محل خون (فرج) تک پہنچنے کا ذریعہ اور سبب ہے جو کہ بالاجماع حرام ہے، پس احتیاطاً اس کا حکم دیا گیا ہے اور فی نفسہ محل دم کو حرام قرار دیا گیا اور آثار کے معانی اس کے ساتھ متفق ہیں، کوئی تضاد نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 8۔ اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جو حالت حیض میں عورت کے ساتھ مجامعت کرتا ہے کہ اس پر

1۔ بخاری شریف، باب من سمی النفاس حیضا والحیض نفاسا، حدیث نمبر 289، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا ہوگا؟

حضرت امام مالک، شافعی اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے: وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اور مزید اس پر کوئی شے لازم نہیں، یہی قول ربیعہ اور یحییٰ بن سعید کا ہے اور اسی طرح داؤد نے بھی کہا ہے اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ نصف دینار صدقہ کرے گا۔(1)

اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: عبدالحمید کی حدیث کتنی اچھی ہے کہ وہ مقسم کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے گا۔'' اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: اسی طرح صحیح روایت ہے۔ فرمایا: دینار یا نصف دینار۔ علامہ طبری نے اسے مستحب قرار دیا ہے، پس اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس پر کوئی شے نہ ہوگی اور بغداد میں امام شافعی کا یہی قول ہے۔

اور محدثین میں سے ایک جماعت نے کہا ہے: اگر اس نے خون کی حالت میں وطی کی تو اس پر دینار ہوگا اور اگر اس نے خون کے انقطاع کی حالت میں وطی کی تو اس کے لئے نصف دینار ہوگا۔

اور امام اوزاعی نے کہا ہے: جس نے اپنی بیوی کے ساتھ حالت حیض میں وطی کی تو وہ ایک دینار کے دو خمس صدقہ کرے۔ ان تمام کی اسناد سنن ابی داؤد اور دار قطنی وغیرہ میں ہیں۔

اور کتاب ترمذی (2) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے: ''جب خون سرخ ہو تو ایک دینار ہوگا اور خون کا رنگ زرد ہو تو نصف دینار ہوگا۔''

ابوعمر نے کہا ہے: ان کی دلیل جنہوں نے استغفار اور توبہ کے سوا ایسے آدمی پر کوئی کفارہ واجب نہیں کیا اس حدیث کا مضطرب ہونا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی مثل حدیث حجت نہیں بن سکتی، کیونکہ فی الاصل ہر کوئی ذمہ داری سے بری ہے اور یہ واجب نہیں کہ اس میں کسی مسکین اور کسی دوسرے کے لئے کوئی شے ثابت ہو مگر کسی دلیل کے ساتھ جس میں نہ کوئی رد ہو اور نہ اس پر طعن ہو اور یہ اس مسئلہ میں معدوم ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: میں نے علامہ الشاشی سے مجلس النظر میں سنا ہے وہ فرماتے ہیں: جب کہا جائے لا تقرب یعنی راء کے فتحہ کے ساتھ تو اس کا معنی ہے تو کام میں مشغول نہ ہو اور اگر راء کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے تو اس کے قریب نہ ہو۔

نافع، ابوعمرو، ابن کثیر، ابن عامر اور حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہم نے اس روایت میں جو حفص نے ان سے نقل کی ہے يَطْهُرْنَ طا کے سکون اور ہا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور حمزہ، کسائی اور حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہم نے ابوبکر اور مفضل کی روایت میں یطهرن یعنی طا اور ہا دونوں کو شد اور فتحہ کے

1۔ ابوداؤد، باب فی کفارۃ من اتی حائضا، حدیث نمبر 1853، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی الکفارۃ فی ذالک، حدیث نمبر 127، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ساتھ پڑھا ہے اور حضرت ابی اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما کے مصحف میں یَتَطَهَّرْنَ ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ولا تقربوا النساء فی محیضهن واعتزلوهن حتی یتطهرن ہے۔ اور علامہ طبری نے طا کی تشدید والی قراءت کو ترجیح دی ہے۔ اور کہا ہے: یہ بمعنی یغتسلن ہے، کیونکہ اس پر تمام کا اجماع ہے کہ آدمی پر حرام ہے کہ وہ اپنی زوجہ کا خون ختم ہونے کے بعد اس کے پاک ہونے سے پہلے اس کے قریب جائے۔ انہوں نے کہا: بلاشبہ طہر میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے، تو ایک گروہ نے کہا ہے کہ طہر سے مراد پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: کہ اس سے مراد نماز کے وضو کی طرح وضو کرنا ہے اور ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس سے مراد شرمگاہ کو دھونا ہے۔ اور یہ اسے اپنے خاوند کے لئے حلال کر دے گا اگرچہ اس نے غسل نہ بھی کیا۔

اور ابوعلی فارسی نے طا کی تخفیف والی قراءت کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ ثلاثی ہے اور طمث کی ضد ہے اور یہ بھی ثلاثی ہے۔

مسئلہ نمبر 10 ۔ قولہ تعالیٰ: فَاِذَا تَطَهَّرْنَ، یعنی جب وہ پانی کے ساتھ طہارت حاصل کر لیں، یہی موقف امام مالک اور جمہور علماء کا ہے اور بلاشبہ وہ طہارت جس کے سبب حائضہ عورت سے جماع حلال ہو جاتا ہے جب اس کا خون ختم ہو جائے وہ اس کا پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرنا ہے جیسا کہ جنبی کی طہارت (پانی کے ساتھ حاصل ہوتی ہے) اور تیمم یا کوئی اور اس کی جانب سے جائز نہ ہوگا، یہی امام مالک، امام شافعی، طبری، محمد بن مسلمہ، اہل مدینہ اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی کہا ہے۔ اور یحییٰ بن بکیر اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: جب حیض والی عورت پاک ہو جائے (یعنی اس کا خون ختم ہو جائے) اور اس نے ایسی جگہ تیمم کر لیا جہاں پانی نہ ہو تو وہ اپنے خاوند کے لئے حلال ہو گئی اگرچہ اس نے غسل نہ بھی کیا ہو۔

حضرت مجاہد، عکرمہ اور طاؤس رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: خون کا منقطع ہونا ہی اسے زوج کے لئے حلال کر دیتا ہے، لیکن اسے وضو کر لینا چاہئے۔

امام اعظم ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اگر اس کا خون دس دن گزرنے کے بعد ختم ہوا تو آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ غسل سے پہلے اس سے وطی کر لے اور اگر خون کا انقطاع دس دنوں سے پہلے پہلے ہو گیا تو پھر جائز نہیں ہے یہاں تک کہ وہ غسل کر لے یا اس پر نماز کا وقت داخل ہو جائے۔ یہ ایسا فیصلہ ہے جس کی کوئی وجہ اور علت نہیں، تحقیق انہوں نے حائضہ عورت کے لئے اس کا خون منقطع ہونے کے بعد اس طرح فیصلہ کیا ہے جو عدت میں محبوس ہو۔ اور انہوں نے اس کے خاوند کو کہا: عورت کی طرف رجوع کرنا جائز ہے جب تک وہ تیسرے حیض سے غسل نہ کر لے، پس ان کے اس قول کے قیاس کی بنا پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے وطی کی جائے یہاں تک کہ وہ غسل کر لے یہ اہل مدینہ کے ساتھ موافقت ہے۔

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس میں حکم کو دو شرطوں پر معلق کیا ہے: ان میں سے ایک خون کا منقطع ہونا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتّٰی یَطْهُرْنَ اور دوسرا پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِذَا تَطَهَّرْنَ یعنی جب وہ پانی کے ساتھ غسل کر لیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ الآیہ (النساء: 6) (اور آزماتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح (کی عمر کو)۔ اس میں بھی حکم دو شرطوں پر معلق ہے اور حکم

مال دینے کا جواز ہے۔ دو شرطوں میں سے ایک مکلف کا نکاح کی عمر کو پہنچنا ہے اور دوسرا دانائی کا محسوس کرنا ہے، اسی طرح مطلقہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (البقرہ: 230) (تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ) پھر عسیلہ کی شرط (مراد جماع ہے) کے بارے حدیث پاک موجود ہے۔ پس حلالہ بھی مجموعی طور پر دو امروں پر موقوف ہوا اور وہ نکاح کا انعقاد اور وطی کا پایا جانا ہے۔ (1)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: بے شک آیت کا معنی ہے: شرط میں غایت وہی ہے جو اس سے پہلی غایت میں مذکور ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰى يَطْهُرْنَ یعنی مخفف بعینہ يَطَّهَّرْنَ مشدد کے معنی میں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آیت میں دو لغتوں کو جمع کر دیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ (التوبہ) (اس میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے کو اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پاک صاف لوگوں سے۔) کمیت نے کہا ہے:

وما كانت الانصارُ فيها أذِلَّةً ولا غُيَّبًا فيها اذا الناسُ غُيَّبُ

اور یہ بھی کہ دو قراءتیں دو آیتوں کی طرح ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ان دونوں کے مطابق عمل کیا جائے۔ اور ہم ان دونوں میں سے ہر ایک کو علیحدہ معنی پر محمول کرتے ہیں۔ پس ہم مخفف کو اس معنی پر محمول کرتے ہیں جبکہ اس کا خون دس دنوں سے کم میں ختم ہو جائے، تو ہم اس کے ساتھ وطی کی اجازت نہیں دیتے یہاں تک کہ وہ غسل کر لے، کیونکہ آدمی خون کے دوبارہ لوٹ آنے سے محفوظ اور امن میں نہیں ہوتا اور ہم دوسری قراءت کو اس معنی پر محمول کرتے ہیں جبکہ اس کا خون اکثر مدت پر جا کر ختم ہو تو اس صورت میں اس کے ساتھ وطی جائز ہوتی ہے اگرچہ وہ غسل نہ بھی کرے۔

حضرت ابن عربی نے کہا ہے: ان کے دلائل میں سے یہ قوی ترین ہے۔ پس پہلے (استدلال) کا جواب یہ ہے کہ وہ فصحاء کے کلام میں سے نہیں ہے اور نہ ہی بلغاء کی زبان ہے، کیونکہ وہ تعداد میں تکرار کا تقاضا کرتا ہے اور جب لفظ کو ایک الگ فائدہ پر محمول کرنا ممکن ہو تو اسے لوگوں کے کلام میں تکرار پر محمول نہیں کیا جاتا، تو پھر علیم حکیم رب کریم کے کلام میں کیسے ممکن ہو سکتا ہے اور دوسرے (استدلال) کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ معنی پر محمول ہے، تو پھر ان پر لازم ہے کہ جب خون منقطع ہو جائے تو وہ اس کے لئے غسل سے پہلے رجعت کی صورت میں حیض کا حکم نہ لگائیں اور وہ اس طرح نہیں کہتے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے اور یہ عورت جب حائضہ ہے تو حیض والی عورت کے ساتھ وطی کرنا بالاتفاق جائز نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی جو انہوں نے کہا ہے وہ اکثر مدت پر انقطاع دم اباحت وطی کا تقاضا کرتا ہے اور جو ہم نے کہا ہے وہ ممنوع ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور جب ایسی دو دلیلوں کے درمیان تعارض آ جائے جن میں سے ایک نہی کا تقاضا کرتی ہو اور دوسری اباحت کا تو ان دونوں کے باعث اور سبب کو غلبہ دیا جائے گا (پس) نہی کے سبب کو غلبہ دیا جائے گا، جیسا کہ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے ملک یمین کی حیثیت سے دو بہنوں کو جمع کرنے کے بارے میں کہا ہے۔ ایک آیت نے دونوں کو حلال قرار دیا ہے

1۔ بخاری شریف، باب من اجاز طلاق الثلاث لقول اللہ تعالی الطلاق مرتان فامساك بمعروف أو تسريح، حدیث نمبر 4856، ضیاء القرآن

اور دوسری نے دونوں کو حرام قرار دیا ہے اور تحریم اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 11۔ ہمارے علماء نے کتابیہ عورت کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا اسے غسل کرنے پر مجبور کیا جائے گا یا نہیں، تو حضرت امام مالک نے ابن قاسم کی روایت میں کیا ہے: ہاں، تا کہ خاوند کے لئے اس کے ساتھ وطی حلال ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ آپ کہتے ہیں: جب وہ پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرلیں اور یہ صرف مسلمان عورت کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اسے حیض کے سبب غسل پر مجبور نہ کیا جائے گا کیونکہ وہ اس کا اعتقاد ہی نہیں رکھتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ: 228) (اور جائز نہیں ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور روز آخرت پر) اور وہ حیض اور حمل ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خطاب صرف مومنہ عورتوں کو کیا ہے اور فرمایا ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ: 252) (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے) اور اسی طرح محمود بن عبد الحکم بھی کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 12۔ حائضہ عورت کے غسل کا طریقہ وہی ہے جو اس کے غسل جنابت کا طریقہ ہے، اس پر اس میں اپنے بالوں کو کھولنا لازم نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے سر کی مینڈھیاں باندھے ہوئے ہوں کیا میں غسل جنابت کے لئے انہیں کھول دوں گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں بلکہ تیرے لئے اپنے سر پر تین بار پانی بہانا کافی ہوگا پھر تو اپنے سارے بدن پر پانی بہائے گی تو تو پاک ہو جائے گی۔'' اور ایک روایت میں ہے: کیا میں (1) انہیں حیض اور جنابت (کے غسل) کے لئے کھولوں گی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں''۔ ابوداؤد نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے: ''اور تو ہر چلو ڈالتے وقت اپنے سر کو خوب ملے گی۔''

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ، یعنی اور تم ان سے جماع کرو۔ یہ امر اباحت کے لئے ہے اور اتیان وطی سے کنایہ ہے اور یہ امر اسے مزید مضبوط اور قوی کرتا ہے جو کچھ ہم نے کہا ہے کہ تطہر سے مراد پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے صیغہ امر یقیناً اکمل وجہ پر ہی واقع ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور مِنْ بمعنی فی ہے، یعنی تم اس محل میں جماع کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے اور وہ قُبل (فرج) ہے اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ (فاطر: 40) یعنی فی الارض (مجھے بھی تو دکھاؤ زمین کا وہ گوشہ جو انہوں نے بنایا ہے) اور یہ ارشاد بھی ہے: اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ (الجمعہ: 9) یعنی فی الجمعة (جب تمہیں) بلایا جائے نماز کی طرف جمعہ کے دن)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے یعنی اس وجہ سے جس میں تمہیں اجازت دی گئی ہے، یعنی جب تم روزے، احرام اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی المرأة هل تنقض شعرها عند الغسل، حدیث نمبر 219، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اعتکاف کی حالت میں نہ ہو۔ اصم نے یہی کہا ہے۔ اور ابن عباس اور ابورزین نے کہا ہے: (معنی ہے) طہر کی جانب سے نہ کہ حیض کی جانب سے اور ضحاک نے بھی یہی کہا ہے۔ اور محمد بن حنفیہ نے کہا ہے: معنی ہے من قبل الحلال لا من قبل الزنی یعنی حلال طریقے سے نہ کہ زنا کے طریقے سے۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ۝ اس میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ مراد ہے گناہوں اور شرک سے توبہ کرنے والے اور المتطهرون یعنی جنابت اور حدث کے لاحق ہونے کے وقت پانی سے طہارت اور پاکیزگی حاصل کرنے والے۔ حضرت عطا وغیرہ نے یہی کہا ہے اور حضرت مجاہد نے کہا: التوابین سے مراد گناہوں سے توبہ کرنے والے ہیں اور آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے: عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں جماع کرنے سے توبہ کرنے والے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: گویا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف دیکھا ہے جو لوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں بطور حکایت ہے: اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْیَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ یَّتَطَهَّرُوْنَ۝ (الاعراف) (باہر نکال دو انہیں اپنی بستی سے یہ لوگ تو بڑے پاکباز بنتے ہیں۔)

اور یہ بھی قول ہے: المتطهرون وہ ہیں جنہوں نے گناہ نہیں کیے اور اگر کہا جائے کہ جس نے گناہ کیے ہیں اس کا ذکر اس پر مقدم کیسے ہو سکتا ہے جس نے گناہ نہیں کیے، تو جواب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر پہلے کیا تا کہ توبہ کرنے والا رحمت سے مایوس اور ناامید نہ ہو جائے اور متطہر اپنی ذات کے بارے میں عجب اور خود پسندی میں مبتلا نہ ہو جائے، جیسا کہ دوسری آیت میں ذکر کیا ہے: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ (فاطر: 32) اس کا بیان آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ۝

"تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں تو تم آؤ اپنے کھیت میں جس طرح چاہو اور پہلے پہلے کر لو اپنی بھلائی کے کام اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ تم ملنے والے ہو اس سے اور (اے حبیب) خوشخبری دو مومنوں کو۔"

اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ائمہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (1) اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ فرمایا: یہودی کہتے تھے جب کوئی آدمی اپنی عورت کے ساتھ اس کی دبر کی جانب سے اس کی قبل (فرج) میں وطی کرتا ہے تو بچہ بھینگا ہوتا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ اور زہری سے ایک روایت میں یہ زائد ہے: اگر چاہے تو اسے اوندھا لٹائے اور اگر چاہے تو سیدھا لٹائے مگر وطی ایک سوراخ میں ہو اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4164، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صمام کا لفظ سمام سین کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ترمذی نے یہی کہا ہے۔ (1)

اور امام بخاری نے حضرت نافع سے روایت کیا ہے (2) کہ انہوں نے فرمایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب قرآن کریم پڑھتے تھے تو گفتگو نہ کرتے تھے یہاں تک کہ قراءت سے فارغ ہو جاتے۔ پس ایک دن میں قرآن کریم اٹھائے ہوئے تھا اور انہوں نے سورۃ البقرہ پڑھی یہاں تک کہ اس مقام (اس آیت) پر پہنچ کر رک گئے فرمایا: کیا تو جانتا ہے کیونکر یہ آیت نازل کی گئی ہے؟ میں نے عرض کی نہیں۔ فرمایا: یہ اس اس میں نازل ہوئی ہے، پھر آپ آگے پڑھنے لگے۔

اور عبد الصمد نے بیان کیا ہے کہ میرے باپ نے مجھے بتایا کہ مجھے ایوب نے نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بیان کی ہے: فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ کے بارے انہوں نے کہا: یا تیھا فی۔ یعنی اس میں مجرور محذوف ہے۔ حمیدی نے کہا ہے: وہ الفرج ہے (3) یعنی وہ اس کے ساتھ فرج میں جماع کرے۔

ابو داؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: بلاشبہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو وہم ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، بلاشبہ یہ انصار کا ایک قبیلہ تھا، وہ بت پرست تھے اور اس قبیلے کے ساتھ یہودی بھی تھے اور وہ اہل کتاب ہیں۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر علم میں فضیلت دیتے تھے اور وہ بہت سے افعال میں ان کی اقتدا کرتے تھے اور اہل کتاب کے امور میں سے ایک یہ تھا کہ وہ عورتوں کے ساتھ ایک طرف پر جماع کرتے تھے اور یہ عورت کے لئے زیادہ باعث ستر ہوتا تھا۔ پس انصار کے اس قبیلے نے ان کے افعال میں سے اس فعل کو بھی اختیار کر لیا اور یہ قبیلہ قریش میں سے تھا جو عورتوں کو گدی کے بل لٹا کر ان سے وطی کرتے تھے اور ان سے لذت حاصل کرتے تھے، کبھی سامنے کی جانب سے، کبھی پیچھے کی جانب سے اور کبھی چت لٹا کر، پس جب مہاجرین مدینہ طیبہ آئے تو ان میں سے ایک آدمی نے انصار کی ایک عورت سے شادی کی اور وہ اس کے ساتھ وہی کچھ کرنے لگا، تو اس نے اسے ناپسند کیا اور ایسا کرنے سے روکا اور کہا: ہمارے ہاں عورت کے ساتھ ایک طرف سے جماع کیا جاتا ہے پس تو بھی اسی طرح کر ورنہ مجھ سے دور ہو جا، یہاں تک کہ ان دونوں کا معاملہ بڑھ گیا اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ یعنی سامنے کی جانب سے، پیچھے کی جانب سے اور چت لیٹنے کی حالت میں (محل حرث میں جماع کرو۔) اور یہی محل ولد ہے۔ (4)

امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: کس شے نے تمہیں ہلاک کیا ہے؟ عرض کی: آج رات میں نے اپنے پالان (مراد بیوی ہے) کو الٹا کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ راوی نے بیان کیا: پھر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ آیت وحی فرمائی:

1۔ سنن ترمذی، باب سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر 2904، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4163، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

4۔ سنن ابی داؤد، باب فی جامع النکاح، حدیث نمبر 1849، ایضاً

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ، اقبل و ادبر واتق الدبر والحیضة (تو سامنے کی جانب سے اور پیچھے کی جانب سے وطی کر اور دبر اور حالت حیض میں وطی کرنے سے بچ۔) فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔(1)

اور نسائی نے ابوالنضر سے بیان کیا ہے کہ اس نے نافع مولیٰ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کہا: تمہارے بارے میں اکثر قول ہے کہ تم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کرتے ہو کہ انہوں نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں جماع کیا جا سکتا ہے۔ تو حضرت نافع نے فرمایا: تحقیق انہوں نے میرے بارے میں جھوٹ بولا: البتہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ معاملہ کیسے تھا۔ ایک دن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے قرآن کریم مجھے دیا اور میں ان کے پاس تھا یہاں تک کہ وہ اس آیت پر پہنچے۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ۔ فرمایا: نافع! کیا تو جانتا ہے اس آیت کا حکم کیا ہے؟ بے شک ہم گروہ قریش عورتوں کو منہ کے بل اوندھا لٹاتے تھے، جب ہم مدینہ منورہ میں آئے اور ہم نے انصار کی عورتوں سے نکاح کیے تو ہم نے ان سے وہی کرنا چاہا جو ہم اپنی عورتوں سے کرتے تھے تو ان عورتوں نے اسے ناپسند کیا اور اسے بڑا معاملہ قرار دیا، کیونکہ انصار کی عورتوں کے ساتھ ان کے پہلوؤں کے بل جماع کیا جاتا تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى

مسئلہ نمبر 2۔ یہ احادیث تمام کیفیات اور حالت کی اباحت میں نص ہیں بشرطیکہ وطی محل حرث میں ہو، یعنی جس کیفیت میں تم چاہو پیچھے کی جانب سے اور آگے کی جانب سے وہ سینے کے بل لیٹی ہوئی ہو یا چت یا پہلو کے بل۔ اور رہا محل حرث کے سوا کسی جگہ میں وطی کرنا تو یہ نہ مباح رہا ہے اور نہ اسے مباح کیا جائے گا اور حرث کا ذکر اس پر دلالت کرتا ہے کہ محل حرث کے سوا میں وطی کرنا حرام ہے۔ اور حرث یہ تشبیہ ہے، کیونکہ ان میں بھی بیج بویا جاتا ہے اور لفظ حرث واضح کرتا ہے کہ اباحت صرف اور صرف فرج میں واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ وہی بیج ڈالنے کا محل ہے اور ثعلب نے کہا ہے:

انما الأرحام أرض　　ون لنا محترثات

بے شک ارحام زمینیں ہیں ہمارے لئے کھیتیاں بنائی گئی ہیں۔

فعلینا الزرع فیها　　و علی الله النبات

پس ہمارے اوپر ان میں بیج ڈالنا ہے اور اگانا (یعنی اولاد عطا کرنا) اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے۔

پس عورت کی فرج زمین کی طرح ہے اور نطفہ بیج کی مانند ہے اور بچہ نباتات کی طرح ہے۔ پس الحرث بمعنی المحترث ہے اور الحرث کو واحد لایا گیا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: رَجلٌ صومٌ، وقومٌ صَومٌ۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اَنّٰى شِئْتُمْ جمہور صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ فتویٰ کے نزدیک اس کا معنی ہے: جس طرح تم چاہو سامنے کی جانب سے اور پشت کی جانب سے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ اور آنّیٰ سوال کے لئے اور کسی کام کی خبر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی کئی جہتیں ہیں اور یہ لغوی اعتبار سے کیف، این اور متی سے عام ہے۔ یہی انی میں عربی استعمال ہے اور لوگوں نے اس آیت میں انہی الفاظ کے ساتھ انی کی تفسیر بیان کی ہے۔

1۔ سنن ترمذی، باب من سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر 2906، ایضاً

اور سیبویہ نے کیف اور این دونوں کے ساتھ اکٹھی اس کی تفسیر بیان کی ہے۔

اور ایک فرقہ نے این کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی ہے اور یہ موقف اپنایا ہے کہ دبر میں وطی مباح ہے اور جن کی طرف یہ قول منسوب ہے وہ حضرت سعید بن مسیب، حضرت نافع، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم، حضرت محمد بن کعب قرظی اور عبدالملک بن ماجشون رحمۃ اللہ علیہما ہیں اور اسے امام مالک سے ان کی جس کتاب سے بیان کیا گیا ہے اس کا نام کتاب السر ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ماہر اصحاب اور ان کے مشائخ اس کتاب کا انکار کرتے ہیں اور امام مالک کا مقام و مرتبہ اس سے کہیں بلند اور اعلیٰ ہے کہ ان کے لئے کتاب السر ہو اور یہ قول العتبیہ میں ہے۔

اور علامہ ابن عربی نے ذکر کیا ہے کہ ابن شعبان نے اس قول کے جواز کو صحابہ کرام اور تابعین میں سے بہت بڑی جماعت کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بہت سی روایات کتاب جماع النسوان و احکام القرآن میں منسوب کی ہیں اور الکیا الطبری نے کہا ہے: محمد بن کعب قرظی سے روایت ہے کہ وہ اس میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے اور وہ اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کرتے تھے: اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَۙ وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ (الشعراء) (کیا تم بدفعلی کے لئے جاتے ہو مردوں کے پاس ساری مخلوق سے اور چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لئے تمہارے رب نے تمہاری بیویاں۔) اور فرمایا: تقدیر کلام یہ ہے تترکون مثل ذلك من ازواجكم یعنی تم اس کی مثل اپنی بیویاں چھوڑ دیتے ہو، اگر اس کی مثل بیویوں سے مباح نہ ہوتا تو یہ صحیح نہ ہوتا اور اس کی مثل کسی دوسرے محل میں مباح نہیں، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے: تم وہ کرتے ہو اور اس کی مثل مباح کو چھوڑ دیتے ہو۔

الکیا نے کہا: یہ بات محل نظر ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: اور تم چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لئے تمہارے رب نے تمہاری بیویاں جن میں تمہاری شہوت کی تسکین ہے اور جماع کی لذت ہے۔ یہ دونوں ایک ساتھ حاصل ہو جاتی ہیں، پس اس معنی پر زجر و توبیخ جائز ہے، قول باری تعالیٰ: فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اس ارشاد گرامی کے ساتھ: فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ محل جس میں واقع ہونا ہے وہ خاص ہے اور وہ اسی میں مقصور ہے جو محل ولد ہے (یعنی جس محل میں وطی کرنے سے اولاد کا ہونا ممکن ہے وہی محل حرث ہے اور اسی میں جماع جائز ہے تو چونکہ دبر میں یہ عمل کرنے سے اولاد کا امکان نہیں اس لئے نہ وہ محل حرث ہے اور نہ ہی اس میں وطی مباح ہے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس مسئلہ میں یہی حق اور صحیح ہے۔

ابو عمر بن عبدالبر نے ذکر کیا ہے کہ علماء نے رتقاء میں اختلاف نہیں کیا۔ یہ ایسی عورت ہے جس سے وطی نہیں کی جا سکتی، یہ عیب ہے اس کے سبب اسے رد کیا جا سکتا ہے، مگر وہ روایت جو حضرت عمر بن عبدالعزیز سے کئی طرق سے مروی ہے وہ قوی نہیں ہے وہ یہ کہ رتقاء کو نہیں لوٹایا جائے گا اور نہ کسی اور کو، تمام کے تمام فقہاء اس کے خلاف ہیں کیونکہ مسیس (وطی) ہی نکاح کا مقصود ہے اور اس پر ان کے اجماع میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ دبر محل وطی نہیں ہے اور اگر یہ وطی کا محل ہوتی تو پھر اسے رد نہ کیا جاتا جس کی فرج میں وطی نہ کی جا سکتی ہو۔

اوران کے اجماع میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ ایسی بانجھ عورت جو بچے نہیں جنتی اسے رد نہیں کیا جائے گا۔ اور اس مسئلہ میں صحیح وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے اور وہ جو امام مالک اور ان کے اصحاب کی طرف منسوب ہے وہ باطل ہے اور وہ اس سے بری الذمہ ہیں، کیونکہ وطی کی اباحت محل حرث کے ساتھ مختص ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَأْتُوا حَرْثَكُمْ اور اس لئے بھی کہ بیویوں کو پیدا کرنے میں حکمت نسل کو پھیلانا ہے اور جو اس کا محل نہیں ملک نکاح اسے شامل ہی نہیں ہوتی۔ یہی بات حق ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے کہا ہے: ہمارے نزدیک وہ (یعنی دبر میں وطی کرنا) اور ذکر کو ساتھ مس کرنا حکم میں برابر ہیں۔ کیونکہ محل نجاست میں قذر (گندگی) اور اذیت دم حیض کی نسبت زیادہ ہے، پس وہ زیادہ شنیع اور برا ہے اور رہی بول کی تکلیف تو یہ رحم کی تکلیف کے سوا ہے۔

علامہ ابن عربی نے قبس میں کہا ہے کہ ہمیں الشیخ الامام فخر الاسلام ابوبکر محمد بن احمد بن حسین فقیہ وقت اور امام وقت نے کہا: فرج پینتیس چیزوں کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتی ہے اور انہوں نے اپنے ہاتھ پر گن کر بتایا اور کہا: بول کا راستہ تیس کے ماتحت ہے اور ذکر اور فرج کا راستہ وہ ہے جس پر پانچ مشتمل ہیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرج کو حالت حیض میں عارضی نجاست کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے تو پھر دبر کو لازمی نجاست کی وجہ سے حرام قرار دیا جانا بدرجہ اولیٰ ہے۔

اور امام مالک نے ابن وہب اور علی بن زیاد کو اس وقت کہا جب ان دونوں نے انہیں یہ خبر دی کہ مصر میں لوگ آپ کے بارے میں یہ باتیں کرتے ہیں کہ وہ اسے (دبر میں وطی کو) جائز قرار دیتے ہیں تو آپ نے اس سے نفرت کی (اسے انتہائی ناپسند کیا) اور ناقل کی تکذیب بالفور کی اور فرمایا: انہوں نے میرے بارے میں جھوٹ بولا ہے، انہوں نے میری تکذیب کی ہے، انہوں نے میری طرف جھوٹی نسبت کی ہے۔ (کذبوا علیّ تین بار کہا) پھر فرمایا: کیا تم عرب قوم نہیں ہو؟ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ تو کیا اگانے والے محل کے سوا کوئی کھیت ہو سکتا ہے (اور وہ محل فرج ہی ہے۔)

اور جس سے مخالف نے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنّٰى شِئْتُمْ یہ اپنی عمومیت کے اعتبار سے تمام راستوں کو شامل ہے (یعنی قبل اور دبر دونوں کو) تو اس میں ان کے لئے کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے کیونکہ جو ہم نے اس کے بارے ذکر کیا ہے اس کے سبب یہ خاص ہو چکا ہے اور ان احادیث کے سبب جو صحیح، حسن اور مشہور ہیں اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بارہ صحابہ کرام نے مختلف متنوں کے ساتھ روایت کیا ہے وہ تمام کی تمام عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں وطی کے حرام ہونے پر دال ہیں۔

انہیں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں، ابوداؤد، نسائی اور ترمذی رحمہم اللہ وغیرہم نے روایت کیا ہے اور انہیں ابوالفرج بن جوزی نے ان کی سندوں سمیت ایک جز میں جمع کیا ہے اور اس کا نام رکھا ہے تحریم المحل المکروہ اور ہمارے شیخ ابوالعباس نے بھی ایک جز میں جمع کیا ہے اور اس کا نام رکھا اظہارُ ادبار من أجاز الوطی فی الادبار۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی وہ حق ہے جس کی اتباع کی گئی ہے اور اس مسئلہ میں صحیح (نظریہ) ہے اور اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھنے والے کو نہیں چاہئے کہ وہ اس مصیبت میں پڑے کیونکہ یہ عالم کی خطا اور لغزش ہے اس کے بعد کہ اس کے بارے میں صحیح روایات موجود ہیں اور ہمیں عالم کی غلطی سے ڈرایا اور محفوظ رکھا گیا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کے خلاف مروی ہے اور جس نے ایسا کیا اس کی تکفیر مروی ہے اور یہی آپ رضی اللہ عنہ کے لائق اور شایان شان ہے۔ اسی طرح حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے اسے جھوٹا قرار دیا ہے جس نے آپ کی طرف سے اس بارے میں بیان کیا، جیسا کہ امام نسائی نے ذکر کیا ہے اور وہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور امام مالک نے اس کا انکار کیا اور اسے بہت بڑا قدم قرار دیا اور جس نے اسے آپ کی طرف منسوب کیا اسے جھوٹا قرار دیا۔

اور الدارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں سعید ابن یسار ابی الحباب سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا: آپ ان عورتوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں جن کے ساتھ تحمیض کی جائے؟ آپ نے فرمایا: تحمیض کیا ہے؟ تو میں نے عرض کیا: ''دبر''، تو آپ نے فرمایا: کیا مسلمانوں میں سے بھی کوئی ایسا کرتا ہے۔

اور حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مسند روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ''اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ حق سے حیا نہیں کرتا تم عورتوں کی دبروں میں وطی نہ کرو'' اور اسی کی مثل حضرت علی بن طلق سے بھی مروی ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مسند روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے عورت کے ساتھ اس کی دبر میں وطی کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر (کرم) نہیں فرمائے گا۔''

اور ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حضرت قتادہ سے، انہوں نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ لواطت صغریٰ ہے'' (1)۔ یعنی عورت کی دبر میں وطی کرنا۔

اور حضرت طاؤس سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں وطی کرنے سے ہی قوم لوط کا عمل شروع ہوا تھا۔

ابن منذر نے کہا ہے: جب کوئی شے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو پھر جو بھی اس کے سوا ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ، یعنی پہلے پہلے وہ عمل کر لو جو کل (یعنی آخرت میں) تمہارے لئے باعث نفع ہوں، اس میں مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی تصریح اس ارشاد باری تعالیٰ میں کی گئی ہے: وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ (البقرہ:110) (اور جو کچھ آگے بھیجو گے اپنے لئے نیکیوں سے ضرور پاؤ گے اس کا ثمر اللہ کے ہاں) پس معنی یہ ہوا تم اپنے لئے طاعت اور عمل صالح آگے بھیجو (یعنی پہلے پہلے کر لو)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اولاد اور نسل کی چاہت ہے کیونکہ اولاد دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔ تحقیق بیٹا شفیع بھی ہوتا ہے اور ڈھال بھی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد پاک دامن عورتوں سے شادی کرنا ہے تا کہ اولاد صالح اور طاہر ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد افراط کو آگے بھیجنا ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ''جس نے تین بچے آگے بھیجے جو ن

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 6706

بلوغت کو نہ پہنچے ہوں تو آگ اسے مس نہ کرے گی مگر کفارہ قسم کے طور پر'' الحدیث (1)۔ اس کا بیان سورۂ مریم میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عباس اور حضرت عطا رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: جماع کے وقت پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''اگر تم میں سے کوئی جب اپنی بیوی کے پاس مجامعت کے لئے آیا اور اس نے یہ پڑھا بسم اللہ اللّٰھم جنبنا الشیطان و جنب الشیطان ما رزقتنا (اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں۔ اے اللہ! تو ہمیں شیطان سے دور رکھ اور شیطان کو اس سے دور رکھ جو تو نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔) تو اگر ان دونوں کے مابین بچہ مقدر رہوا تو شیطان کبھی بھی اسے ضرر نہ پہنچائے گا۔'' اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَاتَّقُوا اللّٰهَ یہ تحذیر ہے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ یہ خبر ہے جو تحذیر میں مبالغہ کا تقاضا کرتی ہے، یعنی وہ تمہیں نیکی اور گناہ پر جزا دے گا۔ ابن عیینہ نے عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے اور کہا ہے: میں نے سعید بن جبیر کو سنا انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا اور انہوں نے فرمایا: میں نے سعید بن جبیر کو سنا انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا اور انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوران خطبہ یہ فرماتے ہوئے سنا: ''بلاشبہ تم اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرو گے اس حال میں کہ تم سر اور پاؤں سے ننگے ہو گے، پیدل ہو گے اور غیر مختون ہو گے۔'' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ۔ مسلم نے اسے اسی معنی میں روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ نیکی کرنے والے اور ہدایت کے طریقے تلاش کرنے والے کے لئے تانیس ہے۔ (2)

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

''اور نہ بناؤ اللہ (کے نام) کو رکاوٹ اس کی قسم کھا کر کہ نیکی نہ کرو گے اور پرہیز گاری نہ کرو گے اور صلح نہ کراؤ گے لوگوں میں اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے فرمایا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے اور یتیموں کے ساتھ زندگی گزارنے اور عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم فرمایا تو فرمایا: تم مکارم اخلاق میں سے کسی شے سے انکار نہ کرو اس علت کی بنا پر کہ ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ ہم اس طرح نہ کریں گے، یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابراہیم نخعی، مجاہد اور ربیع رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے سوا کئی دوسروں نے بیان کیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ واقسموا باللہ جھد ایمانھم، حدیث نمبر 6164، ایضا

2۔ صحیح بخاری، باب کیف العشاء، حدیث نمبر 6043، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: مراد ایسا آدمی ہے جو قسم کھالیتا ہے کہ وہ نیکی نہ کرے گا اور صلہ رحمی نہ کرے گا اور نہ لوگوں کے درمیان صلح کرائے گا، پس اسے کہا جاتا ہے: تو نیکی کر، تو وہ کہتا ہے: میں نے تو (نیکی نہ کرنے کی) قسم کھا رکھی ہے۔
اور بعض تاویل کرنے والوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جھوٹ بولتے ہوئے قسمیں نہ کھاؤ جب تم نیکی، پرہیزگاری اور اصلاح (صلح کرانے) کا ارادہ کرو، پس اُن کے بعد لاَ کو مقدر ماننے کی ضرورت نہ ہوگی۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کثرت سے قسمیں نہ کھاؤ کیونکہ یہ دلوں کو خوفزدہ کر دیتی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ (اور تم اپنی قسموں کی حفاظت کرو) اور کثرت سے قسمیں کھانے والے کی مذمت بیان فرمائی۔ سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ (القلم) (اور نہ بات مانیئے کسی (جھوٹی) قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کی۔) اور عرب کم قسمیں کھانے کے سبب تعریف کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کسی کہنے والے نے کہا:

قليل الألايا حافظٌ ليمينه　　وان صدرت منه الألية برّتِ

کم قسمیں کھانے والا اپنی قسم کی حفاظت کرتا ہے اور اگر اس سے قسم صادر ہو جائے تو وہ سچی ہو جاتی ہے۔
اس بنا پر اَنْ تَبَرُّوْا کا معنی ہے تم قسمیں کم کھاؤ کیونکہ اس میں نیکی اور پرہیزگاری ہے، کیونکہ کثیر قسموں کے ساتھ حِنث (قسم توڑنا) بھی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کی رعایت اور پاسداری میں کمی واقع ہوتی ہے، یہ تاویل حسن اور اچھی ہے۔
حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ قسم ہر شے میں رائج ہے اور کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ تم ہر حق اور باطل میں تصرف کے لئے قسم نہ کھاؤ۔
اور زجاج وغیرہ نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے کہ ایک آدمی ایسا ہوتا ہے کہ جب اس سے فعل خیر کا مطالبہ کیا جائے تو اللہ کے ساتھ عذر پیش کرتا ہے اور کہہ دیتا ہے: مجھ پر قسم ہے، حالانکہ اس نے قسم نہیں کھائی ہوتی۔ قتبی نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ جب تم یہ قسم کھاؤ کہ تم صلہ رحمی نہ کرو گے، صدقہ نہ کرو گے اور صلح نہیں کراؤ گے اور انہی کے مشابہ نیکی اور خیر کے کاموں سے متعلقہ قسمیں تو تم قسم کا کفارہ ادا کر دو۔
میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ (تاویل) حسن ہے اس کے لئے جو ہم نے بیان کیا ہے اور اسی پر سبب نزول بھی دلالت کرتا ہے، ہم اس کے بعد والے مسئلہ میں اسے بیان کریں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وجہ سے نازل ہوئی، جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ مسطح پر (مال) خرچ نہ کریں گے جس وقت اس نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے باتیں کیں (اور آپ پر تہمت لگائی) جیسا کہ حدیث الافک میں ہے، اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔ یہ ابن جریج سے مروی ہے۔(1)
اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ النور، حدیث نمبر 4381، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مہمانوں کے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے۔(1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ بشیر بن نعمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ کلام نہیں کریں گے اور وہ آپ کی بہن کی نسبت سے آپ کے داماد تھے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ یعنی کھڑی کی ہوئی علامت۔ یہ جوہری سے منقول ہے۔

اور فلان عرضة ذاك یعنی فلاں اس کے لئے علامت (رکاوٹ) ہے، یعنی وہ اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور وہ اس پر قوی اور غالب ہے اور عرضہ کا معنی الھمة بھی ہے۔ کسی نے کہا:

هم الأنصار عرضتها اللقاء

وہ انصار ہیں ان کا ارادہ لشکر سے ملاقات ہے۔

اور فلان عرضة للناس اور فلاں لوگوں کا ٹارگٹ ہے: وہ مسلسل اس میں واقع ہوتے رہتے ہیں۔ و جعلت فلانا عرضة لكذا یعنی میں نے فلاں کو اس کے لئے علامت قرار دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عرضة یہ شدت اور قوت سے ہے اور اسی سے عورت کے لئے ان کا قول ہے: عرضة للنكاح، جب وہ نکاح کی صلاحیت رکھے اور اس کے لئے قوی ہو جائے۔

اور لفلان عرضة: یعنی فلاں کے لئے سفر اور جنگ کی قوت و طاقت ہے۔ کعب بن زہیر نے کہا ہے:

من كل نضّاخة الذّفرى اذا عرقت عُرضَتُها طامسُ الاعلامِ مجهولُ

اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

فهذى لأيام الحروب و هذه لِلَهْوِى و هذى عرضةٌ لارتحالنا

پس یہ جنگ کے دنوں کے لئے ہے اور لہو ولعب کے لئے ہے اور یہ ہمارے سفر کے لئے قوت و طاقت ہے۔ یعنی تیاری ہے۔ اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

فَلَا تجعلنى عُرضة للّوائم

اور اوس بن حجر نے کہا ہے:

وأدماء مثل الفحل يوماً عرضتُها لرحلى و فيها هزّةٌ و تقاذُفُ

اور معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ قسم کھانے کو اپنے لئے قوت نہ بناؤ اور نیکی سے رکنے کے لئے بہانہ نہ بناؤ۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی البر و التقوىٰ و الاصلاح أولى و أمثل: یعنی نیکی کرنا، تقوی اختیار کرنا اور صلح کرانا زیادہ بہتر اور زیادہ اچھا ہے۔

جیسا کہ یہ قول ہے طاعةٌ و قول معروف یہ زجاج اور نحاس سے منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا محل نصب ہے،

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حدیث نمبر 5675، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یعنی تمہیں اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم نیکی، تقویٰ اور صلح کرانے سے باز نہ رکھے، یہ بھی زجاج سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مفعول من اجلہ ہے اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ألا تبروا اور لا کو حذف کر دیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا۔ ای لئلا تضلوا (اللہ تعالیٰ تمہارے لئے بیان فرماتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ) طبری اور نحاس نے اسی طرح کہا ہے اور وجوہ نصب میں سے چوتھی وجہ یہ ہے: کراھة ان تبروا، (کہ نیکی کو ناپسند کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے نام کی قسمیں نہ کھاؤ۔) پھر اسے حذف کر دیا گیا ہے، اسے نحاس اور مہدوی نے ذکر کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ محل جر میں ہے۔ یہ قول خلیل اور کسائی کا ہے اور تقدیر کلام ہے: فی أنْ تبروا اور فی مضمر کر دیا گیا اور اس کے ساتھ اسے جر دی گئی۔

اور سَمِیْعٌ یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کے اقوال کو سننے والا ہے۔ عَلِیْمٌ اور ان کی نیتوں کو جاننے والا ہے۔

لَا یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْۤ اَیْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ یُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۲۲۵﴾

''نہیں پکڑے گا تمہیں اللہ تعالیٰ تمہاری لایعنی قسموں پر لیکن پکڑے گا تمہیں ان قسموں پر جن کا ارادہ تمہارے دلوں نے کیا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا حلم والا ہے۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: بِاللَّغْوِ۔ اللغو: یہ مصدر ہے لَغَا یَلْغُوْ وَیَلْغٰی، و لَغِیَ یَلْغَی لَغًا جب کلام میں کوئی ایسی شے ذکر کی جائے جس کی حاجت اور ضرورت نہ ہو یا ایسی شے کو لانا جس میں خیر اور بھلائی نہ ہو یا ایسی شے جس کا گناہ لغو ہو جائے اور حدیث میں ہے: ''جب تو اپنے ساتھی کو کہے ''خاموش ہو جا'' اس حال میں کہ امام جمعہ کا خطبہ دے رہا ہو تو تو نے لغو عمل کیا'' (1) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی لغت میں۔ لَغَوْتَ کی بجائے لغیت ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

وَ رُبَّ أسراب حجیج کُظَّمِ عن اللَّغا و رَفَثِ التَّکَلُّمِ

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

و لستَ بمأخوذ بلَغْوٍ تقولُه اذا لم تَعَمَّد عاقداتِ العزائمِ

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا یمین لغو کے بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: کسی آدمی کا وہ قول جو اس کے کلام کے درمیان میں ہو اور محاورہ میں اس کی عجلت پسندی کے سبب ہو: لا واللہ اور بلیٰ واللہ، یہ (الفاظ) قسم کے ارادے سے نہ ہوں۔

مروزی نے کہا ہے: وہ یمین لغو جس پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ لغو ہے وہ آدمی کا یہ قول ہے: لا واللہ اور بلیٰ واللہِ۔ جبکہ یہ اس کی گفتگو اور کلام میں واقع ہوں نہ ان سے قسم کا اعتقاد ہو اور نہ ہی قسم کا ارادہ ہو۔

اور ابن وہب نے یونس سے اور انہوں نے ابن شہاب سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ ام

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، حدیث نمبر 882، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

المومنین زوج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یمین لغو وہ ہے جو (محض) دکھاوا، تمسخر اور مزاح میں ہو اور وہ بات جس پر دل کا اعتقاد نہ ہو۔

اور بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ ایک آدمی کے اس قول کے بارے میں نازل ہوا: (یعنی) لا واللہ اور بلی واللہ۔

اور کہا گیا ہے: لغو وہ ہے جس کے بارے میں کوئی ظن کی بنا پر قسم کھاتا ہے اور وہ امر قسم کے خلاف ہوتا ہے، امام مالک نے یہی کہا ہے آپ سے اسے ابن قاسم نے بیان کیا ہے اور اسلاف میں سے ایک جماعت نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب آدمی کسی شے کی قسم کھائے اور اس کا ظن یہی ہو کہ وہ اسی طرح ہے جبکہ (فی الحقیقت) وہ اس طرح نہ ہو تو وہ قسم لغو ہوگی اور اس میں کفارہ نہیں ہے، اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور روایت ہے کہ ایک قوم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گفتگو کا تبادلہ کیا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں تہمت عائد کرنے لگے تو ان میں سے ایک نے قسم کھائی کہ میں نے درست کہا اور اے فلاں! تو نے غلط بیانی کی ہے، جبکہ معاملہ اس کے خلاف نکلا، تو اس آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ حانث ہو گیا ہے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: أیمان الرُّماۃ لغو لا حنثَ فیھا ولا کفارۃ(1) (گفتگو میں زیادتی کی قسم لغو ہے، اس میں نہ حانث ہونا ہے اور نہ کوئی کفارہ ہے۔)

اور موطا میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اس بارے میں جو سب سے اچھا میں نے سنا ہے (وہ یہ ہے) کہ اللغو سے مراد انسان کا کسی شے کے بارے میں قسم کھانا ہے جس کے بارے وہ یقین رکھتا ہو کہ وہ اسی طرح ہے پھر وہ اس کے برعکس پائی جاتی ہے، اس میں کفارہ نہیں ہے اور وہ جو کسی شے کے بارے میں قسم کھاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ اس میں گنہگار ہے، جھوٹا ہے تاکہ وہ اس کے ساتھ کسی کو راضی کرے یا مخلوق کے لئے معذرت کرے یا وہ اس کے ذریعہ مال ہتھیا لے تو یہ اس سے بڑھ کر ہے کہ اس میں کفارہ ہو۔

اور کفارہ اس پر ہوگا جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ یہ کام نہیں کرے گا حالانکہ اس کے لیے اس کا کرنا مباح ہے پھر وہ اسے کر گزرتا ہے یا (یہ قسم کھائے) کہ وہ اس طرح کرے گا پھر وہ ایسا نہ کرے، مثلاً اگر کسی نے قسم کھائی کہ وہ اپنا کپڑا دس درہم کے عوض نہیں بیچے گا پھر وہ اتنے کے عوض ہی فروخت کر دیتا ہے یا کسی نے قسم کھائی کہ وہ اپنے غلام کو ضرور مارے گا پھر وہ اسے نہ مارے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے..... اگر آپ سے یہ روایت صحیح ہے..... آپ نے فرمایا: یمین لغو یہ ہے کہ تو قسم کھائے درآنحالیکہ تو غصے میں ہو اور طاؤس نے یہی کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا یمین فی غَضَبٍ (2) حالت غضب میں قسم نہیں ہوتی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ (اللغو سے مراد) حلال کو حرام قرار دینا ہے، پس وہ کہتا ہے: میرا مال مجھ پر حرام

1۔ تفسیر طبری، جلد 4، صفحہ 31
2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 26

ہے اگر میں نے اس طرح کیا اور حلال مجھ پر حرام ہے، مکحول دمشقی نے اسی طرح کہا ہے۔ اور امام مالک نے بھی یہی کہا ہے، سوائے بیوی کے کیونکہ اس نے اس میں تحریم لازم کردی ہے مگر یہ کہ قسم کھانے والا اپنے دل کے ساتھ اسے خارج کردے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لغو سے مراد معصیت کی قسم ہے، حضرت سعید بن مسیب، ابوبکر بن عبدالرحمٰن اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے دونوں بیٹوں حضرت عروہ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے جیسا کہ کوئی یہ قسم کھاتا ہے: ''وہ شراب ضرور پیے گا یا وہ قطع رحمی ضرور کرے گا۔''

پس اس کی نیکی اس فعل کو ترک کرنا ہے اور اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے اور ان کی دلیل حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا دیکھا تو اسے چاہیے کہ وہ اسے چھوڑ دے اور بے شک اس کا ترک کرنا ہی اس کا کفارہ ہے (1)۔'' اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ عنقریب اس کا ذکر بھی ''المائدۃ'' میں آئے گا۔

اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یمین لغو یہ ہے کہ آدمی اپنے بارے میں بددعا کرے: (مثلاً) اللہ تعالیٰ اس کی بصارت کو اندھا کردے، اللہ تعالیٰ اس کا مال ضائع کردے، وہ یہودی ہے، وہ مشرک ہے، وہ ولد الزنا ہے اگر اس نے اس طرح کیا۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دو آدمی خرید و فروخت کرتے ہیں، پس ان میں سے ایک کہتا ہے: قسم بخدا! میں تجھے اتنے کے عوض نہیں بیچوں گا اور دوسرا کہتا ہے: قسم بخدا! میں اتنے کے عوض اسے نہیں خریدوں گا۔

حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: وہ آدمی جو قسم کھاتا ہے کہ وہ یہ کام نہیں کرے گا پھر وہ بھول جاتا ہے اور اسے کر گزرتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: بے شک یمین لغو وہ ہے جس کا کفارہ ادا کیا جائے، یعنی جب قسم کا کفارہ ادا کردیا جائے تو وہ ساقط ہوجاتی ہے اور لغو ہوجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا کفارہ ادا کرنے کے سبب اور اس سے بہتر کی طرف لوٹنے کے سبب مؤاخذہ نہیں فرمائے گا۔ ابن عبدالبر نے ایک قول بیان کیا ہے کہ لغو سے مراد مکرہ کی قسم ہے۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ قسم جو نسیان اور بھول کے ساتھ ہو اس کے لغو ہونے میں کوئی شک نہیں، کیونکہ وہ اس کے قصد اور ارادہ کے خلاف واقع ہوئی ہے، پس وہ محض لغو ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: مُكْرَہ کی قسم اپنے انجام سمیت، جس نے بالاکراہ قسم کھائی اس کا حکم ''النحل'' میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عربی نے کہا ہے: رہا وہ جس نے کہا کہ لغو سے مراد یمین المعصیۃ ہے تو یہ باطل ہے، کیونکہ ترک معصیت پر قسم کھانے والے کی قسم عبادت ہونے کے اعتبار سے منعقد ہوجاتی ہے اور معصیت کا ارتکاب کرنے پر قسم کھانے والے کی قسم معصیت ہونے کے اعتبار سے منعقد ہوجائے گی اور اسے کہا جائے گا: تو معصیت کا ارتکاب نہ کر اور کفارہ ادا کردے اور

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6736 2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 635

اگر اس نے اقدام فعل کیا تو وہ اپنے اقدام میں گنہگار ہوگا اور اپنی قسم سے بری ہو جائے گا۔

اور رہا وہ جس نے یہ کہا کہ اس سے مراد انسان کا اپنے خلاف دعا کرنا ہے اگر اس طرح نہ ہوا تو اس کے عوض اس طرح آفات نازل ہوں، تو یہ قول لغو ہے کفارہ کے طریق میں، لیکن فی القصد یہ قول منعقد ہو جائے گا اور مکروہ ہے اور بسا اوقات اس کے سبب مؤاخذہ بھی کیا جاتا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی اپنے بارے میں بددعا نہ کرے بسا اوقات اتفاقیہ ایسی ساعت ہوتی ہے کہ جو کوئی اس میں اللہ تعالیٰ سے کسی شے کے بارے سوال کرتا ہے تو وہ اسے ضرور عطا فرما دیتا ہے۔“

اور رہا وہ جس نے کہا اس سے مراد یمین الغضب ہے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حالت غضب میں قسم کھانا اس کی تردید کرتا ہے کہ وہ اشعریین کی بوجھ اٹھانے میں مدد نہیں کریں گے اور پھر آپ نے ان کی مدد کی اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس کا ذکر ”سورۂ براءۃ“ میں آئے گا۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: رہا وہ جس نے یہ کہا کہ اس سے مراد وہ قسم ہے جس کا کفارہ ادا کر دیا گیا ہو تو یہ اس کے متعلق نہیں جو بیان کیا جا رہا ہے اور اسے ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ضعیف اور کمزور قرار دیا ہے اور کہا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے مطلقاً لغو سے مؤاخذہ اٹھا لیا ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں نہ کوئی گناہ ہے اور نہ ہی کفارہ ہے اور قسم میں مؤاخذہ یمین غموس میں جو کہ حالف نے اپنے ذمہ لازم کر رکھی ہو اور اس میں جس کا کفارہ ادا کرنا ترک کر دیا گیا ہو حالانکہ وہ اس میں سے ہو جن میں کفارہ ہوتا ہے آخرت کی سزا ہے اور لازم کرنے میں دنیا کی سزا ہے، پس یہ قول ضعیف ہو جاتا ہے اس سبب سے کہ یہ یمین المکفرہ ہے، کیونکہ اس میں مؤاخذہ واقع ہوا ہے اور مؤاخذہ کو فقط آخرت کے ساتھ خاص کرنا یہ مرضی کا فیصلہ ہے (جس کی کوئی حقیقت نہیں)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فِیْٓ اَیْمَانِكُمْ۔ الأیمان یمین کی جمع ہے اور الیمین کا معنی قسم ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ عرب لوگ جب آپس میں قسم اٹھاتے تھے یا باہم عقد کرتے تھے تو ایک آدمی اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ اپنے ساتھی کا دایاں ہاتھ پکڑتا پھر یہ رواج بہت زیادہ بڑھ گیا یہاں تک کہ نفس قسم اور عہد کا نام ہی یمین پڑ گیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یمین فَعِیلٌ کے وزن پر یُمْنٌ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی برکت ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے یہ نام اس لئے دیا ہے کیونکہ یہ حقوق کی حفاظت کرتی ہے اور یَمِیْنٌ کا لفظ مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، اس کی جمع ایمان اور ایمن ہے۔ زہیر نے کہا ہے:

فتجمع أیمُنٌ منا و منکم

(پس ہماری طرف سے اور تمہاری طرف سے بہت سی قسمیں جمع ہو رہی ہیں۔)

(۴) قولہ تعالیٰ: وَ لٰكِنْ یُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ یہ اس قول کی مثل ہے: وَ لٰكِنْ یُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ (المائدہ: 89) اس کے تحت اس کے بارے مکمل بحث آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے کہا: قولہ تعالیٰ: وَ لٰكِنْ یُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ یہ ایسے آدمی کے بارے میں ہے

جو یہ کہتا ہے: وہ مشرک ہے اگر وہ ایسا کرے، یعنی یہ لغو ہے مگر یہ کہ وہ اپنے دل سے شرک کرنے کا اعتقاد اور اس کا ارادہ کرے اور غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ یہ دونوں صفتیں ہیں جو اس کے مناسب ہیں جو مؤاخذہ چھوڑنے کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ یہ نرمی اور وسعت کے باب سے ہے۔(1)

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

''ان کے لئے جو قسم اٹھاتے ہیں کہ وہ اپنی بیویوں کے قریب نہ جائیں گے مہلت ہے چار ماہ کی پھر اگر رجوع کر لیں (اس مدت میں) تو بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ اور اگر پکا ارادہ کر لیں طلاق دینے کا تو بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

اس میں چوبیس مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ۔ يُؤْلُوْنَ کا معنی ہے وہ قسم اٹھاتے ہیں (2) اور مصدر ایلاءٌ، اَلِيَّةٌ، اَلْوَةٌ اور اِلْوَةٌ ہیں۔ حضرت ابی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لِلَّذِيْنَ يقسمون (3) قراءت کی ہے اور یہ بات جانی پہچانی ہے کہ یقسمون، يُؤْلُوْنَ کی تفسیر ہے۔ اور لِلَّذِيْنَ آلَوْا بھی پڑھا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: آلَى يُؤْلِي اِيلاءً اور تَاَلّٰى تَاَلِّيًا اور اِئْتَلٰى ائتلاء یعنی اس نے قسم کھائی۔ اور اسی میں سے ہے: وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ (نور: 22) (اور تم میں سے صاحب فضل قسم نہ کھائیں)۔

اور شاعر نے کہا ہے:

فَآلَيْتُ لا أنفكّ أحْذُ و قصيدةً تكون و اياها بها مثلا بعدِى

اور دوسرے نے کہا:

قليل الألايا حافظٌ ليمينه وان سبقَت منه الألِيَة برّتِ(4)

کم قسمیں کھانے والا اپنی قسم کی پاسداری کرتا ہے اور اگر اس سے قسم صادر ہو جائے تو وہ پوری ہو جاتی ہے۔

اور ابن درید نے کہا ہے:

ألِيّة باليَعْمَلاتِ يَرْتَمِى بها النَّجَاءُ بين أجواز الْفَلَا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ دور جاہلیت کا ایلاء ایک سال، دو سال اور اس سے زیادہ عرصہ کا تھا۔ وہ اس سے رات کے وقت عورت کو اذیت پہنچانے کا قصد کرتے تھے، پس ان کے لئے چار ماہ رکھے گئے اور جس نے اس سے کم عرصہ کے لئے ایلاء کیا تو وہ حکماً ایلاء نہ ہوگا (5)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 215، دار الکتب العلمیہ 5۔ احکام القرآن ابن عربی، جلد 1، صفحہ 177، دار احیاء التراث العربیۃ

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایلاء کیا اور طلاق دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلاء کا سبب آپ سے ازواج مطہرات کا ایسے نفقہ کا سوال تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ تھا، اسی طرح صحیح مسلم میں ہے اور کہا گیا ہے کیونکہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہدیہ آپ پر واپس لوٹا دیا تھا، پس اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصے ہو گئے اور ان سے ایلاء کرلیا (1)۔ اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ایلاء ہر اس کے لئے ثابت ہوتا ہے جس کے لئے طلاق ثابت ہے، پس آزاد، غلام اور سکران (نشے والا) ہر ایک کو ایلاء لازم ہوتا ہے اور اسی طرح سفیہ (احمق) اور جس پر ایلاء کیا جائے بشرطیکہ وہ بالغ اور غیر مجنون ہو اور اسی طرح خصی ہے جبکہ وہ مقطوع الذکر نہ ہو اور بوڑھا آدمی جبکہ اس میں رمق اور نشاط باقی ہوں۔

مقطوع الذکر آدمی جب ایلاء کرے تو اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف ہے۔

ایک قول میں ہے کہ اس کے لئے کوئی ایلاء نہیں ہے اور ایک قول میں ہے: اس کا ایلاء صحیح ہوتا ہے۔

پہلا قول زیادہ صحیح اور کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ رجوع وہ ہے جو قسم کو ساقط کر دیتا ہے اور رجوع بالقول اسے ساقط نہیں کرتا تو جب حنث سے مانع قسم باقی ہے تو پھر ایلاء کا حکم بھی باقی ہوگا اور گونگے آدمی کا ایلاء ایسی تحریر یا اشارہ کے ساتھ ہوتا ہے جو سمجھا جا سکتا ہو اور وہ اس کو لازم ہو۔ اسی طرح عجمیوں کا حکم ہے جب وہ اپنی عورتوں سے ایلاء کر لیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا اس بارے اختلاف ہے جس کے ساتھ قسم میں سے ایلاء واقع ہوتا ہے۔

پس ایک قوم نے کہا ہے: ایلاء واقع نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی قسم کھانے کے ساتھ (2)، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: من کان حالفا فلیحلف باللہ او لیصمت (3) یعنی جو کوئی قسم اٹھانے والا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھائے یا پھر وہ خاموش رہے۔)

امام شافعی نے بھی اپنے جدید قول میں یہی کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: "ہر وہ قسم جو جماع سے روکے تو وہی ایلاء ہے (4) اور اسی کے مطابق شعبی، نخعی، مالک، اہل حجاز، سفیان ثوری، اہل عراق، امام شافعی نے اپنے دوسرے قول میں، ابوثور، ابوعبید، ابن منذر اور قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: ہر وہ قسم جس کے سبب حالف اپنی بیوی کے ساتھ جماع کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ وہ حانث ہو جائے گا تو وہ اس کے سبب ایلاء کرنے والا ہوگا، بشرطیکہ اس کی قسم چار مہینوں سے زیادہ کی ہو، پس ہر وہ جس نے اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی صفات اور اس کی کفالت، اس کا عہد اور اس کا ذمہ ہے کہا تو اس پر ایلاء لازم ہو جائے گا۔ اور اگر اس نے کہا: اقسم یا اعزم

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب الایلاء، جلد 1، صفحہ 148، وزارت تعلیم

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 177، دار احیاء التراث العربیۃ

3۔ بخاری شریف، کتاب الایمان، باب لا تحلفوا بآبائکم، جلد 2، صفحہ 983، وزارت تعلیم

ایضاً، کتاب الشہادات، حدیث نمبر 2482، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 356، دار الکتب العربیۃ

اور ساتھ باللہ کا ذکر نہ کیا تو کہا گیا ہے: اس پر ایلاء واقع نہ ہوگا، مگر یہ کہ وہ باللہ کا ارادہ کرے اور اس کی نیت کرے۔ اور جس نے کہا ہے کہ یہ قسم ہے تو اس پر ایلاء واقع ہو جائے گا۔ اس کا تفصیلی بیان "سورۃ المائدۃ" میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور اگر کسی نے روزوں کے ساتھ قسم کھائی کہ وہ اپنے بیوی سے وطی نہ کرے گا اور کہا: اگر میں تجھ سے وطی کروں تو مجھ پر ایک ماہ یا ایک سال کے روزے تو وہ ایلاء کرنے والا ہو جائے گا۔ اور اسی طرح ہر وہ جو حج، طلاق، عتق، نماز یا صدقہ میں سے اپنے ذمہ لازم کرتا ہے (تو وہ مولیٰ ہو جائے گا) اور ان تمام میں بنیاد اور اصل قول باری تعالیٰ کی عمومیت ہے: لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ اور کوئی فرق نہیں ہے جب اس نے صدقہ یا معین غلام کی آزادی یا غیر معین غلام کی آزادی کے ساتھ ایلاء کیا تو ایلاء ثابت ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر کسی نے قسم کھائی قسم بخدا! وہ وطی نہ کرے گا اور استثنا کر دی اور کہا: ان شاء اللہ تعالیٰ، تو بلاشبہ وہ ایلاء کرنے والا ہو جائے گا اور اگر اس نے اس سے وطی کی تو اس پر کفارہ نہیں ہوگا، یہ امام مالک سے ابن قاسم کی روایت میں ہے اور ابن ماجشون نے المبسوط میں کہا ہے: وہ مولیٰ نہیں ہوگا، یہی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ استثناء (ان شاء اللہ کہنا) قسم کو کھول دیتا ہے۔ اور حالف کو اس طرح کر دیتا ہے گویا کہ اس نے قسم کھائی ہی نہیں اور یہی فقہائے امصار کا مذہب ہے، کیونکہ ان شاء اللہ کہہ کر اس نے وضاحت کر دی ہے کہ وہ فعل کا قصد کرنے والا نہیں (1) اور اس کی وجہ جسے ابن القاسم نے روایت کیا ہے اس کی بنا اس پر ہے کہ استثنا قسم کو نہیں کھولتا، البتہ وہ کفارہ کو ساقط کرنے میں مؤثر ہوتا ہے، اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا۔ پس جب اس کی قسم باقی ہے، منعقد ہو چکی ہے تو پھر ایلاء کا حکم اسے لازم ہوگا، اگرچہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ اگر کسی نے نبی علیہ السلام، ملائکہ یا کعبہ معظمہ کے ساتھ قسم کھائی کہ وہ اس سے وطی نہ کرے گا یا اس نے کہا: وہ یہودی یا نصرانی یا زانی اگر وہ اس سے وطی کرے، تو اس صورت میں وہ ایلاء کرنے والا نہ ہوگا (2)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ الباجی نے کہا ہے: میرے نزدیک اس کا معنی ہے کہ وہ اسے قسم کے طریقہ کے بغیر لایا ہے اور اگر وہ اسے اس ارادہ پر لایا کہ ان میں سے یا کوئی اور جو الفاظ اس نے اسے کہے ہیں وہ اس کے ساتھ ایلاء کرنے والا ہے، تو المبسوط میں ہے کہ ابن القاسم سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اپنی بیوی کو کہتا ہے: لا مرحبا اور اس سے وہ ایلاء کا ارادہ کرتا ہے وہ مولیٰ ہو جائے گا، تو انہوں نے ذکر کیا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہر وہ کلام جس سے اس نے طلاق کی نیت کی تو وہ طلاق ہو جاتی ہے اور یہ (ایلاء) اور طلاق دونوں برابر ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ قرآن کریم میں مذکور ایلاء کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: کوئی ایلاء کرنے والا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ یہ قسم کھائے کہ وہ ہمیشہ عورت کو مس نہیں کرے گا۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب کسی نے قسم کھائی کہ وہ ایک دن یا کچھ کم یا کچھ زیادہ اپنی بیوی کے قریب نہیں آئے گا پھر اس نے چار مہینے تک وطی نہ کی تو وہ عورت ایلاء کے سبب اس سے جدا ہو جائے گی۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 178، دار احیاء التراث العربیۃ

2۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب الایلاء واللعان باب فمن قال علی نذر، جلد 6، صفحہ 86، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، نخعی، ابن ابی لیلیٰ، حکم، حماد بن ابی سلیمان اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے اور یہی اسحاق نے بھی کہا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: کثیر اہل علم نے اس قول کا انکار کیا ہے۔(1)

اور جمہور نے کہا ہے: ایلاء یہ ہے کہ آدمی قسم کھائے کہ وہ چار مہینے سے زیادہ (عرصہ) وطی نہ کرے گا۔ پس اگر اس نے چار ماہ اور ان سے کم کی قسم کھائی تو وہ مولی نہ ہوگا اور ان کے نزدیک وہ صرف قسم ہے۔ اگر اس نے اس مدت کے دوران وطی کی تو اس پر کوئی شے نہ ہوگی جیسا کہ تمام قسموں میں ہوتا ہے یہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔

اور ثوری اور علماء کوفہ نے کہا ہے کہ ایلاء یہ ہے کہ آدمی چار مہینے اور کچھ زائد کی قسم کھائے اور یہی حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے (2)۔

اہل کوفہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ایلاء میں چار مہینے مہلت مقرر کی ہے جیسا کہ اس نے عدت وفات کے لئے چار ماہ دس دن اور عدت میں تین حیض مقرر کیے ہیں اور اس کے بعد کوئی مہلت اور انتظار نہیں۔ انہوں نے کہا: مدت کے بعد ایلاء کا ساقط ہونا واجب ہو جاتا ہے اور وہ ساقط نہیں ہوتا مگر فیئ (رجوع) کے ساتھ اور اس سے مراد مدت کے اندر جماع کرنا ہے (ورنہ) چار مہینے گزرنے کے بعد طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے استدلال کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ایلاء کرنے والے کے لئے چار ماہ مدت مقرر کی ہے۔ پس یہی اس کی کامل مدت ہے، اس دوران اس کی بیوی کو اس پر کوئی اعتراض (کا حق) نہیں۔ جیسا کہ دین مؤجل کا مالک مدت مکمل ہونے کے بعد ہی اس کے بارے مطالبے کا استحقاق رکھتا ہے۔

اور حضرت اسحاق کے قول کی وجہ مدت کم ہونے کے بارے میں (یعنی چار ماہ سے کم) کہ اس کے ساتھ بھی قسم کھانے والا مولی ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ وطی نہ کرے۔ اس کا قیاس چار مہینے سے زیادہ کی قسم کھانے والے پر ہے کیونکہ وہ مولی ہو جاتا ہے، کیونکہ قسم سے مقصود ضرر اور اذیت پہنچانا ہے اور یہ معنی قلیل مدت میں بھی موجود ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اس بارے اختلاف ہے کہ جس نے چار مہینے سے زیادہ مدت اپنی بیوی سے وطی نہ کرنے کی قسم کھائی اور چار ماہ گزر گئے اور عورت نے اس سے مطالبہ نہ کیا اور اسے نہ سلطان وقت کے پاس پیش کیا تا کہ وہ اسے مطلع کرے (3)، تو امام مالک، آپ کے اصحاب اور اکثر اہل مدینہ کے نزدیک اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی۔

اور ہمارے علماء میں سے بعض کہتے ہیں کہ چار ماہ گزرنے کے ساتھ ایک طلاق رجعیہ اس پر لازم ہو جائے گی اور ان سے بعض اور کچھ دوسرے علماء کہتے ہیں: چار مہینے گزرنے کے ساتھ اسے ایک طلاق بائنہ لازم ہوگی اور صحیح قول وہ ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے اختیار کیا ہے اور وہ یہ کہ مولی کو طلاق لازم نہیں ہوتی یہاں تک کہ حاکم وقت اسے اس کی بیوی کے مطالبہ کے بارے میں آگاہ کرے تا کہ وہ رجوع کرلے تو وہ اپنی بیوی کی طرف وطی کے ساتھ رجوع کرلے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے یا وہ طلاق دے دے اور (حاکم) اسے نہ چھوڑے یہاں تک کہ وہ رجوع کرلے یا طلاق دے دے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً

اور فیئ (رجوع) سے مراد جماع کرنا ہے جس صورت میں اس کے ساتھ مجامعت ممکن ہو۔ سلیمان بن یسار نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں نو (یا انیس) آدمی تھے جو ایلاء میں توقف کرتے تھے۔ امام مالک نے کہا: یہ حکم ہمارے نزدیک ہے اور اسی طرح لیث، شافعی، احمد، اسحاق، ابوثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور اسے ابن منذر نے پسند کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور ایلاء کرنے والے کی مدت قسم کھانے کے دن سے شروع ہوگی نہ کہ اس دن سے جس دن اس کی زوجہ اس سے جھگڑے اور اسے حاکم کے پاس پیش کرے اور اگر عورت نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا اور وہ اس کے مباشرت نہ کرنے کے ساتھ راضی نہ ہوئی تو حاکم قسم کے دن سے اس کے لئے چار مہینے کی مدت مقرر کردے، پس اگر اس نے مباشرت کی تو اس نے زوجہ کے حق کی طرف رجوع کرلیا اور وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کردے اور اگر اس نے رجوع نہ کیا تو وہ اس پر طلاق رجعیہ ڈال دے۔
امام مالک نے فرمایا: اگر اس نے رجوع کرلیا تو اس کا رجوع کرنا صحیح نہ ہوگا یہاں تک کہ وہ عدت میں مقاربت اختیار کرے۔
ابہری نے کہا ہے: اس میں طلاق کا واقع ہونا دفع ضرر کے لئے ہے تو جب اس نے مقاربت نہ کی تو ضرر باقی رہا، تو اس صورت میں رجعت کا کوئی معنی نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے لئے کوئی عذر ہو جو اسے مقاربت سے روکتا ہو تو پھر اس کا رجوع صحیح ہو گا، کیونکہ ضرر زائل ہو جائے گا اور وطی سے اس کا باز رہنا ضرر پہنچانے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ تو عذر کی وجہ سے ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ حالت غضب کے سوا ایلاء کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، سو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حالت غضب کے سوا ایلاء نہیں ہوتا (1) اور اس کے بارے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے حدیث مشہور میں یہی مروی ہے اور اسی طرح لیث، شعبی، حسن اور عطا رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے، یہ سب کہتے ہیں: ایلاء نہیں ہوتا مگر اس وجہ سے کہ وہ باہم ایک دوسرے پر غصے ہوں، آپس میں جھگڑ رہے ہوں، تنگ ہوں اور تکلیف دینا مقصود ہو کہ وہ اسے ضرر پہنچانے اور اذیت دینے کے لئے اس کے ساتھ مجامعت نہیں کرے گا، چاہے اس کے ضمن میں بچے کی اصلاح مقصود ہو یا نہ ہو اور اگر یہ غضب کی وجہ سے نہ ہو تو پھر ایلاء نہیں ہوگا (2)۔
اور ابن سیرین نے کہا ہے: چاہے قسم حالت غضب میں ہو یا بغیر غضب کے ہو وہ ایلاء ہے۔ یہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ثوری، مالک اور اہل عراق، امام شافعی اور آپ کے اصحاب اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے مگر امام مالک نے کہا ہے: جب اس نے بچے کی اصلاح کا ارادہ نہ کیا ہو (3)۔ ابن منذر نے کہا ہے: یہی اصح ہے کیونکہ انہوں نے جب اس پر اجماع کیا ہے کہ ظہار، طلاق اور تمام قسمیں حکم میں برابر ہیں، چاہے حالت غضب میں ہوں یا حالت رضا میں تو پھر ایلاء بھی انہیں کی طرح ہے۔
میں (مفسر) کہتا ہوں اور اس پر قرآن کریم کا عام حکم دلالت کرتا ہے اور حالت غضب کی تخصیص دلیل کی محتاج ہے اور ایسی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی جو اسے لازم قرار دے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: وہ آدمی جو بغیر ایسی قسم کے اپنی بیوی کی مقاربت سے رکا رہا جو اس نے بیوی کو ستانے کے لئے قسم کھائی ہو۔ تو اسے اس کے ساتھ مباشرت کا حکم دیا جائے اور اگر وہ انکار کردے اور اسے ضرر پہنچانے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کے لئے امتناع وطی پر قائم رہے تو بغیر مدت مقرر کیے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کر دی جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لئے مدت ایلاء مقرر کی جائے گی اور یہ قول بھی ہے کہ آدمی کا اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے کی صورت میں اس پر ایلاء داخل نہ ہوگا، اگرچہ وہ کئی سال تک اس سے مقاربت نہ کرنے پر قائم رہے، لیکن اسے نصیحت کی جائے گی اور اسے اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا جائے گا کہ وہ اسے ضرر اور تکلیف پہنچانے کے لئے نہ روکے رکھے۔

مسئلہ نمبر 11۔ اور اس کے بارے میں بھی اختلاف ہے جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اپنی بیوی سے مجامعت نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ اپنے بچے کو دودھ نہ چھڑا لے، تاکہ حاملہ اپنے بچے کو دودھ نہ پلائے اور وہ اسے ضرر پہنچانے کا ارادہ نہ کرے یہاں تک کہ مدت رضاع گزر گئی تو امام مالک کے نزدیک بچے کی اصلاح کا ارادہ ہونے کی بنا پر اس کی بیوی کو مطالبے کا حق حاصل نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اسے ایلاء نہ قرار دیا (1)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے دو قولوں میں سے ایک میں یہی کہا ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ مولی ہو جائے گا اور بچے کو دودھ پلانے کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور یہی حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، اوزاعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ آدمی ایلاء کرنے والا نہ ہوگا جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اپنی زوجہ سے اس کمرے میں یا اس گھر میں دخول نہ کرے گا کیونکہ وہ مقاربت کے لئے اس کے سوا اور جگہ بھی پا سکتا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ اور اسحاق نے کہا ہے: اگر اس نے اسے چار ماہ تک چھوڑے رکھا تو وہ ایلاء کے ساتھ جدا ہو جائے گی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ اس سے چار ماہ تک رکا رہا ہے اور اگر اس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اس سے اس مصر یا اس شہر میں وطی نہ کرے گا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ مولی ہو جائے گا۔ اور ایسا بلاشبہ سفر میں ہوتا ہے کہ وہ مشقت اور کلفت برداشت کرتا ہے نہ کہ اپنے باغ یا اپنے قریبی کھیتوں میں۔

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ نِّسَآبِهِمْ اس میں آزاد عورتیں، ذمیہ عورتیں اور لونڈیاں سبھی داخل ہیں جب وہ شادی کر لیں اور غلام کا ایلاء بھی اپنی بیوی سے ثابت ہو جاتا ہے۔

امام شافعی، احمد اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ غلام کا ایلاء بھی آزاد آدمی کے ایلاء کی مثل ہے (2)۔ ان کی دلیل اس قول باری تعالیٰ کا ظاہر ہے: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآبِهِمْ کیونکہ یہ تمام ازواج کے لئے ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور یہی میں بھی کہتا ہوں۔

امام مالک، زہری، عطا بن ابی رباح اور اسحاق نے کہا ہے: اس (غلام) کی مدت دو مہینے ہے۔ اور حسن اور نخعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اگر غلام کی بیوی کسی کی لونڈی ہو تو اس کے ایلاء کی مدت دو مہینے ہے اور اگر وہ آزاد ہو تو اس کے ایلاء کی مدت چار مہینے ہے اور یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے، اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لونڈی کے ایلاء کی مدت آزاد

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، باب الایلاء، جلد 1، صفحہ 515، وزارت تعلیم　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ

عورت کے ایلاء کا نصف ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ امام مالک اور ان کے اصحاب، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، اوزاعی اور نخعی وغیرہم نے کہا ہے کہ ایلاء کے لازم ہونے میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں برابر ہیں۔ اور زہری، عطا اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ ایلاء نہیں ہوتا مگر دخول کے بعد۔

اور امام مالک نے کہا ہے: صغیرہ عورت میں ایلاء نہیں ہوتا جب تک وہ بالغ نہ ہو اور اگر اس نے اس سے ایلاء کیا اور وہ بالغ ہوگئی تو اس کے بالغ ہونے کے دن سے ایلاء لازم ہو جائے گا (1)۔

مسئلہ نمبر 15۔ اور رہا ذمی تو اس کا ایلاء صحیح نہیں ہوتا، جس طرح کہ اس کی جانب سے ظہار اور طلاق درست نہیں ہوتے اور وہ اس لئے کہ ہمارے نزدیک اہل شرک کا نکاح صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ ان کے لئے نعمت اور احسان کے مشابہ ہے اور اس لئے بھی کہ وہ شریعت کے مکلف نہیں کہ ان پر قسموں کے کفارات لازم ہوں اور اگر وہ ہمارے پاس ایلاء کا مقدمہ پیش بھی کریں تو ہمارے حاکم کو نہیں چاہئے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے اور وہ اپنے حکام کی طرف جائیں گے اور اگر ان کے درمیان ایک دوسرے پر ظلم ہونے لگے تو پھر یہ حکم اسلام کے مطابق فیصلہ کرے، جیسا کہ اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو ضرر پہنچانے کے لئے بغیر قسم کے اس سے وطی چھوڑ دے۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ، التربص کا معنی ہے: مہلت دینا اور تاخیر کرنا۔ یہ تصبّر (مصنوعی صبر) کا الٹ (مقلوب) ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

تَرَبَّصْ بها ريبَ المَنُونِ لعلّها　　تُطلَّق يوما او يموتُ حليلُها

تو اس کے ساتھ حوادثات زمانہ کا انتظار کر شاید کسی دن اسے طلاق ہو جائے گی یا اس کا خاوند فوت ہو جائے گا

اور رہا چار مہینے وقت مقرر کرنے کا فائدہ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس بارے میں اہل جاہلیت سے جو ذکر کیا ہے وہ پہلے گزر چکا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس (ایلاء) سے منع فرما دیا اور دوری اور علیحدگی کے ساتھ عورت کو ادب سکھانے کے لئے خاوند کے لئے چار مہینے مدت مقرر کر دی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (النساء: 34) (اور تم انہیں بستروں میں چھوڑ دو) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ انہیں ادب سکھانے کے لئے ایک ماہ تک ایلاء کیا اور کہا گیا ہے کہ چار مہینے وہ ہیں جن سے زیادہ کوئی خاوند صبر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کسی رات مدینہ طیبہ میں گشت کر رہے تھے تو آپ نے ایک عورت کی آواز سنی، وہ یہ اشعار کہہ رہی تھی:

ألا طال هذا الليلُ و اسوَدَّ جانبُه　　وأرّقَني أن لاحبيب أُلاعِبُه

فو الله لو لا الله لا شيءَ غيره　　لَزُعْزِعَ من هذا السرير جوانبُه

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ

مخافۃ ربی والحیاءُ یکفنی　　واکرامَ بَعلی أن تُنال مراکِبُہ

جب صبح ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو طلب کیا اور اس سے پوچھا: تیرا خاوند کہاں ہے؟ تو اس نے جواب دیا: آپ نے اسے عراق بھیجا ہوا ہے پھر آپ نے عورتوں کو بلایا اور ان سے پوچھا: ایک عورت کتنی دیر تک اپنے خاوند کے بغیر صبر کر سکتی ہے؟ تو انہوں نے کہا: دو مہینے اور تیسرے ماہ اس کا صبر کم ہو جاتا ہے اور چوتھے ماہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کے جہاد کی مدت چار مہینے مقرر کر دی، جب چار ماہ گزر جاتے تو آپ جہاد کرنے والے لشکر کو واپس بلا لیتے اور ان کی جگہ دوسرا لشکر بھیج دیتے اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے یہ بات بھی مدت ایلاء کے چار مہینوں کے ساتھ اختصاص کو قوی کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ فَآءُوْ اس کا معنی ہے: پھر اگر انہوں نے رجوع کر لیا اور اس سے یہ بھی ہے (1) حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ اور اس معنی میں زوال کے بعد والے سایہ کو فَیٔ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مشرق کی جانب سے مغرب کی جانب لوٹ آتا ہے، کہا جاتا ہے: فَاءَ یَفِیْءُ فَیْئَۃً وَ فُیُوْءًا۔ و انہ لسریع الفیئۃ یعنی وہ رجوع میں تیز رفتار ہے۔ شاعر نے کہا:

ففاءَتْ و لم تقضِ الذی اقبلَتْ لہ　　و مِنْ حاجۃ الانسان ما لیس قاضیا

پس وہ لوٹ آئی اور اس نے اسے پورا نہ کیا جس کے لئے آئی اور انسان کی حاجت پوری ہونے والی نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے وہ سب کے سب جن سے کچھ محفوظ اور یاد کیا جاتا ہے وہ اس پر ہیں کہ فیء سے مراد اس آدمی کا جماع کرنا ہے جس کا کوئی عذر نہ ہو اور اگر اس کا کوئی عذر ہو (مثلاً) وہ بیمار ہو جائے، قید ہو جائے یا اس کے مشابہ کوئی اور عذر ہو تو بلاشبہ اس کا رجوع صحیح ہوگا اور یہ اس کی بیوی ہوگی اور جب سفر سے آنے کے سبب یا مرض سے افاقہ پانے کے سبب عذر زائل ہو جائے یا قید سے رہائی پانے کے سبب (عذر ختم ہو جائے) اور وہ وطی سے انکار کر دے تو ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی، بشرطیکہ مدت ایلاء گزر چکی ہو۔ امام مالک نے المدونہ میں اور المبسوط میں یہی کہا ہے۔

اور عبدالملک نے کہا ہے: وہ عورت مولی سے اس دن سے جدا ہو گی جس دن مدت ختم ہوئی، پس اگر رجوع کے ساتھ اس کا عذر سچا ہوا جبکہ عورت نے اسے قدرت دی تو گزرے ہوئے ایام میں بھی اس کے سچا ہونے کا حکم لگایا جائے گا اور اگر عورت پر قدرت حاصل ہونے کے وقت (وطی سے) انکار کے ساتھ جس رجوع کا دعویٰ کیا تھا اس کی تکذیب کر دی، تو اس کے معاملہ کو جھوٹ اور جھگڑے پر محمول کیا جائے گا اور اس وقت میں جو کچھ احکام واجب ہوتے ہیں وہ بیان کر دیئے گئے ہیں۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب عذر کی حالت میں گواہوں نے اس کے رجوع کے بارے شہادت دی ہے تو وہ اس کے لئے کافی ہوگی۔ حسن، عکرمہ اور نخعی نے یہی کہا ہے اور امام اوزاعی نے بھی یہی کہا ہے۔

اور نخعی نے بھی کہا ہے: صرف قول اور شہادت کے ساتھ رجوع صحیح ہوتا ہے اور ایلاء کا حکم ساقط ہو جاتا ہے، تیرا کیا خیال ہے اگر اسے وطی کے مواقع میسر نہ ہوں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ

ابن عطیہ نے کہا ہے: اگر اس نے مباشرت نہ کی تو اس قول کو باب ضرر کی طرف لوٹایا جائے گا(1)۔

اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر وہ جماع پر قادر نہ ہو تو وہ یہ کہے: میں نے اس (بیوی) کی طرف رجوع کرلیا۔

الکیا الطبری نے کہا ہے: امام ابوحنیفہ ایسے آدمی کے بارے فرماتے ہیں جس نے ایلاء کیا درآنحالیکہ وہ مریض تھا اور اس کے اور اس کی بیوی کے مابین چار ماہ کی مسافت تھی یا یہ رتقاء تھی یا صغیرہ تھی یا آدمی مقطوع الذکر تھا تو جب اس نے اس کی طرف زبان سے رجوع کیا اور مدت گزر گئی اور عذر ابھی تک موجود تھا تو وہ رجوع صحیح ہے۔ امام شافعی اپنے دو قولوں میں سے ایک میں ان کی مخالفت کرتے ہیں۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جماع کے بغیر رجوع نہیں ہوسکتا، چاہے حالت عذر ہو یا غیر عذر اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر نے بھی کہا ہے، فرمایا: اور اسی طرح حکم ہے اگر وہ سفر میں ہو یا قید میں۔

مسئلہ نمبر19۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور جمہور علماء رحمۃ اللہ علیہم نے مولی پر کفارہ واجب کیا ہے جب وہ اپنی بیوی کی طرف جماع کے ساتھ رجوع کرلے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر کفارہ نہیں ہے(2) اسی طرح نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ حضرت نخعی نے بیان کیا ہے وہ کہا کرتے تھے: جب مُولی رجوع کرلے تو اس پر کفارہ نہیں ہو گا اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد فَاِنْ فَآءُوْ میں بعض اہل تاویل نے کہا ہے: یعنی اس قسم کے لئے جس میں وہ حانث ہوئے (اگر انہوں نے رجوع کرلیا)، قسم میں بعض تابعین کا ان کے بارے میں یہی مذہب ہے جنہوں نے نیکی، تقویٰ یا کسی بھی بھلائی اور خیر کے خلاف یہ قسم کھائی کہ وہ اسے نہیں کرے گا، پھر وہ اسے کرے اس پر کوئی کفارہ نہ ہوگا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اس میں کفارہ کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی کہ یہ اس معنی پر مترتب ہوتا ہے کہ یمین لغو وہ ہے جو کسی معصیت پر قسم کھائی جائے اور زوجہ کے ساتھ وطی ترک کرنا معصیت ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کبھی اس قول کے لئے سنت سے استدلال کیا جاتا ہے، حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی کام پر قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا پایا تو اسے چاہیے کہ وہ اسے ترک کردے کیونکہ اسے ترک کرنا ہی اس (قسم) کا کفارہ ہے(3)۔''

اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ اس کا مزید بیان آیۃ الایمان میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور جمہور کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: من حلف علی یمین فرأی غیرها خیرا منها فلیأت الذی هو خیر و لیکفر عن یمینه (4) (کہ جس نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا پایا تو اسے چاہیے کہ وہ کرے جو بہتر اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ
2۔ جامع البیان، جلد 2، صفحہ 511، دار احیاء التراث العربیۃ
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب من قال کفارتها ترکها، جلد 1، صفحہ 154، وزارت تعلیم
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب من حلف علی یمین، جلد 1، صفحہ 153، وزارت تعلیم

اچھا ہو اور اپنی قسم کی طرف سے کفارہ ادا کر دے)

مسئلہ نمبر 20۔ جب اس نے قسم کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا تو اس سے ایلاء ساقط ہو گیا، ہمارے علماء نے یہی کہا ہے۔ اس میں ایک مذہب کے مطابق حنث پر کفارہ کو مقدم کرنے پر دلیل ہے، ایلاء کے مسئلہ میں یہی اجماع ہے اور ایمان کے مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف دلیل ہے کیونکہ آپ حنث پر کفارہ کو مقدم کرنے کے جواز کے قائل نہیں (1)۔ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 21۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت سے امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے حانث ہونے سے پہلے کفارہ جائز نہ ہونے پر استدلال کیا ہے اور کہا ہے: جب الله تعالیٰ نے مولی کے لئے دو فیصلوں میں سے ایک کے بارے حکم دیا ہے یعنی رجوع یا طلاق کا ارادہ، پس اگر حانث ہونے پر کفارہ کی تقدیم جائز ہو تو یقیناً رجوع یا طلاق کے ارادہ کے بغیر ہی ایلاء باطل ہو گیا، کیونکہ اگر وہ حانث ہوا تو حنث کے سبب کوئی شے اس پر لازم نہ ہو گی اور جب حانث پر قسم توڑنے کے سبب کوئی شے لازم نہیں تو وہ مولی نہ ہوا۔ اور کفارہ کو مقدم کرنے کے جواز میں ایلاء کے حکم کو اس کے بغیر ساقط کرنا ہے جو الله تعالیٰ نے ذکر کیا ہے اور یہ کتاب الله کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 22۔ الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾ اس میں العزیمة کا معنی ہے: کسی شے پر عقد کو مکمل کرنا، کہا جاتا ہے: عَزَم علیه يَعْزِم عُزْما و عَزِيْمَةً و عَزِيْمًا و عَزَمَاناً، و اعتزم اعتزاما، و عزمتُ علیك لتفعلن، یعنی میں نے تجھ پر قسم کھائی کہ تو ضرور ایسا کرے گا۔

شمر نے کہا ہے: العزیمة و العزم اس سے مراد تیرا کسی کام پر اپنے آپ کو پختہ اور مضبوط کرنا ہے کہ تو اسے کرے گا۔ اور الطلاق من طلقت المرأة تطلق (یہ نصر ینصر کے وزن پر ہے) طلاقا، (میں نے عورت کو طلاق دی وہ طلاق والی ہو گئی) فھی طالق و طالقة۔ (یعنی صفت کا صیغہ مذکر اور مونث دونوں طرح آتا ہے۔) اعشیٰ نے کہا ہے:

أیا جارتا بینی فانكِ طالقة

اے میری زوجہ! تو مجھ سے علیحدہ ہو جا کیونکہ تو طلاق والی ہے۔

اور طلقت میں (لام کو مضموم پڑھنا بھی) جائز ہے مثلاً عظُم یعظُم اور اخفش نے اس کا انکار کیا ہے اور طلاق سے مراد ہے نکاح کی گرہ کو کھولنا اور اس کی اصل الانطلاق (جانا) ہے اور المطلقات سے مراد المخلیات ہے (یعنی وہ عورتیں جنہیں آزاد چھوڑ دیا گیا) اور الطلاق کا معنی ہے: تخلية (فارغ چھوڑ دینا) کہا جاتا ہے: نعجة طالق و ناقة طالق: یعنی وہ بھیڑ یا اونٹنی جسے کھیت میں مہمل چھوڑ دیا جائے، اس پر کوئی رکاوٹ (قید) نہ ہو اور نہ ہی کوئی چرواہا ہو۔ اور بعیر طلق (طاء اور لام کے ضمہ کے ساتھ) یعنی وہ اونٹ جو بندھے ہوئے نہ ہوں۔ اور اس کی جمع اطلاق ہے۔ اور حبس فلان فی السجن طلقاً ای بغیر قید یعنی فلاں کو قید خانہ میں بغیر بیڑی اور قید کے بند کیا گیا ہے اور الطالق من الابل: یعنی وہ اونٹنی جسے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 182، دار الفکر

چرواہا اپنے لئے چھوڑ دیتا ہے وہ اسے پانی پر نہیں دوہتا ہے، کہا جاتا ہے: استطلق الراعی ناقة لنفسه۔ چرواہے نے اونٹنی اپنے لئے آزاد چھوڑ دی اور یہی نام اس عورت کو دے دیا گیا ہے جس کا راستہ چھوڑ دیا جائے جیسا کہ یہی نام اس بھیڑ یا ناقہ کو دیا گیا ہے جس کا معاملہ مہمل ہو۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ طلق الفرس سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے گھوڑے کا دور چلے جانا، اس کے لئے کوئی مانع اور رکاوٹ نہ ہو۔ پس وہ عورت جسے آزاد چھوڑ دیا جائے اس کو طالق کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اب اس کے لئے کوئی مانع نہیں ہوتا جبکہ اس سے پہلے اس کے لئے رکاوٹ تھی۔

مسئلہ نمبر 23۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ میں اس پر دلیل ہے کہ عورت کو چار ماہ کی مدت گزرنے کے ساتھ ہی طلاق واقع ہوگی، جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے جب تک کہ مدت گزرنے کے بعد طلاق دینے کا عمل واقع نہ ہو۔

اور یہ بھی کہ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: سَمِیْعٌ اور سمیع مدت گزرنے کے بعد مسموع کا تقاضا کرتا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: سَمِیْعٌ یعنی وہ اس کے ایلاء (قسم) کو سننے والا ہے، عَلِیْمٌ اور اس کے اس عزم و ارادہ کو جاننے والا ہے جس پر چار ماہ کا گزرنا دلالت کرتا ہے۔

اور سہیل بن ابی صالح نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے بارہ آدمیوں سے اس آدمی کے بارے پوچھا ہے جو اپنی بیوی سے ایلاء کرتا ہے تو تمام کہتے ہیں: اس پر کوئی شے نہ ہوگی یہاں تک کہ چار ماہ گزر جائیں اور وہ (اسی حالت پر) ٹھہرا رہے، پھر اگر وہ رجوع کرلے (توفیہا) ورنہ وہ طلاق دے دے (1)۔

قاضی ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تحقیق الامر یہ ہے کہ ہمارے نزدیک آیت کی تقدیر یہ ہے: للذین یؤلون من نسائهم تربص اربعة اشهر فان فاءوا بعد انقضائها فان الله غفور رحيم وان عزموا الطلاق فان الله سميع عليم اور ان کے نزدیک تقدیم آیت اس طرح ہے: للذین یؤلون من نسائهم تربص اربعة اشهر فان فاءوا۔ فيها۔ فان الله غفور رحيم۔ وان عزموا الطلاق۔ بترك الفيئة فيها، يريد مدة التربص فيها۔ ان الله سميع عليم۔ یعنی اگر وہ اس مدت (چار ماہ) میں رجوع کرلیں تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور اگر وہ اس مدت میں رجوع ترک کر کے طلاق کا پختہ ارادہ کرلیں تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ سمیع علیم ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: یہ احتمال متساوی (برابر) ہیں، اسی مساوات کی وجہ سے صحابہ کرام نے اس میں توقف کیا ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب احتمال متساوی ہے تو پھر مہینوں اور حیضوں کے ساتھ عدت گزارنے والی عورت پر قیاس کرتے ہوئے علمائے کوفہ کا قول زیادہ قوی ہے، کیونکہ یہ سب وہ مدت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، پس اس کے گزرنے کے ساتھ عصمت (حفاظت) منقطع ہو جاتی ہے اور بغیر کسی اختلاف کے اسے جدا اور الگ کر دیا جاتا ہے اور اس کی اجازت کے بغیر اس کے خاوند کو اس پر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور ایلاء بھی اسی طرح ہے یہاں تک کہ اگر وہ رجوع بھول گیا

1۔ النکت والعیون، جلد 1، صفحہ 289، موسسۃ الکتب الثقافیہ　　2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 181، دار الفکر

اور مدت گزر گئی تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ اس پر دلیل ہے کہ لونڈی ملک یمین کے ساتھ ہوتی ہے اس میں ایلاء نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس پر طلاق واقع نہیں ہو سکتی۔ واللہ اعلم۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾

''اور طلاق دی ہوئی عورتیں روکے رکھیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک اور جائز نہیں ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور روز آخرت پر۔ اور ان کے خاوند زیادہ حقدار ہیں ان کو لوٹانے کے اس مدت میں اگر وہ ارادہ کرلیں اصلاح کا۔ اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق، البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ عزت والا حکمت والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ جب اللہ تعالیٰ نے ایلاء کا ذکر فرمایا اور بلاشبہ اس میں طلاق واقع ہو جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے طلاق ہو جانے کے بعد عورت کے حکم کو بیان فرمایا۔

ابو داؤد اور نسائی کی کتاب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد باری تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ الآیہ کے بارے میں فرمایا کہ آدمی جب اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو وہی اس کا زیادہ حقدار ہے اور اگر وہ اسے تین طلاقیں دے تو پس یہ منسوخ ہے (1) اور فرمایا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ الآیہ۔

اور الْمُطَلَّقٰتُ لفظ عام ہے لیکن اس سے مراد خاص ہے اور وہ ہے مدخول بہا عورتیں اور دخول سے پہلے جس عورت کو طلاق دے دی گئی وہ سورۃ الاحزاب کی آیت کے تحت اس سے خارج ہو گئی۔ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا (الاحزاب: ۴۹) (پس تمہارے لئے ان پر عدت گزارنا ضروری نہیں جسے تم شمار کرو) اس کا بیان آگے آئے گا اور اسی طرح حاملہ عورت اس ارشاد کے ساتھ اس سے خارج ہو گئی: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق: 4) (اور حاملہ عورتوں کی میعاد ان کے بچے جننے تک ہے۔)

اور اقراء سے مقصود استبراء ہے، بخلاف عدت وفات کے کہ وہ عبادت ہے (2) اور وہ صغیرہ جسے ابھی تک حیض نہ آئے اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی نسخ المراجعۃ، جلد 1، صفحہ 297، وزارت تعلیم
ایضاً، حدیث نمبر 1876، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

وہ کبیرہ جو نا امیدی کی عمر کو پہنچ جائے، اللہ تعالیٰ نے ان کی عدت مہینے مقرر کی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: بلاشبہ المطلقات میں عموم ان تمام کو شامل ہے پھر انہیں منسوخ کر دیا گیا ہے، یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ یہ آیت صرف ان عورتوں کے بارے ہے جو حائضہ ہیں اور یہی عورتوں کا عرف ہے اور اسی پر ان کا بڑا حصہ ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: یَتَرَبَّصْنَ۔ التربص کا معنی انتظار کرنا ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ یہ (بظاہر) خبر ہے لیکن اس سے مراد امر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ (بقرہ:233) اور جیسے رجل علیہ ثیابہ، (اور آدمی اپنے اوپر اپنے کپڑے لے) اور حسبك درهم یعنی تو ایک درہم پر اکتفا کر۔ یہ اہل زبان کا قول ہے۔ ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اس میں جو ابن الشجری نے ذکر کیا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: یہ باطل ہے اور بلاشبہ یہ حکم شریعت کے بارے خبر ہے، پس تو کسی مطلقہ کو پائے کہ وہ انتظار نہیں کرتی تو یہ حکم شریعت کے مطابق نہیں ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی خبر کا مخبر کے خلاف واقع ہونا لازم نہیں آئے گا(2) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی لیتربصن (یعنی چاہئے کہ وہ انتظار کریں) اور پھر لام کو حذف کر دیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جمہور لوگوں نے قُرُوْٓءٍ۔ فُعُوْلٍ کے وزن پر قراءت کی ہے، اس میں لام کلمہ ہمزہ ہے اور حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ سے قُرُوٍّ روایت کیا گیا ہے یعنی واؤ کے کسرہ اور شد کے ساتھ بغیر ہمزہ کے۔ اور حسن نے قَرْءٍ قاف کے فتحہ، را کے سکون اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے(3)۔

اور قروء، اَقْرُؤ اور اَقْرَاء کی جمع ہے(4) اور واحد قُرْءٌ قاف کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اصمعی نے یہی کہا ہے۔ اور ابو زید نے کہا ہے: قَرْءٌ قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ان دونوں نے کہا ہے: أَقْرَأَتِ المرأة جب عورت حائضہ ہو جائے۔ فهي مُقْرِء۔ اور أَقْرَأَتْ کا معنی طہرت بھی ہے جب وہ پاک ہو جائے۔

اور اخفش نے کہا ہے: أقرأت المرأۃُ (یہ کہا جاتا ہے) جب عورت حیض والی ہو جائے اور جب اسے حیض آئے تو تو کہے گا: قَرأت، بغیر الف کے۔ کہا جاتا ہے: أقرأت المرأة حيضة أو حيضتين (عورت کو ایک حیض آیا یا دو) اور القرء کا معنی حیض کا ختم ہونا بھی ہے اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد وہ ایام ہیں جو دو حیضوں کے درمیان ہوتے ہیں (یعنی طہر) اور أقرأتْ حاجتك: تیری حاجت قریب آ گئی۔ یہ جوہری سے منقول ہے۔ اور ابو عمرو ابن العلاء نے بیان کیا ہے کہ عربوں میں سے بعض حیض کو قرء کا نام دیتے ہیں، بعض طہر کو قرء کہتے ہیں اور ان میں سے بعض دونوں کو ایک ساتھ قرء کہتے ہیں۔ پس طہر کو حیض کے ساتھ قرء کہا جاتا ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اقراء کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے: اہل کوفہ نے کہا ہے: أقراء سے مراد حیض ہیں، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو موسیٰ، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت عکرمہ اور حضرت سدی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ
2۔ احکام القرآن للماوردی، جلد 1، صفحہ 186، دار الفکر
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ
4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 302، دار الفکر

رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے (1)۔

اور اہل حجاز نے کہا ہے: أقراء سے مراد اطہار ہیں، حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت زہری، حضرت ابان بن عثمان اور حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔ پس جنہوں نے حیض کو قرءٌ کا نام دیا ہے تو انہوں نے رحم میں خون جمع ہونے کی وجہ سے یہ نام رکھا ہے اور جنہوں نے اسے طہر کا اسم قرار دیا ہے تو وہ بدن میں خون جمع ہونے کی وجہ سے ہے اور وہ جو القرء میں اس اصل کو تیرے لئے ثابت کر رہا ہے وہ وقت ہے، کہا جاتا ہے: ھبت الریح لقرئھا و قارئھا ای لوقتھا (یعنی ہوا چلی اپنے وقت کے سبب)۔ شاعر نے کہا ہے:

کرِھتُ العقرَ عقرَ بنی شلیل   اذا ھبت لقارئھا الریاح (2)

میں نے بنی شلیل کی بستی العقر کو ناپسند کیا جب کہ ہوائیں چلیں اپنے وقت پر۔

اور کہا گیا ہے کہ حیض کے لئے ایک وقت ہے اور طہر کے لئے بھی ایک وقت ہے، کیونکہ یہ دونوں ایک معین وقت کی طرف راجع ہوتے ہیں اور اعشیٰ نے الاطہار کے بارے میں کہا ہے:

أفی کل عام انتَ جاشِمُ غزوۃ   تشد لأقصاھا عزیم عزائکا

مورِّثۃ عزا و فی الحیّ رفعۃ   لِما ضاع فیھا من قُرُوُ نسائکا (3)

اور ایک دوسرے نے حیض کے بارے میں کہا ہے:

یا رب ذی ضِغْنٍ علیّ فارض   لہ قُرُوءٌ کقُرُوْ الحائض (4)

یعنی اس نے اسے نیزہ مارا تو اس کا خون حیض والی عورت کے خون کی طرح تھا۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: یہ قرء الماء فی الحوض سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد حوض میں پانی کا جمع ہونا ہے (5) اور اسی سے القرآن ہے کیونکہ یہ معانی کو مجتمع ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اجتماع حروف کی وجہ سے قرآن کہا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: ما قرأتِ الناقۃ سلًی قطُّ، یعنی کبھی اس کے پیٹ میں جھلی جمع نہیں ہوئی اور عمرو بن کلثوم نے کہا ہے:

ذِراعَیْ عَیْطَلٍ أدماء بکرٍ   ھِجَان اللون لم تَقْرَأ جنِینا (6)

تو گویا رحم حیض کے وقت خون کو جمع کرتا ہے اور جسم طہر کے وقت اسے جمع کرتا ہے۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے: اس کا قول جس نے یہ کہا کہ القرءان کے اس قول سے ماخوذ ہے: قریت الماء فی الحوض (میں نے حوض میں پانی جمع کیا) یہ کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ القرء مہموز ہے اور یہ غیر مہموز ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

2۔ النکت والعیون للماوردی، جلد 1، صفحہ 292، مؤسسۃ الکتب الثقافۃ بیروت

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 303، دار الفکر

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

5۔ ایضاً

6۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 365، دار الکتب العربیۃ بیروت

میں (مفسر) کہتا ہوں: اہل لغت کی نقل کے مطابق یہ صحیح ہے، یعنی جوہری وغیرہ نے یہ کہا ہے اور اس پانی کا نام قریٰ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ القرء کا معنی ہے الخروج (نکلنا) یا طہر سے حیض کی طرف یا حیض سے طہر کی طرف، اسی بنا پر امام شافعی نے ایک قول میں کہا ہے: القرء الانتقال من الطھر الی الحیض، یعنی القرء کا معنی طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا ہے اور وہ حیض سے طہر کی طرف نکلنے کو قرء نہیں کہتے۔ اور اشتقاق کے حکم کے مطابق تو لازم آتا ہے کہ وہ بھی قرء ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ کا معنی ہوگا تین ادوار یا تین انتقالات اور مطلقہ عورت صرف دو حالتوں سے متصف ہوتی ہے، پس کبھی وہ طہر سے حیض کی طرف منتقل ہوتی ہے اور کبھی حیض سے طہر کی طرف اس کلام کا معنی صحیح ہو جائے گا اور اس کی دلالت طہر اور حیض دونوں پر ہوگی اور یہ اسم مشترک ہوگا۔

اور کہا جاتا ہے: جب یہ ثابت ہو گیا کہ القرء سے مراد انتقال (تبدیل ہونا) ہے تو عورت کا طہر سے حیض کی طرف نکلنا آیت میں بالکل مراد نہیں اور اسی لئے حالت حیض میں طلاق کا ہونا طلاق سنی (سنت والی) نہیں ہے جس کا حکم دیا گیا ہے اور نہ عدت کے لئے وہ طلاق ہے، کیونکہ عدت کے لئے طلاق وہ ہے جو حالت طہر میں ہو اور یہ القرء کے انتقال سے ماخوذ ہونے پر دلالت کرتا ہے اور جب حالت طہر میں طلاق سنی ہے تو پھر تقدیر کلام یہ ہوگی: فعدتھن ثلاثۃ انتقالات، (پس ان کی عدت تین انتقالات ہیں۔) ان میں سے پہلا اس طہر سے انتقال ہے جس میں طلاق واقع ہوئی اور وہ انتقال جو حیض سے طہر کی طرف ہے اسے قرء نہیں بنایا گیا، کیونکہ لغت اس پر دلالت نہیں کرتی، لیکن ہمیں دوسری دلیل سے معلوم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حیض سے طہر کی طرف منتقل ہونے کا ارادہ نہیں کیا ہے اور جب ان دو میں سے ایک معنی مراد بہ ہونے سے خارج ہو گیا تو دوسرا مراد بہ باقی رہ گیا اور وہ ہے طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا، پس اس بنا پر اس کی عدت تین انتقالات ہے، ان میں سے پہلا طہر ہے اور اس معنی کی بنا پر کامل تین اقراء کو پورا کرنا ممکن ہوتا ہے بشرطیکہ طلاق حالت طہر میں ہو اور کسی اعتبار سے اسے مجاز پر محمول کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

الکیا طبری نے کہا ہے: امام شافعی کے مذہب کی انتہائی توجیہ کے لئے یہ گہری نظر ہے اور ممکن ہے کہ ہم اس میں وہ راز ذکر کریں جسے شریعت کی حکمتوں کی باریکیوں میں سے سمجھنا بعید نہ ہوگا اور وہ ہے طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا۔ اسے قرء کہا گیا ہے کیونکہ یہ براءت رحم پر دلالت کرتا ہے تو چونکہ حاملہ عورت کو اغلباً حیض نہیں آتا پس اسے حیض آنا اس کے لئے براءت رحم کی علامت ہے اور حیض سے طہر کی طرف منتقل ہونا اس کے خلاف ہے اور حیض والی عورت کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے حیض کے بعد حاملہ ہو جائے اور جب حمل برقرار رہے اور بچہ قوی ہو جائے تو اس کا خون منقطع ہو جاتا ہے اسی وجہ سے عرب حالت طہر میں اپنی عورتوں کے حمل کے سبب تعریف کرتے ہیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدح بیان کی۔ شاعر کہتا ہے:

و مُبَرَّء من کل غُبَّر حَيْضَةٍ و فساد مُرْضِعَةٍ و دَاءِ مُغْيَلِ

یعنی یہ کہ اس کی ماں اپنے حیض کے باقی ہونے کی صورت میں اس کے ساتھ حاملہ نہیں ہوئی۔

پس یہ وہ ہے جو علماء اور اہل زبان نے القراء کی تاویل میں کہا ہے۔ اور انہوں نے کہا: قرأت المرأۃ قرءا جب وہ

(عورت) حائضہ ہو یا پاک ہو۔ اور قرأت تب بھی بولا جاتا ہے جب وہ حاملہ ہو اور اس پر انہوں نے اتفاق کیا ہے کہ القرء سے مراد الوقت ہے اور جب تو کہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ اوقات، تو آیت عدد میں مفسر ہو جائے گی درآنحالیکہ معدود میں احتمال ہوگا۔ اور پھر معدود کے لئے بیان کی تلاش کسی دوسری آیت میں ضروری ہوگی، پس ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ اور انہیں طلاق دو ان کی عدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اسے طہر کے وقت طلاق دینے کے بارے حکم دیا جائے گا پس ضروری ہے کہ وہی (طہر) عدت میں بھی معتبر ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَطَلِّقُوْهُنَّ یعنی تم انہیں ایسے وقت میں طلاق دو جس کے ساتھ عدت گزاری جاتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وأحصُوا العِدَّةَ (اور تم عدت کو شمار کرو) اس سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ مطلقہ عدت گزارتی ہے اور وہ وہ طہر ہے جس میں طلاق دی جاتی ہے۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''اسے (یعنی اپنے بیٹے کو) حکم دو کہ وہ اس کی طرف رجوع کر لے پھر اسے چاہیے کہ وہ اسے روکے رکھے یہاں تک کہ وہ (حیض سے) پاک ہو جائے۔ پھر وہ حائضہ ہو پھر وہ پاک ہو پس یہی وہ عدت ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ عورتوں کو اس وقت طلاق دی جائے (1)۔'' اسے مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے (2)۔ اور یہ اس بیان میں نص ہے کہ طہر کا زمانہ ہی وہ ہے جسے عدت کا نام دیا جاتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں عورتوں کو طلاق دی جائے گی۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے حالت حیض میں طلاق دی تو وہ اس حیض کو شمار نہ کرے گی اور جس نے حالت طہر میں طلاق دی تو جمہور کے نزدیک وہ اس طہر کو عدت میں شمار کرے گی۔ پس یہی اولیٰ اور بہتر ہے۔

ابوبکر بن عبدالرحمٰن نے کہا ہے: ہم اپنے فقہاء میں سے کسی کو نہیں جانتے مگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قول کے مطابق وہ یہ کہتا ہے کہ اقراء سے مراد اطہار ہیں۔ پس جب آدمی ایسے طہر میں طلاق دے جس میں اس نے وطی نہ کی تو عورت مابقی طہر کو شمار کرلے گی اگرچہ وہ ایک ساعت اور ایک لحظہ ہو، پھر وہ حیض کے بعد دوسرے طہر کی طرف متوجہ ہوگی، پھر دوسرے حیض کے بعد تیسرے کی طرف متوجہ ہوگی۔ پس جب اس نے تیسرے حیض کا خون دیکھ لیا تو وہ ازواج کے لئے حلال ہوگئی (یعنی وہ نئی شادی کرسکتی ہے) اور عدت سے نکل گئی۔

اور اگر طلاق دینے والے نے ایسے طہر میں طلاق دی جس میں اس نے مباشرت کی تھی تو طلاق ثابت ہو جائے گی اور وہ گنہگار ہوگا اور وہ اس طہر میں سے مابقی کے ساتھ عدت گزارے (3)۔ اور زہری نے ایسی عورت کے بارے میں کہا ہے جسے طہر کے دوران طلاق دی گئی کہ وہ اس طہر کے مابقی دنوں کے سوا تین اطہار کے ساتھ عدت گزارے گی (☆)۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب تحریم طلاق الحائض، جلد 1، صفحہ 476، قدیمی کتب خانہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دارالکتب العلمیہ بیروت

☆ عورت کی عدت حیض کے اعتبار سے یا طہر کے اعتبار، ائمہ فقہ کا اس میں اختلاف ہے ائمہ احناف کے نزدیک حیض کے اعتبار سے ہے احناف کے دلائل قوی ہیں تفصیل 'ہدایہ' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ابوعمر نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے یہ کہا ہو کہ الأقراء سے مراد اطہار ہیں۔ یہ ابن شہاب زہری کے علاوہ کوئی کہتا ہے، کیونکہ انہوں نے کہا ہے وہ طہر جس میں طلاق دی گئی وہ لغو ہو جائے گا پھر وہ عورت تین اطہار کے ساتھ عدت گزارے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس قول کی بنا پر مطلقہ عورت حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ چوتھے حیض میں داخل ہو جائے اور ابن القاسم اور امام مالک اور آپ کے جمہور اصحاب، امام شافعی اور علمائے مدینہ رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے کہ مطلقہ عورت جب تیسرے حیض کا پہلا نقطہ دیکھے گی تو وہ عصمت (پابندی) سے نکل جائے گی (1)، یہی حضرت زید بن ثابت، حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کا مذہب ہے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے اور اسی کی طرف داؤد بن علی اور ان کے اصحاب گئے ہیں۔

اور زہری کے خلاف دلیل یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طاہر کی طلاق میں بغیر جماع کے اجازت عطا فرمائی اور اول طہر اور آخر طہر کا ذکر نہ فرمایا۔

اور اشہب نے کہا ہے: عصمت اور میراث منقطع نہیں ہوتیں یہاں تک کہ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ دم حیض ہے، تاکہ ایک دفعہ خون کا آنا دم حیض کے سوا کوئی اور نہ ہو (2)۔

علمائے کوفہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ بنت ابی حبیش کو اس وقت فرمایا جب اس نے آپ کے پاس خون کی شکایت کی: ''بے شک وہ ایک رگ ہے پس تو ابھی دیکھ اور جب تجھے دم حیض آئے تو تو نماز نہ پڑھ اور جب حیض کے ایام گزر جائیں تو تو طہارت حاصل کر (غسل کر لے) پھر ایک حیض سے دوسرے حیض تک نمازیں پڑھتی رہ (3)۔''

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ الّٰٓیِٴْ یَىٕسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ (الطلاق: 4) (اور تمہاری (مطلقہ) عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے۔) پس جس سے اسے ناامید اور مایوس قرار دیا گیا ہے وہ حیض ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ وہی علامت ہے اور جو اس کا عوض بنایا گیا ہے وہ مہینے ہیں جبکہ وہ معدوم ہو (یعنی حیض نہ آنے کی صورت میں عدت مہینوں کے ساتھ ہوگی۔) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی موجودگی میں کہا کہ لونڈی کی عدت دو حیض ہے (یعنی) آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے۔ اور اگر میں اس پر قدرت رکھتا کہ میں اس کی عدت ایک کامل اور ایک نصف حیض مقرر کر سکوں تو میں کر دیتا اور کسی صحابی نے بھی آپ کی بات کا انکار نہ کیا۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ ان کی طرف سے اجماع ہے اور یہی دس صحابہ کرام کا قول ہے انہیں میں سے خلفائے اربعہ بھی ہیں اور تیرے لئے وہی کافی ہے جو انہوں نے کہا ہے! اور قول باری تعالیٰ: وَ الْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ اس پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

3۔ سنن نسائی، کتاب الطہارۃ، باب ماء الرجل و ماء المرأۃ، جلد 1، صفحہ 45، وزارت تعلیم

دلالت کرتا ہے، کیونکہ اس کا معنی یتربصن ثلاثۃ اقراء ہے اور اس سے مراد کامل تین حیض ہیں اور یہ ممکن نہیں ہو سکتا مگر ہمارے قول کے مطابق کہ اقراء سے مراد حیض ہیں کیونکہ جو کہتے ہیں کہ مراد طہر ہیں وہ جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ دو طہر اور تیسرے کے بعض ایام عدت گزارے، کیونکہ جب اس نے حالت طہر میں طلاق دی تو وہ ان کے نزدیک اس طہر کا بقیہ حصہ عدت گزارے، یہی ایک قرء ہے اور ہمارے نزدیک وہ شروع حیض سے آغاز کرے گی تاکہ اسم (قرء) صادق آجائے اور جب آدمی نے عورت کو ایسے طہر میں طلاق دی جس میں اس نے وطی نہ کی تو وہ متوجہ ہوگی حیض کی طرف پھر حیض کی طرف پھر حیض کی طرف (یعنی وہ تین حیض عدت گزارے گی) اور جب وہ تیسرے حیض سے غسل کرلے تو وہ عدت سے نکل جائے گی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد رد کرتا ہے: سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ (الحاقۃ: 7) (اللہ نے مسلط کر دیا اسے ان پر (مسلسل) سات رات اور آٹھ دن تک) اور ثمانیۃ ایام میں ہاء کو ثابت رکھا ہے، کیونکہ الیوم مذکر ہے اور اسی طرح القرء ہے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یہی مراد ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے ساتھ اس میں موافقت کی ہے کہ عورت کو جب حالت حیض میں طلاق دی جائے کہ وہ اس حیض کو عدت میں شمار نہ کرے گی جس میں اسے طلاق دی گئی اور نہ ہی اس طہر کو جو اس حیض کے بعد ہوگا، بلکہ وہ عدت کا آغاز اس حیض سے کرے گی جو طہر کے بعد ہوگا اور ہمارے نزدیک وہ طہر سے عدت شروع کرے گی، جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اور اہل لغت نے جائز قرار دیا ہے کہ وہ بعض کو کل کے نام سے تعبیر کریں، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ اور اس سے مراد شہران (دو مہینے) اور تیسرے کے بعض ایام ہیں (1) اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ہے۔ واللہ اعلم

اور جو یہ کہتے ہیں کہ قرء سے مراد حیض ہیں ان میں سے بعض نے کہا ہے جب وہ تیسرے حیض سے پاک ہو جائے تو غسل کے بعد اس کی عدت گزر گئی اور رجعت کا حق باطل ہو گیا (2)۔ حضرت سعید بن جبیر، طاؤس، ابن شبرمہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔

اور شریک نے کہا ہے: جب عورت غسل میں بیس برس تک کوتاہی کرے گی تو اس کے خاوند کو اس پر رجعت کا حق حاصل رہے گا جب تک وہ غسل نہ کرلے۔

اور اسحاق بن راہویہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جب تیسرے حیض میں عورت میں عیب پڑ گیا تو وہ جدا ہو جائے گی اور خاوند کے لئے رجوع کا حق منقطع ہو جائے گا، مگر یہ کہ عورت کے لئے شادی کرنا حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اپنے حیض سے غسل کرلے اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور یہ قول ضعیف ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ: 234) (اور جب پہنچ جائیں اپنی (اس)

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 185، دار الفکر
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

مدت کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے) اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور رہا وہ جو امام شافعی نے ذکر کیا ہے کہ طہر سے حیض کی طرف نفس انتقال کو قرء کا نام دیا جاتا ہے اور اس کا فائدہ عورت پر عدت کو کم کرنا ہے اور وہ اس طرح کہ جب وہ عورت کو اس کے طہر کی آخری ساعت میں طلاق دے پھر وہ حیض میں داخل ہو جائے تو وہ اسے ایک قرء شمار کرلے گی اور تیسرے طہر سے منتقل ہوتے ہی عصمت منقطع ہوگئی اور وہ حلال ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ وہ لونڈی جسے حیض آتا ہے جب اس کا خاوند اسے طلاق دے تو اس کی عدت دو حیض ہوگی۔ اور ابن سیرین سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں لونڈی کی عدت کو آزاد عورت کی عدت کی طرح ہی دیکھتا ہوں مگر یہ کہ اس میں کوئی سنت جاری ہو چکی ہو، کیونکہ سنت زیادہ حق رکھتی ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔

اور الاصم عبدالرحمن بن کیسان، داؤد بن علی اور اہل ظاہر کی ایک جماعت نے کہا ہے: بے شک طلاق اور وفات کی عدت مہینوں اور حیضوں کے ساتھ ہے اس سے متعلقہ آیات لونڈی اور آزاد عورت کے حق میں عام ہیں، پس آزاد اور لونڈی کی مدت برابر ہے۔

اور جمہور نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: طلاق الأمة تطلیقتان و عدتها حیضتان(1) (لونڈی کی طلاق دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں) اسے ابن جریج نے عطا عن مظاہر بن اسلم عن ابیه عن القاسم بن محمد عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے بیان کیا ہے۔ قالت: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: طلاق الأمة تطلیقتان و قرؤھا حیضتان(2) آپ نے طلاق اور عدت دونوں کی اکٹھی نسبت اس کی طرف کی ہے مگر مظاہر بن اسلم اس حدیث کے ساتھ منفرد ہے اور وہ ضعیف ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے ان دونوں میں سے جو بھی غلام ہوا اس کی طلاق کم ہوگی۔ اور علماء کی ایک جماعت نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ یعنی حیض میں سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے اسے چھپانا ان کے لئے جائز نہیں۔ حضرت عکرمہ، زہری اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد حمل ہے۔ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے(3)۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد حیض اور حمل دونوں ہیں اور یہ اس بنا پر ہے کہ حاملہ عورت حائضہ ہوتی ہے اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، باب ما جاء ان طلاق الأمة تطلیقتان، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی سنة طلاق العبد، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم

جامع ترمذی، کتاب الطلاق، باب ما جاء ان طلاق الأمة تطلیقتان، حدیث نمبر 1102، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2069، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ

آیت سے معنی مقصود یہ ہے کہ جب عدت کا دارومدار حیض اور اطہار پر ہے اور دونوں پر اطلاع فقط عورتوں کی جانب سے ہو سکتی ہے تو پھر اس میں قول عورت کا ہی تسلیم کیا جائے گا جب وہ عدت کے گزرنے یا نہ گزرنے کا دعویٰ کرے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر امین بنادیا ہے اور یہی اس ارشاد کا مقتضی ہے: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ۔(1)

اور سلیمان بن یسار نے کہا ہے: ہمیں حکم نہیں دیا گیا ہے کہ ہم عورتوں کو کھولیں اور ان کی شرمگاہوں کی طرف دیکھیں، بلکہ اسے ان کے سپرد کیا گیا ہے کیونکہ انہیں اپنے آپ پر امین بنایا گیا ہے۔

اور چھپانے سے منع کرنے کے معنی مرد کو نقصان پہنچانے اور اس کا حق ضائع کرنے سے منع کرنا ہے، پس جب مطلقہ نے کہا: میں حیض سے ہوں، حالانکہ وہ حیض سے نہ ہو تو اس نے مرد کے رجوع کا حق ضائع کر دیا اور جب اس نے کہا: میں حیض سے نہیں ہوں، حالانکہ وہ حالت حیض میں ہو تو اس نے مرد پر وہ نفقہ لازم کر دیا جو اس پر لازم نہیں تو اس طرح اس نے مرد کو ضرر اور نقصان پہنچایا یا وہ حیض کی نفی کے بارے اپنے جھوٹ سے یہ قصد کرتی ہے کہ اسے واپس نہ لوٹایا جاسکے یہاں تک کہ عدت گزر جائے اور شریعت اس کے حق کو ختم کر دے اور اسی طرح حاملہ عورت حمل کو چھپاتی ہے تاکہ وہ مرد رجوع کے حق کو ختم کر دے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: دور جاہلیت میں ان کی عادت تھی کہ وہ حمل کو چھپاتی تھیں تاکہ وہ بچے کو نئے خاوند کے ساتھ ملا دیں، پس اس بارے میں آیت نازل ہوئی(2)۔

اور بیان کیا گیا ہے کہ اشجع کا ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے اور وہ حاملہ ہے اور مجھے اس کے شادی کرنے سے امن نہیں ہے اور میرا بیٹا دوسرے کے پاس چلا جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اشجعی کی عورت اس کے پاس لوٹا دی گئی۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن منذر نے بیان کیا ہے: اہل علم میں سے ہر اس نے کہا جس سے میں نے حفظ کیا: جب عورت نے دس دنوں میں کہا: میں نے تین حیض گزار لئے ہیں اور میری عدت گزر چکی ہے۔ بلاشبہ اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی اور اس سے وہ قول قبول نہیں کیا جائے گا، مگر وہ یہ کہے: میں نے کچا بچہ (سقط) گرادیا ہے تحقیق اس کی خلقت ظاہر ہو چکی تھی (تب اس کا قول قبول کرلیا جائے گا)۔

اور اس مدت میں علماء کا اختلاف ہے جس میں عورت کے قول کی تصدیق کی جائے گی، تو حضرت امام مالک نے کہا ہے: جب اس نے کہا ''میری عدت گزر چکی ہے'' یہ اتنی مدت میں کہا جس کی مثل میں عدت گزر سکتی ہے تو اس کا قول قبول کیا جائے گا(3) اور اگر اس نے اتنی مدت میں عدت گزرنے کی خبر دی جس میں شاذ و نادر ایسا ہو سکتا ہے تو اس کے بارے دو قول ہیں۔ آپ نے المدونہ میں فرمایا: جب عورت نے کہا میں نے ایک مہینے میں تین حیض گزار لئے ہیں اس کی تصدیق کر لی جائے بشرطیکہ عورتیں اس کی تصدیق کر دیں(4)، اسی طرح شریح نے کہا ہے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا قالون!

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً

3۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب ارخاء الستور، باب دعوی المرأۃ انقضاء عدتها، جلد 5، صفحہ 10، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر　4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 12

یعنی تو نے درست کہا اور اچھا کہا۔

اور کتاب محمد میں فرمایا: اس کی تصدیق نہ کی جائے گی مگر ڈیڑھ ماہ میں۔ اور اسی طرح ابوثور کا قول ہے۔ ابوثور نے کہا ہے: کم سے کم اس کے قول کی تصدیق سینتالیس دنوں میں ہو سکتی ہے اور وہ اس طرح کہ کم سے کم طہر کی مدت پندرہ دن ہے اور کم سے کم حیض کی مدت ایک دن ہے۔ اور حضرت نعمان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: ساٹھ دنوں سے کم مدت میں عورت کے قول کی تصدیق نہیں کی جائے گی، اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، رحم میں موجود شے کو چھپانے کی حرمت کی تاکید کے لئے یہ انتہائی شدید اور عظیم وعید ہے اور فی الحقیقت رحم میں جو کچھ ہے اس کے بارے خبر دینے کی امانت کی ادائیگی کے لئے واجب ہونے کا اظہار ہے۔ یعنی مومن عورتوں کا شیوہ یہ ہے کہ وہ حق کو نہ چھپائیں، اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو ایمان نہیں رکھتا اس کے لئے چھپانا مباح ہے، کیونکہ ایسا کرنا اس کے لئے بھی حلال نہیں جو ایمان نہیں رکھتا، بلاشبہ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: ان کنت اخی فلا تظلمنی (اگر تو میرا بھائی ہے تو تو مجھ پر ظلم نہ کر)، (بلکہ مقصود یہ ہے) کہ چاہئے ایمان تجھے ایسا کرنے سے روکے، کیونکہ ایسا کرنا اہل ایمان کے فعل میں سے نہیں ہے (یعنی ان کے شایان شان نہیں ہے۔)

قولہ تعالیٰ: وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَبُعُوْلَتُهُنَّ۔ البعولۃ: البعل کی جمع ہے اور اس کا معنی زوج (خاوند) ہے (1) اور اسے بعل اس لئے نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ زوجہ پر ان چیزوں کے بارے میں غالب اور بلند ہوتا ہے جن کا وہ اس کی زوجیت کے اعتبار سے مالک ہوتا ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا (الصافات: 125) ای ربًا۔ کیا تم رب کو پکارتے ہو۔ تو اسے ربوبیت میں بلند ہونے کی وجہ سے بعل کہا گیا ہے، کہا جاتا ہے: بَعْل و بُعُولۃ۔ جیسا کہ ذکر کی جمع میں کہا جاتا ہے ذَكَرٌ و ذُكُوْرَةٌ اور فحل کی جمع میں کہا جاتا ہے: فَحَلٌ و فُحُوْلَةٌ، اس کے آخر میں یہ ہا زائدہ ہے اور جمع مؤنث کی تاکید کے لئے ہے (2) اور یہ شاذ ہے، اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جا سکتا اور اس میں سماع معتبر ہوتا ہے، پس لَعْبٌ میں لُعُوْبَةٌ نہیں کہا جا سکتا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ ہا تانیث ہے جو فُعُوْل پر داخل کی گئی ہے (3)۔

اور البَعُولۃ البَعل کا مصدر بھی ہے اور بَعل الرجل یَبْعَل (مثل منع یمنع) بُعُوْلَةٌ، یعنی آدمی بعل ہو گیا اور المباعلۃ اور البِعال کا معنی جماع ہے۔ اسی معنی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایام تشریق کے بارے ارشاد گرامی ہے: انها أيام أكل و شرب و بعال (4) (کہ وہ کھانے، پینے اور جماع کرنے کے دن ہیں۔) یہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس آدمی عورت کے لئے بعل ہوتا ہے اور عورت مرد کے لئے بعلۃٌ ہوتی ہے اور بَاعَل مُبَاعلۃ کہا جاتا ہے جب وہ اس سے مباشرت کرے اور فلان بعل هذا، یعنی فلاں اس کا مالک اور مربی ہے۔ اس کے کثیر محامل ہیں وہ آگے آئیں گے۔ ان شاء اللہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ سنن دار قطنی، کتاب طلوع الشمس بعد الافطار، جلد 3، صفحہ 212، حدیث نمبر 32، دار المحاسن القاہرہ

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ وہ انہیں واپس لوٹانے کا زیادہ حق رکھتا ہے: پس مراجعت کی دو صورتیں ہیں: ایک مراجعت عدت کے دوران اس کی بنا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث پر ہے اور دوسری مراجعت عدت کے بعد اس کی بنا حضرت معقل کی حدیث پر ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر آیت میں اس کی تخصیص پر دلیل ہوگی جسے مسمیات کا عموم شامل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ عام ہے ان کے بارے میں بھی جنہیں تین طلاقیں دی گئی ہوں اور ان کے بارے میں بھی جنہیں تین سے کم دی گئی ہوں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ یہ اس کے بارے میں خاص حکم ہے جس کی طلاقیں تین سے کم ہوں۔

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ آزاد آدمی جب اپنی آزاد بیوی کو طلاق دے ایک طلاق یا دو طلاقیں اور وہ مدخول بہا بھی ہو تو وہ اس کی طرف رجوع کا زیادہ حق رکھتا ہے جب تک اس کی عدت نہ گزرے اگرچہ عورت ناپسند بھی کرے اور اگر طلاق دینے والے نے اس کی طرف رجوع نہ کیا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی تو پھر وہ عورت اپنے نفس کی زیادہ حقدار ہے اور وہ اس سے اجنبیہ ہو جائے گی اور وہ اس کے لئے ولی کی اجازت اور شاہدوں کی شہادت کے ساتھ نیا نکاح کیے بغیر حلال نہیں ہوگی نہ کہ مراجعت کے طریقہ پر، اس پر علماء کا اجماع ہے۔

مہلب نے کہا ہے: ہر وہ جس نے عدت کے دوران رجوع کر لیا صرف رجوع پر گواہ بنائے بغیر احکام نکاح میں سے کوئی شے اس پر لازم نہ ہوگی۔ اس پر بھی علماء کا اجماع ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اشاد ہے: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (الطلاق:2) (تو جب پہنچنے لگیں اپنی میعاد کو تو روک لو انہیں بھلائی کے ساتھ یا جدا کر دو انہیں بھلائی کے ساتھ اور گواہ مقرر کر لو دو معتبر آدمی اپنے میں سے) پس رجعت میں تو گواہ بنانے کا ذکر کیا ہے اور نکاح اور طلاق میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: ہم نے کتاب اللہ میں جو مسائل اہل علم کے اجماع کے ساتھ ذکر کر دیے ہیں وہ کافی ہیں ان کے ذکر کی حاجت نہیں جو اس باب میں متقدمین سے مروی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس کے بارے میں اختلاف ہے جس کے ساتھ ایک آدمی عدت کے دوران رجوع کر سکتا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب آدمی عدت کے دوران عورت سے وطی کرے اور وہ رجعت کا ارادہ رکھتا ہو اور وہ شاہد بنانے سے جاہل ہو اور ناواقف ہو تو رجعت ثابت ہو جائے گی اور عورت کو چاہیے کہ وہ مرد کو مباشرت سے روکے، یہاں تک کہ وہ گواہ بنالے۔ اسی طرح اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ مانویٰ(1) (اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔)

اور اگر اس نے عدت میں وطی کی لیکن وہ رجعت کی نیت نہیں کرتا تو امام مالک نے فرمایا ہے: وہ عدت میں رجوع کر سکتا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان باب کیف کان بدء الوحی، جلد 1، صفحہ 2، وزارت تعلیم

ہے اور وہ اس سے وطی نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ اسے فاسد پانی سے استبرا کرا لے (1) (یعنی یہ یقین کر لے کہ پہلی وطی سے استقرار حمل نہیں ہوا)۔

ابن قاسم نے کہا ہے: اگر اس کی عدت گزر جائے تو وہ اور کوئی غیر بقیہ مدت استبرا میں اس کے ساتھ نکاح نہ کرے، اگر اس نے کیا تو اس کا نکاح فسخ کر دیا جائے گا اور عورت مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام نہیں ہو گی کیونکہ وہ پانی بھی تو اسی کا پانی ہے۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب مرد نے عورت کے ساتھ مجامعت کر لی تو اس نے اس کی طرف رجوع کر لیا: اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، حسن بصری، ابن سیرین، زہری، عطا، طاؤس اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ مزید کہا: اور وہ شاہد بنا لے گا، اسی طرح اصحاب الرائے، امام اوزاعی اور ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے، اسے ابن منذر نے بیان کیا ہے۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: تحقیق کہا گیا ہے: اس کی وطی ہر حال میں رجوع ہو گی، چاہے وہ رجعت کی نیت کرے یا نہ کرے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے ایک فریق سے اسی طرح روایت کیا جاتا ہے اور یہی موقف لیث نے اپنایا ہے۔

اور انہوں (علماء) نے اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کیا جس نے اپنی لونڈی خیار کے ساتھ فروخت کی کہ اس کے لئے مدت خیار میں اس کے ساتھ وطی کرنا مباح ہے اور یہ کہ وہ اس کے ساتھ اسے اپنی ملکیت کی طرف واپس لوٹا لائے اور اسے اپنے اس فعل کے ساتھ بیع توڑنے کا اختیار ہے اور یہ حکم مطلقہ رجعیہ کے لئے ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ جس نے بوسہ لیا یا مباشرت کی اور اس سے وہ رجعت کی نیت کرتا ہے تو رجعت ثابت ہو جائے گی اور اگر اس نے بوسہ اور مباشرت سے رجعت کی نیت نہ کی تو وہ گنہگار ہو گا اور رجوع کرنے والا نہ ہو گا اور سنت یہ ہے کہ وہ وطی کرنے سے پہلے یا بوسہ لینے یا مباشرت سے پہلے گواہ بنا لے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: اگر اس نے عورت سے وطی کی یا شہوت کے ساتھ اسے مس کیا یا شہوت کے ساتھ اس کی فرج کی طرف دیکھا تو اس کی رجعت ثابت ہو جائے گی، یہی امام ثوری کا قول ہے اور اسے چاہیے کہ وہ گواہ بنا لے اور امام مالک، امام شافعی، اسحاق، ابو عبید اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم کے قول کے مطابق رجعت ثابت نہ ہو گی۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے اور المنتقی میں کہا ہے بالقول رجوع کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور رہا بالفعل جیسا کہ جماع اور بوسہ وغیرہ تو قاضی ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان کے ساتھ اور ان تمام افعال کے ساتھ جو حصول لذت کے لئے کیے جاتے ہیں رجوع صحیح ہوتا ہے۔

ابن المواز نے کہا ہے: لذت کے لئے جسم کو چھونا یا اس کی فرج کی طرف دیکھنا یا اس کے محاسن میں سے جو اس کے قریب ہیں انہیں دیکھنا جبکہ وہ اس سے رجعت کا ارادہ کرے بخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کے کہ رجعت صحیح نہیں ہوتی مگر بالقول، اسے ابن منذر نے ابو ثور، جابر بن زید اور ابو قلابہ رحمۃ اللہ علیہم سے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر اس نے عورت سے جماع کیا وہ رجعت کی نیت کرے یا اس کی نیت

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدۃ و طلاق السنۃ، باب ما جاء فی عدۃ المطلقۃ، جلد 5، صفحہ 122، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

نہ کرے تو اس طرح رجعت ثابت نہ ہوگی اور اس کے لئے مرد پر مہر مثل ہوگا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی، کیونکہ اگر وہ اسے لوٹا لیتا تو اس پر کوئی مہر نہ تھا اور بغیر رجعت کے وطی مہر کے عوض رجعت سے اولی نہیں ہوگی۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا سوائے امام شافعی کے کہ جس نے اس پر مہر مثل واجب کیا ہو اور ان کا قول قوی نہیں ہے، کیونکہ یہ عورت زوجات کے حکم میں ہے اور یہ اس مرد کی وارث بنتی ہے اور وہ اس کا وارث بنتا ہے تو کس طرح اس عورت کے ساتھ وطی کرنے میں مہر مثل واجب ہوگا جس کا حکم اپنے اکثر احکام میں زوجہ کے حکم کی مثل ہے، مگر یہ کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں شبہ قوی ہے، کیونکہ بغیر رجعت کے اس عورت کو اس مرد پر حرام قرار دیا گیا ہے اور اس پر علماء کا اجماع ہے کہ وہ عورت جس کے ساتھ شبہ کے سبب وطی کی جائے اس کے لئے مہر واجب ہوتا ہے اور تجھے یہی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا آدمی عورت کی طرف رجوع کرنے سے پہلے اس کے ساتھ سفر کر سکتا ہے؟ تو امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ اس کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ رجوع کر لے(1)۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ اور امام زفر کے سوا آپ کے دیگر اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ کیونکہ امام زفر سے حسن بن زیاد نے روایت کیا ہے کہ آدمی کے لئے رجعت سے پہلے اس کے ساتھ سفر کرنا جائز ہے اور ان سے عمرو بن خالد نے روایت کیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا یہاں تک کہ وہ رجوع کر لے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اس بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے کہ کیا آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کے پاس داخل ہو اور اس کے محاسن میں سے کوئی شے دیکھے اور کیا وہ عورت اس کے لئے بناؤ سنگھار کرے گی اور پھر اس پر ظاہر ہوگی؟ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ اس کے ساتھ خلوت اختیار نہیں کر سکتا اور نہ ہی بغیر اجازت کے وہ اس پر داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی طرف وہ دیکھ سکتا ہے مگر یہ کہ اس پر کپڑے ہوں اور نہ ہی وہ اس کے بالوں کی طرف دیکھ سکتا ہے اور کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ کھانا کھائے بشرطیکہ ان دونوں کے ساتھ ان کے سوا کوئی اور بھی ہو اور نہ وہ ایک کمرے میں اس کے ساتھ رات بسر کر سکتا ہے بلکہ وہ اس سے (دوسرے کمرے میں) منتقل ہو جائے گا۔

ابن قاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور کہا ہے: نہ وہ اس پر داخل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بال دیکھ سکتا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ اس کے لئے بناؤ سنگھار کر سکتی ہے، خوشبو لگا سکتی ہے، زیور پہن سکتی ہے اور اس کے سامنے بھی آ سکتی ہے۔

اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب آدمی اپنی عورت کو ایک طلاق دے دے تو وہ اس کے پاس اجازت لے کر آ سکتا ہے اور وہ لباس اور زیور میں سے جو چاہے پہن سکتی ہے اور اگر ان دونوں کے لئے ایک کمرے کے سوا اور کوئی نہ ہو تو

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدۃ و طلاق السنۃ، جلد 5، صفحہ 146، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

وہ اپنے درمیان پردہ ڈال لیں اور آدمی اس کے پاس داخل ہوتے وقت سلام کہے۔ اسی طرح حضرت قتادہ سے بھی مروی ہے اور وہ اسے کنکھارنے یا کھانسنے وغیرہ کے ساتھ اپنے آنے کا احساس دلائے جب وہ داخل ہو۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ عورت جسے ایک طلاق دی گئی ہو آدمی اس کی طرف رجوع کا مالک ہوتا ہے اور وہ طلاق دینے والے پر طلاق بائنہ والی کی طرح حرام کی گئی ہے یہاں تک کہ وہ رجوع کرلے اور وہ رجوع نہیں کرے گا مگر قول کے ساتھ، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ طلاق دینے والے نے جب عدت گزرنے کے بعد کہا: بلاشبہ میں نے عدت میں تیری طرف رجوع کرلیا تھا اور اس نے انکار کردیا، تو اس میں عورت کا قول اس کی قسم کے ساتھ قبول کرلیا جائے گا اور آدمی کو اس پر کوئی اختیار نہ رہے گا، مگر حضرت نعمان (امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) نکاح اور رجعت میں قسم کا نظریہ نہیں رکھتے اور صاحبین نے اس میں ان کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور ان دونوں نے دیگر تمام اہل علم کے قول کی مثل ہی کہا ہے۔ اور اسی طرح جب بیوی لونڈی ہو اور آقا اور لونڈی کا اختلاف ہو جائے اور خاوند عدت گزرنے کے بعد عدت میں رجوع کا دعویٰ کرتا ہو اور اس (لونڈی) نے انکار کیا ہو تو اس میں قول زوجہ لونڈی کا معتبر ہوگا اگرچہ اس کا آقا اسے جھوٹا قرار دے، یہی امام شافعی، ابوثور اور نعمان رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے اور یعقوب اور محمد نے کہا ہے: قول آقا کا معتبر ہوگا کیونکہ وہی اس کا زیادہ حق رکھتا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ لفظ رد عصمت کے زوال کا تقاضا کرتا ہے مگر ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک طلاق رجعی وطی کو حرام کردیتی ہے اور رجوع اسے حلت کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

اور لیث بن سعد، ابوحنیفہ اور جنہوں نے ان دونوں کے قول کے مطابق کہا ہے، ان کا بیان ہے کہ رجعت وطی کو حلال کر دیتی ہے، طلاق کا فائدہ اس عدد کو کم کرنا ہے جو صرف اس کے لئے رکھا گیا ہے اور احکام زوجیت باقی ہیں ان میں سے کوئی شے نہیں کھلی۔ انہوں نے کہا: احکام زوجیت اگرچہ باقی ہیں، لیکن جب تک عدت میں ہے وہ عدت گزرنے کے ساتھ زوال کے راستے پر چل رہی ہے۔ پس رجعت اس راستے سے واپس لوٹانے کا نام ہے جسے عورت نے اپنے چلنے کے لئے اختیار کر رکھا ہے۔ اور یہ رد مجازی ہے اور وہ رد جس کے ساتھ ہم نے حکم لگایا وہ رد حقیقی ہے کیونکہ وہاں زوال رو پذیر ہو چکا ہے اور وہ وطی کو حرام قرار دینا ہے، پس اس سے حقیقۃً رد (رجوع) واقع ہوا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 10۔ لفظ اَحَقُّ کا اطلاق دو حقوں کے درمیان تعارض کے وقت ہوتا ہے اور ان میں سے ایک حق ترجیح پا جاتا ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ انتظار کی مدت (عدت) میں خاوند کا حق عورت کے بارے میں اس کے اپنے حق سے زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ عورت عدت گزرنے کے بعد اپنے نفس کی مالک بنتی ہے اور اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد بھی ہے: الایم احق بنفسہا من ولیہا (1) (بیوہ عورت اپنے بارے میں اپنے ولی کی نسبت زیادہ حق رکھتی ہے۔) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ آدمی کے لئے رجوع مستحب ہے لیکن جب عورت کے لئے اپنے احوال کی اصلاح کے سبب

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 1888

اصلاح کا قصد کرے اور آپس میں وحشت کو زائل کرنے کا قصد کرے اور اگر عورت کو ضرر پہنچانے، عدت کو طویل کرنے اور اس کے ساتھ نکاح کے پٹے سے خلاصی پانے کو قطع کرنے کا قصد اور ارادہ کرے تو پھر اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ارشاد ربانی ہے: وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا (البقرہ: 231) (اور نہ روکو انہیں تکلیف دینے کی غرض سے تاکہ زیادتی کرو) پھر جس نے ایسا کیا تو رجعت صحیح ہوگی۔ اگرچہ اس نے نہی کا ارتکاب کیا اور اپنے نفس پر ظلم کیا اور اگر ہم نے اس مقصد کو جان لیا تو ہم اسی پر چھوڑ دیں گے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ، اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَهُنَّ یعنی حقوق زوجیت میں سے ان کے حقوق مردوں پر ہیں جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بلاشبہ میں اپنی بیوی کے لئے زیب و زینت کا انتظار کرتا ہوں جس طرح وہ میرے لئے بناؤ سنگھار کرتی ہے اور میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ یہی ہے کہ میں اپنے وہ تمام حقوق اچھی طرح حاصل کروں جو میرے اس پر ہیں اور وہ اپنے وہ حقوق حاصل کرے جو اس کے مجھ پر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق) یعنی ایسی زینت جس میں گناہ نہ ہو۔ اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے: یعنی ان کے لئے حسن صحت اور حسن سلوک ان کے خاوندوں پر اسی طرح لازم ہے جس طرح اپنے خاوندوں کے۔ لئے ان پر ہر اس کام میں اطاعت واجب ہے جو وہ ان پر لازم قرار دیں۔

اور کہا گیا ہے: بے شک ان کے لئے ان کے خاوندوں پر انہیں اذیت نہ دینا اسی طرح لازم ہے جس طرح اپنے خاوندوں کے لئے مضرت کو ترک کرنا ان پر لازم ہے۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: تم ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس طرح کہ ان پر لازم ہے کہ وہ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈریں (1)۔ تمام معانی باہم قریب قریب ہیں اور یہ آیت حقوق زوجیت سے متعلقہ تمام حقوق کو شامل ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''بلاشبہ میں اپنی زوجہ کے لئے زیب و زینت کرتا ہوں''۔ (2)

علماء نے کہا ہے: رہی مردوں کی زینت تو اس کا انحصار ان کے مختلف احوال پر ہوتا ہے۔ بے شک وہ اس کے اعمال نرم مزاجی، خوش اخلاقی اور اتفاق کی بنا پر کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایک طرح کی زینت ایک وقت میں مناسب ہوتی ہے اور ایک وقت میں وہی مناسب نہیں ہوتی، کبھی ایک طرح کی زینت جوانوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اور ایک زینت بوڑھوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اور وہ جوانی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ شیخ اور بوڑھا آدمی جب اپنی لبیں مونڈ دے تو یہ اس کے لئے موزوں ہے اور اس کے لئے باعث زینت ہے اور جوان جب ایسا فعل کرے تو وہ بدصورت ہو جاتا ہے اور اسے ناپسند کیا جاتا ہے، کیونکہ داڑھی ابھی بڑھی نہیں اور جب وہ اپنی لبیں مونڈ دے جونہی وہ پہلی بار ظاہر ہوں تو

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 543، دار احیاء التراث العربیۃ

2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 544

اس کا چہرہ قبیح ہو جاتا ہے اور جب اس کی داڑھی بڑھ جائے اور وہ اپنی لبوں کو مونڈ دے تو یہی اس کے لئے زینت بن جاتی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میرے رب نے مجھے حکم ارشاد فرمایا ہے کہ میں داڑھی مبارک کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دوں اور اپنی لبوں کو کاٹوں (1)۔'' اسی طرح لباس کی کیفیت اور حالت بھی ہے۔ اور ان تمام میں حقوق کی طلب اور چاہت ہے۔ بلاشبہ وہ نرم مزاجی اور خوش اسلوبی سے کام کرتا ہے تاکہ وہ اپنی بیوی کے نزدیک اتنا حسین اور خوبصورت ہو جائے کہ اسے خوش کر دے۔ اور وہ اسے کسی بھی غیر مرد سے پاکدامن کر دے۔ اسی طرح سرمہ ہے مردوں میں سے بعض کے ساتھ وہ مناسبت رکھتا ہے اور بعض کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔ اور جہاں تک خوشبو لگانا، مسواک کرنا، دانتوں کا خلال کرنا، میل کچیل اور فالتو بالوں کو دور کرنے، پاکیزگی وطہارت حاصل کرنے اور ناخن تراشنے کا تعلق ہے تو یہ اعمال بالکل ظاہر اور تمام کے موافق ہیں اور خضاب بوڑھوں کے لئے اور انگوٹھی جوانوں اور بوڑھوں تمام کے لئے زینت ہے اور یہ مردوں کا زیور ہے۔ اس کا بیان سورۃ النحل میں آئے گا۔ پھر اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس کی حاجت کے اوقات مقرر کرے اور اسے پاکدامن بنائے اور اسے کسی غیر کی طرف دیکھنے سے بے نیاز کر دے اور اگر آدمی اپنے آپ میں بستر پر عورت کے حقوق ادا کرنے سے عجز اور کمزوری دیکھے تو وہ ایسی ادویہ استعمال کرے جو اس کی قوت باہ میں اضافہ کریں اور اس کی شہوت کو تقویت پہنچائیں یہاں تک کہ وہ اسے پاکدامن بنا دے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ یعنی مردوں کے لئے عورتوں پر درجہ اور رتبہ ہے۔ اور مَدْرَجَةُ الطريق: اس کا معنی ہے راستے کا بلند اور بڑا حصہ۔ اس میں اصل معنی الطی لپیٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے: دَرَجوا، یعنی طَوَوْا اعمرهم انہوں نے اپنی اپنی عمریں لپیٹ لیں اور اسی سے وہ درجہ ہے جس پر وہ ترقی کرتا ہے اور کہا جاتا ہے: رجل بین الرّجلة، یعنی ایسا آدمی جس کی قوت ظاہر ہو۔ وھو أرجل الرجلین اور وہ ان دو میں سے زیادہ قوی ہے اور فرس رجیل یعنی طاقتور گھوڑا اور اسی سے الرِجل ہے کیونکہ اس میں چلنے کی قوت ہوتی ہے۔ پس آدمی کے مرتبہ کی زیادتی اس کی عقل اور اس کے خرچ کرنے کی قوت کے سبب اور دیت، میراث اور جہاد کے سبب ہے۔

حمید نے کہا ہے: الدرجہ کا معنی داڑھی ہے۔ یہ اگر ان کی طرف سے صحیح بھی ہے تو بھی ضعیف ہے۔ اس کا تقاضا نہ آیت کا لفظ کرتا ہے اور نہ اس کا معنی۔ (2)

ابن عربی نے کہا ہے: بندے کے لئے اچھا اور خوبصورت یہ ہے کہ اس سے باز رہے جو وہ نہیں جانتا اور خصوصاً کتاب اللہ کے بارے میں اور مردوں کی عورتوں پر فضیلت کسی ذی عقل پر مخفی نہیں ہے اور اگر اور کچھ نہ ہو تو بھی عورت مرد سے تخلیق کی گئی ہے۔ پس مرد اس کی اصل ہے (3) اور مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے بغیر اجازت کے تصرف کرنے سے روکے اور وہ روزہ نہیں رکھ سکتی مگر مرد کی اجازت کے ساتھ اور وہ حج نہیں کر سکتی مگر محرم کے ساتھ۔ اور کہا گیا ہے کہ الدرجة کا معنی الصداق

1۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 656، مؤسسۃ الرسالہ بیروت۔ بخاری شریف، باب تقلیم الأظفار، حدیث نمبر 5442، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 188-189، دار الفکر

(دوستی) بھی ہے۔ شعبی نے یہی کہا ہے اور کہا گیا ہے اس کا معنی جواز الادب (ادب کا لحاظ رکھنا) ہے۔ جملہ معانی کے اعتبار سے الدرجہ کا لفظ تفضیل کا تقاضا کرتا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ خاوند کا حق زوجہ پر اس سے زیادہ ہے جو بیوی کا حق خاوند پر ہے۔ اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ولو امرت احدا بالسجود لغیر اللہ لأمرت المرأۃ ان تسجد لزوجها(1) (اگر میں کسی کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ الدرجہ کا لفظ مردوں کو حسن معاشرت پر ابھارنے اور عورتوں کے لئے مال اور اخلاق میں وسعت ظرفی اپنانے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی بلاشبہ افضل کو چاہئے کہ وہ اپنے اوپر بوجھ برداشت کرے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول حسین اور عمدہ ہے۔(2)

ماوردی نے کہا ہے: احتمال ہے کہ یہ حقوق نکاح میں ہو۔ اس کے لئے ان کے سوا کو عقد نے اٹھا دیا ہے اور عورت پر لازم ہوتا ہے کہ مرد کے بلانے پر اس کے بستر پر جائے اور مرد پر اس کی دعوت کو قبول کرنا لازم نہیں ہوتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں اسی کے بارے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: ''جس عورت کو اس کے خاوند نے اپنے بستر کی جانب بلایا اور اس نے اس سے انکار کر دیا تو ملائکہ صبح ہونے تک اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں''(3)۔ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ یعنی وہ مضبوط سلطان ہے، اس پر کوئی اعتراض کرنے والا نہیں۔ حَكِيْمٌ یعنی وہ جاننے والا ہے اور جو وہ کرتا ہے وہی درست اور صحیح کرتا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

''طلاق دو بار ہے پھر یا تو روک لینا ہے بھلائی کے ساتھ یا چھوڑ دینا ہے احسان کے ساتھ اور جائز نہیں تمہارے لئے کہ لو تم اس سے جو تم نے دیا ہے انہیں کچھ بھی بجز اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو تو کوئی حرج نہیں ان پر کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے۔ یہ حدیں ہیں اللہ کی سو ان سے آگے نہ بڑھو اور جو کوئی آگے بڑھتا ہے اللہ کی حدوں سے سو وہی لوگ ظالم ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اس میں سات مسائل ہیں:

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المراۃ، جلد 1، صفحہ 134، وزارت تعلیم

جامع ترمذی، باب جاء فی حق الزوج علی المراۃ، حدیث نمبر 1079، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ 3۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، حدیث نمبر 4794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ۔ یہ بات ثابت ہے کہ اہل جاہلیت کے نزدیک طلاق کے لئے کوئی عدد معین نہ تھا۔ البتہ ان کے نزدیک عدت (کی مدت) معین اور مقرر تھی اور ابتدائے اسلام میں بھی کچھ عرصہ یہی رہا۔ ایک آدمی اپنی عورت کو جو چاہتا تھا طلاق دے دیتا تھا اور جب وہ اس کی طلاق سے حلال ہونے کے قریب ہوتی تو وہ اس سے رجوع کر لیتا جب تک چاہتا، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی نے اپنی عورت کو کہا: نہ میں تجھے گھر میں رکھوں گا اور نہ تجھے چھوڑوں گا کہ تو (کسی کے لئے) حلال ہو جائے۔ اس نے کہا: وہ کیسے ہوگا؟ اس نے کہا: میں تجھے طلاق دوں گا اور جب تیری عدت گزرنے کے قریب ہوگی تو میں تجھ سے رجوع کرلوں گا (1)۔ تو اس عورت نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس کی شکایت کی اور آپ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اس کا ذکر کیا، سو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جو آدمی کے لئے طلاق کی اس تعداد کو بیان کرتی ہے جس میں وہ بغیر مہر اور ولی کے رجوع کرسکتا ہے اور جو طریقہ ان میں رائج تھا اسے منسوخ کر دیا۔ اس کا یہ معنی حضرت عروہ بن زبیر، حضرت قتادہ اور حضرت ابن زید وغیرہم نے بیان کیا ہے۔ (2)

اور حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم وغیرہ نے کہا ہے: اس آیت سے مقصود سنت طلاق کی پہچان ہے، یعنی جو دو طلاقیں دے تو اسے تیسری کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے، پس یا تو اس کے حقوق میں سے کسی شی کا ظلم کیے بغیر اسے چھوڑ دے یا پھر اسے حسن معاشرت کے ساتھ اپنے پاس روک لے اور آیت ان دونوں معنوں کو متضمن ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ طلاق سے مراد اس بندھن اور عصمت کو کھولنا ہے جو مخصوص الفاظ کے ساتھ زوجین کے درمیان منعقد اور قائم ہوئی۔ اس آیت اور اس کے علاوہ دیگر آیات کے ساتھ ثابت ہے کہ طلاق مباح ہے اور حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے: فان شاء امسک وان شاء طلق (4) (پھر اگر وہ چاہے تو اسے روک لے اور اگر چاہے تو طلاق دے دے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دی اور پھر ان کی طرف رجوع کر لیا (5)۔ اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔ (6)

اور علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس نے اپنی عورت کو ایسے طہر کے دوران طلاق دی جس میں اس نے اس سے مقاربت نہ کی ہو تو وہ سنت کے مطابق طلاق دینے والا ہے اور اس کے لئے وہ عدت ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جب عورت مدخول بہا ہو تو مرد کے لئے اس کی عدت گزرنے سے پہلے پہلے رجعت کا حق حاصل ہوگا اور جب عدت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دارالکتب العلمیہ

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1113، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دارالکتب العلمیہ۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق والخلع والایلاء، جلد 4، صفحہ 10، دارالمحاسن قاہرہ

بخاری شریف، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابن ماجہ کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 146، وزارت تعلیم

6۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گزر گئی تو وہ بھی خطاب میں سے ایک خاطب (پیغام نکاح بھیجنے والا) ہے۔ کتاب اللہ، سنت اور اجماع امت اس پر دال ہے کہ طلاق مباح ہے ممنوع نہیں ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: اس سے منع کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے جو ثابت ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ دار قطنی نے روایت کیا ہے "مجھے ابوالعباس محمد بن موسیٰ بن الدولابی اور یعقوب بن ابراہیم دونوں نے حدیث بیان کی ہے اور ان دونوں نے کہا ہے: ہمیں حسن بن عرفہ، اسماعیل بن عیاش بن حمید ابن مالک اللخمی نے مکحول سے اور انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ذکر کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے معاذ! روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک عتاق (آزاد کرنے) سے زیادہ پسندیدہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر کوئی شے تخلیق نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہو۔ پس جب کوئی آدمی اپنے غلام کو کہے انت حران شاء اللہ تعالیٰ تو آزاد ہے اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا، تو وہ آزاد ہے اور اس کے لئے استثنا نہیں ہے اور اگر کوئی اپنی بیوی کو کہے انت طالق ان شاء اللہ تعالیٰ تو اس کے لئے استثنا ہے اور اسے طلاق واقع نہ ہوگی۔"

محمد بن موسیٰ بن علی، حمید بن ربیع، یزید بن ہارون نے ہمیں بیان کیا کہ اسماعیل بن عیاش نے اپنی اسناد کے ساتھ اسی طرح ہمیں خبر دی ہے۔

حمید نے کہا ہے کہ مجھے یزید بن ہارون نے کہا ہے: کون سی حدیث ہے اگر حمید ابن مالک اللخمی معروف ہوتا! میں نے کہا: وہ میرے دادا ہیں! تو یزید نے کہا: تو نے مجھے خوش کر دیا ہے، اب یہ حدیث ہوئی ہے!" (1)

ابن منذر نے بیان کیا ہے: جنہوں نے طلاق میں استثنا یعنی ان شاء اللہ کو مؤخر قرار دیا ہے ان میں سے طاؤس، حماد، امام شافعی ابوثور اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔

امام مالک اور امام اوزاعی کے قول کے مطابق طلاق میں استثنا جائز نہیں ہے اور حسن اور قتادہ کا صرف طلاق کے بارے میں یہی قول ہے۔ فرمایا: وبالقول الاول اقول۔ میں تو پہلے قول کے مطابق کہتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ یہ مبتدا ہے اور خبر امثل یا احسن ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو، یعنی فعلیکم امساک بمعروف، یا فالواجب علیکم امساک بما یعرف أنه الحق (2) (یعنی تم پر واجب ہے روک لینا ایسے طریقہ سے جس کے بارے یہ معلوم ہو کہ یہ حق اور درست ہے) اور قرآن کے علاوہ اسے مصدر ہونے کی بنا پر فَاِمْسَاكًا پڑھنا بھی جائز ہے۔

اور بِاِحْسَانٍ کا معنی یہ ہے کہ وہ بیوی کے حقوق میں سے کسی بھی شے میں اس پر ظلم نہ کرے اور نہ قول میں زیادتی اور حد سے تجاوز کرے۔ اور الامساک، الاطلاق کے خلاف ہے (یعنی امساک کا معنی روکنا اور اطلاق کا معنی چھوڑنا ہے۔) اور التسریح کا معنی ہے کسی شے کو چھوڑ دینا اور اسی سے تسریح الشعر (یعنی بالوں کو چھوڑ دینا ہے، تاکہ وہ بعض کو بعض سے علیحدہ

1۔ سنن دار قطنی، جلد 4، صفحہ 35، دار المحاسن قاہرہ

2۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 200، دار الکتب العلمیہ

کر لے اور سَرَّحَ الماشیۃ: اس نے مویشی کو چھوڑ دیا اور تسریح کا لفظ دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے یہاں تک کہ دوسری طلاق کی عدت مکمل ہو جائے اور وہ اپنے نفس کی زیادہ مالک ہو جائے۔ یہ سدی اور ضحاک کا قول ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اسے تیسری طلاق دے اور اسے چھوڑ دے یہ حضرت عطا اور حضرت مجاہد وغیرہما کا قول ہے (1) اور تین وجوہ کی بناء پر یہ زیادہ صحیح ہے۔

(۱) وہ حدیث جسے دار قطنی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ (طلاق دو بار ہے) تو یہ تین کیونکر ہوئیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ۔ ایک روایت میں ہے: یہ تیسری طلاق ہے (2)۔ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔

(۲) تَسْرِيْحٌ الفاظ طلاق میں سے ہے، کیا تو جانتا نہیں کہ ان عزموا السراح بھی پڑھا گیا ہے۔

(۳) بے شک فعل تفعیلا یعنی باب تفعیل اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اس نے دوسری طلاق پر فعل کو مکرر کیا ہے اور ترک میں فعل کو نئے سرے سے کرنا نہیں ہے جسے تفعیل سے تعبیر کیا جاتا ہو۔ (3)

ابو عمر نے کہا ہے: اس پر علماء نے اجماع کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ یہ دو طلاقوں کے بعد تیسری طلاق ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی یہی مراد لی گئی ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (البقرہ: 230) (دو بار طلاق دینے کے بعد) پھر اگر وہ طلاق دے اپنی بیوی کو تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ) اور اس پر بھی علماء کا اجماع ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دیں تو اس کے لئے اس کی طرف رجوع کا حق ہے اور اگر اس نے اسے تیسری طلاق دے دی تو پھر وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی زوج سے شادی کر لے (4)۔ اور یہ قرآن کریم کا وہ محکم حکم ہے جس کی تاویل (اور معنی) میں کوئی اختلاف نہیں، اسی کی مثل عادل راویوں کی احادیث بھی مروی ہیں۔ سعید بن نصر نے بیان کیا کہ ہمیں قاسم بن اصبغ نے بیان کیا کہ ہمیں محمد بن وضاح نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ابوبکر بن ابی شیبۃ نے بیان کیا اور انہوں نے کہا: ہمیں ابو معاویہ نے اسماعیل بن سمیع کے واسطہ سے ابو رزین سے حدیث بیان کی کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے آپ کا کیا خیال ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ تو اس میں تیسری طلاق کہاں ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (وہ ہے) فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اور اسے ثوری وغیرہ نے اسماعیل بن سمیع سے اور انہوں نے ابو رزین سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ (5)

میں (مفسر) کہتا ہوں: الکیا الطبری نے یہ خبر ذکر کی ہے اور کہا ہے: یہ نقل کے اعتبار سے ثابت نہیں ہے اور ضحاک اور سدی کے قول کو ترجیح دی ہے اور بلاشبہ تیسری طلاق ہی اس ارشاد گرامی میں سیاق خطاب میں مذکور ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیۃ　2۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 4، دار المحاسن
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ　4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 307، دار الفکر　5۔ سنن دار قطنی، جلد 4، صفحہ 4، دار المحاسن

لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ پس تیسری طلاق اس خطاب کی صلب میں مذکور ہے اور یہ ایسی بینونت کا فائدہ دیتی ہے جو تحریم کا موجب ہے مگر زوج (ثانی) کے بعد (وہ تحریم ختم ہو جاتی ہے) پس ارشاد باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کو نئے فائدہ پر محمول کرنا واجب ہے اور وہ عدت گزرنے کے ساتھ دو طلاقوں کے ساتھ بینونت کا واقع ہونا ہے اور اس پر (محمول کرنا واجب ہے) کہ آیت سے مقصود ایسی طلاق کے عدد کا بیان ہے جو تحریم کو ثابت کرتی ہے اور اسے منسوخ کرنا ہے جو ان میں بلا عدد محصور طلاق واقع کرنا جائز تھا اور اگر قول باری تعالیٰ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ہی تیسری طلاق ہو تو یہ تین کے ساتھ تحریم واقع کرنے کا مقصد ظاہر نہیں کرتی، کیونکہ اگر اس پر اقتصار کر لیا جائے تو پھر یہ اس کے لئے بینونت محرمہ کے وقوع پر دلیل نہیں مگر زوج کے بعد، بلاشبہ تحریم کا علم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوا: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ تو پھر یہ ضروری ہے کہ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کا معنی تیسری طلاق نہ ہو۔ اور اگر اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ تیسری طلاق کے معنی میں ہو تو پھر اس کے پیچھے ارشاد باری تعالیٰ فَاِنْ طَلَّقَهَا چوتھی طلاق ہو گی، کیونکہ فاء تعقیب کے لئے ہے اور یہ ان کے بعد نئی طلاق کا تقاضا کرتی ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ سو اس سے ثابت ہوا کہ قول باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ سے مراد عورت کو چھوڑ دینا ہے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام بخاری نے اس آیت پر یہ عنوان باندھا ہے: باب من أجاز الطلاق الثلاث بقوله تعالى: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (یعنی یہ باب اس کے بیان میں ہے جس نے مذکورہ ارشاد گرامی کے ساتھ تین طلاقوں کو جائز قرار دیا ہے) اس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ تعداد بلاشبہ ان کے لئے وسعت ہے۔ پس جس نے اپنے اوپر تنگی اور شدت کی تو یہ اس پر لازم ہو جائے گی۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: ائمہ فتویٰ کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں واقع کرنے سے لازم ہو جاتی ہے اور یہی جمہور اسلاف کا قول ہے۔

اور طاؤس اور بعض اہل ظاہر نے یہ کہا ہے کہ ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں واقع کرنے سے ایک طلاق واقع ہوتی ہے اور یہ محمد بن اسحاق اور حجاج بن ارطاۃ سے روایت کیا جاتا ہے اور ان دونوں سے یہ بھی منقول ہے کہ اس سے کوئی شے لازم نہیں ہوتی اور یہ مقاتل کا قول ہے اور داؤد سے بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا (کوئی شے) واقع نہ ہو گی۔ اور حجاج بن ارطاۃ اور جمہور سلف اور ائمہ سے مشہور قول یہ ہے کہ وہ تینوں لازم اور واقع ہو جاتی ہیں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ تین طلاقیں اکٹھی ایک کلمہ کے ساتھ واقع کرے یا تین متفرق کلمات کے ساتھ۔

اور رہے وہ جنہوں نے یہ کہا کہ اس سے کوئی شے لازم نہ ہو گی انہوں نے قول باری تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ کی دلیل سے استدلال کیا ہے۔ یہ ہر مطلقہ کو شامل ہے سوائے اس کے جسے اس سے خاص کر دیا جائے اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور کہا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ طلاق دو بار ہے اور تیسری فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ہے اور جس نے ایک کلمہ میں تین طلاقیں دیں پس وہ لازم نہ ہو گی، کیونکہ وہ قرآن کریم میں مذکور نہیں اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ایک

واقع ہوئی ہے تو انہوں نے تین احادیث سے استدلال کیا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت طاؤس، ابو صہباء اور عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اور دوسری حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اس کی روایت کے مطابق جس نے یہ بیان کیا کہ آپ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں رجوع کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور وہ آپ کے لئے ایک طلاق شمار ہوئی (1) اور تیسری حدیث یہ ہے کہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں رجعت کا حکم فرمایا (2) اور رجعت ایک طلاق واقع ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔

ان احادیث کا جواب وہ ہے جو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد، حضرت عطا، حضرت عمرو بن دینار، حضرت مالک بن حویرث، حضرت محمد بن ایاس بن بکیر اور حضرت نعمان ابن ابی عیاش رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے بارے میں یہ روایت بیان کی ہے (کہ) جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کی بیوی اس سے جدا ہوگئی اور اب وہ اس سے نکاح نہیں کر سکتا مگر دوسرے زوج کے بعد (3) اور اس بارے میں ان ائمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایت کی ہے وہ جماعت (جمہور کی رائے) سے موافقت رکھتی ہے اور طاؤس وغیرہ کی روایت وہن (کمزوری) پر دلالت کرتی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ایسے نہیں ہیں کہ وہ اپنی رائے کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخالفت کریں۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ طاؤس کی روایت وہم اور غلط ہے۔ حجاز، شام، عراق، مشرق اور مغرب کے شہروں کے فقہاء میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے موالی میں سے ابو صہباء معروف نہیں ہیں۔

قاضی ابو الولید الباجی نے کہا ہے: میرے نزدیک ابن طاؤس سے اس بارے میں روایت صحیح ہے اور ان سے ائمہ نے روایت کی ہے: (یعنی) معمر اور ابن جریج وغیرہ اور ابن طاؤس امام ہیں اور وہ حدیث جس کی طرف وہ اشارہ کر رہے ہیں وہ ہے جسے ابن طاؤس نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق کے عہد اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے زمانہ خلافت کے پہلے دو سال تک تین طلاقیں ایک طلاق تھی۔ پھر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک لوگ اس امر میں جلدی کرنے لگے ہیں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی۔ پس اگر ہم اسے ان پر نافذ کر دیں! پھر آپ نے اسے ان پر نافذ کر دیا۔ (4)

اور حدیث کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ ایک طلاق واقع کرتے تھے اس کے بدلے جہاں اب لوگ تین طلاقیں واقع کرتے ہیں اور اس تاویل کے صحیح ہونے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول دلالت کرتا ہے کہ بے شک لوگ اس معاملے میں جلدی کرنے لگے

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 7، دار المحاسن

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1877، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ شرح معانی الآثار، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 34، مکتبہ امدادیہ ملتان　4۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 477-478، وزارت تعلیم

ہیں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی تو آپ نے انہیں ناپسند کیا کہ وہ طلاق دینے کے معاملہ میں جلدی کریں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی پس اگر ابتدائے اسلام میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ان کا یہی حال ہوتا جو آپ نے کہا ہے تو ان پر یہ عیب نہ ہوتا کہ انہوں نے اس معاملہ میں جلدی کی ہے جس میں ان کے لئے تاخیر تھی۔

اور اس تاویل کے صحیح ہونے پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کئی سندوں سے مروی ہے کہ آپ نے اس کے لئے تین طلاقوں کے لازم ہونے کا فتویٰ دیا جس نے اکٹھی تین واقع کیں۔ پس اگر ابن طاؤس کی حدیث کے یہ معنی ہیں تو یہ تو ہم نے بیان کر دیے ہیں اور اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو اس معنی پر محمول کیا جائے جس میں وہ تاویل کرتے ہیں جن کے قول کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی، تو بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جماعت کے قول کی طرف رجوع کر لیا ہے اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور قیاس کے اعتبار سے ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ طلاق ہے اور اسے وہ واقع کرتا ہے جو اس کا مالک ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اسے لازم قرار دیا جائے اور اس کی اصل یہ ہے کہ جب کوئی مفرد طلاق واقع کرے (تو وہ واقع ہو جاتی ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو تاویل الباجی نے بیان کی ہے وہ وہی ہے جس کا معنی الکیا الطبری نے علمائے حدیث سے ذکر کیا ہے؟ یعنی وہ ایک طلاق دیتے تھے۔ وہی اب تین طلاقیں دیتے ہیں، یعنی وہ ہر طہر میں ایک طلاق نہیں دیتے تھے بلکہ وہ پوری عدت میں ایک طلاق دیتے تھے یہاں تک کہ وہ جدا ہو جاتی اور عدت گزر جاتی۔

قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے بیان کیا ہے: اس کا معنی ہے کہ لوگ ایک طلاق پر اقتصار کرتے تھے، پھر وہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کثرت سے تین طلاقیں دینے لگے۔ قاضی نے کہا: یہی معنی راوی کے اس قول کے زیادہ مشابہ ہے کہ لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تین طلاقوں میں جلدی کی تو آپ نے ان پر جلدی نافذ کر دی۔ اس کا معنی ہے کہ آپ نے ان کا حکم ان پر لازم کر دیا۔

اور رہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث تو دار قطنی نے احمد بن صبیح عن طریف بن ناصح عن معاویہ بن عمار الدھنی عن ابی الزبیر کی سند سے روایت کیا ہے کہ ابو الزبیر نے کہا: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس آدمی کے بارے پوچھا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں درآنحالیکہ وہ حائضہ ہو۔ تو انہوں نے مجھے فرمایا: کیا تو ابن عمر رضی اللہ عنہما کو پہچانتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں (اور وہ حائضہ تھی) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سنت کی طرف لوٹا دیا۔ اور دار قطنی نے کہا: تمام کے تمام (راوی) شیعہ ہیں۔ اور محفوظ روایت یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں ایک طلاق دی۔ (1)

عبید اللہ نے کہا ہے کہ انہوں نے اسے حالت حیض میں ایک طلاق دی تھی مگر انہوں نے سنت کے خلاف عمل کیا تھا۔

اسی طرح صالح بن کیسان، موسیٰ بن عقبہ، اسماعیل بن امیہ، لیث بن سعد، ابن ابی ذئب، ابن جریج، جابر، اسماعیل بن

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 7، دار المحاسن

ابراہیم بن عقبہ نے حضرت نافع سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک طلاق دی تھی (1) اور اسی طرح زہری نے سالم عن ابیہ اور یونس ابن جبیر اور شعبی وحسن سے بیان کیا ہے۔

اور رہی حدیث رکانہ تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ حدیث مضطرب، منقطع ہے، کسی ایسی سند سے یہ بیان نہیں کی جاسکتی جس سے استدلال ہوسکتا ہو۔ اسے ابوداؤد نے ابن جریج کی حدیث سے بیان کیا جوانہوں نے بنی رافع کے بعض افراد سے نقل کی ہے اور ان میں کوئی بھی قابل حجت نہیں ہے۔ (یعنی) عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما مروی ہے۔ اور اس میں ہے کہ رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''تو اسے واپس لوٹا لے۔'' (2)

تحقیق اسے کئی طرق سے عن نافع بن عجیر بھی روایت کیا ہے کہ رکانۃ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو طلاق البتۃ دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قسم دی کہ اس نے اس سے کیا ارادہ کیا ہے؟ تو انہوں نے قسم کھائی کہ انہوں نے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ان کی طرف واپس لوٹا دیا (3)۔ پس یہ اسم اور فعل دونوں میں اضطراب ہے اور اس طرح کی شے سے کسی قسم کا استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو کئی طرق سے دارقطنی نے اپنی سنن میں بیان کیا ہے، بعض میں کہا ہے: حدثنا محمد بن یحییٰ بن مرداس حدثنا ابو داؤد السجستانی حدثنا احمد بن عمرو بن السرح و ابو ثور ابراهیم بن خالد الکلبی اور دوسروں نے کہا: حدثنا محمد بن ادریس الشافعی حدثنی عمی محمد ابن علی بن شافع عن عبد الله بن علی بن السائب عن نافع بن عجیر بن عبد یزید کہ رکانہ ابن عبد یزید نے اپنی بیوی سہیمہ المزنیہ کو بتہ طلاق دی اور اس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہ کیا اور کہا: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قسم بخدا! تو نے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے؟ تو رکانہ نے عرض کی: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے (بیوی کو) اس کی طرف واپس لوٹا دیا اور انہوں نے دوسری طلاق حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں دی اور تیسری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں (4)۔ ابوداؤد نے کہا ہے: ''یہ حدیث صحیح ہے''۔ پس حدیث رکانہ میں سے جو صحیح ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق البتۃ دی نہ کہ تین طلاقیں دیں۔ اور طلاق البتۃ کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ پس اس سے استدلال ساقط ہوگیا۔ والحمد للہ، واللہ اعلم۔

اور ابو عمر نے کہا کہ حدیث رکانہ کے بارے میں امام شافعی کی روایت اپنے چچا سے زیادہ واضح اور ظاہر ہے اور انہوں نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 476، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1886۔ 1887، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی البتۃ، جلد 1، صفحہ 300، و ت۔ ترمذی حدیث، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی البتۃ، جلد 1، صفحہ 300، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 1886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایسی زیادتی بیان کی ہے جسے اصول رد نہیں کرتے۔ پس اس کے ناقل کے ثقہ ہونے کی وجہ سے اسے قبول کرنا واجب ہے۔
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، ان کے چچا اور ان کے دادا رکانہ کے اہل بیت ہیں اور تمام کے تمام بنی عبدالمطلب بن عبد مناف میں سے ہیں اور وہ اس قصہ کو زیادہ بہتر جانتے ہیں جو انہیں پیش آیا۔

فصل: احمد بن محمد بن مغیث الطلیطلی نے اپنی وثائق میں یہ مسئلہ ذکر کیا ہے اور کہا ہے: طلاق دو قسموں پر منقسم ہے: طلاق سنت، طلاق بدعت، پس طلاق سنت وہ ہے جو اس طریقہ پر واقع ہو جو شریعت نے مباح قرار دیا ہے اور طلاق بدعت وہ ہے جو اس کی نقیض اور ضد ہو اور وہ یہ ہے کہ آدمی عورت کو طلاق دے حالت حیض میں یا حالت نفاس میں یا ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں دے، پس اگر اس نے ایسا کیا تو طلاق اسے لازم ہو جائے گی۔

اہل علم کے اس پر اجماع کر لینے کے بعد کہ وہ طلاق دینے والا ہے، ان کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ کتنی طلاقیں اسے لازم ہوں گی، تو حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اسے ایک طلاق لازم ہو گی، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے اور فرمایا: اس کا قول ثلاثا اس کا کوئی معنی نہیں ہے کیونکہ اس نے تین بار طلاق نہیں دی۔ البتہ اس کا قول فی ثلاث جائز ہو گا جبکہ وہ اس سے اس کے بارے خبر دے رہا ہو جو گزر چکا ہے۔ پس وہ کہتا ہے: میں نے تین طلاقیں دیں تو یہ ان تین افعال کی خبر دینے والا ہو جائے گا جو اس سے تین اوقات میں صادر ہوئے۔ جیسا کہ کوئی آدمی کہے: ''میں نے کل فلاں سورۃ تین بار پڑھی'' تو وہ صحیح ہو گا اور اگر اس نے ایک بار سورۃ پڑھی اور کہا: میں نے اسے تین بار پڑھا'' تو وہ جھوٹا ہو گا۔ اسی طرح اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ تین بار قسم کھائے کہ وہ قسم کو بار بار لوٹا تا رہے تو یہ تین قسمیں ہوں گی اور اگر اس نے ایک بار قسم کھائی اور کہا: أحلف باللہ ثلاثاً میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ تین قسمیں کھاتا ہوں تو یہ صرف ایک قسم ہو گی اور طلاق بھی اسی کی مثل ہے۔

حضرت زبیر بن عوام اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما نے بھی یہی کہا ہے اور ہم نے یہ سب ابن وضاح سے روایت کیا ہے اور شیوخ قرطبہ میں سے ابن زنباع شیخ ہدی، محمد بن تقی بن مخلد، محمد بن عبد السلام الحسنی جو اپنے وقت میں منفرد عالم دین اور فقیہ عصر تھے، اصبغ بن الحباب اور ان کے سوا ایک پوری جماعت نے اسی طرح کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حجت میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں لفظ طلاق تفریق کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ اس سے مراد وہ اکثر طلاقیں ہیں (یعنی دو بار طلاق) جن کے بعد امساک بالمعروف ہو سکتا ہے اور اس سے مراد عدت میں رجوع کرنا ہے اور قول باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کا معنی ہے کہ وہ اسے بغیر رجوع کیے اسی حالت پر چھوڑے رکھے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے (1) اور اس میں اس پر احسان ہے اگر ان دونوں کے درمیان ندامت واقع ہو، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝ (الطلاق) (تجھے کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے۔) اس سے مراد فرقت پر ندامت اور رجعت میں

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 307، دار الفکر

رغبت رکھنا ہے اور تین کو واقع کرنا اچھا نہیں ہے کیونکہ اس میں اس وسعت کو ترک کرنا ہے جو ان کے بارے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی اور اس پر متنبہ کیا۔ پس اللہ تعالیٰ کا طلاق کو متفرقاً ذکر کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جب انہیں جمع کیا جائے تو وہ لفظ واحد ہے (لہٰذا ایک واقع ہوگی) اور المدونہ میں موجود دیگر مسائل جو اس پر دلالت کرتے ہیں ان پر قیاس کے ذریعے اسے بیان کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے انسان کا یہ قول ہے: مالی صدقة فی المساکین کہ میرا مال مساکین کے لئے صدقہ ہے تو ثلث مال اس کی طرف سے جائز ہوتا ہے۔ اور ابن منذر کی الاشراف میں ہے کہ حضرت سعید بن جبیر، طاؤس، ابوالشعثاء، عطا اور عمرو بن دینار رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں: جس نے باکرہ عورت کو تین طلاقیں دیں تو وہ ایک واقع ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ بسا اوقات انہوں نے ہمت کی اور کہا: غیر المدخول بھا لاعدة علیھا، کیونکہ جب اس نے غیر مدخول بہا عورت کو کہا انت طالق ثلاثا تو وہ انت طالق سے اس کے فارغ ہونے کے ساتھ ہی بائنہ ہوگئی، تو ثلاثاً کا لفظ اس پر اس حال میں پڑ رہا ہے کہ وہ بائن ہو چکی ہے۔ لہٰذا یہ لفظ اس پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوگا، کیونکہ اس کا قول: انت طالق (معنی طلاق کو ادا کرنے میں) بنفسہ مستقل ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ غیر مدخول بہا عورت میں بینونت (جدائی) اس پر موقوف نہ ہو جو اس کے بعد وارد ہو رہا ہے جبکہ اس میں اصل ''انت طالق'' ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام شافعی نے قول باری تعالیٰ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اور سَرِّحُوْهُنَّ سے اس پر استدلال کیا ہے کہ یہ لفظ طلاق کے لئے صریح ہے۔(1) حالانکہ علماء نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے۔ قاضی ابو محمد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ صریح وہ ہوتا ہے جو کسی بھی طریقہ پر لفظ طلاق کو متضمن ہو، مثلاً وہ کہے: أنت طالق، انت مطلقة، قد طلقتك، یا الطلاق له لازم۔ اور اس کے سوا الفاظ طلاق میں سے جو بھی اس معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ الفاظ کنایہ ہیں اور اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

اور قاضی ابو الحسن نے کہا ہے: طلاق کے لئے الفاظ صریح کثیر ہیں اور ان میں سے بعض بعض کی نسبت زیادہ بین اور واضح ہیں: (مثلاً) لفظ طلاق، سراح، فراق، حرام، خلیة اور بریة وغیرھا۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: صریح تین الفاظ ہیں اور وہ وہ ہیں جن کے بارے قرآن وارد ہو چکا ہے اور وہ ہیں لفظ طلاق، السراح اور الفراق۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (الطلاق: 2) (یا جدا کر دو انہیں بھلائی کے ساتھ) اور فرمایا: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اور مزید فرمایا: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (الطلاق: 1) (تو انہیں طلاق دو ان کی عدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب یہ بات پختہ اور ثابت ہوگئی تو پھر طلاق کی دو قسمیں ہیں: صریح اور کنایہ۔

پس صریح تو وہ ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے اور کنایہ وہ ہے جو اس کے سوا ہے اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ صریح میں آدمی نیت کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ صرف لفظ کے ساتھ ہی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور کنایہ نیت کی محتاج ہوتی ہے اور ان کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیة

دلیل جنہوں نے کہا: بے شک (الفاظ) الحرام، الخلیة اور البریة، صریح الطلاق ہیں، طلاق کے معنی میں کثیر الاستعمال ہیں یہاں تک کہ وہ اس معنی میں معروف ہیں اور یہ ایقاع طلاق میں بین اور واضح ہو گئے، جیسا کہ جس طرح غائط کا لفظ پست زمین کے لیے وضع کیا گیا، پھر اسے بطریق مجاز قضائے حاجت کے لئے استعمال کیا جائے۔ اور وہ اس معنی میں زیادہ بین، ظاہر اور مشہور ہو جائے اس کی نسبت جس کے لئے اسے وضع کیا گیا اور ہمارے مسئلہ میں اسی طرح کی مثال ہے۔

پھر عمر بن عبدالعزیز نے کہا ہے: ''اگر طلاقیں ہزار ہوں تو (طلاق) البتۃ ان میں سے کوئی شے باقی نہیں چھوڑتی۔ پس جس نے کہا ہے: البتۃ، تو اس نے انتہائے اخیر کو چھو لیا (1)۔ اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

دار قطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: الخلیة والبریة والبتة والبائن اور الحرام تین طلاقیں ہیں، اور عورت آدمی کے لئے حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ اس کے سوا دوسرے خاوند سے شادی کر لے۔ (2) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی روایت ہے کہ البتہ تین طلاقیں ہیں۔ انّ البتۃ ثلاث سند کے اعتبار سے اس میں ضعف ہے، اسے دار قطنی نے بیان کیا ہے اور عنقریب ارشاد خداوندی: وَ لَا تَتَّخِذُوْا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا کے تحت اس کا ذکر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ علماء نے اس کے بارے کوئی اختلاف نہیں کیا جس نے اپنی بیوی کو کہا: قد طلقتُكِ میں نے تجھے طلاق دی، کہ یہ مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں کے حق میں صریح طلاق ہے اور جس نے اپنی عورت کو کہا: انت طالق تو طلاق والی ہے تو یہ ایک طلاق ہے مگر یہ کہ وہ اس سے زیادہ کی نیت کرے۔ اور اگر اس نے دو یا تین کی نیت کر لی تو اتنی ہی لازم ہو جائیں گی جن کی اس نے نیت کی اور اگر اس نے کسی شے کی نیت نہ کی تو پھر ایک طلاق ہو گی اور آدمی رجعت کا مالک ہو گا (یعنی ایک طلاق رجعیہ ہو گی) اور اگر اس نے کہا: انت طالق اور کہا: میں نے قید (بیڑیوں) سے آزاد ہونے کا ارادہ کیا ہے تو اس کا قول قبول نہ کیا جائے گا اور طلاق اس پر لازم ہو جائے گی، مگر یہ کہ وہاں کوئی ایسا قرینہ ہو جو اس کے صدق پر دلالت کرتا ہو۔ اور جس نے کہا: انت طالق واحدة، لا رجعة لی علیك تو اس کا قول: لا رجعة لی علیك (مجھے تجھ پر رجوع کا حق نہیں) باطل ہو گا اور اس کے قول واحدۃ کی وجہ سے اس کے لئے رجعت ثابت ہو گی، کیونکہ واحدۃ سے مراد تین نہیں ہو سکتیں اور اگر اس نے اپنے قول: لا رجعة لی علیك سے تین کی نیت کی، تو امام مالک کے نزدیک یہ تین ہی ہوں گی۔

اور اس کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے جس نے اپنی بیوی کو کہا: قد فارقتك (میں نے تجھے جدا کر دیا)، سرحتكِ (میں نے تجھے چھوڑ دیا)، انت خلیةٌ (تو فارغ ہے)، انت بریّة (تو بری ہے) انت بائن (تو جدا ہے)، حبلك علی غاربك (تیری رسی تیرے کندھے پر)، انت علیّ حرام (تو مجھ پر حرام ہے)، الحقی باھلك (تو اپنے اہل سے جا مل)، قد وھبتك لأھلك (میں نے تجھے تیرے اہل کے حوالے کر دیا)، قد خلیت سبیلك (میں نے تیرا راستہ چھوڑ دیا)، لا سبیل لی علیك (مجھے تجھ پر کوئی اختیار نہیں) تو امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ نے کہا ہے: اس سے طلاق

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، باب ما جاء فی البتۃ، جلد 1، صفحہ 511، وزارت تعلیم

2۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 2، جز رابع، صفحہ 32، دار المحاسن

بائن واقع ہوگی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب آدمی نے اپنی بیوی کو کہا استقلی بأمرك (تو اپنے معاملے میں مستقل ہے) یا اَمْرُكِ لك (تیرا معاملہ تیرے سپرد ہے) یا الحقی باھلك۔ (تو اپنے گھر والوں سے جا مل) اور انہوں نے اسے قبول کرلیا تو اس سے ایک طلاق بائن ہوگی۔

اور امام مالک سے اس کے بارے میں یہ مروی ہے جس نے اپنی عورت کو کہا: قد فارقتك یا سرحتك کہ یہ صریح طلاق میں سے ہے۔ جیسا کہ اس کا قول: انت طالق صریح ہے اور آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ طلاق کنایہ ہے، لہٰذا اس میں کہنے والے کی نیت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا جتنے عدد کا اس نے ارادہ کیا ہے مدخول بہا ہو یا غیر مدخول بہا۔

ابن المواز نے کہا ہے: وہ عورت جس کے ساتھ دخول نہیں کیا گیا اس کے بارے میں دو میں سے اصح قول یہ ہے کہ ایک طلاق ہوگی، مگر یہ کہ وہ اکثر کی نیت کرے۔ ابن القاسم اور ابن عبدالحکم نے یہی کہا ہے۔

اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ تین طلاقیں ہیں اور اس کی مثل یہ الفاظ بھی ہیں: خلعتك (میں نے تجھے چھوڑ دیا) یا لا ملك لی علیك (میری تجھ پر کوئی ملکیت نہیں)

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تمام الفاظ کنایات سے مدخول بہا عورت کے حق میں تین طلاقیں ہوتی ہیں جن میں کہنے والا کوئی نیت نہ کرے اور غیر مدخول بہا کے بارے میں وہ نیت کرے اور اگر وہ حلف اٹھا دے اور کہے: میں نے ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے تو وہ خطاب میں سے ایک خاطب ہے کیونکہ مدخول بہا عورت کو اس کا خاوند نہ چھوڑ سکتا ہے نہ جدا کر سکتا ہے اور نہ ہی بری قرار دے سکتا ہے مگر تین طلاقوں کے ساتھ اور جس سے دخول نہ کیا گیا ہو اسے وہ ایک طلاق کے ساتھ چھوڑ سکتا ہے، بری کر سکتا ہے اور جدا کر سکتا ہے۔

امام مالک اور آپ کے اصحاب کے ایک طائفہ سے مروی ہے اور یہی اہل مدینہ کی ایک جماعت کا قول ہے کہ وہ ان تمام الفاظ میں نیت کرے گا اور طلاق میں سے جس کی اس نے نیت کی وہ اسے لازم ہو جائے گی۔

اور آپ سے تمام کنایات میں سے بالخصوص البتۃ کے بارے یہ مروی ہے کہ وہ اس سے نیت نہ کرے نہ مدخول بہا کے بارے میں اور نہ غیر مدخول بہا کے بارے میں۔

اور امام ثوری، ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: ان تمام میں اس کی نیت کا اعتبار ہے، پس اگر اس نے تین کی نیت کی تو یہ تین ہوں گی اور اگر ایک کی نیت کی تو وہ ایک بائنہ ہوگی اور وہ اپنے نفس کے بارے زیادہ حقدار ہو جائے گی اور اگر اس نے دو کی نیت کی تو یہ ایک ہوگی۔ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اگر اس نے دو کی نیت کی تو یہ دو ہوں گی۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: ان تمام الفاظ میں وہ طلاق دینے والا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ یہ کہے: میں نے اپنے کلام سے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو پھر اتنی ہوں گی جتنی کی اس نے نیت کی۔ پس اگر اس نے تین سے کم کی نیت کی تو وہ رجعی ہوگی۔ اور اگر اس نے اسے ایک بائن طلاق دی تو وہ ایک طلاق رجعی ہوگی۔

اور اسحاق نے کہا ہے: ہر وہ کلام جو طلاق سے مشابہت رکھتا ہو تو اس سے وہ طلاق واقع ہو جائے گی جس کی اس نے نیت کی اور ابوثور نے کہا: یہ طلاق رجعیہ ہوگی اور اس کی نیت کے بارے نہیں پوچھا جائے گا۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ طلاق بائن کا تصور نہیں کرتے مگر خلع یا ایلاء میں اور ان میں یہی روایت محفوظ ہے۔ ابوعبید نے بھی یہی کہا ہے۔

اور امام بخاری نے یہ عنوان باندھا ہے باب اذا قال فارقتك او سرحتك او البرية او الخلية او ما عنى به الطلاق فهو على نيته (1) (یعنی ان الفاظ سے طلاق کا انحصار اس کی نیت پر ہے۔) اور آپ نے اس سے علمائے کوفہ اور امام شافعی کے قول کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے قول ما عنى به من الطلاق سے اسحاق کے قول کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس میں یہ دلیل ہے کہ ہر وہ کلمہ جو طلاق یا غیر طلاق ہونے کا احتمال رکھتا ہو تو یہ جائز نہیں کہ اس سے طلاق لازمی ہو مگر تب جبکہ متکلم یہ کہے: بلاشبہ اس نے اس سے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو اس کے اقرار کے ساتھ اسے طلاق لازم ہو جائے گی اور نکاح کو باطل کرنا جائز نہیں ہوتا کیونکہ یقین کے ساتھ اس کے صحیح ہونے پر انہوں نے اجماع کیا ہوا ہے۔

ابوعمر نے کہا ہے: امام مالک کا قول ایسے آدمی کے قول کے بارے میں مختلف ہے جس نے اپنی بیوی کو کہا: اعتدی (تو عدت کے دن شمار کر)، قد خليتك، يا حبلك على غاربك۔

آپ نے ایک بار کہا: وہ ان میں نیت نہیں کرے گا اور یہ تین طلاقیں ہیں۔ اور ایک بار کہا: وہ ان تمام میں نیت کرے گا۔ مدخول بہا کے بارے میں بھی اور غیر مدخول بہا کے بارے میں بھی اور اسی طرح میں بھی کہتا ہوں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف جمہور نے اختیار کیا ہے اور جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ ان الفاظ میں نیت کرے گا اور اسی کے مطابق اس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ صحیح ہے، ہم نے اسے دلیل سے بیان کر دیا ہے اور اس صحیح حدیث سے جسے ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارقطنی وغیرہم نے یزید بن رکانہ سے بیان کیا ہے کہ رکانہ بن عبد یزید رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سہیمہ کو طلاق البتۃ دی اور اس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قسم بخدا! تو نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے؟ تو رکانہ نے عرض کی: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ عورت ان کی طرف لوٹا دی۔ ابن ماجہ نے کہا ہے: میں نے ابوالحسن الطنافسی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: یہ حدیث کتنی اشرف واعلیٰ ہے۔ (2)

اور امام مالک نے اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جو اپنی بیوی کو کہتا ہے: انت على كالميتة والدم ولحم الخنزير کہ تو

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 792، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب طلاق البتۃ، جلد 1، صفحہ 149، وزارت تعلیم

ایضاً۔ ابوداؤد، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2040، ضیاء القرآن پبلی کیشنز ترمذی، کتاب الطلاق اللعان، حدیث نمبر 1097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مجھ پر مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کی طرح ہے کہ میں اسے البتہ (بالکل جدا) دیکھتا ہوں اگرچہ آدمی کی نیت نہ بھی ہو اور وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی مگر دوسرے زوج کے بعد۔

اور امام شافعی کے قول میں ہے کہ اگر اس نے طلاق کا ارادہ کیا تو وہ طلاق ہوگی جتنی بھی طلاقوں کا اس نے ارادہ کرلیا اور اگر اس نے طلاق کا ارادہ نہ کیا تو پھر اس کے حلف دینے کے بعد کوئی شے واقع نہ ہوگی۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: ہر وہ لفظ جو کنایہ عن الطلاق ہے کے بارے میں اس باب کی اصل وہ روایت ہے جو حضور نبی مکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اس عورت کے لئے جس سے کسی نے شادی کی تو اس وقت اس عورت نے کہا: اعوذ باللہ منك۔ میں تجھ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتی ہوں۔ تو اس نے کہا قد عذت بمعاذ الحقی باھلك (1) (تجھے پناہ حاصل ہے تو اپنے گھر والوں کے ساتھ جامل) پس وہ طلاق ہوگئی۔ اور حضرت کعب ابن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو کہا جبکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس سے علیحدہ رہنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا الحقی باھلك اور وہ طلاق نہ ہوئی تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ لفظ نیت کا محتاج ہے اور اس میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا مگر وہی جس کی بولنے والا نیت کرے گا۔ اور اسی طرح تمام الفاظ کنایات کا حکم ہے جو فراق اور غیر فراق کے معنی کا احتمال رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم

اور رہے وہ الفاظ جو الفاظ طلاق میں سے نہیں ہیں اور نہ انہیں فراق (جدائی) سے کنایہ قرار دیا جاسکتا ہے تو اکثر علماء ان میں سے کسی سے طلاق واقع نہیں کرتے اگرچہ کہنے والا اس کا ارادہ بھی کرے۔ اور امام مالک نے کہا ہے: ہر وہ آدمی جس نے کسی بھی لفظ سے طلاق کا ارادہ کیا تو طلاق اسے لازم ہو جائے گی، حتیٰ کہ اس قول کے ساتھ بھی کلی و اشربی و قومی و اقعدی۔ (تو کھا، تو پی، تو کھڑی ہو، تو بیٹھ جا) اس میں امام مالک کے اپنے اصحاب کے سوا کسی نے ان کی اتباع نہیں کی۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۲۹﴾

اس میں پندرہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا اس میں ''اَنْ'' يَحِلُّ کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور آیت میں خطاب ازواج کو ہے، انہیں منع کیا گیا ہے کہ وہ اپنی ازواج سے کوئی شے ضرر اور اذیت پہنچانے کی غرض سے لیں اور یہ وہ خلع ہے جو صحیح نہیں ہوتا مگر اس طرح کہ آدمی ضرر اور اذیت دینے میں متفرد نہ ہو۔ اور ذکر خاص کر انہی چیزوں کا کیا گیا ہے جو خاوندوں نے اپنی عورتوں کو دے رکھی ہوں، کیونکہ لوگوں میں عرف اور رواج یہی ہے کہ فساد اور نا چاکی کے وقت آدمی اس شے کا مطالبہ کرتا ہے جو مرد کے ہاتھ سے عورت کے لئے مہر اور اس کی دیگر حاجات کو پورا کرنے کے لئے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب ما یقع بہ الطلاق، جلد 1، صفحہ 149۔

بخاری شریف، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4852-4853، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، کتاب حدیث کعب بن مالک، حدیث نمبر 4066

سامان نکلا ہو۔ اسی وجہ سے اسے ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَ لَا يَحِلُّ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ اور فَاِنْ طَلَّقَهَا کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے فصل ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ طلاق پر فدیہ لینا جائز ہے اور عورت کا مال نہ لینے کی تشدید پر اجماع ہے مگر یہ کہ نافرمانی اور معاملات میں فساد عورت کی جانب سے ہو۔

ابن منذر نے حضرت عثمان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ جب ظلم اور خصومت مرد کی جانب سے ہو اور عورت اس سے خلع لے تو اس کا مال لینا جائز ہے اور وہ گنہگار ہوگا اور جو کچھ اس نے کہا ہے وہ حلال نہ ہوگا اور جو مال اس نے لیا ہے وہ واپس لوٹانے پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ابن منذر نے کہا ہے: ان کے قول میں سے یہ ظاہر کتاب اللہ، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت (1) ہونے والی خبر اور اس نظریہ کے خلاف ہے جس پر عام اہل علم کا اجماع ہے اور میں گمان نہیں کرتا کہ اگر کسی کو کہا جائے کہ تو خطا کی تلاش میں خوب محنت اور کوشش کر، تو وہ اس سے بڑھ کر کوئی امر نہیں پائے گا کہ کتاب اللہ کسی شے کی تحریم کے بارے حکم لگائے پھر کوئی مقابلہ کرنے والا اس کے مقابل ایسی شے لائے جو نص کے خلاف ہو اور وہ کہنے لگے: بلکہ وہ جائز ہے اور جو کچھ اس نے لیا ہے وہ واپس لوٹانے پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ابوالحسن بن بطال نے کہا ہے اور ابن قاسم نے امام مالک سے اسی کی مثل روایت کیا ہے اور یہ قول ظاہر کتاب اللہ کے خلاف ہے اور حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی والی حدیث کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے کہ وہ (کوئی شے) لے مگر اس اندیشہ اور خوف کے بعد کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے اور تحریم کو اس کے لئے وعید کے ساتھ مؤکد کیا جس نے حد سے تجاوز کیا۔

اور معنی یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو اپنے بارے میں یہ گمان ہو کہ وہ اپنے ساتھی کے نکاح سے متعلقہ حقوق اس طرح پورے نہ کر سکے گا جس طرح اس پر واجب ہیں۔ اس میں وہ کراہت اور ناپسندیدگی بھی ہے جس کا وہ اعتقاد رکھتا ہے تو پھر عورت پر فدیہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور نہ ہی خاوند پر کچھ لینے میں حرج ہے اور خطاب زوجین (میاں بیوی دونوں) کو ہے اور اَنْ يَّخَافَاۤ میں ضمیر دونوں کے لئے ہے اور اَلَّا يُقِيْمَا مفعول بہ ہے اور خفت ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ یہ خوف بمعنی علم ہے یعنی وہ دونوں جان لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود قائم نہیں کر سکیں گے اور یہی خوف حقیقی ہے اور یہ مکروہ عمل کے واقع ہونے کا ڈر اور خوف ہے اور یہ ظن کے معنی کے قریب ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ یہ استثناء منقطع ہے۔ (یعنی) لیکن اگر نافرمانی عورتوں کی جانب سے ہو تو پھر تم پر فدیہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ

حمزہ نے اسے الا ان یُخافا یاء کے ضمہ کے ساتھ (1) صیغہ مجہول میں پڑھا ہے اور فاعل محذوف ہوگا اور وہ والی اور حکام ہیں۔ ابوعبید نے اسے پسند کیا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے فَاِنْ خِفْتُمْ فرمایا: خوف زوجین کے علاوہ کسی اور کے لئے ذکر کیا ہے (یعنی والی یا حاکم کو خوف ہو) اگر زوجین کا ارادہ کرتا تو کہتا: فَاِنْ خَافَا اس میں ان کے لئے حجت اور دلیل ہے جنہوں نے خلع سلطان کے حوالے کیا ہے (یعنی حاکم وقت کے فیصلے کے بغیر خلع نہیں ہو سکتا۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حضرت سعید بن جبیر، حسن اور ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے اور شعبہ نے کہا ہے، میں نے حضرت قتادہ کو کہا: کس سے حسن نے یہ اخذ کیا ہے کہ خلع سلطان کے سپرد ہے؟ تو انہوں نے کہا: زیاد سے اور یہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی جانب سے والی تھے۔

نحاس نے کہا ہے: یہ قول زیاد سے معروف ہے اور اس قول کا کوئی معنی اور حقیقت نہیں ہے کیونکہ آدمی جب اپنی بیوی سے خلع کرتا ہے تو بلاشبہ وہ ایسی شے پر ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ دونوں راضی ہوتے ہیں اور سلطان اس پر اسے مجبور نہیں کر سکتا اور اس کے قول کی کوئی اصل نہیں ہے جس نے کہا ہے: یہ سلطان کے سپرد ہے اور انہوں نے ابوعبید کے اختیار کا انکار کیا ہے اور اسے رد کیا ہے اور میں ان کے اختیار اور پسند میں اس حرف سے زیادہ بعید اور کوئی شے نہیں جانتا، کیونکہ اعراب، لفظ اور معنی میں سے کوئی بھی اسے ثابت نہیں کرتا۔ جہاں تک اعراب کا تعلق ہے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے الا ان یخافا کو پڑھا ہے تخافوا اور یہ عربی ہے۔ جب اسے مالم یسم فاعله کی طرف لوٹایا گیا تو کہا گیا الا ان یخاف، اور رہا لفظ تو اگر اس کا انحصار لفظ یخافا پر ہو تو پھر ضروری ہے کہ کہا جائے: فان خیف۔ اور اگر لفظ فان خفتم پر ہو تو پھر واجب ہے کہ یہ کہا جائے: الا ان تخافوا۔

اور رہا معنی تو یہ بعید ہے کہ کہا جائے کہ تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم اس میں سے کوئی شے لو جو تم نے انہیں دے رکھی ہے مگر یہ کہ تمہارے سوا کسی کو خوف ہو اور نہ رب العالمین نے یہ کہا ہے: فلا جناح علیکم ان تاخذوا له منها فدیة، (کہ تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ تم مرد کے لئے عورت سے فدیہ لو) کہ خلع سلطان کے حوالے ہو جائے۔

امام طحاوی نے کہا ہے: حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ سلطان کے بغیر خلع کا جائز ہونا صحیح ہے اور جس طرح طلاق اور نکاح بغیر سلطان کے جائز ہیں اسی طرح خلع بھی جائز ہے۔ یہی جمہور علماء کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا اگر تمہیں خوف ہو اس پر کہ وہ قائم نہ رکھ سکیں گے حُدُوْدَ اللّٰهِ اللہ کی حدیں۔ یعنی ان حقوق میں جو ان دونوں پر واجب ہیں مثلاً حسن صحبت اور خوبصورت طرز زندگی اور اس میں خطاب حکام کو اور حاکم نہ ہونے کی صورت میں اس طرح کے معاملات میں واسطہ بننے والوں کو کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم نہ کرنے کا معنی ہے عورت کا اپنے خاوند کے حق کو حقیر جاننا اور اس کا اس کی اطاعت و پیروی نہ کرنا وغیرہ حضرت ابن عباس، مالک بن انس اور جمہور فقہاء نے یہی کہا ہے۔ (2)

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 308، دار الفکر 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 307، دار الکتب العلمیہ

اور حسن بن ابی الحسن اور ان کے ساتھ ایک جماعت نے کہا ہے: جب عورت نے یہ کہہ دیا کہ میں تیرے حکم کی اطاعت نہیں کروں گی اور میں تیرے لئے غسل جنابت نہیں کروں گی اور میں تیرے لئے قسم پوری نہیں کروں گی تو خلع حلال ہو گیا اور شعبی نے کہا ہے: اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ کا معنی ہے کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کریں گے۔ وہ یہ کہ ایک دوسرے کو غصہ دلانا اور ناراض کرنا ترک طاعت کی طرف دعوت دیتا ہے (1)۔

اور حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: خلع اور مال لینا حلال ہو جاتا ہے جب کہ عورت اپنے خاوند کو کہے: میں تجھے ناپسند کرتی ہوں اور میں تجھ سے محبت نہیں کرتی اور اسی طرح کے جملے (2)۔ تو ان پر کوئی حرج نہیں ہے کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے۔

امام بخاری نے ایوب عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے حدیث بیان کی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثابت بن قیس کے بارے میں اخلاق و کردار اور دین کے اعتبار سے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے (اس اعتبار سے ان میں کوئی عیب اور نقص موجود نہیں) لیکن میں اس کی طاقت نہیں رکھتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کیا تو اس پر اس کا باغ لوٹا دے گی"؟ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ (3)

اسے ابن ماجہ نے حضرت قتادہ عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے کہ جمیلہ بنت سلول حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: قسم بخدا! میں دین اور اخلاق کے بارے میں ثابت بن قیس میں کوئی عیب نہیں پاتی، لیکن میں اسلام میں کفر (ناشکری، انکار) کو ناپسند کرتی ہوں، میں بغض کی وجہ سے اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا: کیا تو اس کا باغ اسے لوٹا دے گی؟ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ وہ اس سے اپنا باغ لے لے اور مزید کچھ نہ لے (4)۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ان سے انتہائی شدید بغض رکھتی تھیں اور وہ اس سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کے درمیان بطریق خلع تفریق کر دی۔ اسلام میں یہی پہلا خلع تھا۔

حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اسلام میں سب سے پہلے جس نے خلع کیا وہ عبداللہ بن ابی کی بہن ہے وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرا سر اور اس کا سر کبھی جمع نہیں رہ سکتے۔ میں نے خیمے کی ایک طرف اٹھائی تو میں نے اسے ایک جماعت میں آتے دیکھا تو وہ ان تمام میں سب سے زیادہ سیاہ تھا، قد و قامت کے اعتبار سے ان سے چھوٹا تھا اور چہرے کے لحاظ سے سب سے زیادہ قبیح تھا! تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تو اس کا باغ اس پر واپس لوٹا دے گی؟ اس نے عرض کی: جی ہاں اور اگر وہ چاہے تو میں زائد بھی دوں گی، تو آپ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 307، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، الخلع و کیف طلاق فیہ، جلد 2، صفحہ 794، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 4867-4868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، المختلعۃ یأخذ ما أعطاھا، جلد 1، صفحہ 148، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 2045، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کے مابین تفریق کر دی۔ یہ حدیث خلع میں اصل ہے اور جمہور فقہاء اسی پر عمل پیرا ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: میں اہل علم سے اس کے بارے مسلسل سنتا رہا ہوں اور یہی امر ہے جس پر ہمارے نزدیک اجماع ہے اور وہ یہ کہ آدمی جب عورت کو کوئی ضرر اور تکلیف نہ دے اور اس کی طرف برائی کی نسبت بھی نہ کرے اور مرد کی جانب سے اسے ستایا بھی نہ جائے اور عورت اس سے جدائی اور علیحدگی پسند کرے تو آدمی کے لئے حلال ہے کہ وہ اس سے ہر وہ شے لے لے جو بطور فدیہ وہ اسے دے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ثابت بن قیس کی بیوی کے بارے میں کہا اور اگر ناچاکی اور اختلاف مرد کی جانب سے ہو کہ وہ اسے تنگ کرتا ہو اور اسے اذیت اور ضرر پہنچاتا ہو تو وہ اسے وہ شے واپس لوٹا دے جو اس سے لی ہے۔

عقبہ بن ابی الصہباء نے کہا ہے: میں نے بکر بن عبداللہ مزنی سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جس کی عورت یہ چاہتی ہے کہ وہ اس سے خلع لے لے تو انہوں نے کہا: اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس سے کوئی شے لے۔

میں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے وہ کہاں گیا فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ؟ انہوں نے کہا: یہ منسوخ ہو چکا ہے، میں نے کہا: ناسخ آیت کہاں ہے؟ تو انہوں نے کہا: سورۃ النساء میں یہ آیت ہے: وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا ۝ (النساء)(1) (اور اگر تم ارادہ کر لو کہ بدلو اپنی بیوی کو پہلی بیوی کی جگہ اور دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز، کیا تم لینا چاہتے ہو اپنا مال (زمانہ جاہلیت کی طرح) بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کر کے۔)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول شاذ ہے اور اپنے شاذ ہونے کی وجہ سے اجماع سے خارج ہے اور دونوں آیتوں میں سے ایک آیت دوسری کو ختم کرنے والی نہیں ہے کہ نسخ واقع ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَاِنْ خِفْتُمْ الآیۃ اس آیت کے ساتھ زائل اور ختم ہونے والا نہیں ہے کیونکہ دونوں کو جب یہ خوف اور اندیشہ ہو تو پھر خاوند وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ (النساء: 20) میں داخل نہیں، کیونکہ یہ صرف مردوں کے لئے ہے اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ آیت محکم ہے(2) اور بکر کے قول کی کوئی حقیقت نہیں اگر عورت دینے کا ارادہ کرے۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے جائز قرار دیا کہ وہ اپنی زوجہ سے وہ کچھ لے لے جو اسے دے رکھا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس آیت سے انہوں نے استدلال کیا ہے جنہوں نے خلع کو شقاق اور ضرر کی حالت کے ساتھ خاص کیا ہے اور یہ کہ خلع میں یہ شرط ہے اور یہ نظریہ اس روایت سے مزید پختہ اور مضبوط ہو جاتا ہے جو ابوداؤد نے حضرت عائشہ سے بیان کی ہے کہ حبیبہ بنت سہل حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں تو انہوں نے اسے مارا اور کندھے کے کنارے کی باریک ہڈی توڑ دی، چنانچہ صبح کے وقت وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور شکایت پیش کی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: ''تو اس سے کچھ مال لے لے اور اسے فارغ کر دے۔''

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 566، دار احیاء التراث العربیۃ بیروت
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 173

انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا وہ اس سے صلح کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں''۔ حضرت ثابت نے کہا: میں اسے دو باغ دیتا ہوں اور دونوں اس کے قبضے میں ہیں۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو وہ دونوں لے لے اور اسے جدا کر دے۔'' چنانچہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے وہ دونوں لے لئے اور اسے فارغ کر دیا (1)۔ اور جس موقف پر جمہور فقہاء ہیں وہ یہ ہے کہ ضرر اور تکلیف کی شکایت کیے بغیر خلع جائز ہے۔

جیسا کہ اس پر حدیث بخاری وغیرہ دلالت کرتی ہے (2) اور رہی آیت تو اس میں کوئی حجت موجود نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شرط کے انداز میں اس کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اس طور پر اس کا ذکر کیا ہے کہ خلع کے احوال میں اس کا غالب امکان ہے۔ پس یہ قول غالب کے بارے ہے اور وہ ارشاد جو عذر کو ختم کرتا ہے اور علم کو واجب کرتا ہے وہ یہ ہے: فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا۝ (النساء) (پس اگر وہ بخش دیں تمہیں کچھ اس سے خوشدلی سے تو کھاؤ اسے لذت حاصل کرتے ہوئے خوشگوار سمجھتے ہوئے۔)

مسئلہ نمبر 6۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ خلع اس سے زیادہ مال کے عوض بھی جائز ہے جو آدمی نے عورت کو دے رکھا ہو (3)۔ تحقیق علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ سو امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ یہ جائز ہے کہ عورت آدمی کو بطور فدیہ اتنا مال دے جس پر دونوں راضی ہوں، چاہے وہ اس سے کم یا زیادہ ہو جو مرد نے عورت کو دے رکھا ہے اور یہ حضرت عثمان بن عفان، ابن عمر رضی اللہ عنہم اور قبیصہ اور نخعی رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے اور قبیصہ نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ مکارم اخلاق میں سے نہیں ہے اور نہ ہی میں نے اہل علم میں سے کسی کو دیکھا کہ وہ اسے مکروہ جانتا ہو اور دار قطنی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میری بہن انصار میں سے ایک آدمی کی زوجیت میں تھی اس نے اس کے ساتھ ایک باغ کے عوض شادی کی تھی، تو ان دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہو گئی تو وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیش ہو گئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس کا باغ اسے واپس کر دے اور وہ تجھے طلاق دے دے گا۔''؟ (کیا تجھے قبول ہے) اس نے عرض کی: جی ہاں اور میں اسے زائد بھی دوں گی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اس کا باغ اس پر واپس لوٹا دے اور اسے زائد بھی دے۔'' (4)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: ''اور اگر اس نے چاہا تو میں اسے زیادہ دوں گی اور آپ نے اس بات کا انکار نہیں کیا۔''

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی الخلع، جلد 1، صفحہ 303، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 1901، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 1، صفحہ 565، دار احیاء التراث العربیۃ

4۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، باب المہر، جلد 3، صفحہ 254، دار المحاسن قاہرہ

اور ایک گروہ نے کہا ہے: وہ اس سے اس مال سے زیادہ نہیں لے گا جو اس نے اسے دیا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت طاؤس، حضرت عطا اور حضرت اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ امام اوزاعی نے کہا ہے: قضاۃ اس کے مال لینے کی اجازت نہیں دیتے مگر اتنا جو اس نے اسے دیا ہوا ہو۔ یہی قول امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہما نے بھی کہا ہے۔ اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے ابن جریج نے روایت کیا ہے کہ ابوالزبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے نکاح میں زینب بنت عبداللہ بن ابی بن سلول تھی۔ اور انہوں نے بطور مہر ایک باغ اسے دیا تھا۔ پھر اس نے انہیں ناپسند کیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''زیادہ تو نہیں البتہ اس کا باغ واپس کر دے۔'' تو اس نے عرض کی! جی ہاں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے وہ باغ لے لیا اور اس کا راستہ چھوڑ دیا (یعنی اسے فارغ کر دیا) اور جب یہ خبر حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، تو انہوں نے کہا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ قبول ہے (1)۔ اسے ابوالزبیر نے کئی ایک سے سنا ہے اور دارقطنی نے اسے بیان کیا ہے اور حضرت عطا سے مرسل روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی خلع لینے والی عورت سے اس سے زیادہ مال نہیں لے گا جتنا اس نے اسے دیا ہوا ہے۔'' (2)

مسئلہ نمبر 7۔ امام مالک کے نزدیک خلع جائز ہے ایسے پھل کے عوض جس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر نہ ہو، بدکنے والے اونٹ کے عوض، بھاگ جانے والے غلام کے عوض، جنین کے عوض جو بھی اپنی ماں کے پیٹ میں ہو یا اسی طرح کی اور چیزیں جن کی ہلاکت کا امکان ہو، بخلاف بیوع اور نکاح کے اور اس کے لئے ان تمام کا مطالبہ جائز ہے پس اگر وہ اس کے حوالے ہو گئی تو وہ اس کی ہو جائے گی اور اگر اس کے حوالے نہ ہوئی تو پھر اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی اور طلاق اس کے حکم پر نافذ ہو جائے گی۔

امام شافعی نے کہا ہے: خلع جائز ہوگا اور اس کے لئے مہر مثل ہوگا۔ اسے ابن خویز منداد نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: کیونکہ وہ عقود جن میں معاوضہ ہوتا ہے جب وہ بدل فاسد کو متضمن ہوں اور وہ ضائع ہو جائے تو ان میں بدل کی مثل واجب کی طرف رجوع کیا جاتا ہے (لہٰذا مہر مثل لوٹایا جائے گا۔)

اور ابوثور نے کہا ہے: خلع باطل ہے، اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: خلع جائز ہے اور اس کے لئے وہ ہوگا جو لونڈی کے پیٹ میں ہے اور اگر اس میں بچہ نہ ہو تو اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی۔

اور ''المبسوط'' میں ابن قاسم سے منقول ہے: خلع جائز ہوتا ہے اس پھل کے عوض جو اس کے درخت اس سال دیں گے اور ان کے عوض جو بچے اس کا ریوڑ اس سال دے گا، اس سے امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے اختلاف کیا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ابن القاسم کے موقف کی دلیل اس ارشاد کا عموم ہے: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ۔

اور قیاس کی جہت سے یہ کہ یہ ان میں سے ہیں جن کا وہ ہبہ اور وصیت کے ساتھ مالک بن جاتا ہے تو پھر جائز ہے کہ یہ معلوم کی طرح خلع میں بھی عوض ہوں اور یہ بھی کہ خلع طلاق ہے اور طلاق اصلاً بغیر عوض کے صحیح ہوتی ہے تو جب بغیر کسی شے

1۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، باب المہر، جلد 3، صفحہ 255، دار المحاسن قاہرہ　2۔ ایضاً

کے عوض کے یہ صحیح ہے تو پھر فاسدِ عوض کے ساتھ اس کا صحیح ہونا بدرجہ اولیٰ ہوگا، کیونکہ مبذول کی سب سے بری حالت یہی ہے کہ وہ مسکوت عنہ کی طرح ہو اور جب وہ نکاح جو عقد تحلیل ہے فاسد عوض اسے فاسد نہیں کرتا تو یہ اس طلاق کو کیونکر فاسد کر سکتا ہے جو عقد کو زائل کرنے والی اور اسے کھولنے والی ہے (یعنی بدرجہ اولیٰ عوض فاسد اسے فاسد نہیں کرے گا۔)

مسئلہ نمبر 8۔ اگر کسی عورت نے اس کے عوض آدمی سے خلع کیا کہ وہ اس سے اپنے بیٹے کو دو سال تک دودھ پلائے گی تو یہ جائز ہے۔ خلع کی صورت میں دو سال کے بعد مدت معلومہ تک اس کا نفقہ بیٹے پر ہوگا اس کے بارے دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک ہے کہ وہ جائز ہے اور یہ مخزومی کا قول ہے اور اسے سحنون نے اختیار کیا ہے اور دوسرا یہ ہے کہ وہ جائز نہیں اسے ابن قاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اور اگر خاوند نے اس کی شرط لگائی تو وہ باطل ہے اور زوجہ سے اسے اتار دیا جائے گا(1) (یعنی اس پر اسے لازم نہیں کیا جائے گا)۔

ابو عمر نے کہا ہے: جنہوں نے بدکنے والے اونٹ، بھاگ جانے والے غلام اور اسی طرح کی دوسری چیزیں جن کے ضائع ہونے کا امکان ہے کہ عوض خلع کو جائز قرار دیا ہے ان کے ذمہ پر لازم ہے کہ وہ اسے بھی جائز قرار دیں۔ ان کے علاوہ قرویین نے کہا: امام مالک نے اس نفقہ کے عوض خلع سے منع نہیں کیا جو دو سال سے زائد ہو غرر کی وجہ سے۔ بلکہ اس سے منع کیا ہے کیونکہ یہ وہ حق ہے جو ہر حال میں باپ کے ساتھ خاص ہوتا ہے، پس اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اسے کسی دوسرے کی طرف منتقل کرے اور اس میں اور دو سال کے نفقہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ نفقہ اور یہ دودھ پلانا زوجیت کی حالت میں ماں پر واجب ہوتا ہے اور طلاق کے بعد بھی جب باپ تنگ دست اور مفلس ہو تو جائز ہے کہ وہ نفقہ ماں کی طرف منتقل ہو جائے، کیونکہ یہی اس کا محل ہے۔ اور امام مالک نے اس پر المبسوط میں اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ (البقرہ: ۲۳۳) (اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو دودھ کی مدت پوری کرنا چاہتا ہے۔)

مسئلہ نمبر 9۔ اگر بیٹے کے نفقہ کے عوض وجہ مباح پر خلع واقع ہو اور مدت مکمل ہونے سے پہلے بچہ فوت ہو جائے تو کیا بقیہ نفقہ کے لئے خاوند اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے؟ تو ابن المواز نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ وہ کسی شے کے لئے عورت کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔ اور ابو الفرج نے آپ سے روایت کیا ہے کہ وہ اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے کیونکہ یہ ایسا حق ہے جو خلع کے عوض اس کے لئے عورت کے ذمہ ثابت ہے اور وہ بچے کی موت سے ساقط نہیں ہوگا، جیسا کہ اگر وہ اس سے خلع کرے ایسے مال کے عوض جو عورت کے ذمہ کے ساتھ متعلق ہو۔ اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے لئے ایسے مال کی شرط نہیں لگائی جو اسے خوشحال بنا دے گا، بلکہ اس نے اپنے بچے کی مشقت کی کفایت کرنے کی شرط لگائی ہے اور جب بچہ فوت ہو گیا تو اب اس کے لئے عورت کی طرف کسی شے کے لئے رجوع نہیں ہوگا جیسا کہ اگر کوئی آدمی ایک سال تک کسی بچے پر استحساناً اور تطوعاً خرچ کرنے کی ذمہ داری لے اور بچہ فوت ہو جائے تو اس پر کسی شے کے لئے رجوع نہیں کیا

1۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب ما جاء فی الخلع، جلد 5، صفحہ 27، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

جائے گا کیونکہ اس نے اپنے تطوع سے بچے کی مشقت برداشت کرنے کا قصد کیا ہے۔ واللہ اعلم

امام مالک نے کہا ہے: میں نے کسی کو نہیں دیکھا ہے جو اس طرح کی صورت میں رجوع کرتا ہو اور اگر وہ اس کا پیچھا کرے تو بھی اس بارے اس کے لئے آپ کا ایک قول ہے۔ اور علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اگر عورت فوت ہوگئی تو بچے کا نفقہ اس کے مال میں ہوگا کیونکہ یہ وہ حق ہے جو اس کی موت سے پہلے اس میں ثابت ہو چکا ہے، لہٰذا وہ اس کی موت کے ساتھ ساقط نہیں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 10۔ جس کسی نے خلع کی صورت میں اپنی عورت پر اس کے حمل کے نفقہ کی شرط لگائی اور عورت کے پاس کوئی شے نہ ہو تو نفقہ اس آدمی پر ہوگا کیونکہ عورت کے پاس کوئی مال نہیں ہے جس سے وہ خرچ کر سکے اور اگر وہ اس کے بعد خوشحال ہو جائے تو آدمی اس مال کے لئے اس کی طرف رجوع کر لے جو اس نے خرچ کیا اور وہ اس سے لے لے۔

امام مالک نے کہا: حق یہ ہے کہ آدمی کو اس کے اپنے بچے کے نفقہ کا مکلف اور پابند بنایا جائے اگرچہ اس نے بچے کی ماں پر اس کے نفقہ کی شرط لگائی ہو بشرطیکہ ماں کے پاس ایسا مال نہ ہو جو وہ اس پر خرچ کر سکے۔

مسئلہ نمبر 11۔ خلع کے بارے میں علماء کا یہ اختلاف ہے کہ کیا وہ طلاق ہے یا فسخ نکاح ہے؟ پس حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ خلع طلاق ہے (1) اور یہی امام مالک، ثوری، اوزاعی، ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے اپنے دو قولوں میں سے ایک میں کہا ہے۔ پس جس نے خلع سے دو یا تین طلاقوں کی نیت کی، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ اسے لازم ہو جائیں گی اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: اگر خاوند نے تین طلاقوں کی نیت کی تو وہ تین ہی ہوں گی اور اگر اس نے دو کی نیت کی تو وہ ایک طلاق بائنہ ہوگی (کیونکہ یہ ایک کلمہ ہے)۔

اور امام شافعی نے اپنے دو قولوں میں سے ایک میں کہا ہے: اگر اس نے خلع سے طلاق کی نیت کی اور اس کا نام بھی لیا تو وہ طلاق ہوگی اور اگر اس نے طلاق کی نیت نہ کی اور نہ اس کا نام لیا تو فرقت واقع نہ ہوگی، آپ نے قدیمی قول میں یہی کہا ہے اور آپ کا پہلا قول میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ مزنی نے کہا ہے: وہی ان کے نزدیک زیادہ صحیح ہے۔

اور ابوثور نے کہا ہے: جب وہ طلاق کا نام نہ لے تو خلع فقط فرقت ہوگی اور طلاق نہیں ہوگی اور اس نے طلاق کا نام لیا تو وہ طلاق ہوگی اور زوج رجعت کا زیادہ مالک ہوگا جب تک وہ عدت میں رہی۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ خلع فسخ ہے، طلاق نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اس کی نیت کرے ان میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت طاؤس، حضرت عکرمہ، حضرت اسحاق اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو ابن عیینہ نے عمرو سے، انہوں نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ابراہیم بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما نے ان سے پوچھا کہ ایک آدمی جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں پھر بیوی نے اس سے خلع لے لیا کیا وہ اس

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب ما جاء فی الخلع، جلد 5، صفحہ 18، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

سے شادی کر سکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں چاہیے کہ وہ اس سے نکاح کر لے، خلع طلاق نہیں ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے آیت کی ابتدا میں اور اس کے آخر میں طلاق کا ذکر کیا ہے اور خلع کا ذکر ان کے درمیان میں ہے، پس خلع کوئی شے نہیں ہے۔ پھر کہا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ، پھر پڑھا: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ۔ انہوں نے کہا: کیونکہ اگر خلع طلاق ہو تو پھر دو طلاقوں کے ذکر کے بعد یہ تیسری ہوگی اور اس کے بعد فَاِنْ طَلَّقَهَا چوتھی طلاق پر دال ہوگا، پس تحریم چار طلاقوں کے ساتھ متعلق ہو جائے گی۔

انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جسے امام ترمذی، ابوداؤد اور دارقطنی رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنے زوج سے خلع لیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ایک حیض عدت گزارنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے (2)۔ اور حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء سے روایت ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مقدس میں خلع لیے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے حکم دیا یا اسے حکم دیا گیا کہ وہ ایک حیض کے ساتھ عدت گزارے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ربیع کی حدیث صحیح ہے کہ اسے حکم دیا گیا کہ وہ ایک حیض عدت گزارے (3)۔ انہوں نے کہا: پس یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ خلع فسخ ہے نہ کہ طلاق اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ اور اگر یہ (خلع لینے والی) عورت مطلقہ ہوتی تو اس کے لئے ایک حیض پر اقتصار نہ کیا جاتا (کیونکہ عدت تو تین حیض ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں پھر اس نے اس سے خلع کر لیا، پھر وہ اس سے شادی کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اس کے لئے صحیح ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ اگرچہ وہ اس کے علاوہ کسی زوج سے شادی نہ کرے۔ کیونکہ اس کے لئے دو طلاقوں کے سوا کچھ نہیں ہے اور خلع لغو ہے۔

اور جنہوں نے خلع کو طلاق بنایا ہے انہوں نے کہا ہے: اس کے لئے اس عورت کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں یہاں تک کہ وہ دوسرے زوج سے شادی کر لے، کیونکہ خلع کے ساتھ تین طلاقیں مکمل ہوگئی ہیں اور یہی صحیح ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قاضی اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: اس آدمی کے بارے میں قول کیسے جائز ہو سکتا ہے جسے اس کی بیوی نے کہا: تو مجھے مال کے عوض طلاق دے دے، پس اس نے اسے طلاق دے دی، کہ یہ طلاق نہیں ہوگی اور اگر اس نے بغیر کسی شے کے عورت کا معاملہ اس کے ہاتھ دے دیا اور اس نے اپنے آپ کو طلاق دے دی تو وہ طلاق ہوگی۔ (فرمایا) رہا قول باری تعالیٰ: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ تو یہ اس قول پر معطوف ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کیونکہ اس کا ارشاد: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ بلاشبہ یہ مراد بہ ہے یا تطلیق ہے اور اگر خلع کا عطف دو طلاقوں پر کیا جائے تو پھر خلع اصلاً جائز ہی نہ ہوگا

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، باب الخلع ہل ہو فسخ او طلاق، جلد 7، صفحہ 316، دار الفکر بیروت

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم اسلام آباد۔ ابوداؤد، باب الخلع، حدیث نمبر 1902، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی الخلع، حدیث نمبر 1105، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

مگر دو طلاقوں کے بعد اور یہ کوئی بھی نہیں کہتا۔

اور کسی اور نے کہا ہے: آیت میں جو تاویل انہوں نے کی ہے وہ غلط ہے، کیونکہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ نے دو طلاقوں کے حکم کا فائدہ دیا ہے جب وہ ان دونوں کو خلع کی وجہ کے سوا پر واقع کرے۔ اور ان دونوں کے ساتھ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ کے سبب رجعت بھی ثابت ہوگی۔ پھر ان دونوں کا حکم ذکر کیا جب یہ علی وجہ الخلع ہوں۔ پس خلع ان دو کی طرف لوٹ آئے گا جن کا ذکر پہلے ہو چکا، کیونکہ اس سے مقصود طلاق مطلق اور طلاق بالعوض کا بیان ہے اور تیسری طلاق چاہے بالعوض ہو یا بغیر عوض کے ہو بلا شبہ وہ حلت کو ختم کر دیتی ہے مگر زوج ثانی کے بعد۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جواب تو آیت کا ہے اور رہی حدیث! تو ابوداؤد نے کہا ہے۔ جب انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث حیض کے بیان میں ذکر کی۔ اس حدیث کو عبدالرزاق نے معمر بن عمرو بن مسلم عن عکرمۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سند سے مرسل ذکر کیا ہے اور قعنبی نے مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے ہمیں بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: خلع والی عورت کی عدت طلاق والی عورت کی عدت کی مثل ہے (1)۔ ابوداؤد نے کہا ہے: ہمارے نزدیک عمل اسی پر ہے۔

میں کہتا ہوں: یہی امام مالک، شافعی، احمد، اسحاق، ثوری اور اہل کوفہ کا مذہب ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے اکثر اہل علم اور دوسروں کا بھی یہی مذہب ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک حیض کے بارے میں حدیث اپنی غرابت کے باوجود جیسا کہ امام ترمذی نے کہا ہے اور مرسل ہونے کے باوجود جیسا کہ ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی عدت ڈیڑھ حیض مقرر فرمائی (2)، اسے دارقطنی نے معمر عن عمرو بن مسلم عن عکرمۃ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ذکر کیا ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنے زوج سے خلع لیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی عدت ڈیڑھ حیض مقرر فرمائی۔ یہاں معمر سے ڈیڑھ حیض روایت کرنے والا وہی راوی ہے جو ان سے ایک حیض روایت کرتا ہے اور وہ ہشام بن یوسف ابو عبدالرحمٰن الصنعانی الیمانی ہے۔ اکیلے امام بخاری نے اس کی روایت نقل کی ہے۔ پس سند اور متن کے اعتبار سے حدیث مضطرب ہے، پس اس سے اس بارے میں استدلال کرنا ساقط ہو گیا کہ خلع فسخ نکاح ہے اور اس بارے میں بھی کہ مطلقہ کی عدت ایک حیض ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ہر مطلقہ مدخول بہا کے بارے میں نص باقی رہا۔ سوائے ان کے جنہیں اس سے خاص کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ''اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض اصحاب نے کہا ہے: خلع والی عورت کی عدت ایک حیض ہے (3)، اسحاق نے کہا ہے: اگر کوئی جانے والا اس طرف جائے تو وہ مذہب قوی ہے۔''

ابن منذر نے کہا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم نے فرمایا: اس کی عدت ایک حیض ہے اور یہی ابان

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم 2۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 255، دار المحاسن قاہرہ

3۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق واللعان، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب فی الخلع، حدیث نمبر 1105، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بن عثمان اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اس کی عدت مطلقہ کی عدت کی طرح ہے اور حضرت عثمان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کے قول کے بارے میں میں کہتا ہوں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ثابت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: تحقیق ہم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: خلع والی عورت کی عدت طلاق والی عورت کی عدت کی طرح ہے (1) اور یہ قول صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ امام مالک کا قول اس کے بارے میں مختلف ہے جس نے بلاعوض خلع واقع کرنے کا قصد کیا۔ پس عبدالوہاب نے کہا ہے: امام مالک کے نزدیک وہ خلع ہے اور طلاق بائن ہے اور آپ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ طلاق بائن نہ ہوگی مگر عوض پائے جانے کے ساتھ۔ اشہب اور امام شافعی نے بھی یہی کہا ہے، کیونکہ یہ طلاق عوض اور استیفاء عدد سے خالی ہے پس یہ رجعی ہوگی جیسا کہ اگر یہ لفظ طلاق کے ساتھ ہو۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: میرے نزدیک اور دیگر اہل علم کے نزدیک نظر وفکر کے اعتبار سے آپ کے دو قولوں میں سے یہ زیادہ صحیح ہے اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ خلع میں عوض کا حاصل نہ ہونا اسے اپنے مقتضا سے نہیں نکالتا۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب وہ شراب یا خنزیر کے عوض خلع کرے۔

مسئلہ نمبر 13۔ خلع کرنے والی عورت وہ ہوتی ہے جو اپنی کل شے کے عوض خلع کرتی ہے۔ اور مفتدیہ فدیہ دینے والی وہ ہوتی ہے جو بعض مال بطور فدیہ دیتی ہے اور بعض لے لیتی ہے اور مبارئۃ مبارات کرنے والی وہ ہوتی ہے جو دخول سے پہلے ہی اپنے خاوند سے جدائی اختیار کر لے۔ پس وہ کہتی ہے: قد ابرأتك فبارئنی (میں نے تجھے جدا کیا پس تو مجھے جدا کر دے۔) یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور عیسیٰ بن دینار نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: مبارئۃ وہ عورت ہے جو نہ کوئی شے لیتی ہے اور نہ کچھ دیتی ہے (2) اور مختلعہ (خلع کرنے والی) وہ ہے جو وہ مال بھی دے دیتی ہے جو خاوند نے اسے دیا ہو اور اپنے مال سے اس میں اضافہ بھی کرتی ہے۔ اور مفتدیہ وہ ہے جو اس مال کے بعض سے فدیہ دیتی ہے جو مرد نے اسے دیا ہو اور بعض اپنے پاس روک لیتی ہے اور یہ سب دخول سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور بعد بھی۔ پس جو دخول سے پہلے ہو اس میں عدت نہیں ہے۔ اور مصالحہ (صلح کرنے والی) مبارئۃ کی مثل ہے۔

قاضی ابو محمد وغیرہ نے کہا ہے: یہ چاروں الفاظ ایک ہی معنی کی طرف راجع ہوتے ہیں (3) اگرچہ ایقاع کے اعتبار سے ان کی صفات مختلف ہیں۔ اور یہ طلاق بائنہ ہے چاہے وہ اس کا نام لے یا نام نہ لے، مرد کے لئے عدت کے دوران رجعت کا حق نہیں ہوگا اور اسے عدت میں اور اس کے بعد ولی کی رضامندی اور مہر کے ساتھ زوج ثانی سے پہلے اور بعد نکاح کا حق حاصل ہوگا، بخلاف ابوثور کے، کیونکہ عورت نے جب عوض ادا کر دیا تو وہ اپنے نفس کی مالک ہو جائے گی اور اگر طلاق خلع رجعی ہو تو

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم

2۔ المدونۃ الکبری، کتاب ما جاء فی الخلع، جلد 5، صفحہ 14، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر 3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیۃ بیروت

پھر وہ اپنے نفس کی مالک تو نہ ہوئی: پس خاوند کے لئے عوض اور معوض عنہ دونوں جمع ہو جائیں گے (اور یہ صحیح نہیں ہے۔)

مسئلہ نمبر 14۔ اور یہ عقد مطلق کے ساتھ نافذ ہے: پس اگر عورت نے مرد کے لئے عوض خرچ کر دیا اور اس نے رجعت کی شرط لگا لی، تو اس میں دو روایتیں ہیں۔ ابن وہب نے دونوں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہیں۔ ان میں سے ایک میں اس کا ثبوت ہے اور سحنون نے بھی اسی طرح کہا ہے اور دوسری میں اس کی نفی ہے۔ سحنون نے کہا ہے: پہلی روایت کی وجہ یہ ہے کہ وہ دونوں (مرد و عورت) اس پر متفق ہو گئے کہ عوض اس کے مقابلے میں ہوگا جو عدد طلاق میں سے ساقط ہو رہا ہے اور یہ جائز ہے۔

اور دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ اس نے عقد میں شرط ایسی قائم کی ہے جو مقصود کے مانع ہے، پس وہ ثابت نہ ہوگی، جیسا کہ اگر وہ عقد نکاح میں شرط رکھ لے کہ میں اس سے وطی نہ کروں گا۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا۔ جب اللہ تعالیٰ نے نکاح اور فراق کے احکام بیان کیے تو فرمایا: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں جن کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں روزے کی تحریمات کا ذکر کیا اور فرمایا: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں سو تم ان کے قریب نہ جاؤ) اور حدود کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا ان میں سے ایک وہ حدود الامر ہیں جن کی پیروی لازم ہے اور دوسری حدود النہی ہیں جن سے اجتناب لازم ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی اور فرمایا: وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ (اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی حدود سے آگے بڑھتا ہے سو وہی لوگ ظالم ہیں۔)

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

"(دو بار طلاق دینے کے بعد) پھر اگر وہ طلاق دے اپنی بیوی کو تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ پس اگر وہ (دوسرا) طلاق دے اسے تو کوئی حرج نہیں ان دونوں پر کہ رجوع کر لیں بشرطیکہ انہیں خیال ہو کہ وہ قائم رکھ سکیں گے اللہ کی حدود کو اور یہ حدیں ہیں اللہ کی وہ بیان فرماتا ہے انہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ احناف میں سے بعض مشائخ خراسان نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ خلع والی عورت کو طلاق لاحق ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہا: ایسی طلاق جس کے عوض فدیہ دیا جاتا ہے اس کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے صریح طلاق کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ فا حرف تعقیب ہے (1)۔ اور یہ بعید ہے کہ اسے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کی طرف لوٹایا جائے، کیونکہ درمیان

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 196، دار الفکر بیروت

میں ایسا کلام ہے جو فَاِنْ طَلَّقَهَا کی اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ پر بنا کرنے کے مانع ہے۔ بلکہ اقرب یہی ہے کہ اس کا رجوع اس پر ہو جو اس کے ساتھ متصل ہے جیسا کہ استثنا (ان شاء اللہ تعالیٰ) میں ہوتا ہے۔ اور یہ اس کی طرف راجع نہیں ہوگا جو اس سے متقدم ہے مگر دلالت کے ساتھ (یعنی جب کوئی قرینہ دال ہو تو پھر متقدم کی طرف راجع ہو سکتا ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ (النساء: ٢٣) (اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں ان بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو۔)

پس یہ اسی پر مقصور ہوگی جو اس کے متصل بعد ہے اور اس کی طرف عائد نہیں جو اس پر متقدم ہے یہاں تک کہ عورتوں کی ماؤں کے بارے میں دخول کی شرط نہیں ہوگی۔

علماء کا خلع کے بعد عدت میں طلاق ہونے کے بارے اختلاف ہے، پس ایک گروہ نے کہا ہے: جب آدمی نے اپنی بیوی سے خلع کر لیا پھر اسے طلاق دے دی اور وہ عورت ابھی عدت میں تھی تو جب تک وہ عدت میں ہے اسے طلاق واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، شریح، طاؤس، نخعی، زہری، حکم، حماد، ثوری، اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اسے طلاق لازم نہ ہوگی اور یہ قول حضرت ابن عباس، حضرت ابن زبیر، حضرت عکرمہ، حضرت حسن، حضرت جابر بن زید، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابوثور رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور یہی امام مالک کا قول ہے، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر عورت نے اس شرط پر اسے طلاق کا فدیہ دیا کہ وہ اسے مسلسل تین طلاقیں ترتیب کے ساتھ دے گا پھر جس وقت اس نے اسے طلاق دی تو وہ اس پر ثابت ہوگئی اور اگر اس کے درمیان خاموشی ہو تو جو طلاق خاموشی اور وقفے کے بعد ہوگی وہ کوئی شے نہ ہوگی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نسق الکلام کا معنی ہے کہ وہ بعض بعض کے ساتھ متصل ہو اور یہ اس کے لئے ایک حکم ثابت کرتا ہے اسی طرح جب استثناء قسم کے متصل بعد ہو تو اس کے لئے استثنا کا حکم ثابت ہو جاتا ہے اور جب اس سے منفصل ہو تو پھر اس کا متقدم کلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَاِنْ طَلَّقَهَا سے مراد تیسری طلاق ہے فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ اس پر اجماع ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس بارے میں اختلاف ہے (کیا) نکاح کافی ہوتا ہے۔ اور اس بارے میں کہ کیا شے تحلیل کو مباح کرتی ہے۔ پس حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھ موافقت رکھنے والوں نے کہا ہے: صرف عقد نکاح ہی کافی ہے۔ اور حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے: صرف وطی کافی نہیں ہے یہاں تک کہ انزال ہو جائے۔

جمہور علماء اور تمام فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ اس میں وطی کافی ہے اور اس سے مراد شرمگاہوں کا اس طرح ملنا ہے جو حد اور غسل کو واجب کر دے۔ روزے اور حج کو فاسد کر دے اور زوجین کو محصن بنا دے اور کامل مہر لازم کر دے۔

ابن عربی نے کہا ہے: فقہ میں میرے سامنے کوئی ایسا مسئلہ نہیں آیا جو اس سے زیادہ مشکل ہو اور وہ یہ کہ اصول فقہ میں سے ہے کہ کیا حکم اوائل اسماء سے متعلق ہوتا ہے یا اواخر اسماء سے؟ سو اگر ہم کہیں کہ حکم اوائل اسماء سے متعلق ہوتا ہے تو پھر ہم پر لازم

ہے کہ ہم حضرت سعید بن مسیب کے قول کے مطابق کہیں۔ اور اگر ہم کہیں کہ حکم اواخر اسماء سے متعلق ہوتا ہے تو پھر ہم پر لازم ہے کہ ہم حشفہ کو فرج میں غائب کرنے کے ساتھ انزال کی شرط بھی لگائیں، کیونکہ یہی ذوق عسیلہ کا آخر ہے(1) جیسا کہ حسن نے کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: ذوق عسیلہ کا معنی وطی کرنا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب کے سوا علماء کی جماعت کا یہی موقف ہے۔ آپ فرماتے ہیں: پس لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ دوسرا اس سے مجامعت کرلے اور میں یہ کہتا ہوں جب دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ نکاح صحیح کرلیا کہ وہ اس سے اس کے حلالہ کا ارادہ نہ کرے تو پھر کوئی حرج نہیں کہ زوج اول اس سے نکاح کرلے۔ اور یہ قول ہے جس کے بارے ہم کسی کو بھی نہیں جانتے جس نے آپ کے ساتھ موافقت کی ہو سوائے خوارج کی ایک جماعت کے اور اس کے ماسوا کے بارے میں سنت پر اکتفا کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت سعید بن مسیب کے قول کے بارے میں حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ اسے نحاس نے کتاب ''معانی القرآن'' میں ذکر کیا ہے۔ فرمایا: اہل علم کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں نکاح سے مراد جماع ہے، کیونکہ فرمایا: زَوْجًا غَيْرَهٗ حالانکہ زوجیت مقدم ہے پس نکاح جماع کے معنی میں ہوگا۔ مگر سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ یہاں لفظ نکاح نکاح صحیح کے معنی میں ہے جب اس نے اسے حلالہ کرنے کا ارادہ نہ کیا ہو۔

میں (مفسر) نے کہا ہے: میں ان دونوں کے بارے یہ گمان کرتا ہوں کہ حدیث عسیلہ ان تک نہیں پہنچی یا وہ ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے، پس انہوں نے ظاہر قرآن کو لے لیا اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ واللہ اعلم۔

ائمہ کرام نے روایت کیا اور الفاظ دارقطنی کے ہیں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی اور خاوند سے شادی کرلے اور دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا شہد چکھ لے۔''(2)

بعض علمائے احناف نے کہا ہے: جو کوئی حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے مذہب کے مطابق عقد نکاح کرلے تو قاضی کو چاہیے کہ وہ اسے فسخ کردے اور اس میں آپ کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ علماء کے اجماع سے خارج ہیں۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: اور وہ ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے سمجھا جاتا ہے: حتی یذوق کل واحد منهما عسیلة صاحبه (3) کہ وہ دونوں جماع کی لذت پانے میں برابر ہیں۔ اور یہی ہمارے نزدیک اس بارے میں دو قولوں میں سے ایک کے لئے حجت ہے کہ اگر اس نے اس سے وطی کی درآنحالیکہ وہ سوئی پڑی ہو یا اس پر غشی طاری ہو تو وہ طلاق دینے والے (زوج اول) کے لئے حلال نہ ہوگی، کیونکہ اس نے شہد نہیں چکھا جب اسے اس کا ادراک نہ ہوا۔

مسئلہ نمبر 3۔ امام نسائی نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بال گودنے والی اور گودوانے والی، دوسرے کے بال اپنے بالوں میں لگانے والی اور بال لگوانے والی، سود کھانے والے اور

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 196، دار الفکر بیروت
2۔ دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 32، دار المحاسن قاہرہ
3۔ ایضاً

کھلانے والے، حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے حلالہ نکالا جائے ان تمام پر لعنت کی ہے۔(1)

اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے حلالہ نکالا جائے پر لعنت کی ہے(2)۔ اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور یہ حدیث حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کئی اسناد سے مروی ہے اور اہل علم کے نزدیک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے جن کا اس پر عمل ہے ان میں سے حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں۔

اور تابعین میں سے فقہاء کا بھی یہی قول ہے اور اسی طرح سفیان ثوری، ابن مبارک، امام شافعی، امام مالک، امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم بھی کہتے ہیں اور میں نے جارود سے سنا ہے وہ وکیع سے ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی اسی طرح کہا ہے اور فرمایا: چاہئے کہ اس باب کے بارے میں اصحاب رائے کا قول بیان کیا جائے اور حضرت سفیان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جب آدمی کسی عورت سے شادی کرے تاکہ وہ اسے (پہلے خاوند کے لئے) حلال کر دے پھر اسے خیال آیا کہ وہ اسے روک لے تو وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ نیا نکاح کرے۔

ابو عمر بن عبدالبر نے کہا ہے کہ حلالہ نکالنے والے کے نکاح میں علماء نے اختلاف کیا ہے اور امام مالک نے کہا ہے: حلالہ نکالنے والا اپنے نکاح پر قائم نہیں رہے گا یہاں تک کہ وہ نکاح جدید کر لے، پس اگر اس نے اس کے ساتھ مجامعت کی تو اس کے لئے مہر مثل ہوگا اور اس کی مجامعت اسے زوج اول کے لئے حلال نہیں کرے گی۔ برابر ہے دونوں کو علم ہو یا علم نہ ہو جب اس نے حلالہ کی غرض سے اس کے ساتھ شادی کی۔ اور نہ وہ اپنے نکاح پر برقرار رہے گا اور اسے فسخ کر دیا جائے گا۔ اسی طرح امام ثوری اور اوزاعی نے بھی کہا ہے اور اس میں ایک دوسرا قول بھی ہے جو نکاح خیار اور محلل کے بارے میں امام ثوری سے مروی ہے کہ نکاح جائز ہے اور شرط باطل ہے اور اس میں اور نکاح متعہ کے بارے میں ابن ابی لیلیٰ کا بھی یہی قول ہے اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے نکاح محلل کے بارے میں مروی ہے: کتنا برا ہے جو اس نے کیا ہے اور نکاح جائز ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: نکاح جائز ہے اگر اس کے ساتھ دخول کیا گیا اور اس کے لئے اسے اپنے پاس روک لینا جائز ہے اگر وہ چاہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: وہ عورت زوج اول کے لئے حلال نہیں ہوگی اگر اس نے اس کے ساتھ حلالہ کی غرض سے شادی کی اور ایک بار انہوں نے کہا: اس نکاح کے ساتھ وہ اس کے لئے حلال ہو جائے گی بشرطیکہ زوج ثانی اس کے ساتھ مجامعت کرے اور اسے طلاق دے دے اور اس بارے میں انہوں نے کوئی اختلاف نہیں کیا کہ اس زوج (مراد زوج ثانی) کا نکاح صحیح ہے اور یہ کہ اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس پر قائم رہے۔

1۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 101، وزارت تعلیم۔ ایضاً، مسند امام احمد، حدیث نمبر 4283

2۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 133، وزارت تعلیم

ایضاً، باب ما جاء فی المحل الخ، حدیث نمبر 1038-1039۔ ابو داؤد، باب فی التحلیل، حدیث نمبر 1778، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب المحلل والمحلل لہ، حدیث نمبر 1923-1924-1925، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب آدمی نے یہ کہا کہ میں تیرے ساتھ شادی کرنے لگا ہوں تا کہ میں تجھے (زوج اول کے لئے) حلال کر دوں پھر اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی نکاح نہیں، تو یہ نکاح متعہ کی قسم ہے اور یہ فاسد ہے، وہ اس پر برقرار نہیں رہے گا اور اسے فسخ کر دیا جائے گا اور اگر اس نے اس نکاح پر وطی کی تو وہ (زوج اول کے لئے) حلال نہ ہوگی اور اگر زوج ثانی نے اس کے ساتھ مطلقاً نکاح کیا نہ اس نے کوئی شرط لگائی اور نہ ہی اس پر حلالہ کی شرط لگائی گئی تو اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ان کی قدیم کتاب میں دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل ہے اور دوسرا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل ہے اور ان کی جدید مصری کتاب میں ان کا قول مختلف نہیں کہ نکاح صحیح ہوگا جب اس نے کوئی شرط نہ لگائی اور یہی داؤد کا قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: الماوردی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ اگر حلالہ کی شرط عقد سے پہلے لگائی گئی تو نکاح صحیح ہوگا اور وہ اسے زوج اول کے لئے حلال کر دے گا۔ اور اگر دونوں نے عقد کے دوران حلالہ کی شرط لگائی تو نکاح باطل ہوگا اور وہ اسے پہلے کے لئے حلال نہیں کرے گا۔ فرمایا: یہی امام شافعی کا قول ہے اور حسن اور ابراہیم نے کہا ہے: جب تین میں سے کسی ایک نے حلالے کا قصد کیا تو نکاح فاسد ہوگا اور یہ بہت شدت اور سختی ہے اور سالم اور قاسم نے کہا ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ حلالہ کی غرض سے شادی کرے بشرطیکہ زوجین کو اس کا علم نہ ہو (1) اور وہ ماجور ہوگا۔ اسی طرح ربیعہ اور یحییٰ بن سعید نے کہا ہے اور داؤد بن علی نے بھی یہی کہا ہے بشرطیکہ عقد کرتے وقت اس کی شرط کا اظہار نہ ہو۔

مسئلہ نمبر 4۔ ہمارے علماء کے نزدیک حلالہ کے لئے نکاح کے جائز ہونے کا دارومدار نکاح کرنے والے زوج پر ہے۔ خواہ اس کی شرط لگائی جائے یا وہ اس کی نیت کرے اور جب اس میں سے کوئی شے ہوگی تو اس کا نکاح فاسد ہوگا اور وہ اس پر برقرار نہیں رہے گا اور اس کی وطی اس عورت کو زوج اول کے لئے حلال نہیں کرے گی۔ اور طلاق دینے والے خاوند کا اس بارے میں جاننا اور نہ جاننا برابر ہے اور کہا گیا ہے: بے شک اسے چاہئے کہ جب اسے علم ہو کہ اس کے ساتھ نکاح کرنے والے نے اس لئے اس کے ساتھ شادی کی ہے تو وہ اس کے رجوع سے احتیاط برتے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اسے حلال نہیں کرے گا مگر وہ نکاح جو رغبت کے ساتھ ہو اور اسے عورت کی حاجت اور ضرورت ہو اور اس سے حلالہ کا قصد نہ کیا جائے اور اس کا عورت کے ساتھ وطی کرنا مباح ہو (یعنی) نہ وہ روزے دار ہو، نہ حالت احرام میں ہو اور نہ ہی حیض کی حالت میں ہو اور زوج بالغ مسلمان ہو۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: جب زوج ثانی نکاح صحیح کے ساتھ اس سے وطی کرے اور اس کی فرج میں حشفہ غائب کر دے تو تحقیق دونوں نے شہد چکھ لیا اور اس میں نکاح کرنے والے کا قوی اور ضعیف ہونا برابر ہے اور برابر ہے کہ وہ اسے داخل کرے اپنے ہاتھ کے ساتھ یا عورت کے ہاتھ کے ساتھ اور وہ بچہ ہو یا مراہق (قریب البلوغ) ہو یا مجبوب (مقطوع الذکر) ہو اس کا اتنا حصہ باقی ہو جسے وہ غائب کر سکتا ہو جیسا کہ غیر خصی آدمی غائب کرتا ہے اور برابر ہے کہ خاوند اس سے وطی کرے اس حال

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ

میں کہ وہ عورت احرام باندھے ہوئے ہو یا روزے دار ہو۔ یہ سب کچھ اس بنا پر ہے جو امام شافعی نے بیان کیا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، امام ثوری، اوزاعی، حسن بن صالح کا قول بھی ہے اور بعض اصحاب مالک کا قول بھی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ابن حبیب نے کہا ہے: اگر وہ اس سے شادی کرے پھر اگر وہ اسے پسند آ جائے تو وہ اسے روک لے گا ورنہ اسے حلال کرنے میں اس کے لئے اجر ہوگا تو یہ جائز نہیں۔ جب اس نے اپنے نکاح کو حلالہ کی نیت سے ملا دیا تو اب اس کے ساتھ وہ زوج اوّل کے لئے حلال نہ ہوگی۔

مسئلہ نمبر 6۔ آقا کا اپنی اس لونڈی کے ساتھ وطی کرنا جس کا خاوند اسے قطعی طلاق دے دے اسے حلال نہیں کرتا، کیونکہ وہ زوج نہیں ہے۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی عبیدہ، مسروق، شعبی، ابراہیم، جابر بن زید، سلیمان بن یسار، حماد بن ابی سلیمان اور ابوالزناد رحمۃ اللہ علیہم کا بھی قول ہے اور اسی موقف پر فقہائے امصار کی جماعت بھی ہے۔

اور عثمان، زید بن ثابت اور زبیر سے اس کے خلاف بھی روایت ہے وہ یہ کہ وہ اسے حلال کر دے گا جب اس کے آقا نے اس کے ساتھ وطی کی اور وہ اس سے نہ دھوکہ دہی کا ارادہ کرے اور نہ ہی حلالہ کا اور وہ اپنے زوج کی طرف نکاح اور مہر کے ساتھ لوٹ جائے گی۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ اور آقا اس پر ملک یمین کی حیثیت سے مسلط ہوا ہے اور یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ مؤطا امام مالک میں ہے کہ انہیں خبر پہنچی ہے کہ حضرت سعید بن مسیب اور سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہما سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنے غلام کی شادی اپنی ایک لونڈی سے کی، پھر غلام نے اسے طلاق البتۃ (قطع کرنے والی طلاق) دی، پھر آقا نے وہ لونڈی اسی غلام کو ہبہ کر دی تو کیا وہ ملک یمین کے طور پر اس کے لئے حلال ہوگی؟ تو دونوں نے کہا: وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ کسی اور خاوند سے شادی کرے (1)۔

مسئلہ نمبر 8۔ حضرت امام مالک سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جس کے نکاح میں ایک مملوکہ لونڈی تھی پھر اس نے اسے خرید لیا درآنحالیکہ اس نے اسے ایک طلاق دے رکھی تھی۔ تو انہوں نے فرمایا: وہ اس کے لئے ملک یمین کی حیثیت سے حلال ہوگی جب تک وہ اس کی طلاق کو مغلظہ نہ بنائے اور اگر اس نے اسے طلاق مغلظہ دی تو پھر وہ ملک یمین کے طور پر اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کرے (2)۔ ابو عمر نے کہا ہے: علماء کی جماعت اور ائمہ فتویٰ کا یہی موقف ہے، امام مالک، ثوری، اوزاعی، شافعی، ابوحنیفہ، احمد، اسحاق، ابوثور انہی میں سے ہیں۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عطا، طاؤس اور حسن رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں: جب اس نے اسے خرید لیا جس نے اسے طلاق البتہ دی تو وہ اس کے لئے ملک یمین کے طور پر حلال ہوگی، اس لئے کہ یہ ارشاد عام ہے: او ما ملکت ایمانکم۔

ابو عمر نے کہا ہے: اس قول میں خطا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد او ما ملکت ایمانکم کا معنی ہے مائیں اور بہنیں مباح

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 504، وزارت تعلیم
2۔ ایضاً

نہیں ہیں اور اسی طرح تمام محرمات بھی مباح نہیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 9۔ جب مسلمان نے اپنی ذمیہ بیوی کو تین طلاقیں دے دیں پھر ایک ذمی نے اس کے ساتھ نکاح کیا اور اس کے ساتھ دخول بھی کیا اور پھر اسے طلاق دے دی تو ایک گروہ نے کہا کہ وہ ذمی اس کے لئے زوج ہے، لہٰذا اب اس کے لئے زوج اوّل کی طرف لوٹنا جائز ہے۔ اسی طرح حسن، زہری، سفیان ثوری، شافعی، ابوعبید اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: اسی طرح ہم بھی کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: **حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ** اور نصرانی بھی زوج ہے اور مالک اور ربیعہ نے کہا ہے: وہ اسے حلال نہیں کر سکتا۔

مسئلہ نمبر 10۔ جمہور علماء کا موقف ہے کہ نکاح فاسد تین طلاقوں والی عورت کو حلال نہیں کر سکتا۔ امام مالک، ثوری، امام شافعی، اوزاعی، اصحاب الرائے، امام احمد، اسحاق اور ابوعبید تمام یہ کہتے ہیں کہ وہ نکاح صحیح کے بغیر زوج اوّل کے لئے حلال نہیں ہو سکتی۔ اور حکم کہتے ہیں کہ وہ زوج ہے اور ابن منذر نے کہا ہے: وہ زوج نہیں ہے کیونکہ ظہار، ایلاء اور لعان میں ازواج کے احکام ان دونوں کے درمیان ثابت نہیں ہیں اور اہل علم میں سے جن سے کچھ یاد رکھا جا سکتا ہے ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ عورت نے جب زوج اوّل کو کہا: میں نے شادی کی ہے اور میرے خاوند نے مجھ سے دخول کیا ہے اور زوج اوّل نے اس کی تصدیق کر دی تو وہ اس کے لئے حلال ہو جائے گی۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: احتیاط اس میں ہے کہ وہ اس کی تصدیق نہ کرے جب اس کے دل میں اس کے جھوٹا ہونے کا خیال واقع ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 11۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس باب میں انتہائی شدت اور تغلیظ مروی ہے اور آپ کا ارشاد ہے: میرے پاس جو حلالہ نکالنے والا اور جس کے لئے حلالہ نکالا گیا لایا گیا تو میں یقیناً ان دونوں کو رجم کر دوں گا (1)۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حلالہ نکالنا تو زنا ہے وہ مسلسل زنا ہی کرتے رہیں گے اگرچہ وہ بیس برس تک بھی اس پر قائم رہیں۔

ابوعمر نے کہا ہے: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول فقط تغلیظ کا احتمال رکھتا ہے، کیونکہ آپ سے یہ صحیح روایت ہے کہ آپ نے حرام فرج میں وطی کرنے والے سے حد کو اٹھا لیا درآنحالیکہ وہ اس کی تحریم سے جاہل تھا اور آپ نے جہالت کے سبب اسے معذور قرار دیا۔ پس اس بارے میں تاویل اولیٰ اور بہتر ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس پر رجم نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: **فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یُبَیِّنُهَا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ۝**

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: **فَاِنْ طَلَّقَهَا** اس میں مراد زوج ثانی ہے (یعنی اگر زوج ثانی اسے طلاق دے دے) **فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ** اس میں **هما** تثنیہ ضمیر سے مراد عورت اور زوج اوّل ہے (تو ان دونوں پر کوئی حرج نہیں)۔ یہ حضرت ابن

1۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 211، دار الکتب العلمیہ

عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے (1)۔

ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ آزاد آدمی جب اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے پھر اس کی عدت گزر جائے اور وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے اور وہ اس سے مجامعت کرے پھر اسے فارغ کر دے اور اس کی عدت بھی گزر جائے، پھر وہ پہلے خاوند سے نکاح کرے تو وہ اس کے پاس تین طلاقوں کے حق کے ساتھ رہے گی (یعنی زوج اول کو ازسرنو تین طلاقوں کا اختیار حاصل ہوگا)۔

اور ایسے آدمی کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جو اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دیتا ہے پھر وہ کسی دوسرے سے شادی کرتی ہے، پھر اس سے پہلے خاوند کی طرف لوٹ کر آتی ہے تو اس کے بارے ایک گروہ نے کہا ہے: وہ اس کے پاس اپنی مابقی طلاقوں کے حق کے ساتھ رہے گی (چاہے مابقی ایک ہو یا دو)۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکابر اصحاب نے کہا ہے: ان میں حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابی بن کعب، حضرت عمران ابن حصین اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں اور اسی طرح حضرت زید بن ثابت، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبد اللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہم سے روایت کیا جاتا ہے اور یہی قول حضرت عبیدہ السلمانی، حضرت سعید بن مسیب، حضرت حسن بصری، حضرت مالک، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابن ابی لیلیٰ، حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق، حضرت ابو عبیدہ، حضرت ابو ثور، حضرت محمد بن حسن اور حضرت ابن نصر رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور اس میں دوسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ یہ نکاح بھی جدید ہے اور طلاق بھی جدید ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے اور اسی طرح حضرات عطا، نخعی، شریح، نعمان اور یعقوب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ ابو معاویہ اور وکیع نے اعمش سے اور انہوں نے ابراہیم سے ہمیں بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبد اللہ کے اصحاب کہتے ہیں: کیا زوج ثانی تین طلاقوں کو تو گرا دیتا ہے اور وہ ایک اور دو طلاقوں کو نہیں گراتا فرمایا: ہمیں حفص نے حجاج سے، انہوں نے طلحہ سے اور انہوں نے ابراہیم سے ہمیں بیان کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب کہا کرتے تھے: زوج ثانی ایک اور دو طلاقوں کو اسی طرح گرا دیتا ہے جیسے وہ تین طلاقوں کو گرا دیتا ہے سوائے عبیدہ کے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: یہ عورت اس کے پاس اپنی مابقی طلاقوں کے ساتھ رہے گی (2)۔ اسے ابو عمر نے ذکر کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: میں قول اوّل کے مطابق کہتا ہوں۔

اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ دخول کیا ہے تو طلاق بھی جدید ہے اور نکاح بھی جدید ہے اور اگر اس کے ساتھ دخول نہیں ہوا تو پھر وہ اپنی مابقی طلاقوں پر ہوگی۔ یہ ابراہیم نخعی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ یہ شرط ہے۔ طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر دونوں کو گمان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ

2۔ الکتاب المصنف لابن ابی شیبہ، باب من قال عندہ، جلد 4، صفحہ 113، مکتبۃ الزمان للثقافۃ والعلوم، المدینۃ المنورہ

ہو کہ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے ساتھ حسن معاشرت اختیار کر سکے گا۔

اور کہا گیا ہے کہ حُدُوْدَ اللّٰہِ سے مراد اس کے فرائض ہیں، یعنی جب دونوں کو علم ہو کہ ان کے درمیان دوسرے نکاح کے سبب صلح اور بہتری ہوگی اور جب خاوند کو علم ہو کہ وہ اپنی بیوی کے نفقہ یا اس کے مہر یا اس کے وہ حقوق جو اس پر واجب ہیں ان میں سے کسی شے سے وہ عاجز ہے تو اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس سے شادی کرے یہاں تک کہ وہ اسے واضح طور پر بتا دے یا وہ اپنے بارے میں عورت کے حقوق کی ادائیگی پر قدرت کے بارے جانتا ہو اور اسی طرح اگر اسے کوئی ایسی بیماری ہو جو اسے استمتاع سے روکتی ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے بیان کر دے تاکہ وہ اپنی جانب سے عورت کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اور اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اسے نسب کے بارے دھوکے میں مبتلا کرے جس کا وہ دعویٰ کرتا ہے اور اس کے پاس نہ مال ہو اور نہ ہی کوئی قابل ذکر کاروبار اور اس میں جھوٹ بولنے والا ہو۔ اسی طرح عورت پر بھی لازم ہے کہ جب وہ اپنی ذات میں خاوند کے حقوق کی ادائیگی سے عجز کے بارے جانتی ہو یا اسے کوئی ایسی بیماری ہو جو استمتاع سے مانع ہو مثلاً جنون، جذام، برص یا فرج میں کوئی بیماری ہو تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ مرد کو دھوکے میں ڈالے اور اس پر لازم ہے کہ اسے جو کچھ بھی ہے وہ اس کی وضاحت کر دے، جس طرح کہ بائع پر سامان کے بارے واجب ہوتا ہے کہ اس کے سامان میں جو عیوب اور نقائص ہیں وہ انہیں بیان کر دے۔

اور جب زوجین میں سے کوئی اپنے شریک میں کوئی عیب پالے تو اس کے لئے اسے رد کر دینا جائز ہے، پس اگر عیب مرد کی جانب ہو تو عورت کے لئے کامل مہر ہوگا اگر اس کے ساتھ دخول کیا گیا ہو اور اگر اس کے ساتھ دخول نہیں ہوا تو پھر اس کے لئے نصف مہر ہوگا اور اگر عیب عورت کی جانب ہو تو خاوند اسے واپس لوٹا دے اور جو مہر اسے دیا ہے وہ اس سے لے لے اور تحقیق یہ روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی بیاضہ کی ایک عورت سے شادی کی تو آپ نے اس کے پہلو میں برص کا نشان پایا تو آپ نے اسے رد کر دیا اور فرمایا: ''تم نے مجھ پر اسے پوشیدہ رکھا ہے۔''

اور عنین کی بیوی کے بارے میں امام مالک سے روایت مختلف ہے جب اس نے اپنا آپ مرد کے حوالے کر دیا پھر مرد کے عنین ہونے کے سبب ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی گئی تو آپ نے ایک بار کہا: اس کے لئے مکمل مہر ہوگا اور ایک بار کہا: اس کے لئے نصف مہر ہوگا اور اس کا انحصار اس قول کے اختلاف پر ہے کہ وہ کس کے ساتھ مہر کی مستحق ہوگی کیا اپنے آپ کو مرد کے سپرد کرنے کے ساتھ یا دخول کے ساتھ؟ اس بارے میں بھی دو قول ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہمارے اصحاب نے اختلاف کیا ہے کہ کیا عورت کے ذمہ خدمت کرنا بھی ہے یا نہیں؟ تو ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: عورت پر خدمت کرنا لازم نہیں ہے کیونکہ یہ عقد استمتاع (لطف اندوز ہونا) کو شامل ہے نہ کہ خدمت کو۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ یہ عقد اجارہ نہیں ہے اور نہ ہی اس سے ملک رقبہ حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ تو فقط استمتاع پر عقد ہے اور عقد کے ذریعہ صرف استمتاع کا مستحق بنا جاتا ہے نہ کہ اس کے سوا کسی اور کا، لہٰذا اس سے زیادہ کا عورت سے مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیا آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف دیکھتے نہیں: فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ

سَبِیۡلًا۔ (النساء:34)۔

اور ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: اس پر اس کی حیثیت کے مطابق خدمت ہے، پس اگر وہ عورت شریفۃ المحل ہے اس کے والدین دولتمند اور خوشحال ہیں تو اس پر گھر کی تدبیر اور خادم کا معاملہ ہوگا اور اگر وہ متوسط الحال ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ بستر وغیرہ بچھائے اور اسی طرح کے دیگر کام۔ اور اگر وہ اس درجہ سے بھی کم ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ گھر میں جھاڑو دے اور کھانا وغیرہ پکائے اور کپڑے وغیرہ دھوئے۔ اور اگر وہ کرد اور دیلم کی عورتوں میں سے ہو اور ان کے علاقے میں پہاڑ ہوں تو وہ عورت بھی اس کام کی پابند ہوگی جس کی ان کی عورتیں پابند ہوتی ہیں اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ لَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِیۡ عَلَیۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ (البقرہ:228)

اور مسلمانوں کا عرف اور رواج ان کے شہروں میں قدیم وجدید دور سے اس کے بارے جاری ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور آپ کے صحابہ کرام کی بیویاں آٹا پیسنے، روٹیاں پکانے، ہانڈی تیار کرنے، بستر بچھانے، کھانا پیش کرنے اور اسی طرح کے دیگر کاموں کی پابند ہوتی تھیں اور ہم تو کسی عورت کو نہیں جانتے جس نے اس سے انکار کیا ہو اور نہ ہی اس کا انکار کرنا جائز ہوتا ہے بلکہ وہ تو اپنی عورتوں کو سزا دیتے تھے جب وہ کاموں میں کوتاہی اور سستی کرتیں اور وہ ان سے خدمت لیتے تھے اور اگر یہ لازم اور ضروری نہ ہوتی تو وہ ان سے اس کا مطالبہ نہ کرتے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ یُبَیِّنُهَا لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ۔ حُدُوۡدُ اللّٰهِ، وہ ہیں جن سے روکا گیا ہو اور حد فواحش کے ارتکاب کی جرأت کرنے سے مانع ہوتی ہے اور احدت المرأۃ اس کا معنی ہے عورت زینت سے باز آگئی اور رَجُلٌ محدودٌ وہ آدمی جسے خیر سے روک دیا جائے اور البواب حداد یعنی دربان روکنے والا ہے اور یہ مکمل بحث پہلے ہو چکی ہے۔

اور فرمایا: لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ کیونکہ جاہل جب اس کے لئے امر اور نہی زیادہ ہو جائیں تو وہ نہ اسے یاد رکھتا ہے اور نہ اس کی پاسداری کرتا ہے اور عالم اسے یاد بھی رکھتا ہے اور اس کی پاسداری بھی کرتا ہے پس اسی وجہ سے اس نے علماء کو خطاب کیا ہے اور جاہلوں کو خطاب نہیں کیا۔

وَ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ ۪ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَیۡكُمۡ وَمَاۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَالۡحِكۡمَةِ یَعِظُكُمۡ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۳۱﴾

"اور جب تم طلاق دے دو عورتوں کو اور وہ پوری کر لیں اپنی عدت پس یا تو روک لو انہیں بھلائی کے ساتھ یا چھوڑ دو انہیں بھلائی کے ساتھ اور نہ روکو انہیں تکلیف دینے کی غرض سے تاکہ زیادتی کرو اور جو کوئی کرے گا اس طرح تو وہ ظلم کرے گا اپنی ہی جان پر اور نہ بنالو اللہ کی آیتوں کو مذاق اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے اور (یاد

کرو) جو اس نے نازل فرمایا تم پر قرآن اور حکمت وہ نصیحت فرماتا ہے تمہیں اس سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔"

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ اس میں بلغن کا معنی قاربن ہے (یعنی جب وہ اپنی عدت پوری کرنے کے قریب ہو جائیں) اس پر علماء کا اجماع ہے، کیونکہ معنی اس کا محتاج ہے کیونکہ عدت مکمل ہونے کے بعد اسے روکنے کا کوئی اختیار نہیں ہے (1) اور اس کے بعد والی آیت میں یہ لفظ انتہا کو پہنچنے کے معنی میں ہے، کیونکہ وہاں معنی اس کا تقاضا کرتا ہے۔ پس یہ لفظ دوسری آیت میں حقیقت ہے اور پہلی میں مجاز ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ، امساک بالمعروف کا معنی ان حقوق کے ساتھ قیام ہے جو عورت کی جانب سے مرد پر واجب ہوتے ہیں۔ اسی لئے علماء کی جماعت نے کہا ہے: بے شک امساک بالمعروف میں سے ہے کہ خاوند جب وہ مال نہ پائے جسے وہ بیوی پر خرچ کرے گا تو وہ اسے طلاق دے دے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ معروف کی حد سے خارج ہو گیا۔ پھر اس کی جگہ حاکم طلاق دے دے گا اس ضرر اور اذیت کی وجہ سے جو عورت کو ایسی حالت میں اس کے پاس رہنے سے لاحق ہو رہی ہے جس میں وہ اس کے نفقہ پر قادر نہیں۔ اور بھوک ایسی شے ہے جس پر صبر نہیں۔ اسی طرح امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابو ثور، ابو عبید، یحییٰ القطان اور عبد الرحمن ابن مہدی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور صحابہ کرام میں سے حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے اور تابعین میں سے حضرت سعید بن مسیب نے یہی کہا ہے اور کہا ہے: بے شک یہی سنت ہے اور اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے اور ایک گروہ نے کہا ہے: ان کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی اور اس پر صبر کرنا عورت کے ذمہ لازم ہوگا اور حاکم کے حکم کے مطابق نفقہ مرد کے ذمہ پڑے گا۔ یہ قول حضرت عطا اور زہری رضی اللہ عنہما کا ہے اور علماء کوفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ (البقرہ: 280) اور فرمایا: وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآىِٕكُمْ الآیہ (النور: 32)۔

پس اللہ تعالیٰ نے فقیر کے نکاح کرنے کو مستحب قرار دیا ہے تو معلوم ہوا کہ فقر و افلاس کا سبب فرقت ہونا جائز نہیں اور اس کا اس کے باوجود نکاح کرنا مستحب ہے۔

اور یہ بھی کہ زوجین کے درمیان نکاح اجماع کے ساتھ منعقد ہوا ہے لہٰذا ان کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی مگر اس کی مثل اجماع کے ساتھ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایسی سنت کے ساتھ جس کے معارض کوئی روایت نہ ہو۔

اور پہلے قول کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ ارشاد ہے جو صحیح بخاری میں ہے: "عورت کہے گی یا مجھے کھانا مہیا کر اور یا مجھے طلاق دے دے۔ (2)" اور یہ محل خلاف میں نص ہے اور ہمارے نزدیک تنگدستی کے سبب ہونے والی فرقت طلاق

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 806، وزارت تعلیم

رجعی ہے، بخلاف امام شافعی کے کہ ان کا کہنا ہے: وہ طلاق بائنہ ہے کیونکہ یہ بنا کے بعد فرقت ہوئی ہے اس کے ساتھ طلاق کا عدد مکمل نہیں ہوا اور نہ یہ کسی عوض کے لئے اور نہ ہی اس کا سبب خاوند کی جانب سے ضرر ہے، پس یہ رجعیہ ہوگی۔ اس کی اصل مولی (ایلاء کرنے والا) کی طلاق ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ یعنی یا تم انہیں طلاق دے دو، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا امام مالک نے ثور بن زید الدیلی سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے پھر اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اسے اس کی حاجت اور ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اسے اپنے پاس روکنے کا ارادہ رکھتا ہے اور (صرف اس لئے) تاکہ وہ اس طرح اس پر عدت کو طویل کر دے اور اسے ضرر اور اذیت پہنچائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ انہیں نصیحت کر رہا ہے (1) اور زجاج نے کہا ہے: فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ، یعنی اس نے اپنے آپ کو عذاب کے لئے پیش کیا، کیونکہ جس کام سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اسے کرنا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے لئے پیش کرنا ہی ہے۔ اور یہ خبر اس خبر کے موافق ہے جو طلاق اور رجوع کو ترک کرنے کے بارے میں نازل ہوئی جس طریقہ پر اہل جاہلیت تھے، جیسا کہ اس کا بیان اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کے تحت گزر چکا ہے۔ پس ان دونوں خبروں نے ہمیں یہ فائدہ دیا ہے کہ مذکورہ دونوں آیتوں کا نزول قریب قریب ایک ہی معنی میں ہے اور وہ مرد کا عورت کو ضرر اور اذیت پہنچانے کے ارادہ سے اسے اپنے پاس روکنا اور اس کی طرف رجوع کرنا ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا۔ اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کے احکام کو مذاق کے طریقہ پر نہ لو، کیونکہ یہ تمام کے تمام سنجیدہ ہیں۔ پس جس نے ان میں مذاق کیا تو یہ اسے لازم ہو جائیں گے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: دور جاہلیت میں ایک آدمی طلاق دیتا ہے اور کہتا ہے: بلاشبہ میں نے طلاق دی ہے اور مذاق کر رہا ہوں اور وہ غلام کو آزاد کرتا اور کسی سے اپنا نکاح کرتا اور یہ کہتا: میں نے استہزا کیا ہے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی (2) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''جس نے طلاق دی یا جس نے کسی کو آزاد کیا یا اپنا نکاح کیا یا کسی کا نکاح کیا اور پھر یہ گمان کیا کہ وہ مذاق کر رہا ہے تو وہ سنجیدہ شمار ہوگا (3)'' (یعنی یہ تمام احکام نافذ ہو جائیں گے) اسے معمر نے روایت کیا ہے کہا ہے: ہمیں عیسیٰ بن یونس نے عمرو سے، انہوں نے حسن سے اور انہوں نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے اور اسی کے معنی میں اسے ذکر کیا ہے اور موطا امام مالک میں ہے کہ ان کے پاس یہ خبر پہنچی کہ کسی آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: میں نے اپنی بیوی کو سو بار طلاق دی ہے، آپ میرے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اسے تیری جانب سے تین طلاقیں واقع ہوئیں اور ستانوے طلاقوں کے ساتھ تو نے اللہ تعالیٰ کی آیت کے ساتھ استہزا کیا ہے (4)۔

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 576، دار احیاء التراث العربیۃ　2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 399، دار الکتب العربیۃ
3۔ مجمع الزوائد، باب فمن نکح او اعتق او طلق لاعبا، جلد 4، صفحہ 529، دار الفکر　4۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 510، وزارت تعلیم

اور دار قطنی نے اسماعیل بن امیہ القرشی کی حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی آدمی کو سنا کہ اس نے طلاق البتہ دی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض ہوئے اور فرمایا: ''تم اللہ تعالیٰ کی آیات کو یا اللہ تعالیٰ کے دین کو تمسخر اور مذاق کے طور پر لیتے ہو، جس نے طلاق البتہ دی ہم نے اس کے لئے تین طلاقیں لازم کر دیں اور وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کر لے۔'' اس میں راوی اسماعیل بن امیہ کوفی ہے اور ضعیف الحدیث ہے۔(1)

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ آدمی جو اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے پھر کہتا ہے: قسم بخدا! نہ میں تجھے وارث بناؤں گا اور نہ میں تجھے چھوڑوں گا'' عورت نے کہا: وہ کیسے ہوگا؟ اس نے کہا: جب تیری عدت گزرنے کے قریب ہو گی تو میں تیری طرف رجوع کر لوں گا، تب یہ آیت نازل ہوئی (2): وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا الآیۃ۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: تمام اقوال آیت کے معنی میں داخل ہیں کیونکہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ تمسخر کرے اسے ہی کہا جائے گا: اتخذھا ھزوا۔ اس نے اسے مذاق کے ساتھ لیا ہے اور اسے بھی کہا جائے گا جس نے اس (آیت) کے ساتھ کفر کیا اور اسے بھی کہا جائے گا جس نے اسے پرے پھینک دیا اور اسے نہ لیا اور عمل اس کے خلاف کیا، سو اس بنا پر یہ تمام اقوال آیت میں داخل ہیں اور آیات اللہ سے مراد اس کے دلائل، اس کا امر اور اس کی نہی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے مذاق کے طور پر طلاق دی تو وہ طلاق اسے واقع ہو جائے گی اور اس کے سوا میں اختلاف ہے۔ اس کا بیان سورۂ براءت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تین کام ہیں کہ ان میں سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور ان میں مذاق بھی سنجیدگی ہے (اور وہ ہیں) نکاح، طلاق اور رجعت۔''(3)

اور حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ ان تمام نے کہا: تین فعل ہیں جن میں کوئی مذاق اور استہزاء نہیں اور ان میں مذاق کرنے والا بھی سنجیدہ شمار ہوتا ہے اور وہ نکاح، طلاق اور عتاق ہیں۔(4)

اور کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ترک نہ کرو کہ تم کوتاہی کرنے والے اور مذاق کرنے والے ہو جاؤ۔ اور اس آیت میں گناہ سے قولاً استغفار کرنا بھی داخل ہے جبکہ فعلاً اس پر اصرار ہو اور اسی طرح ہر وہ عمل جو اس معنی میں ہو پس اس کے بارے آگاہ رہ۔

1۔ دار قطنی، کتاب الطلاق والخلع والایلاء، جلد 4، صفحہ 20، دار المحاسن قاہرہ

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء فی طلاق المعتوہ حدیث نمبر 1113، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب فی الطلاق علی الھزل، حدیث نمبر 1875، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، ابن ماجہ، باب من طلق الخ، حدیث نمبر 2028، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، جلد 7، صفحہ 341، دار الفکر

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ، یعنی اسلام اور احکام کے بیان (کے ساتھ تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اسے یاد کرو۔) وَالْحِكْمَةِ اس سے مراد سنت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مقدس سے اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی مراد اور مقصود کو بیان کرتی ہے جس کے بارے میں کتاب اللہ میں بیان اور وضاحت نہ ہو (1)۔ يَعِظُكُمْ بِهٖ یعنی وہ تمہیں ڈراتا ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٢﴾

''اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پوری کر چکیں اپنی عدت تو نہ منع کرو انہیں کہ نکاح کر لیں اپنے خاوندوں سے جب کہ رضامند ہو جائیں آپس میں مناسب طریقہ سے۔ یہ فرمان الٰہی (ہے) نصیحت کی جاتی ہے اس کے ذریعے اس کو جو تم سے یقین رکھتا ہو اللہ پر اور قیامت پر، یہ بہت پاکیزہ ہے تمہارے لئے اور بہت صاف اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ روایت ہے کہ حضرت معقل بن یسار کی بہن ابو البداح کے نکاح میں تھی تو اس نے اسے طلاق دی اور اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی، پھر وہ نادم ہوا تو اسے پیغام نکاح بھیجا سو وہ راضی ہو گئی اور اس کے بھائی نے انکار کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے اور کہا: میرا چہرہ تیرے لئے حرام ہے اگر تو اس سے شادی کرے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت مقاتل نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معقل کو بلایا اور فرمایا: ''اگر تو مومن ہے تو اپنی بہن کو ابو البداح سے نہ روک۔'' تو معقل نے عرض کی: امنت باللّٰہ اور بہن کی شادی اس سے کر دی (2)۔

اور امام بخاری نے حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن کو اس کے خاوند نے طلاق دی یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی پھر اس نے اسے پیغام نکاح بھیجا تو حضرت معقل نے انکار کر دیا، پس یہ آیت نازل ہوئی (3): فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ۔

اور اسے دارقطنی نے بھی حسن سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے: میری ایک بہن تھی میرے پاس اس کے لئے پیغام نکاح آتے تھے اور میں اس سے لوگوں کو روکتا رہتا تھا، پھر میرے چچا کا بیٹا میرے پاس آیا اور اس نے اس کے ساتھ نکاح کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اس کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا، پھر جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ دونوں ایک ساتھ رہے پھر اس نے اسے طلاق رجعی دے دی پھر اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس کی عدت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 310، دار الکتب العلمیۃ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 803، وزارت تعلیم　　2۔ ایضاً

گزر گئی، پھر اس نے دیگر لوگوں کے ساتھ اسے پیغام نکاح دیا تو میں نے کہا: میں نے اس کے بارے لوگوں سے انکار کیا اور میں نے تیرے ساتھ اس کی شادی کر دی پھر تو نے اسے طلاق دی جس میں رجعت کا حق تھا پھر تو نے اسے چھوڑے رکھا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی اور جب میرے پاس پیغام نکاح آئے تو تو بھی دیگر خواہش رکھنے والے لوگوں کے ساتھ میرے پاس نکاح کی خواہش لے کر آیا میں تیرے ساتھ کبھی شادی نہ کروں گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، یا فرمایا: یہ آیت نازل کی گئی: وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ۔ پس میں نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا اور میں نے اس کا نکاح اس سے کر دیا(1)۔

بخاری کی روایت میں ہے: پس حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے اس سے ابھی تک نفرت کی اور کہا: اس نے اسے چھوڑ دیا ہے حالانکہ وہ اس پر قدرت رکھتا تھا پھر وہ اس کے ساتھ نکاح کی خواہش کر رہا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بلایا اور یہ آیت پڑھ کر سنائی پھر حضرت معقل نے حمیت کو چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت و پیروی کی (2)۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ معقل بن سنان (یعنی نون کے ساتھ) ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں معقل بن یسار یا سنان سے روایت کیا ہے اور امام طحاوی نے فرمایا ہے کہ وہ معقل بن سنان ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب یہ ثابت ہو چکا تو پھر اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ بغیر ولی کے نکاح جائز نہیں ہوتا کیونکہ حضرت معقل رضی اللہ عنہ کی بہن ثیبہ تھی۔ اگر ولی کے بغیر اختیار اس کے پاس ہوتا تو وہ اپنی شادی کر لیتی اور وہ اپنے ولی معقل کی محتاج نہ ہوتی۔ پس معلوم ہوا کہ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ میں خطاب اولیاء کو ہے اور شادی کے بارے میں اختیار انہیں کے پاس ہے کہ وہ ان کی رضامندی کے ساتھ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں خطاب ازواج کو ہے اور وہ اس طرح کہ غیر کے نکاح سے روکتے ہوئے اس کا رجوع کر لینا عورت پر عدت کے طویل ہونے کے سبب اذیت ناک اور ضرر رساں ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ عورت اپنی شادی خود کر سکتی ہے۔ انہوں نے کہا: کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت عورت کی طرف کی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ اور ولی کا ذکر نہیں کیا ہے اور اس مسئلہ میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے جو کہ اس کے سبب نزول کے بارے ہم نے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ اس مقام پر بلوغ الاجل سے مراد انتہا کو پہنچنا ہے کیونکہ نکاح کی ابتدا کا تصور عدت گزرنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے اور تَعْضُلُوْهُنَّ کا معنی ہے تحبسوھن (یعنی جب وہ اپنی عدت کی انتہا کو پہنچ جائیں تو تم انہیں نہ روکو۔)

اور خلیل نے بیان کیا ہے: دجاجۃ معقل جب مرغی اپنا انڈا روک لے (تب یہ کہا جاتا ہے)۔

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 3، صفحہ 224، دار المحاسن
2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 803، وزارت تعلیم

اور کہا گیا ہے کہ العضل کا معنی التضییق والمنع ہے یعنی تنگ کرنا اور روکنا اور یہ حبس کے معنی کی طرف ہی راجع ہے۔ کہا جاتا ہے: اردت امرا فعضلتنی عنہ یعنی میں نے کام کا ارادہ کیا اور تو نے مجھے اس سے روک دیا اور مجھ پر اسے تنگ اور مشکل کر دیا۔ اور اعضل الامر کہا جاتا ہے جب تجھ پر کام کے ذرائع تنگ ہو جائیں۔ اسی سے ان کا یہ قول بھی ہے: انہ لعضلة من العضل جب وہ کام میں کسی قسم کے حیلہ اور ذریعہ پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

اور الازہری نے کہا ہے: عضل کی اصل ان کے اس قول سے ہے: عضلت الناقة (1) (یہ تب کہا جاتا ہے) جب اونٹنی کا بچہ پھنس جائے اور اس کا نکلنا آسان نہ ہو اور عضلت الدجاجة، جب اس کا انڈا پھنس جائے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے معضلة ولا اباحسن یعنی مسئلہ مشکل ہے اور اس کے مخارج بہت تنگ ہیں اور حضرت طاؤس نے کہا ہے: تحقیق مشکل ترین فیصلے لائے گئے اور سوائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کوئی ان پر قائم نہ رہا۔ لقد وردت عُضَل اقضية ما قام بها الا ابن عباس اور عربوں کے نزدیک ہر مشکل معضل ہے اور اسی سے امام شافعی کا قول ہے:

اذا المعضِلاتُ تصدّینني كشفتُ حقائقَها بالنظر

جب مشکلات مجھے چیلنج کرتی ہیں تو میں ان کے حقائق کو نظر و فکر سے کھول دیتا ہوں

اور کہا جاتا ہے: اعضل الأمر جب معاملہ بہت سخت ہو جائے اور داء عُضال یعنی شدید بیماری جس کا درست ہونا مشکل ہے اور وہ طبیبوں کو تھکا دے اور عضل فلان ایمه یعنی فلاں نے اپنی مطلقہ منع کیا۔ یعضُلُها و یَعْضِلُها یعنی ضمہ اور کسرہ دونوں لغتیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ اس میں ذلکم نہیں کہا کیونکہ یہ جمع کے معنی پر محمول ہے اور اگر ذلکم ہوتا تو بھی جائز ہوتا۔ مثلاً ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تمہارے لئے اس میں صلاح اور خیر نہیں ہے۔ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اور تم اسے نہیں جانتے ہو۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

''اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو پورا کرنا چاہتا ہے دودھ کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 310، دار الکتب العلمیہ

مدت۔ اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے کھانا ان ماؤں کا اور ان کا لباس مناسب طریقہ سے۔ تکلیف نہیں دی جاتی کسی شخص کو مگر اس کی حیثیت کے مطابق۔ نہ ضرر پہنچایا جائے کسی ماں کو اس کے لڑکے کے باعث اور نہ کسی باپ کو (ضرر پہنچایا جائے) اس کے لڑکے کے باعث اور وارث پر بھی اسی قسم کی ذمہ داری ہے۔ پس اگر دونوں ارادہ کرلیں دودھ چھڑانے کا اپنی مرضی اور مشورہ سے تو کوئی گناہ نہیں دونوں پر اور اگر تم چاہو تو دودھ پلواؤ (دایہ سے) اپنی اولاد کو، پھر کوئی گناہ نہیں تم پر جبکہ تم ادا کردو جو دینا ٹھہرایا تھا تم نے مناسب طریقہ سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور (خوب) جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کررہے ہو اسے دیکھنے والا ہے۔"

اس میں اٹھارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالْوَالِدٰتُ یہ مبتدا ہے۔ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ یہ محل خبر میں ہے۔ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ یہ ظرف زمان ہے جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نکاح اور طلاق کا ذکر کرچکا تو پھر اس نے اولاد کا ذکر کیا کیونکہ کبھی زوجین آپس میں جدا ہوتے ہیں اور ان کے پاس بچہ ہوتا ہے۔ پس تب یہ آیت ان مطلقہ عورتوں کے بارے میں ہے جن کی ان کے خاوندوں سے اولاد ہو۔ سدی اور ضحاک وغیرہ نے یہی کہا ہے (1)۔ یعنی وہ خود اجنبی عورتوں کی نسبت اپنی اولاد کو دودھ پلانے کا زیادہ حق رکھتی ہیں کیونکہ وہ زیادہ شفیق اور زیادہ نرم ہیں اور صغیر بچے کو چھین لینا بچے اور اس کی ماں دونوں کے لئے تکلیف دہ اور ضرر رساں ہے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بچے کو اگر دودھ چھڑا دیا جائے تو ماں ہی زیادہ شفیق اور مہربان ہونے کی وجہ سے اس کی پرورش کا زیادہ حق رکھتی ہے اور وہی پرورش کی زیادہ حقدار ہوتی ہے جب تک وہ شادی نہ کرے جیسا کہ آگے آرہا ہے اور اس پر یہ قول اشکال پیدا کرتا ہے: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ کیونکہ مطلقہ عورت تو لباس کی مستحق نہیں ہوتی جب طلاق رجعی نہ ہو بلکہ وہ اجرت کی مستحق ہوتی ہے مگر یہ کہ اسے مکارم اخلاق پر محمول کیا جائے اور کہا جائے: اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ اجرت اس سے کم نہ ہو جو اس کی خوراک اور لباس کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ آیت عام ہے ان مطلقات کے بارے میں بھی جن کی اولاد ہو اور بیویوں کے بارے میں بھی (یعنی تمام کو شامل ہے) اور اظہر یہی ہے کہ یہ آیت ان بیویوں کے بارے میں ہے جن کا نکاح ابھی باقی ہو، کیونکہ وہ نفقہ اور لباس دونوں کی مستحق ہوتی ہیں اور زوجہ نفقہ اور لباس کی مستحق ہوتی ہے چاہے وہ دودھ پلائے یا نہ پلائے، نفقہ اور لباس دونوں تمکین (قدرت) کے مقابلے میں ہیں۔ اور جب وہ دودھ پلانے میں مشغول ہو جائے گی تو قدرت کامل نہ رہے گی اور کبھی یہ وہم کیا جاتا ہے کہ نفقہ ساقط ہو جاتا ہے، پس اس وہم کو اس ارشاد کے ساتھ زائل کردیا: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ مراد زوج (بچے کا باپ) ہے رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ یعنی دودھ پلانے کی حالت میں (ان کا نفقہ اور لباس زوج پر ہے۔) کیونکہ یہ زوج کے مصالح اور منافع میں مشغول ہونا ہے تو یہ اسی طرح ہو گیا جیسا کہ اگر وہ خاوند کے کام کی غرض سے اس کی اجازت کے ساتھ سفر پر چلی جائے تو نفقہ ساقط نہیں ہوتا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 311، دار الکتب العلمیہ

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: یُرْضِعْنَ یہ خبر ہے۔ اس کا معنی ہے کہ یہ امر بعض والدات کے لئے وجوب کے معنی پر ہے اور بعض کے لئے مستحب کے معنی پر (1)، جیسا کہ آگے آ رہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس کے مشروع ہونے کی خبر ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور دودھ پلانے کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ کیا یہ ماں کا حق ہے یا یہ اس پر لازم ہے لفظ دونوں کا احتمال رکھتا ہے کیونکہ اگر ماں پر اس کے لازم ہونے کی تصریح مراد ہوتی تو اللہ تعالیٰ فرماتا: وعلی الوالدات رضاع اولادھن (ماؤں پر اپنی اولاد کو دودھ پلانا لازم ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ لیکن یہ اس پر زوجیت کی حالت میں ہے اور یہی عرف ہے جس سے لازم آتا ہے کہ یہ شرط کی طرح ہو گیا ہے (2) مگر یہ کہ وہ شریف اور خوشحال ہو تو اس کا عرف یہ ہے کہ وہ دودھ نہ پلائے اور یہ شرط کی طرح ہے اور اس پر دودھ پلانا واجب ہے اگر بچہ کسی غیر کو قبول نہ کرے، تو دودھ پلانا اس پر واجب ہے اس کے اختصاص کی وجہ سے بشرطیکہ اور معدوم ہو۔ اور اگر باپ فوت ہو جائے اور بچے کا کوئی مال نہ ہو تو المدونہ میں امام مالک کا یہ مذہب بیان ہوا ہے کہ دودھ پلانا ماں کے لئے لازم ہے بخلاف نفقہ کے اور ابن الجلاب کی کتاب میں ہے: اسے دودھ پلانے کا انتظام کرنا بیت المال کے ذمہ ہوگا۔

اور عبدالوہاب نے کہا ہے: وہ (بچہ) بھی مسلمان فقراء میں سے ایک فقیر ہے۔

اور رہی وہ عورت جسے طلاق بائن دی گئی ہو تو اس پر رضاع نہیں ہے، بلکہ رضاع خاوند پر لازم ہے مگر یہ کہ وہ عورت چاہے تو اجرت مثل کے عوض یہ زیادہ حقدار ہوگی اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ خاوند خوشحال ہو اور اگر وہ تنگ دست ہو تو پھر اس مطلقہ عورت کے لئے دودھ پلانا لازم نہیں مگر یہ کہ بچہ اس کے سوا کسی کو قبول نہ کرتا ہو تو اس وقت اسے دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا اور وہ تمام جو دودھ پلانا اس پر لازم کرتے ہیں (ان کا موقف ہے) کہ اگر اسے کوئی عذر لاحق ہو جائے جو اسے دودھ پلانے سے مانع ہو تو دودھ پلانے کا امر باپ کی طرف لوٹ آئے گا۔

اور امام مالک سے مروی ہے کہ باپ جب مفلس ہو اور بچے کا کوئی مال نہ ہو تو دودھ پلانا ماں پر لازم ہے (3) اور اگر اس کا دودھ نہ ہو لیکن اس کے پاس مال ہو تو پھر اپنے مال سے دودھ پلانے کا انتظام کرنا اس پر لازم ہوگا۔

امام شافعی نے فرمایا: دودھ پلانے کا اہتمام لازم نہیں ہوتا مگر باپ پر یا دادا پر اور جو بھی اس سے اوپر ہوں اس بارے میں علماء کا نظریہ اس ارشاد کے تحت آئے گا وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ۔

کہا جاتا ہے: رَضِعَ یَرْضَعُ رَضَاعَۃ و رضاعا اور رَضَعَ یَرْضِعُ رِضَاعًا و رَضَاعَۃ (یعنی پہلے میں را مکسور ہے اور دوسرے میں مفتوح ہے) اور دونوں میں اسم فاعل راضع ہے اور الرضاعۃ کا معنی اللؤم (بخل کرنا) بھی ہے۔ (یہ لفظ فقط راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: حَوْلَيْنِ یعنی دو سال، یہ حال الشیء سے ماخوذ ہے جب کوئی شے پلٹ جائے، پس حول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 310، دار الکتب العلمیہ | 2۔ ایضاً | 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 311

اوّل وقت سے دوسرے کی طرف پلٹنے والا ہے اور کہا گیا ہے کہ سال کو حول اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں اغلباً امور بدل جاتے ہیں۔ کاملین یہ کامل ہونے کے لئے قید ہے کیونکہ کبھی کوئی کہنے والا کہتا ہے: اقمت عند فلان حولین اور اس سے وہ ایک سال اور دوسرے سال کا کچھ حصہ مراد لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ یعنی جو کوئی ایک دن اور دوسرے دن کے کچھ حصے میں جلدی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ اس پر دلیل ہے کہ دو سال دودھ پلانا حتمی نہیں ہے کیونکہ دو سال سے پہلے بھی دودھ چھڑانا جائز ہے۔ لیکن یہ حد اس لئے بیان کی گئی ہے تاکہ زوجین کے درمیان مدت رضاع کے بارے میں تنازع ختم ہو جائے۔ لہٰذا خاوند پر دو سال سے زیادہ عرصہ اجرت دینا واجب نہیں ہے اور اگر باپ اس مدت سے پہلے دودھ چھڑانا چاہے اور ماں اس پر راضی نہ ہو تو وہ ایسا نہیں کر سکتا اور دو سال میں زیادتی یا کمی تب ہو سکتی ہے جب بچے کے لئے اس میں کوئی نقصان نہ ہو اور والدین رضامند ہوں۔

حضرت مجاہد اور ابن محیصن نے لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ پڑھا ہے یعنی تاء کو فتحہ کے ساتھ اور الرضاعۃ کو رفع کے ساتھ۔ یعنی فعل کی نسبت اس کی طرف کی ہے۔

اور ابوحیوہ، ابن ابی عبلہ، جارود بن ابی سبرہ نے الرِّضَاعَةَ کو راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے جیسا کہ الحَضارۃ اور الحِضارۃ ہے۔

اور حضرت مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے الفعلۃ کے وزن پر الرضعۃ پڑھا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے أن یکمل الرضاعۃ (1) قراءت کی ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ بصری الرَّضَاعَةَ کو صرف راء کے فتحہ کے ساتھ اور الرضاع کو صرف راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں مثلاً القتال اور کوفی الرضاعۃ کو راء کے کسرہ کے ساتھ اور الرضاع کو راء کے فتحہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، آپ کے تابعین اور علماء کی ایک جماعت نے اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ وہ رضاعت جو حرمت میں نسب کے قائم مقام ہے وہ یہی ہے جو دو سال میں ہو، کیونکہ دو سال گزرنے کے ساتھ رضاعت کی مدت مکمل ہو گئی اور دو سال کے بعد کی رضاعت معتبر نہیں ہے (2)۔ آپ کا یہ قول مؤطا میں ہے اور یہ آپ سے محمد بن عبدالحکم کی روایت ہے اور یہی حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی حضرت زہری، قتادہ، شعبی، سفیان ثوری، اوزاعی، شافعی، احمد، اسحاق، ابو یوسف، محمد اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور ابن عبدالحکم نے آپ سے دو سال اور کچھ تھوڑے دن زیادہ کا قول روایت کیا ہے۔ عبدالملک نے کہا ہے کہ وہ مہینہ اور اس طرح کی مدت ہے۔

اور ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رضاعت کی مدت دو سال اور دو مہینے ہے (3) اور ولید بن مسلم نے آپ سے بیان کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: دو سالوں کے بعد دودھ پلانے کی جو مدت ہو گی ایک مہینہ یا دو مہینے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 311، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ المدونۃ الکبری، کتاب الرضاع، جلد 5، صفحہ 90، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

یا تین مہینے وہ دو سالوں میں ہی شمار ہوگی اور جو اس سے زائد ہوگی وہ عبث ہوگی۔

اور حضرت نعمان سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: دو سالوں کے بعد چھ ماہ تک جو مدت ہوگی وہ رضاع میں ہی شمار ہوگی۔ ان میں پہلا قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ الْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بچے نے جو دو سال کے بعد دودھ پیا ہے اس کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔

اور حضرت سفیان نے عمرو بن دینار سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا رضاع الا ما کان فی الحولین (رضاع نہیں ہے مگر وہی جو دو برس میں ہو۔) دارقطنی نے کہا ہے: اسے ابن عیینہ سے ہیثم بن جمیل کے سوا کسی نے بیان نہیں کیا ہے اور یہ ثقہ اور حافظ راوی ہے۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ یہ خبر آیت اور معنی کے ساتھ موافق ہے۔ یہ کبیر کی رضاعت کی نفی کرتی ہے اور یہ کہ اس کے لئے حرمت کا حکم ثابت نہ ہوگا۔

اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح کا قول مروی ہے اور علماء میں سے لیث بن سعد بھی یہی کہتے ہیں اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ بڑے کی رضاعت کا لحاظ رکھتے ہیں اور آپ کا اس سے رجوع بھی مروی ہے (2)۔ عنقریب سورۃ النساء میں یہ مسئلہ تفصیل سے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6۔ جمہور مفسرین نے کہا ہے: یہ دو سال ہر بچے کے لئے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ اس بچے کے بارے میں جو چھ ماہ تک پیٹ میں رہتا ہے اور اگر وہ سات ماہ تک پیٹ میں رہے تو پھر اس کی رضاعت کی مدت تیئس ماہ ہے اور اگر آٹھ مہینے رہے تو اس کی مدت رضاعت بائیس مہینے ہے اور اگر وہ نو مہینے رہے تو پھر اس کی مدت رضاعت اکیس مہینے ہے (3) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وحملہ و فصالہ ثلاثون شھراً (اس کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے) اس بنا پر مدت حمل اور مدت رضاعت دونوں ایک دوسرے میں داخل ہیں اور ایک دوسرے سے اپنا حصہ لے گئیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ یعنی باپ پر ہے اور عربی میں و علی المولود لھم کہنا جائز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: و منھم من یستمعون الیك۔ کیونکہ معنی ہے: و علی الذی ولد لہ اور اس پر جس کا بیٹا ہے اور الذی کے ساتھ واحد اور جمع دونوں کو تعبیر کیا جا سکتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ اس حکم میں رزق سے مراد وہ طعام (کھانا) ہے جو کافی ہو اور اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ بچے کا نفقہ والد پر واجب ہے، چاہے وہ کمزور اور عاجز ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے مال کے لئے مقرر فرمایا ہے کیونکہ رضاع کی صورت میں ماں کے واسطہ سے غذا بچے تک پہنچتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: وَ اِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الرضاع، جلد 4، صفحہ 174، دار المحاسن قاہرہ 2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 410، دار الکتب العربیۃ

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 311، دار الکتب العلمیہ

فَاَنۡفِقُوۡا عَلَيۡهِنَّ (الطلاق:6) (اور اگر وہ حاملہ ہوں تو تم ان پر خرچہ کرو) کیونکہ انہی کے سبب غذا پہنچتی ہے۔

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ آدمی پر اپنی اولاد میں سے ان بچوں کا نفقہ واجب ہے جن کا کوئی مال نہ ہو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہند بنت عتبہ کو فرمایا اس حال میں کہ اس نے آپ سے عرض کی تھی کہ ابوسفیان انتہائی بخیل آدمی ہے وہ مجھے اتنا نفقہ نہیں دیتا جو میرے لئے اور میرے بچوں کے لئے کافی ہو تو پھر میں اسے بتائے بغیر اس کے مال سے لے لیتی ہوں، کیا مجھ پر اس میں گناہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خذی ما یکفیك وولدك بالمعروف (1) (تو اتنا مال لے لے مناسب طریقے سے جو تیرے لئے اور تیری اولاد کے لئے کافی ہو۔)

اور الکسوۃ کا معنی لباس ہے اور قولہ بِالۡمَعۡرُوۡفِ کا معنی ہے جو عرف شرع میں بغیر افراط و تفریط کے متعارف ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نفقہ خاوند کی دولت اور اس کے منصب کے مطابق ہوگا مد یا کسی اور پیمانے کے ساتھ اندازے کی ضرورت نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَا تُكَلَّفُ نَفۡسٌ اِلَّا وُسۡعَهَا۔ اس کا بیان سورۃ الطلاق میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے: عورت کو اجرت میں کنجوسی پر صبر کرنے کا پابند اور مکلف نہیں کیا جائے گا اور خاوند کو اسراف (فضول خرچی) کا پابند نہیں کیا جائے گا بلکہ میانہ روی کا لحاظ رکھا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 9۔ اس آیت میں امام مالک کی اس پر دلیل موجود ہے کہ پرورش کا حق ماں کو ہے اور یہ بچے میں اس کے بالغ ہونے تک ہے اور بچی میں نکاح تک ہے اور یہ ماں کا حق ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: جب بچہ آٹھ برس کی عمر کو پہنچ جائے تو یہ وہ عمر ہے جس میں وہ تمیز کر سکتا ہے، لہٰذا اسے والدین کے درمیان اختیار دیا جائے گا کیونکہ اس کی یہ حالت قرآن کریم کی تعلیم، ادب اور دیگر وظائف عبادات کے لئے اس کی ہمت اور استعداد کو متحرک کرنے کی ہے اور اس میں بچہ اور بچی دونوں برابر ہوتے ہیں۔

اور امام نسائی وغیرہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ ایک عورت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: میرا خاوند چاہتا ہے کہ وہ میرا بیٹا مجھ سے لے لے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بچے کو فرمایا: "یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو ان میں سے جسے چاہے پکڑ لے" تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا (2)۔

اور ابوداؤد کی کتاب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک عورت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرا خاوند چاہتا ہے کہ وہ میرا بیٹا لے جائے، حالانکہ یہ ابوعنبہ کے کنوئیں سے مجھے پانی لا کر دیتا ہے اور میرے لئے بہت نفع بخش ہے۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تم دونوں اس کے بارے میں قرعہ اندازی کر لو"۔ تو اس کے خاوند نے کہا: میرے بیٹے کے بارے میں کون میرے ساتھ جھگڑ سکتا ہے؟ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیٹے کو فرمایا: "یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو جس کا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارت، جلد 1، صفحہ 167، وزارت تعلیم

2۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 112، وزارت تعلیم۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب تخییر الصبی ابویہ، حدیث نمبر 2341، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چاہے ان دو میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ لے۔" تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اسے لے کر چلی گئی (1)۔

اور ہماری دلیل وہ ہے جسے ابوداؤد نے امام اوزاعی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کی ہے کہ ایک عورت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک یہ میرا بیٹا ہے میرا پیٹ اس کے لئے جائے حفاظت رہا، میرے پستان اسے سیراب کرتے رہے اور میری گود اس کے لئے گھر بنی رہی اور اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی اور اب اس نے اسے مجھ سے چھیننے کا ارادہ کیا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: انت احق بہ مالم تنکحی (2) تو اس کا زیادہ حق رکھتی ہے جب تک تو نکاح نہ کرے۔

ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ زوجین جب آپس میں علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور ان دونوں کا بچہ ہو تو ماں اس بچے کا زیادہ حق رکھتی ہے جب تک وہ نکاح نہ کرے۔ اسی طرح ابو عمر نے کہا ہے: میں علماء سلف میں سے کہیں بھی مطلقہ عورت کے بارے میں اختلاف نہیں جانتا کہ جب تک وہ شادی نہ کرے تو وہ باپ کی نسبت اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہے جس وقت تک وہ چھوٹا بچہ ہے اور کسی شے کی تمیز نہیں کر سکتا بشرطیکہ اس کے پاس وہ حفاظت میں ہو اور (اخراجات کی) کفایت بھی ہو اور اس عورت میں فسق اور اجنبیوں کے سامنے زینت کا اظہار ثابت نہ ہو۔ پھر اس کے بعد اسے اختیار دینے میں اختلاف ہے جبکہ وہ اپنے باپ اور اپنی ماں کے درمیان تمیز کر سکتا ہو اور یہ عقل رکھتا ہو کہ ان میں سے کون اس کے حق میں اولیٰ اور بہتر ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے بارے میں بغیر تخییر کے خالہ کے حق میں فیصلہ فرمایا۔

ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ گئے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو لے آئے تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اسے لوں گا اور میں ہی اس کا زیادہ حقدار ہوں، یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر ہے اور خالہ ماں ہوتی ہے اور حضرت علی نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی میرے گھر ہے اور وہ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں، میں اس کے لئے (گھر سے) نکلا اور میں نے سفر کیا اور میں اسے لے کر آیا۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور یہ حدیث بیان فرمائی۔ فرمایا: واما الجاریۃ فاقضی بھا لجعفر تکون مع خالتھا وانما الخالۃ ام (3) اور رہی بچی تو میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں یہ اپنی خالہ کے پاس رہے گی،

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم۔

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1938، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 311، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1940، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بلاشبہ خالہ ماں ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ ابن منذر نے کہا ہے: تمام معتمد اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ بچے میں ماں کا حق نہیں ہے جب وہ شادی کر لے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح انہوں نے اپنی ''کتاب الاشراف'' میں کہا ہے اور قاضی عبدالوہاب نے ''شرح الرسالہ'' میں حسن سے ذکر کیا ہے کہ شادی کے سبب پرورش میں اس کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ اور امام مالک، امام شافعی، نعمان اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ نانی بچے کی پرورش کا زیادہ حق رکھتی ہے۔

اور انہوں نے اختلاف کیا ہے کہ جب بچے کی ماں نہ ہو اور اس کی دادی ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب بچے کی خالہ نہ ہو تو پھر دادی زیادہ حقدار ہے(1) اور ابن القاسم نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مجھ تک آپ سے یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے کہا: خالہ دادی سے زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے(2)۔

اور امام شافعی اور نعمان کے قول میں ہے کہ دادی خالہ سے زیادہ حق رکھتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک باپ دادی کی نسبت اپنے بیٹے کے لئے زیادہ اولیٰ ہے(3)۔

ابوعمر نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک ہے بشرطیکہ اس کی کوئی اجنبی بیوی نہ ہو۔ پھر باپ کے بعد بہن اور پھر پھوپھی کا حق ہے اور یہ تب ہے جبکہ ان میں سے ہر ایک کے پاس بچہ محفوظ و مامون ہو اور وہ اس کے پاس حفاظت و کفایت میں ہو اور جب اس طرح نہ ہو تو پھر کسی کو حق حضانت حاصل نہیں، بلکہ اس کے بارے غور و فکر کیا جائے گا جس کے پاس بچہ زیادہ محفوظ ہوگا اور وہ اس کی حفاظت اور خیر اور بھلائی کی تعلیم کے سلسلہ میں انتہائی اچھا اور حسین سلوک کرے گا اور یہ ان کے قول کے مطابق ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ پرورش بچے کا حق ہے اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور آپ کے اصحاب میں سے بھی ایک جماعت نے یہی کہا ہے اور اسی طرح فاجرہ عورت، ضعیف اور بیماری یا اپاہج ہونے کی وجہ سے جو بچے کا حق ادا کرنے سے عاجز ہو وہ اسے حق حضانت نہیں دیتے۔

ابن حبیب نے مطرف سے اور ابن ماجشون نے امام مالک سے ذکر کیا ہے کہ پرورش کا حق پہلے ماں کو ہے، پھر نانی کو، پھر خالہ کو، پھر دادی کو پھر بچے کی بہن کو پھر بچے کی پھوپھی کو پھر بچے کی بھتیجی کو اور پھر باپ کو ہے۔ دادی بہن سے اولیٰ ہے اور بہن پھوپھی سے اولیٰ ہے اور پھوپھی اپنے مابعد افراد سے اولیٰ اور بہتر ہے۔ اور تمام مردوں میں سے اولیاء زیادہ ارجح اور اولیٰ ہیں اور خالہ کی بیٹی کے لئے، پھوپھی کی بیٹی کے لئے اور بچے کی بھانجیوں کے لئے اس کی پرورش میں سے کوئی حق نہیں ہے۔ اور جب پرورش کرنے والے کی جانب سے بچے پر ضائع ہونے یا فساد برپا ہونے کا کوئی اندیشہ اور خوف نہ ہو تو وہ اس کی مسلسل پرورش کرتا رہے یہاں تک کہ وہ سن بلوغت کو پہنچ جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں تک کہ وہ بچہ ہونے کے اطلاق سے نکل جائے۔ اور یہاں تک کہ بچی شادی کر لے مگر یہ کہ باپ سفر پر نکلنے اور وطن سے منتقل ہونے کا ارادہ رکھتا ہو تو اس وقت وہ ماں

1۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب الرضاع، جلد 5، صفحہ 40، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر
2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 39
3۔ ایضاً

اور کسی غیر کی نسبت اپنے بچے کا زیادہ حقدار ہے اگر وہ (بچے کی ماں) منتقل نہ ہونا چاہے اور اگر باپ نے تجارت کے لئے نکلنے کا ارادہ کیا تو پھر اس کے لئے حق حضانت نہیں اور اسی طرح بچے کے وہ اولیاء ہیں جن کے ساتھ وہ رہتا ہے جب وہ وطن بنانے کے لئے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ اور ماں کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بچے کو باپ کے رہنے کی جگہ سے منتقل کرے مگر اس صورت میں کہ وہ اتنی مسافت سے بھی قریب ہو جس میں نماز قصر ہو جاتی ہے اور اگر آدمی نے عورت کے شہر سے منتقل ہوتے وقت اس پر یہ شرط عائد کر دی کہ وہ اس کے پاس اپنا بچہ نہیں چھوڑے گا مگر یہ کہ اس کا نفقہ اور اس کی مشقت معین سالوں تک اس پر لازم ہوگی، تو اگر عورت نے اسے اپنے ذمہ لازم کر لیا تو وہ اس پر لازم ہو جائے گا۔ اور اگر وہ فوت ہو گئی تو پھر اس کے ترکہ میں سے اس کے لئے اس کے ورثاء کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ قرض ہے جو اس کے ترکہ میں سے لیا جائے گا۔ اور پہلا قول اصح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جیسا کہ اگر بچہ فوت ہو جائے یا جیسا کہ اگر وہ حمل اور رضاع کے خرچہ کی بھی اس سے صلح کر لے اور وہ اسے ساقط کر دے تو پھر اس میں سے کسی شے کے لئے اس کا پیچھا نہ کیا جائے۔

مسئلہ نمبر 11۔ جب ماں شادی کر لے تو اس سے اس کا بچہ نہ چھینا جائے یہاں تک کہ اس کا خاوند اس سے دخول کر لے (1)۔ یہ امام مالک کے نزدیک ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: جب اس نے نکاح کر لیا تو اس کا حق حضانت ختم ہو گیا۔ اور اگر اس نے اسے طلاق دے دی تو امام مالک کے نزدیک اس میں اس کے لئے رجوع کا حق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کا مشہور مذہب یہی ہے اور قاضی اسماعیل نے ذکر کیا ہے اور اسے ابن خویز منداد نے بھی امام مالک سے ذکر کیا ہے کہ اس بارے میں آپ کا قول مختلف ہے۔ سو ایک بار کہا: وہ بچہ اس کی طرف لوٹا دیا جائے گا اور ایک بار کہا: وہ نہیں لوٹایا جائے گا۔

ابن منذر نے کہا ہے: جب ماں اس شہر سے نکل گئی جس میں اس کا بیٹا تھا، پھر اس کی طرف واپس آ گئی تو پھر یہی اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہوگی۔ یہ امام شافعی، ابوثور اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔ اور اسی طرح اگر اس نے شادی کی پھر اسے طلاق ہو گئی یا اس کا خاوند فوت ہو گیا تو بچہ بھی اس کے حق میں لوٹا دیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح قاضی ابو محمد عبدالوہاب نے کہا ہے: پس اگر خاوند نے اسے طلاق دی یا وہ فوت ہو گیا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ بچے کو لے لے کیونکہ وہ عذر زائل ہو چکا ہے جس کے سبب بچے کو چھوڑنا جائز ہوا تھا۔

مسئلہ نمبر 12۔ اگر عورت نے اپنے بچے کی پرورش چھوڑ دی اور اس نے اسے لینے کا ارادہ ہی نہ کیا حالانکہ وہ فارغ تھی اور زوج کے سبب مشغول نہ تھی۔ پھر اس کے بعد اس نے بچے کو لینے کا ارادہ کیا تو اس کے بارے غور وفکر کی جائے گی۔ پس اگر اس کا بچے کو چھوڑنا کسی عذر کے باعث تھا تو اس کے لئے اسے لینا جائز ہے اور اگر اس کا ترک اسے چھوڑنے اور نفرت کے سبب ہو تو اب اس کے بعد اس کے لئے بچے کو لینا جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 13۔ اور علماء نے ایسے زوجین کے بارے اختلاف کیا ہے جو طلاق کے سبب جدا ہو جاتے ہیں اور زوجہ ذمیہ ہے تو ایک گروہ نے کہا ہے: ذمیہ اور مسلم میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہی اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہے۔

1۔ المدونۃ الکبریٰ، جلد 5، صفحہ 40، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

یہ قول ابوثور، اصحاب الرائے اور ابن القاسم صاحب مالک رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: تحقیق ہم نے حدیث مرفوع روایت کی ہے جو اس قول کے موافق ہے اور اس کی اسناد میں کلام ہے۔

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ بچہ ان میں سے مسلمان کے ساتھ ہوگا۔ یہ قول امام مالک، سوار اور عبداللہ بن حسن کا ہے اور یہی حضرت امام شافعی سے بھی بیان کیا گیا ہے۔

اور اسی طرح ان کا ان زوجین میں بھی اختلاف ہے جو آپس میں جدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک آزاد ہے اور دوسرا مملوک۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: آزاد اولیٰ ہے۔ یہ قول حضرت عطا، ثوری، امام شافعی اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

اور امام مالک نے کہا ہے: باپ جب آزاد ہو اور اس کا آزاد بیٹا ہو اور ماں مملوکہ (کنیز) ہو تو بلاشبہ ماں اس کی زیادہ حقدار ہو گی مگر یہ کہ اسے بیچ دیا جائے اور وہ کہیں اور منتقل ہو جائے تو پھر باپ کا حق زیادہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ماں بچے کے باپ کو ضرر اور تکلیف پہنچانے کے لئے اسے دودھ پلانے سے انکار نہ کرے یا وہ اجرت مثل سے زیادہ کا مطالبہ کرے اور باپ کے لئے بھی حلال نہیں ہے کہ ماں کو دودھ پلانے میں اس کی رغبت کے باوجود اس سے منع کرے، یہ قول جمہور مفسرین کا ہے۔

نافع، عاصم، حمزہ اور کسائی نے تضار راء مشددہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ نہی کی بنا پر محل جزم میں ہے (1) اور اس کی اصل لا تضارر ہے اور پہلی راء کو دوسری میں ادغام کیا گیا اور دو ساکن ملنے کی وجہ سے دوسری کو فتحہ دے دیا گیا۔ اسی طرح مضاعف میں کیا جاتا ہے جبکہ اس سے پہلے فتحہ یا الف ہو، تو کہتا ہے: عض یا رجل (تو کاٹ اے آدمی!) اور ضار فلانا یا رجل (تو فلاں کو ضرر پہنچا اے آدمی) یعنی بچہ ماں سے نہیں چھینا جائے گا جب وہ دودھ پلانے پر راضی ہو اور بچہ اس سے مانوس ہو۔

ابوعمرو، ابن کثیر اور ابان نے حضرت عاصم اور ایک جماعت سے تضار سے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا عطف تُكَلَّفُ نَفْسٌ پر کیا ہے اور یہ خبر ہے اور اس سے مراد امر ہے (2)۔

اور یونس نے حسن سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: لا تضارر زوجھا (یعنی وہ اپنے خاوند کو ضرر نہ پہنچائے) کہ وہ یہ کہے: میں اسے دودھ نہیں پلاؤں گی اور نہ خاوند اسے ضرر پہنچائے کہ وہ اس کا بیٹا چھین لے حالانکہ وہ کہہ رہی ہو: میں اسے دودھ پلاؤں گی۔ اور یہ احتمال ہے کہ یہ اصل میں تضارر، ہو، اور والدۃ مفعول مالم یسم فاعلہ ہو۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے لا تضارر پڑھا ہے یعنی دو راء میں سے پہلی مفتوح ہے۔

اور ابوجعفر بن قعقاع نے تُضَارْ یعنی راء کو اسکان اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی طرح لا یُضَارْ کَاتِبٌ ہے۔ اور یہ بعید ہے کیونکہ دو ہم مثل لفظ جب جمع ہو جائیں اور وہ دونوں اصلی ہوں تو ان میں سے ایک کو تخفیف کے لئے حذف کرنا جائز نہیں۔ پس یا ادغام ہوگا یا اظہار ہوگا۔ اور آپ سے اسکان اور تشدید بھی مروی ہے اور حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم سے لا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

تُضَارِرُ پہلی راء کے کسرہ کے ساتھ مروی ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یہ قول باری تعالیٰ: وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ پر معطوف ہے۔ اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس حضرت قتادہ، سدی، حسن اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ وارث سے مراد بچے کا وارث ہے کہ اگر وہ فوت ہو جائے۔

بعض نے کہا ہے: مراد بچے کا ایسا وارث ہے جو صرف مردوں میں سے ہو کہ دودھ پلانے کا اہتمام کرنا اس کے ذمہ لازم ہوگا جیسا کہ یہ بچے کے باپ پر لازم تھا اگر وہ زندہ ہوتا اور حضرت مجاہد اور حضرت عطا نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ وغیرہ نے کہا ہے: مراد بچے کا وارث ہے مردوں اور عورتوں میں سے جو بھی ہو۔ اسے دودھ پلانے کا اہتمام کرنا لازم ہوتا ہے اتنی مقدار جتنا اس کی میراث میں ان کا حصہ ہے (2) اور یہی امام احمد اور اسحاق نے کہا ہے۔

اور قاضی ابو اسحاق اسماعیل بن اسحاق نے اپنی کتاب ''معانی القرآن'' میں کہا ہے: ''پس رہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو انہوں نے کہا ہے: صغیر کا نفقہ اور اسے دودھ پلانا ہر ذی رحم محرم پر واجب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کی بہن کا صغیر اور محتاج بیٹا ہو اور چچا کا بیٹا صغیر اور محتاج ہو اور وہی اس کا وارث ہو، تو نفقہ ماموں پر واجب ہوگا اپنے اس بھانجے کے لئے جس کا وہ وارث نہیں ہے اور چچا کے بیٹے سے اپنے چچا کے اس بیٹے کے لئے جس کا وہ وارث ہے نفقہ ساقط ہو جائے گا''۔ ابو اسحاق نے کہا ہے: انہوں نے ایسا قول کیا ہے جو نہ کتاب اللہ میں ہے اور نہ ہم کسی کو جانتے ہیں جس نے یہ کہا ہو۔

علامہ طبری نے امام ابوحنیفہ اور آپ کے صاحبین رحمۃ اللہ علیہم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ وارث جس پر بچے کو دودھ پلانے کا اہتمام کرنا لازم ہوتا ہے وہی اس کا وارث ہوتا ہے بشرطیکہ وہ اس کا ذی رحم محرم ہو اور اگر چچا کا بیٹا وغیرہ ذی رحم محرم کے ساتھ نہیں ہے تو اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی (3)۔

اور کہا ہے: (الوارث) سے مراد باپ کا حصہ ہے ان پر نفقہ اور لباس دونوں واجب ہوں گے۔

ضحاک نے کہا ہے: اگر بچے کا باپ فوت ہو جائے اور بچے کا مال ہو تو اسے دودھ پلانے والا اس مال سے لے لے گا۔ اور اگر اس کا کوئی مال نہ ہو تو پھر وہ عصبہ سے لے گا۔ اور اگر عصبہ کے پاس بھی مال نہ ہو تو پھر ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے۔

اور قبیصہ بن ذؤیب، ضحاک اور بشیر بن نصر قاضی عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: الوارث سے مراد بچہ بذات خود ہے اور انہوں نے علی الوارث کی تاویل المولود سے ہے جیسا کہ ماعلی المولود لہ ہے، یعنی اس پر اپنے مال میں سے اپنے آپ کو دودھ پلانا واجب ہے جب وہ اپنے باپ کا وارث بن جائے۔

اور سفیان نے کہا ہے: یہاں وارث سے مراد بچے کے والدین میں سے ایک کے فوت ہونے کے بعد جو باقی رہ جائے (4)، وہ ہے۔ پس اگر باپ فوت ہو جائے تو ماں پر بچے کی کفالت اور دیکھ بھال کرنا لازم ہے جبکہ بچے کا مال نہ ہو اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 1، صفحہ 600، دار احیاء التراث العربیہ
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ

عصبہ بچے کو دودھ پلانے کا اہتمام کرنے میں اس کے ساتھ اتنی مقدار شراکت کرے گا جتنا میراث میں سے اس کا حصہ ہے۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اگر یتیم فوت ہو، اس کا کوئی مال نہ ہو، تو امام وقت پر بیت المال سے اس کا انتظام کرنا واجب ہے اور اگر امام ایسا نہ کرے تو پھر مسلمانوں پر ایسا کرنا واجب ہے اخص فالأخص کے طریقہ پر۔ اور ماں بچے کے ساتھ سب سے زیادہ مختص ہے لہٰذا اس پر اسے دودھ پلانا اور اس کا اہتمام کرنا واجب ہوگا نہ وہ بچے کی طرف رجوع کرے گی اور نہ کسی اور کی طرف (یعنی بچے پر اٹھنے والے اخراجات کے لئے بچے یا کسی اور طرف متوجہ نہ ہوگی) اور دودھ پلانا واجب ہے اور نفقہ مستحب ہے اور وجہ استحباب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ اور ازواج پر ان کے ساتھ حقوق کا قیام واجب ہے اور جب خاوند کے فوت ہو جانے یا اس کے تنگدست ہو جانے کے سبب ان کے حق کا پورا ہونا متعذر اور مشکل ہو جائے تو حق ان سے ساقط نہیں ہوتا۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ عدت ان (عورتوں) پر واجب ہے اور نفقہ اور سکنیٰ ان کے خاوندوں پر لازم ہے اور جب ان کے لئے نفقہ متعذر ہو جائے تو ان سے عدت ساقط نہیں ہوتی۔

عبدالرحمٰن بن قاسم نے الاسدیہ میں امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: آدمی کے ذمہ بھائی، قریبی رشتہ دار اور ذو رحم محرم کا نفقہ لازم نہیں ہوتا (1)۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یہ منسوخ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ امام مالک کے الفاظ ہیں اور آپ نے یہ بیان نہیں کیا کہ اس کا ناسخ کون ہے اور نہ ہی عبدالرحمٰن بن قاسم (نے بیان کیا ہے) اور نہ مجھے معلوم ہو سکا ہے کہ ان کے اصحاب میں سے کسی نے اسے بیان کیا ہو اور وہ جو یہ شبہ ڈالتا ہے کہ وہ ان کے نزدیک اس کا ناسخ ہو۔ واللہ اعلم، وہ یہ کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے جب اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک سال کا نفقہ اور سکنیٰ متوفی کے مال سے واجب کیا پھر اسے منسوخ کر دیا اور اسے اٹھا لیا۔ اسی طرح وارث سے بھی اسے منسوخ کر دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اسی بنا پر نفقہ بچے کی اپنی ذات پر اس کے مال سے ہوتا ہے اور وارث پر اس میں سے کوئی شے نہیں ہوتی اس بنا پر جو آ رہا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ، ابن قاسم نے امام مالک سے بیان کیا ہے کہ یہ منسوخ ہے اور یہ ایسا کلام ہے جس میں غافلوں کے دل خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور تھوڑے لوگوں کی عقلیں اس میں حیرت زدہ ہو جاتی ہیں، حالانکہ اس میں امر قریب ہے اور وہ یہ کہ فقہاء و مفسرین میں سے علماء متقدمین تخصیص کو نسخ کا نام دیتے تھے، کیونکہ اس میں ان بعض افراد سے حکم کو اٹھانا ہوتا ہے جنہیں عموم شامل ہوتا ہے۔ یہ ان کا تسامح تھا اور وہ ان کی زبانوں پر جاری رہا یہاں تک کہ اس نے ان کے بعد والے لوگوں کو اشکال میں ڈال دیا۔ اور اس میں قول کی تحقیق یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یہ ماتقدم کی طرف اشارہ ہے۔ پس لوگوں میں سے وہ جنہوں نے ایجاب نفقہ اور تحریم اضرار میں سے تمام کی طرف لوٹایا ان میں فقہاء میں سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سلف میں سے حضرت قتادہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہما ہیں اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

1۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب ارخاء الستور، جلد 5، صفحہ 48، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

اور علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کا معنی تمام ماتقدم کی طرف نہیں لوٹتا، بلکہ یہ صرف تحریم اضرار کی طرف لوٹتا ہے اور معنی یہ ہے کہ وارث پر بھی ماں کو ضرر پہنچانا اسی طرح حرام ہے جس طرح باپ پر ہے اور یہ ہی اصل ہے۔ پس جو یہ دعویٰ کرے کہ اس میں عطف جمیع ماتقدم کی طرف راجع ہے تو دلیل لانا اس پر لازم ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ ان کا قول ھذا ھو الاصل اس سے مراد قریب ترین مذکور کی طرف ضمیر کو لوٹانا ہے۔ اور یہی صحیح ہے کیونکہ اگر وہ ان تمام کا ارادہ کرتا یعنی دودھ پلانا، نفقہ مہیا کرنا اور ضرر نہ پہنچانا تو یقیناً فرماتا: وعلی الوارث مثل ھؤلاء پس یہ اس پر دلیل ہے کہ اس کا عطف ضرر سے روکنے پر ہے۔

اور اسی بنا پر تمام مفسرین نے اس کی تاویل اس معنی میں کی ہے جسے قاضی عبدالوہاب نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے بچے کو اس طرح ضرر نہ پہنچائے کہ باپ جب اسے اجرت مثلی دے (تو وہ کہے) کہ وہ اسے دودھ نہیں پلائے گی اور نہ باپ اپنے بچے کے باعث ضرر پہنچائے۔ اس طرح کہ ماں جب تیار ہو کہ وہ اسے اجرت مثلی کے عوض دودھ پلائے گی تو پھر اسی کا وہ حق ہے۔ (باپ انکار نہ کرے) کیونکہ ماں بچے کے لئے زیادہ نرم اور زیادہ محبت وشفقت سے پیش آنے والی ہے اور اس کا دودھ کسی بھی اجنبیہ عورت کے دودھ کی نسبت زیادہ بہتر اور نفع بخش ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: امام مالک، آپ کے تمام اصحاب، شعبی، زہری، ضحاک اور علماء کی ایک جماعت رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مِثْلُ ذٰلِكَ سے مراد ہے کہ ضرر نہ پہنچایا جائے۔ رہا رزق (نفقہ) اور لباس تو ان میں سے کوئی شے واجب نہ ہوگی۔

اور ابن قاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ آیت اس معنی کو متضمن ہے کہ نفقہ اور لباس وارث پر ہے پھر اسے اجماع امت کے ساتھ اس معنی میں منسوخ کر دیا گیا ہے کہ وارث کو ضرر نہ پہنچایا جائے اور اختلاف اس میں ہے کہ کیا اس پر نفقہ اور لباس ہے یا نہیں؟

اور یحییٰ بن یعمر نے وعلی الورثۃ جمع کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ عموم کا تقاضا کرتا ہے۔ پس اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کریں لا یقبل اللہ صدقۃ و ذو رحم محتاج کہ اللہ تعالیٰ کوئی صدقہ اس حال میں قبول نہیں فرماتا کہ ذو رحم محتاج ہو۔ تو انہیں کہا جائے گا کہ الرحم ہر ذی رحم کے لئے عام ہے، چاہے وہ محرم ہو یا غیر محرم اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ذو رحم پر صدقہ خرچ کرنا اولیٰ اور ارجح ہے۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اجعلھا فی الأقربین (2) (تم صدقہ کو اقربین میں خرچ کرو) پس حدیث کو اس معنی پر محمول کیا گیا ہے اور اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے جس کا انہوں نے قصد کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور نحاس نے کہا ہے: رہا اس کا قول جس نے کہا: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کہ اسے ضرر نہ پہنچایا جائے تو یہ قول حسن اور اچھا ہے کیونکہ لوگوں کے اموال ممنوع ہیں اور اس میں کوئی شے بغیر دلیل قطعی کے نہیں نکل سکتی اور جنہوں نے علی ورثۃ الأب

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 205، دار الفکر
2۔ صحیح بخاری، کتاب الوصایا، جلد 1، صفحہ 385، وزارت تعلیم

مراد لیا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ نفقہ باپ پر لازم ہے۔ لہٰذا اس کے وارث بیٹے کے وارثوں سے اولیٰ ہوں گے اور ان کی دلیل جنہوں نے کہا: مراد بیٹے کے وارث ہیں، تو وہ کہتے ہیں: جس طرح وہ اس کے وارث ہوتے ہیں (اسی طرح) وہ اس کے حقوق کو بھی ادا کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: محمد بن جریر ان کے قول کو پسند کرتے تھے جنہوں نے کہا ہے کہ یہاں مراد بیٹے کے وارث ہیں، یہ اگرچہ قول غریب ہے لیکن اس سے استدلال صحیح ہے اور اس کی دلیل بالکل ظاہر ہے کیونکہ اس کا مال اسی کے زیادہ قریب اور اولیٰ ہے۔ اور فقہاء نے اجماع کیا ہے سوائے اس کے جو ان سے الگ ہو گیا کہ ایک آدمی کا اگر چھوٹا بچہ ہو اور بچے کا مال بھی ہو اور باپ خوشحال ہو تو باپ پر نفقہ اور رضاع واجب نہ ہو گا بلکہ وہ بچے کے مال سے ادا ہو گا۔

اور اگر کہا جائے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ کہا جائے گا کہ یہ ضمیر مؤنث کے لئے ہے اور اس کے ساتھ اجماع آیت کی حد ہے، اس کی وضاحت کرنے والا ہے، کوئی مسلمان اس سے نکلنے کی وسعت نہیں رکھتا۔

اور رہا وہ جس نے کہا کہ اس سے مراد وہ ہے جو والدین میں سے ایک کے مرنے کے بعد باقی رہے، تو اس کی دلیل یہ ہے کہ ماں کے لئے اپنے بچے کو ضائع کرنا جائز نہیں، حالانکہ وہ فوت ہو جائے جو بچے پر اور اس کی ماں پر خرچ کرتا تھا۔

اور امام بخاری نے اس قول کے رد میں ایک باب بیان کیا ہے اس کا عنوان ہے "باب - وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ، و هل على المرأة منه شيء" اور آگے ام سلمہ اور ہند کی حدیث بیان کی ہے۔

اس میں معنی یہ ہے کہ ام سلمہ کے حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے بیٹے تھے اور ان کا کوئی مال نہ تھا تو اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بتایا کہ اس کے لئے اس میں اجر ہے۔ پس یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس کے بیٹوں کا نفقہ اس پر واجب نہیں اور اگر واجب ہوتا تو وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس یہ نہ کہتی: اور میں نے اسے چھوڑا نہیں (1)۔

اور رہی ہند کی حدیث تو اس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے باپ کے مال سے اپنا نفقہ اور اپنے بچے کا نفقہ لینے کے لئے چھوڑ دیا اور آپ نے نفقہ اس پر واجب نہیں کیا جیسا کہ اسے باپ پر واجب کیا۔ پس امام بخاری نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ جب باپوں کی زندگی میں بیٹوں کا خرچہ ماؤں پر لازم نہیں ہے تو اسی طرح باپوں کے فوت ہو جانے کے بعد بھی ان پر لازم نہ ہو گا۔

اور رہا ان کا قول جنہوں نے کہا کہ بلا شبہ نفقہ اور لباس ہر ذی رحم محرم پر لازم ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ آدمی پر لازم ہے کہ وہ ہر ذی رحم محرم پر خرچ کرے جب وہ فقیر ہو۔

نحاس نے کہا ہے: اس قول کا معارض یہ ہے کہ نہ اسے کتاب اللہ سے لیا گیا ہے نہ اجماع سے اور نہ ہی سنت صحیحہ سے۔ بلکہ جو قول ہم نے ذکر کیا ہے اس کے سوا یہ کہیں معروف ہی نہیں ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 809، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب النفقات، حدیث نمبر 4950، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پس رہا قرآن کریم تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ پس اگر وارث پر نفقہ اور لباس ہے تو انہوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے کہا ہے: جب وہ اپنا ماموں اور اپنے چچا کا بیٹا چھوڑے تو نفقہ اس کے ماموں پر ہے اور اس کے چچا کے بیٹے پر کوئی شے نہیں ہے تو یہ قرآن کریم کی نص کے خلاف ہے کیونکہ ماموں چچا کے بیٹے کے ساتھ کسی کے قول کے مطابق بھی وارث نہیں بن سکتا اور نہ ہی وہ اکیلا کثیر علماء کے قول کے مطابق وارث بن سکتا ہے اور وہ جنہوں نے اس سے ہر ذی رحم محرم پر نفقہ کا استدلال کیا ہے، اکثر اہل علم اس کے خلاف ہیں۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا اس میں اَرَادَا میں ضمیر والدین کے لئے ہے اور فِصَالًا کا معنی ہے دودھ چھڑانا (1)۔ یعنی ماں کے دودھ کے سوا کسی اور خوراک کو غذا بنانا اور الفصال اور الفصل کا معنی الفطام ہے اور اس کا اصل معنی التفریق ہے اور یہ بچے اور پستان کے درمیان تفریق اور جدائی کرنا ہے اور اسی سے الفصیل ہے (یعنی اونٹنی یا گائے کا بچہ) کیونکہ اسے اپنی ماں سے جدا کیا جاتا ہے۔ عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا یعنی وہ راضی ہو جائیں دو سالوں سے پہلے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا یعنی انہیں کا دودھ چھڑانے میں ان پر کوئی گناہ نہیں اور وہ یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب مدت رضاع دو سال مقرر کی تو اس نے بیان کر دیا کہ ان دونوں کا دودھ چھڑانا وہی فطام ہے اور ان دونوں کا جدا کرنا وہی فصال ہے اس سے کسی کو مفر نہیں، مگر یہ کہ والدین اس مدت سے کم پر بچے کو نقصان پہنچائے بغیر متفق ہو جائیں اور وہ اس بیان کے ساتھ جائز ہے۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ دو سال دودھ پلانا واجب تھا اور اس سے پہلے دودھ چھڑانا حرام تھا، پھر اس میں تخفیف کی گئی اور دو سال سے کم مدت دودھ پلانا مباح کر دیا گیا، اس قول کے ساتھ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا الآیہ۔ اور اس میں احکام میں اجتہاد کے جائز ہونے پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے لئے مشاورت مباح قرار دی ہے ایسے امور میں جو صغیر کی اصلاح کرنے والے ہوں اور یہ ان دونوں کے ظن غالب پر موقوف ہے نہ کہ حقیقت ویقین پر۔ اور التشاور کا معنی ہے: رائے کا اظہار کرنا۔ اسی طرح المشاورۃ اور المشورۃ ہے جیسا کہ المعونۃ اور شُرْتُ العسل کا معنی ہے میں نے اسے (شہد کو) نکالا۔ اور شُرْتُ الدابۃ و شَوَّرْتھا یعنی میں نے اسے چلایا اس کی چال کو تیز کرنے کے لئے اور الشَّوَار کا معنی ہے گھر کا سامان، کیونکہ وہ دیکھنے والے کے لئے ظاہر ہوتا ہے اور الشارۃ کا معنی ہے آدمی کی ہیئت اور الاشارۃ کا معنی ہے جو تیرے دل میں ہے اسے نکالنا اور اس کا اظہار کرنا۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ یعنی لاولادکم غیر الوالدۃ اگر تم چاہو تو اپنی اولاد کو دودھ پلواؤ والدہ کے علاوہ (دایہ سے) زجاج نے یہی کہا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: عربی میں تقدیر عبارت یہ ہے اَنْ تسترضعوا اجنبیۃ لاولادکم (کہ تم اجنبی عورت سے اپنی اولاد کو دودھ پلواؤ) اس کی مثل یہ ارشاد ہے: كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ (المطففین: 3) یعنی کالوا لھم او وزنوا لھم اور لام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتے ہیں ان میں سے ایک حرف کے ساتھ ہوتا ہے اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 313، دار الکتب العلمیہ

امرتُك الخير فافعل ما أمرتَ به　　فقد تركتُك ذا مال و ذا نَشَبِ

میں نے تجھے خیر کا حکم دیا ہے پس تو وہ کر جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے، تحقیق میں نے تجھے صاحب مال اور صاحب جائیداد چھوڑا ہے۔

اور یہ جائز نہیں ہے: دعوتُ زیدا، ای دعوت لزید، کیونکہ یہ تلبیس (حقیقت کو چھپانا) تک پہنچا دیتا ہے اور اس نوع میں سماع معتبر ہوتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر اس آیت میں دایہ بنانے کے جواز پر دلیل موجود ہے جبکہ آباء اور مائیں اس پر متفق ہو جائیں اور عکرمہ نے قول باری تعالیٰ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ میں کہا ہے۔ اس کا معنی ہے دایہ۔ اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے(1)۔

اور اصل یہ ہے کہ ہر ماں پر اپنے بچے کو دودھ پلانا لازم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے۔ پس اس نے زوجات کو اپنی اولاد کو دودھ پلانے کا حکم دیا ہے اور ان کے لئے ازواج پر نفقہ اور لباس واجب کیا ہے اور زوجیت قائم رہے گی اور اگر دودھ پلانے کا انتظام کرنا باپ پر لازم ہوتا تو جب اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کے نفقہ اور لباس کے لازم ہونے کا ذکر کیا ہے تو وہ اس کا بھی ذکر کر دیتا۔ مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر فقہاء امصار کے سوا حسیبہ (خاندانی شرف والی عورت) کی استثنا کی ہے اور کہا ہے: اس پر دودھ پلانا لازم نہ ہوگا(2) اور اسے آیت سے نکال دیا ہے اور اصول فقہ کے ایک اصول کے ساتھ اس کی تخصیص کر دی ہے۔ اور وہ ہے العمل بالعادۃ۔ عمل عادت اور رواج کے مطابق ہوتا ہے اور یہ وہ اصول ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کوئی نہیں سمجھا۔ اور اس میں عمدہ اصول یہ ہے کہ یہ امر دور جاہلیت میں صاحب حسب و شرف لوگوں میں رائج تھا، پھر اسلام آیا اور اس نے اسے تبدیل نہیں کیا اور آپ کے زمانے تک صاحب ثروت و حسب لوگ بچوں کو دودھ پلانے والیوں کے حوالے کرنے کے ساتھ ماؤں کو استمتاع کے لئے فارغ کرنے پر مصر رہے۔ تو آپ نے یہ کہہ دیا اور رہا ہمارے زمانے کا حکم تو ہم نے اسے شرعاً ثابت کر دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ قولہ تعالیٰ: اِذَا سَلَّمْتُمْ جب تم یعنی آباء اجرت دودھ پلانے والی دایہ کو ادا کر دو۔ سفیان نے یہی کہا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: جب تم ماؤں کو ان کی اجرت اس حساب سے ادا کر دو جس کے مطابق انہوں نے دودھ پلانے کے وقت تک دودھ پلایا(3)۔

سات قراء میں سے چھ نے ما آتیتم بمعنی ما أعطیتم پڑھا ہے اور ابن کثیر نے اَتَیْتُمْ بمعنی ما جئتم و فعلتم (جو تم لائے اور تم نے کیا) پڑھا ہے۔ جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

و ما كان من خير أتوهُ فانما　　توارثه آباءُ آبائهم قبلُ (4)

جو انہوں نے کہا ہے وہ خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ بلاشبہ ان کے آباء کے آباء اس سے پہلے اس کے وارث بنیں ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 311
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 313، دار الکتب العلمیہ
4۔ ایضاً

حضرت قتادہ اور زہری رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے اس کا معنی ہے جب تم وہ ادا کر دو جو تم نے دودھ پلوانے کے ارادہ سے طے کیا ہے، یعنی والدین میں سے ہر ایک حوالے کر دے اور راضی ہو جائے اور یہ ان دونوں کے اتفاق کی بنا پر ہو اور خیر کے قصد اور امر معروف کے ارادہ سے ہو اور اس احتمال پر سَلَّمْتُمْ کے خطاب میں مرد اور عورتیں سبھی داخل ہوں گے (1) اور پہلے دونوں قولوں کی بنا پر خطاب مردوں کو ہے۔

ابو علی نے کہا ہے: اذا سلمتم ما آتیتم معنی ہے نقدہ او اعطاءہ ہے پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے اور ضمیر کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور تقدیر کلام ہے: ما آتَيْتُمُوْهُ، پھر ضمیر کو صلہ سے حذف کر دیا گیا اور اس تاویل کی بنا پر خطاب مردوں کو ہوگا، کیونکہ وہی دودھ پلانے کی اجرت ادا کرتے ہیں۔ ابو علی نے کہا ہے: اور یہ احتمال بھی ہے کہ ما مصدریہ ہو یعنی اذا سلمتم الاتیان اور معنی پہلے کی طرح ہی ہے، لیکن یہ مضاف کے حذف اور پھر ضمیر کے حذف کے طریقہ سے مستغنی ہو جائے گا۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

"اور جو لوگ فوت ہو جائیں تم میں سے اور چھوڑ جائیں بیویاں تو وہ بیویاں انتظار کریں چار مہینے اور دس دن اور جب پہنچ جائیں اپنی (اس) مدت کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب واقف ہے۔"

اس میں پچیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ جب اللہ تعالیٰ نے طلاق کی عدت کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ متصل مسئلہ رضاعت کا ذکر فرمایا، پھر ساتھ ہی عدت وفات کا ذکر بھی کر دیا، تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ عدت وفات عدت طلاق کی مثل ہے۔ وَالَّذِيْنَ یعنی وہ آدمی جو تم سے فوت ہو جاتے ہیں۔ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا اور وہ بیویاں چھوڑ جاتے ہیں یا اور ان کی بیویاں ہوں، تو وہ بیویاں انتظار کریں گی، زجاج نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے اور نحاس نے اسے اختیار کیا ہے۔ کلام میں مبتدا کا حذف بہت زیادہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ (الحج: 72)

یہ اصل میں ھو النار ہے اور ابو علی فارسی نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بعدھم وہ آدمی جو تم میں فوت ہو جاتے ہیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جاتے ہیں تو وہ ان کے بعد انتظار کریں گی (2) اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: السمن منوان بدرھم یہ اصل میں منوان منہ بدرھم ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ تقدیر کلام یہ ہے وازواج الذین یتوفون منکم یتربصن (اور وہ ازواج جو تم سے فوت ہو جاتے ہیں تو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 313، دار الکتب العلمیہ
2۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 612، دار احیاء التراث العربیۃ

ان کی بیویاں انتظار کریں گی۔) پس عبارت میں انتہائی ایجاز اور اختصار ہے۔ اور مہدوی نے سیبویہ سے بیان کیا ہے کہ معنی ہے: وفیما یتلی علیکم الذین یتوفون۔

اور کوفہ کے بعض علمائے نحو نے کہا ہے: الذین کی خبر چھوڑ دی گئی ہے اور مقصود ان کی ازواج کے بارے خبر دینا ہے کہ وہ انتظار کریں گی۔ اور اس لفظ کا معنی ہے مشروع ہونے کی خبر دینا دو وجہوں میں سے ایک میں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس عورت کی عدت کے بارے میں ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے۔ اس میں ظاہراً عموم ہے لیکن اس کا معنی خاص ہے۔ مہدوی نے بعض علماء سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت حاملہ عورتوں کو بھی شامل تھی پھر اسے اس قول کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا ہے: وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (طلاق: 4)(1) (اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنے حمل وضع کر لیں۔)

اور اکثر علماء نے یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ یہ آیت اس ارشاد باری تعالیٰ کے لئے ناسخ ہے: وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ۔ کیونکہ لوگ اسلام کا کچھ عرصہ اس پر قائم رہے جب کوئی آدمی فوت ہوتا اور اپنے پیچھے حاملہ بیوی چھوڑتا تو وہ اپنی بیوی کے لئے ایک سال کے نفقہ کی وصیت کرتا اور سکنیٰ (رہائش گاہ) کی وصیت کرتا جب تک وہ نہ نکلے اور شادی نہ کرلے، پھر اسے چار مہینے اور دس دن اور میراث کے ساتھ اسے منسوخ کر دیا۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اس میں نسخ نہیں ہے بلکہ یہ سال کی مدت میں کمی کرنا ہے جیسا کہ صلوٰۃ مسافر کہ جب یہ چار سے کم ہو کر دو رکعتیں ہوئی تو یہ نسخ نہیں ہے اور یہ واضح طور پر غلط ہے جب اس کا حکم یہ تھا کہ وہ ایک سال تک عدت گزارے گی جب وہ نہ نکلے اور اگر وہ نکل گئی تو اسے روکا نہ جائے پھر اس حکم کو زائل کر دیا گیا ہے اور اس پر چار مہینے دس دن عدت لازم ہوگئی ہے اور یہی وہ نسخ ہے اور صلوٰۃ مسافر میں اس میں سے کوئی شے نہیں ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ نماز دو دو رکعتیں فرض کی گئی، پھر مقیم کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا اور صلوٰۃ مسافر کو اپنے حال پر برقرار رکھا گیا(2)۔ عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ایسی حاملہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت وضع حمل ہے۔ یہ جمہور علماء کے نزدیک ہے اور حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ اس کی عدت دو مدتوں میں سے آخری مدت (طویل مدت) کو مکمل کرنا ہے۔ اور ہمارے علماء میں سے سحنون نے اسے اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور اس کی دلیل جو حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے وہ ان دونوں قولوں کو جمع کرنے کا ارادہ ہے: یعنی وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا (3) اور اس قول کے درمیان: وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ اور وہ اس طرح کہ جب وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 314، دارالکتب العلمیۃ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 51، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، حدیث نمبر 337، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 613، داراحیاء التراث العربیۃ

دو مدتوں کی انتہا تک بیٹھی رہی تو اس نے دونوں آیتوں کے مقتضا کے مطابق عمل کیا۔ اور اگر وہ وضع حمل کے ساتھ عدت گزارے تو اس نے عدت وفات والی آیت کے ساتھ عمل ترک کر دیا۔ اور دونوں کو جمع کرنا ترجیح سے زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے۔ اس پر تمام اہل اصول کا اتفاق ہے۔ یہ انتہائی اچھی نظر وفکر ہے اگر اس پر حدیث سُبَیْعَه اسلمیه (1) سے اعتراض نہ کیا جائے کہ اسے اپنے خاوند کی وفات کے بعد چند ہی راتیں گزرنے کے ساتھ نفاس آنے لگا اور اس نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے اسے الصحیح میں نقل کیا ہے اور حدیث نے واضح کر دیا ہے کہ رب کریم کا ارشاد: وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ مطلقات اور ان عورتوں کے بارے میں جن کے خاوند فوت ہو جائیں اپنے عموم پر محمول ہے اور عدت وفات دونوں صنفوں میں سے غیر حاملہ کے ساتھ مختص ہے اور اسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے تقویت حاصل ہوتی ہے اور جو چاہے میں اس سے مباہلہ کرتا ہوں کہ سورۃ النساء القصریٰ کی آیت عدت وفات کی آیت کے بعد نازل ہوئی۔

ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس کا ظاہر کلام بے شک اس کا ناسخ ہے لیکن وہ اس سے مراد نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بلاشبہ یہ آیت اس کے لئے مخصصہ ہے اور اس نے اس سے اس کے بعض مشتملات کو نکال دیا ہے اور اسی طرح حدیث سُبَیْعَه عدّت وفات سے متاخر ہے۔ کیونکہ سبیعہ کا قصہ حجۃ الوداع کے بعد کا ہے۔ اور اس کا خاوند سعد بن خولہ تھا اور وہ بنی عامر بن لؤی میں سے تھا۔ اور وہ غزوۂ بدر میں شامل ہونے والے صحابہ کرام میں سے تھا۔ جس وقت وہ مکہ مکرمہ میں فوت ہوا اس وقت یہ حاملہ تھی۔ اور یہ وہی ہیں جن کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرثیہ کہا کہ وہ مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے ہیں اور ان کے وصال سے نصف مہینہ گزرنے کے بعد اس نے بچے کو جنم دیا۔ اور بخاری نے کہا ہے: چالیس راتیں گزرنے کے بعد (2)۔

اور مسلم نے حضرت عمر بن عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہم کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ سبیعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا۔ اس نے بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فتویٰ دیا کہ میں اس وقت سے حلال ہو چکی ہوں جب سے میں نے حمل کو وضع کر لیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے شادی کی اجازت مرحمت فرما دی اگر میرے لئے ضرورت ہو (3)۔

ابن شہاب نے بیان کیا ہے: میں کوئی حرج نہیں دیکھتا کہ وہ اس وقت شادی کر لے جب بچے کی ولادت ہو جائے اگرچہ اس کا خون جاری ہو، مگر یہ کہ اس کا خاوند اس کے قریب نہ جائے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے۔ اسی نظریہ پر جمہور علماء اور ائمہ فقہاء ہیں۔

اور حسن، شعبی، نخعی اور حماد نے کہا ہے: نفاس والی عورت جب تک دم نفاس میں ہے نکاح نہیں کرے گی اور انہوں نے دو شرطیں لگائی ہیں۔ ایک وضع حمل اور دوسری نفاس سے پاک ہونا۔ اور حدیث ان کے خلاف حجت ہے اور ان کے لئے اس

1۔ صحیح بخاری، باب واولات الاحمال الخ، حدیث نمبر 4907، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
صحیح بخاری، باب والذین یتوفون الخ، حدیث نمبر 4168، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، جلد 2، صفحہ 729، وزارت تعلیم 3۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 486، وزارت تعلیم

قول میں کوئی حجت نہیں ہے۔ فلما تعلّت من نفاسها تجملت للخُطّاب(1) (جب وہ اپنے نفاس سے پاک ہوجائے تو وہ دعوت نکاح دینے والوں کے لئے بناؤ سنگار کرے) جیسا کہ صحیح مسلم اور ابی داؤد میں ہے۔ کیونکہ تَعَلّتْ کا اگر چہ اصلی معنی دم نفاس سے پاک ہونا ہے، جیسا کہ خلیل نے بیان کیا ہے، پھر بھی یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہاں اس سے مراد اس کے نفاس کے دردوں اور تکلیف کا کم ہونا ہو اور اگر وہ معنی تسلیم کرلیا جائے جو خلیل نے بیان کیا ہے تو پھر اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے بلکہ دلیل سبیعہ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد میں ہے "کہ تو حلال ہوگئی جب سے تو نے وضع حمل کرلیا(2)" پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضع کے وقت حلت کو واقع کیا اور اسی پر اسے معلق کیا اور یہ نہیں فرمایا جب تیرا خون منقطع ہوا اور نہ یہ فرمایا کہ جب تو پاک ہوئی۔ لہٰذا وہ صحیح ہے جو جمہور نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء کے درمیان اس پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ہر مطلقہ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے چاہے خاوند رجعت کا مالک ہو یا نہ ہو (یعنی طلاق رجعی ہو یا بائن) وہ عورت آزاد ہو یا لونڈی، مدبرہ ہو یا مکاتبہ۔ البتہ حاملہ متوفی عنہا زوجہا کی مدت عدت میں اختلاف ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور تمام نے آپس میں اختلاف کیے بغیر اس پر اجماع کیا ہے کہ اگر آدمی فوت ہو جائے اور وہ حاملہ عورت پیچھے چھوڑے اور چار مہینے اور دس دن گزر جائیں تو وہ حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ بچے کو جنم دے لے پس اس سے معلوم ہوا کہ مقصود ولادت ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: يَتَرَبَّصْنَ، التربص کا معنی نکاح میں تاخیر کرنا اور صبر کرنا ہے اور مسکن نکاح سے نہ نکلنا ہے وہ اس طرح کہ وہ رات کے وقت اس سے جدا اور علیحدہ نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے متوفی عنہا زوجہا کے لئے اپنی کتاب میں سکنیٰ کا ذکر نہیں کیا ہے جیسا کہ مطلقہ کے لئے اپنے اس قول کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اَسْكِنُوْهُنَّ اور کتاب اللہ میں لفظ عدت میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو احداد (سوگ کا اظہار کرنا) پر دلالت کرتی ہو۔ بلکہ فقط فرمایا: يَتَرَبَّصْنَ حدیث طیبہ نے ان تمام چیزوں کو بیان فرمایا ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احادیث بالکل ظاہر ہیں کہ عدت وفات میں انتظار بلاشبہ احداد کے ساتھ ہے اور احداد سے مراد زیب و زینت سے، خوبصورت رنگے ہوئے کپڑے پہننے سے اور خوشبو وغیرہ لگانے سے رکنا اور باز رہنا ہے(3) اور یہ جمہور علماء کا قول ہے۔

حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے: احداد کوئی شے نہیں ہے صرف زوج سے انتظار کرنا ہے اور عورت کے لئے مباح ہے کہ بناؤ سنگھار کرسکتی ہے اور خوشبو لگا سکتی ہے۔ لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ سنت کے خلاف ہے اور یہ ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فریعہ بنت مالک بن سنان کو فرمایا اور اس کا خاوند فوت ہو چکا تھا: اُمكثي في بيتك حتّٰى يبلغ الكتاب أجله (4) (تو اپنے گھر میں ہی رکی رہ یہاں تک کہ کتاب اللہ کے مطابق عدت اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔) اس نے بیان کیا ہے سو میں نے

1۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 115، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب عدۃ الحامل، حدیث نمبر 1962، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 569، وزارت تعلیم

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 615، دار احیاء التراث العربیۃ

4۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 531، وزارت تعلیم

چار مہینے اور دس دن عدت گزاری ہے۔ یہ حدیث ثابت ہے۔ اسے امام مالک نے سعید بن اسحاق بن کعب بن عجرہ سے بیان کیا ہے اور اسے ان سے امام مالک، ثوری، وہیب بن خالد، حماد بن زید، عیسیٰ بن یونس اور ایک کثیر تعداد نے، ابن عیینہ، القطان اور شعبہ رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے۔

اور تحقیق امام مالک نے اسے ابن شہاب سے روایت کیا ہے اور یہ تیرے لئے کافی ہے۔

الباجی نے کہا ہے: ان سے ان کے سوا کسی اور نے روایت نہیں کیا اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بھی اسے اخذ کیا ہے۔

ابوعمر نے کہا ہے: انہوں نے اس کے ساتھ متوفیٰ عنہا زوجہا کے لئے اپنے گھر میں عدت گزارنے کا فیصلہ کیا ہے اور علمائے حجاز و عراق کے نزدیک یہ حدیث مشہور و معروف ہے کہ متوفیٰ عنہا زوجہا پر لازم ہے کہ وہ اپنے گھر میں عدت گزارے اور اس سے نہ نکلے۔ اور یہی قول حجاز، شام، عراق اور مصر وغیرہ امصار کے فقہاء کی جماعت کا ہے۔

اور داؤد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس پر لازم نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہی عدت گزارے بلکہ وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے، کیونکہ قرآن کریم میں سکنیٰ کا ذکر مطلقات کے بارے ہے اور ان کی دلیل میں سے یہ بھی ہے کہ یہ وہ مسئلہ ہے جس میں اختلاف ہے۔

انہوں نے کہا ہے: بلاشبہ یہ حدیث ایک ایسی عورت روایت کر رہی ہے جس کا علمی مرتبہ معروف نہیں۔ اور سکنیٰ کو واجب کرنا ایک حکم کو واجب کرنا ہے اور احکام ثابت نہیں ہوتے مگر کتاب اللہ کی نص کے ساتھ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ساتھ یا اجماع کے ساتھ۔

ابوعمر نے کہا ہے: جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو یہ تو بحمد اللہ ثابت ہے اور رہا اجماع تو سنت کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت نہیں کیونکہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو حجت اس کا قول ہوتا ہے جس قول کی تائید اور موافقت سنت کرے۔ و باللہ التوفیق۔

اور حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت جابر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی داؤد کے قول کی مثل مروی ہے اور اسی طرح حضرت جابر بن زید، عطا اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہم نے بھی کہا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **یَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّعَشۡرًا** اور یہ نہیں فرمایا: یعتددن فی بیوتهن (وہ اپنے گھروں میں عدت گزاریں) لہٰذا عورت جہاں چاہے عدت گزار لے (1)۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔

اور عبدالرزاق نے بیان کیا ہے کہ معمر نے زہری سے اور انہوں نے حضرت عروہ سے ہمیں حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی بہن ام کلثوم کے ساتھ عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ کی طرف نکلیں اس وقت اس کا خاوند طلحہ بن عبید اللہ شہید ہو چکا تھا اور آپ فتویٰ دیتی تھیں کہ متوفیٰ عنہا زوجہا اپنی عدت کے دوران نکل سکتی ہے (2)۔

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 615، دار احیاء التراث العربیۃ

2۔ مصنف عبدالرزاق، کتاب الطلاق، جلد 7، صفحہ 20، دار الکتب العلمیۃ

فرمایا: ہمیں ثوری نے عبید اللہ بن عمر سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے قاسم بن محمد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ لوگوں نے اس بارے میں ان کا انکار کیا ہے(1)۔ مزید فرمایا: معمر نے زہری سے ہمیں بیان کیا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت کے بارے میں رخصت دینے والوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کو لیا ہے اور اہل ورع وعزم لوگوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کو لیا ہے۔(2)

اور موطا میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایسی عورتوں کو مقام بیداء سے لوٹا دیتے تھے جن کے خاوند فوت ہو چکے ہوتے اور آپ انہیں حج سے منع کرتے تھے(3) اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے اجتہاد ہے۔ کیونکہ آپ اس گھر میں عورت کے لئے عدت گزارنے کے قائل تھے جس میں اس کا خاوند فوت ہوا، آپ عورت کے لئے اسے لازم قرار دیتے تھے اور یہی قرآن وسنت کا تقاضا ہے۔ پس عورت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ حج اور عمرہ کے لئے نکلے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

امام مالک نے کہا ہے: اسے واپس لوٹا دیا جائے گا جب تک کہ اس نے احرام نہ باندھا ہو۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب خاوند رہائش گاہ کا ذاتی طور پر مالک ہو تو عورت کے لئے اس میں عدت گزارنا لازم ہے۔ یہی اکثر فقہاء کا موقف ہے۔ (مثلاً) امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ۔ اور یہ حدیث فریعہ کی وجہ سے ہے۔ کیا گھر کو فروخت کرنا جائز ہے جب کہ وہ مرنے والے کی ملکیت ہو اور ورثاء نے اس کا ارادہ کیا ہو؟ تو ہمارے جمہور اصحاب کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے اور اس میں عورت کے عدت گزارنے کی شرط رکھی جائے گی۔

ابن قاسم نے کہا ہے: کیونکہ عورت غرماء کی نسبت سکنی کی زیادہ حقدار ہے اور محمد بن حکم نے کہا ہے: یہ بیع فاسد ہے کیونکہ اس میں یہ شک ہو سکتا ہے کہ اس کی عدت طویل ہو جائے۔

اور ابن قاسم کے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غالب سلامتی ہے اور شک نادر ہے، لہٰذا یہ عقود کو فاسد کرنے میں مؤثر نہیں ہو سکتا اور اگر اس میں اس شرط کے ساتھ بیع واقع ہو جائے پھر عورت کو شک پڑ جائے، تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب محمد میں کہا ہے کہ وہ اس مقام کا زیادہ حق رکھتی ہے یہاں تک کہ شک ختم ہو جائے اور ہمارے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ مشتری کے لئے بیع فسخ کرنے یا اسے مکمل کرنے کا اختیار ہو اور کسی شے کے ساتھ اس کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ عدت معتادہ داخل ہوا ہے۔ اور اگر بیع زوال شک کی شرط کے ساتھ واقع ہوئی تو وہ فاسد ہے۔

سحنون نے کہا ہے: مشتری کے لئے کوئی حجت نہیں ہے اگرچہ شک پانچ سال تک پھیل جائے کیونکہ وہ عدت پر داخل ہے اور عدت کبھی پانچ سال ہوتی ہے اور اسی طرح اسے ابوزید نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر خاوند کا سکنی تو ہو لیکن ذاتی ملکیت نہ ہو تو عورت کے لئے عدت کی مدت میں سکنیٰ ہوگا۔ بخلاف امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے۔ اور اس کی علت فریعہ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے حالانکہ آپ

1۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب الطلاق، جلد 7، صفحہ 20، دار الکتب العلمیة 2۔ ایضاً، جلد 7، صفحہ 26
3۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 531، وزارت تعلیم

جانتے تھے کہ اس کا خاوند رہائش گاہ کی ذاتی ملکیت نہیں رکھتا: امکثی فی بیتتک حتی یبلغ الکتاب اجلہ (1) (تو اپنے گھر میں ہی ٹھہر یہاں تک کہ لکھی ہوئی مدت اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔) یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ گھر اس عورت کا تھا، پس اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: امکثی فی بیتتک (2) کیونکہ معمر نے زہری سے روایت کیا ہے کہ اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی کہ اس کا خاوند قتل کر دیا گیا ہے اور اس نے اسے ایسے گھر میں چھوڑا ہے جو اس کا نہیں اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی اور آگے حدیث ذکر کی۔

اور ہمارے لئے معنی کی نوعیت یہ ہے کہ اس نے ایسا گھر چھوڑا جس کے باسی اس کے اس طرح مالک ہوتے ہیں کہ اس میں اس پر کوئی تاوان اور برائی نہیں ہوتی۔ تو لازم ہے کہ اس کی بیوی اسی میں عدت گزارے، اس کی اصل یہی ہے جبکہ وہ ذاتی طور پر اس کا مالک ہو۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور یہ تب ہوتا ہے جب اس نے کرایہ ادا کر رکھا ہو۔ اور رہی وہ صورت جب اس نے کرایہ نہ ادا کیا ہو تو المدونہ میں ہے کہ میت کے مال میں عورت کے لئے کوئی سکنیٰ نہیں اگرچہ وہ خوشحال ہو۔ کیونکہ عورت کا حق اس کے ساتھ متعلق ہوتا ہے جس رہائش گاہ کا وہ مکمل طور پر مالک ہوتا ہے اور جس کا کرایہ اور عوض اس نے ادا نہ کیا ہو وہ اس کا کامل طور پر مالک نہیں ہوتا بلکہ وہ اس عوض کا مالک ہے جو اس کے قبضے میں ہے اور اس میں بیوی کا کوئی حق نہیں مگر میراث کے سبب نہ کہ سکنیٰ کی حیثیت سے، کیونکہ وہ مال ہے سکنیٰ نہیں ہے اور امام محمد نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ میت کے لئے اس کے مال میں کرایہ لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فریعہ کے لئے ارشاد گرامی: امکثی فی بیتتک حتی یبلغ الکتاب اجلہ (3) یہ احتمال رکھتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس لئے حکم دیا تھا کہ اس کے خاوند نے گھر کا کرایہ ادا کیا ہوا تھا یا یہ کہ اس میں اس کی وفات تک سکونت اختیار کی گئی تھی یا یہ کہ گھر والوں نے اس کے لئے اس میں عدت کو مباح قرار دیا تھا کرائے کے عوض یا بغیر کرائے کے یا ان میں سے جو اللہ تعالیٰ نے چاہا جس سے آپ نے یہ جان لیا کہ اس گھر میں رہنا اس کے لئے لازم ہے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

مسئلہ نمبر 10۔ اس عورت کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جس کے پاس اس کے خاوند کی موت کی خبر آتی ہے اس حال میں کہ وہ اپنے خاوند کے گھر کے سوا کسی اور گھر میں ہو۔ تو امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اس کے گھر اور قرار گاہ کی طرف لوٹنے کا حکم دیا ہے اور یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور حضرت سعید بن مسیب اور نخعی نے کہا ہے کہ وہ وہیں عدت گزارے گی جہاں اس کے پاس خبر پہنچی۔ وہ وہاں سے نہیں جائے گی یہاں تک کہ عدت گزر جائے۔

ابن منذر نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول صحیح ہے، مگر یہ کہ خاوند نے اسے اس مکان کی طرف منتقل کیا ہو تو پھر عدت اسی مکان میں لازم ہوگی۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 144، وزارت تعلیم 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 11۔ اس عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی حاجات اور ضروریات کے لئے صبح کے وقت لوگوں کے عام پھیل جانے کے وقت سے لے کر شام کے بعد ان کے اپنے گھروں میں پرسکون ہونے کے وقت تک گھر سے نکل سکتی ہے اور وہ اپنے اس گھر کے سوا رات کہیں نہیں گزار سکتی۔

اور بخاری اور مسلم میں ام عطیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ نہیں کرے گی سوائے اپنے خاوند کے کہ وہ چار مہینے اور دس دن ہے۔ وہ نہ تو رنگا ہوا کپڑا پہنے گی سوائے یمنی کپڑے کے (یعنی عصب کا کپڑا) نہ وہ سرمہ لگا سکتی ہے اور نہ خوشبو لگا سکتی ہے مگر جب وہ پاک ہو تو قسط یا اظفار (1) (خوشبو کی دو قسمیں ہیں) میں سے تھوڑی سی لگا سکتی ہے۔

اور ام حبیبہ کی حدیث میں ہے: ''وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھتی ہے اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی میت پر تین دنوں سے زیادہ سوگ کا اظہار کرے مگر اپنے خاوند پر چار مہینے اور دس دن (2) (سوگ کرے گی) الحدیث۔ الاحداد کا معنی ہے: عورت جب تک عدت میں ہے اس کا ہر قسم کی زیب و زینت کو ترک کر دینا مثلاً بھڑکیلا لباس، خوشبو، زیورات، سرمہ اور مہندی لگانا وغیرہ۔ کیونکہ زینت ازواج کی طرف دعوت دیتی ہے، پس سد ذرائع کے طور پر اس سے منع کر دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی حرمات کو تار تار ہونے سے بچانے کے لئے اور عورت زیتون اور تلوں کا تیل کسی خوشبو میں ملا کر اپنے سر کو نہ لگائے۔ کہا جاتا ہے: امرأۃ حاد و مُحِدٌّ سوگ منانے والی عورت۔ اصمعی نے کہا ہے: ہم حدّ نہیں پہنچانتے۔ اور لایحل کا فاعل وہ مصدر ہے جسے تُحِدُّ مع اَنْ سے بنانا ممکن ہے یہی مراد ہے تو گویا کہ اس نے کہا: الاحداد۔

مسئلہ نمبر 12۔ حضور نبی مکرم ﷺ کا عورت کو ایمان سے متصف کرنا دو قولوں میں سے ایک کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک ایسی کتابیہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس پر احداد نہیں ہے۔ یہ قول ابن کنانہ اور ابن نافع کا ہے۔ اور اسے اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن منذر نے کہا ہے اور ان سے ابن القاسم نے روایت کیا ہے کہ اس پر بھی مسلمان عورت کی طرح احداد (سوگ کا اظہار کرنا) ہے۔ یہی لیث، شافعی، ابو ثور اور ہمارے عام اصحاب نے کہا ہے، کیونکہ یہ عدت کے احکام میں سے ایک حکم ہے اور یہ مسلمان کے تحت کتابیہ عورت پر اسی طرح لازم ہے جس طرح رہائش کی جگہ اور عدت لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ حضور نبی مکرم ﷺ کے ارشاد میں: فوق ثلاث الا علی زوج (3) اس پر دلیل ہے کہ مسلمان عورتوں پر تین دنوں سے زیادہ اپنے ازواج کے سوا کسی پر احداد کرنا حرام ہے اور ان پر تین دن سوگ کا اظہار کرنا مباح ہے۔ مرنے کے بعد آنے والی رات سے لے کر تیسری رات کے اختتام تک اسے شمار کیا جائے گا۔ اگر کسی عورت کا دیور فوت ہوا اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 488، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تلبس الحادۃ... الخ، حدیث نمبر 4924، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 804، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب الکحل للحادۃ، حدیث نمبر 4921، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 488، وزارت تعلیم

حال میں کہ ابھی دن یا رات کا کچھ حصہ باقی تھا تو اسے وہ لغو قرار دے گی اور آنے والی رات سے حساب لگائے گی۔

مسئلہ نمبر 14۔ یہ حدیث اپنے حکم کے عام ہونے کے سبب ان تمام زوجات کو شامل ہے جن سے ان کے ازواج فوت ہو جائیں اور اس میں لونڈیاں، آزاد عورتیں، بڑی اور چھوٹی سب داخل ہیں۔ اور یہی جمہور علماء کا مذہب ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ لونڈی اور صغیرہ پر احداد نہیں ہے آپ سے اسے قاضی ابو الولید الباجی نے بیان کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: لونڈی جو کسی کی بیوی ہو وہ جملہ ازواج میں اور عموم اخبار میں داخل ہے اور یہ قول امام مالک، شافعی، ابوثور اور اصحاب الرائے رحمہم اللہ علیہم کا ہے اور مجھے اس بارے کسی کا اختلاف یاد نہیں ہے اور نہ میں انہیں جانتا ہوں کہ وہ ام ولد پر احداد ہونے کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں جب اس کا آقا فوت ہو جائے۔ کیونکہ وہ زوجہ نہیں ہوتی اور احادیث ازواج کے بارے میں وارد ہیں۔

الباجی نے کہا ہے: صغیرہ جب ان عورتوں میں سے ہو جو امر و نہی کی عقل رکھتی ہیں اور اس کے لئے جو حد بیان کی جائے اس کا وہ التزام کرتی ہو تو اسے احداد کا حکم دیا جائے گا اور اگر وہ اپنی صغرسنی کے سبب کسی شے کو نہ جانتی ہو تو ابن مزین نے عیسیٰ سے روایت کیا ہے کہ اس کے گھر والے اسے ان تمام چیزوں سے روکیں گے جن سے کبیرہ اجتناب کرتی ہے اور یہ (احداد) اس کے لئے لازم ہے اور صغیرہ پر احداد کے واجب ہونے کی دلیل وہ روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عورت نے اپنی اس بیٹی کے بارے پوچھا جس کا خاوند فوت ہو چکا تھا اور اس کی آنکھیں دکھنے لگیں کہ کیا وہ سرمہ لگا سکتی ہے؟ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں" آپ نے یہ دو بار یا تین بار پوچھا تو آپ ہر بار یہی کہتے رہے "نہیں" (1) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عمر کے بارے نہ پوچھا۔ اگر صغر اور کبر کے سبب حکم مختلف ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عمر کے بارے ضرور سوال کرتے تاکہ آپ اس کا حکم بیان فرمائیں اور اس قسم کے مسئلہ میں بیان میں تاخیر جائز نہیں ہوتی اور یہ دلیل بھی ہے کہ ہر وہ جس پر عدت وفات لازم ہے اس پر کبیرہ کی طرح احداد کرنا بھی لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ ابن منذر نے کہا ہے: میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ خضاب بھی اس زینت میں داخل ہے جس سے منع کیا گیا ہے اور انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ سوگ والی عورت کے لئے رنگے ہوئے کپڑے اور زرد رنگ کے کپڑے پہننا جائز نہیں ہے مگر ایسا کپڑا جسے سیاہ رنگ سے رنگا جائے کیونکہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ علیہما نے اس کی رخصت دی ہے۔ اور زہری نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسے چاہئے کہ وہ عصب کا کپڑا نہ پہنے۔ اور یہ حدیث کے خلاف ہے۔

اور المدونہ میں امام مالک نے کہا ہے: وہ یمن کے عصب کا باریک کپڑا نہیں پہن سکتی اور آپ نے موٹے کپڑے کی گنجائش رکھی ہے۔ ابن قاسم نے کہا ہے: کیونکہ باریک کپڑا رنگے ہوئے کپڑے کے قائم مقام ہے (2) اور وہ ریشم، کتان اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 314، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تحد المتوفی الخ، حدیث نمبر 4920، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب العدۃ و طلاق السنۃ، جلد 5، صفحہ 113، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

روئی کا باریک اور موٹا کپڑا پہن سکتی ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: ہر اس نے رخصت دی ہے جس نے آپ سے سفید لباس کے بارے کچھ محفوظ کیا ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: امام شافعی کا موقف یہ ہے کہ ہر وہ رنگ جو باعث زینت ہو سوگ منانے والی عورت اسے مس نہ کرے گی، چاہے وہ باریک ہو یا موٹا ہو۔ اسی طرح قاضی عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رنگوں میں سے ہر وہ جس کے ساتھ عورتیں اپنے خاوندوں کے لئے زیب وزینت اور حسن کا اظہار کرتی ہیں سوگ منانے والی عورت کو چاہئے کہ وہ اس سے باز رہے۔

اور ہمارے بعض متاخرین مشائخ نے ایسا عمدہ سفید لباس پہننے سے بھی منع کیا ہے جس سے زیب وزینت کی جاسکتی ہے اور اسی طرح اعلیٰ قسم کا سیاہ لباس (پہننے سے بھی منع کیا ہے)۔

ابن المواز نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ زیور نہیں پہن سکتی اگرچہ وہ لوہے کا بنا ہوا ہو، فی الجملہ ہر وہ شے جسے ایک عورت اس طور پر پہنتی ہے کہ اسے حسن وخوبصورتی کے اظہار کے لئے بطور زیور استعمال کیا جاتا ہو سوگ منانے والی عورت اسے نہیں پہن سکتی۔

اور ہمارے اصحاب نے جواہرات، یواقیت اور زمرد پر کوئی نص بیان نہیں کی حالانکہ وہ بھی زیور کے معنی میں داخل ہیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 16۔ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس پر احداد کے واجب ہونے پر سوائے حسن کے تمام لوگوں نے اجماع کیا ہے حسن نے کہا ہے: احداد واجب نہیں۔ اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے عبداللہ بن شداد بن الہاد نے اسماء بنت عمیس سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جب حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''تین دن تک سوگ کا لباس پہن لے پھر جو چاہے وہ کر (1)۔''

ابن منذر نے کہا ہے: تمام اہل علم میں سے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ احداد کے قائل نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اور وہ جس کا خاوند فوت ہو جائے وہ دونوں سرمہ لگا سکتی ہیں، خضاب لگا سکتی ہیں اور جو چاہیں وہ کر سکتی ہیں۔ حالانکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث سے احداد ثابت ہے اور جس کے پاس بھی یہ احادیث پہنچی ہیں اس نے اسے تسلیم کیا ہے۔ شاید حسن بصری تک یہ احادیث نہیں پہنچیں یا پہنچی تو ہیں لیکن آپ نے اسماء بنت عمیس کی حدیث کے سبب ان کی تاویل کر لی ہے کہ اس نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر سوگ کا اظہار کرنے کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت طلب کی اور یہ ان کی بیوی تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے تین دن کی اجازت عطا فرمائی اور پھر تین دن گزرنے کے بعد اس کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ طہارت کا اہتمام کرے اور سرمہ لگا لے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم نے کئی وجوہ سے اس کا رد کیا ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہ حدیث شاذ ہے، اس کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اسحاق نے بھی کہا ہے۔

1۔ مسند ابن جعد، جلد 1، صفحہ 398، مؤسسہ نادر بیروت

مسئلہ نمبر 17۔ امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ طلاق والی عورت پر احداد نہیں ہے، چاہے طلاق رجعی ہو یا بائن، ایک ہو یا اس سے زیادہ۔ یہی قول ربیعہ اور عطا کا ہے۔

اور علمائے کوفہ، امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، ثوری، حسن بن حی، ابوثور اور ابوعبید رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اس پر احداد ہے اور یہی حضرت سعید بن مسیب، سلیمان بن یسار، ابن سیرین اور حکم بن عیینہ کا قول ہے۔

حکم نے کہا ہے کہ احداد متوفی عنہا زوجہا کی نسبت اس پر زیادہ مؤکد اور شدید ہے اور معنی کے اعتبار سے دونوں عدت میں ہیں جس کے ساتھ نسب کی حفاظت کی جاتی ہے۔

امام شافعی، احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: احتیاط اسی میں ہے کہ مطلقہ عورت کو زینت سے بچنا چاہئے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ تین دنوں سے زیادہ کسی میت پر سوگ کا اظہار کرے مگر خاوند پر چار مہینے اور دس دن (1) (سوگ منائے)۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اور طلاق دینے والا زندہ ہو اس پر احداد نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو ایسی طلاق دی جس میں وہ رجوع کا مالک ہو پھر وہ عدت گزرنے سے پہلے فوت ہو جائے تو عورت پر عدت وفات ہوگی اور وہ اس کی وارث بھی ہوگی۔ اور وہ عورت جسے حالت مرض میں تین طلاقیں دی جائیں اس کی عدت میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ وہ عدت طلاق گزارے گی (2)۔ یہ قول امام مالک، امام شافعی، یعقوب، ابوعبید اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہی ہم کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیض والی عورتوں کی عدت حیض قرار دی ہے اور اس پر اجماع ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں دی جائیں اگر وہ فوت ہو جائے تو طلاق دینے والا اس کا وارث نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ اس کی بیوی نہیں رہی اور جب وہ اس کی بیوی نہیں تو پھر وہ اس کا خاوند بھی نہیں ہوگا۔

اور ثوری نے کہا ہے: دو عدتوں میں سے جو زیادہ ہوگی اس کے مطابق عدت گزارے گی اور نعمان و محمد نے کہا ہے: اس پر چار مہینے اور دس دن عدت ہوگی اور اس میں تین حیض مکمل کرے گی۔

مسئلہ نمبر 19۔ علماء کا ایسی عورت کے بارے اختلاف ہے جسے اپنے خاوند کے فوت ہونے یا اس کی طرف سے طلاق کی خبر پہنچی۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: طلاق اور وفات کی صورت میں عدت اس دن سے ہوگی جس دن وہ مرتا ہے یا طلاق دیتا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے اور یہی حضرت مسروق، عطا اور تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے اور یہی امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابوعبید، ثوری، ابوثور، اصحاب الرائے اور ابن منذر کا موقف ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 804، وزارت تعلیم 2۔ المدونۃ الکبری، کتاب الطلاق، جلد 6، صفحہ 35، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر عدت اس دن سے ہوگی جس دن اس کے پاس خبر پہنچی۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت حسن بصری، قتادہ، عطا خراسانی اور جلاس بن عمرو رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور حضرت سعید بن مسیب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اگر بینہ قائم ہو جائے تو اس کی عدت یوم وفات یا یوم طلاق سے ہوگی اور اگر بینہ قائم نہ ہو تو اس دن سے جس دن اس کے پاس خبر پہنچے گی۔ پہلا قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عدت کو وفات یا طلاق کے ساتھ معلق کیا ہے اور اس لئے بھی کہ اگر وہ اس کی موت کے بارے جان لے اور احداد چھوڑ دے تو عدت گزر جاتی ہے اور جب اس نے علم نہ ہونے کے سبب احداد چھوڑ دیا تو یہ اور زیادہ آسان ہے کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ صغیرہ کی عدت گزر جاتی ہے اور اس پر احداد نہیں ہوتا اور یہ بھی کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر وہ حاملہ ہو اور وہ خاوند کی طلاق یا اس کی وفات کا علم نہ رکھتی ہو پھر وہ اپنا حمل وضع کر لے تو بلاشبہ اس کی عدت گزر گئی اور اس مسئلہ اور مختلف فیہا مسئلہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور ان کی دلیل جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس کی عدت اس دن سے ہوگی جس دن اس کے پاس خبر پہنچے گی یہ ہے کہ زیب و زینت ترک کرنے کے سبب عدت عبادت ہے اور وہ قصد اور نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتی اور قصد نہیں ہو سکتا مگر علم کے بعد۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 20۔ آزاد، لونڈی، صغیرہ، کبیرہ، وہ عورت جو حیض کی عمر کو نہ پہنچے، وہ جو حائضہ ہو اور حیض سے ناامید ہو جائے اور کتابیہ عورت اس کے ساتھ دخول ہوا یا نہیں جبکہ وہ غیر حاملہ ہو ان تمام پر عدت وفات لازم ہوتی ہے اور سوائے لونڈی کے ان تمام کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔ کیونکہ اس ارشاد میں آیت عام ہے: يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا اور وہ لونڈی جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت دو مہینے اور پانچ راتیں ہیں۔

ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کی عدت بالا جماع آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے مگر وہ جو اصم سے بیان کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے آزاد اور لونڈی کو اس میں برابر قرار دیا ہے، حالانکہ اجماع اس سے پہلے ہے لیکن اپنے بہرے پن کے سبب (1) اس نے سنا نہیں۔

الباجی نے کہا ہے: اس بارے میں ہم کوئی اختلاف نہیں جانتے سوائے اس کے جو ابن سیرین سے مروی ہے اور وہ ان سے ثابت نہیں ہے کہ انہوں نے کہا ہے: لونڈی کی عدت آزاد عورت کی عدت کی مثل ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اصم کا قول من حیث النظر صحیح ہے کیونکہ وہ آیات جو مہینوں اور حیضوں کے ساتھ وفات اور طلاق کی عدت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں وہ لونڈی اور آزاد کے حق میں عام ہیں۔ پس اس نقطۂ نظر سے آزاد اور لونڈی کی عدت برابر ہے۔ کیونکہ عمومات میں آزاد اور لونڈی کے مابین کوئی فرق نہیں ہے اور جس طرح نکاح میں لونڈی اور آزاد برابر ہیں اسی طرح وہ عدت میں بھی اس کے ساتھ برابر ہوگی۔ واللہ اعلم

ابن عربی نے کہا ہے: امام مالک سے روایت ہے کہ کتابیہ عورت تین حیضوں کے ساتھ عدت گزارے گی تب اس سے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 210، دار الفکر

براءت رحم ہوگی اور یہ آپ سے انتہائی فاسد قول منقول ہے، کیونکہ اس قول نے اسے (کتابیہ کو) آیت وفات کے عموم سے خارج کر دیا ہے حالانکہ وہ اس میں شامل ہے اور اس نے اسے آیت طلاق کے عموم میں داخل کر دیا ہے حالانکہ یہ اس میں سے نہیں ہے(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی پر اس کی بنا ہے جو مدونہ میں ہے اس پر عدت نہیں اگر وہ غیر مدخول بہا ہو کیونکہ اس کی براءت رحم معلوم ہے اور یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ خاوند کے فوت ہونے کے بعد کسی مسلمان یا غیر مسلم سے شادی کر سکتی ہے کیونکہ جب اس پر عدت وفات نہیں ہے اور نہ ہی دخول کے سبب استبراء رحم لازم ہے تو پھر وہ ازواج کے لئے حلال ہے۔

مسئلہ نمبر 21۔ اور علماء نے ام ولد کی عدت کے بارے اختلاف کیا ہے جب اس کا آقا فوت ہو جائے۔

پس ایک گروہ نے کہا ہے: اس کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔ یہی تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ ان میں سے حضرت سعید بن مسیب، حضرت زہری، حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہم اور کئی اور بھی ہیں اور یہی امام اوزاعی اور اسحاق رحمہما اللہ نے کہا ہے۔

اور ابوداؤد اور دارقطنی نے قبیصہ بن ذؤیب سے اور انہوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم پر ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مشتبہ نہ بناؤ کہ متوفیٰ عنہا زوجہا کی عدت چار مہینے دس دن ہے یعنی ام ولد کے حق میں۔ یہ لفظ ابوداؤد کے ہیں اور دارقطنی نے کہا ہے: یہ موقوف ہے۔ اور یہی درست ہے اور یہ مرسل ہے کیونکہ قبیصہ نے عمرو سے سماع نہیں کیا(2)۔

ابن منذر نے کہا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد اور ابوعبید نے ضعیف قرار دیا ہے۔

اور حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی عدت تین حیض ہے اور یہی قول حضرت عطا، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکہ عدت آزادی کی حالت میں واجب ہو رہی ہے لہٰذا یہ واجب ہے کہ عدت کامل ہو اور اس کی اصل آزاد عورت کی عدت ہے۔

امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور ابوثور نے کہا ہے: اس کی عدت ایک حیض ہے(3) اور یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

اور طاؤس سے روایت ہے کہ اس کی عدت اس آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے اور اسی طرح حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے بارے میں یہی کہتا ہوں کہ وہ سب سے قلیل مدت ہے جو کچھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 211، دار الفکر

2۔ سنن دارقطنی، باب المہر، جلد 2، صفحہ 310، دار المحاسن قاہرہ۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، باب فی عدۃ ام الولد، حدیث نمبر 1964، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب العدۃ وطلاق السنۃ، جلد 5، صفحہ 120، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

اس کے بارے میں کہا گیا ہے اور اس میں کوئی سنت نہیں ہے جس کی اتباع کی جائے اور نہ ہی کوئی اجماع ہے جس پر اعتماد کیا جائے۔ آزادی کی حالت میں اس کی عدت میں ان کے اختلاف کا ذکر حالت وفات میں اختلاف کی طرح برابر برابر ہے۔ مگر امام اوزاعی نے کہا ہے کہ آزادی کی حالت میں اس کی عدت تین حیض ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان اقوال میں سے اصح قول امام مالک کا ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔ پس حیضوں کے انتظار میں یہ شرط ہے کہ وہ طلاق کے سبب ہو۔ پس اس کے ساتھ کسی غیر سبب سے ہونے کی نفی ہوگئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا۔ پس اس کے وجوب کو اس کے ساتھ معلق کیا ہے کہ انتظار کرنے والی بیوی ہو۔

پس یہ اس پر دلیل ہے کہ لونڈی اس کے خلاف ہے اور یہ بھی دلیل ہے کہ بے شک یہ ملک یمین کے سبب موطوءہ لونڈی ہے پس اس کا استبراء رحم ایک حیض سے ہے۔ لونڈی میں اصل یہی ہے۔

مسئلہ نمبر 22۔ جب یہ ثابت ہوگیا تو کیا ام ولد کی عدت محض استبرا ہے یا عدت ہے؟ پس اس کے بارے ابو محمد نے اپنی معونت میں ذکر کیا ہے کہ ایک حیض استبراء ہے اور عدت نہیں ہے۔ اور المدونہ میں ہے کہ ام ولد پر عدت ہے اور اس کی عدت ایک حیض ہے جس طرح کہ آزاد عورت کی عدت تین حیض ہیں۔ اور اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب ہم نے کہا: یہ عدت ہے تو امام مالک نے فرمایا: میں یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ کسی سے وعدہ کرے جو اس سے نکاح کرلے گا مگر یہ کہ ایک حیض گزر جائے (1)۔

ابن القاسم نے کہا ہے: مجھ تک آپ سے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ نے کہا کہ وہ اپنے گھر میں ہی رات گزارے گی اور آپ نے اس کی مدت استبرا کے لئے عدت کا حکم ثابت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 23۔ اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہوں یا ایسی مطلقہ جس پر خاوند کو رجوع کا حق ہو درآنحالیکہ وہ حاملہ ہو اس کا خرچہ خاوند پر واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كُنَّ اُولٰتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق: 6) (اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہیں، یہاں تک کہ وہ بچہ جنیں۔)

اور حاملہ متوفی عنہا زوجہا کے نفقہ کے واجب ہونے کے بارے میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی نفقہ نہیں ہے۔ اسی طرح حضرات جابر بن عبداللہ، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن مسیب، حضرت عطا، حضرت حسن، حضرت عکرمہ، عبدالملک بن یعلی، یحییٰ انصاری، ربیعہ، مالک، احمد اور اسحاق رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور ابو عبید نے اصحاب الرائے سے اسے بیان کیا ہے۔ اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے لئے کل مال سے نفقہ ہوگا اور یہ قول حضرت علی اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، شریح، ابن سیرین، شعبی، ابو العالیہ، نخعی، جلاس بن عمرو، حماد بن ابی سلیمان، ایوب سختیانی، سفیان ثوری اور ابو عبید رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے۔

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدۃ وطلاق السنۃ، جلد 5، صفحہ 121، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

ابن منذر نے کہا ہے: میں پہلے قول کے مطابق کہتا ہوں، کیونکہ انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ہر اس آدمی کا نفقہ جس کے نفقہ پر اسے زندگی میں مجبور کیا جا سکتا ہے مثلاً اس کے بچے، بیوی اور اس کے والدین وہ نفقہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے تو اسی طرح اس کی ازواج میں سے حاملہ کا نفقہ بھی اس سے ساقط ہو جائے گا۔

اور قاضی ابو محمد نے کہا ہے: کیونکہ حمل کا نفقہ دین ثابت نہیں ہے کہ وہ اس کی موت کے بعد اس کے مال سے متعلق ہو جائے، اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تنگدستی کے سبب اس سے ساقط ہو جاتا ہے تو موت کے سبب اس کا ساقط ہونا زیادہ اولیٰ اور زیادہ مناسب ہے۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا۔ علماء نے ان چار ماہ اور دس دن میں اختلاف کیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے متوفیٰ عنہا زوجہا کی عدت کے لئے وقت مقرر فرمایا ہے کہ کیا ان میں سے وہ ایک بار حیض آنے کی محتاج ہوتی ہے یا نہیں؟ تو بعض نے کہا ہے: جب وہ عورت موطوءہ ہو تو اس کی براءت رحم نہ ہوگی مگر اس حیض کے ساتھ جو اسے چار مہینے اور دس دن کے دوران آئے گا ورنہ وہ مشکوک ہو جائے گی اور بعض دوسروں نے کہا ہے: اس پر چار ماہ اور دس دن سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر یہ کہ وہ اپنے آپ کو واضح شک میں دیکھے۔ کیونکہ اس مدت میں حیض نہیں آتا یا ان میں سے ہو جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا یا اسے پہچان لیا جائے کہ اس کا حیض اسے نہیں آئے گا مگر اس مدت سے زیادہ اور اکثر مدت میں۔

مسئلہ نمبر 25۔ قولہ تعالیٰ: وَّعَشْرًا۔ وکیع نے ابو جعفر الرازی سے، انہوں نے ربیع بن انس سے اور انہوں نے ابو العالیہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ چار مہینوں کے ساتھ دس دن کو کیوں ملایا گیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: کیونکہ اتنی مدت میں روح پھونکی جاتی ہے۔ عنقریب سورۃ الحج میں اس کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اصمعی نے کہا ہے: بے شک ہر حاملہ کا بچہ اس کے حمل کی نصف مدت میں حرکت کرنے لگتا ہے۔ پس یہ بھی حرکت کرنے لگے گا (یعنی فھی مرکفتین ذکر کیا ہے) اور کسی اور نے کہا ہے: ارکفت فی مرکفۃ (اس نے حرکت دی پس یہ حرکت کرنے والی ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

و　مرکفۃ　صریحی　ابوھا　تھان　لھا　الغلامۃ　والغلام

اس میں مرکفۃ اسی معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور خطابی نے کہا ہے: قولہ: وَّعَشْرًا اس سے مراد راتوں سمیت دن ہیں۔ واللہ اعلم

اور مبرد نے کہا ہے: العشر مؤنث لایا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد مدت ہے۔ اس کا معنی ہے و عشر مدد ہر مدت ایک دن اور ایک رات کی ہے۔ پس رات اپنے دن کے ساتھ مل کر زمانے کی ایک مدت معلوم ہے اور کہا گیا ہے: عشرۃ نہیں فرمایا راتوں کے حکم کو غلبہ دیتے ہوئے کیونکہ رات دن سے پہلے ہوتی ہے اور ایام ان کے ضمن میں ہوتے ہیں۔ وَّعَشْرًا لفظ کے اعتبار سے زیادہ خفیف ہے (1)۔ پس راتوں کو دنوں پر غلبہ دیا جاتا ہے جب یہ تاریخ میں جمع ہو جائیں، کیونکہ مہینوں کی ابتدا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 314، دار الکتب العلمیہ

رات سے چاند طلوع ہونے کے وقت ہوتی ہے تو جب مہینے کی ابتدا اور پہلا حصہ رات ہے تو پھر رات کو ہی غلبہ دیا جائے گا۔ آپ کہتے ہیں: صمنا خمسا من الشھر ہم نے مہینے سے پانچ روزے رکھے۔ پس راتیں غالب ہوتی ہیں اگرچہ روزہ دن کے وقت ہوتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور علمائے کوفہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد دن اور راتیں ہیں۔

ابن منذر نے کہا ہے: پس اگر کسی عقد کرنے والے نے اس سے اس قول کی بنا پر نکاح کیا درآنحالیکہ چار مہینے اور دس راتیں گزر چکی تھیں تو وہ نکاح باطل ہوگا یہاں تک کہ دسواں دن بھی گزر جائے۔

اور بعض فقہاء نے کہا ہے کہ جب اس کی مدت چار مہینے اور دس راتیں گزر گئی تو وہ ازواج کے لئے حلال ہو گئی اور وہ اس لئے کہ انہوں نے عدت کو مبہم دیکھا تو تانیث کو غلبہ دے دیا اور اسے راتوں پر محمول کر دیا۔ اور یہ موقف فقہاء میں سے امام اوزاعی اور متکلمین میں سے ابوبکر الاصم نے اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اربعة اشھر وعشر لیال پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ نے اجل (مدت) کی نسبت ان (عورتوں) کی طرف کی ہے کیونکہ وہ انہیں کے معاملے کی حد بیان کی گئی ہے اور اس سے مراد ہے عدت کا گزرنا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے اور یہ اس حکم کے ساتھ متعلق ہے جو حکام اور اولیاء کے لئے ہے(1)۔ فِيْمَا فَعَلْنَ اس سے مراد شادی کرنا ہے اور جو کچھ اس سے پہلے ہوتا ہے (یعنی) بناؤ سنگھار کرنا اور احداد کو ترک کرنا وغیرہ(2)۔ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی ایسے طریقے سے جس کی شریعت میں اجازت دی گئی ہے یعنی ازواج کو دیکھنے کا اختیار اور عقد ہونے سے پہلے مہر مقرر کرنا وغیرہ کیونکہ یہ اولیاء کا حق ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ اولیاء کو اختیار ہے کہ وہ انہیں عدت کے دوران شادی کے لئے بناؤ سنگھار کرنے اور آراستہ ہونے اور حسن و خوبصورتی کا اظہار کرنے سے منع کریں۔ اس میں اسحاق کے اس قول کا رد بھی ہے کہ مطلقہ عورت جب تیسرے حیض میں داخل ہو جائے تو وہ بائنہ ہو جاتی ہے اور پہلے خاوند کے لئے رجعت کا حق منقطع ہو جاتا ہے مگر یہ کہ اس کے لئے شادی کرنا حلال نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ غسل کر لے اور شریک سے روایت ہے کہ اس کے خاوند کے لئے رجعت کا حق رہتا ہے جب تک وہ غسل نہ کرے اگرچہ بیس سال بعد تک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ اور یہاں بلوغ الاجل سے مراد تیسرے حیض کے خون میں اس کے داخل ہونے کے ساتھ عدت کا گزرنا ہے اور اس میں غسل کا ذکر نہیں تو جب اس کی عدت گزر گئی وہ ازواج کے لئے حلال ہو گئی اور بناؤ سنگھار میں سے جو بھی وہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو حدیث مروی ہے اگر وہ صحیح

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 314، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

ہے تو وہ استحباب پر محمول ہوگی۔ واللہ اعلم۔

(اشارہ اس حدیث کی طرف ہے: عن ابن عباس من أن المرأة اذا طعنت فی الحیضة الثالثة بانت و انقطعت رجعة الزوج، و ھذا قول اسحاق المتقدم و ھو ضعیف) حاشیہ قرطبی

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾

''اور کوئی گناہ نہیں تم پر اس بات میں کہ اشارہ سے پیغام نکاح دو ان عورتوں کو یا جو چھپائے ہو تم اپنے دلوں میں، جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے، البتہ نہ وعدہ لینا ان سے خفیہ طور پر بھی مگر یہ کہ کہو (ان سے) شریعت کے مطابق کوئی بات اور نہ پکی کرلو نکاح کی گرہ یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت اپنی انتہا کو اور جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا حلم والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا جُنَاحَ یعنی کوئی گناہ نہیں، جُنَاحَ کا معنی گناہ ہے، یہی معنی شریعت میں اصح ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد شاق گزرنے والا امر ہے۔ لغت کے اعتبار سے یہ معنی اصح ہے۔ شاخ نے کہا ہے:

اذا تعلو براکبھا خلیجا　　تذکر مالدیہ من الجناح

اس میں الجناح سے مراد مشقت آمیز امر ہے۔

اور قولہ تعالیٰ: عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم اس میں خطاب تمام لوگوں کو کیا گیا ہے: اور حکماً اس سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے دل میں معتدہ کے ساتھ نکاح کی خواہش رکھتا ہو(1)۔ یعنی عدۃ وفات میں اشارۃ پیغام نکاح دینے میں تم پر کوئی بوجھ اور گناہ نہیں۔ تعریض تصریح کی ضد ہے۔ اس سے مراد افہام المعنی بالشئ المحتمل لہ ولغیرہ ہے یعنی کسی معنی کو ایسی شے کے ساتھ سمجھا دینا جو اس معنی اور دوسرے کا احتمال رکھتی ہو اور یہ عرض الشئ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی کسی شے کی جانب اور طرف ہے۔ گویا وہ اس طرح مطلوبہ شے کے اردگرد گھومتا رہتا ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ

اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ میرے اس قول سے ہے عرضت الرجل یعنی میں نے آدمی کو بطور تحفہ ہدیہ پیش کیا اور حدیث طیبہ میں ہے: ان رکبا من المسلمین عرضوا رسول اللہ ﷺ و ابا بکر ثیابا بیضا۔ ای اھدوا لھما۔ کہ مسلمان شہسواروں نے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سفید کپڑے بطور تحفہ پیش کیے۔ اور کلام کے ساتھ تعریض کرنے والا وہ ہوتا ہے جو اپنے ساتھی تک بات اس طرح پہنچاتا ہے کہ وہ اس کا معنی ومفہوم سمجھ جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس پر اجماع امت ہے کہ عدت گزارنے والی عورت کے ساتھ ایسی گفتگو کرنا جو اس کے نکاح کے بارے میں صریح نص ہو اور اس پر متنبہ کرنے والی ہو وہ جائز نہیں ہے اور اسی طرح اس پر بھی امت کا اجماع ہے کہ اس کے ساتھ ایسی کلام کرنا جو فحش ہو اور جماع کا ذکر کرنا یا ایسی گفتگو جو جماع پر ابھارتی ہو یہ بھی جائز نہیں ہے اور اسی طرح جو کلام بھی اس معنی ومفہوم کے مشابہ ہو گا وہ جائز نہیں اور اس کے سوا جو گفتگو ہے اسے جائز قرار دیا گیا ہے اور تصریح کے جو قریب تر کلام ہے وہ حضور نبی رحمت ﷺ کا وہ قول ہے جو آپ نے فاطمہ بنت قیس کے ساتھ کیا: کونی عند ام شریك ولا تسبقینی بنفسك(1) (تو ام شریک کے پاس رہ اور اپنے بارے میں مجھ سے سبقت نہ لے جا) اور وہ عورت جو طلاق رجعی کی عدت گزار رہی ہو بالا جماع اسے تعریضاً پیغام نکاح دینا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ زوجہ کی طرح ہے اور رہی وہ عورت جو طلاق بائن کی عدت میں ہو تو صحیح قول یہی ہے کہ اسے تعریضاً پیغام نکاح دینا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

تعریض کی تفسیر میں بہت سے الفاظ ذکر کیے گئے ہیں۔ ان کا مجموعہ دو قسموں کی طرف لوٹتا ہے:

پہلی قسم یہ ہے کہ وہ اس کا ذکر اس کے ولی سے کرے اور اسے اس طرح کہے لا تسبقنی بھا (تو اس کے بارے مجھ سے (کسی اور کی طرف) آگے نہ بڑھنا۔) اور دوسری قسم یہ ہے کہ وہ بغیر کسی واسطہ کے اس کی طرف اس سے اشارہ کرے۔ اور اسے اس طرح کہے: بلاشبہ میں شادی کا ارادہ رکھتا ہوں یا تو بڑی خوبصورت ہے یا بلاشبہ تو صالحہ اور نیک ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ تجھے خیر و برکت عطا فرمانے والا ہے۔ میں تجھ سے رغبت رکھتا ہوں، کون ہے جو تجھ سے اعراض کر سکتا ہے، بے شک تجھ میں رغبت بہت زیادہ ہے، بلاشبہ مجھے کسی عورت کی حاجت وضرورت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کوئی امر مقدر فرمائے گا تو وہ ہو جائے گا۔

یہ تمام امام مالک اور ابن شہاب کی بیان کردہ تمثیلات ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ یہ کہے: ''تو اپنے بارے میں مجھ سے تجاوز نہ کرنا(2)''۔ اور کوئی حرج نہیں کہ وہ اسے کوئی ہدیہ اور تحفہ دے اور یہ کہ عدت کے دوران اس کا کام کاج کر دے جبکہ وہ اس کی شان کے مطابق ہو۔ ابراہیم نے یہی کہا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ اپنی مدح اور تعریف کرے اور وہ اپنے پسندیدہ افعال اور خاندانی شرافت کا ذکر کرے جس میں اشارۃً شادی کا تذکرہ بھی ہو۔

ابوجعفر محمد بن علی بن حسین رضی اللہ عنہم نے اسی طرح کہا ہے۔ سکینہ بنت حنظلہ نے بیان کیا ہے کہ محمد بن علی رضی اللہ عنہما میرے پاس اجازت لے کر آئے اور میرے خاوند کے فوت ہونے کے وقت سے ابھی میری عدت نہیں گزری تھی اور انہوں نے کہا: تو

1۔ ۔ ۔ ، جز، جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ

2۔ جامع البیان، جلد 2، صفحہ 619، دار احیاء التراث العربیۃ

جانتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میری قرابت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے میری قرابت ہے اور عرب میں میرے مقام و مرتبہ کو بھی تو جانتی ہے۔ میں نے کہا: اے ابوجعفر! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے، بلاشبہ تم ایسے آدمی ہو جس سے مؤاخذہ کیا جائے گا، تم مجھے میری عدت کے دوران پیغام نکاح دے رہے ہو۔ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ میں نے تو تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اپنی قرابت کے بارے بتایا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام سلمہ کے پاس تشریف لے گئے۔ وہ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے بیوہ ہو چکی تھیں اور ارشاد فرمایا: ''یقیناً تو جانتی ہے میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس کا پسندیدہ ہوں اور میری قوم میں میرے مقام سے بھی تو آگاہ ہے۔'' یہی پیغام نکاح تھا۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے(1) اور معتدہ کے پاس ہدیہ بھیجنا بھی جائز ہے اور یہ بھی تعریض میں سے ہے۔ سحنون اور بہت سے علماء نے یہی کہا ہے اور ابراہیم نے بھی اسی طرح کہا ہے اور حضرت مجاہدؒ نے یہ ناپسند کیا ہے کہ کوئی اسے یہ کہے: ''تو اپنے بارے میں مجھ سے سبقت نہ کرنا اور وہ اسے ہی خفیہ معاہدہ جان لے(2)۔

قاضی ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تاویل کی بنا پر جائز ہے جو آپ نے فاطمہ کو فرمایا تھا کہ یہ اس کے لئے اس آدمی کے بارے میں رائے کے طور پر ہے جو اس سے شادی کرے گا نہ کہ اس طور پر کہ اس سے اس نے اپنی ذات کا ارادہ کیا ہو، کیونکہ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے خلاف ہے(3)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ الخطبہ خاء کے کسرہ کے ساتھ، اس کا معنی ہے کلام اور قصد سے پیغام نکاح دینا اور فعل یا قول سے لطف اندوز ہونا۔ کہا جاتا ہے: خطبها یخطبها خطبا و خطبة (پیغام نکاح دینا) اور رجل خطاب کثرت سے پیغام نکاح دینے والا آدمی۔ اور اس معنی میں شاعر کا قول بھی ہے

بَرَّحَ بالعَيْنَيْنِ خطاب الكُثَبْ يقول انی خاطِبٌ وقد كَذَبْ

وانما یخطُبُ عُسًّا مِنْ حَلَبْ(4)

اور الخطیب اس کا معنی ہے الخاطب پیغام نکاح دینے والا۔ اور الخطیبی کا معنی الخِطبة (منگنی) ہے۔

عدی بن زید نے کہا ہے، وہ جذیمہ الابرش کی طرف سے الزباء کی منگنی کے ارادہ کا ذکر کرتا ہے:

لخطِّیبَی الّتی غدرت و خانت و هُنَّ ذواتُ غائلةٍ لِحُینَا

اور الخِطْبُ سے مراد وہ آدمی ہے جو عورت کو پیغام نکاح دیتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے: هی خطبه و خطبته التی یخطبها۔ یہ فلاں کی طرف منسوب ہے اور اس کی منگیتر وہ ہے جسے وہ پیغام بھیجتا ہے۔ اور الخِطبة فِعلةٌ کے وزن پر ہے جیسے جِلسةٌ اور قِعدةٌ۔ اور الخُطْبة خاء کے ضمہ کے ساتھ اس سے مراد وہ کلام ہے جو نکاح وغیرہ میں کہا جاتا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: خُطبہ وہ ہے جو اس کے اول اور آخر میں ہو۔ اور اسی طرح وہ جو فُعلة کے وزن پر ہو جیسے الاُکلة

1۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 224، دارالمحاسن قاہرہ
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 315، دارالکتب العلمیہ
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً

(خارش) اور الضّغطۃ (تنگی، ایک دفعہ کا بھینچنا) ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اس کا معنی ہے اس کی عدت گزرنے کے بعد اس سے شادی کرنے کے بارے جو تم پوشیدہ رکھے ہوئے ہو اور چھپائے ہوئے ہو۔ الاکنان کا معنی ہے ڈھانپنا، چھپانا اور مخفی رکھنا۔

کہا جاتا ہے: کننتہ و أکننتہ دونوں کا معنی ایک ہے یعنی میں نے اسے چھپائے رکھا۔

اور کہا گیا ہے: کننتہ یعنی میں نے اسے محفوظ رکھا، یہاں تک کہ اسے کوئی آفت نہ آپہنچی، اگرچہ وہ مستور اور چھپا ہوا نہ بھی ہو۔ اور اسی سے بَیْضٌ مکنون اور دُرٌّ مکنون ہے (یعنی چھپایا ہوا انڈا اور موتی) اور اکننتہ کا معنی ہے میں نے اسے مخفی رکھا اور میں نے اسے ڈھانپ لیا۔

اور کہا جاتا ہے: کَنَنْتُ الشیء (من الأجرا) جب تو اسے چھپالے کپڑے سے، یا گھر سے یا زمین وغیرہ سے اور اکننت الأمرفی نفسی: میں نے کام کو اپنے دل میں چھپائے رکھا۔ اور عربوں سے یہ جملہ نہیں سنا گیا۔

کننتہ فی نفسی اور کہا جاتا ہے: أکنّ البیتُ الانسان گھر نے انسان کو چھپالیا وغیرہا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اس سے گناہ کو اٹھا دیا ہے جس نے اخفا اور تعریض کے ساتھ معتدہ سے شادی کرنے کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ایسا وعدہ لینے سے منع فرمایا ہے جو شادی کے بارے صریح ہو اور اس پر اس کی بناء ہو اور وعدے پر اتفاق ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے علم اور جاننے کی رخصت دی ہے، نفوس کے غلبہ اور ان کے مغرور ہونے کے سبب اور انسان کے اس کی ملکیت سے کمزور اور ضعیف ہونے کے سبب۔

مسئلہ نمبر 5۔ شوافع نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ تعریض میں حد واجب نہیں ہوگی۔ اور انہوں نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے تعریضاً پیغام نکاح دینے میں گناہ کو اٹھالیا ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ قذف کے بارے تعریض کرنا حد کو ثابت نہیں کرتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نکاح میں تعریض کو تصریح کے مقام پر نہیں رکھا۔ ہم نے کہا ہے: یہ (قول) ساقط (الاعتبار) ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پیغام نکاح میں نکاح کے بارے تصریح کی اجازت نہیں دی۔ اور اس نے ایسی تعریض کی اجازت عطا فرما رکھی ہے جس سے نکاح کو سمجھا جاسکتا ہو۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ تعریض سے قذف سمجھی جائے گی اور عزتوں کی حفاظت کرنا واجب ہوتا ہے اور یہ تعریض کرنے والے پر حد کو ثابت کردے گا تا کہ فاسق لوگوں کو ایسی تعریض کے ذریعہ عزتوں کو ہاتھ میں لینے کا راستہ نہ مل جائے جس سے وہی سمجھا جاتا ہو جو تصریح سے سمجھا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے، چاہے وہ چھپا ہوا ہو تمہارے دلوں میں یا اعلانیہ ہو تمہاری زبانوں کے ساتھ۔ سو اللہ تعالیٰ نے تعریض کی رخصت دی ہے تصریح نہیں کی۔ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم انہیں پیغام نکاح دو گے (1)۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا ای علی سِرٍّ یعنی تم ان سے خفیہ طور پر معاہدہ نہ کرو۔ اس میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 315، دارالکتب العلمیہ

سِرًّا سے پہلے حرف جر کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ فعل ان میں سے ہے جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور ان میں سے ایک حرف جر کے ساتھ ہوتا ہے۔

اور سِرًّا کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے: بعض نے کہا ہے اس کا معنی نکاح ہے یعنی کوئی آدمی اس معتدہ کو یہ نہ کہے ''تو مجھ سے شادی کر لے'' بلکہ تعریض کرے اگر ارادہ ہو۔ اور اس سے خفیۃً یہ عہد و پیمان نہ لے کہ وہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن جبیر، مالک اور آپ کے اصحاب، شعبی، مجاہد، عکرمہ، سدی اور جمہور اہل علم رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اس تاویل پر سِرًّا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے بمعنی مستسرین۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ السر سے مراد زنا ہے۔ یعنی تم میں سے کوئی عدت کے دوران زنا اور پھر عدت کے بعد نکاح کا وعدہ نہ لے۔ اس کا یہ معنی جابر ابن زید، ابومجلز، لاحق بن حمید، حسن بن ابی الحسن، قتادہ، نخعی اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے کہ اس آیت میں السر بمعنی زنا ہے، یعنی تم ان سے زنا کا وعدہ نہ لو (2) اور اسے طبری نے اختیار کیا ہے اور اس معنی میں اعشیٰ کا قول ہے:

فلا تقربَنَّ جارَةً إنّ سرّها عليك حرامٌ فأنكحَن أو تأبّدا

تو کسی پڑوسن کے قریب نہ جا بلاشبہ اس کے ساتھ زنا کرنا تجھ پر حرام ہے پس تو اس سے نکاح کر لے ورنہ تو وحشی ہو جائے گا۔

اور حطیئہ نے کہا ہے:

و یحرم سرّ جارتهم علیهم و یا کل جارُهم أنف القِصاع (3)

اور ان پر اپنی پڑوسن کے ساتھ زنا کرنا حرام ہے ورنہ ان کا پڑوسی سارے پیالے کو کھا جائے گا۔

اور یہ بھی قول ہے کہ السر کا معنی جماع ہے۔ یعنی تم انہیں نکاح کی ترغیب دینے کے لئے اپنے آپ کو کثرت جماع سے متصف نہ کرو، کیونکہ بیوی کے سوا کسی اور کے ساتھ جماع کا کرنا فحش ہوتا ہے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے اور امرؤالقیس نے کہا ہے:

ألا زعمت بَسْباسة الیومَ أننی کبِرْتُ وألّا یُحسِن السرّ أمثالِی

اور روبہ نے کہا ہے:

فکُفّ عن اسرارها بعد العسق

یعنی اس کے لئے اپنے کو لازم کر لینے کے بعد اس کے جماع سے رک جا۔ اور کبھی السر کا معنی عقد نکاح ہوتا ہے، چاہے وہ سراً ہو یا جہراً ہو۔

اعشیٰ نے کہا ہے:

فلن یطلبوا سرّها للغِنَی ولن یُسْلِموها لازهادها

مراد یہ ہے کہ وہ ہرگز اس کے مال کی کثرت کے پیش نظر اس کے نکاح کا مطالبہ نہ کریں اور نہ وہ اسے مال کم ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 316، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

اور ابن زید نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا کا معنی یہ ہے کہ تم ان سے نکاح نہ کرو اور پھر تم اسے چھپاتے پھرو۔ بلکہ جب وہ حلال ہو جائے تو تم اسے ظاہر کرو اور ان سے دخول کرو (1)۔ اور یہی پہلے قول کا معنی ہے۔ پس اس بنا پر ابن زید پہلے قول کے ہی قائل ہیں۔ اور بلاشبہ انہوں نے شاذ قرار دیا ہے کہ عقد کو مواعدۃ کا نام دیا جائے اور یہ پریشانی اور اضطراب ہے (2)۔ مکی اور ثعلبی نے ان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس قول سے منسوخ ہے: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ۔ (3)

مسئلہ نمبر 8۔ قاضی ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: امت کا اس پر اجماع ہے کہ کسی عورت کے لئے اپنے بارے میں عدت کے دوران نکاح کا وعدہ کرنا اور باپ کے لئے اپنی باکرہ بیٹی کے بارے میں اور آقا کے لئے اپنی لونڈی کے بارے میں وعدہ کرنا مکروہ ہے۔

ابن المواز نے کہا ہے: وہ ولی جو جبر کرنے کا مالک نہیں ہوتا تو میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں اور اگر وہ نکاح کر دے تو میں اسے فسخ نہیں کرتا۔

امام مالک نے ایسے آدمی کے بارے میں جو عدت میں وعدہ کرتا ہے اور پھر عدت کے بعد شادی کرتا ہے کہا ہے: میرے نزدیک اس کی تفریق زیادہ پسندیدہ ہے چاہے اس سے دخول کیا جائے یا نہ کیا جائے اور یہ تفریق ایک طلاق ہوگی اور جب وہ حلال ہو جائے تو پھر وہ بھی دیگر لوگوں کے ساتھ اسے پیغام نکاح دے سکے گا۔ یہ ابن وہب کی روایت ہے (4) اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان کے درمیان وجوباً تفریق کر دی جائے گی۔ ابن القاسم نے یہی کہا ہے اور ابن الحارث نے ابن ماجشون سے اسی طرح بیان کیا ہے اور کچھ زائد کیا ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ یہ تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی (5)۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: اگر اس نے دعوت نکاح صراحۃً دی اور عورت نے بھی صراحۃً اس کا جواب دیا اور عقد نکاح نہ ہوا یہاں تک کہ عدت گزر گئی تو نکاح ثابت ہوگا اور دونوں کے لئے تصریح مکروہ ہوگی۔ کیونکہ نکاح منگنی کے بعد واقع ہوا ہے۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا یہ استثنا منقطع ہے اور الا بمعنی لکن ہے (6)۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے اِلَّا خَطَاً بمعنی لکن خطأ۔ اور قول معروف سے مراد ایسی تعریض ہے جو شرعاً مباح ہو اور ضحاک نے ذکر کیا ہے کہ قول معروف میں سے یہ ہے کہ وہ معتدہ کو کہے: تو میرے لئے اپنے آپ کو محبوس کر لے کیونکہ مجھے تیرے ساتھ رغبت ہے اور وہ کہتی ہے: میں بھی اسی طرح ہوں (7) تو یہ ایک دوسرے سے وعدہ کرنے کے مشابہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ

اس میں نو مسائل ہیں:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 316، دار الکتب العلمیہ | 2۔ ایضاً | 3۔ ایضاً | 4۔ ایضاً
5۔ ایضاً | 6۔ ایضاً | 7۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَعْزِمُوْا عزم کے معنی میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ کہا جاتا ہے: عزم الشیء و عزم علیہ (اس نے شے کا ارادہ کیا اور اس پر پختہ ہو گیا) اور یہاں معنی ہے: ولا تعزموا علی عقدۃ النکاح (اور تم نکاح کی گرہ پر پختہ نہ ہو جاؤ) اور یہ ایک واضح امر ہے کہ قرآن کریم سب سے فصیح کلام ہے۔ پس جو اس میں وارد ہوا ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کی صحت وفصاحت میں کوئی شک کیا جا سکتا ہے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (البقرہ: 227) (اور اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کرلیں) اور یہاں فرمایا: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ تو اس کا معنی ہے لا تعزموا علی عقدۃ النکاح فی زمان العدۃ (تم عدت کے دوران نکاح کی گرہ پختہ نہ کرلو۔) پھر اس سے علیٰ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

سیبویہ نے کہا ہے: ضُرِبَ فلانٌ الظھرَ والبطنَ یعنی علی الظھرِ والبطنِ (فلاں کو پیٹھ اور پیٹ پر مارا گیا) سیبویہ نے کہا ہے: ان اشیاء میں حذف پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

نحاس نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ وَلَا تَعْقِدُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ ہو کیونکہ تَعْزِمُوْا اور تعقدوا کا معنی ایک ہے (اور تم نکاح کی گرہ کو پختہ نہ باندھ لو) اور کہا جاتا ہے: تَعْزُمُوْا یعنی زا کے ضمہ کے ساتھ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ اس سے مراد عدت کا مکمل ہونا ہے اور الکتاب سے یہاں مراد وہ حد ہے جو مقرر کی گئی اور مدت میں سے وہ مقدار ہے جسے بیان کر دیا گیا، لکھ دیا گیا اور اس کا نام کتاب رکھا ہے کیونکہ کتاب اللہ نے اس حد کو بیان کیا ہے اور اسے مقرر کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: کتاب اللہ علیکم۔

اور اسی طرح فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (النساء) (بے شک نماز مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اپنے اپنے مقررہ وقت پر) پس الکتاب کا معنی الفرض (مقرر کرنا) ہے۔ یعنی یہاں تک کہ مقرر کی ہوئی مدت اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔ (حتی یبلغ الفرض أجلہ)

کتب علیکم الصیام یعنی تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے۔ تقدیر کلام ہے حتی یبلغ فرض الکتاب أجلہ یعنی کتاب کی مقرر کی ہوئی مدت اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔ اس تاویل کی بنا پر الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور پہلی تاویل پر اس میں کوئی حذف نہیں ہے، سو وہی اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ نے عدت کے دوران عقد نکاح کو حرام قرار دیا ہے اپنے اس ارشاد کے ساتھ: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ یہ محکم ہے، اس کی تاویل پر اجماع ہے کہ بلوغ اجلہ سے مراد انقضاء العدۃ (عدت کا گزرنا) ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ عدت میں تعریض کو مباح قرار دیا ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ الآیہ۔

اور علماء نے اس کی اباحت میں کوئی اختلاف نہیں کیا ہے، البتہ انہوں نے تعریض کے الفاظ میں اختلاف کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر

چکا ہے۔ اور انہوں نے اس آدمی کے بارے میں بھی اختلاف کیا ہے جو کسی عورت کو اس کی عدت میں پیغام نکاح دیتا ہے درآنحالیکہ وہ جاہل ہو یا وہ اس سے وعدہ لیتا ہے اور عدت کے بعد عقد نکاح کرتا ہے اور اس سے پہلی آیت میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔

اور انہوں نے اختلاف کیا ہے کہ اگر کسی نے عدت میں نکاح کی گرہ پختہ کر لی اور اس پر اطلاع پالی گئی اور حاکم نے اس کا نکاح فسخ کر دیا اور وہ دخول سے پہلے ہوا تو وہ یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ اسے ہمیشہ کے لئے حرام قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ وہ بھی نکاح میں دلچسپی رکھنے والے دیگر لوگوں کے ساتھ نکاح کا ایک خواہشمند ہو سکتا ہے (اور پیغام نکاح بھیج سکتا ہے) امام مالک نے یہی کہا ہے اور ابن القاسم نے المدونہ میں اس باب کے آخر میں بیان کیا ہے جس کے پیچھے ضرب اجل المفقود ہے۔

اور ابن جلاب نے امام مالک سے ایک روایت بیان کی ہے کہ عقد میں تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی اگرچہ نکاح کا فسخ دخول سے پہلے ہو (1)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے نکاح عدت میں کیا ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ تحریم دائمی ہو۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب وہ اس کے پاس جائے۔ اور اگر عقد عدت میں ہوا اور وہ اس کے پاس داخل ہوا اس کی عدت گزرنے کے بعد تو پھر مسئلہ یہ ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 5۔ پس اہل علم میں سے ایک قوم نے کہا ہے: یہ عدت میں دخول کی طرح ہے۔ لہٰذا دونوں کے درمیان تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی اور اہل علم میں سے ایک گروہ نے کہا ہے اس سے تحریم ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگی۔ اور امام مالک نے کہا ہے: تحریم دائمی ہوگی اور ایک بار کہا: اس سے تحریم ثابت نہیں ہوتی۔ یہ بالکل واضح ہے۔ آپ کے دونوں قول المدونہ میں طلاق سنت کے بیان میں ہیں اور اگر اس نے عدت میں دخول کیا تو پھر مسئلہ یہ ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام مالک، لیث اور اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور وہ عورت اس کے لئے کبھی حلال نہ ہوگی۔ امام مالک اور لیث نے کہا ہے: ملک یمین کے ساتھ بھی نہیں۔ اس کے باوجود کہ انہوں نے مزنی کی اس کے ساتھ شادی کو جائز قرار دیا۔ اور انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ دونوں کبھی جمع نہ ہو سکیں گے۔ حضرت سعید نے کہا ہے: اس کے لئے اس کا وہ مہر ہوگا جس کے عوض اس کی فرج حلال سمجھی گئی (4)۔ اسے امام مالک نے مؤطا میں بیان کیا ہے۔

اور ثوری، علمائے کوفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے: ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور تحریم دائمی نہ ہوگی بلکہ ان کے درمیان فسخ نکاح کیا جائے گا پھر وہ اس کی عدت گزارے گی پھر وہ دعوت نکاح دینے والوں میں سے ایک دعوت نکاح دینے والا ہو جائے گا اور انہوں نے اس پر علماء کے اجماع سے استدلال کیا ہے کہ اگر وہ اس کے ساتھ زنا کرے تو اس پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 317، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً

3۔ ایضاً　　4۔ مؤطا امام مالک، صفحہ 504، وزارت تعلیم

اس سے شادی کرنا حرام نہیں ہوتا۔ تو اس طرح دوران عدت اس کا اس سے وطی کرنا بھی ہے۔ انہوں نے کہا: یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے، اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حسن رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کی مثل ذکر کیا گیا ہے۔
اور عبدالرزاق نے ثوری عن اشعث عن الشعبی عن مسروق کی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے رجوع کر لیا اور فرمایا: وہ دونوں اکٹھے رہ سکتے ہیں، جمع ہو سکتے ہیں۔

قاضی ابوالولید الباجی نے المنتقی میں بیان کیا ہے: عدت میں نکاح کرنے والا اس سے خالی نہ ہوگا کہ جب وہ اس کے پاس گیا تو یا وہ اس کے پاس عدت میں جائے گا یا عدت کے بعد۔ پس اگر وہ عدت میں اس کے پاس گیا ہے تو پھر مشہور مذہب یہ ہے کہ تحریم دائمی ہوگی۔ یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور شیخ ابوالقاسم نے تفریع میں بیان کیا ہے کہ جب آدمی عدت میں عورت سے شادی کرتا ہے، چاہے وہ عدت طلاق ہو یا عدت وفات ہو، یہ جانتے ہوئے کہ ایسا کرنا حرام ہے تو اس کے بارے دو روایتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی تحریم دائمی ہوگی (کبھی بھی وہ عورت اس پر حلال نہ ہو سکے گی) جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اور دوسری یہ ہے کہ وہ زنا کرنے والا ہے اور اس پر حد لازم ہے اور بچہ اس کے ساتھ لاحق نہیں کیا جائے گا اور اس کے لئے جائز ہے کہ جب اس کی عدت گزر جائے تو وہ اس کے ساتھ شادی کر لے۔ یہی امام شافعی (1) اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے۔
پہلی روایت کی وجہ یہ ہے اور وہی مشہور ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس طرح فیصلہ کرنے اور لوگوں میں اس کے نافذ ہونے سے ثابت ہے اور آپ کے فیصلے مختلف شہروں میں منتقل ہوتے تھے اور پھیل جاتے تھے اور آپ سے اختلاف کرنے والا کوئی معلوم نہیں، پس اس سے ثابت ہوا کہ اسی پر اجماع ہے۔
قاضی ابومحمد نے بیان کیا ہے کہ اس کی مثل حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور اس کے مشہور ہونے اور عام منتشر ہونے کے باوجود دونوں کے ساتھ اختلاف کرنے والا کوئی نہیں۔ یہی اجماع کا حکم ہے۔
اور دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ یہ ممنوع وطی ہے اور اس کی تحریم دائمی نہیں۔ جیسا کہ اگر وہ اپنی شادی خود کرے یا نکاح متعہ کرے یا زنا کرے (تو ان سے دائمی تحریم ثابت نہیں ہوتی۔)
اور قاضی ابوالحسن نے کہا ہے: اس بارے میں امام مالک کا مشہور مذہب نظر و فکر کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔
اور ابوعمر نے سند بیان کی ہے: حدثنا عبدالوارث بن سفیان حدثنا قاسم بن اصبغ عن محمد ابن اسماعیل عن نعیم بن حماد عن ابن المبارک عن اشعث عن الشعبی عن مسروق کہ انہوں نے کہا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس خبر پہنچی کہ قریش کی ایک عورت سے ثقیف کے ایک آدمی نے اس کی عدت میں شادی کی تو آپ نے ان دونوں کو بلا بھیجا اور ان کے درمیان تفریق کر دی اور ان دونوں کو سزا دی اور فرمایا: تو کبھی اس سے نکاح نہیں کر سکتا اور آپ نے اس کا مہر بیت المال سے دے دیا۔ یہ بات لوگوں میں پھیل گئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تک بھی پہنچی، تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ امیر المومنین پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 317-318، دار الکتب العلمیہ

رحم فرمائے۔ مہر اور بیت المال کا کیا تعلق ہے۔ وہ دونوں جاہل تھے۔ پس امام کو چاہئے کہ وہ ان دونوں کو سنت کی طرف لوٹا دے۔ عرض کی گئی: آپ ان دونوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کے لئے مہر وہ ہے جس کے عوض اس کی فرج کو حلال سمجھا گیا اور ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور ان پر بطور حد کوڑوں کی سزا نہ ہوگی، اور وہ پہلے خاوند کی جانب سے اپنی عدت کو مکمل کرے گی، پھر دوسرے خاوند کی جانب سے کامل تین حیض عدت مکمل کرے گی، پھر اگر وہ چاہے تو اسے دعوت نکاح دے سکتا ہے(1)۔ پس یہ خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی تو آپ نے لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: اے لوگو! جہالتوں کو سنت کی طرف لوٹا دو۔ الکیا الطبری نے کہا ہے: فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ آدمی جس نے کسی عورت کے ساتھ عقد نکاح کیا درآنحالیکہ وہ عورت کسی اور مرد کی عدت میں ہو تو وہ نکاح فاسد ہے اور حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دونوں کا ان سے حد کی نفی پر اتفاق اس پر دلالت کرتا ہے کہ نکاح فاسد حد کو ثابت نہیں کرتا مگر اس کی جہالت کے باوجود تحریم متفق علیہ ہے اور اس کا علم ہونے کے ساتھ اس میں اختلاف کیا گیا ہے اور علماء نے اختلاف کیا ہے کیا وہ دونوں کی جانب سے اکٹھی عدت گزارے گی؟ یہ دو عدتوں کا مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 7۔ اہل مدینہ نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ پہلے کی جانب سے بقیہ عدت مکمل کرے گی اور دوسرے کی جانب سے دوسری عدت نئے سرے سے گزارے گی۔ یہی لیث، حسن بن حی، شافعی، احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

محمد بن قاسم اور ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ دوسرے خاوند کی جانب سے اس کی عدت اس کے لئے اس دن سے کافی ہوگی جس دن مرد اور عورت کے درمیان تفریق کر دی گئی، چاہے وہ حمل کے ساتھ ہو یا حیضوں کے ساتھ ہو یا مہینوں کے ساتھ۔ یہی قول ثوری، اوزاعی اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کا ہے اور ان کی دلیل اس پر اجماع ہے کہ پہلا خاوند اپنی بقیہ عدت میں اس سے نکاح نہیں کر سکتا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ دوسرے کی عدت میں ہے۔ اگر اس طرح نہ ہوتا تو وہ یقیناً اس کی بقیہ عدت میں اس سے نکاح کر سکتا۔

پہلے گروہ نے جواب دیا اور کہا: یہ لازم نہیں ہے کیونکہ پہلے خاوند کو اس کی بقیہ عدت میں اس سے نکاح کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس کے پیچھے اس پر دوسرے کی عدت واجب ہے۔ یہ دونوں حق ہیں جو دو خاوندوں کی جانب سے اس پر واجب ہیں جیسا کہ آدمیوں کے تمام حقوق واجب ہوتے ہیں اور ان دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے حق میں داخل نہیں ہو سکتا۔

امام مالک نے ابن شہاب عن سعید بن مسیب اور عن سلیمان بن یسار کی سند سے بیان کیا ہے کہ طلیحہ اسدیہ رشید ثقفی کے نکاح میں تھی تو اس نے اسے طلاق دے دی اور اس نے اپنی عدت میں نکاح کر لیا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسے اور اس کے خاوند کو خفیف سی ضربیں لگائیں اور ان کے درمیان تفریق کر دی۔ پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس عورت نے بھی اپنی عدت کے دوران نکاح کیا پس اگر اس کا خاوند ایسا ہے جس نے اس کے ساتھ شادی کی ہے اس نے اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 318، دار الکتب العلمیہ

کے ساتھ دخول نہیں کیا ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے، پھر وہ عورت پہلے خاوند کی جانب سے اپنی بقیہ عدت گزارے، پھر دوسرا پیغام نکاح دینے والوں میں سے ایک ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس نے دخول کر لیا ہے تو ان کے درمیان تفریق کر دی جائے پھر وہ پہلے کی جانب سے اپنی بقیہ عدت گزارے پھر دوسرے کی جانب سے عدت گزارے پھر وہ کبھی جمع نہ ہو سکیں گے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: حضرت سعید بن مسیب نے فرمایا: اس کے لئے اس کا وہ مہر ہے جس کے عوض اس کی فرج حلال سمجھی گئی (1)۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ طلیحہ طلیحہ بنت عبید اللہ ہے، طلحہ بن عبید اللہ التیمی کی بہن ہے اور موطا کے بعض نسخوں میں یحییٰ کی روایت سے یہ ہے: طلیحہ الاسدیہ اور یہ خطا اور لاعلمی ہے۔ میں کسی کو نہیں جانتا کہ اس نے یہ کہا ہو۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ: فضربها عمر بالمخفقة و ضرب زوجها ضربات (2) اس سے مراد ہے کہ آپ نے بطور سزا انہیں یہ ضربیں لگائیں جب کہ ان دونوں نے ایک ممنوع عمل کا ارتکاب کیا اور وہ ہے عدت میں نکاح کرنا۔

اور زہری نے کہا ہے: میں نہیں جانتا کہ وہ کوڑے کتنی مقدار تک پہنچے۔ فرمایا: اس مسئلہ میں عبد الملک کے کوڑے دونوں میں سے ہر ایک کے لئے چالیس کوڑے تھے۔ فرمایا: اس بارے میں قبیصہ بن ذویب سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: اگر تم تخفیف بھی کرو تو بیس کوڑے لگاؤ۔ اور ابن حبیب نے ایسی عورت کے بارے میں کہا جو عدت میں شادی کرتی ہے اور مرد اسے مس کرتا ہے یا بوس و کنار کرتا ہے یا مباشرت کرتا ہے یا ہاتھ سے ٹٹولتا ہے یا شہوت کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہے تو زوجین پر سزا ہوگی، ولی پر، گواہوں پر اور ان میں سے ہر اس پر جو یہ جانتا ہو کہ یہ عدت میں ہے اور ان میں سے جو نہ جانتا ہو اس پر سزا نہ ہوگی۔ اور ابن المواز نے کہا ہے: زوجین کو بطور حد کوڑے لگائے جائیں گے اگر دونوں نے عمداً کیا ہو۔ اور ابن حبیب کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ یہ اس کے بارے ہے جسے عدت کے بارے علم ہو۔ اور شاید وہ جو تحریم سے ناواقف ہو اور اس نے فعل ممنوع کا ارتکاب جان بوجھ کر نہ کیا ہو تو وہ ہے جسے سزا دی جائے گی اور اسی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت اور اس کے خاوند کو ہلکی سی شے کے ساتھ ضربیں لگائیں۔ اور اس بارے میں سزا اور تادیب اس کے حال کے مطابق ہوگی جسے سزا دی جا رہی ہے۔ اور ابن المواز کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ ان دونوں کو تحریم کا علم ہو اور انہوں نے جرأت اور دلیری کرتے ہوئے ممنوع فعل کا ارتکاب کیا ہو۔ اور شیخ ابو القاسم نے کہا ہے: بلاشبہ یہ دونوں روایتیں عمداً کرنے کے بارے میں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حد جاری کی جائے گی اور دوسری کے مطابق سزا دی جائے گی اور حد جاری نہیں کی جائے گی۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ یہ تحذیر اور ڈرانے کی انتہا ہے ایسے امر کے وقوع کے بارے جس سے منع کیا گیا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِیْضَةً ۚۖ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا

1۔ موطا امام مالک، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 503-504، وزارت تعلیم

2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 503

عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

''کوئی حرج نہیں تم پر اگر تم طلاق دے دو ان عورتوں کو جن کو تم نے چھوا بھی نہیں اور نہیں مقرر کیا تم نے ان کا مہر اور خرچہ دو انہیں مقدور والے پر اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے مطابق یہ خرچہ مناسب طریقہ پر ہونا چاہئے، یہ فرض ہے نیکو کاروں پر۔''

اس میں گیارہ مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ یہ بھی مطلقات کے احکام میں سے ہیں۔ جماع اور بیوی کے پاس جانے سے قبل طلاق دینے والے سے حرج کے اٹھا دینے کے بارے یہ خبر کی ابتدا ہے، چاہے مہر مقرر کیا گیا ہو یا نہ مقرر کیا جائے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوق اور قضائے شہوت کی غرض سے شادی کرنے سے منع فرمادیا اور پاکدامنی کی طلب اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی التجا اور صحبت دوام کے ارادہ سے شادی کرنے کا حکم ارشاد فرمایا، تو مومنین کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس کسی نے عورت کے پاس جانے سے قبل طلاق دی تو وہ اس مکروہ عمل کے جز میں واقع ہونے والا ہے۔ تو اس بارے میں حرج کو اٹھانے اور ختم کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ بشرطیکہ اصل نکاح حسین مقصد پر ہو۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اس کا معنی ہے کہ اس میں تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم حیض کے وقت میں طلاق بھیجو، بخلاف مدخول بہا عورت کے، کیونکہ غیر مدخول بہا پر عدت نہیں ہوتی۔ (1)

مسئلہ نمبر 2۔ مطلقات چار ہیں: (۱) مطلقہ مدخول بہا جس کے لئے مہر مقرر کیا جائے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم اس سے پہلی آیت میں ذکر کیا ہے کہ اس سے مہر میں سے کوئی شے واپس نہیں لی جائے گی اور یہ کہ اس کی عدت تین حیض ہے۔ (۲) مطلقہ غیر مدخول بہا جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا جائے۔ پس یہ آیت اسی کے بارے میں ہے اور اس کے لئے کوئی مہر نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے متعہ دینے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور سورۃ الاحزاب میں بیان فرمایا ہے کہ غیر مدخول بہا کو جب طلاق دی جائے تو اس پر کوئی عدت نہیں۔ عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔ (۳) مطلقہ غیر مدخول بہا جس کے لئے مہر مقرر کیا جائے۔ اس کا ذکر اس آیت کے بعد کیا ہے جبکہ فرمایا: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً (البقرۃ: 237) (اور اگر تم طلاق دو انہیں اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ اور مقرر کر چکے تھے ان کے لئے مہر۔) (۴) مطلقہ مدخول بہا جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا جائے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء: 24) (پس جو تم نے لطف اٹھایا ہے ان سے تو دو ان کو ان کے مہر جو مقرر ہیں۔) پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیت میں ایسی مطلقہ کا ذکر کیا ہے جسے چھوئے جانے سے قبل اور مہر مقرر کیے جانے سے قبل طلاق دے دی جائے اور اس مطلقہ کا جسے چھوئے جانے سے پہلے اور مہر مقرر کیے جانے سے قبل طلاق دی جائے۔ پس پہلی کے لئے متعہ مقرر کیا ہے اور دوسری کے لئے نصف مہر، کیونکہ عورت کو گرہ کا کھلنا اور اس حلت میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 318، دار الکتب العلمیہ

عیب اور نقص پڑنا لاحق ہوا ہے جو مرد کو عقد کے سبب حاصل ہوئی تھی اور مس مہر واجب کے بالمقابل ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب اللہ تعالیٰ نے مطلقہ کی حالت کو یہاں دو قسموں میں تقسیم کر دیا ایک ایسی مطلقہ جس کا مہر مقرر کیا گیا ہو اور دوسری ایسی مطلقہ جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا جائے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ نکاح کی تفویض جائز ہے اور اس سے مراد ہر وہ نکاح ہے جو مہر کا ذکر کیے بغیر کیا جائے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس کے بعد مہر مقرر کر دیا جاتا ہے۔ پس اگر وہ مقرر کر دیا جائے تو وہ عقد کے ساتھ مل جاتا ہے اور یہ جائز ہے اور اگر وہ نہ مقرر کیا جائے اور طلاق ہو جائے تو پھر بالا جماع مہر واجب نہیں ہوتا (1)۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے یہی کہا ہے۔

اور مہدوی نے حماد بن ابی سلیمان سے نقل کیا ہے کہ جب آدمی عورت کو طلاق دے اور اس سے دخول نہ کیا ہو اور نہ ہی اس کے لئے مقررہ مہر ہو تو اسے نصف مہر مثل پر مجبور کیا جائے اور اگر عقد نکاح کے بعد اور طلاق واقع ہونے سے پہلے مہر مقرر کر دیا گیا تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: طلاق کے سبب وہ نصف نہ ہوگا کیونکہ وہ عقد کے ساتھ واجب نہیں ہوا اور یہ اس ارشاد باری کے ظاہر کے خلاف ہے: وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً (البقرۃ: 237)

اور یہ خلاف قیاس بھی ہے، کیونکہ عقد کے بعد مقرر کردہ مہر عقد کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے پس یہ ضروری ہے کہ یہ طلاق کے ساتھ نصف ہو جائے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ مقرر کردہ مہر عقد کے ساتھ ملا دیا جائے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر مہر مقرر کرنے سے پہلے موت واقع ہو جائے تو ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ ان سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے ایسی عورت سے شادی کی جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا اور اس کے ساتھ دخول نہ کیا یہاں تک کہ مر گیا تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کے لئے اس جیسی عورتوں کا مثل ہوگا نہ اس میں کمی ہوگی اور نہ زیادتی اور اس پر عدت ہوگی اور اس کے لئے میراث بھی ہوگی۔ تو حضرت معقل بن سنان اشجعی کھڑے ہوئے اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں سے ایک عورت بروع بنت واشق کے بارے میں اسی طرح فیصلہ فرمایا جیسے تم نے کیا ہے۔ تو اس سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور آپ سے کئی اسناد سے مروی ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے بعض اہل علم اور ان کے سوا دوسروں کا اسی پر عمل ہے اور ثوری، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ علیہم بھی اسی طرح کہتے ہیں۔

اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے بعض اہل علم جن میں حضرت علی ابن ابی طالب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم شامل ہیں نے کہا ہے کہ جب آدمی کسی عورت سے شادی کرے اور اس کے ساتھ دخول نہ کرے اور نہ اس کے لئے مہر مقرر کرے یہاں تک کہ مر جائے تو انہوں نے کہا: اس کے لئے میراث ہوگی اور اس کے لئے مہر نہیں ہوگا اور اس پر عدت ہوگی۔ یہی امام شافعی کا قول ہے اور کہا ہے: اگر بروع بنت واشق کی حدیث ثابت ہے تو پھر یقیناً وہ حجت ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور امام شافعی کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ انہوں نے اس

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 218، دار الفکر

کے بعد مصر میں اپنے اس قول سے رجوع کر لیا اور بروع بنت واشق کی حدیث کے مطابق بیان کیا۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: بروع کی حدیث ثابت کرنے میں اختلاف ہے، پس قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے ابن ابی زید کے رسالہ کی شرح میں کہا ہے کہ بروع بنت واشق کی حدیث کو حفاظ حدیث اور ائمہ اہل علم نے رد کر دیا ہے اور واقدی نے کہا ہے: یہ حدیث مدینہ منورہ میں پیش ہوئی تو علماء میں سے کسی نے اسے قبول نہیں کیا اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ ہم نے آپ سے اور ابن منذر سے ذکر کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کی مثل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے اور اسی کے مطابق ہم کہتے ہیں اور بیان کیا کہ یہی ابو ثور اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔

اور زہری، اوزاعی، مالک، شافعی رحمۃ اللہ علیہم سے حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کے قول کی مثل ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس مسئلہ میں ایک تیسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کے لئے میراث نہیں ہوگی یہاں تک کہ مہر ہو (یعنی مہر کے بغیر میراث نہیں ہو سکتی) مسروق نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف امام مالکؒ نے اختیار کیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ مہر مقرر ہونے سے پہلے نکاح میں تفریق ہے پس اس میں مہر واجب نہیں اور اس کی اصل طلاق ہے لیکن جب حدیث صحیح ہے تو اس کے مقابلے میں قیاس فاسد ہے اور ابو محمد عبد الحمید نے ایسا مذہب بیان کیا ہے جو حدیث سے موافقت رکھتا ہے۔ الحمد للہ۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: حدیث بروع کو عبد الرزاق نے ثوری عن منصور عن ابراھیم عن علقمہ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کیا ہے اور اس میں ہے: پس معقل ابن سنان کھڑے ہوئے اور اس میں ابن مہدی نے ثوری عن فراس عن الشعبی عن مسروق عن عبد اللہ کی سند سے بیان کیا اور کہا: معقل بن یسار۔ اور میرے نزدیک صحیح اس کا قول ہے جس نے معقل بن سنان کہا ہے نہ کہ معقل بن یسار (2)۔ کیونکہ معقل بن یسار قبیلہ مزینہ کا آدمی ہے اور یہ حدیث ایسی عورت کے بارے ہے جس کا تعلق قبیلہ اشجع سے ہے نہ کہ مزینہ سے۔ اور اسی طرح اسے داؤد نے شعبی عن علقمہ سے روایت کیا ہے اور اس میں ہے۔ پس اشجع کے لوگوں نے کہا اور معقل بن سنان یوم حرہ میں شہید ہوئے اور یوم حرہ کے بارے میں شاعر کہتا ہے

ألا تلكم الأنصار تبكي سراتها　　و أشجع تبكي معقل بن سنان

خبردار! وہ انصار اپنے شیروں کو رو رہے ہیں اور بنی اشجع معقل بن سنان کو رو رہے ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اس میں ما بمعنی الذی ہے۔ یعنی اگر تم نے ان عورتوں کو طلاق دی جنہیں تم نے مس نہیں کیا اور تَمَسُّوْهُنَّ کو ثلاثی سے تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور یہ نافع، ابن کثیر، ابو عمر، عاصم اور ابن عامر کی قراءت ہے اور حمزہ اور کسائی نے تماسوھن باب مفاعلہ سے پڑھا ہے کیونکہ وطی دونوں کے ساتھ مکمل ہوتی ہے اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 136، وزارت تعلیم

2۔ ابن ماجہ، باب الرجل یتزوج ولا یفرض لھا فیموت، حدیث نمبر 1880، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کبھی باب مفاعلہ میں فاعل بمعنی فعل بھی آتا ہے۔ جیسے طارقت النعل (میں نے نعل کھٹکھٹائے) اور عاقبت اللص (میں نے چور کو سزا دی) اور پہلی قراءت اس باب میں مفاعلہ کے معنی کا تقاضا کرتی ہے اس معنی کے اعتبار سے جو مس سے سمجھا گیا ہے اور ابوعلی نے اسے ترجیح دی ہے کیونکہ اس معنی کے افعال اس وزن پر ثلاثی آئے ہیں۔ جیسا کہ نکح، سفد، قرع، دفط اور ضرب الفحل (ان تمام میں جفتی کرنے اور وطی کرنے کا معنی مشترک ہے) اور دونوں قرأتیں حسن ہیں۔

اور اَوْ تَفْرِضُوْا میں اَوْ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی واؤ ہے۔ یعنی ما لم تمسوھن و لم تفرضوا لھن جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآىِٕلُوْنَ۝ (الاعراف) (اور کتنی بستیاں تھیں برباد کر دیا ہم نے انہیں۔ پس آیا ان پر عذاب رات کے وقت یا جب وہ دوپہر کو سور ہے تھے۔) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ۝ یہ و یزیدون کے معنی میں ہے۔ (الصافات) (اور ہم نے بھیجا تھا انہیں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف) اور ارشاد گرامی ہے: وَ لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا۝ بمعنی و کفورا ہے (الدہر) (اور نہ کہنا مانئے ان میں سے کسی بدکار یا احسان فراموش کا) اور یہ قول: وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ (النساء: 43) یہ بمعنی و جاء احد من الغائط و انتم مرضی او مسافرون ہے۔ (اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے۔)

اور یہ ارشاد: اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اَوِ الْحَوَايَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (الانعام: 146) اور اسی کے مثل دیگر ارشادات۔ (مگر جو اٹھا رکھی ہو ان کی پشتوں یا آنتوں نے یا جو ملی ہوئی ہو ہڈی کے ساتھ۔)

اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر اس کے مہر مفروض کا عطف کیا ہے اور فرمایا ہے:

وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً

پس اگر پہلا ارشاد مس سے قبل مفروض لہا کی طلاق کے بیان کے لئے ہوتا تو اس کا وہ دوبارہ ذکر نہ فرماتا۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَّ مَتِّعُوْهُنَّ اس کا معنی ہے تم انہیں کوئی ایسی شی دو جو ان کے لئے متعہ بن سکتی ہو۔ حضرت ابن عمر، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت حسن بن ابی حسن، حضرت سعید بن جبیر، حضرت ابوقلابہ، حضرت زہری، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک بن مزاحم رضی اللہ عنہم نے اسے وجوب پر محمول کیا ہے۔

اور ابوعبید، امام مالک بن انس اور ان کے اصحاب اور قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم نے اسے ندب پر محمول کیا ہے (1)۔

پہلے قول والوں نے مقتضائے امر سے استدلال کیا ہے (یعنی الامر للوجوب) اور دوسرا قول کرنے والوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: حقا علی المحسنین اور علی المتقین اور اگر یہ واجب ہوتا تو پھر اس کا اطلاق تمام مخلوق پر ہوتا اور پہلا قول اولیٰ اور بہتر ہے۔ کیونکہ امر کے عمومات میں ہے متعوھن کے قول میں امتاع ہے اور امتاع کی اضافت ان کی طرف لام تملیک کے ساتھ ہے۔ اس ارشاد میں و للمطلقات متاع اس میں وجوب ندب سے زیادہ ظاہر ہے اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 319، دار الکتب العلمیہ

قولہ: علی المتقین یہ اس کے ایجاب کی تاکید ہے کیونکہ ہر ایک پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے میں اور اس کی نافرمانی اور معصیت کرنے میں اس سے ڈرے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ یہ ہدایت ہے متقی لوگوں کے لئے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اور قول باری تعالیٰ: وَّ مَتِّعُوْهُنَّ کی ضمیر متصل میں اختلاف ہے کہ عورتوں میں سے ان سے کون مراد ہیں؟ تو حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت جابر بن زید، حضرت حسن رضی اللہ عنہم، حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد، حضرت عطا، حضرت اسحاق اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: ایسی مطلقہ عورت کے لئے متعہ واجب ہے جس کے پاس جانے اور اس کا مہر مقرر کیے جانے سے پہلے اسے طلاق ہو جائے اور اس کے سوا دوسری عورتوں کے حق میں مستحب ہے۔

اور امام مالک اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: ہر مطلقہ عورت کے حق میں متعہ مستحب ہے اگرچہ اس سے دخول کیا گیا ہو، مگر اس کے حق میں کہ جس کے ساتھ دخول نہ کیا گیا اور اس کے لئے مہر مقرر کیا گیا تو اس کے لئے وہی کافی ہے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور اس کے لئے کوئی متعہ نہ ہوگا (1)۔

اور ابو ثور نے کہا ہے اس کے لئے بھی اور ہر مطلقہ عورت کے لئے متعہ ہے اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ وہ عورت جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا گیا اور اس کے ساتھ دخول بھی نہ کیا گیا تو اس کے لئے متعہ کے سوا کوئی شے نہیں ہے۔ زہری نے کہا ہے: اس کے لئے متعہ کا فیصلہ قاضی کرے گا اور جمہور لوگوں نے کہا ہے: قاضی اس کے لئے اس کے بارے فیصلہ نہیں کرے گا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اجماع بلاشبہ صرف آزاد عورت کے حق میں ہے۔ پس رہی لونڈی جب اسے مس کیے جانے اور مہر مقرر ہونے سے قبل طلاق دے دی جائے تو جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس کے لئے متعہ ہوگا۔ امام اوزاعی اور ثوری نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی متعہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس کے آقا کے لئے ہوگا اور وہ اپنی مملوکہ کو طلاق کے سبب پہنچنے والی تکلیف کے مقابلے میں کسی مال کا مستحق نہیں ہے۔ رہا امام مالک کے مذہب کا ربط تو ابن شعبان نے کہا ہے: متعہ طلاق کے غم کے بدلے ہوتا ہے، اسی لئے وطی سے پہلے یا بعد خلع لینے والی عورت، مبارات کرنے والی اور لعان کرنے والی کے لئے کوئی متعہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ وہ ہے جس نے خود طلاق کو اختیار کیا ہے۔

اور ترمذی، عطا اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: خلع لینے والی عورت کے لئے متعہ ہے اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: لعان کرنے والی عورت کے لئے متعہ ہے۔ ابن قاسم نے کہا ہے: فسخ کئے گئے نکاح میں کوئی متعہ نہیں ہے۔ ابن المواز نے کہا ہے: ایسا نکاح جس کا عقد صحیح ہونے کے بعد اس میں فسخ داخل ہو جائے تو اس میں متعہ نہیں ہے۔ مثلاً زوجین میں سے ایک دوسرے کا مالک ہو جائے (3)۔ ابن قاسم نے کہا ہے: اس کی اصل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ پس یہ حکم طلاق کے ساتھ مختص ہے فسخ اس میں شامل نہیں۔ اور ابن وہب نے مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ وہ عورت جسے اختیار دیا گیا اس کے لئے متعہ ہے بخلاف اس لونڈی کے جو کسی غلام کے نکاح میں آزاد ہو جائے تو اسے اپنے نفس کے بارے اختیار ہوگا۔ پس اس صورت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 319، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

میں اس کے لئے متعہ نہیں ہوگا رہی وہ آزاد عورت جسے اختیار دیا گیا یا جو مالک ہو جائے یا مرد اس پر کسی لونڈی سے شادی کرے تو وہ ان تمام صورتوں میں اپنے نفس کی مختار ہوتی ہے اور اس کے لئے متعہ بھی ہوتا ہے کیونکہ زوج فرقت کا سبب بنتا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک مقدار کے قلیل اور کثیر ہونے کے اعتبار سے متعہ کی کوئی معروف حد نہیں ہے (1)۔ البتہ لوگوں نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کم سے کم وہ مقدار جو متعہ میں دینی جائز ہے وہ تیس درہم یا ان کے مشابہ کوئی شے ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سب سے اعلیٰ اور ارفع متعہ خادم ہے پھر لباس ہے اور پھر نفقہ ہے۔ حضرت عطا نے کہا ہے: اوسط متعہ قمیص، دوپٹہ اور چادر ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہی اس کی کم سے کم مقدار ہے۔ ابن محیریز نے کہا ہے: صاحب دیوان پر تین دینار ہوں گے اور غلام پر متعہ ہوگا۔

اور حسن نے کہا ہے: ہر کوئی اپنی قدر کے مطابق متعہ ادا کرے گا کوئی خادم کے ساتھ، کوئی کپڑوں کے ساتھ، کوئی ایک کپڑے کے ساتھ اور کوئی نفقہ کے ساتھ۔ اسی طرح امام مالک بن انس بھی کہتے ہیں اور یہی قرآن کریم کا مقتضا ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نہ اس کی مقدار مقرر کی ہے اور نہ اس کی حد بیان فرمائی ہے۔ بے شک اس نے ارشاد فرمایا ہے: عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ (مقدور والے پر اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے مطابق ہے) حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے بیس ہزار اور ایک زقاق (مشکیزہ) شہد بطور متعہ دیا۔ اور شریح نے پانچ سو درہم بطور متعہ دیئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بلاشبہ عورت کی حالت کا بھی اعتبار کیا جائے گا۔ بعض شوافع نے یہی کہا ہے، انہوں نے کہا ہے: اگر ہم صرف مرد کی حالت کا اعتبار کریں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اگر وہ دو عورتوں سے شادی کرے ان میں سے ایک شریف اور اعلیٰ ہو اور دوسری ادنیٰ اور گھٹیا ہو پھر وہ مس کرنے سے پہلے ہی دونوں کو طلاق دے دے اور دونوں کے لئے مہر مقرر نہ کرے کہ وہ دونوں متعہ میں برابر ہوں۔ پس گھٹیا کے لئے بھی وہی کچھ واجب ہوگا جو شریف اور اعلیٰ کے لئے واجب ہو رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے خلاف ہے: مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ (متعہ دو مناسب طریقہ کے ساتھ۔) اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ انتہائی دولتمند اور خوشحال آدمی جب کسی کمینی اور گھٹیا عورت سے شادی کرے کہ وہ اس کی مثل ہو جائے، کیونکہ اس نے جب اسے دخول اور مہر مقرر ہونے سے پہلے طلاق دے دی تو مرد کی حالت اور عورت کے مہر مثل کے اعتبار سے اس پر متعہ لازم ہوگا، پس اس طرح متعہ اس کے مہر مثل کا کئی گنا ہو جائے گا۔ نتیجتاً وہ دخول سے قبل اس کے اس مہر کے کئی گنا کا مستحق ہو جائے گی جس مہر مثل کا وہ دخول کے بعد مستحق ہوگی جس میں استعمال کی انتہا ہے اور وہ وطی ہے۔

اصحاب الرائے وغیرہم نے کہا ہے: وہ عورت جسے دخول اور مہر مقرر کیے جانے سے پہلے طلاق دی جاتی ہے اس کا متعہ نصف مہر مثل ہے اس کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ مہر مثل عقد کے سبب لازم ہوا ہے اور متعہ مہر مثل کا ہی بعض ہے، پس یہ اس کے لئے اسی طرح واجب ہوگا جیسے مہر مسمی کا نصف واجب ہوتا ہے جبکہ طلاق قبل از دخول ہو اور اس کی تردید رب العالمین کا یہ ارشاد کرتا ہے: عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ اور یہ تحدید چھوڑنے پر دلیل ہے (2) اور اللہ تعالیٰ ہی حقائق الامور

1۔ موطا امام مالک، جلد 1، صفحہ 522، وزارت تعلیم

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 319، دار الکتب العلمیہ

کے بارے جاننے والا ہے۔

اور ثعلبی نے حدیث ذکر کی ہے۔ بیان کیا ہے کہ یہ آیت لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ الآیہ انصار کے ایک آدمی کے بارے نازل ہوئی۔ اس نے بنی حنیفہ کی ایک عورت سے شادی کی اور اس کے لئے مہر مقرر نہ کیا پھر اسے چھونے سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تو اسے متعہ دے اگرچہ وہ تیری ٹوپی ہی ہو'' متعھا ولو بقلنسوتك۔(1)

اور دار قطنی نے سوید بن غفلہ سے روایت کیا ہے کہ عائشہ خشعمیہ حضرت امام حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کے نکاح میں تھی جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت کر لی گئی تو اس نے کہا: اے امیر المومنین! تجھے خلافت مبارک ہو۔ تو آپ نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے ہیں اور تو خوشی کا اظہار کر رہی ہے! اذھبی فأنت طالق ثلاثا تو جا تجھے تین طلاقیں ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ اس نے اپنا کمبل لپیٹ لیا اور بیٹھ گئی یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی۔ پس آپ نے اس کی طرف بطور متعہ دس ہزار اور اس کے مہر میں سے جو بھی باقی تھا وہ سب بھیج دیا۔ تو اس نے کہا:

متاع قلیل من حبیب مُفارِق

جدا ہونے والے محبوب کی نسبت متعہ انتہائی قلیل ہے۔

پس جب آپ کے پاس اس کا یہ قول پہنچا تو آپ رونے لگے اور فرمایا: اگر میں نے اپنے جد امجد سے نہ سنا ہوتا یا میرے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے میرے جد امجد سے سنا۔ آپ فرماتے ہیں: وہ آدمی جس نے اپنی بیوی کو تین مبہم یا اقراء کے وقت تین طلاقیں دیں تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی اور زوج سے شادی کرلے، تو میں اس کی طرف رجوع کر لیتا۔(2)

ایک روایت میں ہے کہ قاصد نے انہیں اس کی خبر دی اور وہ رونے لگے اور فرمایا: اگر میں نے اسے طلاق کے ساتھ مکمل جدا نہ کر دیا ہوتا تو میں اس کی طرف رجوع کر لیتا۔ لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: جس آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں ہر طہر کے وقت ایک طلاق یا ہر مہینے کے شروع میں ایک طلاق یا اسے اکٹھی تین طلاقیں دے دیں تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کرلے (ایما رجل طلّق امرأته ثلاثا عند کل طهر تطلیقة او عند رأس کل شهر تطلیقة او طلّقها ثلاثا جمیعا لم تحل له حتّی تنکح زوجا غیرہ)(3)

مسئلہ نمبر 9۔ وہ آدمی جو متعہ سے جاہل اور ناواقف ہو یہاں تک کہ کئی سال گزر گئے تو اسے چاہئے کہ وہ اسے دے اگرچہ وہ شادی بھی کرلے۔ اور اگر وہ عورت فوت ہو جائے تو اس کے ورثاء کو دے۔ اسے ابن مواز نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔ اور اصبغ نے کہا ہے: اگر عورت فوت ہو جائے تو پھر اس پر کوئی شے لازم نہیں ہے کیونکہ متعہ طلاق کی وجہ سے پہنچنے والے غم کے سبب عورت کو تسلی دینے کے لئے ہے اور وہ مقصود فوت ہو چکا ہے اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک حق ہے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 324، دار الفکر　2۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 30، دار المحاسن قاہرہ　3۔ ایضاً

جو مرد کے ذمہ ثابت ہو چکا ہے۔ لہٰذا وہ دیگر حقوق کی طرح عورت سے اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گا اور یہ ان کے مذہب میں متعہ کے واجب ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ یہ متعہ کے وجوب پر دلیل ہے۔ جمہور نے اسے الْمُوْسِعِ یعنی واؤ کے سکون اور سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے (1) اور اس سے مراد وہ ہے جس کی حالت میں وسعت اور خوشحالی ہو۔ کہا جاتا ہے: فلاں ینفق علی قدرہ یعنی فلاں اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرتا ہے۔ اور ابوحیوہ نے اسے واؤ کے فتحہ اور سین کی شد اور فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی اَلْمُوَسَّعِ) ابن عامر، حمزہ، کسائی اور عاصم نے حفص کی روایت میں دونوں مقامات پر دال کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی قَدَرُهٗ) اور ابن کثیر، نافع، ابوعمرو اور عاصم نے ابوبکر کی روایت میں قَدْرُهٗ یعنی دونوں جگہوں پر دال کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابوالحسن الاخفش وغیرہ نے کہا ہے: یہ دونوں ہم معنی ہیں، دونوں لغتیں فصیح ہیں۔

اور اسی طرح ابوزید نے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں: خذ قَدْرَ کذا و قَدَرَ کذا۔ دونوں کا معنی ایک ہے (یعنی اتنی مقدار لے لو) اور کتاب اللہ میں پڑھتے ہیں: فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌۢ بِقَدَرِهَا (الرعد: 17) (پس بہنے لگیں وادیاں اپنے اپنے اندازے کے مطابق) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ (الانعام: 91) (اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ کی جیسے حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا) اگر دال کو حرکت دی جائے تو بھی جائز ہے اور اَلْمُقْتِرِ کا معنی ہے قلیل المال (یعنی ایسا آدمی جس کے پاس مال کم ہو، وہ تنگدست ہو۔) مَتَاعًا یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے (2)۔ یعنی متعوھن متاعاً۔ تم انہیں خرچہ دو بِالْمَعْرُوْفِ یعنی جس طرح شریعت میں بیان کیا گیا ہے میانہ روی وغیرہ۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِیْنَ یعنی یہ نیکوکاروں کا فرض ہے۔ کہا جاتا ہے: حققت علیه القضاء أحققت، یعنی میں نے فیصلہ اس پر لازم کر دیا۔ اس میں اس پر دلیل ہے کہ متعہ واجب ہے کیونکہ اس کے بارے حکم دیا گیا ہے اور قول باری تعالیٰ حَقًّا وجوب کی تاکید کے لئے ہے۔ اور عَلَى الْمُحْسِنِیْنَ اور عَلَى الْمُتَّقِیْنَ کا معنی ہے علی المؤمنین یعنی مومنین پر لازم ہے۔ اسی لئے یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی یہ کہے: لست بمحسن ولا متق (کہ میں محسن اور متقی نہیں) اور لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمام کے تمام محسنین اور متقین ہوں۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کے فرائض ادا کرنے کے ساتھ محسن ہوتے ہیں اور وہ اس کی نافرمانی سے اجتناب کرتے ہیں تاکہ وہ جہنم میں داخل نہ ہوں۔ پس تمام مخلوق پر واجب ہے کہ وہ محسنین اور متقین ہوں اور حَقًّا یہ مَتَاعًا کی صفت ہے یا پھر مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اسے امر کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّاۤ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۳۷﴾

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 319، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

''اور اگر تم طلاق دو انہیں اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ اور مقرر کر چکے تھے ان کے لئے مہر تو نصف مہر (ادا کرو) جو تم نے مقرر کیا ہے مگر یہ کہ وہ (اپنا حق) معاف کر دیں یا معاف کر دے وہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ اور (اے مردو!) اگر تم معاف کر دو تو یہ بہت قریب ہے تقویٰ سے اور نہ بھلایا کرو احسان کو آپس (کے لین دین) میں، بے شک اللہ تعالیٰ جو تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے۔''

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ لوگوں نے اس آیت میں اختلاف کیا ہے، پس ایک جماعت نے کہا ہے، اس میں سے امام مالکؒ وغیرہ ہیں کہ یہ مہر مقرر ہونے کے بعد متعہ کے حکم سے مطلقہ کو نکالنے والی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسے شامل ہے وَّمَتِّعُوْهُنَّ اور حضرت ابن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس آیت کو سورۃ الاحزاب کی آیت نے منسوخ کر دیا ہے، کیونکہ وہ ہر اس مطلقہ کے متعہ کو متضمن ہے جس کے ساتھ دخول نہیں ہوا اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس آیت نے اپنے سے پہلی آیت کو منسوخ کیا ہے(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت سعید اور حضرت قتادہ کا قول محل نظر ہے کیونکہ نسخ کی شروط موجود نہیں ہیں اور انہیں جمع کرنا ممکن ہے اور ابن القاسم نے المدونہ میں کہا ہے: متعہ اس ارشاد کے مطابق ہر مطلقہ کے لئے ہے: وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ اور غیر مدخول بہا کے لئے اس آیت کے مطابق ہے جو سورۃ الاحزاب میں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ساتھ اس مطلقہ کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا ہے جس کے لئے مہر مقرر کیا گیا اور اسے قبل از دخول طلاق ہو گئی اور اس کے لئے صرف اس مہر کا نصف ثابت کیا جو اس کے لئے مقرر کیا گیا(2)۔

اور علماء کے ایک فریق نے کہا ہے ان میں سے ابو ثور ہیں کہ عموماً ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے اور اس آیت نے یہ بیان کیا ہے کہ جس کے لئے مہر مقرر کیا گیا وہ اس میں سے نصف بھی لے گی اور آیت سے اس کے متعہ کو ساقط کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے لئے متعہ اور نصف مہر ہے(3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ یعنی جو مہر تم نے مقرر کیا اس کا نصف واجب ہے۔ یعنی بالاجماع مہر میں سے نصف خاوند کے لئے ہے اور نصف عورت کے لئے اور نصف دو میں سے ایک جز ہے۔

پس کہا جاتا ہے: نَصَفَ الماءُ القدحَ یعنی پانی پیالے کے نصف تک پہنچ گیا۔ اور نصف الازار الساق چادر پنڈلی کے نصف تک ہوگی، ہر وہ شے جو اپنے غیر کے نصف تک پہنچ جائے تو تحقیق وہ اس کا نصف ہوگئی۔

جمہور نے فَنِصْفُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور ایک جماعت نے فَنِصْفَ یعنی فا کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے معنی یہ ہے کہ تم نصف دو۔

حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما نے فَنُصْفُ تمام قرآن میں نون کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ اور اسی طرح اصمعی نے ابو عمرو بن العلاء سے قراءت روایت کی ہے(4)۔ کہا جاتا ہے: نِصف و نُصف و

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 320، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

نَصِیفٌ۔ یہ تینوں نصف کے بارے میں لغات ہیں اور حدیث میں ہے: لو ان احدکم انفق مثل احد ذھبا ما بلغ مد احدھم ولا نصیفہ۔ ای نصفہ۔(1) (یعنی اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کی مثل سونا خرچ کرے تو وہ ان میں سے کسی کے مد کو نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس کے نصف کو) اور نصیف کا معنی القِناع (اوڑھنی دوپٹہ) بھی ہے۔

مسئلہ نمبر3۔ جب آدمی نے عورت کو مہر دے دیا پھر اسے قبل از دخول طلاق دے دی اور مہر عورت کے قبضے میں بڑھتا رہا تو امام مالک نے فرمایا ہے: کل سامان جو مرد نے اسے بطور مہر دیا یا غلام تو دونوں کی بڑھوتری دونوں (مرد و عورت) کے لئے ہوگی اور اس کا نقصان بھی دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا۔

اور اس کی ہلاکت بھی ان دونوں پر اکٹھی پڑے گی، اس صورت میں اس میں سے عورت پر کوئی شے نہ ہوگی۔ اور اگر اس نے اسے سونے یا چاندی کی معینہ مقدار بطور مہر دی اور اس نے اس کے ساتھ غلام یا گھر خرید لیا یا اس کے عوض ان کا کچھ حصہ خرید لیا یا اس کے سوا خوشبو یا گھر کا ساز و سامان یا اس کے علاوہ کوئی ایسی شے خریدی جس میں عورت کا تصرف ہو اپنی حاجت و ضرورت کے لئے اور مرد کے ساتھ اس گھر میں رہنے کی خاطر اپنے معاملات کی اصلاح کے لئے، تو وہ تمام کا تمام اسی کے قائم مقام ہے کہ اگر وہ اسے وہی بطور مہر دیتا اور اس کی نمو اور کمی دونوں کے درمیان منقسم ہوگی۔

اور اگر اس نے اسے قبل از دخول طلاق دی تو پھر اس کے لئے نصف کے سوا کچھ نہیں ہے اور نہ عورت پر یہ لازم ہے کہ وہ مرد کو اس مہر کا نصف بطور قرض ادا کرے جس پر اس نے قبضہ کیا ہے۔ اور اگر عورت نے کامل مہر یا اس کے کچھ حصہ کے ساتھ کوئی شے خریدی تو وہ اس کے ساتھ مختص ہو جائے گی اور عورت پر مرد کے لئے اس مہر کا نصف بطور قرض ہوگا جس پر عورت نے قبضہ کیا ہے اور اسی طرح اگر عورت نے کسی غیر سے غلام یا گھر خرید لیا اس ہزار کے عوض جو مرد نے اسے بطور مہر دیا تھا پھر اسے دخول سے پہلے طلاق دے دی تو وہ اس پر ہزار کے نصف کے لئے رجوع کر سکتا ہے۔

مسئلہ نمبر4۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت کی پھر فوت ہو گیا درآنحالیکہ اس کے لئے مہر مقرر کیا گیا تھا تو اس عورت کے لئے وہ کامل مہر مسمی ہوگا اور میراث بھی ہوگی اور اس پر عدت بھی ہوگی۔

اور علماء نے ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو عورت کے ساتھ خلوت تو اختیار کرتا ہے اور اس سے مجامعت نہیں کرتا یہاں تک کہ اسے جدا کر دیا۔ تو علمائے کوفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر تمام مہر واجب ہوگا اور عورت پر عدت بھی ہوگی، کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، انہوں نے کہا: خلفائے راشدین نے اس آدمی کے بارے میں فیصلہ فرمایا جس نے دروازہ بند کر لیا یا پردہ لٹکا لیا تو اس عورت کے لئے میراث ہوگی اور اس پر عدت بھی ہوگی (2)۔ یہ مرفوع روایت ہے اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔

اور امام شافعی کامل مہر واجب نہیں کرتے اور نہ ہی عورت پر عدت ہوگی جبکہ دخول نہ ہو۔ ظاہر قرآن کریم اس کی تائید کرتا

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1 صفحہ 518، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب قول النبی لو کنت متخذا، حدیث 3397، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ السنن الکبریٰ، جلد 7 صفحہ 255، دار الفکر

ہے۔ شریح نے کہا ہے: میں نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بابًا یا ستراً کا ذکر کیا ہو، جبکہ آپ کا خیال یہ ہے کہ چونکہ مرد نے عورت کو مس نہیں کیا لہٰذا اس کے لئے نصف مہر ہوگا۔ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مذہب ہے۔ اور اس بارے میں ہمارے علماء کا موقف عنقریب سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

رب کریم کے اس ارشاد کے تحت: وقد افضی بعضکم الی بعض۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ الآیۃ۔

اس میں اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ استثنا منقطع ہے۔ کیونکہ ان کا نصف معاف کرنا ان کے لینے کی جنس میں سے نہیں ہے۔ اور یَّعْفُوْنَ کا معنی یترکن (وہ چھوڑ دیتی ہیں) اور تصفحن (وہ درگزر کرتی ہیں) ہے اور اس کا وزن یَفْعُلْنَ ہے۔ معنی یہ ہے مگر یہ کہ وہ اس نصف کو چھوڑ دیتی ہیں جو ان کے لئے زوج پر واجب ہوتا ہے اور اَنْ داخل ہونے کے باوجود نون ساقط نہیں ہوا، کیونکہ مضارع میں جمع مؤنث کا صیغہ رفع، نصب اور جزم کی صورت میں ایک ہی حالت پر رہتا ہے اور یہ ضمیر ہے علامت اعراب نہیں ہے۔ پس اسی وجہ سے نون ساقط نہیں ہوا، کیونکہ اگر نون ساقط ہو جائے تو پھر مذکر کے ساتھ اس کا اشتباہ لازم آئے۔

اس آیت میں معاف کرنے والیوں میں ہر وہ عورت ہے جو اپنی ذات کے معاملہ کی خود مالک ہوتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں مہر ثابت ہو جانے کے بعد اسے ساقط کرنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ اسے خالص ان کا حق بنایا ہے۔ پس وہ اس میں قائم رکھنے اور ساقط کرنے کا تصرف کر سکتی ہیں جیسے چاہیں جبکہ وہ اپنے نفسوں کے معاملہ کی مالک ہیں اور وہ بالغ، عاقل اور ہدایت یافتہ بھی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور فقہاء و تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے: اس باکرہ عورت کا معاف کرنا بھی جائز ہوتا ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو اور اسے سحنون نے المدونہ میں ابن قاسم کے سوا کسی اور سے بیان کیا ہے اس کے بعد کہ ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ اس کا نصف مہر کو ساقط کرنا جائز نہیں ہے۔ رہی وہ جو باپ یا وصی کے زیر پرورش رہی تو اس کا اپنے نصف مہر کو ساقط کرنا جائز نہیں۔

یہ ایک ہی قول ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں جسے میں جانتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ اس کا عطف پہلے پر ہے، وہ مبنی ہے اور یہ معرب ہے اور حسن نے اَوْ یَعْفُوْ واؤ کو ساکن پڑھا ہے (1)۔ گویا کہ انہوں نے واؤ پر فتحہ کو ثقیل سمجھا ہے۔ لوگوں نے اس ارشاد کے معنی مراد میں اختلاف کیا ہے: اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ پس دارقطنی نے حضرت جبیر بن مطعم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بنی نصر کی ایک عورت سے شادی کی اور پھر دخول سے پہلے ہی اسے طلاق دے دی اور اس کی طرف کامل مہر بھیج دیا اور فرمایا: میں اسے معاف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (بقرہ: 237) اور میں اس سے معاف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں (2)۔ اور انہوں نے اس قول باری تعالیٰ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 321، دار الکتب العلمیہ　　2۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 279، دار المحاسن قاہرہ

کی تاویل کی: اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ مراد اپنی ذات ہے ہر حال میں طلاق سے پہلے بھی اور طلاق کے بعد بھی۔ یعنی یا وہ معاف کر دے جس کے ہاتھ میں اپنے نکاح کی گرہ ہے (یعنی عبارت ہے) عقدۃ نکاحہ۔ پھر جب لام داخل کیا گیا تو ہاء کو حذف کر دیا گیا، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى۔ ای مأواہ۔ نابغہ نے کہا ہے:

لهم شِيمَة لم يعطها اللهُ غيرَهم   من الجود والاحلام غيرُ عَوَازِبِ

اس میں الأحلام اصل میں أحلامهم ہے۔ اسی طرح قول باری تعالیٰ: عُقْدَةُ النِّكَاحِ اصل میں عقدۃ نکاحہ ہے۔

دارقطنی نے حضرت قتیبہ بن سعید کی حدیث سے مرفوع روایت بیان کی ہے کہ ابن لہیعہ نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ولی عقدۃ النکاح الزوج (1) کہ نکاح کی گرہ کا ولی زوج ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن مسیب اور قاضی شریح رضی اللہ عنہم سے بھی مسند بیان کی گئی ہے۔ فرمایا: اسی طرح نافع بن جبیر، محمد بن کعب، طاؤس، مجاہد، شعبی اور سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہم نے بھی کہا ہے اور اس کے سوا نے حضرت مجاہد اور حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہما کا اضافہ کیا ہے۔ اسے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے اور امام شافعی کے قول سے بھی یہی صحیح ہے۔ یہ تمام کے تمام عورت کے مہر میں سے کسی شے پر ولی کے لئے کوئی حق نہیں دیکھتے، اس پر اجماع ہونے کی وجہ سے کہ ولی اگر زوج کو طلاق سے پہلے مہر سے بری کر دے تو یہ جائز نہیں اور اسی طرح طلاق کے بعد بھی ہے۔

اور اس پر بھی اجماع ہے کہ ولی اس کے مال میں سے کوئی شے ہبہ کرنے کا مالک نہیں ہوتا اور مہر بھی اس کا مال ہے۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ اولیاء میں سے وہ بھی ہیں جن کا معاف کرنا جائز نہیں ہوتا اور وہ چچا کے بیٹے اور بھائیوں کے بیٹے ہیں۔ اسی طرح باپ بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

اور ان میں سے وہ بھی ہے جس نے کہا وہ ولی ہے، اسے دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی بیان کیا ہے (2)۔ انہوں نے کہا ہے: یہی ابراہیم، علقمہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے اور اس کے سوا حضرت عکرمہ، طاؤس، عطا، ابوالزناد، زید بن اسلم، ربیعہ، محمد بن کعب، ابن شہاب، اسود بن یزید، شعبی، قتادہ، مالک اور شافعی کے قدیم قول نے اس میں اضافہ کیا ہے۔

اور باپ کے لئے اپنی باکرہ بیٹی کا نصف مہر معاف کرنا جائز ہوتا ہے جب اسے طلاق ہو جائے، چاہے وہ حیض کی عمر کو پہنچے یا نہ پہنچے۔

عیسیٰ بن دینار نے کہا ہے: وہ اس میں سے کسی شے کے لئے اپنے باپ کی طرف رجوع نہیں کرے گی اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس سے مراد ولی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے آیت کے اول حصہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (البقرہ: 237) پس ازواج کا ذکر کیا اور اس خطاب کے ساتھ انہیں خطاب فرمایا، پھر فرمایا: اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ پس عورتوں کا ذکر کیا۔ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ تو یہ تیسرا حصہ ہے اسے اس زوج کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا جس کا ذکر پہلے ہوا مگر یہ کہ اس کے سوا کوئی موجود نہ ہو، حالانکہ وہ پایا گیا

1۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 279، دارالمحاسن قاہرہ   2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 280

ہے اور وہ ولی ہے اور وہی مراد ہے۔ اس کا یہ معنی مکی نے بیان کیا ہے اور اسے ابن عربی نے ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اور یہ معلوم شدہ ہے کہ ہر عورت معاف نہیں کرسکتی، کیونکہ صغیرہ اور وہ عورت جس پر پابندی ہو ان کے لئے معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دونوں قسموں کو بیان فرمادیا اور فرمایا: اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ یعنی اگر وہ اس کے اہل ہوں اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ اور اس سے مراد ولی ہے کیونکہ اس میں اختیار اسی کے پاس ہے۔

اور اسی طرح ابن وہب، اشہب، ابن عبدالحکم اور ابن قاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنی باکرہ بیٹی کے حق میں باپ ہے اور اپنی لونڈی کے حق میں آقا ہے۔ اور بلاشبہ ولی کا معاف کرنا جائز ہوتا ہے جب کہ وہ صائب الرائے لوگوں میں سے ہو اور اس کا معاف کرنا جائز نہیں ہوتا جبکہ وہ بیوقوف اور احمق ہو۔

اور اگر کہا جائے: ہم تسلیم نہیں کرتے کہ اس سے مراد ولی ہے بلکہ اس سے مراد زوج ہے اور یہ اسم اس کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ یہ ولی کی نسبت عقد کرنے کا زیادہ مالک ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ باکرہ بیٹی کے حق میں باپ کی نسبت زوج عقد کا زیادہ مالک ہوتا ہے، بلکہ وہاں تو صرف باکرہ کا باپ مالک ہوتا ہے نہ کہ زوج، کیونکہ جس پر عقد کیا گیا ہے وہ باکرہ کی بضع ہے اور زوج اس کا عقد کرنے کا مالک نہیں ہوتا بلکہ باپ اس کا مالک ہوتا ہے۔

اور شریح نے بھائی کے نصف مہر معاف کرنے کو جائز قرار دیا ہے اور اسی طرح عکرمہ نے کہا ہے: اس کا معاف کرنا بھی جائز ہے جس نے دونوں کے درمیان عقد نکاح کیا چاہے وہ چچا ہو یا باپ ہو یا بھائی ہو۔ اگرچہ وہ ناپسند بھی کرے۔

ابونہیک اور شعبی نے اَوْ یَعْفُوْ واؤ کو الف کے مشابہ قرار دے کر اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی مثل شاعر کا قول بھی ہے:

فما سودتني عامر عن وراثة　　أبى الله أن اسمُو بأم ولا أب

اس میں اسمو کی واؤ کو سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور تَعْفُوْ دراصل تَعْفُوُوْا ہے پہلی واؤ کو ساکن کردیا گیا اس پر حرکت ثقیل ہونے کی وجہ سے، پھر التقائے ساکنین کی وجہ سے اسے حذف کردیا گیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق یہ خطاب مردوں اور عورتوں کو ہے اور مردوں کو اس میں غلبہ دیا گیا ہے۔ اور لام بمعنی الیٰ ہے یعنی اقرب الی التقویٰ۔

اور جمہور نے اسے تعفو تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابونہیک اور شعبی نے وَاَنْ یَعْفُوْا یاء کے ساتھ قراءت کی ہے۔ یہ ضمیر اسی کی طرف راجع ہے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (1)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 321، دارالکتب العلمیہ

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے وان تعفون تاء کے ساتھ نہیں پڑھا گیا کہ یہ عورتوں کے لئے ہو۔

اور جمہور نے وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ کو واؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یحییٰ بن یعمر نے اسے کسرہ دیا ہے۔ اور حضرت علی، مجاہد، ابوحیوہ، ابن ابی عبلہ رحمۃ اللہ علیہم نے ولا تناسوا الفضل پڑھا ہے۔ اور یہ قراءت معنی کو پختہ کرنے والی ہے، کیونکہ یہ تناسی (بھولنے کا بہانہ کرنا) کا محل ہے نہ کہ نسیان کا مگر تشبیہ کی بنا پر۔

مجاہد نے کہا ہے: الفضل سے مراد مرد کا کل مہر کو مکمل کرنا ہے یا عورت کا اپنے نصف مہر کو چھوڑ دینا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ یہ خبر اپنے ضمن میں محسن کے لئے وعدہ اور غیر محسن کے لئے محرومی لئے ہوئے ہے (2)۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر تمہارا معاف کرنا اور تمہارا پورا پورا طلب کرنا مخفی نہیں ہے۔

حٰفِظُوۡا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰی ٭ وَ قُوۡمُوۡا لِلّٰهِ قٰنِتِیۡنَ ﴿۲۳۸﴾

"پابندی کرو سب نمازوں کی اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی اور کھڑے رہا کرو اللہ کے لئے عاجزی کرتے ہوئے۔"

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: حٰفِظُوۡا یہ خطاب تمام امت کو ہے اور یہ آیت نمازوں کو ان کے اوقات میں ان کی تمام شرائط کے ساتھ قائم کرنے اور اس پر ہمیشگی اختیار کرنے کا حکم ہے۔

اور محافظۃ کا معنی کسی شے پر مداومت اور مواظبت اختیار کرنا ہے اور الوسطیٰ الاوسط کی تانیث ہے اور کسی شے کا وسط اس کا بہترین، عمدہ اور متناسب ہونا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا اس کی تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور ایک اعرابی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح کرتے ہوئے کہا:

یا اوسط الناس طرًّا فی مَفاخرهم ۔۔۔ واکرم الناس اُمًّا برّةً و اَبا

اور وسط فلان القوم یَسِطهم یعنی فلاں ان کے وسط میں ہو گیا۔ اور الصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰی کا علیحدہ اور منفرد ذکر کیا گیا ہے حالانکہ الصلوٰت کے عموم میں بھی وہ داخل ہے تو اس کی عظمت اور مرتبہ کے اظہار کے لئے ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیۡثَاقَهُمۡ وَ مِنۡكَ وَ مِنۡ نُّوۡحٍ (الاحزاب: 7) (اور اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح سے) (اس میں مِنۡكَ اور مِنۡ نُّوۡحٍ کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے حالانکہ النبیین کے عموم میں یہ داخل ہیں۔ تو یہ اظہار شرف و مرتبہ کے لئے ہے) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: فِیۡهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخۡلٌ وَّ رُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ (الرحمن) (ان میں میوے ہوں گے اور کھجوریں اور انار ہوں گے۔)

(فَاكِهَةٌ کے عموم میں داخل ہونے کے باوجود نخل اور رمان کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے۔)

ابوجعفر الواسطی نے وَ الصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰی کو اغراء کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھا ہے یعنی الزموا الصلاۃ الوسطی (تم صلوٰۃ وسطیٰ کو لازم پکڑو) اور اسی طرح حلوانی نے بھی پڑھا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 322، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

اور قالون نے نافع سے الوصطی صاد کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ طاء اس کی مجاورت میں ہے کیونکہ یہ دونوں ایک ہی محل میں سے ہیں۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ صراط وغیرہ۔

مسئلہ نمبر 2۔ لوگوں نے وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى کی تعیین میں اختلاف کیا ہے اس پر دس اقوال ہیں۔

(۱) اس سے مراد ظہر ہے، کیونکہ یہ نماز دو قولوں میں سے صحیح قول کی بنا پر دن کے وسط میں ہے کہ دن کا آغاز طلوع فجر سے ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور ہم نے ظہر سے ابتدا کی ہے کیونکہ یہی وہ پہلی نماز ہے جو اسلام میں ادا کی گئی۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہی الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ہے ان میں سے حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو سعید خدری، حضرت عبد اللہ بن عمر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم ہیں۔

اور ان روایات میں سے جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ یہی صلوٰۃ وسطی ہے ایک وہ ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی، جس وقت ان دونوں نے املا کرائی حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى وَصَلَاةِ العصر اسے واؤ کے ساتھ بیان کیا (1)۔

اور روایت ہے کہ یہ مسلمان پر بہت زیادہ شاق گزرتی ہے کیونکہ یہ تیز گرمی کے وقت میں آتی ہے درآنحالیکہ انہیں اپنے اموال میں کاموں نے خوب تھکا رکھا ہوتا ہے۔

اور ابوداؤد نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہر کی نماز سخت گرمی میں ادا فرماتے تھے اور کوئی ایسی نماز نہ تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب پر اس سے زیادہ شاق اور مشقت آمیز ہوتی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى اور یہ بھی فرمایا: اس سے پہلے بھی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد بھی دو نمازیں ہیں (2)۔ اور امام مالک نے موطا میں اور ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: صلوٰۃ وسطی صلوٰۃ ظہر ہے (3)۔

طیالسی نے یہ زیادہ کہا ہے: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے سخت گرمی کے وقت میں ادا فرماتے تھے۔

(۲) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد نماز عصر ہے، کیونکہ اس سے پہلے دن کی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد رات کی دو نمازیں ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اس استدلال میں سے عمدہ اور اعلیٰ یہ ہے کہ یہ نماز ہے جس کے لئے وسطیٰ کہا گیا ہے کیونکہ یہ دو نمازوں کے درمیان ہے ان میں سے ایک وہ ہے جو سب سے اول فرض کی گئی اور دوسری وہ نماز ہے جو دوسرے نمبر پر فرض کی گئی۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہی نماز صلوٰۃ وسطی ہے ان میں سے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم ہیں (4)، یہی امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم کا مختار ہے۔ امام شافعی

1۔ موطا امام مالک، کتاب صلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 121، وزارت تعلیم　　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 59، وزارت تعلیم

3۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 122، وزارت تعلیم

4۔ صحیح بخاری، باب الدعاء علی المشرکین، حدیث 5917، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر اہل الاثر نے یہی کہا ہے اور عبد الملک بن حبیب نے بھی یہی موقف اپنایا ہے اور ابن عربی نے بھی قبس میں اور ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں اسے ہی اختیار کیا ہے اور کہا ہے: اسی قول پر جمہور لوگ ہیں اور یہی میں بھی کہتا ہوں۔

اور انہوں نے اس باب میں وارد ہونے والی احادیث سے استدلال کیا ہے انہیں مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے اور میں ان میں سے حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بیان کروں گا۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الصلاۃ الوسطی صلاۃ العصر صلاۃ وسطی نماز عصر ہے۔ اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1) اور ہم اس سے زیادہ احادیث ''القبس فی شرح موطا مالک بن انس'' میں لائے ہیں۔

(۳) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد نماز مغرب ہے۔ قبیصہ بن ابی ذویب نے ایک جماعت میں یہی کہا ہے۔ ان کی حجت یہ ہے کہ یہ رکعتوں کی تعداد میں متوسط ہے نہ رکعتوں کی تعداد بہت کم ہے اور نہ ہی بہت زیادہ ہے اور نہ ہی سفر میں اس کی قصر کی جاتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہ اپنے وقت سے مؤخر کیا ہے اور نہ ہی اسے جلدی ادا فرمایا ہے اور اس کے بعد دو نمازیں جہری ہیں اور اس سے پہلے دو نمازیں سری ہیں اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل ترین نماز مغرب ہے۔ اس نے اسے نہ کسی مسافر سے ساقط کیا اور نہ کسی مقیم سے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ رات کی نماز کا آغاز کیا اور اس کے ساتھ دن کی نمازوں کو ختم کر دیا۔ پس جس نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک محل بنائے گا اور جس نے اس کے بعد چار رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے بیس سال کے گناہوں کی مغفرت فرما دے گا۔ یا فرمایا چالیس سال کے''۔

(۴) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد عشاء کی نماز ہے کیونکہ یہ ایسی دو نمازوں کے درمیان ہے جن کی قصر نہیں کی جاتی اور یہ نیند کے وقت میں آتی ہے اور اس میں تاخیر کرنا مستحب ہوتا ہے اور یہ شاق اور گراں ہوتی ہے، لہٰذا اس کی محافظت کی تاکید فرمائی۔

(۵) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد صبح کی نماز ہے، کیونکہ اس سے پہلے رات کی دو نمازیں ہیں جن میں قراءت بالجہر کی جاتی ہے اور اس کے بعد دن کی دو نمازیں ہیں جن میں سراً قراءت کی جاتی ہے اور اس لئے بھی کہ اس کا وقت داخل ہو جاتا ہے اور لوگ سو رہے ہوتے ہیں اور اس کے لئے سردی کے موسم میں سردی کی شدت کی وجہ سے اٹھنا اور گرمی کے موسم میں رات کے چھوٹا ہونے کے باعث اٹھنا شاق اور مشکل ہوتا ہے۔

اور جنہوں نے کہا کہ یہی صلوٰۃ وسطیٰ ہے ان میں سے حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ اسے مؤطا نے بلاغاً ذکر کیا ہے۔ (یعنی امام مالک نے الموطا میں فرمایا کہ ان دونوں سے یہ خبر ان کے پاس پہنچی ہے) اور ترمذی نے اسے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ (معلق ایسی روایت ہے جو غیر مسند ہو) اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی امام مالک اور آپ کے اصحاب کا قول ہے اور اسی کی طرف امام شافعی کا میلان ہے اس میں جو آپ سے القشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ نماز عصر ہے اور آپ

1۔ سنن ترمذی، باب ماجاء فی صلوٰۃ الوسطیٰ، حدیث نمبر 166، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے یہ صحیح اور معروف سند سے مروی ہے۔(1)

اور جنہوں نے کہا ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ صبح کی نماز ہے انہوں نے الله تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ یعنی فیھا (اور کھڑے رہا کرو الله کے لئے اس میں عاجزی کرتے ہوئے) (لیکن استدلال کرنے والوں نے ترجمہ کیا قنوت پڑھتے ہوئے۔) اور صبح کی نماز کے سوا کوئی فرض نماز نہیں ہے جس میں قنوت ہو۔ ابورجاء نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ہمیں بصرہ میں صبح کی نماز پڑھائی اور اس میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھائی اور اپنے ہاتھوں کو بلند کیا اور جب فارغ ہوئے تو فرمایا: یہ وہ صلوٰۃ وسطیٰ ہے جس کے بارے الله تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس میں قنوت پڑھتے ہوئے کھڑے رہیں۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز میں رکوع کے بعد قنوت پڑھی (2)۔ قنوت کا حکم آگے آئے گا اور اس بارے میں علماء کی جو آراء ہیں سورہ آل عمران میں اس ارشاد کے تحت: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (آل عمران: 128)

(۶) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد جمعہ کی نماز ہے کیونکہ اس کے لئے جمع ہونے اور اس میں خطبہ ہونے کے سبب اسے خاص کیا گیا ہے اور اسے عید بنایا گیا ہے۔ ابن حبیب اور مکی نے یہ ذکر کیا ہے۔ اور مسلم نے حضرت عبد الله رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس قوم کے لئے جو جمعہ کی نماز سے پیچھے رہ جاتے ہیں لقد هممت أن آمر رجلا يصلي بالناس ثم احرق على رجال يتخلفون من الجمعة بيوتهم (3) میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں کسی آدمی کو لوگوں کو نماز پڑھانے کے لئے حکم دوں پھر ان لوگوں کو ان کے گھروں میں جلا دوں جو جمعہ کی نماز سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

(۷) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد صبح اور عصر کی دونوں نمازیں ہیں۔ شیخ ابوبکر الابہری نے یہی کہا ہے اور انہوں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: يتعاقبون فيكم ملائكة بالليل و ملائكة بالنهار الحديث (4) (تم میں رات اور دن کے فرشتے ایک دوسرے کے پیچھے ہوتے ہیں۔) اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

اور حضرت جریر بن عبد الله رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہم رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھا اور فرمایا: أما أنكم سترون ربكم كما ترون هذا القمر لا تضامون في رؤيته فان استطعتم الا تغلبوا على صلاة قبل طلوع الشمس و صلاة قبل غروبها، يعني العصر و الفجر۔ (بے شک عنقریب تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح تم ان چاند کو دیکھ رہے ہو۔ تمہیں اس کی رؤیت میں کوئی مشقت نہ ہوگی۔ پس اگر تم

1۔ صحیح بخاری، باب الدعاء على المشرکين، حدیث نمبر 5917، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 237، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب القنوت الخ، حدیث نمبر 946، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 232، وزارت تعلیم

4۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 79، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، فضل صلوٰۃ العصر، حدیث نمبر 522، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

استطاعت رکھو تو خبردار! اس نماز کے بارے میں تم مغلوب نہ ہو جو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہے اور وہ نماز جو غروب آفتاب سے پہلے ہے) ان سے مراد عصر اور فجر کی نمازیں ہیں۔ پھر حضرت جریر نے یہ آیت پڑھی وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا (طٰہٰ: 130) (1) (اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ طلوع آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے۔)

اور حضرت عمارہ بن رؤیبہ نے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''ہرگز کوئی آگ میں داخل نہ ہوگا جس نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے نماز پڑھی (2)۔'' ان سے مراد بھی فجر اور عصر کی نمازیں ہیں۔

اور انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من صلی البردین دخل الجنة (3) جس نے دو ٹھنڈی نمازیں پڑھیں وہ جنت میں داخل ہوگا۔ یہ تمام صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہیں۔ ان دونوں نمازوں کو بَرْدَین کا نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں نمازیں ٹھنڈک کے وقت میں پڑھی جاتی ہیں۔

(۸) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد عشاء اور صبح کی نمازیں ہیں۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اپنے اس مرض کے دوران فرمایا جس میں ان کا وصال ہوا: تم سنو اور تم اپنے پیچھے آنے والوں کو بھی پہنچاؤ ان دو نمازوں پر مواظبت اختیار کرو۔ یعنی جماعت کے ساتھ ادا کرو۔ عشاء اور صبح کی نمازیں اور اگر تم جان لو جوان دونوں میں (اجر) ہے تو تم ان دونوں کو ادا کرنے کے لئے آؤ اگرچہ تمہیں اپنی کہنیوں اور گھٹنوں کے بل گھسٹ کر آنا پڑے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے۔

ائمہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اگر وہ جان لیں جو (اجر) عشاء اور صبح کی نمازوں میں ہے تو وہ ان دونوں کے لئے آئیں اگرچہ گھسٹ کر آنا پڑے اور فرمایا بے شک یہ دونوں نمازیں منافقین پر بہت سخت اور بھاری ہیں (4)۔'' اور صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے والے کے لئے پوری رات قیام کرنے اور عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے والے کے لئے نصف رات قیام کرنے کا (اجر) رکھا گیا ہے۔ اسے امام مالک نے موقوف علی عثمان ذکر کیا ہے اور مسلم نے اسے مرفوع ذکر کیا ہے اور ابوداؤد اور ترمذی نے آپ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: من شهد العشاء فی جماعة کان له قیام نصف لیلة و من صلی العشاء و الفجر فی جماعة کان له کقیام لیلة (5) جو آدمی عشاء کی جماعت میں حاضر ہوا اس کے لئے نصف رات کا قیام کرنے کا اجر ہے اور جس نے عشاء اور فجر کی نمازیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب فضل صلوٰۃ العصر، حدیث نمبر 521، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب فضل صلوٰۃ الفجر، حدیث نمبر 540، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 322، دار الکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، باب فضل العشاء الخ، حدیث نمبر 617، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 30، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ، حدیث نمبر 468، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ترمذی، باب ماجاء فی فضل العشاء والفجر فی الجماعۃ، حدیث نمبر 205، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جماعت کے ساتھ ادا کیں تو اس کے لئے پوری رات قیام کرنے کی طرح اجر ہے۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جسے امام مالک اور مسلم رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے۔

(۹) یہ پانچوں کی پانچویں نمازیں ہیں یہ حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ سے فرض اور نفل کو شامل ہے پھر فرض کا خصوصاً ذکر کیا۔

(۱۰) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد غیر معین نماز ہے۔ حضرت نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہی روایت کیا ہے اور ربیع بن خثیم نے بھی یہی کہا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نمازوں میں صلوٰۃ وسطیٰ کو اسی طرح مخفی اور پوشیدہ رکھا ہے جیسے کہ رمضان المبارک میں لیلۃ القدر کو مخفی رکھا ہے اور جس طرح کہ جمعہ کے دن (مقبول) ساعت کو اور رات کی ان ساعتوں کو مخفی رکھا جن میں دعا مقبول ہوتی ہے، تاکہ وہ رات کے وقت اندھیروں میں عالم الخفیات کی مناجات کے لئے قیام کریں۔

اور جس سے اس کی صحت پر استدلال ہوتا ہے کہ یہ مبہم ہے غیر معین ہے وہ وہ روایت ہے جسے مسلم نے اپنی صحیح میں باب کے آخر میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ آیت نازل ہوئی: حافظوا علی الصلوات وصلوۃ العصر تم نمازوں پر اور نماز عصر پر مواظبت اختیار کرو۔ پس ہم نے اسے پڑھا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور یہ نازل ہوئی: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى تو کسی آدمی نے کہا: کیا یہ صلوٰۃ عصر ہی ہے؟ براء نے کہا ہے: میں نے تجھے خبر دی ہے کیسے یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے کیسے منسوخ فرمایا؟ (1) واللہ اعلم۔ پس اس سے لازم ہوا کہ اسے معین کرنے کے بعد اس کی تعیین کو منسوخ کر دیا گیا اور اسے مبہم رکھا گیا پس تعیین اٹھ گئی۔ واللہ اعلم۔

اور یہ مسلم کی پسند ہے، کیونکہ اسے باب کے آخر میں لایا گیا ہے اور علماء متاخرین میں سے کئی ایک نے اسی طرح کہا ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ دلائل کے مابین تعارض ہونے اور ترجیح نہ ہونے کی وجہ سے (علماء متاخرین نے یہی کہا ہے۔) پس تمام نمازوں پر محافظت اور ان کے اوقات میں ان کی ادائیگی کے سوا کوئی شے باقی نہیں رہی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى میں یہ اختلاف ان کے بطلان پر دلالت کرتا ہے جنہوں نے وصلواۃ العصر ثابت کیا ہے جو کہ ابو یونس مولیٰ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں مذکور ہے جبکہ آپ نے اسے حکم دیا کہ وہ آپ کے لئے مصحف قرآنی لکھے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: بلاشبہ یہ الفاظ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے تفسیر کی مانند ہیں۔ اور اس پر عمرو بن رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حکم ارشاد فرمایا کہ میں ان کے لئے مصحف لکھوں۔ الحدیث۔ اور اس میں ہے: پس آپ نے مجھے اسی طرح املاء کرائی حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۔۔۔ وھی العصر ۔۔۔ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (2) اور فرمایا: اسی طرح میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا۔ پس آپ کا قول وھی العصر اس پر دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کلام اللہ میں سے الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى کی اپنے قول وھی العصر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 227، وزارت تعلیم

2۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 121-122، وزارت تعلیم

کے ساتھ تفسیر بیان کی ہے۔ اور نافع نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے صلاۃ العصر کے الفاظ روایت کیے ہیں (1) جیسا کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے صلاۃ العصر کے الفاظ بھی یعنی بغیر واؤ کے روایت کیے گئے ہیں (2)۔

اور ابوبکر الانباری نے کہا ہے: اس زائد لفظ میں یہ اختلاف اس کے بطلان پر اور جو کچھ تمام مسلمانوں کے مصحف الامام میں ہے اس کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

اور اس پر ایک دوسری دلیل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جنہوں نے کہا: والصلاۃ الوسطی و صلاۃ العصر انہوں نے ہی صلاۃ وسطیٰ غیر عصر کو قرار دیا ہے۔ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا رد ہے جسے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: غزوۂ احزاب کے دن مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عصر کی نماز سے مشغول رکھا یہاں تک کہ سورج کا رنگ زرد ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شغلونا عن الصلاۃ الوسطیٰ ملأ اللہ اجوافهم و قبورهم نارا (3) الحدیث۔ انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ سے مشغول رکھا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى میں اس پر دلیل موجود ہے کہ وتر واجب (فرض) نہیں ہیں، کیونکہ مسلمانوں کا فرض نمازوں کی تعداد پر اتفاق ہے کہ وہ سات سے کم ہیں اور تین سے زیادہ ہیں اور تین سے سات کے درمیان سوائے پانچ کے اور کوئی طاق عدد نہیں ہے۔ اور جفت اعداد کا کوئی وسط نہیں تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ فرض نمازیں پانچ ہیں اور حدیث معراج میں یہی پانچ ہی وہ پچاس ہیں کیونکہ میرے نزدیک قول تبدیل نہیں ہوتا۔ ھی خمس و ھن خمسون لا یبدل القول لدی۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ اس کا معنی ہے تم اپنی نمازوں میں عجز و انکساری کرتے ہوئے کھڑے رہو۔ اور لوگوں کا قٰنِتِيْنَ کے معنی میں اختلاف ہے۔ حضرت شعبی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے طائعین اطاعت کرنے والے اور حضرت جابر بن زید، عطا اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے۔

اور ضحاک نے کہا ہے: قرآن کریم میں ہر مقام پر قنوت کا لفظ طاعت کے معنی میں ہے۔ اور ابو سعید نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی بیان کیا ہے اور بے شک ہر دین والے آج وہ نافرمانی کرتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس امت کو کہا گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے لئے اطاعت و پیروی کرتے ہوئے کھڑے رہو (4)۔

اور مجاہد نے کہا ہے: قٰنِتِيْنَ کا معنی ہے خاشعین خشوع کرنے والے۔ قنوت کا معنی ہے رکوع کو طویل کرنا، خشوع کرنا، آنکھوں کو جھکانا اور عجز و انکساری کرنا۔

اور ربیع نے کہا ہے: القنوت کا معنی ہے قیام کو طویل کرنا (5)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے اور اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 122، وزارت تعلیم
2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 442، دار الکتاب العربیۃ بیروت
3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 227، د۔ت
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 323، دار الکتب العلمیہ
5۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 324

اَمَّنۡ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا پڑھا ہے۔ (الزمر:9) (بھلا جو شخص عبادت میں بسر کرتا ہے رات کی گھڑیاں کبھی سجدہ کرتے ہوئے اور کبھی کھڑے ہوئے) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے: افضل الصلاۃ طول القنوت (1) افضل نماز طویل قیام والی ہے۔ مسلم وغیرہ نے اسے بیان کیا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

قانتا للہ یدعو ربّہ و علی عمدٍ من الناس اعتزل

اس میں بھی قانتاً طویل قیام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: قانتین داعین۔ دعا مانگنے والے، پکارنے والے (2)۔ اور حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینہ تک قنوت پڑھی اور آپ رعل وذکوان کے خلاف دعا مانگتے رہے (3)۔ ایک قوم نے کہا ہے: اس کا معنی ہے دعا۔ اس نے دعا مانگی۔ اور ایک قوم نے کہا: ہے اس کا معنی ہے طول قیامہ۔ اس نے اپنا قیام طویل کیا۔ اور سدی نے کہا ہے: قانتین کا معنی ہے ساکتین۔ خاموش رہنے والے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ آیت نماز میں کلام کرنے سے روکنے کے لئے نازل ہوئی۔ اور ابتدائے اسلام میں یہ مباح تھی اور یہی صحیح ہے اس روایت کی وجہ سے جسے مسلم وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پیش کرتے تھے، درآنحالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہوتے اور آپ ہم پر جواب لوٹاتے تھے اور جب ہم نجاشی کے پاس سے لوٹ کر آئے، ہم نے آپ پر سلام پیش کیا تو آپ نے ہمیں جواب نہ لوٹایا، تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ پر نماز میں سلام عرض کرتے تھے اور آپ ہم پر جواب لوٹاتے تھے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان فی الصلوٰۃ شغلا (4) بے شک نماز میں مشغولیت ہے۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے روایت کیا اور کہا: ہم نماز میں کلام کرتے تھے ایک آدمی اپنے ساتھی سے گفتگو کر لیتا تھا درآنحالیکہ وہ اس کے پہلو میں حالت نماز میں ہوتا، یہاں تک کہ پھر یہ آیت نازل ہوئی: قُوۡمُوۡا لِلّٰهِ قٰنِتِیۡنَ۔ پھر ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور گفتگو سے ہمیں روک دیا گیا (5)۔

اور کہا گیا ہے: لغوی اعتبار سے قنوت کا اصل معنی کسی شے پر دوام اختیار کرنا ہے اور اس حیثیت سے کہ لغت میں قنوت کا اصل معنی دوام علی الشیء ہے۔ یہ جائز ہے کہ طاعت و پیروی پر دوام اختیار کرنے والے کو قانت کا نام دیا جائے اور اسی طرح جس نے قیام، قراءت اور دعا نماز میں طویل کر دیے یا خشوع اور سکوت کو طویل کیا۔ یہ سب کے سب قنوت کرنے والے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ سب کے سب مسلمانوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ نماز میں جان بوجھ کر کلام کرنا جبکہ نمازی جانتا ہو

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 51، وزارت تعلیم 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دار الکتب العلمیہ

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 237، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب القنوت قبل الرکوع وبعدہ، حدیث نمبر 948، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 204، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب ماینھی عنہ من الکلام، حدیث نمبر 1124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ ایضاً۔ صحیح بخاری، باب ماینھی عنہ من الکلام فی الصلوٰۃ، حدیث نمبر 1125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہ وہ نماز میں ہے اور وہ کلام اس کی نماز کی اصلاح کے بارے میں نہ ہو تو وہ نماز کو فاسد کر دیتی ہے، سوائے اس روایت کے جو اوزاعی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: جس نے نفس کے احیاء کے لئے کلام کی یا اسی جیسے بڑے امور کے بارے میں تو اس کے ساتھ اس کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ یہ قول نظر وفکر کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ۔

اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم نماز میں کلام کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ۔(1) الحدیث اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ نیا حکم بیان کیا ہے کہ تم نماز میں کلام نہ کرو'' (2) اور ایسا کوئی بڑا واقعہ نہیں ہے جس کے لئے نماز کو توڑنا وہ پسند کرتا ہو اور اس وجہ سے وہ استیناف سے منع کرتا ہو۔ پس جس کسی نے ایسے کام کے لئے اپنی نماز کو توڑ دیا جسے وہ احیاء نفس یا مال یا ایسا کام جو انہی کے طریقہ پر ہو کے لئے فضیلت دیکھتا ہو تو وہ اپنی نماز نئے سرے سے پڑھے اور بنا نہ کرے۔ اس مسئلہ میں یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ نماز کے دوران بھول کر کلام کرنے کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما اور ان کے اصحاب ان تمام نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ نماز میں سہواً گفتگو کرنا اسے فاسد نہیں کرتا۔ لیکن امام مالک نے یہ بھی کہا ہے: نماز میں عمداً گفتگو کرنا بھی نماز کو فاسد نہیں کرتا بشرطیکہ وہ اس کی کیفیت اور اس کی اصلاح کے بارے ہو۔ یہی ربیعہ اور ابن القاسم کا قول ہے۔

اور سحنون نے ابن القاسم سے اور انہوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر کسی قوم کو امام نے دو رکعتیں نماز پڑھائی اور بھول کر سلام پھیر دیا اور انہوں نے اس کے لئے تسبیح (سبحان اللہ کہا) کہی اور وہ اسے نہ سمجھا، تو ان لوگوں میں سے جو اس کے پیچھے نماز میں تھے ایک آدمی نے کہا: بلاشبہ تم نے نماز مکمل نہیں کی سو اپنی نماز مکمل کرو۔ پس وہ قوم کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: کیا یہ حق ہے جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں۔ تو فرمایا: امام انہیں وہ نماز پڑھا دے گا جو ان کی نماز میں سے باقی ہے اور وہ اس کے ساتھ اپنی بقیہ نماز پڑھیں گے ان میں سے وہ بھی جس نے کلام کیا اور وہ بھی جس نے کلام نہیں کیا اور ان پر کوئی شے نہ ہوگی اور وہ اس میں وہی کچھ کرنے والے ہوں گے جو کچھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذوالیدین کے دن کیا۔ یہ المدونہ میں ابن القاسم کا قول ہے اور ان کی روایت امام مالک سے ہے اور یہ امام مالک کے تمام اصحاب ذوالیدین کے مسئلہ میں امام مالک کے قول کے خلاف ہیں سوائے اکیلے ابن قاسم کے، کیونکہ اس بارے میں وہی امام مالک کا قول بیان کرتے ہیں اور ان کے سوا دوسرے اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: بلاشبہ یہ ابتدائے اسلام میں ہوا۔ اور آپ لوگ اپنی نماز کے بارے میں پہنچا تے ہیں۔ پس جس کسی نے اس دوران گفتگو کی تو وہ اس کا اعادہ کرے۔ اور یہی قول

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 204، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 133، وزارت تعلیم

ایضاً صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ کل یوم هو فی شان، قبل هذا الحدیث 6968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عراقیین کا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب، اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ نماز میں گفتگو کرنا کسی بھی حال میں اسے فاسد کر دیتا ہے چاہے وہ سہواً ہو یا عمداً ہو، نماز کے بارے میں ہو یا کسی غیر کے بارے میں۔ اور یہی ابراہیم نخعی، عطا، حسن، حماد بن ابی سلیمان اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ کے اصحاب کا خیال ہے کہ ذوالیدین کے قصہ کے بارے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حضرت ابن مسعود اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہما کی حدیث سے منسوخ ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اگرچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ متاخر الاسلام ہیں لیکن انہوں نے ذوالیدین کی حدیث کو مرسل ذکر کیا ہے جیسا کہ انہوں نے اس حدیث کو مرسل ذکر کیا ہے: من ادرکه الفجر جنبا فلا صوم له (1) جسے جنبی حالت میں فجر نے پالیا تو اس کے لئے روزہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کثرت سے مرسل حدیثیں روایت کرتے ہیں۔

اور علی بن زیاد نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں ابوقرہ نے بتایا کہ میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: جب آدمی نماز میں کلام کرے تو مستحب یہ ہے کہ وہ اس کا اعادہ کرے اور بنا نہ کرے۔ مزید کہا: اور ہمیں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گفتگو فرمائی اور اس دن آپ کے اصحاب نے بھی آپ کے ساتھ گفتگو کی، کیونکہ ان کا گمان تھا کہ نماز کم ہو گئی ہے اور آج کسی کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

اور سحنون نے ابن القاسم سے ایک آدمی کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اس نے اکیلے نماز پڑھی اور اپنی طرف سے وہ چار رکعتوں سے فارغ ہو گیا، تو اس کے پہلو میں موجود ایک آدمی نے اسے کہا: بلاشبہ تو نے تو صرف تین رکعتیں پڑھی ہیں، تو وہ دوسرے کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا: کیا یہ درست ہے جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: اس کی نماز فاسد ہو گئی اور اس کو نہیں چاہئے تھا کہ وہ اس سے کلام کرتا اور نہ یہ چاہئے تھا کہ اس (دوسرے) کی طرف متوجہ ہوتا۔

ابوعمر نے کہا ہے: وہ اس مسئلہ میں جماعت کے ساتھ امام اور منفرد کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ پس وہ امام اور اس کے مقتدیوں کے لئے نماز کی حالت کے بارے کلام کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں اور منفرد کو اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اور ان کے سوا دوسرے اس مسئلہ میں ابن القاسم کے جواب کو منفرد اور امام اور اس کے ساتھیوں پر محمول کرتے ہیں آپ کے اس قول میں اختلاف کی بنا پر جو ذوالیدین کی حدیث کے استعمال میں ہے۔ جیسا کہ اس میں امام مالک کا قول مختلف ہے۔

اور امام شافعی اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: جس نے عمداً کلام کیا اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس نے نماز مکمل نہیں کی اور یہ کہ وہ نماز میں ہے تو اس نے اپنی نماز کو فاسد کر دیا اور اگر اس نے سہواً گفتگو کی یا اس نے گفتگو کی اور وہ یہ گمان کرتا ہو کہ وہ نماز میں نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی طرف سے اسے مکمل کر لیا ہے تو وہ بنا کر سکتا ہے۔

اس مسئلہ میں امام احمد نے اختلاف کیا ہے اور ان سے الاثرم نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: آدمی نے اپنی نماز کے دوران اس کی اصلاح کے لئے جو گفتگو کی تو اس سے اس کی نماز فاسد نہیں ہوئی۔ اور اگر اس کے سوا کوئی اور گفتگو کی تو اس کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، جلد 1، صفحہ 353، وزارت تعلیم

نماز فاسد ہو گئی۔ یہی امام مالک کا مشہور قول ہے اور الحزمی نے ان سے ذکر کیا ہے کہ ان کا مذہب اس کے بارے میں جس نے عمداً کلام کیا یا بھول کر، یہ ہے کہ اس کی نماز باطل ہو گئی، سوائے صرف امام کے کیونکہ جب اس نے اپنی نماز کی اصلاح کے لئے گفتگو کی تو اس کی نماز باطل نہیں ہوئی۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے سحنون نے یہ استثنا بیان کی ہے کہ جس نے چار رکعت نماز میں دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا اور وہاں کلام ہوئی تو نماز باطل نہ ہو گی اور اگر اس کے سوا کسی اور محل میں کلام واقع ہو تو نماز باطل ہو جائے گی۔ اور صحیح وہ ہے جو امام مالک کا مشہور قول ہے اور حدیث سے استدلال ہے اور احکام کے متعدی ہونے اور شریعت کے عموم کے بارے میں اسے اصل کلی پر محمول کرتے ہوئے اور خصوصیت کے وہم کو دور کرتے ہوئے جبکہ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

اور اگر کوئی کہنے والا کہے: تحقیق کلام بھی نماز میں واقع ہوئی اور سہو بھی، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''تسبیح کہنا مردوں کے لئے ہے اور تالی بجانا عورتوں کے لئے ہے'' (1) تو انہوں نے تسبیح کیوں کر نہ کہی؟ تو کہا جائے گا: شاید اس وقت میں انہیں اس کا حکم نہیں تھا اور اگر تھا جیسا کہ آپ نے ذکر کیا ہے اور انہوں نے تسبیح نہ کہی، کیونکہ انہیں یہ وہم ہوا کہ نماز کم ہو گئی ہے۔ اس کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔ فرمایا: لوگوں میں سے ایک تیز رفتار آدمی نکل گیا تو لوگوں نے کہا: کیا نماز کم ہو گئی ہے؟ پس اس وجہ سے کلام کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

اور بعض مخالفین نے کہا ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو نماز پڑھائی اور وہ (ابو ہریرہ) ان میں سے نہ ہوں، جیسا کہ نزال بن سبرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا: ''بے شک ہم اور تم بنی عبد مناف پکارے جاتے تھے اور تم آج بنو عبداللہ ہو اور ہم بھی بنو عبدللہ ہیں''۔ (2) اس سے مراد یہ لیا ہے کہ آپ نے یہ اپنی قوم کو فرمایا اور یہ بعید ہے، کیونکہ یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کہیں صلی بنا آپ نے ہمیں نماز پڑھائی حالانکہ اس وقت وہ کافر تھے۔ اہل صلوٰۃ میں سے نہ تھے اور یہ کذب ہو گا، اور نزال کی حدیث وہ بھی من جملہ قوم میں سے تھے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا جو سنا۔

اور رہا وہ دعویٰ جو حنیفہ نے نسخ اور ارسال کے بارے کیا ہے تو ہمارے علماء وغیرہم نے ان کے قول کا جواب دیا ہے اور اسے باطل قرار دیا ہے۔ خاص کر حافظ ابو عمر ابن عبد البر نے اپنی کتاب ''التمہید'' میں یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فتح خیبر کے سال اسلام لائے اور اسی سال مدینہ طیبہ میں آئے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں چار سال تک رہے اور ذوالیدین کے قصے کو دیکھا اور اس میں حاضر تھے۔ اور یہ بدر سے پہلے کا نہیں ہے جیسا کہ انہوں نے گمان کیا ہے اور ذوالیدین بدر میں شہید ہوئے۔ فرمایا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ذوالیدین کے دن حاضر ہونا ثقہ حفاظ کی روایت کے مطابق محفوظ ہے اور جنہوں نے اسے جانا، اسے یاد کیا اور اس کا ذکر کیا ان کے خلاف حجت لانے سے جو باز رہے اس میں ان کی کوئی کوتاہی نہیں ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 180، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب التصفیق للنساء، حدیث 1128، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً صحیح بخاری، باب تشبیك الاصابع الخ، حدیث 460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ شرح مشکل الآثار، جلد 8، صفحہ 282، موسسۃ الرسالۃ بیروت۔

مسئلہ نمبر 8۔ القنوت: اس کا معنی قیام ہے اور یہ اس کی ان اقسام میں سے ایک ہے جو ابو بکر بن انباری نے ذکر کی ہیں۔ اور امت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ فرض نماز میں قیام کرنا ہر تندرست اور اس پر قدرت رکھنے والے آدمی پر واجب ہے چاہے وہ منفرد ہو یا امام ہو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ امام بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے۔ پس جب کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو'' (1) الحدیث۔ اسے ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا بیان ہے: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ اور انہوں نے صحت مند مقتدی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو ایسے مریض امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے جو کھڑے ہونے کی استطاعت نہیں رکھتا تو اہل علم کے ایک گروہ نے اس کی اجازت دی ہے بلکہ جمہور اہل علم نے، کیونکہ امام کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اور جب وہ (امام) بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم تمام بھی بیٹھ کر نماز پڑھو'' (2)۔ یہی اس مسئلہ میں صحیح ہے۔ ابھی ہم بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور علماء کے ایک گروہ نے مریض امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ ہر کوئی اپنی طاقت کے مطابق اپنا فرض ادا کر رہا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مرض میں بیٹھ کر نماز پڑھائی جس میں آپ کا وصال ہوا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں کھڑے ہو کر آپ کی نماز کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ آپ کے پیچھے کھڑے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ نہیں کیا اور اپنی نماز انہیں کے ساتھ بیٹھ کر مکمل کی اور وہ کھڑے تھے۔ اور یہ معلوم ہے کہ یہ واقعہ آپ کے اپنے گھوڑے سے گرنے کے بعد کا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا دوسرا فعل پہلے فعل کے لئے ناسخ ہے۔

ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اس سے استدلال کیا ہے ان میں سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد بن علی ہیں اور یہی ولید بن مسلم کی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ امام کے پہلو میں ان میں سے کوئی کھڑا ہو جائے جو لوگوں کو امام کی نماز کے بارے بتلاتا رہے (یعنی امام کی حرکات و سکنات سے آگاہ رکھے۔) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت غریب ہے۔

اور اس کے بارے اہل مدینہ کی ایک جماعت اور دوسروں نے کہا ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ یہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مشہور روایت یہ ہے کہ کوئی بیٹھنے والا کھڑے ہونے والوں کی امامت نہیں کرائے گا۔ پس اگر بیٹھ کر اس نے ان کی امامت کرائی تو امام اور مقتدی تمام کی نماز باطل ہوگی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''میرے بعد بیٹھ کر کوئی بھی امامت نہ کرائے گا (3)''۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 89، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب انما جعل الامام لیوتم، حدیث نمبر 647-648، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب انما جعل الامام لیوتم، حدیث نمبر 648-646، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن دار قطنی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 398، دار المحاسن قاہرہ

فرمایا: اگر امام بیمار ہو تو امام کی نماز مکمل ہو گی اور اس کے پیچھے پڑھنے والے کی نماز فاسد ہو گی۔ مزید کہا: جس نے بغیر علت کے بیٹھ کر نماز پڑھی تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔ یہ امام مالک سے ابو مصعب نے اپنی مختصر میں روایت بیان کی ہے۔ پس جس نے بیٹھ کر نماز پڑھی اس پر وقت میں اور وقت کے بعد اعادہ واجب ہو گا۔ اور امام مالک سے اس بارے میں روایت بیان کی گئی ہے کہ وہ صرف وقت میں اعادہ کریں گے۔ اور اس بارے میں امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول امام مالک کے مشہور قول کی مثل ہی ہے۔ انہوں نے اپنے قول کے لئے اور اپنے مذہب کے لئے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے ابو مصعب نے بیان کیا ہے، اسے دار قطنی نے جابر سے اور انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یؤمن احد بعدی جالسا دار قطنی نے کہا ہے: اسے جابر جعفی کے سوا کسی نے حضرت شعبی سے روایت نہیں کیا ہے اور وہ متروک الحدیث ہے۔ یہ روایت مرسل ہے، اس کے ساتھ حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ ابو عمر نے کہا ہے: جابر جعفی کسی بھی شے سے حجت نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ اسے مسند روایت کرتا ہو تو پھر اس سے کیسے استدلال ہو سکتا ہے جسے وہ مرسل روایت کرتا ہے؟

امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب مریض امام بیٹھ کر ایسی قوم کو نماز پڑھائے جن میں کچھ صحت مند اور کچھ مریض ہوں تو امام کی نماز اور اس کے پیچھے پڑھنے والوں میں سے ان کی نماز جو کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رکھتے صحیح اور جائز ہے اور ان کی نماز جن کے لئے قیام کا حکم ہے باطل ہے۔

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ نے کہا ہے: امام اور تمام مقتدیوں کی نماز جائز ہے اور انہوں نے کہا: اگر امام نے اشارے کے ساتھ ایسے لوگوں کو نماز پڑھائی جو رکوع و سجود کر سکتے ہیں تو تمام کے قول کے مطابق مقتدیوں کی نماز جائز نہیں اور امام کی نماز جائز ہے اور امام زفر کہتے ہیں: ان کی نماز بھی جائز ہو گی کیونکہ انہوں نے اپنے فرض ادا کیے ہیں اور ان کے امام نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اسی طرح امام شافعی نے بھی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ ابو عمر اور ان کے علاوہ ان سے پہلے اور بعد کے علماء نے کہا ہے کہ یہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی، حالانکہ میں نے ان کے سوا کو اس کے خلاف بھی دیکھا ہے جنہوں نے اس باب میں طرق احادیث کو جمع کیا ہے اور ان پر گفتگو کی ہے اور اس بارے میں فقہاء کا اختلاف بھی ذکر کیا ہے۔ جو کچھ انہوں نے ذکر کیا ہے ہم اسے اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے تاکہ تیرے لئے راہ صواب واضح ہو جائے اگر اللہ تعالیٰ چاہے اور اس کے قول کی صحت واضح ہو جائے جس نے یہ کہا کہ تندرست مقتدی کا مریض امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

پس ابو حاتم محمد بن حبان البستی نے المسند الصحیح میں اس کا ذکر کیا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی ایک جماعت میں تھے تو آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے نہیں ہو کہ میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں؟ صحابہ نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے نہیں ہو کہ جس نے میری اطاعت کی تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں میری طاعت ہے؟'' انہوں نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ ہم تو شہادت دیتے ہیں کہ جس کسی نے آپ کی اطاعت کی تحقیق اس نے

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے آپ کی اطاعت ہے۔ پھر فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ کی اطاعت یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو اور میری اطاعت یہ ہے کہ تم اپنے امراء کی اطاعت کرو۔ پس اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھائیں تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو (1)۔'' اس کی سند میں عقبہ بن ابی الصہباء راوی ہے اور وہ ثقہ ہے، یحییٰ بن معین نے یہی کہا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: اس حدیث میں یہ واضح بیان ہے کہ مقتدیوں کا بیٹھ کر نماز پڑھنا جبکہ ان کا امام بھی بیٹھ کر نماز پڑھائے اللہ تعالیٰ کی اس اطاعت میں سے ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم ارشاد فرمایا ہے۔ یہ میرے نزدیک اس اجماع کی ایک قسم ہے جس کی اجازت پر انہوں نے اجماع کیا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے چار ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ فتویٰ دیا ہے۔ (یعنی) حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت اسید بن حضیر اور حضرت قیس بن فہد رضی اللہ عنہم اور ان صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی ان چار کے خلاف مروی نہیں جو وحی اور قرآن کریم کے نزول کے وقت حاضر تھے اور جنہیں تحریف و تبدیل سے محفوظ رکھا گیا، نہ اسناد متصل کے ساتھ اور نہ منقطع کے ساتھ۔ تو گویا صحابہ کرام نے اس پر اجماع کیا کہ امام جب بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدیوں پر بھی لازم ہے کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھیں۔ اسی طرح جابر بن زید، اوزاعی، مالک بن انس، احمد بن حنبل، اسحاق ابن ابراہیم، ابو ایوب سلیمان بن داؤد الہاشمی، ابو خیثمہ، ابن ابی شیبہ، محمد بن اسماعیل اور اصحاب حدیث میں سے جو ان کے متبعین ہیں مثلاً محمد بن نصر اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور اس حدیث کو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت انس بن مالک، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن عمر بن خطاب اور حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔

اس امت میں سب سے اول جس نے بیٹھ کر نماز پڑھنے والے مقتدی کی نماز کو باطل قرار دیا جبکہ امام بھی بیٹھ کر نماز پڑھائے وہ مغیرہ بن مقسم صاحب النخعی ہیں اور ان سے حماد بن ابی سلیمان نے اسے لیا ہے اور پھر حماد سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اخذ کیا ہے اور پھر آپ کے بعد آنے والے آپ کے اصحاب نے آپ کی اتباع کی ہے اور اس بارے میں وہ اعلیٰ روایت جس سے انہوں نے استدلال کیا ہے اسے جابر جعفی نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا یؤمن احد بعدی جالسا اس روایت کی اسناد اگر صحیح بھی ہو تو بھی یہ مرسل ہے اور مرسل خبر اور وہ جسے کوئی روایت نہ کرے ہمارے نزدیک حکم میں دونوں برابر ہیں، پھر امام ابو حنیفہ کہتے ہیں: جن سے میں نے ملاقات کی ان میں حضرت عطا سے افضل میں نے کوئی نہیں دیکھا اور جن سے میں ملا ان میں جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا میں نے کوئی نہیں دیکھا اور میں کبھی اس کے پاس رائے سے کوئی شے نہیں لایا مگر وہ اس بارے میرے پاس حدیث لایا اور گمان ہوا کہ اس کے پاس اتنے اتنے ہزار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں ہیں جن کے بارے گفتگو نہیں۔ پس یہ امام اعظم ابو حنیفہ ہیں جو جابر جعفی پر جرح کر رہے ہیں اور اس کی تکذیب کر رہے ہیں اور یہ اس قول کی ضد ہے جس کی بنا پر آپ کے اصحاب نے آپ کا مذہب اختیار کیا ہے (2)۔

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 470، موسسۃ الرسالہ بیروت

2۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 417 تا 474، موسسۃ الرسالہ بیروت

ابو حاتم نے کہا ہے: رہی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ نماز جو آپ نے حالت مرض میں ادا فرمائی تو اس کے بارے مجمل اور مختصر اخبار مروی ہیں اور ان میں سے بعض مفصل اور واضح بھی ہیں، تو ان میں سے بعض میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں آکر بیٹھ گئے۔ پس حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدا کر رہے تھے اور لوگ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتدا کر رہے تھے (1) اور بعض میں ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بائیں جانب تشریف فرما ہو گئے۔ یہ روایت مفصل ہے۔ اس میں ہے: فکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی بالناس قاعدا و ابوبکر قائما پس حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھ کر لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے اور ابو بکر کھڑے ہو کر۔

ابو حاتم نے کہا ہے: جہاں تک اس خبر کے اجمال کا تعلق ہے تو بلاشبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس مقام پر اس نماز کو بیان کیا ہے اور آخر القصہ یہ ہے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کے نزدیک کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نماز میں بھی انہیں بیٹھنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا جیسا کہ آپ نے انہیں اپنے گھوڑے سے گرنے کے وقت اس کا حکم دیا تھا (2) محمد بن الحسن بن قتیبہ نے ہمیں خبر دی ہے، انہوں نے کہا: ہمیں یزید بن موہب نے خبر دی ہے، انہوں نے کہا: مجھے لیث بن سعد نے ابو الزبیر سے اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیمار ہوئے تو ہم نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں تک آپ کی تکبیر کی آواز پہنچا رہے تھے۔ راوی فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ہمیں کھڑا دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہماری طرف اشارہ کیا تو ہم بیٹھ گئے اور ہم نے بیٹھ کر آپ کی نماز کے ساتھ نماز پڑھی اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام پھیرا تو فرمایا: ''قریب ہے کہ تم اہل فارس اور روم کے عمل جیسا عمل کرو وہ اپنے بادشاہوں کے پاس کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں پس تم اس طرح نہ کرو تم اپنے ائمہ کی اقتدا کرو اگر امام کھڑے ہو کر نماز پڑھائے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔''

ابو حاتم نے کہا ہے: پس اس مفصل خبر میں واضح بیان ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بائیں جانب بیٹھے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مقتدی ہو گئے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کی اقتدا کرنے لگے اور آپ تکبیر کہتے اور وہ لوگوں تک تکبیر کی آواز پہنچاتے تا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کی اقتدا کریں اور اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں بیٹھنے کا حکم دیا جب آپ نے انہیں کھڑے ہوئے دیکھا اور جب آپ اپنی نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے انہیں بیٹھنے کا بھی حکم فرمایا جب ان کا امام بیٹھ کر نماز پڑھائے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نماز میں حاضر تھے جس وقت آپ اپنے گھوڑے سے گرے اور آپ کی دائیں جانب کچھ زخمی ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماہ ذی الحجہ ۵ ھ کے آخر میں گرے تھے اور وہ اس نماز میں بھی حاضر تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مرض کی حالت میں اس تاریخ کے علاوہ ادا فرمائی اور آپ نے ہر خبر کو اس کے الفاظ

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوۃ، جلد 5، صفحہ 489، موسستہ الرسالہ بیروت
ایضاً صحیح بخاری، باب الرجل یاتم بالامام الخ، حدیث نمبر 672، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 490-491

کے ساتھ بیان فرمایا کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ وہ اس نماز میں ذکر کر رہے ہیں؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تکبیر کہتے ہوئے اپنی آواز بلند کی تاکہ لوگ آپ کی اقتدا کریں اور وہ نماز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھوڑے سے گرنے کے وقت اپنے گھر میں پڑھائی تھی اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے آپ کو ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ وہ تکبیر کے ساتھ اپنی آواز بلند کریں تاکہ وہ لوگوں کو آپ کی تکبیر سنوا سکیں۔ تو بلاشبہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس عظیم مسجد میں تکبیر کے ساتھ اپنی آواز بلند کی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حالت مرض میں نماز پڑھائی، پس جب صحیح ہے جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے تو پھر یہ جائز نہیں کہ ہم ان اخبار میں سے بعض کو بعض کے لئے ناسخ قرار دیں (1) اور اس نماز کی طرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو آدمیوں کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں امام تھے اور آپ نے انہیں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور انہیں بھی بیٹھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور رہی وہ نماز جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کی آخری نماز پڑھی تو اس کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت بریرہ اور حضرت ثوبہ (یا ثویبہ) رضی اللہ عنہما کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے اور اس میں آپ مقتدی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ہی کپڑا پہن کر اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز ادا فرمائی (2)۔ اسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، فرمایا: وہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قوم کے ساتھ ایک کپڑا پہن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر ادا فرمائی (3)، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد میں دو نمازیں جماعت کے ساتھ ادا فرمائیں نہ کہ ایک نماز۔ اور عبید اللہ ابن عبد اللہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی خبر میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو مردوں کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے۔ ان دو میں سے ایک حضرت عباس اور دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور مسروق نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جو خبر بیان کی ہے اس میں ہے: پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آپ میں کچھ آرام اور سکون پایا تو آپ حضرت بریرہ اور حضرت ثوبہ کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے۔ بے شک میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نعلین کی طرف دیکھتی رہی وہ سنگریزوں میں لکیر ڈال رہے تھے اور میں آپ کے قدموں کے تلووں کی طرف دیکھتی رہی۔ الحدیث۔

پس یہ تیری اس پر راہنمائی کرتی ہے کہ وہ دو نمازیں تھیں نہ کہ ایک نماز (4)۔

ابو حاتم نے کہا ہے: ہمیں محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے خبر دی ہے، انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن بشار نے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا ہمیں بدل بن محبر نے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا ہمیں شعبہ نے موسیٰ بن ابی عائشہ عن عبید اللہ بن عبد اللہ کی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صف میں آپ کے پیچھے تھے (5)۔

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 491 تا 493، موسسۃ الرسالہ بیروت	2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 496

3۔ ایضاً۔ جامع ترمذی، باب ما جاء اذا صلی الامام قاعدا، حدیث نمبر 331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صحیح بخاری، باب من قام الی جنب الامام لعلۃ، حدیث 642۔ صحیح بخاری، باب الرجل یاتم بالامام، حدیث 672، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً صحیح بخاری، باب جعل الامام لیؤتم بہ، حدیث نمبر 648، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 488، موسسۃ الرسالہ بیروت	5۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 483

ابو حاتم نے کہا ہے: شعبہ بن حجاج نے زائدہ بن قدامہ سے اس خبر کے متن میں موسیٰ بن ابی عائشہ سے اختلاف کیا ہے۔ پس شعبہ نے حضور نبی کریم ﷺ کو مقتدی بنایا ہے اس حیثیت سے کہ آپ ﷺ نے بیٹھ کر نماز پڑھی اور دوسرے لوگوں نے کھڑے ہو کر۔ اور زائدہ نے آپ ﷺ کو امام قرار دیا ہے اور اس حیثیت سے کہ آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور قوم نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ اور یہ دونوں انتہائی ثقہ اور حافظ ہیں۔ تو یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ایسی دو روایتیں جن کے ظاہر میں ایک فعل میں تضاد ہے ان میں سے ایک کو مطلق متقدم امر کے لئے ناسخ بنا دیا جائے پس جس نے دو حدیثوں میں سے ایک کو حضور نبی کریم ﷺ کے امر متقدم کے لئے ناسخ بنایا اور دوسرے کو بغیر دلیل کے چھوڑ دیا تو اس کی صحت پر ثبوت لانا اس کے ذمہ ہے اس نے اپنے خصم کے لئے جائز قرار دیا کہ وہ دو خبروں سے اسے لے لے جسے اس نے چھوڑا ہے اور اسے چھوڑ دے جسے اس نے لیا ہے۔ اور سنن میں سے اس نوع کی نظیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خبر ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا اور آپ حالت احرام میں تھے (1) اور حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ان سے نکاح کیا اور وہ دونوں حلال تھے (یعنی حالت احرام میں نہ تھے۔) (2) پس یہ دونوں حدیثیں ایک فعل میں بظاہر متضاد ہیں بغیر اس کے کہ ہمارے نزدیک ان دونوں کے درمیان تضاد ہو، اصحاب حدیث کی ایک جماعت نے ان دونوں حدیثوں کو متعارض قرار دیا ہے جو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے مروی ہیں اور انہوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خبر کو لے لیا ہے جو انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ لاینکح المحرم ولا ینکح (محرم نہ اپنا نکاح کر سکتا ہے اور نہ کسی کا نکاح کر سکتا ہے) تو انہوں نے اسے لے لیا۔ جبکہ یہ ان دو روایتوں میں سے ایک کے ساتھ موافقت رکھتی ہے جو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے روایت کی گئی ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خبر کو چھوڑ دیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ان کے ساتھ حالت احرام میں نکاح کیا۔ پس جس نے یہ کہا اس کے لئے یہ کہنا لازم ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ کی حالت مرض میں نماز کے بارے دو حدیثیں متضاد ہیں، اس طریقہ پر جو اس سے پہلے ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ پس ضروری ہے کہ وہ ایک ایسی خبر لائے جس میں مقتدیوں کو بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم موجود ہو جبکہ ان کا امام بیٹھ کر نماز پڑھائے اور وہ اسے پکڑ لیں جبکہ وہ ان دو روایتوں میں سے ایک کے موافق ہو جو حضور نبی مکرم ﷺ کی حالت مرض میں نماز کے بارے روایت کی گئیں ہیں اور وہ چھوڑ دے اس خبر کو جو ان میں سے منفرد ہو، جیسا کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے معاملہ میں کیا گیا (3)۔

ابو حاتم نے کہا ہے: بعض عراقیین نے گمان کیا ہے جو کوفیوں کا مذہب اختیار کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کا یہ قول واذا صلی قاعدا فصلوا قعودا اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ بیٹھ کر تشہد پڑھے تو تم تمام بھی بیٹھ کر تشہد پڑھو۔ تو یہ خبر کو اس کے عموم سے

1۔ صحیح بخاری، باب التزویج المحرم، حدیث نمبر 1706، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ترمذی، باب ما جاء فی کراھیۃ تزویج المحرم، حدیث 770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوۃ، جلد 5، صفحہ 483 تا 485، موسسۃ الرسالہ بیروت

پھیر دینا ہے جس کے بارے میں خبر وارد ہے بغیر کسی ایسی دلیل کے جو اس معنی کو ثابت کر سکے (1)۔

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۳۹

''پھر اگر تم کو ڈر ہو (دشمن وغیرہ کا) تو پیادہ یا سوار (جیسے بن پڑے) پھر جب تمہیں امن حاصل ہو جائے تو یاد کرو اللہ تعالیٰ کو جس طرح اس نے سکھایا ہے تمہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔''

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ خِفْتُمْ یہ خوف سے ماخوذ ہے جس کا معنی گھبراہٹ اور ڈر ہے۔ فَرِجَالًا یعنی تم نماز پڑھو پیدل چلتے ہوئے اَوْ رُكْبَانًا یا سوار۔ یہ رجالا پر معطوف ہے۔ اور الرجال راجل یا رَجُل کی جمع ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: رَجِلَ الانسان یَرْجَلُ رَجَلاً جب آدمی کے پاس سواری نہ ہو اور وہ اپنے قدموں پر چلے۔ (صفت کا صیغہ ہوگا) فھو رَجِل و رَاجِل و رَجُلٌ (جیم کے ضمہ کے ساتھ) یہ اہل حجاز کی لغت ہے، وہ کہتے ہیں: مشی فلان الی بیت اللہ حافیا رَجُلاً (فلاں بیت اللہ شریف کی طرف ننگے پاؤں پیدل چلا) اسے طبری وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ و رَجُلان و رَجیل و رَجْل، (2) اور اس کی جمع رِجَال و رَجْلی و رُجّال و رَجّالة و رُجالی و رُجْلان و رِجْلَةٌ و رِجَلة (جیم کے فتحہ کے ساتھ) و أرْجِلة و أراجِل و أراجیل کے اوزان پر بنائی جاتی ہے اور الرَّجُل وہ جو کہ اسم جنس ہے اس کی جمع رجال بھی بنائی جاتی ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب اللہ تعالیٰ نے بندے کو نماز میں قنوت کی کیفیت میں کھڑے ہونے کا حکم ارشاد فرمایا اور قنوت سے مراد وقار، سکینہ اور اعضاء کا پرسکون ہونا ہے اور یہ اغلباً امن اور طمانینت کی حالت میں ممکن ہو سکتا ہے تو پھر حالت خوف کا ذکر فرمایا جو کبھی کبھار طاری ہو سکتی ہے اور بیان فرمایا کہ یہ عبادت بندے سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی اور اپنے بندوں کو نماز کے بارے میں رخصت عطا فرمائی کہ وہ اپنے قدموں پر پیدل چلتے ہوئے اور گھوڑے، اونٹ اور اسی طرح کی کسی شے پر سواری کرتے ہوئے اپنے سر کے اشارے کے ساتھ جس طرف منہ کرنا ممکن ہو متوجہ ہو کر نماز پڑھ لیں۔ یہ عطاء کا قول ہے، اور یہی اس گھبراہٹ اور خوف کی نماز ہے جب خوف شدت اور سختی کے ساتھ آدمی کی ذات پر مسلط ہو جائے جنگ کی حالت میں یا ایسا درندہ جو اسے تلاش کر رہا ہو، اس سے خوف کی حالت میں یا ایسے دشمن سے خوف ہو جو اس کا پیچھا کر رہا ہو یا ایسے سیلاب کا خوف ہو جو اسے اٹھا سکتا ہو۔ بالجملہ ہر وہ شے جس سے آدمی کو اپنی جان پر خوف ہو تو وہی وہ عذر مبیح ہے جسے یہ آیت متضمن ہے (4)۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ رخصت اپنے ضمن میں علماء کا اجماع بھی لئے ہوئے ہے کہ انسان جہاں کہیں بھی ہو راستوں سے

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 487، موسسۃ الرسالہ بیروت

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دار الکتب العلمیہ　　3۔ ایضاً

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دار الکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4171، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہٹ جائے اور رخ تبدیل کرلے اور اپنی عقل کے مطابق اپنی جان بچانے کے لئے ممکنہ اقدام کرے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس خوف کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے جس میں نماز پیادہ اور سوار پڑھنا جائز ہو جاتی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا ہے: مراد ایسا خوف ہے کہ دشمن ان پر بالکل قریب آچکا ہو اور وہ اکٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں اور مسلمان غیر محفوظ ہوں یہاں تک کہ ہتھیار تیر وغیرہ ان تک پہنچ سکتے ہوں یا اس سے بھی زیادہ دشمن ان کے قریب ہو کہ نیزے اور تلواریں ان تک پہنچ سکتی ہوں یا اس کے پاس کوئی ایسا مخبر آئے جس کی خبر کی تصدیق کی جاسکتی ہو اور وہ اسے خبر دے کہ دشمن اس کے قریب ہے اور بڑی تیزی سے وہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے، پس اگر ان دو معنوں میں سے کوئی ایک نہ ہو تو پھر اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ صلوٰۃ الخوف پڑھے اور اگر خبر کی بنا پر انہوں نے صلوٰۃ خوف پڑھی پھر دشمن چلا گیا تو وہ نماز کا اعادہ نہ کریں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نماز کا اعادہ کریں گے۔ یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: وہ حالت جس میں خوفزدہ ہونے والے کے لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ نماز پڑھے پیادہ یا سوار، قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے یا کسی اور طرف یہ شدت خوف کی حالت ہے اور وہ حالت جس کے بارے میں آثار وارد ہیں وہ اس کے سوا ہے۔ اور صلاۃ خوف امام کے ساتھ اور لوگوں کو تقسیم کر کے پڑھی جاتی ہے اور اس آیت میں اس کا حکم نہیں ہے اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور امام مالک نے جنگجو دشمن کے خوف اور درندے کے خوف اور اس جیسی دیگر چیزیں مثلاً حملہ کرنے والا اونٹ، سیلاب یا ہر وہ شے جس میں غالب گمان ہلاکت کا ہو، کے درمیان فرق کیا ہے کہ دشمن کے خوف کے علاوہ وقت کے اندر نماز کا اعادہ کرنا مستحب ہے اگر امن اور سکون میسر آجائے اور اکثر فقہائے امصار نے کہا ہے کہ حکم برابر ہے (چاہے خوف دشمن کا ہو یا کسی درندے وغیرہ کا)

مسئلہ نمبر 5۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بلاشبہ قتال نماز کو فاسد کر دیتا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اس کا رد کرتی ہے اور ظاہر آیت اس پر قوی دلیل ہے۔ عنقریب اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

امام شافعی نے کہا ہے: جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعض شروط کو ترک کرنے کے جواز کی رخصت عطا فرمائی ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ نماز میں قتال کرنا اسے فاسد نہیں کرے گا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام مالک، امام شافعی اور علماء کی ایک جماعت رحمہم اللہ علیہم کے نزدیک خوف کی حالت میں مسافر کی نماز سے رکعتوں کی تعداد کم نہ ہوگی۔

اور حسن بن ابی الحسن اور قتادہ وغیرہما نے کہا ہے کہ وہ ایک رکعت اشارے کے ساتھ پڑھ سکتا ہے(1)۔

امام مسلم نے بکیر بن اخنس سے، انہوں نے حضرت مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اقدس پر شہر میں چار رکعتیں، سفر میں دو رکعتیں اور خوف کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 335، دار الکتب العلمیہ

وقت ایک رکعت نماز فرض کی ہے (1)۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: اس روایت کو بیان کرنے میں بکیر بن اخنس منفرد ہے اور وہ روایت حجت نہیں ہوتی جس میں وہ منفرد ہوتا ہے اور نماز میں اولیٰ یہ ہے کہ اس میں احتیاط برتی جائے وہ آدمی جس نے اپنے خوف اور سفر کی حالت میں دو رکعتیں نماز پڑھ لی تو وہ اختلاف سے یقین کی طرف نکل گیا۔

اور ضحاک ابن مزاحم نے کہا ہے: وہ آدمی جسے حالت جنگ یا کسی اور حالت میں موت کا خوف ہو تو وہ ایک رکعت پڑھ سکتا ہے اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اسے چاہئے کہ دو تکبیریں کہہ لے۔

اور اسحاق بن راہویہ نے کہا ہے: اگر وہ صرف ایک تکبیر پر ہی قادر ہوا تو وہی اس کی طرف سے جائز ہوگی۔ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے (2)۔

اور قولہ تعالیٰ: فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمۡ، یعنی (جب تمہیں امن حاصل ہو جائے) تو تم اس حکم کی طرف لوٹ جاؤ جو تمہیں ارکان کی تکمیل کے بارے دیا گیا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: اَمِنۡتُمۡ کا معنی ہے جب تم دارالسفر سے دارالاقامہ کی طرف نکل جاؤ۔ علامہ طبری نے اس کا رد کیا ہے (3) اور ایک جماعت نے کہا ہے: اَمِنۡتُمۡ جب تمہارا وہ خوف زائل ہو جائے جس نے تمہیں اس نماز پر مجبور کر دیا تھا۔

مسئلہ نمبر 7۔ علماء نے خائف کی بنا کے بارے اس باب میں اختلاف کیا ہے جب وہ امن میں ہو جائے، حضرت امام مالک نے کہا ہے: اگر کسی نے ایک رکعت حالت امن میں پڑھ لی پھر اسے خوف لاحق ہو گیا تو وہ سوار ہوا اور اسی پہ بنا کر لے (یعنی دوسری رکعت سواری پر پڑھ لے تو نماز مکمل ہو جائے گی۔) اور اسی طرح اگر کسی نے حالت خوف میں سوای پر ایک رکعت پڑھی، پھر اسے امن ہو گیا، تو وہ اترے اور اسی پر بنا کر لے۔ یہی امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک ہے اور مزنی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب کوئی امن کی حالت میں نماز شروع کرے، پھر اسے خوف لاحق ہو جائے وہ منہ قبلہ شریف کی طرف کرے اور بنا نہ کرے اور اگر اس نے حالت خوف میں نماز شروع کی پھر اسے امن حاصل ہو جائے تو وہ بنا کر لے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سواری سے اترنے والا تو بنا کر سکتا ہے (لیکن) سوار ہونے والا بنا نہیں کر سکتا۔ اور امام ابو یوسف نے کہا ہے: وہ ان تمام صورتوں میں سے کسی میں بھی بنا نہیں کر سکتا۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایسی نماز کی تعلیم دی ہے جو اصل نماز کے قائم مقام ہے اور تمہاری کوئی نماز فوت نہیں ہوئی اور یہ وہی ہے جسے تم نہ جانتے تھے اور قول باری كَمَا میں کاف بمعنی شکر ہے تو کہتا ہے: تو میرے ساتھ اسی طرح (سلوک) کر جیسے میں نے تیرے ساتھ کیا اسی طرح بدلہ اور شکر ہوگا اور مَا اَنَّہ میں ما، عَلَّمَكُمۡ کا مفعول ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 241، وزارت تعلیم 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 325، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 9۔ ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: صلاۃ کا اصل معنی دعا ہے اور حالت خوف میں تو بدرجہ اولیٰ دعا کے معنی میں ہوگی، اسی لئے خوف کے سبب نماز ساقط نہیں ہوتی اور جب خوف کے سبب نماز ساقط نہیں ہوئی تو پھر یہ زیادہ مناسب اور لائق ہے کہ یہ اس کے سوا حالت مرض یا کسی اور حالت میں ساقط نہ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہر حال میں نمازوں پر مواظبت اور ان کی محافظت کا حکم ارشاد فرمایا ہے، چاہے صحت کی حالت ہو یا مرض کی، حضر ہو یا سفر، نماز کی قدرت ہو یا عجز، خوف ہو یا امن، یہ کسی حال میں بھی مکلف سے ساقط نہیں ہوتی اور کسی قسم کا فساد اور خلل اس کی فرضیت میں حائل نہیں ہو سکتا، راہ نہیں پکڑ سکتا۔ مریض کا حکم سورۂ آل عمران کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس سے مقصود یہ ہے کہ نماز پڑھی جائے گی جس کیفیت میں ممکن ہوگی اور یہ کسی حال میں ساقط نہ ہوگی یہاں تک کہ اگر اسے پڑھنے کا اتفاق نہ ہو مگر آنکھ کے اشارے کے ساتھ تب بھی اسے پڑھنا لازم ہے اور اسی وجہ سے یہ تمام عبادات سے ممتاز ہے، تمام کی تمام عذروں کے سبب ساقط ہو جاتی ہیں اور ان میں رخصت حاصل ہو جاتی ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: اسی لئے ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ مسئلہ عظمیٰ ہے، بے شک نماز ترک کرنے والے کو قتل کر دیا جائے گا، کیونکہ نماز اس ایمان کے مشابہ ہے جو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا اور انہوں نے اس بارے میں کہا ہے: نماز اسلام کے ستونوں میں سے ایک ہے جس کی نیابت نہ بدن کے ساتھ جائز ہوتی ہے اور نہ مال کے ساتھ (یعنی نماز کا قائم مقام کوئی اور بدنی یا مالی عبادت نہیں ہو سکتی) اور اس کے تارک کو قتل کر دیا جائے گا، اس کی اصل شہادتین ہے (1)۔ تارک صلوٰۃ کے بارے میں علماء نے جو کچھ کہا ہے اس کا بیان سورۂ براءۃ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

"اور جو لوگ فوت ہو جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویاں (انہیں چاہئے کہ) وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے لئے کہ انہیں خرچ دیا جائے ایک سال تک (اور) نہ نکالا جائے (انہیں گھر سے) پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو کوئی گناہ نہیں تم پر جو کچھ وہ کریں اپنے معاملہ میں مناسب طور پر اور اللہ بہت زبردست بڑا دانا ہے۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کی تاویل میں کہا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے وہ اپنے فوت ہونے والے خاوند کے گھر میں ایک سال تک بیٹھی رہے گی اور جب تک وہ گھر سے نہ نکلی اس کے مال میں سے اس پر خرچ کیا جاتا رہے گا اور اگر وہ نکل گئی تو اس کا نفقہ ختم کرنے میں ورثاء پر کوئی حرج نہیں۔ پھر سال کی مدت کو چار مہینے اور دس دن کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا اور نفقہ کو سورۂ نساء میں چوتھے اور آٹھویں حصے کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت ابن زید اور

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 228، دار الفکر　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 326، دار الکتب العلمیہ

حضرت ربیع رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ اور سکنیٰ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہا: یہ آیت جو سورۃ البقرہ میں ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ تحقیق اسے دوسری آیت نے منسوخ کر دیا ہے آپ نے اسے کیوں نہیں لکھا یا آپ نے اسے کیوں چھوڑ دیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اے بھتیجے! میں نے اس میں سے کسی شے کو اس کے مکان سے تبدیل نہیں کیا (1)۔

اور علامہ طبری نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے: بے شک یہ آیت محکم ہے اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور عدت چار مہینے اور دس دن ثابت ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے وصیت بنا دی اس میں سکنیٰ سات مہینے اور بیس راتیں ہے۔ پس اگر عورت چاہے تو اپنی وصیت میں رہے اور اگر چاہے تو نکل جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (2) ابن عطیہ نے کہا ہے: اس تمام کا حکم نسخ متفق علیہ کے ذریعے زائل ہو چکا ہے مگر وہ جو طبری نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے دعویٰ کیا ہے۔ اس بارے میں طبری محل نظر ہیں۔

اور حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر اجماع منعقد ہے کہ سال کی مدت منسوخ ہو چکی ہے اور اس کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔ دوسروں نے کہا: قولہ وصیۃ کا معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عورتوں پر زوج کے فوت ہو جانے کے بعد ایک سال تک گھروں میں رہنا واجب ہوتا ہے۔ پھر اسے منسوخ کر دیا گیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ طبری نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے وہ صحیح ثابت ہے۔ بخاری نے روایت کیا ہے: ہمیں اسحاق، روح، شبل نے ابن ابی نجیح سے اور انہوں نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا فرمایا: یہ عدت اپنے زوج کے گھر والوں کے پاس گزارنا واجب تھی پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تمام سال کو سات مہینے اور بیس راتیں وصیت بنا دیا، اگر وہ چاہے تو اپنی وصیت میں سکونت رکھے اور اگر چاہے تو نکل جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (3) مگر پہلا قول زیادہ ظاہر اور واضح ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: ''بلاشبہ یہ عدت چار مہینے اور دس دن ہے تم میں سے کوئی زمانہ جاہلیت میں سال مکمل ہونے پر مینگنیاں پھینکتی تھی۔'' الحدیث (4)

یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شریعت کے احکام نافذ ہونے سے پہلے ان عورتوں کی حالت کا بیان ہے جن کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 650، وزارت تعلیم　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 326، دار الکتب العلمیہ

3۔ صحیح بخاری تفسیر سورۃ بقرہ، جلد 2، صفحہ 650، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4172، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4167، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 143، وزارت تعلیم

خاوند فوت ہو جاتے تھے۔ پس جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سال تک گھروں میں ہی رہنے کا حکم ارشاد فرمایا پھر اس مدت کو چار مہینے دس دن کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا یہ وضاحت کے ساتھ سنت ثابتہ میں ہے جسے اخبار آحاد سے نقل کیا گیا ہے۔ اس پر علماء مسلمین کا اجماع ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابو عمر نے یہی کہا ہے، انہوں نے کہا اور اسی طرح پوری آیت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ جمہور علماء کے نزدیک یہ سب منسوخ ہے۔ پھر بیویوں کے لئے سال بھر رہائش کی وصیت کرنے کو منسوخ کر دیا گیا، سوائے ایک شاذ روایت کے جسے چھوڑ دیا گیا ہے وہ ابن ابی نجیح نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور اس پر کوئی متابع نہیں لائی گئی اور نہ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد آنے والے علمائے مسلمین میں سے کسی نے اس کے سبب چار مہینے اور دس دن پر اضافہ کیا ہے جہاں تک میں جانتا ہوں۔

اور ابن جریج نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے اس طرح کی روایت نقل کی ہے جس پر لوگوں کا عمل ہے، پس اجماع منعقد ہو گیا اور اختلاف ختم ہو گیا۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَّصِيَّةً حضرت نافع، ابن کثیر، کسائی، عاصم نے ایک روایت میں اور ابو بکر رحمۃ اللہ علیہم نے مبتدا ہونے کی بناء پر وَّصِيَّةٌ کو مرفوع پڑھا ہے اور اس کی خبر لِّاَزْوَاجِهِمْ ہے۔ اور یہ معنی ہونے کا احتمال بھی ہے علیھم وصیۃ۔ ان پر وصیت لازم ہے اور قول باری تعالیٰ لِّاَزْوَاجِهِمْ صفت ہو(1)۔ علامہ طبری نے کہا ہے کہ بعض علمائے نحو نے کہا ہے کہ معنی ہے کُتبت علیھم وصیۃ ان پر وصیت فرض کی گئی ہے اور قولہ لِّاَزْوَاجِهِمْ صفت ہو گا(2)۔ فرمایا: اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے۔ اور ابو عمرو، حمزہ اور ابن عامر رحمۃ اللہ علیہم نے وصیَّۃً منصوب پڑھا ہے اور اسے فعل پر محمول کیا ہے۔ یعنی فلیوصُوا وصیۃً پس چاہئے کہ وہ ضرور وصیت کریں پھر میت تو وصیت نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ وفات کے قریب ہوں اور لِاَزْوَاجِهِمْ اس قراءت کی بنا پر بھی صفت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے او صی اللہ وصیۃً۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت کو لازم قرار دیا ہے۔ اور مَتَاعًا۔ مَتِّعُوْهُنَّ مَتَاعًا ہے۔ یعنی تم انہیں ضرور نفقہ ادا کرو۔ یا جعل اللہ لھن ذلک متاعاً۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے وہ خرچہ مقرر فرما دیا ہے۔ کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہو یا مصدر کے سبب جو کہ الوصیۃ ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۙ يَّتِيْمًا (البلد) یہاں متاع سے مراد اس کے سال کا نفقہ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: غَيْرَ اِخْرَاجٍ اس کا معنی ہے کہ میت کے اولیاء کے لئے اور گھر کے ورثاء کے لئے عورت کو باہر نکالنا جائز نہیں ہے اور غَيْرَ اخفش کے نزدیک مصدر کی بنا پر منصوب ہے، گویا کہ یہ فرمایا لا اخراجا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ منصوب ہے کیونکہ یہ متاعا کی صفت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ الموصین (وصیت کرنے والے) سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی متعوھنّ غیر مُخرَجاتٍ (تم انہیں نفقہ دو اس حال میں انہیں نکالا نہ جائے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 325، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً

حرف جر کے حذف ہونے کے سبب منصوب ہے۔ اصل عبارت ہے: من غیر اخراج۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ خَرَجْنَ الآیہ اس کا معنی ہے اگر وہ اپنے اختیار اور مرضی سے سال سے پہلے نکل جائیں۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ تو کسی ولی پر یا حاکم پر کسی اور پر کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس پر پورا سال اپنے خاوند کے گھر میں ٹھہرنا واجب نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نفقہ منقطع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے یا ازواج کی خواہش کے لئے ان پر بناؤ سنگھار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اے ورثاء! ان کے بارے تمہاری نگہبانی کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے پھر ان پر لازم ہے کہ وہ ایک سال عدت گزرنے سے پہلے پہلے شادی نہ کریں یا عدت گزرنے کے بعد ان کی شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: مِنْ مَّعْرُوْفٍ۔ مراد وہ طریقہ ہے جو شریعت سے موافقت رکھتا ہو۔ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ یہ صفت ہے جو اس کے بارے میں وعید کا تقاضا کرتی ہے جس نے اس آیت میں بیان کردہ حد کی مخالفت کی اور عورت کو نکال دیا حالانکہ وہ نکلنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ حَكِیْمٌ یعنی اپنے بندوں کے امور میں سے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے اسے خوب پختہ کرنے والا ہے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

''اور (اسی طرح) جن کو طلاق دی گئی ان کو خرچ دینا چاہئے مناسب طور پر یہ واجب ہے پرہیز گاروں پر۔ اسی طرح کھول کر بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام تاکہ تم سمجھ جاؤ''

اس آیت میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ ابو ثور رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ محکم آیت ہے اور متعہ ہر مطلقہ عورت کے لئے لازم ہے اسی طرح زہری نے کہا ہے (زہری نے کہا) یہاں تک کہ ایسی لونڈی کے لئے بھی جسے اس کا خاوند طلاق دے دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے(1) اور اس آیت کی وجہ سے یہی امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔

اور امام مالک نے کہا ہے: ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے چاہے اسے دو طلاقیں ہوں یا ایک طلاق، وہ اس کے پاس جائے یا نہ جائے، اس کے لئے مہر مقرر کرے یا نہ کرے، سوائے اس عورت کے جس کے پاس جانے سے پہلے اسے طلاق ہو جائے اور اس کے لئے مہر مقرر ہو تو اس کے لئے نصف مہر کافی ہوگا اور اگر اس کے لئے مہر مقرر ہو تو اس کے لیے متعہ ہوگا چاہے وہ مہر مثلی سے کم ہو یا زیادہ اور اس متعہ کی کوئی حد نہیں ہے، اسے آپ سے ابن قاسم نے بیان کیا ہے اور ابن قاسم نے المدونہ سے پردے ڈالنے کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے مطابق ہر مطلقہ کے لئے متعہ مقرر کیا ہے، پھر دوسری آیت میں اس کی استثنا کر دی ہے جس کے لئے مہر مقرر کیا گیا اور اس کے ساتھ دخول نہ ہوا تو اسے متعہ سے خارج کر دیا اور ابن زید نے گمان کیا ہے کہ اس آیت نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے کہ ابن قاسم نے لفظ نسخ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 326، دار الکتب العلمیہ

سے لفظ استثنا کی طرف فرار اختیار کیا ہے، اس محل میں استثنا کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ تو صرف نسخ ہے جیسا کہ زید بن اسلم نے کہا ہے اور ابن قاسم نے لازم قرار دیا ہے کہ قولہ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ ہر مطلقہ کو شامل ہے۔ تو پھر نسخ کا قول لازم اور ضروری ہے۔

اور حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت ان ثیبہ عورتوں کے بارے میں ہے جن سے جماع کیا گیا کیونکہ اس آیت کے سوا دوسری میں ان عورتوں کے لئے متعہ کا ذکر گزر چکا ہے جن کے ساتھ دخول نہیں کیا گیا۔ پس یہ قول ایسی عورت کے بارے میں ہے جس کے لئے مس سے پہلے مہر مقرر کر دیا گیا یہ کبھی عموم میں داخل نہیں ہوئی۔ اور یہ اس بنا پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ یہ عورتوں میں سے اس صنف کو خاص کر رہا ہے اور جب کہا گیا ہے کہ یہ عموم اس قسم کو بھی شامل ہے تو پھر یہ نسخ ہوگا تخصیص نہیں۔ (1)

اور امام شافعی نے دوسرے قول میں کہا ہے: بلاشبہ متعہ نہیں ہے مگر اس عورت کے لئے جسے قبل از دخول طلاق دی جائے اور وہاں نہ مس ہوا اور نہ مہر مقرر ہو۔ کیونکہ جو مہر میں سے کسی شے کی مستحق ہو جائے تو وہ اپنے حق میں متعہ کی محتاج نہیں رہتی۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ (الاحزاب: 28) اس پر محمول ہے کہ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک احسان ہے، نہ کہ آپ کے لئے واجب ہے اور قول باری تعالیٰ: فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ (الاحزاب: 49) بھی غیر مفروضہ پر محمول ہے۔

امام شافعی نے کہا ہے: وہ عورت جس کا مہر مقرر کیا جائے اس کے لئے مہر ہوگا جب اسے قبل المسیس طلاق دی جائے، اس کے لئے کوئی متعہ نہ ہوگا، کیونکہ اس نے مجامعت کے بغیر نصف مہر لے لیا ہے۔ اور مدخول بہا کو جب طلاق دی جائے تو اس کے لئے متعہ ہوگا، کیونکہ مہر وطی کے مقابلہ میں واقع ہوتا ہے اور متعہ عقد کے ساتھ انتہائی استعمال کے سبب (لازم ہے) اور امام شافعی نے خلع اور مبارات کرنے والی کے لئے بھی متعہ واجب کیا ہے اور امام مالک کے اصحاب نے کہا ہے: فدیہ دینے والی کے لئے کیسے متعہ ہو سکتا ہے حالانکہ وہ خود دیتی ہے تو وہ متعہ کیسے لے گی اور جدائی اور فراق کو اختیار کرنے والی کے لئے کوئی متعہ نہیں ہے چاہے، وہ خلع لینے والی ہو یا فدیہ دینے والی یا مبارات کرنے والی یا صلح کرنے والی یا لعان کرنے والی یا آزاد ہونے والی فراق اور جدائی کو اختیار کر لے۔ اس کے ساتھ دخول ہو یا نہ ہو، اس کے لئے مہر مقرر ہو یا نہ ہو۔ تفصیلی بیان پہلے گزر چکا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۠ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

"کیا نہیں دیکھا تو نے ان لوگوں کی طرف جو نکلے تھے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے تو فرمایا انہیں اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ پھر زندہ فرمایا انہیں، بے شک اللہ تعالیٰ بڑا مہربان ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔"

اس میں چھ مسائل ہیں:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 327، دار الکتب العلمیہ

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلَمْ تَرَ رویت قلب مراد ہے۔ اس کا معنی ہے اَلَمْ تَعْلَمْ کیا آپ نہیں جانتے اور سیبویہ کے نزدیک اس کا معنی ہے: کیا آپ آگاہ نہیں ان لوگوں کے معاملہ کے بارے۔ (یعنی الم تَنَبَّہ) اور یہ رویت (یعنی اَلَمْ تَرَ) دو مفعولوں کا محتاج نہیں ہے۔

ابو عبدالرحمٰن السلمی نے اَلَمْ تَرْ راء کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور القائے حرکت کے بغیر ہی ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کی اصل ہے: الم ترءَ۔

ان لوگوں کا قصہ یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی ایک قوم ہے۔ ان میں وبا پھیل گئی، یہ ایک گاؤں میں تھے جسے دَاوَرْدَان کہا جاتا ہے (یہ گاؤں واسط کے مشرقی نواح میں واقع ہے اور ان کے درمیان ایک فرسخ کا فاصلہ ہے "معجم یاقوت") پس وہ اس سے بھاگتے ہوئے نکلے اور ایک وادی میں جا اترے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر موت مسلط کر دی (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ چار ہزار تھے۔ طاعون سے بھاگتے ہوئے نکلے اور انہوں نے کہا: ہم ایسی زمین پر آئے ہیں جہاں موت نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو مار دیا۔ پھر ان کے پاس سے ایک نبی علیہ السلام کا گزر ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا۔

اور کہا گیا ہے کہ وہ آٹھ دن تک مرے رہے اور بعض نے کہا: سات دن تک، واللہ اعلم۔

حضرت حسن نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں بطور سزا مدت مقررہ سے پہلے مار دیا، پھر انہیں باقی ماندہ عمروں کے لئے اٹھا دیا۔ اور بعض نے کہا ہے: ان کے انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات میں سے ایک نبی علیہ السلام کے معجزہ کے اظہار کے لئے ان کے ساتھ ایسا کیا۔ کہا گیا ہے کہ ان کا اسم گرامی حضرت شمعون علیہ السلام ہے۔ اور نقاش نے بیان کیا ہے کہ وہ بخار سے بھاگے تھے (2)۔

اور بعض کا خیال ہے کہ وہ جہاد سے فرار ہوئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی حضرت حزقیل علیہ السلام کی زبان سے جہاد کے بارے حکم ارشاد فرمایا، تو وہ جہاد میں قتال ہونے کے سبب موت سے خوفزدہ ہو گئے، پس وہ اس سے بھاگتے ہوئے اپنے گھروں سے نکل گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں موت دے دی تاکہ وہ انہیں متنبہ کر دے کہ کوئی شے انہیں موت سے نجات نہیں دلا سکتی پھر انہیں زندہ کیا اور انہیں اپنے اس ارشاد سے جہاد کے بارے حکم دیا: وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (اور تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرو) حضرت ضحاک نے یہی کہا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ تمام کے تمام قصص ضعیف الاسانید ہیں، البتہ آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنبیہ اور توقیف کی عبارت میں انسانوں کو ایک قوم کے بارے خبر دی ہے کہ وہ موت سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں موت دے دی اور پھر انہیں زندہ کر دیا، تاکہ وہ اور ان کے بعد آنے والے تمام یہ جان لیں کہ موت دینا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ لہٰذا کسی ڈرنے والے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 327، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 328

کے خوف کا اور کسی دھوکہ کھانے والے کے دھوکہ کا کوئی معنی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو اپنے اس امر کا مقدمہ بنایا ہے جو اس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مومنوں کو جہاد کے بارے حکم فرمایا۔ یہ علامہ طبری کا قول ہے اور یہی آیت کے ظاہر الفاظ ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَهُمْ اُلُوْفٌ جمہور نے کہا ہے: یہ الف کی جمع ہے۔ بعض نے کہا ہے: وہ چھ لاکھ تھے۔ بعض نے کہا ہے: وہ اسی ہزار تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: وہ چالیس ہزار تھے۔ ابو مالک نے کہا ہے: وہ تیس ہزار تھے (1)۔ سدی کا قول ہے: وہ سینتیس ہزار تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ستر ہزار تھے۔ حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی چالیس ہزار اور آٹھ ہزار کی روایت ہے، آپ سے اسے ابن جریج نے روایت کیا ہے۔ آپ سے ہی آٹھ ہزار کی روایت بھی ہے اور آپ سے چار ہزار کی روایت بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تین ہزار تھے۔ اور صحیح یہ ہے کہ وہ دس ہزار سے زائد تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ اُلُوْفٌ اور یہ جمع کثرت ہے اور دس اور اس سے کم کے بارے میں اُلُوْفٌ نہیں بولا جاتا۔

ابن زید نے الوف کے لفظ کے بارے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے و ھم موتلفون، یعنی انہیں اپنی قوم کے افتراق نے نہیں نکالا اور نہ ان کے درمیان کوئی فتنہ برپا ہوا، بلکہ وہ تو ایک دوسرے سے محبت اور الفت رکھتے تھے اور الفت اس فرقت کے خلاف ہے۔ پس وہ موت سے فرار اختیار کرتے ہوئے اور اپنے خیال کے مطابق زندگی کی خواہش رکھتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی جگہ موت دے دی جو ان کے گمان کے مطابق ان کے لئے جائے نجات تھی۔ پس اس معنی کی بنا پر الوف آلف کی جمع ہے۔ جیسا کہ جَالِسٌ کی جمع جلوس ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دینے کے لئے ایک خاص مدت تک موت دی اور پھر انہیں زندہ کر دیا اور سزا کے لئے موت دینے کے بعد زندگی ہے اور اپنی مدت مقررہ پر موت آنے کے بعد زندگی نہیں ہے (2)۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب وہ زندہ کیے گئے اور اپنی قوم کی طرف لوٹے تو وہ پہچانے جا سکتے تھے (کہ وہ مردہ تھے) اور موت کی علامات ان کے چہروں پر تھیں اور ان میں سے کوئی جو کپڑا بھی پہنتا تھا تو وہ میلا سا کفن بن جاتا یہاں تک کہ وہ اپنی اس مدت مقررہ پر فوت ہوئے جو ان کے لئے لکھی گئی تھی۔

ابن جریج نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آج تک بنی اسرائیل کی اس نسل میں وہ بو باقی ہے۔ اور روایت ہے کہ وہ عراق کے (شہر) واسط کے پاس تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بدبودار ہو جانے کے بعد زندہ کیے گئے، پس وہ بو آج تک ان کی نسل میں موجود ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: حَذَرَ الْمَوْتِ، ای لحذر الموت یعنی موت کے ڈر کی وجہ سے۔ اور یہ بھی مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور مُوْتُوْا امر تکوین ہے اور کہا جانا بھی بعید نہیں ہے۔ انہیں ندا دی گئی اور انہیں کہا گیا: تم مر جاؤ اور یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 328، دار الکتب العلمیہ

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 228، دار الفکر

بھی بیان کیا گیا ہے کہ دو فرشتوں نے ان کے پاس چیخ لگائی تم مر جاؤ، پس وہ مر گئے۔ پس معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو فرشتوں کے واسطہ سے کہا: مُوْتُوْا کہ تم مر جاؤ(1)۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ ان اقوال میں سے زیادہ صحیح (اور زیادہ بین) اور زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ وہ وبا سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے نکلے۔ اسے سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: وہ طاعون سے فرار اختیار کرتے ہوئے نکلے تو وہ مر گئے، پھر انبیاء علیہم السلام میں سے ایک نبی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ انہیں زندہ فرما دے تاکہ وہ اس کی عبادت کریں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ فرما دیا(2) اور عمرو بن دینار نے اس آیت کے بارے کہا ہے: ان کی بستی میں طاعون پھیل گیا تو کچھ لوگ وہاں سے نکل گئے اور کچھ لوگ باقی رہ گئے اور نکلنے والوں کی تعداد باقی رہنے والوں کی نسبت زیادہ تھی، فرمایا: پس جو نکل گئے وہ محفوظ رہے اور جو وہیں مقیم رہے وہ مر گئے اور جب دوسری بار ایسا ہوا تو سوائے قلیل لوگوں کے وہ تمام کے تمام نکل گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کے جانوروں کو بھی موت دے دی، پھر انہیں زندہ کر دیا اور وہ اپنے شہروں کی طرف لوٹ گئے اور ان کی اولاد بھی پیدا ہوئی۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ طاعون سے ڈرتے ہوئے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کے جانوروں کو ایک ہی ساعت میں مار دیا اور وہ چالیس ہزار تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس پر اس آیت میں کئی احکام مرتب ہوتے ہیں۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور عامر بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کی حدیث سے الفاظ بخاری کے ہیں کہ انہوں نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو سنا وہ حضرت سعد کو حدیث بیان کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وبا کا ذکر کیا اور فرمایا: ''(یہ) رجز یا عذاب ہے جس کے ساتھ بعض امتوں کو عذاب دیا گیا پھر اس سے کچھ بچ جانے والے باقی رہے اور وہ ایک بار ختم ہو جاتا ہے اور دوسری بار پھر آتا ہے۔ پس جو کوئی اس کے بارے کسی زمین میں سنے تو اسے چاہئے کہ وہ وہاں بالکل نہ آئے اور جو اس علاقے میں ہو کہ وہاں وبا پھیل جائے تو وہ اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلے(3)''۔ اسے ابو عیسیٰ ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: ہمیں قتیبہ نے بیان کیا ہے کہ ہمیں حماد بن زید نے عمرو ابن دینار عن عامر بن سعد عن اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سند سے خبر دی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون کا ذکر کیا اور فرمایا: ''یہ باقی رہنے والا رجز یا عذاب ہے جو بنی اسرائیل کی ایک جماعت پر بھیجا گیا۔ پس جب کسی زمین میں واقع ہو اور تم وہاں ہو تو وہاں سے نہ نکلو اور جب کسی زمین میں واقع ہو اور تم وہاں نہ ہو تو تم وہاں نہ جاؤ(4)''۔ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اس حدیث کے مقتضا کے مطابق حضرت عمر اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عمل کیا جب وہ مقام سرغ سے اس وقت واپس لوٹے جب حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث کے بارے خبر دی۔ اسی بناء

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 328، دار الکتب العلمیہ　　2۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 700، دار احیاء التراث العربیۃ

3۔ صحیح بخاری، کتاب الحیل، جلد 2، صفحہ 1032، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 5288، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 126، وزارت تعلیم۔

ایضاً سنن ترمذی، باب ما جاء فی کراہیۃ الفرار من الطاعون، حدیث نمبر 985، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 5288، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پر یہ مؤطا وغیرہ میں مشہور ہے۔

اور ایک قوم نے وباء اور بیماری والی زمین سے فرار کو مکروہ قرار دیا ہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ''وباء سے بھاگنا میدان جہاد سے بھاگنے کی طرح ہے (1) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شام کی طرف نکلنے کا واقعہ معروف ہے اور اس میں ہے کہ آپ واپس لوٹ آئے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس پر دلیل موجود ہے کہ آدمی پر تکلیف اور اذیت ناک چیزوں کے آنے سے پہلے ان سے بچنا اور احتیاط کرنا لازم ہے اور خوف زدہ کرنے والی اشیاء کے ہجوم اور حملہ سے پہلے ان سے اجتناب کرنا ایک طرف ہو جانا لازم ہے اور ان کے آنے کے بعد اس پر صبر کرنا اور جزع فزع نہ کرنا لازم ہے اور یہ اس لئے ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منع فرمایا ہے جو وباء والی زمین میں نہ ہو کہ وہ وباء پھیل جانے کے بعد اس میں داخل ہو اور جو وہاں ہو اسے وباء پھیل جانے کے بعد اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نکلنے سے منع فرمایا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اسی طرح امور کی تکالیف و مصائب سے ہر بچنے والے کے لئے حکم ہو۔ اس میں اس کے لئے طاعون سے بچنے کی راہ بھی ہے اور یہ معنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کی مثل ہے: ''تم دشمن سے ملاقات کی (جنگ کرنے کی) تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی التجاء کرو اور جب تمہارا ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو پھر صبر کرو (2)۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں یہی صحیح ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مقتضا ہے اور اسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیکوکار اور عظیم المرتبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو اس پر بطور حجت فرمایا جبکہ انہوں نے آپ سے کہا: کیا اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے فرار ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اے ابوعبیدہ! کاش! تیرے سوا کوئی اور یہ کہتا: ہاں، ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی طرف ہی بھاگ رہے ہیں۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے اور اس کے خلاف جو مقدر فرما دیا ہے اس سے بچنے کے لئے انسان کے پاس کوئی پناہ گاہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں ڈرانے والی اور ہلاک کرنے والی اشیاء سے بچنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور وسعت و طاقت کے مطابق مکروہات سے بچنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ پھر آپ نے انہیں فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تیرا اونٹ ہو اور تو وادی میں اترے جس کے دو کنارے ہوں ان میں سے ایک سرسبز و شاداب ہو اور دوسرا قحط زدہ ہو، کیا یہ نہیں ہے کہ اگر تو نے سرسبز و شاداب حصہ میں چرایا تو وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ساتھ ہے اور اگر تو نے قحط زدہ حصہ میں چرایا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ساتھ ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی اس جگہ سے مدینہ منورہ کی طرف لوٹ گئے۔

الکیا الطبری نے کہا ہے: ہم کوئی اختلاف نہیں جانتے کہ کفار یا ڈاکو جب ایک کمزور شہر کا قصد کریں اور اس کے باسیوں میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہ ہو تو ان کے لئے جائز ہے کہ وہ ان کے سامنے سے دور ہٹ جائیں، اگرچہ موت کی مقررہ مدت

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 139، قدیمی کتب خانہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 424، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2744، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کوئی زیادتی اور کمی نہیں ہوسکتی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وبا سے فرار اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ وبا کی جگہ میں جو ہو رہا ہے، شاید اس سے کچھ حصہ لے لیا جائے تا کہ اس مرض عام کے سبب میں اس جگہ والے شریک ہو جائیں اور وہاں سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہ رہے، بلکہ وہ اسے سفر کی ان مشقتوں کی طرف منسوب کرے گا جو اسے وبا کی مبادیات میں سے پہنچیں۔ پس درد کئی گنا بڑھ جائے گا اور ضرر زیادہ ہو جائے گا اور وہ ہر راستے میں ہلاک ہو جائیں گے اور وہ ہر کشادہ اور تنگ جگہ میں گر جائیں گے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے جو کوئی وبا سے نہیں بھاگا وہ محفوظ رہا۔ اسے ابن المدائنی نے بیان کیا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی نصیحت کافی ہے کہ فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا، شاید اگر وہ فرار ہو اور بچ جائے تو وہ کہنے لگے: بلا شبہ میں نے اپنے نکلنے کے سبب وبا سے نجات پالی ہے تو اس طرح اس کا اعتقاد خراب اور فاسد ہو جائے گا۔ بالجملہ اس سے فرار ممنوع ہے اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس میں شہروں کو خالی کرنا لازم آتا ہے اور کمزور لوگ اس سے بھی بری نہیں ہوتے کیونکہ ان پر شہروں سے نکلنا مشکل ہوتا ہے اور ان کے لئے ایسا کرنا آسان نہیں ہوتا اور وہ ان سہولتوں سے شہروں کے خالی ہونے کے سبب اذیت اٹھاتے ہیں جو شہروں کا حصہ ہوتی ہیں اور کمزور لوگوں کے لئے معاون اور مددگار رہتی ہیں۔

اور جب کسی زمین میں وبا ہو تو وہاں احتیاط، خوف اور ضرر کے مقامات سے پرہیز کرنے کے ارادہ سے کوئی نہ آئے اور ایسے وہموں کو دور کرنے کے لئے جو انسان کے دل میں تشویش پیدا کر دیتے ہیں اور وہاں داخل ہونے میں ہلاکت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں جائز نہیں ہوتا، کیونکہ مکروہ سے اپنے آپ کو بچانا واجب ہے اور اس پر سوء اعتقاد کا خوف کیا جا سکتا ہے کہ وہ یہ کہنے لگے: اگر میں اس جگہ میں داخل نہ ہوتا تو مجھے یہ تکلیف نہ آتی۔ پس طاعون زدہ علاقے میں داخل ہونے سے منع کرنے یا وہاں سے نکلنے سے منع کرنے میں یہی فائدہ ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: طاعون مقیم پر اور بھاگنے والے پر ایک آزمائش ہے۔ کیونکہ بھاگنے والا کہتا ہے: میں نے اپنے فرار کے سبب نجات پالی ہے اور مقیم کہتا ہے: میں یہاں مقیم رہا سو میں مر گیا۔ اسی قسم کی طرف امام مالک نے اس وقت اشارہ کیا جس وقت ان سے کوڑھ زدہ کی طرف دیکھنے کی کراہت کے بارے پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: میں نے اس میں کوئی کراہت نہیں سنی ہے اور جو روایات اس سے نہی کے بارے وارد ہوئی ہیں وہ صرف اس خوف سے ہیں کہ وہ اسے گھبراہٹ اور اضطراب میں مبتلا کر دے گا یا اسے وہ شے (وہم) خوفزدہ کرتی رہے گی جو اس کے دل میں واقع ہو جائے گی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وبا کے بارے میں فرمایا ہے: ''جب تم کسی زمین میں اس کے بارے سنو تو تم اس کی طرف نہ آؤ اور جب وبا پھیل جائے اور تم وہاں ہو تو پھر اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلو'' اور اس شہر کے بارے میں بھی پوچھا گیا جس میں موتیں اور بیماریاں واقع ہو رہی ہوں کیا اس سے نکلنا بھی مکروہ ہے؟ تو فرمایا: میں کوئی حرج نہیں دیکھتا وہ نکلے یا وہیں مقیم رہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی: ''جب کسی زمین میں وبا واقع ہو جائے اور تم وہاں ہو تو اس

سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلو (1)'' اس میں اس پر دلیل ہے کہ فرار کے ارادہ کے بغیر طاعون والے شہر سے نکلنا جائز ہے، بشرطیکہ اعتقاد یہ ہو کہ جو کچھ اسے پہنچنا ہے وہ اس سے خطا نہیں ہو سکتا اور اسی طرح حکم وہاں داخل ہونے کا بھی ہے جبکہ اسے یہ یقین ہو کہ اس کا داخل ہونا اس کی طرف ایسی تقدیر کو نہیں کھینچ سکتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقدر نہیں بنائی۔ پس آدمی کے لئے وہاں داخل ہونا اور وہاں سے نکلنا اس حد کی بنا پر مباح ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5۔ طاعون پر صبر کی فضیلت اور اس کے بیان کے بارے میں یہ ہے کہ الطاعون بروزن فاعول الطعن سے ماخوذ ہے مگر یہ کہ جب اسے اصل معنی سے پھیر دیا گیا تو اسے وبا کے سبب عام موت پر دلالت کرنے کے لئے وضع کر دیا گیا۔ جوہری نے یہی کہا ہے اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے روایت کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کی فنا طعن اور طاعون سے ہے۔ (2)'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: طعن کو تو ہم نے پہچان لیا ہے پس طاعون کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ پھوڑ (گلٹی) ہے اونٹ کے پھوڑے (طاعون) کی طرح جو کہ پیٹ سے نیچے والی جگہوں اور بغلوں کے نیچے نکلتا ہے (3)۔

علماء نے کہا ہے: اس وبا کو اللہ تعالیٰ بطور عذاب اور سزا کے اپنے بندوں میں سے گنہگاروں اور کافروں میں سے جن پر چاہتا ہے بھیج دیتا ہے اور کبھی اسے صالحین کے لئے شہادت اور رحمت بنا کر بھیج دیتا ہے، جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے طاعون عمواس میں کہا: بے شک یہ تمہارے لئے شہادت اور رحمت ہے اور تمہارے نبی علیہ السلام کی دعا ہے: اے اللہ! معاذ اور اس کے گھر والوں کو اپنی رحمت سے ان کا حصہ عطا فرما۔ اور ان کی ہتھیلی میں نیزہ مارا گیا۔

حضرت ابو قلابہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: تحقیق میں نے شہادت اور رحمت کو تو پہچان لیا اور میں اسے نہ پہچان سکا کہ یہ تمہارے نبی کی دعا ہے؟ چنانچہ میں نے اس کے بارے پوچھا تو کہا گیا: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعا فرمائی کہ آپ کی امت کی فنا طعن اور طاعون سے ہو، جس وقت آپ نے یہ دعا مانگی کہ آپ کی امت کا آپس میں لڑائی جھگڑا نہ ہو تو اس سے آپ کو روک دیا گیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ دعا مانگی۔

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث سے روایت کیا جاتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''طاعون سے بھاگنے والا میدان جہاد کے لشکر سے بھاگنے والے کی طرح ہے اور اس میں صبر کرنے والا میدان جہاد میں صبر کرنے والے کی طرح ہے (4)۔'' اور بخاری میں حضرت یحییٰ بن یعمر سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اسے خبر دی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے طاعون کے بارے پوچھا، تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں بتایا کہ یہ ایک عذاب ہے جسے اللہ تعالیٰ جن پر چاہتا ہے بھیج دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے مومنین کے لئے رحمت بنایا ہے، پس کوئی بندہ نہیں ہے جو طاعون میں مبتلا ہو جاتا ہے اور صبر کرتے ہوئے اسی شہر میں ٹھہرا رہتا ہے اور وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ اسے ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی مگر وہی جو اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 494، وزارت تعلیم
2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 6، صفحہ 255، دار صادر بیروت
3۔ ایضاً
4۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 139، قدیمی کتب خانہ

تعالیٰ نے اس کے لئے لکھ دی ہے مگر اس کے لئے شہید کے اجر کی مثل اجر ہے (1)۔'' اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کی یہی تفسیر ہے کہ ''طاعون شہادت ہے اور مطعون شہید ہے (2)۔'' یعنی اس پر صبر کرنے والا کہ اس کے اجر کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے اور یہ جاننے والا کہ اسے ہرگز کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے لکھ دی ہے، اسی لئے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے تمنا کی کہ اس میں فوت ہو جائیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو مر گیا وہ شہید ہے اور جو کوئی طاعون سے خوفزدہ ہو گیا اور اسے مکروہ جانا اور اس سے بھاگ گیا تو وہ اس حدیث کے معنی میں داخل نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ ابو عمر نے کہا ہے: مجھ تک کوئی خبر نہیں پہنچی کہ اہل علم میں سے کوئی طاعون سے بھاگا ہو سوائے اس کے جو ابن مدائنی نے ذکر کی ہے کہ علی بن زید بن جدعان طاعون کی وجہ سے السیالہ (یہ مدینہ منورہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے اہل مدینہ کا مکہ کی طرف آتے ہوئے یہ پہلا مرحلہ ہے اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ملل اور روحاء کے درمیان واقع ہے)۔ (شرح القاموس) کی طرف چلے گئے اور وہ ہر جمعہ کی نماز میں شریک ہونے کے لئے لوٹ آتے تھے اور جب وہ جمعہ میں شریک ہوتے تو لوگ ان کے بارے پکارتے تھے: فرّ من الطاعون یہ طاعون سے بھاگ گئے ہیں۔ اور وہ السیالہ میں ہی فوت ہوئے۔ ابن مدائنی نے مزید کہا: عمرو بن عبید اور رباط بن محمد رباطیہ کی طرف بھاگ گئے اور ابراہیم بن علی الفقیمی نے اس بارے میں کہا ہے:

و لما استفزّ الموتُ كلَّ مكذِّب　　صبرتُ و لم يصبر رباطٌ ولا عمرو

جب موت نے ہر جھٹلانے والے کو ہلاک و برباد کر دیا (تو) میں نے صبر کیا اور رباط اور عمرو نے صبر نہ کیا۔

اور ابو حاتم نے اصمعی سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: بصرہ کے بعض لوگ طاعون سے بھاگے اور ان میں سے کوئی اپنے گدھے پر سوار ہوا اور سفوان (یہ بصرہ میں باب المربد سے ایک مرحلہ کے فاصلہ پر پانی ہے) معجم یاقوت کی طرف اپنے گھر والوں کے پاس چلا گیا اور اس نے حدی گانے والے کو سنا کہ وہ اس کے پیچھے حدی گا رہا ہے:

لن يُسبقَ الله على حمار　　ولا على ذى مَنْعة طيّارِ

اويأتى الحتفُ على مقدارِ　　قد يُصبح الله أمام السارى

اور مدائنی نے ذکر کیا ہے: عبد العزیز بن مروان کی حکومت کے دوران مصر میں طاعون پڑا، تو وہ اس سے بھاگتے ہوئے نکل گیا اور الصعید کے دیہاتی علاقوں میں سے ایک دیہات میں جا اترا۔ اسے سُکَّر یہ الصعید کے مشرق کے علاقہ میں واقع ہے۔ اس کے اور مصر کے درمیان دو دن کا فاصلہ ہے (یاقوت) کہا جاتا ہے۔ تو عبد العزیز نے اس سے پوچھا: تیرا کیا نام ہے؟ تو اس نے کہا: طالب بن مدرک۔ تو اس نے کہا: اوہ میں اپنے آپ کو فسطاط کی طرف لوٹنے والا نہیں دیکھ رہا پھر وہ اسی گاؤں میں مر گیا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، جلد 2، صفحہ 853، وزارت تعلیم

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، جلد 2، صفحہ 853، و۔ت۔ ایضاً صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 92-5291، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

''اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑائی کرنے کا خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو ہے۔ یہ جمہور کا قول ہے اور اس سے ارادہ اور نیت یہ کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہے (1)۔ اور اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور یہ ہر راستے کو عام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ (آپ فرما دیجئے: یہ میری راہ ہے)

امام مالک نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور کوئی راستہ نہیں ہے مگر اس پر یا اس میں یا اس کے لئے قتال کیا جاتا ہے اور ان میں سب سے عظیم دین اسلام ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب ان لوگوں کے لئے ہے جو بنی اسرائیل میں سے زندہ کیے گئے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور وَ قَاتِلُوْا میں واؤ سابقہ امر پر عطف کرنے کے لئے ہے اور کلام میں اس کی تقدیر کو چھوڑ دیا گیا ہے: وقال لهم، قاتلوا اور پہلے قول کی بنا پر یہ سارا کلام سابقہ جملہ پر معطوف ہے۔ اور کلام میں مضمر ماننے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

نحاس نے کہا ہے: وَ قَاتِلُوْا یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کو حکم ہے کہ تم نہ بھاگو جیسا کہ وہ بھاگ گئے۔ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ یعنی وہ تمہارے قول کو بھی سن لے گا اگر تم نے اس کی مثل کہا جیسا کہ انہوں نے کہا اور اس سے تمہاری مراد کو بھی جان لے گا۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: اس قول کی کوئی دلیل اور وجہ نہیں ہے جس نے یہ کہا کہ لڑائی کرنے کا حکم ان لوگوں کو ہے جنہیں زندہ کیا گیا۔ واللہ اعلم

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

''کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن، تو بڑھا دے اللہ اس قرض کو اس کے لئے کئی گنا اور اللہ تعالیٰ تنگ کرتا ہے (رزق کو) اور فراخ کرتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حق کی راہ پر جہاد اور قتال کرنے کا حکم ارشاد فرمایا کیونکہ شریعت میں سے کوئی شے (حکم) نہیں ہے مگر اس کی حفاظت اور اس کے دفاع میں قتال جائز ہوتا ہے اور ان میں عظیم تر دین اسلام ہے جیسا کہ امام مالک نے کہا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس میں (اپنا مال) خرچ کرنے پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 329، دار الکتب العلمیہ

برانگیختہ کیا۔ پس اس خبر میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ کرنے والا بھی داخل ہے (اور لشکر کی تیاری میں سامان خرچ کرنے والا بھی) کیونکہ وہ بھی ثواب کی امید پر یہ مال دیتا ہے جیسا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جیش عسرہ (غزوۂ تبوک) میں کیا(1)۔

اور مَنْ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور ذَا اس کی خبر ہے۔ اور الَّذِیْ اس کی صفت ہے اور اگر چاہے تو بدل بنالے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابو الدحداح رضی اللہ عنہ نے اپنے رب سے ثواب چاہتے ہوئے اپنا مال صدقہ کرنے میں بہت تیزی اور جلدی کی۔ ہمیں شیخ الفقہ، امام، محدث، قاضی ابو عامر یحییٰ بن عامر بن احمد بن منیع الاشعری نسباً و مذہباً قرطبۂ میں۔ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ لوٹائے۔ ربیع الثانی ۲۲۸ھ میں میری طرف سے ان پر قراءت کے دوران انہوں نے خبر دی اور کہا: ہمیں ابو اجازہ نے خبر دی، فرمایا: میں نے ابو عبداللہ بن سعدون سے سماع کرتے ہوئے ابو بکر عبدالعزیز بن خلف بن مدین الازدی پر پڑھا، اس نے کہا: ہمیں ابو الحسن علی بن مہران نے بیان کیا اور کہا: ہمیں ابو الحسن محمد بن عبداللہ ابن زکریا بن حیوہ النیشا پوری (متوفی ۳۶۶ھ) نے بیان کیا اور کہا ہمیں میرے چچا ابو زکریا یحییٰ ابن زکریا نے خبر دی اور کہا: ہمیں محمد بن معاویہ بن صالح نے بتایا کہ ہمیں خلف بن خلیفہ نے حمید الاعرج عن عبداللہ بن الحارث عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے حدیث بیان کی ہے۔ انہوں نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی: **مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا** تو حضرت ابو الدحداح رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض کا ارادہ فرما رہا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں اے ابو الدحداح۔ تو انہوں نے عرض کی: اپنا دست مبارک مجھے دکھائیں اور پھر آپ نے اسے دراز کیا۔ تو انہوں نے عرض کی: بلاشبہ میں نے اللہ تعالیٰ کو وہ باغ بطور قرض دے دیا جس میں چھ سو کھجور کے درخت ہیں پھر چلتے ہوئے آئے یہاں تک کہ اس باغ کے پاس آگئے اور ام دحداح اپنے بچوں سمیت اس میں تھی، تو آپ نے اسے آواز دی: اے ام دحداح! اس نے کہا: لبیک (میں حاضر ہوں) آپ نے فرمایا: تو باہر نکل آ، میں نے اپنا وہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے(2) جس میں چھ سو درخت ہیں۔

اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی: **مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا** تو حضرت ابو الدحداح نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں، یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ ہم سے قرض طلب فرما رہا ہے۔ حالانکہ وہ تو قرض سے غنی اور بے نیاز ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں وہ تمہیں اس کے عوض جنت میں داخل فرمانے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' تو انہوں نے عرض کی: بلاشبہ اگر میں اپنے رب کو قرض پیش کردوں تو وہ اس کے عوض میرا ضامن ہو جائے گا اور میری بچی الدحداحہ کو بھی میرے ساتھ جنت میں پہنچا دے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' تو انہوں نے عرض کی پھر اپنا ہاتھ مجھے دیجئے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ انہیں دیا، تو انہوں نے کہا: بلاشبہ میرے دو باغ ہیں ان میں سے ایک سافلہ (نچلی زمین) میں ہے اور دوسرا عالیہ (بلند زمین) میں۔ قسم بخدا! میں ان کے سوا کسی شے کا مالک نہیں

1۔ سنن ترمذی، باب فی مناقب عثمان بن عفان، حدیث نمبر 3633، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ شعب الایمان، جلد 3، صفحہ 250، دار الکتب العلمیہ

ہوں، تحقیق میں نے وہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دے دیے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تو ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کے لئے دے دے اور دوسرے کو اپنے اور اپنے بال بچوں کی گزر اوقات کے لئے رکھ لے۔'' انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں: میں نے ان میں سے زیادہ اچھا اور بہتر اللہ تعالیٰ کے لئے دے دیا اور وہ وہ باغ ہے جس میں چھ سو درخت ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تب اللہ تعالیٰ اس کے عوض تجھے جنت کی جزا عطا فرمائے گا۔'' پھر ابوالدحداح رضی اللہ عنہ چل پڑے یہاں تک کہ ام الدحداح کے پاس آ پہنچے اور وہ اپنے بچوں کے ساتھ باغ میں درختوں کے نیچے گھوم پھر رہی تھی تو آپ کہنے لگے:

هداكِ ربي سُبُلَ الرشاد　　الى سبيل الخير و السداد
بِيني من الحائط بالوداد　　فقد مضى قرضا الى التناد
اقرضته الله على اعتمادی　　بالطَّوع لا مَنٍّ ولا ارتداد
الاّ رَجاء الضِعف فی المعاد　　فارتحلی بالنفس والاولاد
والبِرّ لا شكّ فخيرُ زاد　　قدّمَه المرءُ الى المعاد

تو ام الدحداح نے کہا: تو نے نفع بخش سودا کیا ہے، اللہ تعالیٰ تجھے اس میں برکت عطا فرمائے جو تو نے خریدا ہے، پھر ام الدحداح نے آپ کو جواب دیا اس طرح کہا:

بشّرك الله بخير و فَرَحْ　　مثلُك أدّى مالديه ونَصَحْ
قد مَتَّعَ الله عيالی و مَنَحْ　　بالعَجْوَة السَّوْداء والزَّهْوِ البَلَحْ
والعبدُ يسعىٰ وله ما قد كَدَحْ　　طول الليالی و عليه ما اجْتَرَحْ

پھر ام الدحداح اپنے بچوں کے پاس آئی، جو کچھ ان کے مونہوں میں تھا اسے نکالنے لگی اور جو ان کے پاس خوشوں میں تھا اسے بھی جھاڑ دیا یہاں تک کہ وہ دوسرے باغ میں منتقل ہو گئی اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کتنے ہی پھلوں سے لدے ہوئے بھاری بھرکم درخت اور وسیع گھر ابوالدحداح کے لئے ہیں''۔ (1)

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عربی نے کہا ہے: مخلوق خالق کے حکم، اس کی حکمت، اس کی قدرت، اس کی مشیت اور اس کی قضا وقدر کے مطابق تقسیم ہو گئی جب انہوں نے یہ آیت سنی پس وہ تین حصوں میں بٹ گئے۔

پہلا گروہ انتہائی کمینہ اور رذیل ہے۔ انہوں نے کہا: بے شک محمد (مصطفیٰ ﷺ) کا رب فقیر اور ہمارا محتاج ہے اور ہم غنی ہیں، پس یہ ایسی جہالت ہے جو کسی بھی صاحب عقل پر مخفی نہیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول سے ان کا رد کیا: لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ۔ (آل عمران: 181)

اور دوسرا گروہ وہ ہے کہ جب اس نے یہ قول سنا تو اس نے بخل اور کنجوسی کو ترجیح دی اور مال میں رغبت کو مقدم سمجھا اور انہوں

1۔ شعب الایمان، جلد 3، صفحہ 249، حدیث نمبر 3451، دار الکتب العلمیہ

نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ خرچ نہ کیا، نہ انہوں نے کسی قیدی کو چھڑایا اور نہ کسی کی معاونت کی۔ اطاعت و پیروی سے سستی اور کوتاہی کرتے ہوئے اور اس دنیا کی طرف میلان رکھتے ہوئے۔

اور تیسرا گروہ وہ ہے جس نے یہ قول سنا تو اس کی پیروی اور تعمیل میں جلدی کی اور ان میں سے ایک قبول کرنے والے نے تو اپنے مال کی طرف تیزی سے بڑھنے کو ترجیح دی جیسا کہ حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: قَرْضًا حَسَنًا، القرض کا معنی ہے: اسم لکل مایلتمس علیہ الجزاء یعنی قرض ہر اس شے کا نام ہے جس پر وہ جزا کا طالب ہوتا ہے۔ اقرض فلان فلانا یعنی فلاں نے فلاں کو وہ عطا کیا جس کے بدل کا وہ اس سے تقاضا کرسکتا ہے۔ لبید نے کہا:

و اذا جُوزِيتَ قَرْضًا فَاجْزِهِ　　انما يَجْزِي الْفَتَى ليس الجَمَلُ

جب تجھے بطور قرض جزا دی جائے تو تو اس کی جزا دے بلاشبہ جوان ہی جزا اور بدلہ دیتا ہے نہ کہ اونٹ۔

اور القِرض یعنی قاف کے کسرہ کے ساتھ یہ بھی ایک لغت ہے جسے کسائی نے بیان کیا ہے اور استقرضت من فلان کا معنی ہے میں نے اس سے قرض طلب کیا پس اس نے مجھے قرض دے دیا۔ اور اقترضت منہ کا معنی ہے میں نے قرض لیا۔ اور زجاج نے کہا ہے: لغت میں قرض کا معنی ہے البلاء الحسن و البلاء السئ یعنی اچھی آزمائش اور بری آزمائش۔ امیہ نے کہا ہے:

كل امْرِئٍ سوفَ يُجْزَى قَرْضَه حسنا　　او سيئًا و مَدِينًا مثلَ مَادَانَا

ہر آدمی کو اس کے قرض کا بدلہ دیا جائے گا چاہے وہ حسن ہو یا سیئہ ہو اور جس کو قرض دیا گیا ہے وہ قرض دینے والے کی مثل ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

تُجَازَى الْقُرُوضُ بِأَمْثَالِهَا　　فَبِالْخَيْرِ خيرًا و بِالشَّرِّ شَرًّا

قرضوں کا بدلہ ان کی مثلوں کے ساتھ ہی دیا جائے گا پس اچھائی کا بدلہ اچھائی کے ساتھ اور شر کا بدلہ شر کے ساتھ ہوگا۔

اور کسائی نے کہا ہے: قرض سے مراد وہ اچھے یا برے اعمال ہیں جو گزر گئے اور کلمے کا اصل معنی قطع کرنا اور کاٹنا ہے اور اسی سے المقراض قینچی ہے اور اقرضته سے مراد یہی ہے کہ میں نے اس کے لئے اپنے مال سے ایک حصہ الگ کر دیا ہے جس پر بدلہ دیا جائے گا۔ اور انقرض القوم: اس کا معنی ہے ان کا اثر ختم ہو گیا اور وہ ہلاک ہو گئے۔ اور یہاں پر القرض اسم ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر یہاں اقراضاً ہوتا۔

اس آیت میں قرض کی استدعا کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگوں کی تقریب الی الفہم اور انہیں ایسے انداز سے مانوس کرنے کے لئے ہے جسے وہ سمجھ سکتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ تو الغنی الحمید ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بندۂ مومن کی وہ عطا جس کے عوض وہ آخرت میں ثواب کی امید رکھتا ہے اسے قرض کے ساتھ تشبیہ دی ہے جیسا کہ اس نے جنت کے حصول میں جان اور مال دینے کو بیع اور شرا سے تشبیہ دی ہے۔ اس کا بیان سورۂ براءت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت سے مراد صدقہ پر اور فقراء اور محتاج لوگوں پر مال خرچ کرنے اور ان پر وسعت و خوشحالی

لانے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں دین کی مدد و نصرت کرنے پر ابھارنا اور برانگیختہ کرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کنایۃً فقیر کو اپنی ذات کے ساتھ ذکر کیا ہے صدقہ کی ترغیب دیتے ہوئے۔ اس کی علت یہ ہے کہ اس کی ذات حاجات سے منزہ اور پاک ہے جیسا کہ اس نے مریض، بھوکے اور پیاسے کو کنایۃً اپنی ذات سے تعبیر کیا ہے حالانکہ اس کی ذات نقائص و آلام سے پاک ہے۔

اور صحیح حدیث میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا اور تو نے میری عیادت نہ کی اور میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا اور تو نے مجھے کھانا نہ کھلایا اور میں نے تجھ سے پانی طلب کیا اور تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔'' تو یہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں تجھے کیسے پلا سکتا تھا حالانکہ تو رب العالمین ہے؟ تو رب العالمین فرمائے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا اور تو نے اسے نہ پلایا۔ بلاشبہ اگر تو اسے پلا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا (1)۔'' اور اسی طرح ان چیزوں میں بھی ہے جو اس سے پہلے ہیں۔ اسے مسلم اور بخاری نے روایت کیا ہے اور یہ سب کی سب اس کے لئے محل شرف میں واقع ہیں جس کے بارے اسے ترغیب دینے کے لئے کنایۃً ذکر کیا جس کو اس کے ساتھ خطاب کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 4۔ قرض لینے والے پر قرض کو واپس لوٹانا واجب ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں کچھ خرچ کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضائع نہ ہوگا بلکہ وہ بالیقین ثواب لوٹائے گا اور اس نے جزا کو مبہم رکھا ہے اور حدیث شریف میں ہے: ''اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا گیا (مال) سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ تک بڑھا دیا جاتا ہے (2)۔'' جیسا کہ اس کا بیان اس سورۃ میں اس ارشاد کے تحت آئے گا۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ الآیہ (بقرہ: 261)۔ اور یہاں فرمایا: فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (بقرہ: 245) اور اس کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ کوئی حد۔

مسئلہ نمبر 5۔ قرض کا ثواب بہت زیادہ ہے، کیونکہ اس میں ایک مسلمان کے لئے وسعت اور کشادگی لانا ہے۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے شب معراج جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا: صدقے کا اجر اس کی دس مثل ہے اور قرض کا اجر اٹھارہ مثل۔ تو میں نے حضرت جبریل امین علیہ السلام کو کہا: قرض میں کیا ہے کہ وہ صدقہ سے افضل ہے؟ تو انہوں نے کہا: کیونکہ سائل سوال کرتا ہے اور اس کے پاس (کچھ مال موجود ہوتا ہے) اور قرض لینے والا بغیر حاجت کے قرض کا مطالبہ نہیں کرتا (3)۔''

محمد بن خلف عسقلانی، یعلی، سلیمان بن یسیر نے قیس بن رومی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ سلیمان بن اذنان نے علقمہ کو ایک ہزار درہم ان کی عطا (وظیفہ) تک قرض دیئے پھر جب ان کی عطا کا وقت نکل گیا تو انہوں نے ان سے اس کا تقاضا

1۔ صحیح مسلم، کتاب السیر و الصلۃ و الادب، جلد 2، صفحہ 318، وزارت تعلیم

2۔ جامع ترمذی، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 196، و۔ ت۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل النفقۃ فی الخ، حدیث 1550، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ سنن ابن ماجہ، باب القرض، حدیث نمبر 2421، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا اور اس پر شدت اور سختی کا اظہار کیا، تو انہوں نے وہ پورا کر دیا۔ گویا علقمہ ناراض ہو گئے اور کئی مہینے ٹھہرے رہے (اور ان سے نہ ملے) پھر ان کے پاس آئے اور کہا: مجھے ایک ہزار درہم میری عطا تک قرض دیجئے۔ انہوں نے کہا: ہاں بڑی عزت و کرامت سے! اے ام عتبہ وہ تھیلا لاؤ جس پر مہر لگی ہوئی ہے اور وہ تمہارے پاس ہے۔ راوی کا بیان ہے: چنانچہ وہ لے کر آئی تو انہوں نے کہا: قسم بخدا! یہ تمہارے وہی دراہم ہیں جو تم نے مجھے دیے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک درہم بھی نہیں ہلایا۔ تو آپ نے کہا: تیرے باپ کی قسم! جو تو نے میرے ساتھ سلوک کیا کس نے تجھے اس پر ابھارا؟ تو انہوں نے کہا: میں نے تم سے سنا ہے کہ تم حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہو کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو دو بار قرض دیتا ہے تو وہ اس کے ایک بار صدقہ دینے کی طرح ہے (1)۔'' فرمایا: مجھے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح خبر دی ہے۔

(ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اس طرح مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان بھی کسی مسلمان کو ایک دفعہ قرض دیتا ہے وہ اس کے دو دفعہ صدقہ کے برابر ہو جاتا ہے۔'' اسے ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے مرفوع اور موقوف روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ آدمی کا قرض ایک کا بدلہ ایک ہوتا ہے، یعنی وہ اس پر اتنا ہی لوٹائے گا جتنا اس نے اسے قرض دیا ہے اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ دنانیر، دراہم، گندم، جو، کھجور، کشمش اور ہر وہ شے طعام میں سے جس کی مثل موجود ہے اسے قرض کے طور پر لینا جائز ہے اور مسلمانوں نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے اس پر اجماع کیا ہے کہ قرض میں زیادتی کی شرط لگانا ربا ہے۔ اگرچہ وہ چارے کی ایک مٹھی ہو۔ جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے یا ایک دانہ ہو اور جو چیز قرض کے طور پر لی ہے اس سے افضل واپس لوٹانا جائز ہے، بشرطیکہ اس کی شرط نہ لگائی جائے، کیونکہ یہ احسان کے باب سے ہے۔ البکر کے بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے: ''بے شک تم میں سے اچھا وہ ہے جو قضا کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہے (2)۔'' اسے ائمہ نے روایت کیا ہے، یعنی بخاری اور مسلم وغیرہمانے۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف کی ہے جس نے ادائیگی اچھے طریقہ سے کی اور اسے مطلق قرار دیا اور اسے کسی صفت سے مقید نہ کیا اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے البکر کے بارے میں فیصلہ فرمایا اور اس سے مراد عمدہ اور پسندیدہ جوان اونٹ ہے اور عمدہ اونٹ وہ ہوتا ہے جو رباعی ہو۔ اس میں خیار سے مراد مختار ہے اور رباعی سے مراد وہ ہے جو چوتھے سال میں داخل ہو، کیونکہ وہ اس میں اپنے رباعیہ دانت گرا دیتا ہے اور یہ وہ دانت ہیں جو ثنایا سے ملے ہوتے ہیں اور یہ چاروں رباعیات کہلاتے ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اور یہ جائز نہیں ہے کہ جس نے قرض لیا ہے وہ قرض دینے والے کو کچھ ہدیہ وغیرہ دے اور نہ ہی قرض دینے والے کو اسے قبول کرنا حلال ہے مگر یہ کہ پہلے بھی دونوں کی عادت ہو (کہ وہ ہدیہ اور تحفہ وغیرہ دیتے رہتے ہوں) سنت اسی طرح ہے۔ ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ ہشام بن عمار، اسماعیل بن عیاش، عتبہ بن حمید الضبی نے یحییٰ بن ابی اسحاق الہنائی

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم　　2۔ ایضاً، صفحہ 176

سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جو اپنے بھائی کو مال قرض کے طور پر دیتا ہے اور وہ اسے کچھ ہدیہ دیتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی ایک اپنے بھائی کو قرض دے اور وہ اسے ہدیہ دے یا اسے اپنی سواری پر سوار کرے تو وہ اسے نہ قبول کرے اور نہ اس کی سواری پر سوار ہو مگر یہ کہ ان دونوں کے درمیان اس سے پہلے بھی یہ عادت جاریہ ہو(1)۔''

مسئلہ نمبر 8۔ قرض مال میں سے ہوتا ہے۔ تحقیق ہم اس کا حکم بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ عزت و آبرو سے بھی ہوتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث مروی ہے: ''کیا ہم میں سے کوئی ابو ضمضم کی طرح ہونے سے عاجز ہوگا کہ جب وہ اپنے گھر سے نکلتا تو کہتا: اے اللہ! میں نے اپنی عزت تیرے بندوں پر صدقہ کر دی (2)۔''

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ''تو اپنی عزت اپنے فقر و افلاس کے دن کے لئے قرض دے دے۔'' مراد یہ ہے کہ جو کوئی تجھے گالی گلوچ دے تو تو اس سے حق نہ لے اور نہ تو اس پر حد قائم کر یہاں تک کہ قیامت کا دن آجائے جو وافر اجر دینے والا ہے۔

اور امام ابوحنیفہ نے فرمایا ہے: عزت کو صدقہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اور امام مالک سے مروی ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ فاسد ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حدیث صحیح میں کہا ہے: ''بے شک تمہارے خون اور تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں (3)۔'' الحدیث۔ اور یہ تقاضا کرتی ہے کہ یہ تینوں محرمات اس میں ایک کے قائم مقام ہیں کہ ان کا احترام کرنا آدمی کے لئے فرض اور لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: حَسَنًا واقدی نے کہا ہے: جس کی ذات کو اچھا شمار کیا جائے اور عمرو بن عثمان صدفی نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ نہ احسان جتلایا جائے اور نہ وہ اسے اذیت اور پریشانی میں مبتلا کرے۔

اور سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: وہ اپنے قرض میں کسی عوض کا اعتقاد نہ رکھتا ہو۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ عاصم وغیرہ نے فَيُضَاعِفَهٗ الف اور فاء کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر اور یعقوب نے عین کو مشدد بغیر الف کے اور فاء کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابن کثیر، ابوجعفر اور شیبہ نے تشدید اور فاء کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے الف کے ساتھ اور فاء کو مرفوع پڑھا ہے۔ جنہوں نے اسے رفع دیا ہے انہوں نے یقرض کے ساتھ ملایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تقدیر عبارت ھو یُضَاعِفُهٗ ہے۔ اور جنہوں نے منصوب پڑھا ہے تو انہوں نے فاء کے ساتھ استفہام کا جواب بنایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے پہلے اَنْ مضمر ہے۔ تشدید اور تخفیف دونوں لغتیں ہیں۔ اور تشدید کی دلیل اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ہے کیونکہ تشدید کثرت بیان کرنے کے لئے ہوتی ہے اور حسن اور سدی نے کہا ہے: ہم اس تضعیف (کئی گنا) کو نہیں جانتے مگر صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ اس کا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ سنن ابن ماجہ، باب القرض، حدیث نمبر 2422، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 231، دارالفکر
3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 632، وزارت تعلیم

ارشاد گرامی ہے: وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا (النساء)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ جہاد کے نفقہ کے بارے میں ہے اور ہم حساب لگاتے تھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تھے کہ ایک آدمی کا خرچ اپنی ذات پر اور اپنے رفقاء پر اور اپنی سواری پر بیس لاکھ تھا۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ یہ ہر شے میں عام ہے، پس وہی تنگ کرنے والا ہے اور وہی فراخ اور کشادہ کرنے والا ہے۔ ہم نے ''شرح الاسماء الحسنی فی الکتاب الاسنیٰ'' میں ان دونوں پر بحث کی ہے۔ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ یہ وعید ہے کہ وہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾

''کیا نہیں دیکھا تم نے اس گروہ کو بنی اسرائیل سے (جو) موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد ہوا جب کہا انہوں نے اپنے نبی سے کہ مقرر کر دو ہمارے لئے ایک امیر تا کہ لڑائی کریں ہم اللہ کی راہ میں۔ نبی نے کہا: کہیں ایسا نہ ہو کہ فرض کر دیا جائے تم پر جہاد تو تم جہاد نہ کرو وہ کہنے لگے: (کوئی وجہ) نہیں ہمارے لئے کہ ہم جہاد نہ کریں اللہ کی راہ میں حالانکہ ہم نکالے گئے اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے مگر جب فرض کر دیا گیا ان پر جہاد تو منہ پھیر لیا انہوں نے بجز چند کے ان میں سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو۔''

قتال اور جنگ پر برانگیختہ کرنے کے بارے میں دوسرا قصہ بیان فرمایا جو بنی اسرائیل میں پیش آیا۔ الملأ کا معنی ہے اشراف لوگ، گویا کہ وہ شرف و عزت سے بھرے ہوئے ہیں اور زجاج نے کہا ہے: انہیں یہ نام دیا گیا کیونکہ وہ ان چیزوں سے بھرے ہوئے تھے جن کی انہیں ضرورت اور احتیاج ہوتی تھی۔

اور اس آیت میں الملأ سے مراد قوم ہے، کیونکہ معنی اس کا تقاضا کرتا ہے اور الملأ اسم جمع ہے جیسا کہ قوم اور رھط وغیرہ۔ اور الملأ کا معنی حسن خلق بھی ہے اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: احسنوا المَلأ فکلکم سیَرْوَی، (1) اسے مسلم نے روایت کیا ہے (تم اخلاق اچھے کرلو تو تم تمام کے تمام سیراب (خوشحال) ہو جاؤ گے)

قولہ تعالیٰ: مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد۔ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا، کہا گیا ہے کہ وہ نبی حضرت شمویل بن بال بن علقمہ تھے اور وہ ابن العجوز کے لقب سے معروف تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت شمعون تھے، سدی نے یہی کہا ہے اور بلاشبہ کہا گیا ہے کہ ابن العجوز لقب اس لئے تھا کہ ان کی ماں بوڑھی تھی تو اس نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 240، وزارت تعلیم

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بیٹے کی التجا کی حالانکہ وہ بوڑھی اور بانجھ ہو چکی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے اسے وہ عطا فرما دیا اور انہیں سمعون بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس بڑھیا نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ وہ اسے بیٹا عطا فرمائے تو رب کریم نے اس کی دعا سن لی اور بڑھیا نے بچے کو جنم دیا۔ پس اس نے اس کا نام سمعون رکھا، وہ کہتی: اللہ تعالیٰ نے میری دعا سن لی ہے اور سین عبرانی زبان میں شین ہو جاتی ہے اور وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔

اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ وہ حضرت یوشع بن نون تھے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے، کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہے درمیان میں لوگوں کی کئی امتیں ہیں۔ اور حضرت یوشع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غلام تھے (1) اور محاسبی نے ذکر کیا ہے کہ ان کا نام اسماعیل تھا۔ واللہ اعلم

یہ آیت بنی اسرائیل کی اس قوم کے بارے خبر ہے جنہیں ذلت نے آلیا اور دشمن نے ان پر غلبہ پا لیا تو انہوں نے جہاد کے بارے اجازت طلب کی کہ انہیں اس کا حکم دیا جائے اور جب انہیں حکم دیا گیا تو ان میں سے اکثر نے بزدلی کا مظاہرہ کیا اور قلیل لوگ ڈٹے رہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نصرت سے نوازا۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ مذکورہ لوگ وہی ہیں جنہیں موت دی گئی اور پھر وہ زندہ کر دیے گئے۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: **نُّقَاتِلْ** یہ نون اور جزم کے ساتھ ہے اور جمہور قراء کی قراءت جواب امر کی بنا پر ہے اور ضحاک اور ابن ابی عبلہ نے یاء کے ساتھ اور فعل کو مرفوع پڑھا ہے (یعنی یُقَاتِلُ) اور یہ الملك کی صفت کے محل میں ہے۔

قولہ تعالیٰ: **قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ** اور یہ عَسِيْتُم بھی ہے یعنی فتحہ اور کسرہ کے ساتھ دو لغتیں ہیں۔ دوسری کے مطابق حضرت نافع نے قراءت کی ہے اور باقیوں نے پہلی کے مطابق (یعنی فتحہ کے ساتھ) اور یہی مشہور ہے۔

ابو حاتم نے کہا ہے: کسرہ کی کوئی وجہ (اور علت) نہیں ہے اور اس کے ساتھ حسن اور طلحہ نے پڑھا ہے۔

مکی نے اسم فاعل میں کہا ہے: عَسِیٌ، اور یہ ماضی میں سین کے کسرہ پر دلالت کرتا ہے اور سین پر فتحہ یہ لغت مشہورہ ہے۔ ابو علی نے کہا ہے: کسرہ کی وجہ عربوں کا یہ قول ہے: هو عسٍ بذلك مثلاً حرٍ اور شجٍ۔ اور یہ فَعَلَ اور فَعِلَ دونوں کے وزن پر آیا ہے جیسا کہ نَعَمَ اور نَعِمَ میں ہے اور اسی طرح عَسَیت اور عَسِیت ہے، پس اگر فعل کی نسبت اسم ظاہر کی طرف کی جائے تو عسیتم میں قیاس یہ ہے کہ کہا جائے: عَسِيَ زيدٌ۔ مثلاً رَضِيَ زَيدٌ اور اگر یہ کہا جائے تو یہ قیاس کے مطابق ہے اور اگر نہ کہا جائے تو پھر جائز ہے کہ دونوں لغتیں لے لی جائیں۔ اور دونوں میں سے ایک دوسری کی جگہ استعمال ہوتی رہے۔ اور اس کلام کا معنی یہ ہے کیا تم پیٹھ پھیرنے اور فرار اختیار کرنے کے قریب ہو؟ **اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا**۔ (2)

زجاج نے کہا ہے: **اَلَّا تُقَاتِلُوْا** یہ محل نصب میں ہے، یعنی هل عسيتم مقاتلة (کیا تم لڑائی نہ کرنے کے قریب ہو) **قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ** اخفش نے کہا ہے: اس میں اَنْ زائدہ ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ یہ اپنے معنی پر محمول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 330، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 330-331

ہے۔ یعنی و ما منعنا (یعنی کون سی شے ہمارے لئے رکاوٹ ہے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: مالك اَلّا تصلی ؟ ما منعك یعنی کون سی شے تیرے لئے نماز پڑھنے سے رکاوٹ ہے۔

اور کہا ہے: معنی یہ ہے ہمارے لئے اس میں کون سی شے ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ نہیں کریں گے۔ نحاس نے کہا: یہ معنی زیادہ عمدہ اور اچھا ہے۔ اور ''اَنْ'' محل نصب میں ہے۔ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا یہ علت بیان ہو رہی ہے اور اسی طرح وَ اَبْنَآ ئِنَا بھی ہے یعنی اپنی اولادوں کے سبب سے (ہم ضرور لڑیں گے)

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ یعنی جب ان پر فرض کر دیا گیا تَوَلَّوْا اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جب اس نے ان پر قتال فرض کیا اور انہوں نے حقیقت کو دیکھا تو جنگ لڑنے کے بارے میں ان کے افکار تبدیل ہو گئے اور ان کی جانیں نکلنے لگیں۔ تَوَلَّوْا یعنی ان کی نیتیں مضطرب ہو گئیں اور ان کے عزائم ڈھیلے پڑ گئے۔ یہ حال ہے ان امتوں کا جو بڑی خوشحال اور متنعم تھیں اور انہوں نے خوشحالی کے اوقات میں جنگ کی تمنا کرتے ہوئے دعا کی درخواست کی اور جب جنگ چھڑ گئی تو انہوں نے بزدلی دکھائی اور اپنی طبع کی پیروی کی۔

اسی وجہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی دعا سے اپنے اس ارشاد کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ ''تم دشمن سے ملاقات کی تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی التجا کرو اور جب تمہارا ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو پھر تم ثابت قدم رہو (1)۔'' اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے قلیل لوگوں کی خبر دی کہ وہ پہلی نیت پر ثابت اور مستحکم رہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ کرنے پر ان کے ارادے برقرار رہے۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ۭ وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

''اور کہا انہیں ان کے نبی نے: بے شک اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے تمہارے لئے طالوت کو امیر، بولے: کیوں کر ہو سکتا ہے اسے حکومت کا حق ہم پر، حالانکہ ہم زیادہ حقدار ہیں حکومت کے اس سے اور نہیں دی گئی اسے فراخی مال و دولت میں۔ نبی نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے اسے کشادگی علم میں اور جسم میں اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اپنا ملک جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا یعنی تم نے جو اللہ تعالیٰ سے مانگا ہے اللہ تعالیٰ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 424

تمہاری دعا کو قبول کرلیا ہے اور طالوت پانی پلاتے تھے۔ بعض نے کہا: وہ چمڑا رنگنے کا کام کرتے تھے اور بعض نے کہا ہے: وہ اجرت پر کام کرتے تھے اور عالم بھی تھے۔ پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بلند کردیا جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ وہ حضرت بنیامین کے قبیلے سے تھے اور وہ نہ تو نبوت کے قبیلے سے تھے اور نہ ہی بادشاہت کے قبیلے سے۔ اور نبوت بنی لاوی میں تھی اور بادشاہت یہودا کے قبیلے میں تھی، سو اسی وجہ سے انہوں نے انکار کیا۔

حضرت وہب بن منبہ نے کہا ہے: جب بنی اسرائیل کے گروہ نے حضرت شمویل بن بال علیہ السلام سے کہا جو کہا، تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی کہ وہ ان کی طرف ایک امیر اور بادشاہ بھیجے اور اس پر راہنمائی بھی فرمائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: تم اپنے اس سینگ کی طرف دیکھو جس میں تمہارے گھر میں تیل پڑا ہے۔ جب کوئی آدمی تمہارے پاس آئے اور وہ تیل جوش مار کر آواز نکالنے لگے جو سینگ میں ہے، تو وہی بنی اسرائیل کا بادشاہ ہوگا اور اس تیل میں سے کچھ اس کے سر پر لگا دو اور اسے ان پر بادشاہ مقرر کردو۔

فرمایا: طالوت چمڑے کی دباغت کا کام کرتے تھے۔ ان کا جانور گم ہوگیا اور وہ اس کی تلاش میں نکلے اور حضرت شمویل علیہ السلام کے گھر کا قصد کیا تاکہ وہ اپنے لئے جانور کے معاملہ میں دعا کرائیں یا ان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ پالیں کہ امید لگ جائے، تو تیل میں جوش پیدا ہوگیا جیسا ان کا گمان تھا۔ بیان کیا: پس حضرت شمویل علیہ السلام اس کے پاس کھڑے ہوئے اور اسے اٹھا لیا اور اس میں سے کچھ تیل طالوت کے سر پر لگا دیا اور اسے فرمایا: تو ان بنی اسرائیل کا بادشاہ اور امیر ہے جن کے بارے اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے (1)۔ پھر بنی اسرائیل کو فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ اور امیر مقرر کیا ہے۔

طالوت اور جالوت یہ دونوں عجمی اسم ہیں اور دونوں معرب ہیں۔ اسی لئے یہ دونوں منصرف نہیں (2)۔ اسی طرح داؤد بھی ہے۔ ان کی جمع طوالیت، جوالیت اور دوادید ہے۔ اور اگر کسی آدمی کا نام طاؤس اور راقود رکھا جائے تو یہ دونوں منصرف ہوں گے اگرچہ یہ دونوں عجمی ہیں۔

اس کے اور پہلے کے درمیان فرق یہ ہے کہ آپ کہہ سکتے ہیں: الطاؤس، پس الف لام داخل ہوتے ہیں اور یہ عربی میں غیر منصرف بنا دیتے ہیں اور یہ انہیں متمکن نہیں بنا سکتے (یعنی طالوت اور جالوت کو)

قولہ تعالیٰ: اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا یعنی وہ کیسے ہمارا امیر بن سکتا ہے حالانکہ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کا حق رکھتے ہیں؟ وہ انبیاء علیہم السلام کو تکلیف پہنچانے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے تکبر اور انکار کے بارے میں اپنے طریقے پر چلتے رہے۔ اور انہوں نے کہا: ''اَنّٰى'' یعنی کون سی جہت سے۔ پس ''اَنّٰى'' یہ ظرف ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔

حالانکہ ہم بادشاہ کے قبیلے سے ہیں اور وہ اس طرح نہیں ہے اور وہ فقیر اور مفلس ہے۔ پس انہوں نے اس اقوی سبب کو چھوڑ دیا اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور پہلے سے اس کا فیصلہ ہے۔ یہاں تک کہ ان کے نبی علیہ السلام نے اس قول کے ساتھ

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 718-719
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 332، دار الکتب العلمیہ

ان پر حجت اور دلیل بیان فرمائی: اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰىهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے چن لیا ہے اور یہی حجت قاطعہ ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے لئے طالوت کو چننے کی علت بھی بیان فرمادی اور وہ اس کی علم میں کشادگی اور وسعت ہے جو انسان کی بقا ہے اور وہ جسم ہے جو جنگ میں اس کا معاون اور مقابلے کے وقت اس کا سامان جنگ ہے۔ پس یہ آیت امام کی صفت اور امامت کے احوال کے بیان کو متضمن ہے اور بلاشبہ اس کے لئے علم، دین اور قوت کا ہونا ضروری ہے نہ کہ نسب کا۔ پس اس میں علم اور فضائل نفس کے ساتھ نسب کا کوئی حصہ نہیں ہے اور بلاشبہ یہ نسب پر متقدم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس نے طالوت کو ان پر علم اور اس کی قوت کی وجہ سے اختیار اور ترجیح دی ہے، اگرچہ نسب کے اعتبار سے وہ اعلیٰ اور اشرف ہیں۔ اور سورت کے پہلے حصہ میں امامت اور اس کی شرائط کا ذکر گزر چکا ہے جو کافی ہے اور دوبارہ اس کے بیان کی حاجت نہیں اور یہ آیت اس میں اصل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے اس وقت طالوت بنی اسرائیل میں سب سے بڑا عالم تھا اور بڑا خوبصورت اور طاقتور انسان تھا اور وہ اتنا جسیم تھا کہ دشمن بھی اس سے خوف کھاتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ اس کا نام طالوت اس کی قدوقامت طویل ہونے کی وجہ سے تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جسم کی زیادتی سے مراد خیر اور شجاعت کے اوصاف کی کثرت ہے اور اس سے جسم کا عظیم ہونا مراد نہیں ہے۔ کیا آپ شاعر کے قول کی طرف نہیں دیکھتے:

تری الرجل النحیف فتزدَریه و فی اثوابِه اَسَدٌ هَصُوْرُ

و یعجبك الطّرِیر فَتَبۡتَلِیه فیُخۡلِف ظنك الرجلُ الطّرِیرُ

و قد عَظُمَ البعیر بغیر لُبّ فلم یسۡتَغۡنِ بالعِظَم البعیرُ

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی معنی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی ازواج مطہرات کے لئے ارشاد ہے: ''تم میں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مجھے وہ ملے گی جس کا ہاتھ تم میں سے زیادہ طویل ہوگا''۔ پس وہ آپس میں طوالت کو دیکھنے لگیں۔ تو ان میں حضرت زینب پہلے فوت ہوئیں، کیونکہ وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتی تھیں اور صدقہ کرتی تھیں (1)۔ اسے مسلم نے بیان کیا ہے۔ اور بعض تاویل کرنے والوں نے کہا ہے کہ علم سے مراد جنگ کا علم ہے اور یہ بغیر دلیل کے عام کی تخصیص ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: علم کی زیادتی اس اعتبار سے تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی فرمائی اور یہ اس بنا پر ہے کہ طالوت نبی ہوں۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يُؤۡتِىۡ مُلۡكَهٗ مَنۡ يَّشَآءُ ۔ بعض تاویل کرنے والوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ رب العالمین کا یہ ارشاد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شمویل علیہ السلام کے قول میں سے ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ آپ نے انہیں یہ تب کہا جب آپ نے دلائل میں ان کی سرکشی اور ان کے جھگڑے کو دیکھا، تو ارادہ کیا کہ آپ اپنی کلام کو ایسی قطعی دلیل سے مکمل کریں جس پر کوئی اعتراض نہ ہو سکتا ہو، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ يُؤۡتِىۡ مُلۡكَهٗ مَنۡ يَّشَآءُ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 291، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(اور اللہ تعالیٰ اپنا ملک عطا فرما دیتا ہے جسے چاہتا ہے) اور دنیوی ملک کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف مملوک کی اضافت مالک کی طرف کرنے کی طرح ہے۔ پھر ان کے لئے رشک اور تنبیہ کی بنا پر ان کی طرف سے سوال کے بغیر فرمایا: اِنَّ اٰیَةَ مُلْکِهٖۤ یہ احتمال رکھتا ہے کہ انہوں نے آپ سے اس قول میں صدق پر دلیل طلب کی ہے: اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: پہلا قول سیاق آیت کے مطابق زیادہ ظاہر ہے اور دوسرا بنی اسرائیل کے اخلاق ذمیمہ کے زیادہ مشابہ ہے، یہ موقف طبری نے اختیار کیا ہے(1)۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اٰیَةَ مُلْکِهٖۤ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ التَّابُوْتُ فِیْهِ سَكِیْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِیَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۴۸﴾

''اور کہا انہیں ان کے نبی نے کہ اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ آئے گا تمہارے پاس ایک صندوق اس میں تسلی (کا سامان) ہوگا تمہارے رب کی طرف سے اور (اس میں) بچی ہوئی چیزیں ہوں گی جنہیں چھوڑ گئی ہے اولاد موسیٰ اور اولاد ہارون اٹھا لائیں گے اس صندوق کو فرشتے۔ بے شک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان دار ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اٰیَةَ مُلْکِهٖۤ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ التَّابُوْتُ یہ بمعنی اتیان التابوت ہے، یعنی تابوت کا آنا ان کی بادشاہی کی نشانی ہے اور تابوت (صندوق) کے بارے جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت آدم علیہ السلام پر نازل فرمایا (اتارا) اور وہ آپ کے پاس رہا، یہاں تک کہ (وراثۃً) چلتے چلتے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچ گیا۔ بنی اسرائیل اس کی برکت سے ان پر غالب آتے تھے جو کوئی ان سے جنگ لڑتے، حتیٰ کہ بنی اسرائیل نافرمان ہو گئے تو ان سے تابوت چھین لیا گیا اور عمالقہ نے اسے چھینا تھا۔ سدی کے قول کے مطابق وہ جالوت اور اس کے ساتھی تھے اور انہوں نے ان سے تابوت چھین لیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس پر سب سے بڑی دلیل ہے کہ نافرمانی (گناہوں کی کثرت) ذلت و رسوائی کا سبب ہے اور یہ بالکل بین اور واضح ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ تابوت میں نشانی اس طور پر تھی کہ یہ مروی ہے اس میں سے رونے کی آواز سنائی دیتی تھی، پس جب وہ اسے سنتے تو وہ جنگ کے لئے چل پڑتے تھے اور جب یہ آواز پرسکون ہو جاتی تو نہ وہ چلتے اور نہ ہی تابوت چلتا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ وہ اسے میدان جنگ میں رکھتے تھے اور وہ مسلسل غالب آتے رہے یہاں تک کہ وہ نافرمان اور گستاخ ہو گئے تو وہ مغلوب ہو گئے اور ان سے تابوت لے لیا گیا اور وہ ذلیل و رسوا ہو گئے۔ پس جب انہوں نے ہلاکت اور اپنا ذکر ختم ہونے کی علامت دیکھی، تو ان میں سے بعض نے اسے ناپسند کیا اور وہ اپنے معاملات میں مشاورت کرنے لگے یہاں تک کہ ان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 332، دار الکتب العلمیہ

کی ایک جماعت اس پر جمع ہوگئی کہ وہ اپنے وقت کے نبی علیہ السلام کو عرض کریں کہ ہمارے لئے کوئی امیر مقرر کردو۔ پھر جب نبی علیہ السلام نے انہیں یہ بتایا تمہارا بادشاہ طالوت ہے تو انہوں نے اس میں رجوع کرلیا (یعنی رائے بدل لی) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی ہے۔ پس جب انہیں دلیل کے ساتھ خاموش کرادیا گیا تو انہوں نے اس پر بینہ طلب کرلیا۔ یہ طبری کا قول ہے اور جب انہوں نے اپنے نبی علیہ السلام سے اس پر شہادت طلب کی جو انہوں نے کہا، تو انہوں نے اپنے رب سے دعا کی تو اس کے سبب اس قوم پر بیماری نازل ہوئی جنہوں نے تابوت لے لیا تھا۔ اس میں کچھ اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے اسے اپنے کنیسہ (عبادتگاہ) میں رکھا۔ اس میں بت تھے تو وہ بت صبح کے وقت اوندھے پڑے تھے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے اسے اپنے بت خانہ میں بڑے بت کے نیچے رکھا۔ پس انہوں نے صبح اس حال میں کی کہ وہ بت کے اوپر پڑا ہوا تھا، تو انہوں نے اسے اٹھایا اور اسے بت کی ٹانگوں کے ساتھ باندھ دیا اور پھر صبح اس حال میں کی کہ بت کے دونوں ہاتھ اور اس کی دونوں ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں اور تابوت کے نیچے پڑی ہوئی تھیں۔ پس انہوں نے اسے اٹھایا اور ایک قوم کے گاؤں میں جا کر رکھ دیا تو اس قوم کی گردنوں میں درد ہونے لگی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے اسے ایک قوم کے پاخانہ کی جگہ رکھا تو وہ بواسیر کی بیماری میں مبتلا ہونے لگے اور جب ان کی تکلیف بہت بڑھ گئی جس حالت میں وہ تھی تو انہوں نے کہا: یہ تکلیف نہیں ہے مگر اسی تابوت کی وجہ سے۔ پس ہمیں چاہئے کہ ہم اسے بنی اسرائیل کی طرف واپس لوٹادیں۔ چنانچہ انہوں نے اسے دو بیلوں کے درمیان ریڑھے پر رکھا اور انہیں بنی اسرائیل کے شہروں کی طرف بھیج دیا اور اللہ تعالیٰ نے فرشتے بھیجے وہ بیلوں کو ہانکتے رہے یہاں تک کہ وہ دونوں بنی اسرائیل میں داخل ہوگئے۔ یہ لوگ طالوت کی حکمرانی میں تھے تو انہیں مدد و نصرت کا یقین ہوگیا۔ اس روایت میں یہی ملائکہ کا تابوت کو اٹھانا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ ملائکہ اسے اٹھا کر لائے اور حضرت یوشع بن نون نے اسے ریگستان میں رکھ دیا اور یہ روایت بھی ہے کہ انہوں نے ہوا میں تابوت دیکھا یہاں تک کہ وہ ان کے درمیان اتر گیا۔ ربیع بن خثیم نے یہی کہا ہے۔

اور وہب بن منبہ نے بیان کیا ہے کہ اس تابوت (صندوق) کی مقدار تقریباً تین ہاتھ لمبائی اور دو ہاتھ چوڑائی تھی۔ کلبی نے کہا ہے: یہ شمسار کی لکڑی سے بنا ہوا تھا جس سے کنگھیاں بنائی جاتی ہیں۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے التابوہ پڑھا ہے اور یہ بھی اس کی لغت ہے اور لوگ آپ کی قراءت پر اسے تا کے ساتھ پڑھتے ہیں اور یہ گزر چکا ہے۔ اور آپ سے التیبوت بھی مروی ہے۔ نحاس نے اسے ذکر کیا ہے۔ اور حمید بن قیس نے یحملہ یا کے ساتھ پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ سکینہ اور بقیہ کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ پس سکینہ فَعِيْلَةٌ کے وزن پر ہے یہ سکون، وقار اور طمانینت سے لیا گیا ہے۔ پس یہ قول فِيْهِ سَكِيْنَةٌ یہ تمہارے دلوں کے سکون کا سبب ہے اس میں جو طالوت کے بارے تم میں اختلاف ہے۔ اور اسی کی طرح یہ ارشاد ہے: فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پر وہ نازل فرمایا جس کے سبب اس کے دل کو سکون ہوا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تابوت ان کے دلوں کے سکون کا سبب تھا، پس وہ جہاں بھی ہوئے انہیں اس کے

پاس سکون واطمینان ملا۔ جب تابوت جنگ میں ان کے ساتھ ہوتا تھا وہ اس سے قطعانہ بھاگتے تھے۔

وہب بن منبہ نے کہا ہے: سکینہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے خاص روح ہے جو کلام کرتی تھی۔ جب ان کا کسی امر میں اختلاف ہو جاتا تو وہ اس کی وضاحت اور بیان کے ساتھ بولتی تھی جو وہ ارادہ رکھتے تھے اور جب وہ جنگ میں چیخ مارتی تو کامیابی و کامرانی ان کے لئے ہو جاتی تھی۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے یہ بہت تیز رفتار ہوا تھی اس کا چہرہ انسان کے چہرے کی مثل تھا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہ ایسی ہوا تھی جو ناہموار جگہوں سے بڑی تیزی کے ساتھ گزرتی، اس کے دو سر تھے (1)۔

اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ ایک بلی کی طرح کا حیوان تھا اس کے دو پر تھے، دم تھی اور اس کی آنکھیں چمکدار تھیں اور جب یہ کسی لشکر کی طرف دیکھتا تو وہ شکست کھا جاتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: یہ جنت سے لائی ہوئی سونے کی ایک طشتری تھی جس میں حضرات انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے دل دھوئے جاتے تھے، سدی نے یہی کہا ہے۔

اور ابن عطیہ نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ تابوت میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰت والتسلیمات کی باقی رہ جانے والی کچھ اشیاء (تبرکات) اور ان کی علامات اور نشانیاں تھیں۔ لوگ اس کے پاس سکون حاصل کرتے تھے، اس سے انس رکھتے تھے اور قوت وطاقت حاصل کرتے تھے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صحیح مسلم میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی سورۃ الکہف پڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ گھوڑا دو رسیوں کے ساتھ بندھا ہوا تھا تو اس آدمی پر بادل سا چھا گیا اور وہ گھومتا رہا اور اس کے قریب آتا گیا اور اس کا گھوڑا اس کے سبب خوف سے بدکنے اور اچھلنے کودنے لگے۔ جب صبح ہوئی تو وہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس کا تذکرہ کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سکینہ ہے جو قرآن کے سبب نازل ہوا۔'' اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ ایک رات اپنے مربد (کھجوریں خشک کرنے کی جگہ) میں قرآن کریم پڑھ رہے تھے۔ الحدیث۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ ملائکہ تھے جو تیری تلاوت سن رہے تھے اور اگر تو پڑھتا رہتا تو وہ صبح اس حال میں کرتے کہ لوگ انہیں دیکھ سکتے جو ان سے مخفی رہتے ہیں (3)۔'' اسے بخاری اور مسلم نے بیان کیا ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار سکینہ کے نزول اور ایک بار ملائکہ کے نازل ہونے کے بارے فرمایا، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ سکینہ اس سایہ میں تھا اور وہ ہمیشہ ملائکہ کے ساتھ اترتا ہے اور اس میں ان کے لئے بھی حجت ہے جنہوں نے کہا کہ سکینہ روح ہے یا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 333، دار الکتب العلمیہ　2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 268، وزارت تعلیم

3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 269، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب فضل سورۃ کہف، حدیث نمبر 4625، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً۔ صحیح بخاری، باب فضل المعوذات، حدیث نمبر 4630، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایسی شے ہے جس کی روح ہے، کیونکہ قرآن کا سننا صحیح نہیں ہوتا مگر اس کے لئے جو عقل رکھتا ہے۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: وَ بَقِيَّةٌ۔ بقیة کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

سو کہا گیا ہے: (اس میں) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، حضرت ہارون علیہ السلام کا عصا اور تختیوں کے ٹکڑے تھے کیونکہ وہ ٹوٹ گئی تھیں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں پھینکا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی بیان کیا ہے اور عکرمہ نے یہ زائد کہا ہے کہ اس میں تورات بھی تھی۔

اور ابو صالح نے کہا ہے: بقیة سے مراد حضرت موسیٰ علیہ اسلام کا عصا، آپ کا لباس، حضرت ہارون علیہ السلام کے کپڑے اور تورات کی دو تختیاں ہیں۔

اور عطیہ بن سعد نے کہا ہے: اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کا عصا، دونوں کے کپڑے اور تختیوں کے ٹکڑے ہیں۔

اور ثوری نے کہا ہے: لوگوں میں سے کچھ کہتے ہیں کہ البقیة سے مراد سونے کی طشتری میں دو قفیز منّ (وہ کھانا جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ شریف اور تختیوں کے ٹکڑے ہیں اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: عصا اور نعلین مراد ہیں (1)۔

جو کچھ اس بارے روایت ہے اس کا معنی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کے پاس تختیاں لے کر آئے اور آپ نے انہیں بچھڑے کی عبادت کرتے ہوئے پایا، تو آپ نے غصے میں آ کر وہ تختیاں پھینک دیں اور وہ ٹوٹ گئیں۔ پس آپ نے ان میں سے جو صحیح تھیں انہیں نکال لیا اور جو ٹوٹ گئی تھیں ان کے ٹکڑے اٹھا لئے اور انہیں تابوت میں رکھ دیا۔

اور ضحاک نے کہا ہے: البقیة سے مراد جہاد کرنا اور دشمنوں سے قتال کرنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: تابوت کے بارے میں ان میں سے کوئی امر ہو، یا تو اس میں لکھا ہوا ہے اور یا پھر اس کی ذات کو لانا ہی اس کے بارے امر کی طرح ہے۔ اور تبرک کی نسبت آل موسیٰ اور آل ہارون علیہما السلام کی طرف اس حیثیت سے کی گئی کہ حکم ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف لکھا ہوا تھا اور وہ تمام کے تمام آل موسیٰ اور آل ہارون علیہما السلام ہی تھے اور کسی آدمی کی آل سے مراد اس کے قرابتدار ہوتے ہیں (2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 334، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

''پھر جب روانہ ہوا طالوت اپنی فوجوں کے ساتھ اس نے کہا کہ بے شک اللہ تعالیٰ آزمانے والا ہے تمہیں ایک نہر سے سو جس نے پانی پی لیا اس سے، وہ نہیں میرے ساتھیوں سے اور جس نے نہ پیا وہ یقیناً میرے ساتھیوں میں سے ہے مگر جس نے بھر لیا ایک چلو اپنے ہاتھ سے، پس سب نے پیا اس سے مگر چند آدمیوں نے ان سے (نہیں پیا) پھر جب عبور کیا اسے طالوت نے اور ان لوگوں نے جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ کہنے لگے: کچھ طاقت نہیں ہم میں آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی (مگر) کہا ان لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ وہ ضرور ملاقات کرنے والے ہیں اللہ سے کہ بارہا چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے اذن سے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولِ تعالیٰ: فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ، فَصَلَ کا معنی ہے جب وہ ان کے ساتھ نکلا فصلت الشیء فانفصل یعنی میں نے شے کو کاٹا پس وہ کٹ گئی۔

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب طالوت روانہ ہوا تو لشکریوں نے اسے کہا: بے شک ہم سے نہیں اٹھائے جا سکتے، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے نہر جاری کر دے۔ تو طالوت نے انہیں کہا: بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر سے آزمانے والا ہے۔

سدی کے قول کے مطابق فوجوں کی تعداد اسی ہزار تھی۔ اور حضرت وہب نے کہا ہے کوئی بھی اس سے پیچھے نہ رہا تھا سوائے اس کے جو صغر سنی یا کبر سنی یا مرض کی وجہ سے معذور تھا (1)۔ اور الابتلاء کا معنی الاختبار آزمائش اور امتحان ہے۔ اور النَّهَر اور النَّهْر یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کا معنی السعۃ سے ہے (یعنی وسعت، خوشحالی) اور اس سے النہار بھی ہے۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

حضرت قتادہ نے کہا: وہ نہر جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمایا وہ اردن اور فلسطین کے درمیان ہے (2)۔ جمہور نے بِنَهَر کو ہا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور مجاہد اور حمید الاعرج نے بِنَهْر ہاء کے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے اور اس ابتلاء کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا امتحان لیا، پس جس کی اطاعت و پیروی پانی کو ترک کرنے میں ظاہر ہوئی تو اس کے بارے یہ معلوم ہوگا کہ وہ اس کے سوا دیگر احکام میں بھی مطیع و فرمانبردار رہے گا۔ اور جس پر پانی کے بارے میں اس کی خواہش اور طلب غالب رہی اور اس نے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ بدرجہ اولیٰ دیگر تکالیف و مصائب میں نافرمان ہوگا۔

پس روایت ہے کہ وہ نہر پر پہنچے اس حال میں کہ پیاس انہیں لگی ہوئی تھی اور نہر کا پانی انتہائی میٹھا اور خوبصورت تھا۔ سو اس لئے اطاعت کرنے والوں کو چلو میں لینے کی رخصت دی گئی، تاکہ ان سے شدت پیاس کی اذیت کچھ نہ کچھ ختم ہو جائے اور اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 334، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

حال میں وہ نفس کا جھگڑا ختم کر سکیں (1) اور یہ بیان فرمادیا کہ زندگی کی تنگی پر صبر کرنے والوں کی احتیاط کے وقت پیاس کے ضرر اور تکلیف کو ختم کرنے کے لئے ایک چلو کافی ہو رہے گا جن کا قصد وارادہ آسودگی اور خوشگواری نہ ہو۔ جیسا کہ عروہ نے کہا ہے:

و أحسوا قَرَاحِ الماء والماءُ باردُ

اور انہوں نے خالص پانی تھوڑا تھوڑا پلایا اور پانی ٹھنڈا تھا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس معنی کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: حسب المرء لُقیمات یُقِمن صلبه، (2) آدمی کے لئے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی صلب (ریڑھ کی ہڈی مراد پشت) کو سیدھا رکھ سکیں۔

اور بعض وہ لوگ جو معانی کی گہرائی میں غور وفکر کرتے ہیں انہوں نے کہا ہے: یہ آیت ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لئے بیان فرمائی ہے، پس اللہ تعالیٰ نے دنیا کو نہر سے تشبیہ دی ہے اور اس سے پانی پینے والے کو اس سے جو دنیا کی طرف مائل ہے اور اس سے حظ وافر لینے کا طالب ہے اور پانی نہ پینے والے کو دنیا سے انحراف کرنے والے اور اس میں زہد وتقویٰ اختیار کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور اپنے ہاتھ سے ایک چلو لینے والے کو دنیا میں بقدر حاجت لینے والے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ تینوں احوال مختلف ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ کتنی حسین تعبیر ہے اگر اس تاویل میں تحریف اور ظاہر معنی سے خروج کا اندیشہ نہ ہو لیکن اس کا صحیح معنی دوسرا ہی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ طالوت نبی تھے انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اس کی طرف وحی اور الہام فرمایا اور اس نے الہام کو ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش قرار دیا۔ اور جنہوں نے کہا وہ نبی نہ تھا انہوں نے کہا: اسے ان کے نبی حضرت شمویل علیہ السلام نے وحی کے سبب اس کی خبر دی جب طالوت نے اپنی قوم کو اس کے بارے آگاہ کیا اور بلاشبہ یہ آزمائش اس لئے آئی تا کہ صادق اور کاذب کے مابین تمیز ہو سکے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کی اطاعت و پیروی کو آزمانے کے لئے انہیں آگ روشن کرنے اور پھر اس میں کود جانے کا حکم ارشاد فرمایا، لیکن اسے اس معنی پر محمول کیا گیا کہ یہ آپ کا اس امر سے ڈرانے کے لئے مزاح ہے جس کا آپ نے انہیں مکلف اور پابند بنایا تھا، اس کا تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ یہاں شَرِبَ بمعنی كَرَعَ ہے (یعنی پانی پر منہ رکھ کر بلا واسطہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 334، دار الکتب العلمیہ

2۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 60، وزارت تعلیم

ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی کراهیة کثرة الأكل، حدیث نمبر 2302، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پانی پینا) اور فَلَيْسَ مِنِّيْ کا معنی ہے وہ اس جنگ میں میرا ساتھی نہیں ہے اور اس نے انہیں اس جملہ کے ساتھ ایمان سے خارج نہیں کیا۔

سدی نے کہا ہے: وہ اسی ہزار تھے اور لامحالہ ان میں مومن، منافق، محنت کرنے والے اور سست بھی تھے۔ اور حدیث طیبہ میں ہے: مَنْ غشنا فلیس منا(1) (جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے) یعنی وہ ہمارے اصحاب میں سے نہیں ہے اور وہ ہمارے طریقہ اور ہماری ہدایت پر نہیں ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

اذا حاولتَ فی أسد فجوراً فانی لستُ منك و لستَ مِنی

جب تو اخلاق میں فسق و فجور کا قصد کرے گا تو پھر میں تجھ سے نہیں ہوں اور تو مجھ سے نہیں ہے۔ اور کلام عرب میں یہ عام رائج ہے کہ جب کسی آدمی کا بیٹا اس کے اسلوب اور طریقہ کے خلاف چلے تو وہ بیٹے کو کہہ دیتا ہے: لستَ مِنی تو مجھ سے نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهٗ مِنِّيْٓ کہا جاتا ہے: طعمت الشیٔ یعنی میں نے شے کو چکھ۔ اور اطعمتہ الماءَ یعنی میں نے اسے پانی چکھایا۔ اور یہاں و من لم یشربہ نہیں کہا کیونکہ یہ اہل عرب کی عادت ہے کہ جب وہ کسی شے کو مکرر (دوبارہ) ذکر کریں تو وہ اسے دوسرے لفظ کے ساتھ مکرر لاتے ہیں اور لغۃ القرآن تو تمام لغات سے زیادہ فصیح ہے۔ لہٰذا اس میں اس کی جرح وقدح کا کوئی اعتبار نہیں جو یہ کہتا ہے: کہ طعمت الماء (میں نے پانی کھایا) نہیں کہا جا سکتا۔

مسئلہ نمبر 5۔ ہمارے علماء نے اس سے سد ذرائع کے قول پر استدلال کیا ہے کیونکہ ذوق (چکھنا) وہ کم سے کم شے ہے جو لفظ طعم میں داخل ہے اور جب طعم سے نہی واقع ہے تو شرب کے وقوع کا اس سے کوئی امکان نہیں ہے جو طعم سے اجتناب کرے گا۔ اسی مبالغہ کی خاطر کلام و من لم یشرب منہ نہیں لائے۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ پانی طعام ہے اور جب وہ طعام ہے تو پھر وہ (انسان کی زندگی) باقی رکھنے کے لئے خوراک ہے اور بدنوں کی خوراک اسی سے (حاصل ہوتی ہے) تو پھر یہ واجب ہے کہ اس میں ربا جاری ہو۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہی مذہب صحیح ہے۔(2)

ابو عمر نے بیان کیا ہے کہ امام مالک نے فرمایا: (دریا کے) کنارے پر پانی کی بیع پانی کے ساتھ کرنا متفاضل اور ایک خاص مدت تک اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہی امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ اور امام محمد بن حسن نے کہا ہے: یہ بھی ان چیزوں میں سے ہے جن کا کیل اور وزن کیا جاتا ہے۔ پس اس قول کی بنا پر ان کے نزدیک تفاضل جائز نہیں ہے۔ وہ اس لئے کہ ان کے نزدیک اس میں ربا ہے، کیونکہ ربا میں اس کی علت کیل اور وزن ہیں۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: پانی کی بیع نہ متفاضلا جائز ہے اور نہ اس میں معینہ مدت کا ادھار جائز ہے۔ اور ربا میں اس کی علت یہ ہے کہ یہ جنس ماکول میں سے ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ ابن عربی نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ نے کہا ہے: جس کسی نے کہا: اگر میرے فلاں غلام نے فرات سے پیا تو وہ آزاد ہے تو وہ آزاد نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہ اس میں منہ لگا کر پانی پیے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 70، وزارت تعلیم

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 323، دار الفکر

الکرع کا معنی ہے کہ آدمی دریا سے اپنا منہ لگا کر بلاواسطہ پانی پیے۔ اور اگر اس نے اپنے ہاتھ سے پانی پیا یا برتن کے ساتھ اس سے پیا تو وہ آزاد نہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دریا میں منہ لگا کر پانی پینے اور ہاتھ کے ساتھ پانی پینے کے درمیان فرق کیا ہے (1)۔ فرمایا: یہ فاسد ہے، کیونکہ شرب الماء کا اطلاق لغت عرب میں ہر ہیئت اور صفت پر کیا جاتا ہے۔ ہاتھ کے ساتھ چلو بھر کر یا منہ لگا کر پینا یہ ایک ہی ہے اور جب لغۃً اور حقیقۃً وہ شرب پایا گیا جس کی قسم کھائی گئی ہے تو وہ حانث ہو گیا۔ پس اسے جان لو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اہل لغت نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے جیسا کہ کتاب وسنت نے فرق بیان کیا ہے۔

جوہری وغیرہ نے کہا ہے: کَرَعَ فی الماء کُرُوعاً (کہا جاتا ہے) جب کوئی اپنے منہ کے ساتھ پانی اس کے محل سے پیے نہ وہ ہتھیلی کے ساتھ پیے اور نہ کسی برتن کے ساتھ اور اس میں دوسری لغت ہے۔ کَرِعَ یعنی را کے کسرہ کے ساتھ یکرع، کَرعا۔ اور الکرع سے مراد بارش کا پانی ہے جو منہ میں پڑتا ہے۔

اور رہی حدیث طیبہ تو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے کہ واصل بن عبدالاعلیٰ، ابن فضیل نے لیث عن سعید بن عامر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے کہ ہم ایک تالاب کے پاس سے گزرے اور ہم اس میں منہ لگا کر پانی پینے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم منہ لگا کر نہ پیو بلکہ اپنے ہاتھوں کو دھو اور پھر ان سے پانی پیو کیونکہ ہاتھ سے بڑھ کر اچھا اور پاکیزہ برتن کوئی نہیں ہے (2) اور یہ نص ہے۔ لیث بن ابی سلیم مسلم نے اس کی روایت نقل کی ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ۔ الاغتراف کا معنی ہے: کسی شے سے ہاتھ اور کسی آلہ سے لینا۔ اور اسی سے المِغرَفَة (چمچہ) ہے۔ اور الغَرف، الاغتراف کا ہم معنی ہے۔ اور غَرفۃً غین کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ مصدر ہے اور اغترافۃً نہیں کہا، کیونکہ الغرف اور الاغتراف کا معنی ایک ہے۔ اور الغَرْفَةُ کا معنی ہے ایک بار۔ اور اسے غُرفۃً غین کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور اس سے مراد وہ شی ہے جس کا چلو بھرا جاتا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ الغَرفۃ ایک ہاتھ کے ساتھ چلو بھرنا اور الغُرفۃ دو ہاتھوں کے ساتھ چلو بھرنا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: دونوں لغتیں ایک ہی معنی میں ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہتھیلیاں صاف ترین برتن ہیں۔ اسی معنی میں حسن کا قول ہے:

لا یدلفون الی ماء بآنیة   الا اغترافا من الغدران بالراح

الدلیف کا معنی ہے آہستہ چال۔

وہ برتن لے کر پانی کی طرف آہستہ چال نہیں چلتے مگر نہروں سے ہتھیلی کے ساتھ چلو بھرتے ہوئے (لیتے ہیں)۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 323، دار الفکر

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاشربہ، جلد 1، صفحہ 253، وزارت تعلیم۔ ابن ماجہ، باب الشرب بالاکف والکرع، حدیث نمبر 3423، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کوئی ان زمانوں میں بغیر شبہ، شک اور ارتیاب کے خالص حلال کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ چشموں اور ان دریاؤں سے جو مسخر کیے گئے ہیں اور رات دن جاری ہیں اپنی ہتھیلیوں کے ساتھ پانی پیے، اس کے سبب اللہ تعالیٰ سے نیکیاں کمانے، بوجھ اتارنے، نیکوکار ائمہ کرام کے ساتھ ملنے کا ارادہ اور نیت کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے اپنے ہاتھ کے ساتھ پانی پیا درآنحالیکہ وہ برتن پر قدرت رکھتا ہو (اور) اس سے وہ تواضع کا ارادہ رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کی انگلیوں کی تعداد کے مطابق نیکیاں لکھ دیتا ہے۔ اور یہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا برتن ہے جب انہوں نے پیالہ پھینکا تو کہا: اف! یہ دنیا کے ساتھ ہے'' اسے ابن ماجہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ ہم اپنے پیٹوں کے بل لیٹ کر پانی پییں اور وہ منہ پانی پر رکھ کر پانی پینا ہے، اور آپ نے ہمیں منع کیا ہے کہ ہم ایک ہاتھ کے ساتھ چلو بھر کر پییں اور فرمایا: ''تم میں سے کوئی اس طرح آواز نکال کر (پانی) نہ پیے جس طرح کتا آواز نکال کر پیتا ہے اور کوئی ایک ہاتھ کے ساتھ اس طرح نہ پیے جس طرح وہ قوم پیتی تھی جن پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوا اور کسی برتن میں رات کے وقت نہ پیے یہاں تک کہ وہ حرکت دے لے (خوب ہلا لے) مگر یہ کہ برتن ڈھانپا ہوا ہو اور جس نے اپنے ہاتھ کے ساتھ پانی پیا اور وہ برتن پر قدرت رکھتا ہو (1) .....'' آگے حدیث سابقہ حدیث کی طرح ہے۔ اس کی اسناد میں بقیہ بن الولید ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: اس کی حدیث لکھی جاتی ہے اور اس سے استدلال نہیں کیا جاتا۔ اور ابو زرعہ نے کہا ہے: جب بقیہ ثقہ راویوں سے حدیث بیان کرے تو وہ ثقہ ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: **فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے! انہوں نے اپنے یقین کی مقدار پر پانی پیا اور کفار نے شدت پیاس کی بیماری والے کی طرح پیا اور گنہگاروں اور نافرمانوں نے اس سے تھوڑا کم پیا اور قوم سے چھہتر ہزار واپس لوٹ آئے اور بعض مومنین باقی رہ گئے انہوں نے کچھ نہ پیا اور بعض نے ایک چلو پانی لیا، پس جنہوں نے پانی پیا وہ سیراب نہ ہوئے بلکہ ان کی پیاس مسلسل باقی رہی اور جنہوں نے پانی چھوڑ دیا ان کی حالت اچھی رہی اور وہ ان کی نسبت زیادہ مضبوط رہے جنہوں نے چلو لے لیا تھا۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: **فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ** اس میں ہا ضمیر نہر کی طرف لوٹ رہی ہے اور **هُوَ** تاکید کے لئے ہے۔ **وَ الَّذِيْنَ** یہ محل رفع میں ہے اور **جَاوَزَهٗ** میں ضمیر فعل پر اس کا عطف ہے۔ کہا جاتا ہے: جاوزت المكان مجاوزة و جوازا۔ (میں نے مکان سے تجاوز کر لیا) اور کلام میں مجاز وہی ہے جو استعمال میں جائز ہو اور نافذ ہو اور اپنی علت پر برقرار ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اس (طالوت) کے ساتھ نہر کو چار ہزار آدمیوں نے عبور کیا، ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے پانی پیا۔ پس جب انہوں نے جالوت اور اس کے لشکروں کی طرف دیکھا، ان کی تعداد ایک لاکھ تھی، تمام کے تمام ہتھیاروں کی شکایت کرنے لگے اور ان میں سے تین ہزار چھ سو اسی سے کچھ زائد واپس لوٹ گئے (2)۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، جلد 1، صفحہ 253۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب الشرب والكرع، حدیث نمبر 3423، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 336، دار الکتب العلمیہ

پس اس قول کی بنا پر کہا کہ وہ مومنین جنہیں اس وقت دوبارہ اٹھائے جانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا ایقان حاصل تھا ان کی تعداد اہل بدر کے برابر تھی۔ کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ اکثر مفسرین نے اس پر کہا ہے کہ اس کے ساتھ نہر کو عبور انہوں نے کیا جنہوں نے بالکل پانی نہ پیا اور بعض نے کہا: دشمن کی اتنی کثرت کے باوجود ہم ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ تو ان میں سے جو صاحب عزم و ہمت تھے۔ انہوں نے کہا: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ (اللہ کے اذن سے بارہا چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہم گفتگو کرتے رہتے تھے کہ اہل بدر کی تعداد ان اصحاب طالوت کی تعداد کی مثل تھی جنہوں نے اس کے ساتھ نہر کو عبور کیا وہ تین سو دس سے کچھ زائد آدمی تھے اور ایک روایت میں ہے: تین سو تیرہ آدمی اور اس کے ساتھ صرف مومنین نے اسے عبور کیا تھا (1)۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ یہاں ظن بمعنی یقین ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ بمعنی شک ہو یقین نہ ہو۔ یعنی ان لوگوں نے کہا جو وہم رکھتے تھے کہ انہیں طالوت کے ساتھ قتل کر دیا جائے گا اور وہ شہداء بن کر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کریں گے۔ پس قتل میں شک پڑ گیا۔

قولہ تعالیٰ: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ۔ الفئة کا معنی ہے لوگوں کی ایک جماعت اور ان کا ایک گروہ۔ یہ فاوثُ رأسه بالسیف اور فأیتُه سے ماخوذ ہے یعنی میں نے اس کا سر تلوار سے کاٹ دیا۔ اور ان (صحابہ کرام) رضی اللہ عنہم کے قول میں ہے: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ الآیہ۔ یہ قتال پر انگیخت دلانا ہے اور صبر کا شعور بیدار کرنا ہے اور ان کی اقتدا اور پیروی کرنا ہے جنہوں نے اپنے رب کی تصدیق کی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح کرنا ہم پر بھی واجب ہے لیکن اعمال قبیحہ اور نیات فاسدہ اس سے مانع ہیں۔ یہاں تک کہ ہم میں سے بڑی تعداد دشمن کی قلیل تعداد کے سامنے شکست خوردہ ہو جاتی ہے جیسا کہ ہم نے کئی بار اس کا مشاہدہ کیا ہے اور ایسا ہمارے اپنے اعمال کے سبب ہے۔

اور بخاری میں ہے: حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلاشبہ تم اپنے اعمال کے ساتھ جنگ لڑتے ہو۔ اور اس میں مسند روایت بھی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے ضعفاء کے سبب تمہیں رزق دیا جاتا ہے اور تمہاری مدد کی جاتی ہے (2)۔'' پس اعمال فاسد ہو چکے ہیں، ضعفاء مہمل ہو گئے ہیں، صبر قلیل ہے، اعتماد ضعیف اور کمزور ہو چکا ہے اور تقویٰ زائل ہو گیا ہے۔

جبکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ (ال عمران: 200) (صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلہ میں) اور کمربستہ رہو (خدمت دین کے لئے) ہمیشہ ہی اللہ سے ڈرتے رہو)۔ اور مزید فرمایا: وَ عَلَى اللّٰهِ

1۔ صحیح بخاری، باب عدة اصحاب بدر، حدیث نمبر 3663، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 405، وزارت تعلیم

فَتَوَكَّلُوْٓا (اور اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرو) اور مزید فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ (النحل) (یقینا اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو (اس سے) ڈرتے ہیں اور جو نیک کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔) مزید فرمایا: وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (الحج: 40) (اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا) مزید فرمایا: اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ (الانفال) (جب جنگ آزما ہو کسی لشکر سے تو ثابت قدم رہو اور ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کثرت سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ) پس یہی نصرت کے اسباب ہیں اور اس کی شرائط ہیں اور یہ ہمارے پاس معدوم ہیں، ہم میں موجود نہیں ہے۔ پس اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اس پر جو مصیبت اور آفت ہم پر آئے اور ہم میں اترے بلکہ اسلام میں سے سوائے اس کے ذکر کے کوئی شے باقی نہیں رہی اور نہ ہی دین میں سے سوائے اس کی رسم کے کچھ باقی رہا ہے اور یہ فساد کے ظہور، رعونت و سرکشی کی کثرت اور ہدایت و راہنمائی کی قلت کے سبب ہے۔ یہاں تک کہ دشمن شرق و غرب اور بحر و بر میں غالب آچکا ہے، فتنے عام ہو گئے ہیں، آزمائشیں بڑھ گئی ہیں اور کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر وہی جو رحم فرمانے والا ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾

''اور جب سامنے آگئے جالوت اور اس کی فوجوں کے، تو بارگاہ الٰہی میں عرض کرنے لگے: اے ہمارے رب! اتار ہم پر صبر اور جمائے رکھ ہمارے قدموں کو اور فتح دے ہمیں قوم کفار پر۔''

بَرَزُوْا جب وہ براز میں آگئے اور براز سے مراد وسیع زمین میں سے کشادہ اور کھلا میدان ہے۔ جالوت عمالقہ کا امیر تھا اور ان کا بادشاہ تھا اس کا سایہ ایک میل تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ (قوم) بربر اس کی نسل سے ہے اور اس کے بارے میں روایت ہے کہ اس کی فوج میں تین لاکھ گھڑسوار تھے اور عکرمہ نے کہا ہے: نوے ہزار تھے اور جب مومنین نے اپنے دشمن کی کثرت کو دیکھا تو انہوں نے اپنے رب کی بارگاہ میں عجز و انکساری کی اور یہ رب العالمین کے اس قول کی طرح ہے: وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا الآیہ (العمران) (اور کتنے ہی نبی گزرے ہیں کہ جہاد کیا ان کے ہمراہ بہت سے اللہ والوں نے......اور نہیں تھی ان کی گفتگو بغیر اس کے کہ کہا انہوں نے: اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے گناہ)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن سے آمنا سامنا ہوتا تو آپ جنگ میں اس طرح دعا کرتے تھے: اللّٰھم بك أصول و أجول،(1) اے اللہ! میں تیری مدد و نصرت کے ساتھ ہی حملہ کرتا ہوں اور پلٹ کر آتا ہوں۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب دشمن کے سامنے ہوتے تو اس طرح کہتے: اللھم انی اعوذ بك من شرورھم و أجعلك فی نحورھم(2) اے اللہ! میں ان کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور تجھے ہی ان کے مقابلے میں دیکھتا ہوں۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن دعا مانگی حتیٰ کہ آپ کے کندھوں سے آپ کی چادر مبارک گر گئی اور آپ اللہ تعالیٰ سے اپنا وعدہ پورا کرنے کی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 354، وزارت تعلیم
2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 215

التجا کرتے رہے۔ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

"پس انہوں نے شکست دی جالوت کے لشکر کو اللہ کے اذن سے۔ اور قتل کر دیا داؤد نے جالوت کو اور عطا فرمائی داود کو اللہ نے حکومت اور دانائی اور سکھا دیا اس کو جو چاہا اور اگر نہ بچاؤ کرتا اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کا بعض کے ذریعے تو برباد ہو جاتی زمین لیکن اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرمانے والا ہے سارے جہانوں پر۔"

قولہ تعالیٰ: فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر مدد و نصرت نازل فرمائی۔ فَهَزَمُوْهُمْ تو انہوں نے انہیں شکست دی (ان کی کمر توڑ دی) اور الهزم کا معنی ہے توڑنا۔ اور اسی سے ہے سقاء مُتَهَزِّم یعنی ایسی مشک جو خشکی کے سبب ٹوٹ جائے اور اسی سے وہ قول ہے جو زمزم کے بارے میں کہا گیا ہے یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا گڑھا ہے (هَزْمَةُ جبريل) یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام نے زمین کو اپنے پاؤں سے نیچے دبایا، گڑھا بن گیا اور پانی نکل آیا۔ اور الهزم سے مراد وہ خشک لکڑی بھی ہے جو ٹوٹ جاتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ اس لئے کہ طالوت بادشاہ تھا اور جالوت کے ساتھ جنگ لڑنے کے لئے یہ اپنی قوم میں سے چنا گیا تھا۔ یہ قد و قامت کے اعتبار سے چھوٹا، زیادہ تر بیمار رہنے والا، زرد رنگ کا تھا اس کی (آنکھیں چھوٹی اور نیلی تھیں۔) اور جالوت لوگوں میں سے انتہائی مضبوط اور بہت زیادہ قوی تھا۔ اور یہ اکیلا لشکروں کو شکست دے سکتا تھا اور جالوت کو قتل کر دیا گیا، حالانکہ وہ عمالقہ کا امیر اور سردار تھا اور (قتل کرنے والے) داؤد ابن ایشی تھے۔ یہ ایشی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور کہا جاتا ہے: وہ داؤد بن زکریا بن رشوی تھے، یہ یہوذا ابن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کی اولاد میں سے تھے اور بیت المقدس کے رہنے والے تھے۔ ان کو نبوت اور بادشاہت دونوں چیزیں اکٹھی عطا فرما دی گئیں۔ اس سے پہلے یہ چرواہے تھے اور یہ اپنے بھائیوں میں سے چھوٹے تھے اور ریوڑ چراتے تھے اور ان کے سات بھائی اصحاب طالوت میں سے تھے۔ پس جب جنگ شروع ہوئی تو انہوں نے اپنے دل میں کہا: میں ضرور بہ ضرور اس جنگ کو دیکھنے کے لئے جاؤں گا، جب اس راستے پر چلے ایک پتھر کے پاس سے گزرے تو اس نے آپ کو آواز دی اے داؤد! مجھے اٹھا لے، اور میرے ساتھ تو جالوت کو قتل کرے گا، پھر ایک دوسرے پتھر نے انہیں آواز دی، پھر ایک اور نے آواز دی، پس آپ نے انہیں اٹھا لیا اور انہیں اپنے توبرے میں رکھ لیا اور چل پڑے۔ پس جالوت (لشکر کی صفوں سے) باہر نکلا اور دعوت مبارزت دینے لگا تو لوگوں نے اس کے مقابلے کی جرأت نہ کی اور کمزوری دکھائی یہاں تک کہ طالوت نے کہا: جو اس کا مقابلہ کرے گا اور اسے قتل کر دے گا میں اس کا نکاح اپنی بیٹی سے کروں گا اور اپنے مال میں اسے حکم بناؤں گا، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام

آئے اور کہا: میں اس کے ساتھ مقابلہ کروں گا اور اسے قتل کر دوں گا (1)، لیکن طالوت نے جب ان کی صغرسنی اور چھوٹے قد کو دیکھا تو انہیں کمزور قرار دے کر واپس لوٹا دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نیلگوں چھوٹے قد کے تھے۔ پھر طالوت نے دوبارہ اور سہ بارہ اعلان کیا اور پھر بھی حضرت داؤد علیہ السلام ہی باہر نکلے۔ تب طالوت نے ان سے کہا: کیا تو اپنی ذات میں کسی شے سے تجربہ رکھتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں: اس نے پوچھا: وہ کیسے؟ انہوں نے فرمایا: ایک دفعہ ایک بھیڑیا میرے ریوڑ میں داخل ہو گیا تو میں نے اسے مارا، پھر اس کے سر کو پکڑ لیا اور میں نے اسے اس کے جسم سے الگ کر دیا۔ طالوت نے کہا: بھیڑیا تو کمزور ہے، کیا اس کے علاوہ بھی تو کوئی تجربہ رکھتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ ایک دفعہ ایک شیر میرے ریوڑ میں آ گیا تو میں نے اسے مارا، پھر میں نے اسے جبڑوں سے پکڑ لیا اور میں نے ان دونوں کو چیر ڈالا۔ کیا تو اسے شیر سے بھی زیادہ طاقتور جانتا ہے؟ طالوت نے کہا: نہیں۔ طالوت کے پاس ایک زرہ تھی اور وہ اسی پر پوری آسکتی تھی جو جالوت کو قتل کرے گا۔ پس اس نے اس کے بارے آپ کو آگاہ کیا اور وہ زرہ آپ پر ڈال دی تو وہ بالکل برابر ہو گئی۔ پھر طالوت نے کہا: تو میرے گھوڑے پر سوار ہو جا، میرا ہتھیار پکڑ لے (اور اس کے مقابلے میں جا)۔ چنانچہ آپ نے ایسا کر لیا، لیکن جب تھوڑا سا چلے تو واپس لوٹ آئے اور لوگوں نے کہا: یہ نوجوان تو بزدل ہو گیا ہے۔ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے میرے سبب قتل نہ کیا اور اس کے خلاف اس نے میری مدد نہ فرمائی تو پھر یہ گھوڑا اور یہ ہتھیار میرے لئے نفع بخش نہیں ہیں۔ البتہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میں اس سے اپنی عادت کے مطابق ہی لڑوں۔

راوی کا بیان ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام مِقلاع (پتھر پھینکنے کا گوپھیا، فلاخن) کے ساتھ پتھر پھینکنے کے لوگوں کی نسبت زیادہ ماہر تھے۔ پس آپ (گھوڑے سے) اترے اور اپنے توبرے کو اٹھایا اور اسے لٹکا لیا اور اپنا گوپھیا اٹھایا اور جالوت کی طرف چل نکلے۔ وہ مکمل اپنے ہتھیار پہنے ہوئے تھا، اس کے سر پر خود تھا اس میں تین سو رطل تھے، جیسا کہ الماوردی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ تو جالوت نے انہیں کہا: اے نوجوان! تو میری طرف نکلا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: اس طرح جیسا کہ تو کتے کی طرف نکلا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں، بلکہ تو اس سے بھی آسان ہے۔ فرمایا: میں یقیناً آج تیرا گوشت پرندوں اور درندوں کو کھلاؤں گا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوئے اور جالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حقیر جانتے ہوئے انہیں اپنے ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کی، تو حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا ہاتھ پتھر کی طرف بڑھایا۔ اور روایت ہے کہ وہ پتھر جڑ چکے تھے اور وہ ایک پتھر بن گیا تھا۔ سو آپ نے اسے پکڑا اور اپنے گوپھیا میں رکھا اور اللہ تعالیٰ کا نام لیا اور اسے گھمایا اور پھینک دیا، پس وہ جالوت کے سر میں جا لگا اور اسے قتل کر دیا اور اس کے سر کو کاٹ کر اپنے توبرے میں رکھ لیا اور لوگوں میں مل گئے۔ اور طالوت کی فوج نے حملہ کر دیا اور یہی ہزیمت اور شکست تھی (2)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پتھر خود سے ناک کی جگہ پر جا لگا۔ اور بعض نے کہا ہے: اسے آنکھ پر جا کر لگا اور اس کی گدی کی جانب سے نکل گیا اور اس کے لشکر کی ایک جماعت کو جا کر لگا اور اس نے انہیں قتل کر دیا۔ یہ قول بھی ہے کہ پتھر ٹوٹ کر بکھر گیا یہاں تک کہ لشکر کے ہر فرد کو اس کا کچھ حصہ جا کر لگا اور یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 337، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً

(سنگریزوں کی) اس مشت کی طرح تھا جو حضور نبی مکرم ﷺ نے غزوۂ حنین کے دن بنی ہوازن پر پھینکی۔ واللہ اعلم

ان آیات کے قصص میں لوگوں نے بہت زیادہ بیان کیا ہے اور میں نے تیرے لئے ان میں سے خاص مقصود کو ہی ذکر کیا ہے واللہ المحمود۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: طالوت کے اس قول کے بارے میں ہے "جو اس کا مقابلہ کرے گا اور اسے قتل کرے گا تو میں اس کی شادی اپنی بیٹی سے کروں گا اور اسے اپنے مال میں حکم بناؤں گا" یہ مفہوم ہماری شریعت میں بھی ثابت اور موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ امام وقت کہے: جو فلاں کا سر لائے گا تو اس کے لئے اتنا ہوگا، یا جو فلاں کو قیدی بنا کر لائے تو اس کے لئے اتنا انعام ہو گا۔ اس کا بیان سورۃ الانفال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ مبارزت امام کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ امام احمد اور اسحاق وغیرہما اس کے بارے کہتے ہیں اور اس میں امام اوزاعی سے اختلاف منقول ہے، سو ان سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: کوئی بھی اپنے امام کی اجازت کے بغیر حملہ نہیں کر سکتا اور یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے کہا: کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر امام مبارزت سے روک دے تو پھر اس کی اجازت کے بغیر کوئی مبارز طلب نہ کرے گا۔

اور ایک گروہ نے مقابلے کو مباح قرار دیا ہے اور انہوں نے امام کی اجازت ہونے یا نہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔

امام مالک سے اس آدمی کے بارے پوچھا گیا جو دو صفوں کے درمیان کہتا ہے: کون مقابلہ کرے گا؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کا انحصار اس کی نیت پر ہے اگر اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ رکھتا ہے تو میں امید رکھتا ہوں کہ اس کے لئے کوئی حرج نہ ہوگا۔ زمانہ ماضی میں ایسا کیا جاتا رہا ہے اور امام شافعی نے کہا ہے: مبارزت طلب کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: امام کی اجازت کے ساتھ مبارزت طلب کرنا اچھا ہے اور اس پر بھی کوئی حرج نہیں ہے جس نے امام کی اجازت کے بغیر مبارز طلب کیا یہ مکروہ نہیں ہے کیونکہ اس کے بارے میں کوئی مانع خبر نہیں جانتا۔

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ، سدی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو طالوت کا ملک (بادشاہی) اور شمعون کی نبوت عطا فرمائی۔ اور وہ جو اللہ تعالیٰ نے انہیں علم عطا فرمایا وہ زرہیں بنانے اور پرندوں کی گفتگو سمجھنے اور دیگر ان علوم کی انواع میں سے کئی عطا فرمائے جو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم ﷺ کو عطا فرمائے ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک زنجیر عطا فرمایا جو کہکشاں اور فلک سے ملا ہوا تھا اور اس کا ایک سرا حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت گاہ کے پاس تھا اور ہوا میں جو واقعہ بھی پیش آتا زنجیر بجنے لگتا اور اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو اس واقعہ کا علم ہو جاتا جو وقوع پذیر ہوتا اور کوئی آفت زدہ اسے چھو لیتا تو وہ اس سے نجات پا جاتا اور یہ آپ کی قوم کے دین میں داخل ہونے کی علامت تھی کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں کے ساتھ مس کرتے پھر اپنی ہتھیلیوں کو اپنے سینوں پر مل لیتے اور وہ حضرت داؤد علیہ السلام

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 337، دار الکتب العلمیہ

کے بعد اس کے پاس فیصلے کرتے تھے یہاں تک کہ اسے اٹھا لیا گیا۔

قولہ تعالیٰ: مِمَّا يَشَآءُ یہ بمعنی مما شاء ہے اور کبھی ماضی کی جگہ مستقبل کا صیغہ رکھ دیا جاتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ اسی طرح تمام کی قراءت ہے سوائے حضرت نافع کے کیونکہ انہوں نے دِفَاعُ پڑھا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعل کا مصدر ہو جیسا کہا جاتا ہے: حسبت الشئ حِسَاباً۔ آب اِیَاباً۔ لقیتہ لقاء، اور اسی کی مثل کتبہ کتابا ہے اور اسی سے کِتَابَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (النساء) بھی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا ہے۔ پس دفاع اور دَفْع دونوں دَفَعَ کے مصدر ہوں گے۔ یہی سیبویہ کا مذہب ہے۔

اور ابو حاتم نے کہا ہے: دَافَعَ اور دَفَعَ دونوں کا معنی ایک ہے، جیسا طارقت النعل اور طارقت ہے یعنی میں نے جوتے کو ایک دوسرے پر سیا۔ الخصف کا معنی الخرز، سینا ہے۔

ابو عبیدہ نے جمہور کی قراءت کو اختیار کیا ہے (یعنی) وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ اور انہوں نے دِفَاعُ پڑھنے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی بھی غالب نہیں آ سکتا۔ مکی نے کہا ہے: یہ وہم ہے باب مفاعلہ نے اس میں وہم پیدا کیا ہے اور ایسا نہیں ہے۔ اور لفظ اللّٰهِ فعل کے سبب محل رفع میں ہے یعنی لولا ان یدفع اللہُ۔ اور دفاع سیبویہ کے نزدیک مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ النَّاسَ مفعول ہے اور بَعْضَهُمْ، النَّاسَ سے بدل ہے اور بِبَعْضٍ سیبویہ کے نزدیک مفعول ثانی کے محل میں ہے اور یہ ان کے نزدیک تیرے اس قول کی مثل ہے: ذھبت بزید، تو اس میں زید مفعول کے محل میں ہے۔ اسے جان لو۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا ان لوگوں کے بارے میں اختلاف ہے جنہیں فساد سے بچایا گیا ہے وہ کون ہیں؟

تو کہا گیا ہے: وہ ابدال ہیں اور وہ چالیس آدمی ہیں، ان میں سے جب بھی کوئی فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرے کو اس کا بدل بنا دیتا ہے۔ اور جب قیامت قریب ہو گی تو وہ تمام فوت ہو جائیں گے ان میں سے بائیس شام میں ہیں اور اٹھارہ عراق میں ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ان الابدال یکونون بالشام وھم اربعون رجلا کلما مات منھم رجل ابدل اللہ مکانہ رجلا یسقی بھم الغیث و ینصر بھم علی الأعداء و یصرف بھم عن اھل الأرض البلاء (1) (بلاشبہ ابدال شام میں ہوں گے اور وہ چالیس آدمی ہیں جب بھی ان میں سے کوئی آدمی فوت ہو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ اور آدمی مقرر فرما دے گا، ان کے سبب اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے، ان کے سبب دشمنوں کے خلاف مدد فرماتا ہے اور ان کے سبب اہل زمین سے بلائیں اور مصیبتیں دور فرماتا ہے۔) حکیم ترمذی نے اسے نوادر الاصول میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے: انہوں نے کہا: بلاشبہ انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات زمین کے اوتار ہیں اور جب نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، ذکر الیمن والشام، جلد 1، صفحہ 582

امت سے ایک جماعت کو ان کا بدل بنا دیا۔ انہیں ابدال کہا جاتا ہے: اور کثرت صوم وصلوٰۃ کی وجہ سے ان لوگوں کو فضیلت نہیں دی گئی، بلکہ حسن خلق، صدق وورع، حسن نیت، تمام مسلمانوں کے لئے دلوں کا صاف اور سلامت ہونا اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے کے لئے انہیں صبر، حلم، دانشمندی اور بغیر کسی ذلت کے تواضع وانکساری اختیار کرنے کی نصیحت کرنے کے سبب انہیں فضیلت دی گئی۔ اور وہ انبیاء علیہم السلام کے خلفاء ہیں، وہ ایسی قوم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لئے چن لیا ہے اور انہیں اپنی ذات کے بارے میں اپنے علم کے ساتھ خالص اور مختص کر لیا ہے اور وہ چالیس صدیق ہیں، ان میں سے تیس آدمی حضرت ابراہیم خلیل الرحمن کے یقین کی مثل پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے سبب اہل زمین سے مصائب اور لوگوں سے آفات اور آزمائشوں کو دور فرماتا ہے اور ان کے سبب اہل زمین پر بارش برسائی جاتی ہے اور انہیں رزق دیا جاتا ہے اور ان میں سے کوئی آدمی فوت نہیں ہوتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ایسا آدمی پیدا فرما دے جو اس کا خلیفہ اور نائب ہوگا (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی فوجوں کے سبب دشمنوں کو دور نہ کرتا تو مشرکین غالب آجاتے اور وہ مومنین کو قتل کرتے اور شہروں اور مساجد کو برباد کر دیتے۔

اور حضرت سفیان ثوری نے کہا ہے: مراد وہ گواہی اور شہادت دینے والے لوگ ہیں جن کے سبب حقوق حاصل کیے جاتے ہیں اور مکی نے بیان کیا ہے کہ اکثر مفسرین نے یہ معنی بیان کیا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نماز پڑھنے والوں کے سبب انہیں نہ بچائے جو نماز نہیں پڑھتے اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کے سبب ان کی حفاظت نہ کرے جو تقویٰ اختیار نہیں کرتے تو وہ لوگوں کو ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دے (2)۔

اسی طرح نحاس اور ثعلبی نے بھی ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے کہا ہے اور تمام مفسرین نے کہا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نیکوکار مومنین کو فجار اور کفار سے نہ بچائے تو زمین برباد اور فاسد ہو جائے۔ اور ایک حدیث ذکر کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کے نماز پڑھنے والوں کے سبب نماز نہ پڑھنے والوں سے اور تزکیہ اختیار کرنے والوں کے سبب تزکیہ اختیار نہ کرنے والوں سے اور روزے رکھنے والوں کے سبب روزے نہ رکھنے والوں سے اور حج کرنے والوں کے سبب حج نہ کرنے والوں سے اور جہاد کرنے والوں کے سبب جہاد نہ کرنے والوں سے عذاب دور فرماتا رہے گا اور اگر وہ ان اعمال کے ترک کرنے پر جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ انہیں آنکھ جھپکنے کی بھی مہلت نہ دے گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: ان لله ملائكة تنادي كل يوم لولا عباد رُكَّعٌ وأطفال رُضَّع وبهائم رُتَّع لصبّ عليكم العذاب صبا (بے شک اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جو ہر روز ندا دیتے ہیں: اگر عبادت گزار بندے نہ ہوتے، شیرخوار بچے نہ ہوتے اور چرنے والے جانور نہ ہوتے تو تم پر عذاب موسلا دھار برسا دیا جاتا) (3)۔ اسے

1۔ نوادر الاصول فی بیان عدد الابدال، جلد 1، صفحہ 69، دار صادر بیروت
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ
3۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 155، حدیث نمبر 9820، دار الکتب العلمیۃ

ابوبکر الخطیب نے اسی معنی میں حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

منصور نے ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی سند سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تم میں خشوع کرنے والے آدمی، چرنے والے جانور اور شیر خوار بچے نہ ہوں تو مومنین پر موسلا دھار عذاب برسادیا جائے (1)۔

بعض نے یہ معنی لیا اور کہا:

لو لا عبادٌ لِلالٰہِ رُکَّعُ　　وَ صِبیَۃٌ من الیتامی رُضَّعُ

اگر اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے نہ ہوں اور شیر خوار یتیم بچے نہ ہوں۔

وَ مُھمَلاتٌ فی الفلاۃ رُتَّعُ　　صُبَّ علیکم العذابُ الأَوجَعُ

اور جنگل میں چھوڑے گئے چرنے والے جانور نہ ہوں تو تم پر دردناک عذاب موسلا دھار برسادیا جائے۔

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ آدمی کے اپنے بیٹے اور پوتے کی اصلاح کرنے کے سبب اس کی اصلاح فرما دیتا ہے اس کے گھر والوں کی اور اس کے اردگرد کے گھروں کی (اصلاح فرما دیتا ہے) اور وہ مسلسل اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہتے ہیں جب تک وہ ان میں ہو'' (2)

حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ مومن کو کافر کے سبب آزماتا ہے اور کافر کو مومن کے سبب عافیت عطا کرتا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ لیدفع بالمؤمن الصالح عن مائۃ من اھل بیتہ و جیرانہ البلاء بے شک اللہ تعالیٰ نیک صالح مومن کے سبب اس کے گھر والوں اور پڑوسیوں میں سے سو افراد سے مصیبت اور آفت کو دور فرماتا ہے (3)۔ پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھی: وَ لَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعۡضَھُمۡ بِبَعۡضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الۡاَرۡضُ۔

اور کہا گیا ہے: یہ دفاع اور بچاؤ اس شریعت کے سبب ہے جو انبیا و رسل علیہم السلام کی زبانوں پر شریعتوں میں سے جاری ہوئیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ ایک دوسرے سے زبردستی اشیاء چھینتے اور ایک دوسرے کا سامان لوٹتے اور ہلاک ہو جاتے۔ یہ حسین قول ہے کیونکہ روکنے اور دفاع وغیرہ میں عموم ہے۔ پس اس میں غور کر لو۔ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا مومنین سے کفار کے شر کو دور کرنا یہ اس کا فضل اور خاص انعام ہے۔

تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝۲۵۲

''یہ آیتیں ہیں اللہ کی ہم پڑھتے ہیں انہیں آپ پر (اے حبیب!) ٹھیک ٹھیک اور یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔''

تِلۡكَ مبتدا ہے۔ اور اٰيٰتُ اللّٰهِ اس کی خبر ہے اور اگر چاہے تو بدل بنالے اور خبر نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَقِّ بنالے۔ وَ اِنَّكَ

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، صلاۃ الاستسقاء، جلد 3، صفحہ 345، دار الفکر　　2۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 755

3۔ تفسیر معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 355، دار الفکر بیروت

لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ یہ ان کی خبر ہے یعنی وانک لمرسل۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہ فرمایا ہے کہ یہ آیات وہ ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور انہیں نبی مرسل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

''یہ سب رسول، ہم نے فضیلت دی ہے (ان میں سے) بعض کو بعض پر ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ نے اور بلند کیے ان میں سے بعض کے درجے اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں اور مدد فرمائی ہم نے ان کی پاکیزہ روح سے اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) وہ لوگ جو ان (رسولوں) کے پیچھے آئے بعد اس کے کہ آ گئیں ان کے پاس کھلی نشانیاں لیکن انہوں نے اختلاف کیا ان میں سے کوئی ایمان پر (ثابت) رہا اور ان میں سے کوئی کافر ہو گیا اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) لیکن اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ الرُّسُلُ یہاں تِلْكَ فرمایا ہے۔ ذلک نہیں فرمایا تو یہ لفظ جمع کی تانیث کی رعایت کرتے ہوئے کہا ہے۔ اور یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے اور الرُّسُلُ اس کی صفت ہے اور مبتدا کی خبر مابعد جملہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرسل عطف بیان ہے اور فَضَّلْنَا خبر ہے۔ یہ مشکل آیت ہے اور احادیث ثابت ہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا تخیّروا ما بین الانبیاء (1) (تم انبیاء علیہم السلام کے درمیان کسی کو دوسرے پر ترجیح نہ دو) اور مزید فرمایا: لا تفضلوا بین انبیاء اللہ (2) (تم اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے درمیان کسی کو دوسرے پر فضیلت نہ دو) انہیں ائمہ ثقات نے روایت کیا ہے۔ یعنی تم یہ نہ کہو، فلاں فلاں سے بہتر ہے اور نہ یہ کہو: فلاں فلاں سے افضل ہے۔ کہا جاتا ہے: خیّر فلان بین فلان و فلان (فلاں نے فلاں فلاں کے درمیان ایک کو بہتر قرار دیا) اور فضیلت دی جب اس نے یہ کہا تو اس میں (فضّل) مشدد ہو گا۔

اس معنی کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس ایک قوم نے کہا ہے: یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف تفضیل کے بارے وحی نازل ہونے سے پہلے کا ہے اور آپ کے یہ جاننے سے پہلے کا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اولاد آدم کے سردار ہیں۔ اور بلاشبہ قرآن کریم فضیلت دینے سے روکنے والے حکم کے لئے ناسخ ہے۔

اور ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد أنا سید ولد آدم (3) (میں اولاد آدم کا سردار ہوں) سے مراد قیامت کا دن ہے (یعنی قیامت کے دن آپ اولاد آدم کے سردار ہوں گے) کیونکہ اس دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شفاعت فرمائیں

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب بدء الخلق و ذکر الانبیاء، جلد 1، صفحہ 507، 2۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 485، وزارت تعلیم
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 329، و۔ت۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 4343، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے اور لواء الحمد اور حوض کوثر آپ ہی کے لئے ہوگا۔

اور آپ ﷺ نے تواضع اور انکساری کے طور پر یہ ارشاد فرمایا: لا تخیرونی علی موسی (1) (تم مجھے موسیٰ علیہ السلام سے بہتر اور برتر قرار نہ دو) جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس قول میں تواضع مراد ہے: وُلّیتکم و لست بخیرکم (مجھے تمہارا والی بنایا گیا ہے حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں) اور اسی طرح آپ ﷺ کے اس ارشاد کا معنی ہے لا یقل احد أنا خیر من یونس بن متی (2) (کوئی یہ نہ کہے کہ میں حضرت یونس بن متی علیہ السلام سے بہتر ہوں) یعنی یہ تواضع اور انکساری کی بنا پر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ (قلم: 48) (اور تم مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ) اس پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان سے افضل ہیں۔ کیونکہ رب العالمین فرما رہا ہے: ولا تکن مثلہ (اور تم ان کی مثل نہ ہو جاؤ) اور یہ اس پر دلیل ہے کہ آپ کا ارشاد لا تفضلونی علیه (3) (تم مجھے ان پر فضیلت نہ دو) یہ بطریق تواضع ہے۔ اور یہ معنی مراد لینا بھی جائز ہے کہ تم مجھے ان پر عمل میں فضیلت نہ دو، شاید وہ عملاً مجھ سے افضل ہوں اور نہ ہی آزمائش اور امتحان میں مجھے فضیلت دو کیونکہ وہ آزمائش کے اعتبار سے مجھ سے اعظم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کو قیامت کے دن تمام انبیاء علیہم السلام پر سرداری اور فضیلت عطا فرمائی ہے وہ آپ کے عمل کے سبب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے آپ کو فضیلت دینے کے سبب ہے اور اپنے لئے آپ کو خاص کرنے کی وجہ سے ہے۔ اس تاویل کو مہلب نے اختیار کیا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: اس میں گہری غور و خوض سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ گہری غور و خوض اس میں جھگڑے تک پہنچانے کا ذریعہ ہے اور وہ یہاں تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں وہ کچھ کہے جو اسے نہیں کہنا چاہیے اور مقابلے کے وقت ان کا احترام کم ہو جاتا ہے۔

ہمارے شیخ نے کہا ہے: پس یہ نہیں کہا جائے گا: نبی مکرم ﷺ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں اور نہ یہ کہا جائے گا: وہ فلاں سے افضل ہیں اور نہ ہی یہ کہا جائے گا کہ وہ بہتر ہیں۔ جیسا کہ نہی کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس سے مفضول میں نقص اور عیب کا وہم ہو جاتا ہے، کیونکہ نہی لفظ کے اطلاق سے روکنے کا تقاضا کرتی ہے نہ کہ اس معنی کا اعتقاد رکھنے سے روکنے کا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کر دیا ہے کہ رسل علیہم السلام کو ایک دوسرے پر فضیلت دی گئی ہے۔ پس آپ یہ نہیں کہیں گے: ہمارے نبی ﷺ انبیاء علیہم السلام سے بہتر ہیں اور نہ یہ کہ آپ فلاں نبی علیہ السلام سے بہتر ہیں، اس سے اجتناب کرتے ہوئے جس سے منع کر دیا گیا ہے اور اس کی اقتدا کرتے ہوئے اور اس اعتقاد کے مطابق عمل کرتے ہوئے جس تفضیل کو قرآن متضمن ہے اور حقائق امور کو اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان اقوال میں سے احسن قول اس کا ہے جس نے یہ کہا ہے: بلاشبہ فضیلت دینے سے روکنا خالصۃً

1۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 507

2۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 481، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب الخصومات، حدیث نمبر 2235، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 507

اس نبوت کی جہت سے ہے جو ایک خصلت ہے جس میں کسی کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں، بلکہ یہ فضیلت احوال وخصوصیات، کرامات والطاف میں زیادتی اور متفرق معجزات کی بنا پر ہے اور رہی نبوت فی ذاتہا تو اس میں کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں، بلکہ یہ تفاضل دوسرے امور کے سبب ثابت ہوتا ہے جو اس پر مستزاد ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں سے بعض رسل اولوالعزم ہیں اور ان میں سے وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خلیل بنایا ہے اور وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے شرف ہمکلامی عطا فرمایا اور ان میں سے بعض کے درجات بلند کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل) (اور تحقیق ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی۔) اور مزید فرمایا: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (یہ سب رسول ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اچھا قول ہے، کیونکہ اس نے بغیر نسخ کے آیات اور احادیث کے درمیان تطبیق کر دی ہے اور بعض کو بعض پر فضیلت دینے کا قول ان فضائل کی بنا پر ہے جو انہیں عطا فرمائے گئے اور ان وسائل کی وجہ سے ہے جو انہیں دیے گئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام پر اور اہل آسمان پر فضیلت دی ہے تو صحابہ نے پوچھا: اے ابن عباس! رضی اللہ عنہما کیونکر اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان والوں پر فضیلت دی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء) (اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو اسے ہم سزا دیں گے جہنم کی۔ یونہی ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو۔)

اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے فرمایا ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (الفتح) (یقیناً ہم نے آپ کو شاندار فتح عطا فرمائی ہے تاکہ دور فرما دے آپ کے لئے اللہ تعالیٰ جو الزام آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے اور جو ہجرت کے بعد لگائے گئے۔) پھر انہوں نے کہا: انبیاء علیہم السلام پر آپ کی فضیلت کیسی ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم: 4) (اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ وہ کھول کر بیان کرے ان کے لئے (احکام الٰہی کو) اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (السبا: 28) (اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام انسانوں کی طرف) پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن وانس کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ اسے ابو محمد الدارمی نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: خیر بنی آدم نوح و ابراهیم و موسیٰ و محمد صلی اللہ علیہ وسلم (1) کہ بنی آدم میں سے افضل اور بہتر حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہی رسولوں میں سے اولوالعزم ہیں۔ پس یہ تعیین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے نص ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ جنہیں رسالت عطا فرمائی گئی ہے وہ ان سے افضل ہیں جنہیں رسالت نہیں دی گئی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ

تو بلاشبہ جنہیں رسالت دی گئی ہے انہیں رسالت کے اعتبار سے دوسروں پر فضیلت دی گئی ہے اور وہ نبوت میں برابر ہیں، یہاں تک کہ رسولوں کو بھی اپنی امتوں کی جانب سے تکذیب اور انہیں قتل کرنے جیسی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچتی رہی ہیں اور یہ ایسی شے ہے جس میں کوئی خفا نہیں ہے مگر ابن عطیہ ابو محمد عبدالحق نے کہا ہے: بلاشبہ قرآن کریم تفضیل کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ فی الجملہ ہے اس میں کسی ایک مفضول کی تعیین نہیں ہے اور اسی طرح احادیث بھی ہیں اور اسی لئے حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: انا اکرم ولد آدم علی ربی (1) (میں اپنے رب کے نزدیک (تمام) اولاد آدم سے زیادہ معزز ہوں) اور فرمایا: ''میں اولاد آدم کا سردار ہوں (2)'' اور آپ نے تعیین نہیں فرمائی۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''کسی کے لئے یہ کہنا مناسب نہیں کہ میں حضرت یونس بن متی علیہ السلام سے بہتر ہوں (3)۔'' اور فرمایا: ''تم مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو (4)۔'' اور ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں مفضول کی تعیین سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے، کیونکہ حضرت یونس علیہ السلام نوجوان تھے اور آپ اعبائے نبوت کے نیچے دب گئے، تو جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لئے یہ حکم توقیفی ہے تو دوسروں کے لئے تو بدرجہ اولیٰ ہوگا (5)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف ہم نے اختیار کیا ہے وہی اولیٰ ہے ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ خبر دی ہے کہ اس نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تو وہ بعض فضیلت والے انبیاء کو بیان بھی کرتا ہے اور ان احوال کا ذکر بھی کرتا ہے جن کے سبب انہیں فضیلت دی ہے۔ پس اس نے فرمایا ہے: مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ (البقرہ: ۲۵۳) (ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ نے اور بلند کیے ان میں سے بعض کے درجے اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں۔)

اور مزید فرمایا: وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾ (بنی اسرائیل) اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی اور مزید فرمایا: و اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ (اور ہم نے اسے انجیل عطا فرمائی) وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَ ضِيَآءً وَّ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿﴾ (الانبیاء) (اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرقان اور روشنی اور ذکر پرہیزگاروں کے لئے) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا (النمل: 15) (اور تحقیق ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو علم عطا فرمایا) اور مزید فرمایا: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ (احزاب: 7) (اور (اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی نوح سے بھی) پس یہ عام بیان کیا پھر خاص بیان کیا اور آغاز حضور نبی رحمت ﷺ سے کیا اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح گفتگو صحابہ کرام کے بارے میں بھی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ وہ شرف صحبت میں تمام

1۔ مشکوٰۃ المصابیح فضل سید المرسلین، جلد 1، صفحہ 514۔ ایضاً، ترمذی، باب فی فضل النبی، حدیث نمبر 3543، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 329، وزارت تعلیم
3۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 485، وزارت تعلیم
4۔ ایضاً
5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ

مشترک ہیں، پھر ان فضائل میں وہ متفرق اور جدا جدا ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں مواہب و رسائل میں سے عطا فرمائے ہیں۔ پس وہ ان کے سبب ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں اس کے باوجود ان تمام کو صحابیت، عدالت اور ان کی تعریف وغیرہ سب شامل ہیں۔ اور تجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہی کافی ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۗ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح:29) ((جان عالم) محمد اللہ کے رسول ہیں اور وہ (سعادتمند) جو آپ کے ساتھی ہیں کفار کے مقابلہ میں بہادر طاقتور ہیں) اور مزید فرمایا: وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا (الفتح:26) (اور انہیں استقامت بخش دی تقویٰ کے کلمہ پر اور وہ اس کے حق دار بھی تھے اور اس کے اہل بھی تھے۔) پھر فرمایا: لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ (الحدید:10) (تم میں سے کوئی برابری نہیں کر سکتا ان کی جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے (راہ خدا میں) مال خرچ کیا اور جنگ کی) اور مزید فرمایا: لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح:18) (یقیناً راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے جب وہ بیعت کر رہے تھے آپ کی اس درخت کے نیچے۔) پس یہ بھی عام اور خاص بیان ہے۔ اور ان سے عیب اور نقص کی نفی کی ہے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین و نفعنا بحبہم آمین۔

قولہ تعالیٰ: مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ جس سے کلام کی گئی ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ تحقیق رسول اللہ ﷺ سے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے عرض کی گئی: کیا وہ نبی مرسل تھے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں وہ نبی مکلم تھے'' (یعنی جن سے کلام کی گئی۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: بعض لوگوں نے تاویل یہ کی ہے کہ آدم علیہ السلام کو شرف ہمکلامی جنت میں عطا ہوا، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت باقی رہے گی (1)۔ عبارت سے اسم کے طویل ہونے کے سبب ہا ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اصل عبارت ہے: من کلمه الله۔

قولہ تعالیٰ: وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ نحاس نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق یہاں بَعْضَهُمْ سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں سرخ و سیاہ کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میرے لئے ساری زمین سجدہ گاہ اور پاکیزہ بنا دی گئی اور ایک مہینے کی مسافت سے رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی اور میرے لئے غنائم حلال کر دی گئیں (2) اور مجھے شفاعت عطا کی گئی۔'' اور اسی سے قرآن کریم، چاند کا شق ہونا، درخت کا آپ سے کلام کرنا، چند کھجوروں سے آپ ﷺ کا بہت بڑی مخلوق کو کھلانا اور ام معبد کی بکری کے خشک ہونے کے بعد اسے دوہنا وغیرہ تمام معجزات آپ کے متعلق ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور زائد یہ ہے کہ آپ ﷺ امت کے اعتبار سے تمام لوگوں سے عظیم تر ہیں اور آپ ﷺ پر سلسلہ انبیاء علیہم السلام کو ختم کیا گیا۔ علاوہ ازیں وہ خلق عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمایا۔ اور لفظ یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس سے مراد حضور نبی رحمت ﷺ اور آپ کے سوا وہ ہوں جن کی آیات و معجزات بڑے بڑے ہیں۔ اور کلام کا ذکر تاکید ا ہو سکتا ہے اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد حضرت ادریس علیہ السلام کو بلند مکان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ　2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 199، وزارت تعلیم

(آسمان) کی طرف اٹھانا ہو اور مراد آسمان میں انبیاء علیہم السلام کے مراتب ہوں جیسا کہ حدیث اسراء میں ہے۔ اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات یہ ہیں: مردوں کو زندہ کرنا، مادر زاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو شفایاب کرنا اور مٹی سے پرندے بنانا وغیرہ جیسا کہ اس پر قرآن کریم میں نص موجود ہے۔ وَ اَيَّدْنٰهُ اور ہم نے اسے قوت عطا فرمائی۔ بِرُوْحِ الْقُدُسِ یعنی حضرت جبریل علیہ السلام سے۔(1)

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی اگر الله تعالیٰ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ان رسولوں کے بعد آئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہے اور تثنیہ کو جمع سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ قول بھی ہے: من بعد جمیع الرسل یعنی تمام رسولوں کے بعد اور یہی لفظ کا ظاہر معنی ہے۔

اور کہا گیا ہے: بے شک یہ قتال اور جھگڑا ان لوگوں کی طرف سے واقع ہوا جو ان کے بعد آئے اور معنی اس طرح نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ لوگ ہر نبی کے بعد نہ لڑتے جھگڑتے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: اشتریت خیلا ثم بعتھا (میں نے گھوڑا خریدا پھر اسے بیچ دیا۔) پس اس عبارت میں تیرے لئے جائز ہے کہ تو ایک گھوڑا خریدے اور اسے بیچ دے پھر دوسرا خریدے اور اسے بیچ دے پھر تیسرا خریدے اور اسے بیچ دے اور اسی طرح یہ نوازل (سخت مصیبتیں) بھی ہیں کہ لوگوں کا ہر نبی علیہ السلام کے بعد اختلاف ہوا۔ پس ان میں سے وہ بھی ہیں جو ایمان لائے اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے دنیوی ساز و سامان کی طلب اور حسد میں کفر اختیار کیا اور یہ سب کچھ الله تعالیٰ کے ارادہ اور قضا و قدر کے ساتھ ہوا اور اگر الله تعالیٰ اس کا خلاف اور برعکس چاہتا تو وہی ہوتا لیکن وہ اس فعل کو سر حکمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے۔ اور وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا میں نون کو دو ساکن ملنے کی وجہ سے کسرہ دیا گیا ہے اور قرآن کے سوا اور کلام میں اس کا حذف بھی جائز ہوتا ہے اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

فلستُ بآتیه ولا استطیعهُ　ولاكِ اسقنی ان کان ماؤُكَ ذافضْلِ

پس میں اس کی طرف آنے والا نہیں ہوں (جس کی طرف تو نے مجھے دعوت دی ہے) اور نہ میں اس کی استطاعت رکھتا ہوں، لیکن تو مجھے پانی سے سیراب کر اگر تیرے پاس فالتو پانی ہے۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ۔ اس میں مَّنْ مبتدا ہونے اور صفت کے سبب محل رفع میں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ؕ وَ الْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

"اے ایمان والو! خرچ کر لو اس (مال) سے جو ہم نے دیا ہے تم کو اس سے پہلے کہ آجائے وہ دن جس میں نہ تو خرید و فروخت ہو گی اور نہ (کفار کے لئے) دوستی ہو گی اور نہ (ان کے لئے) شفاعت۔ اور جو کافر ہیں وہی ظالم ہیں۔"

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 339، دار الکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، کتاب التیمم، حدیث نمبر 323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حسن نے کہا ہے: یہ فرض زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ اور ابن جریج اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ نے کہا ہے: یہ آیت فرض زکوٰۃ اور نفلی صدقات وغیرہ کو جامع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ صحیح ہے لیکن سابقہ آیات قتال کے ذکر میں ہیں۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ مومنین کے ساتھ اس کو روکتا ہے جو کافروں کے سینوں میں ہے اور اس سے یہ موقف ترجیح پاتا ہے کہ اس سے مراد ندباً اور مستحباً اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنا ہے۔ اور آیت کے آخر میں یہ قول اسے مزید تقویت دیتا ہے: وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ یعنی تم ان سے اپنی جانوں کے ساتھ لڑتے ہوئے اور اموال خرچ کرتے ہوئے مقابلہ کرو۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل پر ایک بار مال خرچ کرنا واجب ہوگا اور ایک بار مستحب جہاد کے تعین اور اس کے عدم تعین کے اعتبار سے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس (مال) سے خرچ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا اور جس کے ساتھ ان پر انعام کیا۔ اور انہیں روک کر رکھنے سے ڈرایا یہاں تک کہ وہ دن آجائے جس میں کوئی خرید و فروخت ممکن نہ ہوگی اور نہ ہی کسی نفقہ کو پانا ممکن ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ (تو (اس وقت) وہ کہنے لگے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت کے لئے کیوں مہلت نہ دی تاکہ میں صدقہ (وخیرات) کر لیتا۔)

اور الخُلَّة سے مراد خالص دوستی ہے۔ یہ تخلل الأسرار بین الصدیقین سے ماخوذ ہے۔ (دو دوستوں کے درمیان راز خاص ہیں۔) اور الخِلالةُ و الخَلالةُ و الخُلالةُ تمام کا معنی دوستی اور محبت ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

و كيف تواصِلُ مَنْ اَصْبَحَتْ　　خلالتُه　　كأبی　　مَرْحَب

تو اسے کیسے پہنچ سکتا ہے جس کی دوستی ابو مرحب کی طرح ہوگئی ہے۔

اور ابو مرحب سائے کی کنیت ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اس عرقوب کی کنیت ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے: مواعید عرقوب (عرقوب کے وعدے۔) اور الخُلَّةُ سے مراد میٹھی اور شیریں گھاس بھی ہے جو عام بوٹی سے خالی ہو۔ کہا جاتا ہے: الخُلَّةُ خُبْزُ الْاِبِلِ و الحُمُضُ فَاكِهتها (شیریں گھاس اونٹ کی روٹی ہے اور نمکین و تلخ گھاس اس کا پھل ہے۔) اور الخَلَّةُ (خاء کے فتحہ کے ساتھ) اس کا معنی حاجت اور فقر ہے اور الخُلَّةُ کا معنی ابن مخاض بھی ہے۔ (یعنی ایک سال کا اونٹ)، یہ اصمعی سے روایت ہے۔ کہا جاتا ہے: اَتاهم بقُرْص كأنه فِرْسِن خَلَّةٍ (وہ ان کے پاس ایک ٹکیہ لے کر آیا گویا کہ وہ اونٹ کا کھر ہے۔) اس کا مؤنث بھی خَلَّةٌ ہی ہے۔ اور میت کے لئے کہا جاتا ہے: اللّٰهم اصلح خَلَّتَهٗ (اے اللہ! اس کے اس خلل کی اصلاح فرمادے جو اس نے چھوڑا ہے۔) اور الخَلَّةُ کا معنی ترش و نمکین گھنا پودا بھی ہے۔

اور الخِلَّةُ یہ خلل السیوف کا واحد مؤنث ہے۔ اور یہ وہ غلاف ہیں جن کے ساتھ تلواروں کی میانوں کو ڈھانپا جاتا ہے اور یہ سونے وغیرہ کے ساتھ منقش ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے سُيُور تُلْبس ظهر سيتي القوس یعنی وہ تسمے جو قوس کی دونوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 339، دار الکتب العلمیہ

طرفوں کے ظاہر کو پہنائے جاتے ہیں اور الخلۃ کا معنی وہ شے بھی ہے جو دانتوں میں باقی رہ جاتی ہے۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں الخلیل کے مادہ اشتقاق اور اس کے معنی کی بحث میں آئے گا۔

پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ آخرت میں نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ شفاعت مگر اللہ تعالیٰ کے اذن سے۔ اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے رحمت ہے جس کے ساتھ وہ اسے شرف بخشے گا جسے شفاعت کرنے کی اجازت عطا فرمائے گا۔

ابن کثیر اور ابو عمرو نے لَا بَیْعَ فِیْهِ وَلَا خُلَّةَ وَلَا شَفَاعَةَ نصب کے ساتھ بغیر تنوین کے قراءت کی ہے اور اسی طرح سورۃ ابراہیم میں لَا بَیْعَ فِیْهِ وَلَا خِلٰلَ۔

اور سورۃ الطور میں ہے لَا لَغْوٌ فِیْهَا وَلَا تَاْثِیْمٌ۔(1)

اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

أَلَا طِعَانَ وَلَا فُرْسَانَ عَادِيَةٌ   إِلَّا تَجَشُّؤُكُمْ عِنْدَ التَّنَانِيرِ

اس میں بھی لا طعانَ ولا فرسانَ منصوب ہیں۔

ہمزہ استفہام لا کے عمل کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے۔ جیسا کہ تیرا قول ہے: ألا رجلَ عندك۔ اور یہ بھی جائز ہے ألا رجلٌ ولا امرأةٌ۔ جیسا کہ بغیر استفہام کے ایسا کہنا جائز ہے۔ پس تو اسے جان لے۔

باقی تمام نے اسے رفع اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ جیسا کہ الراعی نے کہا ہے:

وما صَرَمْتُكِ حتى قُلْتِ مُعْلِنَةً   لا ناقةٌ لِيَ في هذا ولا جَمَلُ

اور میں نے تجھے نہیں چھوڑا یہاں تک کہ تو نے اعلان کرتے ہوئے کہا اس میں نہ میری کوئی اونٹنی ہے اور نہ کوئی اونٹ ہے

اور یہ روایت بھی ہے: وما هجرتكِ پس فتحہ نفی عام پر دلالت کرتا ہے جو اس صنف کی تمام وجوہ کو مستغرق ہے۔ گویا کہ یہ جواب ہے اس کا جس نے کہا: کیا اس میں بیع ہوگی؟ پس سائل نے عام سوال کیا، تو پھر جواب بھی نفی عام کے ساتھ دیا جائے گا۔ اور لا اسم منفی کے ساتھ مل کر ایک اسم کے قائم مقام ہے جو مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور فِیْهِ خبر ہے۔ اور اگر چاہے تو اسے یَوْمٌ کی صفت بنا لے اور جنہوں نے رفع دیا ہے انہوں نے لا کو بمنزلہ لَیْسَ قرار دیا ہے اور جواب کو خبر عام بنایا ہے اور گویا یہ اس کا جواب ہے جس نے کہا: ''کیا اس میں بیع ہوگی''؟ یعنی کلام میں بیع سے پہلے مِنْ کو ساقط کر دیا ہے۔ پس جواب ایسا لایا گیا جو رفع سے اسے تبدیل کرنے والا نہیں اور اسم مرفوع مبتدا ہے یا لَیْسَ کا اسم ہے اور فِیْهِ خبر ہے۔

مکی نے کہا ہے: بہتر اور عمدہ رفع ہے، کیونکہ اکثر قراء نے اسی طرح پڑھا ہے۔ اور قرآن کے علاوہ دیگر کلام میں لا بیعَ فیه ولا خلةٌ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور سیبویہ نے بنی مذحج کے ایک آدمی کے لئے کہا ہے:

هذا لعَمْرُكُمُ الصغار بعينه   لا أُمَّ لِي إن كان ذاك ولا أَبُ

اس میں بھی لا أُمَّ لِي ولا أَبٌ پڑھا گیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 340، دار الکتب العلمیہ

اور جائز ہے کہ پہلے کو مبنی (برفتحہ) پڑھا جائے اور دوسرے کو نصب اور تنوین دی جائے۔ پس تو کہہ سکتا ہے: لا رجلَ فیه ولا امرأةً، جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

لا نسبَ الیوم ولا خلةً اتّسع الخرقُ علی الرّاقِعِ

اور لا دونوں مقامات میں زائدہ ہے، پہلے کا عطف محل پر ہے اور دوسرے کا لفظ پر ہے۔ اور پانچویں وجہ یہ ہے کہ پہلے کو رفع دیا جائے گا اور دوسرے کو مبنی پڑھا جائے گا۔ جیسا کہ آپ کا قول: لا رجلٌ فیها ولا امرأةَ، جیسا کہ امیہ نے کہا ہے:

فلا لَغْوٌ ولا تَأْثِیمَ فیها وما فَاهُوا به أبَدًا مقیم

اعراب کی پانچوں وجہیں تیرے اس قول میں جائز ہیں: لا حول ولا قوة الا بالله، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ والحمد لله۔

وَالْكٰفِرُوْنَ یہ مبتدا ہے۔ هُمْ یہ مبتدائے ثانی ہے، الظّٰلِمُوْنَ یہ دوسرے مبتدا کی خبر ہے اور اگر تو چاہے تو هُمْ ضمیر کو زائدہ بنا لے بطور ضمیر فصل کے۔ اور الظّٰلِمُوْنَ خبر ہے الْكٰفِرُوْنَ کی۔ عطا بن دینار نے کہا ہے (1): سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے یہ کہا ہے: وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ اور یہ نہیں کہا ہے وَالظَّالِمُوْنَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ (یعنی یہ کہا ہے کہ کفار ظالم ہیں یہ نہیں کہا ہے کہ ظالم کافر ہیں۔)

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ وَ لَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

''اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے۔ نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے۔ جانتا ہے جو ان سے پہلے (ہو چکا) ہے اور جو ان کے بعد (ہونے والا) ہے اور وہ نہیں گھیر سکتے کسی چیز کو اس کے علم سے مگر جتنا وہ چاہے۔ سما رکھا ہے اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اور نہیں تھکاتی اسے زمین و آسمان کی حفاظت اور وہی ہے سب سے بلند عظمت والا۔''

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ یہ آیۃ الکرسی ہے، یہ قرآن کی آیات کی سردار ہے اور سب سے بڑی آیت ہے، جیسا کہ سورۃ الفاتحہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ یہ رات کے وقت نازل ہوئی اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بلایا اور یہ آیت لکھوادی۔

حضرت محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جب آیۃ الکرسی نازل ہوئی دنیا میں تمام بت گر گئے اور اسی

1۔ تفسیر طبری، جلد 4، صفحہ 526

طرح دنیا میں تمام بادشاہ گر پڑے اور ان کے سروں سے تاج گر گئے اور شیاطین بھاگ پڑے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو مارنے لگے اور ابلیس کے پاس تمام جمع ہو گئے اور اسے اس کے بارے مطلع کیا، تو اس نے انہیں کہا کہ وہ اس کے بارے تفتیش کریں۔ چنانچہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف آئے تو انہیں یہ خبر موصول ہوئی کہ آیت الکرسی نازل ہوئی ہے۔ ائمہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے فرمایا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابا المنذر! کیا تو جانتا ہے تیرے پاس قرآن کریم میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟'' انہوں نے کہا: میں نے عرض کی: اللہ و رسولہ اعلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابا المنذر! کیا تو جانتا ہے تیرے پاس کتاب اللہ میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟'' تو میں نے عرض کی: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''اے ابا المنذر! تجھے علم مبارک ہو (1)۔'' حکیم ترمذی ابو عبد اللہ نے یہ اضافہ ذکر کیا ہے۔ ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، اس آیت کی ایک زبان ہے اور دو ہونٹ ہیں ساق عرش کے پاس شہنشاہ مطلق کی پاکی بیان کرتی ہے (2)''۔

ابو عبد اللہ نے کہا ہے: یہ آیت اللہ تعالیٰ جل ذکرہ نے اسے نازل فرمایا اور اس کا ثواب اس کے پڑھنے والے کے لئے دنیا اور آخرت میں رکھا ہے۔ پس دنیا میں تو یہ ہے کہ یہ اپنے پڑھنے والے کی آفات و مصائب سے حفاظت کرتی ہے۔ نوف البکالی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: آیت الکرسی تورات میں وَلِيَّةُ اللهِ کے نام سے پکاری جاتی ہے اور اس کے پڑھنے والوں کو ملکوت السموات والارض میں عزیز پکارا جاتا ہے۔ فرمایا: حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جب اپنے گھر میں داخل ہوتے تو وہ اپنے گھر کے چاروں کونوں میں آیۃ الکرسی پڑھتے تھے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ اس کے ذریعے چاروں اطراف سے اپنی حفاظت کا انتظام کرتے تھے اور یہ کہ شیطان آپ کے گھر کے کونوں سے آپ سے دور ہو جائے (3)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک جن سے کشتی کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پچھاڑ دیا، تو جن نے آپ کو کہا: مجھ سے ذرا ہٹو یہاں تک کہ میں آپ کو وہ بتاتا ہوں جس کے ساتھ تم ہم سے محفوظ رہ سکتے ہو۔ تو آپ نے اسے چھوڑ دیا اور اس سے پوچھا، تو اس نے کہا: بلاشبہ تم ہم سے آیۃ الکرسی کے ساتھ محفوظ رہ سکتے ہو (4)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ صحیح ہے اور حدیث میں ہے: جس نے ہر نماز کے پیچھے آیۃ الکرسی پڑھی تو اس کی روح قبض کرنے کی ذمہ داری رب ذوالجلال لے لیتا ہے اور وہ اس آدمی کی طرح ہے جس نے انبیاء علیہم السلام کی معیت میں جنگ لڑی یہاں تک کہ اسے شہید کر دیا گیا۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے کہا: میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی تو اس کے لئے موت کے سوا کوئی شے جنت میں داخل ہونے کے مانع نہیں ہے اور اس پر صدیق اور عابد ہی مواظبت اختیار کرتا ہے اور جس نے اسے اس وقت پڑھا جب وہ اپنے بستر پر گیا تو اللہ تعالیٰ نے

1۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب ماجاء فی آیۃ الکرسی، حدیث نمبر 1248، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ نوادر الاصول، جلد 1، صفحہ 337-338　　3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 338　　4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 338

اسے، اس کے پڑوسیوں کو اور اس کے پڑوسیوں کے پڑوسیوں کو اور اس کے اردگرد کے گھروں کو محفوظ فرمادیا(1)''۔

اور بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان المبارک کی زکوٰۃ (صدقہ فطر) کی حفاظت میرے سپرد کی، آگے پورا قصہ ذکر کیا۔ اور اس میں ہے: تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیال یہ ہے کہ وہ مجھے ایسے کلمات سکھادے گا جن کے سبب اللہ تعالیٰ مجھے نفع پہنچائے گا، سو میں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ کیا ہیں؟'' میں نے عرض کی: اس نے مجھے کہا ہے: جب تو اپنے بستر میں جائے تو اول سے آخر تک آیۃ الکرسی پڑھا کر اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ اور اس نے مجھے کہا ہے: تجھ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلسل محافظ رہے گا اور صبح ہونے تک کوئی شیطان تیرے قریب نہیں آئے گا۔ اور وہ (صحابہ کرام) خیر کی چیز لینے کے بہت زیادہ حریص تھے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ اس نے تجھ سے سچ کہا ہے حالانکہ وہ بہت جھوٹا ہے۔ اے ابوہریرہ! کیا تو اسے جانتا ہے جس سے تو تینوں راتیں باتیں کرتا رہا ہے؟'' عرض کی: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شیطان ہے(2)''۔

مسند دارمی ابومحمد میں ہے شعبی نے کہا ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی کا ایک جن سے آمنا سامنا ہوگیا تو وہ آپس میں کشتی کرنے لگے تو اس صحابی نے اسے پچھاڑ دیا۔ تو اس آدمی نے اسے کہا: بلاشبہ میں تجھے کمزور بلند غبار کی مانند دیکھ رہا ہوں گویا تیرے دونوں ہاتھ کتے کے ہاتھوں کی طرح ہیں، کیا تم اسی طرح ہوتے ہو۔ اے جنوں کے گروہ! یا تو انہیں میں سے اس طرح ہے؟ اس نے کہا: نہیں قسم بخدا! بلاشبہ میں ان میں سے مضبوط پسلیوں والا ہوں، البتہ تو دوبارہ میرے ساتھ کشتی کر، اگر تو نے مجھے پچھاڑ لیا تو میں تجھے ایسی شے سکھا دوں گا جو تیرے لئے نفع بخش ہوگی۔ صحابی نے فرمایا: ہاں ٹھیک ہے۔ پھر انہوں نے اسے پچھاڑ دیا، تو اس نے کہا: کیا تم آیت الکرسی پڑھتے ہو: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ؟ انہوں نے کہا: ہاں، تو اس نے کہا کیونکہ تم جب بھی اسے اپنے گھر میں پڑھو گے تو شیطان گدھے کی مثل ہوا خارج کرتے ہوئے اس سے نکل جائے گا اور پھر صبح ہونے تک اس میں داخل نہ ہوگا۔ اسے ابونعیم نے ابوعاصم ثقفی سے اور انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے۔ اور ابوعبیدہ نے اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غریب حدیث میں ذکر کیا ہے۔ ابومعاویہ نے اس کے بارے ہمیں ابوعاصم ثقفی سے، انہوں نے شعبی سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: کیا وہ عمر رضی اللہ عنہ تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: امکان یہی ہے کہ وہ عمر کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔

ابومحمد دارمی نے کہا ہے۔ الضئیل کا معنی ہے: باریک (کمزور)، الشخیت کا معنی ہے: انتہائی لاغر کمزور، الضلیع کا معنی ہے: پیٹ سے خارج ہونے والی ہوا۔ اور یہ لفظ حاء کے ساتھ الحبج بھی ہے۔

اور ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے حم - المومن - الیہ المصیر تک اور آیۃ الکرسی صبح کے وقت پڑھیں تو شام ہونے تک وہ ان دونوں کے سبب محفوظ رہے گا اور

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الذکر بعد الصلوٰت، جلد 1، صفحہ 89

2۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم

جس نے ان دونوں کو شام کے وقت پڑھا تو وہ صبح ہونے تک ان کے سبب محفوظ رہے گا(1)۔'' فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔
اور ابوعبداللہ الترمذی الحکیم نے کہا ہے: روایت کیا گیا ہے کہ مومنین کے لئے محافظت کی خاطر ہر نماز کے بعد انہیں پڑھنا مستحب ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی جس نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھنے پر دوام اختیار کیا میں اسے اس سے زیادہ عطا کروں گا جو میں شکر کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں اور انبیاء علیہم السلام کا اجر اور صدیقین کے اعمال کا اجر اور میں اس پر اپنا دست رحمت پھیلا دیتا ہوں اور اس کے لئے کوئی شے رکاوٹ نہیں ہے کہ میں اسے جنت میں داخل کروں مگر یہ کہ ملک الموت اسے لے آئے۔''
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے پروردگار! جس نے اس کے بارے سنا وہ اس پر دوام اختیار نہیں کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں یہ اپنے بندوں میں سے کسی کو عطا نہیں کروں گا سوائے نبی کے یا صدیق کے یا ایسے آدمی کے جس سے میں محبت کرتا ہوں یا ایسے آدمی کے جس کے بارے میں ارادہ کروں کہ وہ میرے راستے میں قتل ہو جائے۔''
حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے موسیٰ! جس کسی نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی تو میں اسے انبیاء علیہم السلام (کے اعمال) کا ثواب عطا کروں گا۔ ابوعبداللہ نے کہا ہے: میرے نزدیک اس کا معنی ہے: میں اسے انبیاء علیہم السلام کے عمل کا ثواب عطا فرماؤں گا اور جہاں تک نبوت کے ثواب کا تعلق ہے تو وہ سوائے انبیاء علیہم السلام کے اور کسی کے لئے نہیں ہے(2)۔
یہ آیت توحید اور اعلیٰ صفات کو متضمن ہے۔ اس میں پچاس کلمے ہیں اور ہر کلمے میں پچاس برکتیں ہیں۔ اور یہ تہائی قرآن کریم کے برابر ہے۔ حدیث طیبہ میں اسی طرح وارد ہے۔ ابن عطیہ نے اسے ذکر کیا ہے۔
اور لفظ اَللّٰهُ مبتدا ہے اور لَآ اِلٰهَ مبتدا ثانی ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اور وہ معبودٌ یا موجود ہے۔ اور اِلَّا هُوَ، لا اللہ کے محل سے بدل ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ مبتدا اور خبر ہے اور یہ مرفوع ہے اور اس معنی پر محمول ہے یعنی ما الہ الا ھو۔ (سوائے اس کے کوئی الہٰ نہیں ہے) اور غیر قرآن میں لا الہ الا ایاہ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور استثنا کی بناء پر ضمیر منصوب ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنی طویل حدیث میں کہا ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سے کون سی سب سے بڑی آیت آپ پر نازل فرمائی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (3) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قرآن کریم میں اشرف اور بلند رتبہ آیت آیۃ الکرسی ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے: کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کا تکرار مضمراً اور ظاہراً اٹھارہ بار کیا جاتا ہے۔ (اس لئے یہ دوسری آیات

1۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، جلد 2، صفحہ 111
2۔ نوادر الاصول، جلد 1، صفحہ 338
3۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271

سے بلند رتبہ اور اعلیٰ ہے۔)

اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اگر چاہے تو اسے هُوَ سے بدل بنا لے اور اگر چاہے تو یہ خبر کے بعد خبر بھی ہو سکتی ہے اور اگر چاہے تو اس سے پہلے مبتدا مضمر بھی ہو سکتا ہے اور غیر قرآن میں اسے مدح کی بنا پر منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔

اور اَلْحَيُّ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم ہے جس کے ساتھ اسے پکارا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام جب مردے کو زندہ کرنے کا ارادہ فرماتے تھے تو وہ انہیں اسماء کے ساتھ دعا مانگتے تھے۔ یا حیّ یا قیوم۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت آصف بن برخیا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس تخت بلقیس لانے کا ارادہ فرمایا تو اسی قول کے ساتھ دعا مانگی: یا حیّ یا قیوم۔ اور یہ قول بھی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے انہیں فرمایا: أیاھیا أیاھیا یعنی یا حیّ یا قیوم۔ اور کہا جاتا ہے: یہی سمندر میں سفر کرنے والوں کی دعا ہے کہ جب انہیں غرق ہونے کا خوف لگتا ہے تو انہی اسماء کے ساتھ دعا مانگتے ہیں (پکارتے ہیں)۔

علامہ طبری نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ کہا جائے گا: حیّ قیوم جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف خود بیان کیا ہے اور پھر اس میں کوئی غور و فکر کیے بغیر اسے اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔

اور یہ قول بھی ہے: اللہ تعالیٰ نے امور کے محل میں تصرف کرنے اور اشیاء کی مقادیر مقرر کرنے کی وجہ سے اپنا نام حیّ رکھا ہے اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: حیّ وہ ہوتا ہے جسے موت نہیں آتی۔

اور سدی نے کہا ہے: الحیّ سے مراد باقی رہنے والا ہے۔ لبید کا قول ہے:

فامّا تریِنی الیوم اصبحتُ سالما فلستُ بأحیا من کلابٍ و جَعْفَرِ

پس اگر تو آج مجھے دیکھ رہا ہے کہ میں نے صحیح سالم صبح کی ہے تو میں کلاب و جعفر میں سے باقی رہنے والا نہیں ہوں۔

اور کبھی کہا جاتا ہے: بلاشبہ یہی اسم اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ اَلْقَيُّوْمُ یہ قَامَ سے ہے: یعنی مخلوق کو تدبیر کے ساتھ قائم رکھنے والا۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔

اور حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے: ہر نفس کو اس کے ساتھ قائم رکھنے والا جو اس نے کمایا ہے تاکہ وہ اسے اس کے عمل کے مطابق جزا دے، اس حیثیت سے کہ وہ اس کے بارے میں جاننے والا ہے اور ان میں سے کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ ذات جو نہ بدلتی ہے نہ ختم ہوتی ہے۔ (یعنی نہ اس کی حالت میں کوئی تغیر و تبدل ہوتا ہے اور نہ وہ زوال پذیر ہے) امیہ بن ابی الصلت نے کہا ہے:

لم تُخلَقِ السماءُ والنجوم والشمس معها قمر یقوم

آسمان اور ستارے، سورج اور اس کے ساتھ قائم ہونے والا چاند نہیں پیدا کیے گئے۔

قدّرہ مُهَيْمِن قَيُّومُ والحشر والجنة والنعیم

جسے نگہبان قیوم نے مقرر کیا ہے۔ اور حشر اور جنت اور تمام نعمتیں (نہیں پیدا کی گئیں)

اِلَّا لأمر شانه عظيمٌ

مگر ایسے امر کے لئے جس کی شان انتہائی عظیم ہے۔

علامہ بیہقی نے بیان کیا ہے: میں نے اسماعیل الضریر کی ''عیون التفسیر'' میں الْقَيُّوْمُ کی تفسیر میں دیکھا ہے۔ انہوں نے کہا ہے اور کہا جاتا ہے: وہ وہ ہے جو سوتا نہیں ہے، گویا کہ انہوں نے یہ مفہوم آیۃ الکرسی میں اس کے بعد والے ارشاد گرامی سے لیا ہے: لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔

اور کلبی نے کہا ہے: الْقَيُّوْمُ وہ ہے جس کی ابتدا نہ ہو۔ اسے ابو الانباری نے بیان کیا ہے۔

قیوم کی اصل قَيْوُوم ہے، واؤ اور یاء ایک کلمے میں جمع ہیں ان میں سے پہلا حرف ساکن ہے پس واؤ کو یاء سے بدلنے کے بعد پہلی یا کو دوسری میں ادغام کر دیا۔ قیوم فعول کے وزن پر نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ واؤ سے ہے تو یہ قوود م ہو جائے گا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت علقمہ، حضرت اعمش اور حضرت نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے الحی القیام الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور اہل لغت کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عربوں کے نزدیک القیوم زیادہ اعرف ہے اور بنا کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور علت کے اعتبار سے زیادہ ثابت ہے۔ اور القیام القوام سے القیام کی طرف منقول ہے۔ الفعال کو الفیعال کی طرف پھیرا گیا ہے، جیسا کہ الصواغ کو الصیاغ کہا گیا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

اِن ذا العرش لَلذی یرزق النا س و حیٌ علیهم قیوم

بلاشبہ صاحب عرش وہ ہے جو لوگوں کو رزق عطا فرماتا ہے اور وہ ان پر حی و قیوم ہے۔

پھر رب العالمین نے اس کی نفی کی ہے کہ اسے اونگھ آئے یا نیند (یعنی نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند)

السِنَةُ کا معنی تمام کے قول کے مطابق اونگھ ہے اور اونگھ وہ ہوتی ہے جو آنکھ میں ہوتی ہے اور جب وہ دل میں ہو جائے تو پھر نوم (نیند) ہو جاتی ہے۔ عدی بن رقاع نے ایک عورت کا فتور نظر کے ساتھ وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

وسْنَانُ اقصَدَه النُّعاسُ فَرَنَّقَتْ فی عینه سِنَةٌ و لیس بنائم

وسنان کا اونگھ نے ارادہ کر رکھا ہے۔ پس اس کی آنکھوں میں اونگھ داخل ہو چکی ہے اور وہاں نیند نہیں ہے۔

اور مفضل نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ السِنۃ یہ سر کی جانب سے ہوتی ہے اور نعاس آنکھ میں ہوتی ہے اور نوم (نیند) دل میں ہوتی ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: وسنان وہ ہے جو نیند سے بیدار ہوتا ہے حالانکہ وہ عقل و سمجھ نہیں رکھتا یہاں تک کہ وہ بسا اوقات اپنے گھر والوں پر تلوار ننگی کر لیتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ جو کچھ ابن زید نے کہا ہے یہ محل نظر ہے۔ کلام عرب سے اسے نہیں سمجھا جا سکتا (1)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 341، دار الکتب العلمیہ

اور سدی نے کہا ہے: اَلسِّنَةَ سے مراد اس نیند کی ہوا ہے جو چہرے پر لگتی ہے اور انسان اونگھنے لگتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بالجملہ اس سے مراد وہ فتور اور ڈھیلا پن ہے جو انسان کو لاحق ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی عقل مفقود نہیں ہوتی۔ اور اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی بھی خلل واقع نہیں ہوتا اور کسی حال میں بھی اسے کوئی اکتاہٹ اور سستی لاحق نہیں ہوتی۔

سنة میں اصل وَسْنَةَ ہے اس میں واو کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ یَسَنُ سے حذف کی گئی ہے اور النوم سے مراد وہ ثقل اور بوجھ ہے جس کے ساتھ انسان کے حق میں ذہن زائل ہو جاتا ہے (یعنی عقل کام نہیں کرتی) اس میں واؤ عطف کے لئے ہے اور لا تاکید کے لئے ہے۔

میں کہتا ہوں: لوگ اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کرتے ہیں، انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بطور حکایت موسیٰ علیہ السلام سے منبر پر بیان کرتے ہوئے سنا ہے ''کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کیا اللہ تعالیٰ جل شانہ بھی سوتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا اور اس نے آپ کو تین بار بیدار کیا پھر اس نے آپ کو دو بوتلیں دے دیں، ہر ہاتھ میں ایک بوتل تھی اور آپ کو حکم دیا کہ ان دونوں کی حفاظت کریں۔ فرمایا: پھر آپ سونے لگے اور قریب تھا کہ آپ کے دونوں ہاتھ آپس میں مل جاتے پھر آپ بیدار ہو جاتے اور آپ انہیں ایک دوسرے سے دور ہٹا لیتے بالآخر آپ گہری نیند سو گئے اور آپ کے دونوں ہاتھ آپس میں ٹکرائے اور دونوں بوتلیں ٹوٹ گئیں۔ فرمایا...... اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے یہ مثال بیان فرمائی کہ اگر وہ سوتا رہتا تو پھر یہ آسمان اور زمین (اپنی اپنی جگہ) مضبوطی سے ٹھہرے نہ رہتے (1)۔'' یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اسے کئی ایک نے ضعیف کہا ہے اور ان میں سے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (یعنی زمین و آسمان کی ہر شے) اس کی ملکیت ہے۔ اور وہ تمام کا مالک اور رب ہے۔ عبارت میں مَا ذکر کیا گیا ہے اگرچہ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو عقل رکھتے ہیں تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ اس میں مراد مجموعی طور پر موجود چیزیں ہیں۔ (چاہے وہ ذوی العقول یا غیر ذوی العقول ہوں) علامہ طبری نے کہا ہے: یہ آیت نازل ہوئی جب کفار نے کہا: مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر: 3) (ہم بتوں کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے تاکہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ نزدیک کر دیں۔)

قولہ تعالیٰ: مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اس میں مَنْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور ذَا اس کی خبر ہے۔ اور الَّذِيْ، ذَا کی صفت ہے اور اگر چاہے تو بدل بنا لے اور یہ جائز نہیں ہے کہ ذَا زائدہ ہو جیسا کہ مَا کے ساتھ زائد کیا گیا ہے کیونکہ مَا مبہم ہوتا ہے اور ذَا کی اس کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے اس کے ساتھ اسے زائد کر دیا گیا ہے۔

اور اس آیت میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ شفاعت کے بارے میں جسے چاہے گا اذن عطا فرمائے گا اور وہ انبیاء علیہم السلام، علماء، مجاہدین، ملائکہ اور ان کے علاوہ وہ لوگ ہیں جنہیں رب العالمین یہ اعزاز و اکرام اور شرف عطا فرمائے گا۔

1۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 257، حدیث نمبر 273، دار الفکر

پھر وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر انہیں کے لئے جن کے لئے وہ راضی ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جو ظاہر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ علماء اور صالحین ان کے بارے میں شفاعت کریں گے جو ابھی جہنم تک نہیں پہنچے اور وہ دونوں منزلوں کے درمیان ہوں گے یا وہاں پہنچ چکے ہوں گے لیکن ان کے اعمال صالحہ بھی ہوں گے۔

اور بخاری باب بقیۃ من ابواب الرؤیۃ میں ہے: بے شک مومنین کہیں گے: اے ہمارے رب! بلاشبہ ہمارے بھائی ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے اور یہ شفاعت ان کے بارے میں ہے جن کا معاملہ بالکل قریب کا ہوتا ہے(1) جیسا کہ جنت کے دروازے کے ساتھ چمٹنے والا بچہ شفاعت کرے گا۔

بلاشبہ یہ ان کے قرابتداروں اور ان کے جاننے پہچاننے والوں کے بارے میں ہے اور انبیاء علیہم السلام ان کے بارے میں شفاعت کریں گے جو ان کے گنہگار امتی اپنے گناہوں کے سبب جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے بغیر کسی قرابت اور معرفت کے صرف نفس ایمان کے سبب (وہ شفاعت کریں گے)۔ پھر خطاؤں اور گناہوں میں مستغرق ان لوگوں کے بارے میں ارحم الراحمین کی شفاعت باقی رہ جائے گی جن کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کی شفاعت نے کوئی عمل نہ کیا اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت حساب کی تعجیل کے بارے میں ہوگی اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہی خاص ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں شفاعت کی کیفیت بڑے شافی بیان کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ شاید آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے نہیں پڑھا کہ شفاعت کرنے والے جہنم میں داخل ہوں گے اور وہاں سے ایسے لوگوں کو نکالیں گے جنہوں نے عذاب واجب جان لیا ہوگا۔ پس اس بنا پر یہ کہنا بعید نہیں ہے کہ مومنین کے لئے دو شفاعتیں ہوں گی: ایک شفاعت ان کے بارے میں جو ابھی جہنم تک نہیں پہنچے اور دوسری شفاعت ان کے بارے میں جو اس تک پہنچ چکے ہوں گے اور اس میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پناہ عطا فرمائے۔ آمین۔

سو آپ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے: ''پھر جہنم پر ایک پل بچھایا جائے گا اور شفاعت کھل جائے گی اور وہ کہنے لگیں گے: اللّٰھم سلّم سلّم۔ اے اللہ! سلامتی کے ساتھ گزار دے۔ سلامتی کے ساتھ گزار دے۔ عرض کی گئی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ پل کیسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس میں پاؤں رکھنے کی جگہ پر پھسلن ہوگی (پاؤں قرار نہ پا سکیں گے) اس کے ساتھ لوہے کے ٹیڑھے کنڈے ہوں گے اور اس میں سخت جگہ پر ایسے خاردار پودے ہوں گے جن کو سعدان کہا جاتا ہے۔ پس مومنین اس سے آنکھ جھپکنے کی طرح، بعض بجلی کی طرح، بعض ہوا کی طرح، بعض پرندوں کی طرح اور بعض گھوڑوں اور اونٹوں کی تیز رفتاری کی طرح گزر جائیں گے اور وہ نجات پا جائے گا جو سلامت رہا، جسے فقط خراشیں آئیں اور جسے آتش جہنم میں گرنے سے بچا لیا گیا، یہاں تک کہ جب مومنین آگ سے خلاصی پا جائیں گے۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی بھی ان مومنین سے زیادہ طاقتور نہیں جو قیامت کے دن اپنے ان بھائیوں کا حق لینے کے لئے جو جہنم میں ہوں گے اللہ کی بارگاہ میں قسم کے ساتھ عرض کریں گے۔ وہ کہیں گے: اے ہمارے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 341، دار الکتب العلمیہ۔ بخاری شریف، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رب! وہ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے، تو ان کو کہا جائے گا: تم انہیں نکال لو جنہیں تم پہچانتے ہو۔ پس ان کی صورتیں آگ پر حرام کر دی جائیں گی اور وہ بہت زیادہ مخلوق کو نکال کر لے آئیں گے حالانکہ آگ نے نصف پنڈلی تک اور گھٹنوں تک انہیں پکڑا ہوا ہوگا۔ پھر وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا تھا ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا، تو رب العالمین ارشاد فرمائے گا: تم واپس جاؤ اور جس کے دل میں ایک دینار کے برابر بھی خیر اور نیکی پاؤ تو اسے نکال لاؤ۔ پھر وہ کثیر مخلوق کو نکال لائیں گے۔ اور پھر عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے ان میں سے کوئی ایک بھی جہنم میں نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا تھا۔ پھر رب کریم فرمائے گا تم واپس لوٹ جاؤ اور جس کے دل میں تم نصف دینار کے برابر بھی خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ چنانچہ وہ خلق کثیر کو نکال کر لے آئیں گے۔ پھر عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اس میں ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا، پھر رب العالمین ارشاد فرمائے گا تم واپس چلے جاؤ اور جس کے دل میں تم رائی کے دانے برابر بھی خیر اور نیکی پاؤ تو اسے نکال لاؤ چنانچہ وہ کثیر مخلوق کو نکال لائیں گے۔ پھر عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں چھوڑی۔'' ...... حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: اگر تم اس حدیث کے بارے میری تصدیق نہ کرو تو پھر چاہو تو یہ پڑھ لو: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (بے شک اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا ذرہ برابر بھی، (بلکہ) اگر ہو معمولی سی نیکی تو دوگنا کر دیتا ہے اسے اور دیتا ہے اپنے پاس سے اجر عظیم۔)

پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ملائکہ شفاعت کر چکے، انبیاء علیہم السلام شفاعت کر چکے اور مومن بھی شفاعت کر چکے اور رب ارحم الراحمین کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ پس اللہ تعالیٰ جہنم سے ایک قبضہ (مشت) بھرے گا اور اس سے اس قوم کو نکال کر لے آئے گا جنہوں نے کبھی بھی خیر اور نیکی کا عمل نہیں کیا حالانکہ وہ کوئلہ بن چکے ہوں گے (1)۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سو میں عرض کروں گا: اے میرے پروردگار! مجھے اس کے بارے اجازت عطا فرما جس نے کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ تو رب کریم فرمائے گا: وہ تیرے لئے نہیں ہے ...... یا فرمایا: وہ تیری طرف نہیں ہے۔ مجھے اپنی عزت، کبریائی اور عظمت وجلال کی قسم ہے میں ضرور بہ ضرور اسے نکالوں گا جس نے کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (2)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا گیا ہے: ''یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان قضا (فیصلہ فرمانے) سے فارغ ہوگا اور ارادہ فرمائے گا کہ وہ اہل جہنم میں سے جنہیں چاہے اپنی رحمت کے ساتھ نکال لے تو وہ ملائکہ کو حکم ارشاد فرمائے گا کہ وہ جہنم سے انہیں نکال لائیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے ان میں سے جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمانے کا ارادہ کیا ہے اور وہ کہتے ہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ پس وہ فرشتے انہیں جہنم

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 102، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 110، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6956، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں پہچان لیں گے اور وہ انہیں سجدوں کے نشانات سے پہچانیں گے، آگ ابن آدم کو کھا جائے گی سوائے سجدوں کے اثر کے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے آپ پر سجدوں کے اثر (نشان) کو کھانا حرام قرار دیا ہے (1)۔" الحدیث بطولہ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مومنین وغیرہم کی شفاعت بلاشبہ ان کے لئے ہے جو جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے اور اس میں پہنچ چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ اور ابن عطیہ کا قول: "ان میں سے جو نہیں پہنچے یا پہنچ چکے" یہ احتمال رکھتا ہے کہ وہ دوسری احادیث سے لیا گیا ہو۔ واللہ اعلم۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے دن لوگوں کی کئی صفیں بنائی جائیں گی" ...... اور ابن نمیر نے کہا ہے: اہل جنت کی ...... پس اہل نار میں سے ایک آدمی ایک آدمی کے پاس سے گزرے گا تو وہ کہے گا: اے فلاں! کیا تجھے وہ دن یاد نہیں ہے جب تو نے پانی طلب کیا تو میں نے تجھے خوب جی بھر کر پانی پلایا تھا؟ فرمایا: تو وہ اس کی شفاعت کر دے گا اور ایک اور آدمی ایک آدمی کے پاس سے گزرے گا اور کہے گا کیا تجھے وہ دن یاد نہیں ہے جب میں نے تجھے طہور (جس سے پاکی حاصل کی جائے) دیا تھا؟ چنانچہ وہ اس کی شفاعت کر دے گا ...... ابن نمیر نے کہا ...... وہ کہے گا اے فلاں! کیا تجھے وہ دن یاد نہیں جس دن تو نے مجھے فلاں فلاں کام کے لئے بھیجا تھا اور میں تیرے لئے چلا گیا تھا؟ پس وہ اس کی شفاعت کرے گا (2)۔" رہیں ہمارے نبی مکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتیں تو ان کے بارے میں اختلاف ہے۔

ایک قول ہے کہ وہ تین ہیں ایک قول ہے کہ وہ دو ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ پانچ ہیں۔ اس کا بیان سبحان میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور ہم نے ان پر کتاب "التذکرہ" میں بحث کی ہے۔ والحمد للہ۔

قولہ تعالیٰ: **یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ** دونوں ضمیریں ہر اس ذی عقل کی طرف لوٹ رہی ہیں جنہیں یہ قول متضمن ہے: **لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ** اور مجاہد نے کہا ہے: **مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ** سے مراد دنیا اور **وَ مَا خَلْفَهُمْ** سے مراد آخرت ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سب فی نفسہ صحیح ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ ما بین الید سے مراد ہر وہ شے ہے جو انسان کے سامنے ہے اور ما خلفہ سے مراد ہر وہ شے ہے جو اس کے بعد آئے گی۔ اور حضرت مجاہد کے قول کی طرح ہی سدی وغیرہ نے بھی کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: **وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ** یہاں علم بمعنی معلوم ہے یعنی وہ اس کی معلومات میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتے اور یہ حضرت خضر علیہ السلام کے اس قول کی طرح ہے جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت کہا جب چڑیا نے سمندر میں چونچ ماری، میرا اور تمہارا علم اللہ تعالیٰ کے علم سے کم نہیں ہے مگر اتنا ہی جتنی یہ چڑیا اس سمندر سے کم ہے۔ پس یہ اور جو اس کے مشابہ ہے وہ معلومات کی طرف راجع ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم تو وہ ہے جو اس کی ذاتی

1۔ ایضاً۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6885، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، جلد 1، صفحہ 270، وزارت تعلیم

صفت ہے وہ منقسم نہیں ہوتا۔ اور آیت کا معنی ہے: کسی کے لئے کوئی معلوم نہیں مگر وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے کہ وہ اسے جان لے۔

قولہ تعالیٰ: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کرسی ایک موتی ہے اور قلم بھی ایک موتی ہے اور قلم کی لمبائی سات سو برس کی ہے اور کرسی کی طوالت اتنی ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

حماد بن سلمہ نے عاصم بن بہدلہ سے...... اور یہی عاصم بن ابی النجود ہیں...... اور انہوں نے زر بن حبیش کے واسطہ سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ساتویں آسمان اور کرسی کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہے اور کرسی اور عرش کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور عرش پانی کے اوپر ہے اور اللہ تعالیٰ (اپنی شان قدرت کے مطابق) عرش کے اوپر ہے اور وہ اسے جانتا ہے جس میں اور جس پر تم ہو۔ کہا جاتا ہے: كُرْسِيّ اور كِرْسِيّ اور جمع الكراسيّ ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: کرسیه کا معنی علمه (1) (اس کا علم) ہے۔

اور علامہ طبری نے اسے ترجیح دی ہے اور کہا ہے: اسی سے وہ کراسه (کاپی) بھی ہے جو علم کو جمع کرتی ہے۔ (اور محفوظ رکھتی ہے) اور اسی وجہ سے علماء کو الکراسیّ کہا گیا ہے، کیونکہ ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

يَحُفُّ بهم بِيضُ الوُجوهِ و عُصْبَةٌ كَراسيّ بالأحداث حين تَنُوبُ

اچھی شہرت رکھنے والے اور علماء کا گروہ انہیں ان امور کے ساتھ گھیر لیتا ہے (2) جب وہ پیش آتے ہیں۔

اور کہا گیا ہے: کرسیّه سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ قدرت ہے جس کے ساتھ وہ آسمانوں اور زمین کو ٹھہرائے ہوئے ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں: اجعل لهذا الحائط كرسيا، اس دیوار کی کرسی بنا دو یعنی وہ جس پر اس کا اعتماد اور سہارا ہو۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے قریب ہے جو انہوں نے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ میں کیا ہے۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور ہم نے حضرت ابن مسعود اور حضرت سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَسِعَ كُرْسِيُّهُ میں یہ روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے تمام روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اس سے مراد وہی کرسی ہے جو عرش کے ساتھ مشہور ہے۔ اور اسرائیل نے سدی سے اور انہوں نے ابو مالک سے اس قول وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے تحت روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک وہ چٹان جس پر ساتویں زمین ہے اور اس کی اطراف پر مخلوق کی انتہا ہے، اس پر چار فرشتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے چار چہرے ہیں: ایک انسان کا چہرہ، ایک شیر کا چہرہ، ایک بیل کا چہرہ اور ایک گدھ کا چہرہ، پس وہ اس پر کھڑے ہیں حالانکہ وہ زمینوں اور آسمانوں کو گھیرے ہوئے ہیں اور ان کے سر کرسی کے نیچے ہیں اور کرسی عرش کے نیچے ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی کرسی کو عرش کے اوپر رکھے ہوئے ہے۔ علامہ بیہقی نے کہا ہے: اس میں اشارہ دو کرسیوں کی طرف

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 342، دار الکتب العلمیہ 2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 16

ہے ان میں سے ایک عرش کے نیچے ہے اور دوسری عرش پر رکھی ہوئی ہے۔

اور أسباط عن السدی عن ابی مالك اور عن ابی صالح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عن مرة الهمدانی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عن مرة الهمدانی عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن ناس من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت میں ارشاد باری تعالیٰ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے تحت موجود ہے کہ آسمان و زمین کرسی کے درمیان میں ہیں اور کرسی عرش کے سامنے ہے۔ اور ملحدین اس کو بادشاہ کی عظمت اور جلالت سلطان پر محمول کرتے ہیں اور وہ عرش و کرسی کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور یہ کوئی شے نہیں ہے۔ اور اہل حق ان دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں بڑی وسعت ہے اور اس کے ساتھ ایمان لانا واجب ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کرسی قدم رکھنے کی جگہ ہے اور اس کی کجاوے کے چرچرانے کی طرح چرچراہٹ ہے۔

علامہ بیہقی نے کہا: ہم نے اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت کیا ہے اور ہم نے ذکر کیا ہے کہ اس کا معنی جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عرش سے (نیچے) رکھی ہوئی ہے (جیسے) تخت سے قدم رکھنے کی جگہ اور اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے مکان کا اثبات نہیں ہے۔ اور حضرت ابن بریدہ نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے فرمایا: جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبشہ سے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''کیا تم نے کوئی انتہائی تعجب خیز شے دیکھی ہے؟'' انہوں نے کہا: میں نے ایک عورت کو دیکھا ہے اس کے سر پر کھانے کا ایک ٹوکرا ہے۔ پس ایک شہسوار گزرا اور اس نے وہ ٹوکرا گرا دیا۔ پس وہ عورت بیٹھ گئی اور اپنا کھانا (طعام) جمع کرنے لگی۔ پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے کہا: تیرے لئے اس دن ہلاکت اور بربادی ہو جس دن بادشاہ اپنی کرسی رکھے گا اور وہ مظلوم کے لئے ظالم کو پکڑے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: لاقُدِّسَتْ اُمَّةٌ (امت پاک کردی گئی) یا فرمایا: کیف تقدس اُمة (امت کیسے پاکی بیان کرتی ہے) ...... اس کا کمزور اس کے طاقتور سے اپنا حق نہیں لے سکے گا(1)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے قول میں ہے۔ ''کرسی قدم رکھنے کی جگہ ہے'' وہ مراد یہ لیتے ہیں (کہ کرسی) عرش رحمن سے اس طرح ہے جیسے بادشاہوں کے تختوں سے قدم رکھنے کی جگہ ہوتی ہے اور یہ عرش کے سامنے بہت بڑی مخلوق ہے اور اس کی نسبت عرش کی طرف ایسے ہی ہے جیسے کرسی کی نسبت بادشاہ کے تخت کی طرف ہے۔

اور حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے کہ کرسی سے مراد نفس عرش ہے۔ اور یہ قول پسندیدہ نہیں ہے اور جس کا تقاضا احادیث کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ کرسی عرش کے سامنے پیدا کی گئی ہے اور عرش اس سے بڑا ہے(2)۔

اور ابوادریس خولانی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا، میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم سب سے عظیم آیت کون سی ہے جو آپ پر نازل کی گئی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آیۃ الکرسی ...... (3) پھر فرمایا:

1۔ مجمع الزوائد، کتاب الخلافۃ، صفحہ 375، حدیث نمبر 9054
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 342، دار الکتب العلمیہ
3۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 457

... اے ابوذر! (رضی اللہ عنہ) سات آسمانوں کو کرسی کے ساتھ ایسی ہی نسبت ہے جیسے وسیع زمین پر پھینکی ہوئی انگوٹھی کے حلقہ کو اس کے ساتھ ہوتی ہے اور عرش کو کرسی پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسی وسیع زمین کو انگوٹھی کے حلقہ پر ہوتی ہے۔'' اسے آجری، ابو حاتم بستی نے اپنی صحیح مسند میں اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے۔

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ساتوں آسمان اور زمین کرسی کے مقابلے میں وسیع زمین میں پھینکی ہوئی انگوٹھی کے حلقہ کی طرح ہیں۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے عظیم ہونے کے بارے میں آگاہ کرتی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظمت کا پتہ چلتا ہے کیونکہ اس امر عظیم کی حفاظت اسے نہیں تھکاتی۔

اور یَئُوْدُهٗ کا معنی ہے وہ اسے بھاری اور بوجھل بنا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے: آدني الشئ بمعنی أثقلني۔ اس نے مجھے تھکا دیا اور میں نے اس سے مشقت برداشت کی۔ اسی کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہما وغیرہم نے اس لفظ کی تفسیر بیان کی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ جائز ہے کہ اس میں ہا ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ کرسی کے لئے ہو۔ اور جب کرسی کے لئے ہوگی تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کے امر میں سے ہے (یعنی کرسی)...... اور الْعَلِیُّ اس سے مراد قدر و منزلت کی بلندی ہے نہ کہ مکان کی بلندی، کیونکہ اللہ تعالیٰ جگہ اور مکان سے منزہ اور پاک ہے۔

اور علامہ طبری نے ایک قوم سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ اپنی مخلوق سے بلند ہے کیونکہ اس کا مکان اپنی مخلوق کی جگہوں سے بلند ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ جسم ماننے والے جہلاء کا قول ہے اور اصل یہی ہے کہ اسے بیان نہ کیا جائے (1)۔

اور عبدالرحمن بن قرط سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شب معراج آسمانوں کی بلندیوں میں تسبیح سنی: سبحان الله العلِيّ الأعلى سبحانه و تعالى اور العلی و العالی ان کا معنی ہے اشیاء پر بہت سخت غلبہ رکھنے والا۔ عرب کہتے ہیں: علا فلان فلانا۔ یعنی فلاں فلاں پر غالب آگیا۔ شاعر نے کہا ہے:

فلما عَلَوْنا و استَوَينا عليهم ترکنا هم صَرْعى لِنَسْرٍ و كاسِرِ

پس جب ہم غالب آئے اور ہم نے انہیں خوب ہلاک کیا تو ہم نے ان کے مردوں کو گدھوں اور عقابوں کے لئے چھوڑ دیا اور اسی سے قول باری تعالیٰ ہے: اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ۔

الْعَظِیْمُ۔ یہ صفت ہے۔ اس کا معنی ہے قدر و منزلت اور شرف کے اعتبار سے عظیم۔ یہ اجسام کی عظمت کے معنی میں نہیں ہے۔ علامہ طبری نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ العظیم بمعنی المعظم ہے (جس کو عظمت دی جائے) جیسے کہا جاتا ہے: عتیق بمعنی معتق ہے اور اعشی کا شعر ہے:

فكأن الخمر العَتِيقَ من الإسفِنطِ ممزوجَةٌ بماءٍ زُلالِ (2)

گویا کہ وہ شراب جو اسفنط (شراب کی ایک قسم) سے آزاد ہے درآنحالیکہ وہ میٹھے پانی سے ملی ہوئی ہو۔

اور ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: اگر یہ بمعنی معظم ہو تو پھر لازم آتا ہے کہ وہ مخلوق

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 342

2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 19-18، دار احیاء التراث العربیۃ

کو پیدا کرنے سے پہلے اور اسے فنا کرنے کے بعد عظیم نہ ہو کیونکہ اس وقت اسے عظیم بنانے والی کوئی شے نہیں (1)۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

''کوئی زبردستی نہیں ہے دین میں۔ بے شک خوب واضح ہوگئی ہے ہدایت گمراہی سے۔ تو جو انکار کرے شیطان کا اور ایمان لائے اللہ کے ساتھ تو اس نے پکڑ لیا مضبوط حلقہ جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ اس آیت میں دین سے مراد وہ ہے جس کا اعتقاد رکھا جاتا ہے اور وہ ملت ہے اور اس پر قرینہ یہ ارشاد ہے: قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ اور اکراہ وہ جو ایمان، بیوع، ہبات وغیرہ احکام میں سے ہے یہ اس کا محل نہیں ہے، اس کی بحث اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ (مگر وہ جسے مجبور کیا جائے) کی تفسیر میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور ابوعبدالرحمن نے قَدْ تَبَيَّنَ الرَّشَدُ مِنَ الْغَيِّ پڑھا ہے اور اسی طرح حسن اور شعبی سے بھی روایت ہے۔ کہا جاتا ہے: رَشَدَ يَرْشُدُ رُشْدًا، اور رَشِدَ يَرْشَدُ رَشَدًا جب آدمی اس شے تک پہنچ جائے جسے وہ پسند کرتا ہے اور غویٰ اس کی ضد ہے۔ نحاس سے یہی منقول ہے۔ ابن عطیہ نے ابوعبدالرحمن السلمی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے الرشاد الف کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن سے اَلرُّشُدُ راء اور شین کے ضمہ کے ساتھ بھی مروی ہے (2)۔

اَلْغَيُّ یہ مصدر ہے غَوٰى يَغْوِيْ سے۔ جب کوئی آدمی اعتقاد یا رائے میں گمراہ ہو جائے اور یہ مطلقاً نہیں کہا جا سکتا اَلْغَيُّ فِي الضلال۔ (غی گمراہی میں ہے)

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں چھ اقوال ہیں:

(۱) کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کو دین اسلام پر مجبور کیا اور ان سے لڑائیاں کیں اور آپ ان سے اسلام کے بغیر کسی پر راضی نہ ہوئے۔ سلیمان بن موسیٰ نے یہی کہا ہے۔ انہوں نے کہا: اسے اس ارشاد سے منسوخ کر دیا ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (التوبہ:73) (اے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں کے ساتھ) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور بہت سے مفسرین سے یہی مروی ہے۔

(۲) یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ صرف اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی کہ انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جب وہ جزیہ ادا کریں اور وہ لوگ جن پر زبردستی کی جائے گی وہ بت پرست ہیں۔ سو ان سے اسلام کے سوا کوئی شے قبول نہیں کی جائے گی اور انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ۔ یہ حضرات شعبی، قتادہ، حسن اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے اور اس قول کی دلیل وہ روایت ہے جسے حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 19، دار احیاء التراث العربیۃ
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 344، دار الکتب العلمیہ

سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو سنا، آپ بوڑھی نصرانی عورت کو کہہ رہے تھے: اے بڑھیا! تو اسلام قبول کر لے تو محفوظ ہو جائے گی، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ اس نے جواب دیا: میں انتہائی بوڑھی عورت ہوں اور موت میرے بہت قریب ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ! گواہ رہنا اور پھر یہ آیت تلاوت کی: لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ الآیۃ۔

(۳) وہ قول ہے جو ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک عورت مقلات (وہ عورت جس کا بچہ زندہ نہ رہے) ہوتی تھی، پس وہ اپنے اوپر یہ لازم کر لیتی تھی کہ اگر اس کا بچہ زندہ رہا تو وہ اسے یہودی بنائے گی۔ پس جب بنونضیر کو جلاوطن کیا گیا تو ان سے انصار کے بہت سے بچے تھے۔ تو انہوں نے کہا: ہم اپنے بچے نہیں چھوڑیں گے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ۙ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔ ابوداؤد نے کہا ہے: مقلات وہ عورت ہوتی ہے جس کا بچہ زندہ نہ رہتا ہو(1)۔

ایک روایت میں ہے: بلاشبہ ہم نے کیا جو ہم نے کیا اور ہم گمان کرنے لگے کہ ان کا دین اس سے افضل ہے جس پر ہم ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے دین اسلام عطا فرمایا تو ہم انہیں اس پر مجبور کرنے لگے تب لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ نازل ہوئی (یعنی) جو چاہے وہ ان کے ساتھ مل جائے اور جو چاہے وہ دین اسلام میں داخل ہو جائے۔ یہ قول حضرت سعید بن جبیر، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہم کا ہے، مگر آپ نے یہ بھی کہا ہے: انصار کے بچوں کا بنی نضیر میں ہونے کا سبب رضاعت تھا (یعنی دودھ پلانے کے لئے بچے ان کے پاس چھوڑے گئے تھے۔)

نحاس نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول صحت اسناد کی وجہ سے تمام اقوال سے اولیٰ اور ارجح ہے اور یہ کہ اس کی مثل قول فقط رائے سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) سدی نے کہا ہے: یہ آیت انصار میں سے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی، اسے ابوحصین کہا جاتا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ شام سے کچھ تاجر زیتون کا تیل لے کر مدینہ طیبہ آئے اور جب انہوں نے وہاں سے جانے کا ارادہ کیا تو حصین کے دونوں بیٹے ان کے پاس آئے اور انہوں نے ان دونوں کو نصرانیت کی دعوت دی، سو وہ دونوں عیسائی ہو گئے اور ان کے ساتھ شام چلے گئے تو ان کا باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کے معاملے کی شکایت لے کر حاضر ہوا اور اس نے یہ خواہش کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسا آدمی بھیج دیں جو انہیں واپس لوٹا لائے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی: لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ اور اس وقت تک اہل کتاب کے ساتھ لڑنے کے بارے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اور آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو دور کر دیا ہے وہ دونوں کفر کرنے والوں میں اول ہیں۔'' پس ابوحصین کے دل میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں (کچھ ملال سا) پیدا ہوا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تلاش میں کوئی آدمی نہ بھیجا تو اللہ تعالیٰ جل شانہ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ الآیہ (النساء: 65) پھر اللہ تعالیٰ نے لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ کو منسوخ کر دیا اور اہل

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 9

کتاب کے ساتھ لڑائی کرنے کے بارے سورۂ برأت میں حکم ارشاد فرمایا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ کے سبب نزول کے بارے میں صحیح حضرت زبیر کا اپنے پڑوسی انصاری (1) کے ساتھ پانی والا واقعہ ہے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ۔

(۵) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے جو تلوار کے خوف سے اسلام لائے تم اسے مُجبَر اور مُکرَہ نہ کہو۔ یہی ان میں پانچواں قول ہے۔

(۶) اور چھٹا قول یہ ہے کہ یہ آیت قیدیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب وہ اہل کتاب میں سے ہوں کہ ان پر زبردستی نہ کی جائے جب وہ بڑے ہوں اور اگر وہ مجوسی ہوں چھوٹے ہوں یا بڑے یا بت پرست ہوں تو بلاشبہ انہیں اسلام پر مجبور کیا جائے گا، کیونکہ جس نے انہیں قیدی بنا رکھا ہے وہ ان سے ان کے بت پرست ہونے کے ساتھ کوئی نفع حاصل نہیں کر سکتا۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جاتا اور ان کی عورتوں سے وطی نہیں کی جاسکتی اور وہ مردار کھانے اور دیگر نجاستوں کے بارے اعتقاد رکھتے ہیں۔ مالک ان کے لئے انہیں نجس سمجھے گا اور ملک کے اعتبار سے ان سے نفع اٹھانا اس پر معتذر ہو جائے گا۔ نتیجۃً اس کے لئے زبردستی کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ابن القاسم نے مالک سے روایت کیا ہے اور رہے اشہب تو انہوں نے کہا ہے: وہ اس کے دین پر ہوں گے جس نے انہیں قیدی بنایا ہے۔ پس جب وہ انکار کریں تو انہیں اسلام پر مجبور کیا جائے اور چھوٹوں کا کوئی دین نہیں ہوتا۔ اسی لئے انہیں دین اسلام میں داخل ہونے پر مجبور کیا جائے تاکہ وہ کسی باطل دین کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔

پس تمام کی تمام انواع کفر جب جزیہ دینے لگیں تو ہم انہیں اسلام پر مجبور نہ کریں گے چاہے وہ عربی ہوں یا عجمی، قریشی ہوں یا کوئی اور...... اس کا بیان آگے آئے گا۔ علماء نے جزیہ کے بارے میں جو کہا ہے اور جس سے جزیہ قبول کیا جائے گا اس کا بیان سورۂ برأت میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ۔ شرط کی وجہ سے فعل کو جزم دی گئی ہے۔ الطاغوت مؤنث ہے طَغٰی یطغٰی سے۔ اور علامہ طبری نے یطغو بیان کیا ہے۔ جب کوئی حد سے اس پر زیادتی کرتے ہوئے تجاوز کر جائے (2) اور اس کا وزن فعلوت ہے۔

اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ مفرد مذکر اسم ہے گویا کہ یہ اسم جنس ہے اور قلیل و کثیر کے لئے واقع ہوتا ہے اور ابو علی کا مذہب یہ ہے کہ یہ مصدر ہے جیسا رَهَبُوت اور جَبَرُوت۔ اور اس کے ساتھ واحد اور جمع کی صفت لگائی جاسکتی ہے اور اس کے لام کلمے کو عین کلمے کی جگہ اور اس کے عین کو لام کی جگہ بدل دیا گیا ہے جیسا کہ جبذ اور جذب میں ہے۔ پھر واؤ کو متحرک ہونے اور اس کے ماقبل کے متحرک ہونے کی وجہ سے الف سے بدل دیا گیا ہے اور طاغوت کہا گیا ہے۔ اس قول کو نحاس نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 343، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً صحیح بخاری، باب سکر الانہار، حدیث نمبر 2187، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 25، دار احیاء التراث العربیۃ

اختیار کیا ہے اور کہا گیا ہے: طاغوت کی اصل لغت میں الطُغیان سے ماخوذ ہے اور یہ بغیر اشتقاق کے اپنا معنی ادا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے: لآل یہ اللؤلؤ سے ہے۔

اور مبرد نے کہا ہے: یہ جمع ہے اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے (1)۔

جوہری نے کہا ہے: الطاغوت سے مراد کاہن، شیطان اور ہر وہ ہے جو گمراہی میں سردار ہو اور کبھی یہ واحد ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ یَّكْفُرُوْا (النساء:60) ((اس کے باوجود) چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرانے کے لئے (اپنے مقدمات) طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ انکار کریں طاغوت کا۔) اور کبھی جمع ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ (البقرہ:257) (ان کے ساتھی شیطان ہیں۔) اور اس کی جمع طواغیت آتی ہے اور وَ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یہ معطوف ہے۔ اور فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى یہ جواب شرط ہے اور اَلْوُثْقٰی کی جمع الوُثَق ہے جیسا کہ اَلْفُضْلٰی کی جمع اَلْفُضَل ہے۔ اور الوُثْقٰی، فُعْلٰی کے وزن پر الوثاقة سے ہے اور یہ آیت تشبیہ ہے اور مشبہ بہ کے بارے میں مفسرین کی عبارت مختلف ہے۔

پس حضرت مجاہد نے کہا ہے: العروۃ سے مراد ایمان ہے اور سدی نے کہا: اسلام ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور یہ سب عبارات ایک ہی معنی کی طرف راجع ہیں۔ پھر فرمایا: لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (2) حضرت مجاہد نے کہا ہے: مراد یہ ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو تبدیل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ خود اپنے آپ کو تبدیل کرلیں یعنی ان سے ایمان کا نام زائل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ کافر ہو جائیں۔

اور الانفصام کا معنی ایسا ٹوٹنا ہے جس میں جدائی اور علیحدگی نہ ہو۔ اور القصم کا معنی، ایسا توڑنا ہے جس میں جدائی اور علیحدگی بھی ہو۔ اور صحیح حدیث میں ہے: ''پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی ختم ہوتی تو آپ کی پیشانی پسینے سے شرابور ہوتی (3)''۔ یعنی پیشانی پسینہ چھوڑ رہی ہوتی تھی۔

جوہری نے کہا: فصم الشیٔ اس نے اسے توڑ دیا اسے جدا کیے بغیر۔ آپ کہتے ہیں: فصمته فانفصم میں نے اسے توڑا تو وہ ٹوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَا انْفِصَامَ لَهَا اور اس کی مثل توڑ دیا جاتا ہے، جیسا کہ ذوالرمہ نے ہرن کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے وہ اسے چاندی کے بازوبند کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے:

کَأَنّه دُمْلُجٌ مِن فضة نَبَهٌ　　فی ملعب من جواری الحیّ مفصوم

بے شک اس نے اسے مفصوم قرار دیا ہے اس کے مڑنے اور ٹیڑھا ہونے کے سبب جب وہ سوتا ہے۔ اور مقصوم قاف کے ساتھ نہیں کہا اس لئے کہ یہ دو حصوں میں بٹ جانا ہوتا ہے۔ اور افصم المطر کا معنی ہے بارش تھم گئی۔ اور افصمت عنه الحمی (اس سے بخار اتر گیا) اور جب کفر شیطان کے ساتھ ہے اور ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جس کا زبان اقرار کرتی ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 344، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 2، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی، حدیث نمبر 2، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور دل اعتقاد رکھتا ہے تو نطق کے سبب صفات میں سے سَمِیْعٌ اور اعتقاد کی وجہ سے صفات میں سے عَلِیْمٌ ذکر کی گئی ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف۔ اور جنہوں نے کفر کیا ان کے ساتھی شیطان ہیں، نکال لے جاتے ہیں انہیں نور سے اندھیروں کی طرف۔ یہی لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، اَلْوَلِیُّ فعیل کے وزن پر بمعنی فاعل ہے۔ علامہ خطابی نے کہا ہے: الولی الناصر ینصر عبادہ المومنین۔ یعنی الولی کا معنی مددگار ہے وہ اپنے مومن بندوں کی مدد فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (اللہ تعالیٰ مددگار ہے ایمان والوں کا نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف۔) اور مزید فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝ (محمد) (یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مددگار ہے اور کفار کا کوئی مددگار نہیں۔)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الظلمات سے مراد گمراہی اور نور سے مراد ہدایت ہے اور اسی معنی کو ضحاک اور ربیع نے بیان کیا ہے۔

اور حضرت مجاہد اور عبدۃ بن ابی لبابہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ ایسی قوم کے بارے میں نازل ہوا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے اور جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفر کیا۔ پس یہی انہیں نور سے اندھیروں کی جانب نکالنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: گویا یہ اعتقاد رکھنے والے نے نور معتقد میں محفوظ رکھ دیا اور اس سے اندھیروں کی جانب نکل گیا۔ آیت کا لفظ اس تخصیص سے مستغنی ہے، بلکہ یہ تو ہر کفر کرنے والی جماعت میں مترتب ہوتا ہے جس کے بعض افراد ایمان لے آئے ہوں جیسا کہ عرب (1)، اس لئے کہ ان میں سے جو ایمان لایا اللہ تعالیٰ اس کا مددگار ہے اور اس نے اسے کفر کی تاریکی سے نور ایمان کی طرف نکال دیا اور جس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داعی مرسل کی تشریف آوری کے بعد کفر کیا تو اس کا شیطان اسے گمراہ کرنے والا ہے، گویا کہ اس نے اسے ایمان سے نکال دیا، جبکہ وہ اس کے لئے تیار اور اس میں داخل ہونے کے اہل تھا اور اس نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے جہنم میں داخل ہونے کا حکم لگا دیا، ایمان سے پھیرتے ہوئے۔ اس سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جو وہ کرتا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

اور حسن نے اَوْلِيَآءُهُمُ الطَّوَاغِيتُ پڑھا ہے، مراد شیاطین ہیں۔ واللہ اعلم

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

''کیا نہیں دیکھا آپ نے (اے حبیب!) اسے جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں اس وجہ سے کہ دی تھی اسے اللہ نے بادشاہی۔ جب کہ کہا ابراہیم (علیہ السلام) نے (اسے) کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ اس نے کہا: میں بھی جلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے تو تو نکال لا اسے مغرب سے۔ (یہ سن کر) ہوش اڑ گئے اس کافر کے اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلَمْ تَرَ یہ الف توقیفی ہے اور کلام میں تعجب کا معنی ہے یعنی انہوں نے اس کو تعجب میں ڈال دیا اور فراء نے کہا ہے: اَلَمْ تَرَ بمعنی ھل رأیتَ ہے یعنی کیا آپ نے اسے دیکھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا اور کیا آپ نے اسے دیکھا جو بستی کے پاس سے گزرا اور وہ نمروذ بن کوش بن کنعان بن سام بن نوح اپنے زمانے کا بادشاہ اور آگ اور مچھر والا تھا۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ، حضرت ربیع، حضرت سدی، حضرت ابن اسحاق اور حضرت زید بن اسلم وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کا ہے (1) اور اسے ہلاک کرنے کا واقعہ یوں ہے کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنگ لڑنے کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر مچھروں کا ایک باب کھول دیا۔ پس انہوں نے سورج کو ڈھانپ لیا اور اس کے لشکر کو کھانے لگے اور انہوں نے سوائے ہڈیوں کے اور کچھ نہ چھوڑا اور ان میں سے ایک اس کے دماغ میں داخل ہو گیا اور اسے کھا ڈالا یہاں تک کہ وہ چوہیا کی مثل ہو گیا اور اس کے بعد اس کے نزدیک لوگوں میں سے سب سے معزز وہ تھا جو اس کے دماغ پر بھاری ہتھوڑے کے ساتھ مارتا تھا۔ پس چالیس دن تک وہ اس آزمائش اور مصیبت میں مبتلا رہا۔

ابن جریج نے کہا ہے: زمین میں وہ پہلا بادشاہ تھا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول مردود ہے۔

اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: وہ پہلا حکمران ہے جس نے جبر و استبداد اور رعونت و سرکشی اختیار کی اور وہی بابل میں صاحب الصرح (محل کا مالک) تھا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ پوری دنیا کا حکمران تھا اور یہ دو کافر بادشاہوں میں سے ایک ہے اور دوسرا بخت نصر ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا تھا وہ نمروذ بن فالخ بن عابر بن شالح بن ارفخشد بن سام تھا۔ اس تمام کو ابن عطیہ نے بیان کیا ہے (1)۔

اور سہیلی نے بیان کیا ہے کہ وہ نمروذ بن کوش بن کنعان بن حام بن نوح تھا اور وہ سواد عراق کا بادشاہ تھا اور اسے اس ضحاک نے حکمران بنایا تھا جو ازدھاق سے معروف تھا اور اس کا نام بیوراسب بن اندراست تھا اور وہ تمام سلطنتوں کا بادشاہ تھا اور یہ وہی ہے جسے افریدون بن اثفیان نے قتل کیا تھا اور اس بارے میں حبیب کہتا ہے:

وَ کأنه الضحاك من فتكاتِه فی العالمین وأنْتَ أفْرِيدُونُ

ضحاک سرکش اور جابر حکمران تھا اور اس کی حکومت ہزار برس تک رہی جس بارے میں انہوں نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ پہلا حکمران ہے جس نے سولی دی اور پہلا حکمران ہے جس نے ہاتھ اور پاؤں کاٹے اور نمروذ کا صلبی بیٹا تھا اس کا نام ''کوش'' تھا یا اس نام کی طرح کا کوئی نام تھا اور اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام نمروذ الاصغر تھا اور نمروذ الاصغر ایک سال تک حاکم رہا۔ اور نمروذ الاکبر کی حکومت چار سو برس تک رہی جیسا کہ اس کے بارے ذکر کیا گیا ہے۔

اس جھگڑے کے قصص میں دو روایتیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے میلے کی طرف نکلے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے بتوں کے پاس گئے اور انہیں توڑ دیا۔ جب وہ واپس لوٹے تو آپ نے انہیں کہا: کیا تم ان کی عبادت کرتے ہو جو (ٹوٹ کر) گر جاتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا: تو کس کی عبادت کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں اپنے اس رب کی عبادت کرتا ہوں جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: بے شک نمروذ طعام (اناج) ذخیرہ کر لیتا تھا اور جب انہیں طعام کی حاجت ہوتی تھی تو وہ اس سے اسے خریدتے تھے اور جب وہ اس کے پاس آتے تھے تو اسے سجدہ کرتے تھے۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے پاس گئے تو آپ نے اسے سجدہ نہ کیا تو اس نے کہا: تجھے کیا ہے کہ تو مجھے سجدہ نہیں کرتا؟ آپ نے فرمایا: میں اپنے رب کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتا۔ نمروذ نے آپ کو کہا: تیرا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا: میرا رب وہ ہے جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔

حضرت زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ یہ نمروذ بیٹھ گیا اور لوگوں کو اہل و عیال کے لئے طعام لے جانے کا حکم دینے لگا۔ پس جب بھی کوئی قوم آتی یہ ان سے پوچھتا: تمہارا رب اور تمہارا الٰہ کون ہے؟ تو وہ کہتے: تو ہے، تو یہ کہتا: تم انہیں طعام دے دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے اہل و عیال کو طعام مہیا کرنے کے لئے اس کے پاس آئے تو اس نے آپ سے کہا: تمہارا رب اور تمہارا معبود کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ جب نمروذ نے یہ سنا تو اس نے کہا: میں بھی جلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سورج کے معاملہ کے ساتھ اس کا معارضہ کیا تو وہ کفر اختیار کرنے والا متحیر ہو گیا اور اس نے کہہ دیا: تم اسے اناج نہ دو۔ تو حضرت ابراہیم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

علیہ السلام بغیر کسی شے کے واپس اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ گئے۔ راستے میں آپ ریت کے ٹیلے کے پاس سے گزرے جو آٹے کی مثل تھا۔ تو آپ نے اپنے دل میں کہا: اگر میں اس سے اپنا بورا بھر لوں تو جب میں اسے لے کر گھر داخل ہوں گا تو بچے خوش ہو جائیں گے یہاں تک کہ میں انہیں دیکھ لوں گا۔ پس آپ وہ لے گئے، جب آپ اپنے گھر پہنچے تو بچے خوش ہو گئے اور وہ دونوں بوروں کے اوپر کھیلنے لگے اور آپ تھکاوٹ کی وجہ سے سو گئے۔ تو آپ کی زوجہ محترمہ نے کہا: اگر میں آپ کے لئے کھانا تیار کر دوں جب آپ بیدار ہوں گے تو آپ اسے موجود پائیں گے (اور تناول فرمالیں گے۔) چنانچہ اس نے ایک بورا کھولا تو انہوں نے اسے اس سے بھی اچھا پایا جتنا سفید آٹا ہوتا ہے اور پھر اس کی روٹیاں پکا دیں اور جب آپ نیند سے بیدار ہوئے تو اس نے وہ کھانا آپ کے سامنے رکھ دیا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا: یہ کہاں سے آیا ہے؟ اس نے جواب دیا: یہ وہی آٹا ہے جو آپ لائے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جان گئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آسانی پیدا فرما دی ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابوبکر بن ابی شیبہ نے ابو صالح سے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام طعام لانے کے لئے چلے اور آپ اس پر قادر نہ ہو سکے، تو آپ سرخ موٹی ریت کے پاس سے گزرے تو آپ نے اس سے بورے بھر لیے اور پھر اپنے گھر والوں کی طرف واپس لوٹ آئے۔ تو انہوں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ سرخ گندم ہے۔ پس انہوں نے اسے کھولا تو اسے سرخ گندم ہی پایا اور جب اس میں سے کچھ کاشت کی تو جڑ سے شاخ کے سرے تک سٹہ نکلا جو دانوں سے بھرا ہوا تھا (2)۔

اور ربیع وغیرہ نے ان قصص میں کہا ہے کہ نمروذ نے جب کہا میں جلاتا بھی ہوں اور مارتا بھی ہوں تو اس نے دو آدمیوں کو حاضر کیا، ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا اور کہا: تحقیق میں نے اسے زندہ کر دیا اور اسے مار دیا۔ اور جب آپ نے اس پر سورج کا معاملہ لوٹایا تو وہ مبہوت اور متحیر ہو گیا (3)۔ اور الخبر میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم! قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ میں سورج کو مغرب سے طلوع کروں گا تا کہ وہ جان لے کہ میں اس پر قادر ہوں (4)۔ پھر نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے حکم دیا تو انہیں آگ میں پھینک دیا گیا اور اسی طرح جابر حکمرانوں کی عادت ہے کہ جب کسی شے کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جائے اور دلیل لانے سے عاجز ہو جائیں تو وہ سزا دینے میں لگ جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگ سے نجات عطا فرمائی، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور سدی نے کہا ہے: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ سے نکلے تو انہوں نے آپ کو بادشاہ کے پاس پیش کر دیا ..... اور اس سے پہلے آپ کو اس پر پیش نہیں کیا گیا تھا ..... اور اس نے آپ سے گفتگو کی۔ اور آپ کو کہا: تیرا رب کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔ نمروذ نے کہا: میں بھی زندہ کر سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں، میں چار

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6، صفحہ 330، حدیث نمبر 31819، الزمان للشقافة والعلوم مدینہ منورہ

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 346

4۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4269، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آدمیوں کو پکڑوں گا اور انہیں ایک کمرے میں بند کر دوں گا اور وہ کوئی شے کھا پی نہیں سکیں گے یہاں تک کہ جب وہ بھوک سے نڈھال ہو جائیں گے تو میں انہیں نکال دوں گا اور دو کو کھانا وغیرہ کھلاؤں گا۔ پس وہ دونوں زندہ رہیں گے اور دو کو چھوڑ دوں گا اور وہ مر جائیں گے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بطور معارضہ سورج کا معاملہ پیش کر دیا (کہ اگر وہ طاقت رکھتا ہے تو وہ سورج کو مغرب سے طلوع کرے) تو وہ متحیر و مبہوت ہو گیا۔

علمائے اصول نے اس آیت میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب رب کریم کا وصف بیان کیا ایسی شے کے ساتھ جو اس کی صفت ہے یعنی احیاء (جلانا) اور اماتۃ (مارنا) لیکن یہ ایسا امر ہے جس کے لئے حقیقت اور مجاز دونوں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حقیقت کا قصد کیا(1) اور نمرود نے مجاز کی پناہ لی اور اپنی قوم پر جھوٹا امر پیش کر دیا۔ اور حضرت ابراہیم نے اسے بطور قیاس جدلی کے تسلیم کر لیا اور آپ اس کے ساتھ مثال سے منتقل ہو گئے اور اس کے سامنے ایک ایسا امر رکھ دیا جس میں مجاز نہیں ہے۔ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ یعنی اس کی دلیل اور حجت حکم سے کٹ گئی، ختم ہو گئی اور اس نے لئے یہ کہنا ممکن نہ رہا کہ میں سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہوں کیونکہ صاحب عقل و فہم اس کی تکذیب کر دیں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ کافر کو بادشاہ (مَلِكٌ) کا نام دینا جائز ہے جب اللہ تعالیٰ دنیا میں اسے بادشاہی، عزت اور بلندی عطا کر دے اور یہ مناظرہ، مجادلہ اور حجت قائم کرنے کے اثبات پر بھی دلالت کرتی ہے۔ قرآن و سنت میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس پر کثیر دلائل موجود ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝ (البقرہ) (آپ (انہیں) فرمایئے لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو)

اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ یعنی تمہارے پاس کوئی حجت نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ جھگڑا اور بتوں کی عبادت کے بارے میں آپ کی جانب سے ان کا رد بھی بیان فرمایا ہے جیسا کہ سورۃ الانبیاء وغیرہ میں ہے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا ہے: قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ۝ قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ۝ وَ لَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۝ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُهٗ فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ وَ اَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ۝ (ہود) (وہ (برافروختہ ہو کر) بولے اے نوح! تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور اس جھگڑے کو بہت طول دیا۔ اور میں بری الذمہ ہوں ان گناہوں سے جو تم کرتے ہو) اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ساتھ مجادلہ ہے اس کا کئی آیات میں ذکر ہے۔ پس یہ سب کی سب اللہ کی جانب سے دین کے بارے میں سوال و جواب اور مجادلہ کی تعلیم ہے، کیونکہ حق اور باطل کے درمیان فرق ظاہر ہی نہیں ہوتا مگر تبھی جب حق کی دلیل ظاہر اور غالب ہو اور باطل کی دلیل فاسد ہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب سے مجادلہ کیا اور حجت قائم کرنے کے بعد ان سے مباہلہ کیا، جیسا کہ اس کا بیان "آل

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 346، دار الکتب العلمیہ

عمران'' میں آئے گا اور حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آپس میں مکالمہ ہوا اور آدم علیہ السلام حجت کے ساتھ ان پر غالب آگئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب سقیفہ کے دن جھگڑتے رہے، ایک دوسرے کو دور ہٹاتے رہے، تقریر کرتے رہے اور باہم مناظرہ کرتے رہے یہاں تک کہ حق اس کے بارے میں ظاہر ہو گیا جو اس کے اہل تھا اور انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لینے کے بعد مرتدین کے بارے میں مناظرہ کیا، علاوہ ازیں کثیر ایسے واقعات ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: فَلِمَ تُحَاجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ میں اس پر دلیل ہے کہ علم کے ساتھ حجت پیش کرنا، احتجاج کرنا مباح ہے اور غور و فکر کرنے والوں کے درمیان شائع ہے۔

مزنی صاحب شافعی نے کہا ہے: مناظرہ کے حقوق میں سے یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کیا جائے اور اس سے جو شے واضح ہو اسے قبول کر لیا جائے۔

اور بعض نے کہا ہے: مناظرہ صحیح نہیں ہوتا اور مناظرہ کرنے والوں کے درمیان حق ظاہر اور واضح ہو جاتا ہے جبکہ وہ دین، عقل، فہم اور انصاف میں ایک دوسرے کے قریب ہوں یا ایک ہی مرتبہ میں مساوی اور برابر ہوں، مگر اس میں ریاکاری اور باہمی عداوت، مخالفت اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش ہوتی ہے۔

قراءات: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اَلَمْ تَرْ را کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور جمہور نے اسے متحرک پڑھا ہے اور یا جزم کے لئے حذف کر دی گئی ہے۔ اور اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ محل نصب میں ہے یعنی لِأن آتاہ اللہ، یا مِنْ اجلِ اَنْ آتاہ اللہ۔ اور جمہور قراء نے اَنَا اُحْيِ یعنی وصل کلام میں اَنَا سے نون کے بعد الف کو گرا کر پڑھا ہے اور نافع اور ابن ابی اویس نے اسے ثابت رکھا ہے، جب بھی پورے قرآن میں ہمزہ اس کے ساتھ ملا ہے سوائے اس قول کے: اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ کیونکہ وہ اسے اس جگہ میں اس کی قلت کے سبب تمام قراء کی طرح گرا دیتے ہیں، کیونکہ یہ قرآن کریم میں صرف تین مقامات پر واقع ہوا ہے اور یہ اپنے قلیل ہونے کی وجہ سے اس کے قائم مقام ہے جس کے بعد ہمزہ نہ ہو لہٰذا الف کو وصل کلام میں بھی حذف کر دیا گیا۔

علمائے نحو نے کہا ہے: متکلم کی ضمیر اسم ہے اس میں ہمزہ اور نون ہے، اور جب تو کہے: أَنَا یا أَنَهْ تو الف اور ہاء وقف میں حرکت کو بیان کرنے کے لئے ہیں اور جب کلمہ کسی شے سے متصل ہو تو وہ دونوں ساقط ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ شے جس کے ساتھ کلمہ متصل ہوتا ہے وہ قائم مقام الف کے ہوتا ہے۔ پس یہ نہیں کہا جائے گا: أنا فعلت الف کے اثبات کے ساتھ مگر شعر میں یہ شاذ ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أنا سیف العشیرة فاعرفونی حُمَیدا قد تذَرّیتُ السّناما

نحاس نے کہا ہے: اس بنا پر کہ نافع نے الف کو ثابت رکھا ہے اور پڑھا ہے ''أَنَا أُحْيِي وَ أُمِيتُ'' اس کی کوئی وجہ اور علت نہیں ہے۔ مکی نے کہا ہے: بصریوں کے نزدیک الف زائدہ ہے اور ان کے نزدیک اسم مضمر ہمزہ اور نون ہیں اور الف کو تقویت کے لئے زائد کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وقف کے لئے زائد کیا گیا ہے تاکہ نون کی حرکت ظاہر ہو۔ اور کوفیوں کے نزدیک أنا مکمل طور پر اسم ہے۔ پس نافع نے ان کے قول کے مطابق اصل کی بنا پر الف کو ثابت رکھا ہے اور

جنہوں نے الف کو حذف کیا ہے تو انہوں نے تخفیف کے لئے اسے حذف کیا ہے کیونکہ فتحہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

جوہری نے کہا ہے: اور رہا ان کا قول أنا تو یہ اسم کنایہ ہے اور یہ اکیلا متکلم کے لئے ہے اور یہ مبنی بر فتحہ ہے تاکہ اس کے اور أنْ حرف ناصب کے درمیان فرق ہو سکے اور آخر میں الف حالت وقف میں حرکت کے بیان کے لئے ہے اور اگر درمیان کلام میں ہو تو یہ گر جاتا ہے سوائے لغت ردیہ کے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

أنا سیف العشیرۃ فاعرفونی حُمیدا قد تَذَرَّیْتُ السناما

اور بَهُتَ الرجل و بَهِت و بُهت کا معنی ہے جب آدمی کے پاس کوئی دلیل باقی نہ رہے اور وہ متحیر ہو کر خاموش ہو جائے۔ یہ نحاس وغیرہ سے منقول ہے۔

اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور انہوں نے بعض عربوں سے اس معنی میں بَهَتَ یعنی با اور ہا کے فتحہ کے ساتھ بھی بیان کیا ہے (1)۔ ابن جنی نے کہا ہے: ابو حیوہ نے فَبَهُتَ الَّذِیْ کَفَرَ یعنی با کے فتحہ اور ہا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی بُهت میں ایک لغت ہے۔ فرمایا: اور ابن السمیقع نے فَبَهَتَ باء اور ہاء کے فتحہ کے ساتھ اس معنی پر پڑھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے متحیر کر دیا جس نے کفر کیا۔ پس الذی محل نصب میں ہے۔ فرمایا: اور یہ بھی جائز ہے کہ بَهَتَ فتحہ کے ساتھ بَهُتَ میں ہی ایک لغت ہو۔

فرمایا: ابوالحسن اخفش نے فَبَهِتَ کی قراءت بیان کی ہے جیسا کہ غَرِقَ اور دَهِشَ۔

مزید کہا: اکثر نے ہا میں ضمہ پڑھا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ایک قوم نے اس کی قراءت کی تاویل کی ہے جنہوں نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ بمعنی سَبَّ (گالی گلوچ دینا) اور قذف (تہمت لگانا) ہے۔ اور بلاشبہ نمرود وہی ہے جس نے اس وقت گالیاں دیں جب اس کے دلائل ختم ہو گئے اور اس کے پاس کوئی حیلہ نہ رہا (2)۔

أَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيِ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۵۹

"یا (کیا نہ دیکھا) اس شخص کو جو گزرا ایک بستی پر درآنحالیکہ وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل۔ کہنے لگا کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد۔ سو مردہ رکھا اسے اللہ تعالیٰ نے سو سال تک پھر زندہ کیا اسے۔ فرمایا: کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا؟ اس نے عرض کی: میں ٹھہرا ہوں گا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ نے فرمایا: نہیں، بلکہ ٹھہرا رہا ہے تو سو سال اب (ذرا) دیکھ اپنے کھانے اور اپنے پینے (کے سامان)

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 32، دار احیاء التراث العربیۃ 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 347، دار الکتب العلمیہ

کی طرف۔ یہ باسی نہیں ہوا اور دیکھ اپنے گدھے کو اور یہ سب اس لئے کہ ہم بنائیں تجھے نشانی لوگوں کے لئے اور دیکھ ان ہڈیوں کو کہ ہم کیسے جوڑتے ہیں انہیں پھر (کیسے) ہم پہناتے ہیں انہیں گوشت، پھر جب حقیقت روشن ہوگئی اس کے لئے (تو) اس نے کہا میں جان گیا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا۔ اَوْ معنی پر محمول کرتے ہوئے عطف کے لئے ہے اور امام کسائی اور فراء کے نزدیک تقدیر کلام یہ ہے: هل رأیت کالذی حاج ابراهیم فی ربه او کالذی مرّعلی قریة۔

اور مبرد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے الم ترالی الّذی حاج ابراهیم فی ربه، ألم ترمن هو! کالذی مرّعلی قریة۔ پس کلام میں مَنْ هو کے الفاظ مضمر ہیں۔

ابو سفیان بن حسین نے اَوَ کَالَّذِی مَرَّ واؤ کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ واؤ عاطفہ ہے اور اس پر الف استفہام داخل ہے جس کا معنی تقریر (1) (پختہ کرنا) ہے۔ اور القریة (یعنی خاص بستی) کو قریة (کوئی بستی) کا نام دیا گیا ہے اس لئے کہ اس میں لوگوں کا اجتماع تھا۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: قریتُ الماء یعنی میں نے پانی جمع کیا۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

سلیمان بن بریدہ، ناجیہ بن کعب، قتادہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ربیع، عکرمہ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے جو اس بستی کے پاس سے گزرا تھا وہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے۔

حضرات وہب بن منبہ، عبداللہ بن عبید بن عمیر، عبداللہ بن بکر بن مضر رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ ارمیاہ تھے اور وہ نبی تھے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: ارمیاء ہی حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ نقاش نے وہب بن منبہ سے اسے بیان کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے مگر یہ کہ وہ ایک نام ہو جو اس نام کے موافق ہو کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمعصر تھے اور یہ جو اس بستی کے پاس سے گزرے وہ ان کے بعد کے زمانہ میں حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے جیسا کہ اسے حضرت وہب بن منبہ نے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اگر خضر علیہ السلام ہی ارمیاء ہوں تو کوئی بعید نہیں کہ وہی ہوں کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت سے اب تک مسلسل موجود ہیں۔ اس بارے میں صحیح روایت اسی طرح ہے۔ اس کا بیان سورۃ الکہف میں آئے گا اور اگر وہ اس واقعہ سے پہلے وصال فرما چکے ہیں تو پھر ابن عطیہ کا قول صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

نحاس اور مکی نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی تھا اس کا نام معلوم نہیں۔ نقاش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے وہ حضرت لوط علیہ السلام کا غلام تھا (2)۔

سہیلی نے قتبی سے بیان کیا ہے وہ ان کے دو قولوں میں سے ایک کے مطابق شعیا تھے اور وہ جس نے اس بستی کو برباد ہونے کے بعد زندہ (آباد) کیا تھا وہ کوشک الفارسی ہے۔ اور حضرت وہب بن منبہ، حضرت قتادہ، حضرت ربیع بن انس وغیرہم کے قول کے مطابق وہ بستی جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ بیت المقدس ہے۔ فرمایا: وہ مصر سے آنے والا تھا اور اس کے جس طعام و

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 347، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

شراب کا ذکر کیا گیا ہے وہ سبز انجیر اور انگور اور چمڑے سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا برتن شراب کا تھا اور یہ بھی ہے کہ اس میں جوس تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پانی کا ایک مٹکا تھا یہی اس کی شراب تھی اور وہ جس نے اس وقت بیت المقدس کو خالی کرایا وہ بخت نصر تھا اور وہ عراق پر لہراسب کی طرف سے پھر یستاسب بن لہراسب والد اسبند یاد کی جانب سے والی تھا۔

نقاش نے بیان کیا ہے کہ ایک قوم نے کہا ہے: یہ ایک الٹی کی ہوئی بستی تھی۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابو صالح کی روایت میں کہا ہے کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل سے جنگ لڑی اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو قیدی بنا لیا۔ وہ انہیں لے کر آیا اور ان میں عزیر بن شرخیا بھی تھے اور وہ بنی اسرائیل کے علماء میں سے تھے۔ پس وہ ان کے ساتھ بابل کی طرف آئے، وہ ایک دن اپنے کسی کام سے ہرقل کی عبادت گاہ کی طرف دریائے دجلہ کے کنارے پر نکلے۔ پس وہ درخت کے سائے میں اترے اور وہ اپنے ایک گدھے پر سوار تھے۔ انہوں نے درخت کے سائے میں گدھا باندھا پھر بستی کا چکر لگایا اور وہاں کوئی رہائشی نہ دیکھا اور یہ بستی اپنی چھتوں کے بل گری پڑی تھی تو کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی ہلاکت و بربادی کے بعد زندہ کرے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ یہ وہ بستی ہے جس سے موت کے ڈر سے ہزاروں افراد نکلے۔

ابن زید نے یہی کہا ہے۔ اور ابن زید سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ لوگ جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے وہ ہزاروں تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: تم مر جاؤ، ان کے پاس سے کوئی آدمی گزر رہا درآنحالیکہ وہ خالی ہڈیاں تھے جو بالکل ظاہر تھیں۔ پس وہ آدمی کھڑے ہو کر دیکھنے لگا اور اس نے کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا، تو اللہ تعالیٰ نے اسے سو برس تک مردہ رکھا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: ابن زید کی جانب سے یہ قول آیت کے الفاظ کے مناقض ہے، کیونکہ یہ آیت ایسی بستی کو متضمن ہے جو گری پڑی ہے اور اس میں کوئی انیس و غمخوار نہیں ہے اور ھذہٖ کے ساتھ اشارہ اسی بستی کی طرف ہے اور اسے زندہ کرنے سے مراد اسے آباد کرنا ہے اور اس میں عمارتوں اور رہنے والوں کا موجود ہونا ہے (1)۔

حضرت وہب بن منبہ، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت ربیع اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ بستی بیت المقدس ہے جبکہ اسے بخت نصر بابلی نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔

اور طویل حدیث میں ہے کہ جس وقت بنی اسرائیل ایسے واقعات سے دوچار ہوئے تو ارمیاء یا عزیر اس بستی کے پاس ٹھہرے اور وہ بہت بڑے ٹیلے کی مانند تھی بیت المقدس کے وسط میں، کیونکہ بخت نصر نے اپنے لشکر کو اس کی طرف مٹی منتقل کرنے کا حکم دیا تھا یہاں تک کہ اس نے اسے پہاڑ کی طرح بنا دیا اور ارمیاء نے گھروں کو دیکھا، ان کی دیواریں ان کی چھتوں پر گری پڑی ہیں۔ تو انہوں نے کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا۔

اور العریش کا معنی ہے: مکان کی چھت۔ اور ہر وہ شے جو اس لئے تیار کی جاتی ہے کہ وہ سایہ دے یا وہ چھپا لے تو وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 347، دار الکتب العلمیہ

عریش ہے اور اسی سے عریش الدالیہ بھی ہے (کنویں کی من) اور اسی سے رب کریم کا ارشاد بھی ہے: وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ۔ سدی نے کہا ہے: کہتے ہیں هی ساقطة علی سقفها، یعنی چھتیں گریں پھر ان پر دیواریں گر پڑیں۔ اسے طبری نے اختیار کیا ہے اور سدی کے علاوہ دوسروں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ بستی لوگوں سے خالی ہے اور گھر قائم ہیں۔ اور خاویة کا معنی خالیة (خالی ہونا) ہے۔ اور الخَوَاء کا اصل (معنی) الخلوّ ہے۔ کہا جاتا ہے: خَوَالدار و خَوِیَتْ تَخْوَی خواء (یہ الف ممدودہ کے ساتھ بھی ہے) و خَوِیًا: أقوت یعنی گھر کا ساکنین سے خالی ہونا(1)۔ اور اسی طرح جب وہ ساقط ہو جائے، گر جائے اور اسی معنی میں رب کریم کا یہ ارشاد ہے: فَتِلْكَ بُیُوْتُهُمْ خَاوِیَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا (نمل: 52) اس میں خَاوِیَةً بمعنی خالیہ ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خَاوِیَةٌ بمعنی ساقطة ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: فَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا یعنی وہ گرنے والی ہے اپنی چھتوں پر۔

الخَوَاء الجوع پیٹ کے غذا سے خالی ہونے کے لئے بولا جاتا ہے اور خَوَت المرأة اور خَوِیت بھی ہے خَوًی یعنی عورت کا پیٹ ولادت کے وقت خالی ہو گیا۔ اور خوّیت لها تخویة کہا جاتا ہے جب تو اس کے لئے کھانا تیار کرے جسے وہ کھائے گی اور اس سے مراد طعام ہے۔ اور الخَوِیّ فَعِیل کے وزن پر ہے اور اس سے مراد زمین کا نشیبی ہموار حصہ ہے۔ اور خوّی البعیر جب اونٹ کے بیٹھنے کے وقت اس کا پیٹ زمین سے دور ہوا اور اسی طرح آدمی اپنے سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا اس کا معنی ہے: کونسے طریقے اور کون سے سبب سے اللہ تعالیٰ اسے موت کے بعد زندہ کرے گا؟ ظاہر لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ بستی کو آبادی اور مکینوں کے ساتھ زندہ کرنے کے بارے سوال ہے، جیسا کہ اب ان خراب و برباد شہروں کے بارے کہا جاتا ہے جو آباد ہونے اور مکینوں سے دور ہوتے ہیں کہ یہ کیونکر اپنی بربادی کے بعد آباد ہوں گے۔ گویا کہ یہ وہاں کھڑے ہونے والے کی طرف سے اظہار افسوس ہے جو اس شہر پر عبرت کی نظر ڈال رہا ہے جس میں اس کے گھر والے اور اس کے دوست احباب موجود تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اس کی ذات میں ایسی شے سے مثال بیان فرمائی جو اس سے عظیم تر ہے جس کے بارے اس نے سوال کیا ہے اور وہ مثال جو اس کے لئے اس کی ذات میں بیان کی گئی ہے وہ احتمال رکھتی ہے کہ اس کا سوال بنی آدم کے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کیونکر اس کے مردوں کو زندہ کرے گا(2)۔

علامہ طبری نے بعض سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: یہ قول احیاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک ہے اور اسی لئے اس کی ذات میں اس کی مثال بیان کی گئی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس پر اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کوئی شک داخل نہیں ہو سکتا کہ وہ بستی کو دوبارہ آباد کر کے اسے زندہ کر دے۔ بلاشبہ دوسری وجہ میں شک کا تصور صرف جاہل کی طرف سے کیا جا سکتا ہے اور درست یہ ہے کہ آیت میں شک کی کوئی تاویل نہ کی جائے(3)۔

قولہ تعالیٰ: فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ، مِائَةَ یہ ظرف کی بناء پر منصوب ہے اور عام بمعنی سال ہے۔ کہا جاتا ہے: سنون

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 39، دار احیاء التراث العربیۃ　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 348، دار الکتب العلمیہ　　3۔ ایضاً

عُوَّم یہ پہلے کی تاکید کے لئے ہے، جیسے کہا جاتا ہے: بینھم شُغُلٌ شَاغِلٌ۔ اور عجاج نے کہا ہے: مِن مرّ أعوامِ السنین العُوَّم اس میں العوم السنین کی تاکید کے لئے ہے۔

اور یہ تقدیر میں عائم کی جمع ہے، مگر یہ مفرد مذکور نہیں ہوتا کیونکہ یہ اسم نہیں ہے بلکہ یہ تو تاکید ہے۔ جوہری نے یہی کہا ہے۔ اور نقاش نے کہا ہے: العام مصدر ہے جیسا کہ عوم مصدر ہے اور اس کے ساتھ سال بھر کے زمانے کا نام رکھا گیا ہے کیونکہ یہ سورج کے فلک میں گھومنے اور چکر لگانے سے پیدا ہوتا ہے۔

اور العوم، السَّبْح کی طرح ہے (یعنی تیرنا) اور رب العالمین نے ارشاد فرمایا ہے: كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ (الانبیاء) (سب (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہے ہیں۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ نقاش کے قول کے معنی میں ہے اور العام اس بنا پر القول اور القال کی طرح ہے اور اس اماتت (مارنے) کا ظاہر معنی جسم سے روح کو نکالنا ہے اور اس آیت کے قصص میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ اس کے لئے بھیجا جو اسے آباد کرے گا اور اس بارے میں اہتمام اور کوشش کرے گا، یہاں تک کہ اس کی آبادی کا کمال کہنے والے کو دوبارہ اٹھانے (زندہ کرنے) کے ساتھ ہوگا (1)۔ اور کہا گیا ہے کہ جب اس کی موت کو ستر برس گزر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ملوک فارس میں سے ایک عظیم بادشاہ بھیجا اسے کوشک کہا جاتا ہے تو اس نے اسے تیس سال میں آباد کر دیا۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثَهٗ اس کا معنی ہے: پھر اس نے اسے زندہ کر دیا۔ اس کے بارے میں کلام ہو چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ كَمْ لَبِثْتَ۔ یہ قول کہنے والے کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ رب العالمین ہے اور اس نے اسے یہ نہیں کہا ''اگر تو سچا ہے'' جیسا کہ ملائکہ کو فرمایا تھا جیسا کہ پہلے بحث گزر چکی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس نے آسمان کی جانب سے ہاتف غیبی سے سنا وہ اسے یہ کہہ رہا ہے اور یہ بھی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اس سے مخاطب ہوئے۔ اور یہ بھی ہے کہ نبی علیہ السلام نے کہا۔ اور یہ بھی ہے کہ ایک مومن آدمی جو اس کی قوم میں سے تھا اور اس نے اسے مرتے وقت دیکھا تھا اور وہ اس کے زندہ ہونے کے وقت تک زندہ تھا تو اس نے اسے کہا: كَمْ لَبِثْتَ (کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اظہر بات یہ ہے کہ کہنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا۔ واللہ اعلم۔

اہل کوفہ نے كَمْ لَبِثْ پڑھا ہے یعنی ثا کو تا میں قریب المخرج ہونے کی وجہ سے ادغام کر دیا ہے کیونکہ ان دونوں کا مخرج طرف لسان اور ثنایا علیا کی جڑیں ہیں اور اس اعتبار سے بھی کہ یہ دونوں حروف مہموسہ میں سے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: ثا اور تا کا مخرج جدا جدا ہونے کی وجہ سے اظہار احسن اور بہتر ہے اور کہا جاتا ہے: یہ سوال علی جہۃ تقریر فرشتے کے واسطہ سے تھا۔ اور کم ظرف کی بنا پر محل نصب میں ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 349، دار الکتب العلمیہ

قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ۔ اس نے یہ قول اس بنا پر کیا جو اس کے نزدیک تھا اور جو اس کے گمان میں تھا اور اس بنا پر وہ اپنی خبر دینے میں جھوٹا نہیں ہو سکتا اور اسی کی مثل اصحاب کہف کا قول ہے: قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (الکہف: 19) (بعض نے کہا ہم ٹھہرے ہوں گے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ) بلاشبہ وہ تین سو نوے برس تک ٹھہرے رہے...... جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا...... اور وہ جھوٹے نہیں تھے کیونکہ انہوں نے اس مدت کی خبر دی جو ان کے نزدیک تھی، گویا کہ انہوں نے کہا: جو ہمارے نزدیک ہے اور جو ہمارے گمان میں ہے (وہ یہ ہے) کہ ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے۔ اور اس کی نظر ذوالیدین کے قصہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بھی ہے: لم أقصر ولم أنس (1) (یعنی نہ نماز کم ہوئی اور نہ میں بھولا۔)

اور لوگوں میں سے جو کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے وہ اس بنا پر ہے کہ اس میں جھوٹ حقیقتاً موجود ہے لیکن اس کے سبب اس کا مواخذہ نہیں، ورنہ جھوٹ سے مراد کسی شے کے بارے میں ایسی خبر دینا ہے جو اس کی حقیقت کے خلاف ہو اور یہ علم اور جہالت کے سبب مختلف نہیں ہوتا اور یہ اصول کی نظر میں واضح اور بین ہے اور اس بنا پر جائز ہے کہ یہ کہا جائے: بے شک انبیاء علیہم السلام کسی شے کے بارے ایسی خبر دینے سے معصوم نہیں ہیں جو خلاف واقعہ ہو بشرطیکہ وہ بالقصد اور بالارادہ نہ ہو، جیسا کہ وہ سہو ونسیان سے معصوم نہیں ہیں۔ اور یہ وہ ہے جو اس آیت سے تعلق رکھتا ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ابن جریج، قتادہ اور ربیع نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے ایک دن صبح کو موت دی پھر اسے غروب آفتاب سے پہلے زندہ کر کے اٹھا دیا گیا تو اس نے اسے ایک دن گمان کیا اور کہا: میں ایک دن ٹھہرا، پھر اس نے سورج کو باقی دیکھا اور اسے جھوٹا ہونے کا خوف لاحق ہوا تو اس نے کہہ دیا: ''یا دن کا کچھ حصہ'' تو اسے کہا گیا: ''بلکہ تو سو سال تک ٹھہرا رہا'' اور بستی کی آبادی، اس کے درخت اور اس کی ان عمارتوں کو دیکھا جو اس پر دال تھیں (2)۔

قولہ تعالیٰ: فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ۔ طعام سے مراد وہ انجیر ہے جو اس نے اس بستی کے درختوں سے جمع کیا تھا جس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح قراءت کی ہے وھذا طعامك و شرابك لم يَتَسَنَّهْ (اور یہ تیرے کھانے اور تیرے پینے کا سامان ہے، یہ باسی نہیں ہوا) اور طلحہ بن مصرف وغیرہ نے اس طرح پڑھا ہے: وانظر لطعامك و شرابك لمائة سنة (3) اور جمہور نے وصل کلام میں ہا کو ثابت رکھا ہے مگر اخوان (حمزہ اور کسائی) اسے حذف کرتے ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس پر وقف ہا کے ساتھ ہے اور طلحہ بن مصرف نے بھی لم یَسَّنَّ۔ وانظر پڑھا ہے سین میں تا کو مدغم کیا گیا ہے (4)۔ اور جمہور کی قراءت کے مطابق ہا اصلیہ ہے اور ضمہ کو جزم کے سبب حذف کر دیا گیا ہے اور یہ یَتَسَنَّهْ ہو جاتا ہے یہ السَّنه سے ہے یعنی سالوں نے اسے تبدیل نہیں کیا۔ جوہری نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے سُنُون اور السَّنَة یہ السِّنین کی واحد ہے۔ اور اس کے ناقص ہونے میں دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک کے مطابق یہ واوی ہے اور آخر میں ہا ہے۔ اور اس کی اصل سَنْهَة، جَبْهَةٌ کی مثل ہے کیونکہ یہ سَنَهتِ النخلةُ و تسنَّهت سے ہے جب اس پر کئی

1۔ سنن نسائی، کتاب الصلوۃ، جلد 1، صفحہ 181۔ ایضاً صحیح بخاری، باب هل يأخذ الامام الخ، حدیث نمبر 673، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 348، دار الکتب العلمیہ　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 350

سال گزر جائیں۔ اور نخلة سَنَاء یعنی درخت ایک سال بار آور ہوتا ہے اور دوسرا سال بار آور نہیں ہوتا۔ اور سَنْهَاء بھی ہے۔ جیسا کہ انصار میں سے کسی نے کہا ہے:

فَلَيْسَتْ بِسَنْهَاءٍ وَلَا رُجَبِيَّةٍ　وَلٰكِنْ عَرَايَا فِي السِّنِينَ الجَوَائِحِ (1)

اور أَسْنَهتَ عند بنی فلان تو اس کے پاس مقیم رہا، و تَسَنَّيت بھی ہے۔ اور استأجرته مساناة و مُسَانهة بھی ہے اور اس کی تصغیر سُنَيَّة اور سُنَيْهَةٌ ہے۔

نحاس نے کہا ہے: جس نے لم یتسنّ اور انظر پڑھا ہے اس نے تصغیر میں سُنَيَّة کہا ہے اور الف کو جزم کے لئے حذف کر دیا ہے اور وقف ہا پر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: لم یتسنه یہ ہا بیان حرکت کے لئے ہوتی ہے۔

مہدوی نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ اس کی اصل سانَيْتُه مساناة سے ہے یعنی میں نے اس کے ساتھ یکے بعد دیگرے کئی سال معاملہ کیا۔ یا یہ سانہت (ہا کے ساتھ) سے ہے۔ پس اگر یہ سانیت سے ہو تو اس کی اصل یتسنّى ہے اور الف جزم کی وجہ سے گر گئی۔ اور یہ اصل میں واوی ہے اور اس کی دلیل ان کا یہ قول ہے سنوات اور اس میں ہا برائے سکتہ ہے اور اگر یہ سانہت سے ہو تو پھر ہا فعل کے لام کلمہ کی جگہ ہے اور سنة کی اصل اس بنا پر سَنْهَة ہے اور پہلے قول کی بنا پر سَنَوَة ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أَسِنَ الماء سے ماخوذ ہے۔ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب پانی متغیر ہو جائے اور اس بنا پر اس کا یتأسن ہونا لازم آتا ہے۔ ابو عمرو الشیبانی نے کہا ہے: یہ اس ارشاد سے ہے حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۞ (الحجر) پس معنی ہے کہ وہ متغیر نہ ہوا۔ زجاج نے کہا ہے: اس طرح نہیں ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ مَّسْنُوْنٍ کا معنی متغیر (تبدیل شدہ) نہیں ہے بلکہ اس کا معنی زمین کی سبزی اور طراوت پر انڈیل دیا جانا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: شیبانی کے قول کے مطابق اس کی اصل یتسنّن ہے۔ دونوں میں سے ایک کو یا سے بدل دیا گیا ہے کیونکہ اس میں تضعیف (مضاعف ہونا) مکروہ ہے تو یہ یتسنی ہو گیا۔ پھر حالت جزمی میں الف کو گرا دیا گیا اور سکتہ کے لئے ہا داخل کر دی گئی۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: لَمْ يَتَسَنَّهْ کا معنی ہے: وہ بدبودار نہیں ہوا۔

نحاس نے کہا ہے: اس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں اصح یہ ہے کہ یہ السَّنَةِ سے ہے یعنی سالوں نے اسے تبدیل نہیں کیا۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ السَّنَة سے ہو اور اس کا معنی قحط سالی ہے۔ اور اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ (الاعراف: 130) (اور بے شک ہم نے پکڑ لیا فرعونیوں کو قحط سالی سے) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: اَللّٰهُمَّ اجعلها علیهم سِنِيْنَ كسِنِي يوسف (2) (اے اللہ! ان پر قحط سالی مسلط کر دے حضرت یوسف علیہ السلام (کے زمانے) کے قحط کی طرح) اسی سے کہا جاتا ہے: أَسْنَتَ القومُ یعنی قوم قحط میں مبتلا ہو گئی۔ پس معنی یہ ہو گا: قحطوں اور خشک سالیوں نے تیرے طعام کو تبدیل نہیں کیا یا سالوں اور برسوں نے اسے متغیر نہیں کیا

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 46، دار احیاء التراث العربیۃ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء، جلد 1، صفحہ 136، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تسمیۃ الولید، حدیث نمبر 5732، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یعنی وہ اپنی طراوت اور عمدگی پر باقی رہا۔

قولہ تعالیٰ: وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ۔ حضرت وہب بن منبہ وغیرہ نے کہا ہے: اس کی ہڈیوں کے جڑنے اور اس کے ایک ایک عضو کے زندہ ہونے کی طرف دیکھ۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اسی طرح زندہ کیا یہاں تک کہ وہ جڑی ہوئی ہڈیاں ہو گیا، پھر اس پر گوشت پیدا کر دیا یہاں تک کہ وہ کامل گدھا بن گیا۔ پھر اس کے پاس ایک فرشتہ آیا اور اس نے اس میں روح پھونک دی تو گدھا کھڑا ہو کر ہینگنے لگا۔ یہی موقف اکثر مفسرین کا ہے۔

حضرت ضحاک اور حضرت وہب بن منبہ سے بھی یہ روایت کیا گیا ہے کہ ان دونوں نے کہا، بلکہ اسے کہا گیا: تو اپنے گدھے کی طرف دیکھ درآنحالیکہ وہ اپنے باندھنے کی جگہ میں کھڑا ہے، سو برس میں اسے کوئی شے (آفت، تکلیف) نہیں پہنچی۔ اور وہ ہڈیاں جن کی طرف اس نے دیکھا ہے وہ اس کی اپنی ہڈیاں تھیں، اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھوں اور اس کے سر کو پہلے زندہ کر دیا اور ابھی اس کا سارا جسم مردہ تھا۔ ان دونوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ارمیاء اور اس کے گدھے کی طرف اتنی طویل مدت تک دیکھنے سے اندھا کیے رکھا (1)۔

قولہ تعالیٰ: وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ۔ فراء نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَلِنَجْعَلَكَ میں واؤ داخل کی گئی ہے اس پر دلالت کرنے کے لئے کہ یہ اپنے مابعد فعل کے لئے شرط ہے۔ اس کا معنی ہے: وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ، و دلالة على البعث بعد الموت جعلنا ذالك۔ (اور یہ سب اس لئے) (کہ ہم بنائیں تجھے لوگوں کے لئے نشان) اور ہم نے بعث بعد الموت پر بطور دلیل اسے بنایا ہے۔ اور اگر تو چاہے تو واؤ کو مقحمہ زائدہ بنا لے۔ اور اعمش نے کہا ہے: اس کے نشانی ہونے کا محل یہ ہے کہ وہ اپنی اسی حالت پر نوجوان اٹھا جس حالت پر وہ اس دن تھا جس دن فوت ہوا اور اس نے بیٹے اور پوتے بڑھاپے کی حالت میں پائے۔ حضرت عکرمہ نے کہا ہے: جس دن وہ فوت ہوا اس وقت اس کی عمر چالیس برس تھی (2)۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عزیر اپنے گھر والوں سے نکلے اور پیچھے اپنی حاملہ بیوی چھوڑی۔ آپ کی عمر پچاس سال تھی اور اللہ تعالیٰ نے سو برس آپ کو مردہ حالت میں رکھا، پھر آپ کو اٹھایا اور آپ لوٹ کر اپنے گھر والوں کی طرف گئے اس حال میں کہ آپ پچاس سال کے جوان تھے اور آپ کا بیٹا سو برس کا تھا۔ پس آپ کا بیٹا آپ سے پچاس برس بڑا تھا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر کو زندہ کیا تو وہ اپنے گدھے پر سوار ہوئے اور اپنے محلہ میں آئے، تو نہ وہ لوگوں کو پہچان سکے اور نہ ہی لوگ انہیں پہچان سکے۔ اور انہوں نے اپنے گھر میں ایک نابینی بڑھیا کو پایا وہ ان کی کنیز تھی۔ جب حضرت عزیر ان سے نکلے تھے اس وقت اس کی عمر بیس برس تھی۔ تو آپ نے اسے فرمایا: کیا یہ عزیر کا گھر ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ پھر وہ رونے لگی اور کہنے لگی: عزیر اتنے برس سے ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: میں عزیر ہوں، اس نے کہا: بلاشبہ عزیر تو سو برس سے ہم سے گم اور مفقود ہیں۔ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سو برس تک مجھے موت دیئے رکھی پھر اس نے مجھے زندہ فرما دیا ہے۔ بڑھیا نے کہا: عزیر تو مریض کے لئے مستجاب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 350، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

الدعوات تھے اور کسی مصیبت و لذیت میں مبتلا آدمی افاقہ پالیتا تھا تو آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ میری بصارت مجھے لوٹا دے۔ سو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اس کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ پھیرا تو وہ اسی جگہ صحت یاب ہوگئی، گویا اسے بیڑیوں سے آزاد کر دیا گیا۔ تو وہ کہنے لگی: میں شہادت دیتی ہوں بلاشبہ تو عزیر ہے۔ پھر وہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی طرف چل پڑی اور ان میں حضرت عزیر کا بوڑھا بیٹا بھی تھا اس کی عمر ایک سو اٹھائیس برس تھی اور اس کے بیٹوں کے بیٹے بھی بوڑھے تھے۔ تو بڑھیا نے کہا: اے قوم! قسم بخدا! یہ عزیر ہے۔ تو آپ کا بیٹا لوگوں کے ساتھ آپ کی طرف آیا تو ان کے بیٹے نے کہا: میرے باپ کے دونوں کندھوں کے درمیان ہلال کی مثل سیاہ نشان تھا، سو اس نے اسے دیکھا تو وہ عزیر ہی تھے۔ اور کہا گیا ہے: آپ اس حال میں آئے کہ آپ کو پہچاننے والے تمام ہلاک ہو چکے تھے تو آپ ان کے لئے ایک نشانی تھے جو آپ کی قوم میں سے زندہ تھے کیونکہ آپ کے احوال سننے کے سبب وہ یقین رکھتے تھے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اتنی مدت آپ کو موت دینے میں اور پھر اس کے بعد آپ کو زندہ کرنے میں بہت عظیم نشانی ہے اور آپ کا سارا معاملہ آنے والے زمانے کے لئے علامت و نشانی ہے۔ بعض کو چھوڑ کر بعض کی تخصیص کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں (1)۔

قولہ تعالیٰ: وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا۔ علمائے کوفہ اور ابن عامر نے زا کے ساتھ قراءت کی ہے اور باقیوں نے را کے ساتھ اور اَبان نے حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے نَنْشُرُهَا یعنی نون کے فتحہ، شین کے ضمہ اور را کے ساتھ روایت کیا ہے اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن اور ابوحیوہ نے قراءت کی ہے اور کہا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں احیاء (زندہ کرنے) کے معنی میں ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: رَجَعَ وَ رَجَعْتُهُ اور غاض الماء و غِضْتہ، خَسِرت الدابة و خَسِرتها، مگر لغت میں معروف یہ ہے: أنشر الله الموتى فنشروا، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا پس وہ زندہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾ (عبس) (پھر جب چاہے گا اسے زندہ کر دے گا) اور اس کا اٹھنا کپڑے کے اٹھنے (لپیٹنے) کی مثل ہو گا۔ نشر المیتُ ینشُرُ نُشُوْرًا یعنی مرنے والا موت کے بعد زندہ ہو گیا۔

اعشی نے کہا ہے:

حتی یقولَ الناسُ مما رأوْا ۔۔۔ یا عَجَبًا للمیّت النّاشِرِ (2)

یہاں تک کہ لوگ کہنے لگے جو کچھ انہوں نے دیکھا موت کے بعد زندہ ہونے والے میت کا واقعہ کتنا عجیب ہے۔

گویا موت ہڈیوں اور اعضاء کو لپیٹنے کا نام ہے اور احیاء اور اعضاء کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جمع کرنا نشر ہے۔

اور رہی نُنْشِزُهَا کی قراءت زا کے ساتھ تو اس کا معنی ہے: ''ہم انہیں اٹھاتے ہیں'' اور النَّشَزُ کا معنی ہے: زمین کی بلند اور اٹھی ہوئی جگہ...... جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

تری الثعلب الحَوْلِیّ فیها کأنه ۔۔۔ اذا ما علا نَشَزًا حَصان مجلّلُ

اس میں نشزًا بلند جگہ کے معنی میں ہی مذکور ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 350، دار الکتب العلمیہ 2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 55، دار احیاء التراث العربیۃ

مکی نے کہا ہے: معنی یہ ہے تو ہڈیوں کی طرف دیکھ ہم کیسے زندہ کرنے کے لئے ان میں سے بعض کو اٹھا کر بعض پر ترکیب کے ساتھ رکھتے ہیں، کیونکہ النشز کا معنی الارتفاع (بلند ہونا) ہے اور اسی سے المرأة النشوز ہے اس سے مراد ایسی عورت ہے جو اپنے خاوند کے ساتھ موافقت کرنے سے بلند ہوتی ہے۔ (یعنی اس کے ساتھ موافقت نہیں کرتی) اور اسی سے رب العالمین کا یہ ارشاد ہے: وَ اِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (المجادلہ:11) (اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو) یعنی تم اٹھو اور مل جاؤ۔ اور یہ بھی ہے کہ را کے ساتھ قراءت ہو تو معنی احیاء (زندہ کرنا) ہے۔ اور ہڈیاں انفرادی طور پر زندہ نہیں ہوتیں یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ اور زا اس معنی کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ بمعنی انضمام (ملنا) ہے نہ کہ بمعنی احیاء۔ پس احیاء کے ساتھ آدمی متصف ہے نہ کہ انفرادی طور پر ہڈیاں اور یہ نہیں کہا جا سکتا: ھذا اعظم حی (یہ زندہ ہڈی ہے)۔ لہٰذا معنی یہ ہوا: پس تو دیکھ ہڈیوں کی طرف ہم کیسے انہیں زمین میں ان کی جگہوں سے جسم کی طرف اٹھاتے ہیں (جس) جسم والے کو زندہ کرنا مقصود ہے۔

اور نخعی نے نَنْشُزُھَا نون کے فتحہ، شین کے ضمہ اور زا کے ساتھ قراءت کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ننشیھا یا کے ساتھ قراءت کی ہے۔

اور کسوہ سے مراد وہ کپڑے ہیں جو ڈھانپ لیں۔ اور گوشت کو ان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور لبید نے اسلام کے لئے بطور استعارہ اسے استعمال کیا ہے۔ اور کہا ہے:

حتی اکتسبتُ من الاسلامِ سربالا (1)

(یہاں تک کہ میں نے اسلام سے لباس پہن لیا، یعنی میں نے اسلام قبول کر لیا۔) اور یہ سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (اَعْلَمُ) میں ہمزہ قطعی ہے اور یہ روایت ہے کہ اللہ جل ذکرہٗ نے اس کے بعض (حصے) کو زندہ فرمایا پھر اسے دکھایا کہ اس نے اس کے بقیہ حصہ کو کیسے زندہ کیا ہے۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: بلاشبہ وہ دیکھنے لگا اللہ تعالیٰ کیسے بعض ہڈیوں کو بعض کے ساتھ جوڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سب سے اول اس کے سر کو تخلیق فرمایا اور اسے کہا گیا: تو دیکھ، تو اس وقت اس نے کہا: أعلم الف قطعی کے ساتھ، یعنی أعلم ھذا میں اسے جان گیا۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ میں معنی یہ ہے: جب اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سے وہ شے اس کے لئے بالکل عیاں اور واضح ہوگئی جس سے وہ ناواقف تھا تو اس نے اپنے بالعین دیکھنے کو قبول کر لیا اور اس پر اعتماد کرتے ہوئے کہا: أعلم۔ (میں جان گیا)

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ خطا ہے، کیونکہ اس نے ایسی شے کو لازم کیا ہے لفظ جس کا تقاضا نہیں کرتا اور اس نے شاذ قول اور ضعیف احتمال کے مطابق تفسیر بیان کی ہے۔ یہ میرے نزدیک اس شے کے بارے میں اقرار نہیں ہے جس کا وہ اس سے پہلے

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 55، دار احیاء التراث العربیۃ

انکار کرتا تھا جیسا کہ علامہ طبری نے گمان کیا ہے، بلکہ یہ ایسا قول ہے جس پر اعتبار نے ابھارا ہے، جیسا کہ ایک بندہ مومن جب اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سے کوئی عجیب وغریب شے دیکھے تو کہتا ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اور اسی طرح کے الفاظ۔

ابوعلی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں علم کی اس قسم کو جان گیا جس کا علم میرے پاس نہ تھا(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہم نے یہ معنی حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے اور اسی طرح مکی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ مکی نے کہا ہے: بلاشبہ جب اس نے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کرلیا تو اس نے اپنے بارے میں خبر دی، اور اسے مشاہدہ کے ساتھ اس کا یقین ہو گیا اور اس نے اقرار کرلیا کہ وہ جانتا ہے اللہ تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے، یعنی میں علم کی اس قسم کو جان گیا ہوں معائنہ کی بنا پر جسے میں پہلے نہ جانتا تھا اور یہ ان کی قراءت کے مطابق ہے جنہوں نے اَعْلَمُ الف قطعی کے ساتھ پڑھا ہے اور وہ اکثر قراء ہیں۔ اور حمزہ اور کسائی نے ہمزہ وصل کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دو وجہوں کا احتمال رکھتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے فرشتے نے کہا: اعلم (تو جان لے) اور دوسری یہ کہ وہ اپنی ذات کو اجنبی اور منفصل مخاطب کے قائم مقام رکھے، تو معنی یہ ہوگا کہ جب اس کے لئے حقیقت روشن ہوگئی تو اس نے اپنے آپ کو کہا: اے نفس! تو جان لے یہ وہ علم یقینی ہے جسے تو بالعین نہ جانتا تھا اور اس معنی کی مثل میں ابوعلی نے کہا ہے:

ودّع هريرةَ ان الركب مرتحل ألم تغتمِض عيناك ليلة أرمدا

تو بلی کو چھوڑ دے۔ بے شک قافلہ کوچ کرنے والا ہے۔ کیا تیری آنکھیں آشوب چشم والی رات بند نہیں ہوئیں

ابن عطیہ نے کہا ہے: ابوعلی اس معنی میں شاعر کے قول سے مانوس ہوئے ہیں:

تذكّر من أنّى و من أين شُرْبُه يُوَامِرُ نفسَيه كذى الهَجمَة الابل (2)

مکی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور یہ بعید ہے کہ یہ اس کے لئے اللہ جل ذکرہ کی جانب سے علم کے بارے حکم ہو۔ کیونکہ اس نے تو اس پر اپنی قدرت ظاہر فرما دی ہے اور اسے ایسا امر دکھا دیا ہے جس کی صحت کا اسے یقین حاصل ہو گیا اور اس نے قدرت کا اقرار کرلیا۔ لہٰذا اس کا کوئی معنی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کے علم کے بارے حکم دے بلکہ اس کے بارے وہ اپنے آپ کو حکم دے رہا ہے اور یہ جائز اور حسن ہے۔

اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے حرف میں جو اس پر دلالت ہو رہی ہے کہ یہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم کے بارے میں حکم ہے اس معنی میں کہ تو اس کے بارے میں علم کو لازم پکڑ لے اور یقین کرلے جب تو نے معائنہ کرلیا اور یقین کرلیا۔ اس لئے کہ ان کی قراءت میں ہے: قیل اعلم۔ اور یہ بھی کہ یہ اپنے ماقبل امر کے موافق ہے جو اس قول میں ہے: فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ اور وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ اور وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ پس اسی طرح ہے۔ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پڑھتے تھے قیل اعلم اور کہتے تھے: کیا وہ بہتر ہے یا ابراہیم؟ کیونکہ انہیں کہا گیا: وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝ پس یہ واضح کرتا ہے کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ہے جب اس نے احیاء (زندہ کرنے) کا معائنہ کرلیا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 351، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 352

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

''اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے پروردگار! دکھا مجھے کہ تو کیسے زندہ فرماتا ہے مردوں کو۔ فرمایا: (اے ابراہیم) کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟ عرض کی: ایمان تو ہے لیکن (یہ سوال اس لئے ہے) تاکہ مطمئن ہو جائے میرا دل۔ فرمایا: تو پکڑ لے چار پرندے پھر مانوس کر لے انہیں اپنے ساتھ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا پھر بلا انہیں چلے آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لے یقیناً اللہ تعالیٰ سب پر غالب بڑا دانا ہے۔''

لوگوں نے اس سوال کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے یہ شک کے سبب صادر ہوا یا نہیں؟ تو جمہور نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے میں کبھی شک لاحق نہیں ہوا۔ بلاشبہ آپ نے معائنہ کا مطالبہ کیا، وہ اس لئے کہ نفوس ہر اس شے کو دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں جس کے بارے انہیں خبر دی جائے۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: لیس الخبر کالمعاینة (1) (خبر معائنہ کی طرح نہیں ہے) اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے آپ کے سوا کسی نے اسے روایت نہیں کیا، ابو عمر نے یہی کہا ہے۔

امام اخفش نے کہا ہے: اس سے دل کی رؤیت مراد نہیں لی گئی بلکہ آپ نے آنکھ کے ساتھ دیکھنے کا ارادہ کیا ہے۔

اور حضرت حسن، قتادہ، سعید بن جبیر اور ربیع رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے: آپ نے سوال کیا تاکہ آپ کے یقین میں مزید اضافہ ہو جائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں عنوان بنایا اور کہا: وقال آخرون سال ذالك ربه، لأنه شك فی قدرة الله تعالیٰ (اور دوسروں نے کہا: آپ نے اپنے رب سے یہ سوال کیا کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک تھا۔) اور انہوں نے اس عنوان کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول ذکر کیا ہے آپ نے فرمایا: میرے نزدیک قرآن کریم میں کوئی آیت اس سے زیادہ امید افزا نہیں۔

اور حضرت عطا بن ابی رباح رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں وہ بعض داخل ہو گیا جو لوگوں کے دلوں میں داخل ہو جاتا ہے تو آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ فرماتا ہے؟ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نحن أحق بالشك من ابراهيم، الحدیث۔ (ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسبت شک کے زیادہ حقدار ہیں)۔ پھر علامہ طبری نے اس قول کو ترجیح دی ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے ان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ المستدرک علی الصحیحین، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 315، حدیث نمبر 3250
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 352، دار الکتب العلمیہ

نے فرمایا: ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسبت شک کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں جبکہ انہوں نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ فرماتا ہے؟ تو رب کریم نے فرمایا: کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟ عرض کی: ایمان تو ہے لیکن سوال اس لئے ہے تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے اور اللہ تعالیٰ لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے وہ رکن شدید (مضبوط شے) کی طرف پناہ لیتے تھے اور اگر میں قید میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے ہیں تو میں دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کر لیتا(1)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جو علامہ طبری نے عنوان بنایا ہے میرے نزدیک وہ مردود ہے اور جو عنوان کے تحت انہوں نے ذکر کیا ہے اس کی تاویل کی گئی ہے۔ پس جہاں تک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کا تعلق ہے: ھی أرجی آیۃ تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ پر اور دنیا میں مردوں کے زندہ کرنے کے سوال پر رہنمائی موجود ہے اور یہ اس وہم میں ڈالنے والی نہیں ہے اور آپ کا یہ کہنا جائز ہے: ھی أرجی آیۃ (یہ زیادہ امید دلانے والی آیت ہے) یعنی بلاشبہ ایمان کافی ہے یہ اپنے ساتھ کسی چھان بین اور بحث وتمحیص کا محتاج نہیں ہوتا۔

اور رہا حضرت عطا کا یہ قول: دخل قلبَ ابراھیم بعضُ مایدخل قلوب الناس تو اس کا معنی یہ ہے کہ اگر وہ شک کرنے والے ہوتے تو یقیناً ہم ان کی نسبت اس کا زیادہ حق رکھتے اور ہم شک نہیں کرتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے یہ زیادہ مناسب ہے کہ وہ شک نہ کریں(2)۔ پس حدیث طیبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شک کی نفی پر مبنی ہے اور وہ حدیث جس میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذالك محض الایمان(3) (وہ خالص ایمان ہے) تو یہ ایسے خطرات (کھٹکنے والی چیزوں) کے بارے میں ہے جو ثابت نہیں رہتے اور رہا شک تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ دو امروں کے درمیان توقف کرنا ہے جس میں ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہ ہو۔ اور اس کی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے نفی کی گئی ہے اور مردوں کو زندہ کرنا تو دلیل سمعی سے ثابت ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے بارے زیادہ جانتے تھے اور اس پر آپ کا یہ قول تیری رہنمائی کرتا ہے: رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ اور اس پر شک کرنا اس کے لیے بعید ہے جس کا قدم فقط ایمان میں ثابت ہو تو جو مرتبہ نبوت اور خلت پر فائز ہو اس کے بارے شک کیسے ہو سکتا ہے اور انبیاء علیہم السلام تو کبائر سے معصوم ہیں اور بالاجماع ان صغیرہ گناہوں سے بھی جن میں رذالت ہوتی ہے اور جب تو آپ علیہ السلام کے سوال اور آیت کے تمام الفاظ میں غور وفکر کرے گا تو وہ قطعاً شک پیدا نہیں کرتے اور وہ اس طرح کہ سوال کیف کے ساتھ ہے اور اس کے ساتھ سوال کسی شے کی حالت کے بارے ہوتا ہے جو موجود ہو اور سائل اور مسئول دونوں کے نزدیک اس کا وجود متقرر اور ثابت ہو۔ مثلاً تیرا یہ قول: کیف علمُ زیدٍ (زید کا علم کیسا ہے؟) کیف نسج الثوب (کپڑے کی بنائی کیسی ہے) اور اسی طرح کی دیگر مثالیں۔ اور جب تو نے کہا: کیف ثوبك؟ (تیرا کپڑا کیسا ہے) اور کیف زید؟ (زید کیسا ہے) تو بلاشبہ سوال ان کے احوال میں سے کسی حال کے بارے ہے اور کبھی کیف کسی شی کے بارے خبر دینے کے لئے ہوتا ہے جس کی شان یہ ہو

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 477، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 3121، ضیاء القرآن پبلی کیشنز	2۔ ایضاً
3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 79، وزارت تعلیم۔

کہ اس کے بارے کیف سے سوال کیا جائے۔ جیسے تیرا یہ قول: کیف شئت فَكُنْ۔ (جس حالت میں تو چاہے تو ہو جا) اور اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: کیف کان بدء الوَحْی (وحی کا آغاز کیسے ہوا؟) اور اس آیت میں كَيْفَ زندہ کرنے کی ہیئت کے بارے سوال کرنے کے لئے ہے اور احیاء (زندہ کرنا) متقرر اور ثابت شدہ امر ہے۔

لیکن جب ہم نے کسی شے کے وجود کا انکار کرنے والے بعض لوگوں کو پایا ہے کہ وہ اس کے انکار کو اس شے کی حالت کے بارے سوال سے تعبیر کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہے، تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ شے فی نفسہٖ صحیح نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک دعویٰ کرنے والا یہ کہے: انا ارفع هذا الجبل، میں اس پہاڑ کو اٹھا سکتا ہوں۔ تو اسے جھٹلانے والا کہتا ہے: مجھے دکھا تو اسے کیسے اٹھا سکتا ہے؟ تو عبارت میں یہی طریقہ مجاز ہے اور اس کا معنی ہے ایک بار بطور قیاس جدلی کے تسلیم کرنا۔ گویا کہ وہ کہہ رہا ہے: میں فرض کرتا ہوں کہ تو اسے اٹھا سکتا ہے سو تو مجھے دکھا تو اسے کیسے اٹھائے گا۔

پس جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی عبارت اس اشتراک مجازی کے مطابق تھی، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے اسے خالص کر دیا اور اسے اس پر محمول کیا کہ آپ کے لئے حقیقت بیان فرما دی اور آپ کو فرمایا: أَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلَىٰ تو اس سے امر مکمل ہو گیا اور ہر قسم کے شک سے پاک ہو گیا پھر آپ علیہ السلام نے راحت وطمانینت کے ساتھ اپنے سوال کی علت بیان کی (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جو ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے وہ اپنی (انتہا کو) پہنچا۔ اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے بارے میں اس طرح کا شک جائز نہیں ہوتا کیونکہ یہ کفر ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات دوبارہ اٹھائے جانے کے ساتھ ایمان لانے پر متفق ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے رکھی ہے کہ اس کے انبیاء علیہم السلام اور اس کے اولیاء رحمۃ اللہ علیہم پر شیطان کو کوئی راہ اور غلبہ نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر: 42) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔) اور اس لعین نے کہا تھا: اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۸۳﴾ (ص) یعنی تیرے مخلص بندوں پر میرا تسلط نہیں ہو سکتا) اور جب شیطان کے لئے ان پر کوئی غلبہ اور تسلط نہیں ہے تو پھر وہ انہیں شک میں کیسے ڈال سکتا ہے؟ بلاشبہ آپ نے سوال کیا کہ آپ مردوں کے اجزاء بکھر جانے کے بعد ان کے جمع ہونے کی کیفیت اور پٹھوں اور جلدوں کو پھاڑنے اور بکھیرنے کے بعد انہیں جوڑنے کی کیفیت کا مشاہدہ کریں۔ اور ارادہ یہ کیا کہ آپ علم یقین سے مزید علم یقین کی طرف ترقی کریں۔ پس آپ کا قول: أَرِنِیْ كَیْفَ یہ کیفیت کے مشاہدہ کی طلب پر دال ہے۔

اور بعض علمائے معانی نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ ارادہ کیا کہ وہ آپ کو دکھائے وہ کیسے دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ یہ رائے فاسد اور مردود ہے اس بیان کے سبب جو اس کے پیچھے ہے۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے اور اس ارشاد اَوَلَمْ تُؤْمِنْ میں الف برائے استفہام نہیں ہے، بلکہ یہ الف برائے ایجاب وتقریر ہے۔ جیسا کہ جریر نے کہا ہے:

ألستم خير من ركب المطايا

کیا تم ان سے بہتر نہیں ہو جو سواریوں پر سوار ہوئے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 353، دار الکتب العلمیہ

(یعنی ان سے بہتر ہو۔ تو گویا الف برائے ایجاب ہوا)

اور و تُؤمِنْ میں واؤ حالیہ ہے۔ اس کا معنی ایمان مطلق ہوا اور اس میں مردوں کو زندہ کرنے کی فضیلت داخل ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِىْ یعنی میں نے تجھ سے سوال کیا ہے تا کہ میرا دل برہان (دلیل) کے ساتھ معلوم اور مشاہدہ کے مابین فرق حاصل ہونے سے مطمئن ہو جائے۔

اور طمانینت کا معنی اعتدال اور سکون ہے اور اعضاء کی طمانینت تو معروف ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ثم ارکع حتی تطمئن راکعا۔(1) الحدیث (پھر تو رکوع کر یہاں تک کہ تو پورے اطمینان سے رکوع کرے) اور دل کی طمانینت یہ ہے کہ کسی شے معتقد میں اس کی فکر پرسکون ہو جائے (اور راحت میں بدل جائے۔) اور احیاء کے بارے میں فکر کرنا ممنوع نہیں ہے، جیسا کہ آج ہمارے لئے ہے کہ ہم اس میں فکر کریں کیونکہ اس فکر میں ہی عبرت ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو مشاہدہ اور معائنہ کا ارادہ کیا تو احیاء کی صورت میں ان کی فکر ختم ہو جائے گی۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِىْ کا معنی ہے تا کہ میرا دل محفوظ ہو جائے اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ان سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے تا کہ یقین میں اضافہ ہو جائے۔ ابراہیم اور قتادہ نے یہی کہا ہے اور بعض نے کہا ہے: تا کہ وہ میرے ایمان کے ساتھ مزید ایمان کا اضافہ کرے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس معنی میں کوئی زیادتی ممکن نہیں ہوتی مگر فکر سے سکون حاصل کرنے کے ساتھ، ورنہ یقین منقسم نہیں ہوتا (2)۔

سدی اور ابن جبیر نے بھی کہا ہے: کیا تم یقین نہیں رکھتے اس کے ساتھ کہ تم میرے خلیل ہو؟ آپ نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ (سوال اس لئے ہے) تا کہ میرا دل خلت کے ساتھ مطمئن ہو جائے۔

اور یہ قول بھی ہے: آپ نے دعا کی کہ وہ آپ کو دکھائے وہ کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے تا کہ وہ جان لے کہ اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں تمہاری دعا قبول کرتا ہوں؟ آپ نے عرض کی: ایمان تو ہے (لیکن سوال اس لئے کیا ہے) تا کہ میرا دل مطمئن ہو جائے کہ تو میری دعا قبول کرتا ہے۔

آپ کو اس پر برانگیختہ کرنے والے کے بارے میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ آپ کو خلیل بنائے گا، تو آپ نے اس پر کسی نشانی (کے حصول) کا ارادہ کیا۔

سائب بن یزید نے یہی کہا ہے اور یہ قول بھی ہے: (کہ وہ) نمرود کا یہ قول تھا: میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں اور حسن نے کہا ہے: انہوں نے ایک مردار دیکھا اس کا نصف حصہ خشکی میں پڑا تھا اسے درندے چیر پھاڑ کر کھا رہے تھے اور نصف حصہ سمندر میں تھا اسے سمندری جانور چیر پھاڑ رہے تھے، تو جب آپ نے اسے متفرق ہوتا اور بکھرتا دیکھا تو آپ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، جلد 1، صفحہ 105، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب ابواب صلاۃ الجماعۃ، حدیث نمبر 715، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 353، دار الکتب العلمیہ

پسند کیا کہ اسے جڑتا اور ملتا بھی دیکھیں تو آپ نے سوال کر دیا تا کہ آپ کا دل اس کے جمع ہونے کی کیفیت دیکھ کر مطمئن ہو جائے جیسا کہ اس نے تفریق اور تقسیم کی کیفیت کو دیکھا ہے: سو آپ کو کہا گیا: فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ کہا گیا ہے کہ وہ چار پرندے مرغ، مور، کبوتر اور کوا تھے۔ اسے ابن اسحاق نے بعض اہل علم سے ذکر کیا ہے اور مجاہد، ابن جریج، عطاء بن یسار اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کوے کی جگہ سارس کا ذکر کیا ہے(1) اور آپ ہی سے یہ بھی ہے کہ آپ نے کبوتر کی جگہ گدھ کا ذکر کیا ہے۔ پس آپ نے حسب حکم یہ پرندے پکڑ لئے اور انہیں ذبح کیا اور انہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ دیا اور بعض کا گوشت بعض کے ساتھ خون اور پروں سمیت خلط ملط کر دیا یہاں تک کہ آپ بہت تعجب کرنے لگے، پھر اس ملے جلے مجموعہ میں سے ایک ایک جز ہر پہاڑ پر رکھ دیا اور آپ ایسی جگہ پر ٹھہر گئے جہاں سے آپ ان اجزاء کو دیکھ سکتے تھے اور آپ نے پرندوں کے سر اپنے ہاتھ میں ہی روک لئے۔ پھر کہا: تعالین باذن الله (تم اللہ تعالیٰ کے اذن سے آجاؤ) پس وہ اجزاء اڑنے لگے اور خون خون کی طرف اور پر پروں کی طرف اڑے یہاں تک کہ پہلے کی طرح وہ سب جڑ گئے اور بغیر سروں کے وہ باقی رہ گئے۔ پھر آپ نے دوبارہ آواز دی تو وہ آپ کے پاس اپنی ٹانگوں پر دوڑتے ہوئے آئے۔ اور پرندے کے لئے سعی کا لفظ نہیں بولا جاتا جب وہ اڑے مگر تمثیل کی بنا پر۔ نحاس نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ان میں سے ایک کی طرف اس کے سر کے بغیر اشارہ کیا تو پرندہ دور ہو گیا اور جب اس کی طرف اس کے سر کے ساتھ اشارہ کیا تو وہ قریب ہوا یہاں تک کہ ہر پرندہ اپنے سر کے ساتھ مل گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اڑ گیا۔

زجاج نے کہا ہے: معنی یہ ہے پھر ہر پہاڑ پر ہر ایک کا ایک ایک جز رکھ دے۔

ابو بکر نے عاصم اور ابو جعفر سے جُزُؤًا بروزن فُعُل پڑھا ہے اور ابو جعفر نے جُزًّا زاء مشددہ کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے مہموز مخفف پڑھا ہے یہ اس کی لغات ہیں اور اس کا معنی ہے: نصیب اور حصہ۔

يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا۔ سَعْيًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور صُرْهُنَّ کا معنی ہے: تو انہیں کاٹ دے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت مجاہد، ابو عبیدہ اور ابن انباری رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ کہا جاتا ہے: صار الشیٔ یَصُورہ۔ یعنی اس نے شے کو کاٹ دیا۔ اور ابن اسحاق نے یہی کہا ہے۔ اور ابو الاسود الدؤلی سے ہے، اور یہ سریانی زبان کے ساتھ تقطیع ہے، توبہ بن الحمیر نے اس کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

فلما جذبت الحبل أطّت نُسوعُه　　بأطراف عيدان شديد سيورها

فأدنت لی الأسباب حتی بلغتُها　　بنهضی و قد کاد ارتقائی یصورها

یعنی وہ اسے کاٹ دے گا اور الصَّوْر بمعنی القطع (کاٹنا) ہے۔ ضحاک، عکرمہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنی کسی روایت میں کہا ہے جو ان سے روایت کی گئی ہے کہ یہ لفظ نبطی زبان کا ہے اور اس کا معنی ہے: فَقَطِّعْهُنَّ تو انہیں کاٹ دے۔ اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: أمِلْهُنَّ الیك، یعنی تو انہیں ملا دے اور انہیں اپنے پاس جمع کر لے۔ کہا جاتا ہے: رجل أصور جب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 353، دار الکتب العلمیہ

وہ گردن کو جھکانے والا ہو۔ اور آپ کہتے ہیں: انی الیکم لأصور، یعنی بلاشبہ میں تمہاری طرف مشتاق اور راغب ہوں۔ اور امرأۃ صَوْراء (جھکنے والی عورت) اور اس کی جمع صُوْرٌ ہے جیسا کہ أسود کی جمع سُوْدٌ ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

اللہُ یعلم أنا فی تلفُتِنا　　یومَ الفِراق الی جیراننا صُورُ

اور قولہ اِلَیْکَ تقطیع کی تاویل پر متعلق خذ کے ہے اور کسی مضمر کی حاجت نہیں۔ اور امالہ اور ضم کی تاویل پر یہ صُرْھُنَّ کے متعلق ہے اور کلام میں یہ چھوڑ دیا گیا ہے: فأمِلْھُنَّ الیک ثم قطعھن (تم انہیں اپنے پاس جمع کرلو اور پھر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کردو) اور اس میں پانچ قراءتیں ہیں۔ سات میں سے دو یہ ہیں: صاد کا ضمہ، صاد کا کسرہ اور را کی تخفیف۔ اور ایک قوم نے فصُرَّھن یعنی صاد کے ضمہ اور را مفتوحہ کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا کہ وہ کہہ رہا ہے پس تو انہیں باندھ دے۔ اور اسی سے صُرّۃ الدنانیر ہے۔ اور ایک گروہ نے فصِرَّھُنَّ صاد کے کسرہ اور را مفتوحہ کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا معنی ہے تو انہیں چیر پھاڑ دے۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: صرّ البابُ و القلمُ اذا صوت۔ (دروازہ اور قلم پھٹ گئے جب تو نے آواز لگائی۔) اسے نقاش نے بیان کیا ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے: یہ قراءت غریب ہے اور وہ اس لئے کہ مضاعف متعدی بکسر عین بہت قلیل آتا ہے بلکہ اس کا باب یفعل عین کلمہ کے ضمہ کے ساتھ ہے جیسے شَدَّ یَشُدُّ وغیرہ۔ لیکن کبھی کبھی اس سے یہ بھی آتا ہے نَمّ الحدیثَ ینِمُّہ و یَنِمُّہ۔ اس نے چغلخوری کی۔ اور ھرّ الحرب یھُرُّھا و یھِرُّھا، جنگ چھڑ گئی۔

اور اسی سے اعشیٰ کا شعر ہے:

لیَعْتَوِرَنْکَ　القولُ　حتی　تھِرَّہٗ

علاوہ ازیں بھی قلیل حروف میں سے ہے۔

ابن جنی نے کہا ہے: پس عکرمہ کی قراءت صاد کے ضمہ کے ساتھ تو یہ را میں ضمہ، فتحہ اور کسرہ تینوں کا احتمال رکھتی ہے۔ (جیسے مد اور شد) کے را پر ضمہ اس کے بعد ہا پر ضمہ کی وجہ سے ہے۔

پانچویں قراءت صَرِّھنّ صاد کے فتحہ اور را مکسورہ کی شد کے ساتھ ہے۔ اسے مہدوی وغیرہ نے عکرمہ سے بیان کیا ہے، یہ بمعنی فاحبسھن (اور تو انہیں روک لے) ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: صَرّی یُصَرِّی جب کوئی قید کر لے، روک لے۔ اور اسی سے الشاۃ المُصَرّاۃ ہے۔

اور یہاں ایک اعتراض ہے جسے ماوردی نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا آخرت کی نشانیوں کے بارے میں کیسے قبول کر لی گئی جبکہ موسیٰ علیہ السلام کی قبول نہیں کی گئی جو اس قول میں ہے: رَبِّ أَرِنِیۡۤ أَنْظُرْ اِلَیْکَ (الاعراف: 143) (اے میرے رب! مجھے دیکھنے کی قوت دے تاکہ میں تیری طرف دیکھ سکوں) تو ان سے دو جواب منقول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا وہ مکلف باقی رہتے ہوئے صحیح نہیں ہے اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا تھا وہ خاص ہے اور اس کے ساتھ مکلف باقی رہنا صحیح ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ احوال مختلف ہوتے ہیں پس بعض اوقات اصلح قبولیت ہوتی ہے اور بعض دوسرے اوقات میں اس بارے میں منع کرنا اور روکنا

اصلح ہوتا ہے جس میں پیشگی اذن نہ ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کے بارے حکم دیا تھا اس سے پہلے کہ آپ کی اولاد ہو اور اس سے پہلے کہ آپ پر وہ صحف نازل کرے۔ واللہ اعلم۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ؀

''مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں ایسی ہے جیسے ایک دانہ جو اگاتا ہے سات بالیں (اور) ہر بال میں سو دانہ ہو اور اللہ تعالیٰ (اس سے بھی) بڑھا دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اور اللہ وسیع بخشش والا جاننے والا ہے۔''

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے وہ قصے بیان کر دیئے جن میں دلائل ہیں، تو اس نے جہاد پر برانگیختہ کیا اور تو جان لے کہ جس نے اس برہان اور دلیل کے بعد جہاد کیا جسے نبی کے بغیر کوئی نہیں لا سکتا تو اس کے لئے اس جہاد میں ثواب عظیم ہے۔

البستی نے اپنی صحیح مسند میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کی: ''اے رب! میری امت کے لئے اور اضافہ فرما۔'' تو پھر یہ آیت نازل ہوئی، مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (البقرہ: 245) (کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن، تو بڑھا دے اللہ اس قرض کو اس کے لئے کئی گنا۔) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر عرض کی: ''اے میرے رب! میری امت کے لئے اور اضافہ فرما'' تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ؀ (الزمر)

اس آیت کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے شرف اور اس کے حسن کی مثال بیان کرنے کے لئے ہیں اور یہ اس پر انگیخت دلانے کو متضمن ہیں۔ اور کلام میں مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: مثل نفقة الذين ينفقون اموالهم فی سبیل اللہ کمثل حبة۔ ان کے نفقہ کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے: مثل الذين ينفقون اموالهم کمثل زارع زرع فی الأرض حبة فأنبتت الحبة سبع سنابل یعنی ان کی مثال جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کسان کی مثل ہے جس نے زمین میں ایک دانہ کاشت کیا اور اس دانے نے سات بالیں اگائیں۔ یعنی سات بالیں نکالیں اور ہر بال میں سو دانہ ہو۔ پس صدقہ کرنے والے کو کاشت کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دی اور صدقہ کو بیج کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ اسے ہر صدقہ کے عوض سات سو نیکیاں عطا فرمائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے سات سو پر بڑھا دیتا ہے۔ پس صدقہ کرنے والے کی مثل کاشت کرنے والے کی مثل ہو جائے گی، (جیسا کہ) اگر وہ اپنے عمل میں حاذق (ماہر) ہو اور بیج عمدہ ہو، زمین آباد ہو تو پیداوار زیادہ ہو جاتی ہے۔ پس اسی طرح اگر صدقہ کرنے والا جب صالح ہو، مال طیب اور پاک ہو اور وہ اسے اپنے محل میں خرچ کرتا ہو تو ثواب بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے جس نے کہا ہے: آیت میں سات

سو گنا پر زیادتی کا ذکر نہیں ہے، جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2۔ روایت کی گئی ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان بن عفان اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ وہ اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب لوگوں کو صدقہ پر ابھارا جس وقت آپ نے غزوہ تبوک کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا، تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ چار ہزار لے کر حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے پاس آٹھ ہزار تھے تو میں نے اپنے لئے اور اپنے اہل وعیال کے لئے چار ہزار رکھے ہیں اور چار ہزار میں نے اپنے رب کو بطور قرض پیش کر دیئے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بارك الله لك فيما امسكت و فيما أعطيت (اللہ تعالیٰ تجھے برکت عطا فرمائے اس میں بھی جو تو نے (گھر والوں کے لئے) روک لیا اور اس میں بھی جو تو نے پیش کر دیا) اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی تیاری کا سامان میرے ذمہ ہے جس کے پاس تیاری کا سامان نہیں ہے، تو ان دونوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ آیت آیت زکوٰۃ نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی پھر آیت زکوٰۃ کے ساتھ یہ منسوخ ہوگئی اور نسخ کے دعویٰ کی کوئی حاجت نہیں، کیونکہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا مستحب ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور ان میں عظیم تر جہاد ہے تاکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: كَمَثَلِ حَبَّةٍ اس میں الحبة اسم جنس ہے ہر اس شے کے لئے جسے انسان کاشت کرتا ہے اور اس سے خوراک حاصل کرتا ہے اور اس سے زیادہ مشہور گندم ہے اور اکثر حب سے مراد یہی لی جاتی ہے اور اسی معنی میں المتلمس کا قول ہے:

آليتُ حَبَّ العراقِ الدهرَ أطعمه　　والحَبُّ ياكلُه فى القرية السُّوسُ

اور حبة القلب سے مراد دل کی سیاہی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد ثمرة القلب (دوستی، الفت) ہے اور وہ وہی ہے۔ اور الحِبة حاء کے کسرہ کے ساتھ، اس سے مراد سبزیوں کا وہ بیج ہے جو خوراک (غذا) نہیں ہوتا اور حدیث شفاعت میں ہے: فينبتون كما تنبت الحِبة فى حميل السَيل (1) (پس وہ اس طرح اگ پڑیں گے جس طرح سیلاب کے لائے ہوئے کیچڑ میں بیج اگتے ہیں۔ اور جمع حِبب آتی ہے اور الحُبةُ (حاء کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی حُب ہے۔ کہا جاتا ہے: نَعَمَ و حُبة و كرامة۔ (وہ محبت و کرامت کے اعتبار سے اچھا ہے۔) اور الحُب کا معنی محبت ہے اور اسی طرح الحِب (بالکسر) کا معنی بھی ہے اور الحِب سے مراد حبیب (گہرا دوست) بھی ہے۔ جیسے خِذن اور خَدِيْنٌ (گہرا دوست) اور سُنبلة یہ فُنعلةٌ کے وزن پر أسبل الزرع سے ماخوذ ہے جب کھیتی میں بالیں ظاہر ہو جائیں یعنی وہ بالیں چھوڑ دے جس طرح پردے کو لٹکا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: اس میں چھپے ہوئے دانے ہیں جس طرح کہ کسی شے پر پردہ لٹکانے سے وہ چھپ جاتی

1۔ صحیح بخاری، باب تفاضل اهل الایمان فی الاعمال، حدیث نمبر 21، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور اس کی جمع سَنَابِلَ ہے، پھر کہا گیا ہے کہ اس سے مراد سنبل الدخن (باجرے یا کنگنی کی بال) ہے۔ وہی وہ شے ہے جس کی ایک بال میں اتنی تعداد میں دانے ہوتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ باجرے کی بالیں میں سے ایک بال میں اس تعداد سے دوگنا زیادہ بلکہ اس سے بھی زیادہ دانے ہوتے ہیں۔ ہم نے خود اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: گندم کی بالیں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں سو دانے ہوتے ہیں۔ اور رہے تمام دانے تو وہ کہیں زیادہ ہوتے ہیں، لیکن مثال اس مقدار کے ساتھ بیان کی ہے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: **فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ** اس کا معنی ہے اگر وہ اسے پائے، ورنہ اس بنا پر کہ وہ اسے فرض کرے۔ پھر انہوں نے ضحاک سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس کا معنی ہے ہر بال نے سو دانے اگائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: علامہ طبری نے حضرت ضحاک کے قول کو اسی طرح رکھا ہے جیسے انہوں نے کہا ہے اور یہ ضحاک کے قول سے لازم نہیں آتا اور ابو عمرو الدانی نے بیان کیا ہے کہ بعض نے مائۃ کو اس تقدیر پر منصوب پڑھا ہے۔ انبتت مائۃ حبۃ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یعقوب حضرمی نے کہا ہے: اور بعض نے پڑھا ہے: **فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ** یہ اس بنا پر ہے کہ یہ انبتت مائۃ حبۃ ہے۔ اور اسی طرح بعض قراء نے پڑھا ہے: **وَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ** اور یہ وَ **اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ** کی بنا پر ہے، یعنی واعتدنا للذین کفروا عذاب جھنم۔ (اور ہم نے جہنم کا عذاب تیار کیا ہے ان کے لئے جنہوں نے کفر کیا) اور ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے انبتت سَبْعَ سَنَابِلَ میں تا کو سین میں ادغام کر کے پڑھا ہے کیونکہ یہ دونوں حروف مہموسہ میں سے ہیں۔ کیا تم جانتے نہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور ابو عمرو نے شعر بیان کیا ہے:

یا لعنَ اللہ بنی السِّعلاۃِ　　عمرَو بنَ میمون لئام النات

مراد لوگ (الناس) لئے ہیں اور سین کو تا میں بدل دیا ہے اور باقی قراء نے اصل کی بنا پر دونوں کو ظاہر کر کے پڑھا ہے کیونکہ یہ دونوں دو کلمے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قرآن کریم اس بارے میں وارد ہوا ہے کہ نیکی کے جملہ اعمال میں ایک نیکی کا بدلہ اس کی مثل دس کے ساتھ ہے اور یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ جہاد پر خرچ کرنے کی نیکی کا عوض سات سو گنا ہے اور علماء نے اس قول **وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ** کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ سابقہ سات سو کے ذکر کے بیان اور تاکید کے لئے ہے۔ لہٰذا اس میں سات سو گنا سے بڑھانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اور علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے: بلکہ یہ اس پر اطلاع دینا اور آگاہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے اس کے لئے عوض سات سو گنا سے بھی زیادہ کر دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت کی ابتدائی تفسیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث بیان کی گئی ہے اس کے مطابق یہ قول زیادہ صحیح ہے۔ اور ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے: **حدثنا هارون بن عبد الله الحمال حدثنا ابن ابي فديك عن**

الخلیل بن عبد اللہ عن الحسن عن علی بن ابی طالب و ابی الدرداء و عبد اللہ بن عمرو ابی امامہ الباھلی و عبد اللہ بن عمرو و جابر ابن عبد اللہ و عمران بن حصین یہ تمام کے تمام صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچہ بھیج دیا اور خود اپنے گھر میں ہی رہا تو اس کے لئے ایک درہم کے بدلے سات سو درہم ہیں۔ اور جو بذات خود بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد میں شریک ہوا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر خرچہ کیا تو اس کیلئے ایک درہم کے بدلے سات لاکھ درہم ہوں گے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ (1)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے اس عوض کو بڑھاتے بڑھاتے بیس لاکھ تک کر دیتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ روایت آپ سے ثابت الاسناد نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ زراعت کا پیشہ ان پیشوں میں سے اعلیٰ ترین پیشہ ہے جنہیں لوگ اختیار کرتے ہیں اور ان کمائیوں میں سے اعلیٰ ہے جن کے ساتھ کام کرنے والے (مزدور) مشغول ہوتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ مثال بیان فرمائی ہے اور ارشاد فرمایا ہے: مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ الآیہ۔

اور صحیح مسلم میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت موجود ہے: ''جو مسلمان بھی کوئی درخت لگاتا ہے یا فصل کاشت کرتا ہے اور اس سے پرندے، انسان یا جانور کھاتے ہیں تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے (2)۔'' اور ہشام بن عروہ نے اپنے باپ کے واسطہ سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''زمین کی تہوں میں رزق تلاش کرو'' مراد زراعت ہے۔ اسے ترمذی نے بیان کیا ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کے درخت کے بارے فرمایا ہے: ''یہ کیچڑ میں گڑھے ہوتے ہیں (اور) محلات میں خوراک باہم پہنچاتے ہیں'' یہ مدح کے محل میں بیان ہوا ہے۔

اور زراعت فروض کفایہ میں سے ہے اور امام وقت پر لازم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس پر مجبور کرے اور اس پر جو اس کی مثل ہے مثلاً درخت لگانا وغیرہ۔ (یعنی باغبانی)

عبد اللہ بن عبد الملک نے حضرت ابن شہاب زہری رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور کہا: میری ایسے مال پر رہنمائی کیجئے جس کے لئے میں محنت و مشقت کروں۔

تو ابن شہاب رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار کہے:

اقول لعبد اللہ یوم لقیتہ	و قد شدّ أحلاس المطیّ مُشرّقا
تتبع خبایا الأرض وادع ملیکھا	لعلّک یوما ان تُجاب فتُرزقا
فیؤتیک مالا واسعا ذا مَثابۃ	اذا ما میاہ الأرض غارت تدفّقا

1۔ سنن ترمذی، باب ماجاء فی النفقۃ فی الاھل، حدیث نمبر 1889۔ ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2749-2750، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المزارعۃ، باب فضل الزرع، حدیث نمبر 2152، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور معتضد سے بیان کیا گیا ہے کہ اس نے کہا: میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا۔ آپ مجھے بیلچہ (یا کدال) عطا فرما رہے ہیں اور آپ نے فرمایا: اسے پکڑ لو کیونکہ یہ زمین کے خزانوں کی چابیاں ہیں۔ (خذھا فانھا مفاتیح خزائن الأرض)

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾

''جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں پھر جو خرچ کیا اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دکھ دیتے ہیں، انہیں کے لئے ثواب ہے ان کا ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ جیش العُسرہ کا (غزوہ تبوک) کی تیاری کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک ہزار دینار لے کر حاضر ہوئے اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں ڈال دیا، تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ سے اپنا دست مبارک ان میں داخل کرتے ہیں اور انہیں الٹ پلٹ کر رہے ہیں اور فرما رہے ہیں: ما ضَرّ ابن عفان ما عمل بعد الیوم اللّٰھم لاتنس ھذا الیوم لعثمان آج کے بعد ابن عفان نے جو عمل بھی کیا وہ ان کے لئے نقصان دہ نہیں۔ اے اللہ! تو آج کے دن عثمان کو نہ بھولنا۔'' اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے دیکھا ہے۔ آپ کہہ رہے تھے: یا رب عثمان انی رضیت عن عثمان فارض عنہ (اے عثمان کے رب! میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی رہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہوگئی۔ اور یہ آیت نازل ہوئی: اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى الآیہ (1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ بالعموم اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر جب پہلی آیت میں گزر چکا، تو اس آیت میں یہ بیان کیا کہ وہ حکم اور ثواب بلاشبہ اس کے لئے ہے جو خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتا ہے اور نہ وہ دکھ دیتا ہے کیونکہ احسان جتلانا اور اذیت دینا یہ صدقہ کے ثواب کو باطل کر دیتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد والی آیت میں بیان کر دیا ہے۔ بلاشبہ آدمی پر یہ لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور منفق علیہ پر خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ سے ثواب کے حصول کا ارادہ کرے اور وہ منفق علیہ سے کسی شے کی امید نہ رکھے اور سوائے اپنے استحقاق کی رعایت کرنے کے اس کے احوال میں سے کسی حال پر نظر نہ رکھے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ﴿۹﴾ (الدہر) (نہ ہم تم سے کسی اجر کے خواہاں ہیں اور نہ شکریہ کے)

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 81

اور جب اس نے اس ارادے سے مال خرچ کیا کہ وہ کسی بھی وجہ سے منفق علیہ سے جزا حاصل کرے تو اس طرح اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہ کیا اور یہ تب ہے جب اس کے اس گمان کے پیچھے خرچ کرنے سے مقصود احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا ہو۔ اور اسی طرح جس نے کسی مضطر اور مجبور آدمی سے مشقت اور تکلیف دور کرنے کے لئے خرچ کیا یا تو اس پر احسان جتلانے کے لئے جس پر خرچ کیا گیا ہے یا مشقت کے کسی دوسرے قرینہ کے سبب اذیت پہنچانے کے لئے تو اس طرح اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا۔ بلاشبہ اس کا یہ عمل قبول کیا جائے گا جب اس کی یہ عطا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو اور اس کا زیادہ سے زیادہ ارادہ اس (اجر و ثواب) کی خواہش ہو جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک اعرابی آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا:

یا عُمَر الخیر جُزیت الجنه اُکسُ بُنَیَّاتِی و اُمَّهُنه

اے عمر! بھلائی اور نیکی کیجیے آپ کو جنت کی جزا دی جائے میری بیٹیوں اور ان کی ماں کو لباس پہنا یئے۔

و کُنْ لنا من الزمان جُنَّه أقسم بالله لتفعلَنَه

تو ہمارے لئے (مصائب) زمانہ سے ڈھال بن جا۔ میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہوں آپ ضرور ایسا کریں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں نہ کروں تو کیا ہوگا؟ اس نے عرض کی:

اِذًا ابا حفص لأذهبَنه

اے ابا حفص! تب میں چلا جاؤں گا۔

پھر آپ نے فرمایا: جب تو چلا گیا تو کیا ہوگا؟ اس نے عرض کی:

تکون عن حالی لَتُسألَنه یوم تکون الأعطیات هَنَه

میرے حال کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا جس دن عطیات کی آرزو ہوگی۔

و مَوقِفُ المسئول بَیْنَهُنَّة اما الی نارٍ واما جَنّه

اور ان کے درمیان مسئول کا موقف (ٹھہرنے کی جگہ) یا جہنم ہوگی یا جنت۔

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے یہاں تک کہ آپ کی ریش مبارک تر ہوگئی۔ پھر آپ نے فرمایا: اے غلام! اس دن کے لئے اسے میری یہ قمیص دے دو نہ کہ اس کے شعر کے لئے۔ قسم بخدا! میں اس کے سوا کسی کا مالک نہیں ہوں۔ ماوردی نے کہا ہے: جب عطا اس ارادہ پر ہو کہ وہ جزا اور شکر کی طلب سے خالی ہو اور احسان جتلانے اور شہرت سے بھی پاک ہو تو وہ خرچ کرنے والے کے لئے انتہائی اشرف و اعلیٰ ہے اور قبول کرنے والے کے لئے باعث مبارک ہے، لیکن جب عطا کرنے والا اپنی عطا سے جزا کا خواہشمند ہو اور اس کے عوض شکر اور ثنا کا طالب ہو تو وہ شہرت کا طالب اور ریاکاری کرنے والا ہے۔ اور ان دونوں میں ایسی ذم اور برائی ہے جو سخاوت کے منافی ہوتی ہے اور اگر اس نے جزا کا مطالبہ کیا تو وہ ایسا نفع کمانے والا تاجر ہے جو حمد اور مدح کا مستحق نہیں ہوتا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس قول باری تعالیٰ میں کہا ہے: وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝

(المدثر) یعنی آپ کسی کو ایسا عطیہ نہ دیں کہ آپ اس کے عوض اس سے افضل و اعلیٰ کی خواہش رکھتے ہوں۔

اور ابن زید نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جو خود جہاد میں نہیں نکلتے بلکہ وہ خرچ کرتے ہیں اس حال میں کہ خود بیٹھے ہوتے ہیں اور اس سے پہلی آیت ان کے بارے میں ہے جو بنفس نفیس جہاد کے لئے نکلتے ہیں۔ فرمایا: اسی لئے ان پر شرط لگائی گئی ہے اور پہلوں پر کوئی شرط نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول محل نظر ہے، کیونکہ اس میں اپنی رائے سے فیصلہ دینے کا اظہار ہو رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مَنًّا وَّلَآ اَذًى، المن کسی نعمت و احسان کا ذکر کرنا ہے اس کو شمار کرنے اور گننے کے لئے اور اس کے سبب (دوسرے کو) پریشان کرنے کے لئے۔ مثلاً وہ یہ کہے: قد احسنت الیك و نعشتك میں نے تجھ پر احسان کیا اور تجھے ہلاک ہونے سے بچالیا۔ اور اسی کے مشابہ اور الفاظ۔

اور بعض نے کہا ہے: المن کا مفہوم ہے اس کے بارے میں گفتگو کرنا جو اس نے دیا یہاں تک کہ وہ گفتگو اس تک پہنچ جائے جسے دیا گیا اور وہ اس کے لئے باعث تکلیف ہو اور احسان جتلانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور یہ صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہے (1)۔ اور یہ بھی ان تین میں سے ایک ہے جن کی طرف اللہ تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرمائے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

اور نسائی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تین آدمی ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر رحمت نہیں فرمائے گا: اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا، مرد کی طرح بننے والی عورت جو کہ مردوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرتی ہو اور دیوث (بے غیرت انسان۔) اور تین ہیں جو جنت میں داخل نہیں ہوں گے: اپنے والدین کا نافرمان، ہمیشہ شراب پینے والا اور اس کے ساتھ احسان جتلانے والا جو کسی کو عطا کرے (2)۔'' اور مسلم کی بعض اسناد میں ہے: المنان (احسان جتلانے والا) وہ ہے جو کسی کو بغیر احسان جتلائے کوئی شے نہیں دیتا۔'' اور الاذی سے مراد گالیاں دینا اور شکایت کرنا ہے اور یہ مَنّ سے اعم ہے۔ کیونکہ مَنّ، الاذی کا جز ہے لیکن اس کے کثیر الوقوع ہونے کے سبب اس پر نص وارد ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: اگر تجھے گمان ہو کہ تیرا اسلام اس پر ثقیل اور گراں ہوگا جس پر تو نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کچھ خرچ کیا ہے تو تو اس پر سلام نہ کر اور آپ کو ایک عورت نے کہا: اے ابو اسامہ! میری ایسے آدمی پر رہنمائی کیجئے جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلتا ہے کیونکہ وہ تو نکلتے ہیں (اور) وہ پھل کھاتے ہیں بلاشبہ میرے پاس تیر اور ترکش ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تیروں اور تیرے ترکش میں تیرے لئے برکت نہ رکھے تحقیق تو نے انہیں دینے سے پہلے انہیں اذیت اور تکلیف دی ہے۔

ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا اور اس کے پیچھے نہ احسان جتلایا اور نہ دکھ پہنچایا جیسا کہ اس کا یہ قول: تیرا اصرار اور تیری احتیاج کتنی شدید تھی! تیری جانب سے اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص عطا فرمائے۔ اور اسی

1۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی إسبال الازار، حدیث نمبر 3565، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ مسند امام احمد، حدیث 6180

طرح کی دیگر مثالیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اجر کی ضمانت دی ہے اور وہ اجر جنت ہے اور اس کی موت کے بعد مستقبل کے لئے اس سے خوف کی نفی کر دی اور اس حزن اور غم کی نفی کر دی جو اسے اس پر ہوا جو دنیا میں سے گزر چکا ہے کیونکہ وہ تو اپنی آخرت کے ساتھ خوش اور مسرور ہوتا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے یہ فضل و شرف کافی ہے۔ اور اس میں ان کے لئے دلیل ہے جنہوں نے غنی کو فقیر پر فضیلت دی ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

''اچھی بات کرنا اور (غلطی) معاف کر دینا بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے پیچھے دکھ پہنچایا جائے اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے بڑے حلم والا ہے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی قول معروف أولی و أمثل (اچھی بات کرنا اولیٰ اور عمدہ ہے) اس کا ذکر نحاس اور مہدوی نے کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ خبر ہو اور مبتدا محذوف ہو۔ یعنی الذی أمرتم بہ قولٌ معروف۔ (وہ جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے وہ اچھی بات کرنا ہے) اور قول معروف سے مراد دعا کرنا، انس اور غمخواری کا اظہار کرنا اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس کی آرزو کرنا ہے، یہ صدقہ سے بہتر ہے، کیونکہ یہ ظاہر میں صدقہ ہے اور اپنے باطن میں کوئی شی نہیں ہے اور قول معروف کے ذکر میں اجر ہے اور ایسے صدقہ میں کوئی اجر نہیں ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پاکیزہ کلمہ صدقہ ہے(1) اور بلاشبہ تیرا اپنے بھائی کو خندہ پیشانی سے ملنا بھی نیکی میں سے ہے۔'' اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

پس چاہیے کہ آدمی سائل کو خوشی سے اور مرحبا کہتے ہوئے ملے اور کشادہ روئی اور انتہائی قرب اور فرحت کے ساتھ اس کا سامنا کرے، تاکہ وہ مشکور ہو اگر کچھ عطا کرے اور معذور ہو اگر کچھ نہ دے۔ اور بعض حکماء نے کہا ہے: تو حاجتمند کے ساتھ خندہ پیشانی اور خوش روئی سے ملاقات کر۔ پس اگر تو اس کے شکر سے محروم رہا تو اس کے عذر سے محروم نہ رہے۔

اور ابن لنکک نے کہا ہے کہ ابوبکر بن درید نے ایک حاجت کے بارے میں کسی وزیر کا قصیدہ لکھا جس نے اسے پورا نہ کیا اور اس کے لئے اس کی جانب سے تنگی کا اظہار ہوا تو اس نے کہا:

لا تدخلنك ضجرة من سائل   فلخيرُ دهرِك أن تُرى مسئولا

کسی سائل سے کوئی تنگی تجھ میں نہ آنے پائے۔ پس تیرے زمانے کی خیر اور بھلائی اس میں ہے کہ تیرے سامنے دست سوال دراز کیا جاتا رہے۔

لا تجبَهَنْ بالردِّ وجه مُؤمِّلٍ   فبقاءُ عِزِّك أن تُرى مأمولا

1۔ صحیح بخاری، باب من اخذ بالرکاب، حدیث نمبر 2767، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو کسی آرزومند کی حاجت لوٹا کر اس کے چہرے پر نہ مار۔ پس تیری عزت کی بقا اس میں ہے کہ تجھ سے آرزو اور امید وابستہ کی جاتی رہے۔

تلقى الكريمَ فتستدلّ ببِشْرِه　و ترى العُبُوس على اللّئيم دَليلا

تو کسی کریم اور سخی سے ملے تو تیرے لئے اس کی دلیل اس کی خندہ پیشانی ہے اور لئیم کی دلیل اس کے چہرے کی یبوست اور تیوری چڑھانا ہے۔

وَاعلَمْ بأنك عن قليل صائرٌ　خبرا فكُن خبراً يَروق جميلا

تو اس کے بارے میں جان کہ تو قلیل کی طرف سے خبر دینے والا ہے۔ پس تو ایسی خبر بن جا جو حسن و جمال کے اعتبار سے خوش کرنے والی ہو۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب سائل سوال کرے تو تم اس پر اس کا سوال کاٹ نہ دو یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہو جائے، پھر بڑے وقار اور نرمی کے ساتھ یا تھوڑے سے بدل کے ساتھ یا حسین انداز میں رد کے ساتھ اس پر جواب لوٹاؤ۔ تحقیق تمہارے پاس وہ آتے ہیں جو نہ انسانوں میں سے ہیں اور نہ جنات میں سے ہیں، وہ اس بارے میں تمہارے احسانات کو دیکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمائے ہیں۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کی دلیل ابرص (برص کا مریض) أقرع (گنجا) اور اعمیٰ (اندھا) والی حدیث ہے (1)، اسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک فرشتے نے مختلف صورتیں اختیار کیں۔ ایک بار برص کے مریض کی، دوسری بار گنجے آدمی کی اور تیسری بار اندھے آدمی کی مسئول (جس سے سوال کیا جائے) کا امتحان لینے کے لئے۔

اور حضرت بشر بن حارث نے کہا ہے: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا اور عرض کی: اے امیر المومنین! مجھے کوئی ایسی شے بتایئے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ مجھے نفع عطا فرمائے، تو انہوں نے فرمایا: اغنیاء کا فقراء پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی رغبت اور آرزو رکھتے ہوئے لطف و مہربانی کرنا بہت اچھا ہے اور اس سے اچھا فقراء کا اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد اور یقین کرتے ہوئے اغنیاء پر سرگشتہ پھرنا ہے، پھر میں نے کہا: اے امیر المومنین! کچھ اضافہ فرمایئے تو آپ نے پیٹھ پھیری اور آپ یہ کہنے لگے:

قد كنتَ ميتا فصرتَ حيًا　وعن قليل تصير ميتاً

تحقیق تو مردہ تھا اور تو زندہ ہو گیا اور پھر قلیل کے سبب تو مردہ ہو جائے گا۔

فاخرب بدار الفناء بيتا　و ابن بدار البقاء بيتا

پس تو دار الفنا (دنیا) میں گھر گرا دے اور دار البقاء (آخرت) میں گھر بنا لے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَّ مَغْفِرَةٌ۔ یہاں مغفرت سے مراد محتاج کی بری حالت اور خصلت کو چھپانا ہے۔ اور اسی

1۔ صحیح بخاری، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3205، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے اعرابی کا قول ہے تحقیق اس نے فصیح کلام کے ساتھ ایک قوم سے سوال کیا تو کہنے والے نے اسے کہا: تو کس (خاندان کا) آدمی ہے؟ تو اس نے اسے کہا: اللہ تعالیٰ مغفرت کرے! بری کمائی نسب ظاہر کرنے سے مانع ہوتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: سائل کو معاف کر دینا جب وہ اصرار کرے، اکھڑپن اور خشکی کا مظاہرہ کرے اس پر ایسا صدقہ کرنے سے بہتر ہے جس کے ساتھ وہ احسان جتلائے اور اسے دکھ پہنچائے۔

نقاش نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ مشکل ہے اعراب (ترکیب) اس کی وضاحت کرے گا۔ وَّ مَغْفِرَةٌ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ ہے اور معنی اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اور وہ فعل جو مغفرت تک پہنچا دیتا ہے وہ اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ پہنچانا ہو۔ اور عربی میں تقدیر عبارت یہ ہے: و فعل مغفرۃ او یہ بھی جائز ہے کہ یہ تیرے اس قول کی مثل ہو: تفضُّلُ اللہ علیك اکبر من الصدقة التی تَمُنُّ بھا (تجھ پر اللہ تعالیٰ کا فضل اس صدقہ سے بڑا ہے جس کے ساتھ تو احسان جتلاتا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ کی مغفرت تمہارے اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے ساتھ تم احسان جتلاتے ہو۔ (ای غفران اللہ خیر من صدقتکم ھذہ التی تمُنُّونَ بھا)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے غنائے مطلق کی خبر دی ہے کہ وہ بندوں کے صدقہ سے مستغنی ہے اور اس کا حکم صرف اس لئے دیا ہے تاکہ وہ انہیں ثواب عطا کرے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حلم کے بارے خبر دی ہے کہ وہ اسے سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا جو احسان جتلائے اپنے صدقہ کے ساتھ اور دکھ پہنچائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

''اے ایمان والو! مت ضائع کرو اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر اور دکھ پہنچا کر اس آدمی کی طرح جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے اور یقین نہیں رکھتا اللہ پر اور دن قیامت پر۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چکنی چٹان ہو جس پر مٹی پڑی ہو پھر برسے اس پر زور کی بارش اور چھوڑ جائے اسے چٹیل صاف پتھر۔ (ریاکار) حاصل نہ کر سکیں گے کچھ بھی اس سے جو انہوں نے کمایا اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کفر اختیار کرنے والوں کو۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى۔ ان کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عدم قبول اور ثواب سے محروم ہونے کو ابطال سے تعبیر کیا ہے اور مراد وہ صدقہ ہے جس کے ساتھ وہ احسان جتلاتا ہے اور دکھ پہنچاتا ہے، جو اس کے سوا ہو وہ مراد نہیں۔ اور عقیدہ یہ ہے کہ گناہ (سیئات) نیکیوں (حسنات) کو نہ باطل کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں بالکل بے کار بنا دیتے

ہیں۔ پس صدقہ میں احسان جتلانا اور دکھ پہنچانا بھی اس صدقہ کے سوا کسی صدقہ کو باطل نہیں کرتا۔

جمہور علماء نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک وہ صدقہ جس کے دینے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ احسان جتلائے گا یا اس کے سبب دکھ پہنچائے گا تو وہ قبول نہیں کیا جاتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ کبھی اس پر بطور اَمارۃ فرشتہ کو مقرر کر دیتا ہے اور وہ اسے لکھتا ہی نہیں۔ اور یہ قول حسن اور اچھا ہے۔ اور عرب اس کے بارے کہتے ہیں جس کے ساتھ احسان جتلایا جاتا ہے: یَدٌ سوداء (سیاہ ہاتھ (یعنی ایسی نعمت جس کو ضائع کر دیا گیا) اور جو کسی کو بغیر سوال کے عطا کرتا ہے اسے یَدٌ بیضاء (روشن ہاتھ) کہتے ہیں اور جو سوال کرنے پر عطا کرتا ہے اسے یَدٌ خضراء (سبز ہاتھ) کہتے ہیں۔ اور بعض بلغاء نے کہا ہے: جس نے اپنی نیکی کے ساتھ احسان جتلایا اس کا شکر ساقط ہو گیا۔ اور جس نے اپنے عمل کے ساتھ تکبر کیا اس کا اجر ضائع ہو گیا اور بعض شعراء نے کہا ہے:

و صاحب سلفتْ منه الیّ ید　　أبطا علیه مُکافاتی فعادانی

میرا وہ ساتھی جس کی طرف سے مجھ پر پہلے احسان ہوتا رہا ہے اس پر میری طرف سے بدلہ موخر ہوا تو اس نے میرے ساتھ عداوت اختیار کر لی۔

لما تیقن ان الدھر حاربنی　　أبدَی الندامة فیما کان أولانی

جب یقین ہو گیا کہ زمانے نے مجھ سے جنگ شروع کر دی ہے تو جو شے میرے قریب آئی اسی میں اس نے ندامت ظاہر کر دی۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا:

أفسدتَ بالمن ما اسدیت من حَسَنٍ　　لیس الکریم اذا اسدی بمنّان

تو نے احسان جتلانے کے ساتھ اس نیکی کو ضائع کر دیا جس کا تو نے احسان کیا اور کریم (سخی آدمی) جب احسان کرتا ہے تو وہ احسان نہیں جتلاتا۔

اور ابوبکر وراق نے کہا اور خوب اچھا کہا:

أحسن من کل حَسَنٍ　　فی کل وقت و زَمَنٍ

ہر اچھائی اور نیکی سے بڑھ کر اچھائی ہر وقت اور ہر زمانے میں

صنیعةٌ مَرْبُوبَةٌ　　خالیة من المنن

وہ احسان ہے جو بڑھایا جائے درآنحالیکہ وہ احسان جتلانے سے خالی ہو۔

ابن سیرین نے ایک آدمی کو سنا وہ دوسرے کو کہہ رہا ہے: فعلتُ الیک و فعلت (میں نے تیرے ساتھ ایسا کیا اور ایسا کیا) تو آپ نے اسے کہا: تو خاموش رہ نیکی کو جب شمار کر لیا جائے تو پھر اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایاکم و الامتنان بالمعروف فانه یبطل الشکر و یمحق الأجر تم نیکی کے ساتھ احسان جتلانے سے بچو کیونکہ یہ شکر کو باطل کر دیتا ہے اور اجر کو مٹا ڈالتا ہے...... پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت

فرمائی..... لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى الآیۃ۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اس آیت کی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مکروہ قرار دیا ہے کہ آدمی اپنا واجب صدقہ اپنے اقارب کو دے تاکہ وہ ان سے تعریف وثنا کی صورت میں عوض کا طالب نہ ہو۔ وہ ان پر اپنے احسان کا اظہار کرے گا اور وہ اسے اس پر بدلہ اور عوض دینے کی کوشش میں ہوں گے۔ نتیجتاً وہ صدقہ خالصۃ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے نہ ہوگا۔ اور مستحب یہ ہے کہ وہ صدقہ اجنبی لوگوں کو دے۔ اور یہ بھی مستحب ہے کہ وہ کسی غیر کو اس کی تقسیم پر مقرر کرے جبکہ امام وقت عادل نہ ہو، تاکہ احسان جتلانے اور دکھ پہنچانے کے ساتھ یا جس کو دیا گیا ہے اس کی طرف سے شکر، تعریف یا خدمت کی صورت میں عوض دینے کے سبب وہ ضائع نہ ہو جائے۔ اور یہ اس نفلی صدقہ کے خلاف ہے جو سرّاً دیا جاتا ہے کیونکہ اس کا ثواب جب ضائع ہو جائے تو وہ وعید سے محفوظ رہتا ہے اور وہ ایسے آدمی کے حکم پر ہو جاتا ہے جس نے وہ کام نہیں کیا لیکن واجب صدقہ کا جب ثواب ضائع ہو جائے تو اس کی طرف وعید متوجہ ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے حکم میں ہو چکا ہے جس نے وہ ادا ہی نہیں کیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ۔ یہاں کاف محل نصب میں ہے۔ ای ابطال كَالَّذِيْ اور یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال کے محل میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال بیان فرمائی ہے جو احسان جتلاتا ہے اپنے صدقہ کے ساتھ اور دکھ پہنچاتا ہے اس آدمی کے ساتھ جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کے لئے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور اس کافر کے ساتھ جو مال خرچ کرتا ہے تاکہ اسے سخی کہا جائے اور طرح طرح سے اس کی تعریف کی جائے۔ پھر اس خرچ کرنے والے کی مثال بیان فرمائی ایسی چٹان کے ساتھ جس پر مٹی پڑی ہوئی ہو اور گمان کرنے والا اسے اچھی اگانے والی زمین گمان کر رہا ہو اور جب اس پر موسلا دھار بارش پڑے تو وہ اس سے ساری مٹی بہا کر لے جائے اور وہ صاف چٹیل پتھر باقی رہ جائے۔ پس یہ ریاکاری کرنے والا بھی اسی طرح ہے۔

پس احسان جتلانا، دکھ پہنچانا اور ریاکاری آخرت میں نیت کو ظاہر کر دیں گے اور صدقہ باطل ہو جائے گا جیسا کہ موسلا دھار بارش چٹان کو ظاہر کر دیتی ہے۔ صفوان سے مراد وہ بڑا پتھر ہے جو چکنا ہو۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت سے مراد فضل (اضافی ثواب) کو باطل کرنا ہے نفس ثواب کو باطل کرنا نہیں۔ اپنے نفقہ سے ریاکاری کا ارادہ کرنے والا نہ کہ ثواب کا وہ کافر کی طرح ہے، کیونکہ اس نے اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد نہیں کیا کہ وہ ثواب کا مستحق ہو۔ اور یہ اس احسان جتلانے والے اور دکھ پہنچانے والے کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد کرتا ہے وہ اس کے ثواب کا مستحق ہوگا اگرچہ اس نے بار بار کسی کو عطا کیا اور اس نے اس کے فضل اور زیادتی کو باطل کر دیا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ وہ اپنے احسان جتلانے اور اس کو دکھ پہنچانے کے وقت سے اپنے صدقہ کے ثواب سے محروم ہوتا ہے اور جو اس سے پہلے ہے وہ اس کے لئے لکھ دیا جاتا ہے اور اسے بڑھایا جاتا ہے اور جب وہ احسان جتلاتا ہے اور دکھ پہنچاتا ہے تو اس کی تضعیف (کئی گناہ زیادتی) منقطع ہو جاتی ہے کیونکہ صدقہ دینے والے کے لئے صدقہ بالتدریج بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بہت بڑے پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے اور جب وہ اپنے مالک کے ہاتھ سے خالصہ علی وجہ المشروع نکلے تو وہ کئی گنا بڑھا

دیا جاتا ہے اور جب اس کے ساتھ احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا شامل ہو جائے تو اس کے سبب وہ وہیں رک جاتا ہے اور اس سے تضعیف کی زیادتی منقطع ہو جاتی ہے۔ پہلا قول اظہر ہے۔ واللہ اعلم

صَفْوَانٍ جمع ہے اور اس کی واحد صَفْوانۃ ہے۔ اخفش نے یہی کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: صفوان واحد ہے جیسا کہ حجر اور کسائی نے کہا ہے: صَفْوان واحد ہے اور اس کی جمع صِفْوان، صُفِیّ اور صِفِیّ ہے۔ مبرد نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: بلاشبہ صُفِیّ صَفَا کی جمع ہے جیسا کہ قفاکی جمع قُفِیّ ہے اور اسی معنی سے الصَّفواء اور الصَّفَا ہیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور زہری نے صَفَوان فاء کو متحرک پڑھا ہے اور یہ ایک لغت ہے۔ اور قطرب نے صِفْوان بیان کیا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: صَفْوان اور صَفَوان یہ بھی جائز ہے کہ یہ جمع ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ واحد ہو۔ مگر اولیٰ یہ ہے کہ یہ واحد ہو۔ اور دلیل یہ ارشاد گرامی ہے { عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ اگرچہ جمع کے لئے مذکر ضمیر لانا جائز ہوتا ہے مگر کوئی شے دلیل قاطع کے بغیر اپنے باب سے نہیں نکل سکتی۔ اور رہا وہ جو امام کسائی نے جمع کے بارے میں بیان کیا ہے تو وہ فی الحقیقت صحیح نہیں ہے۔ البتہ صِفْوان صَفا کی جمع ہے اور صفا معنی صَفْوان ہے۔ اور اس کی نظیر وَرَلٌ (گوہ کی مانند ایک جانور) اور وِرْلَانٌ، اَخٌ اور اخوان اور کَرٌ اور کِرْوان (بھورے رنگ اور لمبی چونچ کا ایک پرندہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ رات کو نہیں سوتا ہے۔) ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لنا یومٌ و لِلکِرْوان یومٌ تطیر البائسات و لا نطیر

اور عربی میں کَرَوان کی جمع کِرْوان ضعیف ہے اور صُفِیّ اور صِفِیّ صَفا کی جمع بھی جیسا کہ عَصًا اور الوابل کا معنی ہے: شدید اور موسلا دھار بارش اور (کبھی کہا جاتا ہے) وَبَلَت السمآء تَبِل (آسمان موسلا دھار برسا) اور الارض مَوْبُولۃ (اور زمین خوب تر ہو گئی) اخفش نے کہا ہے اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا یعنی ہم نے اسے انتہائی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اور ضرب وَبیل (سخت مار) اور عذاب وبیل (شدید عذاب) اور الصَّلْد کا معنی ہے: چکنا پتھر۔ امام کسائی نے کہا ہے: صَلِد یَصْلَد صَلَدًا اس میں لام متحرک ہے فھو صَلْدٌ اس میں لام ساکن ہے۔ مراد ہر وہ شے ہے جو کسی شے کو نہ اگائے۔ اور اسی سے جَبِینٌ اَصْلَد (روشن پیشانی) ہے۔ اصمعی نے روبہ کے لئے شعر کہا ہے:

بَرَّاقُ أَصْلادِ الجَبِينِ الأَجْلَه

نقاش نے کہا ہے: ہذیل کی لغت کے مطابق اصلد کا معنی اجرد (خالی ہونا) ہے۔

اور لَا يَقْدِرُونَ کا معنی ہے: ریاکار، کافر اور احسان جتلانے والا کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ عَلٰى شَيْءٍ یعنی اپنے خرچ کرنے سے کسی شے کے ثواب کا نفع اٹھانے پر (وہ قادر نہیں ہو سکیں گے) اور یہی ان کی کمائی ہے انہیں اس کی ضرورت اور حاجت ہونے کے وقت، کیونکہ یہ غیر اللہ کے لئے (صدقہ) تھا۔ اور نفقہ کو کسب سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے اس سے کسب (کمائی) کا ارادہ کیا ہے۔

اور کہا گیا ہے: یہ ریاکار کے لئے اس کا ثواب باطل کرنے کی مثال بیان کی گئی ہے اور احسان جتلانے والے اور اذیت

دینے والے کے لئے اس کی فضل وزیادتی کو باطل کرنے کی مثال ہے۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَیْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۶۵﴾

''اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے اور اس لئے تاکہ پختہ ہوجائیں ان کے دل ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو ایک بلند زمین پر ہو، برسا ہو اس پر زور کا مینہ تو لایا ہو وہ باغ دوگنا پھل اور اگر نہ برسے اس پر بارش تو شبنم ہی کافی ہوجائے اور اللہ تعالیٰ جو تم کررہے ہو سب دیکھ رہا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ۔ اس میں اِبْتِغَاءَ مفعول من اجلہ ہے۔ اور وَ تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ اس پر معطوف ہے۔ اور مکی نے المشکل میں کہا ہے: یہ دونوں مفعول من اجلہ ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے اور تَثْبِیْتًا کو مفعول من اجلہ بنانا صحیح نہیں ہے، کیونکہ انفاق (خرچ کرنا) تثبیت (پختہ ہو جانا) کی وجہ سے نہیں ہے۔ اور ابْتِغَآءَ کو حال کے محل میں مصدر ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے اور اس میں نصب مفعول من اجلہ کی وجہ سے بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن مصدر کی بنا پر نصب دینا اس وجہ سے درست ہے کہ اس پر تَثْبِیْتًا مصدر کا عطف ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے صدقات کا حال بیان کیا جن کے صدقات کا خیر وبھلائی میں کوئی بڑا حصہ نہیں اور مومنین کو ان مواقع سے منع فرمایا جو من وجہ اس سے مشابہت رکھتے ہیں تو اس کے بعد اس آیت میں اس قوم کے نفقات کا ذکر فرما رہا ہے جنہوں نے اپنے صدقات کو پاک کیا کیونکہ وہ شریعت کے موافق اور اس کی طرز پر تھے۔

اور ابْتِغَآءَ کا معنی طلب ہے اور مَرْضَاتِ یہ رَضِیَ یَرْضٰی سے مصدر ہے۔ اور وَ تَثْبِیْتًا کا معنی ہے کہ وہ پختہ ہوجائیں جہاں وہ اپنے صدقات کو رکھیں۔ یہ مجاہد اور حسن رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے۔ حسن نے کہا ہے: آدمی جب صدقہ کا قصد کرے تو وہ ثابت ہوجاتا ہے۔ پس اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہو تو وہ اسے ادا کردے اور اگر اس میں شک کی آمیزش ہو جائے تو اسے روک لے۔

اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تصدیق اور یقین کرتے ہوئے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے: اپنے دلوں میں ثواب کی نیت کرتے ہوئے۔ اور حضرات شعبی، سدی، قتادہ نے بھی، ابن زید اور ابوصالح رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم نے کہا ہے: وَ تَثْبِیْتًا کا معنی وَ تَیَقُّنًا ہے یعنی کہ ان کے دلوں کو بصیرت حاصل ہوجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرنے پر ان کے پختہ ہونے کا یہی مفہوم ہے۔ یہ تینوں اقوال حضرت حسن اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی نسبت زیادہ صحیح اور درست ہیں، کیونکہ وہ معنی جسے ان دونوں نے اختیار کیا ہے اس کی عبارت میں وَ تَثْبِیْتًا مصدر غیر مصدر پر محمول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اور یہ جائز نہیں ہوتا مگر مصدر کے

ذکر کے ساتھ اور فعل متقدم کی فصاحت و بیان کے ساتھ، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اللّٰهُ اَنۡۢبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا ۙ (نوح) (اور اللہ نے تم کو زمین سے عجب طرح اگایا ہے) اور وَ تَبَتَّلۡ اِلَیۡهِ تَبۡتِیۡلًا ؕ (المزمل) (اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو) لیکن جب فعل کے ساتھ وضاحت نہ ہو تو ایسا مصدر لانا جائز نہیں ہوتا جو اس کا ہم معنی نہ ہو۔ پھر تو کہے گا: میں اسے فلاں فلاں معنی پر محمول کرتا ہوں اس فعل کے لئے جن کا ذکر پہلے نہیں ہوا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ کلام عرب کا وسیع راستہ ہے جس کے بارے تو نے جان لیا ہے۔

اور نحاس نے کہا ہے: اگر ایسا ہوتا جیسا کہ حضرت مجاہد نے کہا ہے تو پھر وَتَثۡبِیۡتًا تثبت سے ہوتا جیسا کہ تکرمت تکرما ہے۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول کہ یہ اِحۡتِسَابًا کے معنی میں ہے، یہ نہیں پہچانا جا سکتا مگر اس طرح کہ اس سے مراد یہ لیا جائے کہ ان دلوں نے احتساب کرتے ہوئے ان کی خوب چھان بین کی اور یہ بعید ہے اور حضرت شعبی کا قول اچھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرنے پر اپنے دلوں کو پختہ رکھتے ہوئے۔ کہا جاتا ہے: ثَبَّتُّ فلانا فی هذا الامر میں نے فلاں کو اس کام میں پختہ کر دیا۔ یعنی میں نے اس کے عزم اور ارادہ کی تصحیح کی اور میں نے اس میں اس کی رائے کو قوی کر دیا، أثبته تثبیتا اور میں نے اسے بہت پختہ کر دیا۔ یعنی ان کے دل اللہ تعالیٰ کے وعدے کے ساتھ یقین رکھتے ہوئے اس میں بہت پختہ ہو گئے۔

اور بعض نے کہا ہے: وَ تَثۡبِیۡتًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ یعنی وہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر پختہ کر دے گا ای و تثبیتا من انفسهم لثوابها۔ یعنی تاکہ اس کے ثواب کے بارے ان کے دل پختہ ہو جائیں بخلاف اس منافق کے جو ثواب کا گمان بھی نہیں رکھتا۔

قولہ تعالیٰ: كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبۡوَةٍ اس میں جنة کا معنی باغ ہے اور یہ وہ قطعہ زمین ہوتا ہے جس میں درخت اگائے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اسے ڈھانپ لیتے ہیں۔ اور یہ لفظ جِنّ اور جنین سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ چھپے ہوتے ہیں اور اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔ اور رَبۡوَةٍ کا معنی ہے: ایسی بلند جگہ جس میں بلندی تھوڑی ہو اور اغلباً اس کے ساتھ مٹی کی کثافت اور کثرت بھی ہو۔ اور جو زمین اس طرح ہوتی ہے اس کی پیداوار اور نباتات اچھی ہوتی ہے۔ اسی لئے خاص طور پر ربوۃ کا ذکر کیا گیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اور ریاض الحزن اس میں سے نہیں ہے جیسا کہ طبری نے گمان کیا ہے۔ بلکہ یہ وہ ریاض ہے جو نجد کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ تہامہ کے ریاض سے بہتر ہے اور نجد کی نباتات زیادہ معطر اور خوشبودار ہوتی ہیں۔ اور اس کی ہوا زیادہ ٹھنڈی اور راحت بخش ہوتی ہے اور نجد کو ہی حزن کہا جاتا ہے۔ اور تہامہ کی ہوا سوائے رات کے بہت کم صحتمند اور نفع بخش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک اعرابیہ عورت نے کہا ہے: زوجی کلیل تهامة (میرا خاوند تہامہ کی رات کی مثل ہے) (1) اور سدی نے کہا: بِرَبۡوَةٍ بمعنی برباوۃ ہے یعنی زمین کا وہ حصہ جو پست ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قَلِقَة (دشواری، پریشانی) سے عبارت ہے اور ربوۃ کا لفظ رَبَا یَرۡبُوۡ سے ماخوذ ہے جب وہ بڑھ جائے اس میں اضافہ ہو جائے۔

1۔ صحیح بخاری، باب حسن المعاشرة مع الاهل، حدیث نمبر 4790، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: سدی کی عبارت کوئی شے نہیں ہے کیونکہ رَبَ وَکی بناء کا معنی کلام عرب میں زیادتی اور اضافہ کرنا ہے اور اسی سے الربو بلند نفس کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ رَبَا یَرْبُو جب ربوٗ (زیادتی) اسے آلے اور ربا الفرس جب دوڑنے یا گھبراہٹ کے سبب گھوڑے کی سانس پھول جائے۔ اور فراء نے اس قول باری تعالیٰ میں کہا ہے: اَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً کہ یہ بمعنی زائدہ ہے۔ (یعنی اس نے انہیں سخت مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا) جیسے کہ تیرا یہ قول ہے: اَرْبَيتُ جب تو اس سے زیادہ لے جو تو نے دیا ہو۔ اور رَبَوْتُ فی بنی فلان و رَبِیت ای نشأت فیھم۔ (میں نے ان میں نشوونما پائی) اور خلیل نے کہا ہے: الرَّبْوَةُ بلند زمین جو اچھی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو ذکر کے ساتھ خاص کیا ہے جس میں بلاد عرب میں عرف کے اعتبار سے پانی جاری نہیں ہوتا اور ان کے لئے اس کی مثال بیان فرمائی جسے وہ محسوس کر سکتے ہیں اور اس کا ادراک کر سکتے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ربوۃٌ سے مراد وہ بلند جگہ ہے جس میں نہریں جاری نہیں ہوسکتیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَصَابَهَا وَابِلٌ آخر آیت تک اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں جاری پانی نہیں ہے اور نہ ہی اس زمین کی جنس کا ار ہ کیا ہے، جس میں نہریں جاری ہوسکتی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ربوۃ ذات قرار و مَعین کا ذکر کیا ہے اور کلام عرب میں معروف یہ ہے کہ ربوہ سے مراد وہ جگہ ہے جو اپنے آس پاس سے بلند ہو چاہے اس میں پانی جاری ہو یا نہ جاری ہو۔ اور اس میں پانچ لغات ہیں، رُبْوَةٌ راء کے ضمہ کے ساتھ، ابن کثیر، حمزہ، کسائی، نافع اور ابوعمرو رحمۃ اللہ علیہم نے پڑھا ہے۔ اور رَبْوَةٌ عاصم، ابن عامر اور حسن رحمۃ اللہ علیہم نے راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور رِبْوَةٌ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابواسحاق سبیعی نے را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور رَبَاوَةٌ ابوجعفر اور ابوعبدالرحمن نے اس طرح پڑھا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

مَن مُنزِلِی فی رَوْضَة بِرَبَاوَة بین النخیل الی بقیع الغَرْقَدِ؟

اور رِبَاوَةٌ اشہب نے اسے را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے: بِرَبَاوَة اور بِرِبَاوَة، اور یہ سب الرابیہ سے ہیں اور اس کا فعل رَبَا یَرْبُو ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَصَابَهَا اس میں ہا ضمیر کا مرجع ربوۃ ہے۔ وَابِلٌ اس کا معنی ہے: شدید بارش۔ شاعر نے کہا ہے:

ما رَوْضَةٌ من رِیاض الحَزْن مُعْشِبَةٌ خضراء جَادَعلیها وَابِلٌ هَطِلٌ

اس میں وابل ھَطِل موسلا دھار بارش کے معنی میں ہی مذکور ہے۔

فَاٰتَتْ، ای اعطت تو لایا ہو اُکُلَهَا ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ۔ مراد وہ پھل ہے جو کھایا جاتا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ (ابراہیم: 25)

ہر شے میں سے کھائی جانے والی شے کو اُکُل کہا جاتا ہے اور الاکلة سے مراد لقمہ ہے۔۔ اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: فان کان للطعام مشفوها قلیلا فلیضع فی یدہ منه اُکلة اُو اُکلتین (اگر کھانا بہت تھوڑا رہ جائے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھ میں اس سے ایک یا دو لقمے رکھ لے۔) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ (1)

1۔ صحیح بخاری، باب اذا اتاہ خادمہ بطعامہ، حدیث نمبر 2370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس کی اضافت باغ کی طرف یہ اضافت اختصاص ہے۔ جیسا کہ سرج الفرس اور باب الدار میں اضافت اختصاص ہے ورنہ پھل اس میں سے نہیں ہے جسے باغ کہا جاتا ہے۔

نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے اُکلَھَا ہمزہ کو ضمہ اور کاف کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح ہر وہ جو مؤنث کی طرف مضاف ہو۔ اور ابو عمرو نے ان دونوں کا فرق بیان کیا ہے کہ جب اسے مذکر کی طرف مضاف کیا جائے مثلاً اُکلُهٗ یا کسی بھی شے کی طرف مضاف نہ ہو مثلاً اُکُلٍ خَمْطٍ (سبا: 16) تو ابو عمرو نے اسے مثقل پڑھا ہے اور دوسرے دونوں نے مخفف پڑھا ہے۔

اور عاصم، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے ان تمام صورتوں میں جو ہم نے ذکر کی ہیں اسے مثقل پڑھا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اُکْلٌ اور اُکُلٌ دونوں ہم معنی ہیں۔

ضِعۡفَيۡنِ یعنی وہ دوسری زمین کے مقابلہ میں دوگنا پھل لایا۔ اور بعض اہل علم نے کہا ہے کہ وہ سال میں دو بار پھل لایا۔ اور پہلا قول زیادہ ہے۔ یعنی اس نے اپنی پیداوار ایک سال میں دی جتنی پیداوار دوسری زمین دو سالوں میں دیتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنۡ لَّمۡ يُصِبۡهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بلند زمین کی مدح کی تاکید کے لئے ہے۔ اس طرح کہ اگر اسے موسلا دھار بارش نہ بھی پہنچے تو اسے شبنم ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اور یہی دوگنا پھل نکالنے میں شدید بارش کے قائم مقام ہو جاتی ہے اور یہ زمین کے زرخیز اور طیب ہونے کی وجہ سے ہے۔ مبرد وغیرہ نے کہا ہے: تقدیر کلام میں فطلٌّ یکفیھا۔ (پس شبنم ہی اسے کافی ہو جائے) اور زجاج نے کہا ہے: فالذی یصیبھا طلّ (اور وہ جس پر شبنم برسے) اور طلّ سے مراد کمزور سی بارش ہے جس کے قطرے باریک اور بالکل خفیف سے ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے یہی کہا ہے اور یہ اس کی مشہور لغت ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے جن میں سے حضرت مجاہد ہیں کہ الطل کا معنی شبنم ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مجاز اور تشبیہ ہے۔ نحاس نے کہا ہے اور اہل لغت نے بیان کیا ہے: وَبَلَتْ اور اَوۡبَلَت، طَلَّتْ اور أَطَلَّتْ۔ اور الصحاح میں ہے: الطلّ سے مراد انتہائی ضعیف اور کمزور بارش اور اس کی جمع الطِّلال ہے۔ اسی سے آپ کہتے ہیں: طُلَّت الارض و اطلها الندی زمین پر شبنم پڑی فھی مَطْلولة۔

ماوردی نے کہا ہے: شبنم کی کھیتی بارش کی کھیتی سے دگنی ہوتی ہے اور پیداوار کے لحاظ سے کم ہوتی ہے اور اس میں ہے ...... اور اگرچہ پیداوار اور نفع کم ہے۔

بعض نے کہا ہے: آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور اس کا معنی ہے: کمثل جنة بربوة أصابها و ابل فان لم یصبھا و ابل فطل فأتت اکلھا ضِعفین۔ یعنی باغ کے اوراق (پتے) سبز ہو گئے اور اس کا پھل دوگنا نکلا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلی تاویل زیادہ صحیح ہے اور تقدیم و تاخیر کی کوئی حاجت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان مخلص بندوں کے خرچ کئے ہوئے مال کے بڑھنے کو جن کے صدقات کو اللہ تعالیٰ بڑھاتا رہتا ہے جیسا کہ گھوڑے اور اونٹ کے بچے کو بڑھانا وغیرہ ایسے باغ کے پودوں کے بڑھنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو بلند جگہ پر واقع ہو بخلاف اس چکنی چٹان کے جس کی مٹی بہہ گئی

اور وہ خالص پتھر باقی رہ گیا۔

اور مسلم وغیرہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی آدمی بھی جو اپنی پاکیزہ کمائی سے ایک کھجور صدقہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنے دست قدرت کے ساتھ لے لیتا ہے اور پھر اس کی نشوونما کرتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کے بچے اور اونٹ کے بچے کی پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی مثل یا اس سے بھی بڑی ہو جاتی ہے'' اسے مؤطا نے بھی روایت کیا ہے۔(1)

قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ یہ وعدہ اور وعید ہے۔ زہری نے يَعْمَلُوْنَ یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا وہ اس سے تمام لوگ مراد لیتے ہیں یا پھر صرف خرچ کرنے والے مراد لیتے ہیں تو اس صورت میں یہ صرف وعدہ ہے۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

''کیا پسند کرتا ہے کوئی تم میں سے کہ ہو اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا بہتی ہوں اس کے نیچے ندیاں (کھجور اور انگور کے علاوہ) اس کے لئے اس میں ہر قسم کے اور پھل بھی ہوں اور آ لیا ہو اسے بڑھاپے نے اور اس کی اولاد بھی کمزور ہو (تو کیا وہ پسند کرتا ہے کہ) پہنچے اس باغ کو بگولہ جس میں آگ ہو پھر وہ باغ جل بھن جائے۔ ایسے ہی کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنی) آیتیں تاکہ تم غور و فکر کرو۔''

قولہ تعالیٰ: اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ الآیہ۔ طبری نے سدی سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت ریا کے نفقہ کی دوسری مثال ہے اور آپ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی روایت ہے، آپ نے بیان فرمایا: یہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے ریاکاروں کے اعمال کے بارے بیان فرمائی ہے جنہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ باطل کر دے گا جن کی طرف وہ زیادہ محتاج ہوگا، جیسا کہ اس آدمی کی مثال جس کا ایک باغ ہو اور اس کے بچے ہوں اور وہ اسے کوئی نفع اور فائدہ نہ دیں اور وہ بوڑھا ہو جائے اور باغ کو بگولہ آ پہنچے یعنی ایسی تیز آندھی جس میں آگ ہو اور وہ جل جائے اور وہ اسے گم کر دے اس وقت جب وہ اس کا زیادہ محتاج ہوا۔ اور ابن زید سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد پڑھا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى الآیہ (بقرہ: 264) پھر فرمایا: پھر اس بارے میں مثال بیان فرمائی اور فرمایا: اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ الآیہ۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ اس سے واضح اور زیادہ بین ہے جسے طبری نے ترجیح دی ہے اور یہ آیت ریا کے نفقہ کی دوسری مثال نہیں ہے۔ یہی سیاق کلام کا تقاضا ہے۔ اور رہا وہ معنی جو اس سیاق کے سوا میں ہے تو وہ ہر منافق یا کافر کے حال کے مشابہ ہے جو ایک عمل کرتا ہے اور وہ گمان رکھتا ہے کہ وہ خوب اچھا کر رہا ہے اور جب وہ حاجت کے وقت وہاں آئے گا تو وہ کوئی شے نہ پائے گا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، حدیث نمبر 1321، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ مثال اس آدمی کی ہے جس نے غیر اللہ کے لئے عمل کیا چاہے وہ منافق ہو یا کافر ہو۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ مگر بخاری میں آپ سے اس کے خلاف ثابت ہے۔ امام بخاری نے حضرت عبید بن عمیر سے روایت بیان کی ہے (1)، انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو ایک دن کہا: تم کیا رائے رکھتے ہو یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ؟ انہوں نے جواب دیا: اللہ و رسولہ اعلم۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصے ہو گئے اور فرمایا: تم کہو: ہم جانتے ہیں یا ہم نہیں جانتے۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: اے امیر المومنین! میرے دل میں اس کے بارے ایک شے آ رہی ہے۔ آپ نے فرمایا: اے میرے بھتیجے! کہو اور اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھو، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ ایک عمل کی مثال بیان کی گئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: وہ کون سا عمل ہے؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: غنی اور سخی آدمی کے عمل کی جو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و پیروی میں کرتا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک شیطان بھیج دیا اور اس نے گناہ کے عمل کئے یہاں تک کہ اس نے پہلے عمل کو جلا دیا (2) اور ایک روایت میں ہے: جب وہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا اور اس کی موت قریب آ گئی تو بدبختی کے اعمال میں سے کسی عمل پر اس کا خاتمہ ہوا۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے خوش ہوئے (اور اس رائے کو پسند فرمایا) اور ابن ابی ملیکہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا: یہ ایک مثال ہے جو ایسے انسان کی بیان کی گئی ہے جو عمل صالح کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی آخری عمر کو پہنچتا ہے اور زیادہ اس کا محتاج ہوتا ہے تو اس وقت برائی اور گناہ کا عمل کر لیتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ایک نظر اور رائے ہے جس کے ساتھ آیت کو ہر اس شے پر محمول کیا جا سکتا ہے جو اس کے الفاظ کے تحت داخل ہو۔ اور اسی طرح مجاہد، قتادہ اور ربیع وغیرہم نے بیان کیا ہے۔ کھجور اور انگور کو ذکر کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ ان دونوں کو تمام درختوں پر فضل و شرف حاصل ہے۔

اور حسن نے جنات جمع کے ساتھ قراءت کی ہے۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ لَهٗ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ یہ ماضی کا مستقبل پر عطف ہے اور وہ تَكُوْنَ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ یَوَدُّ ہے۔ اور کہا گیا ہے: تقدیر عبارت ہے: و قد اصابه الكبرُ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ معنی پر محمول ہے، کیونکہ معنی یہ ہے: اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ ان لو كانت له جنة۔ (کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اگر اس کا ایک باغ ہو۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ واؤ حالیہ ہے اور اسی طرح وَلَهٗ میں بھی ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ۔ حسن نے کہا ہے: اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ ایسی ہوا جس میں شدید سردی ہو۔ زجاج نے کہا ہے: لغت میں الاعصار سے مراد ایسی شدید اور سخت ہوا ہے جو زمین سے آسمان کی طرف عمود (خط عمودی) کی طرح چلتی ہے اور یہی وہ ہے جسے الزوبعه کہا جاتا ہے۔

جوہری نے کہا ہے: الزوبعة جنات کے سرداروں میں سے ایک سردار ہے اور اسی سے الاعصار کا نام زوبعه رکھا گیا

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4174، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ ایضاً

ہے۔ اور کہا جاتا ہے: امر زوبعہ اور یہ وہ ہوا ہے جو غبار اڑاتی ہے اور آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے گویا وہ عمود ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ الاعصار سے مراد وہ ہوا ہے جو بادلوں کو چلاتی ہے جن میں گرج اور چمک ہوتی ہے۔ اور مہدوی نے کہا: اس کو اعصار کہا گیا ہے کیونکہ یہ لپٹ جاتی ہے کپڑے کی طرح جب اسے نچوڑا جائے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول ضعیف ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بلکہ یہ صحیح ہے، کیونکہ یہی محسوس مشاہدہ ہے کیونکہ یہ عمودی شکل میں لپٹے ہوئے اوپر چڑھتی ہے اور کہا گیا ہے: بلاشبہ ہوا کو اعصار کہا گیا ہے، کیونکہ یہ بادلوں کو نچوڑ دیتی ہے اور بادل مُعْصِرات کہلاتے ہیں یا تو اس لئے کہ یہ (بارش) اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ پس یہ عورتوں میں سے معصر کی طرح ہیں یا اس لئے کہ یہ ہواؤں کے سبب نچڑ جاتے ہیں۔

ابن سیدہ نے بیان کیا ہے کہ ایک قوم نے معصرات کی تفسیر ریاح (ہواؤں) سے کی ہے نہ کہ بادلوں سے۔

ابن زید نے کہا ہے کہ اعصار سے مراد سخت آندھی اور گرم ہوا ہے اور اسی طرح سدی نے بھی کہا ہے کہ اعصار سے مراد ہوا اور سخت گرم آگ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: ایسی ہوا جس میں شدید گرمی اور تپش ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سخت گرمی میں بھی ہوتی ہے اور سخت سردی میں بھی ہوتی ہے اور یہ سب جہنم کی گرمی اور اس کی سانس لینے سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اسے متضمن ہے: اِذَا اشتدّ الحر فأبردوا عن الصلواۃ فَاِنَّ شدّۃ الحر من فیح جھنم جب گرمی شدید ہو جائے تو نماز کو ٹھنڈا کرو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی گرمی میں سے ہے۔ اور ان النار اشتکت الی ربھا الحدیث (1)۔ (اور بے شک آگ نے اپنے رب کے پاس شکایت کی۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے، یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے کافروں اور منافقین کے لئے بیان فرمائی ہے، جیسا کہ اس آدمی کی حالت جس نے ایک باغ لگایا اور اس میں کثرت سے پھل اگائے پھر اسے بڑھاپا آ پہنچا اور اس کی اولاد بھی کمزور ہو ...... اولاد سے مراد بچے، بچیاں اور غلام ہیں ...... پس اس کا گزارا اور اس کی اولاد کا گزارا اسی باغ سے ہو، تو اللہ تعالیٰ اس باغ پر ایسی ہوا چلا دے جس میں آگ ہو اور وہ اسے جلا کر بھسم کر دے اور اس کے پاس کوئی اور قوت و طاقت نہ ہو کہ وہ دوبارہ اسے لگا سکے اور نہ ہی اس کے بیٹوں کے پاس خیر و نفع ہو کہ وہ اپنے باپ کی طرف رجوع کریں۔ اسی طرح کافر اور منافق ہے جب وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے پاس پیش ہوں گے تو اس کے لئے (بھاگنے کا) کوئی ذریعہ نہ ہوگا، اسے اٹھایا جائے گا اور وہ دوسری بار حاضر ہو جائے گا۔ جیسا کہ اس کے پاس کوئی قوت نہیں کہ وہ اپنا باغ دوسری بار لگا سکے۔ اور نہ اس کے پاس وہ ہے جس کا وہ اپنی کبرسنی کے وقت محتاج ہے اور اس کی اولاد کمزور ہے اور اس سے مستغنی ہے۔

کَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ اس سے مراد ہے تاکہ تم میری عظمت اور میری ربوبیت کی طرف رجوع کرو اور میرے سوا کسی کو دوست نہ بناؤ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: تاکہ تم دنیا کے زوال اور اس کی فنا اور آخرت کے آنے اور اس کی بقا میں غور و فکر کرو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ

1۔ صحیح بخاری، باب الابراد بالظھر فی شدۃ الحر، حدیث نمبر 502-504، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الْاَرْضِ ۪ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۲۶۷

''اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لئے زمین سے اور نہ ارادہ کرو ردی چیز کا اپنی کمائی سے کہ (تم اسے) خرچ کرو حالانکہ (اگر تمہیں کوئی ردی چیز دے تو) تم نہ لو اسے بجز اس کے کہ چشم پوشی کر لو اس میں اور (خوب) جان لو کہ الله تعالیٰ غنی ہے ہر تعریف کے لائق ہے۔''

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا۔ یہ خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام امت کو ہے اور یہاں انفاق سے جو معنی مراد ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب، عبیدہ سلمانی اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: اس سے مراد وہ زکوٰۃ ہے جو فرض کی گئی ہے۔ اس میں عمدہ شے کی بجائے ردی اور گھٹیا چیز خرچ کرنے سے لوگوں کو منع کیا گیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: حضرت براء بن عازب، حسن اور قتادہ رضی اللہ عنہم کے قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں ہے اور لوگوں پر مستحب قرار دیا گیا ہے کہ وہ نفلی صدقہ وخیرات نہ کریں مگر عمدہ اور جید چیز کے ساتھ۔ اور آیت دونوں وجہوں کو شامل ہے لیکن صاحب زکوٰۃ کا تعلق اس اعتبار سے ہے کہ اس آیت کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے اور امر وجوب پر دلالت کرتا ہے اور یہ کہ اسے ردی شے دینے سے منع کیا گیا ہے اور یہ فرض زکوٰۃ کے ساتھ مخصوص ہے اور رہا نفلی صدقہ تو جس طرح آدمی کے لئے نفلی صدقہ میں قلیل شے دینا جائز ہوتا ہے تو اسی طرح اس کے لئے کم درجے کی شے نفلی صدقہ میں دینا جائز ہوگا اور درہم کھجور سے بہتر اور اچھا ہے۔

اور ندب والوں نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ اِفْعَل کا لفظ (مراد صیغہ امر ہے) ندب واستحباب کی صلاحیت رکھتا ہے جس طرح وہ فرض کی صلاحیت رکھتا ہے اور ردی اور گھٹیا شے دینے سے نفلی صدقہ میں بھی اسی طرح منع کیا گیا ہے جس طرح فرض میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور الله تعالیٰ کسی کی نسبت زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کے لئے عمدہ اور اچھی شے دی جائے۔ اور حضرت براء رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ کسی آدمی نے ردی کھجوروں کا ایک خوشہ لٹکایا اور رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دیکھا تو فرمایا: بئسما علق کتنی ردی شے ہے جو اس نے لٹکائی ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (1)۔ عنقریب یہ مکمل روایت آئے گی۔ اس قول کی بنا پر امر ندب واستحباب پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا انہوں نے مستحب قرار دیا کہ وہ نفلی صدقہ میں اچھی اور عمدہ شے کے سوا کوئی نہ دیں۔

اور جمہور متاولین نے کہا ہے: مِنْ طَيِّبٰتِ کا معنی ہے: عمدہ اور پسندیدہ شے میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔ اور ابن زید نے

1۔ ابن ماجہ، باب النهي أن يخرج فى الصدقة شر ماله، حدیث نمبر 1811، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا ہے: حلال چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ کسب (کمائی) وہ ہوتا ہے جو بدن کی مشقت اور محنت سے حاصل ہو۔ اور یہی اجارہ ہے اس کا حکم آگے آئے گا یا تجارت میں باہم گفتگو ہوتی ہے اور وہ بیع ہے اس کا بیان آگے آئے گا اور میراث اس میں داخل ہے کیونکہ غیر وارث نے اسے کمایا ہے، (حاصل کیا ہے)۔

حضرت سہل بن عبداللہ نے بیان کیا ہے کہ ابن مبارک سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو کچھ کمانے کا ارادہ رکھتا ہو اور اپنی کمائی سے ارادہ اور نیت یہ کرتا ہو کہ وہ اس سے صلہ رحمی کرے گا، جہاد کرے گا اور وہ نیکی اور خیر کا کام کرنے لگتا ہے اور اس غرض سے کسب کی آفات اور مشقتوں میں داخل ہو جاتا ہے تو انہوں نے کہا: اگر اس کے پاس زندگی گزارنے کے لئے اتنی مقدار میں سامان اور قوت موجود ہو جس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو لوگوں سے روک سکتا ہو (یعنی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت اسے نہ پڑے) تو پھر اس کسب کو ترک کرنا افضل ہے، کیونکہ جب اس نے حلال طلب کیا اور حلال میں ہی خرچ کیا تو اس سے اس کی کمائی کے بارے اور اس کے خرچ کرنے کے بارے سوال کیا جائے گا اور اسے چھوڑنا زہد ہے کیونکہ زہد حلال چھوڑنے میں ہی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: اس آیت کے مطابق والد کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی اولاد کی کمائی سے کھا سکتا ہے اور اس لئے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری اولاد تمہاری عمدہ اور اچھی کمائی میں سے ہے۔ پس تم اپنی اولاد کے اموال میں سے خوشی خوشی کھاؤ''(1)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یعنی نباتات، معادن اور رکاز (زمین میں قدرتی طور پر گڑی ہوئی دھاتیں) یہ تین ابواب ہیں۔ یہ آیت ان تینوں کو متضمن ہے۔

پس رہی نباتات، دارقطنی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنت جاریہ یہ ہے ''کہ پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔'' اور ایک وسق ساٹھ صاع کا ہے اور وہ گندم، جو، کھجور اور کشمش میں سے تین سو صاع ہیں۔ اور زمین جو سبزہ وغیرہ اگاتی ہے اس میں زکوٰۃ نہیں ہے اور ایک قوم نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے لئے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۔ بے شک یہ آیت عام ہے اور زمین سے قلیل یا کثیر مقدار میں پیدا ہونے والی تمام اقسام کی چیزوں کو شامل ہے اور انہوں نے امر کے ظاہر کو دیکھا کہ وہ وجوب کے لئے ہے۔ اس کا مکمل بیان سورۂ انعام میں آئے گا۔

اور جہاں تک معدن کا تعلق ہے تو ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جانوروں کا زخم رائیگاں ہے، کنواں ہدر ہے، معدن بھی ہدر ہے اور رکاز میں خمس ہے(2)۔'' تو یہ اس پر دلیل ہے کہ معادن کا

1۔ ابوداؤد، باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ، حدیث نمبر 3061، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب فی الرکاز الخمس، حدیث نمبر 1403، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حکم رکاز کے حکم کے سوا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معادن اور رکاز کے مابین واؤ فاصلہ کے ساتھ فرق بیان کیا ہے۔ اگر دونوں میں حکم ایک جیسا ہوتا تو آپ فرماتے: معدن ہدر ہے اور اس میں خمس ہے۔ اور جب آپ نے یہ فرمایا: وفی الرکاز الخمس تو اس سے معلوم ہوا کہ رکاز کا حکم معدن کے حکم کے سوا ہے اس بارے میں جو اس سے لیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

رکاز دراصل لغت میں اس سے مراد وہ سونا، چاندی اور جواہرات ہیں جو زمین میں گڑے ہوئے ہوں۔ تمام فقہاء کے نزدیک اسی طرح ہے، کیونکہ وہ سونے چاندی کے ان ٹکڑوں کے بارے میں کہتے ہیں جو معدن میں پائے جاتے ہیں وہ زمین میں گڑے ہوئے ہیں وہ عمل، محنت اور مشقت سے نہیں پائے جاتے، ان میں خمس ہے: کیونکہ وہ رکاز ہے اور امام مالک سے روایت ہے کہ معدن میں سونے اور چاندی کے ٹکڑوں کا حکم اس شے کا حکم ہے جس میں عمل اور محنت کی مشقت کی جاتی ہے جو کچھ معدن سے نکالا جاتا ہے وہ رکاز میں داخل ہے۔ پہلا قول ہی آپ کے مذہب کا حاصل ہے اور اسی پر جمہور فقہاء کا فتویٰ ہے۔

اور عبداللہ بن سعید ابن ابی سعید مقبری نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رکاز کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سونا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زمین میں اس دن پیدا فرمایا جس دن آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا۔'' یہ عبداللہ بن سعید متروک الحدیث ہیں۔ اسے ابن ابی حاتم نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری سند سے بھی یہ مروی ہے اور وہ صحیح نہیں ہے، اسے دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔ علماء کی جماعت کے نزدیک دور جاہلیت میں لوگوں کے دفن کئے ہوئے اموال بھی رکاز ہیں وہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کرتے بشرطیکہ اس کا دفن اسلام سے پہلے اموال عادیہ (پرانے اموال) میں سے ہو۔ اور وہ جو زمانہ اسلام کے اموال میں سے ہو تو ان کے نزدیک اس کا حکم لقطہ کے حکم کی مثل ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ رکاز جب پایا جائے تو اس کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے بیان کیا ہے: زمانہ جاہلیت کے دفینوں میں سے جو سرزمین عرب میں یا اس ہموار اور جنگلی زمین میں پایا جائے جو بغیر جنگ کے مسلمانوں کی ملکیت میں آئی ہو تو وہ دفینہ اسی کے لئے ہوگا جس نے اسے پایا اور اس میں خمس ہوگا اور جو مسلمانوں کی زمین میں پایا جائے تو وہ لقطہ کی مثل ہوگا۔ مزید فرمایا: اور جو دفینہ جنگ کے علاقے میں پایا جائے تو وہ اس پوری جماعت (لشکر) کے لئے ہوگا جس نے اسے فتح کیا نہ کہ صرف پانے والے کے لئے اور جو کچھ صلح والے علاقے سے پایا جائے تو وہ اس شہر والوں کے لئے ہوگا نہ کہ عام لوگوں کے لئے اور اس میں پانے والے کے لئے کوئی شے نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ اہل دار میں سے ہو تو پھر وہ ان کے سوا اس کے لئے ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ وہ تمام صلح کرنے والوں کے لئے ہوگا۔

اسماعیل نے کہا ہے: بلاشبہ رکاز کا حکم مال غنیمت کے حکم کے ساتھ ہے کیونکہ وہ کافر کا مال ہے جسے مسلمان نے پالیا ہے۔ پس اسے اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے جو کافر کو قتل کرے اور اس کا مال لے لے۔ پس اس کے لئے کل مال کے چار خمس ہوں گے۔

ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک ساز و سامان، جواہرات، لوہا، تانبہ اور اسی طرح کی دیگر چیزوں میں جو بطور رکاز پائی جاتی ہیں ان کے بارے کہتے تھے کہ ان میں خمس ہے۔ پھر آپ نے اس سے رجوع کر لیا اور فرمایا: میں اس میں کوئی شے نہیں

دیکھتا۔ پھر آخری بار جب ہم آپ سے جدا ہوئے تو آپ نے کہا: اس میں خمس ہے۔ اور عموم حدیث کی بنا پر یہی صحیح ہے اور اسی پر جمہور فقہاء ہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما نے ایسے رکاز کے بارے میں جو گھر میں پایا جاتا ہے کہا ہے: بلاشبہ یہ گھر کے مالک کے لئے ہے نہ کہ پانے والے کے لئے اور اس میں خمس بھی ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے برعکس کہا ہے کہ وہ پانے والے کے لئے ہے نہ کہ صاحب خانہ کے لئے اور یہی ثوری کا قول ہے اور اگر وہ جنگل میں پایا جائے تو پھر تمام کے قول کے مطابق وہ پانے والے کے لئے ہوگا اور اس میں خمس ہوگا اور ان کے نزدیک صلح اور جنگ کی زمین کے مابین کوئی فرق نہیں ہے اور اسی طرح ان کے نزدیک عرب کی زمین اور دوسری زمین سب برابر ہے اور ان کے نزدیک پانے والے کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کا خمس اپنے لئے روک لے جبکہ وہ خود محتاج ہو اور اس کے لئے وہ مساکین کو دینا بھی جائز ہے۔

اہل مدینہ اور اصحاب مالک میں سے کچھ ہیں جو ان میں سے کسی شے کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور انہوں نے کہا ہے: برابر ہے رکاز جنگ والی زمین یا صلح کی زمین میں پایا جائے یا سرزمین عرب میں ہو یا علاقہ حرب میں جب وہ کسی ایک کی ملکیت نہ ہو اور نہ کسی ایک نے اس کا دعویٰ کیا ہو تو وہ اپنے پانے والے کے لئے ہوگا اور اس میں ظاہر حدیث کے عموم کی بنا پر خمس ہوگا اور یہی لیث، عبداللہ بن نافع، شافعی اور اکثر اہل علم کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے جو معادن سے حاصل کی جاتی ہیں اور کانوں سے نکلتی ہیں ان میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا ہے: سونا یا چاندی میں سے جو کچھ کانوں سے نکلتا ہے اس میں کوئی شے واجب نہیں ہوتی یہاں تک کہ سونا بیس مثقال یا چاندی پانچ اوقیہ ہو جائے۔ پس جب یہ دونوں چیزیں اس مقدار کو پہنچ جائیں تو ان میں زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ اور جو مقدار اس سے زائد ہو اس کے حساب سے اس کی زکوٰۃ بھی ہوگی جب تک وہ معدن میں پائی جائے اور اگر ایک بار وہ ختم ہو جائے اور پھر دوبارہ اس کے بعد پائی جائے تو پھر اس میں زکوٰۃ شروع کر دی جائے گی اور ان کے نزدیک رکاز کھیتی کی طرح ہے کہ جب کوئی شے نکلے گی تو اسی وقت اس سے زکوٰۃ لے لی جائے گی اور اس پر سال گزرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

سحنون نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے جس کی کئی کانیں ہوں کہ وہ ان میں سے ایک میں جو کچھ ہے اسے دوسری سے حاصل ہونے والی شے کے ساتھ نہیں ملائے گا اور نہ ہی زکوٰۃ ادا کرے گا مگر تبھی جب ان میں سے ہر ایک میں سے دوسو درہم یا بیس دینار حاصل ہوں۔ اور محمد بن مسلمہ نے کہا ہے: وہ بعض کو بعض کے ساتھ ملا دے گا اور تمام کی اکٹھی زکوٰۃ ادا کرے گا جیسا کہ زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار میں کیا جاتا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: معدن رکاز کی مثل ہے۔ پس سونے یا چاندی میں سے جو کچھ معدن میں پایا گیا خمس نکالنے کے بعد دونوں میں سے ہر ایک کا اعتبار کیا جائے گا۔ پس جس نے اپنے ہاتھ سے محنت کے ساتھ وہ شے حاصل کی جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو سال مکمل ہونے پر وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اگر اس پر سال گزر جائے اور

وہ نصاب اس کے پاس ہو۔ یہ تب ہے جب اس کے پاس اتنا سونا یا چاندی نہ ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہو۔ اور اگر اس کے پاس اس میں سے اتنا ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو وہ اسے اس کے ساتھ ملا لے اور اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اسی طرح ان کے نزدیک سال کے دوران جو نفع حاصل ہوگا اسے اپنی جنس کے نصاب کے ساتھ ملایا جائے گا اور اصل نصاب پر سال گزرنے پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ یہی ثوری کا قول ہے۔

اور مزنی نے امام شافعی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ شے جس میں میں شک کرتا ہوں وہ وہی ہے جو معادن سے نکلتی ہے۔ مزنی نے کہا ہے: ان کی اصل کی بنا پر اولیٰ یہ ہے کہ جو کچھ معدن سے نکلتا ہے وہ فائدہ اور نفع ہو وہ اسے نکالنے کے بعد سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

اور لیث بن سعد نے کہا ہے: سونا اور چاندی میں سے جو کچھ بھی معادن سے نکلتا ہے وہ بمنزلہ نفع اور فائدہ کے ہے وہ نئے سرے سے اس پر سال پورا کرے گا۔ اور یہی امام شافعی کا اس بارے میں قول ہے جسے مزنی نے ان کے مذہب سے حاصل کیا ہے۔

اور اس کے بارے میں داؤد اور ان کے اصحاب نے کہا ہے: جب اس پر ایسے مالک کے پاس پورا سال گزر جائے جس کی ملکیت صحیح ہو (تو اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی) کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے "جس نے مال حاصل کیا اس پر زکوٰۃ نہیں ہے یہاں تک کہ اس پر سال گزر جائے" اسے ترمذی اور دارقطنی نے بیان کیا ہے۔ (1)

اور انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جسے عبدالرحمٰن بن انعم نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مؤلفۃ قلوب میں سے ایک قوم کو کچھ سونا عطا فرمایا جو ابھی اپنی مٹی میں ملا ہوا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ یمن سے بھیجا تھا۔ (2)

حضرت امام شافعی نے کہا ہے: مؤلفۃ قلوب کا حق زکوٰۃ میں ہے، تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ معادن کا طریقہ وہی ہے جو زکوٰۃ کا طریقہ ہے۔ (یعنی ان کے احکام ایک جیسے ہیں۔)

امام مالک کی دلیل حضرت ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ کو معادن قبلیہ (☆) عطا فرمائیں اور یہ الفرع (☆☆) کی طرف میں واقع ہیں اور ان معادن سے آج تک صرف زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ یہ حدیث منقطع الاسناد ہے۔ محدثین اس قسم کی حدیث سے استدلال نہیں کرتے لیکن آپ نے عمل کیا ہے اور ان کے نزدیک مدینہ منورہ میں اس کے مطابق عمل کیا جاتا ہے اور اسے دراوردی نے ربیعہ سے، انہوں نے حارث بن بلال المزنی

1۔ سنن ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 572، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر 3095، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ القَبَلیہ (بالتحریک) یہ منسوب ہے قبل کی طرف جو ساحل سمندر پر ایک جگہ کا نام ہے اور مدینہ طیبہ سے پانچ دنوں کے فاصلے پر ہے۔

☆☆ اور الفرع: یہ السقیا سے بائیں جانب ربذہ کے نواح میں ایک گاؤں ہے۔ اس کے اور مدینہ طیبہ کے درمیان مکہ کی راہ پر آٹھ برید کا فاصلہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چار راتوں کی مسافت ہے۔

سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے۔ اسے بزار نے ذکر کیا ہے اور اسے کثیر بن عبد اللہ بن عمرو بن عوف نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ کو قبلیہ کی ساری کانیں عطا فرمائیں جو وہاں کی بلند زمین میں تھیں اور پست زمین میں تھیں۔ اور قُدس (مشہور پہاڑ) سے وہ زمین عطا فرمائی جو کاشت کی صلاحیت رکھتی تھی اور آپ نے انہیں کسی مسلمان کا حق نہیں دیا۔ اسے بزار نے بھی ذکر کیا ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کے ضعف پر اجماع کیا ہے۔ یہ حکم ان چیزوں کا ہے جنہیں زمین نکالے اور عنقریب سورۃ النحل میں ان چیزوں کا حکم آئے گا جو سمندر سے نکلیں کیونکہ وہ بھی زمین کا قسیم ہے اور سورۃ الانبیاء (1) میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا معنی بیان ہوگا: العجماء جرحها جُبار ہر ایک کا بیان اپنے محل میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔ تَیَمَّمُوا کا معنی تقصدوا ہے۔ یعنی تم قصد و ارادہ نہ کرو۔ عنقریب سورۃ النساء میں عرب اشعار سے اس پر شواہد ذکر ہوں گے کہ التیمم بمعنی القصد ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آیت اس پر دلیل ہے کہ کمائی ہوئی شے طیب اور عمدہ بھی ہوتی ہے اور گھٹیا اور ردی بھی۔ امام نسائی نے حضرت ابو امامہ بن سہل بن حنیف سے اس آیت کے بارے روایت کیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ فرمایا: وہ جُعرور اور لون حُبَیق (یہ دونوں کھجور کی انتہائی ردی اور گھٹیا اقسام میں سے ہیں)۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو صدقہ میں لینے سے منع فرمایا ہے اور دارقطنی نے حضرت ابو امامہ بن سہل بن حنیف سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کے بارے حکم ارشاد فرمایا، تو ایک آدمی ایسی کچی کھجوروں کا خوشہ لے کر آیا (جن کے پکنے اور مکمل ہونے کی صلاحیت ابھی ظاہر نہ ہوئی تھی) ...... سفیان نے کہا: یعنی بالکل ناکارہ اور ردی کھجوریں ...... تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ''یہ کون لے کر آیا ہے؟'' اور کوئی کوئی شے بھی نہیں لاتا ہے مگر وہ اس کی طرف منسوب ہوتی ہے جو اسے لے کر آتا ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔ راوی نے بیان کیا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جُعرور اور لون الحبیق سے منع فرمایا کہ ان دونوں (قسموں) کو صدقہ میں لیا جائے ...... زہری نے کہا ہے: یہ دونوں قسمیں مدینہ کی کھجوروں میں سے ہیں (2) ...... اور اسے ترمذی نے حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے (3) اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

علامہ طبری اور نحاس نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں وَلَا تَأَمَّمُوْا ہے۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں اور حضرت مسلم بن جندب نے وَلَا تُيَمِّمُوْا تاء کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر نے تَيَّمَّمُوْا یاء کو مشدد پڑھا ہے اور اس لفظ میں کئی لغات ہیں ان میں سے أَمَمْتُ الشَّیْءَ پہلی میم مخفف اور اَمَّمْتُهٗ پہلی میم مشدد، اور يَمَّمْتُهٗ اور تَيَمَّمْتُهٗ

1۔ ابوداؤد، فی اقطاع الارضین، حدیث نمبر 2661، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابوداؤد، باب مالا یجوز من الثمرۃ فی الصدقۃ، حدیث نمبر 1369، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2913، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں۔ اور ابوعمرو نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے وَلَا تُؤَمِّمُوْا تاء مضمومہ کے بعد ہمزہ سے پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ علامہ جرجانی نے کتاب ''نظم القرآن'' میں کہا ہے کہ لوگوں میں سے ایک فریق نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد الْخَبِيْثَ پر کلام مکمل ہے۔ پھر خبیث کے وصف میں دوسری خبر کی ابتدا کی اور فرمایا: مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ اور تم ردی چیز نہ لو بجز اس کے کہ تم نرمی کا برتاؤ کرو، گویا یہ معنی لوگوں کے لئے عتاب اور ڈانٹ ہے۔ اور مِنْهُ کی ضمیر الْخَبِيْثَ کی طرف راجع ہے۔ اور الْخَبِيْثَ سے مراد انتہائی گھٹیا اور ردی ہے۔ علامہ جرجانی نے کہا ہے: دوسرے فریق نے کہا ہے کہ کلام قول باری تعالیٰ مِنْهُ تک متصل ہے اور مِنْهُ میں ضمیر مَا كَسَبْتُمْ کی طرف راجع ہے۔ اور تُنْفِقُوْنَ کو حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں واقع ہے اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: أنا أخرج أجاهد في سبيل الله۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ یعنی تم اپنے قرضوں اور اپنے حقوق میں سے لوگوں سے نہیں لیتے مگر یہ کہ تم اس بارے میں نرمی کا برتاؤ کرو اور اپنے حقوق میں سے کچھ چھوڑ دو، حالانکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو اور اس پر راضی نہیں ہوتے۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ برتاؤ نہ کرو جو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے ہو۔ اس کا یہ معنی حضرت براء بن عازب، حضرت ابن عباس اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے۔

اور حسن نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے اور تم اسے (ردی کو) نہ لو اگرچہ تم اسے بازار میں پاؤ کہ اسے بیچا جا رہا ہے مگر یہ کہ وہ تمہارے لئے اس کے ثمن کم کر دے۔ اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ دونوں قول آیت کے زکوٰۃ فرضیہ کے بارے میں ہونے کا شبہ دلاتے ہیں۔

ابن عربی نے کہا ہے: اگر یہ آیت فرض زکوٰۃ کے بارے میں ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ کیونکہ ردی اور عیب ناک چیز فرض میں کسی بھی حال میں لینا جائز نہیں ہوتا، نہ چشم پوشی کے طریقہ پر اور نہ اس کے سوا کسی طریقہ پر، البتہ چشم پوشی کے بغیر بھی نفل میں لی جا سکتی ہے۔

اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کا معنی ہے: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اگر تمہیں ہدیہ دیا جائے (تو تم ردی شے نہ لو) اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ مگر یہ کہ تم ہدیہ دینے والے سے حیاء کرو اور اس سے وہ شے قبول کر لو جس کی نہ تمہیں حاجت ہے اور نہ وہ شے فی نفسہ کوئی قدر و منزلت رکھتی ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ آیت کے نفلی صدقہ کے بارے میں ہونے کا شبہ دلاتا ہے اور ابن زید نے کہا ہے: اور تم حرام چیز نہ لو مگر یہ کہ تم اس کے مکروہ ہونے کے بارے میں اغماض برتو۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ۔ جمہور کی قراءت اسی طرح ہے۔ یہ اغمض الرجل في امر كذا سے ہے۔ جب آدمی کسی کام میں تساہل اور نرمی برتے اور اپنے بعض حق کے ساتھ راضی ہو جائے اور بعض سے درگزر کر لے اور اسی معنی میں طرماح کا قول ہے:

لم يَفُتْنَا بالوتر قومٌ وللذُّ لِّ أناس يَرْضَوْنَ بالاِغماضِ

کسی قوم نے وتر کے بارے میں ہمیں فتویٰ نہیں دیا اور سہولت کے لئے لوگ بعض حق کے ساتھ راضی ہو جاتے ہیں۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تغیض العین سے لیا گیا ہو کیونکہ جو مکروہ اور ناپسندیدہ شے پر صبر کا ارادہ رکھتا ہے وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے ...... جیسا کہ شاعر نے کہا:

الی کَمْ وکَمْ اشیاءَ منك تُرِیْبُنی　　أُغَمِّضُ عنها لستُ عنها بذی عَمَی

کتنے تک اور تیری طرف سے کتنی اشیاء مجھے شک میں ڈالتی ہیں میں ان سے آنکھیں بند کر لیتا ہوں میں ان سے اندھا نہیں ہوں۔

اور یہ مکروہ کے وقت اِغضاء (آنکھ بند کرنا) کی طرح ہے۔ اور نقاش نے یہی معنی اس آیت میں ذکر کیا ہے اور اس کی طرف مکی نے اشارہ کیا ہے۔

اور یا یہ عربوں کے اس قول سے ہے: أغمض الرجل اذا أتی غا مضا من الأمر۔ (یعنی جب کوئی کسی کام میں نرمی برتے و کہا جاتا ہے: اغمض الرجل۔ (آدمی نے نرمی کا سلوک کیا۔) جیسا کہ تو کہتا ہے: أعْمَنَ یعنی وہ عُمان آیا۔ اور اَعْرَق یعنی وہ عراق آیا اور انجد و اغور، یعنی وہ نجد اور غور آیا اور غور سے مراد تہامہ ہے، یعنی وہ اسے لینے کے لئے کوئی تاویل تلاش کرتا ہے۔

زہری نے اسے تاء کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ مخفف پڑھا ہے اور ان ہی سے تُغَمِّضُوْا بھی مروی ہے۔ یعنی تاء کے ضمہ، غین کے فتحہ اور میم کے کسرہ اور اس کی شد کے ساتھ۔ پس پہلی قراءت اس معنی کی بناء پر ہے تم اپنے بائع سے اس کا سودا ختم کر دو کہ وہ تمہارا بھاؤ کم کر دے۔

اور دوسری قراءت اور یہی حضرت قتادہ کی قراءت ہے جو کہ نحاس نے ذکر کی ہے۔ یہ معنی ہے کہ تم نقصان اور کمی کے ساتھ لے لو۔ ابو عمرو الدانی نے کہا ہے کہ زہری کی دونوں قراءتوں کا معنی ہے: ''یہاں تک کہ تم نقصان اور کمی کے ساتھ لے لو۔'' اور مکی نے حسن سے بیان کیا ہے: اِلَّاۤ اَنْ تُغَمِّضُوْا یعنی میم مشدد اور مفتوح ہے اور قتادہ نے تُغْمَضُوْا بھی قراءت کی ہے یعنی تا کے ضمہ، غین کے سکون اور میم مخفف مفتوح کے ساتھ۔ ابو عمرو الدانی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تمہارے لئے اس کی قیمت کم کر دی جائے۔

اسے نحاس نے حضرت قتادہ سے بیان کیا ہے اور ابن جنی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم اس حال میں پائے جاؤ کہ تم نے تاویل کے سبب یا نرمی کے سبب معاملے میں چشم پوشی کر لی ہے اور تم نے ادنیٰ چیز اپنے لئے لینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: احمدت الرجل وجدته محمودًا۔ (میں نے آدمی کی تعریف کی اور میں نے اسے محمود پایا) اسی طرح کی کئی مثالیں ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جمہور کی قراءت تجاوز (درگزر کرنے) اور آنکھیں بند کرنے کے معنی دیتی ہے، کیونکہ اَغْمَض غَمَض کے قائم مقام ہے۔ اور اسی بنا پر معنی یہ ہے یہاں تک کہ تم اسے لینے میں غور و فکر اور تاویل سے آنکھیں بند کرتے ہوئے آؤ۔ یا تو اس کے حرام ہونے کی وجہ سے ابن زید کے قول کے مطابق اور یا پھر اس لئے کہ ایک ہدیہ ہے یا اسے قرض میں لیا گیا ہے۔

دوسروں کے قول کے مطابق۔

اور مہدوی نے کہا ہے جنہوں نے تُغۡمِضُوۡا پڑھا ہے تو معنی یہ ہے تم اسے لینے سے اپنی بصیرت کی نگاہیں بند رکھتے ہو۔

جوہری نے کہا ہے: غَمَّضۡتُ عن فلان کا معنی ہے جب بیع یا شرا کے معاملہ میں تو اس پر نرمی کرے۔ اور چشم پوشی کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَسۡتُمۡ بِاٰخِذِیۡہِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِیۡہِ کہا جاتا ہے: أُغمِضَ لی فیما بعتنی۔ (میرے لئے چشم پوشی اور نرمی کی گئی اس میں جو تو نے مجھے بیچی) گویا تو اس سے زیادتی کا ارادہ رکھتا ہے اس کے ردی ہونے کے سبب اور اس کے ثمن میں سے کم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور أَنۡ محل نصب میں ہے اور تقدیر کلام ہے اِلَّا بِأَنۡ۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ۔ اللہ تعالیٰ نے صفت غنی پر متنبہ فرمایا کہ تمہارے صدقات کی اسے کوئی حاجت نہیں۔ پس جو قرب حاصل کرنا چاہے اور ثواب کا طالب ہو تو اسے چاہیے کہ وہ صدقہ ادا کرے ایسی شے کے ساتھ جو قدر و منزلت والی ہو اور مہتم بالشان ہو کیونکہ وہ اسے اپنے لئے آگے بھیجتا ہے۔

اور حَمِیۡدٌ کا معنی ہے: محمود فی کل حال ہر حال میں تعریف کیا ہوا۔ ہم نے ان دونوں اسموں کے معنی الکتاب الأسنی میں ذکر کر دیئے ہیں۔ والحمد للہ۔

اور زجاج نے قول باری تعالیٰ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ کے تحت کہا ہے: اس نے تمہیں حکم نہیں دیا ہے کہ تم حاجت اور تنگی کے باوجود صدقہ کرو البتہ اس نے تمہارے اخیار اور نیک لوگوں کا امتحان لیا ہے اور وہ ان تمام نعمتوں پر تعریف کیا گیا ہے۔

اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَ یَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ ۚ وَ اللّٰہُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَۃً مِّنۡہُ وَ فَضۡلًا ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۶۸﴾

''شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا اور اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے تم سے اپنی بخشش کا اور فضل (وکرم) کا اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلشَّیۡطٰنُ شیطان اور اس کے مادۂ اشتقاق کا معنی پہلے گزر چکا ہے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور یَعِدُکُمۡ کا معنی ہے: وہ تمہیں ڈراتا ہے۔ اَلۡفَقۡرَ تنگدستی سے تاکہ تم خرچ نہ کرو۔

یہ آیت ماقبل سے متصل ہے اور یہ کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے انسان کو باز رکھنے میں خاصہ دخل ہے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ فحشاء (بے حیائی) کا حکم دیتا ہے اور فحشاء سے مراد معاصی اور ان میں خرچ کرنا ہے اور کہا گیا ہے یعنی اس طرح کہ تم صدقہ نہ کرو تم گنہگار ہو جاؤ گے اور آپس میں جدا جدا ہو جاؤ گے اور الفُقۡرَ فاء کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ ایک لغت ہے۔

جوہری نے کہا ہے: الفَقۡرَ میں ایک لغت الفُقۡرَ ہے۔ مثلاً الضُّعۡفَ اور الضَّعۡفَ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ کلام عرب میں الوعد کا لفظ جب مطلق ہو تو وہ خیر اور بھلائی کے لئے ہوتا ہے اور جب اسے موعود (وہ شے جس کا وعدہ کیا گیا) کے ساتھ مقید کر دیا جائے تو پھر وہ خیر اور شر دونوں کے لئے مقدر ہو سکتا ہے، جیسا کہ البشارۃ۔ تو اس آیت میں لفظ الوعد اکٹھا دو معنوں کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس آیت میں دو وعدے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اور دو شیطان کی طرف سے۔

اور امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک شیطان کی جانب سے ایک وسوسہ یہ ہے کہ وہ شر کے ساتھ خوفزدہ کرتا ہے اور حق کی تکذیب کی طرف راغب کرتا ہے اور فرشتے کا القاء یہ ہے کہ وہ خیر کا وعدہ دلاتا ہے اور حق کی تصدیق کی رغبت دلاتا ہے۔ پس جو کوئی اسے پائے تو اسے جان لینا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جو کوئی دوسرا انہیں پائے تو اسے چاہیے کہ وہ شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1) اور غیر قرآن میں باء کو حذف کرنا بھی جائز ہے۔ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ سیبویہ نے شعر کہا ہے:

امرتُك الخير فافعل ما امرتَ به فقد تركتك ذا مال و ذا نسب

میں نے تجھے خیر کا حکم دیا ہے پس تو وہی کر جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے۔ تحقیق میں نے تجھے صاحب مال اور صاحب نسب چھوڑا ہے۔

اور المغفرۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر دنیا اور آخرت میں پردہ ڈالنا ہے اور فضل سے مراد دنیا میں رزق ہے اور آخرت میں وسعت اور نعمتیں ہیں۔ تمام کے بارے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ نقاش نے ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ اس بارے میں اس آیت سے مانوس ہوئے ہیں کہ فقر (تنگدستی) غنیٰ (دولتمندی، خوشحالی) سے افضل ہے، کیونکہ شیطان بندے کو نیکی اور خیر سے دور ہٹاتا ہے اور وہ اسے فقر کا خوف دلا کر اس سے دور کرتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: آیت میں کوئی حجت قاطعہ نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ معارضہ قوی ہے اور روایت ہے کہ تورات میں ہے۔ ''میرے بندے میرے رزق سے خرچ کر میں تجھ پر اپنا فضل وسیع کر دوں گا کیونکہ میرا ہاتھ ہر کشادہ ہاتھ سے زیادہ کشادہ ہے۔'' اور قرآن کریم میں اس کا مصداق یہ ارشاد گرامی ہے: وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (سبا) (اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو تو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔)

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے اور یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ خوشحالی اور وسعت عطا فرماتا ہے اور وہ اسے جانتا ہے جہاں اسے رکھتا ہے اور وہ غیب و شہادۃ کا علم رکھتا ہے۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے دو اسم ہیں ہم نے ان دونوں کا ذکر بھی تمام اسماء میں الکتاب الاسنیٰ میں کیا ہے۔

1۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر 2914، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والحمد للہ۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَآءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝٢٦٩

''عطا فرماتا ہے دانائی جسے چاہتا ہے اور جسے عطا کی گئی دانائی تو یقیناً اسے دے دی گئی بہت بھلائی اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند۔''

قولہ تعالیٰ: يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرما دیتا ہے۔ یہاں حکمت کے مفہوم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ سدی نے کہا ہے: اس سے مراد نبوت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم کی معرفت ہے یعنی اس کی فقاہت، نسخ، محکم، غریب اور مقدم و موخر آیات کا علم۔ حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم کی سمجھ اور فقاہت ہے۔ حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس سے مراد قول و فعل میں صائب اور درست ہونا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: حکمت سے مراد دین میں عقل و فہم کا رکھنا ہے۔ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: حکمت سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت و پیروی، دین میں فقاہت اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ حضرت ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حکمت سے مراد خشیت ہے۔

حضرت ابراہیم نخعی کا قول ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم میں فہم اور سمجھ رکھنا ہے اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کہا ہے اور حسن نے کہا ہے: حکمت سے مراد ورع ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام اقوال ماسوائے سدی، ربیع اور حسن کے اقوال کے آپس میں ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں، کیونکہ حکمت مصدر ہے الاحکام سے اور اس کا معنی ہے: قول یا فعل میں پختہ اور مضبوط ہونا۔ پس کتاب اللہ حکمت ہے اور اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت بھی حکمت ہے اور فضیلت میں سے جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ سب حکمت ہے۔ دراصل حکمت وہ شے ہے جس کے سبب انسان سفاہت اور بے وقوفی سے باز رہے، پس علم کو حکمت کہا گیا ہے کیونکہ اس کے سبب اس سے روکا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ سفاہت سے باز رہنے کو جانا جا سکتا ہے اور سفاہت سے مراد ہر وہ فعل ہے جو قبیح ہو۔ اور اسی طرح قرآن کریم، عقل اور فہم و فراست (یہ سب حکمت ہیں کیونکہ ان کے سبب سفاہت کے ارتکاب سے باز رہا جاتا ہے۔)

اور بخاری شریف میں ہے: مَنْ يُرِدِ اللہ بِہٖ خیرا یفقھہ فی الدین (اللہ تعالیٰ جس کے بارے خیر اور بھلائی چاہتا ہے اسے دین میں فقاہت عطا فرما دیتا ہے۔) اور یہاں ارشاد فرمایا: وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (اور جسے دانائی عطا کی گئی یقیناً اسے بہت بھلائی دے دی گئی۔ (1)) اور دوبارہ حکمۃ کا لفظ ذکر فرمایا اس کے لئے ضمیر ذکر نہیں فرمائی، اس کا اہتمام کرتے ہوئے اور اس کے شرف و فضل پر تنبیہ کرتے ہوئے جیسا کہ اس کا بیان اس قول باری تعالیٰ کے تحت گزر چکا ہے: فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا (البقرہ: 59)

1۔ صحیح بخاری، باب من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین، حدیث نمبر 69، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔ مروان بن محمد، رفدہ الغسانی نے بیان کیا ہے کہ ہمیں ثابت بن عجلان انصاری نے خبر دی ہے اس نے کہا: بیان کیا جاتا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ اہل زمین کو عذاب دینے کا ارادہ فرماتا ہے اور جب وہ معلم کو بچوں کو حکمت کی تعلیم دیتے ہوئے سنتا ہے تو وہ اسے ان سے پھیر دیتا ہے۔ مروان نے کہا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ کہا جاتا ہے: بے شک جسے حکمت اور قرآن عطا کر دیئے گئے تحقیق اسے اس سے افضل و اعلیٰ عطا کر دیا گیا جسے پہلی کتابوں اور صحف وغیرہ کا جمیع علم عطا کیا گیا، کیونکہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (الاسراء)

اور اسے خَيْرًا كَثِيْرًا کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ یہ جوامع الکلم ہے۔

اور بعض حکماء نے کہا ہے: جسے علم اور قرآن عطا کیا گیا اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور اہل دنیا کے سامنے ان کی دنیا کی وجہ سے نہ جھکے، کیونکہ جو اسے عطا کیا گیا ہے وہ اس سے بہت افضل ہے جو اصحاب دنیا کو دیا گیا ہے (من اعطی العلم والقرآن ینبغی ان یعرف نفسه ولا یتواضع لاهل الدنیا لأجل دنیاهم فانها أعطی افضل اصحاب الدنیا) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو متاع قلیل کا نام دیا ہے اور فرمایا ہے: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (النساء: 77)

اور علم اور قرآن کو خَيْرًا كَثِيْرًا کا نام دیا ہے (2)۔

جمہور نے وَ مَنْ يُّؤْتَ فعل مجہول کی صورت میں پڑھا ہے اور زہری اور یعقوب نے وَ مَنْ يُّؤْتِ تا کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ (یعنی فعل معروف) اس معنی کی بناء پر و من یؤتِ اللهُ الحکمة اور جسے اللہ تعالیٰ دانائی عطا فرما دے۔ اس میں فاعل اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے۔ اور مَنْ مفعول اول مقدم ہے اور الحکمة مفعول ثانی ہے اور الالباب کا معنی عقول ہیں اور اس کا واحد لب ہے اس کا ذکر بھی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

"اور جو تم خرچ کرتے ہو یا منت مانتے ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور نہیں ہے ظالموں کیلئے کوئی مددگار۔"

یہ شرط اور جواب شرط ہے۔ عربوں کے رواج میں منتیں کثرت سے مانی جاتی تھیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو آدمی بطور نفل اور تبرع فعل کرتا ہے اور ایک وہ جو آدمی اپنے لئے اسے لازم کرنے کے بعد وہ فعل کرتا ہے۔ اور آیت میں وعدہ اور وعید کا معنی موجود ہے، یعنی وہ آدمی جس کی نیت میں اخلاص ہو اسے ثواب دیا جائے گا اور جس نے ریا کاری یا کسی اور معنی مثلاً احسان جتلانے اور دکھ پہنچانے کے لئے خرچ کیا تو وہ ظالم ہوگا۔ اس کا عمل باطل ہو جائے گا اور وہ اپنے لئے اس میں کوئی معاون و مددگار نہیں پائے گا اور يَعْلَمُهٗ کا معنی ہے وہ اسے شمار کرتا ہے اور سمجھتا ہے، یہ مجاہد نے کہا ہے (ای يُحْصِيْهِ) اور ضمیر واحد ذکر کی حالانکہ پہلے دو چیزوں کا ذکر کیا، تو نحاس نے کہا ہے: تقدیر عبارت ہے وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ

1۔ تفسیر ابولیث، جلد 1، صفحہ 232

نَفَقَةٍ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهَا (یعنی جو تم خرچ کرتے ہو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے) اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ پھر اسے حذف کر دیا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو: وما انفقتم فان اللہ یعلمہ۔ اور اس میں ھا ضمیر ''ما'' کی طرف لوٹ رہی ہو۔ جیسا کہ سیبویہ نے (امرء القیس کے لئے) کہا ہے:

فتُوضِحَ فالمِقْرَاةِ لم يَعْفُ رَسْمُها لِما نَسَجَتْها من جَنُوبٍ و شَمْألِ

اس میں نسجتھا میں ہا ضمیر ما کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اور اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ اس پر معطوف ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: يَعْلَمُهٗ میں واحد ضمیر ذکر کی ہے حالانکہ دو چیزوں کا ذکر کیا ہے تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ ارادہ اس کا کیا ہے جسے ذکر کیا گیا ہے یا جسے بیان کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حسین اور اچھا ہے کیونکہ کبھی ضمیر سے مراد وہ تمام ہوتے ہیں جو مذکور ہوتے ہیں اگرچہ وہ کثیر ہوں۔ نذر کی حقیقی تعریف یہ ہے: ھو ما اوجبہ المکلف علی نفسہ من العبادات مما لو لم یوجبہ لم یلزمہ (ان عبادات میں سے وہ عبادت جو مکلف نے اپنے اوپر لازم کی ہو کہ اگر وہ اسے لازم نہ کرتا تو وہ اس پر لازم نہ ہوتی۔) لہٰذا جب کوئی فعل آدمی اپنے ذمہ لازم کر لے تو تو کہتا ہے: نذر الرجل، ینذر ذال کے ضمہ کے ساتھ بھی ہے اور ذال کے کسرہ کے ساتھ بھی۔ اس کے کئی احکام ہیں جن کا بیان کسی اور جگہ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

''اگر ظاہر کرو (اپنی) خیرات تو بہت اچھی بات ہے اور اگر پوشیدہ رکھو صدقوں کو اور دو انہیں فقیروں کو تو یہ بہت بہتر ہے تمہارے لئے اور (صدقہ کی برکت سے) مٹا دے گا تم سے تمہارے بعض گناہ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خبردار ہے۔''

جمہور مفسرین کا موقف یہ ہے کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں ہے کیونکہ اس میں اظہار کی نسبت اخفاء افضل ہے اور اسی طرح تمام نفلی عبادات میں اخفا افضل ہوتا ہے کیونکہ اس طرح ریا ان سے دور رہتا ہے اور واجبات میں ایسی طرح نہیں ہے۔ حسن نے کہا ہے: زکوٰۃ میں اظہار احسن ہے اور نفل میں اخفا افضل ہے کیونکہ یہ اس پر زیادہ دلالت کرتا ہے کہ اس سے ارادہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفل میں سری صدقہ کو اعلانیہ صدقہ پر فضیلت دی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ستر گنا ہے اور فرضی صدقہ میں اعلانیہ کو سری پر فضیلت دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پچیس گنا ہے۔ فرمایا: تمام اشیاء میں جمیع فرائض اور نوافل اسی طرح ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس طرح کا قول رائے سے نہیں کہا جا سکتا۔ بالیقین وہ امر توقیفی ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''فرض نماز کے سوا آدمی کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے۔'' اور یہ اس لئے ہے کہ فرائض میں ریا داخل نہیں ہوتا اور نوافل اس کے نشانے پر ہیں۔

اور امام نسائی نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک وہ آدمی جو قرآن بالجہر پڑھتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو صدقہ بالجہر دیتا ہے اور جو قرآن سرا پڑھتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو صدقہ سراً دیتا ہے۔'' اور حدیث میں ہے۔ سراً صدقہ دینا رب العالمین کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے (1)۔''

ابن عربی نے کہا ہے: اعلانیہ صدقہ کی سری صدقہ پر فضیلت کے بارے میں اور نہ ہی سری صدقہ کی اعلانیہ صدقہ پر فضیلت کے بارے میں کوئی صحیح حدیث ہے۔ البتہ اس کے بارے میں اجماع ثابت ہے۔ پس رہا نفلی صدقہ تو اس کے بارے صراحۃً قرآن کریم میں موجود ہے کہ یہ سراً دینا جہراً دینے سے افضل ہے۔ اس کے بارے ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک اس کا اطلاق غالب کیفیت پر ہے اور اس بارے میں تحقیق یہ ہے کہ صدقہ میں حالات مختلف ہوتے ہیں صدقہ دینے والے کی حالت کے ساتھ، جس کو صدقہ دیا جائے اس کی حالت کے سبب اور ان لوگوں کی حالت کے ساتھ جو صدقہ کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ رہا صدقہ دینے والا تو اس کے لئے اس میں سنت کے اظہار اور پیشوائی کا ثواب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس کے لئے ہے جس کی حالت قوی ہو اور اس کی نیت نیک اور اچھی ہو اور وہ اپنے بارے میں ریا سے محفوظ اور مامون ہو۔ اور رہا وہ آدمی جو اس مرتبہ سے ضعیف اور کمزور ہو تو اس کے لئے سراً صدقہ دینا افضل ہے۔

اور جہاں تک اس کا تعلق ہے جسے صدقہ دیا گیا ہے تو اسے سری صدقہ لوگوں کے اسے حقیر سمجھنے سے محفوظ کرنے والا ہے اور اس شے کی نسبت سے کہ اس نے غنی اور غیر محتاج ہونے کے باوجود صدقہ لیا ہے اور پاکدامنی کو ترک کر دیا ہے اور رہا لوگوں کا حال تو ان کے اعتبار سے بھی سری صدقہ اعلانیہ سے افضل ہے، اس جہت سے کہ وہ کبھی دینے والے کو ریا کاری کا طعنہ دیتے ہیں اور صدقہ لینے کو اس کا مستحق قرار نہیں دیتے اگرچہ ان کے لئے جہری صدقہ میں دلوں کو صدقہ کی طرف مائل اور راغب کرنے کا سامان بھی ہے لیکن آج کے دور میں یہ بہت قلیل ہے۔

یزید بن حبیب نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ پر صدقہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ پس وہ سراً زکوٰۃ کی تقسیم کا حکم دے رہا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے بالخصوص سلف صالحین کے نزدیک اور علامہ طبری نے کہا ہے: لوگوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ واجب صدقہ میں اظہار افضل ہے۔

میں کہتا ہوں: الکیا الطبری نے ذکر کیا ہے کہ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ مطلقاً صدقات میں اخفا اولیٰ ہے اور یہ فقیر کا حق ہے اور صاحب مال کے لئے جائز ہے کہ وہ صدقات بذات خود تقسیم کرے۔ جیسا کہ حضرت امام شافعی کا ایک قول ہے اور ان کے دوسرے قول کے مطابق انہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہاں صدقات سے مراد نفلی صدقات ہیں نہ کہ وہ فرض جسے ظاہر کرنا اولیٰ ہے تا کہ اسے کوئی تہمت لاحق نہ ہو۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ نفلی نماز انفرادی طور پر پڑھنا افضل ہے (یعنی بغیر جماعت کے) اور فرض نماز میں جماعت تہمت سے دور رکھنے والی ہے۔

اور مہدوی نے کہا ہے: آیت سے مراد فرض زکوٰۃ بھی ہے اور نفلی صدقات بھی۔ پس حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ

1۔ طبرانی، الکبیر، حدیث 8014

مقدس میں اخفا افضل تھا پھر اس کے بعد لوگوں کے خیالات اور گمان غلط ہو گئے تو علماء نے فرائض میں اظہار کو مستحسن قرار دیا تا کہ کسی کے بارے عدم ادائیگی کا گمان نہ کیا جائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول آثار و روایات کے خلاف ہے اور یہ ہمارے زمانے میں فرض صدقہ میں اخفا کے مستحسن ہونے کو مشتبہ کرتا ہے اور اس کے مانع کثیر ہیں اور اسے اعلانیہ نکالنا ریا کے لئے پیش کرنا ہوگا۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ آیت سے فرض زکوٰۃ اور نفل صدقہ مراد لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اخفا کا ذکر کیا ہے اور اس کی مدح کی ہے اور اظہار کا ذکر کیا ہے اور اس کی بھی مدح کی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ دونوں کی طرف اکٹھا متوجہ ہوا جائے۔

اور نقاش نے کہا ہے: بے شک اس آیت کو اس قول باری تعالیٰ نے منسوخ کر دیا ہے: اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً الآیہ (البقرہ: 274) (جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں چھپ کر اور علانیہ (تو ان کے لئے ان کا اجر ہے اپنے رب کے پاس)

قولہ تعالیٰ: فَنِعِمَّا هِیَ۔ یہ اظہار صدقہ پر تعریف ہے۔ پھر اس پر یہ حکم لگایا کہ اظہار سے اخفا بہتر ہے اسی لئے بعض حکماء نے کہا ہے جب تو نیکی کرے تو اسے مخفی رکھ اور جب تیرے ساتھ نیکی کی جائے تو تو اسے پھیلا'' (اذا اصطنعت المعروف فاسترہ و اذا اصطنع الیک فانشرہ)

دعبل الخزاعی نے کہا ہے:

اذا انتقموا اعلنوا امرھم　　وان أنعموا انعَمُوا باکتتام

جب وہ انتقام لیتے ہیں تو اپنے معاملے کا اعلان کرتے ہیں۔ اور اگر وہ نیکی اور احسان کریں تو وہ نیکی خاموشی اور پوشیدہ طور پر کرتے ہیں۔

اور سہل بن ہارون نے کہا ہے:

خل اذا جئته یوما لتسأله　　اعطاك ماملکت کفاہ و اعتذرا

تو چھوڑ دے جب تو کسی دن مانگنے اور سوال کرنے کے لئے اس کے پاس آئے اس نے تجھے وہ عطا کر دیا ہے جس کا تو مالک ہے تو اسے کافی سمجھ اور اس کا عذر قبول کر لے۔

یخفی صنائعه واللهُ یُظْهِرھا　　ان الجمیل اذا اخفیته ظَهَرَا

وہ اپنے کارناموں کو چھپاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں ظاہر کرتا ہے۔ بلاشبہ نیکی کو جب تو مخفی رکھے تو وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کوئی نیکی تین خصلتوں کے سوا مکمل نہیں ہوتی: اسے جلدی کرنا، اسے صغیر سمجھنا اور اسے مخفی رکھنا، جب تو نے اسے جلدی کر لیا تو تو نے اسے حاصل کر لیا اور جب تو نے اسے چھوٹا سمجھا تو تو نے اسے عظیم بنا دیا اور جب تو نے اسے مخفی رکھا تو تو نے اسے مکمل کر دیا اور بعض شعراء نے کہا ہے اور خوب اچھا کہا ہے:

زاد معروفُك عندی عِظَما　　انه عندك مستور حقیر

تیری نیکی میرے نزدیک بہت عظیم اور بڑی ہے بلاشبہ وہ تیرے نزدیک چھپی ہوئی اور حقیر ہے۔

تتناساه كأن لم تأته و هو عند الناس مشهور خطير

تو اسے بھلا دیتا ہے گویا تو نے اسے کیا ہی نہیں حالانکہ وہ لوگوں کے نزدیک بہت زیادہ مشہور ہوتی ہے۔

قراء نے قول باری تعالیٰ فَنِعِمَّا هِيَ میں اختلاف کیا ہے۔ پس ابو عمرو اور نافع نے ورش کی روایت میں، عاصم نے روایت حفص میں اور ابن کثیر نے فَنِعِمَّا هِيَ کو نون اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو عمرو نے بھی اور نافع نے ورش کی روایت کے سوا میں اور عاصم نے ابو بکر اور مفضل کی روایت میں فَنَعِمَّا نون کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور تمام نے میم کو ساکن کیا ہے۔

اور قرآن کے علاوہ دوسرے کلام میں فَنِعْمَ مَا هِيَ پڑھنا بھی جائز ہے۔

نحاس نے کہا ہے لیکن چونکہ یہ سواد میں متصل ہے اس لئے ادغام لازم ہے۔

علمائے نحو نے نِعْمَ میں چار لغات بیان کی ہیں: نَعِمَ الرجلُ زیدٌ، یہ اصل ہے اور نِعِمَ الرجل یعنی عین کے کسرہ کی وجہ سے نون کے کسرہ کے ساتھ اور نَعْمَ الرجل یعنی نون کے فتحہ اور عین کے سکون کے ساتھ۔ یہ اصل میں نَعِمَ تھا کسرہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور نِعْمَ الرجلُ اور یہ افصح اللغات ہے، اس میں بھی اصل نَعِمَ ہے۔ اور یہ ہر مدح اور تعریف کے محل میں واقع ہوتا ہے پھر اس میں تخفیف کی گئی اور عین کا کسرہ نون کو دے دیا گیا اور عین کو ساکن کر دیا گیا۔

اور جنہوں نے فَنِعِمَّا هِيَ پڑھا ہے تو اس کی دو تقدیریں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ان کی لغت کے مطابق ہو جو نِعِم کہتے ہیں اور دوسری تقدیر یہ ہے کہ یہ جید اور عمدہ لغت پر ہو۔ پس اصل نِعْمَ ہوگا۔ پھر التقائے ساکنین کی وجہ سے عین کو کسرہ دے دیا گیا۔ نحاس نے کہا ہے کہ ابو عمرو اور نافع سے عین کے ساکن ہونے کے بارے جو قول بیان کیا گیا ہے وہ محال ہے۔ محمد بن یزید سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اگر عین ساکن ہو اور میم مشدد ہو تو کوئی بھی اسے بولنے کی قدرت نہیں رکھتا بلکہ وہ دو ساکنوں کو جمع کرنے کا قصد کرے گا اور حرکت دے گا اور اس کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔

اور ابو علی نے کہا ہے: جس نے عین کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس کا قول صحیح نہیں ہے کیونکہ اس نے دو ساکنوں کو جمع کر دیا ہے اور ان میں سے پہلا حرف مد ولین نہیں ہے اور وہ نحویوں کے نزدیک تب جائز ہوتا ہے جب کہ پہلا حرف مدہ ہو، کیونکہ مد حرکت کے عوض ہوتی ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ دابّة اور ضَوَّال وغیرہ، شاید ابو عمرو نے حرکت کو مخفی رکھا ہے اور اسے پر کئے بغیر پڑھا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے بَارِئِكُمْ...... اور يَأْمُرُكُمْ میں اخفا کیا ہے اور سامع نے سمع اور خفا میں لطف کے سبب اخفا کو اسکان گمان کر لیا ہے۔ ابو علی نے کہا ہے اور جنہوں نے نَعِمَّا نون کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ کلمہ کو اپنے اصل پر لائے ہیں۔ اور اسی سے شاعر کا یہ قول ہے:

ما أقلتْ قدماىَ اِنهمْ نَعِمَ الساعون فی الأمر المُبِر

میرے قدم کمزور نہیں ہیں بلاشبہ وہ نیکی کے معاملہ میں کوشش اور سعی کرنے والے بہت اچھے ہیں۔

ابوعلی نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: نِعِمَّا میں ما محل نصب میں ہے اور قولہ هِیَ یہ اس فاعل کی تفسیر ہے جو اس سے پہلے مضمر مذکور ہے۔ اور تقدیر عبارت نعم شیئا ابداؤہ (اسے ظاہر کرنا کتنی اچھی شے ہے) اور الابداء ہی مخصوص بالمدح ہے، مگر مضاف کو حذف کر دیا گیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ دلالت کرتا ہے یعنی الاخفاء خیر۔ بس جس طرح یہاں ضمیر اخفا کے لئے ہے صدقات کے لئے نہیں ہے۔ پس اسی طرح پہلا فاعل وہ الابداء ہے اور وہی ہے جس کے ساتھ ضمیر متصل ہے، پھر الابداء کو حذف کر دیا گیا اور صدقات کی ضمیر کو اسی کی مثل اس کی جگہ رکھ دیا گیا۔

وَ اِنْ تُخْفُوْهَا یہ شرط ہے، اسی لئے نون کو حذف کر دیا گیا ہے اور وَتُؤْتُوْهَا کو اس پر عطف کیا گیا ہے اور جواب شرط فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ يُكَفِّرُ قراء نے اس کی قراءت میں اختلاف کیا ہے۔ پس ابوعمرو، ابن کثیر اور عاصم نے ابوبکر کی روایت میں، قتادہ اور ابن ابی اسحاق تمام نے وَ نُكَفِّرُ نون اور را کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور (نافع)، حمزہ اور کسائی نے نون کے ساتھ اور را کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی طرح حضرت عاصم سے بھی مروی ہے اور حسین بن علی الجعفی نے اعمش سے روایت کیا ہے يُكَفِّرَ یعنی را کو منصوب پڑھا ہے۔ ابن عامر نے یا کے ساتھ اور را کو مرفوع پڑھا ہے اور اسے حفص نے عاصم سے روایت کیا ہے اور اسی طرح حسن سے بھی مروی ہے اور ان سے یا اور جزم کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وَ تُكَفِّرْ یعنی تا کے ساتھ، فا کو کسرہ کے ساتھ اور را کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور عکرمہ نے وَ تُكَفَّرْ پڑھا ہے یعنی تا کے ساتھ اور فا کو مفتوح اور را کو مجزوم...... اور مہدوی نے ابن ہرمز سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے وَ تُكَفِّرُ تا کے ساتھ اور را کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور عکرمہ اور شہر بن حوشب سے بیان کیا گیا ہے کہ ان دونوں نے تا کے ساتھ اور را کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ پس یہ نو قراءتیں ہیں میں انہیں بیان کرتا ہوں۔ وَ نُكَفِّرُ یعنی نون اور رفع کے ساتھ۔ یہ امام خلیل اور سیبویہ کا قول ہے۔ نحاس نے بیان کیا ہے کہ سیبویہ نے کہا ہے کہ یہاں رفع کی ایک ہی وجہ ہے اور وہی جید اور عمدہ ہے کیونکہ فا کے بعد کلام غیر جزا کے قائم مقام ہوتا ہے اور معنی پر محمول کرتے ہوئے انہوں نے جزم کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ معنی یہ ہے: وان تخفوھا و تؤتوھا الفقراء یکن خیرا لکم و نکفر عنکم (اور اگر تم صدقوں کو پوشیدہ رکھو اور انہیں فقیروں کو دو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور ہم تم سے بعض گناہ مٹا دیں گے۔)

اور ابوحاتم نے کہا ہے: اعمش نے پڑھا ہے يُكَفِّرْ یا کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے پہلے واؤ نہیں ہے۔

نحاس نے کہا ہے: وہ جو ابوحاتم نے اعمش سے بغیر واؤ کے جزم کے ساتھ بیان کیا ہے تو وہ بدل کے طور پر ہے گویا وہ فا کے محل میں ہے اور وہ جو عاصم سے وَيُكَفِّرُ یا اور رفع کے ساتھ مروی ہے اس کا معنی ہے: وَيُكَفِّرُ اللہ (اور اللہ تعالیٰ مٹا دے گا) اور ابوعبید کا قول ہے۔ اور ابوحاتم نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یکفر الاعطاء (یعنی صدقہ دینا مٹا دے گا) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وَ تُكَفِّرْ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہوگا اور صدقات مٹا دیں گے۔ المختصر یہ کہ ان قراءتوں میں سے جو نون کے ساتھ ہیں تو

وہ نوان نون عظمت ہے اور جو تا کے ساتھ ہیں تو ان سے مراد صدقہ ہے۔ پس تو اسے یاد کر لے۔ سوائے اس کے جو مکرمہ سے فا کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے کیونکہ اس قراءت میں تا وہ سیئات کے لئے ہے اور ان میں سے جو قراءت یا کے ساتھ ہے تو اس میں مٹانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور خفیۂ صدقہ دینا بھی انہیں مٹانے والا ہے اسے مکی نے بیان کیا ہے۔

اور رہا را کا رفع تو اس کی دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ فعل مبتدا کی خبر ہو اور تقدیر کلام ہو: و نحن نکفر یا وھی تکفر۔ یعنی صدقہ مٹا دے گا۔ یا و اللہ یکفر (اور اللہ تعالیٰ مٹا دے گا) اور دوسری وجہ قطع اور استئناف ہے واؤ عاطفہ اشتراک کے لئے نہ ہوگی بلکہ جملہ کلام کو جملہ پر عطف کیا جائیگا۔ اور ہم نے جزم کی قراءت کا معنی ذکر کر دیا ہے اور جہاں تک نصب کا تعلق ہے وَ نُكَفِّرَ تو یہ ضعیف ہے اور یہ ان مضمرہ کی بنا پر ہے اور یہ بعد کی بنا پر جائز ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: یہ جواب استفہام میں نصب کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ جزا کے ساتھ غیر کے وجوب کے سبب شے واجب ہوتی ہے جیسا کہ استفہام۔ ان قراءتوں میں را پر جزم افصح ہے، کیونکہ یہ تکفیر کے جزا میں داخل ہونے کی خبر دیتی ہے اور اس کے مشروط ہونے کی (اس شرط کے ساتھ) کہ اگر اخفا واقع ہو اور جہاں تک رفع کا تعلق ہے تو اس میں یہ معنی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ وہ اختلاف ہے جسے خلیل اور سیبویہ نے اختیار کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ میں مِّنْ صرف تبعیض کے لئے ہے۔ اور علامہ طبری نے ایک جماعت سے بیان کیا ہے کہ یہ زائدہ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ان سے خطا ہوئی ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ یہ وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

''نہیں ہے آپ کے ذمہ ان کو سیدھی راہ پر چلانا ہاں اللہ سیدھی راہ پر چلاتا ہے جسے چاہتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرو (اپنے) مال سے تو (اس میں) تمہارا اپنا فائدہ ہے۔ اور تم تو خرچ ہی نہیں کرتے ہو سوائے اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی کے اور جتنا کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پورا ادا کر دیا جائے گا تمہیں اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

قولہ تعالیٰ: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ۔ یہ کلام صدقات کے ذکر کے ساتھ متصل ہے، تو گویا اس میں مشرکین کو صدقہ دینے کے جواز کو بیان کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں مرسل روایت بیان کی ہے کہ مسلمان ذمی لوگوں میں سے فقراء کو صدقہ دیتے رہتے تھے۔ جب مسلمان فقراء زیادہ ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا تتصدقوا الا علی اھل دینکم تم اپنے اہل دین کے سوا کسی کو صدقہ نہ دو۔ تو یہ آیت نازل ہوئی جو ان کے لئے صدقہ مباح کر رہی ہے جو دین اسلام پر نہیں ہیں۔

اور نقاش نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس صدقات لائے جاتے تھے۔ پس ایک یہودی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے پاس آیا اور اس نے کہا: مجھے کچھ عطا فرمائیے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لیس لك من صدقة المسلمين شئ (تیرے لئے مسلمانوں کے صدقہ میں سے کوئی شے نہیں ہے۔) پس وہ یہودی ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا تو یہ آیت نازل ہو گئی: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے مال عطا فرما دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے آیت صدقات کے ساتھ منسوخ کر دیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: انصار میں سے کچھ لوگوں کی بنی قریظہ اور بنی نضیر کے ساتھ رشتہ داریاں تھیں اور وہ انہیں اس تصور اور رغبت کے تحت صدقات نہیں دیتے تھے کہ جب وہ محتاج ہوں گے تو اسلام قبول کریں گے۔ پس یہ آیت ان کے سبب سے نازل ہوئی۔

اور بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے دادا ابو قحافہ کو کچھ دے پھر وہ اس سے رک گئیں اس لئے کہ وہ کافر ہیں۔ تب اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اور علامہ طبری نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صدقہ روکنے سے مقصود یہ تھا تاکہ وہ لوگ اسلام قبول کر لیں اور دین میں داخل ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ (ان کو سیدھی راہ پر چلانا آپ کے ذمہ نہیں ہے۔)

اور یہ قول بھی ہے کہ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ ماقبل سے متصل نہیں ہے۔ پس یہ صدقات کے بارے میں اور انہیں کفار پر خرچ کرنے کے بارے میں ظاہر ہے بلکہ یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی ابتدائے کلام ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ صدقہ جو ان کے لئے مباح کیا گیا ہے جیسا کہ مذکورہ آثار اسے متضمن ہیں یہ نفلی صدقہ ہے اور جہاں تک فرض زکوٰۃ کا تعلق ہے تو وہ کسی کافر کو دینا جائز نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشاد گرامی ہے: ''مجھے حکم فرمایا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء اور خوشحال لوگوں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کروں اور اسے تمہارے فقراء کی طرف لوٹا دوں (1)۔'' ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے وہ تمام جن سے روایات محفوظ کی جاتی ہیں ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ذمی کو مالوں کی زکوٰۃ میں سے کوئی شے نہ دی جائے گی، پھر انہوں نے ان میں سے ایک جماعت کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اسے بیان کیا ہے اور کوئی اختلاف ذکر نہیں کیا۔

اور مہدوی نے بیان کیا ہے: مسلمانوں کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ اس آیت کے تحت اپنے مشرک قرابتداروں کو فرض زکوٰۃ میں سے دیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ بالا جماع مردود ہے۔ واللہ اعلم۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: انہیں صدقہ فطر دیا جا سکتا ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ صدقہ پاک کرنے والا اور واجب ہے لہٰذا کسی کافر کو نہیں دیا جائے گا جیسا کہ چوپائے اور عمدہ مال کا صدقہ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اغنوهم عن سوال هذا اليوم تم انہیں اس دن یعنی عید الفطر کے دن سوال کرنے سے غنی کر دو۔ (یعنی تم انہیں اتنا دے دو کہ وہ اس دن سوال کرنے کے محتاج نہ رہیں۔)

1۔ صحیح بخاری، باب ماجاء فی العلم، حدیث نمبر 61، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ ان کے عید اور نماز عید میں مشغول ہونے کے سبب ہے اور یہ مشرکین میں ثابت نہیں ہوتا۔ اور صدقہ فطر غیر مسلم کو دینا ان کے قول کے مطابق جائز ہے جنہوں نے اسے سنت قرار دیا ہے اور ہمارے نزدیک دو قولوں میں سے ایک یہی ہے۔ اور یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے وہ آیت کو نیکی، کھانا کھلانے اور صدقات کے اطلاق میں عام قرار دیتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ حکم ان مسلمانوں کے لئے متصور ہے جو اہل ذمہ کے ساتھ اور اہل حرب میں سے جنہیں غلام بنایا گیا ہے ان کے ساتھ ہیں۔

میں کہتا ہوں: قرآن کریم میں ہے: وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ۝ (الدہر) (اور جو کھانا کھلاتے ہیں اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو۔)

اور اسیر (قیدی) دارالاسلام میں ہوتا ہے اور وہ مشرک ہی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَيْهِمْ (الممتحنہ: 8) (اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا کہ تم ان کے ساتھ احسان کرو اور ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرو۔)

پس ان آیات کا ظاہر انہیں جملہ صدقات دینے کے جواز کا تقاضا کرتا ہے، مگر حضور نبی کریم ﷺ نے ان سے فرض زکوٰۃ کو خاص کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''ان کے اغنیاء اور خوشحال لوگوں سے صدقہ لو اور ان کے فقراء پر لوٹا دو (1)۔'' اور اس پر علماء نے اتفاق کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس جب وہ محتاج ہوں تو انہیں نفلی صدقات میں سے دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

ابن عربی نے کہا ہے: رہا گنہگار مسلمان تو اس بارے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اسے صدقہ فطر دیا جائے گا مگر جب وہ ارکان اسلام نماز، روزہ وغیرہ کو چھوڑ دے تو پھر اسے صدقہ نہیں دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے۔ اور تمام گنہگار جو کہ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں انہیں مسلمانوں میں سے شامل ہونے کی وجہ سے صدقہ دیا جائے گا اور صحیح مسلم میں ہے (2) کہ وہ آدمی جس نے کسی غنی، چور اور زانی کو صدقہ دیا اور اس کا صدقہ قبول کر لیا گیا۔ اس کا بیان آگے آیۃ الصدقات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ رہنمائی فرماتا ہے جس کی چاہتا ہے۔ اس میں قدریہ اور معتزلہ کے گروہوں کا رد ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ۔ یہ شرط اور اس کا جواب ہے۔ اور اس آیت میں خَيْرٍ سے مراد مال ہے، کیونکہ یہ انفاق کے ذکر سے مقترن ہے اور یہ قرینہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد مال ہے اور جہاں ایسے قرینہ سے مقترن نہ ہو جو اس سے مراد مال ہونے پر دلالت کرتا ہو تو پھر یہ لازم نہیں ہے کہ یہ مال کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب اذا تصدق علی غنی وھو لا یعلم، حدیث نمبر 1332، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

معنی میں ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا (الفرقان: 24) اور مزید ارشاد ہے: مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝ (الزلزلۃ) الی غیر ذالک۔ اور یہ عکرمہ کے اس قول سے پرہیز اور احتیاط کرنا ہے کہ کتاب اللہ میں جہاں کہیں لفظ خیر ہے وہ مال کے معنی میں ہے۔

اور بیان کیا جاتا ہے کہ بعض علماء بہت سی نیکیاں کرتے ہیں پھر حلف اٹھا دیتے ہیں کہ اس نے کسی کے ساتھ خیر (نیکی) نہیں کی۔ تو اس بارے میں اسے کہا جائے تو وہ کہتا ہے: بلاشبہ میں نے اپنے ساتھ یہ عمل کیا ہے اور یہ آیت تلاوت کرتا ہے: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ نفقہ جو قبولیت کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے وہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لئے ہو۔ اور ابْتِغَآءَ یہ مفعول لہ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے شہادت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور یہ آیت ان کی فضیلت اور مدح کے محل میں وارد ہوئی ہے اور پہلی تاویل کی بنا پر یہ ان پر شرط عائد کرنا ہے اور پھر یہ شرط ان کے علاوہ پوری امت کو شامل ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا: انك لن تنفق نفقةً تبتغي بها وجه الله تعالى الا اجرت بها حتى ما تجعل في في امرأتك(1) (بلاشبہ تو ہرگز کوئی نفقہ خرچ نہیں کرے گا جس سے تو اللہ تعالیٰ کی رضا چاہے گا مگر تجھے اس کے عوض اجرت دی جائے گی یہاں تک کہ جو کچھ تو اپنی بیوی کے منہ میں بھی ڈالے گا۔)

قولہ تعالیٰ: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ، یُوَفَّ اِلَیْکُمْ یہ قول باری تعالیٰ: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ کے لئے تاکید اور بیان ہے اور یہ کہ خرچ کرنے والوں کو خرچ کرنے کا ثواب پورا پورا دیا جائے گا اور اس سے کوئی شے کم نہیں کی جائے گی۔ پس یہی کمی ان کے لئے ظلم ہوگی۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ٘ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ٘ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ٘ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا٘ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۝۲۷۳

"(خیرات) ان فقیروں کے لئے جو روکے گئے ہیں اللہ کی راہ میں نہیں فرصت ملتی انہیں (روزی کمانے کے لئے) چلنے پھرنے کی زمین میں۔ خیال کرتا ہے انہیں ناواقف (کہ یہ) مالدار (ہیں) بوجہ ان کے سوال نہ کرنے کے۔ (اے حبیب! صلی اللہ علیہ وسلم) آپ پہچانتے ہیں انہیں ان کی صورت سے۔ یہ نہیں مانگا کرتے لوگوں سے لپٹ کر اور جو کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پس یقیناً اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے۔"

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لِلْفُقَرَآءِ۔ اس میں لام وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ کے متعلق ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، حدیث نمبر 54، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ محذوف کے متعلق ہے اور تقدیر عبارت ہے: الانفاق او الصدقة للفقراء۔ سدی، مجاہد وغیرہما نے کہا ہے: ان فقراء سے مراد فقراء مہاجرین ہیں جو قریش اور دوسرے قبائل سے تعلق رکھتے تھے، پھر یہ آیت ہر اس کو شامل ہے جو مستقبل میں فقراء کی صفت کے تحت داخل ہوگا اور مہاجرین فقراء کو ذکر کے ساتھ خاص اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ وہاں ان کے سوا کوئی (فقیر) نہ تھا۔ اور یہ فقراء اہل صفہ تھے اور تقریباً چار سو افراد تھے، وہ فقر و افلاس کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے نہ ان کے اہل و عیال تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی مال تھا۔ پس ان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں ایک صفہ (سایہ دار چبوترہ) تعمیر کیا گیا۔ پس ان کو اہل صفہ کہا گیا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: میں اہل صفہ میں سے تھا جب شام ہوتی تھی تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر حاضر ہوتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر آدمی کو حکم ارشاد فرماتے تھے اور وہ ایک آدمی کو ساتھ لے جاتا تھا۔ اور اہل صفہ میں سے جو باقی رہ جاتے وہ دس یا اس سے کم افراد ہوتے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا شام کا کھانا لے آتے اور ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا تناول کر لیتے اور جب ہم فارغ ہوتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: ناموا فی المسجد مسجد میں جا کر سو جاؤ۔''

اور ترمذی نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: (یہ آیت) وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ ہم گروہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی، ہم کھجوروں کے مالک تھے، فرمایا: ہر آدمی اپنے درخت سے اپنی حیثیت کے مطابق زیادہ یا کم کھجوریں لاتا تھا اور کوئی آدمی ایک خوشہ اور دو خوشے لے کر آتا تھا اور انہیں مسجد میں لٹکا دیتا تھا اور اہل صفہ کے لئے کوئی کھانے کی شے نہ ہوتی تھی تو ان میں سے جب کسی کو بھوک ستاتی تھی تو وہ اس خوشے کے پاس آتا، اسے اپنا عصا مارتا، تو اس سے خشک اور پکی کھجوریں گر پڑتی اور وہ کھا لیتا تھا اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اچھی اور عمدہ شے میں رغبت نہ رکھتے تھے اور وہ ایسا خوشہ لے آتے جس میں ردی اور گھٹیا قسم کی کھجوریں ہوتی تھیں۔ اور کوئی ایسا خوشہ لے کر آتا جو ٹوٹا ہوا ہوتا اور وہ اسے مسجد میں لٹکا دیتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ

فرمایا: اگر تم میں سے کسی کو ایسا ہدیہ دیا جائے جیسا اس نے دیا ہے تو وہ اسے نہ لے گا مگر چشم پوشی کرتے ہوئے اور حیاء کرتے ہوئے۔ فرمایا: پس اس کے بعد ہم میں سے ہر آدمی وہی لاتا تھا جو اس کے پاس عمدہ اور اچھی شے ہوتی تھی۔ فرمایا: یہ حدیث حسن، غریب، صحیح ہے۔

ہمارے علماء نے بیان کیا ہے کہ وہ مسجد میں ضرورت کے تحت رہتے تھے اور ضرورت کے تحت ہی صدقہ وغیرہ کھاتے تھے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر خوشحالی کے دروازے کھول دیئے وہ اس حالت سے مستغنی ہو گئے اور نکل گئے پھر وہ مالک بن گئے اور حاکم بن گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان فقراء مہاجرین کے وہ احوال بیان کئے جو ان پر واپس مڑنے کو واجب کرتے ہیں اور فرمایا: الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اور معنی ہے وہ جو روک دیئے گئے۔ حضرت قتادہ اور ابن زید نے کہا ہے: اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کا معنی ہے: جنہوں نے اپنے آپ کو دشمن کے خوف سے اپنے کاروبار میں تصرف کرنے

سے روک لیا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ وہ زمین میں چلنے پھرنے کی استطاعت نہیں رکھتے کیونکہ تمام شہر مکمل طور پر کفر کے زیر تسلط ہیں اور یہ ابتدائے اسلام میں تھا اور انہیں اکتساب دولت سے باز رکھنے کی علت جہاد تھا اور کفار کا اسلام قبول کرنے سے انکار کرنا کاروبار تجارت میں تصرف کرنے سے مانع تھا۔ نتیجتاً وہ فقراء ہی باقی رہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ کا معنی ہے یعنی کیونکہ انہوں نے جہاد کو لازم پکڑ لیا ہے اور پہلا معنی زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ یعنی بے شک ان کے سوال کرنے اور مانگنے کو چھوڑنے اور ترک کرنے کے سبب اور ان کے اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کے سبب ناواقف لوگ انہیں مالدار اور اغنیاء گمان کرتے ہیں۔ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ لفظ فقر کا اطلاق اس پر بھی کرنا جائز ہے جس کا لباس بہت قیمتی ہو اور وہ اسے زکوٰۃ دینے سے مانع نہیں ہوتا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو زکوٰۃ دینے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور وہ ان مہاجرین میں سے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کرتے تھے نہ وہ مریض تھے اور نہ ہی اندھے۔ اور التَّعَفُّفِ یہ تفعل کے وزن پر ہے اور یہ عفت من الشیٔ سے مبالغہ کا وزن ہے جب کوئی اس شے سے رکا رہے اور اس کی طلب سے احتیاط برتے۔ اس معنی کے ساتھ حضرت قتادہ وغیرہ نے تفسیر بیان کی ہے اور یحسبھم میں سین کو فتحہ اور کسرہ دونوں دیئے گئے ہیں اور یہ دو لغتیں ہیں۔ ابو علی نے کہا ہے: فتحہ زیادہ قیاس کے مطابق ہے کیونکہ اس کی ماضی میں عین کلمہ مکسور ہے۔ پس اس کا باب مضارع میں مفتوح آتا ہے اور کسرہ کے ساتھ پڑھنا اچھا اور حسین ہے۔ کیونکہ سماع اسی طرح ہے۔ اگرچہ یہ قیاس کے مقابلہ میں شاذ ہے اور مِنَ التَّعَفُّفِ میں مِنَ ابتدائے غایت کے لئے ہے اور بعض نے کہا ہے: یہ بیان جنس کے لئے ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ شکل و صورت سے کسی پر جو آثار ظاہر ہوتے ہیں ان کا اعتبار میں خاصا اثر ہوتا ہے، یہاں تک کہ جب ہم کسی میت کو دار الاسلام میں دیکھیں اور اس پر زنار ہو (مراد وہ دھاگا سا ہے جو ذمی لوگ اپنی کمر میں باندھتے ہیں) اور وہ غیر مختون ہو تو اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا۔ اور اکثر علماء کے قول کے مطابق اسے دار کے حکم پر آگے کر دیا جائے گا اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ (محمد: ۳۰) (اور آپ ضرور پہچان لیا کریں گے انہیں ان کے انداز گفتگو سے)

پس یہ آیت ایسے آدمی کو صدقہ دینا جائز ہونے پر دلیل ہے جس کے پاس اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے لباس، کپڑے وغیرہ موجود ہوں۔ اور علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد اس مقدار میں انہوں نے اختلاف کیا ہے جو ضرورت مند ہونے کی صورت میں وہ لے سکتا ہے۔ پس امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اتنی مقدار کا اعتبار کیا ہے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سال کی خوراک کا اعتبار کیا ہے اور امام مالک نے چالیس درہم کا اعتبار کیا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کمانے والے کو زکوٰۃ کا مصرف قرار نہیں دیتے۔

اور السیمیا (الف مقصورہ کے ساتھ) اس کا معنی علامت، نشانی ہے اور کبھی اسے مد کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے اور کہا جاتا

ہے: السِّیْمَاء۔ اور یہاں اس کے معنی کی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد خشوع اور تواضع ہے۔ سدیؒ نے کہا ہے: ان کے چہروں پر حاجت اور فاقہ کشی اور تنگدستی کا اثر مراد ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: ان کے کپڑوں کا پھٹا پرانا ہونا مراد ہے اور ایک قوم نے کہا ہے اور اسے مکی نے بیان کیا ہے کہ اس سے مراد سجدوں کا اثر ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے اور یہ اس لئے کہ وہ فارغ اور توکل کرنے والے لوگ تھے ان کا زیادہ تر نماز کے سوا کوئی شغل نہ تھا۔ لہٰذا ان پر سجدوں کے نشانات تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ سیما جس سے مراد سجدوں کا اثر ہے اس میں تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مشترک ہیں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے: سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (الفتح: ۲۹) (ان (کے ایمان وعبادت) کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہے۔)

لہٰذا اس معنی میں تو ان کے اور دوسروں کے درمیان کوئی فرق نہ رہا۔ پس کوئی معنی باقی نہ رہا مگر یہ کہ سیما سے مراد فقر و افلاس اور حاجت مند ہونے کا اثر ہو یا پھر سجدوں کے نشانات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوں، وہ رات کے قیام اور دن کے روزوں کی وجہ سے چہروں کی زردی سے پہچانے جاتے تھے۔ واللہ اعلم۔

اور رہا خشوع! تو اس کا محل دل ہے اور اس میں غنی اور فقیر سب مشترک ہوتے ہیں، نتیجتاً جو معنی ہم نے اختیار کیا ہے اس کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ والموفق الالہ۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا۔ الحاف مصدر ہے جو حال کے محل میں واقع ہے، یعنی معنی ولحفین۔ کہا جاتا ہے: أَلحفَ، أَحْفٰی اور أَلَحَّ سوال میں اصرار کرنے کے معنی میں برابر ہیں اور کہا جاتا ہے۔ و لیس لِلْمُلْحِف مِثْلُ الرّد۔

اور الالحاف اللحاف سے مشتق ہے۔ سوال کرنے اور مانگنے میں وجوہ طلب پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا ہے جیسا کہ اللحاف ڈھانپنے کے معنی کو شامل ہوتا ہے۔ یعنی یہ سائل عوام الناس سے اپنا سوال کرتا ہے اور اپنے سوال میں خوب اصرار کرتا ہے (گویا وہ ان کے ساتھ لپٹ کر سوال کر رہا ہے) اسی معنی میں ابن احمر کا یہ قول ہے:

فظلّ یَحُفُّهُنَّ بقَفْقَفَیْه و یَلْحَفُهُنَّ هَفْهافا ثخینا

شاعر شتر مرغ کا ذکر کر رہا ہے کہ وہ انڈوں کو اپنے پیروں کے نیچے چھپا لیتے ہیں اور وہ ان پر اس طرح پر ڈال لیتا ہے جیسا کہ لحاف اور وہ اپنے سخت ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا باریک ہوتا ہے۔

نسائی اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسکین وہ نہیں ہے جسے ایک یا دو کھجوریں اور ایک یا دو لقمے دیئے جاتے ہیں بلکہ مسکین تو پاکدامن بننے والا (سوال کے لئے ہاتھ نہ پھیلانے والا) ہے اگر چاہو تو یہ پڑھ لو لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا۔

1۔ صحیح بخاری، باب لایسئالون الناس الحافا، حدیث نمبر 4175، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 5۔ علماء نے قول باری تعالیٰ: لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کے معنی میں دو مختلف قول بیان کئے ہیں: پس ایک گروہ نے کہا ہے جن میں طبری اور زجاج ہیں کہ اس کا معنی ہے: وہ قطعاً سوال نہیں کرتے اور یہ اس بنا پر ہے کہ وہ سوال سے کلی طور پر بچتے اور پاکدامن رہتے ہیں۔ یہی موقف جمہور مفسرین کا ہے اور پاکدامنی کی صفت ان کے لئے ثابت ہوتی ہے یعنی وہ لوگوں سے سوال نہیں کرتے نہ اصرار کے ساتھ اور نہ بغیر اصرار کے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مراد الحاف کی نفی ہے، یعنی وہ اصرار اور لپٹے بغیر تو سوال کرتے رہتے ہیں اور یہ فہم کے زیادہ قریب اور اس میں جلدی آنے والی شے ہے اور اس میں اس کی بری حالت پر تنبیہ ہے جو لوگوں سے لپٹ کر سوال کرتا ہے۔

ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ امام مسلم کے ہیں کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''تم سوال میں اصرار نہ کرو قسم بخدا! تم میں سے کوئی بھی مجھ سے کسی شے کا سوال نہیں کرتا تو اس کا سوال اس کے لئے مجھ سے کوئی شے نکال لاتا ہے اور میں اسے ناپسند کرتا ہوں، پس اس کے لئے اس میں برکت رکھ دی جائے گی جو کچھ میں نے اسے عطا کیا۔''

اور مؤطا میں ہے، حضرت زید بن اسلم نے حضرت عطاء بن یسار سے اور انہوں نے بنی اسد کے ایک آدمی سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں اور میرے گھر والے بقیع غرقد میں اترے تو میرے گھر والوں نے مجھے کہا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس جا اور آپ سے ہمارے لئے کوئی چیز لے آتا کہ ہم اسے کھائیں اور وہ اپنی حاجت اور ضرورت ذکر کرنے لگے۔ پس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس حاضر ہوا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس ایک آدمی کو سوال کرتے ہوئے پایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسے فرمارہے تھے: لا أجد ما اعطیك میں کوئی ایسی شے نہیں پاتا جو میں تجھے دوں۔ وہ آدمی آپ سے پیٹھ پھیر کر لوٹا اس حال میں کہ وہ بڑے غصے میں تھا اور کہہ رہا تھا مجھے اپنی عمر کی قسم بلاشبہ آپ جسے چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک یہ مجھ پر غصے ہو رہا ہے کہ میں نے اسے دینے کے لئے کوئی شے نہیں پائی۔ تم میں سے جس نے اس حال میں سوال کیا کہ اس کے پاس ایک اوقیہ (چاندی) یا اس کے برابر (سامان) ہو تو تحقیق اس نے بالاصرار اور لپٹ کر سوال کیا۔''

اسدی نے کہا ہے: پس میں نے کہا ہمارے لئے تو دودھ دینے والی ایک اونٹنی اوقیہ سے بہتر ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں...... اس آدمی نے بیان کیا تو میں واپس لوٹ گیا اور میں نے آپ سے کچھ نہ مانگا، پھر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس جو اور کشمش لائے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں ہمارے لئے تقسیم فرمادیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غنی فرمادیا۔

ابن عبد البر نے کہا ہے اسی طرح اسے مالک نے روایت کیا ہے اور ہشام بن سعد وغیرہ نے ان کی اتباع کی ہے اور یہ حدیث صحیح ہے اور علماء کے نزدیک جب صحابی کا نام نہ لیا جائے تو اس کا حکم کسی دوسرے آدمی کے حکم کی طرح نہیں ہے جب اس کا نام نہ لیا جائے، کیونکہ تمام صحابہ کرام سے جرح اٹھ چکی ہے اور ان کے لئے عدالت ثابت ہے۔ یہ حدیث اس پر دلالت

کرتی ہے کہ اس کے لئے سوال کرنا مکروہ ہے جس کے پاس ایک اوقیہ چاندی ہو۔ پس جس نے سوال کیا اس میں کہ اس کے پاس یہ حد ہو اور اتنی مقدار اور تعداد میں چاندی یا وہ شے ہو جو اس کے قائم مقام ہوتی ہے اور وہ اس کے مساوی ہو تو وہ مُلحِف ہے (یعنی لپٹ کر سوال کرنے والا ہے) اور میں اہل علم میں سے کسی کو نہیں جانتا مگر ہر کوئی اس کے لئے سوال کو مکروہ قرار دیتا ہے جس کے پاس اتنی مقدار میں چاندی ہو یا اس کے مساوی سونا ہو۔ یہ حکم اس حدیث کے ظاہر کی بنا پر ہے اور جو شے بغیر سوال کے کسی کے پاس آ جائے تو اس کے لئے اسے کھانا جائز ہے اگر وہ زکوٰۃ میں سے نہ ہو۔ اور یہ ان (مسائل) میں سے ہے جس میں میں کسی اختلاف سے واقف نہیں اور اگر وہ شے مال زکوٰۃ میں سے ہو تو اس میں اختلاف ہے اس کا بیان آیۃ الصدقات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: سوال کے معانی اور اس کی کراہیت کے بارے میں فقہاء کے جوابات اور اہل ورع کا مذہب بیان کیا گیا ہے اس میں سے احسن ترین وہ ہے جسے اثرم نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے۔ آپ سے سوال کرنے کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ کب حلال ہوتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: جب اس کے پاس اتنی شے بھی نہ ہو جس سے وہ اپنی صبح اور شام کا کھانا تیار کر سکے۔ یہ حضرت سہل بن حنظلیہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق ہے (1)۔ ابوعبداللہ (یہ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی کنیت ہے) کو کہا گیا اگر وہ سوال کرنے پر مجبور ہو جائے، تو آپ نے فرمایا: جب وہ مجبور ہو جائے تو اس کے لئے مانگنا مباح ہے پھر کہا گیا: اور اگر وہ مانگنے سے باز رہے تو؟ آپ نے فرمایا: یہ اس کے لئے بہت بہتر ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: میں کسی کے بارے یہ گمان نہیں رکھتا کہ وہ بھوک سے مر جائے گا! اللہ تعالیٰ اسے اس کا رزق ضرور عطا فرمائے گا۔ (ما اظن أحدا یموت من الجوع! اللہ یاتیہ برزقہ) پھر آپ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر فرمائی: مَن استعف اعفہ اللہُ (2) جو پاکدامنی کا طالب ہوا اللہ تعالیٰ اسے پاکدامن کر دے گا (یعنی جو سوال سے رکا رہا اللہ تعالیٰ اسے اس سے محفوظ کر دے گا۔)

اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: تَعَفَّفْ تو پاکدامن رہ (یعنی کسی سے نہ مانگ) ابوبکر نے بیان کیا ہے: میں نے آپ کو سنا۔ آپ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا جس کے پاس کوئی شے نہیں ہوتی کیا وہ لوگوں سے سوال کر سکتا ہے یا مردار کھا سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: کیا وہ مردار کھا سکتا ہے جو ایسے آدمی کو پائے جس سے وہ کچھ مانگ سکتا ہو، یہ بہت شنیع اور برا ہے۔ مزید بیان کیا اور میں نے آپ سے یہ بھی سنا کہ آپ سے سوال کیا گیا کیا آدمی کسی دوسرے کے لئے مانگ سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، البتہ وہ تعریض کر سکتا ہے۔ (یعنی اشارۃً توجہ اس کی طرف دلوا سکتا ہے) جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قوم آئی وہ ننگے پاؤں تھے، بدن پر کپڑے نہ تھے اور اپنے جسموں کو اونی دھاری دار چادروں سے ڈھانپے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1۔ ابی داؤد، باب من یعطی من صدقۃ وحد الغناء، حدیث نمبر 1388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الاستعفاف عن المسألۃ، حدیث نمبر 1376، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تصدّقُوا (اے صحابہ!) تم صدقہ کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا: اعطوھم۔ تم انہیں دو...... ابو عمر نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اشفعوا توجروا تم مدد کرو تم اجر دیئے جاؤ گے (1) تو اس میں دوسرے کے لئے سوال کا اطلاق ہے۔ واللہ اعلم...... اور فرمایا: ألا رجل یتصدق علی ھذا کیا کوئی آدمی نہیں جو اس پر صدقہ کر سکتا ہو۔؟ ابو بکر نے بیان کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا ایک آدمی اس آدمی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے: بے شک وہ محتاج ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ تعریض ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بے شک سوال تب بنتا ہے کہ وہ کہے: أعطہ تو اسے دے۔ پھر فرمایا: میرے نزدیک یہ پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی ذات کے لئے سوال کرے تو پھر کسی دوسرے کے لئے یہ کیسے پسندیدہ ہو سکتا ہے؟ البتہ میرے نزدیک تعریض کرنا پسندیدہ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو داؤد اور نسائی وغیرہما نے روایت کیا ہے کہ فراسی (بنی فراس بن مالک کا کوئی آدمی) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا میں سوال کر سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں اور اگر تو سائل ہے تو پھر ضروری ہے کہ تو صالحین سے مانگ۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاجت و ضرورت کے وقت اہل فضل و صلاح کے سوال کو مباح قرار دیا ہے اور اگر وہ اپنی حاجت اللہ تعالیٰ کے پاس پیش کرے تو یہ اور اعلیٰ ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لوگوں سے حاجات کا مطالبہ کرنا یہ تیرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب ہے۔ پس تو اپنی حاجت اس کے پاس پیش کر جو ہر قسم کے نفع اور نقصان کا مالک ہے اور چاہیے کہ تیرا بھاگ کر جانا اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ماسویٰ سے کافی ہو جائے گا اور تو خوشحال اور مسرور زندگی گزارے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر بغیر مانگے کسی کے پاس کوئی شے آجائے تو اس کے لئے جائز ہے وہ اسے قبول کرلے اور اسے رد نہ کرے کیونکہ وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا ہے۔ امام مالک نے حضرت زید بن اسلم سے اور انہوں نے حضرت عطا بن یسار سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف کچھ عطا (ہدیہ، تحفہ) بھیجی تو آپ نے اسے واپس لوٹا دیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو فرمایا: ''تم نے اسے کیوں لوٹا دیا ہے؟'' تو آپ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا آپ نے ہمیں بتایا نہیں ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ کوئی شے نہ لے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ وہ سوال کے بارے میں ہے اور رہی وہ شے جو بغیر مانگے مل جائے تو یقیناً وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمایا ہے۔'' تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میں کسی سے کسی شے کے بارے سوال نہیں کروں گا اور بن مانگے جو شے بھی میرے پاس آئے گی میں اسے لے لوں گا۔

یہ نص ہے۔ مسلم نے اپنی صحیح میں اور نسائی نے اپنی سنن میں (2) اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1342، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6630، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مجھے عطیات عطا فرماتے رہتے تھے تو میں عرض کرتا: آپ اسے عطا فرما دیجئے جو مجھ سے زیادہ اس کا محتاج ہے، حتیٰ کہ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مال عطا فرمایا تو میں نے عرض کی: آپ مجھ سے زیادہ محتاج اور حاجت مند کو عطا فرما دیجئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے لے لو اور اس مال میں سے جو تمہارے پاس آئے اور تو نہ اس پر جھانکنے والا ہے اور نہ سوال کرنے والا، پس اسے اور اس مال کو لے لو اور تم اس میں اپنے نفس کی اتباع و پیروی نہ کرو۔'' نسائی نے خذہ کے قول کے بعد یہ اضافہ نقل کیا ہے۔ ''پس تم اسے اپنے پاس جمع کر لو یا اسے صدقہ کر دو۔''

اور مسلم نے حضرت عبداللہ بن سعدی مالکی سے حدیث نقل کی ہے (1) کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: اذا اعطیت شیئا من غیر ان تسأل فکل و تصدق (کہ جب تمہیں کوئی شے بغیر سوال کے دی جائے تو اسے کھاؤ اور صدقہ کرو) یہ روایت تمہارے لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مرسل حدیث کو صحیح بناتی ہے۔

الاثرم نے کہا ہے: میں نے ابوعبداللہ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ان سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بارے میں سوال کیا گیا: ''جو شے تیرے پاس بغیر سوال اور بغیر اشراف کے آجائے۔'' اس میں اشراف سے آپ نے کون سا ارادہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ تو اس پر جھانکتا رہے اور اپنے دل میں یہ کہتا رہے۔ شاید یہ شے میری طرف بھیج دی جائے۔ آپ سے کہا گیا: اگرچہ وہ تعرض نہ بھی کرے؟ آپ نے فرمایا: ہاں بلاشبہ وہ (اشراف) دل کے ساتھ ہوتا ہے پھر آپ سے کہا گیا: یہ تو بہت سختی ہے آپ نے فرمایا: اگرچہ یہ شدید ہے لیکن یہ اسی طرح ہے۔ آپ سے کہا گیا: اگر کوئی آدمی مجھے عادی نہ بنائے کہ وہ میری طرف کوئی شے بھیجے مگر یہ کہ اس کا خیال میرے دل میں آئے اور میں کہوں: قریب ہے کہ وہ میری طرف کوئی شے بھیجے۔ تو آپ نے فرمایا: یہ اشراف ہے۔ پس اگر وہ تیرے پاس آئے اس کے بغیر کہ تو اس کا تصور کرے اور نہ ہی وہ تیرے دل میں کھٹکے تو یہ وہ شے ہے جس میں اشراف نہیں ہے۔

ابوعمر نے کہا ہے: لغت میں الاشراف سے مراد اس شے کی طرف سر اٹھانا ہے جو اس آدمی کے پاس ہو جس کی حرص ہو اور اس شے میں بھی حرص اور طمع ہو۔ اور یہ کہ وہ انسان کو خوش کرے اور یہ تعرض کرنے لگے۔ اور امام احمدؒ نے اشراف کی تاویل میں جو کچھ کہا ہے وہ تضییق اور تشدید ہے اور وہ میرے نزدیک بعید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے اس سے درگزر فرمائی ہے جو کچھ ان کے دلوں میں پیدا ہو، نہ زبان اس کے ساتھ بولے اور نہ ہی اعضاء اس کے مطابق عمل کریں۔ کفر کے سوا گناہوں میں سے دل جن کا اعتقاد رکھے وہ کوئی شے نہیں ہیں یہاں تک کہ وہ اس کے مطابق عمل کرے اور دل میں کھٹکنے والے خیال اور وہم سے بالاجماع درگزر کر لیا گیا ہے۔ (یعنی ان پر کوئی مواخذہ نہیں جب تک انہیں عملی جامہ نہ پہنایا جائے۔)

مسئلہ نمبر 8۔ کسی سے کچھ مانگنے میں اصرار کرنا اور اس سے مستغنی ہونے کے باوجود اس سے لپٹ جانا حرام ہے حلال نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کثرت مال کے باوجود لوگوں سے ان کے مالوں کے بارے سوال کیا تو وہ (آگ کے) انگارے مانگ رہا ہے چاہے وہ قلیل طلب کرے یا زیادہ مانگے۔'' اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6630، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

روایت کیا ہے اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی مسلسل (بھیک) مانگتا رہے گا یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے گا اور اس کے چہرے میں گوشت (☆) کا ٹکڑا تک نہ ہوگا۔'' اسے مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ (1)

مسئلہ نمبر 9۔ سائل جب محتاج ہو تو کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ تین بار تک عذر پیش کرتے ہوئے اور ڈراتے ہوئے اپنا سوال بار بار کرے۔ اور ایسا نہ کرنا افضل ہے اور اگر وہ آدمی جس سے سوال کیا گیا ہے وہ اس کے بارے جانتا ہو اور وہ اس پر قادر بھی ہو جو شے اس نے مانگی ہے تو اس پر اسے عطا کرنا واجب ہے اور اگر وہ اس کے بارے ناواقف ہو تو وہ اسے اس خوف سے دے دے کہ ہو سکتا ہے وہ اپنے سوال میں سچا ہو اور وہ اسے واپس لوٹانے میں کامیاب نہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 10۔ اور اگر وہ ایسی شے کا محتاج ہو جس کے ساتھ وہ سنت کو قائم کر سکتا ہے مثلاً ایسے کپڑے کے ساتھ آراستہ ہونا جسے وہ عید اور جمعہ (کی نمازوں) میں پہنتا ہو۔ تو ابن عربی نے ذکر کیا ہے: ''میں نے خلیفہ بغداد کی جامع مسجد میں ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ یہ تمہارا بھائی ہے جو تمہارے ساتھ جمعہ کی نماز میں حاضر ہوتا ہے اور اس کے پاس کپڑے نہیں ہیں جن کے ساتھ یہ جمعہ کی سنت کو قائم کر سکتا ہو۔ پس جب دوسرا جمعہ آیا تو میں نے اس پر دوسرا لباس دیکھا۔ تو مجھے بتایا گیا۔ ابوالطاہر البرسی نے اسے یہ لباس پہنایا ہے اور مدح و تعریف حاصل کی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

''جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں چھپ کر اور علانیہ تو ان کے لئے ان کا اجر ہے اپنے رب کے پاس اور نہ انہیں کچھ خوف ہے اور نہ غمگین ہوں گے۔''

اس میں ایک مسئلہ ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابوذر، حضرت ابوامامہ، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم، حضرت عبداللہ بن بشر غافقی اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ یہ آیت ان گھوڑوں کے چارے کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں باندھے گئے ہوں۔ اور ابن سعد نے طبقات میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے: مجھے محمد بن شعیب بن شابور سے خبر دی گئی ہے کہ انہوں نے کہا ہمیں سعید بن سنان نے یزید بن عبداللہ بن عریب عن ابیہ عن جدہ عریب کی سند سے خبر دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے پوچھا گیا: اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ

1۔ صحیح بخاری، باب من سأل الناس تکثرا، حدیث نمبر 1381، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ وہ قیامت کے دن ذلیل و خوار ہو کر آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی اور یہ بھی کہا گیا ہے یہ حدیث اپنے ظاہر پر ہی محمول ہے اسے اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے چہرہ میں فقط ہڈیاں ہوں گی گوشت نہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم اصحاب الخیل کہ ان سے مراد گھوڑوں والے ہیں۔

اور اسی اسناد کے ساتھ انہوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھوڑے پر خرچ کرنے والا صدقے کے ساتھ اپنا ہاتھ پھیلانے والے کی طرح ہے۔ (یعنی کثرت سے صدقہ دینے والے کی طرح ہے۔) کہ وہ اسے بند نہیں کرتا۔ ان کا پیشاب اور ان کی لید قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک کستوری کی پاکیزگی کی طرح ہوگی۔''

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ آیت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کے پاس چار دراہم تھے تو آپ نے ایک درہم رات کے وقت اور ایک درہم دن کے وقت، ایک درہم سرا اور ایک درہم جہراً صدقہ کر دیئے۔ اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے ہمیں عبدالوہاب بن مجاہد نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی خبر دی ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: یہ ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے اس طرح عمل کیا اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی اور آدمی کا نام ذکر نہیں کیا۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اسراف اور کنجوسی کے بغیر خرچ کرتے ہیں اور بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ کا معنی ہے فی اللیل والنہار (رات اور دن میں) اور فَلَهُمْ میں فا داخل ہے کیونکہ کلام میں جزا کا معنی ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور زید فمنطلق کہنا جائز نہیں ہے۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَوٰا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوٓا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَوٰا ۗ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَوٰا ۚ فَمَن جَآءَهُۥ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ فَانتَهَىٰ فَلَهُۥ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُۥٓ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ۝ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَوٰا وَيُرْبِي الصَّدَقَٰتِ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ۝ إِنَّ الَّذِينَ ءَامَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحَٰتِ وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا الزَّكَوٰةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَوٰٓا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝

''جو لوگ کھایا کرتے ہیں سود وہ نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ جسے پاگل بنا دیا ہو شیطان نے

چھوکر۔ یہ حالت اس لئے ہوگی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ سوداگری بھی سود کی مانند ہے حالانکہ حلال فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجارت کو اور حرام کیا سود کو۔ پس جس کے پاس آئی نصیحت اپنے رب کی طرف سے تو وہ (سود سے) رک گیا تو جائز ہے اس کے لئے جو گزر چکا اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اور جو شخص پھر سود کھانے لگے تو وہ لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ہر ناشکرے گنہگار کو۔ بےشک جو لوگ ایمان لائے اور کرتے رہے اچھے عمل اور صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز اور دیتے رہے زکوٰۃ کو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم (سچے دل سے) ایمان دار ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہیں (مل جائیں گے) اصل مال نہ تم ظلم کیا کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔''

تین آیات سود کے احکام، بیع کی عقود کے جواز اور اس کے لئے وعید کو متضمن ہیں جو کوئی سود کو حلال سمجھے اور اس پر عمل کرنے پر مصر ہو۔ اس میں اڑتیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا یہاں یَاْكُلُوْنَ بمعنی یاخذون ہے (یعنی وہ جو سود لیتے ہیں) اور اخذ (لینے) کو اکل (کھانے) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ سود کھانے کے لئے ہی لیا جاتا ہے اور ربا کا لغوی معنی مطلق زیادتی ہے۔ کہا جاتا ہے: ربا الشیء یربو۔ جب کوئی شے زیادہ ہوجائے اور اس معنی میں حدیث طیبہ بھی ہے: فلا واللہ ما اخذنا من لقمۃ الا ربا من تحتھا (قسم بخدا! ہم نے جو لقمہ بھی لیا تو وہ اپنے نیچے سے اور زیادہ ہوگیا) مراد وہ کھانا ہے جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔(1)

قیاس یہ ہے کہ یہ یاء کے ساتھ لکھا جائے کیونکہ اس کے اول میں کسرہ ہے، حالانکہ انہوں نے اسے قرآن کریم میں واؤ کے ساتھ لکھا ہے۔

پھر شریعت نے اس اطلاق میں تصرف کیا اور اسے بعض مواقع کے ساتھ محصور کر دیا۔ پس ایک بار اس کا اطلاق حرام کمائی پر کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کے بارے میں فرمایا: وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ (النساء: 161) (اور بوجہ اس کے سود لینے کے حالانکہ منع کئے گئے تھے اس سے) اور اس سے وہ شرعی ربا مراد نہیں لیا جس کے حرام ہونے کا ہم پر حکم لگایا، بلکہ اس سے حرام مال مراد لیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (المائدہ: 42) (قبول کرنے والے ہیں جھوٹ کو بڑے حرام خور ہیں) اس سے مراد مال حرام ہے رشوت وغیرہ۔ اور وہ جسے انہوں نے اُمِّیّٖن کے اموال میں سے حلال سمجھ لیا تھا جہاں انہوں نے کہا: لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ (العمران: 75) (کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت) اس بنا پر اس میں نہی ہر مال حرام کو شامل ہے جس طریقہ سے بھی مال کمایا جائے اور وہ ربا جس پر شرعی

1۔ صحیح بخاری، باب السمر مع الضیف والاھل، حدیث نمبر 567، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اصطلاح ہے وہ دو چیزیں ہیں: نَسَاء کو حرام قرار دینا اور عقود اور مطعومات میں تفاضل (زیادتی) جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے اور اس میں غالب وہی ہے جو عرب کرتے تھے، قرض دینے والے کے لئے ان کا یہ قول ہے: أتقضی ام تربی؟ (کیا تو ادا کرے گا یا تو اضافہ کرے گا) پس وہ (قرض دینے والا) مال کی تعداد میں اضافہ کر دیتا اور قرض لینے والا اس پر صبر کرتا اور یہ سب حرام کر دیا گیا ہے اس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اکثر وہ بیعیں جنہیں ممنوع قرار دیا گیا ہے ان میں ممنوع ہونے کی علت زیادتی کے معنی کا پایا جانا ہے یا تو عین مال میں زیادتی یا پھر (بائع اور مشتری میں سے) کسی ایک کے لئے تاخیر کے سبب منفعت میں زیادتی وغیرہ...... اور بیوع میں سے وہ جس میں زیادتی کا معنی نہ ہو، جیسا کہ پھل کی بیع کرنا اس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اور اسی طرح وہ بیع جو جمعہ کے دن اذان کے وقت ہو، اگر ان کے کرنے والے کو کہا جائے، سود کھانے والا تو یہ مجازاً اور تشبیہاً ہوگا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم شریف کے ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سونے کی بیع سونے کے عوض، چاندی کی بیع چاندی کے عوض، گندم کی بیع گندم کے عوض، جو کی بیع جو کے عوض، کھجور کی بیع کھجور کے عوض اور نمک کی بیع نمک کے عوض برابر برابر اور ہاتھوں ہاتھ ہے۔ پس جس نے زیادتی کی یا زیادتی کا مطالبہ کیا تو اس نے سود لیا لینے اور دینے والا اس میں برابر ہیں۔''

اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''جب یہ اصناف مختلف ہوں تو پھر ان کی بیع کرو جیسے تم چاہو بشرطیکہ دست بدست ہو۔'' اور ابو داؤد نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سونے کی بیع سونے کے عوض اس کی پتریاں ہوں اور اس کا عین ہو، چاندی کی بیع چاندی کے عوض اس کی پتریاں ہوں اور اس کا عین ہو، گندم کی بیع گندم کے عوض (یعنی) مد کی بیع مد کے عوض، جو کی بیع جو کے عوض (یعنی) مد کی بیع مد کے عوض، کھجور کی بیع کھجور کے عوض (یعنی) مد کے بدلے مد اور نمک کی بیع نمک کے عوض (یعنی) مد کے بدلے مد۔ پس جس نے زیادہ دیا یا زیادتی کا طالب ہوا تحقیق اس نے سود لیا اور سونے کو چاندی کے عوض بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ ان میں سے چاندی کی مقدار زیادہ ہو درآنحالیکہ بیع دست بدست ہو اور رہی نسیئہ (ادھار) تو یہ جائز نہیں ہے اور گندم جو کے عوض بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جو ان دونوں میں زیادہ ہوں درآنحالیکہ بیع دست بدست ہو اور رہی ادھار تو یہ جائز نہیں (1)۔'' علماء نے اس سنت کے تقاضا کے مطابق قول پر اجماع کیا ہے اور اسی طریقہ پر مسلمان فقہاء کی جماعت ہے مگر گندم اور جو میں، کیونکہ امام مالک نے ان دونوں کو ایک صنف قرار دیا ہے۔ پس ان دونوں میں سے دو کی بیع ایک کے عوض جائز نہیں ہے۔ اور یہی قول لیث، اوزاعی اور مدینہ اور شام کے عظیم علماء کا ہے۔ اور امام مالک نے ان دونوں کی طرف السلت (جو کی ایک قسم جس پر چھلکا نہیں ہوتا) کی اضافت کی ہے اور لیث نے کہا ہے: السلت (جو)، باجرہ اور مکئی یہ ایک ہی صنف ہے اور ابن وہب نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب حدیث طیبہ ثابت ہے تو اس کے ساتھ کسی قول کی کوئی حیثیت نہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الصرف، حدیث نمبر 2907، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والسلام نے فرمایا ہے: ”جب یہ اصناف مختلف ہوں تو تم جیسے چاہو انہیں بیچو بشرطیکہ بیع دست بدست ہو“ اور آپ کا یہ ارشاد بھی ہے: ”کہ گندم کی بیع گندم کے عوض اور جو کی بیع جو کے عوض“ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ دونوں دو مختلف قسمیں ہیں جیسا کہ گندم اور کھجور مختلف ہیں کیونکہ دونوں کی صفات مختلف ہیں اور دونوں کے نام بھی مختلف ہیں۔ اور اگانے والے اور کاٹنے والے کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ شریعت نے اس کا اعتبار نہیں کیا، بلکہ جدائی اور فرق بالکل واضح اور بین ہے اور امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ثوری اور اصحاب حدیث کا یہی مذہب ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ یہ موقف اختیار کرتے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے نہی اور تحریم ڈھلے ہوئے دینار اور ڈھلے ہوئے درہم کے بارے میں وارد ہے نہ کہ سونے کی پتریوں اور ڈھالی گئی چاندی کے بارے میں اور نہ ہی اس کے بارے میں جو ڈھلی ہوئی (چاندی) سے شے بنائی گئی ہو۔ اور کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نہی صرف اس کے بارے میں ہے جو اس سے خاص نمونہ پر تیار کی گئی ہو۔ یہاں تک کہ ان کی ملاقات حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوگئی، جسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے، بیان فرمایا: ہم جہاد میں شریک ہوئے اور لوگوں پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حکمران تھے۔ پس ہم نے بہت زیادہ مال غنیمت اکٹھا کیا اور ہمارے اس مال غنیمت میں چاندی کے برتن بھی تھے۔ تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو لوگوں کے عطیات میں انہیں بیچ ڈالنے کا حکم دیا۔ تو اس بارے میں لوگوں کے مابین تنازع شروع ہوگیا۔ پس اس کی اطلاع حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، آپ کھڑے ہوئے اور فرمایا: بلاشبہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، گندم گندم کے عوض، جو جو کے عوض، کھجور کھجور کے عوض اور نمک نمک کے عوض بیچنے سے منع کرتے ہوئے سنا ہے مگر (اس صورت میں کہ وہ) برابر برابر ہو اور عین کے عوض عین ہو۔ جس نے زیادہ کیا یا زیادتی کا طالب ہوا تو تحقیق اس نے سود لیا۔ پس لوگوں نے جو لیا تھا وہ واپس لوٹا دیا...... پس یہ خبر جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا: خبردار! سنو کیا حال ہے ان لوگوں کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احادیث بیان کرتے ہیں حالانکہ ہم آپ کے پاس حاضر رہتے تھے اور آپ کی صحبت و معیت میں رہتے تھے اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسی احادیث نہیں سنیں، تو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور دوبارہ وہی حدیث بیان فرمائی۔ پھر فرمایا: ہم ضرور بہ ضرور اس کے بارے حدیث بیان کریں گے جو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہے، اگرچہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اسے ناپسند کریں ...... مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں نے سیاہ رات میں آپ کے لشکر میں آپ کی صحبت اختیار نہیں کی۔ حماد نے یہی یا اسی طرح کہا ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: یہ بھی روایت ہے کہ یہ قصہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں کا آپ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو لیکن عرف میں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث محفوظ رہی۔ اور یہی وہ اصل ہے جس پر علماء نے ربا کے باب میں اعتماد اور بھروسہ کیا ہے اور انہوں نے اس بارے میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فعل کے جائز نہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں کیا ہے اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ معاملہ حضرت امیر معاویہ

رضی اللہ عنہ پر مخفی رہا ہو حالانکہ حضرت ابوالدرداء اور حضرت عبادہ رضی اللہ عنہما دونوں نے اسے جان لیا ہو کیونکہ یہ دونوں فقہاء اور کبار صحابہ کرام میں سے جلیل القدر صحابی ہیں، کبھی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر کوئی ایسی شے مخفی رہی جو ان کے سوا دوسرے صحابہ کرام سے پالی گئی جو درجہ اور رتبہ میں ان سے کم ہیں۔ پس حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی دوسرے ہیں...... اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا مذہب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مذہب کی طرح ہو۔ اس کے باوجود کہ وہ علم کا سمندر تھے وہ ایک درہم کی بیع دو درہم کے ساتھ کرنے میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے یہاں تک کہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے انہیں اس سے پھیر دیا۔ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اسی طرح ہے اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں پیش آیا۔ قبیصہ بن ذؤیب نے کہا ہے: بے شک حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کسی شے سے منع کیا تو انہوں نے کہا: میں تجھے اس زمین پر نہیں رہنے دوں گا جہاں تو رہ رہا ہے تو وہ مدینہ میں داخل ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: کون سی شے تجھے لے آئی ہے؟ تو انہوں نے آپ کو سارا واقعہ بیان کر دیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو اپنی جگہ کی طرف لوٹ جا، اللہ تعالیٰ اس زمین کو فاسد کرے جس میں تم اور تمہاری مثل لوگ نہ ہوں! اور ساتھ ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف لکھ دیا لا امارۃ لك علیہ (تجھے اس پر کوئی ولایت حاصل نہیں ہے۔)

مسئلہ نمبر 5۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دینار دینار کے عوض ہے اور درہم درہم کے عوض ہے ان کے درمیان کوئی فضل اور زیادتی نہیں ہے جسے چاندی کی حاجت ہو اسے چاہیے کہ وہ اسے سونے کے عوض بدل لے اور اگر سونے کی ضرورت ہو تو پھر اسے چاہیے کہ وہ چاندی کے عوض اسے بدل لے دست بدست (یعنی ایک ہاتھ سے لے اور دوسرے سے دے)

علماء نے بیان کیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی: الدینار بالدینار والدرھم بالدرھم لا فضل بینھما یہ اس اصل کی جنس کی طرف اشارہ ہے جو ڈھلی ہوئی ہو۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: الفضۃ بالفضۃ والذھب بالذھب الحدیث۔ چاندی چاہے سفید ہو یا سیاہ اور سونا سرخ ہو یا زردکسی کی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بیع جائز نہیں ہوتی مگر یہ کہ دونوں ہم مثل ہوں اور ہر حال میں برابر ہوں۔ اسی پر علماء کی ایک جماعت ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اور حضرت امام مالک سے فلوس کے بارے میں روایت مختلف ہے۔ سو آپ نے انہیں دراہم کے ساتھ ملحق کیا ہے اس حیثیت سے کہ یہ اشیاء کے ثمن ہیں اور ایک بار انہیں ان کے ساتھ ملانے سے منع بھی کیا ہے اس اعتبار سے کہ یہ ہر شہر میں ثمن نہیں ہیں بلکہ بعض شہران کے ساتھ مختص ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے اصحاب سے مروی ہے۔ ان میں سے بعض اسے امام مالک سے تاجر کے بارے میں روایت کرتے ہیں درآنحالیکہ خروج (گھر سے نکلنا) اسے دھوکہ دے رہا ہو۔ اور اس کے سبب اسے ڈھالے گئے دراہم یا دنانیر کی حاجت پڑ جائے۔ پس وہ اپنی چاندی یا اپنا سونا لے کر ٹکسال میں آتا ہے اور ڈھالنے والے کو کہتا ہے، میری یہ چاندی یا یہ سونا تو لے لے اور اپنی محنت بھی لے لے اور تو مجھے میرے سونے کے بدلے

ڈھلے ہوئے دنانیر یا میری اس چاندی کے بدلے ڈھلے ہوئے دراہم مجھے دے دے۔ کیونکہ مجھے خروج کے وقت دھوکا دیا گیا ہے اور مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے چھوڑ دے گا جس کے ساتھ میں نکلا ہوں۔ تو ضرورت کے تحت اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے اور بعض لوگوں نے اس کے مطابق عمل کیا ہے۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی قبس میں امام مالک سے تاجر کے سوا دوسروں کے بارے میں بھی اسے بیان کیا ہے کہ امام مالک نے اس میں تخفیف فرمائی ہے...... اور یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی وہ چاندی بیچے جس کا وزن ایک سو پانچ درہم تھا اور وہ اس کے بدلے اسے سو درہم دے اور یہ خالص ربا ہے۔ اور جس نے اس کے جواز کو ثابت کیا ہے کہ اگر وہ اسے اس طرح کہے: یہ چاندی مجھے ڈھال دے اور اس پر تو اس سے اجرت کاٹ لے۔ پس جب وہ اسے ڈھال لے اور یہ اسے اس سے لے لے اور یہ اسے اس کی اجرت ادا کر دے۔ پس جو امام مالک نے پہلے کہا ہے وہ وہی ہے جو آخر میں ہوگا۔ امام مالک نے مال کی طرف دیکھا ہے اور اس پر حال کا حکم مرتب کیا ہے اور تمام فقہاء نے اس کا انکار کیا ہے، ابن عربی نے کہا ہے: اس میں امام مالک کی حجت واضح ہے۔

ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہ عین ربا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول سے حرام کیا ہے: **مَنْ زاد او ازداد فقد اربی** (جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا تحقیق اس نے سود لیا)

ابن وہب نے اس مسئلہ میں امام مالکؒ کا رد کیا ہے اور اس کا انکار کیا ہے۔

اور علامہ ابہری نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ تجارت کے فروغ کے لئے نرم رویہ اپنایا گیا ہے تاکہ تجارتی منڈی ختم ہی نہ ہو جائے اور ربا (سود) نہیں ہے مگر اس پر جو اس سے زیادہ لینے کا ارادہ کرے جو اس کا قصد کرتا ہو اور اسے چاہتا ہو۔ اور ابہری بھول گئے اس کی اصل سد ذرائع میں ہے اور ان کا قول اس آدمی کے بارے میں ہے جس نے کپڑا ادھار بیچا اور وہ اسے خریدنے کی نیت اور ارادہ نہ رکھتا ہو پھر وہ اسے بازار میں پاتا ہے کہ اسے بیچا جا رہا ہے۔ بے شک اس کے لئے اس سے کم قیمت کے ساتھ اسے خریدنا جائز نہیں ہے جتنے کے ساتھ اس نے اسے بیچا تھا، اگرچہ وہ اس کا قصد نہ بھی کرے اور نہ اسے چاہے اور اس کی کثیر مثالیں ہیں۔ اور اگر ربا نہیں ہے مگر اسی پر جو اس کا قصد کرے تو پھر (ہر شے) فقہاء پر ہی حرام کی گئی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ہمارے بازار میں کوئی تجارت نہیں کرے گا مگر وہی جو اس کی خوب سمجھ بوجھ رکھتا ہو ورنہ وہ ربا کھائے گا۔ یہ اس کے لئے بالکل واضح ہے جسے انصاف عطا کیا گیا اور اسے رشد وہدایت عطا فرمائی گئی۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مالکؒ نے زیادتی (لینے دینے) سے روکنے میں انتہائی مبالغہ کیا ہے یہاں تک کہ انہوں نے متوھم (موھومہ) کو متحقق (ثابت شدہ) کی مثل قرار دیا ہے۔ سو آپ نے ایک دینار اور ایک درہم کی بیع ایک دینار اور ایک درہم کے بدلے کرنے سے منع کیا ہے۔ یہ سد ذرائع کے لئے اور تو ہمات کی جڑ کاٹنے کے لئے کیا ہے کیونکہ اگر زیادتی کا وہم نہ ہوتا تو وہ آپس میں تبادلہ نہ کرتے اور تقسیم کے وقت مماثلت متعذر ہونے کو اس منع کی علت قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس سے سونے اور چاندی کا تبادلہ سونے کے عوض لازم آتا ہے اور اس سے زیادہ واضح یہ ہے کہ انہوں نے تفاضل معنوی سے بھی منع

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل الصلوۃ علی النبی، حدیث نمبر 449، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اس سے منع کیا ہے کہ کوئی اعلیٰ اور عمدہ سونے کے ایک دینار اور گھٹیا سونے کے ایک دینار کی بیع اعلیٰ کے مقابلہ میں کرے اور گھٹیا پن کو لغو قرار دے۔ اور یہ آپ کی دقت نظر کی علامت ہے۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ آپ سے وہ روایت منکر ہے اور وہ صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 7۔ خطابی نے کہا ہے: تبر سے مراد سونے اور چاندی کا وہ ٹکڑا ہے جسے ابھی تک ڈھالا نہ گیا ہو اور نہ ہی اس سے دراہم یا دنانیر بنائے گئے ہوں۔ اس کی واحد تِبْرَۃٌ ہے۔ اور العین سے مراد وہ ہے جس سے دراہم یا دنانیر بنا لئے گئے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے کہ ایک مثقال عین سونا بیچا جائے مثقال اور ایسی پتریوں کے ساتھ جو ڈھلی ہوئی نہ ہوں۔ اور اسی طرح مضروب چاندی اور غیر مضروب چاندی کے درمیان تفاوت کو بھی حرام قرار دیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد تِبْرُھا و عَیْنُھا سواء کا یہی معنی ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کھجور کی بیع کھجور سے کرنا جائز نہیں ہوتی مگر برابر برابر۔ اور انہوں نے ایک کھجور کی بیع دو کھجوروں کے ساتھ کرنے میں اور گندم کے ایک حبہ (دانہ یا دو جو کے برابر وزن) کی بیع دو جوؤں کے ساتھ کرنے میں اختلاف کیا ہے۔ اور امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے اس سے منع کیا ہے۔ یہی امام مالک کے قول کا قیاس ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ وہ شے جس میں ربا جاری ہوتا ہے اس کی کثیر مقدار میں تفاضل کے سبب تو قیاساً اور نظراً اس کی قلیل مقدار بھی اس میں داخل ہے۔ اور جنہوں نے اس بیع کو جائز قرار دیا ہے انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ ایک یا دو کھجوریں ضائع کرنے والے پر قیمت واجب نہیں ہوتی، فرمایا: کیونکہ اس کا کوئی ماپ اور وزن نہیں ہے لہٰذا اس میں تفاضل (زیادتی) جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ تو جان! اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے کہ اس باب کے مسائل کثیر ہیں اور اس کی فروع پھیلی ہوئی ہیں، وہ شے جو تیرے لئے مضبوط ہو وہ یہ ہے کہ تو ربا کی اس علت میں غور و فکر کرے جس کا علماء میں سے ہر ایک نے اعتبار کیا ہے۔ پس امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کی علت جنس کے اعتبار سے کیلی یا وزنی ہونا ہے۔ پس ہر وہ شے جس میں کیل یا وزن داخل ہوگا آپ کے نزدیک وہ ایک جنس میں سے ہے اور اس کے بعض کی بعض کے ساتھ متفاضلاً یا نسیئاً بیع کرنا جائز نہ ہوگا۔ پس آپ نے مٹی کی مٹی کے ساتھ بیع متفاضل سے منع کیا ہے، کیونکہ اس میں کیل داخل ہوتا ہے اور ایک روٹی کی بیع دو روٹیوں کے ساتھ کرنے کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ آپ کے نزدیک یہ اس کیل میں داخل نہیں ہیں جو اس کی اصل ہے۔ پس یہ اس جنس سے خارج ہوگئی جس میں ربا داخل ہوتا ہے۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: اس کی علت جنس کے اعتبار سے اس شے کا مطعوم (وہ شے جو کھائی جائے) ہونا ہے۔ یہ آپ کا جدید قول ہے۔ پس آپ کے نزدیک آٹے کی بیع روٹی کے ساتھ کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی روٹی کی بیع روٹی کے ساتھ کرنا جائز ہے نہ متفاضلاً اور نہ نسیئاً، چاہے روٹی خمیری ہو یا تازہ ہو۔ اور آپ کے نزدیک ایک انڈے کی بیع دو انڈوں سے کرنا جائز نہیں ہے، ایک انار کی بیع دو اناروں سے کرنا جائز نہیں ہے، ایک تربوز کی بیع دو تربوزوں سے کرنا جائز نہیں ہے نہ

دست بدست اور نہ ہی ادھار کیونکہ یہ سب کھایا جانے والا طعام ہے۔

اور آپ نے اپنے پرانے قول میں کہا ہے کہ اس کی علت کیلی یا وزنی ہونا ہے۔

اور اس بارے میں ہمارے اصحاب مالکیہ کی عبارات مختلف ہیں اور ان میں سے جو سب سے اچھی اور حسین ہے وہ یہ ہے کہ وہ شے ایسی جنس سے ہو جو خوراک بن سکتی ہو اور اغلباً زندگی گزارنے کے لئے ذخیرہ کی جاسکتی ہو۔ جیسا کہ گندم، جو، کھجور اور نمک جن پر نص بیان کی گئی ہے اور وہ چیزیں جو ان کے معنی میں ہیں جیسا کہ چاول، مکئی، باجرہ اور تل اور وہ دانے جو ہانڈی میں پکائے جاتے ہیں مثلاً لوبیا، دالیں، سیم اور چنے وغیرہ۔ اور اسی طرح گوشت، دودھ، سرکہ اور تیل وغیرہ۔ اور پھل مثلاً انگور، کشمش اور زیتون وغیرہ اور انجیر میں اختلاف کیا گیا ہے اور شہد اور شکر اس کے ساتھ ملحق کئے جاتے ہیں۔ پس یہ تمام وہ چیزیں ہیں جن میں نساء کی جہت سے ربا داخل ہوتا ہے اور ان میں تفاضل جائز ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے: ''جب یہ اصناف مختلف ہوں تو تم جیسے چاہو ان کی بیع کرو بشرطیکہ وہ دست بدست ہو۔'' اور ان تازہ پھلوں میں ربا نہیں ہے جو باقی نہیں رہتے مثلاً سیب، تربوز، انار، ناشپاتی، ککڑی، کھیرا، بینگن اور اس کے علاوہ دیگر سبزیاں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: انڈے کی بیع انڈے کے ساتھ متفاضلاً جائز نہیں ہوتی، کیونکہ یہ ان میں سے ہیں جو ذخیرہ کئے جاسکتے ہیں اور ان کے نزدیک برابر برابر بیع جائز ہوتی ہے۔

اور محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم نے کہا ہے: ایک انڈے کی بیع دو انڈوں سے اور زیادہ سے کرنا بھی جائز ہے کیونکہ یہ ان چیزوں میں سے ہیں جو ذخیرہ نہیں کی جاسکتیں۔ اور یہی امام اوزاعی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 10 ۔ الرِّبَا کے لفظ میں علماء نحو نے اختلاف کیا ہے۔ بصریوں نے کہا ہے یہ واوی الفاظ میں سے ہے کیونکہ تو اس کے تثنیہ میں کہتا ہے: رِبَوان۔ سیبویہ نے یہی کہا ہے اور کوفیوں نے کہا ہے: یہ یا کے ساتھ لکھا جائے گا اور اس کا تثنیہ یا کے ساتھ ہے، کیونکہ اس کے اول میں کسرہ ہے۔

زجاج نے کہا ہے: میں نے کوئی خطا نہیں دیکھی جو اس سے زیادہ قبیح اور زیادہ شنیع ہو اور لکھنے میں خطا نہیں کافی نہ ہوتی یہاں تک کہ انہوں نے تثنیہ میں غلطی کی، حالانکہ وہ یہ پڑھتے ہیں: وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَاۡ فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ۔ محمد بن یزید نے کہا ہے: مصحف میں الرِّبَا واؤ کے ساتھ لکھا گیا ہے تاکہ اس کے درمیان اور زنا کے درمیان فرق ہو جائے۔ رِبَا واؤ کے ساتھ لکھنا اولیٰ ہے کیونکہ یہ ربا یربو سے ہے۔

مسئلہ نمبر 11 ۔ قولہ تعالیٰ: لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔ یہ جملہ مبتدا کی خبر ہے اور وہ اَلَّذِیْنَ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ وہ اپنی قبروں سے نہیں اٹھیں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔ حضرت ابن عباس، حضرت مجاہد، حضرت ابن جبیر، قتادہ، ربیع، ضحاک، سدی اور ابن زید رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کے ساتھ شیطان رکھا جائے گا وہ اس کا گلا دباتا رہے گا۔ اور تمام نے کہا ہے: اسے بطور سزا

اور تمام اہل محشر کے نزدیک ناپسندیدہ قرار دینے کے لئے مجنون کی طرح اٹھایا جائے گا۔ اور اس تاویل کو جس پر اجماع کیا گیا ہے یہ بات قوی اور پختہ کرتی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے: لا یقومون یوم القیامۃ الا کما یقوم (کہ قیامت کے دن وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے۔)

ابن عطیہ نے کہا ہے: جہاں تک آیت کے الفاظ کا تعلق ہے وہ دنیوی تجارت کی طرف انتہائی حرص و لالچ کے ساتھ کھڑے ہونے والے کی حالت کو پاگل کے کھڑے ہونے کے ساتھ تشبیہ دینے کا احتمال رکھتے ہیں کیونکہ طمع اور رغبت اسے مضطرب کر دیتی ہے یہاں تک کہ اس کے اعضاء مضطرب ہو جاتے ہیں اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ تو تیز رفتار چلنے والے کے بارے کہتا ہے کہ وہ اپنی حرکات کی ہیئت میں پاگل لگتا ہے یا تو گھبراہٹ کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے اسے پاگل کہا گیا ہے اور اعشیٰ نے اپنی ناقہ کو اپنے اس قول میں اس کی چستی اور تیزی میں جنون کے ساتھ تشبیہ دی ہے:

و تُصبِح عن غِبِّ السُّرَی و کانما أَلَمَّ بها من طائِفِ الجِنّ أولَقُ

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

لَعَمْرُكَ بی من حُبّ أسماءَ أَوْلَقُ

لیکن وہ جس کے مطابق حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے اس کے مطابق مفسرین کے اقوال ظاہر ہیں۔ وہ اس تاویل کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔

اور یَتَخَبَّطُهُ یہ یتفعله کے وزن پر خبَط یخبِط سے ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں تملکه و تَعبّدَه۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سود کھانے والوں کے لئے علامت قرار دیا ہے اور وہ یہ کہ وہ اسے ان کے پیٹوں میں بڑھا دے گا اور انہیں خوب بوجھل کر دے گا، پس وہ جب اپنی قبروں سے نکلیں گے تو وہ کھڑے ہوں گے اور گر پڑیں گے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے۔ بے شک انہیں قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ ان کے پیٹ حاملہ عورتوں کی طرح پھولے ہوئے ہوں گے اور جب بھی وہ اٹھیں گے تو گر جائیں گے اور لوگ ان کے اوپر چلتے رہیں گے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے بلاشبہ یہ ان کی علامت اور نشانی ہوگی اس سے وہ قیامت کے دن پہچانے جائیں گے پھر عذاب اس کے پیچھے ہوگا۔ جیسا کہ کینہ رکھنے والا قیامت کے دن اس شے کی شہرت کے ساتھ آئے گا جس کے ساتھ اس نے کینہ رکھا اس کے ساتھ اسے مشہور کیا جائے گا پھر اس کے پیچھے اسے عذاب دیا جائے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یَأْكُلُوْنَ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سود کھاتے ہیں اور اس کا کاروبار کرتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اَکل (کھانے) کا ذکر کیا ہے اس لئے کہ انسان کا مال میں سب سے قوی مقصد یہی ہوتا ہے۔ اور اس لئے کہ یہ انتہائی رغبت اور حرص پر دلالت کرتا ہے۔ الجشع کا معنی شدید حرص ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل جشع بیّن الجَشَع و قوم جشعون (یعنی انتہائی شدید حرص رکھنے والا آدمی اور قوم) المجمل میں یہی ہے۔ اور کسب (کمائی) کے توابع میں سے اس بعض کو کل کسب کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ پس لباس، رہائش، ذخیرہ اور اہل و عیال پر خرچ کرنا سب اس ارشاد میں داخل

ہے۔ اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ

مسئلہ نمبر 12۔ اس آیت میں ان کے انکار کے فاسد ہونے پر دلیل ہے جنہوں نے جن کی جانب سے گرا دینے کا انکار کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ یہ طبائع کے فعل میں سے ہے اور یہ کہ شیطان نہ انسان میں چل سکتا ہے اور نہ اس کی جانب سے چھوا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں پہلے ان کا رد گزر چکا ہے۔

نسائی نے ابوالیسر سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا ہے: رسول اللہ ﷺ اس طرح دعا مانگتے تھے: اللھم انی اعوذبك من التردی والھدم والغرق والحریق واعوذبك ان یتخبطنی الشیطان عند الموت وأعوذبك أن اموت فی سبیلك مُدبِرا وأعوذبك أن اموت لدیغا (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں (کنویں میں) گرنے سے اور (اس سے کہ مجھ پر کوئی عمارت) گر پڑے اور (پانی میں) غرق ہونے سے اور (آگ میں) جلنے سے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ شیطان موت کے وقت مجھے پاگل بنا دے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں تیرے راستے میں (میدان جہاد سے) پیٹھ پھیرتے ہوئے مروں اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ مجھے کسی شے کے ڈسنے سے موت آئے۔)

اور محمد بن مثنی کی حدیث سے مروی ہے کہ ابوداؤد نے ہمام سے انہوں نے حضرت قتادہ سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ دعا مانگتے تھے: اللّٰھم انی اعوذبك من الجنون والجذام والبرص وسیّئ الاسقام (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں جنون سے، جذام سے، برص سے اور بیماریوں کی شدت اور تلخی سے)

اور مس کا معنی جنون ہے۔ کہا جاتا ہے مُسَّ الرجل وأُلِسَ، فَهُوَ ممسوس و مألوس جب وہ آدمی مجنون ہو، اور یہ آخرت میں ربا کی علامت ہوگی۔ اور حدیث اسراء میں روایت کیا گیا ہے۔ ''جبرائیل امین علیہ السلام مجھے لے کر چلے تو میں بہت سے لوگوں کے پاس سے گزرا ان میں سے ہر آدمی کا پیٹ بہت بڑے گھر کی مثل ہے درآنحالیکہ وہ آل فرعون کے راستے پر پڑے ہوئے ہیں۔ اور آل فرعون کو صبح و شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے پس وہ شدید پیاسے اونٹوں کی مثل آتے ہیں وہ پتھروں اور درختوں سے ٹکراتے ہیں نہ وہ کچھ سنتے ہیں اور نہ عقل رکھتے ہیں پس جب ان بڑے پیٹوں والوں نے انہیں محسوس کیا تو وہ کھڑے ہوئے اور ان کے پیٹ ان پر غالب آ گئے اور وہ گرنے لگے پھر ان میں سے کوئی کھڑا ہوتا تو وہ اس کا پیٹ اس پر بھاری ہو جاتا اور وہ گر پڑتا۔ پس وہ واضح استطاعت اور قدرت نہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ آل فرعون نے انہیں ڈھانپ لیا اور وہ انہیں آتے جاتے ہوئے روندنے لگے۔ پس دنیا اور آخرت کے درمیان برزخ میں یہی ان کا عذاب ہے۔ اور آل فرعون کہتے ہیں اے اللہ! کبھی قیامت قائم نہ کر، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَیَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ ۟ اَدۡخِلُوۡۤا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ ۞ (الغافر) (اور جس روز قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا) داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں) میں نے پوچھا...... اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ تو اس نے کہا: ''یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔'' اور مس سے مراد جنون ہے اور اسی سے اَوۡلَق، اَلۡس اور الزّود کے الفاظ بھی اسی معنی میں ہیں۔

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا تمام متاولین کے نزدیک اس کا معنی ہے کہ یہ کفار کے بارے میں ہے اور ان کو کہا گیا ہے: فَلَهٗ مَا سَلَفَ (تو جائز ہے اس کے لئے جو گزر چکا ہے) اور کسی گنہگار مومن کو یہ نہیں کہا جاتا، بلکہ اس کی بیع ٹوٹ جاتی ہے اور اس کا فعل رد کر دیا جاتا ہے اگرچہ وہ ناواقف ہو۔ سو اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ عمل عملا لیس علیه امرُنا فهو رَدٌّ (جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کے بارے ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ کام مردود ہے) لیکن نافرمان اور معصیت کا ارتکاب کرنے والے اس آیت کی وعید سے ایک طرف ہو کر سود لیتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا یعنی بے شک قرض کی مدت پوری ہونے کے بعد آخر میں زیادتی اسی طرح ہے جس طرح عقد کی ابتدا میں اصلی ثمن تھے۔ اور عربوں میں صرف یہی ربا معروف تھا۔ پس جب ان کے قرض کی ادائیگی کا وقت آ پہنچتا تو وہ مقروض کو کہتے: کیا تو پورا ادا کرے گا یا اسے بڑھائے گا۔ یعنی قرض میں اضافہ کرے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے اور اپنے اس قول حق کے ساتھ ان کے قول کو رد کر دیا ہے: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا اور واضح کر دیا ہے جب مدت گزر جائے اور اس کے پاس ادائیگی کے لئے کچھ نہ ہو تو اسے آسانی اور خوشحالی آنے تک مہلت دی جائے اور یہی وہ ربا ہے جسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نویں ذی الحجہ کے دن اپنے قول کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ جب آپ نے فرمایا: ”خبردار! سنو بلاشبہ تمام سود ختم کر دیا گیا ہے اور وہ پہلا سود جسے میں ختم کر رہا ہوں وہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا سود ہے وہ سارے کا سارا ختم کر دیا گیا ہے۔“ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے اور لوگوں میں سے خاص ترین آدمی سے اس کا آغاز کیا۔ اور یہی امام وقت کے عدل کے طریقوں میں سے ہے کہ وہ عدل کو اپنی ذات پر اور اپنے خواص پر نافذ کرتا ہے اور پھر وہ تمام لوگوں میں پھیل جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا یہ قرآن کریم کے عمومات میں سے ہے۔ اور اس پر الف لام جنس کیلئے ہے، عہد کے لئے نہیں ہے، کیونکہ اس سے پہلے بیع کا ذکر نہیں ہوا جس کی طرف رجوع کیا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ (قسم ہے زمانے کی بے شک انسان خسارے میں ہے) پھر استثنیٰ فرمائی: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے) (اس میں الانسان پر الف لام جنسی ہے) اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ بیع عام ہے تو پھر اسے اس کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے جس ربا وغیرہ کا ذکر ہم نے کر دیا ہے کہ اس سے منع کر دیا گیا ہے اور ان کا عقد کرنے سے روکا گیا ہے، جیسا کہ خمر، مردار اور کسی حاملہ جانور کا حمل وغیرہ ذالک اور اس بارے میں یہی سنت ہے اور اجماع امت سے ثابت ہے اور اس کی نظیر یہ بھی ہے: اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ۔

اور وہ تمام کے تمام ظواہر جو عمومات کا تقاضا کرتے ہیں اور ان میں تخصیص داخل ہو سکتی ہے اور یہ اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔

اور بعض نے کہا ہے یہ قرآن کریم کی وہ مجمل آیت ہے جس کی تفسیر بیع کی اس قسم کے ساتھ کی گئی ہے جو حلال کی گئی ہے اور اس کے ساتھ جو حرام کی گئی ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے بیع کو حلال کرنے اور اسے حرام کرنے کے بارے میں استعمال کیا جائے مگر تب جب اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں سے کوئی بیان مقترن ہو...... اگرچہ یہ تفصیل کے بغیر فی الجملہ

بیوع کی اباحت پر دال ہے اور یہ عموم اور مجمل کے درمیان فرق ہے۔ پس عموم فی الجملہ اور تفصیل کے ساتھ بیوع کی اباحت پر دلالت کرتا ہے جب تک وہ کسی دلیل کے ساتھ مخصوص نہ ہو۔ اور مجمل ان کی اباحت پر تفصیل سے دلالت نہیں کرتا یہاں تک کہ اس کے ساتھ بیان مقترن ہو۔ اور پہلا زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 16۔ البیع لغت میں مصدر ہے باع کذا بکذا۔ یعنی اس نے عوض دیا اور معوض لیا۔ اور یہ بائع (بیچنے والا) کا تقاضا کرتی ہے اور وہ مالک ہوتا ہے یا اس کا نائب ہوتا ہے اور بیع مشتری (خریدار) کا تقاضا کرتی ہے اور یہ وہ ہے جو ثمن ادا کرتا ہے۔ اور مبیع کا تقاضا کرتا ہے۔ اور مبیع وہ شے ہوتی ہے جس کے ثمن لگائے جائیں یعنی جس کے مقابلے میں ثمن دیئے جاتے ہیں۔ اور اس بنا پر بیع کے چار ارکان ہوئے۔ بائع (بیچنے والا) مشتری (خریدار) ثمن (قیمت) اور مثمن (مبیع وہ شے جو بیچی جا رہی ہو) پھر عربوں کے نزدیک معاوضہ اپنے مضاف الیہ کے اختلاف کے سبب مختلف ہوتا رہتا ہے۔ پس اگر معاوضہ رقبہ یعنی ذات کے مقابلہ میں ہو تو اسے بیع کا نام دیا گیا ہے اور اگر رقبہ کی منفعت کے مقابلہ میں ہو تو اگر وہ منفعت بضع ہو تو اسے نکاح کا نام دیا گیا ہے اور اگر اس کے سوا کسی اور منفعت کے مقابلہ میں ہو تو اس کا نام اجارہ ہے اور عین (دراہم و دنانیر) کی بیع عین کے عوض ہو تو وہ بیع النقد ہے اور وہی بیع الصرف ہے اور اگر بیع دین موجل کے ساتھ ہو تو وہ بیع سلم ہے۔ اس کا بیان آگے آیۃ الدین میں آئے گا۔ اور بیع الصرف کا حکم گزر چکا ہے اور اجارہ کا حکم سورۃ القصص میں آئے گا اور نکاح میں مہر کا حکم سورۃ النساء میں آئے گا ہر ایک کا ذکر اپنے اپنے محل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 17۔ بیع قبول اور ایجاب (کا نام) ہے یہ مستقبل اور ماضی کے الفاظ کے ساتھ منعقد ہوتی ہے۔ اس میں ماضی حقیقۃً ہوتی ہے اور مستقبل کنایۃً ہوتا ہے اور یہ ایسے لفظ صریح اور کنایہ سے واقع ہو جاتی ہے جس سے ملکیت کا منتقل ہونا سمجھا جائے۔ چاہے وہ یہ کہے: بعتك هذه السلعة بعشرة میں نے تجھے یہ سامان دس کے عوض بیچا اور خریدنے والا کہے: اشتریتھا۔ میں نے اسے خرید لیا۔ یا خریدنے والا پہلے کہے: اشتریتھا۔ میں نے اسے خرید لیا اور پھر بیچنے والا کہے: بعتُکھا۔ میں نے اسے تجھے بیچ دیا یا بائع کہے: میں تجھے دس کے عوض بیچوں گا اور پھر مشتری کہے۔ میں خرید لوں گا یا میں نے خرید لیا۔ اور اسی طرح ہے اگر وہ کہے تو اسے دس کے عوض لے لے یا میں نے تجھے یہ دے دیا یا تو اسے لے لے یا تجھے اس میں برکت دی جائے دس کے عوض یا میں نے اسے تیرے حوالے کر دیا اور وہ دونوں بیع کا ارادہ رکھتے ہوں۔ تو ان تمام الفاظ کے ساتھ بیع لازم ہو جائے گی۔ اور اگر بائع نے کہا: میں نے تجھے دس کے عوض بیچ دی پھر وہ مشتری کے قبول کرنے سے پہلے رجوع کر لے تو امام مالکؒ نے کہا ہے: اس کے لئے رجوع کرنا جائز نہیں ہے یہاں تک کہ وہ مشتری کے قبول یا اس کے رد کو سن لے، کیونکہ اس نے اپنی جانب سے اسے دے دیا ہے اور اسے اس پر ثابت کر دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ اس کے لئے جائز ہے کیونکہ ابھی اس پر عقد مکمل نہیں ہوا۔

اور اگر بائع کہے: میں نے تو مذاق کیا تھا تو اس بارے میں روایت مختلف ہے۔ پس آپ نے ایک بار کہا: بیع لازم ہو جائے گی اور اس کے قول کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ اور ایک بار فرمایا: سامان کی قیمت کی طرف دیکھا جائے گا۔ پس اگر ثمن اس

کی قیمت سے موافقت رکھتے ہوں تو بیع لازم ہوگی اور اگر متفاوت ہوں جیسا کہ غلام ایک درہم کے عوض اور گھر ایک دینار کے بدلے، تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس نے اس سے بیع کا ارادہ نہیں کیا۔ بلا شبہ وہ مذاق کرنے والا ہے نتیجتاً بیع لازم نہیں ہوئی۔

مسئلہ نمبر 18۔ قولہ تعالیٰ: وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا یہاں الف لام عہدی ہے اور اس سے مراد وہی ربا ہے جس کا کاروبار عرب کرتے تھے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے، پھر یہ شامل ہوگا اسے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایسی بیع سے منع کیا گیا ہے جس میں ربا داخل ہو سکتا ہے اور جو بھی اس کے معنی میں بیوع ہیں ان سے منع کر دیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 19۔ عقد ربا کو فسخ کر دیا گیا ہے وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ ائمہ نے اسے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سرخ کھجوریں لے کر آئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''یہ کہاں سے لائے ہو؟'' حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ہمارے پاس کچھ ردی کھجوریں تھیں، تو میں نے ان میں سے دو صاع ایک صاع کے عوض بیچ دیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے کے لئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا: ''اوہ! یہی تو عین ربا ہے تو اس طرح نہ کر۔ البتہ جب تو کھجوریں بیچنے کا ارادہ کرے تو تو پہلے ایک بیع کے ساتھ انہیں بیچ دے پھر ان (کے ثمن) کے عوض وہ خرید لے۔'' اور ایک روایت میں ہے۔ ''یہ ربا ہے پس تم اسے لوٹا دو پھر تم ہماری کھجوریں بیچو اور ان کے (ثمن کے) عوض ہمارے لئے کھجوریں خرید لو۔''(1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: اوہ عین الربا سے مراد وہ ربا ہے جو فی نفسہ حرام ہے نہ کہ وہ جو اس سے مشابہت رکھتا ہے اور آپ کے قول: فردوہ عقد ربا کو فسخ کرنے کے واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے اور یہ بیع کسی اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہو سکتی اور یہی جمہور کا قول ہے، بخلاف امام اعظم ابو حنیفہ کے کہ وہ فرماتے ہیں: بلا شبہ ربا کی بیع اپنے اصل کے اعتبار سے جائز ہے اس حیثیت سے کہ وہ بیع ہے اور اپنے وصف کے اعتبار سے ممنوع ہے اس اعتبار سے کہ وہ ربا ہے۔ پس ربا ساقط ہو جائے گا اور بیع صحیح ہو جائے گی اور اگر اس طرح ہوتا جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس عقد کو فسخ نہ کرتے اور آپ ایک صاع پر جو زیادتی تھی اسے واپس لوٹانے کا حکم ارشاد فرماتے۔ اور یقیناً ایک صاع کے مقابلہ میں صفقہ کو صحیح قرار دیتے۔

مسئلہ نمبر 20۔ ہر وہ عقد جو واضح طور پر حرام ہو اور اسے فسخ کر دیا جائے تو مشتری پر سامان بعینہٖ واپس لوٹانا واجب ہے اور اگر مشتری کے ہاتھ سے وہ ضائع ہو گیا تو وہ اس سامان میں قیمت لوٹائے گا جس کی قیمت ہو اور وہ یہ ہیں مثلاً زمین، سامان اور حیوان وغیرہ۔ اور جن کی مثل موجود ہو اس کی مثل واپس لوٹائے گا وزنی چیزوں میں سے ہو یا کیلی چیزوں میں سے طعام ہو یا عرض (سامان) ہو۔

امام مالک نے کہا ہے: جس کا حرام ہونا بین ہو وہ واپس لوٹایا جائے گا چاہے وہ ضائع ہو یا نہ ہو۔ اور وہ جو اس میں سے ہو جسے لوگوں نے مکروہ جانا ہو تو اسے رد کر دیا جائے مگر یہ کہ سامان ضائع ہو جائے تو پھر اسے چھوڑ دیا جائے۔ (یعنی رد نہ کیا جائے۔)

مسئلہ نمبر 21۔ قولہ تعالیٰ: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ حضرت امام جعفر بن محمد صادق رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، حدیث نمبر 2145، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعالیٰ نے سود حرام کر دیا ہے تا کہ لوگ ایک دوسرے کو قرض دیں اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دو بار قرض دینا ایک بار صدقہ دینے کے مساوی ہوتا ہے۔'' اسے بزار نے نقل کیا ہے اور اس کا مکمل معنی پہلے گزر چکا ہے۔

اور بعض لوگوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ مالوں کے لئے باعث ضیاع اور لوگوں کے لئے باعث ہلاکت ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَمَنْ جَآءَهٗ میں فعل کے آخر سے علامت تانیث ساقط ہے کیونکہ الموعظة مونث غیر حقیقی ہے اور یہ بمعنی وعظ ہے اور حسن نے علامت تانیث کو ثابت رکھتے ہوئے فَمَنْ جَاءَتْهُ پڑھا ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو جب حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے فعل کی خبر دی گئی تو آپ نے یہ آیت پڑھی۔ دارقطنی نے عالیہ بنت انفع سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا کہ میں اور ام محبہ مکہ کی طرف نکلیں اور ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس داخل ہوئیں اور آپ پر سلام عرض کیا تو آپ نے ہم سے پوچھا تم کن میں سے ہو؟ ہم نے عرض کی۔ ہم اہل کوفہ میں سے ہیں، اس نے کہا گویا آپ نے ہم سے اعراض کر لیا۔ پھر ام محبہ نے آپ سے عرض کی: اے ام المومنین! میری ایک کنیز تھی اور میں نے اسے حضرت زید بن ارقم انصاری رضی اللہ عنہ کو آٹھ سو درہم کے عوض انہیں عطیہ ملنے تک فروخت کر دیا۔ اور پھر انہوں نے اسے بیچنے کا ارادہ کیا تو میں نے ان سے اسے نقد چھ سو درہم کے عوض خرید لیا ہے۔ وہ کہتی ہیں۔ پس آپ رضی اللہ عنہا ہماری طرف متوجہ ہوئیں اور فرمایا: تیری خرید بہت بری ہے اور وہ بھی جو تو نے خریدی ہے۔ اور زید رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام پہنچا دے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں کئے جانے والے اپنے جہاد کو باطل کر دیا ہے مگر یہ کہ وہ توبہ کر لے۔

پھر اس نے آپ سے عرض کی: آپ کی کیا رائے ہے اگر میں ان سے اپنے راس المال کے سوا اور کچھ نہ لوں؟ تب آپ نے کہا: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ (پس جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آئی اور وہ (سود سے) رک گیا تو اس کے لئے جائز ہے جو گزر چکا ہے۔) عالیہ ابو اسحاق ہمدانی کوفی السبیعی کی بیوی اور یونس بن ابی اسحاق کی ماں ہے۔ اور یہ حدیث امام مالک نے بیوع الآجال کے بیان میں نقل کی ہے جو آپ سے ابن وہب نے روایت کی ہے۔ پس اگر بیوع میں ایسی شے ہو جو ممنوع میں پڑنے تک پہنچاتی ہو تو آپ (امام مالک) نے اس بیع سے منع کیا ہے اگرچہ ظاہراً وہ جائز ہو۔ اور جمہور فقہاء نے اس اصل (بنیاد) میں امام مالک سے اختلاف کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: احکام کا دارومدار ظاہر پر ہے نہ کہ ظنون پر۔ اور ہماری دلیل سد ذرائع کے بارے قول ہے۔ پس اگر اسے تسلیم کر لیا جائے (توفبہا) ورنہ ہم نے اس کی صحت پر استدلال بیان کیا ہے۔ اور وہ گزر چکا ہے۔ اور یہ حدیث نص ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یہ نہ فرماتیں: أبلغی زیدًا أنه قد ابطل جهاده الا آن یتوب یہ ارشاد توقیفی ہے۔ کیونکہ فقط رائے سے ایسا قول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اعمال کو باطل کرنے کی معرفت بغیر وحی کے حاصل نہیں ہو سکتی، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور صحیح مسلم (1) میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک حلال واضح اور بین

1۔ صحیح بخاری، باب فضل من استبرأ لدینہ، حدیث نمبر 50، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور حرام بھی واضح اور بین ہے اور ان دونوں کے درمیان امور مشتبہات ہیں۔ لوگوں میں سے بہت سے انہیں نہیں جانتے پس جو کوئی شبہات سے بچتا رہا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا اور جو کوئی شبہات میں پڑ گیا تو وہ حرام میں واقع ہو گیا، اس چرنے والے کی طرح جو چراگاہ کے ارد گرد چرتا ہے۔ قریب ہے کہ وہ اس میں واقع (داخل) ہو جائے۔ خبردار! سنو بلاشبہ ہر مالک کے لئے ایک چراگاہ ہے۔ خبردار! سنو اللہ تعالیٰ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں"۔

اور وجہ دلالت یہ ہے کہ آپ نے محرمات میں واقع ہونے کے خوف سے متشابہات میں پڑھنے سے منع کیا ہے۔ اور یہی ذریعہ کو بند کرنا اور ختم کرنا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک کبائر میں سے یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین کو گالیاں دے۔" صحابہ نے عرض کی: آدمی اپنے والدین کو گالیاں کیسے دے سکتا ہے؟" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ دوسرے آدمی کے باپ کو گالیاں دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالیاں دیتا ہے اور وہ اس کی ماں کو گالیاں دیتا ہے اور وہ اس کی ماں کو گالیاں دیتا ہے☆" پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریضاً کسی کے والدین کو گالیاں دینے کو اپنے والدین کو گالیاں دینے کی طرح قرار دیا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود پر لعنت فرمائی جب انہوں نے ان (چیزوں کے ثمن کھائے جن) کے کھانے سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ (1)

اور ابو بکر نے اپنی کتاب میں کہا ہے: صدقہ کے خوف سے متفرق اشیاء کو جمع نہیں کیا جائے گا اور مجتمع کو متفرق نہیں کیا جائے گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دراہم کی بیع دراہم کے ساتھ کرنے سے منع کیا ہے جبکہ ان کے درمیان گناہ ہو۔ اور علماء نے بیع اور قرض کو جمع کرنے سے روکنے پر اتفاق کیا ہے اور اس پر کہ شراب کی قلیل مقدار حرام ہے اگرچہ وہ نشہ نہ بھی لائے اور اس پر کہ اجنبیہ عورت سے خلوت اختیار کرنا حرام ہے اگرچہ وہ عنین ہو اور اس پر کہ نوجوان عورت کے چہرہ کی طرف دیکھنا حرام ہے، علاوہ ازیں بہت سی چیزیں ہیں اور ان کے بارے قطعی اور یقینی علم ہے کہ شریعت نے ان سے باز رہنے کا حکم دیا ہے، اس لئے کہ وہ محرمات تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔ اور ربا اس کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کی چراگاہ کی حفاظت کی جائے اور اس کے راستوں کو بند کیا جائے۔

اور جنہوں نے ان اسباب کو مباح قرار دیا ہے تو انہیں چاہئے کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کو ہلاک کرنے کے لئے کنواں کھودنے اور پھندے گاڑنے کو بھی مباح قرار دیں۔ اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے اور یہ بھی کہ ہم نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ آدمی کو زیادہ قیمت کے ساتھ ادھار شے بیچنے کو منع کیا جائے گا، بشرطیکہ یہ معروف ہو اور اس کی عادت ہو۔ اور یہ اسی باب کے معنی میں ہے۔ واللہ الموفق للصواب۔

مسئلہ نمبر 22۔ ابو داؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "جب تم زیادہ قیمت کے ساتھ ادھار چیزیں بیچنے لگو اور بیلوں کی دمیں پکڑنے لگو اور کھیتی پر ہی راضی ہو جاؤ اور جہاد چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ تم پر ایسا رعب اور خصلت مسلط کر دے گا وہ اسے تم سے دور نہیں کرے گا یہاں

1۔ صحیح بخاری، باب لا یجمع بین متفرق ولا یفرق بین مجتمع، حدیث نمبر 1358، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6529

تک کہ تم اپنے دین کی طرف واپس لوٹ آؤ (1)۔'' اس کی اسناد میں ابوعبدالرحمٰن خراسانی ہے۔ وہ مشہور راوی نہیں ہے۔

ابوعبید ہروی نے العینہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ آدمی اپنا سامان ثمن معلوم کے عوض کسی آدمی کو ایک مقررہ مدت تک ادھار بیچ دے اور پھر اسے اس سے ان ثمنوں سے کم کے عوض خرید لے جتنے کے عوض اسے بیچا تھا۔ فرمایا: اگر کسی نے عینہ کے طالب کی موجودگی میں ایک سامان دوسرے آدمی سے ثمن معلوم کے عوض خریدا اور اس پر قبضہ کر لیا پھر اسے عینہ کے طالب کو اس سے زیادہ ثمن کے عوض مقررہ مدت تک ادھار بیچ دیا جتنے کے عوض اسے خریدا تھا پھر وہ مشتری پہلے بائع سے نقد اس سے کم ثمن کے ساتھ بیچ دے تو یہ بھی عینہ ہے اور یہ پہلے سے زیادہ آسان ہے اور یہ بعض کے نزدیک جائز ہے اور صاحب عینہ کے پاس نقد موجود ہونے کی وجہ سے اسے عینہ کا نام دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ العین سے مراد مال حاضر ہے اور مشتری بلاشبہ اسے خرید رہا ہے تا کہ وہ اسے حاضر مال کے عوض بیچے جو اسے جلدی مل جائے گا۔

مسئلہ نمبر 23۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: جس نے کچھ سامان ایک خاص مدت تک ثمن کے عوض فروخت کیا پھر اسے خرید لیا ایسے ثمن کے عوض جو اس ثمن کی جنس میں سے تھے جن کے عوض اسے بیچا تھا تو وہ اس سے خالی نہیں ہے کہ وہ اسے نقد ثمن کے عوض خریدے گا یا اتنی مدت تک ادھار جو اس مدت سے کم تھی جس تک اس نے اسے بیچا تھا یا اس تک جو اس مدت سے زیادہ تھی، ثمن مثلی کے عوض یا اس سے کم کے عوض یا اس سے زیادہ کے عوض۔ پس یہ تین مسائل ہیں۔ جہاں تک پہلے اور دوسرے کا تعلق ہے تو اگر وہ مثل ثمن یا اکثر ثمن کے عوض خریدے تو یہ جائز ہے اور کم ثمن کے عوض ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مقتضا کے مطابق جائز نہ ہوگا، کیونکہ اس نے چھ سو دیئے ہیں تا کہ وہ آٹھ سو لے اور سامان لغو ہو گیا۔ اور یہ ہی خالص ربا ہے۔ اور رہا تیسرا مسئلہ کہ وہ اس سے زیادہ مدت تک ادھار لے لے، پس اگر اس نے صرف اسے ہی خریدا یا کچھ اور بھی، تو مثل ثمن یا اقل ثمن کے ساتھ یہ جائز ہوگی، البتہ زیادہ ثمن کے عوض جائز نہ ہوگی۔ اور اگر اس نے اس میں سے بعض حصہ خرید لیا تو پھر کسی حال پر بھی یہ خرید جائز نہ ہوگی نہ مثل ثمن کے ساتھ، نہ اقل کے ساتھ اور نہ ہی اکثر کے ساتھ۔ اس باب کے مسائل کو ہمارے علماء نے ستائیس مسائل میں محصور کیا ہے اور ان کا دارومدار اسی پر ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ پس تو جان لے۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: فَلَهٗ مَا سَلَفَ یعنی سود کے معاملہ میں سے جو گزر چکا ہے اس پر نہ دنیا میں کوئی مواخذہ ہوگا اور نہ آخرت میں، سدی وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے لئے حکم ہے جس نے کفار قریش میں سے اسلام قبول کیا اور بنی ثقیف اور ان میں سے جو وہاں تجارت کرتے تھے (ان میں سے جس نے اسلام قبول کیا) اور سلف کا معنی ہے وہ زمانہ جو پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 25۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ اس میں چار تاویلات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ضمیر ربا کی طرف لوٹ رہی ہے، معنی یہ ہے کہ سود کا معاملہ اس کی یا دوسری چیزوں کی تحریم کو جاری رکھنے میں اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی النھی من العینۃ، حدیث نمبر 3003، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دوسری یہ کہ ضمیر ما سَلَفَ کی طرف لوٹ رہی ہو یعنی جو کچھ گزر چکا ہے اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اسے معاف کرنے کے بارے میں اور اس میں تاوان اور سزا کو ساقط کرنے کے بارے میں۔ اور تیسری یہ ہے کہ ضمیر سود لینے والے (ذی الربا) کی طرف لوٹ رہی ہے، اس معنی میں کہ اس کا معاملہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے کہ وہ اسے اس سے رکنے پر ثابت قدم رکھے یا اسے دوبارہ ربا میں گناہ کی طرف لوٹا دے۔

اس قول کو نحاس نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے: یہ قول اچھا اور واضح ہے۔ یعنی مستقبل میں اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اگر وہ چاہے تو اسے تحریم پر ثابت رکھے اور اگر چاہے تو اسے مباح قرار دے۔ اور چوتھی تاویل یہ ہے کہ ضمیر رکنے والے اور باز رہنے والے کی طرف لوٹ رہی ہو لیکن اسے مانوس کرنے اور خیر اور بھلائی میں اس کی آرزو اور امید پھیلانے کے معنی میں، جیسا کہ تو کہتا ہے: اس کا معاملہ اطاعت اور خیر کے سپرد ہے اور جیسا کہ تو کہتا ہے: اس کا معاملہ نمو اور توجہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کی اطاعت کے سپرد ہے۔

مسئلہ نمبر 26۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ عَادَ یعنی جو فعل ربا کی طرف لوٹ آیا (یعنی دوبارہ سود کھانے لگا) یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ حضرت سفیان نے یہ کہا ہے۔ اور ان کے سوا دوسروں نے کہا: جو لوٹا اور اس نے کہا بے شک بیع ربا کی مثل ہے تو وہ کافر ہو گیا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اگر ہم کہیں کہ یہ آیت کافر کے بارے میں ہے تو پھر خلود سے مراد حقیقی طور پر ہمیشہ رہنا ہے۔ اور اگر ہم اسے گنہگار مسلمان کے بارے قرار دیں تو پھر خلود کا لفظ مجازاً مبالغہ کے معنی میں ہوگا، جیسا کہ عرب کہتے ہیں: مُلْكٌ خالد یہ ایسے دوام سے عبارت ہے جو حقیقی طور پر ہمیشہ باقی نہیں رہے گا۔

مسئلہ نمبر 27۔ قولہ تعالیٰ: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ سود کو مٹا دے گا یعنی اس کی نمو ختم ہو جائے گی اگرچہ وہ زیادہ ہی ہو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ان الرّبا وان کثر فعاقبتہ الی قُلّ (بلاشبہ سود اگرچہ بہت زیادہ ہو اس کا انجام قلیل ہی ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ سود کو مٹا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سے کوئی صدقہ، حج، جہاد اور صلہ رحمی قبول نہیں کرے گا۔

المَحْقُ کا معنی النقص والذھاب۔ کم ہونا یا گھٹانا اور ختم ہونا ہے اور اسی سے مُحَاق القمر یعنی چاند کا گھٹنا بھی ہے۔ وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ یعنی وہ دنیا میں خیرات کو برکت کے ساتھ بڑھاتا ہے اور آخرت میں ان کا ثواب کئی گناہ کر کے بڑھا دے گا۔ اور صحیح مسلم میں ہے: "بے شک تم میں سے کسی کا صدقہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہوتا ہے اور وہ اسے اس کے لئے بتدریج بڑھاتا رہتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی گھوڑی اور گائے کے بچوں کی نشوونما کرتا ہے، یہاں تک کہ قیامت کا دن آ جائے گا اور بے شک ایک لقمہ احد پہاڑ کی مثل ہو جائے گا۔" (1)

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل الصدقۃ، حدیث نمبر 598، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔
صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1321، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن زبیر نے یُمَحِّقُ یا کے ضمہ اور حا کے کسرہ کو مشدد اور یُرَبِّی را کو فتحہ کے ساتھ اور با کو مشدد پڑھا ہے اور حضور نبی مکرم ﷺ سے اسی طرح مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 28۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ اس میں کفار کی صفت اثیم مبالغہ کے لئے لگائی گئی ہے، اس حیثیت سے کہ دونوں لفظ مختلف ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کفار میں اشتراک کے معنی کو زائل کرنے کے لئے یہ صفت لگائی گئی ہے کیونکہ کبھی اس کا اطلاق اس کسان پر بھی ہوتا ہے جو زمین میں دانا چھپاتا ہے۔ (یعنی کاشت کرتا ہے) ابن فورک نے یہی کہا ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اور نماز اور زکوۃ کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا ہے حالانکہ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ انہیں متضمن اور شامل ہے۔ تو یہ ان دونوں کے شرف و عظمت اور ان کی قدر و منزلت پر آگاہ کرنے کے لئے ہے کیونکہ یہ دونوں اعمال کی اصل ہیں، نماز بدنی اعمال کی اصل ہے اور زکوۃ مالی اعمال کی اصل ہے۔

مسئلہ نمبر 29۔ قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ظاہر یہ ہے کہ وہ اس سود کو باطل کر دے جس پر قبضہ نہیں ہوا ہے، اگرچہ آیت تحریم ~~کے نازل~~ ہونے سے پہلے اس کا عقد ہو چکا ہو۔ اور جب اس پر قبضہ ہو چکا ہو تو پھر اس کے فسخ کے پیچھے نہ پڑے۔

تحقیق کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی ثقیف کے سبب نازل ہوئی۔ انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ اس پر معاہدہ کیا تھا کہ ان کے سود کا مال جو لوگوں پر ہے تو وہ انہیں کے لئے ہے اور جو لوگوں کا ان پر ہے تو وہ ان سے ختم کر دیا گیا ہے، پھر جب ان کے سود کی مقررہ مدتیں آ پہنچیں تو انہوں نے اہل مکہ کی طرف تقاضا کے لئے (پیغام) بھیجا۔ قرضے بنی عبدہ کے تھے اور وہ بنو عمرو بن عمیر ثقیف میں سے تھے اور یہ بنی مغیرہ مخزومیوں پر تھے۔ اور بنو مغیرہ نے کہا: ہم کوئی شے نہیں دیں گے کیونکہ ربا ختم کر دیا گیا ہے۔ اور انہوں نے اپنا معاملہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی طرف لکھا۔ اور یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے حضرت عتاب رضی اللہ عنہ کی طرف لکھ بھیجا اور ثقیف نے بھی اس کے بارے جان لیا اور وہ (سود کا مطالبہ کرنے) سے رک گئے۔ یہی آیت کا سبب نزول ہے اور یہ اس مجموعے کا اختصار ہے جو ابن اسحاق، ابن جریج اور سدی وغیرہم نے روایت کیا ہے اور اس کا معنی یہ ہے تم اپنے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کے درمیان کوئی آڑ اور رکاوٹ بنا لو اپنے مابقی ربا کو چھوڑ کر اور اس سے درگزر کر کے۔

مسئلہ نمبر 30۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یہ اس بنا پر ثقیف کے حق میں شرط محض ہے کیونکہ یہ حکم ان کے اسلام میں داخل ہوتے ہی پہلے پہل نازل ہوا۔ اور جب ہم آیت کو ان کے بارے میں مقدر قرار دیں جن کا ایمان پختہ ہو چکا تھا تو پھر یہ مبالغہ کی جہت پر شرط مجازی ہے جیسا کہ تو اس کے بارے میں کہتا ہے جس کی ذات کو تو ابھارنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ ''اگر تو مرد ہے تو تو اس طرح کر۔'' اور نقاش نے مقاتل بن سلیمان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اس آیت میں اِنْ بمعنی

اِذْ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے اور لغت میں معروف نہیں ہے۔ اور ابن فورک نے کہا ہے: یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایمان لانا ہو اور ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایمان لانا مراد ہو، کیونکہ اس کے بغیر پہلا ایمان نفع نہیں دے گا اور یہ اس کے سبب مردود ہے جو آیت کے سبب نزول میں بیان کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 31۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ یہ وعید ہے اگر انہوں نے سود نہ چھوڑا اور جنگ قتل کی دعوت دیتی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن سود کھانے والے کو کہا جائے گا: جنگ کے لئے اپنے ہتھیار لے لے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے: جو کوئی سود پر قائم رہے اور اس سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کے امام پر لازم ہے کہ وہ اس سے سود کا مال واپس لے لے، پس اگر وہ باز آجائے (تو فبہا) ورنہ وہ اسے قتل کر دے۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے سود لینے والوں کو قتل کی دھمکی دی ہے اور انہیں مباح قرار دیا ہے جہاں بھی وہ پکڑے جائیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: اگر تم باز نہ آئے تو تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے والے ہو، یعنی تم ان کے دشمن ہو۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اگر کسی نہر والوں نے سود پر اسے حلال سمجھتے ہوئے صلح کر لی تو وہ مرتد ہو گئے اور ان کے بارے میں حکم مرتدین کے حکم کی طرح ہوگا۔ اور اگر وہ اسے حلال نہ سمجھیں تو امام وقت کے لئے ان سے جنگ لڑنا جائز ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اعلان فرمایا ہے فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (پھر وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جانب سے اعلان جنگ سن لیں) اور ابو بکر نے حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے ''فَاٰذِنُوْا'' پڑھا ہے۔ اس معنی کی بنیاد پر کہ تم اپنے سوا کو بتا دو کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے حالت جنگ میں ہو۔

مسئلہ نمبر 32۔ ابن بکیر نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہا: اے ابا عبد اللہ! میں نے ایک آدمی کو نشہ کی حالت میں دیکھا، وہ گالی گلوچ کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ چاند کو پکڑ لے، سو میں نے کہا میری بیوی کو طلاق اگر ابن آدم (انسان) کے پیٹ میں شراب سے بڑھ کر کوئی بری شے داخل ہوتی ہو۔ تو آپ نے اسے فرمایا: تو واپس چلا جا یہاں تک کہ میں تیرے مسئلہ میں غور و فکر کر لوں۔ پھر وہ دوسرے دن آیا، تو آپ نے اسے پھر فرمایا: تو واپس لوٹ جا یہاں تک کہ میں تیرے مسئلہ میں غور و فکر کر لوں۔ وہ پھر تیسرے دن آیا تو آپ نے اسے فرمایا: تیری بیوی کو طلاق ہو چکی ہے میں نے کتاب اللہ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت میں خوب چھان بین کی، گہری غور و فکر کی تو میں نے سود سے بڑھ کر کوئی بری شے نہ دیکھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں جنگ کا اعلان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 33۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ سود کھانا اور اس کے مطابق کاروبار کرنا گناہ کبیرہ میں سے ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے ہم اسے بیان کریں گے۔

حضور نبی مکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یاتی علی الناس زمان لا یبقی أحد الا أکل الربا ومن لم یأکل الربا أصابه غبارہ (لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ کوئی باقی نہیں رہے گا مگر وہ سود کھائے گا اور جس نے نہ کھایا تو اس کا غبار اس تک پہنچ جائے گا۔)

اور دارقطنی نے حضرت عبداللہ ابن حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: لَدرھِمُ ربًا اشد عند اللہ تعالیٰ من ست و ثلاثین زنیۃ فی الخطیئۃ (سود کا ایک درہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ میں چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ شدید ہے۔)

اور آپ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: الرِّبا تسعۃ و تسعون بابا أدناھا کاتیان الرجل بأمه (1) (سود کے ننانوے دروازے ہیں اور ان میں سے ادنیٰ آدمی کا اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کی مثل ہے) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سود کھانے والا، کھلانے والا، اسے لکھنے والا اور اس کی شہادت دینے والا سب پر حضور نبی کریم ﷺ کی زبان سے لعنت کی گئی ہے۔

اور امام بخاری نے ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (2) کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ ﷺ نے خون کے ثمن (قیمت) کتے کے ثمن اور بدکاری کی کمائی سے منع فرمایا ہے اور سود کھانے اور کھلانے والے پر (بال) گودنے اور گدوانے والی پر اور تصویر بنانے والے پر لعنت کی ہے۔ نھی رسول اللہ ﷺ عن ثمن الدم و ثمن الکلب و کسب البغی و لعن آکل الربا و مؤکله و الواشمة و المستوشمة و المصور اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو اور ان میں ہے...... و آکل الربا اور سود کھانے والا۔

اور مصنف ابی داؤد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (3) انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اسے لکھنے والے اور اس پر شاہد بننے والے سبھی پر لعنت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 34۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَكُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِكُمۡ الآیہ۔ ابو داؤد نے سلیمان بن عمرو سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے (4) کہ انہوں نے کہا: میں نے حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''خبردار! سنو بے شک دور جاہلیت کے سودوں میں سے تمام سود ختم کر دیئے گئے ہیں تمہارے لئے تمہارے اصل مال ہوں گے نہ تم ظلم کرو اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے گا۔'' اور آگے پوری حدیث بیان کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں توبہ کے ساتھ اپنے رأس الاموال کی طرف لوٹا دیا اور انہیں فرمایا: سود لینے میں ''تم ظلم نہ کرو'' ''اور تم پر یہ ظلم نہیں کیا جائے گا''۔ کہ تمہارے رأس

1۔ ابن ماجہ، باب التغلیظ فی الرباء، حدیث نمبر 2264، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب ثمن الکلب، حدیث نمبر 2084، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، حدیث نمبر 1127، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، باب فی وضع الرباء، حدیث نمبر 2896، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الاموال میں سے کوئی شے روک لی جائے اور تمہارے اموال ختم ہو جائیں۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ تم پر ٹال مٹول کر کے ظلم نہیں کیا جائے گا، کیونکہ غنی کا ٹال مٹول کرنا بھی ظلم ہے (1)۔ پس معنی یہ ہوا کہ فیصلہ سود ختم کرنے کے ساتھ ہی ہوگا اور اسی طرح صلح کا طریقہ ہے اور یہی صلح کے زیادہ مشابہ شے ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کعب بن مالک کی طرف ابن ابی حدرد کے قرض میں نصف ختم کرنے کے بارے اشارہ کیا اور کعب نے کہا: جی ہاں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے کو فرمایا: ''اٹھ اور اسے ادا کر دے'' پس علماء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر بالقضاء کو مصالحات میں سنت کے طور پر لیا ہے۔ عنقریب سورۃ النساء میں صلح کا بیان آئے گا اور ان کا جن میں صلح جائز ہوتی ہے اور جن میں جائز نہیں ہوتی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 35۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ یہ تاکید ہے اس (ربا) کو باطل کرنے کی جس پر قبضہ نہیں کیا گیا اور اس رأس المال کو لینے کی جس میں سود نہیں۔ پس بعض علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ ہر وہ شے جو بیع پر قبضہ کرنے سے پہلے ان چیزوں میں سے طاری ہو جو عقد کی تحریم کو ثابت کرتی ہیں تو وہ عقد کو باطل کر دے گی، جیسا کہ جب کوئی مسلمان شکار خریدے پھر مشتری یا بائع قبضہ سے پہلے اسے حرام کر دے تو بیع باطل ہو جائے گی، کیونکہ اس پر قبضہ سے پہلے وہ شے طاری ہو چکی ہے جس نے عقد کے حرام ہونے کو ثابت کر دیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس (ربا) کو باطل قرار دیا ہے جس پر قبضہ نہیں ہوا، کیونکہ اس پر وہ طاری ہو چکی ہے جس نے قبضہ سے پہلے اس کی تحریم کو ثابت کر دیا ہے اور اگر اس پر پہلے قبضہ کر لیا گیا ہو تو پھر اس پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ یہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے اور یہی امام شافعی کے اصحاب کا بھی قول ہے اور اس کے ساتھ اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ قبضہ سے پہلے بائع کے ہاتھ میں مبیع کا ہلاک ہو جانا اور مبیع میں قبضہ کا ساقط ہو جانا عقد کے باطل ہونے کو واجب کرتا ہے۔ بخلاف بعض سلف کے اور یہ اختلاف امام احمد سے روایت کیا جاتا ہے۔

اور اس کے قول کے مطابق جاری ہو سکتا ہے جو یہ کہتا ہے: بے شک ربا میں عقد فی الاصل منعقد ہو چکا تھا اور پھر وہ قبضہ سے پہلے طاری ہونے والے اسلام کے سبب باطل ہو گیا۔ اور رہے وہ جنہوں نے اصل میں ربا کے انعقاد کا انکار کیا ہے تو (ان کے نزدیک) یہ کلام صحیح نہیں ہے وہ یہ کہ سود (تمام) ادیان میں حرام کر دیا گیا ہے اور وہ جو دور جاہلیت میں اس کا کاروبار کرتے تھے تو وہ مشرکین کی عادت تھی اور ربا میں سے جس پر انہوں نے قبضہ کر لیا ہے وہ ان مالوں کے جمع ہونے کی جگہ میں ہے جو ان تک غصب اور سلب کے ذریعہ پہنچے ہیں تو اس پر کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ پس اس بنا پر استشہاد صحیح نہیں ہوگا ان مسائل میں جو انہوں نے ذکر کئے ہیں اور ہم سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کا ربا کی تحریم پر مشتمل ہونا مشہور ہے اور کتاب اللہ میں مذکور ہے، جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں یہودیوں کے بارے بیان کیا گیا ہے: وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ (النساء: 161) (اور بوجہ ان کے سود لینے کے حالانکہ منع کئے گئے تھے اس سے)

اور حضرت شعیب علیہ السلام کے قصہ میں مذکور ہے کہ ان کی قوم نے ان کا انکار کیا اور کہا: اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا

1۔ صحیح بخاری، باب الحوالۃ، حدیث نمبر 2125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوۡ اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ہود: 87) (کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں انہیں جن کی عبادت کرتے ہمارے باپ دادا یا نہ تصرف کریں اپنے مالوں میں جیسے ہم چاہیں)

پس اس بنا پر اس سے استدلال درست نہ ہوگا۔ ہاں اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ عقود جو دار الحرب میں واقع ہوں جب امام وقت ان پر غالب آئے تو وہ فسخ کے احکام جاری نہیں کرے گا اگرچہ وہ عقود فاسدہ ہی ہوں۔

مسئلہ نمبر 36۔ ارباب ورع و زہد میں سے بعض غلو کرنے والوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حلال مال میں جب حرام مال اس طرح مل جائے کہ تمیز ممکن نہ رہے پھر وہ ملے جلے مال میں سے حرام مال کی مقدار مال نکال دے تو پھر بھی (باقی مال) حلال اور پاک نہ ہوگا، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ جو مال نکالا گیا ہے وہ حلال ہو اور جو باقی ہے وہ حرام ہو۔ ابن عربیؒ نے کہا ہے: یہ دین میں غلو ہے۔ کیونکہ ہر وہ مال جس میں تمیز کرنا (اور اسے علیحدہ علیحدہ کرنا) ممکن نہ رہے تو پھر اس سے مقصود اس کی مالیت ہوتی ہے نہ کہ اس کا عین۔ اور اگر مال ضائع ہو جائے تو پھر اس کی مثل مال اس کے قائم مقام ہوتا ہے۔ دونوں قسم کے مالوں کا مخلوط ہو جانا اس کی تمیز اور علیحدگی کے اعتبار سے اتلاف اور ضیاع ہی ہے جیسا کہ ہلاک کر دینا اس کے عین (ذات) کے لئے اتلاف اور ضیاع ہے اور مثل ضائع ہونے والے مال کے قائم مقام ہوتی ہے اور یہ حسّاً اور معنیً بین اور واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہمارے علماء نے کہا ہے اموال حرام میں سے جو آدمی کے قبضہ میں ہو اگر وہ سود کا مال ہے تو اس سے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اسے اس کے پاس واپس لوٹا دے جس پر سود لگایا تھا اور اگر وہ حاضر نہ ہو تو اسے تلاش کرے اور اگر اسے پانے سے مایوس ہو جائے تو پھر چاہیے کہ وہ اسے صدقہ کر دے اور اگر اس نے وہ مال ظلماً لیا ہو تو جس کے ساتھ اس نے ظلم کیا ہے اس کے ساتھ بھی اسے اسی طرح معاملہ کرنا چاہئے۔ اور اگر اس پر معاملہ مشتبہ ہو جائے اور وہ یہ نہ جان سکے کہ جو مال اس کے قبضے میں ہے اس حلال میں سے حرام کتنا ہے، تو جو مال اس کے قبضے میں ہے اس میں سے وہ مقدار تلاش کرے جس کا لوٹانا اس پر واجب ہے، یہاں تک کہ اسے اس میں کوئی شک نہ رہے کہ جو مال باقی ہے وہ خالص اس کا اپنا ہے۔ پس جو مال اس نے اپنے قبضے سے زائل کیا اسے وہ ان لوگوں کو واپس لوٹائے گا جن کے بارے یہ معروف ہو کہ اس نے اس پر ظلم کیا ہے یا اس سے بطور سود مال لیا ہے اور اگر وہ ایسے آدمی کو پانے سے مایوس ہو جائے تو پھر اس کی طرف سے وہ مال صدقہ کر دے۔

اور اگر مظالم اس کے ذمہ کا احاطہ کئے ہوئے ہوں اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس پر جو کچھ واجب الادا ہے وہ اسے کثیر ہونے کے سبب کبھی بھی ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھے گا تو اس کی توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس موجود ہے وہ سب اپنی ملکیت سے زائل کر دے، چاہے مساکین کو دے دے اور چاہے تو ایسے کاموں میں خرچ کر دے جو عام مسلمانوں کی منفعت اور صلاح کے لئے ہوں، یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی شے باقی نہ رہے، سوائے اس کم سے کم لباس کے جس میں نماز جائز ہوتی ہے اور وہ اتنا کپڑا ہے جو شرمگاہ کو ڈھانپ سکے اور وہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے۔ اور ایک دن کی خوراک (باقی رہ جائے) کیونکہ یہ وہ مقدار ہے جو اضطراری حالت میں دوسرے کے مال سے لینا واجب ہوتی ہے، اگرچہ وہ اسے ناپسند کرے جس سے وہ لے رہا ہے۔ اور اکثر علماء کے قول کے مطابق یہاں مفلس علیحدہ اور جدا ہو گیا، کیونکہ مفلس کے پاس لوگوں کے

اموال کسی زیادتی یا ظلم کی وجہ سے نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے وہ مال اس کے حوالے کر رکھے ہوتے ہیں۔ پس اس کے لئے اتنا مال چھوڑ دیا جائے گا جو اسے چھپالے گا اور وہ وہ ہے جو اس کے لباس کی ہیئت و کیفیت میں ہو۔

اور ابو عبید وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ وہ مفلس کے لئے لباس نہ چھوڑے مگر وہ کم سے کم مقدار جو نماز میں اسے کافی ہو اور وہ وہ ہے جو اسے ناف سے گھٹنے تک ڈھانپ لے، پھر جب بھی کوئی شے اس کے ہاتھ میں آئے اسے وہ اپنے ہاتھ سے نکال دے اور اس سے وہ کچھ روک کر نہ رکھے سوائے اس مقدار کے جو ہم نے ذکر کر دی ہے، یہاں تک کہ وہ جان لے، اور کون اس کی حالت کو جان سکتا ہے کہ اس نے وہ ادا کر دیا ہے جو اس کے ذمہ واجب الادا ہے۔

مسئلہ نمبر 37۔ یہ وہ وعید ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے سود کھانے کی صورت میں جنگ سے ڈرایا دھمکایا ہے اور اسی کی مثل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بٹائی پر کھیتی کرنے کے بارے میں بھی وارد ہے۔ ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یحییٰ بن معین اور ابن رجا نے ہمیں خبر دی ہے اور ابن رجا نے کہا ہے کہ مجھے ابن خیثم نے ابو الزبیر سے اور انہوں نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے بٹائی پر کھیتی کرنے کو نہ چھوڑا تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلان جنگ سن لے۔'' پس یہ بٹائی پر کھیتی کرنے سے روکنے پر دلیل ہے اور مخابرہ سے مراد زمین کو نصف یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض لینا ہے اور اسے مزارعت کہا جاتا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے تمام اصحاب، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے متبعین اور داؤد رحمۃ اللہ علیہم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ زمین ثلث اور ربع پر دینا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس پیداوار کے جز پر جو زمین سے حاصل کی جائے گی، کیونکہ وہ مجہول ہے۔ مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ زمین کو اناج کے عوض کرائے پر دینا جائز ہے بشرطیکہ مقدار معلوم ہو، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پس جو شے معلوم ہو اس کی ضمانت ہو سکتی ہو تو اس کے عوض کوئی حرج نہیں ہے۔''

اسے مسلم نے بیان کیا ہے اور محمد بن عبد اللہ بن عبد الحکم نے یہی موقف اپنایا ہے اور امام مالک اور آپ کے اصحاب نے اس سے منع کیا ہے کیونکہ مسلم نے حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں زمین کی کھیتی پکنے سے پہلے فروخت کر دیتے تھے اور ہم زمین ثلث، ربع اور مقررہ اناج کے عوض کرائے پر دیتے تھے۔ پس ایک دن میرے چچاؤں میں سے ایک آدمی ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایسے معاملے سے منع کیا ہے جو ہمارے لئے باعث نفع تھا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری ہمارے لئے زیادہ نفع بخش ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس سے منع کیا ہے کہ ہم زمین کی کھیتی پکنے سے پہلے فروخت کر دیں اور ہم زمین ثلث، ربع اور مقررہ اناج کی شرط پر کرائے پر دیں اور آپ نے زمین کے مالک کو حکم دیا ہے کہ وہ خود کاشت کرے یا اسے مزارعت پر دے دے۔ اور آپ نے اس کے کرائے کو اور جو کچھ اس کے سوا ہے اسے ناپسند کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: پس زمین کا کرایہ اناج میں سے کسی شے کے ساتھ جائز نہیں ہے کسی بھی حال میں چاہے وہ شے کھائی جانے والی ہو

یا پی جانے والی، کیونکہ یہ طعام کے بدلے طعام ادھار بیچنے کے معنی میں ہے اور اسی طرح زمین کا کرایہ ان کے نزدیک اس شے سے دینا بھی جائز نہیں ہے جو زمین سے نکلے گی اگر چہ وہ کھایا اور پیا جانے والا طعام نہ بھی ہو، سوائے لکڑی، کانے اور ایندھن کی لکڑی کے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ بیع مزابنہ کے معنی میں ہے۔ (بیع مزابنہ سے مراد بغیر کیل اور وزن کے صرف اندازے کے ساتھ کسی شے کی بیع کرنا ہے) یہی وہ ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب سے محفوظ ہے۔

اور ابن سحنون نے مغیرہ بن عبد الرحمٰن مخزومی مدنی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ زمین کو اس اناج کے عوض کرائے پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو اس سے نہ پیدا ہوتا ہو اور یحییٰ بن عمر نے مغیرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ جائز نہیں ہے، جیسا کہ تمام اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

اور ابن حبیب نے ذکر کیا ہے کہ ابن کنانہ کہتے تھے: زمین کو ایسی شے کے عوض کرائے پر نہیں دیا جائے گا کہ جب وہ شے زمین میں لوٹائی جائے تو وہ اگ پڑے۔ اور اس کے سوا تمام ایسی اشیاء کے عوض کرائے پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو کھائی جاتی ہوں اور ان کے عوض جو نہ کھائی جاتی ہوں چاہے وہ زمین سے پیدا ہوں یا نہ ہوں۔ اور اسی طرح یحییٰ بن یحییٰ نے بھی کہا ہے اور کہا ہے: بے شک یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں سے ہے۔ (ابن حبیب نے) کہا ہے اور ابن نافع کہا کرتے تھے: زمین کو طعام وغیرہ میں سے ہر شے کے عوض کرائے پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو زمین سے پیدا ہو یا نہ پیدا ہو، ماسوائے گندم اور اس جیسی اجناس کے، کیونکہ یہ محاقلہ ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ (اور محاقلہ سے مراد کھیتی کو پکنے سے پہلے فروخت کر دینا ہے۔)

اور امام مالکؒ نے الموطا میں کہا ہے وہ آدمی جو اپنی سفید زمین اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے ثلث اور ربع کے عوض دے دیتا ہے تو یہ اس میں سے ہے جس میں دھوکہ داخل ہے کیونکہ پیداوار ایک بار کم ہوتی ہے اور دوسری بار زیادہ ہوتی ہے اور بسا اوقات بالکل کچھ بھی نہیں ہوتا تو زمین کا مالک مقررہ کرایہ ترک کرنے والا ہو جائے گا، بے شک اس کی مثال اس آدمی کی مثل ہے جس نے کسی مزدور کو معین شے کے عوض سفر کے لئے اجرت پر لیا پھر مستاجر نے اجیر کو کہا: میں اپنے اس سفر سے جو نفع حاصل کروں گا اس کا دسواں حصہ تجھے دوں گا وہی تیرے لئے اجرت ہوگی۔ تو نہ یہ حلال ہے اور نہ اسے ایسا کرنا چاہیے۔

امام مالک نے کہا ہے کسی آدمی کو نہیں چاہیے کہ وہ اپنی ذات کو، اپنی زمین کو، اپنی کشتی اور اپنے جانور کو اجرت پر دے مگر ایسی معلوم شے کے عوض جو زائل اور ہلاک نہ ہو اور امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان دونوں کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم بھی یہی کہتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل، لیث، ثوری، اوزاعی، حسن بن حی، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ کوئی آدمی اپنی زمین کسی کو اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے ایک خاص جز مثلاً ثلث اور ربع وغیرہ کی شرط پر دے دے، یہی ابن عمر رضی اللہ عنہما اور طاؤس رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور انہوں نے خیبر کے واقعہ سے استدلال کیا ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں کے باسیوں کو ہی اپنی زمینوں پر ان سے حاصل ہونے والی پیداوار اور پھلوں میں سے نصف کی شرط پر عامل مقرر کیا۔ امام احمد نے کہا ہے کہ کھیت کے کرائے سے نہی کے بارے میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث مضطرب

الالفاظ ہے اور وہ صحیح نہیں ہے اور قصہ خیبر کے بارے قول اولیٰ اور ارجح ہے اور وہ حدیث صحیح ہے۔(1)

تابعین کی ایک جماعت اور ان کے بعد آنے والوں نے اسے جائز قرار دیا ہے کہ آدمی اپنی کشتی اور اپنی سواری کسی کو دے جس طرح کہ وہ اپنی زمین اس جز کے بدلے دیتا ہے جو اس پیداوار میں سے ہو جو اللہ تعالیٰ اسے محنت کے سبب عطا فرمائے گا۔ اور انہوں نے اس میں اپنی اصل اور بنیاد اس مضاربت کو بنایا ہے جس پر اجماع ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ المزمل میں اس ارشاد کے تحت آئے گا: وآخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے بارے کہا ہے کہ ہم بٹائی پر کھیتی کرتے تھے اور ہم اس میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے یہاں تک کہ ہمیں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، یعنی ہم زمین اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے بعض کے عوض کرائے پر دیتے تھے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا: اس میں قصہ خیبر والی حدیث کا نسخ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو شے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نسخ کے بارے قول کو صحیح قرار دیتی ہے وہ وہ روایت ہے جسے ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محاقلہ (پکنے سے پہلے کھیتی فروخت کر دینا) مزابنہ (اندازے سے بیع کرنا) مخابرہ (بٹائی پر کھیتی کا کام کرنے) اور الثنایا (عقد بیع کے وقت مبیع میں سے مجہول شے کی استثنا کر دینا) سے منع فرمایا ہے مگر یہ کہ (جس شے کی استثنا کی گئی ہے) وہ معلوم ہو۔ یہ روایت صحیح ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے(2) کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مخابرہ سے منع فرمایا ہے۔ میں نے پوچھا۔ مخابرہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ تو زمین نصف یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض لے لے۔

مسئلہ نمبر 38۔ یہ قراءتوں کے بیان میں ہے۔ جمہور نے مَا بَقِیَ میں یا کو متحرک پڑھا ہے اور حسن نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی کی مثل جریر کا قول ہے:

هو الخليفة فارضَوا ما رَضِی لکم　　ماضی العزيمةِ ما فی حکمه جَنَفَ

اور عمر بن ربیعہ نے کہا ہے:

کم قد ذکرتُك لو أُجْزَی بذکرِکم　　يا أشبَهَ النَّاسِ کُلَّ الناسِ بالقمرِ

اِنِّی لأَجْذَلُ أن أُمسِی مُقَابِلَه　　حُبًّا لرؤية مَنْ اشْبَهت فی الصُّوَرِ

اس کی اصل ما رَضِیَ اور آنْ اُمسِیَ ہے۔ اور انہوں نے انہیں سکون دیا ہے اور شعر میں ایسا کثرت سے ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں یا کو الف کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو جس طرح الف پر حرکت نہیں آسکتی تو اسی طرح یہاں یا پر بھی حرکت نہیں آسکتی۔ اور اس لغت میں سے جس کی طرف دعوت دینا میں پسند کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ میں تجھے اس کی نصیحت

1۔ صحیح بخاری، باب اذا لم یشترط السنین فی المزارعة، حدیث نمبر 2161، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب فی المخابرة، حدیث نمبر 2958، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کروں وہ واؤ اور یا کو ساکن کرنا ہے۔ حسن نے مابَقِی الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ لغت طی ہے۔ وہ جاریہ کے لئے جاراۃ اور ناصیۃ کے لئے ناصاۃ بولتے ہیں۔ اور شاعر کا قول ہے:

لعمرك لا أخشى التصعلك مابقى على الأرض قيني يسوق الأباعرا

ابو السمال نے تمام قراء کے درمیان سے مِنَ الرِّبُوا مشددہ کے کسرہ، با کے ضمہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو الفتح عثمان بن جنی نے کہا ہے: دو اعتبار سے یہ حرف شاذ ہے، ایک تو اس اعتبار سے کہ اس میں کسرہ سے ضمہ کی طرف خروج ہے اور دوسرا اس اعتبار سے کہ اس میں اسم کے آخر میں ضمہ کے بعد واؤ واقع ہے اور مہدوی نے کہا ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے الف کو پر پڑھا ہے تو وہ اس سے اس واؤ کی طرف جھک گئی جس سے الف ہے اور سوائے اس وجہ کے کسی پر اسے محمول نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ کلام میں کوئی اسم نہیں جس کے آخر میں واؤ ساکن ہو اور اس سے پہلے ضمہ ہو۔ کسائی اور حمزہ نے الربا میں را میں کسرہ کے محل کی وجہ سے امالہ کیا ہے۔ اور باقیوں نے با کے فتحہ کی وجہ سے اسے تفخیم کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابو بکر نے عاصم اور حمزہ سے فَأْذَنُوا پڑھا ہے یعنی تم آگاہ ہو جاؤ۔ (ی کونوا علی اذن) یہ تیرے اس قول سے ہے: انی علی علم (میں جانتا ہوں) اسے ابو عبید نے اصمعی سے بیان کیا ہے۔ اور اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: أذنت به اذنا، ای علمت به یعنی میں نے اس کے بارے جان لیا۔ اور مفسرین میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: فَأْذَنُوا کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کی جانب سے جنگ یقینی سمجھو۔ اور یہ بمعنی الاذن ہے اور ابو علی وغیرہ نے قراۃ المد کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے: کیونکہ جب انہیں ان دوسروں کو خبردار کرنے کے بارے حکم دیا گیا ہو اس سے آگاہ نہیں تو لامحالہ انہوں نے انہیں بتایا۔ مزید کہا: پس ان کے بتانے میں ان کا علم ہے اور ان کے علم میں ان کا اعلام (بتانا) نہیں ہے۔ اور علامہ طبری نے قراۃ القصر کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ ان کے ساتھ مختص ہے۔ بے شک انہیں مد کی قراءت پر اپنے سوا کو آگاہ کرنے کے بارے حکم دیا گیا ہے اور تمام قراء نے لَا تَظْلِمُوْنَ تا کے فتحہ کے ساتھ اور وَلَا تُظْلَمُوْنَ تا کے ضمہ کے ساتھ قراءت کی ہے اور مفضل نے عاصم سے لَا تُظْلَمُوْنَ۔ وَلَا تَظْلِمُوْنَ یعنی پہلی میں تا کو ضمہ کے ساتھ اور دوسرے میں تا کو فتحہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور ابو علی نے کہا ہے۔ جماعت کی قراءت ترجیح یافتہ ہے کیونکہ یہ وَاِنْ تُبْتُمْ کے قول سے مناسبت رکھتی ہے اس میں کہ دونوں فعلوں کی اسناد فاعل کی طرف ہے اور تَظْلِمُوْنَ تاء کے فتحہ کے ساتھ بھی آتا ہے اور یہ اپنے ماقبل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

''اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو مہلت دو اسے خوشحال ہونے تک، اور بخش دینا اسے (قرض) بہت بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو''۔

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ جب اللہ تعالیٰ نے سود لینے والوں کو ان کے اصل اموال کے

بارے حکم فرمایا درآنحالیکہ وہ ان کے پاس ہو جو مال کو پانے والے ہوں، تو تنگدستی کی حالت میں خوشحال ہونے تک مہلت دینے کا ارشاد فرمایا اور وہ یہ کہ ثقیف نے جب اپنے ان اموال کا مطالبہ کیا جو بنی مغیرہ پر قرض تھے تو بنی مغیرہ نے تنگدستی کا عذر پیش کیا اور کہا: ہمارے پاس کوئی شے نہیں ہے اور انہوں نے اپنے پھلوں کے تیار ہونے کے وقت تک مہلت کا مطالبہ کیا، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ۔(1)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ اس ارشاد کے ساتھ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ صاحب قرض کے اپنے مدیون (مقروض) سے مطالبہ کے ثبوت اور اس کی رضا کے بغیر اس کا مال لینے کے جائز ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ غریم جب امکان کے باوجود قرض ادا کرنے سے رکا رہے تو وہ ظالم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اپنے رأس المال کے مطالبہ کو جائز قرار دیا ہے تو جب اس کے لئے مطالبہ کا حق ہے تو پھر وہ جس پر قرض ہے لامحالہ اسے ادا کرنا اس پر واجب ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ مہدوی اور بعض علماء نے کہا ہے یہ آیت اس طریقہ اور رواج کے لئے ناسخ ہے جو زمانہ جاہلیت میں تنگدست کو بیچنے کے بارے میں تھا اور مکی نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائے اسلام میں اس کے بارے حکم فرمایا تھا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: پس اگر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ثابت ہے تب تو یہ نسخ ہے ورنہ یہ نسخ نہیں ہے(2)۔

امام طحاوی نے کہا ہے: ابتدائے اسلام میں قرض میں آزاد آدمی کو بیچ دیا جاتا تھا جب اس کے پس اتنا مال نہ ہوتا جسے وہ اپنے قرض میں ادا کر سکتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور ارشاد فرمایا: وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے دار قطنی نے مسلم بن خالد زنجی کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہمیں زید بن اسلم نے ابن البیلمانی سے اور انہوں نے سرق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی کا مجھ پر کچھ مال تھا...... یا کہا مجھ پر قرض تھا...... پس وہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا اور آپ نے میرے لئے کوئی مال نہ پایا تو آپ نے مجھے اس سے یا فرمایا اس کے لئے فروخت کر دیا۔ بزار نے اسے اس سے طویل سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور مسلم ابن خالد الزنجی اور عبدالرحمن بن البیلمانی دونوں قابل حجت نہیں ہیں اور اہل علم کی ایک جماعت نے کہا ہے: ارشاد باری تعالیٰ: فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ تمام لوگوں کے لئے عام ہے، پس ہر وہ جو تنگدست ہو اسے مہلت دی جائے۔ اور یہی قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حسن اور عام فقہا رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے سب سے اچھا قول حضرت عطاء، ضحاک اور ربیع بن خثیم کا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ آیت ہر تنگدست کے لئے ہے کہ اسے ربا اور تمام قرضوں میں مہلت دی جائے گی اور یہ قول تمام اقوال کو جامع ہے کیونکہ یہ جائز ہے کہ یہ آیت عام ناسخ ہو ربا کے بارے میں نازل ہوئی ہو پھر دوسرے قرضوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 376 2۔ ایضاً

کا حکم بھی اس کے حکم کی طرح ہو گیا ہو۔ اور اس لئے بھی کہ رفع کے ساتھ قرأت اس معنی میں ہے وان وقع ذو عسرة من الناس اجمعین (اور اگر تمام لوگوں میں سے مقروض تنگدست واقع ہو۔)

اور حضرت ابن عباس اور شریح رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: یہ آیت ربا کے بارے میں خاص ہے اور رہے قرضے اور دیگر تمام معاملات تو اس میں مہلت نہیں ہے بلکہ وہ یا تو ان کے مالکوں کو ادا کرے گا یا اس سے اسے محبوس کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اسے پورا کر دے اور یہی ابراہیم کا قول ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا الآیہ (النساء: 58) (بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل ہیں)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول اس پر مرتب ہوتا ہے جب فقر و افلاس شدید اور ذلیل و رسوا کرنے والا نہ ہو اور اگر وہ اس کے فقدان اور فقر کی حالت بالکل صریح اور واضح ہو تو پھر بالضرور اس کے لئے مہلت کا حکم ہو گا (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ جس آدمی کے قرض زیادہ ہوں اور اس کے قرض خواہ اپنے مال کا مطالبہ کریں تو حاکم کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے اپنے کل مال سے فارغ کر دے اور اس کے لئے اتنا مال چھوڑ دے جو اس کی حاجت اور ضرورت کو پورا کر سکے۔ ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ اس کے لئے نہیں چھوڑے گا مگر صرف اتنا جو اسے ڈھانپ سکتا ہو۔ اور مشہور یہ ہے کہ وہ اس کے لئے اتنا مروجہ لباس چھوڑ دے گا جس میں کوئی شے فالتو اور اضافی نہ ہو اور اس سے اس کی چادر نہیں چھینی جائے گی بشرطیکہ وہ اسے بطور تہبند پہنتا ہو۔ اور اس کی بیوی کا لباس چھوڑنے میں اور اگر وہ عالم ہے تو اس کی کتابیں فروخت کرنے میں اختلاف ہے۔ اس کے لئے نہ گھر چھوڑا جائے گا اور نہ خادم اور نہ ہی جمعہ کا لباس چھوڑا جائے گا جبکہ اس کی قیمت کم نہ ہو اور اس وقت اسے محبوس کرنا حرام ہوتا ہے اور اس میں اصل اور بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ائمہ نے روایت بیان کی ہے اور الفاظ مسلم شریف کے ہیں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی کو ان پھلوں میں نقصان ہو گیا جو اس نے خریدے تھے تو اس کا قرض بہت بڑھ گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تصدقوا علیہ تم اس پر صدقہ کرو پس لوگوں نے اس کے لئے صدقہ دیا لیکن وہ اس مقدار کو نہ پہنچ سکا جس سے اس کا قرض پورا ہو سکتا ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے قرض کا مطالبہ کرنے والوں کو فرمایا: خذوا ما وجدتم ولیس لکم الا ذالك (تم جو پاؤ وہ لے لو اور تمہارے لئے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔) اور مصنف ابی داؤد میں ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے غرماء (قرض کا مطالبہ کرنے والے) کے لئے یہ زائد نہیں کہا کہ ''وہ ان کے لئے اپنا مال چھوڑ دے'' اور یہ نص ہے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آدمی کو محبوس کرنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا: اور وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ تھے جیسا کہ شریح نے کہا ہے اور نہ ہی اسے لازم پکڑنے (یعنی اس کے ساتھ ساتھ رہنے) کا حکم فرمایا، بخلاف امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: وہ اس کے ساتھ ساتھ رہیں گے کیونکہ ممکن ہے اس کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 377

مال ظاہر ہو جائے اور قرض خواہ اسے مال کمانے کا پابند نہیں کرے گا اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ وباللّٰہ توفیقنا۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک، شافعی، ابوحنیفہ وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کے قول کے مطابق مفلس کو محبوس کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کے پاس مال کا نہ ہونا ظاہر ہو جائے اور امام مالکؒ کے نزدیک اسے محبوس نہ کیا جائے گا اگر اس پر یہ وہم نہ ہو کہ اس نے اپنا مال غیب کر دیا ہے اور اس کا جھگڑالو ہونا بھی ظاہر نہ ہو اور اسی طرح اسے محبوس نہ کیا جائے گا اگر اس کی تنگدستی درست ہو جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور اگر مفلس کا مال جمع کر لیا جائے پھر وہ قرض کا مطالبہ کرنے والوں تک پہنچنے سے پہلے اور بیع سے پہلے ضائع ہو جائے، تو مفلس پر اس کی ضمانت ہوگی اور قرض خواہوں کا قرض اس کے ذمہ ثابت رہے گا اور اگر حاکم نے اس کا مال فروخت کر دیا اور اس کے ثمن پر قبضہ کر لیا پھر قرض خواہوں کے قبضہ سے پہلے وہ ثمن ضائع ہو گئے تو اس کی ضمانت ان پر ہو گی اور مفلس اس سے بری الذمہ ہوگا اور محمد بن عبدالحکم نے کہا ہے اس کی ضمانت ہمیشہ مفلس سے لی جائے گی یہاں تک کہ وہ غرماء تک پہنچ جائے۔

مسئلہ نمبر 7۔ العسرۃ کا معنی ہے مال نہ ہونے کی جہت سے حال کا تنگ ہونا اور اسی سے جیش عسرہ ہے۔ (یعنی وہ لشکر جس کے پاس مالی حالت تنگ تھی۔) اور النظرۃ کا معنی التاخیر (مہلت دینا) ہے۔ اور المیسرۃ مصدر بمعنی الیسر (خوشحال ہونا) ہے۔ اور ذُو اس کَانَ تامہ کی وجہ سے مرفوع ہے جو بمعنی وجد اور حدث ہے۔ یہ سیبویہ اور ابوعلی وغیرہما کا قول ہے۔ اور سیبویہ نے کہا ہے:

فِدًى لبني ذُهل بن شَيبان ناقتي اذا كان يوم ذو كواكب أشهب

اور نصب بھی جائز ہے۔ مصحف ابی بن کعب رضی اللہ عنہ میں ہے وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ اس معنی کی بنا پر "کہ اگر مطلوب (مقروض) تنگ دست ہو اور اعمش نے وَاِنْ کَانَ مُعْسِرًا فَنَظِرَۃٌ پڑھا ہے۔ ابوعمرو الدانی نے احمد بن موسیٰ سے روایت کیا ہے اور اسی طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ہے۔ نحاس، مکی اور نقاش نے کہا ہے: اس قرأت پر آیت کا لفظ اہل ربا کے ساتھ مختص ہو جائے گا اور جمہور نے ذُوْ پڑھا ہے ان کی قرأت کے مطابق یہ آیت ان تمام کے بارے میں عام ہے جن پر قرض ہو اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور مہدوی نے بیان کیا ہے کہ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں فَاِنْ کَانَ ذُوْعُسْرَۃٍ فا کے ساتھ ہے اور معتمر نے حجاج الوراق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں وَاِنْ کَانَ ذا عُسْرَۃٍ ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے اور جماعت کی قرأت نَظِرَۃٌ ظا کے کسرہ کے ساتھ ہے اور مجاہد، ابورجا اور حسن نے فَنَظْرَۃٌ ظاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے اور وہی ہیں جو کہتے ہیں قَدْ کَرْمَ زید بمعنی کَرُمَ زید اور وہ کہتے ہیں کَبْدٌ بمعنی کَبِدٌ۔ اور اکیلے نافع نے مَیْسُرَۃٍ سین کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور جمہور نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

نحاس نے حضرت مجاہد اور حضرت عطا سے فَنَاظِرْہُ اِلٰی مَیْسُرِہٖ یعنی صیغہ امر اور مَیْسُرِہٖ میں سین کو ضمہ، راء کو کسرہ اور درج

کلام میں یاء کو ثابت رکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ اور فَنَاظِرَۃٌ بھی پڑھا گیا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: فناظِرۃٌ جائز نہیں ہے، وہ سورۃ النمل میں ہے، کیونکہ وہ ایک عورت ہے جس نے اس کے ساتھ اپنی ذات کے بارے کلام کیا ہے۔ یہ نظرتُ تنظُرُ فھی نَاظِرَۃٌ سے ہے اور جو سورۃ البقرہ میں ہے وہ التاخیر بمعنی مہلت دینا سے ہے۔ یہ تیرے اس قول سے ہے۔ انظرتك بالدین۔ یعنی میں نے تیرا قرض موخر کر دیا ہے اور اسی سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (الحجر) (پھر مہلت دے مجھے اس دن تک جب مردے (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے) ابو اسحاق الزجاج نے اسے جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے: یہ مصادر کے اسماء میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَیْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (واقعہ) (نہیں ہو گا جب یہ برپا ہوگی (اسے) کوئی جھٹلانے والا) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے۔ تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ (القیامہ) (خیال کرتے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہوگا) اور اسی طرح خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وغیرہ ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر خَیْرٌ ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کے ساتھ تنگدست پر صدقہ کرنے کو مستحب قرار دیا ہے اور اسے مہلت دے کر اسے بہتر بنا دیا ہے۔ سدی، ابن زید اور ضحاک نے یہی کہا ہے۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے اور دوسروں نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے کہ تمہارا غنی اور فقیر پر صدقہ کرنا تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور پہلا قول صحیح ہے اور آیت میں غنی داخل نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بریدہ بن خصیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے تنگدست مقروض کو مہلت دی اس کے لئے ہر دن کے عوض صدقہ (کا ثواب) ہے۔'' پھر میں نے عرض کی (کیا) ہر دن کے عوض اس کی مثل صدقہ (کرنے کا ثواب) ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہر دن کے عوض صدقہ ہے جب تک قرض کی ادائیگی کا وقت نہ آ پہنچے اور ادائیگی کا وقت آ جانے کے بعد اگر اس نے اسے مؤخر کر دیا تو اس کے لئے ہر دن کے عوض اس کی مثل صدقہ (کرنے کا ثواب) ہے۔''

اور مسلم نے حضرت ابو مسعود سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی کا محاسبہ کیا گیا تو اس کے لئے خیر اور نیکی میں سے کوئی شے نہ پائی گئی سوائے اس کے کہ وہ لوگوں کے ساتھ معاملات کرتا تھا اور خوشحال تھا تو وہ اپنے غلاموں کو حکم دیتا تھا کہ وہ تنگدست سے چشم پوشی کریں، اسے معاف کریں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا: ہم اس سے زیادہ اس کا حق رکھتے ہیں کہ ہم اسے معاف کر دیں۔''

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے مقروض کو تلاش کیا تو وہ آپ سے چھپ گیا پھر آپ نے اسے پالیا تو اس نے کہا: بلاشبہ میں تنگدست ہوں۔ آپ نے پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ کی قسم۔ اس نے کہا: (ہاں) اللہ کی قسم۔ آپ نے بیان کیا: بلاشبہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بیان فرماتے ہوئے سنا ہے: من سرّہ ان ینجیه الله من کرب یوم القیامة فلینفس عن معسر او یضع عنه (جسے یہ شے خوش کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے یوم قیامت کی تکالیف سے نجات عطا فرمائے تو

اسے چاہیے کہ وہ تنگدست مقروض کو مہلت دے یا اس سے قرض بالکل ساقط کر دے (یعنی معاف کر دے)۔

ابو الیسر الطویل کی حدیث میں ہے...... اور ان کا نام کعب بن عمرو ہے...... کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے کسی تنگدست کو مہلت دی یا اس سے قرض ساقط کر دیا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے (عرش کے) سایہ میں جگہ عطا فرمائے گا۔ مَنْ انظر معسرا أو وضع عنه أظلّه الله في ظله ان احادیث میں اس کے بارے ترغیب موجود ہے جس کے بارے نص بیان کی گئی ہے اور حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ قرض کا مالک جب اپنے مقروض کی تنگدستی کا علم رکھتا ہو یا اسے اس کا گمان ہو تو اس پر اس کا مطالبہ حرام ہے، اگرچہ حاکم کے پاس اس کی تنگدستی ثابت نہ بھی ہو۔

اور انظار المعسر کا معنی ہے اسے مہلت دینا یہاں تک کہ وہ خوشحال ہو جائے اور الوضع عنه سے مراد اس کے ذمہ سے قرض کو ساقط کرنا ہے اور دونوں معنوں کو ابو الیسر نے اپنے مقروض کے لئے اس طرح جمع کیا کہ اس کے بارے تحریر مٹا دی اور اسے کہہ دیا: اگر تو ادائیگی کی وسعت پائے تو تو اسے ادا کر دے ورنہ تو بری الذمہ ہے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

''اور ڈرتے رہو اس دن سے لوٹائے جاؤ گے جس میں اللہ کی طرف پھر پورا پورا دے دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا ہے اور ان پر زیادتی نہ کی جائے گی۔''

کہا گیا ہے: بے شک یہ آیت حضور نبی کریم ﷺ کے وصال سے نو راتیں قبل نازل ہوئی پھر اس کے بعد کوئی شے نازل نہ ہوئی، ابن جریج نے یہی کہا ہے۔ ابن جبیر اور مقاتل نے کہا ہے: سات راتیں پہلے نازل ہوئی۔ اور تین راتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ آیت آپ ﷺ کے وصال سے تین ساعتیں قبل نازل ہوئی اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اسے آیۃ الربا اور آیۃ الدین کے درمیان رکھ دو۔'' اور مکی نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس حضرت جبرائیل امین علیہ السلام آئے اور کہا اسے دو سو اسی نمبر آیت کے بعد رکھ دو۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت ابی بن کعب، حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ آخر میں جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ، الی آخر الآیۃ۔ اور پہلا قول زیادہ معروف، بہت زیادہ اصح اور زیادہ مشہور ہے۔ اور اسے ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا ہے: قرآن کریم میں سے جو آخر میں نازل ہوا وہ یہ آیت ہے: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ اور حضرت جبریل امین علیہ السلام نے حضور نبی مکرم ﷺ کو کہا: اے محمد! ﷺ اسے سورۃ البقرہ میں دو سو اسی آیت کے آخر پر رکھو۔'' اسے ابو بکر انباری نے ''کتاب الرد'' میں ذکر کیا ہے۔ اور یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت آخر میں نازل ہوئی۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ اس کے بعد اکیس دن تک باحیات رہے۔ اس کا بیان سورہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴿۱﴾ کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ آیت تمام لوگوں کے لئے نصیحت ہے اور ایسا حکم ہے جو ہر انسان کے ساتھ خاص ہے اور یَوْمًا مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے نہ کہ ظرف ہونے کی بناء پر۔ تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ یہ اس کی صفت ہے۔

ابو عمرو نے اسے تا کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿ (الغاشیہ) (بے شک انہیں (آخر) ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے۔) اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قرأت پر قیاس کرتے ہوئے یوما تصیرون فیه الی الله (یعنی وہ دن جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹو گے۔) اور باقیوں نے اسے تا کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مثلاً رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ (انعام: ٦٢) (پھر لوٹائیں جائیں گے اللہ تعالیٰ کی طرف) وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ (اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا) اور یہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت کے اعتبار سے ہے۔ یَوْمًا تردُّون فیه الی الله (یعنی وہ دن جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔)

اور حسن نے یرجعون یا کے ساتھ پڑھا ہے یہ اس معنی کی بنا پر ہے کہ تمام لوگ لوٹائیں جائیں گے۔

ابن جنی نے کہا ہے: گویا اللہ تعالیٰ نے مومنین کے ساتھ اس بنا پر نرمی اور مہربانی فرمائی کہ وہ ان کی طرف رجعت کے ذکر کے ساتھ متوجہ ہوا، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جس کے ساتھ دل پھٹنے لگتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: وَاتَّقُوْا يَوْمًا پھر رجعت کے ذکر میں ان کے ساتھ انتہائی نرمی فرماتے ہوئے غیب کی طرف رجوع فرمایا اور جمہور علماء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ دن جس سے ڈرایا گیا ہے یہ قیامت قائم ہونے، حساب و کتاب اور پوری پوری جزا ملنے کا دن ہے۔ ایک قوم نے کہا ہے: اس سے مراد موت کا دن ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: آیت کے الفاظ کے حکم کے مطابق پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِلَى اللّٰهِ میں مضاف محذوف ہے۔ اس کی تقدیر عبارت ہے الی حکم الله و فصل قضائه (یعنی تم لوٹائے جاؤ گے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی تقدیر کے فیصلے کی طرف) وَهُمْ یعنی جمع ضمیر كُلٌّ کے معنی پر محمول ہے نہ کہ لفظ پر۔ مگر حسن کی قرأت میں يُرْجَعُوْنَ ہے تو اس کے مطابق وَهُمْ میں ضمیر یرجعون میں جمع ضمیر کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور اس آیت میں اس پر نص ہے کہ ثواب اور عقاب کسب اعمال کے متعلق ہیں اور یہ جبریہ کا رد ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَـيْـــًٔـا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىھُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

''اے ایمان والو! جب تم ایک دوسرے کو قرض دو مدت مقررہ تک تو لکھ لیا کرو اسے اور چاہیے کہ لکھے تمہارے درمیان لکھنے والا عدل وانصاف سے۔ اور نہ انکار کرے لکھنے والا لکھنے سے جیسے سکھایا ہے اس کو اللہ نے پس وہ بھی لکھ دے اور لکھوائے وہ شخص جس کے ذمہ حق (قرضہ) ہے اور ڈرے اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے۔ اور نہ کمی کرے اس سے ذرہ بھر پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے بے وقوف ہو یا کمزور ہو یا اس کی طاقت نہ رکھتا ہو کہ خود لکھا سکے تو لکھائے اس کا ولی (سرپرست) انصاف سے اور بنا لیا کرو دو گواہ اپنے مردوں سے اور اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جن کو پسند کرتے ہو تم (اپنے لئے) گواہ تاکہ اگر بھول جائے ایک عورت تو یاد کرائے (وہ) ایک دوسری کو اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ بلائے جائیں اور نہ اکتایا کرو اسے لکھنے سے خواہ (رقم قرضہ) تھوڑی ہو یا زیادہ اس کی میعاد تک۔ یہ تحریر عدل قائم کرنے کے لئے بہت مفید ہے اللہ کے نزدیک اور بہت محفوظ رکھنے والی ہے گواہی کو اور آسان طریقہ ہے تمہیں شک سے بچانے کا مگر یہ کہ سودا دست بدستی ہو جس کا تم لین دین آپس میں کرو (اس صورت میں) نہیں تم پر کچھ حرج اگر نہ بھی لکھوا سے اور گواہ ضرور بنا لیا کرو جب خرید وفروخت کرو اور ضرر نہ پہنچایا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو۔ اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ نافرمانی ہوگی تمہاری اور ڈرا کرو اللہ سے اور سکھاتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ (آداب معاشرت) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

اس میں باون مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ الآیہ۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ قرآن کریم نے آیۃ الدین عرش کے پاس سے حاصل کی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ آیت خاص کر بیع سلم کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اہل مدینہ کا بیع سلم کرنا اس آیت کے نازل ہونے کے سبب ہے پھر یہ بالاجماع ان عقود کو شامل ہوگئی ہے جن میں قرض اور دین وغیرہ ہوتا ہے (1)۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت تیس احکام کو متضمن ہے اور اس سے ہمارے بعض علماء نے قرضوں میں مدت مقرر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 378

کرنے کے جواز پر استدلال کیا ہے، جیسا کہ امام مالک نے کہا ہے، کیونکہ انہوں نے قرض اور تمام عقود مداینات میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اور شوافع نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: اس آیت میں تمام قرضوں میں تاجیل کے جواز پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلاشبہ اس میں گواہ بنا لینے کا حکم ہے جب وہ دین مؤجل ہو، پھر دین میں تاجیل کے جواز اور اس کے ممتنع ہونے کے بارے دوسری دلیل سے جانا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: بِدَيْنٍ یہ تاکید ہے۔ جیسا کہ یہ قول ہے وَلَا طٰٓىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (انعام:۳۸) (اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دو پروں سے) فَسَجَدَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ (الحجر) (پس سر بسجود ہو گئے فرشتے سارے کے سارے) اور دین کی حقیقت یہ ہے کہ یہ عبارت ہے ہر اس معاملہ سے جس میں دو عوضوں میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا دوسرے کے ذمہ ادھار ہو، کیونکہ عربوں کے نزدیک عین وہ ہے جو حاضر ہو اور دین وہ ہے جو غائب ہو جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وَعَدتُنَا بدِرهَمَينَا طِلَاءً　و شواء معجّلا غَيرَ دَيْنِ

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

لِترم بی المنایا حیثُ شاءتْ　اذا لم ترمِ بی فی الحُفرتَيْنِ

اِذَا ما اَوْقَدُوْا حطبا و نارًا　فذاك الموتُ نقداً غَيرَ دَيْنِ

تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس معنی کو اپنے اس قول حق کے ساتھ بیان کیا ہے اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ابن منذر نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اس پر دلیل ہے کہ بیع سلم کرنا مجہول مدت تک جائز نہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی کتاب اللہ کے معنی کی مثل پر دلیل ہے۔ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے اور وہ پھلوں میں قرض دو، تین سال کے لئے لے لیا کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی کھجوروں کے عوض قرض کسی کو دے تو اسے چاہیے کہ وہ معین کیل اور وزن، معین مدت تک قرض دے'' (1)۔

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ اسے بخاری، مسلم وغیرہما نے نقل کیا ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: دور جاہلیت کے لوگ اونٹوں کے گوشت کی بیع اونٹنی کے حمل کے حاملہ ہونے تک کرتے تھے حبل الحبلہ کا معنی ہے کہ اونٹنی بچہ جنے پھر وہ حاملہ ہو جو جنا گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع فرمایا (2)۔ اہل علم میں سے وہ تمام جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ان کا اس پر اجماع ہے کہ جائز بیع سلم وہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے ساتھی کے ساتھ ایسے طعام (اناج) کی بیع سلم کرے جس کی مقدار معلوم ہو اور وصف بھی معلوم ہو، وہ عام زمین کے اناج میں سے ہو جس کی مثل میں وہ غلطی اور خطا نہ کرے، معین کیل کے ساتھ، مدت معلومہ تک معلوم دنانیر یا دراہم کے عوض، جو وہ اسے مسلم فیہ کے بدلے دے گا دونوں

1۔ صحیح بخاری، کتاب السلم، باب السلم فی کیل معلوم، حدیث نمبر 2085، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، باب السلم الی تنتج الناقۃ، حدیث نمبر 2096، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(رب السلم اور مسلم الیہ) کے اس مقام سے جدا ہونے سے پہلے پہلے جہاں انہوں نے آپس میں بیع کی ہے اور دونوں اس جگہ کا تعین بھی کریں گے جس میں اس طعام پر قبضہ کیا جائے گا۔ پس جب دونوں نے ایسا کر لیا تو یہ امر جائز ہو گیا اور بیع سلم صحیح ہوگئی۔ میں اہل علم میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا جو اسے باطل قرار دیتا ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک بیع سلم کرنا فصل کی کٹائی، پھل توڑنے اور نیروز اور مہرجان کے دنوں تک یہ جائز ہے کیونکہ یہ وقت اور معلوم زمانے کے ساتھ مختص ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ ہمارے علماء نے بیع سلم کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے(1) یہ معلوم شے کی بیع ہے جو دوسرے کے ذمہ لازم ہو جائے اور اس کا وصف معلوم ہو ایسے دراہم و دنانیر کے عوض جو موجود ہوں یا ایسی شے کے عوض جو ان کے حکم میں ہو مدت معلومہ تک۔ پس اسے معلوم فی الذمۃ کے ساتھ مقید کرنا مجہول سے بچنے کا فائدہ دیتا ہے اور اعیان معینہ میں سلم کرنے سے (بچنے کا فائدہ دیتا ہے) مثلاً وہ جو مدینہ طیبہ کے باسی اس وقت قرض لیتے تھے جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، کیونکہ وہ کھجور کے پھلوں میں ان کے اعیان کے بدلے قرض لیتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع فرما دیا کیونکہ اس میں دھوکے اور نقصان کا امکان ہے، کیونکہ کبھی وہ درخت خراب ہو جاتے ہیں اور وہ بالکل ثمر بار نہیں ہوتے اور ان کا قول محصور بالصفة یہ اس معلوم سے بچنے کے لئے ہے جس کے بارے مجمل علم تو ہو لیکن تفصیلی علم نہ ہو۔ جیسا کہ اگر کوئی کھجوروں، یا کپڑوں یا مچھلیوں میں بیع سلم کرے اور ان کی نوع بیان کرے اور نہ ان کی کوئی معین صفت بیان کرے۔

اور ان کا قول بِعَيْنٍ حَاضِرَةٍ یہ دین کے عوض دین کی بیع کرنے سے بچنے کے لئے ہے اور ان کا قول أو ما هو في حكمها یہ ان دو اور تین دنوں سے بچنے کے لئے ہے جن میں مسلم الیہ کو رأس المال میں تاخیر کرنا جائز ہوتا ہے، کیونکہ ہمارے نزدیک اتنی مقدار اسے موخر کرنا جائز ہوتا ہے، شرط کے ساتھ بھی اور بغیر شرط کے بھی کیونکہ یہ بالکل قریب ہے اور اسے اس پر مشروط کرنا جائز نہیں ہے۔

امام شافعی اور امام ابوحنیفہ نے بیع سلم میں رأس المال کو عقد اور افتراق (رب السلم اور مسلم الیہ کا مجلس عقد سے جدا ہونا) سے مؤخر کرنا جائز قرار نہیں دیا۔ اور انہوں نے یہ جانا ہے کہ یہ بیع صرف کی طرح ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ دونوں باب مختلف ہیں اور اپنے اپنے اوصاف کے ساتھ مختص ہیں، کیونکہ بیع صرف اس کا باب تنگ ہے اور اس میں شروط زیادہ ہیں بخلاف سلم کے کیونکہ اس پر معاملات کے عیوب بہت زیادہ ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور قولهم، الی أجل معلوم یہ سلم حال سے بچنا ہے کیونکہ یہ مشہور قول کے مطابق جائز نہیں ہے اور اس کا ذکر آگے آئے گا اور اجل کو معلوم کی صفت سے متصف کرنا اس مجہول مدت سے بچنا ہے جس پر وہ زمانہ جاہلیت میں بیع سلم کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 5۔ سلم اور سلف دونوں لفظ ایک ہی معنی سے عبارت ہیں اور یہ دونوں حدیث میں آئے ہیں مگر اس باب سے خاص اسم سلم ہے کیونکہ سلف قرض پر بولا جاتا ہے اور سلم بالاتفاق جائز بیوع میں سے ایک بیع ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ

1۔ (بیع معلوم فی الذمة محصور بالصفة بعین حاضرة او ما هو فی حکمها الی اجل معلوم)

والسلام نے اس شے کی بیع کرنے سے جو تیرے پاس نہ ہو منع فرمایا ہے (1) یہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلم میں رخصت دی ہے کیونکہ سلم جب ذمہ میں معلوم شے کی بیع ہے تو یہ ایک غائب شے کی بیع ہے جس کی طرف متبایعین میں سے ہر ایک کی ضرورت دعوت دیتی ہے، کیونکہ رأس المال کا مالک اس کا محتاج ہے کہ وہ پھل خریدے اور پھل کا مالک اسے توڑے اور علیحدہ کرنے سے پہلے اس کے ثمن کا محتاج ہے تاکہ وہ اسے اس پر خرچ کر سکے، پس یہ ظاہر ہوا کہ بیع سلم ضروری مصالح میں سے ہے۔ اور فقہاء نے اس کا نام بیع المحاویج رکھا ہے۔ اور اگر یہ حالاً (یعنی ثمن اور مبیع کا موجود ہونا) ہی جائز ہو تو یہ حکمت باطل ہو گئی اور یہ مصلحت اٹھ گئی اور جو شے تیرے پاس موجود نہیں اس کی بیع سے اس کی استثنا کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ بیع سلم کی وہ شرائط جن پر اتفاق کیا گیا ہے اور جن میں اختلاف کیا گیا ہے وہ نو ہیں: چھ شرائط مسلم فیہ میں ہیں اور تین بیع سلم کے رأس المال میں ہیں۔

پس وہ چھ جو مسلم فیہ میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں: مسلم فیہ اس کے ذمہ لازم ہو جائے، اس کا وصف بیان ہو، اس کی مقدار معلوم ہو، وہ مؤجل ہو، اس کی مدت معلوم ہو اور وہ مدت پوری ہونے کے وقت محل معین پر موجود ہو۔

اور رہیں وہ تین شرطیں جو رأس المال میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں: اس کی جنس معلوم ہو، مقدار معلوم ہو، اور نقد ہو۔ اور یہی وہ تین شرائط ہیں جو رأس المال میں پائی جاتی ہیں اور یہ نقد کے سوا متفق علیہ ہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: جہاں تک پہلی شرط کا تعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم فیہ اس کے ذمہ ہو جائے تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ اس سے مقصود اس کا ذمے میں ہونا ہے، کیونکہ یہ عقد مداینہ ہے (یعنی یہ اس کے ذمہ قرض ہو جاتی ہے) اور اگر ایسا نہ ہو تو از روئے دین کے یہ مشروع نہ ہو اور نہ ہی ربح و رفق کے طور پر لوگ اس کا قصد کریں۔ اور اس قول پر لوگوں کا اتفاق ہے۔ مگر امام مالک نے کہا ہے: کسی معین شے میں بیع سلم جائز نہیں ہوتی مگر دو شرطوں کے ساتھ۔ ان میں سے ایک یہ کہ وہ بستی محفوظ و مامون ہو اور دوسری یہ کہ وہ اس کے لینے میں شروع ہو جائے مثلاً بکری سے دودھ اور کھجور کے درخت سے تر کھجوریں اور ان کے سوا کسی نے یہ قول نہیں کیا ہے۔ اور یہ دونوں مسئلے دلیل میں صحیح ہیں، کیونکہ بیع سلم میں تعیین ممتنع ہے مزابنہ اور غرر کے خوف سے تاکہ (ادائیگی کے) محل کے وقت وہ متعذر نہ ہو اور جب جگہ مامون ہو تو اغلباً جو شے اس میں ہوتی ہے اس کا پایا جانا متعذر نہیں ہوتا (لہٰذا) وہ جائز ہے۔ کیونکہ مسائل فقہ میں عواقب اور انجام کی ضمانت کے قطعی ہونے پر یقین نہیں کیا جا سکتا اور ان میں تھوڑے سے دھوکے کا احتمال ضرور ہوتا ہے اور فرعی مسائل میں ایسا بہت زیادہ ہے۔ ان کی تعداد کتب مسائل میں ہے۔

اور رہی بیع سلم دودھ میں اور ایسی کچی کھجوروں میں جنہیں لینا شروع کر دیا ہو تو یہ مدینہ طیبہ کا مسئلہ ہے اور اس پر اہل مدینہ کا اجماع ہے اور اس کی بناء مصلحت کے قاعدہ پر ہے کیونکہ آدمی دودھ اور کھجوریں یومیہ مزدوری اور اجرت کے طور پر لینے کا محتاج ہے اور ہر روز ابتداءً اس کے لئے لینا شاق ہوتا ہے، کیونکہ نقد کبھی موجود نہیں ہوتے اور اس لئے بھی کہ بھاؤ مختلف ہوتا رہتا ہے اور کھجوروں اور دودھ والا نقد کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ اس کے پاس تو سامان ہے وہ اپنے لئے کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔

1۔ مسند امام احمد، حدیث 6628

پس جب دونوں ہی حاجت میں مشترک ہیں تو دونوں کے لئے اس معاملہ میں رخصت دی گئی ہے عرایا اور دیگر اصول حاجات ومصالح پر قیاس کرتے ہوئے۔

اور رہی دوسری شرط تو وہ یہ ہے کہ اس کی صفت بیان کی گئی ہو۔ یہ متفق علیہ ہے اور اسی طرح تیسری شرط بھی ہے اور اندازہ تین وجہوں سے ہوسکتا ہے۔ کیل (ماپ) وزن اور عدد۔ اور اس کا دارومدار عرف پر ہوتا ہے اور وہ یا تو لوگوں کا عرف ہوگا یا عرف شرع ہوگا۔

اور رہی چوتھی شرط! تو وہ یہ کہ مسلم فیہ مؤجل ہو اور اس میں اختلاف ہے، پس امام شافعی نے کہا ہے: سلم حال جائز ہوتی ہے اور اکثر علماء نے اس کا انکار کیا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: مدت مقرر کرنے میں مالکیہ مضطرب ہیں یہاں تک کہ انہوں نے اسے ایک دن کی طرف لوٹا دیا ہے، یہاں تک کہ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: سلم حال جائز ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس میں تاجیل (مدت مقررہ) کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ مبیع کی دو قسمیں ہیں: معجل اور وہ معین ہے اور دوسری مؤجل، پس اگر یہ سلم حال ہو اور مسلم الیہ کے پاس اس وقت موجود نہ ہو تو یہ بیع مالیس عندك کے باب سے ہو جائے گی۔ پس مدت کا مقرر ہونا اور مہلت ہونا ضروری ہے تاکہ ہر عقد اپنی صفت اور اپنی شرائط کے مطابق خالص ہو۔ اور اس میں احکام شرعیہ جاری ہو سکتے ہوں۔

اور ہمارے علماء کے نزدیک اس کی حد اتنی مدت ہے جتنی مدت میں منڈیاں متغیر ہوتی رہتی ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی: إلی اجل معلوم یہ ہر کہنے والے کے قول سے غنی اور بے نیاز کر دیتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: سلم حال میں سے ہمارے علماء نے جسے جائز قرار دیا ہے وہ وہ ہے جس کا بھاؤ شہروں میں مختلف ہوتا رہتا ہے۔ پس سلم ان چیزوں میں جائز ہوتی ہے جن میں اور اس کے درمیان ایک دن یا دو دن یا تین دن باقی ہوں۔ اور رہا ایک ہی شہر تو اس میں جائز نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا بھاؤ ایک ہی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور رہی پانچویں شرط اور وہ یہ ہے کہ اجل معلوم ہو تو امت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجل (مدت کے تعین) کے بارے فرمادیا ہے۔

اور امام مالک فقہائے امصار میں سے اس میں منفرد ہیں کہ باغ توڑنے اور فصل کاٹنے کے وقت تک بیع سلم جائز ہے۔ کیونکہ انہوں نے اسے مدت معلوم ہی قرار دیا ہے۔ اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: یسالونك عن الاهلة کے تحت بحث گزر چکی ہے۔

اور رہی چھٹی شرط! تو وہ یہ ہے کہ ادائیگی کے وقت وہ موجود ہو تو اس میں بھی امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور اگر مدت پوری ہونے پر امر الٰہی سے مبیع ناپید ہو جائے تو تمام علماء کے نزدیک عقد فسخ ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ بیع سلم کی شرائط میں سے یہ نہیں ہے کہ مُسْلَم الیہ مسلم فیہ کا مالک ہو بخلاف بعض سلف کے

کیونکہ امام بخاری نے محمد بن مجالد سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ عبداللہ بن شداد اور ابو بردہ نے مجھے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی طرف بھیجا اور ان دونوں نے کہا: ان سے پوچھو کیا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کے زمانہ میں گندم میں بیع سلم کرتے تھے؟ تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم شام کے رہنے والے کسانوں سے گندم، جو اور زیتون میں معلوم کیل کے ساتھ معلوم مدت تک بیع سلم کرتے تھے۔ میں نے کہا کون ہے جس کے پاس اس کی اصل ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہم اس کے بارے ان سے سوال کرتے رہے پھر ان دونوں نے مجھے عبدالرحمن بن ابزی کی طرف بھیجا، سو میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کے عہد مقدس میں بیع سلم کرتے تھے اور ہم ان سے نہ پوچھتے کیا ان کی کھیتی ہے یا نہیں (1)؟ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عقد کے وقت سے لے کر مدت مقررہ تک مسلم فیہ کا پایا جانا شرط قرار دیا ہے، اس خوف کی وجہ سے کہ مسلم فیہ کا مطالبہ کیا جائے اور وہ نہ پائی جائے تو وہ دھوکہ اور نقصان ہوگا۔ اور تمام فقہاء نے آپ کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ مدت مقررہ مکمل ہونے کے وقت اس کے موجود ہونے کا لحاظ رکھا جائے گا۔

علمائے کوفہ اور ثوری نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر مسلم فیہ ایسی شے ہو جس کا بوجھ ہو اور اسے اٹھانے میں مشقت ہو تو پھر محل قبض کا ذکر کیا جائے۔ اور انہوں نے کہا ہے: جب مسلم فیہ سپرد کرنے کی جگہ کا ذکر نہ کیا گیا تو بیع سلم فاسد ہوگی۔ اور اوزاعی نے کہا ہے: وہ مکروہ ہوگی۔ اور ہمارے نزدیک اگر وہ اس کے ذکر سے خاموش رہے تو عقد فاسد نہ ہوگا اور محل قبض متعین ہو جائے گا۔ امام احمد، اسحاق اور محدثین کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے، کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں اس جگہ کا ذکر موجود نہیں ہے جس میں مسلم فیہ پر قبضہ کیا جائے گا۔ اگر یہ بیع سلم کی شرائط میں سے ہوتی تو یقیناً حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے اسی طرح بیان فرما دیتے جس طرح آپ نے کیل، وزن اور اجل (مدت) کے بارے بیان فرما دیا ہے اور اسی کی مثل حضرت ابن ابی اوفیٰ کی حدیث ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ ابو داؤد نے سعد الطائی سے، انہوں نے عطیہ بن سعد سے اور انہوں نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی نے کسی شے میں بیع سلم کی تو اسے چاہیے کہ وہ اسے کسی اور کی طرف نہ پھیرے (2)۔'' ابو محمد عبدالحق بن عطیہ نے کہا ہے: وہ عوفی ہے (یہ عطیہ بن سعد کا لقب ہے) اور کسی نے بھی اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا ہے، اگرچہ بزرگ اور اجلہ راویوں نے اس سے روایت نقل کی ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس آدمی کے بارے میں حکم یہ ہے جس نے معلوم قیمت کے ساتھ مقررہ مدت تک کسی اناج میں بیع سلم کی۔ پس مدت گزر گئی اور خریدنے والے نے بائع کے پاس اس شے میں سے ادا کرنے کے لئے کوئی شے نہ پائی جسے اس نے اس سے خریدا تھا تو وہ اس سے اقالہ کر لے اور اسے چاہیے کہ وہ اس سے چاندی یا سونے یا بعینہٖ اس ثمن کے سوا جو اس نے اسے دیئے تھے نہ لے اور نہ اس ثمن کے عوض وہ اس سے کوئی اور شے خریدے، یہاں تک کہ وہ ان پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب السلم، حدیث نمبر 2088، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب السلف لا یحول، حدیث نمبر 3008، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قبضہ کرلے اور وہ اس لئے ہے کہ جب اس نے ان ثمنوں کے علاوہ لے لئے جو اس نے دیئے تھے یا اس نے انہیں ایسے سودے کی طرف پھیر دیا جو اس طعام کے سوا ہو جو اس نے اس سے خریدا تھا تو یہ طعام کو پورا کرنے سے پہلے اسے بیچنا لازم آتا ہے۔ امام مالک نے کہا ہے: تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طعام کو پورا کرنے سے پہلے اس کی بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: فَاكْتُبُوْهُ یعنی تم قرض اور مدت کو لکھ لو...... اور کہا جاتا ہے: کتابت کا حکم دیا گیا ہے لیکن مراد لکھنا اور گواہ بنانا ہے کیونکہ تحریر گواہوں کے بغیر حجت نہیں ہوتی۔ اور کہا جاتا ہے: ہمیں کتابت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ ہم بھول نہ جائیں۔

ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حماد بن سلمہ سے، انہوں نے علی بن زید سے انہوں نے یوسف بن مہران سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں فرمایا ہے: اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ الی آخر الآیۃ بلاشبہ جس نے سب سے اول انکار کیا وہ حضرت آدم علیہ السلام تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد دکھائی تو آپ نے ایک آدمی کو دیکھا جس کا نور انتہائی روشن اور پھیلا ہوا تھا، تو آپ نے عرض کی اے میرے رب! یہ کون ہے؟ رب کریم نے فرمایا یہ تیرا بیٹا داؤد علیہ السلام ہے۔ عرض کی اے میرے پروردگار اس کی عمر کتنی ہے؟ فرمایا: ساٹھ برس۔ عرض کی: اے میرے رب! اس کی عمر میں اضافہ فرما دے۔ تو رب کریم نے فرمایا: نہیں مگر یہ کہ تو اپنی عمر میں سے اس میں اضافہ کر دے۔ عرض کی: میری عمر کتنی ہے؟ فرمایا: ہزار برس۔ آدم علیہ السلام نے عرض کی: میں نے چالیس برس اسے عطا کر دیئے۔ بیان فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے اس پر تحریر لکھ لی اور اس پر اپنے ملائکہ کو گواہ بنالیا۔ پس جب وفات کا وقت آپہنچا اور ملائکہ حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے فرمایا ابھی میری عمر سے چالیس برس باقی ہیں۔ ملائکہ نے کہا: بلاشبہ آپ نے وہ اپنے بیٹے داؤد علیہ السلام کو ہبہ کر دیئے تھے تو آپ نے فرمایا: میں نے کسی کو کوئی شے ہبہ نہیں کی۔ آپ نے فرمایا: سو اللہ تعالیٰ نے وہ تحریر نکالی اور اس پر ملائکہ گواہ تھے...... اور ایک روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کے لئے سو برس اور آدم علیہ السلام کے لئے ان کی عمر ہزار برس مکمل کر دی (1)۔'' اسے ترمذی نے بھی نقل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَاكْتُبُوْهُ میں اس طرف واضح اشارہ ہے کہ وہ (قرض کے بارے) تحریر لکھے اس طرح جو اس کی مکمل وضاحت کرنے والی ہو اور اس سے ہر قسم کے وہم کو دور کرنے والی ہو ایسے اختلاف کے بارے میں جس کا وہم دو باہم معاملات کرنے والوں کے درمیان ہو سکتا ہے اور اگر وہ دونوں اپنا معاملہ حاکم کے سامنے پیش کریں تو وہ تحریر حاکم کی ایسی راہنمائی کرنے والی ہو جس کے مطابق وہ فیصلہ کر سکے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرضوں کا لکھنا ان کے مالکوں پر واجب ہے، اسی آیت کے ساتھ وہ فرض کیا گیا ہے، چاہے وہ بیع کے سبب ہو یا قرض کی صورت میں ہو، تاکہ اس میں بھول یا انکار ممکن نہ ہو سکے۔ اور یہی علامہ طبری

1۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 3002-3250، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کا اختیار ہے اور ابن جریج نے کہا ہے: جس کسی کو کوئی قرض دے اسے چاہیے کہ وہ لکھ لے اور جو کوئی شے فروخت کرے تو اسے چاہیے کہ وہ گواہ بنالے۔

اور علامہ شعبی نے کہا ہے: وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ: فَاِنْ اَمِنَ یہ حکم تحریر کے لئے ناسخ ہے اور اسی طرح ابن جریج نے بیان کیا ہے اور ابن زید نے یہی کہا ہے اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے اور ربیع نے یہ موقف اپنایا ہے کہ وہ ان الفاظ کے ساتھ واجب ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ اس میں تخفیف فرمائی: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا۔

اور جمہور نے کہا ہے: اموال کی حفاظت اور شک کو زائل کرنے کے لئے لکھ لینا مستحب ہے۔ اور جب مقروض متقی ہو تو تحریر اس کے لئے ضرر رساں نہیں اور اگر وہ ایسا نہ ہو تو تحریر اس کے قرض کے بارے اور صاحب حق کی حاجت کے بارے ایک اعتماد اور یاد دہانی ہے، بعض نے کہا ہے: اگر تو گواہ بنالے تو یہ احتیاط ہے اور اگر تو امین بن جائے تو یہ بھی حلال ہے اور اس کی گنجائش ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہی قول صحیح ہے اور اس میں نسخ مرتب نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے لئے اس شے کے بارے میں لکھنا مستحب قرار دیا ہے جسے وہ ہبہ کرے اور اسے چھوڑ دے یہ اجماع سے ثابت ہے اور اس کا مستحب ہونا بلاشبہ لوگوں کے اعتماد اور بھروسہ کی بناء پر ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ حضرت عطا وغیرہ نے کہا ہے: کاتب پر واجب ہے کہ وہ لکھے، شعبی نے یہی کہا ہے اور یہ اس وقت ہے جب اس کے سوا کوئی کاتب موجود نہ ہو تو پھر اس پر واجب ہے کہ وہ لکھے۔ سدی نے کہا ہے: اس پر لکھنا واجب ہے جب وہ فارغ ہو۔ پہلے سے لام کو حذف کر دیا گیا ہے اور دوسرے میں اسے ثابت رکھا گیا ہے کیونکہ دوسرا غائب کے لئے ہے اور پہلا مخاطب کے لئے ہے۔ اور کبھی یہ مخاطب میں ثابت ہوتی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلْتَفْرَحُوا یہ تاء کے ساتھ ہے اور غائب میں حذف ہو جاتی ہے اور اسی سے شاعر کا یہ قول ہے:

محمد تفد نفسَكَ كلُّ نَفْسٍ اِذَا ما خِفْتَ من شئٍ تَبَالا

اس میں تُفْدِ سے لام محذوف ہے یہ مونث غائب کا صیغہ ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ قولہ تعالیٰ: بِالْعَدْلِ یعنی حق اور انصاف کے ساتھ، یعنی صاحب حق کے لئے نہ اس سے زیادہ لکھا جائے گا اور نہ اس سے کم۔ اور فرمایا: بَّيْنَكُمْ یہ نہیں کہا أحد کم، کیونکہ جب وہ آدمی جس کا قرض ہے وہ اس کی کتابت میں شک کر سکتا ہے جس پر قرض ہے اور اسی طرح اس کا برعکس بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے کاتب ایسے آدمی کو قرار دیا ہے جو ان دونوں کے سوا ہو وہ عدل کے ساتھ لکھے، اس کے دل میں اور نہ اس کے قلم میں دونوں میں سے ایک کی دوسرے پر ترجیح ہو۔ (یعنی ایک جانب اس کا جھکاؤ نہ ہو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بے شک لوگ جب معاملات کرتے ہیں تو کوئی بھی معاملہ سے جدا نہیں ہوتا اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو لکھ سکتے ہیں اور وہ بھی جو نہیں لکھ سکتے، اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ ان کے درمیان ایک کاتب عدل و انصاف کے

ساتھ لکھ دے۔

مسئلہ نمبر 13۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد بِالْعَدْلِ میں باء وَلْيَكْتُبْ کے متعلق ہے کَاتِبٌ کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ کوئی معاہدہ (یادستاویز) نہ لکھے مگر اپنی ذات میں عدل کے ساتھ، حالانکہ اسے بچہ، غلام اور حفاظت و نگرانی کرنے والا سب اسے لکھ سکتے ہیں جبکہ وہ اس کی سمجھ اور فقاہت رکھتے ہوں۔ وہ لوگ جو لکھنے کے لئے مقرر ہوتے ہیں والیوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ انہیں چھوڑ دیں مگر جب کہ وہ اپنی رضامندی کے ساتھ کنارہ کش ہو جائیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لوگوں کے درمیان معاہدے کوئی نہیں لکھ سکتا مگر وہی جو انہیں جاننے والا ہو، فی نفسہ عادل ہو اور مامون ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اس بنا پر با کاتب کے متعلق ہے یعنی چاہیے کہ ان کے درمیان عادل کاتب لکھے، پس بِالْعَدْلِ محل صفت میں واقع ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ اس میں اللہ تعالیٰ نے کاتب کو انکار کرنے سے منع کیا ہے۔ لوگوں نے کاتب پر کتابت کے وجوب اور شاہد پر شہادت کے وجوب میں اختلاف کیا ہے، پس طبری اور ربیع نے کہا ہے۔ ''کاتب پر واجب ہے جب اسے لکھنے کا حکم دیا جائے اور حسن نے کہا ہے: یہ اس پر ایسی جگہ واجب ہے جہاں اس کے سوا اور کوئی کاتب میسر نہ ہو، کیونکہ اس کے انکار سے صاحب قرض کا نقصان ہو جائے گا...... پس اگر صورت حال اس طرح ہو تو پھر یہ فرض ہے اور اگر اس کے سوا دوسرے کاتب پر قدرت ہو تو پھر اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے جبکہ وہ دوسرا اس ذمہ داری کو ادا کرے۔ سدی نے کہا ہے: کاتب پر فارغ ہونے کی حالت میں لکھنا واجب ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ مہدوی نے ربیع اور ضحاک سے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلَا يَاْبَ اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ ان کے نظریہ پر جاری ہوتا ہے جن کا یقین یا ظن یہ ہے کہ پہلے متبایعین میں سے جو بھی لکھنا پسند کرے اس پر لکھنا واجب تھا اور اس کے لئے انکار کرنا جائز نہ تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے اسے منسوخ کر دیا: وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ اور یہ بعید ہے۔ کیونکہ اس کا واجب ہونا ہر اس پر ثابت نہیں جو بھی متبایعین میں سے اس کا ارادہ کرے وہ جو بھی ہو۔ اگر کتابت واجب ہوتی تو اس کے عوض اجرت لینا صحیح نہ ہوتا، کیونکہ فرائض میں سے کسی فعل پر اجرت لینا باطل ہے اور اس دستاویز کے لکھنے پر اجرت لینے کے جواز میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ یہ امر ارشاد ہے پس وہ لکھتا ہے اور اپنا حق لے لیتا ہے اور اَبَى يَاْبَى شاذ ہے، اور یہ نہیں آتا مگر اس طرح قَلَى يَقْلَى، اَبَى يَاْبَى، غَسَى يَغْسَى اور جَبَى الخراج يَجْبَى اور یہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ، كَمَا میں کاف اَنْ يَّكْتُبَ کے متعلق ہے معنی یہ ہے کتبا کما علمہ اللہ، یعنی لکھنا اس طرح ہو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اس کے متعلق ہو جو اس قول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 379

میں ہے وَلَا یَاْبَ معنی کے اعتبار سے، یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پر علم کتابت کے ساتھ انعام واحسان فرمایا ہے پس وہ انکار نہ کرے اور چاہیے کہ اسے اسی طرح فضیلت دے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پر (اسے) فضیلت دی ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ کلام اس معنی پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اَنْ یَّكْتُبَ کے پاس مکمل ہو پھر كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ یہ نیا کلام ہو اور کاف قول باری تعالیٰ فَلْیَكْتُبْ کے متعلق ہو۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ اور املا کرانے والا وہ مقروض اور مطلوب ہے جو اپنے بارے میں اپنی زبان سے اقرار کرتا ہے تا کہ جو اس کے ذمہ واجب الاداء ہے وہ اس کے بارے آگاہ کرے۔ املا اور املال دو لغتیں ہیں۔ أَمَلَّ اور أَمْلٰی، پس أَمَلَّ اہل حجاز اور بنی اسد کی لغت ہے اور بنی تمیم کہتے ہیں: أَمْلَيْتُ۔ اور قرآن میں دونوں لغتیں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝ (الفرقان) (پھر یہ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اسے ہر صبح وشام (تا کہ از بر ہو جائیں)) اصل اَمْلَلْتُ ہے اس میں لام کو یا سے بدل دیا گیا ہے کیونکہ یہ زیادہ خفیف ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے املا کا حکم دیا ہے جس پر حق ہے، کیونکہ شہادت اس کے اقرار کے سبب ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں تقویٰ کا حکم دیا ہے جس میں وہ املا کرائے اور حق میں سے کوئی شے کم کرنے سے منع کیا ہے۔ اور البخس کا معنی کم کرنا اور گھٹانا ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ (البقرہ:228) (اور جائز نہیں ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں)

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا بعض لوگوں نے کہا ہے: ضعیف سے مراد صغیر ہے اور یہ غلطی ہے کیونکہ سفیہ (بے وقوف) کبھی بڑا بھی ہوتا ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔ اَوْ ضَعِيْفًا یعنی ایسا کبیر جس کی عقل نہ ہو۔ اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ وہ جس پر قرض ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی چار قسمیں قرار دی ہیں: ایک مستقل بنفسہ ہو خود املا کرائے۔ اور تین قسموں کے وہ ہیں جو خود املا نہیں کرا سکتے اور ہر وقت ان کی تکلیفیں اور اعذار باقی رہتے ہیں، معاملات کے سوا کئی جہتوں میں ان کا حق اس طرح مترتب ہوتا ہے جس طرح کہ میراث جب وہ تقسیم کی جائے وغیرہ ذالک اور وہ بے وقوف، کمزور اور وہ آدمی ہے جو املا کرانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ پس سفیہ وہ ہے جس کی رائے اس مال کے بارے میں عمدہ ہو جسے نہ تو اپنی ذات کے لئے لینا اچھا ہوتا ہے اور نہ اس میں سے کوئی شے دینا (حسین ہوتا ہے) اسے اس گھٹیا کپڑے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس کی بنائی باریک اور ہلکی ہو۔ اور بدزبان کو سفیہ کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ بدزبانی لوگوں میں سے جاہلوں اور کمزور عقل والے لوگوں میں داخل کر دیتی ہے اور عرب کبھی عقل کی کمزوری پر سفہ کا اطلاق کرتے ہیں اور کبھی بدنی کمزوری پر۔

شاعر نے کہا ہے:

نَخَافُ أن تَسْفَهَ أحلامُنا　و　يجهل الدّهرُ مع الحالِمِ

اس میں عقل کی کمزوری کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔

اور ذوالرمۃ نے کہا ہے:

مَشْيْنَ كما اهتزّتْ رِماحٌ تَسَفَّهتْ أعاليها مَرُّ الرياحِ النواسِمِ

اس میں بدنی کمزوری اور ضعف کے معنی میں مذکور ہے۔

یعنی اس نے اسے کمزور اور نرم پایا تو اس نے اسے حرکت دی۔

تحقیق انہوں نے کہا ہے: الضعف ضاد کے ضمہ کے ساتھ بدن کی کمزوری کے لئے اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ رائے میں کمزوری کے لئے آتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں لغتیں ہیں اور پہلی زیادہ صحیح ہے۔

جبکہ ابوداؤد نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک آدمی خریداری کرتا تھا اور اس کی عقل میں ضعف (کمزوری) تھی۔ پس اس کے گھر والے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم فلاں کو روک دیجئے کیونکہ وہ خرید و فروخت کرتا ہے اور اس کی عقل میں ضعف ہے، چنانچہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے بیع کرنے سے روک دیا، تو اس نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں تو ایک ساعت بھی خرید و فروخت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تو خرید و فروخت کو چھوڑ نہیں سکتا تو پھر یہ کہہ کر لے کہ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں (1)۔'' اسے ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ سلمی ترمذی نے حدیث انس سے بیان کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے اور کہا ہے: بےشک ایک آدمی کی عقل میں ضعف تھا اور آگے حدیث ذکر کی (2) اور امام بخاری نے اسے تاریخ میں ذکر کیا ہے اور اس میں یہ کہا ہے۔ ''جب تو بیع کرے تو یہ کہا کر دھوکہ نہیں ہے اور تو ہر سامان تین راتوں کے خیار کے ساتھ خریدا کر۔'' یہ آدمی حبان بن منقذ بن عمرو انصاری تھا اور یحییٰ اور واسع ابن حبان کا والد تھا...... اور یہ قول بھی ہے کہ وہ منقذ یحییٰ اور واسع کا دادا تھا۔ یہ دونوں امام مالک کے شیخ تھے اور منقذ کا والد حبان تھا۔ اس کی عمر ایک سو تیس برس تھی۔ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ایک غزوہ میں زخمی ہو گئے اور زخم ان کے دماغ میں لگا جس سے ان کی عقل اور زبان میں وہم اور خلل پیدا ہو گیا۔

اور دارقطنی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: حبان بن منقذ کمزور آدمی تھا اور اس کی قوت بصارت بھی کمزور تھی اس کے سر میں طمانچہ مارا گیا درآنحالیکہ اس کے سر میں زخم ہو گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ہر اس شے میں تین دن کا خیار رکھ دیا جو وہ خریدے گا اور اس کی زبان بھی بوجھل تھی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: تو خرید و فروخت کر اور یہ کہہ کوئی دھوکہ وغیرہ قبول نہیں۔'' پس میں اسے یہ کہتے ہوئے سنا کرتا تھا: لا خِذَابةَ لا خِذَابةَ اسے حضرت ابن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے، الخلابۃ کا معنی الخديعة (دھوکہ دہی) ہے۔ اور اسی سے ان کا یہ قول ہے: اذا لم تغلب فاخلُب (3) (جب تو غالب نہ آسکے تو پھر حیلے اور چال سے مقصد تلاش کر۔)

مسئلہ نمبر 18۔ علماء کا اس آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جسے تجربہ کی قلت اور عقل کے ضعف کی وجہ سے خرید و فروخت میں دھوکہ دیا جاتا ہو کیا اس پر پابندی عائد کی جائے یا نہیں؟ تو امام احمد اور اسحاق نے اس پر پابندی کا قول کیا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الرجل یقول فی البیع لا خلابۃ، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فیمن یخدع فی البیع، حدیث نمبر 1171، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 3۔ ایضاً، حدیث 1171

دوسروں نے کہا ہے اس پر پابندی نہیں لگائی جائے گی۔ دونوں قول ایک ہی مذہب میں ہیں۔ اور صحیح پہلا قول ہے، اس آیت کی بنا پر۔ اور حدیث طیبہ میں اس قول کی بناء پر۔ یا نبی الله أحجر علی فلان (اے اللہ تعالیٰ کے نبی! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلاں پر پابندی لگا دیجئے) البتہ اس قول کی بنا پر پابندی کا ترک کرنا ثابت ہوتا ہے۔ یا نبی الله اِنی لا أصبر عن البیع (اے اللہ تعالیٰ کے نبی! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بیع سے رک نہیں سکتا۔) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لئے بیع کو مباح قرار دیا اور اسے اس کے ساتھ خاص کر دیا، کیونکہ وہ جسے خرید و فروخت میں دھوکہ دیا جاتا ہو چاہیے کہ اس پر پابندی لگا دی جائے بالخصوص جب اس کی عقل ناقص اور فاسد ہو۔ اور جو شے اس کی خصوصیت پر دلالت کرتی ہے وہ وہ روایت ہے جسے محمد بن اسحاق نے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا ہے، محمد بن یحییٰ بن حبان نے مجھے بیان کیا ہے: وہ میرے دادا منقذ بن عمرو تھے اور وہ وہ آدمی تھے جن کے سر میں زخم آ گیا، تو ان کی زبان میں لکنت آ گئی اور ان کی عقل چھن گئی (یعنی کمزور ہو گئی) وہ تجارت نہیں چھوڑتے تھے اور انہیں ہمیشہ دھوکہ دیا جاتا تھا۔

پس وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کے سامنے اس کا ذکر کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب تو بیع کرے تو یہ کہا کر کوئی دھوکہ (قبول) نہیں پھر تو جو سامان بھی خریدے گا تیرے لئے تین راتوں کا خیار ہوگا پس اگر تو اس پر راضی ہو جائے تو اسے اپنے پاس رکھ لے اور اگر راضی نہ ہو تو اسے اس کے مالک کے پاس لوٹا دے۔" اور انہوں نے طویل عمر پائی ہے، وہ ایک سو تیس برس تک زندہ رہے ہیں اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب لوگ پھیل گئے اور تعداد میں کثیر ہو گئے تو وہ بازار میں خرید و فروخت کرتے تھے اور شے لے کر اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے حالانکہ انہوں نے غبن فاحش کھایا ہوتا، پھر گھر والے انہیں ملامت کرتے تھے اور کہتے کس کے لئے خریدتے ہو؟ تو وہ کہتے: مجھے خیار حاصل ہے اگر میں پسند کروں تو لے لوں اور اگر نہ پسند کروں تو واپس لوٹا دوں، تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے تین دن کا خیار عطا فرمایا ہے، پس وہ دوسرے دن یا تیسرے دن سامان اس کے مالک پر واپس لوٹا دیتے، تو وہ کہتا: قسم بخدا! میں اسے قبول نہیں کروں گا، تحقیق تو نے میرا سامان لے لیا ہے اور مجھے دراہم دے دیئے ہیں، تو وہ کہتے: بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے تین دنوں کا اختیار عطا فرمایا ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے کوئی آدمی ادھر سے گزرتا تو وہ تاجر کو کہتا: تجھ پر افسوس ہے! بلاشبہ یہ سچ بول رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے تین دنوں کا خیار عطا فرمایا تھا۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ ابو عمر نے الاستیعاب میں اس کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے: بخاری نے تاریخ میں عیاش بن ولید عن عبد الاعلی عن ابن اسحاق کی سند سے اسے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 19۔ قولہ تعالیٰ: اَوْ ضَعِيْفًا ضعیف سے مراد وہ آدمی ہے جس کی عقل میں نقص اور فساد داخل ہو چکا ہو، لکھوانے سے اس کی فطرت اور طبیعت عاجز ہو یا تو اس کے بولنے میں رکاوٹ ہونے کی وجہ سے یا اس کے گونگا ہونے کی وجہ سے یا ادائے کلام سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اور یہ بھی کہ کبھی اس کا ولی باپ ہوتا ہے یا وصی۔ اور وہ جو املا کرانے کی استطاعت ہی نہیں رکھتا وہ صغیر ہے اور اس کا ولی اس کا وصی ہوگا یا اس کا باپ ہوگا۔ اور وہ غائب ہے جو محل اشہاد سے غائب ہو یا تو بیماری کی وجہ سے یا اس کے علاوہ کسی عذر کی وجہ سے اور اس کا ولی اس کا وکیل ہوگا اور رہا گونگا تو یہ جائز ہے کہ وہ بھی ضعفاء میں سے ہو۔ اور اولیٰ یہ ہے کہ وہ ان میں سے ہو جو استطاعت نہیں رکھتے۔ پس یہی وہ اصناف ہیں جو ممتاز ہو سکتی ہیں، ان کا

تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 20۔ قولہ تعالیٰ: فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ طبری نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وَلِيُّهٗ میں ضمیر الحق کی طرف عائد ہے اور انہوں نے اس بارے میں ربیع سے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ضمیر الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ کی طرف لوٹ رہی ہے اور یہی صحیح ہے۔ اور جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ صحیح نہیں ہے اور کس طرح گواہ اس شے پر شہادت دے سکتے ہیں اور سفیہ کے ذمہ اس کی املا کے سبب مال ڈال سکتے ہیں جس کا قرض ہو! یہ شے شریعت میں جائز نہیں ہے مگر اس کا قائل ارادہ رکھتا ہے۔ بے شک وہ جو املا کرانے کی استطاعت نہیں رکھتا بیماری کی وجہ سے یا عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے املا کرانے سے اس کی زبان لڑکھڑا جائے یا گونگا ہونے کی وجہ سے اور جب صورتحال اس طرح ہو تو مریض پر اور جس کی زبان گونگا ہونے کی وجہ سے املا کرانے سے عاجز ہو تو علماء میں سے کسی کے نزدیک کوئی ولی نہیں، مثلاً جو بچے پر اور سفیہ پر ان کے نزدیک جو اس پر پابندی لگاتے ہیں کچھ ثابت نہیں۔ پس جب صورتحال اس طرح ہو تو صاحب حق (قرض کا مالک) عدل و انصاف کے ساتھ املا کرائے اور اسے سنائے جو اس سے عاجز ہے اور جب املا مکمل ہو جائے تو وہ اس کا اقرار کرائے۔ اور یہ معنی آیت سے مراد نہیں ہے اور نہ یہ صحیح ہو سکتا ہے مگر صرف اس کے بارے میں جو بیماری کی وجہ سے املا کرانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اور جن کا اس کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 21۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ یہ اس پر دلیل ہے کہ بے شک اسے اس بارے میں امین بنایا گیا ہے جسے وہ شروع کر رہا ہے اور جسے وہ پورا کر رہا ہے اور یہ راہن کا قول قسم کے ساتھ قبول ہونے کا تقاضا کرتا ہے جبکہ راہن اور مرتہن کا قرض کی مقدار میں اختلاف ہو جائے اور رہن موجود ہو۔ اور یہی اکثر فقہاء کا مذہب ہے، یعنی سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم۔ اور اسے ہی ابن منذر نے پسند کیا ہے اور کہا ہے: کیونکہ مرتہن زیادتی کا دعویٰ کرنے والا ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: البيّنة على المدّعى واليمينُ على المدّعَى عليه (گواہ لانا مدعی پر لازم ہے اور قسم مدعیٰ علیہ پر ہے) اور امام مالک نے کہا ہے: اس صورت میں قول مرتہن کا قبول کیا جائے گا جبکہ وہ (راہن کے) قول اور رہن کی قیمت کے درمیان ہو اور اس سے زیادہ پر اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی، تو گویا آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ رہن اور اس کی قسم مرتہن کے لئے شاہد ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ آپ کے اس نظریہ کا رد ہے۔ بے شک وہ جس پر حق ہے وہ راہن ہے اور یہ مسئلہ عنقریب آئے گا۔

اور اگر کوئی کہنے والا کہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے رہن کو شہادت اور کتاب (تحریر) کا بدل بنایا ہے اور شہادت مشہود لہ کے صدق پر دال ہے اس قول میں جو اس کے دعویٰ اور رہن کی قیمت کے درمیان ہو جب وہ اس کی قیمت کو پہنچ جائے اور زیادتی کے بارے میں کوئی دستاویز نہ ہو، تو اسے کہا جائے گا رہن اس پر دلالت نہیں کرتا کہ اس کی قیمت کا قرض کی مقدار کے برابر ہونا واجب ہوتا ہے بسا اوقات مرھونہ شے قلیل اور کثیر کے عوض ہوتی ہے۔ ہاں اکثر اوقات رہن قرض کی مقدار سے کم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 380

نہیں ہوتی اور یہ کہ وہ اس کے مطابق ہوتی ہے تو ایسا بھی نہیں۔

اور یہ کہنے والا کہتا ہے: قرض کی مقدار میں قسم کے ساتھ مرتہن کے قول کی تصدیق کی جائے گی یہاں تک کہ وہ رہن کی قیمت کے مساوی ہو۔ اور عرف اس پر نہیں ہے بسا اوقات قرض رہن سے کم ہوتا ہے اور یہی اس میں غالب ہے، پس ان کے اس قول کا کوئی نتیجہ نہیں۔

مسئلہ نمبر 22۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ مراد ولی ہے تو اس میں اس پر دلیل ہے کہ اس کا اقرار اپنے یتیم کے خلاف جائز ہے کیونکہ جب اس نے اسے املا کرایا تو اس کا قول اس پر اس بارے میں نافذ ہو گیا جو اس نے اسے لکھوایا۔

مسئلہ نمبر 23۔ اور وہ سفیہ جس پر پابندی عائد کی گئی ہو اس کا اپنے ولی کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا فاسد ہے اس پر اجماع ہے یہ ہمیشہ کے لئے فسخ کر دیا گیا ہے نہ یہ کوئی حکم ثابت کرے گا اور نہ کسی شے میں موثر ہو گا۔ پس اگر سفیہ تصرف کرے اور اس پر کوئی پابندی نہ ہو تو اس بارے میں اختلاف ہے اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ۔ الاستشهاد کا معنی ہے شہادت طلب کرنا (یعنی شاہد بنانا) اور لوگوں کے مابین یہ اختلاف ہے کہ کیا یہ فرض ہے یا مستحب؟ اور صحیح یہ ہے کہ یہ مستحب ہے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 25۔ قولہ تعالیٰ: شَهِيْدَيْنِ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت کے ساتھ شہادت کو حقوق مالیہ، بدنیہ اور حدود میں مرتب فرمایا ہے اور سوائے زنا کے ہر شے میں دو گواہ مقرر کئے ہیں، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ اور شہید مبالغہ کا وزن ہے اور اس میں اس پر دلالت ہے جو شہادت دے اور وہ اس کی طرف سے بار بار ہو، تو گویا یہ اس کے عادل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 26۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ رِّجَالِكُمْ یہ کفار، بچوں اور عورتوں کو چھوڑنے کے بارے نص ہے اور رہے غلام! تو لفظ انہیں شامل ہے اور مجاہد نے کہا ہے مراد آزاد مرد ہیں اور قاضی ابو اسحاق نے اسے ہی اختیار کیا ہے اور اس میں مبالغہ کی حد تک بحث کی ہے اور علماء نے غلاموں کی شہادت کے بارے میں اختلاف کیا ہے، پس شریح، عثمان البتی، احمد، اسحاق اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: غلام کی شہادت جائز ہے بشرطیکہ وہ عادل ہو اور انہوں نے آیت کے لفظ کو غلبہ دیا ہے اور امام مالک، ابو حنیفہ، شافعی اور جمہور علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: غلام کی شہادت جائز نہیں ہوتی اور انہوں نے غلامی کے نقص کو غلبہ دیا ہے اور علامہ شعبی اور نخعی نے تھوڑی سی شے میں اسے جائز قرار دیا ہے اور صحیح جمہور کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اور خطاب مِنْ رِّجَالِكُمْ تک جاری ہے۔ پس ظاہر خطاب ان لوگوں کو شامل ہو گا جو آپس میں قرض کا لین دین کرتے ہیں اور غلام اپنے آقاؤں کی اجازت کے بغیر کسی شے کے مالک نہیں ہوتے۔

اور اگر وہ کہیں کہ آیت کے اول حصہ کا خاص ہونا اس کے آخر کے عموم کے ساتھ تعلق کے مانع نہیں ہے تو انہیں کہا جائے گا اسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد خاص کر رہا ہے: وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور الله تعالیٰ کا ارشاد مِنْ رِّجَالِكُمْ اس پر دلیل ہے کہ اندھے اہل شہادت میں سے ہیں لیکن تب جب انہیں یقینی علم ہو۔ مثلاً وہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے شہادت کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو اس سورج کو دیکھ رہا ہے پس تو اس کی مثل پر شہادت دے یا چھوڑ دے" اور یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ شاہد کا اس شے کو دیکھنا شرط ہے جس کے بارے وہ شہادت دے رہا ہے نہ کہ وہ ایسے استدلال کے ساتھ شہادت دے جس میں اس کے خطا کرنے کا احتمال اور امکان ہو۔ البتہ اس کا اپنی بیوی کے ساتھ وطی کرنا جائز ہوتا ہے جب وہ اس کی آواز پہچان لے، کیونکہ وطی کا عمل کرنا غلبہ ظن کے ساتھ جائز ہے، پس اگر شب زفاف کوئی عورت اس کی طرف بھیج دی گئی اور اسے کہا گیا، یہ تیری بیوی ہے اور وہ اسے نہ پہچانتا ہو تو اس کے لئے اس سے وطی کرنا جائز ہے اور اس کے لئے ہدیہ قبول کرنا حلال ہوتا ہے قاصد کے قول کے ساتھ جو اس کے پاس آئے۔ اور اگر کوئی خبر دینے والا اسے زید کے بارے میں اقرار یا بیع یا قذف یا غصب کی خبر دے تب اس کے لئے مخبر عنہ کے خلاف شہادت دینا جائز نہیں ہے، کیونکہ شہادت کا راستہ یقین ہے اور ان کے سوا میں ظن غالب کا استعمال جائز ہوتا ہے اور اسی لئے امام شافعی، ابن ابی لیلیٰ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب اسے نابینا ہونے سے پہلے اس کا علم ہو تو اندھا ہونے کے بعد اس کی شہادت جائز ہے۔ اور اس کے اور مشہود علیہ کے درمیان حائل ہونے والا اندھا پن مشہود علیہ میں غیبت اور موت کے طاری ہونے کی طرح ہے اور یہ ان کا مذہب ہے اور وہ جو اندھے کو اس بارے میں ادائے شہادت سے روکتے ہیں جو شہادت اس نے بصارت کے ساتھ لی ہو اس کی کوئی وجہ اور علت نہیں ہے اور اس کی شہادت اس نسب کے بارے میں صحیح ہوگی جو خبر مشہور سے ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ وہ ایسی شے کے بارے خبر دے جس کا حکم رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو۔

اور علماء میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے اندھے کی شہادت کو ان چیزوں میں قبول کیا ہے جن کی شہادت کا ذریعہ آواز ہے کیونکہ انہوں نے اس کے ساتھ استدلال کو حد یقین تک پہنچنے والا خیال کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ آوازوں کا مشتبہ ہونا شکلوں اور رنگوں کے مشتبہ ہونے کی طرح ہی ہے۔ یہ استدلال ضعیف ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آنکھ والے کے لئے بھی آواز پر اعتماد کرنا جائز ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ نابینے آدمی کا طلاق وغیرہ میں آواز پر شہادت دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ آواز کو پہچانتا ہو۔ ابن القاسم نے بیان کیا ہے کہ میں نے امام مالک سے کہا: ایک آدمی دیوار کے پیچھے سے اپنے پڑوسی کی آواز کو سنتا ہے اور اسے دیکھتا نہیں، وہ یہ سنتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے (کیا) وہ اس پر شہادت دے سکتا ہے درآنحالیکہ اس نے اس کی آواز پہچان لی ہو؟ تو امام مالک نے فرمایا: اس کی شہادت جائز ہے اور یہی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، قاسم بن محمد، شریح الکندی، شعبی، عطا بن ابی رباح، یحییٰ ابن سعید، ربیعہ، ابراہیم نخعی، امام مالک اور لیث رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 27 ۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ معنی یہ ہے کہ اگر طالب دو مرد گواہ نہ لا سکے تو اسے چاہیے کہ وہ ایک مرد اور دو عورتیں لے آئے، یہ جمہور کا قول ہے۔ فَرَجُلٌ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور

وَّامْرَاَتٰنِ اس پر معطوف ہے اور خبر محذوف ہے۔ (تقدیر کلام یہ ہے) فرجل و امرأتان یقومان مقامھما۔ یعنی ایک مرد اور دو عورتیں دو مردوں کے قائم مقام ہو جائیں گے۔ اور غیر قرآن میں نصب بھی جائز ہے (یعنی) فاستشھدوا رجلا و امرأتین۔ پس تم گواہ بناؤ ایک مرد اور دو عورتیں۔ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: ان خنجرًا فخنجرًا (اگر وہ خنجر لے کر آئے تو تم بھی خنجر لے کر آؤ) اور ایک قوم نے کہا ہے: بلکہ معنی یہ ہے پس اگر دو مرد نہ ہوں، یعنی وہ نہ پائے جائیں تو دو عورتوں کو گواہ بنانا جائز نہ ہوگا مگر مرد نہ ہونے کی صورت میں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے (1): یہ ضعیف ہے اور آیت کے الفاظ یہ معنی نہیں دیتے، بلکہ اس سے ظاہر جمہور کا قول ہے، یعنی اگر گواہ بنانے والے کے پاس دو مرد نہ ہوں یعنی اگر صاحب حق اسے چھوڑ دے یا کسی عذر کے سبب اس کا قصد کرے تو اسے چاہیے کہ وہ ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو مردوں کی موجودگی کے باوجود ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے اور اس کے سوا کسی اور میں اس کا ذکر نہیں فرمایا اور جمہور کے قول کے مطابق اسے صرف اموال میں جائز قرار دیا گیا ہے بشرطیکہ ان دونوں کے ساتھ ایک مرد بھی ہو۔ بلاشبہ یہ اموال میں ہو سکتا ہے ان کے سوا میں نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اموال کو پختہ کرنے اور ان کی توثیق کرنے کے اسباب کثیر بنائے ہیں کیونکہ انہیں حاصل کرنے کی جہتیں کثیر ہیں اور ان کے ساتھ عموم بلوی ہونے اور ان کا کاروبار بار بار ہونے کی وجہ سے۔ پس ان میں مضبوطی اور توثق کو کبھی لکھوانے کے ساتھ، کبھی گواہ بنا لینے کے ساتھ، کبھی رہن کے ساتھ اور کبھی ضمان کے ساتھ رکھ دیا۔ اور ان تمام میں عورتوں کی شہادت کو مردوں کے ساتھ داخل کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ سے یہ وہم نہیں ہوتا کہ یہ بضع کے ساتھ مہر کے قرض پر اور دم عمد کی صلح پر مشتمل ہے، کیونکہ وہ شہادت شہادت علی الدین نہیں ہے، بلکہ وہ شہادت علی النکاح ہے اور علماء نے ان معاملات میں اکیلی عورتوں کی شہادت جائز قرار دی ہے جن پر ضرورت کے وقت ان کے سوا کوئی اور مطلع نہیں ہو سکتا اور اسی طرح ضرورت کے وقت بچوں کی شہادت کی اجازت دی گئی ہے ان زخموں اور جھگڑوں میں جو ان کے آپس کے درمیان ہوں۔

تحقیق علماء نے زخموں میں بچوں کی شہادت کے بارے اختلاف کیا ہے اور وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 28۔ امام مالک نے اسے جائز قرار دیا ہے جب تک وہ مختلف اور متفرق نہ ہوں۔ اور ان میں سے دو سے کم کی شہادت جائز نہیں ہے نہ بڑے کی چھوٹے پر اور نہ چھوٹے کی بڑے پر۔ اور علماء میں سے جو بچوں کے آپس کے جھگڑوں میں ان کی شہادت کے ساتھ فیصلے کرتے تھے وہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں اور امام مالک نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس پر اجماع کیا گیا ہے۔

اور امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے بچوں کی شہادت کو جائز قرار نہیں دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِنْ رِّجَالِكُمْ اور مِمَّنْ تَرْضَوْنَ اور ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ اور یہ صفات بچوں میں موجود نہیں ہوتیں۔

مسئلہ نمبر 29۔ جب اللہ تعالیٰ نے دو عورتوں کی شہادت کو ایک آدمی کی شہادت کا بدل قرار دیا ہے تو پھر یہ ضروری

1۔ المحرر الوجیز

ہے کہ ان دونوں کا حکم ایک مرد کے حکم کی طرح ہو، پس اسی طرح ہمارے نزدیک آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ شاہد کے ساتھ قسم کھائے اور امام شافعی کے نزدیک بھی اسی طرح ہے، لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ دو عورتوں کی شہادت کے ساتھ بھی قسم کھا سکتا ہے کیونکہ مطلقاً دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کا عوض ہے۔ اور اس میں امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے اختلاف کیا ہے اور وہ شاہد کے ساتھ قسم کے قائل نہیں اور انہوں نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے شہادت کو تقسیم کیا اور اسے متعدد شمار کیا، لیکن شاہد اور یمین کا ذکر نہیں کیا، لہٰذا اس کے ساتھ فیصلہ کرنا جائز نہیں، کیونکہ جو تقسیم اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے یہ قسم اس پر زائد ہے اور یہ نص پر زیادتی ہے اور یہ نسخ ہے اور جنہوں نے یہ قول کیا ہے ان میں سے ثوری، اوزاعی، عطا، حکم بن عتبہ اور ایک جماعت ہے۔

بعض نے کہا ہے: شاہد کے ساتھ قسم لے کر فیصلہ کرنا قرآن کے ساتھ منسوخ ہے اور عطا نے یہ گمان کیا ہے کہ سب سے پہلے عبدالملک بن مروان نے اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور حکم نے کہا ہے: قسم اور شاہد کے ساتھ فیصلہ کرنا بدعت ہے اور سب سے پہلے اس کے ساتھ حضرت معاویہؓ نے فیصلہ کیا اور یہ سب غلط اور وہم ہے جو حق میں سے کسی شے کا فائدہ نہیں دیتا اور جو نفی کرے اور ناواقف ہو وہ اس کی طرح نہیں جو ثابت کرے اور جانتا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ الآیہ۔ میں وہ نہیں ہے جس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شاہد کے ساتھ قسم کے بارے میں فیصلہ رد ہو سکتا ہو۔ اور نہ اس میں یہ ہے کہ اسے حقوق کے ساتھ نہیں ملایا جا سکتا اور نہ یہ کہ شہادت کے ساتھ صرف انہی چیزوں میں حق حاصل ہوتا ہے جن کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے کسی اور کا نہیں، کیونکہ وہ مطلوب کے انکار اور طالب کی قسم کے ساتھ باطل ہو جاتا ہے۔ بے شک وہ اس کے ساتھ بالاجماع مال کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس کا ذکر کتاب اللہ میں نہیں ہے اور یہ ان کے خلاف قطعی رد ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جنہوں نے یہ قول کیا ہے ان کے خلاف حجت یہ ہے کہ انہیں کہا جائے گا: آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کے خلاف مال کا دعویٰ کرے تو کیا مطلوب اس کے بارے قسم نہیں دے گا جو حق اس پر ہے؟ پس اگر وہ قسم کھالے تو وہ حق اس سے باطل ہو جائے گا اور اگر قسم سے انکار کر دے تو پھر صاحب حق (مدعی) قسم دے گا کہ اس کا حق یقینی ہے اور اس کا حق مدعی علیہ پر ثابت ہو جائے گا۔ پس یہ ایسی شے ہے جس میں لوگوں میں سے کسی کے نزدیک اور نہ ہی شہروں میں سے کسی شہر میں کوئی اختلاف ہے۔ پس کون سی شے ہے جسے انہوں نے لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کون سی کتاب میں اسے پایا ہے؟ پس جس نے اس کا اقرار کیا تو اسے چاہیے کہ وہ شاہد کے ساتھ قسم کا بھی اقرار کرے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: پھر تعجب ہے کہ مشہور اور صحیح احادیث کے باوجود انہوں نے اسے بدعتی قرار دیا جس نے ان کے مطابق عمل کیا، یہاں تک کہ اس کے فیصلے کو توڑ دیا اور اس کی رائے کو حقیر سمجھا، اس کے باوجود کہ اس کے مطابق خلفائے اربعہ، ابی بن کعب، معاویہ، شریح، عمر بن عبدالعزیز...... اور آپ نے اس کے بارے اپنے عمال کی طرف لکھا...... ایاس بن معاویہ، ابوسلمہ بن عبدالرحمن، ابوالزناد اور ربیعہ رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم نے عمل کیا ہے اور اسی لئے امام مالک نے کہا ہے۔ اس بارے میں وہی کافی ہے جو سنت کے عمل میں سے گزر چکا ہے۔ کیا آپ ان کے بارے رائے رکھتے ہیں کہ ان کے احکام توڑ دیئے جائیں

گے اور ان کی بدعت کے مطابق فیصلے کئے جائیں گے؟ یہ شدید عدم توجہ اور غفلت ہے اور ایسی رائے ہے جو پختہ اور مضبوط نہیں۔ ائمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ فرمایا۔

حضرت عمرو بن دینار رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ صرف اموال میں ہے، اسے سیف بن سلیمان نے قیس بن سعد سے انہوں نے عمرو بن دینار سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے

ابو عمر نے کہا ہے: اس حدیث کی یہ سند اصح الاسناد ہے اور یہ حدیث ہے جس کی اسناد میں کسی کے لئے کوئی طعن نہیں ہے اس حدیث کے بارے اہل معرفت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ یحییٰ القطان نے کہا ہے: سیف بن سلیمان ثابت اور مضبوط راوی ہیں میں نے ان سے زیادہ حافظ کوئی نہیں دیکھا اور نسائی نے کہا ہے: یہ اسناد جید ہے، سیف ثقہ راوی ہے اور قیس ثقہ راوی ہے اور مسلم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

ابو بکر البزار نے کہا ہے: سیف بن سلیمان اور قیس بن سعد دونوں ثقہ راوی ہیں اور جو ان دونوں کے بعد ہیں وہ ثقاہت اور عدالت میں اپنی شہرت کے سبب ذکر سے مستغنی ہیں اور صحابہ کرام میں سے کوئی ایک بھی نہیں جس نے شاہد کے ساتھ قسم کا انکار کیا ہو، بلکہ اس کے بارے ان سے قول مروی ہیں اور مدینہ طیبہ کے جمہور اہل علم اسی موقف پر ہیں اور اس میں حضرت عروہ بن زبیر اور ابن شہاب رحمہما اللہ سے اختلاف مروی ہے۔ معمر نے کہا ہے: میں نے زہری سے یمین مع الشاہد کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ ایسی شے ہے جسے لوگوں نے ایجاد کیا ہے۔ دو شاہدوں کا ہونا ضروری ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ جب قضا کے والی بنے تو پہلا فیصلہ ایک شاہد اور قسم کے ساتھ کیا اور امام مالک اور آپ کے اصحاب، امام شافعی اور آپ کے متبعین، امام احمد، اسحاق، ابو عبید، ابو ثور، داؤد بن علی اور محدثین کی ایک جماعت رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے بارے متواتر آثار ہیں اور کئی صدیوں سے اہل مدینہ کا اس پر عمل ہے۔ اور امام مالک نے فرمایا ہے: ہر شہر میں ایک شاہد اور قسم کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔ اور آپ نے الموطا میں اس کے سوا کسی مسئلہ کے لئے حجت اور دلیل بیان نہیں فرمائی اور آپ کے ساتھ یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں کیا گیا اور نہ ہی مدینہ طیبہ اور مصر وغیرہما میں آپ کے اصحاب میں سے کسی سے اختلاف کیا گیا ہے اور ہر شہر میں مالکی اس کے سوا اپنے مذہب سے نہیں پہچانے جاسکتے سوائے ہمارے پاس اندلس میں، کیونکہ یحییٰ [بن یحییٰ] نے گمان کیا ہے کہ انہوں نے لیث کو اس کے مطابق فتویٰ دیتے نہیں دیکھا اور نہ انہوں نے یہ موقف اپنایا ہے۔ اور اس مسئلہ میں یحییٰ نے امام مالک سے اختلاف کیا ہے باوجود اس کے کہ یہ ان کی سنت اور دار الہجرت کے عمل سے مخالفت ہے۔

پھر یمین مع الشاہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے ایک حکم کی زیادتی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورت کو اپنی پھوپھی اور اپنی خالہ پر نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے(1) (یعنی پہلے کسی آدمی کے نکاح میں پھوپھی ہو اور پر سے دوسرا نکاح بھتیجی یا پہلے

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب لا تنکح المراۃ علی عمتھا، حدیث نمبر 4718، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

خالہ ہو اور پھر بھانجی آجائے تو یہ دونوں ایک آدمی کے نکاح میں جمع نہیں ہوسکتیں۔) اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء: 24) (اور حلال کردی گئی ہیں تمہارے لئے ماسوا ان کے) اور جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمادیا اور درندوں میں سے ہر ذی ناب کا، باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ (الانعام: 145) (آپ فرمائیے میں نہیں پاتا) اور اسی طرح مسح علی الخفین کا حکم ہے حالانکہ قرآن کریم میں صرف پاؤں کو دھونے یا ان کا مسح کرنے کے بارے وارد ہے اور اس قسم کی مثالیں کثیر ہیں۔

اور اگر یہ کہا جانا جائز ہو کہ قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلے کو منسوخ کردیا ہے تو پھر یہ کہنا بھی جائز ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے یہ ارشاد: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (بقرہ: 275) اور اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء: 29) (مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے۔) بیع مزابنہ، بیع الغرر، ان چیزوں کی بیع جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئیں، یہاں تک کہ وہ تمام بیوع جو ممنوع ہیں ان کی نہی کے لئے ناسخ ہیں اور یہ کسی کے لئے بھی جائز نہیں، کیونکہ سنت کتاب اللہ کے لئے مبین اور وضاحت کرنے والی ہے۔

اور اگر کہا جائے: بے شک جو حدیث میں وارد ہے اور وہ ایک معین فرد کے بارے فیصلہ ہے اور اس میں عموم نہیں ہے تو ہم کہیں گے، بلکہ وہ اس قاعدہ کی تقعید (روک دینا) سے عبارت ہے، گویا کہ انہوں نے یہ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ایک شاہد اور قسم کے ساتھ حکم ثابت کیا ہے اور جو اس تاویل کی شہادت دیتی ہیں ان میں سے ایک وہ روایت ہے جسے ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق میں ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ فرمایا اور قیاس اور نظر وفکر کے اعتبار سے ہم قسم کو دو عورتوں کی نسبت زیادہ قوی پاتے ہیں، کیونکہ ان دونوں کا لعان میں کوئی دخل نہیں ہے اور قسم لعان میں داخل ہوتی ہے۔ اور جب حدیث صحیح ہے تو پھر اس کے ساتھ کلام کرنا واجب ہے اور سنت ان کی محتاج نہیں ہوتی جو اس کی پیروی کرنے والے ہوتے ہیں کیونکہ جو اس سے مخالفت کرے گا وہی اس کے خلاف حجت بن جائے گی۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 30۔ اور جب یہ بات پختہ ہوگئی اور یمین مع الشاہد کے ساتھ حکم ثابت ہوگیا، تو قاضی ابو محمد عبدالوہاب نے کہا: یہ اموال اور ان کے متعلقات کے بارے ہے بدنی حقوق کے بارے نہیں، جو بھی یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ کرنے کا قائل ہے ان تمام کی طرف سے اس پر اجماع ہے۔ فرمایا: کیونکہ اموال کے حقوق ابدان کے حقوق سے پست اور ہلکے ہوتے ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں عورتوں کی شہادت قبول ہے۔ اور عمداً زخم لگانے کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف ہے، کیا اس میں ایک گواہ اور قسم کے ساتھ قصاص ثابت ہوسکتا ہے؟ اس میں دو روایتیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے ساتھ قصاص اور دیت کے درمیان اختیار ثابت ہوجائے گا اور دوسری یہ ہے کہ اس سے کوئی شے بھی ثابت نہ ہوگی کیونکہ یہ بدنی حقوق میں سے ہے۔ فرمایا: اور یہی صحیح ہے۔

امام مالک نے الموطا میں کہا ہے: وہ (یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ) صرف اموال میں ہوسکتا ہے اور عمرو بن دینار نے بھی یہی کہا ہے اور مازری نے کہا ہے: بغیر کسی اختلاف کے اسے صرف مال میں قبول کیا جائے گا اور محض نکاح اور طلاق میں

بغیر کسی اختلاف کے اسے قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر شہادت کا مضمون مال نہ ہو، لیکن وہ مال تک پہنچانے والی ہو، جیسا کہ وصیت اور موت کے بعد نکاح کے بارے شہادت دینا، یہاں تک کہ اس کے ثابت ہونے سے صرف مال وغیرہ کا مطالبہ کیا جائے گا تو اس کی قبولیت میں اختلاف ہے۔ پس جنہوں نے مال کا لحاظ رکھا ہے انہوں نے اسے قبول کیا ہے جیسے وہ اسے مال میں قبول کرتے ہیں اور جنہوں نے حال کا لحاظ رکھا ہے انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

اور مہدوی نے کہا ہے: عام فقہاء کے قول کے مطابق حدود میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں اور اسی طرح اکثر علماء کے قول کے مطابق نکاح اور طلاق میں بھی (ان کی شہادت جائز نہیں) اور یہی امام مالک اور امام شافعی وغیرہما کا مذہب ہے، وہ صرف اموال میں شہادت دے سکتی ہیں اور ہر وہ معاملہ جس میں وہ خود شہادت نہیں دے سکتیں وہ اس میں اپنے سوا کسی اور کی شہادت پر بھی شہادت نہیں دے سکتیں، چاہے ان کے ساتھ کوئی مرد ہو یا نہ ہو اور وہ شہادت نقل نہیں کر سکتیں مگر مرد کے ساتھ (جبکہ انہوں نے مرد اور عورت سے شہادت نقل کی ہو۔ اور ان تمام معاملات میں دو عورتوں کی شہادت کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا جن میں ان کے سوا کوئی حاضر نہ ہو سکتا ہو، جیسا کہ ولادت اور ولادت کے وقت بچے کا رونا وغیرہ۔ یہ سب امام مالک کا مذہب ہے اور بعض مسائل میں اختلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 31۔ قولہ تعالیٰ: مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ یہ رجل و امرأتان کی صفت ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے۔ ابن بکیر وغیرہ نے کہا ہے: یہ حکام کو خطاب کیا گیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ عمدہ قول نہیں ہے، بلکہ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے لیکن جن کا اس قضیہ کے ساتھ تعلق ہے وہ صرف حکام ہیں اور یہ کتاب اللہ میں بہت زیادہ ہے کہ ان احکام میں خطاب عام ہوتا ہے جن کے ساتھ تعلق بعض کا ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 32۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ گواہوں میں سے وہ بھی ہیں جو پسند نہیں کئے جاتے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو عدالت پر محمول نہ کیا جائے یہاں تک کہ وہ ان کے لئے ثابت ہو جائے اور یہ معنی اسلام پر زائد ہے اور یہ جمہور کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا ہے: ہر وہ مسلمان جس کا اسلام ظاہر ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ظاہری فسق سے سلامت اور محفوظ ہو تو وہ عادل ہے، اگرچہ وہ مجہول الحال ہو۔

اور شریح، عثمان البتی اور ابو ثور نے کہا ہے: وہ مسلمانوں میں سے عادل لوگ ہیں اگرچہ وہ غلام ہوں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں...... پس انہوں نے حکم کو عام قرار دیا ہے اور اس سے شہری کے خلاف بدوی (جنگل میں رہنے والا) کی شہادت کا قبول ہونا لازم آتا ہے، بشرطیکہ وہ عادل اور پسندیدہ ہو اور یہی امام شافعی اور ان کی موافقت کرنے والوں نے کہا ہے اور وہ (بھی) ہمارے مردوں اور ہمارے اہل دین میں سے ہے۔ اور اس کا بدوی ہونا اس کے دوسرے شہر سے ہونے کی طرح ہے اور قرآن کریم میں آیات عمومات عادلوں کی شہادت قبول کرنے پر دال ہیں اور وہ بدوی اور شہری کو مساوی قرار دیتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اور مزید ارشاد فرمایا: وَ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (اور تم اپنے میں سے عدل کرنے والوں کو گواہ بنالو) پس مِنْكُمْ میں خطاب مسلمانوں کو ہے اور یہ یقیناً اس کا تقاضا کرتا ہے کہ عدالت کا

معنی بالضرور اسلام پر زائد ہو (یعنی وہ مسلمان ہونے کے ساتھ عادل بھی ہو) کیونکہ صفت موصوف پر زائد ہوتی ہے اور اسی طرح مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ بھی اسی کی مثل ہے، بخلاف اس کے جو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے پھر اس کا پسندیدہ ہونا معلوم نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کی حالت کو آزما لیا جائے، پس اس سے لازم آتا ہے کہ فقط ظاہر اسلام پر اکتفاء نہ کیا جائے۔ امام احمد بن حنبل، امام مالک نے ان سے ابن وہب کی روایت میں شہری کے خلاف بدوی کی شہادت رد ہونے کا موقف اپنایا ہے، اس لئے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بدوی کی شہادت شہر میں رہنے والے کے خلاف جائز نہیں ہوتی (1)۔'' اور صحیح یہ ہے کہ اس کی شہادت جائز ہے جبکہ وہ عادل اور پسندیدہ ہو، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء اور سورۃ البرأۃ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں سفر یا حضر میں شہری کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور جب وہ سفر میں ہو تو اس کی شہادت قبول ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: عدالت سے مراد احوال دینیہ میں اعتدال ہے اور یہ تب مکمل ہوتا ہے کہ وہ گناہ کبیرہ سے اجتناب کرنے والا ہو، اپنی مروت کی حفاظت کرنے والا ہو اور گناہ صغیرہ کو ترک کرنے کا محافظ ہو اور امانت کا ظاہر یہ ہے کہ اسے چھپایا نہ جائے (غفلت نہ برتی جائے) اور کہا گیا ہے: عادل قرار دینے والے کے گمان میں باطن صاف ہو اور سیرت مستقیم ہو اور یہ معنی باہم متقارب ہیں۔

مسئلہ نمبر 33۔ جب شہادت ولایت عظیمہ اور مرتبہ بلند ہے اور یہ غیر کے قول کو غیر کے خلاف قبول کرنا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں رضا اور عدالت کی شرط لگائی ہے۔ پس شاہد کے حکم میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے اخلاق و اوصاف کے ساتھ منفرد ہو اور فضائل و کمالات سے آراستہ اور مزین ہو، یہاں تک کہ اسے دوسروں پر فضیلت و برتری حاصل ہو اور وہی فضیلت اس کا قول قبول کرنے کے بارے اس کے لئے رتبہ اختصاص ثابت کرتی ہو اور اس کی شہادت کے ساتھ مطلوب کے ذمہ کے مشغول ہونے کے بارے حکم لگایا جا سکتا ہو۔ ہمارے علماء کے نزدیک اجتہاد اور امارات و علامات کے ساتھ استدلال کرنے کے جواز پر اسی شے میں جس کے معانی اور احکام مخفی اور پوشیدہ ہوں یہ بہت بڑی دلیل ہے۔ اس کا بیان سورۂ یوسف میں تفصیل کے ساتھ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس میں ایسی دلیل موجود ہے جو امر کو حکام کے اجتہاد کے سپرد کرنے پر دلالت کرتی ہے اور بسا اوقات وہ شاہد میں غفلت یا شک کو دیکھ لیتا ہے اور اس وجہ سے اس کی شہادت رد کر دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 34۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اموال میں ظاہر اسلام پر اکتفا کیا جائے گا لیکن حدود میں نہیں۔ اور یہ مناقضہ ہے جو آپ کے کلام کو ساقط کر دیتا ہے اور آپ پر اس کے مقاصد فاسد کر دیتا ہے، کیونکہ ہم کہتے ہیں: یہ حقوق میں سے ایک حق ہے۔ پس شہادت میں فقط ظاہر دین پر ہی اکتفا نہ کیا جائے گا جیسا کہ حدود میں۔ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 35۔ جب اللہ تعالیٰ نے عقود مداینہ میں شاہد کے لئے عدالت اور رضا کی شرط عائد کی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تو پھر نکاح میں ان کا شرط ہونا بدرجہ اولیٰ ہے، بخلاف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جہاں انہوں نے فرمایا: بے شک

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام، باب من لا تجوز شہادتہ، حدیث نمبر 2357، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نکاح دو فاسق آدمیوں کی شہادت کے ساتھ منعقد ہو جاتا ہے۔ سو آپ نے اموال میں جس احتیاط کا حکم دیا ہے اس کی نکاح سے نفی کر دی ہے حالانکہ یہ زیادہ اولیٰ اور ضروری ہے کیونکہ اس کے ساتھ حل و حرمت اور حد و نسب تعلق رکھتے ہیں (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول انتہائی ضعیف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رضا اور عدالت کی شرط عائد کی ہے اور اس کا پسندیدہ ہونا خالی اسلام سے معلوم نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو اس کے احوال میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور فقط اس کے اس قول سے دھوکہ نہیں کھایا جائے گا کہ میں مسلمان ہوں۔ بسا اوقات اس میں ایسی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں جو اس کی شہادت کو رد کرنے کا موجب ہوتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ۭ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ (البقرہ) (اور اے (سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو دنیاوی اور وہ گواہ بناتا رہتا ہے اللہ کو اس پر جو اس کے دل میں ہے...... (اور اللہ تعالیٰ) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا) اور مزید فرمایا: وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ الآیہ (المنافقون: 4) (اور جب آپ انہیں دیکھیں تو ان کے جسم آپ کو بڑے خوشنما معلوم ہوں گے......)

مسئلہ نمبر 36۔ قولہ تعالیٰ: اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا ابو عبید نے کہا ہے: تَضِلَّ بمعنی تنسی ہے (کہ ان میں سے ایک بھول جائے) اور شہادت میں ضلال کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا کچھ حصہ بھول جانا اور کچھ یاد ہو اور آدمی اس کے درمیان حیران باقی رہ جاتا ہے یہی ضال ہے اور جو پوری شہادت بھول جائے تو اس کے لئے یہ نہیں کہا جاتا: ضل فیھا۔ (وہ اس میں بھول گیا) حمزہ نے جزا کے معنی کی بنا پر ان میں ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے اور فَتُذَكِّرُ میں فا کو اس کا جواب قرار دیا ہے۔ اور شرط اور جواب شرط رَجُلٌ و امْرَاَتَانِ کی صفت ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہیں۔ اور تُذَكِّرُ استیناف کی بنا پر مرفوع ہے۔ جیسا کہ یہ قول مرفوع ہے وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ (المائدہ: 95) (اور جو (اب) پھر گیا تو انتقام لے گا اللہ تعالیٰ اس سے) یہ سیبویہ کا قول ہے۔

اور جنہوں نے ان میں ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے تو یہ مفعول لہ ہے اور اس میں عامل محذوف ہے اور جماعت کی قرأت کے مطابق فَتُذَكِّرَ منصوب ہے اور اس فعل پر معطوف ہے جس کو اَنْ کے ساتھ نصب دی گئی ہے۔

نحاس نے کہا ہے: تَضَلَّ تا اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا جائز ہے اور تِضَلَّ تا کے کسرہ اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ پس جس نے کہا: تضل یہ ان کی لغت پر ہے جنہوں نے کہا ہے: ضَلِلْتَ تَضَلُّ۔ اور اسی پر آپ تِضَلُّ کہتے ہیں اور تا کو کسرہ دیا جاتا ہے تاکہ وہ ماضی فَعِلت ہونے پر دلالت کرے۔ اور جحدری اور عیسیٰ ابن عمر نے اَنْ تُضَلَّ تا کو ضمہ، ضاد کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بمعنی تُنْسٰی (یعنی اگر ان میں سے ایک بھلا دی جائے) اور اسی طرح ان دونوں سے ابو عمرو الدانی نے بیان کیا ہے۔ اور نقاش نے جحدری سے تا کے ضمہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ نقل کیا ہے بمعنی اَنْ تُضِلَّ الشَّهَادَةَ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 255

(کہ وہ شہادت کو بھلا دے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: اَضْلَلْتُ الفرس والبعیر (میں نے گھوڑے اور اونٹ کو گم کر دیا۔)
جب وہ دونوں تجھ سے ضائع ہو جائیں اور چلے جائیں سو تو انہیں نہ پا سکے۔ (تب یہ جملہ کہا جاتا ہے)

مسئلہ نمبر 37۔ قولہ تعالیٰ: فَتُذَكِّرَ ابن کثیر اور ابو عمرو نے ذال اور کاف کو مخفف پڑھا ہے اور اس پر معنی یہ ہوگا کہ تو اسے شہادت میں مذکر کی طرف لوٹا دے، کیونکہ عورت کی شہادت نصف شہادت ہے اور جب دو عورتوں نے شہادت دی تو دونوں کا مجموعہ ایک مرد کی شہادت کی طرح ہوگا۔ سفیان بن عیینہ اور ابو عمرو بن العلاء نے یہی کہا ہے۔ اور اس میں بہت بعد اور دوری ہے، کیونکہ وہ ضلال جس کا معنی نسیان ہے اس کے مقابلہ میں صرف ذکر (یاد دلانا) ہی آ سکتا ہے اور یہی جماعت کی قرأت کا معنی ہے۔ فَتُذَكِّرَ یعنی وہ دوسری اسے آگاہ کرے جب وہ غافل ہو جائے اور بھول جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو عمرو کی قرأت اس کی طرف راجع ہے، یعنی اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے، کہا جاتا ہے: تذکرت الشیٔ و اذکرتہ غیری و ذکرتہ (میں نے اسے یاد دلایا) ان تمام کا معنی ایک ہے الصحاح میں اس طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 38۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا حسن نے کہا ہے یہ آیت دو امروں کو جمع کیے ہوئے ہے اور وہ دونوں یہ ہیں کہ تو انکار نہ کرے جب تجھے تحصیل شہادت کے لئے بلایا جائے اور نہ تب جب تجھے ادائے شہادت کی طرف بلایا جائے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے اور حضرت قتادہ، ربیع اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: یعنی (تو انکار نہ کرے جب تجھے بلایا جائے) تا کہ تو شہادت اخذ کر لے اور اسے کتاب میں ثابت اور محفوظ کر لے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے جب تجھے ادائے شہادت کے لئے بلایا جائے درآنحالیکہ وہ شہادت تجھے حاصل ہو چکی ہو۔ اور نقاش نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کی ہے کہ آپ نے آیت کی اس طرح تفسیر بیان فرمائی ہے۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے پس جب تجھے بلایا جائے تا کہ تو پہلے شہادت دے تو تو اگر چاہے تو جا اور اگر چاہے تو نہ جا۔ ابو مجلز، عطا، ابراہیم، ابن جبیر، سدی، ابن زید وغیرہم نے یہی کہا ہے۔ اور اس بنا پر متعاقدین کے پاس گواہوں کا حاضر ہونا واجب نہیں ہے، البتہ قرض لینے دینے والے دونوں افراد پر لازم ہے کہ وہ گواہوں کے پاس حاضر ہوں۔ پس جب وہ دونوں ان کے پاس حاضر ہوں اور دونوں انہیں کتاب میں اپنی شہادت ثبت اور محفوظ کرنے کی درخواست کریں تو یہی وہ حالت ہے جو اس ارشاد سے مراد لینا جائز ہے: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا یعنی گواہ انکار نہ کریں جب انہیں شہادت کے اثبات کے لئے بلایا جائے اور جب ان کی شہادت ثابت ہو جائے، پھر انہیں حاکم کے پاس شہادت ادا کرنے کے لئے بلایا جائے تو یہ وہ دعوت ہے جس کے سبب حاکم کے پاس ان دونوں کی حاضری ہوگی، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور ابن عطیہ نے کہا ہے جیسا کہ حسن نے کہا ہے: آیت ندب کے اعتبار سے دو امروں کو جمع کئے ہوئے ہے۔ پس مسلمانوں پر اپنے بھائیوں کی معاونت کرنا مستحب ہے۔ پس جب گواہوں کی کثرت کے سبب وسعت ہو اور حق معطل ہونے اور مٹنے سے محفوظ و مامون ہو تو یہ دعوت مستحب ہے اور جسے بلایا گیا ہے اس کے لئے معمولی عذر کے سبب پیچھے رہ جانا جائز ہے

اور اگر وہ بغیر عذر کے بھی پیچھے رہ جائے تو نہ اس پر گناہ ہے اور نہ اس کے لئے ثواب ہے۔

اور جب ضرورت ہو اور حق کے معطل ہونے کا تھوڑا سا بھی خوف ہو تو ندب قوی ہو جائے گا اور یہ وجوب کے قریب ہو جائے گا اور جب اسے یہ علم ہو کہ شاہد کے شہادت سے پیچھے ہو جانے کے سبب حق ضائع اور تلف ہو جائے گا تو پھر اس پر شہادت دینا واجب ہے، بالخصوص جب شہادت اسے حاصل ہو چکی ہو اور دعوت اسے ادا کرنے کے لئے ہو، کیونکہ یہ ظرف زیادہ پختہ کرنے والی ہے، کیونکہ یہ گردن میں قلادہ ہے اور امانت ادا کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت سے اس پر دلیل ظاہر ہوتی ہے کہ امام کے لئے جائز ہے کہ وہ لوگوں کے لئے گواہوں کا انتظام کرے اور بیت المال سے ان کے لئے ان کی ضروریات پوری کرے اور ان کا لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے تحمل شہادت کے بغیر اور کوئی کام نہ ہو۔ اور اگر اس طرح نہ ہوا تو حقوق ضائع اور باطل ہو جائیں گے سو معنی یہ ہوگا: گواہ انکار نہ کریں جب وہ لوگوں کے حقوق اخذ کریں کہ وہ انہیں ادا کریں گے۔ واللہ اعلم۔

اور اگر کہا جائے: یہ شہادت تو بالاجرت ہے، تو ہم کہیں گے: یہ خالصۃً ایسی قوم کی شہادت ہے جنہوں نے اپنے حقوق بیت المال سے پورے کئے اور یہ قاضیوں اور والیوں کی تنخواہوں اور ان جمیع مصالح کی طرح ہے جو مسلمانوں کے لئے معاون ہوتے ہیں۔ اور یہ (شہادت) بھی من جملہ انہی میں سے ہے، واللہ اعلم۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا پس ان کے لئے مقرر کر دیئے۔

مسئلہ نمبر 39۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ شاہد وہ ہے جو حاکم کے پاس چل کر جاتا ہے اور یہ ایسا امر ہے جس پر شریعت کی بنیاد رکھی گئی ہے اور اس کے مطابق ہر زمانے میں عمل کیا گیا ہے اور ہر امت نے اسے سمجھا ہے۔ اور ان کی امثال میں سے یہ ہے: فِیْ بَیْتِهٖ یُؤْتَی الْحَكَمُ (اس کے گھر میں حکم (فیصلہ کرنے والا ثالث) کو لایا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 40۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا تو غلام گواہوں کی جماعت سے خارج ہو گیا اور یہی مِنْ رِّجَالِكُمْ کے عموم کو خاص کر رہا ہے، کیونکہ اس کے لئے اسے قبول کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لئے (شہادت کے لئے) آنا صحیح ہے، کیونکہ وہ بذات خود مستقل بالحکم نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ غیر کی اجازت سے تصرف کرتا ہے، نتیجتاً وہ منصب شہادت سے اسی طرح گر گیا جیسا کہ وہ ولایت کے مرتبہ سے گر گیا ہے۔ ہاں بلکہ! جیسا کہ وہ جمعہ، جہاد اور حج کے فرض کی ادائیگی سے گرا ہوا ہے (1)۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 41۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ شہادت کی طرف بلانے کی حالت میں ہے۔ رہا وہ جس کے پاس کسی آدمی کے حق میں شہادت ہو اور اس کا وہ مستحق جو اس سے نفع حاصل کر سکتا ہے وہ اسے نہ جانتا ہے، تو ایک قوم نے کہا ہے اس شہادت کو ادا کرنا مستحب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا اور بلانے کے وقت اللہ تعالیٰ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 257

نے ادائے شہادت کو فرض قرار دیا ہے اور جب نہ بلایا جائے تو پھر شہادت دینا مستحب ہے کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''گواہوں میں سے بہترین وہ ہے جو اپنی شہادت دینے کے لئے آئے اس سے قبل کہ اسے اس کے لئے کہا جائے''
اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔

اور صحیح یہ ہے کہ شہادت دینا فرض ہے اگرچہ اس کے بارے درخواست نہ کی جائے جبکہ حق کے ضائع یا فوت ہونے کا خوف ہو یا اس پر طلاق یا عتق کا خوف ہو جسے بیوی ہونے کے اعتبار سے اس سے استمتاع کرنے اور غلام سے خدمت لینے کا تصرف حاصل تھا وغیر ذالک۔ پس جس نے اس میں سے کوئی شی اخذ کر رکھی ہو تو اس شہادت کو ادا کرنا اس پر واجب ہوتا ہے اور وہ اس کی ادائیگی کو اس پر موقوف نہیں کرے گا کہ اسے شہادت کے لئے کہا جائے اور وہ اس طرح حق کو ضائع کر دے۔
تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ اَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (الطلاق:2) (گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے دو) اور مزید فرمایا: اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ (الزخرف) (ہاں شفاعت کا حق انہیں ہے جو حق کی گواہی دیں اور وہ (اس کو) جانتے بھی ہیں) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت میں ہے: انصرا خاك ظالما او مظلوما (تو اپنے بھائی کی مدد کر چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو) تو اس پر اس کی مدد کرنا متعین ہو گیا اس شہادت کی ادائیگی کے ساتھ جو اس کے پاس ہو اس حق کو زندہ کرنے کے لئے جسے انکار مار دے (ضائع کر دے)۔

مسئلہ نمبر 42۔ اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ وہ آدمی جس پر شہادت دینا واجب ہو ان وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر جو ہم نے ذکر کی ہیں اور وہ اسے ادا نہ کرے تو یہ شاہد اور شہادت میں عیب ہے اور اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ ابن القاسم وغیرہ کا قول ہے۔ اور بعض نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اگر وہ شہادت حقوق العباد میں سے کسی حق کے بارے ہو تو وہ خالصۃً اس نفس شہادت میں عیب ہوگا اور اس کے بعد اسے ادا کرنا اس کے لئے مناسب نہ ہو گا۔ پہلا قول صحیح ہے کیونکہ وہ شے جو اس کے عیب کو ثابت کر رہی ہے وہ اس کا اس امر کو ادا نہ کرنے کے سبب فاسق ہو جانا ہے جس امر کی ادائیگی بغیر عذر کے اس پر واجب تھی اور فسق مطلق شہادت کی اہلیت کو سلب کر لیتا ہے اور یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 43۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد: خیر الشهداء الذی یاتی بشهادته قبل ان یُسالها اور اس ارشاد کے درمیان جو حدیث عمران بن حصین میں ہے کوئی تعارض نہیں (وہ ارشاد یہ ہے) اِن خیر کم قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم (بے شک تم میں سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں) پھر عمران نے کہا: میں نہیں جانتا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے بعد دوبار ذکر فرمایا یا تین بار...... پھر ان کے بعد قوم ہوگی جو شہادت دیں گے اور انہیں شاہد نہیں بنایا جائے گا وہ خیانت کریں گے اور انہیں امین نہیں بنایا جائے گا، وہ نذریں مانیں گے اور پوری نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا ظاہر ہو جائے گا (1)۔'' دونوں کو صحیحین نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث تین وجوہ پر محمول ہے: ان میں سے ایک یہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ما یحذر من زهرة الدنیا، حدیث نمبر 5948، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے کہ اس سے مراد جھوٹا گواہ ہو کیونکہ وہ ایسی شے کے بارے گواہی دیتا ہے جس پر اسے شاہد نہ بنایا گیا ہو۔ یعنی ایسی شے کے بارے میں جسے نہ اس نے خود اخذ کیا ہو اور نہ ہی اس جانب اس کی توجہ کرائی گئی ہو۔

اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے باب الجابیہ پر خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں اسی طرح قیام فرماتے تھے جیسے میں تم میں کھڑا ہوں پھر آپ نے فرمایا: یایھا الناس اتقوا اللہ فی اصحابی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم ثم یفشو الکذب شھادۃ الزور (اے لوگو! میرے اصحاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو پھر ان کے بارے میں جو ان کے پیچھے آئیں گے پھر ان کے بارے میں جو ان کے پیچھے آئیں گے پھر جھوٹ اور جھوٹی شہادت پھیل جائے گی) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ ہو جسے حرص اور طمع اس شے کے نافذ کرنے پر برانگیختہ کرے جس کے ساتھ وہ شہادت دے گا لہٰذا وہ درخواست سے قبل ہی شہادت دینے میں جلدی کرتا ہے۔ پس یہ شہادت مردود ہے کیونکہ یہ ایسی خواہش پر دلالت کرتی ہے جو شاہد پر غالب ہوتی ہے اور تیسری وجہ یہ ہے جسے ابراہیم نخعی نے بیان کیا ہے جو کہ اس حدیث کے بعض طرق کے راوی ہیں: وہ ہمیں عہد اور شہادت سے منع کرتے تھے اور ہم ابھی بچے تھے۔

مسئلہ نمبر 44۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ۔ تَسْـَٔمُوْٓا کا معنی ہے تملوا اور تم اکتاؤ نہیں۔

اخفش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے سَئِمْتُ اَسْاَمُ سَاْمًا و سَاٰمَۃً و سَاٰمًا [وسَاٰمۃً] و سَاٰمًا (اکتا جانا) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

سَئِمْتُ تکالیف الحیاۃ و مَنْ یَعِشْ	ثمانین حولا - لا أبالك - یَسأمِ

میں زندگی کی تکالیف سے اکتا گیا اور جو اسی برس تک زندہ رہا...... تیرا باپ نہ ہو وہ اکتا ہی جاتا ہے۔

اَنْ تَكْتُبُوْهُ یہ فعل کے سبب محل نصب میں ہے صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا یہ دونوں تکتبوہ کی ضمیر سے حال ہیں۔ اور صغیر کو اس کے خاص اہتمام کے سبب مقدم ذکر کیا گیا ہے اور یہ نہی اکتانے سے ہے۔ بلاشبہ یہ اس لئے وارد ہوئی ہے کیونکہ ان کے درمیان قرضوں کا لین دین کثرت سے تھا لہٰذا ان کے بارے یہ خوف ہونے لگا کہ وہ لکھنے سے اکتا جائیں (1) اور کوئی یہ کہنے لگے: قرضے کی یہ مقدار تو بالکل قلیل اور تھوڑی ہے مجھے اسے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے قلیل و کثیر میں لکھنے کی انگیخت دلا کر تاکید فرمائی۔ ہمارے علماء نے کہا ہے مگر وہ شے جو اپنی کی اور اقرار و انکار میں نفس کے اس کی طرف جھکاؤ نہ ہونے میں وہ قیراط اور اسی کی طرح کی ہو (تو اس میں لکھنے کی ضرورت نہیں)۔

مسئلہ نمبر 45۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ اَقْسَطُ بمعنی اعدل (یہ تحریر زیادہ عدل کرنے والی ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک) یعنی یہ کہ قلیل و کثیر مقدار کو لکھ لیا جائے اور اس پر گواہ بنالئے جائیں۔ (2)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 383، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت	2۔ احکام القرآن، صفحہ 257، جلد 1، دار الفکر لبنان

وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ یعنی یہ شہادت کو صحیح کرنے والی اور اسے محفوظ بنانے والی ہے۔ وَاَدْنٰی اس کا معنی ہے أقرب۔ زیادہ قریب ہے۔ اور تَرْتَابُوْا تم شک کرو۔ (یعنی یہ تحریر تمہیں شک سے بچانے کا بہت آسان اور قریب ترین طریقہ ہے۔)

مسئلہ نمبر 46۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ یہ اس پر دلیل ہے کہ شاہد جب کتاب دیکھے اور اسے شہادت یاد نہ ہو تو وہ اسے ادا نہیں کرے گا کیونکہ اس پر اس میں شک داخل ہو چکا ہے اور وہ شہادت نہیں دے سکتا مگر اسی شے کی جسے وہ جانتا ہو، لیکن وہ یہ کہہ سکتا ہے: یہ میری تحریر ہے اور اب مجھے وہ یاد نہیں جو میں نے اس میں لکھا۔ (1)

ابن منذر نے کہا: اہل علم میں سے اکثر وہ جن سے روایات محفوظ کی جاتی ہیں وہ اس سے منع کرتے ہیں کہ کوئی شاہد اپنے خط پر شہادت دے جب اسے شہادت یاد نہ ہو۔

اور امام مالک نے اس کے جواز پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ مَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا۔

اور بعض علماء نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے کتابت کی نسبت عدالت کی طرف کی ہے تو اس میں اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے کہ وہ اپنے خط پر شہادت دے اگرچہ اسے یاد نہ بھی ہو۔

ابن مبارک نے معمر عن ابن طاؤس عن ابیہ کی سند سے ایک آدمی کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ وہ شہادت پر شہادت دیتا ہے اور پھر اسے بھول جاتا ہے۔ فرمایا: کوئی حرج نہیں کہ وہ شہادت دے، بشرطیکہ وہ تحریری معاہدہ میں اپنی علامت یا اپنے ہاتھ کی تحریر کو پالے۔ ابن مبارک نے کہا: میں نے یہ بہت اچھا سمجھا ہے اور اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کئی اخبار و روایات مروی ہیں کہ آپ نے کئی ایک اشیاء میں دلائل و شواہد کے ساتھ فیصلہ کیا ہے اور آپ ﷺ سے پہلے آنے والے رسل عظام علیہم السلام سے بھی ایسی روایات ہیں جو اس مذہب کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس کے بارے مزید بیان سورۃ الاحقاف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 47۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ اس میں اَنْ استثنا ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے یہ اول کلام سے نہیں ہے (2)۔ اخفش (ابو سعید) نے کہا ہے: ای الّا أن تقع تجارۃ (مگر یہ کہ تجارت واقع ہو)۔ پس کان بمعنی وقع اور حدث کے ہے۔ اور ان کے سوا کسی اور نے کہا ہے: وَ تُدِيْرُوْنَهَا یہ خبر ہے۔ اور اکیلے عاصم نے کان کی خبر ہونے کی بنا پر تجارۃً پڑھا ہے (3) اور اس کا اسم اس میں مخفی ضمیر ہے اور حَاضِرَةً یہ تجارۃ کی صفت ہے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے الا ان تکون التجارۃُ تجارۃ حاضرۃ۔ یا الا ان تکون المبایعۃ تجارۃ حاضرۃ (مگر یہ کہ سودا دست بدست ہو) کی اور ابو علی فارسی نے اسے اسی طرح مقدر کیا ہے اس کی نظائر اور اس پر استشہاد پہلے گزر چکا ہے۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے ان پر لکھنے کی مشقت کو ملاحظہ فرمایا تو اس کے ترک پر نص بیان فرمائی اور ہر اس بیع میں حرج کو اٹھا دیا جو نقد و نقد ہو اور اغلباً یہی بیع ہوتی ہے جبکہ وہ قلیل شے میں ہو مثلاً کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ نہ کہ کثیر میں جیسا کہ املاک وغیرہ (یعنی املاک کی خرید و فروخت میں چونکہ عوض کثیر ہوتا ہے اس لئے اسے لکھنا لازم ہے۔) سدی اور ضحاک نے کہا ہے:

1۔ احکام القرآن، صفحہ 258، جلد 1، دار الفکر لبنان 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 383، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت 3۔ ایضاً

یہ (رخصت) اس سودے میں ہے جو دست بدستی ہو۔ (1)

مسئلہ نمبر 48۔ قولہ تعالیٰ: تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ یہ ارشاد باہم قبضہ کرنے اور مقبوض کے ساتھ مجلس عقد سے جدا ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ جب گھر، زمین اور حیوانوں میں سے کثیر جدائی اور علیحدگی کو قبول نہیں کرتے اور نہ انہیں چھوڑا جا سکتا ہے تو ان کے سودے میں لکھ لینا اچھا ہے اور اس میں قرضے کا لین دین ملحق ہو جائے گا (2) تو گویا تحریر اس کے لئے اعتماد اور مضبوطی کا باعث ہوگی جبکہ یہ قریب ہے کہ احوال بدلنے اور دلوں کی کیفیت میں تغیر آنے سے نزاع وہاں طاری ہو جائے۔ پس جب وہ معاملہ میں ایک دوسرے سے جدا ہوں گے اور دونوں اپنے اپنے عوض پر قابض ہوں گے اور دونوں میں سے ہر ایک اس شے کے ساتھ مجلس عقد سے جدا ہوگا جو اس نے اپنے ساتھی سے خریدی ہے تو عرفاً و عادۃً تنازع کا خوف کم ہوگا مگر مخفی اور پوشیدہ اسباب کے ساتھ شریعت نے نقد اور ادھار دونوں حالتوں میں ان مصالح پر آگاہ کیا ہے (3) اور جس پر غائب ہوا جا سکتا ہے اور جس پر غائب نہیں ہوا جا سکتا تحریر، شہادت اور رہن کے ساتھ۔

امام شافعی نے کہا ہے: بیوع تین ہیں: ایک وہ بیع جو کتابت اور گواہوں کے ساتھ ہو اور دوسری وہ بیع جو رہن کے عوض ہو اور تیسری وہ بیع جو امانت کے ساتھ ہو اور پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب نقد کے عوض بیع کرتے تھے تو گواہ بنا لیتے تھے اور جب ادھار کوئی شے بیچتے تھے تو اسے لکھ لیتے تھے۔ (4)

مسئلہ نمبر 49۔ قولہ تعالیٰ: وَاَشْهِدُوْٓا علامہ طبری نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور تم گواہ بنا لیا کرو چھوٹے سودے پر بھی اور بڑے سودے پر بھی (5)۔ اور لوگوں نے اس کے واجب ہونے یا مستحب ہونے کے بارے اختلاف کیا ہے (6)، پس حضرات ابو موسیٰ اشعری، ابن عمر، ضحاک، سعید بن مسیب، جابر بن زید، مجاہد، داؤد بن علی اور ان کے بیٹے ابو بکر رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: بیع کے وقت گواہ بنانا واجب ہے (7)۔ اور اس بارے میں ان میں سے زیادہ شدت حضرت عطا نے کی ہے انہوں نے کہا ہے: تو گواہ بنالے جب تو کوئی شے فروخت کرے اور جب تو کوئی شے خریدے درہم کے عوض یا نصف درہم کے عوض یا چوتھائی درہم کے عوض یا اس سے بھی کم کے عوض، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ (اور گواہ ضرور بنا لیا کرو جب خرید و فروخت کرو)

اور ابراہیم نے کہا ہے: گواہ بنالے جب کوئی شے فروخت کرے اور جب کوئی شے خریدے اگرچہ وہ سبزی کی گانٹھ ہی ہو۔ اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اسے ترجیح دی ہے ان میں سے علامہ طبری بھی ہیں اور انہوں نے کہا ہے: کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے جب وہ کوئی شے فروخت کرے اور جب کوئی شے خریدے مگر یہ کہ اس پر گواہ بنا لیا جائے، ورنہ وہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 383، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت　2۔ ایضاً
3۔ احکام القرآن، صفحہ 258، جلد 1، دار الفکر بیروت　4۔ ایضاً
5۔ جامع البیان، صفحہ 158، جلد 3-4، دار احیاء التراث العربیہ　6۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ لبنان　7۔ ایضاً

کتاب اللہ کی مخالفت کرنے والا ہوگا اور اسی طرح اگر وہ مقررہ مدت تک ادھار ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ لکھوا لے اور گواہ بنا لے اگر وہ کوئی کاتب پا لے۔

اور علامہ شعبی اور حسن نے یہ موقف اپنایا ہے کہ اس امر کا اطلاق معنی ندب (1) اور ارشاد پر ہے وجوب پر نہیں ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہی قول امام مالک، امام شافعی اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور ابن عربی نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ تمام کا قول ہے، فرمایا: اور یہی صحیح ہے۔ اور ضحاک کے سوا کسی سے بھی یہ بیان نہیں ہوا کہ یہ وجوب کے لئے ہے۔ فرمایا تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کی اور اسے تحریر کیا۔ فرمایا: اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر کا نسخہ یہ ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ هذا ما اشترى العدّاء بن خالد بن هوذة من محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم، اشترى منه عبدا۔ اوامة۔ لا داء ولا غائلة ولا خبثة بيع المسلم المسلم (بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ یہ وہ ہے جسے عداء بن خالد بن ہوذہ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خریدا ہے، اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے غلام یا کنیز خریدی۔ اس میں کوئی بیماری نہیں، کوئی شر اور فساد نہیں، اور کوئی پلیدی اور نجاست نہیں اور یہ مسلمان کی بیع مسلمان کے ساتھ ہے۔) تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کی اور کسی کو گواہ نہیں بنایا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خریدا اور اپنی زرہ یہودی کے پاس رہن رکھی اور آپ نے کوئی گواہ نہیں بنایا۔ اگر گواہ بنانا امر واجب ہوتا تو جھگڑے کے خوف کی وجہ سے رہن کے ساتھ بھی واجب ہوتا۔ (2)

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہم نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کے سوا دوسروں سے وجوب ذکر کیا ہے۔ اور عداء کی اس حدیث کو دارقطنی اور ابوداؤد رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔ اور انہوں نے فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بعد اسلام قبول کیا۔ اور وہ کہتے ہیں ہم نے حنین کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ لڑی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں غلبہ نہیں دیا اور نہ ہماری مدد کی، پھر وہ اسلام لائے اور اپنے اسلام کو خوب اچھا کیا۔ اسے ابوعمر نے ذکر کیا ہے اور انہوں نے راوی کی اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے: ''اصمعی نے کہا ہے: میں نے سعید بن ابی عروبہ سے غائلہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اس سے مراد بھاگ جانا، چوری کرنا اور زنا کرنا ہے اور میں نے ان سے الخبثہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: مسلمانوں کے عہد میں رہنے والوں کی خرید وفروخت کرنا (یعنی جو مسلمانوں کے ساتھ کسی معاہدہ کے تحت رہ رہا ہو)۔

اور امام ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: اس میں وجوب تو باعث قلق واضطراب ہے اور رہا دقائق میں تو وہ بہت مشکل اور شاق ہے اور جو کچھ اکثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بسا اوقات ایک تاجر گواہ بنانے کو ترک کر کے دوستی کا ارادہ اور قصد کرتا ہے اور کبھی بعض شہروں میں اس کی عادت اور رواج ہوتا ہے (کہ گواہ نہیں بنایا جاتا) اور کبھی وہ عالم اور باعزت بڑے آدمی سے حیا محسوس کرتا ہے لہٰذا اس پر گواہ نہیں بنایا جاتا، پس یہ سب ائتمان (امین بنانا) میں داخل ہیں اور امر بالاشہاد مستحب باقی رہ جاتا ہے، کیونکہ اس میں اغلباً مصلحت ہوتی ہے جب اس سے مانع کوئی عذر موجود نہ ہو جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ لبنان

2۔ احکام القرآن، صفحہ 259، جلد 1، دار الفکر بیروت۔ ابن ماجہ کتاب التجارات حدیث 2241، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مہدوی، نحاس اور مکی نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا ہے: وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے فَاِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا(1) اور نحاس نے اسے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور یہ کہ انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَـيْـــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىھُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْــَٔـمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْھَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِھٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ اور کہا اس آیت نے اپنے ماقبل کو منسوخ کر دیا ہے۔(2)

نحاس نے کہا ہے: یہ حسن، حکم اور عبد الرحمٰن بن زید کا قول ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے اس کا کوئی معنی نہیں کیونکہ یہ حکم پہلے کا مغایر اور اس کے سوا ہے۔ اور بلاشبہ یہ حکم اس کے بارے ہے جو لکھنے والا کاتب نہ پائے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِھٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا یعنی پھر وہ اس سے رہن کا مطالبہ نہ کرے فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ (البقرۃ:283) (اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو۔ پھر اگر اعتبار کرلے کوئی تم میں سے دوسرے پر پس چاہیے کہ ادا کر دے وہ جس پر اعتبار کیا گیا اپنی امانت کو۔) فرمایا: اگر اس کا پہلے کے لئے ناسخ ہونا جائز ہے تو پھر یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارشاد گرامی: وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ الآیۃ (النساء:43) (اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے......) یہ اس ارشاد کے لئے ناسخ ہو: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ الآیۃ (المائدہ:6) (اے ایمان والو! جب تم نماز کا ارادہ کرو۔) اور پھر یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارشاد گرامی: فمن لم یجد فصیام شهرین متتابعین (پس جو (غلام کو) نہ پائے تو وہ دو ماہ لگاتار روزے رکھے۔) اس ارشاد کے لئے ناسخ ہو: فتحریر رقبة مومنة (پس ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے۔)

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا کا ابتدائے آیت سے جو کہ امر بالاشہاد پر مشتمل ہے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت

2۔ جامع البیان، صفحہ 141، جلد 3-4، دار احیاء التراث العربیہ۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 2355، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نزول میں متاخر ہونا واضح اور ظاہر نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں ایک ساتھ نازل ہوئے۔ اور ایک حالت میں اکٹھے نازل ہونے والے دو حکموں کو ناسخ و منسوخ قرار دینا جائز نہیں ہوتا۔ فرمایا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب ان سے کہا گیا آیۃ الدین منسوخ ہے تو آپ نے فرمایا: نہیں قسم بخدا! آیۃ الدین محکم ہے اس میں کوئی نسخ وغیرہ نہیں۔ فرمایا: اشہاد یعنی گواہ بنا لینے کا حکم طمانینت کے لئے فرمایا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے دین کی توثیق اور پختگی کے لئے کئی طرق اور ذرائع بیان فرمائے ہیں ان میں سے ایک لکھوانا ہے، ایک رہن رکھنا ہے اور ایک گواہ بنالینا ہے۔ اور علمائے امصار کے مابین کوئی اختلاف نہیں کہ رہن بطریق ندب مشروع ہے نہ کہ بطریق وجوب۔ پس گواہ بنانے میں بھی حکم اسی کی مثل سمجھا جائے گا اور لوگ ہمیشہ سفر و حضر، برو بحر اور صحراء و پہاڑ میں بغیر گواہ بنائے خرید و فروخت کرتے رہتے ہیں باوجود اس کے کہ لوگ اسے جانتے ہیں لیکن کوئی انکار نہیں کرتا تو اگر گواہ بنانا واجب ہوتا تو وہ اس واجب کو ترک کرنے والے پر اعتراض کرنا قطعاً ترک نہ کرتے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام خوبصورت استدلال ہے اور اس سے حسین تر وہ ہے جو ترک اشہاد کے بارے میں صریح سنت میں وارد ہے اور وہ وہ روایت ہے جسے دارقطنی نے طارق بن عبداللہ محاربی سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: ''ہم ربذہ اور جنوب ربذہ سے ایک قافلہ کی صورت میں آئے اور مدینہ طیبہ کے قریب آکر ہم نے پڑاؤ ڈالا اور ہمارے ساتھ ہماری ایک عورت پالکی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پس اس اثنا میں کہ ہم وہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ہمارے پاس ایک آدمی آیا اس پر دو سفید کپڑے تھے اور اس نے سلام کیا اور ہم نے بھی اس پر سلام کا جواب لوٹایا، تو اس نے پوچھا: یہ قافلہ کہاں سے آیا ہے؟ تو ہم نے کہا: ربذہ سے اور ربذہ کے جنوب سے۔ راوی کہتے ہیں: اور ہمارے ساتھ ایک سرخ اونٹ تھا، تو اس نے پوچھا کیا تم مجھے اپنا یہ اونٹ بیچتے ہو؟ تو ہم نے کہا: ہاں۔ انہوں نے پوچھا: کتنے کے عوض؟ ہم نے کہا: کھجور کے اتنے اتنے صاع کے عوض۔ اس نے کہا: ہم اس میں سے کوئی شے کم نہیں کرائیں گے (یعنی پورا پورا ادا کریں گے) اور کہا: میں اسے پکڑ لوں، پھر اس نے اونٹ کو سر سے پکڑا یہاں تک کہ وہ مدینہ طیبہ میں داخل ہو گیا اور ہم سے اوجھل ہو گیا اور ہم آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور ہم نے کہا: تم نے اپنا اونٹ ایسے آدمی کو دے دیا ہے جسے تم پہچانتے ہی نہیں! تو اس پالکی میں بیٹھی ہوئی عورت نے کہا: تم ایک دوسرے کو ملامت نہ کرو میں نے اس آدمی کا چہرہ دیکھ لیا ہے وہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بے وفائی کرے، میں نے کسی آدمی کا چہرہ اس کے چہرہ سے بڑھ کر چودھویں رات کے چاند سے زیادہ مشابہ نہیں دیکھا۔ تو جب شام ہوئی تو ہمارے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی حیثیت سے تمہارے پاس آیا ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں حکم فرمایا ہے کہ تم اس سے کھاؤ یہاں تک کہ تم خوب سیر ہو جاؤ اور تم اپنا کیل کر لو یہاں تک کہ تم اپنا حق پورا کر لو۔ اس نے بیان کیا: پس ہم نے کھایا یہاں تک کہ ہم سیر ہو گئے۔ اور ہم نے کیل کیا یہاں تک کہ ہم نے اپنا حق پورا کر لیا۔ (1)

اور زہری نے عمارہ بن خزیمہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ ان کے چچا نے انہیں بتایا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا۔ الحدیث۔ اور اس میں ہے: پس اعرابی نے

1۔ سنن الدارقطنی، کتاب بیوع، صفحہ 45، حدیث 186، جلد 3، دار المحاسن قاہرہ

کہنا شروع کر دیا: گواہ لاؤ جو یہ شہادت دے کہ میں نے تمہیں (گھوڑا) فروخت کیا ہے..... تو حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ تو نے (گھوڑا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیچا ہے۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''تو کیونکر شہادت دیتا ہے؟'' تو انہوں نے عرض کی: آپ کی تصدیق کرنے کے ساتھ یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم۔ راوی کہتے ہیں: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ کی شہادت کو دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا۔ فجعل رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم شہادۃ خزیمۃ بشہادۃ رجلین اسے نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 50۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ اس میں تین اقوال ہیں۔

(۱) کاتب نہ لکھے جب تک اسے لکھوایا نہ جائے اور شاہد اپنی شہادت میں کوئی کمی وبیشی نہ کرے۔ حسن، قتادہ، طاؤس اور ابن زید وغیرہم نے یہی کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس، مجاہد اور عطاء رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ معنی یہ ہے کہ کاتب لکھنے سے اور شاہد شہادت دینے سے انکار نہ کرے(2)۔ ان دونوں قولوں کی بنا پر وَلَا يُضَآرَّ اصل میں يُضَارِرَ را کے کسرہ کے ساتھ ہے، پھر ادغام ہوا اور حالت جزمی میں فتحہ کے خفیف ہونے کی وجہ سے را کو فتحہ دے دیا گیا(3)۔ نحاس نے کہا ہے: میں نے ابو اسحاق کو اس قول کی طرف مائل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ فرمایا: کیونکہ اس کے بعد وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ہے۔ پس اس طرح ہونا اولیٰ ہے کہ جس نے بغیر حق کے شہادت دی یا لکھنے میں کوئی تغیر وتبدل کیا اسے فاسق کہا جائے اور یہ اس کے بارے میں اس سے بھی زیادہ اولیٰ ہے کہ آدمی شاہد کو شہادت دینے کے لئے کہے اور وہ مشغول ہو۔ (یعنی شہادت کے لئے فارغ نہ ہو تو اسے فاسق کہا جائے۔)

حضرت عمر بن خطاب، ابن عباس اور ابن ابی اسحاق رضی اللہ عنہم نے يُضَارِرَ پہلی را کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حضرت مجاہد، ضحاک، طاؤس اور سدی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے کہ آیت وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ کا معنی یہ ہے کہ شاہد کو شہادت کی طرف اور کاتب کو کتابت کی طرف بلایا جائے اور وہ دونوں مشغول ہوں(4)۔ اور جب وہ دونوں اپنے عذر پیش کر دیں تو وہ ان دونوں کو نکالے اور انہیں اذیت پہنچائے اور ستائے اور کہے: تم دونوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے اور اسی طرح کی باتیں ان سے کرے اور انہیں ضرر پہنچائے۔ اس قول کی بنا پر يُضَآرَّ کی اصل يُضَارَرَ ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے يُضَارَرَ پہلی را کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے(5)۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے کیونکہ اگر وہ اسے مطلق قرار دیتا تو پھر اس میں ان دونوں کے لئے اپنے دین اور اپنی معاش کے امر سے شغل اور مصروفیت ہے اور لفظ المضارۃ چونکہ دو سے متعلق ہے یہ ان معانی کا تقاضا کرتا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، حدیث نمبر 3130، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، سنن نسائی، کتاب بیوع، صفحہ 228، جلد 2، وزارت تعلیم، اسلام آباد

2۔ احکام القرآن، صفحہ 259، جلد 1، دار الفکر بیروت　3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت

4۔ سنن دار قطنی، کتاب البیوع، صفحہ 145، حدیث نمبر 186، جلد 3، مطبوعہ دار المحاسن قاہرہ

5۔ المحرر الوجیز، صفحہ 385، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان

کاتب اور شہید پہلے دونوں قولوں کی بنا پر اپنے فعل کے سبب مرفوع ہیں اور تیسرے قول کی بنا پر نائب الفاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہیں۔

مسئلہ نمبر 51۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تَفْعَلُوْا یعنی اگر تم ستانے کا عمل کرو گے۔ فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ تو یہ تمہاری طرف سے نافرمانی ہوگی، یہ سفیان ثوری سے مروی ہے۔ پس کاتب اور شاہد زیادتی یا کمی کے ساتھ نافرمانی کرتے ہیں اور یہ وہ جھوٹ ہے جو اموال وابدان میں اذیت پہنچانے والا ہے اور اس میں حق کو باطل کرنا لازم آتا ہے اور اسی طرح ان دونوں کا ستانا اور اذیت دینا یہ بھی ہے کہ جب وہ دونوں نافرمانی میں مشغول ہوں اور الله تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرنے کے اعتبار سے راہ صواب سے نکل جائیں اور قولہ بِکم میں تقدیر عبارت یہ ہے: فسوقٌ حالٌ بکم۔

مسئلہ نمبر 52۔ قولہ تعالیٰ: وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ یہ الله تعالیٰ کی جانب سے وعدہ ہے کہ جو کوئی الله تعالیٰ سے ڈراوہ اسے سکھادے گا۔ یعنی الله تعالیٰ اس کے دل میں نور پیدا فرمادے گا جس کے ساتھ وہ سمجھ جائے گا جو اس کی طرف القا کیا جائے گا اور الله تعالیٰ اس کے دل میں ابتداءً فرقان رکھ دے گا یعنی ایسی قوت عطا فرما دے گا جس کے ساتھ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کر سکے گا۔ اور اسی سے الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (الانفال: 29) (اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے الله سے تو وہ پیدا کردے گا تم میں حق و باطل میں تمیز کی قوت۔) والله اعلم۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِھٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

"اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو۔ پھر اگر اعتبار کرلے کوئی تم میں سے دوسرے پر، پس چاہیے کہ ادا کردے وہ جس پر اعتبار کیا گیا ہے اپنی امانت کو اور ضروری ہے کہ ڈرتا رہے الله سے جو اس کا رب ہے۔ اور مت چھپاؤ گواہی کو اور جو شخص چھپاتا ہے اسے تو یقیناً گنہگار رہے اس کا ضمیر۔ اور الله تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب جاننے والا ہے۔"

اس میں چوبیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب الله تعالیٰ نے اموال و دیون کی حفاظت کی مصلحت کے لئے لکھوانے اور گواہ بنا لینے کے مستحب ہونے کا ذکر فرمایا، تو اس کے بعد ایسے عذروں کا تذکرہ کیا جو لکھوانے سے مانع ہیں اور ان کی صورت میں رہن (گروی رکھنا) کا حکم بیان فرمایا اور عذر کے احوال میں سے سفر پر نص بیان فرمائی جو سفر تمام عذروں پر غالب ہے، بالخصوص اس وقت میں کثرت غزوات کی وجہ سے اور معنوی طور پر اس میں ہر عذر داخل ہے۔ بسا اوقات سفر کے بغیر حضر میں بھی کاتب کا ملنا متعذر اور مشکل ہو جاتا ہے جیسا کہ لوگوں کی مشغولیت کے اوقات اور رات کا وقت اور یہ بھی کہ مقروض کی ذمہ داری کے فساد کا خوف

ہو تو یہ بھی ایک ایسا عذر ہے جو رہن کے مطالبہ کو ثابت کرتا ہے۔ حضور نبی مکرم ﷺ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی جس سے آپ نے جو ادھار لینے کا مطالبہ کیا، تو اس نے کہا: بلاشبہ محمد (ﷺ) میرا مال لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: "اس نے جھوٹ بولا ہے بلاشبہ میں زمین میں بھی امین ہوں اور آسمان میں بھی امین ہوں اگر وہ مجھ پر اعتبار کرتا تو میں یقیناً اسے ادا کر دیتا تم میری زرہ اس کے پاس لے جاؤ(1)۔" پس آپ ﷺ کا وصال ہوا درآنحالیکہ آپ کی زرہ اس کے پاس گروی پڑی ہوئی تھی۔ ابھی اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور علماء نے کہا ہے: سفر میں گروی رکھنا نص قرآن سے ثابت ہے اور حضر میں گروی رکھنا سنت رسول ﷺ سے ثابت ہے اور یہ صحیح ہے اور ہم نے حضر میں آیت سے معنوی طور پر اس کے جائز ہونے کو بیان کیا ہے، کیونکہ کبھی اعذار حضر میں بھی مترتب ہوتے ہیں اور سوائے حضرت مجاہد، ضحاک اور داؤد کے کسی سے بھی حضر میں اس کا ممنوع ہونا مروی نہیں ہے، اس حال میں کہ وہ آیت سے استدلال کرتے ہیں اور آیت میں کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ یہ کلام اگرچہ شرط کے مخرج میں نکلا ہے سو اس سے مراد غالب احوال ہیں۔ اور آیت میں حالت سفر میں رہن کا ہونا ان چیزوں میں سے نہیں ہے جو حالت سفر کے بغیر ممنوع ہوتی ہیں۔ صحیحین وغیرہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت مذکور ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ایک یہودی سے ایک معین مدت تک اناج خریدا اور اس کے پاس لوہے کی زرہ گروی رکھی (2)۔ اسے نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا اور آپ کی زرہ یہودی کے پاس گھر والوں کے لئے تیس صاع جو کے عوض گروی پڑی ہوئی تھی (3)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَلَمْ تَجِدُوْا کَاتِبًا جمہور نے کَاتِبًا پڑھا بمعنی وہ آدمی جو لکھتا ہے۔

حضرت ابن عباس، حضرت ابی، حضرت مجاہد، حضرت ضحاک، حضرت عکرمہ اور حضرت ابو العالیہ رضی اللہ عنہم نے وَلَمْ تَجِدُوْا كِتَابًا پڑھا ہے (4)۔ ابوبکر انباری نے کہا ہے: حضرت مجاہد نے اس کی تفسیر بیان کی ہے اور فرمایا ہے: اس کا معنی ہے پس اگر تم دوران سفر سیاہی نہ پاؤ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے كُتَّابًا بھی مروی ہے (5)۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قراءت شاذ ہے اور قراءت عامہ اس کے خلاف ہے۔ اور بہت کم ہی کوئی شے قراءت عامہ سے خارج ہوتی ہے مگر اس میں طعن ہوتا ہے اور کلام تو کاتب کے بارے چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ارشاد فرمایا ہے: وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ (اور چاہیے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا عدل و انصاف کے ساتھ لکھے) اور كُتَّابٌ پوری جماعت کا تقاضا کرتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: کتاب اس اعتبار سے حسین ہے کہ ہر مصیبت کے لئے ایک کاتب ہو، پس یہ جمع کے لئے کہا گیا ہے: ولم تجدوا کتابا۔ (اور تم لکھنے والے نہ پاؤ) مہدوی نے ابو العالیہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے كُتُبًا پڑھا ہے اور یہ کتاب کی جمع ہے اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً سنن ترمذی، حدیث نمبر 1134، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ روایت بالمعنی
2۔ صحیح مسلم، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 31، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب البیوع، صفحہ 1926، جلد 1، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 229　　4۔ الکشاف، جلد 1، مکتب الاعلام الاسلامی　　5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386

حیثیت سے کہ نوازل (مصائب) مختلف ہیں۔ اور رہی حضرت ابی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی قراءۃ کُتَّابًا تو نحاس اور مکی نے کہا ہے: یہ کاتب کی جمع ہے جیسے قائم وقیام ہے۔ مکی نے کہا ہے معنی یہ ہے: ''اور اگر دوات، قلم اور قرطاس موجود نہ ہوں اور لکھنے والے کے وجود کی نفی اس آلہ کے معدوم ہونے کے ساتھ ہوتی ہے جو متفق علیہ ہے اور کاتب کی نفی بھی کتاب کی نفی کا تقاضا کرتی ہے، پس دونوں قراءتیں حسین اور اچھی ہیں مگر مصحف کے خط کی جہت سے (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ** ابو عمرو اور ابن کثیر نے فَرُهُنٌ را اور ہا کے ساتھ پڑھا ہے اور ان دونوں سے ہا کی تخفیف بھی مروی ہے اور طبری نے کہا ہے: ایک قوم نے یہ تاویل کی ہے کہ رُهُن را اور ہا کے ضمہ کے ساتھ رہان کی جمع ہے۔ اور وہ جمع الجمع ہے، اسے زجاج نے فراء سے بیان کیا ہے (2) اور مہدوی نے کہا ہے: فَرِهَانٌ مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے اور معنی ہے فرهان مقبوضة یکفی من ذالك (تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس پر قبضہ دے دیا کرو اس میں یہ کافی ہو جائے گا) نحاس نے کہا ہے: عاصم بن ابی النجود نے فَرَهْنٌ ہا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور وہ اہل مکہ سے روایت کرتے ہیں اور اس میں باب رِهَانٌ ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: بغل وبغال، (خچر) کبش وکباش (مینڈھا) اور رُهُنٌ اس کا طریقہ یہ ہے کہ یہ رِهان کی جمع ہو، مثلاً کتاب اور کُتُب ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ رَهْنٌ کی جمع ہے، جیسا کہ سَقْفٌ اور سُقُفٌ، حَلْقٌ اور حُلُقٌ، فَرْشٌ اور فُرُشٌ، نَشْرٌ اور نُشُرٌ اور ان کے مشابہ دیگر الفاظ۔ اور رُهْنٌ ہا کے سکون کے ساتھ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ رَهْنٌ کی جمع ہے۔ مثلاً سَهْمٌ حَشْرٌ یعنی باریک اور تیز تر۔ اور سِهام حَشْرٌ اور پہلا زیادہ اولیٰ ہے، کیونکہ پہلا نعت (صفت) نہیں ہے اور یہ صفت ہے۔

اور ابو علی فارسی نے کہا ہے اور رَهْنٌ کی جمع مکسر جمع قلت کے وزن پر میں نہیں جانتا کہ آئی ہو۔ اور اگر آئے تو اس کا قیاس اَفْعُلٌ ہے جیسے کَلْبٌ اور اَکْلُبٌ ہے۔ گویا کہ وہ قلیل کے سبب کثیر سے مستغنی ہیں، جیسا کہ جمع کثرت کے وزن کے ساتھ جمع قلت کے وزن سے اس قول میں مستغنی ہیں: ثلاثة شُسُوع اور وہ رَسَن اور اَرْسَان میں جمع قلت کے وزن کے ساتھ جمع کثرت سے مستغنی ہیں۔ پس رَهْنٌ دونوں وزنوں پر جمع بنائی جاتی ہے اور وہ دونوں فُعُل اور فِعَال ہیں۔ اخفش نے کہا ہے: فَعْل کی جمع فُعُل کے وزن پر قبیح ہے اور یہ قلیل اور شاذ ہے۔ فرمایا: اور کبھی رِهانٌ کی جمع رُهُنٌ آئی ہے، گویا کہ رُهُنٌ کی جمع رِهَان بنائی جاتی ہے اور رِهَانٌ کی جمع رُهُنٌ بنائی جاتی ہے جیسا کہ فراش اور فُرُش ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ رَهْن کا معنی ہے کسی حق کے عوض توثیق اور اعتماد کے لئے کسی خاص چیز کو روک لینا تاکہ اس کے ثمن سے یا اس کے منافع کے ثمن سے وہ حق پورا کر لیا جائے جبکہ اسے مقروض سے لینا متعذر اور مشکل ہو، اسی طرح علماء نے اس کی تعریف بیان کی ہے اور یہ عرب کلام میں بمعنی دوام اور استمرار ہے۔ ابن سیدہ نے کہا ہے: ورهنه ای أدامه یعنی اس نے اسے ہمیشہ رکھا۔ اور یہ رهن بمعنی دام سے ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 387

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

الخُبْزُ واللَّحْمُ لهم راهِنٌ　وقَهْوَةٌ راوُوقها ساكِبُ (1)

اس میں راہن ہمیشہ رہنے والا کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

جوہری نے کہا ہے: رَهَن الشيئُ رَهْناً۔ ای دام۔ یعنی شے ہمیشہ رہی اور أرْهنتُ لهم الطعام و الشراب اور میں نے ان کے لئے طعام وشراب ہمیشہ رکھا، و هو طعام راهن اور الراهن کا معنی الثابت (یعنی ثابت رہنے والا، ہمیشہ رہنے والا) اور الراهن کا معنی ہے اونٹوں اور لوگوں میں سے کمزور ہونے والا۔

شاعر کا قول ہے:

اما ترى جِسْمِيَ خَلًّا قد رَهَن　هَزْلًا وما مَجْدُ الرجالِ فی السِّمَنْ

اس میں رہن کمزور کے معنی میں مستعمل ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: وہ رہن جو کہ وثیقہ اور اعتماد کے معنی میں ہے کہا جاتا ہے وہ الرَّهْن سے ہے۔ أرهنتُ ارهانا (میں نے شے گروی رکھی) اسے ان میں سے بعض نے بیان کیا ہے۔

اور ابوعلی نے کہا ہے: أرهنتُ فی المُغَالاة (میں نے مہنگائی میں اضافہ کر دیا) اور رہی قرض اور بیع کی صورت تو اس میں ہے فرهنتُ۔ (2) (پس میں نے قرض اور بیع کے عوض شے گروی رکھی۔)

اور ابوزید نے کہا ہے: أرهنت فی السلعة أرهانا (میں نے سامان کی قیمت خوب چڑھا دی) اور یہ مہنگائی کے معنی میں خاص ہے۔

کسی شاعر کا قول ہے:

عِيدِيَّةٌ أُرْهِنَتْ فِيها الدَّنَانِيرُ

عیدیہ میں دنانیر بڑھا دیئے گئے ہیں۔

شاعر اونٹنی کا وصف بیان کر رہا ہے اور العید مهرہ کا ایک قبیلہ ہے اور مہرہ کے اونٹ بڑے عمدہ اور اعلیٰ نسل کے ہوتے ہیں۔

اور زجاج نے کہا ہے: گروی رکھنے کے معنی میں کہا جاتا ہے: رَهَنْتُ اور أرْهنتُ (میں نے گروی رکھی)

ابن اعرابی اور اخفش نے یہی کہا ہے۔ عبد اللہ بن ہمام السلولی نے کہا ہے:

فلمّا خَشِيتُ أظَافِيرَهم　نَجَوتُ و أرْهَنْتُهُمْ مالكا (3)

اس میں أرهنتهم گروی رکھنے کے معنی میں ہے۔

ثعلب نے کہا ہے: تمام رواۃ نے أرهنتهم کہا ہے اس بنا پر کہ رَهَنْتُهٗ اور أرْهَنْتُهٗ دونوں جائز ہیں سوائے اصمعی کے کیونکہ انہوں نے اسے و أرْهَنُهُمْ روایت کیا ہے، اس بنا پر کہ انہوں نے فعل مضارع کا عطف فعل ماضی پر کیا ہے اور اسے ان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 387　3۔ ایضاً

کے اس قول کے مشابہ قرار دیا ہے: قمتُ و أصُكُّ وجهه اور یہ مذہب حسن اور اچھا ہے، کیونکہ یہ واؤ حالیہ ہے اور أصك کو پہلے فعل کے لئے حال بنایا گیا ہے اس معنی کی بنا پر قمت صاكا وجهه، یعنی میں نے اسے چھوڑا درآنحالیکہ وہ ان کے پاس مقیم تھا، کیونکہ یہ نہیں کہا جاتا: أَرْهَنْتُ الشَّيْئَ، بلکہ یہ کہا جاتا ہے: رهنته (میں نے شے گروی رکھی) اور آپ کہتے ہیں رهنت لسانی بکذا، (میں نے اپنی زبان اتنے کے عوض گروی رکھ دی) اور اس میں یہ نہیں کہا جاسکتا، أرهنت، اور ابن السکیت نے کہا ہے: اس میں ارهنت بمعنی أسلفت ہے۔ (یعنی میں نے قرض دیا) اور مرتَہن وہ ہوتا ہے جو گروی کے طور پر شے لیتا ہے اور وہ شے جو گروی رکھی جائے وہ مرهون اور رهين کہلاتی ہے اور اس کی مؤنث رهينة ہے اور راهنت فلانا على كذا مُراهنةً کا معنی ہے میں نے فلاں کو اتنے کی شرط پر خطرے میں ڈال دیا (ای خاطرتُه) اور أرهنت به ولدی ارهانا ای اخطرتهم به خطرا۔ یعنی میں نے اس کے عوض اپنی اولاد کو خطرے میں ڈال دیا۔ (یعنی شرط پر رکھ دیا) اور الرهينة الرهائن کی واحد ہے۔ یہ تمام جوہری سے منقول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: بیع اور قرض کے معاملہ میں بلا اختلاف کہا جائے گا: رهنت رهنا۔ پھر اسی صدر سے اس شے کا نام رکھ دیا گیا ہے جو دی جاتی ہے۔ تو کہتا ہے: رهنت رهنا، جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے رهنت ثوبا۔ (1)

مسئلہ نمبر 6۔ ابو علی نے کہا ہے جب رہن بمعنی ثبوت اور دوام ہے تو اسی وجہ سے فقہاء کے نزدیک رہن باطل ہو جاتی ہے جب وہ کسی وجہ سے مرتہن کے قبضے سے نکل کر راہن کے پاس چلی جائے، کیونکہ وہ اس سے نکل چکی ہے جو اختیار مرتہن کو اس کے بارے دیا گیا تھا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہمارے نزدیک اس بارے میں یہی معتمد علیہ ہے کہ رہن جب راہن کی طرف مرتہن کے اختیار سے لوٹ جائے تو رہن باطل ہو جائے گی اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے مگر انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ عاریۃً یا ودیعۃً (امانت کے طور پر) لوٹے تو پھر رہن باطل نہ ہوگی۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: اس کا راہن کے قبضہ کی طرف لوٹنا مطلق سابقہ حکم کو باطل نہیں کرتا اور ہماری دلیل **فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ** ہے۔ پس جب مرهونہ شئ قابض کے ہاتھ سے نکل جائے تو یہ الفاظ نہ لغۃً اس پر صادق آتے ہیں اور نہ ہی حکماً اس پر صادق آتے ہیں اور یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ جب کوئی قولاً گروی رکھے اور فعلاً اس پر قبضہ نہ کرے تو وہ حکماً ثابت نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ**

امام شافعی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے صرف اس رہن کا حکم ارشاد فرمایا ہے جو موصوف بالقبض ہو اور جب صفت نہ پائی جائے تو پھر ضروری ہے کہ حکم بھی نہ پایا جائے (3) اور یہ بالکل عیاں اور ظاہر ہے۔

اور مالکیہ نے کہا ہے: رہن عقد کے ساتھ لازم ہو جاتی ہے اور راہن کو رہن دینے پر مجبور کیا جائے گا تاکہ مرتہن اسے خاص کر سکے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ** (المائدہ:1) (پورا کرو (اپنے) عہدوں کو) اور یہ بھی ایک عقد ہے اور مزید

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 387، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 386 3۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 260

ارشاد ہے: اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ (الاسراء: 34) (وعدہ پورا کرو) اور یہ بھی ایک عہد ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: المؤمنون عند شروطهم (1) (مومنین اپنی شروط کے ساتھ ہوتے ہیں) اور یہ بھی ایک شرط ہے۔ پس ہمارے نزدیک قبضہ کمال فائدہ کے لئے شرط ہے اور ان دونوں ائمہ کے نزدیک قبضہ اس کے صحیح ہونے اور لازم ہونے کے لئے شرط ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: **مَّقْبُوْضَةٌ** یہ لفظ مرتھن کی رہن کے ساتھ بینونت اور علیحدگی کا تقاضا کرتا ہے اور لوگوں نے مرتھن کے قبضہ کے صحیح ہونے پر اجماع کیا ہے اور اسی طرح اس کے وکیل کے قبضہ پر (بھی اجماع ہے) اور عادل آدمی کے قبضہ کے بارے اختلاف ہے جو رہن کو اس کے ہاتھوں پر رکھے گا۔ پس امام مالک، آپ کے تمام اصحاب اور جمہور علماء نے کہا ہے: عادل کا قبضہ کرنا قبضہ ہے اور ابن ابی لیلیٰ، قتادہ، حکم اور عطا رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ قبضہ نہیں ہے اور رہن مقبوض نہیں ہوگی مگر تب جب وہ مرتھن کے پاس ہو اور انہوں نے اسے تعبداً دیکھا ہے۔ اور جمہور کا قول معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے، کیونکہ جب وہ عادل کے پاس ہو گیا تو وہ لغۃً اور حقیقۃً مقبوض ہو گیا، کیونکہ عادل آدمی صاحب حق کا نائب ہے اور وہ قائم مقام وکیل کے ہے اور یہ ظاہر ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اور اگر رہن کو عادل آدمی کے قبضہ میں رکھ دیا جائے اور وہ ضائع ہو جائے تو نہ مرتھن ضامن ہوگا اور نہ وہ جس کے قبضہ میں اسے رکھا گیا، کیونکہ مرتھن کے قبضہ میں تو کوئی شے نہیں آئی جس کا وہ ضامن ہوگا اور جس کے قبضہ میں وہ شے دی گئی ہے وہ امین ہے اور امین ضامن نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 10۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **مَّقْبُوْضَةٌ** تو ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ لفظ اپنے ظاہر اور مطلق ہونے کے ساتھ تقاضا کرتا ہے کہ مشترک شے کو رہن رکھنا جائز ہے، بخلاف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم کے (2)۔ ان کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی گھر کا تیسرا حصہ، اپنے غلام اور تلوار کا نصف حصہ بطور رہن رکھے، پھر انہوں نے کہا ہے: جب دو آدمیوں کا ایک آدمی پر مال (قرض) ہو اور وہ دونوں اس میں شریک ہوں اور وہ آدمی اس کے عوض دونوں کے پاس زمین رہن رکھ دے تو وہ جائز ہے بشرطیکہ دونوں اس پر قبضہ کر لیں۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ مشترک شے کو رہن رکھنے کی اجازت ہے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نصف گھر کا مرتھن ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: مشترک شے کو رہن رکھنا جائز ہے جیسا کہ اسے بیچنا جائز ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ ہمارے علماء کے نزدیک جو شے ذمہ میں ہو اس کو گروی رکھنا بھی جائز ہے، کیونکہ وہ بھی مقبوض ہے بخلاف ان کے جنہوں نے اس سے منع کیا ہے اور اس کی مثال یہ ہے دو آدمی مل کر کاروبار کریں ان میں سے ایک کا دوسرے کے ذمہ قرض ہو۔ پس اس نے اپنا وہی قرض اس کے پاس رہن رکھ دیا جو اس کے ذمہ واجب الادا ہو۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہر وہ سامان جس کی بیع کرنا جائز ہے اس کو رہن رکھنا بھی جائز ہے اور اسی علت کی وجہ سے ہم نے اس شے کو رہن رکھنا جائز

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاجارۃ، جلد 1، صفحہ 303، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، حدیث 3120، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 261

قرار دیا ہے جو مرتہن کے ذمہ واجب الادا ہو، کیونکہ اس کی بیع جائز ہے اور اس لئے بھی کہ وہ مال ہے اس کے ساتھ توثیق واقع ہو سکتی ہے تو پھر اس کا رہن ہونا بھی جائز ہے (تو گویا اسے) موجود سامان پر قیاس کیا گیا ہے۔

اور جنہوں نے اس سے منع کیا ہے انہوں نے کہا ہے: کیونکہ اس پر قبضہ کرنا متحقق نہیں ہوتا اور رہن کے لازم ہونے میں قبضہ کرنا شرط ہے اور اس لئے بھی کہ قرض کی میعاد مکمل ہونے کے وقت اس سے حق پورا کرنا ضروری ہوتا ہے اور حق کا استیفا اس کی مالیت سے ہوتا ہے نہ کہ اس کے عین سے اور دین میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مسئلہ نمبر 12۔ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سواری پر اس کے نفقہ کے عوض سوار ہوا جا سکتا ہے جبکہ وہ رہن رکھی ہوئی ہو اور دودھ دینے والے جانور کا دودھ اس کے نفقہ کے عوض پیا جا سکتا ہے جب مرہونہ ہو اور جو سوار ہوگا اور دودھ پئے گا اسی پر نفقہ ہوگا (1)۔'' اسے ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے اور دونوں جگہوں پر یشرب کی بجائے یحلب (2) (دودھ دوہنا) کا لفظ ذکر کیا ہے۔

خطابی نے کہا ہے: یہ کلام مبہم ہے نفس لفظ میں اس کا بیان نہیں ہے جو سوار ہوگا اور دودھ دوہے گا کیا وہ راہن ہے یا مرتہن ہے یا وہ عادل آدمی ہے جس کے قبضہ میں مرہونہ شے دی گئی؟

میں (مفسر) کہتا ہوں: دو حدیثوں میں مبین مفسر ذکر آیا ہے اور انہیں کے سبب علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''جب کوئی جانور گروی رکھا جائے تو اس کا چارہ مرتہن پر ہوگا اور وہ دودھ دوہ کر پی سکتا ہے اور اسی پر اس کا نفقہ ہوگا جو دودھ پئے گا (3)۔''

آپ نے اسے احمد بن علی حدثنا زیاد بن ایوب حدثنا هشیم حدثنا زکریا عن الشعبی عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ اور یہی احمد اور اسحاق کا قول ہے کہ مرتہن بقدر نفقہ مرہونہ جانور کا دودھ دوہ کر اور اس پر سواری کر کے اس سے نفع اٹھا سکتا ہے۔

اور ابوثور نے کہا ہے: جب راہن اس پر خرچ کرتا ہے تو پھر مرتہن اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا اور اگر راہن اس پر خرچہ نہ کرے اور اسے مرتہن کے قبضہ میں چھوڑ دے اور وہی اس پر خرچہ کرے تو اس کے لئے اس پر سوار ہونا اور غلام سے خدمت لینا جائز ہے۔ اور امام اوزاعی اور لیث نے بھی یہی کہا ہے اور دوسری حدیث بھی دار قطنی نے روایت کی ہے اور اس کی اسناد میں کلام ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔

اسماعیل بن عیاش کی حدیث میں سے ہے کہ ابن ابی ذئب نے زہری سے انہوں نے مقبری سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ''رہن ملکیت میں نہیں آئے گی اور اس کے مالک کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، جلد 1، صفحہ 341، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الرہن، جلد 1، صفحہ 2329، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 141، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الاجارہ، جلد 2، صفحہ 3059، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن دار قطنی، جلد 3، صفحہ 34، حدیث نمبر 135، وزارت تعلیم

لئے اس کے منافع ہیں اور اس پر اس کا تاوان ہے (1)''۔

اور یہی امام شافعی، شعبی اور ابن سیرین کا قول ہے اور یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رہن کے منافع راہن کے لئے ہیں اور اس کا نفقہ بھی اسی پر ہے اور مرتہن رہن سے کسی قسم کی منفعت حاصل نہیں کر سکتا سوائے وثیقہ کی حفاظت کرنے کے۔

خطابی نے کہا ہے: یہی اقوال میں سے اولی اور زیادہ صحیح ہے اس کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: ''رہن ملکیت میں نہیں آئے گا وہ اپنے اس مالک کے لئے ہوگا جس نے اسے رہن رکھا ہے۔ (اسی کے لئے اس کے منافع ہیں اور اسی پر اس کا تاوان (خرچہ) ہے)'' [خطابی نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: من صاحبہ، لصاحبہ کے معنی میں ہے۔] عرب لام کی جگہ من استعمال کرتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ ان کا قول ہے:

أمِنْ أمِّ أوْفٰی دِمْنَةٌ لم تُكَلَّمِ

میں (مفسر) کہتا ہوں: لصاحبہ صراحۃً موجود ہے لہٰذا تاویل کی ضرورت نہیں۔ اور امام طحاوی نے کہا ہے: یہ اس وقت تھا جبکہ ربا مباح تھا اور منفعت لانے والے قرض سے منع نہیں کیا گیا تھا اور نہ ایک شے کے بدلے دوسری شے لینے سے منع کیا گیا تھا اگرچہ وہ دونوں غیر متساوی ہوں، پھر اس کے بعد ربا حرام کر دیا گیا۔ اور امت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مرہونہ لونڈی کے ساتھ راہن کے لئے وطی کرنا جائز نہیں اور اسی طرح اس کا اس سے خدمت لینا بھی جائز نہیں۔ اور علامہ شعبی نے کہا ہے: وہ رہن سے کسی بھی اعتبار سے نفع حاصل نہیں کرے گا اور یہی شعبی ہیں جنہوں نے حدیث روایت کی ہے اور اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے اور ان کے نزدیک وہ جائز نہیں مگر وہ منسوخ ہو چکا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: اس پر اجماع ہے کہ مرہونہ شے کا دودھ اور اس کی پشت راہن کے لئے ہے اور وہ اس سے خالی نہیں ہوگا کہ مرتہن کا اپنے لئے دودھ دوہنا راہن کی اجازت کے ساتھ ہوگا یا اس کی اجازت کے بغیر ہوگا، پس اگر اس کی اجازت کے بغیر ہو تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: ''کوئی بھی کسی کے جانور کا دودھ نہ دوہے مگر اس کی اجازت کے ساتھ (2)'' یہ اس کا رد کرتی ہے اور اس کے نسخ کا تقاضا کرتی ہے اور اگر اجازت کے ساتھ ہو تو پھر مجہول، غرر، اس شے کی بیع جو تیرے پاس نہ ہو اور اس کی بیع جو ابھی پیدا نہیں کی گئی کی تحریم کے بارے میں مجمع علیہ اصول ہے، چنانچہ یہ بھی اسے رد کر دے گا کیونکہ ایسا ربا کے حرام ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے تھا۔ واللہ اعلم۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اگر مرتہن نے رہن سے نفع اٹھانے کی شرط لگائی تو اس کی دو حالتیں ہیں: اگر وہ قرض کے عوض ہو تو پھر جائز نہیں ہے اور اگر وہ بیع یا اجارہ کی وجہ سے ہو تو جائز ہے، کیونکہ وہ مذکور ثمن کے عوض سامان کو بیچنے والا ہو جائے گا اور

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 528

2۔ صحیح مسلم، کتاب اللقطہ، جلد 2، صفحہ 80، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب اللقطہ، حدیث نمبر 2255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رہن کے منافع مدت معلوم تک ہیں گویا کہ وہ بیع اور اجارہ ہے اور جہاں تک قرض کا تعلق ہے تو وہ ایسا قرض ہو جائے گا جو منفعت کو لایا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ قرض دینے کا مقصود تو یہ ہے کہ وہ باعث قربت ہو اور جب اس میں نفع داخل ہو جائے گا تو وہ جنس میں زیادتی ہو جائے گی اور وہی ربا ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ رہن کا ملکیت میں آنا جائز نہیں اور وہ یہ کہ مرتہن شرط لگا لے کہ مرہونہ شے اس کے حق کے عوض ہو جائے گی اگر اس نے مقررہ مدت تک وہ حق ادا نہ کیا اور یہ جاہلیت کے افعال میں سے تھا تو حضور نبی مکرم ﷺ نے اسے اپنے اس ارشاد کے ساتھ باطل کر دیا: لا یغلق الرھن (1) رہن ملکیت میں نہیں آئے گی۔ اسی طرح ہم نے اسے قاف کو رفع دینے کے ساتھ خبر پر مقید کر دیا ہے، یعنی لیس یغلقُ الرھن۔ آپ کہتے ہیں: أغلقت الباب فھو مُغْلَقٌ۔ (میں نے دروازہ بند کیا پس وہ بند ہو گیا) اور غَلَقَ الرھنُ فی ید مرتھنہ یہ تب کہا جاتا ہے جب اسے اس کے قبضہ سے چھڑایا نہ جا سکے جیسا کہ شاعر نے کہا:

أجارَتَنا مَنْ یجتمع یَتَفَرَّق　　و مَنْ یكُ رھنا للحوادث یُغْلَقِ

اور زہیر نے کہا ہے:

و فارَقَتْكَ بِرَھْن لا فكاك له　　یوم الوداع فأمسی الرَّھْنُ قد غَلِقَا (2)

مسئلہ نمبر 14۔ دارقطنی نے سفیان بن عیینہ کی حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے زیاد بن سعد سے، انہوں نے زہری سے، انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رہن ملکیت میں نہیں آئے گی اسی کے لئے اس کے منافع ہوں گے اور اسی پر اس کا تاوان (اخراجات) ہو گا (3)۔'' زیاد بن سعد ثقہ حفاظ میں سے ایک ہیں اور یہ اسناد حسن ہے۔ اور اسے مالک نے ابن شہاب سے اور انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رہن ملکیت میں نہیں آئے گی (4)''۔

ابو عمر نے کہا ہے: اسی طرح اسے روایت کیا ہے ہر اس راوی نے جس نے امام مالک سے المؤطا روایت کی ہے جہاں تک میں جانتا ہوں، مگر معن بن عیسیٰ نے اسے متصل بیان کیا ہے اور معن ثقہ راوی ہے، مگر مجھے یہ خدشہ ہے کہ اس میں علی بن عبد الحمید غضائری عن مجاھد بن موسیٰ عن معن بن عیسیٰ سے خطا ہوئی ہے۔ اور اس میں ابو عبد اللہ عمروس نے ابہری سے اپنی اسناد کے ساتھ ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے: لہ غنمہ و علیہ غرمہ (5) اور راویوں نے ان الفاظ کے رفع میں اختلاف کیا ہے۔ سو ابن ابی ذئب اور معمر وغیرہما نے انہیں مرفوع قرار دیا ہے اور اسے ابن وہب نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یونس نے کہا ابن شہاب نے بیان کیا ہے اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کہتے تھے: رہن اسی کے لئے ہے جس نے اسے رہن رکھا ہے، اسی کے لئے اس کے منافع ہیں اور اسی پر اس کا خرچہ ہے۔

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 528　　2۔ ایضاً　　3۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 33

4۔ مؤطا امام مالک، کتاب الاقضیہ، صفحہ 637　　5۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 33

اور ابن شہاب نے خبر دی ہے کہ یہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کا قول ہے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں ہے (1)، مگر معمر نے اسے ابن شہاب سے مرفوع ذکر کیا ہے اور معمر ابن شہاب سے روایت کرنے میں تمام لوگوں سے بڑھ کر مضبوط اور ثقہ ہے۔ اور اس کے مرفوع ہونے پر یحییٰ بن ابی انیسہ نے ان کی اتباع کی ہے۔ اور یحییٰ قوی راوی نہیں ہے۔ دراصل اہل علم کے نزدیک یہ حدیث مرسل منقول ہے اگرچہ کثیر جہتوں سے یہ متصل بھی ہے لیکن وہ اسے معلل قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے باوجود یہ حدیث ہے جسے ان میں سے کسی نے مرفوع بیان نہیں کیا اگرچہ اس کی تاویل اور اس کے معنی میں اختلاف ہے۔

اور اسے دارقطنی نے بھی اسماعیل بن عیاش عن ابن ابی ذئب عن الزھری عن سعید عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ کی سند سے مرفوع بیان کیا ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: اسماعیل نے ابن ابی ذئب سے اس کا سماع نہیں کیا ہے، بلکہ اس نے اسے عباد بن کثیر عن ابن ابی ذئب سے سنا ہے اور عباد ان کے نزدیک ضعیف ہے، قابل حجت نہیں ہے اور اسماعیل بھی ان کے نزدیک حدیث میں غیر مقبول ہے جب وہ اپنے شہر والوں کے علاوہ کسی اور سے حدیث بیان کرے۔ اور جب وہ شامیوں سے حدیث بیان کرے تو اس کی حدیث صحیح ہوتی ہے اور جب وہ اہل مدینہ وغیرہم سے حدیث بیان کرے تو اس کی حدیث میں بہت زیادہ خطا اور اضطراب ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ رہن کی نمو اور بڑھوتری اس کے ساتھ داخل ہوتی ہے اگر وہ ایسی ہو جسے الگ نہ کیا جا سکتا ہو جیسا کہ اس کا موٹا تازہ ہونا یا وہ نسل ہو جیسا کہ ولادت اور جنین اور وہ جو اس معنی میں ہو جیسا کہ کھجور کے پودوں کو ایک جگہ سے اکھیڑ کر دوسری جگہ لگانا اور جو ان کے سوا ہو مثلاً غلہ، پھل، دودھ اور اون وغیرہ یہ اس میں داخل نہ ہوں گے مگر یہ کہ وہ (مرتہن) اس کی شرط لگا لے۔ اور ان دونوں قسموں کے درمیان فرق یہ ہے کہ اولاد زکوٰۃ میں ماؤں کے تابع ہوتی ہے اور اون، دودھ اور درختوں کا پھل اس طرح نہیں ہیں، کیونکہ یہ زکوٰۃ میں اصل کے تابع نہیں ہیں اور نہ ہی یہ اس کی صورت میں ہیں اور نہ اس کے معنی میں اور نہ یہ اس کے ساتھ قائم رہ سکتے ہیں۔ پس ان کا اپنا حکم ہے ان کے لئے اصل کا حکم نہیں ہے بخلاف بچے اور جنین کے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسئلہ نمبر 16۔ اور اس آدمی کا رہن رکھنا جائز ہے جس کے مال کو قرض محیط ہو جب تک کہ وہ اسے مفلس قرار نہ دے اور مرتہن قرض خواہوں کی نسبت رہن کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ امام مالک اور لوگوں کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے اور امام مالک سے اس کے خلاف بھی مروی ہے...... اور عبدالعزیز بن ابی سلمہ نے یہ کہا ہے کہ قرض خواہ مرتہن کے ساتھ اس میں داخل ہوں گے اور یہ کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ وہ جس پر پابندی عائد نہ کی گئی ہو تو اس کے تصرفات بیع وشراء میں سے تمام احوال میں صحیح ہوتے ہیں اور قرض خواہوں نے اس شرط پر اس کے ساتھ معاملہ کیا ہے کہ وہ خرید و فروخت کرے اور (قرض) ادا کرے۔ اس باب میں امام مالک کا قول مختلف نہیں ہے اور رہن بھی اسی طرح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا الآیہ یہ شرط ہے اور اس کے ساتھ اس کی وصیت کو مربوط کیا

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 528

گیا ہے جس پر ادا کرنے اور ٹال مٹول ترک کرنے کا حق ہے، یعنی اگر وہ جس پر حق ہے صاحب حق کے نزدیک امین اور ثقہ ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنی امانت اسے ادا کر دے۔ اور قولہ فَلْیُؤَدِّ یہ الادا سے ماخوذ ہے اور مہموز ہے۔ (اور یہی جواب شرط ہے) اور ہمزہ کی تخفیف بھی جائز ہے۔ اور ہمزہ کو واؤ کی صورت میں نقل کیا گیا ہے اور اسے الف سے نہیں بدلا گیا اور نہ ہی بین بین بنایا گیا ہے، کیونکہ الف کا ماقبل صرف مفتوح ہو سکتا ہے اور یہ امر وجوب کے معنی میں ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ قرضوں کی ادائیگی واجب ہونے پر اجماع ہے اور اس بارے میں حاکم کے حکم کے ثبوت پر اور اس کے مقروضوں کو اس پر جبر کرنے پر اجماع ہے اور مزید قرینہ غیر کا مال حرام ہونے میں صحاح کی احادیث ہیں۔ (1)

مسئلہ نمبر 18۔ قولہ تعالیٰ: اَمَانَتَهٗ الأمانة مصدر ہے اور اس کے ساتھ اس شے کا نام رکھا گیا ہے جو کسی کے ذمہ میں ہو۔ اور اس کی اضافت اس کی طرف ہے جس پر قرض ہے۔ اس حیثیت سے اس کی اس کی طرف ایک نسبت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ (النساء: 5) (اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال۔)

مسئلہ نمبر 19۔ قولہ تعالیٰ: وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ اور اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اس بارے میں کہ وہ حق میں سے کوئی شے نہ چھپائے۔ اور قولہ: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ یہ قول باری تعالیٰ: ولا یضار، عین کلمہ کے کسرہ کے ساتھ کی تفسیر ہے اور شاہد کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ وہ شہادت چھپانے کے ساتھ ضرر پہنچائے اور یہ نہی متعدد قرائن کے ساتھ وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ اور ان میں سے ایک وعید ہے اور نہی کا محل وہاں ہے جہاں شاہد کو حق کے ضائع ہونے کا خوف ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: شاہد پر شہادت دینا لازم ہے جہاں اسے شہادت دینے کے لئے کہا جائے اور وہاں وہ خبر دے جہاں اس سے خبر کا مطالبہ کیا جائے، فرمایا: اور تو یہ نہ کہہ أخبربها عند الامیر (میں اس کے بارے امیر کے پاس خبر دوں گا) بلکہ (یہ کہہ) اخبرہ بها (میں اسے اس کے بارے خبر دوں گا) شاید وہ رجوع کر لے اور واپس لوٹ آئے۔)

ابو عبدالرحمٰن نے ولا یکتموا یا کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے نہی للغائب بنایا ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ جب حق پر گواہ موجود ہوں تو ان پر اس کی ادائیگی کفایۃً متعین ہے پس اگر دو اسے ادا کر دیں اور حاکم انہیں دو پر اکتفا کر لے تو باقیوں سے فرض ساقط ہو جائے گا اور اگر وہ اس کے ساتھ اکتفا نہ کرے تو اسے جاری رکھنا متعین ہے، یہاں تک کہ اثبات واقع ہو جائے۔ اور یہ صاحب حق کی دعوت کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے پس جب وہ اس کو کہے: تو میرا حق زندہ (ثابت) کر دے اس شہادت کو ادا کر کے جو میرے لئے تیرے پاس ہے تو وہ اس پر متعین ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 21۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ اس میں دل کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ چھپانا اس کے افعال میں سے ہے اور کیونکہ وہ ایک ایسا گوشت کا ٹکڑا ہے جس کی اصلاح سے سارے کا سارا بدن اصلاح پا لیتا ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے (2)۔ پس یہاں کل بدن کو بعض کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ (اور یہ اول سورۃ) میں گزر چکا ہے۔ اور الکیا نے کہا ہے: جب اس نے اس کا قصد کیا کہ وہ اسے ادا نہیں کرے گا اور شہادت کی ادائیگی زبان سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6891، ضیاء القرآن پبلی کیشنز	2۔ صحیح بخاری، کتاب ایمان، جلد 1، صفحہ 13، وزارت تعلیم

ترک کر دی تو گناہ اکٹھا دونوں وجہوں کی طرف راجع ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اٰثِمٌ قَلْبُهٗ یہ مجاز ہے اور یہ حقیقۃً وعید پر دلالت کو پختہ کرنے والا ہے اور یہ معانی کے اعتبار سے بیان کی عمدگی اور اعراب کی لطافت میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: دل کا گناہ اسے مسخ کرنے کا سبب ہے اور اللہ تعالیٰ جب دل کو مسخ کر دیتا ہے تو وہ اسے منافق بنا دیتا ہے اور اس پر مہر لگا دیتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔

(اور اس کا بیان سورت کی ابتدا میں آ چکا ہے) اور قَلْبُهٗ، اٰثِمٌ کی وجہ سے مرفوع ہے اور اٰثِمٌ، اِنَّ کی خبر ہے اور اگر چاہے تو آثم کو مبتدا ہونے کے سبب رفع دے لے اور قَلْبُهٗ فاعل سَدَّ مسد الخبر بن جائے گا اور پھر جملہ اِنَّ کی خبر ہوگا۔ اور اگر چاہے تو آثم کو رفع دے اس بنا پر کہ یہ مبتدا موخر کی خبر ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قَلْبُهٗ، اٰثِمٌ سے بدل بعض من الکل ہو۔ اور اگر چاہے تو اسے آثم کی ضمیر سے بدل بنا لے۔

چوبیس مسائل کی تکمیل اور تتمہ کے طور پر میں نے یہاں تین مسائل بیان کئے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے شہادت اور کتابت کا جو حکم فرمایا ہے یہ دونوں فریقوں کی اصلاح اور منافع کے لئے ہے اور ایسے فساد اور تنازع کی نفی کے لئے ہے جو دونوں کو باہمی فساد اور خرابی تک پہنچانے والا ہے، تاکہ شیطان اسے حق کا انکار کرنے اور شریعت نے اس کے لئے جو حد مقرر کی ہے اس سے تجاوز کرنے یا مقدار مستحق پر اقتصار کو ترک کرنے پر نہ اکسائے اور اسی وجہ سے شریعت نے ان مجہول چیزوں کی بیع کرنے کو حرام قرار دیا ہے جن میں عادت اور رواج یہ ہو کہ وہ فریقین کو فساد اور اختلاف تک پہنچا دیتی ہوں اور وہ باہمی کینہ اور ایک دوسرے سے جدائی واقع کرنے والی ہوں۔ اور انہی میں سے وہ چیزیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ حرام قرار دیا ہے جوا اور شراب نوشی وغیرہ: اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ الآیہ (المائدہ: 91) (یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعہ)

پس جس نے اللہ تعالیٰ کے اوامر و زواجر کے بارے میں اس کے ادب سکھانے کے ساتھ ادب سیکھ لیا اس نے دین اور دنیا کے منافع جمع کر لئے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ الآیہ۔ (النساء: 66) (اور اگر وہ کرتے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔)

مسئلہ نمبر 2۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے لوگوں کے اموال اس ارادہ سے لئے کہ وہ انہیں ادا کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا کر دے گا (یعنی ادائیگی کے اسباب مہیا فرما دے گا) اور جس نے انہیں ضائع کرنے کے ارادہ سے لئے تو اللہ تعالیٰ اسے ضائع کر دے گا (1)۔'' اور نسائی نے حضرت میمونہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے قرض لیا، تو انہیں کہا گیا: اے ام المومنین! آپ قرض لے رہی ہیں اور آپ کے پاس اسے ادا کرنے کے وسائل نہیں ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: میں نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، جلد 1، صفحہ 321۔ ایضاً، حدیث نمبر 2212، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ''جس نے قرض لیا اور وہ اسے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کی معاونت فرمائے گا (1)۔'' اور طحاوی، ابو جعفر طبری اور حارث بن ابی اسامہ نے اپنی مسند میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نفسوں کو ان کے امن کے بعد خوفزدہ نہ کرو۔'' صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ وہ کیا ہے؟ فرمایا: ''وہ قرض ہے (2)'' اور بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے دعا میں اس طرح ذکر کیا: اللھم انی اعوذ بك من الھم والحزن والعجز والکسل والجبن والبخل وضلع الدین وغلبة الرجال (3) (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں غم اور حزن سے، عجز اور سستی، غفلت سے، بزدلی اور بخل سے، قرضے کے بوجھ اور لوگوں کے غلبے سے۔) علماء نے کہا ہے: ضَلَعَ الدَّیْن سے مراد یہ ہے کہ مقروض ایسے وسائل نہ پائے کہ وہ قرض ادا کر سکے۔ اور یہ عربوں کے اس قول سے بنایا گیا ہے: حِمل مُضلِع یعنی بہت بھاری اور ثقیل بوجھ اور دابة مُضلِع یعنی ایسا جانور جو بوجھ اٹھانے کی قوت نہ رکھتا ہو۔ صاحب العین نے یہی کہا ہے۔

اور آپ ﷺ نے فرمایا: الدَّینُ شین الدِّین (4) (قرض دین کے لئے عیب ہے۔) اور آپ سے ہی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: الدَّینُ ھَمٌّ باللیل و مَذَلَّةٌ بِالنَّھَارِ (5) (قرض رات کا غم ہے اور دن کی ذلت ہے۔) ہمارے علماء نے کہا ہے بلاشبہ یہ عیب اور ذلت ہے کیونکہ اس میں دل و دماغ مشغول رہتے ہیں اور ادائیگی کا غم اور فکر لازم رہتا ہے۔ اور مقروض کے لئے ملاقات کے وقت ذلت اور پستی کا سامنا ہوتا ہے اور اسے اپنے وقت تک مؤخر کر کے اس کا احسان برداشت کرنا ہے۔ اور بسا اوقات وہ اپنی طرف سے اسے پورا کرنے کا وعدہ کرتا ہے اور پھر اس کے خلاف کرتا ہے یا مقروض اس کے سبب سے گفتگو کرتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے یا وہ اس کے لئے قسم کھاتا ہے اور اسے توڑ دیتا ہے۔ وغیر ذالك۔ اسی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام گناہ اور قرض سے پناہ مانگتے تھے۔

اور المغرم سے مراد قرض ہے۔ آپ ﷺ سے عرض کی گئی: یا رسول اللہ! ﷺ کیونکر آپ قرض سے اس قدر پناہ مانگتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک آدمی جب قرض ادا کرتا ہے تو وہ گفتگو کرتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے اور وہ وعدہ کرتا ہے اور اس کا خلاف کرتا ہے (6)۔'' اور یہ بھی کہ بسا اوقات وہ مر جاتا ہے اور وہ قرض ادا نہیں کر چکا ہوتا۔ پس وہ اس کے عوض گروی ہو جاتا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ مومن کی روح اپنی قبر میں اس کے قرض کے عوض گروی ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کی طرف سے اسے ادا کر دیا جائے (7)۔'' اور یہ تمام کے تمام اسباب دین میں عیب ہی ہیں۔ ان سے دین کا حسن و جمال ضائع ہو جاتا ہے اور اس کا کمال کم ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

1۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 232 2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 146
3۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 942۔ ایضاً، حدیث نمبر 5005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 231 5۔ ایضاً 6۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، جلد 1، صفحہ 322
7۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 176، ایضاً، حدیث 2403، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 3۔ جب اللہ تعالیٰ نے لکھنے، گواہ بنانے اور کوئی شے بطور گروی لینے کا حکم ارشاد فرمایا تو یہ اموال کی حفاظت اور انہیں بڑھانے کا لحاظ رکھنے پر نص قطعی ہے۔ اور یہ جاہل متصوفہ اور ان کی رعایت کرنے والے وہ لوگ جو اس کا لحاظ نہیں رکھتے ان کا رد ہے کہ وہ اپنے تمام اموال سے فارغ ہو جاتے ہیں (یعنی وہ غربا و مساکین وغیرہ کو دے دیتے ہیں) اور وہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کی کفایت اور حاجت کے لئے بھی کچھ نہیں چھوڑتے، پھر جب وہ محتاج ہوتے ہیں اور ان کے گھر والے فقیر ہوتے ہیں تو پھر یا تو وہ بھائیوں کے احسانات یا ان کے صدقات کا طالب ہوتا ہے یا پھر وہ دنیاداروں اور ان میں سے ظلم کرنے والوں سے کچھ لیتا ہے اور یہ فعل مذموم اور ممنوع ہے۔

ابوالفرج جوزی نے کہا ہے: مجھے ان زہد و ورع اختیار کرنے والوں سے زیادہ تعجب نہیں جنہوں نے اپنی کم علمی کے سبب ایسا کیا، بلکہ زیادہ تعجب ان اقوام کے بارے ہے جو صاحب علم و عقل ہیں انہوں نے اس پر کیسے برانگیختہ کیا۔ اور انہوں نے اس کے بارے حکم دیا باوجود اس کے کہ شرع اور عقل اس کے خلاف ہیں۔ پس محاسبی نے اس بارے میں بہت زیادہ کلام کیا ہے اور ابو حامد طوسی نے اسے پختہ اور مضبوط کیا ہے اور ان کی مدد کی ہے اور میرے نزدیک حارث ابو حامد کی نسبت زیادہ معذور ہے، کیونکہ ابو حامد زیادہ فقیہ ہے مگر ان کے تصوف میں داخل ہونے نے ان پر ان کی مدد و نصرت لازم کر دی جو اس میں پہلے داخل ہو چکے ہیں۔

محاسبی نے اپنے طویل کلام میں کہا ہے: تحقیق مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے کہا: بلاشبہ ہم عبدالرحمٰن پر اس مال کے بارے میں خوف کھا رہے ہیں جو انہوں نے چھوڑا، تو حضرت کعب نے فرمایا: سبحان اللہ! کیا تم عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ پر خوف کھا رہے ہو؟ انہوں نے پاکیزہ مال کمایا، پاکیزہ اور طیب مال خرچ کیا اور حلال و طیب مال چھوڑا۔ پس یہ خبر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، تو وہ حضرت کعب کو تلاش کرنے کے ارادہ سے غصے کی حالت میں نکلے اور اونٹ کے جبڑے کی ہڈی کے پاس سے گزرے تو اسے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا اور پھر حضرت کعب کی تلاش میں نکل پڑے، تو حضرت کعب کو بتایا گیا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ آپ کو تلاش کر رہے ہیں تو وہ بھاگتے ہوئے نکل گئے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے ان سے مدد لینے لگے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ پس حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضرت کعب کی تلاش میں نشانات کی اتباع کرتے ہوئے آئے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دار پر آ کر رک گئے، جب اندر داخل ہوئے تو حضرت کعب اٹھے اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھاگتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے، تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: اے یہودیہ کے بیٹے! تو یہ گمان رکھتا ہے کہ جو کچھ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے چھوڑا ہے اس کے بارے کوئی حرج نہیں ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن باہر تشریف لائے اور فرمایا: ''کثیر مال و دولت والے ہی قیامت کے دن قلیل مال و دولت والے ہوں گے سوائے ان کے جنہوں نے اس اس طرح خرچ کیا(1) (یعنی نیکی اور صدقہ میں وافر مال خرچ کیا)۔ محاسبی نے کہا ہے: پس یہ عبدالرحمٰن اپنی فضیلت کے باوجود قیامت کے دن

1۔ مسند احمد حنبل، جلد 5، صفحہ 152۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الاستقراض و اداء الدیون والحجر والتفلیس، حدیث نمبر 2213

میدان حشر میں روک لئے جائیں گے اس حلال مال کے سبب جو انہوں نے پاکدامنی اور نیکی کرنے کے لئے کمایا اور انہیں فقراء کے ساتھ جنت کی طرف دوڑ کر جانے سے روک دیا جائے گا اور وہ ان کے نشانات پر گھسٹنے لگیں گے، علاوہ ازیں بھی انہوں نے کلام کیا ہے (☆)۔

ابو حامد نے اس کا ذکر کیا ہے اور حدیث ثعلبہ کے ساتھ اسے پختہ اور قوی کیا ہے۔ وہ یہ کہ اسے مال عطا کیا گیا تو اس نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ ابو حامد نے کہا ہے: جس نے انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات اور اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے احوال اور ان کے اقوال میں گہری غور و فکر کی ہے تو اسے اس میں کوئی شک نہیں کہ مال کا نہ ہونا اس کے وجود سے افضل ہے۔ اگرچہ وہ صدقہ و خیرات میں خرچ ہو، کیونکہ وہ کم سے کم شے جو اس میں حاصل ہوتی ہے وہ مال کی اصلاح کے لئے ہمت و کوشش ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مشغول رکھتی ہے۔ پس مرید کو چاہئے کہ وہ اپنا مال نکال دے یہاں تک کہ بقدر ضرورت کے سوا کچھ بھی اس کے پاس باقی نہ رہے۔ پس جو ایک درہم بھی اس کے پاس باقی ہوگا اس کا دل اس کی طرف متوجہ ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے حجاب اور پردہ بن جائے گا۔

علامہ جوزی نے کہا ہے: یہ سب کا سب خلاف شرع اور خلاف عقل ہے اور کوتاہ فہمی ہے اس میں جو مال سے مراد لیا گیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے شرف عطا فرمایا ہے، اس کی قدر و مرتبہ کو عظمت عطا فرمائی ہے اور اس کی حفاظت کا حکم ارشاد فرمایا ہے، کیونکہ اسے آدمی کے لئے باعث قوت و طاقت بنایا گیا ہے اور وہ شے جو شریف آدمی کے لئے باعث قوت و طاقت بنائی گئی ہے تو وہ یقیناً شریف ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا (النساء: 5) اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال جنہیں بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہاری (زندگی کے لئے) سہارا۔) اور اللہ تعالیٰ نے مال احمق اور بے وقوف انسان کے حوالے کرنے سے منع فرمایا ہے اور فرمایا: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (النساء: 6) (پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لوٹا دو انہیں ان کے مال)

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو فرمایا: بے شک تیرا اپنے ورثاء کو غنی اور دولتمند چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تو انہیں اس حالت میں چھوڑے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں (1)"۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما نفعنی مال کمال ابی بکر (2) (مجھے کسی مال نے اتنا نفع نہیں دیا جتنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مال نے دیا) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "صالح آدمی کے لئے صالح اور پاکیزہ مال نعمت ہے (3)"۔ اور آپ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لئے دعا فرمائی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے آخر میں یہ تھا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 943

2۔ سنن ابن ماجہ، مقدمہ، جلد 1، صفحہ 10۔ ترمذی شریف، حدیث 3594، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 197

☆ یہ محاسبی کی رائے ہو سکتی ہے ورنہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

اللھم اکثر مالہ و ولدہ و بارک لہ فیہ (1) (اے اللہ! اس کے مال و اولاد میں کثرت فرما اور اس کے لئے اس میں برکت عطا فرما۔) اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، بلاشبہ میری توبہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنا سارا مال صدقہ کر دوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے لئے کچھ مال روک لے یہ تیرے لئے بہتر ہے (2)''۔

علامہ جوزی نے کہا: یہ احادیث کتب صحاح میں نقل کی گئی ہیں اور یہ اس عقیدہ اور نظریہ کے خلاف ہیں جو متصوفہ رکھتے ہیں کہ مال کی کثرت حجاب اور سزا ہے اور یہ کہ اسے محفوظ رکھنا توکل کے منافی ہے اور کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے فتنہ اور آزمائش سے ڈرا جاتا ہے اور بلاشبہ خلق کثیر نے اس کے خوف کی وجہ سے اس سے اجتناب کیا ہے۔ اور یہ کہ اسے جمع کرنا من وجہ کمزور کر دیتا ہے اور یہ کہ دل بہت کم فتنوں سے سلامت اور محفوظ رہتا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے دل کا ذکر آخرت میں مشغول ہونا نایاب ہو جاتا ہے سو اسی وجہ سے اس کے فتنہ سے ڈرایا گیا ہے۔

اور جہاں تک مال کمانے کا تعلق ہے تو اگر کوئی صرف گزر اوقات کے لئے حلال کمانے پر اکتفا کر لے تو یہ ایک ایسا امر ہے جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور رہا وہ جس نے مال جمع کرنے اور حلال مال کثرت سے طلب کرنے کا قصد کیا تو اس کے مقصود اور مدعیٰ میں دیکھا جائے گا۔ پس اگر اس نے فخر و مباہات کا قصد کیا تو یہ مقصود بہت برا ہے اور اگر اس نے اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کی پاکدامنی کا قصد کیا اور اس نے حوادثات زمانہ کے لئے مال ذخیرہ کیا اور اس نے بھائیوں کی خوشحالی، فقراء کو غنی بنانے اور نیکی کے کام کرنے کا قصد کیا تو اسے اس ارادہ پر ثواب و اجر عطا کیا جائے گا اور اس نیت کے ساتھ مال جمع کرنا کثیر طاعات و ریاضات سے افضل ہے اور صحابہ کرام میں سے کثیر مخلوق کی نیتیں مال جمع کرنے میں سلیم اور حسین تھیں کیونکہ مال جمع کرنے سے ان کے مقاصد حسین تھے، پس وہ اس کے حریص ہوئے اور انہوں نے اس میں زیادتی اور کثرت کی دعائیں کیں۔ اور جب ایک مضبوط آدمی کو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیز رفتار گھڑ دوڑ میں پیچھے چھوڑ دیا۔ اس نے گھوڑا دوڑایا یہاں تک کہ وہ کھڑا ہو گیا پھر اس نے اپنا کوڑا اچھینک دیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اسے اتنی (جگہ) دے دو جہاں اس کا کوڑا پہنچا ہے (3)''۔

اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے وسعت و خوشحالی عطا فرما، اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: وَ نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ (یوسف: 65) (اور ہم زیادہ لیں گے ایک اونٹ کا بوجھ) اور حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا: فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ (القصص: 27) (پھر اگر تم پورے کر دو دس سال تو یہ تمہاری اپنی مرضی) اور حضرت ایوب علیہ السلام کو جب صحت عطا فرما دی گئی تو ان پر سونے کی مکڑیوں کا بہت بڑا گلہ اڑایا گیا تو آپ پکڑ کر اپنے کپڑے میں ڈالنے لگے اور ان میں کثرت و زیادتی کی طلب کرنے لگے تو آپ کو کہا گیا: کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 298۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 5868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، جلد 2، صفحہ 362۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۃ البراءۃ، حدیث نمبر 4308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 156۔ ابی داؤد، باب فی اقطاع الارضین، حدیث نمبر 2670، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آپ سیر نہیں ہوئے ہیں؟ تو آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! کیا فقیر بھی تیرے فضل سے سیر ہو سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا امر ہے جس کا انحصار طبائع اور مزاجوں پر ہے۔

اور جہاں تک محاسبی کے کلام کا تعلق ہے تو وہ غلط ہے وہ علم سے نابلد ہونے پر دلالت کرتا ہے اور انہوں نے حضرت کعب اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث ذکر کی ہے وہ محال ہے۔ وہ جہال کی وضع کردہ ہے۔ اور متصوفہ کے ساتھ ان کے ملنے کی وجہ سے حدیث کی عدم صحت ان پر مخفی رہی ہے اور بعض نے اس کے بارے روایت کیا ہے کہ اگرچہ اس کی سند ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے اور وہ مطعون راوی ہے۔

یحیٰی نے کہا ہے اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا اور تاریخ میں صحیح یہ ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا وصال ۲۵ھ میں ہوا۔ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا وصال ۳۲ھ میں ہوا۔ تحقیق وہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد بھی سات برس تک زندہ رہے۔ پھر وہ لفظ جو انہوں نے اپنی حدیث میں ذکر کئے ہیں وہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کی حدیث موضوع ہے، پھر صحابہ کرام یہ کیسے کہہ سکتے ہیں: ہم عبدالرحمٰن پر خوف کھا رہے ہیں! کیا حلال مال جمع کرنے کی اباحت پر اجماع منعقد نہیں ہوا ہے پھر اباحت کے ساتھ خوف کی کیا وجہ ہے؟ کیا شریعت ایک شے کے بارے میں اجازت دیتی ہے پھر اسی پر سزا دیتی ہے؟ یہ فہم وادراک کی قلت کی وجہ سے ہے، پھر کیا حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پر اعتراض کر سکتے ہیں، حالانکہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ایسی چیزوں کے سبب بہتر اور افضل ہیں جن کے سبب وہ ایک دوسرے کے قریب بھی نہیں ہو سکتے؟ پھر ان کا اکیلے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعلق ہونا اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے سیرت صحابہ کو آزمایا اور اس کا تجربہ کیا ہی نہیں، کیونکہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے تین سو بہار چھوڑے تھے اور ہر بہار میں تین قنطار تھے! اور البہار کا معنی بوجھ ہے۔

اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا مال دو لاکھ پچاس ہزار تھا اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نوے ہزار ترکے میں چھوڑے۔ اور اکثر صحابہ کرام نے مال کمایا اور اسے پیچھے چھوڑا اور ان میں سے کسی نے بھی کسی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور رہا یہ قول: ان عبدالرحمٰن یحبو حَبْوًا یوم القیامۃ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے حدیث کو پہچانا اور سمجھا ہی نہیں۔ اور میں تو اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ عبدالرحمٰن قیامت کے دن گھسٹ کر چلیں، کیا آپ انہیں جانتے نہیں ہیں جو (اسلام قبول کرنے میں) سبقت لے جانے والے ہیں اور آپ ان دس صحابہ کرام میں سے ایک ہیں جن کے لئے جنت کی بشارت دی گئی ہے اور آپ اہل بدر میں سے ہیں اور مجلس شوریٰ کے ممبر ہیں تو کیا آپ گھسٹ کر چلیں گے؟ پھر حدیث عمارہ ابن زاذان روایت کرتے ہیں اور امام بخاری نے کہا ہے: بسا اوقات ان کی حدیث مضطرب ہوتی ہے۔ اور امام احمد نے کہا ہے: یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منکر احادیث روایت کرتا ہے اور ابو حاتم رازی نے کہا ہے: یہ قابل حجت نہیں ہے اور دار قطنی نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے۔ اور آپ کا یہ قول: ترك المال الحلال افضل من جمعه (مال حلال کو چھوڑ دینا اسے جمع کرنے سے افضل ہے) اس طرح نہیں ہے اور جب نیت وقصد صحیح ہو تو بلا اختلاف علماء کے نزدیک اسے جمع کرنا افضل ہے۔ اور حضرت سعید بن مسیب

رضی اللہ عنہ کہتے تھے: اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے جو مال طلب نہیں کرتا وہ اس کے ساتھ اپنا قرض ادا کر سکتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی عزت محفوظ ہو سکتی ہے اور اگر وہ مر جائے تو وہ اسے اپنے بعد والوں کے لئے بطور میراث چھوڑ دے اور حضرت ابن مسیب رضی اللہ عنہ نے چار سو دینار پیچھے چھوڑے اور حضرت سفیان ثوری نے دو سو دینار پیچھے چھوڑے اور وہ کہتے تھے: المال فی ھذا الزمان سلاح اس زمانے میں مال ہتھیار ہے اور اسلاف ہمیشہ مال کی تعریف کرتے رہے اور حوادثات زمانہ اور فقراء کی امداد کے لئے اسے جمع کرتے رہے، البتہ ان میں سے ایک گروہ نے عبادات میں مشغول ہونے اور یکسوئی کو ترجیح دیتے ہوئے مال سے پرہیز کی ہے۔ پس انہوں نے تھوڑے مال پر ہی قناعت کی۔ پس اگر قائل یہ کہے: بے شک مال کو کم کرنا قرب امر کے لئے اولیٰ ہے لیکن وہ مرتبہ اثم کو اس کے ساتھ تنگ کرنے والا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اموال کی حفاظت اور ان کا لحاظ رکھنے پر جو روایات دلالت کرتی ہیں ان میں سے گھٹیا مال اور اعلیٰ مال کے لئے قتال کو مباح قرار دینا بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من قتل دون مالہ فھو شھید (1) (جو اپنے حقیر اور گھٹیا مال (کی حفاظت) میں قتل کر دیا گیا تو وہ شہید ہے) اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

''اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا تم اسے چھپائے رہو حساب لے گا تم سے اس کا اللہ تعالیٰ پھر بخش دے گا جسے چاہے گا اور عذاب دے گا جسے چاہے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

قولہ تعالیٰ: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ لوگوں کا اس ارشاد باری تعالیٰ کے معنی میں اختلاف ہے اور اس بارے میں چار اقوال ہیں۔

(ا) کہ یہ ارشاد منسوخ ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم، حضرت شعبی، حضرت عطا، حضرت محمد بن سیرین، حضرت محمد بن کعب، حضرت موسیٰ بن عبیدہ رحمۃ اللہ علیہم اور صحابہ کرام اور تابعین میں سے ایک جماعت نے یہی کہا ہے۔ اور یہ کہ یہ تکلیف اور پابندی ایک سال تک باقی رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ کشادگی اور وسعت نازل فرمائی: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (و یہ حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عطا، حضرت محمد بن سیرین اور حضرت محمد بن کعب رضی اللہ عنہم وغیرہم کا قول ہے)۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فرمایا: ان میں سے کوئی شے ان کے دلوں میں داخل ہو (یا) شے میں سے کوئی ان کے دلوں میں داخل نہ ہو، تو حضور نبی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدیات، جلد 1، صفحہ 170۔ صحیح بخاری، باب من قاتل دون مالہ، حدیث نمبر 2300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کریم ﷺ نے فرمایا: ''تم کہو ہم نے سنا، ہم نے اطاعت کی اور ہم نے تسلیم کر لیا۔ فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان ڈال دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا (فرمایا: ''میں نے کر دیا'') رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا (فرمایا: ''میں نے کر دیا'') رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ؀ (فرمایا: ''میں نے کر دیا'')(1) اور ایک روایت میں ہے۔ پس جب انہوں نے ایسا کہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

(۲) حضرت ابن عباس، حضرت عکرمہ، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رحمہم اللہ نے فرمایا: یہ آیت محکم مخصوص ہے اور یہ اس شہادت کے معنی میں ہے جسے چھپانے سے منع کیا گیا ہے، پھر اس آیت میں بتایا کہ شہادت کو چھپانے والا اسے چھپانے والا ہے جو اس کے دل میں ہے اس کا محاسبہ کیا جائے گا۔

(۳) یہ آیت اس شک و یقین کے بارے ہے جو نفوس پر طاری ہوتے ہیں، حضرت مجاہد نے بھی یہی کہا ہے۔(2)

(۴) یہ آیت محکم ہے اور عام ہے منسوخ نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا ان اعمال پر بھی حساب لے گا جو انہوں نے کئے اور ان پر بھی جو انہوں نے کئے تو نہیں مگر ان کے دلوں میں ثابت اور پختہ ہو گئے اور انہوں نے انہیں مخفی رکھا اور ان کی نیت اور ارادہ کر لیا۔ پس اللہ تعالیٰ مومنوں کی مغفرت فرما دے گا اور اس کے ساتھ اہل کفر و نفاق کو پکڑ لے گا (3)، علامہ طبری نے ایک قوم سے اسے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے (اس میں) وہ داخل کیا ہے جو اس سے مشابہ ہے۔

علی بن ابی طلحہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی، لیکن جب اللہ تعالیٰ مخلوق کو جمع فرمائے گا تو ارشاد فرمائے گا: ''میں تمہیں اس کے بارے بتاتا ہوں جو تم اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہو۔'' پس مومن کو اللہ تعالیٰ اس کے بارے بتائے گا اور پھر ان کی مغفرت فرما دے گا۔ اور رہے شک کرنے والے تو اللہ تعالیٰ اس کے بارے انہیں بتائے گا جس تکذیب وغیرہ کو انہوں نے چھپائے رکھا تھا، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (البقرہ: 225) یعنی شک اور نفاق میں سے جو تمہارے دلوں نے کمایا اس پر تمہارا مواخذہ کیا جائے گا (4)۔

اور حضرت ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اس کے بارے آگاہ فرمائے گا جسے وہ چھپاتا تھا تا کہ وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شے مخفی نہیں۔ اور حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا یہ وہ دن ہے جس میں مخفی رازوں کو ظاہر کر دیا جائے گا اور چھپی ہوئی باتیں باہر نکل آئیں گی۔ میرے لکھنے والے فرشتوں نے نہیں لکھے مگر تمہارے وہی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 389، دار الکتب العلمیہ
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 173
4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 174

اعمال جو ظاہر ہوئے اور میں ان پر بھی مطلع ہوں جن پر وہ مطلع نہیں ہوئے، نہ انہوں نے ان کی خبر دی اور نہ ہی انہیں لکھا۔ پس میں ان کے بارے تمہیں خبر دوں گا اور ان پر تمہارا محاسبہ بھی کروں گا اور پھر جسے میں چاہوں گا اسے بخش دوں گا اور جسے چاہوں گا اسے عذاب دوں گا (1)۔ ''پس وہ مومنوں کو بخش دے گا اور کافروں کو عذاب دے گا'' اس باب میں یہ اصح روایت ہے۔ اور اسی پر حدیث نجویٰ بھی دلالت کرتی ہے جس کا بیان آگے آ رہا ہے۔ (نہیں کہا جائے گا) تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے'' بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کی ان چیزوں کو معاف فرما دیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوں گی جب تک کہ وہ ان کے ساتھ کلام نہ کریں یا ان کے مطابق عمل نہ کریں (2)۔'' چنانچہ ہم کہتے ہیں: یہ ارشاد احکام دنیا پر محمول ہے۔ مثلاً طلاق، عتاق اور وہ بیع جس کا حکم ثابت نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ کلام نہ ہو اور جو آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ بندے کا اس پر مواخذہ ہوگا وہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان آخرت میں ہوگا۔

حسن نے کہا ہے: یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے (3)۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اور دوسروں نے اس معنی کی طرح بیان کیا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مذکور ہے، مگر انہوں نے یہ کہا ہے: بے شک وہ عذاب جو اس کی جزا ہوتا ہے جو دلوں میں کھٹکے اور اس کے بارے فقط غور و فکر ہو وہ دینوی مصائب و آلام اور دنیا کی تمام تکالیف کے ساتھ ہے پھر اسی معنی کی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا گیا ہے۔ اور یہی (پانچواں قول ہے) اور علامہ طبری نے اس کو ترجیح دی ہے کہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہی درست ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ اس کا معنی ہے ان چیزوں میں سے جو تمہاری وسعت اور تمہارے کسب کے تحت ہیں۔ اور یہ ان چیزوں کے ساتھ ہیں جن کا اعتقاد رکھا جاتا ہے اور جن کے بارے فکر کی جاتی ہے۔ پس جب لفظ ایسے ہیں جن میں دلوں میں کھٹکنے والی چیزیں داخل ہو سکتی ہیں تو صحابہ کرام اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوفزدہ ہو گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے دوسری آیت کے ساتھ اس کی وضاحت فرمائی جس کا اس نے ارادہ کیا اور اسے خاص کر دیا اور اس کے حکم پر نص بیان فرما دی کہ وہ کسی نفس کو مکلف نہیں بنائے گا مگر (اس کا) جو اس کی وسعت میں ہوگا۔ اور دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات ایسے نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا دفاع وسعت میں ہے، بلکہ وہ امر غالب ہے اور وہ ان امور میں سے نہیں ہے جو کمائے جاتے ہیں۔ پس اس بیان اور وضاحت سے مقصود ان کے لئے کشادگی پیدا کرنا اور ان کی پریشانی کا ازالہ کرنا ہے۔ اور باقی آیت محکم ہے اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور جس سے نسخ کا حکم دور کیا جا سکتا ہے اس میں سے یہ بھی ہے کہ یہ آیت خبر کے انداز میں ہے اور اخبار میں نسخ داخل نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی نسخ کا قول کرے تو وہ اس حکم پر مترتب ہوتا ہے جو صحابہ کرام کو اس وقت لاحق ہوا جب وہ اس آیت سے گھبرائے اور اس کی دلیل ان کے لئے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: قولوا سمعنا و اطعنا اس سے یہ حکم ثابت ہو رہا ہے کہ وہ اس ارشاد پر ثابت

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 174　2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 389، دار الکتب العلمیہ

قدم ہو جائیں اور اسے لازم پکڑ لیں اور بخشش وغفران کے بارے اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کا انتظار کریں۔ پس جب یہ حکم پختہ کر دیا گیا تو پھر اس میں نسخ کا واقعہ ہونا صحیح ہے۔ اور اس وقت آیت اس قول باری تعالیٰ کے مشابہ ہوگی: اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ (الانفال:65) پس یہ الفاظ بھی الفاظ خبر ہی ہیں لیکن اس کا معنی ہے: التزموا ھذا و اثبتوا علیه و اصبروا بحسبه، تم اسے لازم پکڑ لو اور اس پر ثابت قدم ہو جاؤ اور اس کے مطابق صبر کرو۔ پھر اس کے بعد اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اور اس بارے میں جو میں جانتا ہوں اس پر لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ آیت جہاد کے بارے میں ہے اور یہ منسوخ ہے دو سو کے مقابلے میں ایک سو کے صبر کرنے (والے حکم) کے ساتھ۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: سورۃ البقرہ میں یہ آیت اس کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں اضمار اور تقیید ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے یحاسبکم به الله ان شاء الله تعالیٰ اس کے ساتھ تمہارا حساب لے گا اگر اس نے چاہا۔ اور اس بنا پر کوئی نسخ نہیں ہے۔

اور نحاس نے کہا ہے: اس آیت میں جو احسن قول کیا گیا ہے اور وہ ظاہر سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت عام ہے، پھر نجوی کے بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث (اس میں) داخل کر دی گئی ہے جسے بخاری، مسلم وغیرہما نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''مومن کو قیامت کے دن اپنے رب سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ رب کریم اپنا دست قدرت اس پر رکھ دے گا اور وہ اسے اس کے گناہوں کے بارے اقرار کرائے گا اور فرمائے گا کیا تو (اپنے ان گناہوں کو) پہچانتا ہے؟ تو وہ مومن عرض کرے گا اے میرے رب! میں پہچانتا ہوں۔ رب کریم فرمائے گا: کیونکہ میں نے دنیا میں تجھ پر پردہ ڈالے رکھا ہے اور بلاشبہ آج کے دن بھی میں تیرے لئے انہیں بخش دوں گا اور پھر نیکیوں کا نامہ عمل اسے عطا فرما دے گا اور رہے کفار اور منافقین! تو انہیں ساری مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو جھٹلایا (2)''۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت مومنین میں سے ان کے بارے نازل ہوئی ہے جو کافروں کو ولی مقرر کرتے تھے۔ یعنی اے مومنین! کفار کی ولایت کے بارے میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کا اعلان کرو یا تم اسے چھپاؤ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ تمہارا حساب لے گا۔ واقدی اور مقاتل نے یہ کہا ہے۔ اور انہوں نے اس ارشاد سے جو کہ آل عمران میں ہے استدلال کیا ہے۔ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ یعنی کفار کی ولایت میں سے جو تمہارے سینوں میں ہے اگر تم اسے چھپاؤ یا تم اسے ظاہر کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور اس پر اس کا ماقبل قول دلالت کرتا ہے: لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (آل عمران:28) (نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست مومنوں کو چھوڑ کر۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں اس میں (حقیقت سے) بعد اور دوری ہے، کیونکہ آیت کا سیاق اس کا تقاضا نہیں کرتا اور جو سورۂ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 389، دار الکتب العلمیہ

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 360۔ صحیح بخاری، باب ستر المومن علی نفسه، حدیث نمبر 5609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آل عمران میں ہے وہ بین اور واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس آیت کے ساتھ اپنی قوم کے پاس تشریف لاتے تھے لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ابن کثیر، نافع، ابوعمرو، حمزہ اور کسائی نے فیغفر اور ویعذب کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اس کا عطف جواب شرط پر کیا گیا ہے اور ابن عامر اور عاصم نے دونوں میں رفع کے ساتھ قطعی طور پر پڑھا ہے۔ یعنی فھو یغفرُ و یعذبُ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، اعرج، ابوالعالیہ اور عاصم جحدری سے دونوں میں نصب کے ساتھ مروی ہے اس بنا پر کہ ان سے پہلے اَنْ مضمر ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا عطف معنی پر ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: فیضاعفہ لہ (1) اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور باہم مشاکلہ کی وجہ سے لفظ پر عطف عمدہ ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

و متی مایع منك كلاماً　　يتكلم فيجبك بعقل

نحاس نے کہا ہے اور طلحہ بن مصرف سے روایت ہے یحاسبکم بہ اللہ یغفر یعنی بغیر فا کے بدل کی بنا پر۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: جعفی اور خلاد نے اسی طرح پڑھا ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اسی طرح ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے یہ یُحَاسِبْكُمْ سے بدل ہونے کی بنا پر ہے اور یہی محاسبہ کی تفسیر ہے۔ اور یہ شاعر کے اس قول کی طرح ہے:

رُوَيْدًا بنی شیبانَ بعضَ وعیدِكم　　تُلاقوا غدًا خیلی علی سفوان

تلاقوا جیادًا لا تحید عن الوَغَی　　اذا ما غَدَتْ فی المأزِق المتَدانِی

اور یہ بدل کی بنا پر ہے۔ شاعر نے فعل کو مکرر ذکر کیا ہے، کیونکہ فائدہ اس قول میں ہے جو اس کے پیچھے آ رہا ہے (2)۔ نحاس نے کہا ہے: اگر بغیر فا کے ہو تو جزم کی نسبت رفع زیادہ عمدہ ہے۔ وہ حال کے محل میں ہو جائے گا، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

متی تأتِه تعشو الی ضَوْءِ نارِہ　　تجدْ خیر نارٍ عندھا خیر مُوقِدِ

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 390، دار الکتب العلمیہ

"ایمان لایا یہ رسول (کریم) اس (کتاب) پر جو اتاری گئی اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اور (ایمان لائے) مومن۔ یہ سب دل سے مانتے ہیں الله کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو (نیز کہتے ہیں) ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ہم طالب ہیں تیری بخشش کے اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔ ذمہ داری نہیں ڈالتا الله تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اس کی۔ اس کو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا۔ اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا خطا کر بیٹھیں اے ہمارے رب! نہ ڈال ہم پر بھاری بوجھ جیسے تو نے ڈالا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں اے ہمارے پروردگار! نہ ڈال ہم پر وہ بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں قوت نہیں اور درگزر فرما ہم سے اور بخش دے ہم کو اور رحم فرما ہم پر۔ تو ہی ہمارا دوست (مددگار) ہے۔ تو مدد فرما ہماری قوم کفار پر"۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ حضرت حسن، مجاہد اور ضحاک سے روایت ہے کہ یہ آیت قصہ معراج میں عطا ہوئی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بعض روایات میں اسی طرح مروی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: تمام قرآن سوائے اس آیت کے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام لے کر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت شب معراج سماعت فرمائی۔ اور بعض نے کہا ہے اس کا واقعہ معراج سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ لیلۃ المعراج تو مکہ مکرمہ میں تھی اور یہ ساری سورت مدنی ہے۔

پس جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس کا تعلق شب معراج سے ہے انہوں نے فرمایا کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلندیوں کی جانب چڑھے اور آسمانوں میں بلند مقام پر پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام بھی تھے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ سے آگے گزر گئے تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ سے عرض کی: بلاشبہ میں اس جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ہی آپ کے سوا کسی کو اس مقام سے تجاوز کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے گزر گئے یہاں تک کہ اس مقام تک پہنچے جہاں تک الله تعالیٰ نے چاہا، تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ اپنے رب کریم کو سلام عرض کیجئے، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: التحیات لِلّٰہ والصلوٰتُ والطیّبات۔ (قولی عبادات، بدنی عبادات اور مالی عبادات سب الله تعالیٰ کے لئے ہیں۔) تو الله تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: السلام علیك ایها النبی و رحمۃ اللّٰه و برکاته (اے نبی مکرم تجھ پر سلام ہو اور الله تعالیٰ کی رحمتیں اور اس کی برکتیں ہوں۔) تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاہا کہ آپ کی امت کے لئے بھی سلام میں حصہ موجود ہو۔ چنانچہ عرض کی: السلام علینا و علیٰ عبادِ اللّٰه الصَّالِحِیْنَ(1) (سلام ہو ہم پر اور الله تعالیٰ کے صالح بندوں پر۔) تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام اور آسمانوں میں رہنے والے تمام ملائکہ نے کہا:

1۔ صحیح بخاری، باب التشهد فی الآخرۃ، حدیث نمبر 788، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

أشهد أنْ لاَ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ أشْهَدُ أنَّ محمدًا عبدهٗ و رسولُه۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ یہ معنی شکر کی بنا پر ہے یعنی رسول نے تصدیق کی۔ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ (اس (کتاب) کی جو اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی۔) پس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بھی کرامت وفضیلت میں شریک کرنے کا ارادہ فرمایا تو کہا: وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ یعنی وہ کہتے ہیں ہم تمام رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے ساتھ ایمان لائے اور ہم ان میں سے کسی کے ساتھ کفر نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی فرق کرتے ہیں جس طرح کہ یہود ونصاریٰ نے فرق کیا...... تو آپ کے رب نے آپ کو فرمایا اس آیت کے بارے ان کی قبولیت کیسی ہے جسے میں نے نازل کیا ہے؟ اور وہ یہ قول باری تعالیٰ ہے: اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ۝ (انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ہم طالب ہیں تیری بخشش کے اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔) یعنی الْمَصِیْرُ بمعنی المرجع (لوٹنے کی جگہ) ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمایا: لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنی طاقتها۔ (اللہ تعالیٰ کسی شخص پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر جتنی اس کی طاقت ہو۔)

اور یہ بھی کہا جاتا ہے: الا دون طاقتها مگر اس کی طاقت سے کم۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ یعنی اس کے لئے اس خیر اور نیکی کے عمل کا اجر ہوگا جو اس نے کیا۔ وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اور اس پر اس برے عمل کا وبال ہوگا جو اس نے کمایا۔ تو اس وقت حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے کہا: مانگئے آپ کو عطا کیا جائے گا۔ تب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِیْنَاۤ اے ہمارے رب! ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یعنی لاعلم رہیں اَوْ اَخْطَاْنَا یا ہم خطا کر بیٹھیں یعنی اگر ہم ارادۃً کریں۔

اور کہا جاتا ہے: اگر ہم عمل کر بیٹھیں بھول کر اور خطاءً۔ تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ سے کہا: آپ کو یہ عطا کر دیا گیا، تحقیق آپ کی امت سے خطا اور نسیان اٹھالئے گئے ہیں۔(1)

پس آپ کسی دوسری شے کی التجا کیجئے۔ تو آپ نے کہا: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَاۤ اِصْرًا، اِصْرًا سے مراد ثقل اور بوجھ ہے۔ (یعنی اے ہمارے رب! ہم پر بھاری بوجھ نہ ڈال) كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا (جیسے تو نے ڈالا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں۔) اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے ظلم کے سبب پاکیزہ چیزیں بھی حرام قرار دیں۔ اور وہ جب رات کے وقت گناہ کرتے تھے تو وہ اسے اپنے دروازے پر لکھا ہوا پاتے تھے اور ان پر نمازیں پچاس تھیں، پس اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے تخفیف کر دی اور ان سے پچاس نمازیں فرض کرنے کے بعد کم کر دیں(2)۔ پھر عرض کی: رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وہ کہہ رہے ہیں: ایسے عمل کا بوجھ ہم پر نہ ڈال جسے کرنے کی طاقت ہم نہیں رکھتے کہ پھر تو ہمیں عذاب دے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسا عمل جو ہم پر گراں اور مشکل ہو، کیونکہ اگر انہیں پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا تو وہ اس کی طاقت رکھتے

1۔ السنن ابن ماجہ، باب طلاق المکرہ والناس، حدیث نمبر 2034، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، ذکر الملائکۃ، حدیث نمبر 2968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں، لیکن وہ ان پر شاق اور مشکل ہوگا اور وہ اس پر دوام اور ہمیشگی اختیار کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ وَاعْفُ عَنَّا اور ہمارے ہر قسم کے (گناہوں کو) معاف فرما وَاغْفِرْ لَنَا اور ہم سے درگزر فرما اور کہا جاتا ہے: وَاعْفُ عَنَّا اور ہمیں مسخ (شکل بدلنے) سے معاف فرما وَاغْفِرْ لَنَا اور ہمارے خسف (زمین میں دھنسا) سے درگزر فرما۔ وَارْحَمْنَا اور ہم پر قذف (پتھر برسانا) سے رحم فرما، کیونکہ سابقہ امتوں میں سے بعض کی شکلیں مسخ کر دی گئیں، بعض کو زمین میں دھنسا دینے کا عذاب دیا گیا اور بعض پر پتھر برسائے گئے۔ پھر کہا اَنْتَ مَوْلٰىنَا یعنی تو ہمارا ولی ہے اور تو ہمارا محافظ ہے۔ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ سو آپ کی دعا قبول کر لی گئی۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''میری ایک مہینے کی مسافت سے رعب کے ساتھ مدد کی گئی ہے۔ نصرت بالرعب مسيرة شهر(1) اور کہا جاتا ہے کہ لشکری جب اپنے گھروں سے خالص نیت کے ساتھ نکلتے اور جنگ کا طبل بجاتے تو کفار کے دلوں میں رعب اور ہیبت ایک مہینہ کی مسافت سے واقع ہو جاتی۔ انہیں ان کے نکلنے کا علم ہوتا یا علم نہ ہوتا۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب (معراج سے) لوٹے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات وحی فرمائیں تاکہ آپ اپنی امت کو اس کے بارے آگاہ کریں۔ اور اس آیت کی ایک دوسری تفسیر بھی ہے۔

زجاج نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں نماز اور زکوٰۃ کے فرض ہونے کا ذکر فرمایا اور حج کے احکام اور حیض، طلاق، ایلا کا حکم اور انبیاء علیہم السلام کے قصص بیان فرمائے اور ربا کا حکم بیان فرمایا، (تو) اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ اپنی عظمت و شان کا ذکر فرمایا: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ پھر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کا ذکر فرمایا اور پھر ان تمام کے بارے مومنین کی تصدیق کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام اشیاء کی تصدیق کی جن کا ذکر جاری ہے۔ اور اسی طرح تمام مومنین نے اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ، اس کی کتب اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا سبب نزول اس کی ماقبل آیت ہے اور وہ یہ ہے لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۗ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ کیونکہ جب یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی، تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب پر انتہائی گراں اور شدید ثابت ہوئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے اور عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں ایسے اعمال کا مکلف بنایا گیا ہے جن کی ہم طاقت رکھتے ہیں: نماز، روزہ، جہاد (اور صدقہ) اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ آیت نازل کی ہے اور ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ تم اس طرح کہو جس طرح تم سے پہلے اہل کتاب نے کہا تھا۔ سمعنا و عصينا (ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی) بلکہ تم یہ کہو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ (ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اے ہمارے رب ہم تیری بخشش کے طالب ہیں اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔) تو انہوں نے کہا: سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ پس جب قوم نے اسے پڑھا تو اس کے ساتھ

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 2، صفحہ 433

ان کی زبانیں پست ہوگئیں۔ تو اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸۵﴾

لیکن جب انہوں نے یہ کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِیْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا فرمایا ''ہاں'' رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَیْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا فرمایا: ''ہاں'' رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ فرمایا: ''ہاں'' وَ اعْفُ عَنَّا ۥ وَ اغْفِرْ لَنَا ۥ وَ ارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۸۶﴾ فرمایا: ''ہاں'' اسے مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (1)۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: پہلی روایت میں یہ قول قد فعلت اور اس روایت میں کہا: نعم یہ اس پر دلیل ہے کہ حدیث بالمعنی نقل کی گئی ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور جب اس پر امر پختہ ہوگیا کہ انہوں نے کہا: سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی تعریف اور مدح کی اور اس مشقت کو دور کر دیا جو انہیں دلوں میں کھٹکنے والی چیزوں کے سبب ہوئی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی طرف کامل متوجہ ہونے کا ثمرہ ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے لئے اس کا برعکس ظاہر ہوا، ان کی مذمت کی اور انہیں ذلت، محتاجگی، اور جلاوطنی جیسی مشقتوں میں ڈال دیا جب انہوں نے یہ کہا تھا۔ سمعنا و عصینا ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی اختیار کرنے کا ثمرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے احسان اور مہربانی سے اس عذاب اور سزا سے پناہ عطا فرمائے۔ (آمین)

اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عرض کی گئی کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس کا گھر ہر رات چراغوں کے ساتھ روشن ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا: شاید وہ سورۃ البقرہ پڑھتا ہو، سو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: میں نے سورۃ البقرۃ میں سے اٰمَنَ الرَّسُوْلُ پڑھی ہے (2)۔ یہ تب نازل ہوئی جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب پر وہ دھمکی شاق گزری جو اللہ تعالیٰ نے ان تصورات پر حساب لینے کے بارے انہیں فرمائی جنہیں ان کے دل مخفی رکھے ہوئے ہوں گے، تو انہوں نے اس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں شکوہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شاید تم یہ کہہ رہے ہو سمعنا و عصینا جیسا کہ بنی اسرائیل نے کہا تھا۔'' تو انہوں نے عرض کی: (نہیں) بل سمعنا و اطعنا۔ بلکہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف میں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ نازل فرمائی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اور ان کے لئے فرض ہے کہ وہ ایمان لائیں (3)۔''

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اٰمَنَ اس کا معنی صدق ہے یعنی تصدیق کی اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور وہ جو نازل کیا گیا وہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 77
2۔ فضائل القرآن، سور القرآن و آیاتہ، صفحہ 229، دار ابن کثیر دمشق بیروت
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 178-179

قرآن کریم ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح پڑھا ہے۔ وآمن المومنون کل امن باللہ یہ لفظ پر (عطف کی بنا) پر ہے (1)۔ اور غیر قرآن میں معنی پر (عطف کرتے ہوئے) آمنوا پڑھنا بھی جائز ہے۔

نافع، ابن کثیر، عاصم ابو بکر کی روایت میں اور ابن عامر رحمۃ اللہ علیہم نے و کُتُبِہٖ صیغہ جمع کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور انہوں نے سورۃ التحریم میں کتابہ صیغہ واحد پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو نے یہاں اور سورۃ التحریم میں و کُتُبِہٖ صیغہ جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حمزہ اور کسائی نے دونوں میں کتابہ واحد کے ساتھ قرأت کی ہے۔ پس جنہوں نے جمع پڑھا ہے انہوں نے کتاب کی جمع کا ارادہ کیا ہے اور جنہوں نے مفرد پڑھا ہے انہوں نے اس مصدر کا ارادہ کیا ہے جو ہر لکھی ہوئی شے کو جامع ہوتا ہے جس کا نزول اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو (2)۔ اور جنہوں نے واحد پڑھا ہے ان کی قرأت میں بھی یہ جائز ہے کہ اس سے مراد جمع لیا جائے، اس اعتبار سے کہ کتاب اسم جنس ہے۔ پس دونوں قرأتیں مساوی طور پر برابر ہو گئیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (البقرہ:213) (تو بھیجے اللہ نے انبیاء خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب۔)

جماعت نے وَرُسُلِہٖ سین کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح رسُلنا و رسُلکم و رسُلك میں ہے سوائے ابو عمرو کے اور ان سے رسْلنا و رسْلکم کی تخفیف مروی ہے۔ اور ان سے رسلك میں تثقیل اور تخفیف دونوں مروی ہیں۔ ابو علی نے کہا ہے: جنہوں نے رسلك کو تثقیل کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ کلمہ کی اصل ہے اور جنہوں نے تخفیف کی ہے تو اسی طرح احاد میں تخفیف کی جاتی ہے، مثلاً عُنُق و طُنُب۔ اور جب احاد میں تخفیف کی جائے تو یہ اس جمع میں زیادہ مناسب ہے جو زیادہ ثقیل ہے۔ فرمایا اس کا (یہ) معنی مکی ہے۔ اور جمہور لوگوں نے لَا نُفَرِّقُ نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے یقولون لا نفرق (3) (وہ کہتے ہیں ہم فرق نہیں کرتے) اور قول حذف کر دیا گیا۔ اور قول کا حذف کرنا کثیر اور زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ علیہم من کل باب سلام علیکم یعنی یقولون سلام علیکم۔ (وہ کہیں گے تم پر سلام ہو) اور مزید فرمایا: و یتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا، ای یقولون ربنا (وہ کہیں گے اے ہمارے رب! اور اسی طرح (ان میں ہے) جو اس کی مثل ہیں۔ سعید بن جبیر، یحییٰ بن یعمر، ابو زرعہ بن عمرو بن جریر اور یعقوب نے لا یفرق یا کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ لفظ کل کی بنا پر ہے۔

ہارون نے کہا ہے: اور یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لا یفرقون (4) ہے۔ اور بَيْنَ اَحَدٍ مفرد پڑھا ہے آحاد نہیں کہا ہے، کیونکہ احد واحد اور جمع تمام کو شامل ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝ (الحاقہ) اس میں حٰجِزِيْنَ احد کی صفت ہے، کیونکہ اس کا معنی جمع ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما احلت الغنائم لاحد سود الرؤس غیرکم (5) (تمہارے سوا بڑے سرداروں میں سے کسی کے لئے غنائم حلال نہیں کی گئیں۔) اس میں سود

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 391، دار الکتب العلمیہ	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً، صفحہ 392	4۔ ایضاً

5۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 134۔ جامع ترمذی، باب سورۃ الانفال، حدیث نمبر 3010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الرؤس، احد کی صفت ہے۔ اور رؤبہ نے کہا ہے:

اذا أمور الناس دِينَتْ دينكا لا يرهبون أحدا مِنْ دونكا

جب لوگوں کے امور تیرے دین کے تابع بنا دیئے گئے ہیں تو وہ تیرے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے۔

اس آیت کا معنی ہے: بے شک مومنین یہود و نصاریٰ کی طرح نہیں ہیں اس میں کہ وہ بعض کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا اس میں حذف ہے، یعنی سمعنا سماع قابلین ہم نے قبول کرنے والوں کے سماع کی طرح سنا۔ اور کہا گیا ہے: سَمِعَ بمعنی قَبِلَ ہے (یعنی قبول کرنا) جیسا کہ کہا جاتا ہے: سمع الله لمن حمده، تو اس میں حذف نہ ہوگا۔ المختصر یہ قول اپنے کہنے والے کی مدح کا تقاضا کرتا ہے اور اطاعت کا معنی حکم کو قبول کرنا ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: غُفْرَانَكَ یہ مصدر ہے جیسا کہ کفران اور خسران ہیں اور اس میں عامل فعل مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: اغفر غفرانك، (تو اپنی بخشش عطا فرما۔) زجاج نے یہی کہا ہے اور اس کے سوا دوسروں نے کہا ہے: نطلب او أسال غفرانك (ہم یا میں تیری بخشش کے طالب ہیں۔) وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ یہ دوبارہ زندہ کئے جانے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا اقرار ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کو کہا: "بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ پر اور آپ کی امت پر غنائم کو حلال کیا ہے سو آپ مانگئے آپ کو عطا کیا جائے گا۔" پس آپ نے آخر سورت تک التجا کی (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا...... تکلیف سے مراد وہ امر ہے جس کے ساتھ کسی کو آزمایا جائے اور تَكَلَّفْتُ الْاَمْرَ کا معنی ہے میں نے اسے کام کرنے کی تکلیف دی، اسے جوہری نے بیان کیا ہے اور اَلْوُسْعُ کا معنی ہے طاقت اور کوشش۔ اور یہ یقینی خبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر نص بیان فرمائی ہے کہ وہ آیت نازل ہونے کے وقت سے بندوں کو دل یا دیگر اعضاء بدن کے اعمال میں سے کسی عبادت کا پابند اور مکلف نہیں بنائے گا مگر اسی کا جو مکلف کی وسعت اور طاقت میں ہوگی اور اس کے ادراک اور اس کی فطرت کے تقاضا کے مطابق ہوگی تو اس سے مسلمانوں سے وہ غم اور پریشانی دور ہوگئی جو دلوں میں آنے والے تصورات کا حساب لینے کے حکم سے انہیں لاحق ہوئی تھی (2)۔ اور اس آیت کے معنی میں وہ روایت ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سوا کسی سے محبت نہیں کی جسے اس کی ماں نے جنم دیا ہے، کیونکہ میں ایک دن ان کے پیچھے پیچھے گیا اور مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی وہ اپنے گھر پہنچے تو انہوں نے گھی کی مشک کے سوا کچھ نہ پایا، اس میں گھی کے کچھ اثرات تھے، چنانچہ انہوں نے اسے ہمارے سامنے پھاڑ دیا اور ہم نے اسے چاٹنا شروع کر دیا جو اس میں گھی اور کھجوروں کا اثر تھا۔ اور وہ کہنے لگے:

ما كلّف الله نفسًا فوق طاقتها ولا تجود يَدٌ الا ما تَجِدُ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 392، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ نے کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بنایا اور ہاتھ وہی شے سخاوت کرتا ہے جو وہ پاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ دنیوی احکام میں تکلیف مالا یطاق کے جائز ہونے کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے جبکہ اس پر ان کا اتفاق ہے کہ شریعت میں تکلیف مالا یطاق واقع نہیں ہے اور اس آیت نے اس کے معدوم ہونے کے بارے آگاہ کیا ہے۔ ابوالحسن اشعری اور متکلمین کی ایک جماعت نے کہا ہے: تکلیف مالا یطاق عقلاً جائز ہے۔ اور یہ عقائد شرعیہ میں سے کسی شے کو ساقط نہیں کرتی اور یہ مکلف کو عذاب دینے پر علامت ہے اور اس کے بارے یہی (حکم) قطعی ہے گویا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ کسی مصور کو جَو پر گرہ لگانے کا پابند کیا جائے۔ (1)

اور اس کے جواز کے قائلین نے اختلاف کیا ہے کہ کیا یہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں واقع ہے یا نہیں ہے؟ پس ایک جماعت نے کہا ہے: یہ ابولہب کے بارے میں نازل ہونے والی سورت میں واقع ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمام شریعت کے ساتھ ایمان لانے کا مکلف بنایا اور من جملہ یہ بھی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا، کیونکہ اس پر دونوں ہاتھوں کے ٹوٹنے اور آتش جہنم میں پھینکے جانے کا حکم لگایا گیا ہے اور یہ اس پر مطلع کرتا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ تحقیق اسے ایمان لانے کا مکلف بنایا باوجود اس کے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔

اور ایک جماعت نے کہا ہے۔ یہ کبھی واقع نہیں ہوئی۔ اور اس پر اجماع بیان کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ سَيَصْلٰى نَارًا کا معنی یہ ہے: اگر وہ اس میں پہنچا (2) اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے۔

اور یُكَلِّفُ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے ان میں سے ایک محذوف ہے اور وہ عبادةً یا شيئاً ہے (3)۔ پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہم پر اپنا لطف وانعام فرمایا۔ اگر وہ چاہتا تو ہمیں ایسے امور کا مکلف بنا دیتا جو مشقت آمیز اور اذیت رساں ہوتے ہیں جیسا کہ دس کے مقابلہ میں ایک کا ثابت قدم رہنا، انسان کا ہجرت کرنا اور اپنے وطن سے نکلنا اور اپنے گھر والوں، اپنے وطن اور اپنے کاروبار سے کلیۃً علیحدگی اختیار کرنا، لیکن اس نے ہمیں ایسے کاموں کا جو سخت مشقت آمیز ہوں اور ایسے امور جو اذیت اور تکلیف پہنچانے والے ہوں ان کا مکلف اور پابند نہیں بنایا۔ جیسا کہ اس نے ہم سے پہلے لوگوں کو مکلف بنایا مثلاً اپنے نفسوں کو قتل کرنا اور اپنے کپڑوں اور جسم پر پیشاب لگ جانے والی جگہ کاٹنا وغیرہ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سہولت عطا فرمائی اور نرمی فرمائی اور ہم سے اس بوجھ اور طوق کو دور فرما دیا جو ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے ہوئے تھا۔ فللہ الحمد والمنة والفضل والنعمة۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس سے وہ نیکیوں اور برائیوں کا ارادہ فرما رہا ہے۔ (یعنی اس کے لئے اجر ہوگا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا۔) سدی نے یہی کہا ہے۔ اور مفسرین کی جماعت میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں، ابن عطیہ نے یہ کہا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام: 164) (اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ) اور

1۔ بخاری حدیث، باب من کذب لی حلمہ، حدیث نمبر 6520، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 393، دار الکتب العلمیہ　3۔ ایضاً

وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (انعام: 164) (اور نہیں کماتا کوئی شخص (کوئی چیز) مگر وہ اسی کے ذمہ ہوتی ہے) اور دل میں پیدا ہونے والے تصورات اور اس طرح کے دیگر وساوس انسان کی کمائی اور کسب میں سے نہیں ہیں۔ اور نیکیوں کے ذکر میں لَهَا ذکر ہوا ہے اس لئے کہ یہ ان میں سے ہیں جنہیں کرنے سے آدمی خوش ہوتا ہے اور ان کے ساتھ مسرت محسوس کرتا ہے لہٰذا انہیں اس کی ملکیت کی طرف منسوب کیا جارہا ہے اور سیئات کے ذکر میں عَلَيْهَا ذکر ہوا ہے اس لئے کہ وہ بھاری بوجھ ہیں اور انہیں اٹھانا انتہائی مشکل اور تکلیف دہ ہے، اور وہ اسی طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: لی مال و علی دین (میرے لئے مال ہے اور مجھ پر قرض ہے یعنی مال میری ملکیت ہے اور قرض مجھ پر بوجھ ہے۔)

فعل کسب کو مکرر (دوبار) لایا گیا ہے اور باب مختلف ذکر کیا ہے تاکہ نوع کلام حسین ہو جائے جیسا کہ فرمایا: فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ (الطارق) (پس آپ کفار کو (تھوڑی سی) مہلت اور دے دیں کچھ وقت انہیں کچھ نہ کہیں)

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں میرے لئے جو ظاہر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ نیکیاں وہ ہیں جو بغیر تکلف کے کمائی جاتی ہیں کیونکہ انہیں کمانے والا اللہ تعالیٰ کے حکم کے راستہ پر اور طریقہ شریعت پر ہوتا ہے اور برے اعمال تکلف اور مبالغہ کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں، کیونکہ انہیں کمانے والا اللہ تعالیٰ کی نہی کے حجاب کو پھاڑ کر ان کے بارے میں تکلف کرتا ہے اور ان کی طرف خطا اور غلطی کے ساتھ قدم اٹھاتا ہے۔ لہٰذا آیت میں اس فعل کا دو بابوں سے آنا اس معنی کی حفاظت کے لئے انتہائی حسین ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ بندوں کے افعال پر ائمہ نے جو کسب اور اکتساب کا اطلاق کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اور اسی لئے انہوں نے ان پر خلق اور خالق کا اطلاق نہیں کیا ہے، بخلاف ان کے جنہوں نے بدعتی گروہوں میں سے اس کا اطلاق کرنے کی جرأت کی ہے۔ اور ہمارے ائمہ میں سے جنہوں نے بندے پر اس کا اطلاق کیا ہے اور یہ کہ وہ فاعل (کام کرنے والا) ہے تو وہ خالصۃً مجاز ہے۔ اور مہدوی وغیرہ نے کہا ہے: آیت کے معنی میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی کو دوسرے کے گناہ کے عوض نہیں پکڑا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: فی نفسہٖ یہ صحیح ہے لیکن یہ اس آیت کے سوا سے ثابت ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 8۔ الکیا طبری نے کہا ہے: قولہ تعالیٰ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس سے اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ جس نے کسی دوسرے کو قتل کر دیا بھاری ہتھیار کے ساتھ یا گلا گھونٹ کر یا پانی میں غرق کر کے تو اس پر قصاص یا دیت کی صورت میں اس کی ضمان ہوگی، بخلاف اس کے جس نے اس کی دیت عاقلہ پر قرار دی ہے اور یہ ظاہر کے خلاف ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ باپ سے قصاص کا ساقط ہونا اس کے شریک سے اس کے ساقط ہونے کا تقاضا نہیں کرتا اور یہ قول عاقلہ پر حد واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے جب وہ مجنون کو اپنی ذات پر قدرت دے۔

اور قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: ''ہمارے علماء نے اس آیت کے ضمن میں کہا ہے کہ قصاص باپ کے شریک پر واجب ہے بخلاف امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اور خطا کرنے والے کے شریک پر واجب ہے بخلاف امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے قتل کا کسب کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے: جس پر قصاص واجب نہیں ہوتا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 393، دار الکتب العلمیہ

اس کا ایسے آدمی کے ساتھ شریک ہونا جس پر قصاص واجب ہوتا ہے اس حکم کے سقوط میں شبہ نہیں بن سکتا جسے شبہ کے سبب ساقط کر دیا جاتا ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا اس کا مفہوم یہ ہے اس گناہ سے درگزر فرمالے جو ہم سے ان دونوں طریقوں پر یا ان میں سے ایک طریقہ پر صادر ہوتا ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے رفع عن امتی الخطأ والنسیان وما استکرھوا علیہ (2) (میری امت سے خطا، نسیان اور اس (گناہ) کو جس پر انہیں مجبور کیا جائے اٹھالیا گیا ہے۔ یعنی ایسے گناہ پر مواخذہ نہ ہوگا۔) اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ گناہ اٹھالیا گیا ہے۔ البتہ ان احکام میں اختلاف ہے جو اس سے متعلق ہوتے ہیں۔ کیا وہ اٹھا لئے ہیں اور اس سے کوئی شے لازم نہ آئے گی یا اس کے سارے احکام لازم آئیں گے؟ اس میں اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ واقعات مختلف ہونے سے یہ بھی مختلف ہوتے ہیں، پس ایک قسم وہ ہے کہ وہ بالاتفاق ساقط نہیں ہوتی مثلاً تاوان، دیات اور فرض نمازیں۔ اور ایک قسم وہ ہے جو بالاتفاق ساقط ہو جاتی ہے۔ مثلاً قصاص اور کلمہ کفر زبان پر لانا۔ اور تیسری قسم وہ ہے جس میں اختلاف ہے مثلاً وہ آدمی جس نے رمضان المبارک میں بھول کر کھالیا یا بھول کر حانث ہوگیا (یعنی قسم توڑ دی) اور وہ کام جو ان کی مثل ہوں اور خطا اور بھول کر واقع ہو سکتے ہوں اور وہ فروع میں معروف ہوں۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا۔ اِصْرًا کا معنی ثقل اور بوجھ ہے۔ امام مالک اور ربیع نے کہا ہے: اصر سے مراد انتہائی سخت اور مشکل امر ہے(3) اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اصر سے مراد عمل کی شدت اور سختی ہے اور وہ جو بنی اسرائیل پر انتہائی شدید اور سخت تھے مثلاً پیشاب وغیرہ کے مسائل۔ اور ضحاک نے کہا ہے: وہ انتہائی تکلیف دہ اور شدید امور برداشت کرتے تھے اور یہ امام مالک اور ربیع رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کی طرح ہی ہے۔ اور اسی سے نابغہ کا قول ہے:

یا مانع الضیم ان یغشی سراتھم　　والحامل الإصر عنھم بعد ما عرفوا

حضرت عطا نے کہا ہے: الاصر سے مراد شکل مسخ کر کے بندر یا خنزیر بنا دینا ہے۔ اور ابن زید نے بھی یہی کہا ہے اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہے جس میں نہ توبہ ہو اور نہ ہی کفارہ ہو(4)۔ اور لغت میں اصر کا معنی عہد ہے۔ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ اور الاصر کا معنی تنگی، گناہ اور بوجھ ہے اور الاصار سے مراد وہ رسی ہے جس کے ساتھ بوجھ وغیرہ باندھے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: أَصَرَ يَأْصِرُ أَصْرًا بمعنی حبسہ یعنی اس نے اسے روک لیا۔ اور الاصر ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اسی سے ہے، جوہری نے کہا ہے: اسم ظرف مَاْصِر اور مَاْصَر ہے اور جمع مَاٰصِر ہے اور عام طور پر تو کہتا ہے معاصر۔

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 264

2۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 233، حدیث نمبر 10307۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب طلاق المکرہ والناس، حدیث نمبر 2034، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 394، دار الکتب العلمیہ　4۔ ایضاً

ابن خویز منداد نے کہا ہے اور ممکن ہے کہ اس کے ظاہر سے ہر اس عبادت میں استدلال کیا جائے جس کے بوجھ اور ثقیل ہونے کا خصم دعویٰ کرے، پس یہ اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہے: وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج:78)

اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: الدّین یسر فیسروا ولا تعسروا (1) (دین آسان ہے پس تم آسانی پیدا کرو اور تنگی اور مشکل نہ بناؤ)۔ اللّھم شق علی من شق علی امۃ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ (اے اللہ اس پر مشقت ڈال دے جس نے امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مشقت ڈالی ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اسی طرح الکیا الطبری نے کہا ہے: اس سے حرج اور تنگی کی نفی میں استدلال کیا جاتا ہے اور جس کا ظاہر بخشش اور نرمی کے میلان کے منافی ہو۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تو ہم پر شدت اور سختی نہ کر جس طرح تو نے ان پر سختی کی جو ہم سے پہلے تھے۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے: ہم پر ایسے اعمال کا بوجھ نہ ڈال جنہیں کرنے کی ہم طاقت نہیں رکھتے اور اسی طرح ابن زید نے کہا ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: تو ہماری شکلیں بندروں اور خنزیروں میں مسخ نہ کر دے۔ اور سلام بن سابور نے کہا: وہ جن کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ وہ شہوت پرستی ہے۔ اسے نقاش نے حضرت مجاہد اور حضرت عطا سے بیان کیا ہے اور روایت ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: واعوذبك من غُلْمَۃ لیس لھا عدّۃ (میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس شہوت پرستی سے جس کی عدت نہ ہو۔) سدی نے کہا ہے: اس سے مراد وہ سختی اور پیاس ہے جو بنی اسرائیل پر مسلط تھی (2)۔

قولہ تعالیٰ: وَاعْفُ عَنَّا اور ہمارے گناہوں سے درگزر فرما۔ عفوت عن ذنبہ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب تو اسے چھوڑ دے اور اسے سزا نہ دے۔ وَاغْفِرْ لَنَا ہمارے گناہوں کو ڈھانپ دے (ان پر پردہ ڈال دے) اور الغفر کا معنی پردہ ہے۔ وَارْحَمْنَا اور رحمت فرما جس کا آغاز تیری جانب سے ہم پر ہو۔ اَنْتَ مَوْلٰىنَا یعنی تو ہمارا ولی اور ہمارا مددگار ہے۔ اور یہ آیات مخلوق کی تعلیم کے لئے بیان کی گئی ہیں کہ وہ کیسے دعا مانگیں گے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ جب اس سورت کی قرأت سے فارغ ہوتے تو کہتے۔ آمین۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس کے بارے یہ گمان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہو، پس اگر ایسا ہے تو یہ کمال ہے اور اگر یہ سورۃ الحمد پر قیاس کے سبب ہے اس حیثیت سے کہ وہاں دعا ہے اور یہاں بھی دعا ہے تو یہ اچھا ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: میں گمان نہیں رکھتا کہ کسی نے اسلام کو سمجھا ہو اور اس کا ادراک کیا ہو اور وہ ان دونوں (آیات) کو پڑھے بغیر سو جائے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مسلم نے اس معنی میں حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ

1۔ کشف الخفاء للعجلونی، جلد 1، صفحہ 498، بحوالہ موسوعہ اطراف الحدیث　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 394، دار الکتب العلمیہ

3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 395

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے رات کے وقت سورۃ البقرہ کی یہ دونوں آیتیں پڑھ لیں تو یہ اسے کافی ہیں (1)۔'' کہا گیا ہے: یہ اسے قیام اللیل سے کافی ہیں (یعنی یہ اس طرح ہے گویا اس نے رات کو عبادت کرتے ہوئے گزارا۔) جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے مجھ پر جنت کے خزانوں میں سے دو آیتیں نازل فرمائی ہیں، ان کے ساتھ سورۃ البقرہ کو ختم کیا ہے رحمٰن نے مخلوق کو پیدا کرنے سے ایک ہزار برس پہلے اپنے دست قدرت سے انہیں تحریر فرمایا۔ جس نے عشاء کے بعد ان دونوں کو دو بار پڑھا وہ دونوں اس کے لئے قیام اللیل سے کافی ہوں گی۔ اور وہ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے آخر سورۃ البقرہ تک ہیں (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ دونوں اسے شیطان کے شر سے (محفوظ رکھنے کے لیے) کافی ہوں گی اور اسے اس پر کوئی غلبہ نہ ہو سکے گا۔ اور ابو عمرو الدانی نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق کرنے سے دو ہزار برس پہلے ایک کتاب لکھی پس اس سے یہ تین آیات نازل فرمائیں جن کے ساتھ سورۃ البقرہ کو ختم کیا گیا جس نے انہیں اپنے گھر میں پڑھا تین راتوں تک شیطان اس کے گھر کے قریب نہیں آئے گا (3)۔

اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: أُوتیتُ هذه الآیات من آخر سورة البقرة من كنز تحت العرش لم یوتهن نبیّ قبلی (4) (مجھے سورۃ البقرہ کی یہ آخری آیات عرش کے نیچے والے خزانے سے عطا کی گئی ہیں اور یہ مجھ سے پہلے کسی نبی علیہ السلام کو عطا نہیں کی گئیں۔) اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اور سورۃ الفاتحہ میں فرشتے کا سورۃ الفاتحہ کے ساتھ انہیں لے کر نازل ہونے کا ذکر گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271۔ ایضاً صحیح بخاری، باب فضل سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 4624، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ الکشاف، جلد 1، صفحہ 333

3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 112۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی آخر سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2807، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 151

سورۃ آل عمران

آیاتہا ۲۰۰ ۳ سورۃ آل عمران مدنیۃ ۸۹ رکوعاتہا ۲۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ﴿۲﴾

''الف - لام - میم - اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے، زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ﴿۲﴾ یہ بالاجماع مدنی سورت ہے۔ نقاش نے بیان کیا ہے کہ تورات میں اس کا نام طیبہ ہے (1)، اور حسن، عمرو بن عبید، عاصم بن ابی النجود اور ابوجعفر الرواسی نے الٓمّٓ - اللّٰہُ الف وصل کو قطع کے ساتھ پڑھا ہے، اس تقدیر پر کہ الٓمّٓ پر وقف ہے۔ جیسا کہ وہ اسماء اعداد مثلاً واحد، اثنان، ثلاثۃ اور اربعۃ وغیرہ میں وقف مقدر کرتے ہیں، حالانکہ وہ انہیں اکٹھا اور ملا کر پڑھتے ہیں۔

اخفش سعید نے کہا ہے: الٓمّٓ ۚ اللّٰہُ التقاء ساکنین کی وجہ سے میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ غلطی ہے۔ ثقیل ہونے کی وجہ سے عرب اس طرح نہیں کہتے۔ نحاس نے کہا ہے: پہلی قرأت ہی قرأت عامہ ہے اور متقدمین علمائے نحو نے اس میں گفتگو کی ہے۔ پس سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے میم کو فتحہ دیا جائے اور انہوں نے اس کے لئے فتحہ کو اختیار کیا ہے تاکہ کسرہ اور یا اور اس کے ماقبل کے کسرہ کے درمیان اسے جمع نہ کر دیا جائے۔

اور کسائی نے کہا ہے: حروف تہجی کے ساتھ الف وصل مل جائے اور تو الف وصل کو حذف کر دے تو اسے الف کی حرکت کے ساتھ حرکت دے گا اور یہ کہے گا: الٓمَ اللہ، والمُ اذکر، والمِ اقتربت۔

اور امام فراء نے کہا ہے: الٓمّٓ ۚ اللّٰہُ کی اصل وہی ہے جسے رواسی نے پڑھا ہے پھر ہمزہ کی حرکت میم پر ڈال دی گئی۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اَلۡحَیُّ الۡقَیَّامُ پڑھا ہے (2) اور خارجہ نے کہا ہے: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے مصحف میں الحیُّ القیِّمُ ہے۔ وہ حروف جو سورتوں کے اوائل میں آئے ہیں ان کے بارے علماء کی آراء سورۃ البقرہ کے شروع میں بیان ہو چکی ہیں۔ اس حیثیت سے اس سورت میں اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ایسا جملہ آیا ہے جو قائم بنفسہ ہے۔ اور اس میں وہ تمام اقوال متصور ہو سکتے ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 396، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 397

مسئلہ نمبر 2۔ امام کسائی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور سورۂ آل عمران شروع کی اور پڑھا الٓمّٓ۔ اللہ لا الہ الا ھو الحی القیام اور پہلی رکعت میں سو آیات تلاوت کیں اور دوسری رکعت میں بقیہ سو آیات پڑھیں (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: دو رکعتوں میں ایک سورت نہیں پڑھی جائے گی اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اس کے لئے جائز ہے۔ اور امام مالک نے المجموعہ میں کہا ہے: اس میں کوئی حرج نہیں اور یہ (مہتم) بالشان نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں صحیح یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مغرب میں سورۃ الاعراف تلاوت فرمائی اور اسے دو رکعتوں میں تقسیم کر دیا (2)۔ اسے نسائی نے بھی بیان کیا ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس سورت کی فضیلت میں کئی آثار و اخبار موجود ہیں اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ یہ سورت سانپوں سے امان ہے۔ اور فقراء او محتاجوں کے لئے یہ خزانہ ہے۔ اور یہ آخرت میں اپنے قاری کی جانب سے جھگڑا کرے گی اور رات کے وقت جس نے اس کی آخری آیات پڑھیں اس کے لئے ساری رات قیام کرنے کی طرح کا ثواب لکھا جائے گا۔ وغیر ذالك۔

دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں ابو عبید قاسم بن سلام نے بیان کیا، انہوں نے کہا مجھے عبید اللہ اشجعی نے بتایا، انہوں نے کہا مجھے مسعر نے بیان کیا، انہوں نے کہا: مجھے جابر نے اس حالت میں واقع ہونے سے پہلے بتایا جس میں وہ واقع ہوئے کہ حضرت شعبی سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: فقراء اور محتاجوں کے لئے سورۂ آل عمران کتنا بہترین اور اچھا خزانہ ہے جو رات کے آخری حصہ میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے (3)۔ (یعنی نوافل میں اس کی تلاوت کرتا ہے۔)

محمد بن سعید نے، عبد السلام نے جریری سے انہوں نے ابی السلیل سے بیان کیا ہے: ایک آدمی وسیع جنگل میں پہنچا اور اس نے وادی مجنہ میں پناہ لی اور یہ وہ وادی ہے جس میں جو بھی چلتا تھا اسے سانپ ڈس لیتے تھے اور اس وادی کے کنارے پر دو راہب تھے۔ پس جب شام ہوئی تو ان میں سے ایک نے دوسرے کو کہا: قسم بخدا! یہ آدمی ہلاک ہو گیا! راوی کا بیان ہے۔ پس اس آدمی نے سورۂ آل عمران پڑھنی شروع کر دی۔ دونوں راہبوں نے کہا: اس نے سورۃ طیبہ پڑھی ہے شاید نجات پا جائے گا۔ راوی کہتا ہے: پس اس آدمی نے صحیح سالم صبح کی۔ اور مکحول سے روایت ہے: جس نے جمعہ کے دن سورۂ آل عمران پڑھی رات تک ملائکہ اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔

اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: جس نے رات کے وقت سورۂ آل عمران کی آخری آیات پڑھیں تو اس کے لئے پوری رات کے قیام کا ثواب لکھ دیا گیا اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے۔

اور مسلم نے نواس بن سمعان کلابی سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "اسے قیامت کے دن قرآن کے ساتھ اور ان اہل قرآن کے ساتھ لایا جائے گا جو اس کے مطابق عمل کرتے رہے اور اس کے آگے سورۃ البقرہ اور آل عمران ہوں گی...... اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے لئے تین مثالیں بیان فرمائیں جنہیں میں ابھی تک نہیں بھولا، فرمایا: گویا کہ یہ دونوں دو بادل ہیں یا دو سیاہ سائے ہیں جن کے درمیان روشنی اور چمک ہے یا گویا

1۔ سنن نسائی، کتاب الافتتاح، جلد 1، صفحہ 154　2۔ ایضاً　3۔ فضائل القرآن، سور القرآن و آیاتہ، صفحہ 238

یہ دونوں پرندوں کا گروہ ہیں جو صفیں باندھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے قاری کی جانب سے جھگڑیں گی (1)۔

مسلم نے ہی حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''قرآن کریم پڑھا کرو کیونکہ یہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لئے شفیع بن کر آئے گا تم زَهْرَاوَين (یعنی) سورۃ البقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھا کرو کیونکہ یہ دونوں قیامت کے دن اس حال میں آئیں گی گویا کہ یہ دو بادل ہیں یا گویا کہ یہ دو سائے ہیں یا گویا کہ یہ دونوں پرندوں کے غول ہیں جو صفیں باندھے ہوئے ہیں اور یہ اپنے پڑھنے والوں کی جانب سے جھگڑا کریں گی۔ سورۃ البقرہ پڑھا کرو کیونکہ اسے لے لینا برکت ہے اور اسے چھوڑنا حسرت ہے اور جادوگر اس کی استطاعت نہیں رکھیں گے۔'' معاویہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ البطلہ سے مراد جادوگر ہیں (2)۔

مسئلہ نمبر 4۔ سورۃ البقرہ اور آل عمران کا نام الزهراوَين رکھا گیا ہے اس بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(۱) بلاشبہ یہ دونوں روشن کرنے والیاں ہیں۔ (زهراوین) الزَّهْر اور الزُّهْرَةُ سے بنایا گیا ہے چونکہ ان کی ہدایت اور راہنمائی کی وجہ سے ان کے قاری کے لئے ان کے انوار یعنی معانی ظاہر اور روشن ہو جاتے ہیں۔ (اس لئے ان کا نام زہراوین رکھا گیا)

(۲) پھر اس لئے کہ ان کی قرأت پر قیامت کے دن نور تام مرتب ہوگا۔ اور یہی دوسرا قول ہے۔

(۳) ان دونوں کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کو متضمن ہونے میں شریک ہیں، جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ حضرت اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دونوں آیتوں میں ہے والهكم اله واحد لا اله الا هو الرَّحمن الرحيم اور وہ آیت جو آل عمران میں ہے اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (3) اسے ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔ الغمام کا معنی ہے وہ بادل جو اکٹھا اور گھنا ہو۔ اور الغیایۃ کا معنی بھی یہی ہے جب کہ وہ سر کے قریب ہو۔ اور یہی ظُلَّۃ بھی ہے اور روایت کا معنی یہ ہے کہ ان دونوں کی تلاوت کرنے والا ان کے ثواب کے سائے میں ہوگا جیسا کہ ایک آدمی اپنے صدقہ کے سائے میں آئے گا۔'' اور قولہ تُحاجان کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے ملائکہ پیدا فرمائے گا جو ان کے ثواب کے عوض پڑھنے والے کی جانب سے جھگڑا کریں گے (4)۔ جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے۔ ''بلاشبہ جس نے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الآیہ پڑھی اللہ تعالیٰ ستر فرشتے پیدا فرمادے گا وہ اس کے لئے یوم قیامت تک استغفار کرتے رہیں گے۔''

اور قولہ: بینهما شَرْقٌ اسے را کے سکون اور اس کے فتحہ کے ساتھ مقید کیا گیا ہے اور یہ روشنی پر تنبیہ ہے، کیونکہ جب فرمایا: سَوْدَاوان اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ دونوں تاریک ہیں تو اپنے قول بینهما شرق سے اس کی نفی کی گئی۔ یعنی یہ

1۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 270 2۔ ایضاً

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 210۔ ایضاً، باب الدعاء، حدیث نمبر 1278، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 371، حدیث نمبر 16109

دونوں اپنی کثافت کے سبب ان کے درمیان جو ان کے نیچے ہوں گے اور سورج کی حرارت اور تپش کی شدت کے درمیان حائل ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس سورت کا ابتدائی حصہ وفد نجران کے سبب نازل ہوا اس بارے میں محمد بن اسحاق نے محمد بن جعفر بن زبیر سے نقل کیا ہے: وہ نصاریٰ تھے جو ساٹھ سواروں پر مشتمل وفد بن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ ان کے اشراف میں سے چودہ افراد ان میں تھے، ان چودہ افراد میں تین آدمی ایسے تھے جن کی طرف ان کا امر لوٹتا تھا۔ (یعنی جملہ معاملات کا انحصار تین افراد پر تھا۔) ایک عاقب تھا جو قوم کا امیر اور ان میں صاحب رائے تھا۔ اور اس کا نام عبد المسیح تھا۔ اور ایک ان کا معاون و مددگار سردار تھا اور انہیں اکٹھا کرنے والا تھا اس کا نام الأیہم تھا، اور ابو حارثہ بن علقمہ بکر بن وائل میں سے ایک تھا وہ ان کا بشپ اور ان کا عالم تھا، وہ عصر کی نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے، وہ یمنی کپڑوں کے جبے اور چادریں پہنے ہوئے تھے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا: ہم نے ان کی مثل جمال و جلال والا کوئی وفد نہیں دیکھا، ان کی نماز کا وقت ہوا، وہ اٹھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں مشرق کی طرف انہوں نے نماز پڑھی۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم انہیں چھوڑ دو" پھر وہ کئی دنوں تک وہاں ٹھہرے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مناظرہ کرتے رہے اور وہ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ ابن اللہ (یعنی اللہ تعالیٰ کے بیٹے) تھے۔ علاوہ ازیں وہ اضطراب میں ڈالنے والی شنیع باتیں کرتے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم براہین ساطعہ کے ساتھ ان کا رد کرتے رہے اور ان کی کوئی مدد نہ کی گئی اور انہیں کے بارے میں اس سورت کی ابتدائی تقریباً اسی آیات نازل ہوئیں، یہاں تک کہ ان کا معاملہ اس حد تک جا پہنچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مباہلہ کی دعوت دے دی۔ جیسا کہ سیرت ابن اسحاق وغیرہ میں مذکور ہے (1)۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

"نازل فرمائی اس نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ تصدیق کرنے والی ہے ان (کتابوں) کی جو اس سے پہلے (اتری) ہیں اور اتاری اس نے تورات اور انجیل، اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے اور اتارا فرقان کو۔ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اللہ کی آیتوں کے ساتھ ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے بدلہ لینے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے بِالْحَقِّ اس سے مراد صدق (سچائی) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حجت غالبہ ہے اور قرآن کریم کو بتدریج تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا، سو اسی لئے فرمایا: نَزَّلَ اور تنزیل یکے بعد دیگرے مرۃ بعد مرۃ نازل کرنے کو کہتے ہیں۔ اور تورات اور انجیل دونوں یکبارگی نازل ہوئیں۔ سو اسی لئے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 396، دار الکتب العلمیہ

(ان کے بارے) ارشاد فرمایا اَنْزَلَ اور بِالْحَقِّ میں با الکتاب سے حال کے محل میں ہے۔ اور با محذوف کے متعلق ہے، تقدیر عبارت ہے آتیا بالحق اور یہ نَزَّلَ کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ وہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے ان میں سے ایک حرف جر کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ تیسرے کی طرف متعدی نہیں ہوتا۔ اور مُصَدِّقًا حال مؤکدہ ہے حال منتقلہ نہیں، کیونکہ یہ ممکن نہیں ہوسکتا کہ وہ غیر مصدق یعنی غیر موافق ہو، یہ جمہور کا قول ہے اور بعض نے اس میں الانتقال کو مقدر مانا ہے، اس معنی کی بنا پر کہ وہ مصدق لنفسہٖ بھی ہے اور مصدق لغیرہٖ بھی۔

قولہ تعالیٰ: لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ یعنی ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل کی گئی ہیں۔ اور تورات کا معنی روشنی اور نور ہے۔ یہ مشتق ہے وَرَى الزَّنْدُ اور وَرِيَ سے یہ دونوں لغتیں ہیں جب چقماق سے آگ نکلے (تو کہا جاتا ہے وَرَى الزند) اور اس کی اصل تَوْرِيَةٌ بروزن تَفْعَلَة ہے۔ تا زائدہ ہے اور یا متحرک ہے اس کا ماقبل مفتوح ہے اسے الف سے بدل دیا گیا اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ تَفْعِلَةٌ ہو اور پھر راکسرہ سے فتحہ کی طرف منتقل ہو جائے، جیسا کہ انہوں نے جارية میں جَارَاةٌ اور ناصية میں ناصاة کہا ہے اور یہ دونوں وزن فراء سے منقول ہیں۔

اور خلیل نے کہا ہے: اس کا اصل وزن فَوْعَلَةٌ ہے۔ پس اصل وَوْرَيَةٌ ہوئی، پھر پہلی واؤ کو تا سے بدل دیا گیا جیسا کہ تَوْلَجٌ میں بدلا گیا ہے اور یہ اصل میں وَوْلَجٌ تھا فَوْعَلٌ کے وزن پر اور یہ وَلَجْتُ سے ماخوذ ہے (1)، اور پھر یا متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدل دیا گیا۔ اور فَوْعَلَةٌ کا وزن تَفْعَلَةٌ کی نسبت زیادہ (قابل استعمال) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ التوراۃ یہ التَّوْرِيَة سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی ہے کسی شے کے بارے تعریض کرنا اور اسے دوسرے سے چھپانا، تو گویا تورات میں زیادہ کنایات ہیں اور بغیر کسی تصریح اور وضاحت کے اشارات ہیں، یہ مورج کا قول ہے۔

اور جمہور نے پہلا قول اختیار کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَد اتينا موسى و هارون الفرقان و ضياء و ذكرا للمتقين مراد تورات اور انجیل ہیں۔ انجیل اِفْعِيْلٌ کے وزن پر النَّجَل سے ماخوذ ہے اور یہی اصل ہے۔ اور اس کی جمع أناجيل اور توراۃ کی توارِ بنائی جاتی ہے۔ پس انجیل علوم اور حکم (کے معنی) کے لئے اصل ہے۔ اور کہا جاتا ہے: لعن الله نَاجِلَيْه یعنی اللہ اس کے والدین پر لعنت کرے۔ کیونکہ والدین اس کی اصل ہیں (اس لئے انہیں ناجلیہ کہا گیا)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نَجَلْتُ الشَّيْئَ سے بنا ہے جب تو کسی شے کو نکالے (تو یہ جملہ بولتا ہے) پس انجیل کے ساتھ علوم و حکم نکالے گئے ہیں اور اس معنی میں اولاد اور نسل کو اس کے نکلنے کی وجہ سے نجل کہا جاتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

الى مَعْشَرٍ لَم يُورِث اللؤمَ جَدُّهم　　أصاغرَهم و كلُّ فَحْل لهم نَجْلُ

اس میں لفظ نَجْلُ نکالنے کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اَلنَّجْلُ سے مراد وہ پانی ہے جو زمین سے پھوٹ کر نکلتا ہے اور اسْتَنْجَلَتِ الْاَرْضُ کا معنی ہے زمین پانی رسنے کی وجہ سے دلدلی ہوگئی۔ اور اسی کو نِجَالٌ کہتے ہیں جب اس سے پانی نکلنے لگے۔ پس اسی معنی کی بنا پر اس کا نام انجیل رکھا گیا ہے کیونکہ اللہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 398، دار الکتب العلمیہ

تعالیٰ نے اسے حق کا درس دینے والا عافیت بنا کر نازل کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ النَّجَلُ فی العین سے ہے۔ اس کا معنی ہے آنکھ کا وسیع اور کشادہ ہونا (1) اور طعنۃ نجلاء ہے۔ یعنی بڑا نیزہ۔ شاعر نے کہا ہے:

رُبَّما ضَرْبۃٍ بسیفٍ صقیلٍ　　من بُصْرٰی و طعنۃ نَجْلاء

اس میں طعنۃ نجلاء بڑے نیزہ کے معنی میں مذکور ہے۔

اور اس کے ساتھ انجیل کا نام رکھا گیا ہے، کیونکہ یہ اصل ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے لئے نکالا ہے اور اسے ان پر نور اور ضیاء کے ساتھ پھیلا دیا ہے، وسیع کر دیا ہے۔

اور کہا گیا ہے: کہ التَّنَاجُل کا معنی التنازع (جھگڑا کرنا) ہے۔ اور لوگوں کے اس جھگڑا کرنے کی وجہ سے اس کا نام انجیل رکھا گیا ہے۔ اور شمر نے بعض سے بیان کیا ہے: انجیل سے مراد ہر کتاب ہے جو لکھی ہوئی ہو اور اس کی سطریں وافر ہوں اور یہ بھی کہا گیا ہے: نجل بمعنی عمل اور صنع ہے۔ یعنی کام کرنا۔ کسی نے کہا ہے۔ وانجل فی ذاك الصنیع كما نجل (اس کاروبار میں تو بھی کام کر جیسے اس نے کیا۔)

اور یہ قول بھی ہے کہ تورات اور انجیل سریانی زبان کے الفاظ ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ انجیل سریانی میں انکلیون ہے، اسے ثعلبی نے بیان کیا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے اسے مذکر و مونث دونوں طرح ذکر کیا جاتا ہے۔ پس جس نے مونث ذکر کیا ہے اس نے صحیفہ کا ارادہ کیا ہے اور جس نے مذکر ذکر کیا ہے اس نے کتاب مراد لی ہے۔ کئی دوسروں نے کہا ہے: کبھی قرآن کو انجیل بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے قصہ میں مروی ہے کہ انہوں نے کہا: یا رب أری فی الألواح اقواما أنا جیلهم فی صدورهم فاجعلهم امّتی (اے میرے رب! میں تختیوں میں کئی اقوام کو دیکھ رہا ہوں ان کی کتابیں ان کے سینوں میں ہیں پس تو انہیں میرا امتی بنا دے) تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا تلك أمّة احمد وہ احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے۔ بلا شبہ اس میں آپ نے اناجیل سے قرآن مراد لیا ہے۔ اور حسن نے والأنجیل ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (2) اور باقیوں نے کسرہ کے ساتھ مثلاً اِکْلِیل۔ اس میں دونوں لغتیں ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ ان میں سے ہو جنہیں عربوں نے اسماء عجمیہ میں سے عربی بنایا ہے۔ اور اس کی ان کے کلام میں کوئی مثال نہ ہو۔

قولہ تعالیٰ: مِنْ قَبْلُ یعنی قرآن کریم سے پہلے هُدًى لِّلنَّاسِ (لوگوں کی ہدایت کے لئے) ابن فورک نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے هدی للناس المتقین (3) یعنی متقی لوگوں کی راہنمائی کے لئے۔ اور اس کی دلیل سورۃ البقرہ میں هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝ ہے۔ پس اس عام کو اس خاص کی طرف لوٹا دیا گیا ہے اور هُدًى یہ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں واقع ہے اور الْفُرْقَانَ سے مراد قرآن کریم ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰى عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ۝

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 424　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 399، دار الکتب العلمیہ　　3۔ ایضاً

''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پوشیدہ رہتی اس پر کوئی چیز زمین اور نہ آسمان میں۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اشیاء کے بارے تفصیلی علم رکھنے کی خبر ہے اور اس کی مثل قرآن کریم میں کثیر آیات ہیں۔ پس وہ جانتا ہے اسے بھی جو ہو چکا، اسے بھی جو ہوگا اور اسے بھی جو نہ ہوگا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے الہ یا اس کے بیٹے ہو سکتے ہیں حالانکہ ان پر کئی اشیاء مخفی ہیں۔

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۞

''وہی ہے جو تمہاری تصویریں بناتا ہے (ماؤں کے) رحموں میں جس طرح چاہتا ہے کوئی معبود نہیں بغیر اس کے (وہی) غالب ہے حکمت والا ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ اللہ تعالیٰ نے ماؤں کے رحموں میں انسان کی تصویریں بنانے کی خبر دی ہے۔ اور رحم کی اصل رحمۃ سے ہے، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جن کے ساتھ ایک دوسرے پر رحم کیا جاتا ہے اور صورۃ کا اشتقاق صارہ الی کذا سے ہے جب وہ اس کی طرف مائل ہو جائے، پس صورت مائل ہوتی ہے ایک شبیہ اور ہیئت کی طرف۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان کو بیان کرتی ہے اور اس کے ضمن میں نجران کے عیسائیوں کا رد ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے ہیں جن کی تصویریں بنائی گئیں اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحج اور المومنون میں تصویر کی شرح اور وضاحت کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ (1) میں اس کی وضاحت کی ہے، جیسا کہ وہاں اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور اس میں طبائعیین کا بھی رد ہے کیونکہ وہ اسے مستقل فاعل بناتے ہیں اور ان کا رد آیۃ التوحید میں گزر چکا ہے اور مسند ابن سنجر میں حدیث ہے۔ (ان کا نام محمد بن سنجر ہے) ''بے شک اللہ تعالیٰ جنین کی ہڈیاں اور اس کی غضاریف (کچی ہڈیاں جو کھائی جا سکتی ہیں) مرد کی منی سے اور اس کی چربی اور گوشت عورت کی منی سے پیدا فرماتا ہے (2)''۔

اور اس میں اس پر بہت بڑی دلیل ہے کہ بچہ مرد اور عورت کے پانی سے پیدا ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں صریحاً موجود ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ (الحجرات:13) (اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے) اور صحیح مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے ''کہ ایک یہودی نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میں ایک شے کے بارے آپ سے سوال کرنے کے لئے آیا ہوں۔ سوائے نبی یا ایک آدمی یا دو آدمیوں کے اہل زمین میں سے کوئی اسے نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا: ''تجھے نفع ہوگا اگر میں تجھے بتا دوں؟'' اس نے کہا: میں کان لگا کر پورے غور سے سنوں گا۔ پھر اس نے کہا: میں بچے کے بارے آپ سے پوچھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی کا پانی سفید ہوتا ہے اور عورت کا پانی زرد۔ اور جب وہ دونوں جمع ہو جائیں اور مرد کی منی عورت کی منی پر غالب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 400، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

ہوتو الله تعالیٰ کے اذن سے بچہ (مذکر) پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کی منی مرد کی منی پر غالب ہوتو الله تعالیٰ کے اذن سے بچی پیدا ہوتی ہے (1)۔'' الحدیث، اس کا بیان سورۃ الشوریٰ کے آخر میں آئے گا ان شاء الله تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: كَيْفَ يَشَآءُ یعنی جسے وہ چاہتا ہے خوبصورت یا بدصورت، سیاہ اور سفید، طویل القامت یا پستہ قد، اعضاء کے اعتبار سے صحیح سالم یا اپاہج (پیدا کرتا ہے) یہاں تک کہ اس کا شقی (بدبخت) ہونا اور سعید ہونا وغیرہ۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا گیا کہ قراء آپ کے پاس جمع ہیں تا کہ جو احادیث آپ کے پاس ہیں وہ انہیں سنیں، تو آپ نے انہیں فرمایا: میں تم سے چار چیزوں کے سبب مشغول ہوں اور میں روایت حدیث کے لئے فارغ نہیں ہوں۔ تو آپ سے عرض کی گئی: وہ مشغولیت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ان میں سے ایک یہ ہے میں یوم میثاق میں غور و فکر اس حیثیت سے کرتا ہوں کہ الله تعالیٰ نے فرمایا: ''یہ جنت میں ہوں گے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے اور یہ جہنم میں ہوں گے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔'' اور میں نہیں جانتا اس وقت میں کون سے فریق میں تھا۔ اور دوسری یہ ہے کہ رحم میں میری صورت بنائی گئی تو اس فرشتے نے کہا جو رحموں پر مقرر ہے: ''اے میرے رب! یہ شقی ہے یا سعید ہے (2)'' تو میں نہیں جانتا اس وقت الله تعالیٰ نے کیا جواب دیا۔ اور تیسری چیز یہ ہے کہ جس وقت ملک الموت میری روح قبض کرے گا تو وہ کہے گا: ''اے میرے رب! کفر کے ساتھ یا ایمان کے ساتھ'' تو میں نہیں جانتا جواب کیسا ہوگا۔ اور چوتھی شے یہ ہے کہ وہ کہے گا: وَ امْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ (یٰسین) (اور (حکم ہوگا) اے مجرمو! (میرے دوستوں سے) آج الگ ہو جاؤ) تو میں نہیں جانتا میں کون سے فریق میں ہوں گا۔

پھر الله تعالیٰ نے فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یعنی اس کے سوا کوئی خالق نہیں اور نہ کوئی مصور (تصویر بنانے والا) ہے اور یہ اس کی وحدانیت پر دلیل ہے، پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے الٰہ مصور ہو سکتے ہیں حالانکہ ان کی تصویر بنائی گئی ہے یعنی وہ مصور ہیں۔ الْعَزِيْزُ سے مراد وہ ہے جو مغلوب نہیں ہو سکتا۔ الْحَكِيْمُ سے مراد ذوالحکمت (صاحب حکمت) یا مُحْكِم (حکم (دانا بنانے والا) دینے والا) ہے۔ یہ اس کے مقابلہ میں اخص ہے جو تصویر کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘؔ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

''وہی ہے جس نے نازل فرمائی آپ پر کتاب اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں وہی کتاب کی اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں، پس وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے سو وہ پیروی کرتے ہیں (صرف) ان آیتوں کی جو متشابہ ہیں قرآن سے (ان کا مقصد) فتنہ انگیزی اور (غلط) معنی کی تلاش ہے اور نہیں جانتا اس کے صحیح معنی کو بغیر الله تعالیٰ کے اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم ایمان لائے ساتھ اس کے سب ہمارے رب کے پاس سے ہے اور نہیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 146
2۔ صحیح بخاری، باب ذکر الملائکہ، حدیث نمبر 2969، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند"۔

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ امام مسلم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ ام المومنین نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو قرآن کریم کی متشابہ آیتوں کی پیروی کرتے ہیں تو وہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ نام دیا ہے لہٰذا تم ان سے بچو(1)"۔

ابو غالب نے بیان کیا ہے: میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ چل رہا تھا اور وہ اپنے گدھے پر سوار تھے، یہاں تک کہ جب وہ مسجد دمشق کے راستے تک پہنچ کر رکے تو وہاں کچھ سر کھڑے کئے گئے، تو آپ نے پوچھا: یہ سر کن کے ہیں؟ تو بتایا گیا: یہ خوارج کے سر ہیں جو عراق سے لائے گئے ہیں۔ تو حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آگ کے کتے ہیں۔ آگ کے کتے ہیں، آگ کے کتے ہیں! آسمان کے سائے کے نیچے شریر ترین مقتول ہیں، اچھائی اور مبارک اس کے لئے جس نے انہیں قتل کیا اور انہوں نے اسے قتل کیا۔ انہوں نے یہی جملہ طوبی لمن قتلهم و قتلوه تین بار کہا۔ پھر رونے لگے۔ تو میں نے عرض کی: اے ابو امامہ! رضی اللہ عنہ کون سی شے تمہیں رلا رہی ہے؟ تو انہوں نے کہا: ان کے لئے رحمت ہو، بے شک وہ اہل اسلام میں سے تھے پھر اس سے نکل گئے، پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ الی آخر الآیات۔ پھر یہ آیت تلاوت کی: وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ (آل عمران:105) (اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور اختلاف کرنے لگے تھے اس کے بعد بھی جب آچکی تھیں ان کے پاس روشن نشانیاں)

تو میں نے کہا: اے ابو امامہ! کیا یہ وہ لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا: ہاں۔ پھر میں نے کہا: کیا یہ ایسی شے ہے جو تم اپنی رائے سے کہہ رہے ہو یا ایسی شے ہے جسے تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے؟ تو انہوں نے کہا: بلاشبہ تب تو میں جرأت کرنے والا ہوں، بلاشبہ تب تو میں جرأت کرنے والا! (نہیں) بلکہ میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے (کئی بار) سنا ہے نہ ایک بار، نہ دو بار، نہ تین بار، نہ چار بار، نہ پانچ بار، نہ چھ بار، نہ سات بار اور انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں پر رکھ لیں۔ بیان کیا: ورنہ انہیں خاموش کرا دیا جاتا(2)...... انہوں نے یہ تین بار کہا...... پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "بنی اسرائیل اکہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے ایک فرقہ جنت میں ہوگا اور بقیہ تمام فرقے جہنم میں ہوں

1۔ صحیح مسلم، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 339۔ ایضاً صحیح بخاری، باب منه آیات محکمات، حدیث نمبر 4183، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 8، صفحہ 267، حدیث نمبر 8034۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب و من سورۃ آل عمران، حدیث 2926، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے اور یقیناً یہ امت ان پر ایک فرقے کا اضافہ کرے گی ایک جنت میں ہوگا اور باقی تمام جہنم میں ہوں گے (1)''۔

مسئلہ نمبر 2۔ محکمات اور متشابہات کے بارے میں متعدد اقوال پر علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اور وہی حضرت شعبی اور حضرت سفیان ثوری وغیر ہما کے قول کا مقتضا بھی ہے کہ محکمات قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جن کی تاویل معروف ہو اور اس کا معنی و تفسیر سمجھے جا سکیں۔ اور متشابہ وہ ہے جسے جاننے کے لئے کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہ ہو یہ ان میں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا ہے نہ کہ اپنی خلق کے ساتھ۔ بعض علماء نے کہا ہے: ان کی مثال میں قیامت قائم ہونے کا وقت ہے، یا جوج اور ماجوج اور دجال کا نکلنا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہے اور اسی طرح سورتوں کے اوائل میں حروف مقطعات ہیں (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احسن قول ہے جو متشابہ کے بارے کیا گیا ہے اور ہم نے سورۃ البقرہ کے اوائل میں ربیع بن خثیم سے پہلے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کو نازل فرمایا اور اس میں سے جو چاہا اسے اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا (3)، الحدیث۔

اور ابوعثمان نے کہا ہے: محکم سے مراد وہ سورۃ فاتحہ ہے جس کے بغیر نماز جائز نہیں ہوتی۔ اور محمد بن فضل نے بیان کیا ہے کہ اس سے مراد سورۃ اخلاص ہے کیونکہ اس میں فقط توحید کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور کبھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن سارے کا سارا محکم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (ہود: 1) (یہ وہ کتاب ہے محفوظ و مستحکم بنا دی گئی ہیں جس کی آیتیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تمام کا تمام متشابہ ہے، کیونکہ ارشاد گرامی ہے: کتابا متشابها۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت کے معنی میں سے اس میں کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ یعنی نظم اور وصف میں اس کی آیات پختہ اور مضبوط ہیں اور یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حق ہیں اور کتابا متشابها کا معنی ہے کہ اس کی بعض آیات بعض کے مشابہ ہیں اور بعض بعض کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ اور وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ سے مراد یہ معنی نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں متشابہ احتمال اور اشتباہ کے باب سے ہے جو اس قول میں ہے ان البقر تشابه علینا یعنی وہ گائے ہم پر ملتبس ہوگئی۔ یعنی یہ (لفظ) گائیوں میں سے بہت سی انواع کا احتمال رکھتا ہے۔ اور محکم سے مراد وہ ہے جو اس کے مقابلہ میں ہو۔ اور وہ وہ ہے جس میں کوئی التباس نہ ہو اور وہ سوائے ایک وجہ کے اور کوئی احتمال نہ رکھتا ہو۔

اور کہا گیا ہے: بے شک متشابہ وہ ہے جو کئی وجوہ کا احتمال رکھتا ہے، پھر جب ان وجوہ کو ایک وجہ کی طرف لوٹا دیا جائے اور باقی باطل قرار دی جائیں تو وہ متشابہ محکم ہو جاتا ہے۔ پس محکم ہمیشہ اصل ہوتا ہے اور فروع اس کی طرف لوٹائی جاتی ہیں اور متشابہ وہی فرع ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: محکمات سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ تین آیات تک، اور سورۃ بنی اسرائیل میں یہ ارشاد ہے: وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ

1۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 8، صفحہ 273، حدیث نمبر 8051

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 401، دار الکتب العلمیہ　　3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 400

اِحْسَانًا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک ایک مثال ہے جو آپ نے محکمات کے بارے میں بیان فرمائی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی بیان کیا: محکمات سے مراد قرآن کریم کی ناسخ آیات، احکام حرام کو بیان کرنے والی اور اس کے فرائض کو بیان کرنے والی وہ آیات ہیں جن کے ساتھ ایمان لایا جاتا ہے اور جن کے مطابق عمل کیا جاتا ہے اور متشابہات سے مراد اس کی منسوخ آیات، اس کی مقدم و مؤخر آیات، اس کی امثال، اس کی اقسام اور وہ جن کے ساتھ ایمان لایا جاتا ہے اور ان کے مطابق عمل نہیں کیا جاتا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: محکمات سے مراد ناسخ آیات ہیں اور متشابہات سے مراد منسوخ آیات ہیں۔ اور یہی حضرت قتادہ، ربیع اور ضحاک نے کہا ہے (1)۔

محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا ہے: محکمات وہ آیات ہیں جن میں رب کریم کی حجت، بندوں کی عصمت اور جھگڑوں اور باطل کو دور کرنے کا ذکر ہے، جس معنی پر انہیں وضع کیا گیا ہے اس سے نہ انہیں پھیرا جا سکے اور نہ اس میں کوئی تحریف کی جا سکے۔ اور متشابہات وہ ہیں جن میں تصریف و تحریف اور تاویل ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ بندوں کو آزمایا ہے، مجاہد اور ابن اسحاق نے یہی کہا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں سب سے احسن قول یہی ہے (2)۔

نحاس نے کہا ہے: جو کچھ محکمات اور متشابہات کے بارے کہا گیا ہے ان میں احسن یہ ہے کہ محکمات وہ ہیں جو قائم بنفسہ ہیں ان میں کسی اور کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (الاخلاص: 4) اور وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ: 82) اور متشابہات مثلاً ان الله يغفر الذنوب جميعاً میں ان ارشادات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے: وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ: 82) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (النساء: 48)

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ نحاس نے کہا ہے وہ اس کی وضاحت کرتا ہے جسے ابن عطیہ نے اختیار کیا ہے اور وہی وضع زبان پر جاری ہے اور وہ یہ کہ محکم احکم سے اسم مفعول ہے اور الاحکام کا معنی الاتقان (پختہ کرنا) ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو لفظ واضح المعنی ہو اس میں کوئی اشکال اور تردد نہیں ہوتا۔ بلاشبہ وہ (محکم) اپنے مفرد کلمات کے واضح ہونے اور ان کی ترکیب کے پختہ اور مضبوط ہونے میں اسی طرح ہوتا ہے اور جب دو امروں میں سے کوئی ایک مختل ہو جائے تو اس میں تشابہ اور اشکال آ جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: مشابہ کی کئی وجوہ ہیں، ایک وہ ہے جس کے ساتھ حکم متعلق ہوتا ہے وہ یہ ہے جس میں علماء کا اختلاف ہو کہ دو آیتوں میں سے کون سی آیت نے دوسری کو منسوخ کر دیا ہے، جیسا کہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ایسی حاملہ عورت کے بارے جس کا خاوند فوت ہو جائے یہ نظریہ ہے کہ یہ دونوں مدتوں میں سے زیادہ کے ساتھ عدت گزارے گی اور حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہم یہ کہتے ہیں کہ اس کی عدت وضع حمل ہے، اور وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 400، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 401

کہتے ہیں: چھوٹی سورۂ نساء (1) (یعنی سورۂ طلاق) نے چار مہینے اور دس دن عدت والے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ اور حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کہتے ہیں یہ حکم منسوخ نہیں ہوا۔ اور اسی طرح ان کا وارث کے لئے وصیت کرنے کے بارے میں اختلاف ہے کیا وہ منسوخ کر دی گئی ہے یا منسوخ نہیں کی گئی؟ اور اسی طرح دو آیتوں میں تعارض کی صورت میں اختلاف ہے کہ ان میں سے اولیٰ کون سی ہے کہ اسے مقدم کیا جائے جب نسخ نہ پہچانا جائے اور نہ اس کی شرائط پائی جائیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء:24) یہ تقاضا کرتا ہے کہ ملک یمین کی حیثیت سے دو قریبی عورتوں کو اپنے پاس جمع کرنا مباح ہے، جبکہ ارشاد باری تعالیٰ: وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (النسا:23) اس سے منع کرتا ہے اور اسی میں سے وہ تعارض بھی ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں پایا جاتا ہے اور وہ جو قیاس میں پایا جائے، پس وہی متشابہ ہے اور ایک آیت کو دو قراءتوں سے پڑھنا متشابہ میں سے نہیں ہے اور اسم کبھی محتمل یا مجمل ہوتا ہے وہ تفسیر کا محتاج ہوتا ہے، کیونکہ اس میں سے واجب اتنی مقدار ہی ہوتی ہے جسے وہ اسم یا پوری آیت شامل ہوتی ہے اور دو قراءتیں دو آیتوں کی طرح ہوتی ہیں اور دونوں کے موجب کے مطابق عمل واجب ہوتا ہے، جیسا کہ پڑھا گیا ہے: وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ (المائدہ:6) (اَرْجُلَكُمْ) کی قراءت فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ بخاری نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کہا: میں قرآن کریم میں ایسی اشیاء پاتا ہوں جو مجھے مختلف نظر آتی ہیں۔ (یعنی ان میں اختلاف ہے) آپ نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ اس نے بیان کیا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ (المومنون) (تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان اس روز اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے۔) اور فرمایا: وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ (الطور) (اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر پوچھیں گے) اور کہا: وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے) اور پھر کہا: وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ (انعام) (قسم بخدا! اے ہمارے رب ہم مشرک نہ تھے) تو انہوں نے اس آیت میں (اپنے شرک کو) چھپایا۔ اور سورہ النازعات میں ہے اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝ وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝ وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ پس اس میں زمین کی تخلیق سے پہلے آسمان کی تخلیق کا ذکر کیا، پھر فرمایا اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِيْهَا وَ قَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ۝ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ ۝ (فصلت) سو اس میں آسمان کی تخلیق سے پہلے زمین کی تخلیق کا ذکر کیا اور فرمایا: وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (النسا) اور وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (النسا) اور وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ (النسا) تو گویا کہ وہ تھا پھر

1۔ صحیح بخاری، باب تفسیر سورۃ الطلاق، حدیث نمبر 4529، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گزر گیا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فلا انساب بینهم نفخہ اولیٰ کے بارے میں ہے پھر صور میں پھونکا جائے گا اور جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہوگا وہ گر پڑے گا سوائے اس کے جس کے بارے اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ اس وقت ان کے درمیان نہ نسب ہوں گے اور نہ وہ ایک دوسرے کے بارے پوچھیں گے۔ پھر دوسرے نفخہ میں ان میں سے بعض بعض کی طرف متوجہ ہوں گے اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔

اور جہاں تک ما کنا مشرکین اور ولا یکتمون اللہ حدیثا کا تعلق ہے تو چونکہ اللہ تعالیٰ اخلاص والوں کے گناہوں کی مغفرت فرمادے گا، تو مشرکین کہیں گے! آؤ ہم کہتے ہیں: ہم مشرک نہیں تھے، تو اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہر لگادے گا اور ان کے اعمال کے بارے ان کے اعضاء گفتگو کریں گے تو اس وقت یہ معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی بات کو نہیں چھپائے گا اور اس وقت کفار یہ خواہش کریں گے کاش وہ مسلمان ہوتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو دنوں میں تخلیق فرمایا، پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی تو دو دنوں میں انہیں ٹھیک سات آسمان بنا دیا، پھر زمین کو بچھایا اور اس سے پانی اور کھیتی نکالی اور ان میں پہاڑ، درخت، ٹیلے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ سب دوسرے دو دنوں میں تخلیق فرمادیا۔ پس اس لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا (نازعات) نتیجتاً زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ چار دنوں میں تخلیق کیا گیا اور دو دنوں میں آسمان بنایا گیا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: و کان اللہ غفورا رحیما (یعنی وہ ذاتی طور پر غفور اور رحیم ہے یعنی وہ ہمیشہ رہا اور ہمیشہ اسی طرح رہے گا)۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی شے کا ارادہ نہیں کیا مگر اسے اسی کے مطابق کیا جو ارادہ فرمایا۔ تجھ پر افسوس ہے! چاہیے کہ تجھ پر قرآن مختلف نہ ہو، کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ اس میں اُخَرُ غیر منصرف ہے۔ کیونکہ اسے الف لام سے معدول کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں اصل یہ ہے کہ یہ الف لام کے ساتھ صیغہ صفت ہو جیسا الکبر اور الصغر، پس جب اسے الف لام کے جاری ہونے کی جگہ سے معدول کر دیا گیا تو یہ غیر منصرف ہو گیا۔ ابو عبید نے کہا ہے: انہوں نے اسے منصرف نہیں کہا کیونکہ اس کا واحد منصرف نہیں ہوتا چاہے وہ معرفہ ہو یا نکرہ۔ اور مبرد نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: اس بنا پر یہ لازم آتا ہے کہ غضاب اور عطاش بھی منصرف نہ ہوں۔ اور امام کسائی نے کہا ہے: یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ صفت ہے۔ اور مبرد نے اس کا بھی انکار کیا ہے اور کہا ہے: بے شک لبدًا اور حطمًا بھی دونوں صفتیں ہیں اور یہ دونوں منصرف ہیں۔

سیبویہ نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ اُخَرُ الف لام سے معدول ہو، کیونکہ اگر یہ الف لام سے معدولہ ہوتا تو یہ معرفہ ہوتا، کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ سَحَرَ تمام اقوال میں معرفہ ہے کیونکہ یہ السحر سے معدول ہے اور اَمْسِ اس کے قول کے مطابق جس نے کہا: ذھب اَمْسِ یہ الامس سے معدول ہے، پس اگر اخر بھی الف لام سے معدول ہوتا تو وہ بھی معرفہ ہوتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نکرہ کے ساتھ اس کی صفت بیان کی ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 712

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ پس الَّذِیْنَ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور خبر فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ہے۔ اور زَیْغٌ کا معنی جھکاؤ اور کجی ہے اور اسی سے زاغت الشمس (سورج کا ڈھلنا) اور زاغت الابصار (آنکھوں کا تھکنا) ہے۔ اور کہا جاتا ہے: زاغ یزیغ زیغا جب وہ قصد وارادہ ترک کر دے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصف: 5) (پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا) اور یہ آیت کفار، زندیق، جاہل، بدعتی تمام گروہوں کو عام ہے۔ اگرچہ اس وقت اس سے اشارہ نجران کے عیسائیوں کی طرف تھا۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس ارشاد فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اگر یہ حروریہ اور خارجیوں کے گروہ نہیں ہیں تو پھر میں نہیں جانتا وہ کون ہیں (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ تفسیر حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث سے گزر چکی ہے۔ وہی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ہمارے شیخ ابوالعباس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: متشابہ کی پیروی کرنے والے اس سے خالی نہیں ہوتے کہ وہ اس کی پیروی کریں اور اسے جمع کرتے رہیں قرآن کریم میں تشکیک تلاش کرنے کے لئے اور عوام کو گمراہ کرنے کے لئے، جیسا کہ زنادقہ اور قرآن کریم میں طعنہ زنی کرنے والے قرامطہ نے کیا، یا وہ متشابہ کے ظواہر کے مطابق اعتقاد رکھنے کی طلب میں ایسا کرتے ہیں، جیسا کہ ان مجسمہ نے کیا جنہوں نے قرآن کریم اور احادیث طیبہ سے ان آیات و روایات کو جمع کیا جن کا ظاہر (اللہ تعالیٰ کی) جسمیت پر دلالت کرتا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے یہ اعتقاد رکھا کہ اللہ تعالیٰ ایک جسم مجسم ہے اور وہ صورت مصورہ ہے اس کا چہرہ، آنکھ، ہاتھ، پہلو، پاؤں اور انگلیاں سبھی اعضاء ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان سے مبرہ اور بلند ہے یا وہ متشابہ کی پیروی کرتے ہیں ان کی تاویلات کو ظاہر کرنے کے لئے اور ان کے معانی کی وضاحت کرنے کے لئے یا جیسا کہ صبیغ نے کیا جس وقت اس نے عمر پر کثرت سے اس بارے سوال کئے۔ پس یہ چار اقسام ہوئیں:

(۱) ان کے کفر میں کوئی شک نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کئے بغیر ان کے بارے میں قتل کا حکم دیا ہے۔

(۲) صحیح قول ان کی تکفیر کا ہے، کیونکہ ان کے اور بتوں اور تصویروں کی عبادت کرنے والوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اور اگر انہوں نے توبہ کی تو ان کی توبہ قبول کی جائے گی، ورنہ یہ قتل کر دیئے جائیں گے جیسا کہ مرتد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

(۳) چونکہ اس کی تاویل کے جواز میں اختلاف ہے لہٰذا اسی بنا پر اس کے جائز ہونے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ سلف کا مذہب متشابہ کی تاویل کے لئے تعرض کو ترک کرنا ہے باوجود اس کے کہ انہیں ان کے ظاہر معنی کے محال ہونے کا یقین تھا۔ پس وہ کہتے: تم اس سے گزر جاؤ جیسے وہ آئے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کی تاویلات کا اظہار کرنا چاہیے اور اسے ایسے معنی پر محمول کیا جائے بغیر یقین کے جس پر لغۃً محمول کرنا صحیح ہو جیسا کہ مجمل کی تعیین کی جاتی ہے۔

(۴) اس میں حکم ادب بلیغ کا ہے، جیسا کہ حضرت عمر نے صبیغ کے ساتھ کیا اور ابوبکر انباری نے کہا ہے: ائمہ سلف اسے سزا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 402، دار الکتب العلمیہ

دیتے تھے جو قرآن کریم کے مشکل حروف (متشابہ) کی تفسیر کے بارے سوال کرتا تھا۔ کیونکہ سائل اگر اپنے سوال سے بدعت کو دوام بخشنے اور فتنہ برپا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو یہ درحقیقت انکار اور بہت بڑی تعزیر کا مستحق ہے اور اگر اس کا یہ قصد نہیں تب بھی وہ گناہ کا جرم کرنے کے سبب عتاب کا مستحق ہے، کیونکہ اس نے منافقین ملحدین کے لئے اس وقت ایک راستہ ایجاد کر دیا ہے کہ وہ تاویل کے حقائق اور قرآن کریم کے مناہج سے انحراف کرتے ہوئے قرآن کریم میں تحریف کرنے کے بارے کمزور مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور ان میں تشکیک پیدا کرنے کا قصد و ارادہ کریں۔ اور اسی سے وہ روایت ہے جو اسماعیل بن اسحاق القاضی نے ہمیں بیان کی کہ ہمیں سلیمان بن حرب نے حماد بن زید عن یزید بن حازم عن سلیمان بن یسار کی سند سے یہ خبر دی ہے کہ صبیغ بن عسل مدینہ طیبہ آیا اور وہ قرآن کریم کی متشابہ (آیات) اور دیگر اشیاء کے بارے سوال کرنے لگا تو اس کی خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپ نے اسے بلا بھیجا۔ پس اسے حاضر کیا گیا تو آپ نے اس کے لئے کھجور کے گچھوں کی جڑیں تیار کی ہوئی تھیں۔ پس جب وہ حاضر ہوا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تو کون ہے؟ اس نے کہا: میں عبداللہ صبیغ ہوں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں عبداللہ عمر ہوں، پھر آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس جڑ کے ساتھ اس کے سر پر ضرب لگائی اور اسے زخمی کر دیا، پھر لگاتار اسے مارا یہاں تک کہ اس کا خون اس کے چہرے پر بہنے لگا، تو اس نے کہا: یہ کافی ہے اے امیر المومنین! قسم بخدا! جو میں اپنے سر میں پاتا تھا وہ نکل گیا ہے (1) اور اس کے ادب کے بارے میں روایات مختلف ہیں ان کا ذکر سورۃ الذاریات میں آئے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ کی طرف متوجہ کیا اور اسے اس کے دل میں ڈال دیا۔ پس اس نے توبہ کر لی اور اس کی توبہ انتہائی اچھی اور حسین تھی۔ اور ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ کا معنی ہے مومنین کے لئے التباس اور شبہات کو طلب کرنا تاکہ وہ ان کے درمیان فساد پیدا کر دیں اور وہ لوگوں کو اپنی کجی کی طرف لوٹا لائیں اور ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: ابۡتِغَآءَ تَاۡوِيۡلِهٖ کا معنی ہے کہ انہوں نے اپنے دوبارہ اٹھائے جانے اور زندہ کئے جانے کے بارے تاویل تلاش کی، تو اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمادیا کہ اس کی اور اس کے وقت کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا: اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا تَاۡوِيۡلَهٗ ؕ يَوۡمَ يَاۡتِىۡ تَاۡوِيۡلُهٗ یعنی جس دن وہ اسے دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے یعنی دوبارہ زندہ کیا جانا، قبروں سے اٹھایا جانا اور عذاب ...... يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ نَسُوۡهُ مِنۡ قَبۡلُ ...... یعنی انہوں نے تو اسے چھوڑ دیا ہے ...... قَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ (اعراف: 53) یعنی تحقیق ہم نے اس کی تاویل دیکھ لی جس کے بارے ہمیں رسل علیہم السلام نے آگاہ کیا تھا۔ فرمایا: پس وقف اس قول باری تعالیٰ پر ہے: وَمَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؕ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ دوبارہ کب اٹھایا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ، کہا جاتا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت جن میں حی بن اخطب بھی تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: ہمیں خبر پہنچی ہے کہ آپ پر الٓمّٓ نازل ہوئی ہے۔ پس اگر آپ اپنے قول میں سچے ہیں تو پھر آپ کی امت کی بادشاہی اکہتر برس ہوگی، کیونکہ حساب الجمل میں الف سے مراد ایک ہے، لام سے مراد تیس ہیں

1۔ سنن دارمی، کتاب مقدمہ باب، من ھاب الفتیا و کرہ التنطع والبدع، جلد اول، حدیث نمبر 144 مکتبہ مدینہ منورہ

اور میم سے مراد چالیس ہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی وَ مَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ اور یہاں تاویل بمعنی تفسیر ہوگا۔ جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: تاویل هذه الكلمة على كذا (یعنی اس کلمہ کی تفسیر اس معنی پر ہے) اور یہ مايؤول الأمر اليه کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے۔ (یعنی جس کی طرف امر لوٹتا ہے۔) اور اس کا اشتقاق آل الأمر إلى كذا يؤول اليه سے ہے یعنی بمعنی صار۔ اور اَوَّلْتُهٗ تَاْوِيْلاً بمعنی صَيَّرْتُهٗ ہے۔ (یعنی میں نے اس کی تاویل کی) اور بعض فقہاء نے اس کی تعریف کی اور کہا: هو ابداء احتمال فى اللفظ مقصود بدليل خارج عنه۔ یعنی کسی لفظ میں مقصود احتمال کو خارجی دلیل کے ساتھ ظاہر کرنا۔ اور تفسیر سے مراد لفظ کا بیان اور اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ یعنی اس میں کوئی شک نہیں۔ اور تفسیر کی اصل فسر ہے اور اس کا معنی بیان ہے، کہا جاتا ہے: فسرت الشئ (بالتخفیف) أفسره (بالکسر) فسرا اور تاویل معنی کا بیان ہوتا ہے، جیسا کہ یہ قول لا شك فيه عند المومنين یعنی مومنین کے نزدیک اس میں کوئی شک نہیں یا چونکہ یہ فی نفسہ حق ہے لہٰذا اس کی ذات شک کو قبول نہیں کرتی۔ اور بلاشبہ شک شک کرنے والے کا وصف ہے اور جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا دادا کے بارے میں اب (باپ) ہونے کا قول ہے، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں تاویل کی ہے: يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ۔ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ میں علماء کا اختلاف ہے، کیا یہ ابتداء کلام ہے اور اس کا ماقبل سے تعلق منقطع ہے، یا یہ اپنے ماقبل پر معطوف ہے اور واؤ جمع کے لئے ہے۔ اکثر کا موقف یہ ہے کہ یہ ماقبل سے منقطع ہے اور یہ کہ قول باری تعالیٰ اِلَّا اللّٰهُ پر پہلا کلام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہم اور کئی دوسروں کا ہے، اور یہی امام کسائی، اخفش فراء اور ابو عبید وغیرہم کا مذہب ہے۔ ابو نہیک اسدی نے کہا ہے: بے شک تم اس آیت کو ملاتے ہو حالانکہ یہ اس سے منقطع ہے۔ اور راسخین کے علم کی انتہا نہیں مگر ان کے اس قول پر اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا اور اسی کی مثل حضرت عمر بن عبد العزیز نے کہا ہے اور علامہ طبری نے اسی طرح یونس بن اشہب عن مالک بن انس سے بیان کیا ہے (1)۔ اور اس بنا پر يَقُوْلُوْنَ، الرّٰسِخُوْنَ کی خبر ہے۔

علامہ خطابی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ کتاب جس کے ساتھ ایمان لانے اور جس کی تصدیق کرنے کا ہمیں حکم ارشاد فرمایا ہے اس کی آیات کی دو قسمیں بنا دی ہیں، ایک محکم اور دوسری متشابہ۔ پس اللہ تعالیٰ نے قائل سے فرمایا: هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ؕۚ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا پس بتا دیا کہ کتاب میں متشابہ کو اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا ہے اور اس کے بغیر کوئی بھی اس کی تاویل کو نہیں جانتا، پھر اللہ تعالیٰ نے راسخین فی العلم کی تعریف بیان فرمائی کہ وہ کہتے ہیں ہم اس کے ساتھ ایمان لائے۔ اور اگر ان کی طرف سے ایمان صحیح نہ ہوتا تو وہ اس پر تعریف کے مستحق نہ ہوتے۔ اور اکثر علماء کا مذہب یہ ہے کہ اس آیت میں وقف تام اس قول پر ہے: وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ اور جو اس کے بعد ہے وہ دوسرا نیا کلام ہے اور وہ یہ قول ہے: وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 403، دار الکتب العلمیہ

اٰمَنَّا بِهٖ اور یہی حضرات ابن مسعود، ابی بن کعب، ابن عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

اور حضرت مجاہد سے یہ روایت ہے کہ الرّٰسِخُوْنَ کا اپنے ماقبل پر عطف نسق ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ بھی اس کا علم رکھتے ہیں۔ اور اس کے بارے میں بعض اہل لغت نے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: اس کا معنی ہے والراسخون فی العلم یعلمونہ قائلین امنا (راسخون فی العلم اسے جانتے ہیں درآنحالیکہ وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے) اور یہ گمان ہے کہ یَقُوْلُوْنَ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اور عام اہل لغت اس کا انکار کرتے ہیں اور اسے بعید سمجھتے ہیں، کیونکہ عرب فعل اور مفعول کو اکٹھا مضمر نہیں کرتے اور حال مذکور نہیں ہوتا مگر تبھی جب فعل ظاہر ہو اور جب فعل ظاہر نہیں تو وہ حال نہیں ہوسکتا اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ کہا جانا بھی جائز ہے۔ عبداللہ راکباً، یعنی اقبل عبداللہ راکباً۔ بلاشبہ فعل مذکور کے ساتھ یہ جائز ہوتا ہے جیسا کہ یہ قول: عبداللہ یتکلم یصلح بین الناس (عبداللہ کلام کر رہا ہے درآنحالیکہ وہ لوگوں کے درمیان صلح کرا رہا ہے۔) تو اس میں یصلح اس کے لئے حال ہے۔ اسی طرح شاعر کا قول ہے۔۔۔۔۔ ابوعمر نے یہ مجھے سنایا ہے اور اس نے کہا ہمیں ابوالعباس ثعلب نے سنایا ہے:

ارسلتُ فیها قَطِمًا لُکَالِکًا　　یَقْصُر یَمْشِی ویطول بَارِکَا

بمعنی یقصر ماشیاً (یعنی یمشی حال واقع ہو رہا ہے۔) پس عام علماء کا قول علمائے نحو کے مذاہب کی تائید سے اکیلے حضرت مجاہد کے قول سے اولیٰ اور ارجح ہے اور یہ بھی کہ یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوق سے کسی شے کی نفی کرے اور اسے اپنی ذات کے لئے ثابت کرے اور پھر اس میں کوئی اس کا شریک ہو۔ کیا آپ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں دیکھتے: قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (النمل: 65) (آپ فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے۔) اور یہ ارشاد: لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ (الاعراف: 187) (نہیں ظاہر کرے گا اسے اپنے وقت پر مگر وہی) اور یہ ارشاد: كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (القصص: 88) (ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے) پس یہ سب انہیں میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کیا ہے اور اپنے سوا کسی کو اس میں شریک نہیں کیا۔ اور اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ اور اگر "والراسخون" واؤ عطف نسق کے لئے ہو تو پھر اس قول کا کوئی فائدہ نہیں كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔ واللہ اعلم۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ خطابی نے بیان کیا ہے انہوں نے حضرت مجاہد وغیرہ کے قول کے سبب نہیں کہا، تحقیق انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ الرّٰسِخُوْنَ اسم جلالت پر معطوف ہے اور وہ بھی متشابہ کا علم رکھنے میں شامل ہیں۔ اور بلاشبہ وہ اس کے بارے اپنے علم کے ساتھ ہی کہتے ہیں اٰمَنَّا بِهٖ (ہم اس کے ساتھ ایمان لائے)، اور ربیع، محمد بن جعفر بن زبیر اور قاسم بن محمد وغیرہم نے یہی کہا ہے۔ اور اس تاویل پر یَقُوْلُوْنَ، الرّٰسِخُوْنَ سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے (1)، جیسا کہ شاعر نے کہا:

الریح　　تبکی　　شجوها　　والبرق　　یلمع　　فی　　الغمامه (2)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 403، دارالکتب العلمیہ

2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 5

یہ شعر دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے، پس یہ بھی جائز ہے کہ والبرق مبتدا ہو، اور تاویل اول کی بنا پر یلمع خبر ہو اور یہ ماقبل سے منقطع ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الریح پر معطوف ہو، اور یلمع دوسری تاویل کی بنا پر حال کے محل میں ہو بمعنی لامعا۔ اور یہ قول کرنے والوں نے بھی اس طرح استدلال کیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے رسوخ فی العلم کے ساتھ ان کی مدح کی، پس وہ کیسے ان کی مدح کر سکتا تھا جبکہ وہ جاہل اور ناواقف ہوتے؟ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: أنا ممن یعلم تأویلہ (1) (میں بھی ان میں سے ہوں جو اس کی تاویل جانتے ہیں) اور حضرت مجاہد نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا: انا ممن یعلم تأویلہ۔ اسے ان سے امام الحرمین ابوالمعالی نے بیان کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بعض علماء نے اس قول کو پہلے قول کی طرف ہی لوٹایا ہے اور کہا ہے: کلام مکمل ہو رہا ہے عند اللہ پر اس کا معنی ہے یعنی متشابہات کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور راسخون فی العلم اس کے بعض کو جانتے ہیں درآنحالیکہ وہ یہ کہتے ہیں ہم اس کے ساتھ ایمان لائے یہ سب ہمارے رب کی جانب سے ہے (اور ان کا یہ علم) ان دلائل کے سبب ہے جو محکم آیات میں بیان کئے گئے ہیں اور اسے اس کی قدرت دی گئی ہے جس نے اسے اس کی طرف لوٹایا ہے۔ پس جب انہوں نے بعض تاویل کو جان لیا اور بعض کو نہ جانا اور انہوں نے یہ کہا: ہم تمام کے ساتھ ایمان لائے یہ سب ہمارے رب کی جانب سے ہے، اور ان مخفی چیزوں میں سے جو اس کی شرع صالح میں ہیں جنہیں ہمارا علم محیط نہیں تو ان کا علم ہمارے رب کے پاس ہے۔ اور اگر کوئی کہنے والا کہے کہ راسخین پر بعض کی تفسیر مشتبہ ہوگئی۔ یہاں تک کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں نہیں جانتا الاواہ کیا ہے اور نہ جانتا ہوں کہ غسلین کیا ہے، تو کہا جائے گا: یہ کوئی الزام نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے بعد اسے جان لیا اور اس کی تفسیر بیان فرمائی جس پر واقف ہوئے۔ اور اس سے زیادہ پختہ اور مضبوط جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا وکل راسخ۔ کہ اس سے یہ ثابت ہو۔ پس جب ایک کو اس کا علم نہیں ہوا تو دوسرے نے اسے جان لیا۔ اور ابن فورک نے اسے ترجیح دی ہے کہ راسخون فی العلم تاویل جانتے ہیں اور انہوں نے اس میں خوب بیان کیا ہے (2) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد میں، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لئے ہے۔ اللھم فقھہ فی الدین و علمہ التاویل (3) (اے اللہ! اسے دین میں فقاہت عطا فرما اور اسے تاویل کا علم عطا فرما) وہ جسے تیرے لئے وہ بیان کرے، یعنی اسے اپنی کتاب کے معانی کا علم عطا فرما۔ اور اس بناء پر وقف وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ پر ہوگا۔ ہمارے شیخ ابوالعباس احمد بن عمر نے کہا ہے: اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ انہیں راسخین کا نام دینا اس کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس محکم سے زیادہ علم رکھتے ہیں جسے جاننے میں وہ تمام لوگ برابر ہوتے ہیں جو کلام عرب کو سمجھتے ہیں اور پھر کون سی شے میں ان کا رسوخ ہے جب وہ اتنا ہی جانتے ہیں جتنا سب جانتے ہیں! لیکن متشابہ متنوع قسم ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے جسے یقیناً کوئی نہیں جانتا جیسا کہ روح اور قیامت کا علم کہ یہ ان میں سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم غیب کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اور اس کا علم کوئی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 403، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً، صفحہ 404، دار الکتب العلمیہ

3۔ تاریخ بغداد للخطیب بغدادی، جلد 14، صفحہ 435، دار الکتب المصریۃ۔ ایضاً، بخاری، کتاب الوضو، حدیث 140، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نہیں حاصل کر سکتا نہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور نہ کوئی اور۔ پس حذاق اور متبحر علماء میں سے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ راسخین متشابہ کا علم نہیں رکھتے تو انہوں نے متشابہ کی اسی نوع کا ارادہ کیا ہے اور رہا وہ جسے وجوہ لغت پر اور کلام عرب کی طرز پر محمول کرنا ممکن ہوتا ہے تو اس میں تاویل کی جاسکتی ہے اور اس کی صحیح تاویل جانی جاسکتی ہے اور اس سے اسے زائل کیا جاسکتا ہے جس کا تعلق غیر صحیح تاویل کے ساتھ ہو، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قول: وَرُوْحٌ مِّنْهُ، الی غیر ذالك۔ پس کسی کو راسخ کا نام نہیں دیا جاسکتا مگر تبھی جب وہ (اللہ تعالیٰ کی جانب سے) دی گئی قدرت و استطاعت کے مطابق اس نوع میں سے کثیر کا علم رکھتا ہو۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ متشابہ سے مراد منسوخ ہے تو اس قول کی بنا پر راسخین کو تاویل کے علم میں داخل کرنا صحیح ہے لیکن متشابہات کو اس نوع کے ساتھ خاص کرنا صحیح نہیں ہے (1)۔

الرُّسُوْخ کا معنی ہے کسی شے میں ثابت ہونا۔ اور ہر ثابت راسخ ہوتا ہے۔ اور اجرام میں اس کی اصل یہ ہے کہ اس نے پہاڑ اور درخت زمین میں راسخ کر دیئے (2)، شاعر نے کہا ہے:

لقد رَسَخَتْ فی الصدر منّی مودّةٌ　　لِلَیلَی اَبَتْ آیاتها اَنْ تَغَیَّرَا

میری طرف سے لیلیٰ کے لئے محبت سینے میں راسخ ہوگئی اس کی علامات نے انکار کر دیا کہ وہ متغیر ہوں۔

اور رسخ الایمان فی قلب فلان یَرْسخ رسوخاً۔ فلاں کے دل میں ایمان راسخ ہو گیا۔

اور بعض نے بیان کیا ہے: رسخ الغدیر: اس کا معنی ہے تالاب کا پانی بہہ پڑا۔ اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے پس یہ اضداد میں سے ہے۔

اور رَسَخَ و رَضَخَ و رَصَنَ و رَسَبَ تمام ثبت فیه کے معنی میں ہیں۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راسخین فی العلم کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''وہ وہ ہے جس کی قسم سچی ہو، اس کی زبان سچ بولے اور اس کا دل مستقیم اور سیدھا ہو۔'' هو من برّت یمینه و صدق لسانه و استقام قلبه (3) اور اگر کہا جائے: قرآن کریم میں متشابہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل: 44) (اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف) تو اللہ تعالیٰ نے کیونکر تمام قرآن کو واضح نہیں بنایا؟ تو اسے کہا جائے گا: حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے بظاہر اس میں حکمت علماء کی فضیلت کا اظہار ہے، کیونکہ اگر سارا قرآن واضح ہوتا تو علماء میں سے بعض کی بعض پر فضیلت ظاہر نہ ہوتی۔ اور اسی طرح وہ کرتا ہے جو کوئی شے تصنیف کرتا ہے کہ اس کے بعض مقامات کو واضح ذکر کرتا ہے اور بعض کو مشکل بنا دیتا ہے اور اس میں (علماء کی) جماعت کے لئے جگہ چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ وہ شے جسے پانا آسان ہو اس کی قدر و قیمت کم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا اس میں ضمیر ہے جو کتاب اللہ کے محکم و متشابہ سبھی کی طرف لوٹ رہی ہے اور تقدیر عبارت ہے: کله من عند ربنا۔ اور لفظ کُلٌ کے اس پر دلالت کرنے کی وجہ سے ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے،

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 404، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً، صفحہ 404　　3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 217

کیونکہ یہ لفظ اضافت کا تقاضا کرتا ہے۔ پھر فرمایا: وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ یعنی صاحب عقل ہی یہ کہتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور جہاں وقف ہو وہاں وقف کرتا ہے اور متشابہ کی اتباع چھوڑ دیتا ہے۔ اور لب کا معنی عقل ہے اور لُبّ کل شئ سے مراد ہر شے کا مغز اور اس کا خالص ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے عقل کو لب کہا گیا ہے اور اُولو، ذُو کی جمع ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

''اے ہمارے رب! نہ ٹیڑھے کر ہمارے دل بعد اس کے کہ تو نے ہدایت دی ہمیں اور عطا فرما ہمیں اپنے پاس سے رحمت بے شک تو ہی سب کچھ بہت زیادہ دینے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا اس کلام میں حذف ہے۔ تقدیر کلام ہے یقولون وہ کہتے ہیں۔ اور یہ راسخین کی جانب سے بطور حکایت ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ معنی اس طرح ہو قل یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہئے) اور کہا جاتا ہے: ازاغۃ القلب (دل کو ٹیڑھا کرنے) سے مراد فساد برپا کرنا اور دین سے اعراض برتنا ہے۔ کیا وہ خوفزدہ ہو رہے تھے حالانکہ انہیں ہدایت دے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ انہیں فساد کی طرف منتقل کر دے گا؟ تو جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی فرما دی تو وہ یہ التجا کرنے لگے کہ وہ انہیں اعمال میں سے کسی ایسے عمل کے ساتھ نہ آزمائے جو ان پر ثقیل اور بھاری ہو اور وہ اس سے عاجز آ جائیں، جیسا کہ ارشاد ہے: وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ (النساء: 66) (اور اگر ہم فرض کر دیتے ان پر کہ قتل کرو اپنے آپ کو یا نکل جاؤ اپنے اپنے گھروں سے۔)

ابن کسان نے کہا ہے: انہوں نے التجا کی کہ وہ ٹیڑھے نہ ہو جائیں کہ پھر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دے، جیسے یہ ارشاد ہے: فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصف: 5) (پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا) یعنی تو ہمیں اپنی ہدایت پر ثابت قدم رکھ جب تو نے ہمیں ہدایت عطا فرما دی ہے اور یہ کہ ہم ٹیڑھے نہ ہو جائیں کہ ہم مستحق بن جائیں کہ تو ہمارے دلوں کو ٹیڑھا کر دے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ماقبل کلام سے منقطع ہے اور وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے اہل الزیغ (ٹیڑھا ہونے والے) کا ذکر کیا تو اس کے پیچھے اسے لائے کہ اس کے ساتھ اپنے بندوں کو اپنی بارگاہ سے مانگنے کی دعا سکھائی کہ وہ اس برے گروہ میں سے نہ ہو جائیں جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور وہ اہل زیغ ہیں۔

اور المؤطا میں حضرت ابوعبداللہ الصنابحی سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا اور مغرب کی نماز آپ کے پیچھے ادا کی، تو آپ نے پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ قصار مفصل میں سے ایک سورت کی قرأت کی، پھر جب تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے تو میں آپ کے اتنا قریب تھا کہ میرے کپڑے آپ کے کپڑوں کے ساتھ مس کرنے کے قریب ہو گئے، تو میں نے آپ کو سورۂ فاتحہ کے ساتھ یہ

آیت رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا الآیہ پڑھتے ہوئے سنا (1)۔ علماء نے کہا ہے: آپ کا یہ آیت پڑھنا قنوت اور دعا کی ایک قسم ہے کیونکہ آپ کے دور میں مرتدین کا معاملہ (خاصا پریشان کن) تھا۔ اور اہل علم کی ایک جماعت کے نزدیک مغرب کی نماز میں قنوت پڑھنا جائز ہے اور ہر نماز میں بھی جب مسلمانوں پر ایسا شدید امر چھا جائے جو انہیں خوفزدہ اور مضطرب کر دے اور وہ اس سے اپنے آپ پر خوف محسوس کرنے لگیں۔

اور ترمذی نے شہر بن حوشب کی حدیث روایت کی ہے انہوں نے بیان کیا میں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو کہا: اے ام المومنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر کون سی دعا مانگا کرتے تھے جب آپ کے پاس ہوتے؟ تو انہوں نے بیان فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر دعا یہ ہوتی یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینك (اے دلوں کو بدلنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ) تو میں عرض کرتی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اکثر یہ دعا مانگتے ہیں یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینك! تو آپ نے فرمایا: یا أم سلمة انه لیس آدمی الا و قلبه بین اصبعین من أصابع الله فمن شاء اقام و من شاء أزاغ (اے ام سلمہ! بے شک کوئی آدمی نہیں مگر اس کا دل رب العالمین کے دست قدرت کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے پس وہ جسے چاہے اسے سیدھا رکھے اور جسے چاہے ٹیڑھا کر دے) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے (2) اور یہ آیت معتزلہ کے اس قول میں ان کے خلاف حجت ہے: بے شک اللہ تعالیٰ بندوں کو گمراہ نہیں کرتا۔ اگر دلوں کو ٹیڑھا کرنا اس کی جانب سے نہ ہوتو پھر یہ جائز نہیں کہ اسے دور کرنے کے بارے دعا، اس سے کی جائے جس پر اس کا کرنا جائز ہی نہیں ہوتا۔

ابو واقد الجراح نے رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا فعل کی نسبت قلوب کی طرف کرتے ہوئے قرأت کی اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف انتہائی رغبت اور میلان ہے اور دونوں قرأتوں پر آیت کا معنی یہ ہے کہ تیری جانب سے زیغ (ٹیڑھا پن) کو دلوں میں پیدا کرنا نہ ہو کہ وہ ٹیڑھے ہو جائیں (3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً یعنی اپنے پاس سے اور اپنی جانب سے فضل و رحمت عطا فرمانا کہ ہمارے کسی سبب سے اور نہ عمل سے۔ اس میں تابعداری اور عجز و انکساری کا اظہار ہے (4)۔ اور لَدُنْ میں چار لغتیں ہیں۔ ایک لَدُنْ یعنی لام کے فتحہ، دال کے ضمہ اور نون کی جزم کے ساتھ۔ اور یہی زیادہ فصیح ہے۔ اور دوسری لام کے فتحہ، دال کے ضمہ اور نون کے حذف کے ساتھ (یعنی لَدُ)، اور تیسری لام کے ضمہ، دال کی جزم اور نون کے فتحہ کے ساتھ (یعنی لُدْنَ) اور چوتھی لام کے فتحہ، دال کے سکون اور نون کے فتحہ کے ساتھ (یعنی لَدْنَ)

شاید جاہل متصوفہ اور زنادقہ باطنیہ اس آیت اور اس کی مثل آیات سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں: علم تو وہی ہے جو بغیر کسب کے ابتداءً اللہ تعالیٰ عطا فرمائے اور کتابوں اور اوراق میں دیکھنا تو حجاب ہے۔ یہ (نظریہ) مردود ہے اس کا بیان

1۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، صفحہ 63، وزارت تعلیم، اسلام آباد
2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 190
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 404، دار الکتب العلمیہ
4۔ ایضاً

اپنے محل میں آئے گا۔

اور آیت کا معنی ہے: ہمیں رحمت سے صادر ہونے والی نعمتیں عطا فرما، کیونکہ رحمت صفت ذات کی طرف راجع ہے اور اس میں ہبہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا (1)۔ کہا جاتا ہے: وَهَبَ يَهَبُ، یہ اصل میں يَوْهِبُ ھا کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور جس نے کہا ہے کہ یہ يَوْهَبُ ھا کے فتحہ کے ساتھ ہے تو اس نے خطا اور غلطی کی ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا جیسے اس نے کہا ہے تو پھر واؤ حذف نہ ہوتی، جیسا کہ يَوْجَلُ میں حذف نہیں ہوئی۔ بلاشبہ واؤ کسرہ اور یا کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے حذف کر دی گئی پھر اس کے حذف کے بعد کسرہ کو فتحہ میں بدل دیا گیا کیونکہ اس میں ھا حروف حلقی میں سے ایک ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

"اے ہمارے پروردگار! بے شک تو جمع کرنے والا ہے سب لوگوں کو اس دن کے لئے نہیں کوئی شبہ جس (کے آنے) میں، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پھرتا اپنے وعدہ سے۔"

یعنی تو لوگوں کے متفرق ہونے کے بعد انہیں اٹھانے والا اور انہیں لانے والا ہے اور اس میں قیامت کے دن کے لئے دوبارہ اٹھائے جانے کا اقرار ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہی وہ تاویل ہے جس کا علم راسخین فی العلم کو ہوا اور انہوں نے اس کا اقرار کیا اور انہوں نے اختلاف کیا جنہوں نے اس کی اتباع کی جو ان پر دوبارہ اٹھائے جانے کے معاملہ میں مشتبہ ہو گیا یہاں تک کہ انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اور الرَّيْبُ کا معنی شک ہے (2) اور اس کے محامل (محمول ہونے کے محل) سورۃ البقرہ میں گزر چکے ہیں، اور میعاد مفعال کے وزن پر الوعد سے ماخوذ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝

"بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے کچھ بھی۔ اور وہی (بدبخت) ایندھن ہیں آگ کا۔"

اس کا معنی بین اور واضح ہے۔ یعنی ان کے اموال اور نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے عذاب میں سے کوئی شے ہرگز ان سے دور نہ کر سکیں گے۔ اور سلمی نے لن يُغْنِيَ یاء کے ساتھ پڑھا ہے (3)۔ اس لئے کہ فعل متقدم ہے اور فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ موجود ہے اور حسن نے يُغْنِيْ یاء کے ساتھ قرات کی ہے مگر آخری یا کو تخفیف کے لئے ساکن کر دیا ہے۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

كفى باليأس من اسماء كافٍ　　　و ليس لِسُقْمِهَا اذ طال شاف

اس میں حق یہ تھا کہ وہ کافیا کہتا۔ پس اس نے یا کو چھوڑ دیا۔

اور اسی کی مثل فرا نے شعر کہا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 405، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

كانّ أيدِيهِنّ بالقاعِ القرِقِ أيدِى جَوَارٍ يَتَعَاطَيْنَ الورِق

القرِقُ اور القرِقَة القاع میں دونوں لغتیں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد مِنَ اللهِ میں مِنْ بمعنی عند ہے، ابوعبید نے یہی کہا ہے۔ أُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ، الوقود یہ جلنے والی لکڑی کا اسم ہے اور سورۃ البقرہ میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ حسن، مجاہد اور طلحہ بن مصرف نے وُقُود واؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام ہے حطب وُقود النار۔(1) اور عرب کلام میں یہ جائز ہے کہ جب واؤ مضموم ہو تو اسے ہمزہ سے بدل دیا جائے لہٰذا اُقُود پڑھنا جائز ہے جیسا کہ اُقِتَتْ۔

اور وُقود واؤ کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے اور وَقَدَت النار تقد کہا جاتا ہے جب آگ بھڑک اٹھے۔ ابن مبارک نے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ دین غالب آئے گا یہاں تک کہ سمندروں کو عبور کر لے گا اور یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد کرتے ہوئے) گھوڑے سمندروں میں ڈال دیے جائیں گے، پھر کچھ قومیں آئیں گی وہ قرآن کریم پڑھیں گے اور جب وہ اسے پڑھیں گے تو کہیں گے: کون ہم سے بڑھ کر قاری ہے اور کون ہم سے بڑھ کر عالم ہے؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم ان میں کوئی خیر اور بھلائی دیکھتے ہو؟ انہوں نے عرض کی: نہیں۔ تو آپ نے فرمایا: ''وہ تم میں سے ہوں گے اور وہ اس امت میں سے ہوں گے اور وہی آگ کا ایندھن ہوں گے (2)''۔

كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ⑪

''(ان کا طریقہ) مثل طریقہ آل فرعون کے اور ان لوگوں کے تھا جو ان سے پہلے تھے انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو پس پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔''

الدأب کا معنی عادت اور طریقہ ہے۔ اور دأب الرجل فی عملہ یدأب دأبا و دؤبا کہا جاتا ہے جب وہ اپنے کام میں کوشش کرے اور خوب محنت کرے اور أدابتہ أنا اور أداب بعیرہ جب وہ اونٹ کو چلانے میں خوب تھکا دے۔ اور الدائبان سے مراد رات اور دن ہیں۔ ابوحاتم نے کہا ہے: میں نے یعقوب کو یہ ذکر کرتے ہوئے سنا ہے كَدَأَبِ کہ یہ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اور انہوں نے مجھے کہا درآنحالیکہ میں نوجوانی کی حالت میں تھا۔ کون سی شے پر كَدَأَب جائز ہو سکتا ہے؟ تو میں نے کہا: میرا گمان ہے کہ یہ دَئِبَ يَدْأَب دَأَباً سے ہے۔ تو انہوں نے میری بات کو قبول کر لیا اور میرے چھوٹا ہونے کے باوجود میری عمدہ وضاحت پر اظہار تعجب و مسرت کیا اور میں نہیں جانتا کیا یہ کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ نحاس نے کہا ہے: یہ قول غلط ہے، بالیقین دَئِبَ نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ کہا جائے گا دَأَبَ يَدْأَب دُؤُباً [ودَأْباً]، اسی طرح نحویوں نے بھی بیان کیا ہے، ان میں سے امام فراء نے اسے کتاب المصادر میں بیان کیا ہے، جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 405، دارالکتب العلمیہ		2۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 212، حدیث نمبر 29121

كَدَأْبِكَ مِنَ أُمِّ الْحُوَيْرِثِ قَبْلَهَا　وجارتِهَا أُمِّ الرَّبَابِ بِمَأْسَلِ

پس رہا الدأب تو یہ کہنا جائز ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: شَعْرٌ و شَعَرٌ، نَهْرٌ و نَهَرٌ کیونکہ اس میں حروف حلقی میں سے ایک حرف ہے، البتہ الکاف میں اختلاف ہے، بعض نے کہا ہے: یہ محل رفع میں ہے تقدیر کلام ہے دَأْبُهُمْ كَدَأْبِ آلِ فرعون، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفار کا رویہ اسی طرح ہے جیسے آل فرعون کا رویہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ اور فراء کا خیال ہے کہ معنی یہ ہے: عرب آل فرعون کے کفر کی طرح کافر ہو گئے۔ نحاس نے بیان کیا ہے: یہ جائز نہیں کہ کاف کفروا کے متعلق ہو، کیونکہ کفروا صلہ میں داخل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اَخَذَهُمُ اللّٰهُ کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں شدید پکڑ لیا جیسا کہ اس نے آل فرعون کو پکڑا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس ارشاد کے متعلق ہے: لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ یعنی انہیں دولت نے کوئی فائدہ نہ دیا جیسا کہ آل فرعون کو ان کے مال اور اولاد نے کوئی فائدہ نہ دیا۔ اور یہ ان کے لئے جواب ہے جو جہاد سے پیچھے رہ گئے۔ اور انہوں نے کہا: ہمارے مالوں اور ہمارے گھر والوں نے ہمیں مشغول رکھا۔

اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس میں لفظ وقود سے مقدر شدہ کوئی فعل عامل ہو۔ اور تشبیہ نفس احتراق (جلنے) میں ہو۔ اور اس معنی کی تائید اس ارشاد سے ہوتی ہے۔ وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا ۚ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ (المومن) (اور ہر طرف سے گھیر لیا فرعونیوں کو سخت عذاب نے۔ دوزخ کی آگ ہے پیش کیا جاتا ہے انہیں اس پر صبح و شام اور جس روز قیامت قائم ہو گی (حکم ہو گا) داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں)

پہلا قول ارجح ہے(1) اور علماء میں سے کئی ایک نے اسے اختیار کیا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ کا معنی ہے جیسا کہ آل فرعون کی عادت اور رویہ تھا، وہ کہہ رہے ہیں: ان کافروں کا الحاد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرکشی اور سختی کا رویہ اسی طرح ہے جیسا کہ آل فرعون نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ سرکشی اور سختی کا رویہ اپنایا اور کہا: یہ معنی ازہری نے بیان کیا ہے۔ اور رہا وہ قول جو سورۃ الانفال میں ہے كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ تو اس کا معنی یہ ہے کہ انہیں قتل اور قید کی سزا دی گئی جیسا کہ آل فرعون کو غرق اور ہلاکت کی سزا دی گئی۔

قولہ تعالیٰ: بِاٰيٰتِنَا یہ احتمال رکھتا ہے کہ مراد وہ آیات ہوں جن کی تلاوت کی گئی ہے (یعنی آیات متلوہ) اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ مراد وہ آیات ہوں جو وحدانیت پر بطور دلیل بیان کی گئی ہیں۔ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (پس پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔)

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

"(اے میرے رسول!) فرما دو ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا کہ عنقریب تم مغلوب کئے جاؤ گے اور ہانکے جاؤ گے جہنم کی طرف اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے"۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 405، دار الکتب العلمیہ

كَفَرُوْا سے مراد یہودی ہیں۔ محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے: جب رسول اللہ ﷺ نے میدان بدر میں قریش کو شکست سے دو چار کیا (اور فتح و کامرانی کے ساتھ) مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نے یہودیوں کو جمع کیا اور فرمایا: ''اے گروہ یہود! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اس کی مثل عذاب سے جو اس نے بدر کے دن قریش پر نازل کیا قبل اس کے کہ وہ تم پر بھی وہی نازل کرے جو ان پر نازل کیا۔ تحقیق تم جانتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجا ہوا نبی ہوں تم اسے اپنی کتاب میں بھی پاتے ہو اور اللہ تعالیٰ نے تم سے عہد بھی لے رکھا ہے۔'' تو انہوں نے کہا: اے محمد! (ﷺ) تجھے یہ بات دھوکہ نہ دے کہ تو نے ان لوگوں کو قتل کیا جو ناتجربہ کار تھے وہ فنون جنگ سے ناواقف تھے، پس تم نے ان میں (قتل و غارت) کا موقع پالیا! قسم بخدا اگر تم نے ہمارے ساتھ جنگ چھیڑی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کتنے (بہادر اور تجربہ کار) لوگ ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ تا کے ساتھ اور مراد یہود ہیں یعنی تمہیں شکست فاش سے دو چار کر دیا جائے گا۔ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ اور تمہیں آخرت میں جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ یہ عکرمہ اور سعید بن جبیر کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے(1)۔ اور آپ ہی سے ابو صالح کی روایت میں ہے کہ یہودی جب خوش ہوئے اس تکلیف اور اذیت سے جس سے مسلمان غزوہ احد کے دن دو چار ہوئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ پس اس بنا پر سَيُغْلَبُوْنَ یا کے ساتھ، مراد قریش ہیں وَيُحْشَرُوْنَ یا کے ساتھ یعنی دونوں لفظ یا کے ساتھ ہیں اور یہ حضرت نافع کی قرأت ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَبِئْسَ الْمِهَادُ مراد جہنم ہے یہی آیت کا ظاہر معنی ہے اور مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے برا ہے وہ جو انہوں نے اپنے لئے ٹھکانا بنایا، تو گویا معنی یہ ہوا: ان کا وہ فعل بہت برا ہے جس نے انہیں جہنم تک پہنچا دیا(2)۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝

''بے شک تھا تمہارے لئے (عبرت کا) نشان (ان) دو گروہوں میں جو ملے تھے (میدان بدر میں) ایک گروہ لڑتا تھا اللہ کی راہ میں اور دوسرا کافر تھا دیکھ رہے تھے (مسلمان انہیں) اپنے سے دو چند (اپنی) آنکھوں سے اور اللہ مدد کرتا ہے اپنی نصرت سے جس کی چاہتا ہے یقیناً اس واقعہ (بدر) میں بہت بڑا سبق ہے آنکھ والوں کے لئے۔''

قولہ تعالیٰ: قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ، اٰيَةٌ کا معنی علامت ہے۔ اور یہاں كَانَ فرمایا كانت نہیں فرمایا، کیونکہ اٰيَةٌ کی تانیث غیر حقیقی ہے اور کہا گیا ہے: اسے بیان کی طرف لوٹایا گیا ہے۔ یعنی قد کان لکم بیان (بے شک تمہارے لئے بیان اور وضاحت تھی)

1۔ اسباب النزول للنیسابوری، جلد 1، صفحہ 62۔ ایضاً، ابی داؤد، باب کان اخراج الیہود من المدینہ، حدیث 2607، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 406، دار الکتب العلمیہ

تو اس میں معنی کو اپنایا گیا ہے اور لفظ کو چھوڑ دیا گیا ہے: جیسا کہ امری القیس کا قول ہے:

بَرَهْرَهَةٌ رُؤْدَةٌ رَخْصَةٌ كخُرْعُوبَة البَانَةِ الْمُنْفَطِر

اور اس میں المنفطرۃ نہیں کہا، کیونکہ انہوں نے قضیب کے معنی کو پیش نظر رکھا ہے۔

اور فراء نے کہا ہے: اسے مذکر ذکر کیا ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان صفت سے فاصلہ کیا گیا ہے اور جب اسم اور فعل کے درمیان صفت حائل ہوگئی تو فعل مذکر لایا گیا۔ اور یہ معنی سورۃ البقرہ میں اس قول کے تحت گزر چکا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ (البقرہ:180) (فرض کیا گیا ہے تم پر جب قریب آ جائے تم میں سے کسی کے موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال کہ وصیت کرے) فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا یعنی مسلمانوں اور مشرکوں کے دو گروہ جو بدر کے دن ملے تھے۔ فِئَةٌ جمہور نے فِئَةٌ رفع کے ساتھ پڑھا ہے بمعنی احدا هما فِئَةٌ۔

اور حسن اور مجاہد نے فِئَةٍ جر کے ساتھ پڑھا ہے وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٍ کو بدل ہونے کی بنا پر جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن ابی عبلہ نے دونوں میں نصب پڑھی ہے (1)۔

احمد بن یحییٰ نے کہا ہے: حال ہونے کی بنا پر نصب پڑھنا جائز ہے، یعنی التقتا مختلفتین مؤمنۃ و کافرۃ۔ زجاج نے کہا ہے: نصب پڑھی گئی ہے بمعنی اعنی۔ اور لوگوں کی جماعت کو فئۃ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے شدت اور تکلیف کے وقت۔

اور زجاج نے کہا ہے: الفئۃ کا معنی جدا کرنا اور علیحدہ کرنا ہے اور یہ فَأَوْتُ رَأْسَهُ بالسیف سے ماخوذ ہے۔ (یعنی میں نے تلوار کے ساتھ اس کا سر جدا کر دیا۔) اور کہا جاتا ہے: فأیته۔ (یہ تب کہے گا) جب تو اسے پھاڑ دے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ان دونوں گروہوں سے اشارہ ان کی طرف ہے جو غزوہ بدر کے دن ملے تھے (2)۔ اور اس کے مخاطب کے بارے میں اختلاف ہے۔

پس کہا گیا ہے: اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ مومنوں کو اس کے ساتھ خطاب کیا گیا ہو، یہ احتمال بھی ہے کہ خطاب تمام کفار کو کیا گیا ہو اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے ساتھ مدینہ طیبہ کے یہودیوں کو خطاب کیا گیا ہو۔ اور ان میں سے ہر احتمال کے مطابق قوم نے قول کیا ہے (3)۔ اور مومنین کو خطاب کا فائدہ نفوس کو ثابت قدم رکھنا اور انہیں تشجیع دلانا ہے یہاں تک کہ وہ دو چند اور کئی چند ہو کر آگے بڑھے، جیسا کہ واقع ہوا ہے۔

قولہ تعالیٰ: يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ ابوعلی نے کہا ہے: اس آیت میں رؤیت سے مراد آنکھ کے ساتھ دیکھنا ہے۔ اسی لئے یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے (4)۔ مکی اور مہدوی نے کہا ہے: اس پر رَأْيَ الْعَيْنِ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ اور نافع نے تَرَوْنَهُمْ تا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، صفحہ 407
3۔ ایضاً، صفحہ 406
4۔ ایضاً، صفحہ 407

نے یا کے ساتھ۔ مِّثْلَيْهِمْ کو تَرَوْنَهُمْ میں ھا اور میم سے حال ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے۔ اور جمہور لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ ترون کا فاعل مومنین ہیں۔ اور اس کے ساتھ ضمیر متصل کفار کے لئے ہے(1)۔

اور ابوبکر نے اس کا انکار کیا ہے کہ اسے ترونهم تا کے ساتھ پڑھا جائے۔ انہوں نے کہا ہے۔ اور اگر اس طرح ہوتا تو پھر مِثْلَيْكُمْ ہوتا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ لازم نہیں آتا، لیکن یہ جائز ہے کہ وہ مثلی اصحابکم ہو۔ مکی نے کہا ہے: تَرَوْنَهُمْ تا کے ساتھ لَكُمْ میں خطاب کی بنا پر واقع ہوا ہے۔ اور اچھا یہ ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں کو ہو۔ اور ھا اور میم (ھم) مشرکین کے لئے ہو۔ اور جنہوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ مثلیکم کاف کے ساتھ پڑھیں اور یہ خط کی مخالفت کی وجہ سے جائز نہیں ہے، لیکن یہ کہ کلام خطاب سے غیب کی طرف نکلنے پر واقع ہو، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ اور یہ ارشاد ہے: وَ مَاۤ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ پس پہلے خطاب کیا پھر فرمایا: فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (روم: 39) اور غیب کی طرف رجوع کیا۔

پس مِّثْلَيْهِمْ میں ھا اور میم احتمال رکھتے ہیں کہ وہ مشرکین کے لئے ہو، یعنی اے مسلمانو! تم مشرکوں کو دو چند دیکھ رہے تھے اس تعداد سے جس پر وہ تھے اور معنوی طور پر یہ بعید ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نگاہوں میں مشرکوں کو زیادہ نہیں کیا، بلکہ اس نے ہمیں یہ بتایا کہ اس نے انہیں مومنین کی نگاہوں میں کم کر دیا، پس معنی یہ ہوگا: اے مومنین! تم مشرکوں کو تعداد میں اپنے سے دو چند دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ ان سے تین گنا تھے، پس اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو مسلمانوں کی نظروں سے کم کر دیا اور انہیں اپنی تعداد سے دوگنا مشرکین دکھائے تاکہ ان کے دل قوی اور مضبوط ہو جائیں اور ان میں جرأت و دلیری آ جائے۔ اور انہیں یہ بتا دیا گیا تھا کہ ان میں سے سو افراد دو سو کافروں پر غالب آ جائیں گے۔ اور مسلمانوں کو مشرکین کی نظروں میں کم کر دیا تاکہ وہ ان پر حملے کی جرأت کریں اور پھر ان میں اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلہ نافذ ہو۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ مِّثْلَيْهِمْ میں ضمیر مسلمانوں کے لئے ہو یعنی اے مسلمانو! تم مسلمانوں کو اس تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے جس پر تم تھے۔ یعنی تم اپنے آپ کو اپنی تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ایسا اس لئے کیا تاکہ ان کے نفوس مشرکین کے ساتھ مقابلہ کے لئے قوی اور طاقتور ہو جائیں۔ پہلی تاویل اولیٰ اور ارجح ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا (الانفال: 43) (یاد کرو جب دکھایا اللہ نے آپ کو لشکر کفار خواب میں قلیل)

اور یہ ارشاد: وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا (الانفال: 44) (اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے دکھایا تمہیں لشکر کفار جب تمہارا مقابلہ ہوا تمہاری نگاہوں میں قلیل) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے اپنے پہلو میں ایک آدمی کو کہا: کیا تو انہیں ستر دیکھ رہا ہے؟ تو اس نے کہا: میں انہیں سو گمان کر رہا ہوں۔ پس جب ہم نے قیدیوں کو پکڑا تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ ہزار تھے(2)۔ اور علامہ طبری نے ایک قول سے بیان کیا ہے کہ انہوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 407، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

نے کہا: بلکہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کی نظروں میں مومنین کی تعداد کو زیادہ کر دیا یہاں تک کہ وہ ان کے نزدیک ان سے دو گنا تھے۔ اور طبری نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اسی طرح کئی جہتوں سے یہ مردود ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو مومنوں کی نگاہوں میں کم کر دیا تھا جیسا کہ گزر چکا ہے (1)۔ اور اس تاویل کی بنا پر ہو تو ترونَ کافروں کے لئے ہو گا یعنی اے کافرو! تم مومنوں کو ان کی اصلی تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ تم انہیں اپنے سے دو گنا دیکھ رہے تھے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور فراء نے گمان کیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تم انہیں دو گنا دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ تین گنا تھے۔ اور یہ بعید ہے لغت میں غیر معروف ہے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ باب الغلط ہے۔ اس میں غلطی تمام قیاسوں میں ہے، کیونکہ ہم کسی شے کی مثل کو اس کا مساوی سمجھتے ہیں اور ہم اس کی دو مثل اسے سمجھتے ہیں جو دو بار اس کے مساوی ہوتی ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: فراء نے اس کا قول بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: جیسا کہ تو کہتا ہے اور تیرے پاس غلام ہو کہ میں اس کی مثل کا محتاج ہوں۔ پس تو اس کا اور اس کی مثل کا محتاج ہو گا۔ اور تو یہ کہے: میں اس کی دو مثل کا محتاج ہوں، تو تو تین گنا کا محتاج ہو گا اور معنی اور لغت اس کے خلاف ہے جو اس نے کہا۔

اور وہ جو فراء نے اس میں بیان کیا ہے کہ مشرکین غزوۂ بدر کے دن مومنین سے تین گناہ تھے۔ پس اسے یہ وہم ہوا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ وہ انہیں دیکھ رہے ہوں مگر ان کی اسی تعداد پر (جس پر وہ تھے) اور یہ بعید ہے اور معنی اس کے مطابق نہیں ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو اعتبار سے ان کی تعداد بدل کر دکھائی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اس میں نفع اور فائدہ دیکھا، کیونکہ مومنین کے دل اس کے ساتھ قوی ہو جائیں گے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علامت و نشانی ہو جائے۔ اس کا ذکر عنقریب واقعہ بدر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور رہی یا کی قرأت تو ابن کیسان نے کہا ہے: یَرَوْنَهُمْ میں ھا اور میم (یعنی ھم ضمیر) وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور مِّثْلَيْهِمْ میں ھا اور میم فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ پر عائد ہے اور اضمار میں سے یہ وہ ہے جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔

پس یہ اس پر دلیل ہے کہ کافر دکھائی دینے میں مسلمانوں کی دو مثل تھے حالانکہ تعداد میں وہ تین مثل تھے، فرمایا یہاں رؤیت یہود کے لئے ہے اور مکی نے کہا ہے: یہاں رؤیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کرنے والے گروہ کے لئے ہے اور جس کو دیکھا گیا وہ کافروں کا گروہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا گروہ کافروں کے گروہ کو مومنین کے گروہ کا دو گنا دیکھ رہا تھا حالانکہ کافروں کا گروہ مومنین سے تین گناہ تھا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی نظروں میں کم کر دیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور لَكُمْ میں خطاب یہودیوں کے لئے ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور طلحہ رضی اللہ عنہم نے تَرَوْنَهُمْ تا کو ضمہ کے ساتھ اور سلمی نے تا مضمومہ کے ساتھ فعل مجہول کی بنا پر پڑھا ہے (2)۔ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 407، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً صفحہ 406

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝

''آراستہ کی گئی لوگوں کے لئے ان خواہشوں کی محبت یعنی عورتیں اور بیٹے اور خزانے جمع کئے ہوئے سونے اور چاندی کے اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے اور چوپائے اور کھیتی یہ سب کچھ سامان ہے دنیوی زندگی کا اور اللہ ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔''

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: زُيِّنَ لِلنَّاسِ زُيِّنَ تزیین سے ہے۔ اور آراستہ کرنے والے کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے، ایک گروہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے آراستہ کیا ہے اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قول کا ظاہر معنی یہی ہے، اسے بخاری نے ذکر کیا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا (الکہف: 7) (بے شک ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں ان کے لئے باعث زینت)

اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے میرے رب! اس وقت تو نے اسے ہمارے لئے آراستہ کیا ہے! پھر یہ آیت نازل ہوئی قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ (آل عمران: 15) (آپ فرمایئے کیا بتاؤں میں تمہیں اس سے بہتر چیز)

اور ایک گروہ نے کہا ہے: آراستہ کرنے والا شیطان ہے اور حضرت حسن کے قول کا ظاہر یہی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: کس نے اسے آراستہ کیا ہے؟ اس کے خالق سے زیادہ شدید اس کی مذمت کرنے والا کوئی نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی تزیین یہ ہے کہ اس نے اسے ایجاد کیا اور نفع کے لئے اسے تیار کیا اور ان اشیاء کی طرف میلان فطرت میں رکھ دیا۔ اور شیطان کی تزیین یہ ہے کہ اس نے وسوسہ اندازی کی دھوکے میں مبتلا کیا اور بغیر اسباب کے انہیں لینے کو حسین قرار دیا۔ اور آیت دونوں وجهوں پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں تمام لوگوں کے لئے وعظ و نصیحت ہے اور اس کے ضمن میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمعصر یہود وغیرہ کے لئے زجر و توبیخ ہے (1)۔ جمہور نے مفعول کا فعل ہونے کی بنا پر زُيِّنَ (یعنی مجہول) پڑھا ہے۔ اور حُبُّ کو رفع دیا ہے۔ اور حضرت ضحاک اور مجاہد نے فاعل کا فعل ہونے کی بنا پر زَيَّنَ (یعنی معروف) پڑھا ہے اور حُبَّ کو نصب دی ہے (2)۔ اور الشھوات میں اسم اور صفت میں فرق کرنے کے لئے ہا کو حرکت دی گئی ہے۔ اور الشَّهَوَات شَهْوَةٌ کی جمع ہے اور یہ معروف ہے۔ اور آدمی کی شے کی خواہش رکھنے والا ہوتا ہے، (کہا جاتا ہے رجل شھوان للشئ) اور شے کی خواہش رکھی جاتی ہے (لہذا کہا جاتا ہے شی شھی ای مشتھی، اور شہوات (خواہشات) کی اتباع و پیروی سرکش بنا دیتی ہے اور ان کی اطاعت اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ''جنت کا احاطہ مصائب و مکروہات سے کیا گیا ہے اور جہنم کا احاطہ خواہشات سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408، دار الکتب العلمیہ	2۔ ایضاً

کیا گیا ہے'' اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے (1)۔ اور اس تمثیل کا فائدہ یہ ہے کہ جنت حاصل نہیں کی جاسکتی مگر تبھی جب مصائب و مکروہات کے جنگل کو کاٹ دیا جائے اور ان پر صبر کیا جائے اور جہنم سے نجات حاصل نہیں کی جاسکتی مگر تب جب شہوات کو چھوڑ دیا جائے اور نفس کو ان سے چھٹکارا دلا دیا جائے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جنت کا راستہ ٹیلوں کے سبب کٹھن اور دشوار ہے اور جہنم کا راستہ نرم ہموار زمین ہونے کے سبب سہل ہے۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کا معنی یہی ہے: حفت الجنۃ بالمکارہ و حفت النار بالشھوات (2) یعنی جنت کا راستہ مشکل ہے کیونکہ اس میں چلنے کے لئے کئی ٹیلوں سے اوپر چڑھنا پڑھتا ہے، اور جہنم کا راستہ آسان ہے اس میں نہ کوئی ناہمواری ہے اور نہ دشوار گزاری۔ اور یہی معنی اس قول کا ہے سھل بسھوۃ اور یہ لفظ سین مہملہ کے ساتھ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: مِنَ النِّسَآءِ ان کی عادت اور رویہ کی وجہ سے لوگوں کا کثرت سے ان کی طرف میلان اور جھکاؤ ہوتا ہے، کیونکہ وہ شیطان کا جال (پھندا) اور مردوں کے لئے فتنہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے بڑھ کر کوئی شدید فتنہ نہیں چھوڑا (3)'' اسے بخاری و مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے روایت کیا ہے۔ پس عورتوں کا فتنہ تمام اشیاء سے زیادہ شدید اور سخت ہے۔ اور کہا جاتا ہے: عورتوں میں دو فتنے ہیں اور اولاد میں ایک فتنہ ہے۔ پس وہ دو جو عورتوں میں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قطع رحمی تک پہنچا دیتا ہے، کیونکہ عورت اپنے خاوند کو ماؤں اور بہنوں سے تعلقات منقطع کرنے کا حکم دیتی ہے اور دوسرا یہ ہے کہ آدمی کو حلال و حرام مال جمع کرنے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور رہے بیٹے! تو ان میں صرف ایک فتنہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو ان کے لئے مال جمع کرنے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا تُسکنوا نسآء کم الغرف ولا تعلموھن الکتاب (4) (تم اپنی عورتوں کو بالا خانوں میں سکونت نہ دو اور تم انہیں لکھنا نہ سکھاؤ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو ڈرایا (اور محتاط رہنے کی تلقین فرمائی۔) کیونکہ ان کے لئے بالا خانوں میں سکونت اختیار کرنے میں مردوں کی طرف دیکھنا (آسان) ہے۔ اور اس میں ان کے لئے نہ حفاظت ہے اور نہ پردہ۔ کیونکہ وہ مردوں پر جھانکتی رہیں گی نتیجتاً فتنہ اور آزمائش کھڑی ہو جائے گی اور کیونکہ یہ مرد سے پیدا کی گئی ہیں، لہٰذا ان کی خواہش اور قصد مرد کی جانب ہوتی ہے۔ اور مرد میں شہوت پیدا کر دی گئی ہے اور عورت کو مرد کے لئے باعث راحت و تسکین بنا دیا گیا ہے، پس دونوں میں سے ہر ایک دوسرے سے محفوظ و مامون نہیں اور انہیں لکھنے کی تعلیم دینے میں یہ فتنہ بھی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا واھلہا، جلد 2، صفحہ 378

2۔ ایضاً صحیح بخاری، باب حجبت النار بالشھوات، حدیث نمبر 6006، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب مایتقی من شوم المراۃ، حدیث 4706، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 380، حدیث نمبر 44999

اور کتاب الشہاب میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث موجود ہے: اُعْزُوا النساء یَلْزَمْنَ الحجال (1) (تم عورتوں کو چھوڑ دو وہ اپنے خاص کمروں کو لازم پکڑے رکھیں گی) پس آدمی پر لازم ہے جب وہ ان زمانوں میں صبر نہ کر سکے تو وہ کسی دیندار عورت کو تلاش کرے تاکہ وہ اپنے دین کو محفوظ رکھ سکے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علیک بذات الدین تَرِبَتْ یداک (2) (تجھ پر کسی دیندار عورت کو تلاش کرنا لازم ہے تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں) اسے مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا تزوجوا النساء لحسنهن فعسى حسنهن ان یُردیهن ولا تزوجوهن لا موالهن فعسى اموالهن ان تطغیهن ولکن تزوجوهن علی الدین ولامة سوداء خرماء ذات دین افضل (3) (تم عورتوں سے ان کے حسن کی وجہ سے شادی نہ کرو کیونکہ قریب ہے ان کا حسن انہیں ہلاک کر دے، اور تم ان کے مالوں کی وجہ سے ان سے شادی نہ کرو کیونکہ قریب ہے ان کے مال انہیں سرکش بنا دیں البتہ تم دین کی بنا پر ان سے شادی کرو اور سیاہ رنگ چھیدے ہوئے کانوں (اور کٹی ہوئی ناک) والی دیندار کنیز افضل ہے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَالْبَنِيْنَ اس کا عطف اپنے ماقبل پر ہے اور بنین کا واحد ابنٌ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی جانب سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَھْلِیْ (بے شک میرا بیٹا میری اہل میں سے ہے۔) اور اس کی تصغیر بُنَیٌّ ہے۔ جیسا کہ لقمان نے کہا ہے اور حدیث طیبہ میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''کیا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے تیری کوئی اولاد ہے''؟ انہوں نے عرض کی: جی ہاں، میرا اس سے ایک بیٹا ہے اور میں یہ پسند کرتا ہوں کہ اس کے لئے میرے پاس طعام کا ایک کنواں ہو اور بنی جبلہ کا جو فرد بھی باقی رہے وہ اسے کھلاتا رہے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تو نے ایسا کیا ہے تو بلاشبہ وہ (بیٹے) دلوں کی الفت اور راحت اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بزدل بنا دینے والے، بخیل بنا دینے والے اور غمزدہ کر دینے والے ہیں۔ لئن قلت ذالك انهم لثمر القلوب و قرة الاعین و انهم مع ذالك لمجبنة مبخلة محزنة۔ (4)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَالْقَنَاطِيْرِ، القناطیر قنطار کی جمع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَآتيتم احدهن قنطارا۔ اور اس سے مراد مال کی بہت بڑی گانٹھ ہے (5) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ایک پیمانے کا نام ہے جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے، جیسا کہ رطل اور ربع وغیرہ۔ اور جو شی اس خاص وزن تک پہنچ جائے اس کے لئے کہا جاتا ہے: هذا قنطار یعنی یہ قنطار کے مساوی اور برابر ہے۔ اور عرب کہتے ہیں: قنطر الرجل۔ جب اس کا مال اس حد کو پہنچ جائے کہ قنطار کے ساتھ وہ اس کا وزن کرے۔ اور زجاج نے کہا ہے: القنطار ماخوذ ہے عقد الشئ و احکامه (6) سے (یعنی کسی شے کو باندھنا اور اسے

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 374، حدیث نمبر 44962

2۔ صحیح مسلم، کتاب الرضاع، جلد 1، صفحہ 474۔ ایضاً صحیح بخاری، الاکفاء فی الدین، حدیث 4700، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، صفحہ 135۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب النکاح، حدیث 1848، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 211 5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408، دار الکتب العلمیہ 6۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 409

مضبوط کرنا، عرب کہتے ہیں: قنطرت الشیٔ۔ جب تو اسے خوب پختہ اور مضبوط کر دے اور اسی سے القنطرۃ ہے کہ اس کے پختہ ہونے کی وجہ سے اس کا نام قنطرۃ رکھا گیا ہے جیسا کہ طرفہ نے کہا ہے:

كَقَنْطَرَةِ الرُّومِيِّ اقسم ربُّها لَتُكْتَنَفَنْ حتّى تُشَادُ بِقَرْمَدِ

اور القنطرۃ سے مراد وہ شے ہے جس کا عقد کیا جائے تو گویا قنطار مال کا عقد کرنا ہے (1) اور علماء نے اس کی حد بیان کرنے میں اختلاف کیا ہے کہ وہ کتنی ہے، اس کے بارے متعدد اقوال ہیں۔ سو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ایک قنطار ایک ہزار دو سو اوقیہ کا ہے۔'' اور اسی کے مطابق حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور علماء کی ایک جماعت نے قول کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اور یہی صحیح ترین قول ہے: لیکن شہروں میں اوقیہ کی مقدار مختلف ہونے کے سبب قنطار بھی مختلف ہوتا ہے (2)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہے، اسے البستی نے اپنی مسند صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہے اور ایک اوقیہ اس سے بہتر ہے جو کچھ زمین و آسمان کے مابین ہے (3)''۔ اور یہی قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی بیان کیا ہے اور مسند ابی محمد الدارمی میں ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ''جس نے ایک رات میں دس آیات پڑھیں اسے ذاکرین میں لکھ دیا جائے گا اور جس نے سو آیات پڑھیں اسے قانتین (بندگی پر قائم و دائم رہنے والے) میں لکھ دیا جائے گا اور جس نے پانچ سو سے ہزار آیات تک پڑھیں تو وہ صبح اس حال میں کرے گا کہ اس کے لئے ایک قنطار اجر ہوگا۔'' عرض کی گئی: قنطار کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ملءُ مَسك ثَوْرٍ ذَهَبًا (مشکیزہ سونے سے بھرا ہوا ہو۔)

یہ روایت موقوف ہے اور ابو نضرۃ العبدی نے یہی کہا ہے اور ابن سیدہ نے بیان کیا ہے: یہ سریانی زبان میں اسی طرح ہے اور نقاش نے ابن کلبی سے بیان کیا ہے کہ یہ لغت روم کے مطابق بھی اسی طرح ہے (4) اور حضرت ابن عباس، حضرت ضحاک اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: قنطار کی مقدار، بارہ سو مثقال چاندی ہے، اسے حسن نے مرفوع ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: چاندی کے بارہ ہزار درہم اور سونے میں سے ایک ہزار دینار مسلم آدمی کی دیت ہے۔ اور حسن اور ضحاک سے یہی مروی ہے اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسی ہزار ہیں۔ حضرت قتادہ نے کہا: سونے کے ایک سو رطل یا چاندی کے اسی ہزار درہم (5) اور ابو حمزہ الثمالی نے بیان کیا ہے: افریقہ اور اندلس میں ایک قنطار سے مراد آٹھ ہزار مثقال سونا یا چاندی ہے۔ سدی نے کہا ہے: چار ہزار مثقال کا ہے۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے: ستر ہزار مثقال کا۔ اور یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (6) اور مکی نے ایک قول بیان کیا ہے کہ ایک قنطار چالیس اوقیہ سونا یا چاندی ہے، اور یہی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 408
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، صفحہ 268۔ ایضاً مسند امام احمد حدیث 8758
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408-409، دار الکتب العلمیہ 5۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 408 6۔ ایضاً

ابن سیدہ نے المحکم میں بیان کیا ہے اور کہا ہے: لغت بربر کے مطابق ایک قنطار ہزار مثقال کا ہے اور ربیع بن انس نے کہا ہے: قنطار سے مراد مال کثیر ہے جو بعض بعض پر پڑا ہو (1)۔

اور عربوں کے نزدیک یہی معروف ہے۔ اور اسی کے مطابق یہ ارشاد ہے: وَّاٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا (النساء: 20) یعنی تم نے ان میں سے ایک کو مال کثیر دیا۔ اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: ''بے شک صفوان بن امیہ زمانہ جاہلیت میں ایک قنطار کو پہنچ گیا اور اس کا باپ بھی قنطار کو پہنچ گیا'' یعنی اس کا مال قنطار ہو گیا۔ اور حکم سے روایت ہے: قنطار وہ ہے جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ اور الْمُقَنْطَرَةِ کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس طبری وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے الْمُضَعَّفَه (دو چند کیا ہوا) گویا قناطیر سے مراد تین قنطار اور مقنطرہ سے مراد نو ہیں (2)۔ اور فراء سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: قناطیر قنطار کی جمع ہے اور مقنطرہ جمع الجمع ہے۔ پس وہ نو قنطار ہو جائیں گے۔ سدی نے کہا ہے: مقنطرہ سے مراد ڈھالا ہوا سونا یا چاندی ہے یہاں تک کہ دنانیر یا دراہم ہو جائے۔ مکی نے کہا ہے: یہ المقنطرۃ المکملۃ (یعنی جمع کئے ہوئے خزانے (3) ''مکمل قنطار'')۔ اور اسے ہروی نے بیان کیا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: بِدَرٌ مُبَدَّرَةٌ (دس ہزار کی تھیلی جوان سے بھری ہوئی ہو۔) اور آلاف مؤلفۃ (ہزاروں جو جمع کئے گئے ہوں۔) اور بعض نے کہا ہے: اور اسی لئے بنا (عمارت) کو اس کی بناوٹ ایک دوسرے کے اوپر گھنی اور مضبوط ہونے کی وجہ سے قنطرہ کہا جاتا ہے۔

ابن کیسان اور فراء نے کہا ہے: نو قنطار سے کم مقنطرہ نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: المقنطرہ حضور مال اور اس کے بھاری بھر کم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ (4)

اور صحیح البستی میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے دس آیات کے ساتھ قیام کیا وہ غافلین میں سے نہیں لکھا جائے گا اور جس نے سو آیات کے ساتھ قیام کیا اسے قانتین میں لکھا جائے گا اور جس نے ہزار آیتوں کے ساتھ قیام کیا تو اسے مقنطرین (خزانہ جمع کرنے والے) میں لکھا جائے گا (5)۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ۔ الذَّهَبِ مونث ہے کہا جاتا ہے: هي الذهب الحسنة (یہ حسین سونا ہے) اس کی جمع ذھاب اور ذھوب آتی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ذَهَبَةٌ کی جمع ہو۔ اور جمع اذھاب بنائی جائے۔ اور ذھب فلان مذھبا حسنا (فلاں خوب اچھی طرح گزر گیا) اور الذھب اہل یمن کا ایک پیمانہ بھی ہے۔ اور رجل ذھب جب کوئی آدمی سونے کی کان دیکھے اور حیران رہ جائے۔ اور الفضۃُ یہ تو معروف ہے اور اس کی جمع فِضَضٌ ہے۔ پس الذھبُ، الذھاب سے ماخوذ ہے۔ اور الفضۃُ یہ انفض الشیٔ (شے کا متفرق ہونا) سے ماخوذ ہے۔ اور اسی سے فَضَضْتُ الْقَوْمَ فَانْفَضُّوْا ہے۔ یعنی میں نے قوم کو تقسیم کیا تو وہ تقسیم ہو گئی اور یہ مادہ اشتقاق ان دونوں کے زوال اور ان کے عدم ثبوت کا احساس دلاتا ہے۔ جیسا وجود میں ۔۔ کہا گیا ہے۔ اور اس معنی میں جو سب سے اچھا کہا گیا ہے وہ بعض کا یہ قول ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

4۔ ایضاً　5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوۃ، جلد 1، صفحہ 198

والھمّ آخرُ ھذا الدِّرْھم الجاری　　النّار آخرُ دینار نطقتَ بہ

جس دینار کے بارے تو نے گفتگو کی ہے اس کا آخر آگ ہے اور اس جاری درہم کا آخر غم ہے۔

مُعذّبَ القلبِ بَیْنَ الْھَمّ والنّارِ　　والمرء بینھما ان کان ذا وَرَعٍ

اگر آدمی کمزور دل ہو تو وہ ان دونوں کے درمیان اس حال میں ہوتا ہے کہ اس کا دل غم اور آگ کے درمیان عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَالْخَیْلِ الخیل مؤنث ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: ابوعبیدہ سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: خیل کا واحد خائل ہے، جیسا طیر کا واحد طائر اور ضَیْن کا واحد ضائن ہے اور گھوڑے کو یہ نام اسی لئے دیا گیا ہے کیونکہ وہ اپنی چال میں اکڑ اور تکبر کا اظہار کرتا ہے اور دوسروں نے کہا ہے کہ یہ اسم جمع ہے لفظوں میں اس کا کوئی واحد نہیں، (1) (بلکہ) اس کا واحد فرس ہے، جیسا کہ یہ الفاظ القوم، الرھط، النساء اور الابل وغیرہ...... اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کو ہوا سے پیدا کیا ہے اور اسی لئے اسے بغیر پروں کے اڑنے والا بنا دیا'' (مراد اس کی تیز رفتاری ہے۔) اور وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جنوب کی ہوا سے تخلیق فرمایا ہے۔ حضرت وہب نے کہا ہے: کوئی تسبیح، تکبیر اور تہلیل نہیں ہے جسے پڑھنے والا پڑھتا ہے مگر وہ (گھوڑا) اسے سنتا بھی ہے اور اسے اسی کی مثل کے ساتھ جواب بھی دیتا ہے۔ گھوڑے کا ذکر اور اس کے وصف کا بیان سورۃ الانفال میں آئے گا جو اس میں کافی ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر تمام جانور پیش فرمائے اور آپ کو کہا گیا: ان میں سے ایک پسند کرلو۔ تو انہوں نے گھوڑا چنا۔ تو آپ کو فرمایا گیا: تم نے اپنی عزت کو اختیار کیا ہے۔ پس اسی وجہ سے اس کا نام الخیر پڑ گیا۔ اور اس کا نام خیل رکھا گیا کیونکہ یہ (گھوڑا) العز سے موسوم ہے اور جو اس پر سوار ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے عزت پا لیتا ہے اور وہ اس کے سبب اللہ تعالیٰ کے دشمنوں پر اظہار فخر کرتا ہے۔ اور اس کا نام فرس رکھا گیا ہے کیونکہ یہ شیر کے جھپٹنے کی طرح اچھلتے کودتے فضا کی مسافتوں کو طے کر لیتا ہے اور وہ زور سے روندتے ہوئے انہیں اس طرح کاٹتا ہے جیسا کہ اپنے ہاتھ سے کوئی شے دبوچ لی جائے۔ اور اس کا نام عربی رکھا گیا ہے کیونکہ اسے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے کعبہ معظمہ کی بنیادیں اٹھانے کی جزا کے طور پر لایا گیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام عربی ہیں۔ پس چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو عطا ہوا اس لئے اس کا نام عربی رکھا گیا۔

اور حدیث طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے: ''شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوگا جس میں عتیق گھوڑا ہو (2)'' گھوڑے کو عتیق اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ وہ ھجانہ سے جدا اور مبرا ہوتا ہے (ھجانہ سے مراد خراب نسل کا گھوڑا جس میں گھوڑی ترکی ہو اور گھوڑا عربی ہو تو ان سے پیدا ہونے والے گھوڑے کو ھجین کہا جاتا ہے۔)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ　　2۔ المطالب العالیہ لابن حجر، حدیث نمبر 3630

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین گھوڑا وہ سیاہ رنگ کا گھوڑا ہے جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو اور اس کی ناک اور اوپر والا ہونٹ بھی سفید ہو۔ (پھر وہ جس کی پیشانی اور چاروں پاؤں سفید ہوں) طلق الیمین ہو (یعنی اس کا دایاں پاؤں سفید نہ ہو) اور اگر سیاہ (ادھم) گھوڑا نہ ہو تو پھر کُمیت (جس کا رنگ سیاہی مائل ہو) گھوڑا جو اسی وضع پر ہو(1)۔''

اسے ترمذی نے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور مسند دارمی میں آپ ہی سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں گھوڑا خریدنے کا ارادہ رکھتا ہوں [میں کون سا گھوڑا خریدوں؟] تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو سیاہ رنگ کا گھوڑا خرید جس کی ناک اور اوپر والا ہونٹ سفید ہوں اور محجل طلق الیمین ہو۔ (یعنی اس کی پیشانی اور تین پاؤں سفید ہوں) یا پھر اسی صورت پر کمیت گھوڑا خرید لے تو نفع پائے گا اور تو سلامت رہے گا(2)۔'' اور نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عورتوں کے بعد گھوڑے سے زیادہ پسندیدہ شے کوئی نہ تھی(3)۔ اور ائمہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھوڑے تین قسم کے ہیں، ایک آدمی کے لئے باعث اجر ہوتا ہے اور ایک آدمی کے لئے باعث ستر (پردہ) ہوتا ہے اور ایک آدمی کے لئے بوجھ ہوتا ہے(4)''۔ یہ حدیث طویل اور مشہور ہونے کے سبب ذکر سے مستغنی ہے۔ گھوڑوں کے احکام کا ذکر سورۃ الانفال اور النحل میں آئے گا جو کافی ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: **الْمُسَوَّمَةِ** مراد چراگاہوں میں چرنے والے، حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ہے۔ کہا جاتا ہے: سامت الدابة والشاة جب گھوڑا اور بکری چرنے کے لئے جائے تسوم سوما فھی سائمة(5)۔ اور أسمتھا انا جب تو انہیں چرنے کے لئے چھوڑے فھی مسامة اور سوّمتھا تسویما فھی مُسوَّمة۔ اور سنن ابن ماجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلوع آفتاب سے پہلے جانور چرانے سے اور دودھ والے جانور ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے(6)۔ (اس حدیث میں السوم کا لفظ چرنے کے معنی میں ہے) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِيهِ تُسِيمُونَ ۝ (النحل) (جس میں تم (مویشی) چراتے ہو) اخطل نے کہا ہے:

مثل ابن بزعة أو كآخر مثله ‏ ‏ ‏ أولى لك ابن مسيمةِ الاجمال

مراد اونٹ کو چرانے والے کا بیٹا ہے اور السوام سے مراد ہر چرنے والا جانور ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں جہاد کے لئے تیار کیا جائے۔ ابن زید نے یہی کہا ہے(7)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 202۔ ایضاً، ترمذی، باب کتاب الجہاد، حدیث 1619، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دارمی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 131، حدیث نمبر 2433 ‏ ‏ 3۔ سنن نسائی، کتاب الخیل والسبق والرمی، جلد 2، صفحہ 122

4۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب السبق والرمی، جلد 10، صفحہ 15

صحیح بخاری، باب شرب الناس والدواب من الانہار، حدیث 2198، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ ‏ ‏ 6۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارت، صفحہ 160

7۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 410، دار الکتب العلمیہ

حضرت مجاہد نے کہا ہے: المُسَوَّمَہ وہ ہوتا ہے جو بہت موٹا تازہ اور خوبصورت ہو۔ اور حضرت عکرمہ نے کہا ہے: سومها الحسن (1) (اس نے اسے خوبصورت نشانات لگائے یا اس نے اسے اچھی طرح چرنے کے لئے چھوڑا۔) اور نحاس نے اسے اختیار کیا ہے، انہی کے قول سے ہے: رجل و سیم خوبصورت چہرے والا آدمی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: المسومہ ایسے گھوڑے جن کے چہروں پر ایسے نشانات لگائے گئے ہوں جن سے ان کی پہچان ہو سکے (2)۔ یہ السیما سے ہے اور اس کا معنی علامت اور نشانی ہے۔ اور یہی کسائی اور عبیدہ کا مذہب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ ذکر کیا گیا ہے لفظ ان تمام کا احتمال رکھتا ہے، پس وہ گھوڑا جو چرنے والا ہو، اچھی طرح تیار کیا ہوا ہو اور اسے ایسے نشانات لگائے گئے ہوں جن کے سبب دوسروں سے اس کی پہچان ہو سکے (وہی) مراد ہوگا۔

ابوزید نے کہا ہے: اس کی اصل یہ ہے کہ تو اس پر ایسی اون اور علامت بنا دے جو اس کے سارے بدن میں نمایاں ہو تا کہ چراگاہ میں وہ اسے ماسویٰ سے ممتاز اور الگ کر دے۔

ابن فارس اللغوی نے اپنی مجمل میں بیان کیا ہے: المسومة سے مراد وہ گھوڑا ہے جو چھوڑا جائے اور اس پر اس کا سوار بھی ہو۔ اور مورج نے کہا ہے: المسومہ کا معنی ہے داغ دیا ہوا۔ مبرد نے کہا ہے: وہ جو شہروں میں معروف ہو۔ ابن کیسان نے کہا ہے: جس میں سیاہ و سفید داغ ہوں۔ یہ تمام معانی سیما کے متقارب ہیں۔ نابغہ نے کہا ہے:

و ضُمْرٍ كالقداح مُسَوَّمَاتٍ　　علیها مَعْشَرٌ اشباهُ جِنِّ (3)

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَالْاَنْعَامِ ابن کیسان نے کہا ہے جب تو کہے نَعَمٌ تو اس کا اطلاق صرف اونٹ پر ہوتا ہے اور جب کہے انعامٌ تو اس میں اونٹ اور تمام چرنے والے جانور آ جاتے ہیں۔

فراء نے کہا ہے: یہ لفظ مذکر ہے اس کی مونث نہیں آتی، وہ کہتے ہیں: هذا نَعَمٌ وارِدٌ (یہ اونٹ آ رہا ہے) اس کی جمع انعام آتی ہے۔ ہروی نے کہا ہے: نَعَمٌ مذکر و مونث دونوں کے لئے آتا ہے۔ اور الأنعام سے مراد اونٹ، گائے اور بکری وغیرہ جانور ہیں اور جب کہا جائے: النَّعَم تو پھر صرف اونٹ مراد ہوتا ہے اور حسان نے کہا ہے:

و کانت لایزال بها انیس　　خِلَالَ مُروجِها نَعَم وَ شَاءُ

اس میں نَعَمٌ سے مراد اونٹ ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں عروہ البارقی سے مرفوع روایت ہے انہوں نے بیان کیا: ''اونٹ اپنے مالکوں کے لئے (باعث) عزت ہے اور بکریاں باعث برکت ہیں اور خیر و بھلائی یوم قیامت تک گھوڑے کی پیشانی میں رکھ دی گئی ہے (4)''۔ اور اس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بکری جنت کے جانوروں میں سے ہے (5)'' اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1 صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً صفحہ 410

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارت، صفحہ 168۔ ابن ماجہ، کتاب التجارت، حدیث نمبر 2295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارت، صفحہ 168۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب التجارت، حدیث نمبر 2296، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اغنیاء کو بکریاں رکھنے کا اور فقراء کو مرغیاں رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا اور فرمایا: اغنیاء کے مرغیاں رکھنے کے وقت اللہ تعالیٰ شہروں کو ہلاک و برباد کرنے کی اجازت دے دیتا ہے (1)۔ اور اسی میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: تو بکریاں رکھ لے کیونکہ ان میں برکت ہے (2)''۔ انہوں نے اسے ابوبکر بن ابی شیبہ عن وکیع عن ھشام بن عروہ عن ابیہ عن ام ھانی کی سند سے بیان کیا ہے اور یہ اسناد صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَالْحَرْثِ یہاں حرث ہر اس شے کا نام ہے جسے کاشت کیا جاتا ہے اور یہ مصدر ہے جس کے ساتھ نام رکھا گیا ہے، تو کہتا ہے: حَرَثَ الرجل حَرْثاً جب وہ کھیتی باڑی کے لئے زمین کو پھاڑے (اس میں ہل چلائے) اور حِراثَہ کا اسم دانے کاشت کرنے، باغات لگانے اور دیگر کاشتکاری کی انواع پر بولا جاتا ہے اور حدیث میں ہے: ''تو اپنی دنیا کے لئے کھیتی باڑی کر گویا کہ تو ہمیشہ زندہ رہے گا۔'' کہا جاتا ہے حرثت اور احترثت (میں نے کھیتی باڑی کی) اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ''تم اس قرآن میں خوب غور و فکر اور تحقیق کرو۔'' ابن عرابی نے کہا ہے: الحرث کا معنی تفتیش کرنا، تحقیق کرنا ہے۔

اور حدیث میں ہے: أصدق الاسماء الحارث (3) ناموں میں سے أصدق نام حارث ہے کیونکہ حارث وہ ہوتا ہے جو کمانے والا ہو اور احتراث المال کا معنی مال کی کمائی ہے اور المحراث: آگ کو بھڑکانے اور ہلانے والی سیخ ہے اور الحَرَاث قوس میں تانت کی جگہ ہے۔ اس کی جمع أحرثہ ہے۔ اور أحرث الرجل ناقتہ آدمی نے ناقہ کو خوب تھکا دیا، کمزور کر دیا۔

اور حضرت معاویہ کی حدیث میں ہے: ما فعلت نواضحکم؟ تمہارے پانی پلانے والے اونٹوں نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: حرثناھا یوم بدر۔ ہم نے انہیں بدر کے دن خوب کمزور کیا اور تھکایا (اشارہ اس طرف ہے کہ ان کے اشیاخ کو قتل کیا ہے۔ النھایہ) ابوعبید نے کہا ہے: وہ اس سے ھزلناھا (ہم نے انہیں کمزور کیا ہے۔) کہا جاتا ہے: حرثت الدابۃ اور احرثتھا دونوں لغتیں ہیں۔ اور صحیح بخاری میں حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے بیان فرمایا کہ انہوں نے ہل کا لوہا (جس کے ساتھ زمین پھاڑی جاتی ہے) اور کوئی شے دیکھی تو کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''یہ کسی قوم کے گھر میں داخل نہیں ہوتی مگر ذلت اس کے ساتھ داخل ہوتی ہے (4)''۔ کہا گیا ہے کہ اس ارشاد میں ذُل سے مراد زمین کے ان حقوق کی مشقت ہے جن کی ادائیگی ہل چلانے والوں پر لازم ہوتی ہے اور ائمہ اور سلاطین ان کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اور مہلب نے کہا ہے: اس حدیث طیبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا حقیقی معنی تو واللہ اعلم بہر حال یہ بلند احوال اور باعزت

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، حدیث نمبر 2297، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔　2۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 2294، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ البدایۃ والنھایہ، جلد 12، صفحہ 192

4۔ صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ، جلد 1، صفحہ 312۔ ایضاً، بخاری، حدیث نمبر 2153، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اشراف ترین کاموں سے رزق طلب کرنے پر برانگیختہ کرتا ہے اور یہ اس لئے ہوا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے بارے میں ہل چلانے میں مشغول ہونے، گھوڑوں کی سواری اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کو ضائع کرنے کا خدشہ لاحق ہوا، کیونکہ اگر یہ ہل چلانے میں مشغول ہو گئے تو پھر ان پر وہ امم اور گروہ غالب آجائیں گے جو گھوڑوں کی سواری ان کی کمائی سے اسباب زندگی تلاش کرنے کے لئے کرتے ہیں۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جہاد سے اسباب زندگی تلاش کرنے پر ابھارا نہ کہ مسلسل زمین کی آبادی اور مشقت کو لازم پکڑنے سے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جوان بنو اور خوب مضبوط اور طاقتور بنو اور اونٹوں کی سواری چھوڑ دو اور گھوڑوں پر کود کر بیٹھو تم پر اونٹ چرانے والے غالب نہیں آئیں گے۔ پس آپ نے انہیں مسلسل گھوڑے رکھنے اور ان پر اچھل کر بیٹھنے کے لئے اپنے ابدان کی ورزش کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور صحیحین میں ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی مسلمان نے کوئی درخت لگایا یا کوئی فصل کاشت کی اور اس سے کوئی پرندہ یا انسان یا کوئی جانور کھائے تو اس کے لئے وہ صدقہ ہوگا(1)''۔

علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے مال کی چار قسمیں ذکر کی ہیں اور مال کی ہر نوع کے سبب لوگوں کی ایک قسم خوشحال اور تمول ہوتی ہے۔ پس سونے اور چاندی سے تاجر لوگ خوشحال ہوتے ہیں اور نشان زدہ گھوڑوں کے سبب بادشاہ اور امراء خوشحال ہوتے ہیں اور رہے چوپائے تو ان سے شہروں میں بسنے والے خوشحال ہوتے ہیں اور جہاں تک کھیتی باڑی کا تعلق ہے تو اس سے دیہات میں رہنے والے خوشحالی حاصل کرتے ہیں اور ہر قسم کی آزمائش اسی نوع کے لئے ہوتی ہے جو اس سے خوشحال ہوتی ہے اور جہاں تک عورتوں اور اولاد کا تعلق ہے تو یہ تمام کے لئے آزمائش اور فتنہ ہیں۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی وہ سامان جس سے دنیا میں لطف اندوز ہوا جاتا ہے پھر وہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ باقی نہیں رہتا، اس میں دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور آخرت کے بارے ترغیب ہے۔ ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ دنیا سامان ہے اور سامان دنیا میں سے کوئی شے نیک اور صالحہ عورت سے افضل نہیں(2)''۔

اور ایک حدیث میں ہے: ''تو دنیا میں زہد اختیار کر اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت فرمائے گا(3)'' یعنی دنیوی ساز و سامان میں جاہ وحشمت اور ضرورت سے زائد مال کو چھوڑ دے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سوائے ان خصال کے ابن آدم (انسان) کا کوئی حق نہیں ہے۔ گھر جو اسے سکونت دیتا ہے، کپڑا جو اس کی شرمگاہ کو چھپاتا ہے اور خشک روٹی اور پانی(4)''۔ ترمذی نے اسے مقدام بن معدیکرب کی حدیث سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعة، جلد 1، صفحہ 312۔ ایضاً، بخاری، حدیث نمبر 2152، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، صفحہ 134۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1844، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، صفحہ 311۔ ایضاً، ابن ماجہ، صفحہ 4091، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 57۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2263، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نقل کیا ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ سے پوچھا گیا: بندے پر دنیا اور تمام شہوات کو چھوڑنا کیونکر آسان ہوجاتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: آدمی کے ان کاموں میں مشغول ہوجانے کے ساتھ جن کا اسے حکم دیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 11 ۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور المآب کا معنی لوٹنے کی جگہ ہے، آب یؤوب ایابا کہا جاتا ہے جب کوئی لوٹ کر آئے۔ امرؤالقیس نے کہا:

و قد طوفت فی الآفاق حتی　　رضِیتُ من الغنیمۃ بِالاِیَابِ (1)

تحقیق میں آفاق میں گھوما پھرا یہاں تک کہ میں غنیمت کی بجائے لوٹ آنے پر راضی ہوگیا۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا:

و کل ذی غیبۃ یؤوبُ　　و غائب الموت لایؤوب (2)

ہر غیب ہونے والا لوٹ آتا ہے (لیکن) موت کے سبب غائب ہونے والا لوٹ کر نہیں آتا۔ مآب کی اصل مَاْوَبٌ ہے واؤ کی حرکت نقل کر کے ماقبل ہمزہ کو دی اور واؤ کو الف سے بدل دیا گیا۔ جیسا کہ مَقَالٌ میں کہا گیا ہے اور آیت کا معنی یہ ہے کہ اس میں دنیا کی قلت اور اس کی حقارت کو بیان کرنا ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف حسین انداز میں لوٹنے کی ترغیب ہے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۚ﴿۱۵﴾

"(اے میرے رسول!) آپ فرمائیے کیا بتاؤں میں تمہیں اس سے بہتر چیز، ان کے لئے جو متقی بنے ان کے رب کے ہاں باغات ہیں، رواں ہیں ان کے نیچے نہریں، ہمیشہ رہیں گے (متقی) ان میں اور (ان کے لئے) پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور حاصل ہوگی انہیں خوشنودی اللہ کی اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھنے والا ہے اپنے بندوں کو۔"

سوال کی انتہا مِّنْ ذٰلِكُمْ پر ہے۔ اور لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا خبر مقدم ہے اور جَنّٰتٌ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سوال کی انتہا عِنْدَ رَبِّهِمْ پر ہے اور جَنّٰتٌ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، تقدیر کلام ہے ذالك جنات (3) اور اس تاویل کی بنا پر جَنّٰتٌ کو خَيْرٍ سے بدل کر مجرور پڑھنا بھی جائز ہے۔ لیکن پہلی صورت میں یہ جائز نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کی مثل ہے: "عورت سے چار چیزوں کے سبب نکاح کیا جاتا ہے اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب کی وجہ سے، اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے۔ پس تو دین والی کو تلاش کر تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں' تنکح المراۃ لأربع لمالها و حسبها و جمالها و دینها فاظفر بذات الدین تربت یداك۔ (4) اسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اس میں فاظفر بذات الدین اس آیت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 410، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، الترغیب فی النکاح، جلد 2، صفحہ 762

کی مثال ہے اور جو اس سے پہلے ہے وہ اس سے پہلی آیت کی مثال ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے دنیا سے تسلی دینے اور اسے چھوڑنے والے نفوس کو تقویت دینے کے لئے یہ ذکر کیا ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں اس آیت کے الفاظ کے معانی گزر چکے ہیں۔ الرضوان رضا سے مصدر ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا "کیا تم کسی شے کا ارادہ رکھتے ہو کہ میں تمہارے لئے اس کا اضافہ کردوں؟" تو وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! اور کون سی شے اس سے افضل ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا: "میری رضا سو اس کے بعد میں کبھی تم پر ناراض نہ ہوں گا (1)"۔

اسے مسلم نے بیان کیا ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ۝ میں وعدہ اور وعید دونوں ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ۝

"یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! یقیناً ہم ایمان لائے تو معاف فرما دے ہمارے لئے ہمارے گناہ اور بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے۔ (یہ مصیبتوں میں) صبر کرنے والے ہیں اور (ہر حالت میں) سچ بولنے والے ہیں اور (عبادت میں) عاجزی کرنے والے ہیں اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے ہیں اور (اپنے گناہوں کی) معافی مانگنے والے ہیں سحری کے وقت۔"

اس میں اَلَّذِيْنَ۔ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا سے بدل ہے۔ اور اگر چاہو تو مرفوع پڑھ لو اور تقدیر کلام ہوگی ھم الذین یا پھر مدح کی بناء پر منصوب پڑھ لو۔ رَبَّنَآ اصل میں یا ربنا ہے۔ اِنَّنَآ اٰمَنَّا کا معنی ہے یقیناً ہم نے تصدیق کی۔ فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا یہ مغفرت کی دعا اور التجاء ہے۔ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اَلصّٰبِرِيْنَ یعنی یہ گناہوں اور شہوات سے صبر کرنے والے ہیں اور بعض نے کہا کہ وہ طاعات پر صبر کرنے والے ہیں۔ وَالصّٰدِقِيْنَ اور افعال و اقوال میں سچ بولنے والے ہیں۔ وَالْقٰنِتِيْنَ اور وہ اطاعت و پیروی کرنے والے ہیں۔ وَالْمُنْفِقِيْنَ اور وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں۔ اور سورۃ البقرہ میں مکمل طور پر یہ معانی گزر چکے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان متقی لوگوں کے احوال تفصیل سے بیان کئے ہیں جن کے لئے جنات کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ کے معنی میں اختلاف ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ مغفرت کی دعا اور التجا کرنے والے لوگ ہیں اور قتادہ نے کہا ہے: ان سے مراد نماز پڑھنے والے ہیں (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں کوئی تضاد اور تناقض نہیں ہے، کیونکہ وہی نماز پڑھتے ہیں اور وہی استغفار کرتے ہیں۔ اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 103۔ ایضاً صحیح بخاری، باب صفۃ الجنۃ والنار، حدیث نمبر 6067، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ

سحری کا وقت خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بارے ظن غالب یہ ہے کہ یہ دعا کی قبولیت کا وقت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس قول باری تعالیٰ کی تفسیر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو کہا: سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ (میں تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا) ''بلاشبہ آپ نے اس دعا کو سحری کے وقت تک موخر کر دیا (1)'' اسے ترمذی نے بیان کیا ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اور حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام سے دریافت فرمایا: ''رات کے کون سے حصہ میں (دعا) زیادہ سنی جاتی ہے؟'' تو انہوں نے جواب دیا: ''میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ سحری کے وقت عرش وجد کناں ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے سَحَر اور سَحْر یعنی حا کے فتحہ اور اس کے سکون کے ساتھ۔ اور زجاج نے کہا ہے: سحر سے مراد وہ وقت ہے جب رات واپس پلٹ رہی ہوتی ہے یہاں تک کہ فجر ثانی طلوع ہو جائے اور ابن زید نے کہا ہے: سحر سے مراد رات کا آخری چھٹا حصہ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بارے میں صحیح ترین روایت وہ ہے جسے ائمہ حدیث نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ (اپنی شان قدرت کے مطابق) ہر رات جب رات کا پہلا تہائی حصہ گزر جاتا ہے آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے: میں بادشاہ ہوں کون ہے وہ جو مجھ سے دعا مانگ رہا ہو کہ میں اس کی دعا قبول کر لوں، کون ہے وہ جو مجھ سے سوال کر رہا ہو کہ میں اسے عطا کروں، کون ہے وہ جو مجھ سے مغفرت طلب کر رہا ہو کہ میں اس کی مغفرت فرما دوں پس وہ اسی طرح ندا دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے۔'' اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں حتی ینفجر الصبح یہاں تک کہ صبح پھوٹ پڑتی ہے (2)۔ یہ مسلم کے الفاظ ہیں..... اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ اور اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے اولیٰ اور ارجح وہ ہے جو نسائی کی کتاب میں بطور مفسر موجود ہے۔

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہما دونوں نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ مہلت دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ رات کا پہلا نصف حصہ گزر جاتا ہے پھر وہ منادی کو حکم دیتا ہے پس وہ کہتا ہے: کیا کوئی دعا مانگنے والا ہے اس کی دعا قبول کی جائے گی، کیا کوئی مغفرت کا طالب ہے اس کی مغفرت کر دی جائے گی، کیا کوئی سائل اور حاجتمند ہے اسے عطا کیا جائے گا'' اسے ابو محمد عبد الحق نے صحیح قرار دیا ہے (3)، اور یہ ارشاد اشکال کو رفع کر دیتا ہے اور ہر احتمال کو واضح کر دیتا ہے۔ اور بے شک پہلے ارشاد میں مضاف محذوف ہے یعنی عبارت اس طرح ہے ینزل مَلَكُ ربنا فیقول۔ اور يُنْزِلُ یاء کو ضمہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے اور یہ بھی اسی مفہوم کو بیان کرتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ و باللہ توفیقنا۔ اور ہم نے اس کا ذکر کتاب الأسنی فی شرح أسماء اللہ الحسنی و صفاته العلی میں کیا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 196۔ ایضاً، ترمذی، حدیث نمبر 3493، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، باب صلاۃ اللیل، صلاۃ المسافرین، جلد 1، صفحہ 258۔ ایضاً صحیح بخاری، باب الدعاء فی الصلوٰۃ، حدیث نمبر 1077، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الجواہر الحسان، جلد 1، صفحہ 239، دار الکتب العلمیہ بیروت

مسئلہ: استغفار کرنا مستحب ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مغفرت طلب کرنے والوں کی تعریف بیان فرمائی ہے۔ اور کئی دوسری آیات میں بھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سحری کے وقت ستر مرتبہ استغفار کریں (1)۔ اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے: جب رات کا پہلا حصہ ہوتا ہے تو ایک ندا دینے والا ندا دیتا ہے چاہیے کہ اطاعت و فرمانبرداری کرنے والے اٹھ کھڑے ہوں چنانچہ وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سحری تک اسی طرح نماز پڑھتے رہتے ہیں اور جب سحری کا وقت ہوتا ہے تو ندا دینے والا ندا دیتا ہے: مغفرت طلب کرنے والے کہاں ہیں کہ وہ مغفرت طلب کریں، پس دوسرا گروہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ نماز پڑھنے لگ جاتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور جب فجر طلوع ہو جاتی ہے تو ندا دینے والا ندا دیتا ہے: خبردار سنو! چاہیے کہ غافل لوگ اٹھ کھڑے ہوں پس وہ اپنے بستروں سے اسی طرح اٹھتے ہیں جیسا کہ مردوں کو ان کی قبروں سے اٹھایا جائے گا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اہل زمین کو عذاب دینے کا ارادہ کرتا ہوں پھر جب میں اپنے گھروں کو آباد کرنے والوں کی طرف، میری رضا کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں کی طرف اور سحری کے وقت تہجد پڑھنے والوں اور استغفار کرنے والوں کی طرف دیکھتا ہوں تو ان کے سبب ان سے عذاب پھیر دیتا ہوں۔'' ان اللہ یقول انی لاھم بعذاب اھل الارض فاذا نظرت الی عمار بیوتی والی المتحابین فی والی المتھجدین والمستغفرین بالاسحار صرفت عنھم العذاب بھم۔ (2)

حضرت مکحول نے کہا ہے: جب امت میں پندرہ افراد موجود ہوں جو ہر روز پچیس مرتبہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے ہوں تو اللہ تعالیٰ عام عذاب کے ساتھ اس امت کا مواخذہ نہیں فرماتا۔ اسے ابونعیم نے کتاب الحلیہ میں ذکر کیا ہے۔

اور حضرت نافع نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما رات جاگتے رہتے تھے پھر فرماتے: اے نافع! کیا سحری کا وقت ہو چکا ہے؟ میں عرض کرتا: نہیں۔ پھر آپ دوبارہ نماز پڑھنے لگ جاتے، پھر آپ پوچھتے، پس جب میں کہتا: ہاں (سحری کا وقت ہو چکا ہے) تو آپ بیٹھ جاتے اور استغفار کرنے لگتے (3) اور ابراہیم بن حاطب نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے سحری کے وقت مسجد کے ایک کونے میں آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے حکم دیا تو میں نے تیری اطاعت و پیروی کی، یہ سحری کا وقت ہے تو میری مغفرت فرما دے۔ یا رب، امرتنی فأطعتك، و هذا سحرٌ فاغفرلی پس میں نے دیکھا تو وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تھے (4)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ سب اس پر دلالت کرتا ہے کہ مراد حضور قلب کے ساتھ زبان سے استغفار کرنا ہے، نہ کہ وہ جو ابن زید نے کہا کہ مستغفرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں (5)۔ واللہ اعلم۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا تھا: اے میرے بیٹے! مرغ تجھ سے زیادہ دانا اور عقلمند نہ ہونے پائے، کہ وہ تو سحری کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ　　2۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 501، حدیث نمبر 9051
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ　　4۔ ایضاً　　5۔ ایضاً

وقت نداد یتا ہے اور تو سو یا ہی رہے''۔

استغفار کے الفاظ میں مختار اور پسندیدہ وہ ہیں جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے شداد بن اوس سے روایت کیے ہیں اور آپ کی الجامع میں اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سید الاستغفار یہ ہے کہ تو کہے: اللّٰھم انت ربی لا الہ الا انت خلقتنی و انا عبدك و انا علی عھدك و وعدك ما استطعتُ اعوذ بك من شرّ ما صنعتُ أَبُوءُ لك بنعمتك علی و أبوء بذنبی فاغفرلی فانه لا یغفر الذنوب الا انت۔۔۔ (اے اللہ! تو میرا رب ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو نے مجھے پیدا فرمایا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں تیرے عہد اور تیرے وعدہ پر ہوں جتنی مجھ میں قدرت اور استطاعت ہے میں تیری پناہ مانگتا ہوں ہر اس عمل کے شر سے جو میں نے کیا تیری جو نعمتیں مجھ پر ہیں میں ان کے سبب تیری طرف ہی رجوع کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں، تو میری مغفرت فرمادے کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں ہے۔)

فرمایا۔۔۔۔۔جس کسی نے پورے یقین اور وثوق کے ساتھ دن کے وقت یہ پڑھا پھر اسی دن شام ہونے سے پہلے پہلے وہ فوت ہو گیا تو وہ اہل جنت میں سے ہوگا اور جس کسی نے رات کے وقت یہ پڑھا اور پھر اسی رات صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ فوت ہو گیا تو وہ اہل جنت میں سے ہوگا(1)'' اور ابو محمد عبدالغنی نے سعید بن ابی لہیعہ کی حدیث عن ابی صخر عن ابی معاویہ عن سعید بن جبیر عن ابی الصہباء البکری عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا پھر ارشاد فرمایا: ''کیا میں تجھے ایسے کلمات نہ سکھا دوں (جب) تو انہیں کہے تو اگر تیرے گناہ چیونٹیوں کی گزرگاہ کی طرح بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ تیرے لئے انہیں معاف فرمادے اس بنا پر کہ اس نے تیری مغفرت فرما دی ہے: اللّٰھم لا الہ الا انت سبحانك عملت سوٗا و ظلمت نفسی فاغفرلی فانه لا یغفر الذنوب الا انت (2) (اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تیری ذات پاک ہے میں نے برائی کے اعمال کئے ہیں اور میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے سو تو میری مغفرت فرمادے کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخش نہیں سکتا۔)

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؕ﴿۱۸﴾

''شہادت دی اللہ تعالیٰ نے (اس بات کی کہ) بے شک نہیں کوئی خدا سوائے اس کے۔ اور (یہی گواہی دی) فرشتوں نے اور اہل علم نے (ان سب نے بھی یہی گواہی دی کہ وہ) قائم فرمانے والا ہے عدل و انصاف کو نہیں کوئی معبود سوائے اس کے (جو) عزت والا حکمت والا ہے۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ کعبہ معظمہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے جب

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 933۔ ایضاً، بخاری، صفحہ 5831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ کنز العمال، جلد 2، صفحہ 677، حدیث نمبر 5052۔ ایضاً، بخاری، باب الدعاء قبل السلام، حدیث نمبر 790، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ آیت نازل ہوئی تو وہ تمام سجدے میں گر گئے (1)۔

اور کلبی نے کہا ہے: جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ کے پاس اہل شام کے علماء میں سے دو عالم حاضر ہوئے، جب ان دونوں نے مدینہ طیبہ کو دیکھا تو ان میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی کو کہا: یہ شہر اس نبی مکرم ﷺ کے شہر کے اوصاف کے ساتھ کتنی زیادہ مشابہت رکھتا ہے جو آخر زمانہ میں تشریف لائے گا! چنانچہ جب وہ دونوں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ کی علامات اور صفات کو دیکھ کر آپ کو پہچان لیا، تو انہوں نے آپ سے پوچھا: کیا آپ محمد (ﷺ) ہیں؟ آپ نے فرمایا ''ہاں'' پھر کہا: کیا آپ احمد (ﷺ) ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ دونوں نے کہا: ہم آپ سے شہادت کے بارے پوچھتے ہیں پس اگر آپ نے ہمیں اس کے بارے بتا دیا تو ہم آپ کے ساتھ ایمان لے آئیں گے اور ہم آپ کی تصدیق کریں گے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو فرمایا: ''تم مجھ سے پوچھو'' تو انہوں نے کہا: کتاب اللہ میں سب سے بڑی شہادت کے بارے آپ ہمیں بتائیے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ چنانچہ وہ دونوں اسلام لے آئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کر دی (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُولُوا الْعِلْمِ سے مراد حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور ابن کیسان نے کہا ہے: مہاجرین اور انصار ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے: اہل کتاب میں سے ایمان لانے والے ہیں اور سدی اور کلبی نے کہا ہے: مراد تمام مومنین ہیں اور یہی قول زیادہ واضح اور ظاہر ہے کیونکہ یہ عام ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں علم کی فضیلت اور علماء کے شرف و فضل پر دلیل ہے، کیونکہ اگر کوئی اور علماء سے اشرف و اعلیٰ ہوتا تو بالیقین اللہ تعالیٰ انہیں اپنے اور ملائکہ کے نام کے ساتھ اسی طرح ملا کر ذکر کرتا جیسا کہ علماء کا ذکر کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے علم کے شرف و عظمت کے سبب ہی اپنے نبی مکرم ﷺ کو فرمایا: وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا پس اگر کوئی اور شے علم کی نسبت زیادہ شرف والی ہوتی تو یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم ﷺ کو حکم ارشاد فرماتا کہ اس میں زیادتی اور اضافہ کی التجا کریں جیسا کہ علم میں زیادتی اور اضافہ کی طلب کا حکم ارشاد فرمایا ..... اور آپ ﷺ نے فرمایا: ان العلماء ورثة الانبیاء (3) (بلاشبہ علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں) اور مزید فرمایا: العلماءُ اُمناء اللہ علی خلقہ (4) (علماء اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی مخلوق پر امین ہیں) اور یہ علماء کے لئے عظیم شرف اور بہت بڑا اعزاز ہے۔ اور دین میں ان کے لئے بہت بڑا مقام اور بلند رتبہ ہے۔ ابو محمد عبدالغنی الحافظ نے برکۃ ابن نشیط کی حدیث نقل کی ہے..... اور یہ عنکل بن حکارک ہیں اور اس کی تفسیر برکۃ بن نشیط ہے..... اور یہ حافظ ہیں۔

ہمیں عمر ابن موئل، محمد بن ابی الخصیب، عنکل، محمد بن اسحاق، شریک نے ابو اسحاق سے حدیث بیان کی کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: العلماء ورثة الانبیاء یحبهم اهل السماء و یستغفر لهم

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 294
2۔ اسباب النزول للنیشابوری، صفحہ 63
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 157
4۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 134، حدیث نمبر 28675

الحیتان فی البحر اذا ماتوا الی یوم القیامۃ (1) (علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں جب وہ فوت ہو جائیں گے تو یوم قیامت تک سمندر میں مچھلیاں ان کے لئے مغفرت طلب کرتی رہیں گی۔) اس باب میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے جسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 3۔ غالب القطان نے بیان کیا ہے: میں تجارت کی غرض سے کوفہ آیا اور میں حضرت اعمش کے قریب اترا۔ اور میں ان سے اختلاف رکھتا تھا۔ پس جب رات ہوئی تو میں نے بصرہ میں نزول کا ارادہ کیا وہ اٹھے اور انہوں نے رات کے وقت نماز تہجد ادا کی اور یہ آیت تلاوت کی شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۞ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اعمش نے کہا میں اس بارے شہادت دیتا ہوں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے شہادت دی ہے اور میں یہ شہادت اللہ تعالیٰ کے پاس امانت رکھتا ہوں اور یہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس ودیعت ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین (فقط) اسلام ہے۔ انہوں نے بار بار یہ کہا...... پس میں صبح کے وقت ان کی طرف گیا اور میں نے انہیں الوداع کہا پھر کہا: بلاشبہ میں نے تمہیں یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا ہے اس کے بارے میں تمہیں کیا خبر پہنچی ہے؟ میں ایک سال تک تمہارے پاس رہا ہوں تم نے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: قسم بخدا! میں ایک سال تک اس بارے میں تمہیں کچھ نہیں بیان کروں گا۔ وہ فرماتے ہیں: پس میں اٹھا اور میں نے ان کے دروازے پر اس دن کے بارے لکھ دیا، پس جب سال گزر چکا تو میں نے کہا: اے ابومحمد! سال گزر چکا ہے۔ تو انہوں نے کہا: مجھے ابووائل نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یجاء بصاحبھا یوم القیامۃ فیقول اللہ تعالیٰ عبدی عھد الیّ وأنا احق من وَفّی أدخلوا عبدی الجنۃَ (3) اس آیت پڑھنے والے کو قیامت کے دن لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے بندے نے میرے ساتھ عہد کیا ہے اور میں کسی بھی وفا کرنے والے سے زیادہ حق رکھتا ہوں پس تم میرے بندے کو جنت میں داخل کردو۔)

ابوالفرج الجوزی نے کہا ہے: غالب القطان سے مراد غالب بن خطاف القطان ہے جو اعمش سے حدیث شَهِدَ اللّٰهُ روایت کرتا ہے اور یہ حدیث معضل ہے۔ ابن عدی نے کہا ہے: اس کی حدیث میں ضعف بین اور واضح ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا غالب بن خطاف القطان ثقہ ہے، ثقہ ہے۔ ابن معین نے کہا: ثقہ ہے۔ اور ابوحاتم نے کہا ہے: یہ صدوق اور صالح ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تیرے لئے اس کی عدالت اور ثقاہت کے لئے یہی کافی ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے اپنی کتابوں میں اس کی حدیث نقل کی ہے اور تیرے لئے یہ کافی ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور

1۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 135، حدیث نمبر 28679

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 157۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 3157، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 440

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے اپنے سونے کے وقت یہ آیت پڑھی شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ستر ہزار فرشتے پیدا فرما دے گا اور وہ اس کے لئے یوم قیامت تک استغفار کرتے رہیں گے۔" اور کہا جاتا ہے: جس نے اس شہادت کے بارے اپنے صحیح قلب سے اقرار کر لیا تحقیق اس نے عدل قائم کر لیا۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: کعبہ معظمہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت تھے قبائل عرب میں سے ہر قبیلے کے لئے ایک یا دو بت تھے۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو تمام بت اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ ریز ہو گئے (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: شَهِدَ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا اور آگاہ فرمایا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: شهد فلان عند القاضی (اس کا معنی ہے) فلاں نے قاضی کے سامنے اس کے بارے بیان کیا جس کا حق ہے یا جس پر حق ہے۔ زجاج نے کہا ہے: شاہد وہ ہوتا ہے جو کسی شے کو جانتا ہے اور اس کی وضاحت کرتا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر ایسی شے کے ساتھ ہماری راہنمائی فرمائی ہے جسے اس نے تخلیق فرمایا اور بیان فرمایا۔

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: شَهِدَ اللّٰهُ بمعنی قضى الله ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے (فیصلہ فرمایا) آگاہ فرمایا۔ اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ کئی اعتبار سے مردود ہے (2)۔

امام کسائی نے قول باری تعالیٰ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اور اِنَّ الدِّيْنَ میں اَن کے ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے۔ مبرد نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے: ان الدین عند الله الاسلام بانه لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ پھر با کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ کہا: امرتك الخير یہ اصل میں بالخیر ہے۔ کسائی نے کہا ہے تو ان دونوں کو اکٹھی نصب دے، اس معنی میں شهد الله انه كذا، وان الدين عند الله۔ ابن کیسان نے کہا ہے: دوسرا ان پہلے سے بدل ہے، کیونکہ اسلام ہی معنی توحید کی تفسیر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی قرأت کی ہے جو کسائی نے بیان کیا ہے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ یعنی اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان الدین اس میں ان کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (3) اور تقدیر کلام یہ ہے شهد الله ان الدين الاسلام پھر ابتدا کی اور فرمایا: اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ اور ابو المہلب نے شُهَدَاءُ اللّٰهُ حال ہونے کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور ان سے شُهَدَاءُ اللّٰهُ بھی مروی ہے (4)۔

اور شعبہ نے عاصم بن زر عن ابی کی سند سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ اس طرح پڑھتے تھے ان الدين عند الله الحنيفية لا اليهودية ولا النصرانية ولا المجوسية (5) ابو بکر انباری نے کہا ہے: کسی صاحب تمیز آدمی پر یہ مخفی نہیں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کلام تفسیر کی حیثیت سے مروی ہے اور ناقلین حدیث میں سے کسی نے اسے قرآن میں داخل کر دیا ہے۔ اور قائماً قول باری تعالیٰ شَهِدَ اللّٰهُ میں اسم جلالت سے یا قول باری تعالیٰ اِلَّا هُوَ سے حال مؤکدہ ہونے

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 294 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 412، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

5۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 132۔ ایضاً، ترمذی، باب مناقب اهل بيت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 3726، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی بنا پر منصوب ہے (1)۔ اور فراء نے کہا ہے: وہ قطع کی بنا پر منصوب ہے، اس کی اصل القائم ہے پس جب الف لام کو کاٹ دیا گیا تو اسے نصب دے دی گئی جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے وَلَهُ الدين واصبا اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں القائم بالقسط ہے لغت اور صفت ہونے کی بنا پر۔ اور القسط کا معنی عدل ہے (2)۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ اسے دوبارہ لایا گیا ہے کیونکہ پہلا دعویٰ کے محل میں واقع ہے اور دوسرا شہادت حکم کے محل میں واقع ہے اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پہلا وصف اور توحید ہے اور دوسرا رسم (حکم) اور تعلیم ہے۔ یعنی تم کہو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۫ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝۱۹

''بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے اور نہیں جھگڑا کیا جن کو دی گئی تھی کتاب مگر بعد اس کے کہ آ گیا تھا ان کے پاس صحیح علم (اور یہ جھگڑا) باہمی حسد کی وجہ سے تھا اور جو انکار کرتا ہے اللہ کی آیتوں کا تو بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اس آیت میں دین سے مراد طاعت اور ملت ہے اور اسلام بمعنی ایمان اور طاعات ہے، ابو العالیہ نے یہی کہا ہے اور اسی پر جمہور متکلمین ہیں (3) اور حدیث جبریل (4) کے مطابق ایمان اور اسلام کے مسمیٰ میں دراصل تغایر ہے۔ (یعنی دونوں لفظوں کا اطلاق علیحدہ علیحدہ معنی پر ہوتا ہے۔) اور کبھی معنی مرادفہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک کو دوسرے کا نام دے دیا جاتا ہے، جیسا کہ وفد عبد القیس کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اللہ وحدہ لا شریک کے ساتھ ایمان لانے کا حکم ارشاد فرمایا اور فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو ایمان کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کی: اللہ و رسولہ اعلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله و اقام الصلوٰة و ایتاء الزکواة و صوم رمضان وان تؤدوا خمسا من المغنم الحدیث (5)۔ (یہ شہادت دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان المبارک کے روزے رکھنا اور یہ کہ تم مال غنیمت سے خمس ادا کرو۔) اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''ایمان کے ستر سے کچھ زائد باب ہیں اور ان میں سے ادنیٰ تکلیف دہ شے کو راستے سے ہٹانا ہے اور اعلیٰ ترین باب لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا ہے۔'' اسے ترمذی نے نقل کیا ہے (6) اور مسلم نے یہ زیادہ کیا ہے والحیاء شعبة من الایمان (7) (حیاء ایمان کا ایک شعبہ ہے)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 413، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

4۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 12۔ ایضاً، حدیث نمبر 48، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 35۔ ایضاً صحیح بخاری، باب اداء الخمس من الایمان، حدیث 51، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

6۔ جامع ترمذی، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 86۔ ایضاً صحیح بخاری، باب امور الایمان، حدیث نمبر 8، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

7۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 47

اور یہ تداخل کے معنی میں ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک بولا جاتا ہے اور اس سے مراد اس کا اپنا اصل مسمیٰ اور دوسرے کا مسمیٰ لیا جاتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے کیونکہ اس میں تصدیق اور اعمال دونوں داخل ہیں اور اسی کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے۔ الایمان معرفة بالقلب و قول باللسان و عمل بالارکان (ایمان سے مراد دل سے معرفت حاصل کرنا، زبان سے قول کرنا اور ارکان کے مطابق عمل کرنا ہے) اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے (1) اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور حقیقی معنی وضعاً اور شرعاً پہلا ہی ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ وسعت کے باب سے ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ الآیہ۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے اختلاف کے بارے خبر دی ہے کہ وہ حقائق کے بارے علم رکھتے تھے اور یہ کہ وہ دنیا کے خواہشمند اور طالب تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ نے (2) یہی کہا ہے اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور معنی یہ ہے: اور نہیں جھگڑا کیا ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی آپس میں حسد کرتے ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس (صحیح) علم آ گیا۔ اخفش نے یہی کہا ہے۔ محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا ہے: اس آیت سے مراد نصاریٰ ہیں اور یہ نجران کے عیسائیوں کے لئے جھڑک ہے (3)۔ اور ربیع بن انس نے کہا ہے: اس سے مراد یہود ہیں اور الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کا لفظ یہود و نصاریٰ تمام کو شامل ہے (4)۔ یعنی وہ لوگ جنہیں کتاب عطا کی گئی وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے بارے میں نہیں جھگڑے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس صحیح علم آ گیا تھا۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت اور نبوت کا بیان ان کی کتابوں میں آ چکا تھا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: (اس آیت سے مراد یہ ہے) جنہیں انجیل عطا کی گئی انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جھگڑا نہیں کیا اور آپ کے بارے میں انہوں نے متفرق قول نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس یہ علم آ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ یکتا اور منفرد معبود ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور بَغْيًا مفعول من اجلہ ہونے کی وجہ سے یا الَّذِيْنَ سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے (5)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

''پھر اگر (اب بھی) جھگڑا کریں آپ سے تو آپ کہہ دیجئے کہ میں نے جھکا دیا ہے اپنا سر اللہ کے سامنے اور جنہوں نے میری پیروی کی اور کہیے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی اور ان پڑھوں سے کہ کیا تم اسلام لائے پس اگر وہ اسلام لے آئیں جب تو ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیر لیں تو اتنا ہی آپ کے ذمہ تھا کہ آپ پیغام پہنچا دیں (جو آپ نے پہنچا دیا) اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے (اپنے) بندوں کو۔''

1۔ سنن ابن ماجہ، مقدمہ، صفحہ 8۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 63، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 413، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ یعنی اگر وہ جھوٹے من گھڑت اقوال اور مغالطوں کے ساتھ آپ سے جھگڑا کریں، تو آپ اپنا معاملہ اس کی طرف منسوب کیجئے جس کا ایمان اور تبلیغ میں سے آپ کو مکلف بنایا گیا ہے اور آپ کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہی ہے (1)۔ اور قول باری تعالیٰ: وَجْهِيَ بمعنی ذاتی ہے (یعنی میں نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دیا ہے) اور حدیث طیبہ میں بھی ہے: سجد وجھی للذی خلقه وصورہ (2) (میری ذات نے اسے سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اسے صورت عطا کی۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الوجہ بمعنی القصد ہے۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں خرج فلان فی وجہ کذا (فلاں اس ارادے اور قصد میں نکلا) یہ معنی سورۃ البقرہ میں مکمل طور پر گزر چکا ہے، پہلا معنی زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے۔ اور ساری ذات کو وجہ کے ساتھ اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ (چہرہ) آدمی کے تمام اعضاء میں سے زیادہ شرف وعزت والا ہے اور حواس کو جمع کرنے والا ہے۔ اور کسی شاعر نے کہا:

اسلمت وجھی لمن اسلمت　له المُزْنُ تحمل عذْبًا زُلَالًا

اس میں وجہ بمعنی ذات ذکر کیا گیا ہے۔

اور ماہر متکلمین نے اس ارشاد گرامی وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ میں کہا ہے کہ اس میں وجہ سے مراد ذات ہے (3) اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ عمل ہے جس کے ساتھ اس کی ذات کا قصد کیا جاتا ہے اور قولہ: وَمَنِ اتَّبَعَنِ میں مَنْ محل رفع میں ہے اور یہ اَسْلَمْتُ کی تا پر معطوف ہے۔ یعنی جنہوں نے میری پیروی کی انہوں نے بھی (اپنا آپ) جھکا دیا۔ اور ضمیر مرفوع متصل پر بغیر تاکید کے عطف جائز ہوتا ہے جبکہ دونوں کے درمیان فاصلہ آجائے۔

حضرت نافع، ابوعمرو اور یعقوب نے اتبعنِ میں یا کو اپنے اصل پر ثابت رکھا ہے اور دوسروں نے مصحف کی اتباع میں اسے حذف کر دیا ہے کیونکہ یہ اس میں بغیر یاء کے ہے (4)۔

اور شاعر نے کہا ہے:

لیس تُخفی یَسارتی قدرَ یوم　ولقد تُخْفِ شیمتی اِعساری

میری خوشحالی دن کی قدر کو نہیں چھپاتی بلکہ میری عادت و کردار میری تنگدستی کو چھپا دیتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ - لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور اُمِّيّٖنَ سے مراد وہ ہیں جن کی کوئی کتاب نہیں اور وہ مشرکین عرب ہیں۔ ءَاَسْلَمْتُمْ میں استفہام تقریری ہے۔ اور اس کے ضمن میں امر ہے۔ یعنی اسلموا (یعنی تم اسلام لے آؤ) علامہ طبری وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔

اور زجاج نے کہا ہے: ءَاَسْلَمْتُمْ یہ تہدید ہے اور یہی اچھا اور بہتر مفہوم ہے۔ کیونکہ معنی ہے: کیا تم اسلام لائے یا نہیں؟

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 413، دار الکتب العلمیہ
2۔ صحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، جلد 1، صفحہ 263
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 414، دار الکتب العلمیہ
4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ

اور ارشاد گرامی فَقَدِ اهْتَدَوْا میں ماضی کا صیغہ ان کے لئے ہدایت کے وقوع اور اس کی تحصیل میں اظہار مبالغہ کے لئے ہے(1)۔ اور الْبَلٰغُ بلغ کا مصدر ہے اس کے فعل میں عین کلمہ مخفف ہے۔ (بَلَغَ) یعنی بلاشبہ آپ پر صرف تبلیغ کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ حکم ان میں سے ہے جو جہاد کے ساتھ منسوخ ہو چکا ہے اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول اس آیت کی تاریخ نزول کی پہچان کا محتاج ہے۔ ظاہر تو یہی ہے کہ یہ آیت وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، کیونکہ معنی یہ ہے کہ بلاشبہ آپ پر یہ لازم ہے کہ آپ کی طرف قتال وغیرہ احکام میں سے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپ وہ ان تک پہنچا دیں (2)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۞ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۞

"بے شک جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے ہیں انبیاء کو ناحق اور قتل کرتے ہیں ان لوگوں کو جو حکم کرتے ہیں عدل و انصاف کا لوگوں میں سے تو خوشخبری دو انہیں دردناک عذاب کی۔ یہ ہیں وہ (بدنصیب) اکارت گئے جن کے اعمال دنیا میں اور آخرت میں اور نہیں ہے ان کے لئے کوئی مددگار۔"

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ ابو العباس المبرد نے کہا ہے: بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ تھے ان کے پاس انبیاء علیہم السلام انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کے لئے آئے تو انہوں نے انہیں قتل کر دیا اور پھر ان کے بعد مومنین میں سے کچھ لوگ اٹھے اور انہوں نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے انہیں بھی قتل کر دیا، پس انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور اسی طرح معقل بن ابی مسکین نے کہا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات بغیر کتاب کے بنی اسرائیل کے پاس آتے رہے اور وہ انہیں قتل کرتے رہے۔ پھر انبیاء علیہم السلام کے متبعین میں سے ایک گروہ اٹھا اور وہ انہیں عدل و انصاف کا درس دینے لگا، تو وہ بھی قتل کئے جانے لگے (3) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بری قوم وہ قوم ہے جو ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں سے عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں اور کتنی بری ہے وہ قوم جو نیکی کا حکم نہیں دیتے اور منکر سے منع نہیں کرتے اور کتنی بری قوم ہے وہ جس میں بندۂ مومن احتیاط اور پرہیز کے ساتھ چلتا ہے (4)"۔

اور حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بنی اسرائیل نے دن کے اول حصہ کی ایک ساعت میں تینتالیس انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا، پھر بنی اسرائیل کے لوگوں میں سے ایک سو بارہ آدمی اٹھے اور انہوں نے نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا تو اسی دن کے آخری حصہ میں وہ سب کے سب قتل کر دیئے گئے اور وہ وہی لوگ ہیں جن کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 414، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ جامع البیان، جلد 2، صفحہ 253
4۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 2، صفحہ 23، حدیث نمبر 2145

ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے (1)''۔ اسے المہدوی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

اور شعبہ نے ابو اسحاق عن ابی عبیدۃ عن عبداللہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ بنی اسرائیل ایک دن میں ستر انبیاء علیہم السلام کو قتل کرتے رہے پھر دن کے آخر میں ان کی سبزیوں کے بازار لگ گئے (2)۔ پس اگر کہنے والا کہے کہ وہ جنہیں یہ نصیحت کی گئی ہے انہوں نے کسی نبی کو قتل نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ان کے فعل کے ساتھ راضی ہیں جنہوں نے قتل کیا ہے پس یہ بھی انہیں کی طرح ہو گئے۔ اور یہ بھی کہ انہوں نے بھی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے ساتھ قتال کیا اور انہوں نے ان کے قتل کا ارادہ اور قصد کیا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ (الانفال: 30) (اور یاد کرو جب خفیہ تدبیریں کر رہے تھے آپ کے بارے میں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا تاکہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو شہید کر دیں۔)

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سابقہ امتوں میں واجب تھا اور یہی رسالت کا فائدہ اور نبوت کی خلافت ہے۔ حسن نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے نیکی کا حکم دیا یا برائی سے روکا تو وہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے اور اس کی کتاب کا خلیفہ ہے (3)''۔

اور درہ بنت ابی لہب نے بیان کیا ہے ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر پر تشریف فرما تھے تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں میں سے بہتر کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''(وہ) جس نے انہیں نیکی کا حکم دیا اور انہیں برائی سے منع کیا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے لئے ڈرایا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب انہیں جمع اور اکٹھا کیا (4)''۔ اور قرآن کریم میں ہے: اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ (التوبہ: 67) (منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک جیسے ہیں حکم دیتے ہیں برائی کا اور روکتے ہیں نیکی سے۔)

پس اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مومنین اور منافقین کے درمیان فرق بنا دیا ہے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ مومن کے اوصاف میں سے خاص ترین وصف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور اس کا سرخیل اسلام کی طرف دعوت دینا اور اس پر قتال کرنا ہے۔ پھر امر بالمعروف ہر ایک کے لائق اور مناسب نہیں ہوتا۔ بلاشبہ اسے سلطان وقت قائم کرتا ہے کیونکہ حدود کا قیام اسی کے سبب ہوتا ہے، تعزیر اس کی رائے کے سپرد ہوتی ہے، قید کرنا اور چھوڑنا اسی کے حوالے ہوتا ہے اور جلاوطنی وغیرہ کے احکام اسی کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ پس وہ ہر شہر میں نیک، صالح، طاقتور، عالم اور امانتدار آدمی مقرر کرے گا اور اسے ان احکام کے نفاذ کا حکم دے گا اور اس طرز پر حدود بغیر کسی زیادتی کے جاری رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج: 41) (وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور حکم کرتے ہیں (لوگوں کو)

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 297　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 414، دار الکتب العلمیہ

3۔ کنز العمال، جلد 3، صفحہ 77، حدیث نمبر 5564　4۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 6، صفحہ 432

نیکی کا اور روکتے ہیں (انہیں) برائی سے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ اہل السنت کے نزدیک ناہی کے لئے عادل ہونا شرط نہیں ہے بخلاف مبتدعہ کے وہ کہتے ہیں: کسی کو عادل کے سوا کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ نظریہ ساقط الاعتبار ہے، کیونکہ عدالت تو مخلوق میں سے قلیل لوگوں میں محصور ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمام لوگوں میں عام ہے اور اگر وہ اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کریں، اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ: 44) (کیا تم حکم کرتے ہو (دوسرے) لوگوں کو نیکی کا اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو) اور قول باری تعالیٰ: كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ اور اسی طرح کی دیگر آیات سے۔ (الصف) (بڑی ناراضگی کا باعث ہے الله کے نزدیک کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرتے نہیں ہو) تو انہیں کہا جائے گا: ان آیات میں وہ عمل کرنے پر مذمت بیان کی گئی ہے جس سے منع کیا گیا ہے نہ کہ یہ مذمت نہی عن المنکر کرنے پر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس عمل سے منع کیا گیا ہے اسے کرنے والا اس کی نسبت زیادہ قبیح ہے جو اسے نہیں کرتا اور اسی وجہ سے وہ جہنم میں اسی طرح گھومتا رہے گا جس طرح گدھا چکی کے ساتھ گھومتا ہے۔ ہم نے اس کی تفصیل سورۃ البقرہ میں قول باری تعالیٰ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ کے تحت بیان کر دی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ مسلمانوں نے اس بارے میں اجماع کیا ہے جو ابن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ منکر کو تبدیل کرنا ہر اس پر واجب ہے جو اس پر قادر ہو اور جبکہ اس فریضہ (تغییر منکر) کی ادائیگی میں اسے ایسی ملامت اور خوف لاحق ہو جو باعث اذیت نہ ہو پھر بھی اس فریضہ کی ادائیگی اس پر واجب ہے اور اگر وہ قدرت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنی زبان سے روکے اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اپنے دل سے (برا جانے) اس پر اس سے زیادہ کچھ نہیں...... اور جب وہ اپنے دل سے برا جانے تو پھر وہ اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داری ادا کرے جب وہ اس کے سوا کچھ استطاعت نہ رکھتا ہو۔ بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید میں بہت زیادہ احادیث مروی ہیں لیکن وہ استطاعت اور قدرت کے ساتھ مقید ہیں۔ حسن نے کہا ہے: بلاشبہ مومن کو امید کے لیے اور جاہل کو تعلیم کے لیے کلام کی جاتی ہے۔ پس وہ جس نے اپنی تلوار یا کوڑا رکھ دیا اور پھر کہا: اِتَّقِنِیْ اِتَّقِنِیْ (مجھ سے تو بچ اور ڈر) تو اس میں نہ تیرے لئے کچھ (خطرہ) ہے اور نہ اس کے لئے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسے آدمی کے بارے میں جو منکر (برائی) کو دیکھے اور اسے تبدیل کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے دل سے الله تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ اعتراف کرے کہ وہ اسے ناپسند کرتا ہے (1)۔ ابن لہیعہ نے اعرج سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مومن کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔'' صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اپنے آپ کو ذلیل کرنا کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ایسی بلا اور مصیبت سے تعرض کرتا ہے جس کے لئے وہ استطاعت نہیں رکھتا (2)''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن ماجہ نے اسے علی بن زید بن جدعان عن الحسن بن جندب عن حذیفہ عن النبی

1۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 2، صفحہ 28، حدیث نمبر 2178

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 299۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے بیان کیا ہے(1)۔ اوران دونوں میں کلام ہے۔ اور بعض صحابہ کرام سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: آدمی جب کسی برائی کو دیکھے اور وہ اسے روکنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ تین بار یہ کہے اللّٰھم ان ھذا منکر (اے اللہ! بلاشبہ یہ منکر (برائی) ہے پس جب اس نے یہ کہہ دیا تو اس نے وہ کردیا جو اس پر (لازم) تھا۔

ابن عربی نے خیال کیا ہے کہ جسے برائی کے زوال کی امید ہو اور اس کی تبدیلی سے اسے اپنی ذات پر ضرب یا قتل کا خوف ہو تو اکثر علماء کے نزدیک اس خطرہ کے وقت اس کا اس مشقت میں پڑنا جائز ہے اور اگر برائی کے زوال کی امید نہ ہو تو پھر ان کے نزدیک کون سا فائدہ ہے۔ فرمایا: قسم بخدا! میرے نزدیک جب نیت خالص ہے تو اسے چاہیے وہ اس مشقت میں پڑ جائے کیفیت جو بھی ہو اور کسی کی پرواہ نہ کرے(2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس کے خلاف ہے جو ابو عمر نے اجماع کا ذکر کیا ہے اور یہ آیت قتل کا خوف ہونے کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جواز پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ (لقمان: 17) (نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے۔) اور یہ اشارہ اذیت پہنچانے کی طرف ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ائمہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''تم میں سے جو کوئی برائی کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے روک دے اور اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھے تو پھر اپنی زبان سے روک دے اور اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو پھر اپنے دل سے (اسے برا سمجھے) اور یہ کمزور ترین ایمان ہے(3)''۔ علماء نے کہا ہے: ہاتھ کے ساتھ امر بالمعروف امراء (حکام وقت) پر لازم ہے اور زبان کے ساتھ امر بالمعروف علماء کے ذمہ ہے اور دل کے ساتھ ضعفاء یعنی عوام الناس پر لازم ہے۔ پس روکنے کے لئے برائی کا ازالہ کرنا جب زبان کے ساتھ ممکن ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اسے روکے۔ اور اگر اس کے لئے سزا یا قتال کے بغیر ازالہ ممکن نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ یہ بھی کرے۔ اور اگر برائی قتال کے بغیر زائل ہو جائے تو پھر قتال جائز نہیں اور یہ مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے لیا گیا ہے: فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ (الحجرات: 9) (تو پھر سب (مل کر) لڑو اس سے جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف)

اور اسی پر علماء نے اس کی بنیاد رکھی ہے کہ جب کوئی کسی ذات پر یا مال پر حملہ آور کو اپنی ذات سے یا اپنے مال سے یا کسی اور کی ذات سے دور ہٹائے تو اس کا تو حق ہے لیکن اس پر کوئی شے (بطور تاوان) لازم نہیں۔ اگر زید نے عمرو کو دیکھا کہ اس نے بکر کا مال (اٹھانے یا ضائع کرنے کا) قصد کیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس سے اسے روکے جبکہ مال کا مالک اس پر قادر نہ ہو

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 299۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 266

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 51۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر، حدیث نمبر 4002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور نہ اس کے ساتھ راضی ہو۔ حتیٰ کہ علماء نے کہا: اگر ہم [قصاص] بھی فرض کر لیں۔ اور کہا گیا ہے: ہر شہر میں جس میں چار قسم کے لوگ ہوں تو اس کے رہنے والے آزمائش اور بلا سے محفوظ رہتے ہیں۔ امام عادل جو ظلم نہ کرتا ہو اور عالم جو راہ ہدایت پر گامزن ہو اور مشائخ جو نیکی کا حکم دیتے ہوں اور برائی سے روکتے ہوں اور علم کے حصول اور قرآن کریم کی تعلیم پر برانگیختہ کرتے ہوں۔ اور ان کی عورتیں پردے میں رہتی ہوں اور زمانہ جاہلیت کی طرح وہ زیب و آرائش کا اظہار نہ کرتی ہوں۔

مسئلہ نمبر 6۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عرض کی گئی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: "جب تم میں وہ ظاہر ہو جائے جو تم سے پہلی امتوں میں ظاہر ہوا" ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پہلی امتوں میں کیا ظاہر ہوا؟ تو آپ نے فرمایا: الملك فی صغارکم والفاحشة فی کبارکم والعلم فی رذالتکم (حکمرانی تمہارے چھوٹوں اور گھٹیا لوگوں میں ہو اور تمہارے بڑوں (اعلیٰ قسم کے لوگوں) میں فحاشی عام ہو جائے اور علم تمہارے رذیل (اور کمینے) لوگوں میں ہو۔) زید نے بیان کیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے والعلم فی رذالتکم یعنی جب علم فاسق لوگوں میں آ جائے۔ اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے (1)، اس باب کا مزید بیان سورۃ المائدہ وغیرہا میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور فَبَشِّرْهُمْ اور حَبِطَتْ کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

"کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا کچھ حصہ کتاب کا (جب) بلائے جاتے ہیں کتاب الٰہی کی طرف تا کہ تصفیہ کر دے ان کے باہمی جھگڑوں کا تو پیٹھ پھیر لیتا ہے ایک گروہ ان میں سے درآنحالیکہ وہ روگردانی کرنے والے ہوتے ہیں۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت اس سبب سے نازل ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المدراس میں یہودیوں کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے اور آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا، تو نعیم بن عمرو اور حارث بن زید نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کون سے دین پر ہیں؟ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ میں ملت ابراہیم علیہ السلام پر ہوں۔" تو ان دونوں نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام تو یہودی تھے۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میرے پاس تورات لے آؤ پس وہی ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گی۔" تو ان دونوں نے اس کا انکار کر دیا تب یہ آیت نازل ہوئی۔

اور نقاش نے بیان کیا ہے: یہ آیت اس لئے نازل ہوئی کیونکہ یہودیوں کی ایک جماعت نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 299

نبوت کا انکار کر دیا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''تم میرے پاس تورات لے آؤ اس میں میری صفات موجود ہیں۔'' تو انہوں نے انکار کر دیا(1)۔ جمہور نے لِيَحْكُمَ پڑھا ہے اور ابوجعفر یزید بن القعقاع نے لِيُحْكَمَ یا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے(2) اور پہلی قرأت احسن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (الجاثیہ:29) (یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ)

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ جس کو دعوت دی جائے اس کا حاکم کے پاس پیش ہونا واجب ہے کیونکہ اسے کتاب اللہ کی طرف دعوت دی گئی ہے، پس اگر وہ اسے قبول نہ کرے تو وہ مخالف ہو گیا اور مخالف کی قدر و منزلت کے مطابق اس پر ادب سکھانے کے لئے زجر و توبیخ کرنا متعین ہو جاتا ہے۔ اور یہی حکم ہمارے پاس اندلس اور بلاد عرب میں جاری ہے، لیکن دیار مصر میں ایسا نہیں ہے۔ اور یہ وہ حکم ہے جسے ہم نے سورۃ النور میں پوری تفصیل کے ساتھ اس ارشاد باری تعالیٰ کے تحت بیان کیا ہے: وَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْۤا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْۤا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (النور) (اور جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ فیصلہ کرے ان کے درمیان تو اس وقت ایک جماعت ان میں روگردانی کرنے لگتی ہے..... (بلکہ در حقیقت) وہ خود ظالم ہیں)

اور زہری نے حسن سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جسے اس کے خصم نے مسلمان حکام میں سے کسی حاکم کے پاس بلایا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ظالم ہو اور اس کا کوئی حق نہ ہو(3)''۔ ابن عربی نے کہا ہے: ''یہ حدیث باطل ہے اور رہا آپ کا یہ قول فَهُوَ ظَالِمٌ تو یہ کلام صحیح ہے اور جہاں تک فلاحق لہ کا تعلق ہے تو وہ صحیح نہیں ہے۔ اور یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ کی مراد یہ ہو أنه علی غیر الحق (کہ وہ غیر حق پر ہو) ابن خویز منداد مالکی نے کہا ہے: ہر وہ آدمی جسے حاکم کی مجلس کی طرف بلایا جائے اس پر واجب ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرے جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ حاکم فاسق ہے یا اسے مدعی اور مدعیٰ علیہ کے درمیان عداوت کا علم ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور اس آیت میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ سابقہ شرائع ہمارے لئے بھی شریعت ہیں سوائے اس حکم کے جس کے منسوخ ہونے کا ہمیں علم ہو۔ اور یہ کہ سابقہ انبیاء علیہ السلام کی شریعتوں کے مطابق فیصلہ کرنا ہم پر واجب ہوتا ہے، اس کا بیان آگے آ رہا ہے۔ اور یہ کہ تورات نہ ہم پڑھیں گے اور نہ جو کچھ اس میں ہے اس پر ہم عمل کریں گے، کیونکہ وہ جن کے قبضہ میں ہے وہ اس پر امین نہیں ہیں اور انہوں نے اس میں تغیر و تبدل کر دیا ہے اور اگر ہم جان لیں کہ اس میں کوئی ایسی شے ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا تو ہمارے لئے اس کی قرأت جائز ہے۔ اور اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جبکہ انہوں نے حضرت کعب کو فرمایا: ''اگر تو جان لے کہ یہ وہی تورات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ بن عمران پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 416-415، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضا
3۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب آداب القاضی، جلد 10، صفحہ 140

نازل فرمایا ہے تو پھر تو اسے پڑھ۔

اور حضور نبی کریم ﷺ اس کے بارے جانتے تھے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا اسی لئے آپ نے انہیں اس کی طرف اور اسی کے مطابق فیصلہ کرنے کی طرف دعوت دی۔ اس کا بیان عنقریب سورۃ المائدہ میں آئے گا اور ان اخبار کا بیان جو اس کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اسی بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَ غَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

''اس (بیباکی) کی وجہ یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ بالکل نہ چھوڑے گی ہمیں دوزخ کی آگ مگر چند دن گنے ہوئے اور فریب میں مبتلا رکھا انہیں ان کے دین کے معاملہ میں ان باتوں نے جو وہ خود گھڑا کرتے تھے۔''

یہ (ان کے) پیٹھ پھیرنے اور اعراض کرنے کی طرف اشارہ ہے، اور ان کے اپنے اس قول سے دھوکہ کھانے کی طرف: نحن ابناء اللہ و احباوہ اور اسی طرح کے ان کے دیگر اقوال۔ اور سورۃ البقرہ کے اس قول کے معنی میں کلام گزر چکی ہے: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ۔

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۪ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

''تو کیا حال ہوگا (ان کا) جب ہم جمع کریں گے انہیں اس روز جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

یہ توقیف اور تعجب کی جہت پر حضور نبی مکرم ﷺ اور آپ کی امت کو خطاب ہے (1)، یعنی کیا حال ہوگا ان کا یا وہ کیا کریں گے جب قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے اور ان سے ان کے وہ حسن مضمحل ہو جائیں گے جن کا وہ دنیا میں دعویٰ کرتے تھے اور جو کچھ انہوں نے اپنے کفر، اپنی جرأت اور اپنے قبیح اعمال میں سے کمایا اس کا انہیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

قول باری تعالیٰ لِيَوْمٍ میں لام بمعنی فی ہے، کسائی نے یہی کہا ہے۔ اور بصریوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے لحساب یوم۔ (اس دن کے حساب کے لئے) اور طبری نے کہا ہے: لما یحدث فی یوم۔ (2) (اس کے لئے جو اس دن میں ظاہر ہوگا)

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾

''(اے حبیب! یوں) عرض کرو اے اللہ! اے مالک مالکوں کے تو بخش دیتا ہے ملک جسے چاہتا ہے اور چھین

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 416، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

لیتا ہے ملک جس سے چاہتا ہے اور عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ذلیل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے تیرے ہی ہاتھ میں ہے ساری بھلائی بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ وہ سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی، شہد اللہ اور قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾ نازل فرمائے، تو یہ عرش کے ساتھ معلق ہوگئیں (اس طرح کہ) ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہ تھا اور انہوں نے عرض کی: اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں دار الذنوب اور ان لوگوں کی طرف اتار رہا ہے جو تیری نافرمانی کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے میری عزت وجلال کی قسم! کوئی بندہ ہر فرض نماز کے بعد تمہیں نہیں پڑھے گا مگر میں اسے حظیرۃ القدس میں اس کے اعلیٰ مقام پر سکونت عطا فرماؤں گا اور یہ کہ میں اس کی طرف ہر روز اپنی مخفی آنکھوں کے ساتھ ستر بار دیکھوں گا اور یہ کہ میں ہر روز اس کی ستر حاجات پوری فرماؤں گا ان میں سے سب سے ادنیٰ مغفرت ہے اور یہ کہ میں اسے ہر دشمن سے پناہ عطا فرماؤں گا اور اس کے خلاف اس کی مدد کروں گا اور جنت میں داخل ہونے سے کوئی شے اس کے لئے مانع اور رکاوٹ نہیں ہوگی مگر یہ کہ وہ فوت ہوجائے۔''

اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں ایک دن حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روک دیا گیا اور میں آپ کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا نہ کرسکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے معاذ! تجھے نماز جمعہ سے کس شے نے روکا ہے؟'' میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یوحنا بن باریا یہودی کا مجھ پر ایک اوقیہ چاندی قرض تھا اور وہ میرے دروازے پر میری تاک میں تھا، پس مجھے یہ خوف لاحق ہوا کہ وہ مجھے آپ سے روک دے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے معاذ! کیا تو پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تیرا قرض ادا فرمادے؟'' میں نے عرض کی: ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر روز یہ پڑھا کر قل اللهم مالك الملك ... تا قوله ... بغير حساب رحمن الدنيا والآخرة رحيمهما تعطي منهما من تشاء وتمنع منهما من تشاء اقض عني ديني (اے دنیا اور آخرت میں بہت زیادہ رحم فرمانے والے اور مہربان تو جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے تو مجھ سے میرا قرض ادا فرمادے) تو اگر تجھ پر اتنا سونا قرض ہوگا جس سے ساری زمین بھر جائے تو یقیناً اللہ تعالیٰ تجھ سے اسے ادا فرمائے گا۔'' اسے ابونعیم الحافظ نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت عطا خراسانی سے بھی روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قرآن کریم میں سے چند آیات یا کلمات سکھائے۔ زمین میں کوئی مسلمان نہیں ہے جو ان کے ساتھ دعا مانگے اور وہ ستایا ہوا ہو یا اس پر تاوان ہو یا وہ مقروض ہو مگر اللہ تعالیٰ اس کی حاجت کو پورا فرمادے گا اور اس کے غم اور پریشانی کو دور فرمادے گا، مجھے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روک لیا گیا۔ پھر آگے مذکورہ روایت بیان کی۔ حضرت عطا کی حدیث غریب ہے انہوں نے اسے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت کیا ہے۔

اور حضرت ابن عباس اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم نے بیان فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ فتح کیا اور اپنی امت کے ساتھ ملک فارس اور روم کا وعدہ فرمایا تو منافقین اور یہودیوں نے کہا: یہ بعید از امکان ہے! ملک فارس اور روم کہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آسکتے ہیں! وہ ان سے کہیں زیادہ عزت والے اور طاقتور ہیں، کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کافی نہیں ہوا کہ یہ ملک فارس اور روم کا طمع کررہے ہیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے اس قول میں باطل نظریہ کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی: ''بے شک عیسیٰ علیہ السلام ہی خدا ہیں'' اور وہ اس طرح کہ یہ اوصاف ہر صحیح الفطرت آدمی کے لئے یہ واضح اور ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے کوئی شے نہیں ہیں (2)۔ ابن اسحاق نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کے عناد اور ان کے کفر کے بارے آگاہ کیا ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ایسی آیات اور معجزات عطا فرمائے ہیں جو ان کی نبوت پر دلالت کرتے ہیں مثلاً مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ لیکن اللہ تعالیٰ ان اشیاء میں منفرد اور یکتا ہے۔ ارشاد گرامی ہے: تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ مزید فرمایا: تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۖ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۖ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۝ پس اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام الٰہ ہوتے تو یہ اختیار ان کے پاس بھی ہوتا۔ پس اس میں یہی قیاس ہے اور یہی واضح نشانی ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلِ اللّٰهُمَّ علمائے نحو نے لفظ اللّٰهُمَّ کی ترکیب میں اختلاف کیا ہے۔ لیکن ان کا اس پر اجماع ہے کہ اس میں ھا مضموم ہے اور میم مفتوح مشدد ہے اور یہ منادیٰ ہے (3) اور اعشیٰ کے قول میں میم مخفف بھی مذکور ہے۔

کدعوۃ من ابی رباح یسمعھا اللّٰھمَ الکُبار

جیسا کہ ابو رباح کی دعا اسے انتہائی عظمت وشان والا معبود حقیقی سن رہا ہے۔

خلیل، سیبویہ اور تمام بصریوں نے کہا ہے: اللّٰھم کی اصل یا اللہ ہے، پس جب کلمہ کو حرف ندا یا کے بغیر استعمال کیا گیا تو انہوں نے اس کا بدل میم مشدد کو بنا دیا پس وہ دو حروف لائے اور وہ دو میمیں ہیں دو حرفوں کے عوض اور وہ دونوں یا اور الف ہیں۔ اور ھا پر ضمہ یہ اسم منادیٰ مفرد کا ضمہ ہے۔ اور امام فراء اور علمائے کوفہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اللّٰھم میں اصل یا اللہ اُمّنا بخیر۔ پھر اسے حذف کر دیا گیا اور دو کلموں کو ملا دیا گیا اور ھا پر ضمہ یہ وہی ضمہ ہے جو اُمّنا میں تھا۔ جب ہمزہ کو حذف کر دیا گیا تو حرکت منتقل ہو گئی (4)۔

نحاس نے کہا ہے: بصریوں کے نزدیک یہ بہت بڑی خطا ہے اور اس میں قول وہی ہے جو امام خلیل اور سیبویہ نے کیا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ محال ہے کہ وہ ضمہ چھوڑ دیا جائے جو ندا مفرد پر دلیل ہے اور یہ کہ لفظ اللہ میں اُمّ کا ضمہ رکھا جائے یہ تو اللہ تعالیٰ کے اسم میں الحاد ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ زجاج کی طرف سے انتہائی غلو اور زیادتی ہے (5)۔ اور انہوں نے

1۔ اسباب النزول الواحدی، صفحہ 63
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 416، دار الکتب العلمیہ
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً

یہ خیال کیا ہے کہ انہوں نے کبھی بھی یا اللہ اُمَّ نہیں سنا۔ اور نہ ہی عرب یہ کہتے ہیں: یا اللّٰھُمَّ۔ اور کوفیوں نے کہا ہے: بلاشبہ کبھی کبھی حرف ندا اَللّٰھُمَّ پر داخل ہو جاتا ہے اور اس پر انہوں نے راجز کا یہ قول بیان کیا ہے۔ غفرتَ أو عذّبت یا اللّٰھمّا (اے اللہ! تو بخش دے یا تو عذاب دے)

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

وَ مَا علیكِ أن تقولِی كلّما سبّحتِ أو هلّلتِ یا اللّٰھُمَّ ما

تجھ پر لازم نہیں کہ جب بھی تو سبحان اللہ یا لاَ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے تو کہے یا اللّٰھُمَّ ما (اے اللہ!)

اُردُد علینا شیخنا مسلّما فَإننا من خیرہ لن نُعْدَما (1)

تو ہم پر ہمارے شیخ کو صحیح سالم لوٹا دے پس ہمیں ان کی خیر و برکت سے ہرگز محروم نہ کیا جائے۔

کسی اور نے کہا:

انی اذا ما حَدَث أَلَمَّا اقول یا اللّٰھم یا اللّٰھمّا

بلاشبہ جب کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش آتا ہے تو میں کہتا ہوں اے اللہ! اے اللہ!

انہوں نے کہا ہے: اگر میم حرف ندا کا عوض ہوتی تو یہ دونوں جمع نہ ہوتے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ شاذ ہے اور اس کا قائل معروف نہیں اور اسے چھوڑا نہیں جا سکتا ہے جو کتاب اللہ میں ہے (2) اور یہ تمام دیوان العرب میں ہے اور اسی کی مثل اس قول میں بھی وارد ہے۔

هما نَفَثا فی فِیَّ من فَمَوَیهما علی النابح العاوی أشدّ رِجَامِ

کوفیوں نے کہا ہے: بلاشبہ فم اور ابنم میں میم مخفف کا اضافہ کیا جاتا ہے لیکن میم مشدد کا اضافہ نہیں کیا جاتا (3)۔ اور بعض نحویوں نے کہا ہے جو کچھ کوفیوں نے کہا ہے وہ خطا اور غلطی ہے۔ کیونکہ اگر اس طرح ہوتا جیسے انہوں نے کہا ہے تو پھر یہ کہا جانا واجب اور ضروری ہے: اللّٰھم اور اسی پر اقتصار کیا جائے کیونکہ اس کے ساتھ دعا ہے۔ اور یہ بھی کہ آپ کہتے ہیں: انت اللّٰھم الرزّاق۔ پس اگر اس طرح ہو جیسے انہوں نے دعویٰ کیا ہے تو تو نے مبتدا اور خبر کے درمیان دو جملوں کے ساتھ فاصلہ کر دیا۔

نضر بن شمیل نے کہا ہے: جس نے اللّٰھم کہا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کو اس کے جمیع اسماء کے ساتھ پکارا۔ اور حسن نے کہا ہے: اللّٰھم دعا کو جامع ہوتا ہے (4)۔

قولہ تعالیٰ: مٰلِكَ الْمُلْكِ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ عزوجل سے عرض کی کہ وہ آپ کی امت کو ملک فارس عطا فرمائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (5)۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے ملک فارس اور روم آپ کی امت کو عطا فرما دے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ ایضاً 5۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 445

تعلیم دی کہ وہ ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگیں۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور مٰلِكَ سیبویہ کے نزدیک منصوب ہے اس بنا پر کہ یہ ندا ثانی ہے، اور اسی کی مثل یہ ارشاد گرامی ہے: قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور ان کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ اسے اللّٰهُمَّ کی صفت بنایا جائے کیونکہ اس کے ساتھ میم ملی ہوئی ہے، اور محمد بن یزید اور ابراہیم بن سری الزجاج نے ان سے اختلاف کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے: مالک ترکیب میں اسم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اسی طرح فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں ہے۔ ابوعلی نے کہا ہے: یہی ابوالعباس المبرد کا مذہب ہے اور جو سیبویہ نے کہا ہے وہ زیادہ صحیح اور زیادہ واضح ہے۔ اور وہ اس لئے کہ اسماء موصوفہ میں اللھم کی طرز پر کوئی شے نہیں ہے کیونکہ یہ اسم مفرد ہے اور اس کے ساتھ (اسم) صوت کو ملایا گیا ہے اور اصوات کی صفت نہیں لگائی جاتی جیسا غَاق اور اس کے مشابہ الفاظ۔ اور اسم مفرد کا حکم یہ ہے کہ اس کی صفت نہ لگائی جائے اگرچہ علمائے (نحو) نے کئی مقامات پر اس کی صفت لگائی ہے۔ اور جب یہاں وہ اسم ملا دیا گیا جس کی صفت نہیں لگائی جاتی تو پھر قیاس یہی ہے کہ صفت نہ لگائی جائے کیونکہ یہ صوت کے ساتھ ملنے کے سبب صوت کی طرح ہو گیا ہے۔ جیسا کہ حَيَهل پس اس کی صفت نہیں لگائی گئی (1)۔ اور الْمُلْكِ یہاں مراد نبوت ہے (2)۔ یہ حضرت مجاہد کا قول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد غلبہ ہے اور یہ بھی ہے کہ مراد مال اور غلام وغیرہ ہیں (3)۔ ''زجاج نے کہا ہے: معنی ہے (اے) بندوں کے مالک اور اس (شے) کے مالک جس کے وہ مالک ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی ہے اے دنیا اور آخرت کے مالک (4)۔ اور تُؤْتِي الْمُلْكَ کا معنی ہے: تو ایمان اور اسلام عطا کرتا ہے۔ مَنْ تَشَآءُ یعنی جسے تو چاہتا ہے کہ تو اسے وہ عطا فرمائے۔ اور اسی طرح اس کا مابعد بھی ہے۔ اور اس میں محذوف (کلام) مقدر ماننا ضروری ہے۔ یعنی وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ آن تنزعه منه، پھر اسے حذف کر دیا گیا۔

اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

أَلَاهل لهذا الدّهر من مُتَعَلّل　　على الناس مهما شاء بالناس يَفْعَلِ

زجاج نے کہا ہے: (اس میں اصل عبارت اس طرح ہے۔) مهما شاء ان يفعل بالناس يفعل (جب وہ لوگوں کے ساتھ کچھ کرنا چاہے تو وہ کر دیتا ہے۔) اور قول باری تعالیٰ: وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ کہا جاتا ہے: عز کا معنی ہے جب وہ بلند ہو اور غالب ہو۔ اور اسی سے ہے وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ (وہ خطاب میں مجھ پر غالب آ گیا۔) وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ذل يذل ذُلًّا (جب وہ غالب آئے اور مسلط ہو جائے۔)

طرفہ نے کہا ہے:

بطيئٍ عن الجُلّى سريعٍ إلى الخنا　　ذليلٍ بأجماع الرجال مُلَهَّدِ

بِيَدِكَ الْخَيْرُ یعنی تیرے ہی قبضے میں ہے خیر اور شر اور اسے (یعنی شر کو) حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ　2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 8　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

اور یہ بھی کہا گیا ہے: خیر کو اس لئے خاص کیا گیا ہے کیونکہ یہ دعا اور اس کے فضل میں رغبت رکھنے کا محل ہے۔ نقاش نے کہا ہے: بِيَدِكَ الْخَيْرُ کا مفہوم ہے مدد و نصرت اور غنیمت تیرے قبضہ میں ہے(1)۔ اور اہل الاشارات نے کہا ہے: ابوجہل بہت زیادہ مال پر ملکیت رکھتا تھا اور وہ غزوۂ بدر کے دن کنوئیں میں گر گیا۔ اور حضرت صہیب، حضرت بلال اور حضرت خباب رضی اللہ عنہم فقراء تھے ان کے پاس کوئی مال نہ تھا اور ان کی ملکیت ایمان تھا قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ تو ابو طالب کے یتیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھڑا کرتا ہے کنوئیں کے کنارے پر، یہاں تک کہ وہ ان ابدان کو ندا دیتا ہے جو کنوئیں میں پھینک دیئے گئے ہیں: اے عتبہ، اے شیبہ۔ تو جسے چاہتا ہے عزت اور غلبہ عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ اے صہیب، اے بلال تم یہ اعتقاد نہ رکھو کہ ہم نے تمہیں تمہارے بغض کے سبب دنیا سے روک دیا ہے۔ بیدك الخیر۔ عجز میں سے کوئی شے تمہارے لئے رکاوٹ نہیں۔ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ حق کا انعام عام ہے وہ جسے چاہتا ہے والی بنا دیتا ہے۔

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

''تو داخل کرتا ہے رات (کا حصہ) دن میں اور داخل کرتا ہے تو دن (کا حصہ) رات میں اور نکالتا ہے تو زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بے حساب۔''

حضرت ابن عباس، مجاہد، حسن، قتادہ اور سدی نے ارشاد باری تعالیٰ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ کے معنی میں بیان کیا ہے کہ تو دونوں (رات اور دن) میں سے ایک کی کمی کو دوسرے میں داخل کر دیتا ہے(2)، یہاں تک کہ دن پندرہ ساعت کا ہو جاتا ہے اور وہ طویل ترین دن ہوتا ہے اور رات نو ساعت کی ہو جاتی ہے اور وہ چھوٹی ترین رات ہوتی ہے۔ اور اسی طرح تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ کا معنی بھی ہے۔ اور یہ کلبی کا قول ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور آیت کے الفاظ یہ احتمال بھی رکھتے ہیں کہ اس میں رات اور دن کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا داخل ہو۔ اور ان میں سے ایک کا زوال دوسرے میں داخل ہونا ہو(3)۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ کے معنی میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ پس حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تو مومن کو کافر سے اور کافر کو مومن سے نکالتا ہے۔ اسی طرح حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور معمر نے حضرت زہری سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی عورتوں کے پاس تشریف لے گئے تو وہاں ایک حسین و جمیل عورت موجود تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: ''یہ کون ہے؟'' تو انہوں نے عرض کی: یہ آپ کی خالاؤں میں سے ایک ہے۔ آپ نے پھر ارشاد فرمایا: ''یہ کون ہے؟'' انہوں نے عرض کی: یہ خالدہ بنت اسود بن عبد یغوث ہے۔ تب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سبحان الذی یخرج الحی من المیت (پاک ہے وہ ذات جو زندہ کو مردہ سے نکالتی ہے) وہ عورت نیک اور صالحہ تھی اور اس کا باپ کافر تھا۔ تو اس قول کی بنا پر مراد یہ ہے کہ کافر کا دل مردہ ہے اور مومن کا دل زندہ ہے، پس موت اور حیات دونوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

مستعار ہیں۔ اور اکثر علماء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ آیت میں حیات اور موت دونوں حقیقت ہیں۔ اور حضرت عکرمہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد مرغی کو انڈے سے نکالنا ہے اس میں مرغی زندہ ہے اور انڈا مردہ ہے اور انڈا جو کہ مردہ ہے اسے مرغی سے نکالتا ہے جو کہ زندہ ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مراد نطفہ ہے جو آدمی سے خارج ہوتا ہے اور اس میں نطفہ مردہ ہے اور آدمی زندہ ہے اور آدمی نطفہ سے زندہ نکلتا ہے حالانکہ نطفہ مردہ ہے۔

اور حضرت عکرمہ اور سدی نے کہا ہے: مراد دانہ ہے جو بالی سے نکلتا ہے اور بالی دانے سے نکلتی ہے اور گٹھلی کھجور سے نکلتی ہے اور کھجور گٹھلی سے نکلتی ہے اور کھجور اور بالی میں حیات تشبیہاً موجود ہے (1)۔ پھر فرمایا: وَ تَرۡزُقُ مَنۡ تَشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ گویا کہ وہ جو کچھ عطا کرتا ہے اس کا حساب نہیں لے گا۔

لَا یَتَّخِذِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡکٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۚ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَلَیۡسَ مِنَ اللّٰہِ فِیۡ شَیۡءٍ اِلَّاۤ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً ؕ وَ یُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفۡسَهٗ ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۲۸﴾

"نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست مومنوں کو چھوڑ کر اور جس نے کیا یہ کام، پس نہ رہا (اس کا) اللہ سے کوئی تعلق مگر اس حالت میں کہ تم کرنا چاہو ان سے اپنا بچاؤ۔ اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے (یعنی غضب سے) اور اللہ ہی کی طرف (سب نے) لوٹ کر جانا ہے۔"

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنین کو منع فرمایا ہے کہ وہ کفار کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں اور انہیں دوست بنائیں۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِکُمۡ (2) اور وہاں اس معنی کا بیان آ رہا ہے۔ اور فَلَیۡسَ مِنَ اللّٰہِ فِیۡ شَیۡءٍ کا معنی ہے پس وہ اللہ کے گروہ میں سے نہیں ہے اور نہ ہی اس کے دوستوں میں سے ہے۔ (یعنی فلیس من حزب اللہ ولا من اولیائہ فی شیئ) اور یہ وَاسۡـَٔلِ الۡقَرۡیَةَ کی مثل ہے۔ سیبویہ نے بیان کیا ہے ھو منی فرسخین یعنی وہ میرے اور میرے ساتھیوں سے دو فرسخ پر ہے۔ (ای من اصحابی و معی) پھر استثناء کی اور وہ یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اور فرمایا: اِلَّاۤ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً حضرت معاذ بن جبل اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تقیہ (بچاؤ) ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کے قوی اور طاقتور ہونے سے پہلے پہلے تھا۔ پس آج اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ اور قوت عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے بچیں اور احتیاط برتیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ (تقیہ) یہ ہے کہ آدمی زبان سے قول کرے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، تو نہ وہ قتل کیا جائے گا اور نہ وہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اور حسن نے کہا ہے: تقیہ (اپنا بچاؤ کرنا) قیامت کے دن تک آدمی کے لئے جائز ہے اور قتل میں کوئی تقیہ نہیں ہے۔

حضرت جابر بن زید، مجاہد اور ضحاک نے کہا ہے: اِلَّاۤ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 418　　2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 9

اور یہ بھی کہا گیا ہے: مومن جب کفار کے درمیان موجود ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ انہیں زبان کے ساتھ دھوکہ دیتا رہے جب اسے اپنی ذات پر خوف ہے اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو۔ اور تقیہ حلال نہیں ہوتا مگر تب جب قتل کا خوف ہو یا اعضائے بدن کٹنے کا خوف ہو یا انتہائی شدید اذیت پہنچنے کا خطرہ ہو۔ اور جسے کفر پر مجبور کیا گیا تو اس کے لئے صحیح یہ ہے کہ وہ سولی چڑھ جائے اور کفریہ کلمات زبان پر نہ لائے۔ (یعنی اس پر کلمہ کفر کہنا واجب نہیں ہے) بلکہ اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ النحل میں آئے گی ان شاء اللہ۔ حمزہ اور کسائی نے تقاۃ میں امالہ کیا ہے (1) اور باقیوں نے اسے پر پڑھا ہے۔ اور تُقَاۃً اصل میں وُقَیَۃٌ بروزن فُعَلَۃٌ ہے جیسا کہ تُؤَدَۃٌ اور تہمۃ ہیں پھر واؤ کو تا سے اور یا کو الف سے بدل دیا گیا ہے۔

حضرت ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، وہ بدری اور متقی صحابی تھے اور ان کا یہود کے ساتھ معاہدہ تھا۔ پس جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ احزاب کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بلاشبہ میرے ساتھ یہود کے پانچ سو آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ میرے ساتھ نکلیں، تو ہم ان کے سبب دشمن پر غالب آسکیں گے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ الآیہ۔ (2)

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ انہوں نے وہ بعض گفتگو کی جس کا مشرکین نے ان سے ارادہ کیا، اس کا بیان سورۃ النحل میں آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَ یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ زجاج نے کہا ہے: ای و یحذرکم اللہ ایاہ اور اللہ تعالیٰ ہی تمہیں ڈراتا ہے پھر تم اس سے (یعنی ایاہ سے) اس کے سبب (یعنی نفسہ کے سبب) مستغنی ہو گئے اور وہ مستعمل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسك پس اس کا معنی ہے تو جانتا ہے جو کچھ میرے پاس ہے اور جو میری حقیقت ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے پاس ہے اور نہ وہ جو تیری حقیقت ہے۔ کسی دوسرے نے کہا: معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی سزا سے ڈراتا ہے (3) (لہٰذا) یہ وَاسْاَلِ الْقَرْیَةَ کی مثل ہے اور فرمایا: تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ تو میری غیب اور چھپی ہوئی شی کو جانتا ہے۔ اور النفس کو ضمیر کی جگہ پر رکھا گیا ہے کیونکہ اضمار نفس میں ہی ہوتا ہے۔ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ای و الی جزاء اللہ، الْمَصِیْرُ اور اللہ تعالیٰ کی جزا کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔ اس میں دوبارہ زندہ کئے جانے کا اقرار ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾

''فرما دیجئے اگر تم چھپاؤ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے یا ظاہر کرو اسے، جانتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 419، دار الکتب العلمیہ
2۔ اسباب النزول للواحدی، جلد 1، صفحہ 66
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 420، دار الکتب العلمیہ

پس وہ سینوں میں مخفی اور چھپی چیزوں کو اور ان تمام کو جن پر وہ مشتمل ہیں جاننے والا ہے اور ان تمام کے بارے جاننے والا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور انہیں جاننے والا ہے جنہیں یہ گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ علام الغیوب ہے اس سے ذرہ برابر کوئی شے پوشیدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی شے غائب ہے اس کی ذات پاک ہے لا الٰہ الا ھو عالم الغیب والشہادۃ۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

''جس دن موجود پائے گا ہر نفس جو کی تھی اس نے نیکی اپنے سامنے اور جو کچھ کی تھی اس نے برائی۔ تمنا کرے گا کہ کاش اس کے درمیان اور اس دن کے درمیان (حائل ہوتی) مدت دراز اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنے (عذاب) سے اور اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔''

يَوْمَ منصوب ہے اور اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے: وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ۔ يَوْمَ تَجِدُ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ۔ يَوْمَ تَجِدُ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۔ يَوْمَ تَجِدُ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ منقطع ہو (یعنی مذکورہ ارشادات میں سے کسی کے ساتھ یہ متصل نہ ہو۔) اس بنا پر کہ اس سے پہلے اُذْکُرْ فعل مضمر ہو۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہے: ان اللہ عزیز ذو انتقام۔ یوم تبدل الارض۔

اور مُّحْضَرًا ما کے صلہ میں ضمیر محذوف سے حال ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے یوم تجد کل نفس ما عملتہ من خیر محضراً اور یہ اس بنا پر ہے کہ تَجِدُ، وجدان الضالۃ (گمشدہ کو پانا) سے ماخوذ ہو۔ اور وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ میں ما پہلے ما پر معطوف ہو۔ اور تَوَدُّ دوسرے ما سے حال ہونے کے محل میں ہے۔ اور اگر تَجِدُ کو بمعنی تعلم بنایا جائے تو پھر مُّحْضَرًا مفعول ثانی ہے۔ اور اسی طرح تَوَدُّ بھی دوسرے مفعول کے محل میں ہوگا۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی یوم تجد کل نفس جزاء ما عملت محضراً اور یہ بھی جائز ہے کہ دوسرا ما مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو۔ اور تَوَدُّ بھی مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہو۔ اور یہ صحیح نہیں ہے کہ ما بمعنی جزا ہو۔ کیونکہ تَوَدُّ مرفوع ہے۔ اور اگر یہ ماضی ہوتا تو اس کا جزا ہونا جائز ہوتا اور کلام کا معنی اس طرح ہوتا: وما عملت من سوء ودت لو ان بینھا و بینہ امدا بعیداً (اور جو کچھ برائی اس نے کی تھی وہ تمنا کرتا ہے کاش اس کے درمیان اور اس دن کے درمیان مدت دراز حائل ہو جاتی) یعنی جیسا کہ مشرق و مغرب کے درمیان بعد ہے۔ اور جب ما کو شرطیہ بنایا جائے تو فعل مضارع مجزوم ہوتا ہے، مگر یہ کہ تو اسے حذف فا پر محمول کرے۔ اور تقدیر کلام یہ ہو: وما عملت من سو فھی تود۔ ابو علی نے کہا ہے: میرے نزدیک فراء کے قول کا یہی قیاس ہے، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ میں کہا ہے کہ یہ حذف فا کی بنا پر ہے۔ اور الْاَمَدُ کا معنی غایت (انتہا) ہے اور اس کی جمع آماد ہے۔ اور کہا جاتا ہے استولی علی الامد۔ ای غالب سابقا۔ وہ سبقت لیتے ہوئے غالب آ گیا۔

جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

اِلّا لمثلك أو من انت سابقه　　سبق الجواد اذا استولى على الامد (1)

اور الامد کا معنی غضب بھی ہے۔ کہا جاتا ہے أمِدَ أمَدًا۔ اذا غضب غضباً۔ یعنی جب وہ شدید غصے ہو جائے تو یہ جملہ کہا جاتا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

''(اے محبوب!) آپ فرمایئے (انہیں کہ) اگر تم (واقعی) محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو (تب) محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ اور بخش دے گا تمہارے لئے گناہ اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔''

الحُبُّ کا معنی ہے محبت اور اسی طرح الحِبُّ بالکسر بھی ہے۔ اور الحِبُّ بمعنی الحبیب بھی ہے جیسا کہ الخِدن اور الخدین (دوست) ہے۔ کہا جاتا ہے أحبه فهو مُحِبٌّ اور حبه يَحِبه (بالکسر) فهو مَحْبُوْبٌ (یعنی پہلا محبت کرنے والا اور دوسرا جس سے محبت کی جائے) جوہری نے کہا ہے: یہ شاذ ہے، کیونکہ مضاعف میں یفعل بالکسر نہیں آتا۔

ابوالفتح نے کہا ہے: اس میں اصل حَبُبَ ہے جیسا کہ ظَرُفَ پھر با کو ساکن کیا گیا اور اسے دوسری با میں مدغم کر دیا گیا۔ ابن الدہان سعید نے کہا ہے: حَبَّ میں دو لغتیں ہیں: حَبَّ اور أحَبَّ اور اس بنا میں حَبَّ اصل میں حَبُبَ تھا جیسا کہ ظَرُفَ اس پر ان کا یہ قول دلالت کرتا ہے: حَبُبْتَ۔ اور فَعُلَ سے صفت کا صیغہ اکثر فَعِیْلٌ کے وزن پر آتا ہے۔ ابوالفتح نے کہا ہے: اور أحَبَّ پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ یہ یا کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اور حُبَّ فَعُلَ کے وزن پر آتا ہے کیونکہ ان کا قول ہے حبیب۔ اور فعل کے وزن پر آتا ہے جیسا کہ ان کا قول محبوب ہے: اور حب متعدی سے اسم فاعل نہیں آتا، پس یہ نہیں کہا جاتا: أنا حَابّ۔ اور أفعل سے اسم مفعول بہت کم آتا ہے۔ جیسا کہ کسی کا قول ہے: مِنّي بمنزلة المُحَبّ المُكْرَم (میرے نزدیک معزز محبوب کے قائم مقام ہے) اور ابوزید نے بیان کیا ہے: حَبَبْتُه أحِبُّه۔

اور شعر بیان کیا:

فوالله لو لا تَمْرَة ما حببتُهُ　　ولا كان أدنىٰ من عُوَيف و هاشِم

لعمرك انني و طِلابَ مِصْرٍ　　لَكَالمُزْدادِ مما حَبَّ بُعْدَا

اصمعی نے بیان کیا ہے: حرف مضارع کو فتحہ دیا گیا ہے درآنحالیکہ با کیلی ہے۔ اور الحَبُّ الحابیه فارسی سے عربی بنایا گیا ہے۔ اور اس کی جمع حِباب اور حِببَةٌ آتی ہے۔ اسے جوہری نے بیان کیا ہے۔ اور یہ آیت وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ گمان کیا کہ انہوں نے جو کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دعویٰ کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں ہے، محمد بن جعفر بن زبیر نے یہی کہا ہے (2)۔

اور حسن اور ابن جریج نے بیان کیا ہے: یہ آیت اہل کتاب کی ایک جماعت کے بارے نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 421، دار الکتب العلمیہ　　2۔ اسباب النزول للواحدی، جلد 1، صفحہ 66

نحن الذین نحبُّ ربنا(1) ہم وہ ہیں جو اپنے رب سے محبت کرتے ہیں۔

اور روایت ہے کہ مسلمانوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم واللہ انا لنُحب ربنا قسم بخدا! ہم اپنے رب سے محبت کرتے ہیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ (2) ابن عرفہ نے کہا ہے: عربوں کے نزدیک محبة کا معنی ہے ارادة الشئ علی قصد له کسی شے کا قصد کرتے ہوئے اس کا ارادہ کرنا۔ اور ازہری نے کہا ہے: بندے کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کا معنی اس کا ان دونوں کی اطاعت کرنا اور ان کے حکم کی اتباع کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ اور اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ محبت کا معنی اس کا ان پر غفران اور بخشش کے ساتھ انعام فرمانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِن اللہ لایحب الکافرین یعنی وہ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔

اور سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت قرآن کی محبت ہے اور قرآن کریم کی محبت کی علامت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی علامت سنت کی محبت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور قرآن کی محبت اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور سنت کی محبت کی علامت آخرت کی محبت ہے اور آخرت کی محبت کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ سے محبت کرے اور اپنے نفس سے محبت کی علامت یہ ہے کہ وہ دنیا سے بغض رکھے اور دنیا کے بغض کی علامت یہ ہے کہ وہ اس سے صرف زادراہ اور گزارے کی مقدار حاصل کرے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کے بارے میں روایت کیا ہے فرمایا: ''(کہ تم میری اتباع کرو) نیکی، تقویٰ، تواضع اور ذلة النفس میں'' اسے ابوعبداللہ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے (3)۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: مَن اراد ان یحبه اللہ فعلیه بصدق الحدیث واداء الامانة والایؤذی جاره۔

جو یہ چاہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے تو اس پر لازم ہے کہ وہ سچ بولے، امانت ادا کرے اور یہ کہ وہ اپنے پڑوسی کو اذیت نہ پہنچائے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت فرمانے لگتا ہے تو وہ جبریل امین علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے: بلاشبہ میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر (4)۔ پس حضرت جبریل امین بھی اس سے محبت فرمانے لگتا ہے: پھر وہ آسمان میں ندا دیتا ہے اور کہتا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے سو تم بھی اس سے محبت کرو تو پھر اہل آسمان بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں فرمایا پھر اسے زمین میں قبول عام عطا فرما دیا جاتا ہے اور جب وہ کسی بندے کو مبغوض جانے تو جبریل امین علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے: بلاشبہ میں فلاں کو ناپسند کرتا ہوں پس تو بھی اسے ناپسند کر پھر جبریل امین علیہ السلام بھی اسے ناپسند کرتے ہیں پھر

1۔ اسباب النزول للواحدی، جلد 1، صفحہ 66
2۔ جامع البیان للطبری، جلد 4، صفحہ 272
3۔ نوادر الاصول فی معرفة احادیث الرسول، قل ان کنتم تحبون، صفحہ 199
4۔ صحیح بخاری، باب ذکر الملائکة، حدیث نمبر 2970، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آسمان کے باسیوں میں اعلان کر دیتے ہیں: بے شک اللہ تعالیٰ فلاں کو ناپسند کرتا ہے تو تم بھی اسے مبغوض جانو...... فرمایا...... پس وہ بھی اسے مبغوض جانتے ہیں پھر زمین میں اس کے لئے نفرت رکھ دی جاتی ہے(1)''۔ اس کے بارے مزید بیان سورۂ مریم کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابو رجا العطاردی نے فَاتَّبِعُوْنِیْ با کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور وَیَغْفِرْ لَكُمْ کا عطف یُحْبِبْكُمُ پر کیا ہے۔ اور محبوب نے ابو عمرو بن علاء سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے یغفر کی را کو لکم کی لام میں مدغم کر دیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: امام خلیل اور سیبویہ را کو لام میں ادغام کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور ابو عمرو نے اس طرح کی غلطی کرنے سے صرف نظر کیا ہے شاید وہ حرکت کو مخفی کر دیتے ہیں جیسا کہ وہ کثیر اشیاء میں ایسا کرتے ہیں۔

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ۝۳۲

''آپ فرمائیے اطاعت کرو اللہ کی اور (اس کے) رسول کی پھر اگر وہ منہ پھیریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کفر کرنے والوں کو۔''

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا یہ شرط ہے، مگر چونکہ یہ ماضی ہے اسے اعراب نہیں دیا جا سکتا (یعنی یہ معرب نہیں ہے) اور تقدیر کلام یہ ہے فان تولوا علی کفرھم و اعرضوا عن طاعۃ اللہ و رسولہ۔ (اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے اعراض کر لیں) فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے فعل کو پسند نہیں کرتا اور وہ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور فرمایا: فَاِنَّ اللّٰهَ یہ نہیں کہا: فانہ کیونکہ عرب جب کسی شے کی عظمت بیان کرتے ہیں تو اس کے ذکر کا اعادہ کرتے ہیں۔

جیسا کہ سیبویہ کے اس شعر میں ہے:

لا أری الموتَ یسبِقُ الموتَ شیٌٔ　　نَغَّصَ الموتُ ذَا الغِنَی وَالفقیرا

میں موت کو نہیں پاتا کہ کوئی شے موت سے سبقت لے جا سکتی ہے موت نے خوشحال اور فقیر آدمی کی زندگی کو مکدر اور بدمزہ کر دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝۳۳

''بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم علیہم السلام کے گھرانے کو اور عمران کے گھرانے کو سارے جہان والوں پر۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا۔ اصْطَفٰى بمعنی اختار ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے چن لیا۔ سورۃ البقرہ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اسی طرح آدم کا مادہ اشتقاق اور آپ کی کنیت کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے اور تقدیر کلام یہ ہے ان اللہ اصطفی

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ، جلد 2، صفحہ 331

دینھم بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کا دین چن لیا اور وہ دین، دین اسلام ہے، سو مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔

اور زجاج نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے زمانے کے رہنے والوں پر نبوت کے لئے چن لیا اور وَ نُوْحًا کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ ناح ینوح سے مشتق ہے اور یہ عجمی اسم ہے مگر یہ منصرف ہے کیونکہ یہ سہ حرفی ہے (اور اس کا درمیان والا حرف ساکن ہے۔) اور آپ مرسلین کے شیخ ہیں اور آپ ہی پہلے رسول ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد اہل زمین کی طرف مبعوث فرمایا اور ساتھ ہی بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں اور تمام قرابت رکھنے والی عورتیں حرام قرار دیں۔ اور جس کسی نے یہ کہا ہے کہ بعض مورخین کے نزدیک حضرت ادریس علیہ السلام آپ سے پہلے تھے، اسے وہم ہی ہے اس کا بیان سورۃ الاعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ اٰلَ کا معنی اور جس پر اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے مکمل طور پر اس کا بیان سورۃ البقرہ میں ہو چکا ہے۔ اور بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: آل ابراہیم اور آل عمران سے مراد وہ مومنین ہیں جو آل ابراہیم، آل عمران، آل یاسین اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے مومنین ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۗ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (1) (آل عمران) (بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم) اور جو (اس نبی پر) ایمان لائے اللہ تعالیٰ مددگار ہے مومنوں کا)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آل ابراہیم سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد ہے اور یہ کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم بھی آل ابراہیم میں سے ہیں (2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ آل ابراہیم سے مراد ان کی اپنی ذات ہے۔ اور اسی طرح آل عمران ہے، اس کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَقِیَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ (البقرہ: 248) (اور (اس میں) بچی ہوئی چیزیں ہوں گی جنہیں چھوڑ گئی ہے اولاد موسیٰ اور اولاد ہارون (3))

اور حدیث میں ہے: "مجھے آل داؤد کی دعاؤں میں سے ایک دعا عطا کی گئی" (4)

اور شاعر نے کہا ہے:

ولا تبک مَیْتا بعد میت اَحَبّه　　　علیّ و عباس وآلُ ابی بکر (5)

اور تو نہ رو کسی میت پر اپنے سب سے زیادہ محبت کرنے والوں کے مرنے کے بعد یعنی حضرت علی، حضرت عباس اور آل ابی بکر۔ اس میں آل ابی بکر سے مراد ان کی ذات ہے۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

یُلاقی من تذکُّرِ آلِ لَیلیٰ　　　کما یَلقَی التَسلِیمُ من العِدَادِ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 488
2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 452
3۔ صحیح بخاری، فضائل القرآن، جلد 2، صفحہ 755
4۔ صحیح بخاری، باب حسن الصوت بالقراءۃ للقرآن، حدیث 4660، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 423، دار الکتب العلمیہ

اس میں تذکر آل لیلیٰ سے مراد اس کی ذات ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آل عمران ہی آل ابراہیم ہے۔
جیسا کہ فرمایا: ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، کیونکہ آپ کی والدہ عمران کی بیٹی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: ان کی اپنی ذات مراد ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ مقاتل نے کہا ہے: وہ عمران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے باپ ہیں اور وہ عمران بن یصہر بن فاھاث بن لاوی بن یعقوب ہیں (1)۔
اور کلبی نے کہا ہے: وہ مریم کے باپ عمران ہیں اور وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ اور سہیلی نے بیان کیا ہے: وہ عمران ابن ماتان ہیں اور ان کی بیوی حنہ (بالنون) ہے۔ انبیاء علیہم السلام میں سے خاص طور پر ان کا ذکر کیا ہے کیونکہ تمام کے تمام انبیاء ورسل علیہم السلام انہیں کی نسل میں سے ہیں۔ اور عمران غیر منصرف ہے کیونکہ اس کے آخر میں الف نون زائد تان ہے۔ اور قولہ تعالیٰ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ کا معنی ہے علی عالمی زمانھم۔ (یعنی انہیں اپنے زمانے کے باسیوں پر چن لیا)، یہ اہل تفسیر کے قول کے مطابق ہے اور ترمذی حکیم ابوعبداللہ محمد بن علی نے کہا ہے: جمیع الخلق کلھم یعنی تمام مخلوق پر۔ اور کہا گیا ہے: عَلَى الْعٰلَمِيْنَ صور پھونکنے کے دن تک تمام مخلوق پر (انہیں چن لیا) اور یہ اس لئے کہ یہ رسل اور انبیاء علیہم السلام تھے اور یہی مخلوق میں چنے ہوئے تھے۔
اور رہے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! تو آپ کا مرتبہ (مقام) اصطفاء سے کہیں بلند ہے کیونکہ آپ تو اللہ تعالیٰ کے حبیب اور رحمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۞ (الانبیاء) پس اور رسل علیہم السلام رحمت کے لئے پیدا کئے گئے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو سراپا رحمت تخلیق فرمایا گیا۔ اسی لئے آپ مخلوق کے لئے امان بن گئے، جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا تو مخلوق یوم قیامت تک عذاب سے محفوظ و مامون ہوگئی۔ اور بقیہ تمام انبیاء علیہم السلام اس مقام پر فائز نہ ہوئے۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انا رحمۃ مھداۃ (2) آپ خبر دے رہے ہیں کہ آپ کی ذات اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخلوق کے لئے رحمت ہے۔ اور آپ کا قول مھداۃ کا معنی ہے: آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخلوق کے لئے ہدیہ اور تحفہ ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پانچ چیزوں کے ساتھ چنا، ان میں سے پہلی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دست قدرت کے ساتھ انتہائی حسین صورت میں تخلیق فرمایا، دوسری یہ ہے کہ انہیں تمام چیزوں کے اسماء سکھا دیئے، تیسری یہ ہے کہ ملائکہ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ انہیں سجدہ کریں، چوتھی یہ ہے کہ انہیں جنت میں سکونت عطا فرمائی اور پانچویں یہ ہے کہ انہیں ابوالبشر بنایا اور پانچ چیزوں کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام کو منتخب فرمایا: پہلی یہ کہ آپ کو ابوالبشر بنایا کیونکہ پہلے تمام کے تمام لوگ غرق کر دیئے گئے اور صرف آپ کی ذریت اور اولاد ہی باقی رہی۔ اور دوسری یہ کہ آپ کو طویل عمر عطا فرمائی اور کہا جاتا ہے: مبارک اور بشارت ہے اس کے لئے جس کی عمر طویل ہو اور اس کا عمل حسین اور اچھا ہو (3)۔ اور تیسری یہ کہ کفار اور مومنین کے بارے میں آپ کی دعا کو قبول فرمایا اور چوتھی

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 453 2۔ شعب الایمان، کتاب حب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد 2، صفحہ 164، حدیث نمبر 1446
3۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی طول العمر للمومن، حدیث نمبر 2251، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ ہے کہ آپ کو کشتی پر اٹھایا اور پانچویں یہ کہ آپ پہلے آدمی تھے جنہوں نے احکام شرعیہ کو منسوخ کیا۔ آپ سے پہلے خالاؤں اور پھوپھیوں سے شادی کرنا حرام نہ تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی پانچ چیزوں کے ساتھ چنا: پہلی یہ کہ آپ کو ابو الانبیاء بنایا، کیونکہ یہ روایت ہے کہ آپ کے زمانہ سے لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک آپ کی صلب سے ایک ہزار نبی تشریف لائے اور دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا خلیل بنایا، تیسری یہ کہ آپ کو نار نمرود سے نجات عطا فرمائی (اور اسے آپ کے لئے گلزار بنا دیا) اور چوتھی یہ کہ آپ کو لوگوں کا امام بنایا اور پانچویں یہ کہ آپ کو کچھ کلمات کے ساتھ آزمایا اور آپ کو توفیق عطا فرمائی یہاں تک کہ آپ نے انہیں مکمل فرمالیا۔ (یعنی آپ تمام آزمائشوں میں کامیاب و کامران ہوئے) پھر فرمایا وَاٰلَ عِمْرٰنَ اگر عمران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے والد ہیں تو یقینا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو عالمین پر چن لیا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم پر من وسلویٰ نازل فرمایا اور عالم میں انبیاء علیہم السلام میں سے کسی ایک کے لئے بھی ایسے نہیں ہوا۔ اور اگر عمران حضرت مریم علیہا السلام کے باپ ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے مریم کو چن لیا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے جنم دیا اور عالم میں کسی کے لئے بھی ایسا نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

''یہ ایک نسل ہے بعض ان میں سے بعض کی اولاد ہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

ذُرِّيَّةً کا معنی اور اس کا مادہ اشتقاق سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور یہاں یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے، اخفش نے یہی کہا ہے۔ ای فی حال کون بعضھم من بعض یعنی اس حال میں کہ وہ بعض بعض سے ہیں، ای ذریۃ بعضھا من ولد بعض یعنی ایک نسل ہے درآنحالیکہ ان میں سے بعض بعض کی اولاد میں سے ہیں۔ کوفیوں نے کہا ہے: بالقطع یہی ہے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ بدل ہے ای اصطفی ذریۃ بعضھا من بعض (یعنی اللہ تعالیٰ نے چن لیا ایک نسل کو جن میں سے بعض بعض کی اولاد ہیں) اور بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ کا معنی ہے یعنی دین میں ایک دوسرے کی مدد کرنے میں (باہم معاون ہیں) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا المنافقون والمنافقات بعضھم من بعض یعنی ضلالت و گمراہی میں (وہ ایک دوسرے کے مددگار ہیں)، حسن اور قتادہ نے یہی کہا ہے (1) اور بعض نے کہا ہے: وہ اجتباء، اصطفاء اور نبوت میں ایک دوسرے کا بعض ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ایک دوسرے کی نسل سے ہونا ہے اور یہ (معنی) سب سے کمزور ہے۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 10

''جب عرض کی عمران کی بیوی نے اے میرے رب! میں نذر مانتی ہوں تیرے لئے جو میرے شکم میں ہے (سب کاموں سے) آزاد کر کے، سو قبول فرمالے (یہ نذرانہ) مجھ سے بے شک تو ہی (دعائیں) سننے والا، (نیتوں کو) جاننے والا ہے۔ پھر جب اس نے جنا اسے (تو حیرت و حسرت سے) بولی اے رب! میں نے تو جنم دیا ایک لڑکی کو اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا۔ اور نہیں تھا لڑکا (جس کا وہ سوال کرتی تھی) مانند اس لڑکی کے۔ اور (ماں نے کہا) میں نے نام رکھا ہے اس کا مریم اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود (کے شر) سے۔''

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ ابوعبیدہ نے کہا ہے: اِذْ زائدہ ہے اور محمد بن یزید نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے اُذکر اِذْ۔ اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اصطفی آل عمران اذ قالت امرأۃ عمران۔ اللہ تعالیٰ نے آل عمران کو چن لیا جب عمران کی بیوی نے عرض کی۔ اور یہ حنہ بنت فاقود بن قنبل حضرت مریم علیہا السلام کی ماں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دادی تھی۔ یہ عربی نام نہیں ہے اور نہ ہی عربی میں کسی عورت کا نام حنہ معروف ہے۔ عربی میں ابو حنہ البدری ہے۔ اور اس میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ابو حبہ ہے اور یہی اصح ہے اور اس کا نام عامر ہے۔ اور حنہ کی خانقاہ شام میں ہے اور ایک دوسری بھی ہے اسے بھی دیر حنہ ہی کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ ابونواس نے کہا ہے:

يا دَيْرَ حَنَّةَ من ذات الأُكَيْرَاحِ　　مَن يَصْحُ عنك فانّي لستُ بالصاحِي

اس میں یا دَیْرَحَنَّہ سے استشہاد کیا گیا ہے۔

اور عرب میں حبہ تو کثیر ہیں، ان میں سے ایک ابو حبہ انصاری ہیں اور ابو السنابل بن بعکک جو کہ حدیث سبیعہ میں مذکور ہیں (1)۔ وہ بھی حبہ ہیں اور خنہ خاء معجمہ کے ساتھ تو کوئی معروف نہیں سوائے بنت یحییٰ بن اکثم القاضی کے اور یہ محمد بن نصر کی ماں ہے اور جنہ تو کوئی معروف نہیں سوائے ابو جنہ کے اور یہ ذی الرمہ شاعر کا ماموں ہے یہ سب ابن ماکولا کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا، نذر کا معنی پہلے گزر چکا ہے اور یہ (نذر) بندے پر لازم نہیں ہوتی مگر اس طرح کہ بندہ خود اسے اپنے اوپر لازم کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ جب حاملہ ہوئیں تو انہوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے نجات عطا فرمائی اور میں نے اسے جنا جو میرے پیٹ میں ہے تو میں اسے (سب کاموں سے) آزاد کر دوں گی۔ اور لَكَ کا معنی ہے لعبادتك یعنی تیری عبادت کے لئے اور مُحَرَّرًا حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ مفعول محذوف کی صفت ہے یعنی انی نذرت لك ما فی بطنی غلامًا محررًا تفسیر، سیاق کلام اور اعراب (ترکیب) کے اعتبار سے پہلا مفہوم زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ جہاں تک ترکیب کا تعلق ہے تو نعت کو منعوت کے قائم

1۔ صحیح بخاری، باب فضل من شهد بدرا، حدیث نمبر 3691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مقام رکھنا کئی مقامات پر جائز نہیں ہوتا اور کئی دوسرے مقامات پر مجازی طور پر جائز ہوتا ہے اور رہی تفسیر، تو کہا گیا ہے کہ عمران کی بیوی کے اس قول کا سبب یہ ہے کہ وہ عمر رسیدہ تھی بچے کو جنم نہ دے سکتی تھی۔

اور یہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں رہ رہے تھے اور وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے ایک پرندے کو دیکھا وہ اپنے بچے کو چوگ دے رہا تھا تو اس وجہ سے اس کے دل میں بھی اضطراب اور حرکت پیدا ہوئی اور اس نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ وہ اسے بچہ عطا فرمائے اور نذر مانی کہ اگر اس نے (بچہ) جنا تو وہ اسے (ہر کام سے) آزاد کر دے گی۔ یعنی وہ خالصۃً اللہ تعالیٰ کے لئے آزاد ہوگا۔ عبادت گاہ کا خادم ہوگا اور اسی کے لئے وقف ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ ہوگا۔ اور ایسا کرنا ان کی شریعت میں جائز تھا اور ان کی اولاد پر لازم تھا کہ وہ ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرے۔ پس جب اس نے حضرت مریم علیہا السلام کو جنم دیا تو کہا: رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی اے رب! میں نے ایک لڑکی کو جنم دیا ہے۔ یعنی لڑکی تو کنیسہ کی خدمت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، کہا گیا ہے یا اس وجہ سے کہ اسے حیض اور دیگر تکلیفیں لاحق ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: (یا اس وجہ سے) کہ وہ مردوں کے ساتھ اختلاط اور میل جول کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور وہ امید کر رہی تھی کہ وہ بچہ ہوگا پس اسی وجہ سے اس نے اسے آزاد کر دیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن عربی نے کہا ہے: ''اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عمران کی بیوی کے حمل تک نذر کوئی راستہ نہیں پا سکتی کیونکہ وہ آزاد تھی۔ اور اگر اس کی بیوی کنیز ہوتی تو بھی کوئی اختلاف نہیں کہ آدمی کے لئے اپنے بچے کے بارے میں نذر ماننا صحیح نہیں ہوتا تو کیونکر اس نے اس کی حالت میں تصرف کر لیا، کیونکہ اگر نذر ماننے والا غلام ہو تو اس بارے میں اس کا کوئی قول مضبوط اور پختہ نہیں۔ اور اگر آزاد ہو تو یہ صحیح نہیں کہ وہ اس کا مملوک ہو۔ اور عورت بھی اسی طرح ہے تو پھر اس بارے میں نذر کی وجہ کیا ہے؟ بلا شبہ اس کا حقیقی معنی تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ بے شک آدمی اپنے بچے کا ارادہ کرتا ہے تاکہ وہ اس سے انس حاصل کرے، اس سے مدد لے اور اس کے ساتھ اطمینان اور تسلی پائے۔ پس اس عورت نے بھی بچے سے انس حاصل کرنے اور سکون اور راحت پانے کے لئے بچے کی خواہش اور طلب کی تو جب اللہ تعالیٰ نے اس پر احسان فرما دیا تو اس نے نذر مانی کہ وہ اس سے انس حاصل کرنے کے اپنے حصہ سے دستبردار ہوتی ہے اور وہ خالصۃً اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے وقف ہوگا۔ اور یہ نیکوکار آزاد لوگوں کی نذر ہے۔ اور اس نے اس سے ارادہ یہ کیا ہے کہ وہ میری جانب سے آزاد ہوگا اور دنیا کی غلامی اور اس کی مشغولیت سے آزاد ہوگا۔ صوفیاء میں سے ایک آدمی نے اپنی ماں کو کہا: اے ماں! تو مجھے اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ دے میں اس کی عبادت کروں گا اور علم حاصل کروں گا تو ماں نے کہا: ہاں (میں نے تجھے چھوڑ دیا) پس وہ چلا گیا یہاں تک کہ اس نے غور و فکر کیا تو پھر ماں کی طرف واپس لوٹ کر آیا اور دروازے پر دستک دی تو ماں نے پوچھا: کون ہے؟ اس نے جواب دیا: میں تیرا فلاں بیٹا ہوں۔ تو ماں نے کہا: ہم نے تجھے اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ دیا ہے اور ہم تجھے واپس نہیں لوٹائیں گے (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **مُحَرَّرًا** یہ ماخوذ ہے اس حریۃ (آزادی) سے جو عبودیۃ (غلامی) کی ضد ہے۔ اسی

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 270

سے تحریر الکتاب ہے اور وہ اسے اضطراب اور فساد سے خالص (خالی) کرنا ہے۔ اور خصیف نے حضرت عکرمہ اور حضرت مجاہد سے روایت کیا ہے کہ محررہ ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور امور دنیا میں سے کسی شے کی اس میں آمیزش نہ ہو۔ اور لغت میں یہ معروف ہے کہ ہر شے جو خالص ہو اسے حر (آزاد) کہا جاتا ہے۔ اور محرر اسی معنی میں ہے۔

جیسا کہ ذوالرمہ نے بھی کہا ہے:

والقُرطُ فی حرّۃِ الذِّفریٰ مُعَلَّقُہٗ　　تباعد الحبلُ منه فهو یَضطرب

اور طین حُرّ وہ مٹی جس میں ریت نہ ہو، باتت فلانۃ بلیلۃ حُرّۃ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب پہلی رات خاوند عورت کے پاس نہ آئے اور اگر وہ اس پر قدرت پالے تو پھر اس کی رات لیلۃ شیباء کہلائے گی۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اس نے یہ کہا ہے کیونکہ نذر میں صرف مذکر قبول کیا جاتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو قبول فرما لیا۔ اور ترکیب کلام میں اُنثیٰ حال ہے اور اگر چاہے تو اسے بدل بنا لے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس نے ان کی تربیت اور پرورش کی یہاں تک کہ وہ جوان ہو گئی تو اس وقت انہیں (آزاد) چھوڑ دیا، اشہب نے اسے مالک سے روایت کیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے اسے ایک کپڑے میں لپیٹا اور مسجد چھوڑ آئی اور اپنی نذر کو پورا کر دیا اور اس سے برأت اختیار کر لی۔ شاید ان میں حجاب (پردہ) نہیں تھا جیسا کہ ابتدائے اسلام میں تھا اور بخاری اور مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک سیاہ رنگ کی عورت مسجد میں جھاڑو دیتی تھی اور وہ فوت ہو گئی۔ الحدیث۔(1)

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ یہ اس کی قرأت کے مطابق ہے جس نے وَضَعْتُ تا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ من جملہ اس کا کلام ہے، کیونکہ کلام متصل ہے اور یہ ابو بکر اور ابن عامر کی قرأت ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا اور اس کے لئے خضوع اور پاکی بیان کرنے کا معنی ہے۔ (اس سے کہ اس پر کوئی شے مخفی ہے۔) اور اس نے یہ بطریق اخبار نہیں کہا کیونکہ مومن کے دل میں یہ پختہ اور ثابت شدہ امر ہے کہ ہر شے کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور تنزیہ بیان کرنے کے طریقہ پر کہا ہے۔ اور جمہور کی قرأت کے مطابق یہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے ہے جو پہلے لایا گیا ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے کہ یہ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ سے موخر ہو وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ، مہدوی نے یہی کہا ہے۔ اور مکی نے کہا ہے: یہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے تثبیت کے طریقہ پر اطلاع ہے پس فرمایا: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اس کے بارے جو مریم کی ماں نے جنا وہ اس کے بارے کچھ کہے یا نہ کہے۔ اور اسے اس سے بھی قوت حاصل ہوتی ہے کہ اگر یہ حضرت مریم کی ماں کے کلام سے ہوتا تو کلام کا انداز یہ ہوتا: وانت اعلم بما وضعتُ، (اور تو بہتر جانتا ہے اس کے بارے جو میں نے جنا) کیونکہ اس نے اپنے قول میں پہلے کلام اس طرح پکارا ہے: رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بِمَا وَضَعْتِ تا کے کسرہ کے ساتھ مروی ہے۔ یعنی اسے یہ کہا گیا۔

1۔ صحیح بخاری، باب کنس المسجد والتقاط الخرق والقذی والعیدان، حدیث نمبر 438، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى بعض شافعیہ نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ رمضان المبارک میں دن کے وقت وطی کے سلسلہ میں عورت اپنے خاوند کی پیروی اور مطاوعت اختیار کرے تو وجوب کفارہ میں مرد عورت کے مساوی نہیں ہوگا۔

ابن عربی نے کہا ہے: اور یہ ان کی طرف سے غفلت ہے، کیونکہ یہ خبر ہم سے پہلے والوں کی شریعت میں سے ہے اور وہ اس طرح کا قول نہیں کرتے تھے۔ اور اس صالحہ عورت نے اپنے کلام کے ساتھ اس کا قصد کیا ہے جس کے بارے اس کی ظاہر حالت اور اس کے کلام کا مقطع شہادت دیتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے بچے کے لئے مسجد کی خدمت کرنے کی نذر مانی تھی۔ پس جب اس نے اسے بچی دیکھا جو اس کی صلاحیت نہیں رکھتی تو چونکہ وہ عورت ہے تو اس نے اپنے مقصود کے خلاف پائے جانے کی وجہ سے اپنے رب کی بارگاہ میں معذرت پیش کی اور ''مریم'' غیر منصرف ہے کیونکہ یہ مونث معرفہ ہے اور یہ عجمی بھی ہے۔ نحاس نے اسی طرح کہا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ ان کی لغت میں مریم کا معنی خادم الرب ہے۔ وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ اس میں ھا ضمیر سے مراد مریم ہے۔ وَذُرِّيَّتَهَا مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ کبھی ذریت کا اطلاق صرف بیٹے پر ہوتا ہے (1)۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے شیطان اسے کچوکا لگاتا ہے اور وہ شیطان کے کچوکا لگانے سے چیخ کر روتا ہے سوائے ابن مریم اور ان کی ماں کے۔'' پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ پڑھ لو۔ وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ہمارے علماء نے کہا ہے: پس اس حدیث نے یہ فائدہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کی دعا کو قبول فرما لیا ہے۔ کیونکہ شیطان سوائے مریم اور ان کے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے تمام اولاد آدم کو حتیٰ کہ انبیاء اور اولیاء کو بھی کچوکے لگاتا ہے۔

حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس کے پہلو میں کچوکا لگاتا ہے سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں کے، ان دونوں کے درمیان حجاب ڈال دیا گیا پس اس کا کچوکا حجاب پر لگا اور دونوں کے لئے اس سے کوئی شے پار نہ ہوئی (2)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اگر اس طرح نہ ہو تو پھر ان دونوں کی خصوصیت باطل ہو جاتی ہے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شیطان کے کچوکا لگانے سے جس کو مس کیا گیا ہے اس کو گمراہ کرنا اور بھٹکانا اس سے لازم آتا ہے، کیونکہ یہ ظن فاسد ہے۔ پس کتنے انبیاء اور اولیاء ہیں کہ شیطان نے فساد اور بھٹکانے کے طرح طرح کے طریقوں سے ان سے تعرض کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے محفوظ و مامون رکھا جو شیطان کا ارادہ تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر: 42) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔) یہ اس کے باوجود ہے کہ بنی آدم میں سے ہر ایک کو شیاطین میں سے اس کے ساتھی کے حوالے کیا گیا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (3)

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر 3177، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب صفۃ ابلیس وجنودہ، حدیث نمبر 3044، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2323

پس حضرت مریم اور ان کا بیٹا اگرچہ دونوں شیطان کے کچوکے سے بچا لئے گئے ہیں لیکن ان دونوں کو اس کی ملازمت اور مقارنت سے محفوظ نہیں رکھا گیا۔ واللہ اعلم۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝

''پھر قبول فرمایا اسے اس کے رب نے بڑی ہی اچھی قبولیت کے ساتھ اور پروان چڑھایا اسے اچھا پروان چڑھانا اور نگران بنا دیا اس کا زکریا کو جب بھی جاتے مریم کے پاس زکریا (اس کی) عبادت گاہ میں (تو) موجود پاتے اس کے پاس کھانے کی چیزیں (ایک بار) بولے اے مریم! کہاں سے تمہارے لئے آتا ہے یہ (رزق) مریم بولیں یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آتا ہے بے شک اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بے حساب۔ وہیں دعا مانگی زکریا نے اپنے رب سے عرض کی اے میرے رب! عطا فرما مجھ کو اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد بے شک تو ہی سننے والا ہے دعا کا۔''

قولہ تعالیٰ: فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ اس کا معنی ہے: اسے سعداء کے راستے پر چلایا۔ یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: تقبل کا معنی ہے تربیت میں کفیل بننا اور اس کے معاملات کو ادا کرنا۔ اور حسن نے کہا ہے تُقُبِّل کا معنی ہے کہ اس کے رب نے اسے رات، دن میں سے کبھی ایک ساعت بھی اذیت اور تکلیف نہیں دی۔ اور وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا سے مراد ہے اس کی خلقت کو بغیر کسی کمی و بیشی کے صحیح بنایا، پس وہ ایک دن میں اتنا بڑھتی تھی جتنا عام بچہ سال میں نشوونما پاتا ہے۔ قبول اور نبات دونوں مصدر ہیں لیکن اپنے فعل کے ہم وزن مصدر نہیں۔ فی الحقیقت مصدر تَقَبُّلًا اور اِنْبَاتًا ہیں۔

شاعر نے کہا:

أَكُفْرًا بعد ردّ الموت عنّی و بعدَ عطائكَ المائةَ الرِّتاعا

شاعر کی مراد بعدِ اعطائِك ہے۔ لیکن جب کہا اَنْبَتَها تو یہ نَبَتَ پر دلیل ہے (انبات بنت کو مستلزم ہے)

اسی طرح امرؤ القیس نے کہا ہے۔

فصِرنا الی الحسنی ورق کلامُنا و رُضْتُ فذلّت صعبةً ایّ اِذلالِ

بلاشبہ ذَلَّتْ کا مصدر ذُلٌّ ہے۔ لیکن اس نے اسے اَذْلَلَتْ کے معنی پر لوٹا دیا ہے اور اسی طرح ہر اس کا حال ہے جو اس باب میں آتا ہے۔ پس تَقَبَّلَ اور قَبِلَ کا معنی ایک ہے۔ پس معنی ہوا فقبلها رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ کہ اس کے رب نے اسے اچھی

طرح قبول کرلیا۔

اور اسی کی مثل روبہ کا قول ہے۔

وقد تَطَوَّيْتُ انطواءَ الحِضْب

اس میں تَطَوَّيْتُ اور انطویت کا معنی ایک ہے۔

اور اسی کی مثل القطامی کا قول ہے:

و خير الامر ما استقبلت منه　و ليس بأن تَتَبَّعَهُ اتباعا

کیونکہ تَتَبَّعتُ اور اتبعت دونوں ہم معنی ہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے وَاَنْزَلَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَنْزِيْلًا کیونکہ نزل اور اَنْزَلَ کا معنی ایک ہے۔ اور مفضل نے کہا ہے: اس کا معنی ہے۔ وانبتها فنبتَتْ نباتًا حسنًا۔ (اس کے رب نے اسے پروان چڑھایا اور وہ خوب اچھی طرح پروان چڑھی۔) اور معنی کی رعایت کرنا زیادہ بہتر ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اور قبول میں اصل ضمہ ہے کیونکہ یہ مصدر ہے جیسا کہ دُخول اور خُروج۔ اور فتحہ قلیل حروف میں آیا ہے جیسا کہ وَلوع اور وَزوع۔ یہ تین ہیں ان کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ ابوعمرو، کسائی اور ائمہ نے یہی کہا ہے۔ اور زجاج نے ''قبول'' کو اصل کی بنا پر قاف کے ضمہ کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا یعنی مریم کو حضرت زکریا علیہ السلام کے ساتھ ملا دیا (سپرد کر دیا)۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے: وہ اس کی دیکھ بھال کے ضامن بن گئے۔ کوفیوں نے وَكَفَّلَهَا تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: وکفلها ربُّها زکریا، یعنی اس کی کفالت ان کے ذمہ لازم کردی۔ اور اس پر انہیں مقرر کر دیا اور اسے ان کے لئے آسان بنا دیا۔

اور مصحف ابی میں ہے واکفلها متعدی میں ہمزہ تشدید کی مثل ہے۔ اور یہ بھی کہ اس سے پہلے فَتَقَبَّلَهَا اور اَنْۢبَتَهَا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں خبر دی اس کے بارے جو اس کے ساتھ کیا، پس اسی وجہ سے كَفَّلَهَا تشدید کے ساتھ ذکر کیا۔ اور باقیوں نے فعل کی نسبت حضرت زکریا علیہ السلام کی طرف کرنے کی بنا پر اسے مخفف پڑھا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ اس کی کفالت اور اس کے معاملات کے والی اور نگران بن گئے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ (ان میں سے کون مریم کی نگرانی کرے گا؟) مکی نے کہا ہے: یہی پسندیدہ ہے، کیونکہ تشدید بھی تخفیف کی طرف ہی لوٹتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب اسے زکریا علیہ السلام کی نگرانی میں دیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے ضامن اور نگران بنے۔ کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام جب اس کے کفیل بنے تو وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی قدرت کے ساتھ ہی بنے۔ پس اس بناء پر دونوں قرأتیں باہم متداخل ہیں۔

عمرو بن موسیٰ نے عبداللہ بن کثیر اور ابی عبداللہ المزنی سے وَكَفِلَهَا فا کے کسرہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے كَفَلَ يَكْفُلُ اور كَفِلَ يَكْفَلُ (یعنی یہ دونوں باب ہیں) اور میں نے كَفُلَ نہیں سنا، حالانکہ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اور مجاہد نے فَتَقَبَّلْهَا سوال اور طلب کی بنا پر لام کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور رَبَّهَا کو نصب کے ساتھ اس لئے کہ اس کی نسبت (حرف) ندا کی طرف ہے۔ اور وَ اَنْبِتْهَا میں تا کو سکون کے ساتھ و كَفِّلْهَا میں لام کو سکون کے ساتھ، اور ''زکریا'' کو مد اور نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ حفص، حمزہ اور کسائی نے ''زکریا'' کو بغیر مد اور ہمزہ کے پڑھا ہے اور باقیوں نے اسے مد کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اہل حجاز ''زکریا'' کو مد کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس میں قصر کرتے ہیں۔ اور اہل نجد اس سے الف کو حذف کر دیتے ہیں اور اسے منصرف پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں: زکرئ۔

اخفش نے کہا ہے: اس میں چار لغات ہیں: مد اور قصر اور زکریئ یا کی تشدید اور منصرف اور زکر اور رأیت زکریا۔ ابو حاتم نے کہا ہے: زکری غیر منصرف ہے کیونکہ یہ عجمہ ہے اور یہ غلط ہے، کیونکہ جو اس میں ''یا'' ہے اس طرح کے الفاظ منصرف ہوتے ہیں مثلاً کرسی اور یحییٰ اور زکریا مد اور قصر کی صورت میں منصرف نہیں کیونکہ اس میں الف تانیث، عجمہ اور تعریف ہے۔

قولہ تعالیٰ: كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۚ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۞ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۞

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ لغت میں محراب سے مراد مجلس میں قابل تکریم جگہ ہے۔ اس کا مزید بیان سورۂ مریم میں آئے گا۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ ''(حضرت مریم) ایک کمرہ میں رہتی تھیں اور حضرت زکریا علیہ السلام ان کے پاس سیڑھی سے چڑھ کر آتے تھے۔

جیسا کہ وضاح الیمن نے کہا ہے:

رَبَّةُ مِحرابٍ اذا جئتُها لم أَلقها حتى ارتَقِي سُلَّما

محراب (مکان) میں رہنے والی، جب بھی میں اس کے پاس آتا ہوں تو میں اس سے ملاقات نہیں کر سکتا یہاں تک کہ میں سیڑھی چڑھتا ہوں۔

اس سے مراد ربّةُ غُرْفَةٍ ہے۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: عمران کی بیوی عمر رسیدہ ہونے کے بعد حاملہ ہوئی تو اس نے نذر مانی کہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ ہر طرح سے آزاد ہے، تو عمران نے اسے کہا: تیری ہلاکت ہو! تو نے کیا کیا ہے؟ تیرا کیا خیال ہے اگر وہ بچی ہوئی؟ تو اس وجہ سے دونوں ہی مغموم ہو گئے۔ پھر عمران فوت ہو گئے اور حنہ حاملہ تھی اس نے بچی کو جنم دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے خوب اچھی طرح قبول کر لیا اور وہ صرف بچوں کو آزاد چھوڑتے تھے، تو علماء نے ان قلموں کے ساتھ اس کے بارے قرعہ اندازی کی جن کے ساتھ وہ وحی لکھتے تھے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ پس زکریا علیہ السلام کو اس پر نگران مقرر کر دیا اور انہوں نے اس کے لئے ایک جگہ بنائی اور جب وہ تھوڑی بڑی عمر کی ہو گئی تو آپ نے اس کے لئے محراب بنا دیا اور اس جگہ کی طرف آپ سیڑھی کے ساتھ اوپر چڑھتے تھے اور آپ نے اس کے لئے ایک دایہ (دودھ

پلانے والی) اجرت پر رکھی اور آپ اس پر دروازہ بند کر جاتے تھے۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام کے سوا کوئی اس کے پاس داخل نہ ہو سکتا تھا یہاں تک کہ وہ بڑی ہو گئی۔ پس جب وہ حائضہ ہوئی تو آپ اسے اپنے گھر کی طرف نکال کر لے گئے اور وہ اپنی خالہ کے پاس رہنے لگی اور کلبی کے قول کے مطابق اس کی خالہ حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی تھی۔ مقاتل نے کہا ہے: اس کی بہن حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ تھی۔ اور جب وہ حیض سے پاک ہو گئی اور اس نے غسل کر لیا تو آپ اسے محراب کی طرف لوٹا لائے۔ اور بعض نے کہا ہے: اسے حیض نہ آتا تھا اور وہ اس سے پاک رہتی تھی۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام جب اس کے پاس آتے تو آپ اس کے پاس موسم سرما کے پھل گرمی میں اور گرمی کے پھل موسم سرما میں پاتے تھے، تو آپ نے فرمایا: اے مریم! تیرے پاس یہ کہاں سے آتے ہیں؟ تو اس نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتے ہیں تو اس وقت حضرت زکریا علیہ السلام نے بچے کی خواہش کی اور کہا: بے شک وہ جو اس کے پاس پھل لاتا ہے وہ مجھے بچہ عطا کرنے پر بھی قادر ہے اور اَنّٰی کا معنی ہے من أین۔ کہاں سے۔ ابوعبیدہ نے یہی کہا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اس میں تساہل ہے، کیونکہ أَیْنَ جگہ اور مکان کے بارے سوال کے لئے آتا ہے اور اَنّٰی مذاہب اور جہات کے بارے سوال کے لئے آتا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ کون سے مذاہب اور کون سی جہات سے تیرے لئے یہ ہیں۔ کمیت نے ان دونوں کے درمیان فرق بیان کیا ہے۔ اور کہا ہے:

أنّی و من أین آبك الطّرب من حیث لا صبوة ولا رِیَب

اس میں أنّی جہات اور أین مکان کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

اور کلّما، وَجَدَ کے سبب منصوب ہے ای کل دَخلة (ہر بار داخل ہوتے وقت) اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۝ کہا گیا ہے: یہ مریم کے قول میں سے ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو اور یہی حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کا اور بچے کی التجا کا سبب بن گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ۔ هُنَالِكَ محل نصب میں واقع ہے، کیونکہ یہ ظرف ہے اور اسے زمان و مکان دونوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ ظرف مکان ہے۔ مفضل بن سلمہ نے کہا ہے: هُنَالِكَ ظرف زمان کے لئے ہے اور ھنا ظرف مکان کے لئے آتا ہے اور کبھی اسے اس کی جگہ بھی رکھ دیا جاتا ہے۔ اور هَبْ لِیْ کا معنی ہے مجھے عطا فرما مِنْ لَّدُنْكَ اپنی بارگاہ سے ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً صالح اور نیک نسل (بچہ) ذُرِّيَّةً واحد اور جمع اور مذکر اور مونث تمام کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہاں واحد کے لئے ہے۔ اور اس پر قول باری تعالیٰ فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا دلالت کرتا ہے کیونکہ یہاں اولیا نہیں فرمایا۔ اور طَيِّبَةً کو مونث لایا گیا ہے کیونکہ لفظ ذُرِّيَّةً مونث ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول:

ابوك خلیفة ولدته أخری وانت خلیفة ذاك الكمال

اس میں لفظ خلیفہ کے مونث ہونے کی وجہ سے ولدتہ کو مونث لایا گیا ہے۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ای رجل مات و ترك ذرّیة طیبة أجری

اللہ لہ مثل أجر عملھم ولم ینقص من اجورھم شیئًا (جو کوئی آدمی فوت ہوا اور اس نے نیک اور صالح اولاد پیچھے چھوڑی تو اللہ تعالیٰ اسے ان کے اعمال کے اجر کی مثل اجر عطا فرمائے گا اور ان کے اجر میں سے کوئی شی کم نہ ہوگی۔) سورۃ البقرۃ میں لفظ ذُرِّيَّةً کا مادہ اشتقاق گزر چکا ہے۔ اور طَيِّبَةً کا معنی ہے صالح، نیک اور بابرکت اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ بلاشبہ تو ہی دعا کو قبول فرمانے والا ہے اور اسی سے سمع اللہ لمن حمدہ بھی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت بچے کی طلب اور خواہش کرنے پر دلیل ہے اور یہ مرسلین اور صدیقین کی سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً (الرعد: 38) (اور بے شک ہم نے بھیجے کئی رسول آپ سے پہلے اور بنائیں ان کے لئے بیویاں اور اولاد۔)

اور صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تجرد اختیار کرنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں منع فرما دیا اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں اس کی اجازت عطا فرما دیتے تو ہم خصی ہو جاتے اور ابن ماجہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نکاح میری سنت ہے پس جس نے میری سنت کے مطابق عمل نہ کیا وہ مجھ سے نہیں ہے اور تم شادی کرو کیونکہ میں تمہارے سبب دیگر امتوں پر اظہار کثرت کروں گا اور جو کوئی قدرت رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ نکاح کرلے اور جو (قدرت) نہ پائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے کیونکہ یہی اس کے لئے وِجاء (شہوت نکاح کو کاٹنے کا ذریعہ) ہے۔ (1)

اور اس میں ان بعض جاہل متصوفہ کا رد ہے جنہوں نے کہا ہے: جو بچے کی خواہش اور طلب رکھتا ہے وہ احمق ہے اور اسے نہیں معلوم کہ وہ کند ذہن اور بے وقوف ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ (الشعراء) (اور بنا دے میرے لئے سچی ناموری آئندہ آنے والوں میں)

اور مزید فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ (الفرقان: 74) (اور وہ جو عرض کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! مرحمت فرما ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک)

اور امام بخاری نے تو اس عنوان سے باب باندھا ہے باب طلب الولد اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو اس دن فرمایا جس وقت ان کا بیٹا فوت ہوا۔ ''کیا تم نے آج رات مباشرت کی ہے'' انہوں نے عرض کی۔ جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: بارک اللہ لکما فی غابر لیلتکما (اللہ تعالیٰ تمہاری گزشتہ رات کے بارے میں تم دونوں کو برکت عطا فرمائے) فرمایا پس وہ حاملہ ہوگئی (2)۔ اور بخاری میں ہے: سفیان نے بیان کیا ہے انصار میں سے ایک آدمی نے کہا ہے: میں نے نو بچے پائے ہیں ان تمام نے قرآن کریم پڑھا ہے (3) اور یہ بھی عنوان ہے باب الدعاء بکثرۃ الولد مع البرکۃ (برکت کے ساتھ اولاد کی کثرت کی دعا کا بیان) اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ام سلیم نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کا خادم انس

1۔ ابن ماجہ، کتاب النکاح، حدیث نمبر 1835، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ صحیح بخاری، کتاب العقیقہ، حدیث 5048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب من لم یظھر حزنہ عند المصیبۃ، حدیث 1218، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللھم اکثر مالہ وولدہ وبارک لہ فیما اعطیتہ (اے اللہ! اس کے مال اور اس کی اولاد میں کثرت عطا فرما اور جو تو اسے عطا فرمائے اس میں اس کے لئے برکت عطا فرما)۔ (1)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اللہ! ابوسلمہ کی مغفرت فرما اور ہدایت یافتہ لوگوں میں اس کا درجہ بلند فرما اور باقی رہنے والے لوگوں میں سے اسے اچھا خلیفہ (نائب) عطا فرما۔'' اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم بچے جننے والی اور محبت کرنے والی (عورت) سے شادی کرو کیونکہ میں تمہارے سبب دیگر امتوں پر اظہار کثرت کروں گا (2)''۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اس معنی میں بہت سی روایات ہیں جو بچے کی طلب پر ابھارتی ہیں اور اس طرف متوجہ کرتی ہیں، کیونکہ انسان اپنی زندگی میں اور اپنی موت کے بعد اس کے نفع اور فوائد کا امیدوار ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا مات أحدکم انقطع عملہ الا من ثلاث جب تم میں سے کوئی مر جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں سوائے تین کے۔ اس میں ذکر فرمایا أو ولد صالح یدعولہ یا نیک بچہ جو اس کے لئے دعا کرتا ہو۔ گر اس حدیث کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو تو اس میں یہی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ پس جب یہ ثابت ہو گیا تو انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنے خالق کی بارگاہ میں اپنے بچے اور اپنی بیوی کی ہدایت کے لئے تضرع اور التجا کرتا رہے کہ وہ دونوں کو ہدایت، نیکی، پاکدامنی اور رعایت کی توفیق عطا فرمائے اور یہ کہ وہ دونوں دین اور دنیا میں اس کے معاون و مددگار رہوں یہاں تک کہ دونوں کے سبب اس کی منفعت اور فوائد دنیا اور آخرت میں عظیم ہو جائیں۔ کیا آپ حضرت زکریا علیہ السلام کے قول میں غور نہیں کرتے وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿﴾ (مریم) اور عرض کی ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً اور کہا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لئے دعا فرمائی اور کہا: اللھم اکثر مالہ وولدہ وبارک لہ فیہ اسے بخاری (3) اور مسلم نے نقل کیا ہے اور یہ تیرے لئے کافی ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿39﴾

''پھر آواز دی ان کو فرشتوں نے جب کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے (اپنی) عبادت گاہ میں کہ بے شک اللہ تعالیٰ خوشخبری دیتا ہے آپ کو یحییٰ کی جو تصدیق کرنے والا ہو گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرمان کی اور سردار ہو گا اور ہمیشہ عورتوں سے بچنے والا ہو گا اور نبی ہو گا صالحین سے۔''

قولہ تعالیٰ: فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ حمزہ اور کسائی نے فَنَادَاهُ مذکر ہونے کی بنا پر الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں اس میں امالہ کرتے ہیں کیونکہ یہ (الف) اصل میں یا ہے۔ اور یہ بھی کہ یہ چوتھی جگہ ہے اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود

1۔ صحیح بخاری، باب دعوۃ النبی لخادمہ بطول العمر و بکثرۃ مالہ، حدیث نمبر 5868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابی داؤد، باب النھی عن تزویج من لم یلد من النساء، حدیث نمبر 1754، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب من زار قوما ولم یفطر عندھم، حدیث نمبر 1846، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رضی اللہ عنہم کی قرأت الف کے ساتھ ہی ہے اور یہی ابوعبید کی پسند ہے۔

اور جریر نے مغیرہ کے واسطہ سے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ پورے قرآن میں ملائکہ کو مذکر قرار دیتے ہیں۔ ابوعبید نے کہا ہے: ہم انہیں جانتے ہیں کہ انہوں نے اسے مشرکین کے خلاف اختیار کیا ہے کیونکہ مشرکین نے کہا: ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔

نحاس نے کہا ہے: یہ ایسا استدلال ہے جس سے کوئی شے حاصل نہیں کی جاسکتی کیونکہ عرب کہتے ہیں: قالت الرجال اور قال الرجال اور اسی طرح النساء کے ساتھ بھی کرتے ہیں (یعنی مذکر و مونث دونوں طرح استعمال کر لیتے ہیں۔) اور ان پر قرآن کریم سے استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ جائز ہے کہ ان کے خلاف قرآن کریم سے اس طرح حجت لائی جائے تو پھر یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کریں: وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ البتہ ان کے خلاف اس ارشاد میں حجت ہے: أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ یعنی انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا۔ پس وہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ مونث ہیں۔ تحقیق یہ معلوم ہو گیا کہ یہ ظن اور محض خواہش ہے۔ اور رہا فَنَادَاهُ تو یہ جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر جائز ہے اور نَادَتْهُ جماعت کے مونث ہونے کی بنا پر جائز ہے۔

مکی نے کہا ہے: الملائکۃ ذوی العقول میں سے جمع مکسر ہے اور یہ تانیث میں قائم مقام غیر ذوی العقول کے ہے۔ آپ کہتے ہیں: ھی الرجال و ھی الجذوع و ھی الجمال و قالت الاعراب۔ اور اسے یہ ارشاد اور تقویت دیتا ہے۔ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ اور دوسری جگہ مذکور ہے: وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ اور اسی پر اجماع ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ پس اس جمع کو مذکر و مونث دونوں طرح لانا اچھا ہے اور سدی نے کہا ہے: اکیلے حضرت جبرائیل امین نے انہیں ندا دی۔ (ناداہ جبرائیل وحدہ) اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے اور قرآن کریم میں ہے: يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ اور روح سے مراد وحی ہے۔ اور عربی میں یہ جائز ہے کہ واحد کے بارے جمع کے لفظ کے ساتھ خبر دی جائے اور قرآن کریم میں آیا ہے: الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ الناس سے مراد نعیم بن مسعود ہے، جیسا کہ آگے آئے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں تمام ملائکہ نے ندا دی اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ یعنی ندا ان کی جانب سے آئی۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ قَآئِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ اس میں وَهُوَ قَآئِمٌ مبتدا اور خبر ہے۔ اور يُصَلِّي محل رفع میں ہے اور اگر چاہے تو ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں رکھ لے۔ أَنَّ اللّٰهَ اصل میں بان اللہ ہے۔ حمزہ اور کسائی نے اِنَّ پڑھا ہے یعنی قالت ان اللہ۔ پس ندا بمعنی قول ہے۔ يُبَشِّرُكَ تشدید کے ساتھ اہل مدینہ کی قرأت ہے۔ اور حمزہ نے يَبْشُرُكَ مخفف پڑھا ہے۔ اسی طرح حمید بن قیس مکی نے کہا ہے مگر یہ کہ انہوں نے شین کو کسرہ یا ضمہ اور با کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: یہ تینوں لغات ایک معنی میں ہیں۔

پہلی کی دلیل اور یہ ایک جماعت کی قرأت ہے کہ اس مادہ سے جو بھی فعل ماضی یا امر کا صیغہ قرآن کریم میں ہے وہ بتثقیل

کے ساتھ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَشِّرْ عِبَادِی۔ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ۔ فَبَشَّرْنَا هَا بِاِسْحَاقَ۔ قَالُوْا بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ اور رہی دوسری تو وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے اور وہ بَشَرَ یَبْشُرُ سے ہے اور وہ اہل تہامہ کی لغت ہے۔ اور اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

بشرتَ عَیالی اذْ رأیتُ صحیفةً　　أتتك من الحجاج یُتلی کتابُها

اس میں محل استشہاد بشرت ہے۔

اور دوسرے نے کہا:

واذا رأیت الباهشین الی الندی　　غُبْرًا أکُفُّهُمْ بقاعٍ مُمْحِلِ

فأعنْهُم وأبشَرْ ما بَشَروا به　　واذا هم نزلوا بضَنْكٍ فانزل

اس میں محل استشہاد بما بَشَرُوا بِہ ہے۔

اور جہاں تک تیسری قرأت کا تعلق ہے تو وہ أبْشَرَ یُبْشِرُ اِبْشَارًا سے ہے۔

شاعر نے کہا:

یا أمَّ عمرو أبْشِرِی بالبُشْرَیٰ　　موتٌ ذریعٌ وجَرَادٌ عَظْلَیٰ

اس میں محل استشہاد أبْشِرِی ہے۔

قولہ تعالیٰ: بِيَحْيٰى پہلی کتاب میں ان کا نام حیا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ سارہ کا نام یسارہ تھا۔ اور عربی میں اس کی تفسیر لاتلد (وہ بچے نہ جنے گی) ہے۔ پس جب انہیں اسحاق کی بشارت دی گئی تو انہیں کہا گیا: سارہ اور انہیں یہ نام حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دیا، تو انہوں نے کہا: اے ابراہیم! علیہ السلام میرے نام سے ایک حرف کیوں کم کر دیا گیا ہے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی جبرائیل علیہ السلام سے کہا تو انہوں نے کہا: ''بلاشبہ یہ حرف ان کے اس بیٹے کے نام میں زائد کر دیا گیا ہے جو افضل انبیاء میں سے ہے اس کا نام حیی ہے اور اس کا نام یحییٰ رکھ دیا گیا ہے۔'' نقاش نے اسے ذکر کیا ہے اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: ان کا نام یحییٰ رکھا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان اور نبوت کے ساتھ پیدا فرمایا (اور زندہ رکھا) اور بعض نے کہا ہے: ان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سبب لوگوں کو ہدایت کے ساتھ احیا عطا فرمایا اور مقاتل نے کہا ہے: ان کا اسم اللہ تعالیٰ کے اسم حیّ سے مشتق ہے پس یحییٰ نام رکھ دیا گیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: کیونکہ ان کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کی ماں کی رحم کو زندہ کر دیا۔

مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ اکثر مفسرین کے قول کے مطابق کلمۃ من اللہ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ وہ اللہ کے کلمہ کُن سے پیدا ہوئے۔ پس وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ ابو السمال العدوی نے بِكِلْمَةٍ تمام قرآن میں کاف کو مکسور اور لام کو ساکن پڑھا ہے۔ اور یہ فصیح لغت ہے جیسا کہ کِتْف اور فِخْذ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نام کلمہ اس لئے ہے کیونکہ لوگ ان سے اسی طرح ہدایت پاتے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ کے کلام سے ہدایت اور راہنمائی پاتے تھے۔

اور ابو عبید نے کہا ہے: بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللهِ کا معنی ہے بکتاب من اللہ (یعنی جو تصدیق کرنے والا ہوگا اللہ تعالیٰ کی کتاب کی۔) فرمایا: اور عرب کہتے ہیں انشدنی کلمۃ ای قصیدۃ اس نے میرے سامنے قصیدہ پڑھا۔ جیسا کہ روایت ہے کہ الحُوَیدِرہ کا حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے پاس ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: لعن اللہ کلمتہ یعنی قصیدتہ۔ (اللہ تعالیٰ اس کے قصیدہ پر لعنت کرے) اور اس کے علاوہ بھی کئی اقوال کہے گئے ہیں۔ پہلا قول زیادہ مشہور ہے اور اکثر علماء اسی پر ہیں اور یحییٰ علیہ السلام وہ پہلے فرد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے اور ان کی تصدیق کی۔ اور حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین سال بڑے تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چھ مہینے بڑے تھے۔ اور دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔

پس جب حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کی شہادت سنی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اٹھے اور انہیں اپنے ساتھ ملا لیا اور وہ ایک کپڑے میں (لپٹے) پڑے تھے اور علامہ طبری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت مریم جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہوئیں تو اسی وقت ان کی بہن حضرت یحییٰ علیہ السلام سے حاملہ تھی، تو وہ اپنی بہن کی ملاقات کے لئے آئی اور کہا: اے مریم! کیا تجھے معلوم ہوا ہے کہ میں حاملہ ہوں؟ تو حضرت مریم علیہا السلام نے اسے کہا: کیا تو نے محسوس کیا ہے کہ میں حاملہ ہوں؟ تو اس نے آپ کو کہا: جو میرے پیٹ میں ہے میں اسے پا رہی ہوں کہ وہ اسے سجدہ کر رہا ہے جو تیرے پیٹ میں ہے۔ اسی وجہ سے یہ روایت کیا گیا کہ انہوں نے اپنے جنین کو محسوس کیا کہ وہ اپنا سر حضرت مریم کے پیٹ کی طرف جھکا رہا ہے۔ سدی نے کہا ہے: پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللهِ اور مُصَدِّقًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ وَ سَيِّدًا اس کا معنی السید (سردار) وہ جو اپنی قوم کا سردار ہوتا ہے۔ اور اس کے قول پر (کسی کام کی) انتہا ہو جاتی ہے اور اس کی اصل سَيْوِدٌ ہے کہا جاتا ہے: فلان اسود من فلان۔ یہ افعل کے وزن پر صیغہ اسم تفضیل ہے اور السیادۃ سے بنایا گیا ہے اور اسی میں اس پر دلیل موجود ہے کہ انسان کا نام سید رکھنا جائز ہے جیسا کہ یہ جائز ہوتا ہے کہ اس کا نام عزیز یا کریم رکھا جائے۔ (1)

اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے بنی قریظہ (☆) کو فرمایا:۔ (اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو۔) اور بخاری و مسلم میں ہے (2) کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے بارے فرمایا: ان ابنی ھذا سید و لعل اللہ یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین (بلاشبہ میرا یہ بیٹا سید (سردار) ہے اللہ تعالیٰ اس کے سبب مسلمانوں کے دو بہت بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔) اور پھر اسی طرح ہوا۔ کیونکہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو چالیس ہزار سے زائد لوگوں نے آپ کی بیعت کی اور بہت سے ان میں سے تھے جو ان کے باپ سے پیچھے رہ گئے تھے اور ان میں سے تھے جنہوں نے ان کی بیعت توڑ دی تھی، آپ تقریباً سات ماہ تک عراق اور اس کے بعد خراسان میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3812، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ ایضاً، کتاب الصلح، حدیث 2505، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆۔ تفسیر میں الفاظ یہی ہیں جبکہ اصل میں یہ ارشاد حضرت سعد بن معاذ کے حق میں انصار کو ہے۔

خلیفہ رہے، پھر آپ اہل حجاز اور اہل عراق کا لشکر ساتھ لے کر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف چلے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اہل شام کو لے کر آپ کی طرف چلے۔ پس جب دونوں لشکر ایک جگہ آمنے سامنے ہوئے وہ انبار کی اطراف میں عراق کی زمین میں سے مَسْکِن کہلاتی ہے، تو امام حسن رضی اللہ عنہ نے جنگ کو ناپسند کیا کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ دونوں گروہوں میں سے کوئی ایک غالب نہیں آسکتا یہاں تک کہ دوسرے کا اکثر حصہ ہلاک ہو جائے۔ پس مسلمان ہلاک ہوں گے، تو آپ نے ان شرائط پر معاملہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا جو شرائط آپ نے ان پر عائد کی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد امارت (حکمرانی) آپ کی ہوگی۔ پس امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان تمام کا التزام کیا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سچا ثابت ہوا اِنَّ ابنی ھذا سید بلاشبہ میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اور اس سے بڑا سردار کوئی نہیں ہو سکتا جسے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول سردار بنائے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے کہ وَسَیِّدًا کا مفہوم ہے کہ وہ علم و عبادت میں سردار ہیں۔ ابن جبیر اور ضحاک نے کہا ہے: علم اور تقویٰ میں سردار ہیں۔

مجاہد نے کہا ہے: السید سے مراد کریم سخی ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: وہ جس پر غصہ غالب نہ آتا ہو۔ اور زجاج نے کہا ہے: سید وہ ہے جو اپنے ساتھیوں پر خیر اور نیکی کے کام میں فوقیت رکھتا ہو۔ اور یہ لفظ (تمام) کو جامع ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: السید کا معنی دو سال کی بھیڑ بھی ہے۔ اور حدیث میں ہے: ثنی من الضان خیر من السید المعز بھیڑوں میں دوندی دو برس کی بھیڑ سے بہتر اور افضل ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

سواءٌ علیہ شاۃُ عامٍ دَنت لہ — لیذبحھا للضیف أم شاۃ سید

وَحَصُوْرًا یہ اصل ہے الحصر سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے روکنا، قید کرنا، حَصَرَنی الشئ و أحْصَرَنی جب کوئی شے مجھے روک لے۔

جیسا کہ ابن میادہ نے کہا ہے:

و ما ھجرُ لیلی ان تکون تباعدت — علیكَ ولا أن احصَرَتك شُغولَ

اور ناقۃ حصور: ضیقۃ الاحلیل یعنی جس اونٹنی کے تھنوں (یا پیشاب) کا سوراخ تنگ ہو۔ اور حَصُور وہ ہوتا ہے جو عورتوں کے پاس نہ آسکتا ہو (یعنی جماع کے قابل نہ ہو) گویا کہ اسے ان سے روک دیا گیا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: رجل حصور و حصیر جب کہ وہ اپنی بخشش اور عطا کو روک لے اور وہ کچھ نہ نکالے جو کچھ اس کے ہم نشین نکال رہے ہیں کہا جاتا ہے: شرِب القوم فحصِر علیھم فلاں ای بخل۔ (قوم نے شراب پی تو ان پر فلاں نے پابندی لگا دی، یعنی اس نے ان کے ساتھ بخل کیا۔) یہ ابو عمرو سے منقول ہے۔

اخطل نے کہا ہے:

و شارِبٍ مُربحٍ بالكأس نادمنِی — لا بالحَصور ولا فیھا بِسوّارِ

اور قرآن کریم میں ہے وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا یعنی جہنم کو ہم نے کافروں کے لئے قید خانہ بنایا ہے اور الحصیر سے مراد مِلک ہے کیونکہ اسے روک لیا جاتا ہے۔

اور لبید نے کہا ہے:

وَ قُمَامِمُ غُلْبِ الرِّقَابِ كأنهم　　جِنٌّ لدى باب الحصير قيام

اس میں باب الحصیر سے مراد مِلک ہے۔

پس حضرت یحییٰ علیہ السلام حصور تھے یہ بروزن فعول بمعنی مفعول ہے یعنی آپ عورتوں کے ساتھ مباشرت نہ کر سکتے تھے۔ گویا کہ انہیں اس سے روک لیا گیا جو کچھ مردوں میں ہوتا ہے، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے۔ اور فعول بمعنی مفعول لغت میں کثیر الاستعمال ہے۔ اسی سے حلوب بمعنی محلوبۃ ہے۔

شاعر نے کہا:

فيها اثنتان واربعون حَلُوبَةً　　سُودًا كخافية الغراب الأسْحَم

اس میں حلوبۃ سے استدلال کیا گیا ہے۔

حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، ابن جبیر، قتادہ، عطا، ابو الشعثاء، حسن، سدی اور ابن زید رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: (حصور) اس سے مراد وہ ہے جو عورتوں سے باز رہتا ہے اور قدرت کے باوجود وہ ان کے قریب نہیں جاتا۔ اور دو اعتبار سے یہی اصح قول ہے۔ ایک یہ ہے کہ یہ ان کی مدح اور تعریف ہے اور بلاشبہ تعریف اکثر فعل کسبی کے سبب ہوتی ہے نہ کہ فطری اور طبعی فعل پر اور دوسری وجہ یہ ہے کہ فعول لغت میں فاعل کے صیغوں میں سے ہے۔

جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

ضَرُوبٌ بنصل السيف سُوقَ سِمانها　　اذا عَدِموا ازادا افانك عاقِرُ

اس میں محل استشہاد لفظ ضروبٌ ہے۔

پس معنی یہ ہے کہ اپنے نفس کو شہوات سے روکنے والا ہے۔ اور شاید یہ ان کی شریعت میں تھا اور رہی ہماری شریعت تو اس میں نکاح ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حصور سے مراد وہ عنین ہے جس کا ذکر نہ ہو کہ وہ اس کے سبب وطی کر سکتا ہو اور نہ اسے انزال ہوتا ہو یہ حضرت ابن عباس سے بھی، حضرت سعید ابن میسب اور ضحاک نے کہا ہے۔ اور ابو صالح نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''ہر انسان اللہ تعالیٰ سے گناہ کے ساتھ ملاقات کرے گا، درآنحالیکہ اس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا ہوگا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ اس کے سبب اسے عذاب دے گا یا پھر رحم فرمائے گا سوائے یحییٰ بن زکریا کے، کیونکہ وہ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ تھے۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک زمین کے ایک تنکے کی طرف نیچے کیا اور اسے اٹھالیا اور فرمایا: ''ان کا ذکر اس تنکے کی مثل تھا۔'' اور قول

بھی ہے کہ اس کا معنی ہے: وہ اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں سے بچانے اور روکنے والا ہے۔ وَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ زجاج نے کہا ہے: الصالح الذی یؤدی لِلّٰہِ ما افترض علیہ والی الناس حقوقهم۔ (کہ صالح وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض ادا کرتا ہے اور لوگوں کو ان کے حقوق عطا کرتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝

”زکریا کہنے لگے اے رب! کیونکر ہوگا میرے ہاں لڑکا حالانکہ آلیا ہے مجھے بڑھاپے نے اور میری بیوی بانجھ ہے فرمایا بات اسی طرح ہے (جیسی تم نے کہی) لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔“

کہا گیا ہے: یہاں رب سے مراد جبریل امین علیہ السلام ہیں یعنی انہوں نے حضرت جبریل امین علیہ السلام کو کہا: رب، اے میرے سردار...... کیونکر میرے ہاں لڑکا ہوگا؟ یہ کلبی کا قول ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: رب سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ اَنّٰى بمعنی کیف ہے اور یہ ظرف ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے اور اس استفہام کے معنی میں دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ انہوں نے سوال کیا کیا اس کے ہاں بچہ ہوگا حالانکہ وہ اور اس کی بیوی اپنے اس حال پر ہیں یا انہیں اس حال پر لوٹا دیا جائے گا جس سے بچہ ہوسکتا ہے؟ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سوال کیا کیا انہیں اپنی اسی بانجھ بیوی سے بچہ عطا کیا جائے گا یا کسی اور سے؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ کون سے درجہ کے سبب اس کا حقدار سمجھا گیا ہے حالانکہ میں اور میری بیوی اس حال پر ہیں۔ آپ نے یہ علی وجہ التواضع کہا۔

اور روایت ہے کہ آپ کی دعا اور جس وقت آپ کو اس کی بشارت دی گئی ان کے درمیان چالیس برس کا فاصلہ تھا۔ اور جس دن آپ کو بشارت دی گئی تھی اس وقت آپ کی عمر نوے برس تھی اور آپ کی اہلیہ کی عمر بھی اس کے قریب تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک نے کہا: جب آپ کو خوشخبری دی گئی اس وقت آپ کی عمر ایک سو بیس برس تھی اور آپ کی بیوی کی عمر اٹھانوے برس تھی۔

پس اسی لئے یہ قول ہے وامراتی عاقر یعنی میری بیوی بانجھ ہے وہ بچہ نہیں جن سکتی۔ کہا جاتا ہے: رجل عاقر و امراۃ عاقر جس میں بانجھ پن واضح اور ظاہر ہو۔ اور (کہا جاتا ہے) عقُرت و عقُر (دونوں میں قاف مضموم ہے) تعقُر عُقُرا وہ بانجھ ہو گئی، مثلاً حسنت تحسن حسنا، یہ ابوزید سے منقول ہے اور عُقارۃ بھی ہے اور دونوں میں اسم فاعل فعُل سے فعیلۃ کے وزن پر ہے۔ کہا جاتا ہے: عظمت فھی عظیمۃ اور ظرفت فھی ظریفۃ اور عاقر کہا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد نسب کی بنا پر بانجھ پن والا ہے اور اگر یہ فعل کی بنا پر ہوتا تو کہتا: عقرت فھی عقیرۃ گویا کہ وہ اس کے سبب بانجھ ہے، یعنی عمر کے اعتبار سے بڑھاپا بچہ جننے سے اس کے لئے مانع ہے۔ اور عاقر سے مراد ریت کی وہ کثیر مقدار ہے جو کوئی شے اگنے نہ دے۔ اور عُقر عورت کے مہر کو بھی کہتے ہیں جب شبہ کے ساتھ اس سے وطی کی جائے۔ اور بیضۃ العقر، اس سے مراد مرغ کا انڈا ہے، کیونکہ یہ اس کی عمر میں طویل مدت تک ایک خاص سفیدی سی لے آتا ہے اور عُقر النار بھی ہے، یعنی آگ کا وسط اور اس کا بڑا حصہ۔

اور عقر الحوض حوض کا پچھلا حصہ جہاں اونٹ کھڑے ہوتے ہیں جب وہ اس پر آئیں، کہا جاتا ہے: عُقْر اور عُقُر مثلاً عُسْر اور عُسُر۔ اور اس کی جمع الاعقار ہے اور یہ لفظ مشترک ہے۔ اور کَذٰلِكَ میں کاف محل نصب میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس کی مثل جو چاہتا ہے کرتا ہے اور الغُلام، الغُلْمہ سے مشتق ہے اور اس کا معنی نکاح کی طلب کا شدید ہونا ہے اور اغتلم الفعل غلمة وہ شهوة ضِراب سے بھڑک اٹھا۔

لیلی الاخیلیہ نے کہا ہے:

شفاها من الداء العضال الذی بها　　علامر اذا هَزَّ القناة سقاها

اور الغلام سے مراد ایسا نوجوان جس کی لبیں نکل رہی ہوں اور وہ جس میں غُلُومة اور غلومية (جوانی) واضح ہو۔ اور اس کی جمع الغِلمة اور الغِلمان ہے۔ اور کہا جاتا ہے: ان الغيلم الشاب و الجارية ايضا (یعنی جوان آدمی اور جوان لڑکی) اور الغَيلم کچھوے کو بھی کہتے ہیں اور الغيلم جگہ بھی ہے۔ اور اغتلم البحر کا معنی ہے: سمندر نے جوش مارا اور اس کی امواج تلاطم خیز ہوئیں۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿٤١﴾

''عرض کی اے میرے رب! مقرر فرما دے میرے لئے کوئی نشانی۔ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ نہ بات کر سکو گے لوگوں سے تین دن مگر اشارہ سے اور یاد کرو اپنے پروردگار کو بہت اور پاکی بیان کرو (اس کی) شام اور صبح۔''

اس میں تین، مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً یہاں جَعَلَ بمعنی صیّر ہے کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ اور لِی مفعول ثانی کے محل میں واقع ہے۔ جب انہیں بچے کی بشارت دی گئی اور ان کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں تو انہوں نے علامت کا مطالبہ کیا جس کے ساتھ وہ اس امر کی صحت اور اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کو پہچان لیں، تو اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ چونکہ انہوں نے علامت اور نشانی کا مطالبہ کیا ہے لہٰذا ملائکہ کے ان کے آمنے سامنے ہونے کے بعد لوگوں کے ساتھ کلام کرنے سے سکوت اور خاموشی انہیں آ پہنچے گی۔ (یعنی وہ کلام نہ کر سکیں گے)

اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے۔ انہوں نے کہا: اور اسی طرح اگر مرض کے سبب گونگا پن یا اس طرح کی کوئی شے نہ ہو تو اس میں ہر حال پر کچھ نہ کچھ سزا ہے۔

ابن زید نے کہا ہے: بے شک حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ جب ان کے سبب یحییٰ سے حاملہ ہوئی تو انہوں نے صبح اس حال میں کی کہ وہ کسی کے ساتھ کلام کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اور وہ اس کے باوجود تورات پڑھتے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے اور جب وہ کسی اور سے گفتگو کرنے کا ارادہ کرتے تو نہ بول سکتے تھے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا رَمْزًا لغت میں الرمز سے مراد ہونٹوں کے ساتھ اشارہ کرنا ہے اور کبھی کبھی یہ بھنووں،

آنکھوں اور دونوں ہاتھوں کے ساتھ اشارہ کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اس کا اصل معنی حرکت ہے۔ اور کہا گیا ہے: آپ نے اس علامت کا مطالبہ طمانیت و راحت میں زیادتی اور اضافہ کے لئے کیا تھا۔ معنی یہ ہے: تو نعمت مکمل اور تمام فرما دے اس طرح کہ تو میرے لئے کوئی علامت اور نشانی بنا دے۔ اور وہ علامت مزید نعمت اور کرامت ہو جائے گی، تو آپ کو کہا گیا: اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ یعنی تم تین رات تک کلام نہ کر سکو گے۔ اس قول کی دلیل اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد ہے جو ملائکہ کے آپ کو بشارت دینے کے بعد ہے۔

وَ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَیْـًٔا یعنی میں نے اپنی قدرت کے ساتھ تجھے پیدا کیا ہے تو اسی طرح تیرے لئے بچہ بھی پیدا فرما دیں گے۔ نحاس نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو ترک کلام کے ساتھ سزا دی گئی۔ یہ قول قابل التفات نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کوئی خبر نہیں دی کہ انہوں نے کوئی گناہ کیا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے منع فرمایا ہے۔ اور اس میں کلام یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: تو میرے لئے ایسی علامت اور نشانی بنا دے جو بچہ ہونے پر دلالت کرتی ہو، جبکہ وہ مجھ سے غائب ہے اور سَمْزًا استثنا منقطع کی بنا پر منصوب ہے، اخفش نے یہی کہا ہے اور کسائی نے کہا ہے: رمز یرمز رمز دیرمز۔ اور اِلَّا سَمْزًا کو میم کے فتحہ اور رُمُزًا میم اور را کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس کی واحد رمزۃ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ اشارہ کلام کے قائم مقام ہوتا ہے اور یہ کثیر احادیث میں موجود ہے اور اشارات کو اس امر نے موکد اور پختہ کر دیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوداء کے بارے میں اس کے ساتھ ہی فیصلہ فرمایا جبکہ آپ نے اسے کہا این اللہ۔ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ تو اس نے اپنے سر سے آسمان کی طرف اشارہ کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعتقها فانها مؤمنة تو اسے آزاد کر دے کیونکہ یہ مومنہ ہے۔ تو آپ نے اشارہ کے ساتھ اس اسلام کی اجازت دے دی جو اس دین کی اصل ہے جو جان اور مال کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے ساتھ جنت کا مستحق بنا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آتش جہنم سے نجات پائی جاتی ہے۔ اور اس کے ایمان کا اسی طرح فیصلہ فرمایا جس طرح اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے جو زبان سے بول کر اقرار کرتا ہے۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ اشارہ تمام دین میں قابل عمل ہے۔ اور یہی عام فقہاء کا قول ہے۔

ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ گونگا آدمی جب طلاق کے لئے اشارہ کرے تو وہ لازم ہو جاتی ہے۔ اور امام شافعی نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے جو بیمار ہوتا ہے اور اس کی زبان مختل ہو جاتی ہے تو وہ رجعت اور طلاق کے مسائل میں گونگے کی طرح ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ جائز ہے جبکہ اس کا اشارہ معروف ہو (یعنی اسے سمجھنے میں کوئی شبہ نہ ہو) اور اگر اس میں شک ہو تو پھر وہ باطل ہے، یہ قیاس نہیں ہے البتہ یہ استحسان ہے۔ ان تمام میں قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ باطل ہو کیونکہ وہ کلام نہیں کر سکتا اور اس کا اشارہ سمجھا نہیں جا سکتا۔

ابو الحسن بن بطال نے کہا ہے: اور انہوں نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے اس قول پر محمول کیا ہے کہ انہیں ان احادیث کا علم نہیں ہوا جو دین کے مختلف احکام کے بارے میں اشارات کے جواز کے بارے وارد ہوئی ہیں۔ اور شاید امام بخاری

نے باب الاشارۃ فی الطلاق والامور کے عنوان سے ان کے رد کا قصد کیا ہے۔(1)

اور حضرت عطا نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ سے تین دن کے روزے کا قصد کیا ہے اور وہ جب روزہ رکھتے تھے تو وہ صرف اشارے کے ساتھ ہی گفتگو کرتے تھے۔ اور یہ انتہائی بعید از حقیقت ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ بعض ان افراد نے کہا ہے جو سنت کے ساتھ قرآن کریم کا نسخ جائز قرار دیتے ہیں کہ بلاشبہ حضرت زکریا علیہ السلام کو کلام کرنے سے روک دیا گیا حالانکہ وہ اس پر قادر تھے اور یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے منسوخ ہے: لا صَمتَ یوما الی اللیل (کسی دن رات تک خاموش رہنا جائز نہیں) اور اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں (2)۔ کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام کو کسی آفت کے سبب کلام سے روک دیا گیا جو انہیں لاحق ہوئی اور اس نے انہیں کلام سے روک دیا اور وہ آفت صحت کے باوجود کلام پر قادر نہ ہونا ہے، اسی طرح مفسرین نے کہا ہے۔ اور بہت سے علماء نے یہ کہا ہے کہ حدیث طیبہ لاصمت یوماً الی اللیل کا معنی یہ ہے کہ پورا دن رات تک اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خاموشی (جائز) نہیں ہے اور رہی فضول اور بے فائدہ گفتگو! تو اس سے تو خاموشی اچھی اور بہتر ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی زبان بند ہونے کے باوجود اپنے دل میں ذکر کبھی نہ چھوڑے، یہ پہلے قول کی بنا پر ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں ذکر کا معنی گزر چکا ہے۔

اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: اگر کسی کو ذکر ترک کرنے کی رخصت دی جاتی تو وہ یقیناً حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے سبب دی جاتی اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا اور اس آدمی کو دی جاتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان جہاد میں ہوتا ہے: اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا اسے علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔

وَسَبِّحْ بمعنی صل ہے یعنی تو نماز پڑھ۔ اس میں صلاۃ (نماز) کو سُبْحَةُ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس میں ہر قسم کی برائی اور نقص سے اللہ تعالیٰ کی پاکی اور تنزیہ بیان کرنا ہے اور العشی، عشیۃ کی جمع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واحد ہے اور اس سے مراد سورج کے زوال پذیر ہونے کے وقت سے لے کر غروب آفتاب تک کا وقت ہے، یہ حضرت مجاہد سے منقول ہے۔ اور موطا میں قاسم بن محمد سے منقول ہے میں نے لوگوں کو نہیں پایا مگر یہ کہ وہ ظہر کی نماز عشی کے وقت ادا کرتے ہیں اور الْاِبْكَارِ سے مراد طلوع فجر سے چاشت تک کا وقت ہے۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

''اور جب کہا فرشتوں نے اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے تمہیں اور خوب پاک کر دیا ہے تمہیں اور پسند کیا ہے تجھے سارے جہان کی عورتوں سے''۔

1۔ صحیح بخاری، باب الاشارۃ فی الطلاق والانوار، حدیث 4883، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابی داؤد، باب ماجاء متی ینقطع الیتم۔ حدیث نمبر 2489، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں اختیار کر لیا ہے (چن لیا ہے) اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔
وَطَهَّرَكِ اور تجھے خوب پاک کر دیا ہے کفر سے۔

حضرت مجاہد اور حسن سے یہی مروی ہے اور زجاج نے کہا ہے: اور تمہیں پاک کر دیا ہے تمام الائشوں سے مثلاً حیض، نفاس وغیرہما۔ اور تمہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دینے کے لئے پسند کر لیا ہے۔ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ یعنی اپنے زمانے کی تمام عورتوں پر، حسن اور ابن جریج وغیر ہما نے یہی بیان کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ قیامت قائم ہونے کے دن تک تمام جہان والی عورتوں کو شامل ہے اور یہی صحیح ہے ہم اسے بیان کریں گے اور یہی زجاج وغیرہ کا قول ہے۔

اصطفاء کا ذکر دوبارہ کیا گیا ہے کیونکہ پہلے کا معنی ہے کہ تمہیں چن لیا ہے اپنی عبادت کے لئے اور دوسرے کا معنی ہے کہ تمہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے لئے چن لیا ہے۔ امام مسلم نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (1) ''مردوں میں سے کامل بہت سے ہیں اور عورتوں میں سے سوائے مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ کے سوا کوئی کامل نہیں اور بلاشبہ عائشہ کی فضیلت دوسری عورتوں پر اسی طرح ہے جیسے ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر۔''

ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: کمال سے مراد انتہا کو پہنچنا اور مکمل ہونا ہے۔ اور اس کا فعل ماضی کمل میم کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔ اور مضارع یکمُل میم کے ضمہ کے ساتھ آتا ہے اور ہر شے کا کمال اس کی اپنی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے اور کمال مطلق تو فقط اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نوع انسان میں سے کامل ترین حضرات انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات ہیں اور پھر ان کے بعد اولیاء مثلاً صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور جب یہ ثابت ہو چکا تو پھر کہا گیا: بے شک وہ کمال جس کا ذکر حدیث طیبہ میں کیا گیا ہے اس سے مراد تو نبوت ہے تو اس پر یہ لازم آتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام اور آسیہ دونوں نبیہ ہوں اور اس طرح کہا گیا ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نبیہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف فرشتہ کے واسطہ سے وحی فرمائی ہے جیسا کہ اس نے تمام انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی فرمائی ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اس کا بیان سورۂ مریم میں بھی آئے گا اور رہی آسیہ تو کوئی ایسی شے بیان نہیں ہوئی جو واضح طور پر اس کی نبوت پر دلالت کرتی ہو بلکہ اس کے صدیقہ ہونے پر اور اس کی فضیلت پر دلالت کرتی ہو۔ اس کا بیان سورۃ التحریم میں آئے گا۔

صحیح اسناد سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اور آپ سے اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے: ''سارے جہان کی عورتوں سے بہتر چار عورتیں ہیں مریم بنت عمران، آسیہ بنت مزاحم جو فرعون کی بیوی ہے، حضرت خدیجہ بنت خویلد اور حضرت فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے: ''اہل جنت کی عورتوں میں سے افضل خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ بنت مزاحم ہیں (2)''۔ اور آپ ہی سے ایک دوسری سند سے مروی ہے: ''مریم کے بعد اہل جنت کی عورتوں کی سردار

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر 3159، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ مسند امام احمد، حدیث 2668

حضرت فاطمہ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہما ہیں''۔

پس قرآن و احادیث کا ظاہر یہ تقاضا کرتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام سارے جہان کی عورتوں سے افضل ہے حضرت مائی حواء علیہا السلام سے لے کر اس آخری عورت تک جس پر قیامت قائم ہوگی (سب سے افضل ہے) کیونکہ ملائکہ نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے تکلیف اخبار، اور بشارت کے بارے میں وحی ان تک اسی طرح پہنچائی ہے جس طرح تمام انبیاء علیہم السلام تک پہنچائی، پس اس طرح یہ نبیہ ہیں اور نبی ولی سے افضل ہوتا ہے پس یہ تمام عورتوں سے افضل ہیں مطلقاً اولین و آخرین سب شامل ہیں۔ پھر ان کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں پھر ان کے بعد حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور پھر ان کے بعد آسیہ رضی اللہ عنہا۔ اور اسی طرح موسیٰ بن عقبہ نے کریب کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سارے جہان کی عورتوں کی سردار مریم ہیں پھر فاطمہ، پھر خدیجہ اور پھر آسیہ ہے'' یہ حدیث حسن ہے اشکال کو دور کر دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو اس کے ساتھ خاص کیا ہے جو عورتوں میں سے کسی کو عطا نہیں فرمایا اور وہ یہ کہ روح القدس ان سے ہمکلام ہوئے، ان کے قریب ہوئے اور عورتوں میں سے کسی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا اور انہوں نے اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کی۔ اور جب انہیں بشارت دی گئی تو کسی نشانی کا مطالبہ نہیں کیا جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے نشانی کا مطالبہ کیا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں قرآن مقدس میں صدیقہ کا نام دیا ہے اور فرمایا: وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ اور فرمایا: وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے صدیقہ ہونے کی شہادت دی اور ان کے لئے کلمات بشارت کی تصدیق کرنے کی شہادت دی اور ان کے لئے عجز و انکساری اور اطاعت شعاری کی شہادت دی۔ اور بلاشبہ جب حضرت زکریا علیہ السلام کو بچے کی بشارت دی گئی تو انہوں نے اپنے بڑھاپے اور اپنی بیوی کے بانجھ پن کی طرف دیکھا اور کہا: کیونکر میرے لئے بچہ ہوسکتا ہے حالانکہ میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے، سو نشانی طلب کی اور حضرت مریم کو بچے کی بشارت دی گئی تو اس نے یہ دیکھا کہ وہ باکرہ ہے اور اسے کسی بشر (انسان) نے مس نہیں کیا تو اسے کہا گیا: كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ اسی طرح تیرے رب نے کہا ہے۔

پس انہوں نے اسی پر اقتصار کیا اور اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کر دی اور کوئی ایسی علامت اور نشانی طلب نہ کی جس سے اس امر کی حقیقت کو جانا جا سکتا ہو۔ بنات آدم میں سے سارے جہان کی عورتوں میں کسی عورت کے لئے اس قسم کے مناقب نہیں ہیں، اسی لئے یہ روایت ہے کہ وہ جنت کی طرف رسل علیہم السلام کے ساتھ پہلے جانے والوں میں جائیں گی۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: ''اگر میں قسم کھاؤں کہ میری امت کے سابقین سے پہلے کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا سوائے دس سے کچھ زائد افراد کے ان میں سے حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم بنت عمران علیہا السلام کے تو میں یقیناً اپنی قسم میں سچا ہوں۔''

تحقیق اس پر یہ فرض اور لازم ہو جاتا ہے جس پر ظاہری علم کھلا اور اس نے اشیاء ظاہرہ سے اشیاء باطنہ پر استدلال کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کو جان لے (1): انا سید ولد آدم ولا فخر (میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور مجھے کوئی فخر نہیں۔) لواء الحمد یوم القیامۃ بیدی و مفاتیح الکرم بیدی و أنا اول خطیب و اول شفیع و اول مبشر و اول و اول (قیامت کے دن لواء الحمد میرے ہاتھ میں ہوگا اور کرم کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی اور میں پہلا خطیب ہوں گا اور میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں گا اور میں سب سے پہلے بشارت دینے والا ہوں گا اور میں (فلاں میں) اول ہوں گا اور (فلاں میں) اول ہوں گا) (2) اور رسل علیہم السلام کو دنیا میں یہ سرداری حاصل نہیں ہوئی مگر باطن میں کسی امر عظیم کے سبب (انہیں یہ مقام ملا) اور اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کی شان ہے کہ انہیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے صدیقہ اور کلمات کی تصدیق کرنے کی شہادت نصیب نہیں ہوئی مگر ایسے مرتبہ کے سبب جو انتہائی قرب عطا کرنے والا ہے۔

اور جنہوں نے یہ کہا کہ وہ نبیہ نہیں انہوں نے کہا ہے: ان کا فرشتے کو دیکھنا اسی طرح ہے جس طرح حضرت جبریل علیہ السلام کو دحیہ کلبی کی صورت میں دیکھا گیا جس وقت انہوں نے اسلام اور ایمان کے بارے سوال کئے تھے اور اس رؤیت کے باوجود صحابہ کرام انبیاء نہیں ہوئے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر اور واضح ہے اور اکثر اسی موقف پر ہیں۔ واللہ اعلم۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

”اے مریم! خلوص سے عبادت کرتی رہ اپنے رب کی اور سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔“

مراد یہ ہے کہ اے مریم! نماز میں قیام طویل کر۔ یہ مجاہد سے منقول ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: تو اطاعت وعبادت پر دوام اختیار کر، قنوت کے بارے تفصیلی گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ امام اوزاعی نے کہا ہے: جب ملائکہ نے انہیں یہ کہا تو وہ نماز میں کھڑی ہوئیں یہاں تک کہ ان کے قدم ورم آلود ہو گئے۔ اور ان سے خون اور پیپ بہنے لگی۔ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ یہاں رکوع پر سجود کو مقدم کیا گیا ہے کیونکہ واؤ ترتیب کو ثابت نہیں کرتی۔ اور اس بارے میں اختلاف سورۃ البقرہ میں اس ارشاد کے تحت گزر چکا ہے اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ پس جب تو کہے: قام زید و عمرو تو یہ مراد لینا جائز ہے کہ عمرو زید سے پہلے کھڑا ہوا ہو۔ پس اس بنا پر معنی یہ ہوگا وارکعی واسجدی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی شریعت میں سجدہ رکوع سے پہلے تھا۔ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کہا گیا ہے اس کا معنی ہے افعلی کفعلھم تو ان کی طرح کا فعل کر اگرچہ تو ان کے ساتھ نماز نہ پڑھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد نماز با جماعت ہے۔ یہ بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

”یہ (واقعات) غیب کی خبروں میں سے ہیں ہم وحی کرتے ہیں ان کی آپ کی طرف اور نہ تھے آپ ان کے

1۔ ابن ماجہ، باب ذکر الشفاعۃ، حدیث نمبر 4297، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب فی فضل النبی، حدیث نمبر 3543، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پاس جب پھینک رہے تھے وہ (مجاور) اپنی قلمیں (یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ) کون ان میں سے سرپرستی کرے مریم کی اور نہ تھے آپ ان کے پاس جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ یعنی یہ جو حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت مریم علیہم السلام کے واقعات ہم نے ذکر کئے ہیں یہ اخبار غیب میں سے ہیں۔ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ اس میں حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت پر دلیل ہے اس حیثیت سے کہ آپ نے حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہما السلام کے واقعہ کی خبر دی حالانکہ آپ ﷺ نے کتابوں میں نہیں پڑھا تھا: آپ ﷺ نے اسے بیان فرمایا اور اہل کتاب نے اس بارے آپ کی تصدیق کی۔ پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ میں ضمیر کو ذالک کی طرف لوٹایا گیا ہے اور اسی کی یاد دلائی گئی ہے اور الایحاء یہاں نبی ﷺ کی طرف کچھ بھیجنے کے معنی میں ہے۔ اور وحی الہام، اشارہ اور کئی دوسرے طریقوں سے ہوتی ہے۔ اور لغت میں اس کی اصل خفیۃً کسی شے سے آگاہ کرنا ہے۔ اسی وجہ سے الہام کو بھی وحی کا نام دیا جاتا ہے اور اسی سے ہے وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَى الْحَوَارِیّٖنَ اور قول باری تعالیٰ: وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اور کہا گیا ہے: اَوْحَیْتُ اَلَى الْحَوَارِیّٖنَ کا معنی ہے "میں نے انہیں حکم دیا، کہا جاتا ہے: وحی اور اوحی، رمی اور آرمی یہ ہم معنی ہیں۔ عجاج نے کہا ہے: اوحی لھا القرار فاستقرت یعنی اس نے زمین کو قرار پکڑنے کا حکم دیا پس وہ قرار پذیر ہوگئی۔

اور حدیث میں ہے: الوحی الوحی مراد انتہائی سرعت اور تیزی ہے اور اس سے فعل توحیت توحیا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے: الوحی کا معنی اشارہ، کتابت اور رسالۃ (بھیجنا) ہے۔ اور ہر وہ شے جسے تو کسی غیر کی طرف القاء کرے یہاں تک کہ وہ اسے جان لے وہی وحی ہے وہ جیسے بھی ہو۔ اور الوحی کا معنی السریع ہے۔ اور اَلْوَحَی کا معنی الصوت آواز ہے۔ اور کہا جاتا ہے: استوحیناھم یعنی ہم نے ان کی مدد طلب کی۔

کسی نے کہا:

اوحیت　میمونا　لھا　والأزراق

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ یعنی اے محمد! ﷺ آپ ان کے پاس موجود نہ تھے۔ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ۔ اقلام قَلَم کی جمع ہے۔ یہ قَلَمَہٗ سے ہے اس کا معنی ہے: فلاں نے اسے کاٹ دیا۔ کہا گیا ہے: قِداحھم و سھامھم یعنی مراد ان کے تیر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کی وہ قلمیں مراد ہیں جن سے وہ تورات لکھتے تھے اور یہی عمدہ معنی ہے، کیونکہ ازلام (جوئے کے تیر) سے تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور کہا ہے ذٰلِكُمْ فِسْقٌ۔

مگر وہ ان کی اجازت دیتا ہے اس طور پر کہ وہ انہیں اس طرز پر استعمال نہ کریں جس طرح دور جاہلیت میں کرتے تھے۔ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ یعنی کون مریم کی پرورش اور تربیت کرے گا؟ تو حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ اس کی خالہ میرے گھر ہے۔ اور ان کے نکاح میں اشیع بنت فاقود تھی جو کہ مریم کی ماں حنہ بنت فاقود کی بہن

تھی۔ بنی اسرائیل نے کہا: ہم اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے عالم کی بیٹی ہے۔ پس انہوں نے اس پر قرعہ اندازی کی اور ہر ایک اپنا قلم لے کر آیا۔ اور انہوں نے اس پر اتفاق کیا کہ وہ قلم جاری پانی میں ڈالیں گے پس جس کا قلم ٹھہر گیا اور پانی اسے بہا کر نہ لے گیا تو وہ اس کی پرورش اور تربیت کرے گا۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس قلم بہہ گئے اور حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم اوپر بلند ہو گیا۔'' اور یہ آپ کی نشانی اور معجزہ تھا، کیونکہ آپ نبی تھے اور معجزات اور علامات آپ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔

اور **اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ** یہ مبتدا اور خبر اس فعل مضمر کے سبب محل نصب میں واقع ہیں جس پر کلام دلالت کرتی ہے۔ تقدیر کلام ہے: ینظرون أیهم یکفل مریم اور فعل لفظاً اسی میں کوئی عمل نہیں کرتا کیونکہ وہ برائے استفہام ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ہمارے بعض علماء نے اس آیت سے قرعہ اندازی کے اثبات پر استدلال کیا ہے اور ہماری شریعت میں یہی اصل اور بنیاد ہے ہر اس کے لئے جو تقسیم میں عدل و انصاف کرنا چاہے اور جمہور فقہاء کے نزدیک دو مساوی حجتوں میں یہی سنت ہے، تاکہ ان کے درمیان عدل ہو سکے اور ان کے دل مطمئن ہو جائیں اور اس آدمی کے بارے میں وہم و گمان اٹھ جائے جو ان کی تقسیم کا والی بنتا ہے۔ اور ان میں سے کسی کو اس کے ساتھی پر فضیلت نہ دی جائے گی جبکہ مقسوم ایک جنس سے ہو یہی کتاب و سنت کی اتباع ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے قرعہ اندازی پر عمل کرنے کو رد کر دیا ہے اور انہوں نے اس بارے میں وارد ہونے والی احادیث کو بھی رد کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ ان کا کوئی معنی اور حقیقت نہیں اور یہ جوئے کے ان تیروں کے مشابہ ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ اور ابن منذر نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ آپ نے اسے (قرعہ اندازی کو) جائز قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے: قیاس کے مطابق قرعہ صحیح نہیں ہوتا لیکن ہم نے اس مسئلہ میں قیاس کو چھوڑ دیا ہے۔ اور ہم نے آثار اور سنت کو پکڑ لیا ہے۔

ابوعبید نے کہا ہے: قرعہ اندازی کے مطابق تین انبیاء نے عمل کیا ہے: مراد حضرت یونس علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام اور ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ...... ابن منذر نے کہا ہے: جو شے شرکاء کے مابین تقسیم کی جاتی ہے اس میں قرعہ اندازی پر عمل کرنا ایسا ہے گویا اس پر اہل علم کا اجماع ہے اور جس نے اس کا رد کیا ہے اس کے قول کا کوئی معنی اور حقیقت نہیں۔ امام بخاری نے کتاب الشہادات کے آخر میں یہ عنوان ذکر کیا ہے باب القرعة فی المشكلات و قول الله عزوجل، **اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ** اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے: ''حدود اللہ پر قائم رہنے والے اور ان میں واقع ہونے والے کی مثال اس قوم کی مثل ہے جنہوں نے کشتی پر قرعہ اندازی کی (1) ...... الحدیث'' عنقریب اس کا بیان سورۃ الانفال اور سورۃ الزخرف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور ام العلاء کی حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون کا حصہ رہائش میں ان کے لئے تقسیم ہو گیا جب انصار نے مہاجرین کی رہائش کے لئے قرعہ اندازی کی (2)، الحدیث۔ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ فرماتے تھے اپنی ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ

1۔ صحیح بخاری، باب القرعۃ فی المشکلات، حدیث 2489، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً، حدیث نمبر 2490

اندازی کرتے اور جس کسی کے نام پر قرعہ نکلتا اسے ساتھ لے جاتے، آگے حدیث ذکر کی۔(1)

اس بارے میں حضرت امام مالک سے مختلف روایات ہیں۔ آپ نے ایک بار کہا حدیث کی وجہ سے وہ قرعہ اندازی کرے گا اور ایک بار کہا: ازواج میں سے جو سفر میں اس کے موافق ہوگی اسے وہ سفر پر لے جائے گا۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر اذان دینے اور پہلی صف میں کھڑے ہونے کے اجر و ثواب کو لوگ جانتے ہوتے پھر وہ قرعہ اندازی کے بغیر اس کا موقعہ نہ پاتے تو یقیناً وہ قرعہ اندازی کرتے (2)''۔ اس بارے میں احادیث کثیر ہیں۔ قرعہ اندازی کی کیفیت اور اختلاف کتب فقہ میں مذکور ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام اور ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قرعہ اندازی ان میں سے ہے کہ اگر تم اس پر بغیر قرعہ اندازی کے راضی ہو جاؤ تو وہ جائز ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: ''یہ ضعیف ہے، کیونکہ قرعہ اندازی کا فائدہ ہی یہ ہے کہ باہم اختلاف اور جھگڑے کی صورت میں کسی مخفی حکم کو نکالنا اور ظاہر کرنا اور رہا وہ حکم جو اس میں رضامندی کے ساتھ نکالا جاتا ہے وہ ایک دوسرا باب ہے۔ اور کسی کے لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ قرعہ باہم رضامندی کے محل میں ڈالا جاتا ہے، کیونکہ یہ کبھی بھی باہم رضامندی کے ساتھ نہیں ہوتا۔'' یہ ہوتا ہی ان چیزوں میں ہے جن میں لوگوں کے مابین اختلاف اور جھگڑا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ بخل کیا جاتا ہے۔

امام شافعی اور جنہوں نے اس کے بارے کہا ہے ان کے نزدیک قرعہ اندازی کا طریقہ یہ ہے کہ کاغذ کے مساوی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لئے جائیں اور ہر ٹکڑے پر حصہ دار کا نام لکھ دیا جائے پھر انہیں مٹی کی ایسی گولیوں میں رکھ دیا جائے جو مساوی ہوں ان میں کوئی تفاوت نہ ہو۔ پھر وہ تھوڑی تھوڑی خشک کر لی جائیں پھر وہ کسی آدمی کے کپڑے میں ڈال دی جائیں جو وہاں حاضر نہ ہو۔ اور انہیں کپڑے سے ڈھانپ دیا جائے پھر وہ اپنا ہاتھ اس میں داخل کرے اور ایک نکال لے اور جس آدمی کا نام لے اسے وہ جز اور حصہ دے دے جس پر قرعہ اندازی کی گئی۔

مسئلہ نمبر 4۔ یہ آیت اس پر بھی دال ہے کہ سوائے دادی کے تمام قرابتداروں کی نسبت خالہ کے لئے حق پرورش زیادہ ہے۔ اور تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کا فیصلہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے لئے فرمایا تھا اور ان کے نکاح میں ان کی خالہ تھی۔ اور فرمایا: ''بلاشبہ خالہ ماں کے قائم مقام ہے (3)''۔ یہ مسئلہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

ابو داؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے (4)۔ انہوں نے بیان فرمایا: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ گئے اور حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو لے آئے تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: اسے میں لوں گا، میں اپنے چچا کی بیٹی کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ اس کی خالہ میرے پاس ہے اور بلاشبہ خالہ ماں ہی ہوتی ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اپنے چچا کی بیٹی کا

1۔ صحیح بخاری، باب القرعۃ فی المشکلات، حدیث 2491، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ ایضاً، حدیث نمبر 2492
3۔ ایضاً، کتاب الصلح، حدیث نمبر 2501، ایضاً
4۔ ابی داؤد، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1940، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ میرے عقد میں رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی ہے اور وہ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں، کیونکہ میں اس کی طرف گیا، میں نے سفر کیا اور اسے ساتھ لے کر آیا۔ پس حضور نبی مکرم ﷺ تشریف لائے اور حدیث ذکر کی فرمایا: ''جہاں تک بچی کا ذکر ہے تو میں حضرت جعفر کے حق میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں یہ اپنی خالہ کے پاس رہے گی بلاشبہ خالہ ماں ہوتی ہے۔'' ابن ابی خیثمہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے وصی تھے۔ پس اس بنا پر خالہ وصی کی نسبت بھی زیادہ حق رکھتی ہے۔ اور چچا کا بیٹا جب خاوند ہو تو وہ خالہ کے حق حضانت کو ختم نہیں کرتا اگرچہ وہ اس کا محرم نہ ہو۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٤٦﴾

''جب کہا فرشتوں نے اے مریم! اللہ تعالیٰ بشارت دیتا ہے تجھے ایک حکم کی اپنے پاس سے اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا معزز ہوگا دنیا اور آخرت میں اور (اللہ کے) مقربین سے ہوگا۔ اور گفتگو کرے گا لوگوں کے ساتھ گہوارے میں بھی اور پکی عمر میں بھی اور نیکوکاروں میں سے ہوگا۔''

یہ حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کی دلیل ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ کے متعلق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ کے متعلق ہو۔ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ابو السمان نے اسے بِكِلْمَةٍ منه پڑھا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ اس میں اِسْمُهَا نہیں فرمایا کیونکہ کلمة بمعنی ولد ہے۔ اور المسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے۔ اور اس کا معنی صدیق ہے، حضرت ابراہیم نخعی نے یہی کہا ہے اور یہ معرب الفاظ میں سے ہے۔ اور اس میں اصل شین ہے اور وہ مشترک ہے۔

ابن فارس نے کہا ہے: مسیح کا معنی پسینہ ہے اور المسیح کا معنی الصدیق ہے اور مسیح کا معنی ایسا درہم بھی ہے جس پر نقش مٹا ہوا ہو۔ اور المَسْح کا معنی جماع ہے۔ کہا جاتا ہے مَسحها اور الامسح سے مراد نرم و ملائم جگہ بھی ہے۔ اور المسحاء وہ عورت جس کے کولہو اور ران کمزور ہوں۔ و بفلان مَسْحة من جِمال (فلاں کے پاس انتہائی مضبوط عمدہ اونٹ ہے) اور المسائح انتہائی مضبوط عمدہ اونٹ اس کی واحد مَسِيحة ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

لها مسائحُ زُوْر في مراكِضها　　لِينٌ و ليس بها وَهْن والارفق

اس میں لفظ مسائح اسی معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور مسیح ابن مریم کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کون سے مادہ سے لیا گیا ہے؟ پس کہا گیا ہے: کیونکہ آپ نے زمین میں خوب سیاحت کی اور آپ نے حفاظت کے لئے کوئی گھر نہیں بنایا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ جب کسی کوڑھ زدہ کو پھونک مارتے تھے تو وہ صحت یاب ہو جاتا تھا، تو اسی وجہ سے آپ کا نام مسیح پڑ گیا۔ اس بنا پر یہ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیونکہ آپ کو برکت کا تیل لگایا گیا تھا، انبیاء علیہم السلام کو جو تیل لگایا جاتا ہے وہ انتہائی خوشبودار ہوتا ہے، پس جب وہ لگایا جاتا ہے تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ نبی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے چونکہ ان کے دونوں (پاؤں کے) تلوؤں کو مس کیا گیا تھا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: ''کیونکہ حسن و جمال نے ان کا احاطہ کیا ہوا تھا اور وہ ان پر ظاہر اور عیاں تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کیونکہ انہیں گناہوں سے پاک کر دیا گیا تھا۔ اور ابوالہیثم نے کہا ہے: مسیح، مسیخ کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے مسحه الله یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی حسین اور مبارک پیدا فرمایا اور مسخه کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی ملعون اور قبیح پیدا کیا۔ اور ابن اعرابی نے کہا ہے: المسیح الصدیق یعنی مسیح کا معنی صدیق ہے۔ اور مسیخ کا معنی اعور (کانا) ہے۔ اور دجال کو یہی نام دیا گیا ہے۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: مسیح دراصل عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اصل میں مشیح یعنی شین کے ساتھ ہے اور پھر اسے عربی کی طرف منتقل کیا گیا ہے جیسا کہ موشیٰ کو عربی میں موسیٰ بنا دیا گیا ہے اور رہا دجال تو اس کا نام مسیح اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس کی ایک آنکھ مسخ کر دی گئی ہے اور دجال کے لئے مِسّیح میم کے کسرہ اور سین کی شد کے ساتھ کہا گیا ہے اور بعض اسی طرح خا نقطے والی کے ساتھ کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں مَسیخ یعنی میم مفتوح ہے خا نقطے والی ہے اور سین مخفف ہے۔ پہلا زیادہ مشہور ہے اور اکثر کا قول اسی کے مطابق ہے۔ اور اس کا وہ نام اس لئے ہے کیونکہ وہ زمین میں گھومتا پھرتا رہے گا اور سوائے مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور بیت المقدس کے تمام شہروں میں داخل ہوگا اور یہ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ پس دجال زمین میں فساد برپا کرنے کے لئے چکر لگائے گا، گھومے گا اور ابن مریم علیہ السلام بخشش و عطا کے لئے سیاحت کریں گے۔ اور اس بنا پر کہ اس کی ایک آنکھ بند کر دی گئی ہے فعیل بمعنی مفعول ہوگا۔

اور شاعر نے کہا:

اِنَّ المسیح یقتل المسِیخا

بے شک مسیح علیہ السلام مسیخ (دجال) کو قتل کر دیں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے سوا کوئی شہر نہیں ہے مگر دجال اس میں داخل ہوگا (1)''۔ الحدیث۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے ''سوائے کعبہ اور بیت المقدس کے'' اسے ابو جعفر طبری نے ذکر کیا ہے اور ابو جعفر طحاوی نے ''مسجد طور'' کا اضافہ ذکر کیا ہے اور اسے انہوں نے جنادہ بن ابی امیہ عن بعض اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

اور ابوبکر بن ابی شیبہ نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے ''کہ وہ ساری زمین پر غالب آجائے گا سوائے حرم پاک اور بیت المقدس کے اور وہ مومنین کو بیت المقدس میں محصور کر دے

1۔ صحیح بخاری، باب لا یدخل الدجال المدینہ، حدیث نمبر 1748، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گا۔'' اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ''پس ہمارے درمیان وہ اسی طرح ہوگا کہ اچانک اللہ تعالیٰ حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام کو مبعوث فرمائے گا۔ وہ دمشق کے مشرق سے سفید منارہ کے پاس نزول فرمائیں گے اس حال میں کہ وہ ورس اور زعفران سے رنگا ہوا لباس پہنے ہوئے ہوں گے اور اپنے ہاتھ دو فرشتوں کے پروں پر رکھے ہوئے ہوں گے جب وہ اپنا سر جھکائیں گے تو اس سے قطرے گریں گے اور جب اسے اٹھائیں گے تو اس سے چاندی کے جے گریں گے جو اپنی ہیئت و شکل میں موتیوں کی مثل ہوں گے۔ پس کسی کافر کے لئے حلال نہ ہوگا کہ وہ آپ کی سانس کی ہوا کو پائے مگر وہ مر جائے گا۔ اور آپ کی سانس کی انتہا وہاں تک ہوگی جہاں تک آپ کی نظر پہنچے گی پس آپ اسے تلاش کریں گے یہاں تک کہ اسے باب لد (لد فسطین میں بیت المقدس کے قریب ایک گاؤں ہے) کے پاس پالیں گے اور اسے قتل کر دیں گے، الحدیث۔ یہ ایک طویل حدیث ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام ہے کسی سے مشتق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کا یہ نام رکھا ہے، اس بنا پر عیسیٰ المسیح سے بدل کل ہوگا۔ اور عیسیٰ عجمی اسم ہے اسی وجہ سے وہ غیر منصرف ہے۔ اور اگر آپ اسے عربی قرار دیں تو پھر اس کے غیر منصرف ہونے کے لئے معرفہ یا نکرہ ہونے کا کوئی سوال نہیں کیونکہ اس میں الف تانیث موجود ہے (اور یہ قائم مقام دو سببوں کے ہے) اور یہ مشتق ہوگا عاسہ یعوسہ سے یعنی جب کوئی کسی کے لئے تدبیر اور انتظام کرے اور اس پر ڈٹ جائے اور قائم رہے۔

وَجِيْهًا کا معنی ہے شریف، صاحب قدر و منزلت اور یہ لفظ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اخفش نے یہی کہا ہے۔

وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقربین میں سے ہوگا۔ یہ **وَجِيْهًا** پر معطوف ہے یعنی بمعنی مقربا، اخفش نے یہی کہا ہے۔ اور وجیہ کی جمع وُجہاء اور وِجہاء ہے۔ **وَيُكَلِّمُ النَّاسَ** اس کا عطف بھی وجیہا پر کیا گیا ہے۔ اخفش نے بھی یہی کہا ہے۔ اور **الْمَهْدِ** سے مراد بچے کی شیر خوارگی کا بچھونا ہے۔ اور مہدت الأمر کہا جاتا ہے جب تو اسے تیار کرے اور پھر اسے روندے...... اور قرآن کریم میں ہے: **فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ** ۝ (الروم) (تو وہ اپنے لئے ہی راہ ہموار کر رہے ہیں) اور امتھد الشیٔ کا معنی ہے کسی شے کا اس طرح بلند ہونا جس طرح اونٹ کی کوہان بلند ہوتی ہے۔ **وَكَهْلًا**، الکھل سے مراد عمر کا وہ حصہ ہے جو بچپن اور شیخوخۃ کے درمیان ہوتا ہے (یعنی پکی عمر) اور امرأۃ کھلۃ پکی عمر کی عورت۔ اور اکتھلت الروضۃ جب باغ میں کلیاں عام ہو جائیں۔ کہتے ہیں کہ آپ ہوارے میں لوگوں سے بطور معجزہ اور علامت کے گفتگو کرتے تھے اور پکی عمر میں وحی اور رسالت کے سبب گفتگو کرتے تھے۔

ابو العباس نے کہا ہے: آپ نے گہوارے میں لوگوں سے اس وقت گفتگو کی جب آپ نے اپنی ماں کی برأت کا اظہار فرمایا اور کہا: **اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ** الآیہ۔ اور رہی حالت کہولت کی گفتگو! تو جب اللہ تعالیٰ آپ کو آسمان سے نازل فرمائے گا تو اس وقت آپ کو تینتیس برس کی عمر والی حالت پر نازل فرمائے گا اور یہی کھل کی حالت ہے تو آپ انہیں فرمائیں گے: **اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ** جیسا کہ آپ نے گہوارے میں کہا تھا۔ پس یہ دونوں معجزے اور دلائل ہیں۔

مہدوی نے کہا ہے: آیت کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ فرمادیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گہوارے میں ان سے گفتگو کریں گے اور کہولت کی حالت میں ان سے گفتگو کرنے تک وہ زندہ رہیں گے، جبکہ عادت یہ ہے کہ جس کسی نے گہوارے میں گفتگو کی وہ زندہ نہیں رہا۔

زجاج نے کہا ہے: وَ كَهْلًا بمعنی ویکلم الناس كَهْلًا ہے۔ اور فراء اور اخفش نے کہا ہے: یہ وَجِیْهًا پر معطوف ہے۔ اور کہا گیا ہے اس کا معنی ہے اور وہ لوگوں سے صغرسنی اور کہولت کی عمر میں گفتگو کریں گے۔ ابن جریج نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ الکھل کا معنی حلیم اور بردبار ہے۔ (1)

نحاس نے کہا ہے: لغت میں یہ معنی معروف نہیں۔ اہل لغت کے نزدیک الکھل سے مراد چالیس سال کے قریب کی عمر ہوتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: سولہ برس تک کی عمر کو حَدَث (لڑکپن) کہا جاتا ہے۔ پھر بتیس سال تک جوانی ہوتی ہے۔ اور پھر تینتیسویں سال میں کہولت شروع ہوجاتی ہے، اخفش نے یہی کہا ہے۔ وَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ اس کا عطف وَجِیْهًا پر کیا گیا ہے یعنی و ھو من العباد الصالحین۔ (اور وہ نیکوکار بندوں میں سے ہوگا۔) ابوبکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن ادریس نے حصین سے اور انہوں نے ہلال بن یساف سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: گہوارے میں تین کے سوا کسی نے گفتگو نہیں کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، صاحب یوسف اور صاحب جریج۔ اسی طرح کہا او صاحب یوسف۔

اور یہی صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''گہوارے میں سوائے تین کے کسی نے کلام نہیں کی حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اور صاحب جریج اور صاحب الجبار اور یہ اس دوران ہوا جب بچہ اپنی ماں کا دودھ پیتا ہے۔'' اور انہوں نے طویل حدیث بیان کی۔ اور حضرت صہیب کی حدیث میں اصحاب اخدود کے واقعہ میں یہ بھی آیا ہے ''کہ ایک عورت کو لایا گیا تا کہ اسے ایمان لانے کی وجہ سے آگ میں ڈال دیا جائے اور اس کے ساتھ ایک (شیرخوار) بچہ بھی تھا۔'' اور مسلم کے علاوہ میں ہے ''وہ شیرخوار تھا تو عورت آگ میں کودنے سے ذرا خوفزدہ ہوئی تو اس بچے نے کہا یا امہ اصبری فانك علی الحق اے میری ماں! تو صبر کر (یعنی آگ میں ڈالے جانے سے خوفزدہ نہ ہو) کیونکہ تو ہی حق پر ہے۔

اور ضحاک نے کہا ہے: گہوارے میں چھ نے کلام کی ہے۔ شاہد یوسف، فرعون کی بیوی کی ماشطہ کا بچہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، یحییٰ، صاحب جریج اور صاحب جبار اور انہوں نے اخدود کا ذکر نہیں کیا اور انہوں نے صاحب الاخدود کو ساقط کردیا ہے اور اس سمیت کلام کرنے والے سات ہوجائیں گے۔ اس کے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے درمیان کوئی معارضت نہیں ہے ''کہ گہوارے میں تین کے سوا کسی نے کلام نہیں کی'' آپ نے کلام حصر کے ساتھ فرمایا۔ کیونکہ آپ نے ان کے بارے خبر دی جن کا علم آپ کو اس وقت بذریعہ وحی عطا فرمایا گیا پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس کے بارے چاہا آپ کو آگاہ فرمایا اور آپ نے اس کے بارے خبر دی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا صاحب یوسف تو اس کے بارے کلام آگے آئے گا۔ اور صاحب جریج، صاحب الجبار اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، قبل الحدیث 3179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صاحب الاخدود کا ذکر صحیح مسلم میں ہے۔ اور عنقریب اصحاب اخدود کا قصہ ''سورۃ البروج'' میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور جہاں تک فرعون کی بیوی کی ماشطہ کے بچے کا ذکر ہے تو اسے علامہ بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب مجھے سفر معراج پر لے جایا گیا تو میں نے انتہائی طیب اور اچھی خوشبو میں سیر کی، تو میں نے کہا یہ خوشبو کیسی ہے؟ انہوں نے بتایا: فرعون کی بیٹی کی ماشطہ اور اس کی اولاد کی اس کی کنگھی اس کے ہاتھ سے گر پڑی تو اس نے کہا: بسم اللہ (اللہ تعالیٰ کے نام سے) تو اس پر فرعون کی بیٹی نے کہا: کیا وہ میرا باپ ہے؟ اس نے جواب دیا: ربی و ربك و رب ابیك (اس کے نام سے جو) میرا رب ہے اور تیرا رب ہے اور تیرے باپ کا بھی رب ہے۔ اس نے کہا: کیا میرے باپ کے سوا بھی تیرا کوئی رب ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں میرا، تیرا اور تیرے باپ کا رب اللہ ہے۔۔۔۔ اس نے کہا نہیں فرعون نے اسے بلایا اور کہا: کیا تیرا میرے سوا کوئی رب ہے؟ اس نے جواب دیا۔ ہاں میرا اور تیرا رب اللہ ہے ۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔۔ پھر اس نے تانبے کے ٹکڑے پگھلانے کا حکم دیا پس اسے گرم کیا گیا پھر اس نے اسے اس میں پھینک دینے کا حکم دیا تو ماشطہ نے کہا: مجھے تجھ سے ایک کام ہے۔ اس نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ میری اور میرے بچے کی ہڈیوں کو ایک ہی جگہ میں جمع کر دے گا۔ اس نے کہا: یہ تیرے لئے اس حق کے عوض میں ہے جو تیرے لئے ہم پر لازم ہے۔ پس اس نے ان کے بارے حکم دیا تو انہیں ایک ایک کر کے اس میں پھینک دیا یہاں تک کہ وہ ان میں شیر خوار بچے تک جا پہنچا، تو اس نے کہا: اے ماں! تو کود جا اور! میں تاخیر نہ کر کیونکہ ہم حق پر ہیں۔۔۔۔ راوی نے کہا۔۔۔۔ چار بچوں نے صغر سنی میں گفتگو کی۔ ایک یہ بچہ ہے، دوسرا شاہد یوسف، تیسرا صاحب جریج اور چوتھا حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

''مریم بولیں اے میرے پروردگار! کیونکر ہو سکتا ہے میرے ہاں بچہ؟ حالانکہ ہاتھ تک نہیں لگایا مجھے کسی انسان نے۔ فرمایا بات یونہی ہے (جیسے تم کہتی ہو لیکن) اللہ پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے جب فیصلہ فرماتا ہے کسی کام (کے کرنے) کا تو بس اتنا ہی کہتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: قَالَتْ رَبِّ مریم بولیں اے میرے سردار۔ آپ حضرت جبریل علیہ السلام کو خطاب کر رہی ہیں، کیونکہ جب وہ اس کے پاس انسانی شکل میں آئے اور اسے کہا: بلاشبہ میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ وہ تجھے ایک پاکیزہ خوبرو بچہ عطا فرمائے تو جب مریم نے ان کا یہ قول سنا تو آپ نے ان سے بچہ کے طریقے کے بارے پوچھا اور کہا: میرے ہاں بچہ کیوں کر ہو سکتا ہے حالانکہ کسی انسان نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا؟ یعنی نکاح کے ساتھ (سورۃ مریم میں ہے) وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۝ (مریم) (اور نہ میں بدچلن ہوں)

انہوں نے یہ بطور تاکید ذکر کیا ہے، کیونکہ ان کا یہ قول لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ (مجھے کسی انسان نے ہاتھ نہیں لگایا) حرام اور حلال دونوں طریقوں کو شامل ہے۔ آپ کہتی ہیں: وہ عادت جاریہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں جاری کر رکھی ہے وہ یہ ہے

کہ بچہ پیدا ہوتا ہے نکاح سے یا زنا سے۔ اور کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بھی بعید نہیں سمجھا، لیکن ارادہ یہ کیا کہ یہ بچہ کیسے ہوگا۔ کیا مستقبل میں خاوند کی جانب سے یا ابتداءً ہی اللہ تعالیٰ اسے پیدا فرمائے گا؟ اور روایت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے جس وقت مریم کو کہا: كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ (بات یونہی ہے اللہ پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے) قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (اس نے کہا اسی طرح ہے تیرے رب نے فرمایا ہے وہ مجھ پر آسان ہے)

انہوں نے مریم کی قمیص کے گریبان اور ان کی آستین میں پھونک ماری۔ ابن جریج نے یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: حضرت جبریل امین علیہ السلام نے اپنی انگلی کے ساتھ ان کی قمیص کی آستین کو پکڑا اور وہ اسی ساعت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہو گئیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔ اس کا بیان سورۂ مریم میں آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور بعض نے کہا ہے: جبریل امین کی پھونک مریم کے رحم پر پڑی پس وہ اس کے سبب حاملہ ہو گئی۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ تخلیق حضرت جبریل امین علیہ السلام کی پھونک سے ہو کیونکہ اس طرح جزوی طور پر بچہ ملائکہ میں سے ہو جائے گا اور اس کا بعض انسانوں میں سے ہوگا لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا اور ان کی اولاد سے عہد و پیمان لیا تو کچھ پانی باپوں کی صلبوں میں رکھ دیا اور کچھ ماؤں کی رحموں میں، پس جب یہ دونوں پانی جمع ہوں تو بچہ بن گیا اور اللہ تعالیٰ نے دونوں پانی اکٹھے مریم میں رکھ دیئے کچھ ان کی رحم میں اور کچھ ان کی صلب میں، پس جبریل امین نے اس میں پھونک ماری تا کہ ان کی شہوت بھڑک جائے، کیونکہ عورت کی شہوت میں جب تک ہیجان پیدا نہ ہو وہ حاملہ نہیں ہوتی، پس جب حضرت جبریل امین کی پھونک سے ان کی شہوت میں انگیخت پیدا ہوئی تو وہ پانی جو ان کی صلب میں تھا وہ رحم میں آ گرا اور اس طرح دونوں پانی آپس میں مل گئے تو اس طرح استقرار حمل ہو گیا۔ پس اسی کے بارے ارشاد باری تعالیٰ: اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا یعنی جب وہ کسی شے کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے کہتا ہے کُنْ تو ہو جا...... تو وہ شے ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں مکمل گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾

''اور اللہ تعالیٰ سکھائے گا اسے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل۔ اور (بھیجے گا اسے) رسول بنا کر بنی اسرائیل کی طرف (وہ انہیں آ کر کہے گا کہ) میں آ گیا ہوں تمہارے پاس ایک معجزہ لے کر تمہارے رب کی طرف سے (وہ معجزہ یہ ہے کہ) میں بنا دیتا ہوں تمہارے لئے کیچڑ سے پرندے کی سی صورت پھر پھونکتا ہوں اس (بے جان

صورت) میں تو وہ فوراً ہو جاتی ہے پرندہ اللہ کے حکم سے اور میں تندرست کر دیتا ہوں مادر زاد اندھے کو اور (لاعلاج) کوڑھی کو اور میں زندہ کرتا ہوں مردے کو اللہ کے حکم سے اور بتلاتا ہوں تمہیں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ تم جمع کر کے رکھتے ہو اپنے گھروں میں۔ بے شک ان معجزوں میں (میری صداقت کی) بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایماندار ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ابن جریج نے کہا ہے: الکتاب سے مراد کتابت کرنا اور لکھنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد تورات اور انجیل کے علاوہ کوئی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سکھائی۔

وَرَسُوْلًا (یعنی) اور ہم اسے رسول بنائیں گے یا وہ ان سے رسول کی حیثیت سے ہمکلام ہوگا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ وَجِيْهًا پر معطوف ہے اور اخفش نے کہا ہے: اگر چاہے تو وَ رَسُوْلًا میں واؤ کو مقحم بنا دے اور رسولاً کو ہٗ ضمیر سے حال بنا لے تقدیر کلام ہوگی ویعلمہ الکتاب رسولاً (اور اللہ تعالیٰ اسے کتاب سکھائے گا اس حال میں کہ وہ رسول ہوگا) اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے ''انبیاء بنی اسرائیل میں سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور آخری حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں'' اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ یعنی میں تمہارے لئے تصویر اور شکل سی بنا دیتا ہوں۔ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ اعرج اور ابو جعفر نے کھیّۃ شد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے ہمزہ کے ساتھ۔

اور الطیر مذکر و مونث دونوں ہو سکتا ہے۔ فَاَنْفُخُ فِيْهِ اور ان میں سے ایک میں پھونک مارتا ہوں یا کیچڑ میں پھونکتا ہوں تو وہ پرندہ اڑنے والا ہو جائے گا۔ اور طائر اور طیر یہ تاجر اور تجر کی مثل ہیں۔

وہب نے کہا ہے: وہ اڑتا رہا جب تک لوگ اس کی طرف دیکھتے رہے اور جب وہ ان کی آنکھوں سے غائب ہو گیا تو مردہ ہو کر گر پڑا تا کہ مخلوق کا فعل اللہ تعالیٰ کے فعل سے ممتاز ہو جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے چمگادڑ کے سوا کوئی نہیں بنایا کیونکہ خلقت کے اعتبار سے وہ کامل ترین پرندہ ہے تا کہ وہ قدرت میں انتہا کو پہنچ جائے، کیونکہ اس کے پستان بھی ہیں، دانت بھی اور کان بھی ہیں اور اسے حیض بھی آتا ہے، وہ پاک بھی ہوتا ہے اور بچے بھی جنتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: انہوں نے چمگادڑ بنانے کا مطالبہ کیا کیونکہ وہ خلقت میں تمام سے عجیب تر ہے اور اس کے عجائب میں سے یہ ہے کہ اس میں گوشت بھی ہے اور خون بھی، وہ بغیر پروں کے اڑتا ہے اور حیوانوں کی طرح بچوں کو جنم دیتا ہے اور وہ اس طرح انڈے نہیں دیتا جس طرح باقی تمام پرندے انڈے دیتے ہیں، اس کی کھیری ہوتی ہے اور اس سے دودھ نکلتا ہے، وہ نہ دن کی روشنی میں دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی رات کی تاریکی میں، بلکہ وہ صرف دو ساعتوں میں دیکھ سکتا ہے، ایک ساعت سورج غروب ہونے کے بعد اور ایک ساعت طلوع فجر کے بعد اس سے پہلے کہ وہ خوب روشن ہو۔ اور وہ اس طرح ہنستا ہے جس طرح آدمی ہنستا ہے اور اسے اسی طرح حیض آتا ہے جس طرح عورت کو حیض آتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: بے شک ان کا آپ سے اس بارے میں سوال کرنا تعنت اور سرکشی کی بنا پر تھا تو انہوں نے کہا: ہمارے لئے

چمگادڑ بناؤ اور اس میں روح ڈال دو اگر آپ اپنے قول میں سچے ہیں، پس آپ نے مٹی لی اور اس سے چمگادڑ بنایا پھر اس میں پھونک ماری تو وہ زمین و آسمان کے درمیان اڑنے لگا، اس میں مٹی اور پھونک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے تھی اور تخلیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے، جس طرح کہ پھونک جبریل امین علیہ السلام کی جانب سے تھی اور تخلیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ الاکمہ وہ جو اندھا اور نابینا پیدا ہوتا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے اور اسی طرح ابو عبیدہ نے کہا ہے: وہ جو اندھا پیدا کیا جاتا ہے اور رؤیۃ کے بارے کسی نے کہا:

فَارْتَدَّ ارتداد الاکمہ

ابن فارس نے کہا ہے: الکمہ کا معنی نابینا (یعنی) انسان پیدا ہوتا ہے اس حال میں کہ اسے یہ عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ سوید نے کہا ہے: کَمِهت عیناہ حتی ابیضتا (اس کی آنکھیں اندھی ہیں یہاں تک کہ وہ سفید ہوگئیں)

حضرت مجاہد نے کہا ہے: وہ جو دن کے وقت تو دیکھتا ہے لیکن رات کے وقت نہیں دیکھ سکتا۔ عکرمہ نے کہا ہے: وہ اعمش ہیں، البتہ لغت میں اس کا معنی عمٰی اندھا پن ہے، کہا جاتا ہے كَمِهَ یَكْمَهُ كَمَهًا اور كَمَّهتها۔ أنا کا معنی ہے جب تو اسے اندھا کر دے۔ اور برص تو معروف بیماری ہے یعنی وہ سفید داغ جو ساری جلد پر چھا جاتے ہیں (اور اسے سفید کر دیتے ہیں) اور الأبرص کا معنی قمر (چاند) بھی ہے اور سام اَبرص (چھپکلی) تو معروف ہے اور اس کی جمع ابا ریص آتی ہے ان دونوں بیماریوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں عاجز کر دینے والی ہیں (یعنی ان کا علاج انتہائی مشقت آمیز اور مشکل ہے گویا لا علاج بیماریاں ہیں) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب کا غلبہ اور دور دورہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسی کی جنس سے انہیں معجزہ دکھا دیا۔

وَ اُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے چار آدمیوں کو زندہ کیا: عاذر کو وہ آپ کا دوست تھا، بڑھیا کے بیٹے کو، ابنۃ العاشر کو اور سام بن نوح کو۔ فاللہ اعلم، پس عاذر نے تو چند دن قبل وفات پائی تھی تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی پس وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی چربی ٹپکنے کے قریب ہوگئی پس وہ زندہ رہا اور اس کی اولاد بھی ہوئی۔ اور رہا ابن العجوز! تو آپ اس کے پاس سے گزرے اسے چارپائی پر اٹھایا جا رہا تھا، تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے پہن لئے اور چارپائی اپنی گردن پر اٹھالی اور اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ گیا اور جہاں تک بنت العاشر کا تعلق ہے تو آپ ایک رات اس کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو وہ اس کے بعد زندہ ہوگئی اور اس کی اولاد بھی ہوئی، پس جب بنی اسرائیل نے یہ دیکھا تو کہنے لگے: بلاشبہ آپ انہیں زندہ کرتے ہیں جن کی موت قریب قریب واقع ہوئی ہے تو شاید وہ ابھی نہ مرے ہوں بلکہ ان پر سکتہ طاری ہوا ہو، تو آپ ہمارے لئے سام بن نوح کو زندہ کریں۔ تو آپ نے انہیں فرمایا: تم اس کی قبر کے بارے میری راہنمائی کرو۔ چنانچہ آپ نکلے اور آپ کے ساتھ قوم بھی نکلی یہاں تک کہ اس کی قبر کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو وہ اپنی قبر سے اس حال میں نکلا کہ اس کے سر کے بال سفید تھے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا: تیرا سر کیسے سفید ہو گیا ہے حالانکہ تمہارے زمانے میں بڑھاپا نہیں تھا؟ تو اس نے جواب دیا: اے روح اللہ! بلاشبہ تو نے مجھے بلایا ہے اور میں نے یہ آواز سنی کوئی کہہ رہا ہے: روح اللہ کو جواب دو، تو میں نے یہ گمان کیا کہ

قیامت قائم ہوچکی ہے، پس اسی خوف کی وجہ سے میرا سر سفید ہو گیا ہے۔ پھر آپ نے اس سے نزع کے بارے پوچھا، تو اس نے کہا: اے روح اللہ! بلاشبہ نزع کی تلخی میری سانس کی نالی سے (نزخرہ سے) ابھی ختم نہیں ہوئی حالانکہ میری موت کے وقت سے (اب تک) چار ہزار برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، پھر اس نے قوم کو کہا: تم ان کی تصدیق کرلو کیونکہ یہ نبی ہیں، تو ان میں سے بعض آپ کے ساتھ ایمان لے آئے اور بعض نے آپ کو جھٹلا دیا۔ اور کہا: یہ سحر ہے۔ اسماعیل بن عیاش کی حدیث سے مروی ہے کہ انہوں نے ذکر کیا مجھے محمد بن طلحہ نے ایک آدمی سے حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام جب کسی مردے کو زندہ کرنے کا ارادہ فرماتے تھے تو آپ دو رکعت نماز ادا فرماتے پہلی رکعت میں تَبٰرَكَ الَّذِیۡ بِیَدِہِ الۡمُلۡكُ اور دوسری میں تنزیل السجدہ کی قرأت فرماتے اور جب فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے پھر ان سات اسماء کے وسیلہ سے دعا مانگتے: یا قدیمُ، یا خَفِیُّ، یا دائم، یا فردُ، یا وِتْرُ، یا اَحَدُ، یا صَمَدُ، اسے علامہ بیہقی نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے۔ اس کی اسناد قوی نہیں ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَ اُنَبِّئُكُمۡ بِمَا تَاۡكُلُوۡنَ وَ مَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِكُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ یعنی میں تمہیں اس کے بارے بتلاتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو تم جمع کر کے رکھتے ہو۔ اور یہ اس لئے ہوا کہ جب آپ نے ان کے لئے مردے زندہ کئے تو انہوں نے آپ سے ایک دوسرے معجزے کا مطالبہ کر دیا اور انہوں نے کہا: آپ ہمیں اس کے بارے بتائیے جو ہم اپنے گھروں میں کھاتے ہیں اور جو آنے والے کل کے لئے جمع کر کے رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے انہیں آگاہ کیا اور فرمایا: اے فلاں! تو نے فلاں فلاں چیز کھائی اور تو نے فلاں فلاں چیز کھائی اور فلاں فلاں چیز جمع کر کے رکھی۔ اسی کے بارے قولہ وَ اُنَبِّئُكُمۡ الآیہ ہے۔

مجاہد، زہری اور سختیانی نے ذال معجمہ کے ساتھ وماتذخرون مخفف پڑھا ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: آپ تعلیم گاہ میں بچوں کو ان چیزوں کے بارے بتلاتے تھے جو وہ جمع کر کے رکھ آتے تھے یہاں تک کہ ان کے والدین نے انہیں آپ کے پاس بیٹھنے سے روک دیا۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: آپ نے انہیں اس کے بارے بتایا جو وہ دستر خوان سے کھا کر آتے اور جو وہ خفیۃً (چھپ کر) اس سے جمع کر آتے تھے۔

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ حُرِّمَ عَلَیۡكُمۡ وَ جِئۡتُكُمۡ بِاٰیَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیۡ وَ رَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ﴿۵۱﴾

''اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اس سے پہلے آئی ہوئی کتاب تورات کی اور تاکہ میں حلال کر دوں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو (پہلے) حرام کی گئی تھیں تم پر اور لایا ہوں تمہارے پاس ایک نشانی تمہارے رب کی طرف سے سو، ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے مجھے اور مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے تمہیں، سو اس کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے''۔

وَ مُصَدِّقًا اس کا عطف وَ رَسُوْلًا پر ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ میں تمہارے پاس تصدیق کرتے ہوئے آیا ہوں۔ لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ اس کی جو مجھ سے پہلے آئی۔ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ اس میں حذف ہے، ای وَلأحل لکم جئتکم (اور تاکہ میں تمہارے لئے حلال کر دوں میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں) بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ یعنی کھانے کی اشیاء میں سے بعض جو تم پر پہلے حرام کی گئی تھیں۔

کہا گیا ہے: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کر دیا جو ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے حرام کی گئی تھیں اور وہ تورات میں نہ تھیں، مثلاً تھوم کھانا اور ہر ناخن والا جانور۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کر دیا جنہیں ان پر علماء نے حرام کر دیا تھا اور وہ تورات میں ان پر حرام نہ کی گئی تھیں۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ بعض بمعنی کل ہو۔

اور لبید نے کہا ہے:

تَرَّاكُ اَمْكِنَةٍ اذا لم ارضها　　　أو يَرْتَبِطْ بعضَ النفوس حِمامُهَا

اس میں بعض بمعنی کل استعمال ہوا ہے۔

یہ قول اہل لغت میں سے اہل نظر و فکر کے نزدیک غلط ہے، کیونکہ بعض اور جز اس جگہ پر بمعنی کل نہیں ہو سکتے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ اسلام نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کیا جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر حرام کیا تھا مثلاً تھوم کھانا وغیرہ۔ اور آپ نے ان کے لئے قتل، چوری اور فحاشی وغیرہ کو حلال نہیں کیا۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی نرمی اور ملائمت کے ساتھ ان کے پاس تشریف لائے ان چیزوں کے بارے میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس لے کر آئے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اونٹوں کی تحریم اور تھوم وغیرہ اشیاء کی تحریم کا حکم لے کر ان کے پاس آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے بعض کی حلت کا حکم لے کر آئے۔

نخعی نے بَعْضَ الَّذِیْ حَرُمَ عَلَیْکُمْ پڑھا ہے۔ یعنی یہ کَرُمَ کی مثل ہے بمعنی صَارَ حرامًا۔ یعنی وہ حرام ہو گیا کے معنی میں ہے۔ اور کبھی بعض کو بمعنی کل بھی رکھا جاتا ہے جبکہ وہاں ایسا قرینہ متصل ہو جو اس پر دلالت کرے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا:

أبا منذر افنيتَ فاستبقِ بعضنا　　　حَنَانَيْكَ بعضُ الشرّ اهون من بعض

اس میں بعض الشر اھون سے مراد کل ہے۔ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اس میں آیہ کو واحد ذکر کیا گیا ہے حالانکہ یہ آیات ہیں، اس وجہ سے کہ یہ آپ کی رسالت پر دلالت کرنے کے اعتبار سے جنس واحد ہے۔

فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَ اشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝۵۲

''پھر جب محسوس کیا عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے کفر (و انکار) (تو) آپ نے کہا: کون ہیں میرے مددگار

اللہ کی راہ میں؟ (یہ سن کر) کہا حواریوں نے کہ ہم مدد کرنے والے ہیں اللہ (کے دین) کی، ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور (اے نبی!) آپ گواہ ہو جائیو کہ ہم (حکم الٰہی کے سامنے) سر جھکائے ہوئے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کفر محسوس کیا۔ آیت میں اَحَسَّ بمعنی عَلِمَ اور وَجَدَ کے ہے (یعنی جانا اور پایا) زجاج نے یہی کہا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: اَحس، عَرَفَ (آپ نے پہچانا) کے معنی میں ہے۔ اور اس کا اصل معنی کسی شے کو حاسہ کے ساتھ پانا ہے (وجود الشئ بالحاسة) اور احساس کا معنی کسی شے کو جاننا ہے (العلم بالشئ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ (مریم: 98) (کیا آپ ان میں سے کسی کو جانتے ہیں؟ اور الحس بمعنی قتل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ (آل عمران: 152) (جبکہ تم قتل کر رہے تھے کافروں کو اس کے حکم سے) اور اسی معنی میں جراد (مکڑی) کے بارے میں حدیث بھی ہے اِذَا حَسَّهُ البرد (جب سردی نے اسے ہلاک کر دیا) مِنْهُمُ الْكُفْرَ یعنی ان کا اللہ کے ساتھ کفر و انکار کرنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ نے ان سے کلمہ کفر سنا اور فراء نے کہا ہے: انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔

قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ۔ فرمایا: کون ہے وہ جس سے میں ان کے خلاف مدد طلب کروں؟ سدی اور ثوری وغیرہما نے کہا: یہاں اِلَى اللّٰهِ بمعنی مع اللہ ہے یعنی الی بمعنی مع ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ یعنی مع اموالکم۔ (یعنی تم اپنے مالوں کے ساتھ ان کے مال نہ کھاؤ۔) واللہ اعلم۔

اور حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے مَن انصاری فی السبیل الی اللہ۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں کون میرے مددگار ہیں؟) کیونکہ آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے کون ہے جو اپنی نصرت اور مدد کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد کے ساتھ ملائے گا؟ ان دونوں قولوں کے مطابق اِلی اپنے اصل معنی پر ہے اور یہی جید اور عمدہ ہے۔

اور آپ نے نصرت اور مدد طلب کی تاکہ اس کے سبب آپ اپنی قوم سے حفاظت میں رہیں اور اعلانیہ دعوت دے سکیں، حسن اور مجاہد سے یہ معنی منقول ہے۔ اور انبیاء و اولیاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت اور طریقہ یہی ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے کہا: لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِیْدٍ۝ (ہود) (اے کاش! میرے پاس بھی تمہارے مقابلے کی قوت ہوتی یا میں پناہ ہی لے سکتا کسی مضبوط سہارے کی) یعنی خاندان اور اصحاب میری مدد کرتے۔ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ حواریوں نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ کے نبی اور اس کے دین کے مددگار ہیں۔ اور حواریوں سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب ہیں اور وہ بارہ آدمی تھے، کلبی اور ابو روق نے یہی کہا ہے۔

ان کا یہ نام رکھنے میں اختلاف ہے، سو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کے سفید کپڑوں کی وجہ سے انہیں یہ نام دیا گیا، وہ صیادین (شکاری) تھے۔ ابن ابی نجیح اور ابن ارطاۃ نے کہا ہے: وہ دھوبی تھے۔ تو انہیں یہ نام کپڑے خوب صاف کرنے کی وجہ سے دیا گیا۔ حضرت عطا نے کہا ہے: حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو متفرق عمال کے سپرد کیا اور سب سے آخر میں آپ نے انہیں حواریوں کے حوالے کر دیا اور وہ دھوبی اور رنگساز تھے، پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معلم نے

سفر کا ارادہ کیا، تو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا: میرے پاس مختلف رنگوں کے بہت سے کپڑے ہیں اور میں نے تمہیں رنگ کرنا سکھا دیا ہے پس تم انہیں رنگ دینا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک مٹکا رنگ پکایا اور اس میں تمام کپڑے ڈال دیئے اور کہا: تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے اسی طرح ہو جا جو میں تجھ سے ارادہ رکھتا ہوں۔ پس حواری آیا اور سارے کپڑے مٹکے میں پڑے ہوئے تھے۔ جب اس نے انہیں دیکھا تو کہا: تو نے انہیں خراب کر دیا ہے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سرخ، زرد اور سبز اور دیگر ان رنگوں میں کپڑے نکالے جو رنگ ان میں سے ہر کپڑے پر لکھا ہوا تھا، یہ دیکھ کر حواری بہت متعجب ہوا اور اس نے جان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اس نے لوگوں کو آپ کی طرف بلایا پس وہ آپ کے ساتھ ایمان لائے اور وہی حواری تھے۔ حضرت قتادہ اور ضحاک نے کہا ہے: انہیں یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ وہ انبیاء علیہ السلام کے ساتھ خاص تھے اور وہ اس سے اپنے دلوں کی صفائی اور طہارت کا ارادہ رکھتے تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ بادشاہ تھے، اس طرح کہ بادشاہ نے کھانے کی دعوت کی اور لوگوں کو اس پر بلایا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے جو پیالہ تھا وہ ذرا کم نہ ہوا تو بادشاہ نے آپ کو کہا: آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں عیسیٰ ابن مریم ہوں، تو اس نے کہا میں اپنی یہ سلطنت چھوڑتا ہوں اور تمہاری اتباع کرتا ہوں۔ پس وہ اپنے متبعین کو ساتھ لے کر آپ کے ساتھ چل پڑا، تو وہی حواری ہیں، یہ ابن عون نے کہا ہے۔ لغت میں الحَوَر کا اصل معنی سفیدی ہے اور حوّرت الثیاب کا معنی ہے میں نے کپڑے کو خوب صاف کیا، سفید کیا اور الحُوّاری من الطعام ماحوّر یعنی جو کھانا خوب اچھی طرح پکایا جائے۔ اور احوَرّ کا معنی ابیض (سفید ہونا) ہے۔ اور الجفنۃ المحورۃ: سفید چمڑے سے بنی ہوئی نیام اور الحواری کا معنی مددگار بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لِکل نبیٍّ حواریٌّ وحواریَّ الزبیر(1) (ہر نبی کا حواری (مددگار) ہے اور میرا حواری زبیر ہے) اور الحواریات سفید عورتیں۔

اور کسی نے کہا:

فقل للحواریات یبکین غیرنا ولا تبکنا الا الکلابُ النوابحُ

پس تو ان سفید عورتوں سے کہہ دے وہ ہمارے سوا اوروں پر روئیں اور ہم پر نہ روئیں گے مگر بھونکنے والے کتے۔

رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنْزَلْتَ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ۝۵۳

''اے رب ہمارے! ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل فرمایا اور ہم نے تابعداری کی رسول کی، تو لکھ لے ہمیں (حق پر) گواہی دینے والوں کے ساتھ۔''

قولہ تعالیٰ: رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنْزَلْتَ یعنی وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے بِمَاۤ اَنْزَلْتَ یعنی اس کے ساتھ جو تو نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا اور اس پر جو تو نے اپنے حکم میں سے ظاہر اور بیان کیا۔ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ رسول سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ شاہدین سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے، یہ

1۔ صحیح بخاری، باب فضل الطلیعۃ، حدیث نمبر 2634، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور معنی یہ ہے ہمارے اسماء ان کے اسماء کے ساتھ لکھ لے اور ہمیں من جملہ ان میں سے بنادے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے ہمیں ان کے ساتھ لکھ لے جنہوں نے تیرے انبیاء علیہم السلام کی صدق وسچائی کے ساتھ شہادت دی۔

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ﴿۵۴﴾

''اور یہودیوں نے بھی (مسیح کو قتل کرنے کی) خفیہ تدبیر کی اور (مسیح کو بچانے کے لئے) اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر (اور موثر) خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَمَكَرُوْا مراد بنی اسرائیل کے وہ کفار ہیں جن سے آپ نے کفر محسوس کیا یعنی آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب ان کی قوم اور ان کی ماں نے اپنے درمیان سے نکال دیا تو آپ حواریوں کے ساتھ ان کی طرف لوٹ کر آئے اور ان میں اعلانیہ دعوت وارشاد کا سلسلہ شروع کیا، تو انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ بنایا اور انہوں نے آپ کے قتل پر اتفاق کیا، پس یہی ان کا مکر اور خفیہ تدبیر ہے۔ اور مَكَرَ اللّٰهُ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے لئے ایسی خفیہ تدبیر کرنا ہے جسے وہ نہ جانتے ہوں، فراء وغیرہ سے یہی مروی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جب بھی انہوں نے کوئی گناہ اور غلطی کی تو ہم نے انہیں ایک تازہ اور اچھی نعمت عطا کردی۔

اور زجاج نے کہا ہے: مَكَرَ اللّٰهُ سے مراد انہیں ان کی خفیہ تدبیر پر جزا اور بدلہ دینا ہے، پس جزا اور بدلے کو ابتدا کا نام دیا گیا ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ اور وَ هُوَ خَادِعُهُمْ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لغت میں مکر کا اصل معنی حیلہ کرنا اور دھوکہ دینا ہے۔ اور مکر کا معنی خدالۃ الساق (پنڈلی کا بھر جانا) ہے اور امرأۃ ممکورۃ الساقین (ایسی عورت جس کی دونوں پنڈلیاں گول اور بھری ہوئی ہوں) اور مکر کپڑوں کی ایک قسم بھی ہے۔

اور کہا جاتا ہے: بلکہ اس سے مراد گیرو اور سرخ مٹی ہے، اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَكَرَ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ کو دوسروں کے سامنے کر دیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف سے اٹھالیا اور وہ اس طرح ہوا کہ یہودی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے تو آپ ان سے بھاگ کر گھر میں داخل ہوئے تو حضرت جبرائیل امین نے آپ کو روشندان سے آسمان کی طرف اٹھالیا، تو ان کے بادشاہ نے ان میں سے ایک خبیث آدمی کو کہا اسے یہودا کہا جاتا تھا: تو ان پر داخل ہو اور انہیں قتل کر دے، پس وہ روشندان سے اندر داخل ہوا لیکن وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ پایا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ مشابہ بنا دیا، پس جب وہ نکلا تو انہوں نے اسے عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ دیکھا چنانچہ انہوں نے اسے پکڑ لیا اور قتل کر دیا اور پھر اسے سولی دے دی۔ بعد ازاں انہوں نے کہا: اس کا چہرہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چہرہ سے مشابہت رکھتا ہے اور اس کا بدن ہمارے اپنے ساتھی کے بدن سے مشابہ ہے، پس اگر یہ ہمارا ساتھی ہے تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کہاں ہیں! اور اگر یہ عیسیٰ ہیں تو پھر ہمارا ساتھی کہاں ہے؟ پس ان کے درمیان جنگ

شروع ہوگئی اور انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو قتل کیا۔ پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ اس کے علاوہ بھی (بہت کچھ) کہا گیا ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔ ماکرین مکر یمکر مکرا سے اسم فاعل ہے اور بعض علماء نے اسے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں شمار کیا ہے اور جب وہ اس کے ساتھ پکاریں تو اس طرح کہتے ہیں: یا خیر الماکرین امکرلی۔ (اے بہترین تدبیر کرنے والے میرے لئے تدبیر فرما) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی دعا میں کہتے تھے (1)۔ اللّٰھم امکرلی ولا تمکر علیّ (اے اللہ! میرے حق میں تدبیر فرما اور میرے خلاف تدبیر نہ فرما) ہم نے اسے ''الکتاب الاسنی فی شرح اسماء الحسنیٰ'' میں ذکر کیا ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

''یاد کرو جب فرمایا اللہ نے اے عیسیٰ! یقیناً میں پوری عمر تک پہنچاؤں گا تمہیں اور اٹھانے والا ہوں تمہیں اپنی طرف اور پاک کرنے والا ہوں تمہیں ان لوگوں (کی تہمتوں سے) جنہوں نے (تیرا) انکار کیا اور بنانے والا ہوں ان کو جنہوں نے تیری پیروی کی غالب کفر کرنے والوں پر قیامت تک، پھر میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے تم نے پس (اس وقت) میں فیصلہ کروں گا تمہارے درمیان (ان امور کا) جن میں تم اختلاف کرتے رہتے تھے۔''

قولہ تعالیٰ: اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ، اِذْ میں عامل یا تو مَكَرُوْا ہے یا فعل مضمر ہے۔ اہل معانی کی ایک جماعت جن میں ضحاک اور فراء بھی ہیں انہوں نے ارشاد باری تعالیٰ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ کے بارے کہا ہے کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے، کیونکہ واؤ ترتیب کو ثابت نہیں کرتی۔ اور معنی یہ ہے: انی رافعك الی و مطهرك من الذین کفروا و متوفیك بعد ان تنزل من السماء (میں تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں ان لوگوں کی تہمتوں سے پاک کرنے والا ہوں جنہوں نے تیرا انکار کیا اور تمہیں آسمان سے اتارے جانے کے بعد تمہیں موت دوں گا۔) اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ۝ (طٰہٰ) (اور اگر ان کے (انجام کے) متعلق آپ کے رب کا فیصلہ پہلے نہ ہو چکا ہوتا اور ان کے لئے ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ابھی ان پر عذاب نازل ہو جاتا۔) اس میں تقدیر عبارت یہ ہے ولولا کلمة سبقت من ربك واجل مسمی لکان لزاما۔

شاعر نے کہا ہے:

الا یا نخلة من ذات عرق   علیك و رحمة الله السلام

اس میں تقدیر عبارت، علیك السلام و رحمة الله۔ یعنی اس میں بھی تقدیم و تاخیر ہے۔

حسن اور ابن جریج نے کہا ہے: متوفیك کا معنی ہے: میں تمہیں قبضہ میں لینے والا ہوں اور بغیر موت کے آسمان کی طرف

1۔ جامع ترمذی، باب فی دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 3474، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اٹھانے والا ہوں، جیسا کہ کہا جاتا ہے: توفیت مالی من فلان یعنی میں نے فلاں سے اپنا مال قبضے میں لے لیا۔

اور وہب بن منبہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دن کی تین ساعتوں کے لئے موت دی اور پھر انہیں آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ لیکن یہ قول بعید از حقیقت ہے۔ کیونکہ آپ کے آسمان سے اترنے اور دجال کو قتل کرنے کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح احادیث مروی ہیں، جیسا کہ ہم نے اسے ''کتاب التذکرہ'' میں بیان کیا ہے اور اس کتاب میں بھی کچھ گزر چکا ہے اور کچھ آگے آئے گا۔

اور ابن زید نے کہا ہے: متوفیك بمعنی قابضك (میں تجھے قبضہ میں لینے والا ہوں) ہے اور متوفیك اور رافعك ایک ہی ہے اور اس کے بعد موت نہیں ہے۔

ابن طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ متوفیك کا معنی ممیتك ہے (یعنی میں تجھے موت دینے والا ہوں) حضرت ربیع بن انس نے کہا ہے کہ اس سے مراد نیند کی موت ہے، (جیسا کہ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وھو الذی یتوفاکم باللیل یعنی تمہیں رات کے وقت سلا دیتا ہے کیونکہ نیند اخو الموت ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب آپ سے پوچھا گیا کیا جنت میں نیند ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، نیند اخو الموت ہے اور جنت میں کوئی موت نہیں'' اسے دارقطنی نے بیان کیا ہے۔

اور صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بغیر وفات اور بغیر نیند کے آسمان کی طرف اٹھا لیا، جیسا کہ حسن اور ابن زید نے کہا ہے اور اسے ہی طبری نے اختیار کیا ہے اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح روایت ہے۔ اور ضحاک نے بھی یہی کہا ہے۔ ضحاک نے کہا ہے: واقعہ یہ ہے کہ جب انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، حواری ایک کمرے میں جمع ہوئے اور وہ بارہ آدمی تھے تو حضرت مسیح علیہ السلام کمرے کے طاق سے ان پر داخل ہوئے تو ابلیس نے یہود کی جماعت کو اس سے آگاہ کر دیا، چنانچہ ان میں سے چار ہزار آدمی سوار ہو کر آئے اور انہوں نے کمرے کے دروازہ کو گھیر لیا، تو حضرت مسیح نے حواریوں کو کہا: تم میں سے کون ہے جو نکلے گا اور اسے قتل کر دیا جائے گا اور وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا؟ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے نبی! میں، پس آپ نے اون سے بنا ہوا ایک جبہ اور ایک عمامہ اس کی طرف پھینکا اور اسے اپنا نیزہ (مراد ایسا ڈنڈا جس کے نیچے پھل لگا ہوا ہو) بھی عطا فرمایا اور اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ بنا دیا گیا، وہ یہود کی طرف نکلا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور اسے سولی دے دی اور رہے حضرت مسیح علیہ السلام! تو اللہ تعالیٰ نے انہیں پر عطا فرمائے اور انہیں نور کا لباس پہنا دیا اور ان سے کھانے پینے کی لذت منقطع کر دی تو وہ ملائکہ کے ساتھ اڑ گئے۔

ابوبکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ ابو معاویہ اعمش نے منہال سے، انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف اٹھانے کا ارادہ فرمایا تو وہ اپنے اصحاب کی طرف نکلے وہ بارہ آدمی تھے، ایک معین کمرے میں جمع تھے اور آپ کے سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے تو آپ نے انہیں کہا: خبردار! بلاشبہ تم میں سے وہ ہے جو عنقریب میرے بارے میں بارہ

مرتبہ انکار کرے گا اس کے بعد کہ وہ میرے ساتھ ایمان لا چکا ہے، پھر آپ نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جس پر میری شبیہ ڈال دی جائے پھر وہ میری جگہ قتل کر دیا جائے تو وہ میرے درجہ میں میرے ساتھ ہوگا؟ تو ان کے جوانوں میں سے ایک جوان اٹھا اور اس نے کہا میں، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تو بیٹھ جا، پھر آپ نے دوبارہ بات کی تو وہی جوان اٹھا اور اس نے کہا: میں، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تو بیٹھ جا۔ آپ نے پھر اپنی بات کی تو وہی جوان پھر اٹھا اور اس نے کہا: میں، تو اب کی بار آپ نے فرمایا: ہاں تو ہی وہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پرتو ڈال دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس سوراخ سے اوپر اٹھا لیا جو گھر میں آسمان کی طرف تھا۔ راوی نے بیان کیا: اور پھر تلاش کرنے والے یہودی آئے اور انہوں نے اس مشابہ شخص کو پکڑ لیا اور اسے قتل کر دیا اور پھر اسے سولی پر لٹکا دیا اور ان میں سے بعض نے آپ کا بارہ مرتبہ انکار کیا بعد اس کے کہ وہ آپ کے ساتھ ایمان لا چکے تھے، پس اس طرح وہ تین فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک فرقے نے کہا: ہم میں اللہ تعالیٰ رہا جب تک اس نے چاہا پھر وہ آسمان کی طرف بلند ہو گیا اور وہ یعقوبیہ ہیں۔ اور ایک گروہ نے کہا: ہم میں ابن اللہ رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور یہ نسطوریہ ہیں۔ اور ایک فرقے نے کہا: ہم میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول رہا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا اور پھر اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور یہ مسلمان ہیں۔ پھر دونوں کافر گروہ مسلمان گروہ پر غالب آ گئے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ پھر اسلام مسلسل مٹتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو وہ قتل کر دیئے گئے اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ ۚ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (الصف: 14) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان کے آباء ایمان لائے عَلٰى عَدُوِّهِمْ یعنی ہم نے اہل ایمان کے دین کو کفار کے دین پر غلبہ دینے میں ان کی تائید کی فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ پس وہ غالب ہو گئے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم بخدا! ابن مریم عادل حکمران کی حیثیت سے ضرور نازل ہوں گے وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے اور خنزیر کو ضرور قتل کریں گے اور جزیہ ختم کر دیں گے اور جوان اونٹنیوں کو چھوڑ دیا جائے گا اور ان پر کوئی کام نہ کیا جائے گا اور کینہ، باہم ایک دوسرے سے بغض رکھنا اور باہمی حسد سب ختم ہو جائے گا اور آپ مال کی طرف دعوت دیں گے اور کوئی اسے قبول نہ کرے گا''۔

اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! ابن مریم کو (مکہ اور مدینہ کے درمیان) روحاء کے راستہ پر ڈالا جائے گا حج کے لئے یا عمرہ کرنے کے لئے یا اس لئے تاکہ وہ دونوں کو ایک ساتھ کریں۔''

وہ کسی نئی شریعت کے ساتھ نزول نہیں فرمائیں گے کہ اس سے ہماری شریعت منسوخ ہو جائے بلکہ وہ ان امور کی تجدید کے لئے نازل ہوں گے جو اس شریعت کے متبعین نے اس سے بوسیدہ کر دیئے ہیں اور مٹا ڈالے ہیں۔ اسی طرح صحیح مسلم میں

1۔ صحیح بخاری، باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام، حدیث نمبر 3192، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم کیسی (شان سے) ہو گے جب ابن مریم تم میں نزول فرمائیں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا'' اور ایک روایت میں الفاظ فأمکم منکم ہیں۔ ابن ابی ذئب نے کہا: تم جانتے ہو تم میں سے امکم کیا ہے؟ میں نے کہا: آپ ہی مجھے بتائیے۔ تو انہوں نے کہا: پس تمہاری اصل (فأمکم) تمہارے رب تبارک وتعالیٰ کی کتاب ہے اور تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے(1)۔ ہم نے ''کتاب التذکرہ'' میں اس بارے قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ والحمدللہ۔

اور مُتَوَفِّيكَ اصل میں مُتَوَفِّيُكَ ہے اور ضمہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور یہ ان کی خبر ہے اور وَرَافِعُكَ اس پر معطوف ہے، اور اسی طرح مُطَهِّرُكَ اور وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ بھی ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اصل ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا پر وقف تام ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول حسن ہے۔ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ اور بنانے والا ہوں ان کو جنہوں نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی اتباع کی۔ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا حجت اور قیام دلیل کے ساتھ غالب ان پر جنہوں نے کفر کیا اور یہ بھی کہا گیا ہے: بالعزو الغلبة۔ یعنی عزت اور غلبے کے ساتھ کفر کرنے والوں پر غالب۔ اور ضحاک اور محمد ابن ابان نے کہا ہے: مراد حواری ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٥٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿٥٧﴾ ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ﴿٥٨﴾

''تو وہ جنہوں نے کفر کیا میں عذاب دوں گا انہیں سخت عذاب دنیا میں اور آخرت میں اور نہیں ہوگا ان کے لئے کوئی مددگار۔ اور وہ جو ایمان لائے اور کئے نیک کام تو اللہ پورے پورے دے گا انہیں ان کے اجر اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا ظلم کرنے والوں سے۔ یہ جو ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو آیتیں ہیں اور نصیحت حکمت والی۔''

قولہ تعالیٰ: فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ یعنی میں انہیں دنیا میں قتل، سولی، قید اور جزیہ کے ساتھ اور آخرت میں آگ کے ساتھ سخت عذاب دوں گا۔

ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ، ذَٰلِكَ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور اس کی خبر نَتْلُوهُ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الامر ذالك ہو یعنی مبتدا مضمر ہو۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٥٩﴾ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٦٠﴾

''بے شک مثال عیسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی مانند ہے بنایا اسے مٹی سے،

1۔ صحیح بخاری، باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام، حدیث نمبر 3193، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پھر فرمایا اسے ہو جا تو وہ ہو گیا۔ (اے سننے والے) یہ حقیقت (کہ عیسیٰ انسان ہیں) تیرے رب کی طرف سے (بیان کی گئی) ہے پس تو نہ ہو جا شک کرنے والوں سے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ یہ آیت قیاس کے صحیح ہونے پر دلیل ہے۔ اور تشبیہ اس بناء پر واقع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آدم علیہ السلام کی طرح بغیر باپ کے پیدا کیا گیا ہے، اس بنا پر نہیں ہے کہ انہیں مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور ایک شے دوسری شے کے مشابہ ہوتی ہے جب وہ دونوں ایک وصف میں جمع ہوں اگرچہ فی الحقیقت دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہو، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے تخلیق فرمایا گیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو مٹی سے پیدا نہیں کیا گیا پس اس جہت سے دونوں کے درمیان فرق ہے لیکن جس شے میں دونوں کو تشبیہ دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے پیدا فرمایا ہے اور اس لئے بھی کہ دونوں کی خلقت کی اصل مٹی سے ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام بھی نفس مٹی سے پیدا نہیں کئے گئے، بلکہ مٹی کو کیچڑ بنایا پھر اسے صلصال (سوکھی ہوئی بجنے والی مٹی) بنایا پھر اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا، تو اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرا، پھر آپ کو بغیر باپ کے بشر بنایا۔

اور یہ آیت وفد نجران کے سبب نازل ہوئی جبکہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول کی وجہ سے انکار کیا: ان عیسی عبد اللہ و کلمتہ کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کا کلمہ ہیں۔ انہوں نے کہا: آپ ہمیں کوئی بندہ دکھائیں جو بغیر باپ کے پیدا کیا گیا ہو، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: '' آدم علیہ السلام جوان کے باپ تھے وہ عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ تمہارے لئے تعجب خیز ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا صرف باپ نہیں لیکن آدم علیہ السلام کا نہ باپ ہے اور نہ ہی ماں'' اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں (وہ آپ کے پاس کوئی مثال نہیں لائیں گے) اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ (مگر ہم آدم علیہ السلام کے بارے میں آپ کے پاس حق لے کر آئے)۔ وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا (اور کتنی اچھی تفسیر بیان کی) اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ہم تم سے پہلے مسلمان تھے، تو آپ نے فرمایا: ''تم نے جھوٹ بولا ہے تین چیزیں تمہیں اسلام سے روک رہی ہیں۔ ایک تمہارا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنایا ہے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) اور دوسرا تمہارا خنزیر کھانا اور تیسرا تمہارا صلیب کو سجدہ کرنا۔'' تو انہوں نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون ہے؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۶۰﴾ فَمَنْ حَآجَّكَ فِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ ﴿۶۱﴾ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں بلایا، تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: اگر تم نے ایسا کیا تو تم پر وادی آگ سے بھڑک اٹھے گی۔ تب انہوں نے کہا: کیا اس کے سوا بھی کوئی شے آپ ہم پر پیش فرمائیں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسلام یا جزیہ یا جنگ تو انہوں نے ان میں سے جزیہ کا اقرار کیا اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور قول باری تعالیٰ اٰدَمَ پر کلام مکمل ہو گیا۔

پھر فرمایا: خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ یہ بمعنی فکان ہے۔ جب معنی معلوم اور معروف ہو تو مستقبل ماضی کے محل میں واقع ہو سکتا ہے۔

فراء نے کہا: اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ یہ مرفوع ہے اور اس سے پہلے ھو مبتدا مضمر ہے۔

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس کی خبر مِنْ رَّبِّكَ کے قول میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الحق فاعل ہے یعنی جاءك الحقُّ۔

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے قطعاً شک کرنے والے نہیں۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾

''پھر جو شخص جھگڑا کرے آپ سے اس بارے میں اس کے بعد کہ آ گیا آپ کے پاس (یقینی) علم تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی اپنے آپ کو بھی اور تم کو بھی، پھر بڑی عاجزی سے (اللہ کے حضور) التجا کریں پھر بھیجیں اللہ تعالیٰ کی لعنت جھوٹوں پر۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم جو شخص آپ سے جھگڑا کرے فِيْهِ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اس کے بعد کہ آپ کے پاس اس بارے میں یقینی علم آ گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ فَقُلْ تَعَالَوْا یعنی تَعَالَوْا بمعنی أقبلوا ہے، تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ۔ یہ لفظ وضع تو اس کے لئے کیا گیا ہے جس کی کوئی قدر و منزلت اور رفعت و شان ہو اور پھر ہر آنے اور متوجہ ہونے کی دعوت دینے والے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اس کا مزید بیان سورۃ الانعام میں آئے گا۔ نَدْعُ یہ محل جزم میں ہے اَبْنَآءَنَا یہ اس پر دلیل ہے کہ بیٹیوں کے بیٹوں کو ابناء کا نام دیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم امام حسن، امام حسین رضی اللہ عنہما کو ساتھ لے کر آئے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چل رہی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فرما رہے تھے: ''اگر میں دعا کروں تو تم آمین کہنا۔'' اور یہی اس ارشاد کا معنی ہے ثُمَّ نَبْتَهِلْ یعنی ہم دعا میں انتہائی عجز و انکساری اختیار کریں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے۔ ابو عبیدہ اور کسائی نے کہا ہے کہ نبتھل بمعنی نلتعِن ہے اور ابتہال کا اصل معنی یہی ہے کہ دعا میں لعن وغیرہ کے ساتھ انتہائی کوشش کرنا۔

لبید نے کہا ہے:

فی کھولٍ سادۃ من قومہ نظر الدھرُ الیھم فابتھل

یعنی زمانے نے انہیں ہلاک کرنے میں پوری کوشش کی۔

کہا جاتا ہے: بھلہ اللہ یعنی اللہ نے اس پر لعنت کی۔ اور البھل کا معنی لعن ہے۔ اور البھل کا معنی ماءقلیل (تھوڑا پانی) بھی ہے اور ابھلتہ تب کہا جاتا ہے جب تو اسے اور اس کے ارادہ کو چھوڑ دے۔ اور بھلتہ کا بھی یہی معنی ہے۔ اور ابوعبیدہ نے بیان کیا ہے: بھلہ اللہ یبھلہ بھلۃ یعنی اللہ نے اس پر لعنت کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اہل نجران تھے: ان کے رؤساء میں قابل ذکر، عاقب اور ابن حارث تھے۔ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ (پھر ہم جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجیں)

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی علامت میں سے ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مباہلہ کی دعوت دی اور انہوں نے اس سے انکار کیا اور جزیہ دینے پر راضی ہو گئے اس کے بعد کہ ان کے بڑے سردار عاقب نے انہیں بتایا کہ اگر انہوں نے آپ سے مباہلہ کیا تو پھر ان پر یہ وادی آگ سے بھڑک اٹھے گی، کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی مرسل ہیں، اور تحقیق تم جانتے ہو کہ وہ تمہارے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تفصیل لے کر آئے ہیں، تو انہوں نے مباہلہ ترک کر دیا اور اپنے شہروں کی طرف واپس چلے گئے اس شرط پر کہ وہ ہر سال ایک ہزار حلہ صفر کے مہینہ میں اور ایک ہزار حلہ رجب کے مہینہ میں ادا کریں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے بدلے اسی پر ان سے صلح کر لی۔

مسئلہ نمبر 3۔ بہت سے علماء نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مباہلہ کے وقت امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے بارے یہ قول نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ اور امام حسن رضی اللہ عنہ کے بارے آپ کا یہ ارشاد اِنَّ اِبْنِیْ ھذا سید(1) امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ مخصوص ہے کہ ان دونوں کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ہونے کا نام دیا گیا، ان کے سوا کسی کے لئے یہ حکم نہیں ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''قیامت کے دن ہر سبب و نسب کٹ جائے گا سوائے میرے نسب و سبب کے'' اسی لئے بعض اصحاب شافعی نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے جس نے فلاں کے بیٹے کے لئے وصیت کی اور اس کا صلبی بیٹا نہ تھا اور اس کے بیٹے کا بیٹا اور بیٹی کا بیٹا تھا، بلاشبہ وہ وصیت بیٹے کے بیٹے کے لئے ہوگی نہ بیٹی کے بیٹے کے لئے اور یہ امام شافعی کا قول ہے۔ اس کے بارے مزید بیان سورۃ الانعام اور ارحرف میں آئے گا ان شاء اللہ۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِالْمُفْسِدِیْنَ ۝

''بے شک یہی ہے واقعہ سچا اور نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور بے شک اللہ ہی غالب ہے (اور) حکمت والا ہے۔ پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ خوب جاننے والا ہے فساد برپا کرنے والوں کو۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ قول باری تعالیٰ اِنَّ هٰذَا میں اشارہ قرآن اور اس میں موجود قصص کی طرف ہے، انہیں قصص کا نام دیا گیا ہے کیونکہ ان میں معانی تسلسل کے ساتھ ہوتے ہیں اور یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے:

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلح، حدیث نمبر 2505، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فلان یقص أثر فلان یعنی فلاں فلاں کی اتباع میں آ رہا ہے۔

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ اس میں مِنْ زائدہ تاکید کے لئے ہے اور معنی ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الہ (معبود) نہیں (وما اله الا الله) الْعَزِيْزُ یعنی وہ جو مغلوب نہیں ہوتا۔ الْحَكِيْمُ اس کا معنی ہے صاحب حکمت اس کی مثال پہلے گزر چکی ہے۔ والحمدللہ۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

''(میرے نبی!) آپ کہئے اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو یکساں ہے ہمارے اور تمہارے درمیان (وہ یہ کہ) ہم نہ عبادت کریں (کسی کی) سوائے اللہ کے اور نہ شریک ٹھہرائیں اس کے ساتھ کسی چیز کو اور نہ بنا لے کوئی ہم میں سے کسی کو رب اللہ کے سوا پھر اگر وہ روگردانی کریں (اس سے) تو تم کہہ دو گواہ رہنا (اے اہل کتاب) کہ ہم مسلمان ہیں۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ حسن، ابن زید اور سدی کے قول کے مطابق یہ خطاب اہل نجران کو ہے اور قتادہ اور ابن جریج وغیرہما کے قول کے مطابق خطاب مدینہ کے یہودیوں کو ہے، انہیں اس لئے خطاب کیا گیا کیونکہ انہوں نے اپنے علماء کو ان کی اطاعت و پیروی کرنے میں رب کی طرح بنا رکھا تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ تمام کے لئے ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل کی طرف جو گرامی نامہ تحریر فرمایا اس میں ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ... من محمد رسول الله الى هرقل عظيم الروم سلام على من اتبع الهدى [أما بعد فانى أدعوك بدعاية الاسلام] أسلم تسلم [وأسلم] يؤتك الله أجرك مرتين وان توليت فان عليك اثم الاريسيين، ويا اهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا وبينكم ان لا نعبد الا الله ... الى قوله: فقولوا اشهدوا بانا مسلمون۔ (1)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ... (یہ خط) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شاہ روم ہرقل کی طرف ہے اس پر سلام ہو جس نے ہدایت کی اتباع اور پیروی کی [اما بعد میں تجھے دعوت اسلام دیتا ہوں] تو اسلام قبول کر لے محفوظ ہو جائے گا [اور تو اسلام لے آ] اللہ تعالیٰ تجھے دوبارہ اجر عطا فرمائے گا اور اگر تو نے اعراض کیا تو تجھ پر اپنے جملہ لواحقین و متبعین کا گناہ ہوگا اور اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے وہ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں ... تا قولہ ''تو تم کہہ دو گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں) یہ مسلم کے الفاظ ہیں۔

السواء کا معنی عدل اور نصف و نصف ہے، قتادہ نے یہی کہا ہے۔

اور زہیر نے کہا ہے:

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2370

أرونی خُطّة لا ضَیم فیها یُسَوّی بیننا فیها السَّوَاء

مجھے کوئی ایسا کام دکھاؤ جس میں ظلم نہ ہو اور اس میں ہمارے درمیان عدل کیا جاتا ہو۔

فراء نے کہا ہے: عدل کے معنی ادا کرنے کے لئے سِویٰ اور سُویٰ کہا جاتا ہے، پس جب تو سین کو فتحہ دے گا تو اسے مد کے ساتھ پڑھے گا اور جب تو سین پر کسرہ یا ضمہ پڑھے گا تو اسے قصر کے ساتھ پڑھے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَكَانًا سُوًى فرمایا: اور حضرت عبداللہ کی قرأت میں ہے الی کلمة عدل بیننا و بینکم اور قعنب (ابو السمال العدوی) نے كِلْمَة لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے لام کی حرکت کاف کو دے دی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: كِبْد پس معنی یہ ہے تم اسے قبول کرو جس کی طرف تمہیں دعوت دی گئی ہے اور وہی وہ کلمہ عادلہ مستقیمہ ہے جس میں حق سے کہیں اور ذرا میلان اور جھکاؤ نہیں اور اس کی تفسیر اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ کی ہے۔ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ اس میں اَن، کلمة سے بدل ہونے کی بنا پر محل جر میں ہے یا مبتدا مضمر ہونے کی بنا پر یہ محل رفع میں ہے، تقدیر کلام یہ ہے ھی أن لا نعبد الا اللہ۔ یا پھر یہ اَن مفسرہ ہے اور اس کا کوئی محل نہیں، اور اس کے ساتھ نَعْبُدُ اور جو اس پر معطوف ہے اس پر رفع اور جزم دونوں جائز ہیں: پس جزم اس بنا پر کہ اَن مفسرہ بمعنی ای ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَنِ امْشُوْا اور لا جازمہ ہو۔ یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ اور اس بنا پر یہ بھی جائز ہے کہ نَعْبُدُ کو رفع دیا جائے اور یہ اور اس کا مابعد خبر ہو۔ اور بمعنی أنه لا نعبدُ رفع دینا جائز ہے اور اس کی مثل یہ ارشاد ہے اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّ لَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ۝ (طٰہٰ) (کہ یہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا اور نہ اختیار رکھتا ہے ان کے لئے کسی ضرر کا اور نہ نفع کا)

اور کسائی اور فراء نے کہا ہے: وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ یعنی یہ جزم کے ساتھ ہیں اس وہم کی بنا پر کہ اول کلام میں اَن نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی ہم کسی شے کو حلال کرنے یا اسے حرام کرنے میں اس کی اتباع اور پیروی نہ کریں گے مگر اسی میں جسے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے علماء کو ان کی حرام کردہ اور حلال کردہ چیزوں کو قبول کرنے میں اپنے رب کے رتبہ اور درجہ میں رکھا ان چیزوں کے بارے میں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نہ حرام کیا اور نہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حلال کیا۔

اور یہ ایسے استحسان کے بارے قول کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے جس کا انحصار کسی دلیل شرعی پر نہ ہو، الکیا الطبری نے کہا ہے: مثلاً امام اعظم ابو حنیفہ کے وہ استحسانات جو ان اندازوں اور تقدیرات کے بارے ہیں جو انہوں نے بذات خود بغیر واضح دلائل کے مقرر کئے۔ اور اس میں ان روافض کا بھی رد ہے جو یہ کہتے ہیں: دلیل شرعی کا سہارا لئے بغیر بھی امام کا قول قبول کرنا واجب ہے اور یہ کہ وہ اسے حلال کر سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہو بغیر اس کے کہ وہ کوئی مستند دلیل شرعی بیان کرے۔ ارباب رب کی جمع ہے اور یہاں دُوْنِ بمعنی غیر ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَوَلَّوْا یعنی اگر وہ اس سے اعراض کر لیں جس کی طرف انہیں دعوت دی گئی ہے۔ فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ توتم کہہ دو گواہ رہنا ہم دین اسلام کے ساتھ متصف ہیں، اس کے احکام کی پیروی کرنے والے ہیں اور ہم ان احسانات اور انعامات کا اعتراف کرتے ہیں جو اس کے بدلے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہم پر ہیں ہم کسی کو رب بنانے والے نہیں ہیں نہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ عزیر علیہ السلام کو اور نہ ہی ملائکہ کو، کیونکہ وہ ہماری مثل بشر ہیں وہ ہمارے حدوث کی طرح حادث ہیں۔ اور راہبوں سے کسی ایسی شے کو قبول نہیں کریں گے جسے انہوں نے ہم پر حرام کیا ہو جب تک اللہ تعالیٰ نے اسے ہم پر حرام نہ کیا ہو، کہ ہم انہیں رب بنالیں۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: یَتَّخِذَ بمعنی یسجد ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک سجدہ (تعظیمی) جائز تھا پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو منع فرمادیا جب انہوں نے سجدہ کرنے کا ارادہ کیا، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہمارے بعض بعض کے لئے جھک سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا ''نہیں'' پھر ہم نے عرض کی: کیا ہم آپس میں ایک دوسرے سے معانقہ کر سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں البتہ تم ایک دوسرے سے مصافحہ کرو' اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے (1)۔ اس بارے میں مزید بیان سورۂ یوسف میں آئے گا اور سورۂ واقعہ میں کہ قرآن یا اس کے جز کو بغیر طہارت کے چھونا کیسا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ مَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ الْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

''اے اہل کتاب! کیوں جھگڑتے ہو تم ابراہیم کے بارے میں حالانکہ نہیں اتاری گئی تورات اور انجیل مگر ان کے بعد کیا (اتنا بھی) تم نہیں سمجھ سکتے۔''

قولہ تعالیٰ: یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ، لِمَ اصل میں لِمَا ہے، استفہام اور خبر کے درمیان فرق بیان کرنے کے لئے الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور یہ آیت یہود و نصاریٰ میں سے ہر فریق کے اس دعویٰ کے سبب نازل ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے دین پر تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی بایں طور کہ یہودی اور نصرانی دونوں ہی آپ کے بعد ہوئے ہیں، سو اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ مَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ الْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ الآیہ۔

زجاج نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ کے خلاف واضح حجت ہے، کیونکہ تورات و انجیل دونوں ان کے بعد نازل کی گئیں اور ان دونوں میں ادیان میں سے کسی ایک کا نام نہیں ہے اور اسلام کا نام ہر کتاب میں ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ہزار برس کا عرصہ تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان بھی ہزار برس کا فاصلہ تھا۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم اپنی دلیل اور قول کے بطلان کو نہیں جانتے۔ واللہ اعلم۔

1۔ ابن ماجہ، باب المصافحہ، حدیث نمبر 3691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

''سنتے ہو! تم وہ لوگ ہو جو جھگڑتے رہے ہو (اب تک) ان باتوں میں جن کا تمہیں کچھ نہ کچھ علم تھا پس (اب) کیوں جھگڑنے لگے ہو ان باتوں میں نہیں ہے تمہیں جن کا کچھ علم اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ یعنی تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جھگڑتے ہو، کیونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان صفات کو جانتے تھے جو وہ اپنی کتاب میں پاتے تھے پس آپ کے بارے میں انہوں نے باطل اور غلط جھگڑا کیا۔ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اپنے اس دعویٰ پر کہ وہ یہودی تھے یا عیسائی (کیوں جھگڑنے لگے ہو جبکہ تمہیں اس بارے کچھ علم ہی نہیں)

هٰۤاَنْتُمْ دراصل أأنتم تھا اس میں پہلے ہمزہ کو ھا سے بدل دیا گیا کیونکہ یہ اس کی اُخت ہے، ابو عمرو بن العلاء اور اخفش سے یہی منقول ہے۔

نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا اور حسین قول ہے۔ اور قنبل نے ابن کثیر سے هأنتم، هعنتم کی مثل نقل کیا ہے اور اس سے احسن یہ ہے کہ ھا ہمزہ سے بدل کر آئی ہو اور اس کی اصل أأنتم ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ھا تنبیہ کے لئے ہو اور یہ انتم پر داخل ہوئی ہو اور الف کو کثرت استعمال کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہو۔ اور ہؤلاء میں دو لغتیں ہیں یعنی مد اور قصر اور عربوں میں سے بعض اسے قصر کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

ابو حاتم نے کہا ہے:

لعمرك انا والأحاليف هاؤلا لفي محنة أظفارها لم تُقَلّم

اس میں ھاؤلا کو قصر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

اور یہاں ہؤلاء محل ندا میں واقع ہے یعنی یا ہؤلاء۔ اور ہولاء کو انتم کی خبر بنانا بھی جائز ہے، اس بنا پر کہ أولاء بمعنی الذین ہو اور اس کا مابعد اس کا صلہ ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ انتم کی خبر حاججتم ہو۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

مسئلہ نمبر 2۔ آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ اس کے بارے جھگڑنا منع ہے جس کے بارے علم نہ ہو اور اس سے روکنے اور منع کرنے کے ممنوع ہونے پر دلیل موجود ہے جو اس کے نزدیک متحقق اور ثابت نہ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ۔

اور اس کے بارے جھگڑنے کا حکم موجود ہے جس کے بارے علم اور یقین ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل: 125) (اور ان سے بحث (ومناظرہ) اس انداز سے کیجئے جو بڑا پسندیدہ اور (شائستہ ہو) اور حضور نبی

مکرم ﷺ سے مروی ہے کہ ایک آدمی آپ کے پاس حاضر ہوا، اس نے اپنے بچے کا انکار کیا اور عرض کی: یا رسول اللہ ! ﷺ میری بیوی نے ایک سیاہ رنگ کے بچے کو جنم دیا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تیرے پاس اونٹ ہیں؟'' اس نے عرض کی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ''ان کی رنگت کیسی ہے؟'' اس نے عرض کی: وہ سرخ رنگ کے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا ان میں کوئی خاکستری رنگ کا بھی ہے؟ اس نے عرض کی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ''وہ کہاں سے آیا؟'' اس نے عرض کی: شاید اصل اس کے مشابہ ہو، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اور یہ بچہ شاید اصل اس کے مشابہ ہو (1)''۔ یہی جھگڑے کی حقیقت اور رسول اللہ ﷺ کی جانب سے استدلال کو واضح اور ظاہر کرنے کی انتہا ہے۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

''نہ تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی بلکہ وہ ہر گمراہی سے الگ رہنے والے مسلمان تھے اور نہ ہی وہ شرک کرنے والوں میں سے تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹے دعاوی سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پاکی اور برأت بیان فرمائی اور یہ بیان فرمایا کہ وہ حنیفیہ اسلامیہ (خالص اسلامی دین) پر تھے اور وہ مشرک نہ تھے۔ اور حنیف وہ ہوتا ہے جو توحید کا اقرار کرتا ہے، حج ادا کرتا ہے، قربانی دیتا ہے، مختون ہوتا ہے اور قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کے مادہ اشتقاق کے بارے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور لغت میں مسلم وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہو اور اس کی اطاعت و پیروی کرنے والا ہو۔ اور اسلام کا معنی سورۃ البقرہ میں بالتفصیل گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

''بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم) اور جو (اس نبی پر) ایمان لائے اللہ تعالیٰ مددگار ہے مومنوں کا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا ہے کہ سرداران یہود نے کہا: قسم بخدا! اے محمد (ﷺ) آپ یقیناً جانتے ہیں کہ ہم آپ اور آپ کے سوا کسی اور کی نسبت دین ابراہیمی کے نزدیک تر لوگ ہیں، کیونکہ وہ یہودی تھے اور آپ کو سوائے حسد کے اور کچھ نہیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اَوْلٰى بمعنی أحق ہے (یعنی زیادہ حق رکھنا) یہ کہا گیا ہے: معونت (مدد) اور نصرت میں (یعنی مدد اور نصرت کے اعتبار سے قریب تر وہ تھے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حجت کے اعتبار سے قریب تر وہ تھے۔ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وہ جو آپ کی ملت اور سنت پر تھے۔ وَهٰذَا النَّبِيُّ حضور نبی کریم ﷺ کی تعظیم (اور توقیر) کے

1۔ صحیح بخاری، باب اذا عرض بنفی الولد، حدیث نمبر 4893، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لئے آپ کا ذکر علیحدہ کیا گیا، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ اور مکمل طور پر اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور لفظ هٰذَا محل رفع میں ہے اور الذین پر معطوف ہے، اور النبیّ۔ هٰذَا کی صفت ہے یا عطف بیان ہے اور اگر اسے محل نصب میں رکھا جائے تو بھی کلام میں جائز ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف اتبعوہ کی ھا ضمیر پر ہوگا۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ مومنین کا مددگار ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان لکل نبیّ ولیاً من النبیین وان ولیّ منھم أبی وخلیل ربی۔ بے شک ہر نبی کا انبیاء علیہم السلام میں سے کوئی (نہ کوئی) مددگار ہے اور ان میں سے میرے مددگار میرے باپ (جد اعلیٰ حضرت ابراہیم) اور میرے رب کے خلیل ہیں (1)۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی...... اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ (آل عمران:68) (بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم)۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٩﴾

"دل سے چاہتا ہے ایک گروہ اہل کتاب سے کہ کسی طرح گمراہ کر دیں تمہیں اور نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے۔"

یہ آیت حضرات معاذ بن جبل، حذیفہ بن یمان، اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی جس وقت بنی نضیر، قریظہ اور بنی قینقاع کے یہودیوں نے انہیں اپنے دین کی طرف دعوت دی۔ اور یہ آیت اس قول باری تعالیٰ کی مثل ہے: وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا (البقرہ:109) (دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب کہ کسی طرح پھر بنا دیں تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر (ان کی یہ آرزو) بوجہ اس حسد کے ہے۔) اس قول کی بنا پر مِنْ تبعیض کے لئے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد جمیع اہل کتاب ہیں، تو پھر مِنْ بیان جنس کے لئے ہوگا۔

اور لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ کا معنی ہے وہ تمہیں دین اسلام سے رجوع اور اس کی مخالفت کے سبب معصیت اور گناہ میں مبتلا کر دیں۔ اور ابن جریج نے کہا ہے: يُضِلُّوْنكم کا معنی ہے يُهْلِكُوْنكم یعنی وہ تمہیں ہلاک کر دیں۔

اور اسی میں اخطل کا قول ہے:

كُنْتَ الْقَذَى فِي موج أكْدَرَ مُزْبِدٍ قذف الأَتِيّ به فضلّ ضلالا

اس میں ضل ضلالاً بمعنی ھلك ھلاکاً ہے۔

وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ اس میں نفی اور اثبات ہے (یعنی اوروں سے ضلالت وگمراہی کی نفی ہے اور ان کی اپنی ذاتوں کے لئے اس کا اثبات ہے۔ یعنی وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو) وَمَا يَشْعُرُوْنَ یعنی وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ وہ مومنین کو گمراہ کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔

1۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 2921، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَمَا يَشْعُرُوْنَ کا معنی ہے: وہ اسلام کی صحت کو نہیں جانتے حالانکہ ان پر واجب ہے کہ وہ اسے جانیں اور سمجھیں، کیونکہ اس کی براہین ظاہر اور دلائل واضح ہیں۔ واللہ اعلم۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝

"اے اہل کتاب! کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا حالانکہ تم خود گواہ ہو"۔

یعنی ان آیات کے صحیح ہونے کے تم خود گواہ ہو جو تمہارے پاس تمہاری کتابوں میں ہیں، یہ حضرت قتادہ اور سدی سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: اور تم ان کی مثل انبیاء علیہم السلام کی ان آیات وعلامات کے گواہ ہو جن کے بارے تم خود اقرار کرتے ہو۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

"اے اہل کتاب! کیوں ملاتے ہو حق کو باطل کے ساتھ اور (کیوں) چھپاتے ہو حق کو حالانکہ تم جانتے ہو"۔

اللبس کا معنی ہے الخلط یعنی ملا دینا (گڈمڈ کر دینا) سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے اور اس آیت کا معنی اور جو آیت اس سے پہلے ہے دونوں کا معنی ایک ہے۔ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ اسے جواب استفہام ہونے کی وجہ سے تَكْتُمُوْا پڑھنا بھی جائز ہے۔ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یہ جملہ حالیہ ہے یعنی حالانکہ تم جانتے ہو۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

"کہا ایک گروہ نے اہل کتاب سے کہ ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو اتاری گئی ایمان والوں پر صبح کے وقت اور انکار کر دو اس کا سر شام شاید (اس طرح) وہ (اسلام سے) برگشتہ ہو جائیں"۔

یہ آیت کعب بن اشرف اور مالک بن صیف وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی، انہوں نے اپنی قوم کے سفلہ اور احمق لوگوں کو کہا کہ ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو ایمان والوں پر اتاری گئی صبح کے وقت، وَجْهَ النَّهَارِ سے مراد دن کا پہلا اور اول حصہ ہے۔ اور اس کے بہت حسین ہونے کی وجہ سے اسے وَجْهًا کا نام دیا گیا ہے اور اس کا اول وہ ہے جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے (مراد صبح ہے۔)

شاعر نے کہا ہے:

د تُضِئُ فی وجه النهارِ منيرةً　　كجمانة البحرىّ سُلّ نظامُها

دن کی صبح کو روشنی اس طرح منور کرتی ہے جیسا کہ موتیوں کو لڑی میں پرو دیا گیا ہو۔

اور ایک دوسرے نے کہا:

من كان مسروراً بمقتل مالك　　فليأت نسوتنا بوجه نهار

جو مالک کے قتل سے مسرور ہے اسے چاہیے کہ وہ ہماری عورتوں کو صبح سویرے لے آئے اور وَجْهَ النَّهَارِ اور اسی طرح اٰخِرَهٗ ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہیں۔

اور حضرت قتادہ کا موقف یہ ہے کہ انہوں نے اس لئے ایسا کیا تا کہ وہ مسلمانوں کو شک میں مبتلا کر دیں۔ اور الطائفہ کا معنی الجماعۃ ہے، یہ طاف یطوف سے ہے اور کبھی نفس طائفۃ کے معنی پر واحد کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اور آیت کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں میں سے بعض نے بعض کو کہا: دن کے اول حصہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان کا اظہار کرو اور پھر دن کے آخر میں اس کا انکار کر دو، کیونکہ جب تم اس طرح کرو گے تو جو ان کی اتباع اور پیروی کر رہے ہیں ان کے لئے اپنے دین میں شک پیدا ہو جائے گا پس وہ ان کے دین سے تمہارے دین کی طرف لوٹ آئیں گے اور یہ کہنے لگیں گے: بے شک اہل کتاب اس بارے میں ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم صبح کے وقت آپ کی نماز کے ساتھ ایمان لے آؤ جس میں منہ بیت المقدس کی طرف ہے کیونکہ وہ حق ہے اور سر شام آپ کی نماز کا انکار کر دو جس میں منہ کعبہ کی طرف ہے، شاید وہ تمہارے قبلہ کی طرف رجوع کر لیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہے۔

اور مقاتل نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ وہ صبح کے وقت حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کے پاس سے لوٹ کر گئے تو انہوں نے سفلہ لوگوں کو کہا: وہ حق ہے تم اس کی اتباع اور پیروی کرو، بعد ازاں انہوں نے کہا: یہاں تک کہ ہم تورات دیکھ لیں، پھر وہ سر شام لوٹ کر آئے تو انہوں نے کہا: تحقیق ہم نے تورات میں دیکھا ہے وہ پسندیدہ نہیں ہے، وہ کہنے لگے: بلاشبہ وہ حق نہیں ہے اور اس سے انہوں نے ارادہ یہ کیا کہ وہ سفلہ لوگوں پر معاملہ مشتبہ کر دیں اور یہ کہ وہ اس بارے میں انہیں شک میں مبتلا کر دیں۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

''(ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہیں) کہ مت مانو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو پیروی کرتے ہیں تمہارے دین کی۔ فرمائیے ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہو (اور یہ بھی نہ ماننا کہ) دیا جا سکتا ہے کسی کو جیسے تمہیں دیا گیا یا کوئی حجت لا سکتا ہے تم پر تمہارے رب کے پاس۔ (اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) فرما دیجئے کہ فضل (و کرم) تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ یہ نہی ہے اور یہ یہود کے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کلام میں سے ہے، یعنی ان کے رؤساء نے سفلہ اور گھٹیا لوگوں کو کہا۔ اور سدی نے بیان کیا ہے: یہ خیبر کے یہودیوں کی مدینہ طیبہ کے یہودیوں کے ساتھ گفتگو میں سے ہے۔ اور یہ آیت اس سورۃ میں مشکل ترین آیت ہے۔

اور حسن اور مجاہد سے مروی ہے کہ آیت کا معنی ہے: تم کسی کی بات نہ مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور تم یہ نہ مانو کہ وہ تم پر تمہارے رب کے پاس کوئی حجت لا سکتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس کوئی حجت ہے ہی نہیں، پس دین کے اعتبار سے تم ان سے زیادہ صحیح ہو۔ أنْ اور یُحَآجُّوْ کُمْ دونوں محل جر میں ہیں ای بأن یحاجو کم ای باحتجاجھم یعنی تم اس بارے میں ان کی تصدیق نہ کرو کیونکہ ان کے پاس کوئی حجت نہیں ہے۔

اَنْ یُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ (اور یہ بھی نہ ماننا کہ) کسی کو اتنا دیا جا سکتا ہے جیسے تمہیں دیا گیا ہے مثلاً تورات، من و سلوی اور سمندر کا پھٹنا اور علاوہ ازیں دیگر علامات وفضائل۔

پس اَنْ یُّؤْتٰۤى۔ اَوْ یُحَآجُّوْ کُمْ کے بعد مؤخر ہوگا۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔

اور اخفش نے کہا ہے: معنی یہ ہے اور تم مت مانو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور مت مانو یہ کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جو تمہیں دیا گیا ہے اور نہ اس کی تصدیق کرو کہ وہ تم پر کوئی حجت لا سکتے ہیں، یہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ کلام معطوف ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: اور تم مت مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جو تمہیں دیا گیا ہے۔ پس استفہام پر مد بھی اس انکار کی تاکید کے لئے ہے جو انہوں نے کہا ہے: ''بے شک کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جا سکتا جیسا انہیں دیا گیا ہے، کیونکہ علمائے یہود نے انہیں کہا ہے: تم مت مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے، یعنی کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جا سکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے، پس کلام اپنی ترتیب پر ہے اور أنْ محل رفع میں ہے ان کے قول کے مطابق جنہوں نے تیرے اس قول میں رفع دیا ہے۔ أزید ضربتہ، اور خبر محذوف ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: أن یؤتی احد مثل ما أوتیتم تصدّقون أو تقرون، ای ایتاء موجود مصدَّقٌ أو مُقَرٌّ بہ، ای لا تصدّقون بذالك۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ فعل مضمر کی بنا پر أنْ محل نصب میں ہو، جیسا کہ تیرے اس قول میں جائز ہے أزیدا ضربتہ اور عربی میں یہ زیادہ قوی ہے کیونکہ استفہام بالفعل اولیٰ ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہوگی: أتقرون أن یؤتی او أتشیعون ذالك أو أتذكرون ذالك نحوہ۔

اور ابن کثیر، ابن محیصن اور حمید نے مد کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور ابو حاتم نے کہا ہے: آن بمعنی أَلِأنْ ہے پھر لام جر کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا اور اسے مد کے ساتھ بدل دیا گیا، جیسا کہ اس کی قراءت جس نے اس طرح پڑھا اٰنْ كَانَ ذَا مَالٍ یہ اصل میں أَلِأنْ ہے۔ اور اس قراءت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَوْ یُحَآجُّوْ کُمْ مومنین کو خطاب کرنے کی طرف رجوع ہے، یا پھر أوْ بمعنی أنْ ہوگا، کیونکہ یہ دونوں حرف شک اور جزا ہیں اور ان میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ رکھا جا سکتا ہے۔ اور آیت کی تقدیر اس طرح ہے: وأن یحاجو کم عند ربکم یا معشر المؤمنین،

پس تم فرما دیجئے! اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک ہدایت اور فضل و کرم تو اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور ہم اسی پر ہیں۔
اور جس نے بغیر مد کے پڑھا ہے اس نے کہا ہے: بے شک پہلی نفی ان کے قول وَلَا تُؤْمِنُوْٓا میں ان کے انکار پر دلالت کرتی ہے۔ پس معنی یہ ہے کہ یہودی علماء نے ان سے کہا: تم اس بات کی تصدیق نہ کرو کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے، یعنی نہ ان کے پاس ایمان ہے اور نہ ہی کوئی حجت، پس علم و حکمت، کتاب و حجت، من وسلویٰ اور سمندر کا پھٹنا وغیرہ فضائل و کرامات کا معنی پر عطف کیا گیا ہے، یعنی بلاشبہ یہ سب صرف تم ہی میں موجود ہیں پس تم یہ بات مت مانو کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں۔ پس اس قرأت کے مطابق کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور لام زائدہ ہے اور من استثنیٰ اول میں سے نہیں ہے؛ ورنہ کلام جائز نہیں ہوگا۔
اور اَحَدٌ داخل کیا گیا ہے کیونکہ اول کلام نفی ہے، پس اسے اَنْ کے صلہ میں داخل کیا گیا ہے کیونکہ وہ فعل منفی کا مفعول ہے، اور جر دینے والا عامل نہ ہونے کی وجہ سے اَنْ محل نصب میں ہے اور خلیل نے کہا ہے: اَنْ محل جر میں ہے کیونکہ اس سے پہلے جر دینے والا لفظ محذوف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لام زائدہ نہیں ہے اور تُؤْمِنُوْٓا یہ تُقِرُّوا پر محمول ہے۔
ابن جریج نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ تم مت مانو سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اس کو ناپسند کرتے ہوئے کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: تم اس کے بارے مت خبر دو جو تمہاری کتاب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف موجود ہیں سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں تا کہ بتوں کی عبادت اور ان کی تصدیق کی طرف کوئی راہ نہ ہو۔
اور فراء نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہودیوں کا کلام اس ارشاد پر ختم ہو چکا ہو اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ اور پھر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہو: قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ یعنی بلاشبہ بیان حق ہی اللہ تعالیٰ کا بیان ہے۔ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ یہ (اس معنی میں) بالکل بین اور ظاہر ہے کہ کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جا سکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے۔ اور لَا، اَنْ کے بعد مقدرہ ہے۔ یعنی لئلا یُؤتیٰ، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا یعنی لئلا تضلوا، تا کہ تم گمراہ نہ ہو۔ پس اسی لئے کلام میں اَحَدٌ کا داخل ہونا صحیح ہے۔ اور اَوْ بمعنی حتّٰی اور اِلَّا اَنْ ہے۔
جیسا کہ امرء القیس نے کہا ہے:

فقلتُ له لا تبكِ عينكَ انما نحاول مُلْكًا أو نموتَ فنُعذَرا

اس میں اَوْ نَمُوْتَ اِلَّا اَنْ نَمُوْتَ کے معنی میں ہے۔
اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

وكنت اِذا غَمَزْتُ قناةَ قَوْمٍ كسرتُ كُعُوبَهَا أو تستقيما

اس میں اَوْ تَسْتَقِيْمَا حَتّٰى اَنْ تستقيما کے معنی میں ہے اور اس کی مثل ان کا یہ قول ہے: لا نلتقي أو تقوم الساعة،

اس میں اَوْ بمعنی حتّٰی یا اِلٰی اَنْ کے ہے اور اسی طرح کسائی کا مذہب ہے۔

اور اخفش کے نزدیک یہ اَوْ عاطفہ ہے اور یہ عطف وَ لَا تُؤْمِنُوْٓا پر ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی لا ایمان لھم ولا حجۃ (نہ ان کا ایمان ہے اور نہ ان کی کوئی دلیل) اور یہ عطف معنی پر کیا گیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ پوری آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کو خطاب ہو ان کے دلوں کو ثابت قدم رکھنے کے لئے اور ان کی نگاہوں میں تیزی پیدا کرنے کے لئے، تاکہ وہ یہودیوں کی تلبیس اور ان کے اپنے دین کو آراستہ اور مزین کر کے پیش کرنے کے وقت کسی شک میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور معنی یہ ہو: اے گروہ مومنین! تم بات نہ مانو مگر ان لوگوں کی جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور اس بات کی تصدیق نہ کرو کہ اس کی مثل فضل و کرم اور دین میں سے کسی کو نہیں دیا جا سکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے اور نہ یہ مانو کہ تمہارا کوئی مخالف تمہارے دین کے بارے میں تمہارے رب کے پاس کوئی حجت لا سکتا ہے یا وہ اس پر قدرت رکھتا ہے، کیونکہ ہدایت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ عطا فرمائے اور بلاشبہ فضل و کرم اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔

ضحاک نے کہا ہے: بے شک یہودیوں نے کہا ہم اپنے رب کے پاس اس پر حجت لائیں گے جس نے ہمارے دین میں ہماری مخالفت کی، پس اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ بے شک وہ پھسلائے گئے ہیں اور عذاب دیئے گئے ہیں اور مومنین غالب آنے والے ہیں۔ اور ان کی حجت ان کا قیامت کے دن جھگڑنا ہے۔ اور حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک یہود و نصاریٰ ہمارے بارے میں ہمارے رب کے پاس حجت لائیں گے اور وہ کہیں گے تو نے ہمیں ایک اجر دیا ہے اور انہیں تو نے دو اجر دیئے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا میں نے تمہارے ساتھ تمہارے حقوق کے بارے کسی قسم کی زیادتی کی ہے؟ وہ عرض کریں گے نہیں، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ میرا فضل ہے جسے میں چاہتا ہوں اسے عطا کرتا ہوں۔" (1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: اگر وہ جانتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل میں سے ہے تو وہ ہمارے بارے میں ہمارے رب کے پاس حجت نہ لاتے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرما دیا کہ وہ قیامت کے دن تمہارے بارے میں تمہارے رب کے پاس حجت لائیں گے، پھر فرمایا! تم اب ان سے کہہ دو اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ بے شک فضل و کرم تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ ابن کثیر نے أن يؤتى کو استفہام کی بنا پر مد کے ساتھ پڑھا ہے، جیسا کہ اعشیٰ نے بھی کہا ہے:

أأن رأت رَجُلاً أعْشَى أضَرَّ بِهِ　　رَيْبُ المنونِ ودهرٌ مُتْبِلٌ خَبِلُ

اور باقیوں نے خبر کی بنا پر بغیر مد کے پڑھا ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے ان يؤتى ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے اس بنا پر کہ اس میں معنی نفی کا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں سے ہوگا جیسا کہ فراء نے کہا ہے۔ اور معنی ہوگا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے: "بے شک ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہو کسی کو اس کی مثل عطا نہیں کیا جائے گا جیسا تمہیں عطا کیا گیا ہے یا نہ کوئی حجت لا سکتا ہے تم پر تمہارے رب کے پاس" یعنی یہودی باطل پر ہیں کہ وہ کہتے ہیں ہم تم سے افضل ہیں۔ اور اَوْ يُحَاجُّوْكُمْ کو اَنْ

1۔ صحیح بخاری، باب الاجارۃ الی صلوۃ العصر، حدیث نمبر 2108، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مضمرہ اور أوْ کے ساتھ نصب دی گئی ہے اور أوْ کے بعد أن کو مضمر کیا جاتا ہے جب وہ حتی اور إلاّ أن کے معنی میں ہو۔

اور حسن نے أن یؤتی یعنی تا کو کسرہ کے ساتھ اور یا کو مفتوح پڑھا ہے معنی یہ ہوگا أن یوتی احدٌ احدًا مثل ما اوتیتم (کہ کوئی کسی کو اتنا دے گا جتنا تمہیں دیا گیا ہے۔) اس میں سے مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اس میں دو قول ہیں:

ایک یہ کہ خیر اور نیکی کی طرف ہدایت کرنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف راہنمائی کرنا اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے وہ اسے اپنے انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کو عطا فرماتا ہے، سو تم انکار نہ کرو کہ تمہارے سوا کسی کو اس کی مثل عطا کیا جائے جیسا تمہیں عطا کیا گیا ہے، پس اگر وہ اس کا انکار کریں تو ان سے فرما دیجئے اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ کہ فضل و کرم اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے: آپ فرما دیجئے ہدایت تو وہی ہے جو اس اللہ کی ہدایت ہو جس نے جو مومنین کو حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کرنے کے بارے عطا فرمائی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

اور بعض اہل اشارات نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے: تم (حسن) معاشرت نہ رکھو سوائے ان کے جو تمہارے احوال اور تمہارے طریقہ میں تم سے موافقت کرتے ہیں، کیونکہ جو تم سے موافقت نہیں کرتا وہ تمہارا دوست نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔

يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

''خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔''

یعنی وہ اپنی نبوت اور ہدایت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے جسے چاہتا ہے، یہ قول حسن اور مجاہد وغیرہما کا ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: وہ خاص کر لیتا ہے اسلام اور قرآن کے ساتھ جسے چاہتا ہے۔ ابو عثمان نے کہا ہے: یہ حسین تر قول ہے جس کے ساتھ امیدوار کی امید اور خوفزدہ ہونے والے کا خوف باقی رہتا ہے۔ ''اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔''

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآىِٕمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

''اور اہل کتاب سے بعض ایسے (دیانتدار) ہیں کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک ڈھیر (سونے چاندی کا) تو ادا کر دے اسے تمہاری طرف اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک اشرفی تو واپس نہ کرے گا اسے بھی تیری طرف مگر جب تک تو اس کے سر پر کھڑا رہے، اس (بددیانتی) کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت اور یہ لوگ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام (ان اہل کتاب میں سے تھے) وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اس سے مراد فنحاص بن عازوراء یہودی ہے، ایک آدمی نے اس کے پاس کچھ دینار امانت رکھے تو اس نے اس میں خیانت کی۔

اور یہ بھی قول ہے کہ ان سے مراد کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی ہیں۔ ابن وثاب اور اشہب عقیلی نے مَنْ اِنْ تِيْمَنْهُ قرأت کی ہے اور یہ ان کی لغت پر ہے جو نِستعین پڑھتے ہیں اور یہ بنی بکر اور بنی تمیم کی لغت ہے۔ اور حضرت عبداللہ کی قرأت میں مالك تِيْمَنَّا علی یوسف کے الفاظ ہیں، جبکہ باقیوں نے الف کے ساتھ پڑھا ہے۔

نافع اور کسائی نے يؤدِّهی ادراج میں یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعبید نے کہا ہے: ابوعمرو، اعمش، عاصم اور حمزہ نے ابوبکر کی روایت میں ھا پر وقف کر کے پڑھا ہے یعنی يؤدّه الیك۔ نحاس نے کہا ہے: بعض نحویوں کے نزدیک ھا کو ساکن کرنا بغیر شعر کے جائز نہیں ہے اور بعض نے اسے مطلقاً جائز قرار نہیں دیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ جنہوں نے سکون کے ساتھ اسے پڑھا ہے انہوں نے غلطی کی ہے اور یہ کہ انہیں وہم ہوا ہے کہ جزم ھا پر واقع ہوئی ہے اور ابوعمرو نے اس سے پاک قرار دیا کہ اس کی مثل اس پر جائز ہو اور ان سے صحیح روایت یہ ہے کہ وہ ھا کو کسرہ دیتے ہیں اور یہی یزید بن قعقاع کی قرأت ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ بعض عربوں کا مذہب یہ ہے کہ وہ ھا کو جزم دیتے ہیں جب اس کا ماقبل متحرک ہو، وہ کہتے ہیں: ضربته ضربا شديدا، جیسا کہ وہ انتم اور قمتم کی میم کو سکون دیتے ہیں اور اس کی اصل رفع ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لما رأى ألا دَعَه ولا شِبَعْ　　مال الى ارطَاة حِقْفٍ فاضطَجَعْ

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس مقام پر ھا کو ساکن کرنا جائز ہے کیونکہ وہ جزم کے محل میں واقع ہے اور یہ یا ختم ہو جانے والی ہے۔ ابوالمنذر سلام اور زہری نے يؤدّهُ بغیر واؤ کے ہا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ، حمید اور مجاہد نے يؤدّهُو کو واؤ کے ساتھ پڑھا ہے، اس کے لئے واؤ کو اختیار کیا گیا ہے کیونکہ واؤ شفتہ سے ادا ہوتی ہے اور ھا بعيدة المخرج ہے۔ (یعنی اس کی ادائیگی کا محل بعید ہے)

سیبویہ نے کہا ہے: مذکر میں واؤ مؤنث میں الف کے قائم مقام ہے اور اسے یا سے بدل دیا جاتا ہے کیونکہ یا زیادہ خفیف ہے، جبکہ اس کا ماقبل کسرہ پایا ہو اور یا حذف ہو جاتی ہے اور کسرہ باقی رہتا ہے، کیونکہ یا کبھی حذف ہو جاتی ہے اور فعل مرفوع ہو تو اسے اپنے حال پر ثابت رکھا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اہل کتاب میں کچھ خائن ہیں اور کچھ امین ہیں اور مومنین ان میں تمیز نہیں کر سکتے، پس چاہیے کہ وہ ان تمام سے اجتناب کریں اور اہل کتاب کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اگرچہ مومنین بھی اسی طرح ہیں، اس لئے کہ ان میں خیانت زیادہ پائی جاتی ہے، پس کلام غالب کے بارے میں کہا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور قنطار کی تفسیر پہلے گزر

چکی ہے اور رہا دینار تو وہ چوبیس قیراط کا ہوتا ہے اور ایک قیراط درمیانے جو کے تین حبوں کے برابر ہوتا ہے اور اس کا مجموعہ بہتر حبے ہیں اور اس پر اجماع کیا گیا ہے۔ جس نے کثیر کی حفاظت کی اور اسے ادا کر دیا تو (حفاظت اور ادائیگی) قلیل میں بدرجہ اولیٰ ہوگی اور جس نے تھوڑے میں خیانت کی یا اسے روک کر رکھا تو وہ کثیر میں اور زیادہ ہوگی۔ اور یہ مفہوم خطاب کے ساتھ قول پر انتہائی واضح دلیل ہے۔ اور اس میں علماء کے مابین بہت زیادہ اختلاف ہے جو اصول فقہ میں مذکور ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں ذکر کی ہیں جو ادا کرتا ہے اور وہ جو ادا نہیں کرتا مگر وہی جو اس پر لازم ہوتا ہے اور کبھی لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو ادا نہیں کرتا اگرچہ تو اس کے پاس ہمیشہ کھڑا رہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں ذکر کی ہیں کیونکہ یہ غالب اور معتاد ہیں اور تیسری نادر ہے، لہٰذا کلام غالب کے بارے ہے اور طلحہ بن مصرف اور ابو عبدالرحمن السلمی وغیرہما نے دِمت دال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں اور کسرہ ازدالسراۃ کی لغت ہے، یہ دِمت تدام سے ماخوذ ہے جیسا خفت تخاف ہے۔

اور اخفش نے دِمت تدوم بیان کیا ہے، اور یہ شاذ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس ارشاد سے اپنے اس موقف پر استدلال کیا ہے کہ غریم (مقروض) کے ساتھ ساتھ رہنا چاہیے اِلَّا مَادُمْتَ عَلَیْهِ قَآىِٕمًا اور تمام علماء نے اس کا انکار کیا ہے اور سورۃ البقرہ میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور ہمارے علماء میں سے بعض بغداد کے رہنے والوں نے بہت زیادہ قرض لینے والے کو حبس میں رکھنے پر اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ اِلَّا مَادُمْتَ عَلَیْهِ قَآىِٕمًا تو جب اسے لازم پکڑنا اور تصرف سے اسے روکنا جائز ہے تو اسے حبس میں رکھنا بھی جائز ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اِلَّا مَادُمْتَ عَلَیْهِ قَآىِٕمًا کا معنی ہے پس وہ تیری وجہ سے تجھ سے ڈرتا ہے اور تجھ سے حیاء محسوس کرتا ہے، کیونکہ حیاء آنکھوں میں ہوتا ہے، کیا آپ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول جانتے نہیں ہیں: لا تطلبوا من الاعمی حاجۃ فَاِنَّ الحیاء فی العینین تم اندھے سے حاجت کا مطالبہ نہ کرو کیونکہ حیاء آنکھوں میں ہوتا ہے۔ اور جب تو اپنے بھائی سے حاجت کا مطالبہ کرے تو تو اپنے چہرے (کو متوجہ کرکے) اس کی طرف دیکھ یہاں تک کہ وہ حیاء محسوس کرنے لگے تو وہ اسے (حاجت کو) پورا کر دے گا۔ اور کہا جاتا ہے: قَآىِٕمًا بمعنی ملازمالہ ہے (یعنی اسے لازم پکڑتے ہوئے) پس اگر تو نے اسے مہلت دی تو وہ تیرا انکار کر دے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: قیام سے مراد مسلسل مطالبہ کرنا ہے نہ کہ عین قیام مراد ہے۔ اور دینار اصل میں دِنَّارِ ہے کثرت استعمال کی وجہ سے تخفیف کے لئے دونوں میں سے ایک کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس کی جمع دنانیر آتی ہے اور تصغیر دُنَیْنِیر بنائی جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ دین میں امانت انتہائی عظیم المرتبت ہے اور اس کی عظمت وقدر میں سے یہ ہے کہ یہ اور رَحم (صلہ رحمی) پل صراط کی دونوں جانبوں پر کھڑے ہوں گے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے اور اسے عبور کرنے پر کوئی قادر نہ ہوگا مگر وہی جو ان دونوں کی حفاظت اور پاسداری کرے گا۔

اور مسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ہمیں رفع امانت کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

نے بیان فرمایا: ''آدمی نیند کی حالت میں سو جائے گا اور اس کے دل سے امانت قبض کر لی جائے گی'' الحدیث۔ یہ روایت سورۃ البقرہ کے اول میں مکمل طور پر گزر چکی ہے۔ اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ محمد بن مصطفیٰ، محمد بن حرب نے سعید بن سنان عن ابی الزاھریہ عن ابی شجرۃ کثیر ابن مرۃ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''بلا شبہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے حیاء چھین لیتا ہے اور جب وہ اس سے حیا چھین لیتا ہے تو اسے نفرت اور ناپسندیدگی کے سوا کچھ نہیں ملتا اور جب اسے نفرت اور ناپسندیدگی آ ملتی ہے تو اس سے امانت چھین لی جاتی ہیں اور جب اس سے امانت چھین لی جاتی ہے تو پھر وہ خود خیانت کا ارتکاب کرتا ہے اور اس سے خیانت کی جاتی ہے اور جب وہ خود خیانت کرنے لگتا ہے اور اس سے خیانت کی جاتی ہے تو اس سے رحمت چھین لی جاتی ہے اور جب اس سے رحمت چھین لی جاتی ہے تو پھر اسے صرف دھتکار اور لعنت آ پہنچتی ہے اور اسے دھتکار اور لعنت پڑنے لگتی ہے تو اس سے اسلام کا قلادہ اتار لیا جاتا ہے (1)''۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اد الامانۃ الی من ائتمنک ولا تخن من خانک اس کی امانت ادا کر جس نے تجھے امین بنایا اور اس کے ساتھ خیانت نہ کر جس نے تجھ سے خیانت کی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس آیت میں تمام اہل کتاب کے لئے اور نہ ہی ان میں سے بعض کے لئے کوئی تبدیلی ہے، بخلاف ان کے جو اس طرف گئے ہیں، کیونکہ فاسق مسلمانوں میں بھی ایسے پائے جاتے ہیں جو امانت ادا کرتے ہیں اور مال کثیر پر امین بنائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ عادل نہیں ہوتے۔ پس عدالت و شہادت کے طریق میں امانت فی الحال کی ادائیگی کو معاملہ اور ودیعت کی جہت سے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا، کیا آپ ان کا قول جانتے نہیں لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّنَ سَبِيلٌ (آل عمران: 75) (کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت) پس وہ کیسے عدل کر سکتا ہے جو کوئی بغیر حرج کے اپنے اوپر ہمارے اموال اور ہماری عزتیں مباح سمجھنے کا اعتقاد رکھتا ہے اور اگر ان کی تعدیل میں اتنا کافی ہوتا تو یقیناً ان کی شہادت مسلمانوں پر سنی جاتی۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا یعنی یہودیوں نے کہا: لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّنَ سَبِيلٌ کہا گیا ہے کہ یہودی جب مسلمانوں سے خرید و فروخت کرتے تھے تو کہتے تھے: ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت نہیں ہے ...... یعنی ان کے ساتھ ظلم میں کوئی حرج نہیں ہے ...... اس لئے کہ انہوں نے ہماری مخالفت کی ہے۔ اور انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ ان کی کتاب میں موجود ہے، پس اللہ عزوجل نے انہیں جھٹلایا اور ان کا رد کر دیا۔ اور فرمایا: بَلٰی یعنی کیوں نہیں ان پر ان کے جھوٹ کی وجہ سے اور ان کے عربوں کے مال حلال سمجھنے کی وجہ سے عذاب کی راہ ہے۔

ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: کلام مکمل ہو گیا ہے، پھر فرمایا مَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى اور کہا جاتا ہے: بے شک یہودی اعرابیوں سے اموال قرض لیتے تھے پس جب حقوق کے مالک اسلام لائے تو یہودیوں نے کہا: تمہارے لئے ہم پر کوئی شے واجب الادا نہیں، کیونکہ تم نے اپنا دین چھوڑ دیا ہے لہٰذا ہم سے تمہارا قرض ساقط ہو چکا ہے۔

1۔ ابن ماجہ، باب ذہاب الامانۃ، حدیث نمبر 4043، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اورانہوں نے دعویٰ کیا کہ یہ تورات کا حکم ہے سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا بَلٰی یہ ان کے اس قول کا رد ہے لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّنَ سَبِيلٌ یعنی اس طرح نہیں ہے جس طرح تم کہتے ہو، پھر نئے سرے سے ارشاد فرمایا: مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ یعنی جس نے وعدہ پورا کیا اور شرک سے بچتا رہا تو وہ جھٹلانے والوں میں سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس سے محبت فرماتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ کسی آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: بے شک ہم ارادۃً اہل ذمہ کے اموال میں سے مرغیاں اور بکریاں پکڑ لیتے ہیں اور ہم یہ کہتے ہیں ہم پر اس میں کوئی حرج نہیں ہے؟ تو آپ نے اسے فرمایا: یہ تو اسی طرح ہے جیسے اہل کتاب نے کہا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّنَ سَبِيلٌ بلا شبہ جب وہ جزیہ ادا کر دیں تو تمہارے لئے ان کے اموال ان کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہیں، عبدالرزاق نے اسے معمر عن ابی اسحاق الھمدانی عن صعصعۃ ان رجلا قال ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ کافر کو قبولیت شہادت کا اہل قرار نہیں دیا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے فرمایا ہے کہ یہ کذاب ہے اور اس میں ان کافروں پر رد ہے جو اللہ تعالیٰ کی تحریم کے بغیر (چیزوں کو) حرام قرار دیتے ہیں اور اس کی تحلیل کے بغیر (چیزوں کو) حلال قرار دیتے ہیں۔ اور پھر اسے شریعت میں سے قرار دیتے ہیں۔ ابن عربی نے کہا ہے: اور اس سے ان کا رد نکلتا ہے جو بغیر دلیل کے استحسان کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں اور میں اہل قبلہ میں سے کسی کو نہیں جانتا کہ اس نے یہ کہا ہو۔ اور حدیث میں ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جاہلیت کی کوئی شے نہیں ہے مگر وہ میرے قدموں کے نیچے ہے سوائے امانت کے کیونکہ اسے نیکوکار اور فاجر تک پہنچایا گیا ہے(1)۔''

بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝

''ہاں کیوں نہیں جس نے پورا کیا اپنا وعدہ اور پرہیزگار بنا تو بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پرہیزگاروں سے۔''

مَنْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور یہ شرط ہے اور أَوْفَىٰ محل جزم میں ہے اور اتَّقَىٰ معطوف علیہ ہے، یعنی اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرا اور وہ جھوٹ نہیں بولا اور نہ ہی اس نے اس شے کو حلال سمجھا جو اس پر حرام کی گئی۔ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ یعنی اللہ ان سے محبت فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اپنے اولیاء سے محبت کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے اور قول باری تعالیٰ بِعَهْدِهِ میں ھا ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ اور اس کا ذکر اس ارشاد میں بھی ہے وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ وعدہ پورا کرنے والے اور کفر و خیانت اور نقض عہد سے پرہیز کرنے والے کی طرف لوٹ رہی ہو۔ عہد مصدر ہے جسے فاعل اور مفعول (دونوں) کی طرف مضاف کیا جا سکتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ

1۔ تفسیر رازی، جلد 8، صفحہ 108 تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 511

وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۪ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

"بے شک جو لوگ خریدتے ہیں اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی سی قیمت، یہ وہ (بدنصیب) ہیں کہ کچھ حصہ نہیں ان کے لئے آخرت میں اور بات تک نہ کرے گا ان سے اللہ تعالیٰ اور دیکھے گا بھی نہیں ان کی طرف قیامت کے روز اور نہ پاک کرے گا انہیں اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ائمہ نے اشعث بن قیس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ میرے اور ایک یہودی آدمی کے درمیان زمین کا تنازعہ ہوا تو اس نے میرے (حق کا) انکار کر دیا سو میں اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: "کیا تیرے پاس گواہ ہیں؟" میں نے عرض کی: نہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کو فرمایا: "تو حلف دے دے۔" میں نے عرض کی: "تب یہ تو حلف دے دے گا اور میرا مال لے جائے گا، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا الی آخر الآیۃ۔ (1)

اور ائمہ نے یہ بھی حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کسی نے کسی مسلمان کا حق اپنی قسم کے ساتھ کاٹ دیا تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جہنم کو واجب کر دیا اور اس پر جنت کو حرام کر دیا" تو ایک آدمی نے آپ سے عرض کی، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ وہ تھوڑی سی شے بھی ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگرچہ وہ درخت کی ایک ٹہنی ہی ہو۔" اور لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ کا معنی ومفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اور احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حاکم کا حکم قضاء ظاہر کے ساتھ باطن میں مال کو حلال نہیں کرتا جبکہ محکوم لہ اس کے بطلان کو جانتا ہو اور ائمہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ تم میرے پاس آ کر جھگڑتے ہو اور بلاشبہ میں تو بشر ہوں شاید تمہارے بعض اپنی دلیل اور حجت بیان کرنے میں بعض کی نسبت خطا کریں میں تمہارے درمیان اس کے بارے فیصلہ کرتا ہوں جو میں تم سے سنتا ہوں پس جس کے لئے اس کے بھائی کے حق میں سے کسی شے کا میں فیصلہ کروں تو وہ اسے نہ لے کیونکہ گویا میں اس کے لئے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ رہا ہوں جس کے ساتھ وہ قیامت کے دن آئے گا۔" (2)

اس میں ائمہ کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس میں امام ابوحنیفہ نے مناقضہ کیا اور فرمایا: بلاشبہ حاکم کا وہ فیصلہ جس کا دارومدار شہادت باطلہ پر ہو اور وہ اس کے لئے اس شرمگاہ کو حلال کر دیتا ہے جسے اس پر حرام کیا گیا تھا، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور یہ گمان کیا ہے کہ اگر دو جھوٹے گواہوں نے ایک آدمی پر اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بارے شہادت دی اور حاکم نے ان کی شہادت کے مطابق فیصلہ کر دیا تو بلاشبہ اس کی شرمگاہ اس کے ساتھ اس شادی کرنے والے کے لئے حلال ہو گی

1۔ صحیح بخاری، باب کلام الخصوم بعضھم فی بعض، حدیث نمبر 2239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب الحیل، حدیث نمبر 6452، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو یہ جانتا ہے کہ فیصلہ باطل ہے۔ اور آپ پر اس صحیح اور صریح حدیث سے اعراض کرنے کا عیب لگایا گیا ہے۔ اور اس طرح کہ آپ نے اموال کو بچالیا اور آپ نے احکام فاسدہ کے سبب انہیں مباح سمجھنے کی طرف غور نہیں فرمایا۔ اور اس سے آپ نے شرمگاہوں کی حفاظت نہیں کی حالانکہ شرمگاہیں زیادہ حق رکھتی ہیں کہ ان کے بارے احتیاط برتی جائے اور ان کی حفاظت کی جائے۔ ان کے قول کا بطلان آیت لعان میں آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ (☆)۔

وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

"اور بے شک ان میں ایک فریق وہ ہے جو مروڑتے ہیں اپنی زبان کو کتاب کے ساتھ تاکہ تم خیال کرنے لگو (ان کی) اس (الٹ پھیر) کو بھی اصل کتاب سے حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں یہ بھی اللہ کی طرف سے (اترا) ہے حالانکہ وہ نہیں ہے اللہ کے پاس سے اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ جان بوجھ کر۔"

فریقاً سے مراد یہود کی ایک جماعت اور گروہ ہے۔ يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ ابوجعفر اور شیبہ نے (معنی) تکثیر کی بنا پر يُلَوُّوْنَ پڑھا ہے۔ جب وہ اسے جھکالے، مروڑ لے اور اسی سے یہ معنی ہے وہ کلام میں تحریف کرتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ اسے مقصد سے پھیر دیتے ہیں، اللیّ کا اصل معنی المیل (ایک طرف جھکنا) ہے۔ لَوی بیدہ (اس نے اپنا ہاتھ پھیر دیا) اور لوی براسہ اور اس نے اپنا سر پھیر دیا۔ قولہ تعالیٰ: لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ یعنی حق سے عناد رکھتے ہوئے اور اس سے غیر کی طرف پھیرتے ہوئے (اپنی زبانوں کو مروڑتے ہیں) اور وَلَا تَلْوٗنَ علی احد کا معنی ہے لا تعرجون علیہ (اس پر نہیں چڑھو گے)، کہا جاتا ہے لَوَى علیہ جب وہ اس پر چڑھے اور مقیم ہو جائے۔ اور اللیّ کا معنی ہے المطل مروڑنا (لوہے کو بڑھانے کے لئے کاٹنا) ٹال مٹول کرنا۔ لواہ بدینہ یلویہ لیًّا و لِیَانًا مطلہ یعنی اس نے اسے قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کی۔

شاعر نے کہا:

قد کنت داینت بها حسّانا　　مخافة الإفلاس واللّیانا

یحسن بیع الأصل والعیانا

ذوالرمہ نے کہا ہے:

تریدین لیّانی وانتِ ملیّةٌ　　و أحسن یا ذات الوشاح التقاضیا

اور حدیث میں ہے لَیُّ الواجِدِ یُحِلّ عِرضَه و عقوبته (پانے والے کا ٹال مٹول کرنا اپنی عزت اور اپنی سزا کو حلال کر دیتا ہے۔)

☆۔ امام اعظم ابوحنیفہ کے بارے میں یہ رائے محل نظر ہے کیونکہ یہ امام اعظم کے نقطہ نظر میں عدم تدبر کی بنا پر ہے اس کی تفصیل ہدایہ کتاب النکاح میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اور السنة، لِسَانٌ کی جمع ہے لغت میں جس نے مذکر قرار دیا ہے اور جس نے مونث قرار دیا ہے اس نے ألسن کہا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

"نہیں ہے مناسب کسی انسان کے لئے کہ (جب) عطا فرمادے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکومت اور نبوت تو پھر وہ کہنے لگے لوگوں سے کہ بن جاؤ میرے بندے اللہ کو چھوڑ کر (وہ تو یہ کہے گا کہ) بن جاؤ اللہ والے اس لئے کہ تم دوسروں کو تعلیم دیتے رہتے تھے کتاب کی اور بوجہ اس کے کہ تم خود بھی اسے پڑھتے تھے۔"

مَا كَانَ اس کا معنی ہے ماینبغی یعنی نہیں چاہیے، جیسا کہ فرمایا: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا اور مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ اور مَا يَكُوْنُ لَنَا اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا تمام میں مراد یہی ہے کہ نہیں چاہیے (مناسب نہیں) ور لفظ بشر واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے کیونکہ یہ قائم مقام مصدر کے ہے اور ضحاک اور سدی کے قول کے مطابق یہاں مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور حکم سے مراد علم اور فہم ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حکم سے مراد احکام ہیں۔ یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنی نبوت کے لئے جھوٹوں کو نہیں چنتا۔ اور اگر کوئی انسان ایسا کرتا تو یقیناً اللہ تعالیٰ نبوت کی آیات وعلامات اس سے سلب کر لیتا۔ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اور يَقُوْلَ کے درمیان اشتراک کی بنا پر ثُمَّ يَقُوْلَ کو نصب دی گئی ہے یعنی کسی نبی کے لئے نبوت کا ہونا اور اس کا یہ قول: كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ جمع نہیں ہو سکتے۔ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ یعنی البتہ یہ جائز ہے کہ وہ نبی ان سے کہے كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ تم اللہ والے ہو جاؤ۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت نجران کے نصاریٰ کے بارے نازل ہوئی ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی روایت ہے کہ پوری سورۃ قول باری تعالیٰ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تک کا سبب نزول نجران کے نصاریٰ تھے، لیکن یہود کو ان کے ساتھ ملا دیا گیا، کیونکہ انہوں نے بھی انکار اور عناد انہیں کی طرح کیا۔

رَبّٰنِيّٖنَ اس کا واحد رَبَّانِیٌّ ہے یہ الرَّبّ کی طرف منسوب ہے اور ربانی وہ ہوتا ہے جو لوگوں کی صغار علم کے ساتھ اپنے بڑا ہونے سے پہلے تربیت کرتا ہے، گویا کہ وہ امور کو آسان بنانے میں رب سبحانہ کی اقتدا کرتا ہے، یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

بعض نے کہا ہے یہ اصل میں رَبِّی تھا پھر مبالغہ کے لئے اس میں الف اور نون داخل کر دیئے گئے، جیسا کہ عظیم اللحیہ کے لئے کہا جاتا ہے: لِحْیَانِیٌّ اور عظیم الجمہ (بہت ہی زیادہ) کے لئے جُمَّانِیٌّ اور غلیظ الرقبہ (موٹی گردن والا) کے لئے رَقَبَانِیٌّ کہا جاتا ہے۔ اور مبرد نے کہا ہے: الربانیون سے مراد ارباب علم ہیں، ان کا واحد ربان ہے، یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے رَبَّهُ يَرُبُّهُ فهو ربان جب وہ اسے مدبر بنائے اور اسی کی اصلاح کرے، اس بنا پر اس کا معنی ہے یدبرون امور الناس ویصلحونها وہ لوگوں کے امور کی تدبیر کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور اس میں الف اور نون مبالغہ کے لئے ہیں جیسا کہ ان کا قول ریان اور عطشان ہے پھر اس کے ساتھ یائے نسبت ملا دی گئی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے: لحیانی،

رَقْبانی اور جتانی۔

شاعر نے کہا ہے:

لوکنت مرتهنًا فی الجوّ انزلنی　　منه الحدیث و رَبانیّ أحباری

پس ربانی کا معنی رب العالمین کے دین کا ایسا عالم ہے جو اپنے علم کے ساتھ ساتھ عمل کرتا ہے، کیونکہ جب وہ اپنے علم کے مطابق عمل نہ کرے تو پھر عالم نہیں۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے اور ابورزین نے کہا ہے: ربانی سے مراد ایسا عالم ہے جو حکیم اور دانا بھی ہو۔

حضرت شعبہ نے حضرت عاصم سے، انہوں نے حضرت زر سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ فرمایا مراد ایسے حکماء ہیں جو علماء ہوں۔ ابن جبیر نے کہا ہے: مراد ایسے حکماء ہیں جو انتہائی متقی اور پرہیزگار ہوں۔

اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ حفظ قرآن کے لئے بہت محنت اور جدوجہد کو چھوڑ دے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ اور ابن زید نے کہا ہے: ربّانیون سے مراد ولی اور جید علماء ہیں۔

اور حضرت مجاہد نے فرمایا ہے: ربّانیون احبار (علماء) سے فائق اور اعلیٰ ہوتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اور یہ قول اچھا ہے، کیونکہ احبار تو علماء ہی ہیں اور ربانی وہ ہوتا ہے جو علم بصیرت کو سیاست و دانائی کے ساتھ جمع کرتا ہے، یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: رَبَّ أمرَ النّاسِ يَرُبُّهُ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ لوگوں کے معاملہ کی اصلاح کردے اور اس کے ساتھ قائم ہوجائے، فهو رابٌّ اور ربانیّ تکثیر پر دلالت کرتا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: میں نے کسی عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ربانی سے مراد حلال و حرام اور امر و نہی کے بارے جاننے والا عالم ہے اور وہ جو امت کی اخبار اور جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہوگا کے بارے جاننے والا ہو۔

جس دن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا وصال ہوا اس دن محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے کہا: الیوم مات ربانیّ هذه الأمة۔ (1) آج اس امت کے عالم ربانی کا وصال ہو گیا۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: کوئی مومن و مرد و عورت اور آزاد و غلام نہیں مگر اس پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ وہ قرآن کا علم حاصل کرے اور اس کے دین میں تفقہ حاصل کرے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ الآیہ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ابوعمرو اور اہل مدینہ نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ علم سے ماخوذ ہے۔ اور ابو حاتم نے اسی قرأت کو پسند کیا ہے۔ ابوعمرو نے کہا ہے: اور اس کی تصدیق تَدْرُسُوْنَ کرتا ہے (کیونکہ) التدریس سے تشدید کے ساتھ تُدَرِّسُوْنَ نہیں کہا گیا۔ ابن عامر اور اہل کوفہ نے تعلیم سے تشدید کے ساتھ تُعَلِّمُوْنَ پڑھا ہے اور ابوعبید نے اسے اختیار کیا ہے (اور) کہا ہے: کیونکہ یہ دونوں معنوں (یعنی) تَعْلَمُوْنَ اور تدرسون کو جامع ہے۔

1۔ الکشاف زمخشری، جلد 1، صفحہ 440

مکی نے کہا ہے: تشدید ابلغ ہے، کیونکہ ہر معلم عالم بمعنی یَعْلَمُ ہوتا ہے لیکن ہر وہ جو کسی شے کا علم رکھتا ہو وہ معلِّم نہیں ہوتا، پس تشدید علم اور تعلیم دونوں پر دلالت کرتی ہے اور تخفیف صرف علم پر دلالت کرتی ہے، پس تعلیم ابلغ اور زیادہ قابل تعریف ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ ذم میں ابلغ ہے۔ جنہوں نے تخفیف کی قرأت کو ترجیح دی ہے، انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کیا ہے کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ فرمایا: تم حکماء علماء ہو جاؤ، پس یوں کہا جانا بعید ہے کونوا فقهاء حكماء علماء بتعليمكم یعنی تم اپنی تعلیم کے ساتھ فقہاء حکماء علماء ہو جاؤ۔ حسن نے کہا ہے: تم اپنے علم کے ساتھ حکماء علماء ہو جاؤ۔ اور ابوحیوہ نے تُدْرِسُوْنَ۔ اَدْرَسَ یُدْرِس (یعنی باب افعال) سے پڑھا ہے۔ اور حضرت مجاہد سے تَعَلَّمُون تا کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اصل میں تتعلمون تھا۔

وَ لَا یَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَ النَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَیَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۠ ۝

"اور وہ (مقبول بندہ) نہیں حکم دے گا تمہیں اس بات کا کہ بنالو فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا (تم خود سوچو) کیا وہ حکم دے سکتا ہے تمہیں کفر کرنے کا بعد اس کے کہ تم مسلمان بن چکے ہو۔"

ابن عامر، عاصم اور حمزہ نے اَنْ یُّؤْتِیَهُ پر عطف کرتے ہوئے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے یہ قول تقویت دیتا ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: کیا آپ یہ چاہتے ہیں اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہم آپ کو رب بنالیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَ لَا یَاْمُرَكُمْ اور اس میں ضمیر بشر کی طرف راجع ہے۔ یعنی تمہیں وہ انسان حکم نہیں دے گا بشر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔

اور باقیوں نے اسے پہلے کلام سے جدا ہونے اور استئناف کی بنا پر رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور اس میں ضمیر کا مرجع اللہ عزوجل کا اسم گرامی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم نہیں دے گا کہ تم بنالو اور اس قرأت کو یہ تقویت دیتا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے مصحف میں وَلَنْ یَاْمُرَكُمْ ہے پس یہ استئناف پر دلالت کرتا ہے اور ضمیر بھی اللہ عزوجل کے لئے ہے، اسے مکی نے ذکر کیا ہے اور سیبویہ اور زجاج نے بھی یہی کہا ہے اور ابن جریج اور ایک جماعت نے کہا ہے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں حکم نہیں دیں گے۔ یہی قرأت ابو عمرو، کسائی اور اہل حرمین کی ہے۔

اَنْ تَتَّخِذُوْا کہ تم ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کو خدا بنالو، یہ نصاریٰ میں موجود تھا وہ انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کی تعظیم کرتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے انہیں خدا بنالیا۔ اَیَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ یہ انکار اور تعجب کے طریقہ پر ہے، پس اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر حرام قرار دیا کہ وہ لوگوں کو ایسے بندے بنادیں کہ وہ ان کے خدا بن جائیں البتہ مخلوق پر ان کی حرمت کو لازم کر دیا۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی یہ نہ کہے عبدی وأمتی (اے میرے بندے اور اے میری بندی) بلکہ یہ کہنا چاہیے فتای و فتاتی (اے میرے جوان اور اے میری

دوشیزہ) اور تم میں سے کوئی کسی کو یہ نہ کہے ربی۔ (اے میرے رب) بلکہ یہ کہنا چاہئے سیدی (اے میرے آقا) (1) اور قرآن کریم میں ہے اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ اس کے معنی کا بیان وہاں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

''اور یاد کرو جب لیا اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے پختہ وعدہ کہ قسم ہے تمہیں اس کی جو دوں میں تم کو کتاب اور حکمت سے پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تصدیق کرنے والا ہو ان (کتابوں) کی جو تمہارے پاس ہیں تو تم ضرور ضرور ایمان لانا اس پر اور ضرور ضرور مدد کرنا اس کی (اس کے بعد) فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور اٹھا لیا تم نے اس پر میرا بھاری ذمہ؟ سب نے عرض کی: ہم نے اقرار کیا (اللہ نے) فرمایا: تو گواہ رہنا اور میں (بھی) تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔''

کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ بعض بعض کی تصدیق کریں اور بعض بعض کو ایمان کا حکم دیں (یعنی وہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں اور ایک دوسرے پر ایمان لائیں۔) سو تصدیق کے ساتھ مدد و نصرت کرنے کا یہی معنی ہے۔ یہ قول سعید بن جبیر، قتادہ، طاؤس، سدی اور حسن رحمۃ اللہ علیہم کا ہے اور یہی آیت کا ظاہر مفہوم ہے۔ طاؤس نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء علیہم السلام سے یہ وعدہ لیا کہ وہ بعد میں آنے والوں کے ساتھ ایمان لائیں اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح قرأت کی ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ۔ کسائی نے کہا ہے: یہ جائز ہے کہ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ بمعنی و اذ اخذ الله ميثاق الذين مع النبيين ہو۔

اور بصریوں نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے پختہ وعدہ لیا تو تحقیق یہ وعدہ انہیں سے لیا جو ان کے ساتھ تھے، کیونکہ انہوں نے ہی ان کی اتباع و پیروی کی اور انہوں نے ہی ان کی تصدیق کی۔ اور قول باری تعالیٰ لَمَآ میں ما بمعنی الذی ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے میں نے خلیل ابن احمد سے قول باری تعالیٰ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ کے بارے پوچھا۔ تو انہوں نے کہا: لَمَآ بمعنی الذی ہے۔

نحاس نے کہا ہے۔ خلیل کے قول کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہے للذی آتیتکموہ، پھر اسم کے طویل ہونے کی وجہ سے ھا کو حذف کر دیا گیا۔ اور الذی مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ہے اور مِنْ بیان جنس کے لئے ہے اور یہ کہنے والے کے اس قول کی طرح ہے: لزید افضل منك اور یہی اخفش کا قول ہے کہ یہ لام ابتدا ہے۔

المہدوی نے بیان کیا ہے: قولہ: ثُمَّ جَآءَكُمْ اور اس کا مابعد جملہ صلہ پر معطوف ہے اور اس سے موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے اور تقدیر کلام یہ ہے ثم جاء کم رسول مصدق بہ۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب العتق، حدیث نمبر 2366، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق اس آیت میں رسول سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لفظ اگر چہ نکرہ ہے لیکن اشارہ معین فرد کی طرف ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: ضَرَبَ اللّٰهُ مثلاً قرية كانت آمنة مطمئنة . . . تا قولہ: ولقد جاءهم رسول منكم فكذبوه۔ پس اللہ تعالیٰ نے تمام کے تمام انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائیں اور آپ کی مدد کریں اگر وہ آپ کو پالیں اور انہیں یہ بھی حکم ارشاد فرمایا کہ وہ یہی وعدہ اپنی اپنی امتوں سے لیں۔ اور لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ میں لام اس قسم کا جواب ہے جو وعدہ لینے کی صورت میں ہے کیونکہ یہ استحلاف (قسم لینے) کے قائم مقام ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آپ کلام میں کہتے ہیں اخذت ميثاقك لتفعلن كذا تو اس صورت میں گویا تو نے یہ کہا: میں تجھ سے حلف لیتا ہوں اور قسم اور جواب قسم کے درمیان فاصلہ اس حرف جار کے سبب ہے جو ابن کثیرہ کی قرأت میں لِمَا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور جنہوں نے اسے فتحہ دیا ہے انہوں نے اسے اس قسم کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے جو اخذ میثاق ہے اور لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ میں محذوف قسم کا جواب ہے یعنی اصل عبارت ہے۔ واللہ لتؤمنن بہ۔

مبرد۔ کسائی اور زجاج نے کہا ہے: ما شرط ہے اس پر لام تحقیق داخل ہوا ہے جیسا کہ یہ اِنْ پر داخل ہوتا ہے، اور اس کا معنی ہے [لمهما] آتيتكم، پس ما کا محل نصب ہے اور اٰتَيْتُكُمْ کا محل جزم ہے اور ثُمَّ جَآءَكُمْ معطوف علیہ ہے، لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ اس میں لام جواب و جزا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ (اسراء: 86) (اس میں لنذهبن جواب اور جزا ہے۔)

اور کسائی کا بیان ہے کہ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ قسم کا معتمد ہے اور یہ کلام اول کے ساتھ متصل ہے اور جواب و جزا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ اور اس بنا پر ضمیر عائد مقدر ماننے کی ضرورت نہیں۔

اور اہل کوفہ نے لِمَا آتيتكم لام مکسور کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی بمعنی الذی ہے اور یہ اَخَذَ کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے پختہ وعدہ لیا اس لئے کہ اس نے انہیں کتاب وحکمت عطا فرمائی پھر اگر تمہارے پاس رسول آجائے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو اس وعدہ کے بعد تم ضرور ضرور اس کے ساتھ ایمان لانا، کیونکہ اخذ الميثاق، استحلاف کے معنی میں ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ نحاس نے بیان کیا ہے: اس بارے میں ابو عبیدہ کا قول اچھا ہے۔ انہوں نے کہا: اس کا معنی یہ ہے واذ اخذ الله ميثاق الذين اوتوا الكتاب لتؤمنن به لما آتيتكم من ذكر التوراة۔

اور جب اللہ نے ان سے وعدہ لیا جنہیں کتاب عطا کی گئی تو تم ضرور اس کے ساتھ ایمان لانا کیونکہ میں نے تمہیں تورات کا ذکر عطا فرمایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے اور معنی یہ ہے: اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے پختہ وعدہ لیا کہ تم ضرور ضرور لوگوں کو اس کے بارے آگاہ کرو گے جو تمہارے پاس کتاب وحکمت لے کر آئے اور ضرور ضرور لوگوں پر یہ لازم کرو گے کہ وہ (اس کے ساتھ) ایمان لائیں۔ (واذ اخذ الله ميثاق النبيين لتعلمن الناس لما جاء كم من كتاب وحكمة، ولتاخذن على الناس ان يومنوا) اور اس حذف پر یہ ارشاد دال ہے وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ اور یہ بھی

کہا گیا ہے کہ جنہوں نے لِمَا میں لام کو کسرہ دیا ہے وہ لام بمعنی بعد ہے، یعنی بعد ما اتیتکم من کتاب وحکمۃ، (بعد اس کے کہ میں تمہیں کتاب وحکمت عطا کر دوں۔)

جیسا نابغہ نے کہا ہے:

توھمت　آیات　لھا　فعرفتُھا　لستۃ　أعوام　وَ　ذالعامُ　سابع

مجھے اس کی نشانیوں کا وہم ہوا تو میں نے اسے چھ سال بعد پہچان لیا اور یہ ساتواں سال ہے۔ اس میں لستۃ اعوام بمعنی بعد ستۃ اعوام ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے لَمَّا کو مشدد پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے حین اتیتکم یعنی جب میں تمہیں عطا کر دوں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس میں اصل تخفیف ہو۔ پھر مِن زائد کر دیا گیا ہو ان کے مذہب کے مطابق جو اس کی زیادتی کو واجب قرار دیتے ہیں تو یہ لِمن ما ہو گیا اور پھر ادغام کے لئے نون کو میم سے بدل دیا گیا، پس تین میم جمع ہو گئے تو ان میں پہلے میم کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا۔ اور اہل مدینہ نے تعظیم کی بنا پر آتَیْنَاکُم پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے آتَیتُکُم صیغہ واحد پڑھا ہے۔

پھر تمام انبیاء علیہم السلام کو کتاب نہیں دی گئی بلکہ بعض کو عطا کی گئی ہے، لیکن غلبہ انہیں دیا گیا ہے جنہیں کتاب عطا کی گئی ہے۔ اور مراد تمام انبیاء علیہم السلام سے وعدہ لینا ہے پس جنہیں کتاب عطا نہیں کی گئی تو وہ بھی ان کے حکم میں ہیں جنہیں کتاب دی گئی ہے کیونکہ انہیں حکم اور نبوت عطا فرمائے گئے ہیں اور یہ بھی ہے کہ جنہیں کتاب نہیں دی گئی تو انہیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے سے پہلے والی کتاب لے لیں (اور اس کے احکام پر عمل کریں۔) نتیجتاً یہ بھی ان کی صفت کے تحت داخل ہو گئے جنہیں کتاب دی گئی۔

قولہ تعالیٰ: ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ۗ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ۗ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ، اَقْرَرْتُمْ یہ اقرار سے ماخوذ ہے۔ اور الاِصر اور الاُصر دو لغتیں ہیں اور اس سے مراد عہد ہے۔ لغت میں الاصر کا معنی ثقل (بوجھ) ہے۔ اور عہد کو اِصر کا نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ بہت بڑی رکاوٹ اور سختی ہے۔ قَالَ فَاشْهَدُوْا بمعنی اعلموا۔ فرمایا پس تم جان لو، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ زجاج نے کہا ہے: تم بیان کرو کیونکہ شاہد وہ ہوتا ہے جو مدعی کے دعویٰ کی تصحیح کرتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم گواہ بنا لو اپنے آپ پر اور اپنے متبعین پر۔ وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ اور میں بھی تم پر اور ان پر گواہوں میں سے ہوں۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا ''پس تم ان پر گواہ رہنا'' تو یہ غیر مذکور سے کنایہ ہوگا۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

''پھر جو کوئی پھرے اس (پختہ عہد) کے بعد تو وہی لوگ فاسق ہیں۔''

من شرطیہ ہے پس انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں سے جس نے وعدہ لئے جانے کے بعد ایمان سے منہ پھیرا فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ پس وہ ایمان سے خارج ہیں اور فاسق بمعنی خارج۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۠ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

''کیا اللہ کے دین کے سوا (کوئی اور دین) تلاش کرتے ہیں حالانکہ اسی کے حضور سر جھکا دیا ہے ہر چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی سے یا مجبوری سے اور اسی کی طرف وہ (سب) لوٹائے جائیں گے۔ آپ فرمایئے ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو اتارا گیا ہم پر اور جو اتارا گیا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کے بیٹوں پر اور جو کچھ دیا گیا موسیٰ، عیسیٰ اور (دوسرے) انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے نہیں فرق کرتے ہم کسی کے درمیان ان میں سے اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ کلبی نے کہا ہے: کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے نصاریٰ کے ساتھ اپنا جھگڑا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیا اور عرض کی: ہم میں سے کون زیادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہے؟ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دونوں فریق آپ کے دین سے بری ہیں'' (یعنی دونوں اس پر نہیں ہیں) تو انہوں نے کہا: نہ ہم آپ کے فیصلے پر راضی ہیں اور نہ ہی ہم آپ کا دین قبول کرتے ہیں، تب یہ آیت نازل ہوئی أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ کیا اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا (کوئی اور دین) وہ تلاش کرتے ہیں۔ آیت میں غَيْرَ کو يَبْغُوْنَ فعل کے سبب نصب دی گئی ہے یعنی یبغون غیر دین اللہ۔ اور صرف عمرو نے یبغون کو خبر کی بنا پر یا کے ساتھ پڑھا ہے اور وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ کو خطاب کی بنا پر تا سے (پڑھا ہے) فرمایا: چونکہ پہلا خاص ہے اور دوسرا عام ہے لہٰذا معنی میں افتراق کے لئے ان کے درمیان فرق کیا گیا ہے اور حفص وغیرہ نے یبغون اور یرجعون دونوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ اور باقیوں نے دونوں کو خطاب کی بنا پر تا سے پڑھا ہے، اس ارشاد کی وجہ سے لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ، واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَلَهٗٓ اَسْلَمَ یعنی سر جھکا دیا، سر تسلیم خم کر دیا اور تمام مخلوق اطاعت و پیروی کرنے والی اور سر جھکانے والی ہے، کیونکہ وہ ایسی فطرت پر ہے جس سے نکلنے کی وہ قدرت نہیں رکھتی۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے کہ مومن نے خوشی اور رضامندی سے سر تسلیم خم کر لیا ہے اور کافر نے اپنی موت کے وقت مجبوری سے (سر جھکایا) اور وہ اسے کوئی نفع نہ دے گا، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (المومن: 85) (پس کوئی فائدہ نہ دیا انہیں ان کے ایمان نے جب دیکھ لیا انہوں نے ہمارا عذاب)

حضرت مجاہد نے کہا ہے: کافر کا اسلام مجبوراً ہے کیونکہ اس کا سجدہ غیر اللہ کے لئے ہے اور اس کے سائے کا سجدہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، (جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے) اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ۝ (النحل) (کیا انہوں نے نہیں دیکھا ان اشیاء کی طرف جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا

ہے کہ بدلتے رہتے ہیں ان کے سائے دائیں سے (بائیں طرف) اور بائیں سے (دائیں طرف) سجدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو اس حال میں کہ وہ اظہار عجز کر رہے ہیں۔) وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ (الرعد) (اور اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً اور ان کے سائے بھی (سجدہ ریز ہیں) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس صورت پر پیدا فرمایا جس کا ان سے ارادہ فرمایا، پس ان میں سے کچھ حسین ہے اور کچھ قبیح، کچھ طویل ہے اور چھوٹے قد کی، کچھ صحت مند ہے اور کچھ بیمار اور تمام کے تمام مجبوراً جھکے ہوئے ہیں۔ پس صحیح رضامندی اور خوشی سے اطاعت کرنے والے ہیں اور اسے پسند کرنے والے ہیں اور مریض جھکتے ہیں، اطاعت اختیار کرتے ہیں اگرچہ وہ مجبور ہوں۔ اور الطوع کا معنی ہے سہولت کے ساتھ جھکنا اور اتباع کرنا۔ اور الکرہ وہ ہوتا ہے جو مشقت کے ساتھ ہو، مجبوراً ہو اور دل سے اس کا انکار ہو۔ اور طَوْعًا وَّ كَرْهًا دونوں مصدر ہیں اور حال کے محل میں واقع ہیں، یعنی یہ طائعین اور مکرہین کے معنی میں ہیں۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ارشاد باری تعالیٰ کے بارے فرمایا: وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا فرمایا: ''ملائکہ نے آسمان میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور انصار اور عبدالقیس نے زمین میں'' اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میرے اصحاب کو گالی گلوچ نہ دو کیونکہ میرے اصحاب اللہ تعالیٰ کے خوف سے اسلام لائے اور لوگ تلوار کے خوف سے اسلام لائے''۔(1)

اور عکرمہ نے کہا ہے: طَوْعًا سے مراد وہ ہے جس نے بغیر کسی بحث مباحثہ کے اسلام قبول کیا اور كَرْهًا سے مراد وہ ہے جسے حجت اور دلیل نے توحید کی جانب مجبور کر دیا ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (الزخرف: 87) (اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو یقیناً کہیں گے اللہ نے) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: 61) (اور اے حبیب!) اگر آپ پوچھیں ان (مشرکوں) سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور کس نے فرمانبردار بنایا ہے سورج اور چاند کو تو وہ ضرور کہیں گے اللہ تعالیٰ نے)

حسن نے کہا ہے: یہ (لفظ) عام ہے مگر اس کا معنی خاص ہے۔ اور آپ سے مروی ہے اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ اور کلام مکمل ہوئی۔ پھر فرمایا: وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا فرمایا: مجبوری سے اطاعت کرنے والا منافق ہے جسے اس کا عمل کوئی نفع نہ دے گا، اور طَوْعًا وَّ كَرْهًا دونوں مصدر ہیں، حال کے محل میں واقع ہیں۔ حضرت مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کی سواری سرکش ہو جائے یا وہ بدکنے لگے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کے کان میں یہ آیت پڑھے: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا الی آخر الآیہ۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

1۔ صحیح بخاری، باب قول النبی ﷺ لو کنت متخذا خلیلا، حدیث نمبر 3397، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

''اور جو تلاش کرے گا اسلام کے بغیر کوئی (اور) دین تو وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اس سے اور وہ قیامت کو زیاں کاروں میں سے ہوگا۔''

غَیْرَ یَبْتَغِ فعل کا مفعول ہے اور دِیْنًا تفسیر کی بناء پر منصوب ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ دِیْنًا، یَبْتَغِ فعل کے سبب منصوب ہو اور غَیْرَ، الدِّین سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہو۔

حضرت مجاہد اور سدی رحمۃ اللہ علیہما نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت جلاس بن سوید کے بھائی حارث ابن سوید کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ انصار میں سے تھا وہ اور اس کے ساتھ بارہ افراد دین اسلام سے مرتد ہو گئے اور وہ مکہ میں کفار سے جا ملے، تو یہ آیت نازل ہوئی، پھر اس نے اپنے بھائی کی طرف پیغام بھیجا جبکہ وہ توبہ کا طالب ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے یہی مروی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اس نے ان آیات کے نازل ہونے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ہشام نے بیان کیا ہے: یعنی وہ آخرت میں زیاں کاروں میں سے ایک زیاں کار ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو صلہ اور موصول کے درمیان تفریق کی جاتی۔ اور مازنی نے کہا ہے: الخاسرین پر الف لام ایسے ہی ہے جسے الرجل پر ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ: وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ کے تحت یہ گزر چکا ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾

''کیسے ہوسکتا ہے کہ ہدایت دے اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ایمان لے آنے کے بعد اور وہ (پہلے خود) گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے اور آ چکی تھیں ان کے پاس کھلی نشانیاں اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم لوگوں کو۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ انصار میں سے ایک آدمی نے اسلام قبول کیا پھر وہ مرتد ہو گیا اور مشرکین سے جا ملا، بعد ازاں وہ اپنے کئے پر نادم ہوا، تو اس نے اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا، تم میرے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرو کیا میرے لئے توبہ ہے؟ تو اس کی قوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی کیا اس کی توبہ (قبول) ہوسکتی ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی: كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۫ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ پس آپ نے اس کی طرف پیغام بھیجا تو اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اسے نسائی نے نقل کیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ انصار میں سے ایک آدمی مرتد ہو گیا اور مشرکین سے جا ملا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ

تَابُوْا (آل عمران) (کیسے ہو سکتا ہے کہ ہدایت دے اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ایمان لے آنے کے بعد ...... مگر وہ لوگ جنہوں نے سچے دل سے توبہ کر لی)

پس اس کی قوم نے اسے اس کی طرف بھیج دیا، تو جب اس پر یہ آیت پڑھی گئی تو اس نے کہا: قسم بخدا! میری قوم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مجھے جھٹلایا نہیں اور نہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے بارے میں جھوٹا سمجھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تینوں کو سچا قرار دیا ہے، چنانچہ وہ تائب ہو کر واپس لوٹ آیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے توبہ کو قبول فرما لیا اور اسے چھوڑ دیا۔

اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بشارت دیتے تھے اور کفر کرنے والوں کے خلاف آپ کے وسیلہ سے فتح کی دعا مانگتے تھے، لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے سرکشی کی اور کفر اختیار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ (آل عمران) (ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی، فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔)

پھر کہا گیا ہے: كَيْفَ لفظ استفہام ہے اور اس کا معنی انکار ہے یعنی لا يهدى الله اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہے: كيف يكون للمشركين عهد عند الله و عند رسوله یعنی لا يكون لهم عهد (ان کے لئے کوئی عہد نہیں ہو سکتا۔)

اور شاعر نے کہا ہے:

كيف نومي على الفراش و لما يشمل القوم غارةٌ شعواءُ

اس میں بھی كيف نومي سے مراد ہے لا نوم لي یعنی میرے لئے کوئی نیند نہیں۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ کہا جاتا ہے کہ ظاہر آیت یہ ہے کہ جس نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفر اختیار کیا اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دے گا اور جو کوئی ظالم ہوا، اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دے گا، حالانکہ ہم نے بہت سے مرتدین کو دیکھا کہ وہ اسلام لائے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت عطا فرمائی اور کثیر ظالموں کو دیکھا انہوں نے اپنے ظلم سے توبہ کر لی۔ تو اسے کہا جائے گا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نہیں دے گا جب تک وہ اپنے کفر اور اپنے ظلم پر قائم رہے اور انہوں نے اسلام قبول نہ کیا، لیکن جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور توبہ کر لی تو اس کے بارے اللہ تعالیٰ نے ہی انہیں توفیق دی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۫ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

''ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی فرشتوں کی، اور سب انسانوں کی۔ ہمیشہ رہیں اسی پھٹکار میں نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ مگر وہ لوگ جنہوں نے (سچے دل سے) توبہ کر لی اس کے بعد اور اپنی اصلاح کر لی تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (انہیں بخش دے گا)''۔

یعنی اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہیں اور لعنۃ اللہ و الناس کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔
وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ یعنی نہ انہیں موخر کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی، پھر اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں کی استثناء فرمائی اور ارشاد فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا امراد حارث بن سوید ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے معنوی طور پر آیت میں ہر وہ داخل ہے جس نے اسلام کی طرف رجوع کیا اور اس کے لئے مخلص ہو گیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝

”یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے چلے گئے کفر میں ہرگز نہ قبول کی جائے گی ان کی توبہ اور یہی لوگ ہیں جو گمراہ ہیں۔“

حضرت قتادہ، عطا خراسانی اور حسن نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کے ساتھ کفر کیا اور پھر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کا انکار کر کے اپنے کفر میں اور اضافہ کر لیا۔ اور ابو العالیہ نے کہا ہے۔ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے حضور نبی رحمت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت و صفت کے ساتھ ایمان لانے کے بعد کفر کیا۔ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا پھر اپنے کفر پر قائم رہ کر انہوں نے اس میں اور اضافہ کر لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ازْدَادُوْا كُفْرًا وہ کفر میں بڑھتے ہی گئے ان گناہوں کے سبب جو انہوں نے کئے۔ اور یہ علامہ طبری کا اختیار کردہ ہے۔ اور یہ آیت ان کے نزدیک یہود کے بارے میں ہے۔
لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یہ اس آیت کی وجہ سے مشکل ہے: وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ (الشوریٰ:25) (اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی اور درگزر کرتا ہے ان کی غلطیوں سے۔)
سو یہ کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے موت کے وقت ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا قول ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ (النساء:18) اور نہیں یہ توبہ (جس کے قبول کرنے کا وعدہ ہے) ان لوگوں کے لئے جو کرتے رہتے ہیں برائیاں (ساری عمر) یہاں تک کہ جب آ جائے کسی ایک کو ان میں سے موت (تو) کہے بے شک میں توبہ کرتا ہوں اب)
اور حضرت حسن، قتادہ اور عطا رحمۃ اللہ علیہم سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یقیناً اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک اس کی جان (روح) حلقوم تک نہ پہنچے (1)“۔ اور اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یعنی وہ حالت جس پر وہ کفر کرنے سے پہلے تھے (اس پر نہیں لوٹ سکتے) کیونکہ کفر نے اسے ضائع کر دیا ہے۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یعنی جب وہ اپنے کفر سے دوسرے کفر کی طرف رجوع کریں، بلاشبہ ان کی توبہ قبول

1۔ ابن ماجہ، باب ذکر التوبہ، حدیث نمبر 4242، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی جائے گی جب انہوں نے اسلام کی طرف رجوع کیا۔ اور قطرب نے کہا ہے: یہ آیت اہل مکہ میں سے ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی انہوں نے کہا: ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تکالیف زمانہ کا انتظار کر رہے ہیں، پس اگر ہمارے لئے واپسی ممکن ہوئی تو ہم اپنی قوم کی طرف لوٹ جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یعنی ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی درآنحالیکہ وہ کفر پر مقیم رہیں، پس اسے ہی توبہ غیر مقبولہ کا نام دیا ہے، کیونکہ قوم کا عزم صحیح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ توبہ مکمل طور پر قبول فرماتا ہے بشرطیکہ عزم و ارادہ صحیح ہو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۹۱﴾

''جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز نہ قبول کیا جائے گا ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا اگرچہ وہ (اپنی نجات کے لئے) عوضانہ دے اتنا سونا، ایسے لوگوں کے لئے عذاب ہے دردناک اور نہیں ہے ان کا کوئی مددگار۔''

المِلْءُ کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد وہ مقدار ہے جو کسی شے کو بھر دیتی ہے اور المَلْءُ فتحہ کے ساتھ مصدر ہے تیرا کسی شے کو بھر دینا اور کہا جاتا ہے: أعطنی مِلأہ و مِلأیه و ثلاثة أملائه۔ اور وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ میں واؤ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مقحم اور زائدہ ہے۔ اور معنی یہ ہے: فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ اور علماء نحو میں سے اہل نظر نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ واؤ مقحمہ ہو کیونکہ یہ معنی پر دلالت کر رہی ہے۔ اور آیت کا معنی یہ ہے: سو ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا تبرعا قبول نہیں کیا جائے گا اگرچہ وہ اسے بطور فدیہ دے۔ اور ذَهَبًا فراء کے قول کے مطابق بطور تفسیر منصوب ہے۔ مفضل نے کہا ہے: تفسیر کے لئے شرط یہ ہے کہ کلام تام ہو اور وہ مبہم ہو، جیسے تیرا یہ قول ہے: عندی عشرون، اس میں عدد معلوم ہے اور معدود مبہم ہے، پس جب تو نے درھما کہا تو تو نے تفسیر بیان کر دی۔ بلاشبہ اسے بطور تمیز نصب دی گئی ہے کیونکہ اس کے لئے کوئی ایسا عامل نہیں ہے جو اسے کسرہ دے رہا ہو اور نہ ہی اسے کوئی رفع دینے والا عامل ہے۔ اور نصب خفیف ترین حرکت ہے اور یہ ہر اس کے لئے بنائی گئی ہے جس میں کوئی عامل نہ ہو۔ اور کسائی نے کہا ہے: اسے مِنْ کو مضمر کر کے نصب دی گئی ہے۔ یعنی اصل میں تھا مِنْ ذَهَبٍ، جیسا کہ اس قول میں ہے: أو عدل ذٰلِكَ صِیَامًا۔ ای مِنْ صِیَامٍ۔

اور بخاری اور مسلم میں حضرت قتادہ سے اور انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن کافر کو لایا جائے گا اور اسے کہا جائے گا: تیرا کیا خیال ہے اگر تیرے لئے زمین بھر سونا ہو۔ کیا تو اسے بطور فدیہ دے سکتا ہے؟ تو وہ کہے گا۔ ہاں۔ پھر اسے کہا جائے گا: تحقیق تجھ سے ایسی چیز کا مطالبہ کیا تھا جو اس سے بہت زیادہ آسان تھی۔'' یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ اور مسلم نے قد کنت کی بجائے کذبت، قد سئلت کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ (تو نے جھوٹ بولا ہے حالانکہ تجھ سے اس کا سوال کیا گیا تھا۔)(1)

1۔ صحیح بخاری، باب من نوقش الحساب عذب، حدیث نمبر 6057، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾

"ہرگز نہ پا سکو گے تم کامل نیکی (کا رتبہ) جب تک نہ خرچ کرو (راہ خدا میں) ان چیزوں سے جن کو تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔"

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ائمہ کرام نے روایت بیان کی ہے اور یہ الفاظ نسائی کے ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا! ہمارا رب ہمارے مالوں کے بارے میں ہم سے سوال کر رہا ہے پس یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کو گواہ بناتا ہوں اس پر کہ میں نے اپنی زمین اللہ تعالیٰ کے لئے دے دی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو اسے اپنے قرابتداروں حسان ابن ثابت اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما میں تقسیم کر دے۔"(1)

اور الموطا میں ہے "ان کے اموال میں سے ان کے نزدیک پسندیدہ مال بیرحاء تھا اور وہ مسجد کے سامنے تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لے جاتے تھے اور اس کا میٹھا اور طیب پانی نوش فرماتے تھے۔" پھر آگے وہی حدیث ذکر کی۔ تو اس آیت میں خطاب کے ظاہر اور اس کے عموم کو عمل میں لانے پر دلیل موجود ہے، کیونکہ جب آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کے اکوئی معنی مذکور کلام سے نہیں سمجھے۔ کیا آپ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو دیکھتے نہیں کہ جب انہوں نے آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا الآیۃ سنی تو انہوں نے توقف کی ضرورت محسوس نہیں کی یہاں تک کہ دوسری آیت کے ذریعہ اس کا بیان اور وضاحت آجائے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے بندے خرچ کریں یا کوئی سنت سامنے آجائے جو اس کی وضاحت کرنے والی ہو کیونکہ وہ تو بہت سی اشیاء کو پسند کرتے ہیں۔

اور اسی طرح حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ نے بھی کیا کہ آپ نے اپنے پسندیدہ گھوڑے کا قصد کیا اسے سَبَل کہا جاتا تھا اور کہا: اے اللہ! یقیناً تو جانتا ہے کہ میرے نزدیک میرے اس گھوڑے سے زیادہ پسندیدہ مال کوئی نہیں ہے، پس آپ اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے اور عرض کی: یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں قربان ہے (اسے قبول فرمائیے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو فرمایا: "اسے قبضے میں لے لو" تو گویا حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے اپنے دل میں کچھ (وہم سا) پایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ قد قبلها منك بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اسے تجھ سے قبول فرما لیا ہے۔ اسے اسد بن موسیٰ نے ذکر کیا ہے(2)۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے غلام نافع کو آزاد کیا اور اس میں حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما نے انہیں ہزار دینار عطا کئے۔ صفیہ بنت ابی عبید نے کہا ہے: میں ان کے بارے گمان کرتی ہوں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تاویل کی: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔

اور شبل نے ابو نجیح سے اور انہوں نے حضرت مجاہد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے

1۔ صحیح بخاری، باب الزکاۃ علی الاقارب، حدیث نمبر 1368، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 577

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ وہ مدائن کسریٰ کی فتح کے دن جلولاء کے قیدیوں سے ان کے لئے ایک لونڈی خریدیں، تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بلایا تو اس نے آپ کو بہت خوش کیا، تو انہوں نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے آزاد کر دیا۔ اور حضرت ثوری سے مروی ہے کہ ان تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ربیع بن خثیم کی ام ولد نے بیان کیا ہے کہ جب ان کے پاس کوئی سائل آتا تو وہ مجھے فرماتے اے فلانہ! سائل کو شکر دے دو، کیونکہ ربیع شکر بہت پسند کرتا تھا۔ سفیان نے کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی (یہی) تاویل کرتے ہیں: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ اور حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ شکر کی بوریاں خریدتے تھے اور انہیں صدقہ کر دیتے تھے تو آپ سے عرض کی گئی: آپ اس کی قیمت کیوں نہیں صدقہ کر دیتے؟ تو آپ نے فرمایا: کیونکہ شکر میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنی زیادہ پسندیدہ اور محبوب شے (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) خرچ کر دوں۔

اور حسن نے کہا ہے: یقیناً تم اسے ہرگز نہیں پا سکو گے جسے تم پسند کرتے ہو مگر اسے چھوڑ کر جس کی خواہش اور چاہت تم رکھتے ہو اور تم اس کا ادراک نہیں کر سکتے جس کی تم آرزو رکھتے ہو مگر اس پر صبر کرتے ہوئے جسے تم ناپسند کرتے ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ اَلْبِرَّ کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے بعض نے کہا ہے: اس سے مراد جنت ہے، یہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت عطا، حضرت مجاہد، عمرو بن میمون اور سدی رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم سے منقول ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہوگی۔ لن تنالوا ثواب البرّ حتی تنفقوا مما تحبون (تم نیکی کا ثواب ہرگز نہیں پا سکتے یہاں تک کہ تم ان چیزوں میں سے (راہ خدا میں) خرچ کرو جنہیں تم پسند کرتے ہو۔) اور النَّوَال بمعنی عطا ہے، یہ تیرے اس قول سے ہے تولته تنویلاً یعنی میں نے اسے عطا کیا۔ اور نالنی من فلان معروف ینالنی، یعنی وہ مجھ تک پہنچ گیا۔ سو معنی یہ ہوگا: تم ہرگز جنت تک نہ پہنچ سکو گے اور نہ تم اسے پا سکو گے یہاں تک کہ تم خرچ کر دو (راہ خدا میں) ان چیزوں میں سے جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔

اور بعض نے کہا ہے: البر سے مراد عمل صالح (نیکی) ہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے: ”تم پر سچ بولنا لازم ہے کیونکہ سچائی عمل صالح کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور عمل صالح جنت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ (1)“ سورۃ البقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔

عطیہ العوفی نے کہا ہے: اَلْبِرَّ سے مراد طاعت ہے۔ حضرت عطا نے بیان کیا ہے: تم ہرگز دین اور تقویٰ کا شرف و مرتبہ نہ پا سکو گے یہاں تک کہ تم صدقہ کرو در آنحالیکہ تم صحت مند اور حریص ہو، تم زندگی کی آرزو رکھتے ہو اور فقر و افلاس سے ڈرتے ہو۔ اور حسن سے منقول ہے کہ حَتّٰى تُنْفِقُوْا سے مراد فرض زکوٰۃ ہے۔ مجاہد اور کلبی نے کہا ہے: یہ آیت منسوخ ہے اسے آیت زکوٰۃ نے منسوخ کیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یہاں تک کہ تم ان چیزوں میں سے خرچ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو خیر اور نیکی کی راہ میں مثلاً صدقہ یا علاوہ ازیں دیگر طاعات وغیرہ اور یہ جامع معنی ہے۔ اور نسائی نے صعصعہ بن معاویہ سے روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا: میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ملا تو میں نے کہا کوئی حدیث بیان فرمایئے تو انہوں نے کہا: ہاں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حدیث نمبر 5629، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو مسلمان آدمی اپنے ہر مال سے جوڑا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو جنت کے تمام دربان اس کا استقبال کریں گے اور ان میں سے ہر کوئی اسے اس کی طرف بلائے گا جو اس کے پاس ہے۔ میں نے پوچھا: وہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: اگر تو وہ (مال) اونٹ ہیں تو پھر دو اونٹ (صدقہ کرے) اور اگر وہ گائیں ہیں تو پھر وہ دو گائیں (صدقہ کرے)۔ اور ابوبکر الوراق نے کہا ہے: (اللہ تعالیٰ نے) اس آیت کے ساتھ مکارم اخلاق پر ان کی راہنمائی کی ہے۔ یعنی تم ہرگز اپنے ساتھ میری نیکی کو نہیں پا سکو گے مگر اس طرح کہ تم اپنے بھائیوں کے ساتھ نیکی کرو اور اپنے اموال اور جاہ و حشمت میں سے ان پر خرچ کرو، پس جب تم اس طرح کرو گے تو پھر میری نیکی، احسان اور میر الطف و مہربانی تمہیں آپہنچے گی۔

حضرت مجاہد نے کہا: یہ اس ارشاد کی مثل ہے: وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا۔ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ یعنی جب وہ جانتا ہے تو اس پر جزا عطا فرمائے گا۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰی نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾

''سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں بنی اسرائیل کے لئے مگر وہ جسے حرام کیا اسرائیل نے اپنے آپ پر اس سے پہلے کہ نازل کی گئی توراۃ۔ آپ فرماؤ: لاؤ توراۃ پھر پڑھو اسے اگر تم سچے ہو۔ پس جو بہتان لگاتا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اس کے بعد تو وہی ظالم ہیں۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: حِلًّا یعنی حلال۔ (کھانے کی ہر چیز حلال تھی۔) پھر استثنا کی اور فرمایا: اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰی نَفْسِهٖ اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔ ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو کہا: آپ ہمیں بتائیے، کون سی شے اسرائیل (حضرت یعقوب علیہ السلام) نے اپنے آپ پر حرام کی تھی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ جنگل میں رہتے تھے اور وہ عرق النساء (کی بیماری) میں مبتلا ہو گئے اور وہ اونٹوں کے گوشت اور ان کے دودھ کے سوا کوئی پسندیدہ اور مناسب شے نہ پاتے تھے۔'' انہوں نے کہا: آپ نے سچ فرمایا ہے۔ (1)

اور حدیث ذکر کی۔ اور کہا جاتا ہے: (بے شک آپ نے) نذر مانی کہ اگر آپ اس بیماری سے شفایاب ہو گئے تو وہ اپنا پسندیدہ کھانا پینا چھوڑ دیں گے اور آپ کے نزدیک پسندیدہ کھانا پینا اونٹ کا گوشت اور ان کا دودھ تھا۔

حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے: حضرت یعقوب علیہ السلام حران سے بیت المقدس کا ارادہ کرتے ہوئے آئے جبکہ آپ اپنے بھائی عیصو سے بھاگے، آپ انتہائی مضبوط اور قوی آدمی تھے، پس آپ کی ملاقات ایک

1۔ سنن ترمذی، باب و من سورۃ الرعد، حدیث 3042، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرشتے سے ہوئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے گمان کیا کہ یہ ڈاکو ہے چنانچہ آپ نے اس کے ساتھ لڑائی کی کہ آپ اس کو پچھاڑ دیں، تو فرشتے نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی ران پر کچوکا لگایا اور پھر وہ آسمان کی طرف چڑھ گیا اور یعقوب علیہ السلام اس کی طرف دیکھتے رہے تو اس طرح آپ پر عرق النساء کی بیماری غالب آگئی اور اس کے سبب شدید تکلیف میں مبتلا ہو گئے، درد کی وجہ سے رات کو نیند نہ آتی تھی بلکہ آپ چیختے ہوئے رات گزارتے تھے، تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں شفا عطا فرمادی تو (ہڈی نہیں کھائیں گے) اور نہ ہی وہ ایسا کھانا کھائیں گے جس میں ہڈی ہوگی تو انہوں نے اسے اپنے اوپر حرام کرلیا، تو اس کے بعد ان کے بیٹے بھی ان کی پیروی کرنے لگے اور وہ گوشت سے ہڈیوں کو نکال دیتے تھے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو فرشتے کا کچوکا لگانے کا سبب یہ تھا کہ وہ نذر مانیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بارہ بیٹے عطا فرمائے اور وہ صحیح سالم بیت المقدس آئے تو وہ ان میں سے آخری کو ذبح کریں گے۔ پس وہ ان کی نذر سے نکلنے کے لئے تھا، حضرت ضحاک سے یہی منقول ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا یہ تحریم حضرت یعقوب علیہ السلام کے اپنے اجتہاد سے تھی یا اللہ تعالیٰ کے اذن سے؟ تو اس میں صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تحریم کی نسبت ان کی طرف کی ہے۔ فرمایا اِلَّا مَا حَرَّمَ اور یہ کہ نبی کو جب اس کا اجتہاد کسی حکم تک پہنچا دے تو وہ دین ہوتا ہے اور اس کی اتباع ہمارے اوپر لازم ہوجاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے اس پر پختہ فرمادیتا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ اس کی طرف وحی کی جاتی ہے اور اس کی اتباع لازم ہوجاتی ہے، اسی طرح اس کو اجازت دی جاتی ہے اور وہ اجتہاد کرتا ہے اور اس کے اجتہاد کا موجب متعین ہوجاتا ہے جب وہ اس پر قادر ہو اور اگر اس کے لئے اس کی تحریم کے بارے پہلے اجازت نہ ہو تو وہ تحلیل و تحریم کی جانب بغیر اجازت کے نہیں بڑھتا۔ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح روایت کے مطابق شہد کو حرام کیا(1) یا اپنی کنیز ماریہ کو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی تحریم کی توثیق نہ کی اور یہ ارشاد نازل ہوا۔ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ اس کا بیان سورۃ التحریم میں آئے گا۔

الکیا الطبری نے کہا ہے یہ کہا جانا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ مطلق ارشاد لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ تقاضا کرتا ہے کہ یہ ماریہ کے ساتھ مختص نہ ہو۔

اور امام شافعی نے یہ رائے بیان کی ہے کہ اس صورت میں کفارہ کا واجب ہونا غیر معقول ہے، تو آپ نے اسے محل نص کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ دراصل کفارہ ہر مباح کو حرام قرار دینے کی صورت میں ہے اور آپ نے اسے قسم کے قائم مقام قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام عرق النساء میں مبتلا ہوئے تو حکماء نے آپ کے لئے یہ تجویز کیا کہ آپ اونٹ کے گوشت سے پرہیز کریں چنانچہ آپ نے اسے اپنے آپ پر حرام قرار دیا۔ پھر یہودیوں نے کہا: بلاشبہ ہم اپنے آپ پر اونٹ کا گوشت حرام

1۔ صحیح بخاری، باب لم تحرم ما احل اللہ لک، حدیث نمبر 4862، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قرار دیتے ہیں، کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے حرام قرار دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تحریم کا حکم تورات میں نازل فرمایا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے: پس اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی اور ان کا رد کر دیا اور فرمایا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ لیکن وہ نہ لائے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ زجاج نے کہا ہے: ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے لئے اس آیت میں بہت بڑی دلیل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ یہ ان کی کتاب میں نہیں ہے اور آپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ تورات لے آئیں لیکن انہوں نے انکار کیا۔ یعنی انہوں نے یہ پہچان لیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے سبب یہ ارشاد فرمایا ہے۔

اور عطیہ العوفی نے کہا ہے: بلاشبہ وہ ان پر حضرت یعقوب علیہ السلام کے حرام کرنے کی وجہ سے حرام ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ اسرائیل نے اس وقت کہا جب انہیں عرق النساء کا مرض لاحق ہوا: قسم بخدا! اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے عافیت اور صحت عطا فرمائی تو کوئی بچہ اسے (گوشت کو) نہیں کھائے گا، حالانکہ وہ ان پر حرام نہیں کیا گیا تھا۔ اور کلبی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے تورات میں ان پر حرام نہیں کیا بلکہ تورات کے بعد ان کے ظلم اور کفر کی وجہ سے اسے حرام قرار دیا۔ اور بنی اسرائیل جب بڑے بڑے گناہ کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر پاکیزہ اور طیب کھانا حرام کر دیا یا ان پر عذاب نازل کر دیا اور وہ موت ہے، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ الآیہ (النساء: 160) (سو بوجہ ظلم ڈھانے یہود کے ہم نے حرام کر دیں ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو حلال کی گئی تھیں ان کے لئے) اور ارشاد گرامی ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ (الانعام) (اور ان لوگوں پر جو یہودی بنے تھے ہم نے حرام کر دیا ہر ناخن والا جانور...... یہ ہم نے سزا دی تھی انہیں بسبب ان کی سرکشی کے اور یقیناً ہم سچے ہیں۔)

مسئلہ نمبر 4۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں یہ عنوان ذکر کیا ہے دواء عرق النساء ہشام بن عمار اور راشد ابن سعید الرملی نے بیان کیا ہے کہ ولید بن مسلم، ہشام بن حسان، انس بن سیرین تمام نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا، عرق النساء کا علاج جنگلی بکری کی لاٹ ہے جسے پگھلایا جائے، پھر اسے تین اجزاء میں تقسیم کیا جائے، پھر ہر روز ایک جز نہار منہ پیا جائے۔" (1)

اور ثعلبی نے بھی اپنی تفسیر میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرق النساء کے بارے میں ارشاد فرمایا: "عربی مینڈھے کی لاٹ لی جائے نہ وہ چھوٹا ہو اور نہ ہی بہت بڑا اور اسے چھوٹا چھوٹا کاٹ لیا جائے اور پھر اس کی چربی پگھلا کر نکال لی جائے اور اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر روز ایک تہائی حصہ نہار منہ لے لیا جائے۔" حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے سو سے زیادہ افراد کو اس کے بارے بتایا اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے

1۔ ابن ماجہ، باب دواء عرق النساء، حدیث نمبر 3453، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تندرست ہو گئے۔

حضرت شعبہ نے بیان کیا ہے: حجاج بن یوسف کے زمانے میں عرق النساء کے متعلق ایک شیخ نے مجھے بتایا: میں تجھے عظمت وشان والے الله کی قسم دیتا ہوں اگر تو (اس سے) تندرست نہ ہو تو میں تجھے آگ کے ساتھ داغ دوں گا یا تجھے استرے کے ساتھ مونڈ دوں گا۔ حضرت شعبہ نے بیان کیا: تحقیق میں نے اس کا تجربہ کیا، تو اسے کہہ، اور تو اس جگہ پر اسے کل دے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۹۵﴾

''آپ کہہ دیجئے: سچ فرمایا ہے الله نے پس پیروی کرو تم ملت ابراہیم کی جو ہر باطل سے الگ تھلگ تھے اور (بالکل) نہ تھے وہ شرک کرنے والوں سے۔''

اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ فرما دیجئے: الله تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے، بلاشبہ وہ تورات میں حرام نہیں کیا گیا ہے۔ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا یعنی الله تعالیٰ نے آپ کے دین کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ یہ ان کے باطل دعویٰ کو انہی پر رد کرنا اور لوٹانا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿ۚ۹۶﴾ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ۬ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۷﴾

''بے شک پہلا (عبادت) خانہ جو بنایا گیا لوگوں کے لئے وہی ہے جو مکہ میں ہے، بڑا برکت والا، ہدایت (کا سرچشمہ) ہے سب جہانوں کے لئے۔ اس میں روشن نشانیاں ہیں (ان میں سے ایک) مقام ابراہیم ہے اور جو بھی داخل ہوا اس میں ہو جاتا ہے (ہر خطرہ سے) محفوظ۔ اور الله کے لئے فرض ہے لوگوں پر حج اس گھر کا جو طاقت رکھتا ہو وہاں تک پہنچنے کی اور جو شخص (اس کے باوجود) انکار کرے تو بے شک الله بے نیاز ہے سارے جہان سے۔''

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے بیان کیا میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس پہلی مسجد کے بارے میں پوچھا جو زمین پر بنائی گئی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مسجد حرام''۔ میں نے عرض کی پھر کون سی مسجد بنائی گئی؟ تو آپ؟ نے فرمایا: ''مسجد اقصیٰ''۔ میں نے عرض کی: ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''چالیس سال، پھر ساری زمین تیرے لئے مسجد بنا دی گئی جہاں کہیں تجھے نماز کا وقت ہو جائے تو تو وہیں نماز پڑھ لے۔'' (1)

حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس سے پہلے کوئی عبادت خانہ نہیں بنایا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیت سے پہلے بیوت تو کثیر تھے، لیکن یہاں بیت سے مراد وہ ہے جو عبادت کے لئے سب سے

1۔ صحیح بخاری، باب یزفون النسلان فی المشی، حدیث نمبر 3115، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اول بنایا گیا۔

اور حضرت مجاہد نے بیان کیا: مسلمان اور یہودی ایک دوسرے پر فخر کرنے لگے پس یہودیوں نے کہا: بیت المقدس کعبہ سے افضل اور اعظم ہے، کیونکہ وہ انبیاء علیہم السلام کی ہجرت گاہ ہے اور ارض مقدس میں ہے۔ اور مسلمانوں نے کہا: (نہیں) بلکہ کعبہ معظمہ افضل ہے۔

تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور سورۃ البقرہ میں بیت اللہ کی بناوٹ اور سب سے اول جس نے اسے بنایا اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے زمین کی کسی شے کو تخلیق فرمانے سے دو ہزار برس پہلے اس بیت کی جگہ کو تخلیق فرمایا اور اس کی بنیادیں نیچے والی ساتویں زمین میں ہیں اور جہاں تک مسجد اقصیٰ کا تعلق ہے تو اسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے، جیسا کہ اسے امام نسائی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے بیت المقدس کو بنایا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے تین خصلتوں اور اعزاز کا سوال کیا [انہوں نے اللہ تعالیٰ سے] حاکم بنائے جانے کی التجا کی کہ وہ انہیں حکومت عطا فرمائے۔ پس وہ انہیں عطا کر دی گئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ملک کی التجا کی کہ آپ کے بعد کسی کے لئے ایسی بادشاہی نہ ہو پس وہ بھی آپ کو عطا کر دی گئی اور انہوں نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں عرض کی جب وہ مسجد بنانے سے فارغ ہوئے کہ جو بھی اس میں آکر نماز ادا کرے تو وہ اسے گناہوں سے اسی طرح پاک کر دے جس طرح وہ اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا پس یہ اعزاز بھی انہیں عطا کر دیا گیا۔'' دونوں حدیثوں کے درمیان اشکال ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے درمیان طویل مدت کا فاصلہ ہے اہل تواریخ نے کہا ہے: وہ مدت ہزار برس سے زیادہ ہے۔

پس کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے اسے نئے سرے سے بنایا جس کی بنیاد ان کے سوا (کسی اور) نے رکھی تھی۔ اور یہ روایت ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف بنایا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس یہ جائز ہے کہ آپ کے بعد آپ کی اولاد میں سے کسی نے چالیس سال بعد بیت المقدس کو تعمیر کیا اور یہ بھی جائز ہے کہ ملائکہ نے ہی بیت اللہ کو بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے اذن سے اسے بنایا ہو، یہ سب احتمالات ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو زمین میں گھر بنانے کا حکم ارشاد فرمایا اور یہ کہ وہ اس کا طواف کریں اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے تھا، پھر حضرت آدم علیہ السلام نے اسے ہی بنایا جو پہلے بنایا جا چکا تھا اور اس کا طواف کیا، پھر ان کے بعد دیگر انبیاء علیہم السلام نے بھی، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بناوٹ کو مکمل کیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ یہ اِنَّ کی خبر ہے اور اس میں لام برائے تاکید ہے اور بَكَّة سے مراد وہ خاص جگہ ہے جہاں بیت اللہ شریف ہے اور مکہ تو سارا شہر ہے، یہ حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

اور محمد بن شہاب نے کہا ہے کہ بَكَّة سے مراد مسجد ہے اور مکہ سے مراد سارا حرم ہے، اس میں گھر داخل ہوتے ہیں۔ اور مجاہد

نے کہا ہے: بکۃ سے مراد مکہ ہی ہے۔ پس اس میں میم کو با سے بدل دیا گیا ہے۔ جیسا کہ عربوں نے کہا ہے: طین لازب و لازم، حضرت ضحاک اور مورج نے یہی کہا ہے۔

پھر یہ کہا گیا ہے کہ بکۃ، البلث سے مشتق ہے اور اس کا معنی از دحام اور بھیڑ ہے۔ جب لوگ اکٹھے ہو جائیں تو کہا جاتا ہے تباک القوم۔ طواف کی جگہ لوگوں کی بھیڑ اور اژدحام ہونے کی وجہ سے اس کا نام بکہ رکھا گیا ہے۔ اور البلث کا معنی ہے دق العنق۔ گردن توڑنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام بکہ اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ بڑے بڑے جابروں کی گردنیں توڑ دیتا ہے جب وہ اس میں ظلم وزیادتی کی طرف مائل ہوں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب بھی کسی جابر نے برائی کی نیت سے اس کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے پاش پاش کر دیا۔ اور رہا مکہ! تو کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام پانی کی قلت کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے ہے کیونکہ اس کا قصد کر کے آنے والا اتنی مشقت پاتا ہے جو اس کی ہڈیوں سے گودا اور مغز کو خشک کر دیتی ہے، یہ معنی ان کے اس قول سے ماخوذ ہے: مککت العظم اذا اخرجت ما فیہ۔ یعنی ہڈیوں میں جو کچھ ہے تو وہ سب نکال لے تب کہے گا مککتُ العظم (میں نے ہڈی کو خالی کر لیا) اور مَكَّ الفصیلُ ضرع امہ و امتکہ جب بچھڑا کھیری میں موجود سارا دودھ چوس لے اور اسے پی لے تب یہ کہا جاتا ہے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

مَكَّت فلم تُبقِ فی اجوافھا دِرَرًا

انہوں نے دودھ چوسا اور ان میں کوئی دودھ نہ چھوڑا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ اسے ہلاک اور تباہ کر دیتا ہے جو اس میں ظلم وزیادتی کرے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے ہے کیونکہ لوگ اس میں تمسخر کرتے تھے اور ہنستے تھے اور یہ معنی اس ارشاد باری تعالیٰ سے لیا گیا ہے: وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً۔ یعنی وہ اس میں تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ اور یہ اس کے منصرف ہونے کو ثابت نہیں کرتا، کیونکہ مکۃ دو حرفی مضاعف ہے۔ اور مُکاء سہ حرفی معتل ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مُبٰرَكًا اسے مبارک بنایا کیونکہ اس میں عمل کو کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے اور برکت کا معنی کثرۃ الخیر ہے۔ اور یہ لفظ وُضِعَ کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یا بکۃ سے ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور معنی یہ ہے: الذی استقر ببکۃ مُبارکًا (یعنی وہ جو مکہ میں قیام پذیر رہا جس میں برکت رکھ دی گئی۔)

اور غیر قرآن میں مبارکٌ پڑھنا بھی جائز ہے یا تو اس لئے کہ یہ خبر ثانی ہے یا اس لئے کہ یہ الذی سے بدل ہے یا اس بنا پر کہ مبتدا مضمر ہے وَهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ یہ اس پر معطوف ہے۔ اور یہ وھو ھدًی لِلعالَمِین کے معنی میں ہوگا۔ اور غیر قرآن میں اسے مبارکٍ جر کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے اس صورت میں یہ البیت کی نعت اور صفت ہوگا۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ اسے مبتدا یا صفت ہونے کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے۔ اہل مکہ، ابن عباس، مجاہد اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے آیۃ بینۃ واحد پڑھا ہے، یعنی مقام ابراہیم واحد اور ایک ہے۔ انہوں نے کہا کہ مقام

ابراہیم میں ان کے قدموں کا نشان ایک واضح اور ظاہر علامت ہے۔ اور حضرت مجاہد نے مقام ابراہیم کی تفسیر پورے حرم سے کی ہے۔ اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس کی آیات اور نشانیوں میں سے صفا اور مروہ، رکن اور مقام ابراہیم ہیں۔

اور باقیوں نے اسے جمع کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے اس سے ارادہ مقام ابراہیم، حجر اسود، حطیم، زمزم اور دیگر تمام مشاعر کا کیا ہے۔

فرمایا: ابوجعفر النحاس نے کہا ہے: جنہوں نے آیات بینات پڑھا ہے تو ان کی قرأت زیادہ واضح اور بین ہے، کیونکہ صفا اور مروہ بھی آیات و علامات میں سے ہیں۔ اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ پرندہ صحیح سالم حالت میں بیت اللہ شریف سے بلند نہیں ہو سکتا۔ اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ جب کوئی شکاری شکار کو تلاش کر رہا ہو تو جب وہ حرم پاک میں داخل ہو جائے تو وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ بارش جب رکن یمانی کی جانب ہو تو ہریالی اور شادابی یمن میں ہوتی ہے۔ اور جب رکن شامی کی جانب ہو تو شادابی شام میں ہوتی ہے۔ اور جب پورے بیت اللہ پر ہو تو شادابی سارے شہروں میں آتی ہے اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ جمرات پر جس قدر اضافہ کیا جاتا ہے وہ ایک ہی مقدار پر دکھائی دیتے ہیں۔

اور المقام ان کے اس قول سے ہے قمت مقاما اور یہ وہ جگہ جس میں کھڑا ہوا جاتا ہے اور المقام تیرے اس قول سے ہے اقمت مقاما اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور مقام میں اختلاف بھی گزر چکا ہے اور اس میں صحیح یہ ہے اور المقام مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور خبر محذوف ہے اور تقدیر کلام ہے: منها مقام ابراهیم۔ اخفش نے یہی کہا ہے اور محمد بن یزید نے بیان کیا ہے کہ مقام، آیات سے بدل ہے اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے۔ یعنی بمعنی هی مقام ابراهیم ہے۔

اور کلام عرب میں اخفش کا قول معروف ہے جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

لها متاع و أعوان غَدَون بِهِ ۔ قِتبٌ و غرب اذا ما أُفرِغ انسَحَقا

یعنی اس کا بہاؤ دور ہو گیا اور ختم ہو گیا...... اور ابوالعباس کا قول ہے۔ بے شک مقام بمعنی مقامات ہے، کیونکہ یہ مصدر ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ۔

اور شاعر نے کہا:

اِنَّ العیون التی فی طرفها مرض

یعنی فی اطرافها۔

اور اسے وہ حدیث جو اس طرح مروی ہے اور تقویت دیتی ہے۔ الحج [کله] مقام ابراهیم (کہ حج سارے کا سارا مقام ابراہیم ہے۔)

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ بھی حرم پاک کی نشانیوں میں سے ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے، کیونکہ اس کے گردونواح سے لوگوں کو لوٹ لیا جاتا تھا، لیکن اس میں کوئی جابر اور ظالم نہیں داخل ہوتا تھا، حالانکہ وہ بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اسے پامال کیا اور حرم پاک تک کسی کو نہ پہنچنے دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ

نے ارشاد فرمایا: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ (الفیل) (کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔)

اور بعض اہل معانی نے کہا ہے: آیت صورۃً تو خبر ہے حالانکہ اس میں معنی امر کا ہے، تقدیر کلام یہ ہے ومن دخلہ فأمنوہ (اور جو اس میں داخل ہو جائے تو تم اسے امن اور پناہ دے دو۔) جیسا کہ یہ قول ہے: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (یعنی نہ تم برائی کی باتیں کرو اور نہ فسق کا ارتکاب کرو اور نہ ہی آپس میں جھگڑا فساد کرو۔) اسی معنی کی وجہ سے امام سابق حضرت نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جس نے گناہ کا ارتکاب کیا اور اس کے سبب وہ حد کا مستحق بن گیا پھر اس نے حرم پاک میں پناہ لے لی تو اس نے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے امن اور پناہ کو واجب قرار دیا جو اس میں داخل ہو گیا اور یہی سلف کی ایک جماعت سے مروی ہے اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر افراد ہیں۔

ابن عربی نے کہا ہے (1): ''ہر وہ جس نے یہ کہا ہے وہ دو اعتبار سے وہم میں مبتلا ہوا ہے۔'' ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ آیت کو سمجھا ہی نہیں کہ یہ ماضی میں ہونے والے واقعہ کی خبر ہے اور اس سے مستقبل کے حکم کا اثبات مقصود نہیں اور دوسرا یہ ہے کہ اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ امن اور پناہ گزر چکی ہے اور یہ کہ قتل و قتال اس کے بعد اس میں واقع ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی خبر واقع نہ ہوگی بخلاف اس کے جس کی خبر دی گئی ہے، پس یہ بھی اس پر دلیل ہے کہ یہ ماضی میں ہو چکا ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مناقضہ کیا اور فرمایا: جب وہ حرم میں پناہ لے لے تو اسے نہ کھلایا جائے گا اور نہ پلایا جائے گا، نہ اس کے ساتھ کوئی معاملہ کیا جائے گا اور نہ ہی کلام اس سے کی جائے گی یہاں تک کہ وہ باہر نکل آئے، پس اسے نکلنے پر مجبور کرنا اس کے ساتھ اس کا امن میں ہونا اور محفوظ ہونا صحیح نہ ہوگا۔ اور آپ ہی سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: حرم پاک میں اعضاء میں قصاص واقع ہو سکتا ہے حالانکہ اس کے ساتھ بھی امن صحیح نہیں ہے اور جمہور علماء نے کہا ہے کہ حرم پاک میں حدود قائم کی جا سکتی ہیں، تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن خطل کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا حالانکہ وہ غلاف کعبہ کے ساتھ چمٹا پڑا تھا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ثوری نے منصور سے، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: جس کسی نے حرم میں حد کا ارتکاب کیا تو اس پر حرم میں حد قائم کی جائے گی اور اگر حل میں اس کا ارتکاب کیا اور پھر حرم میں پناہ لے لی تو اس سے نہ کلام کی جائے اور نہ خرید و فروخت کی جائے یہاں تک کہ وہ حرم پاک سے نکل آئے تو پھر اس پر حد قائم کی جائے گی اور یہی امام شعبی کا قول ہے اور یہی کوفیوں کی حجت اور دلیل ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آیت کے معنی سے یہی سمجھے ہیں اور وہ حبر الامۃ اور عالم الامۃ ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ اس سے ہر اس پر نعمتوں کے شمار کرنے کا ارادہ اور قصد کیا گیا ہے جو ان سے جاہل اور ناواقف ہے اور عرب میں اس کے منکر بھی تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (العنکبوت: 67) (کیا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 284

انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنا دیا ہے حرم کو امن والا حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو ان کے آس پاس سے۔)

پس وہ دور جاہلیت میں تھے جو کوئی اس میں داخل ہوتا اور اس میں پناہ لے لیتا تو وہ قتل و غارت سے امن میں ہو جاتا، جیسا کہ اس کا بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: جو کوئی دور جاہلیت میں اس میں داخل ہوا وہ امن پانے والا اور محفوظ ہو گیا ...... اور یہ حسن اور اچھا ہے(1)۔

اور روایت ہے کہ کسی ملحد نے بعض علماء کو کہا: کیا قرآن کریم میں نہیں ہے وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا پس ہم اس میں داخل ہوئے اور ہم نے اس اس طرح کیا اور جو کوئی اس میں تھا وہ محفوظ نہیں ہوا۔ تو انہوں نے انہیں کہا: کیا تو عربوں میں سے نہیں ہے! جو کوئی یہ کہتا ہے من دخل داری کان امنا (جو کوئی میرے گھر میں داخل ہو گیا وہ محفوظ ہو گیا) وہ اس سے کیا مراد لیتا ہے؟ کیا یہ اسی طرح نہیں کہ کوئی اپنی اطاعت اور پیروی کرنے والے کو کہے: کف عنه فقد أمنته و كففت عنه؟ (تو اس سے رک جا تحقیق میں نے اسے پناہ دے رکھی ہے اور تو اس سے رک جائے؟ اس نے کہا: ہاں کیوں نہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: پس اسی طرح یہ قول ہے۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔

اور یحییٰ بن جعدہ نے کہا ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا کا معنی ہے یعنی وہ آگ (کے عذاب) سے محفوظ ہو گیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں یہ اپنے عموم پر نہیں ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث شفاعت منقول ہے: "قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی بھی قیامت کے دن حق کی بحث میں مومنین سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کو قسم دلانے والا نہ ہو گا جو کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے ان بھائیوں کے لئے اصرار کر رہے ہوں جو کہ جہنم میں ہوں گے اے ہمارے رب! وہ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج ادا کرتے تھے، تو انہیں کہا جائے گا: اسے نکال لو جسے تم پہچانتے ہوں" الحدیث (2)۔ بلاشبہ وہ آگ سے محفوظ ہو جائے گا جو مناسک ادا کرنے کے لئے اس میں داخل ہوا اس کی تعظیم کرتے ہوئے، اس کے حق کو پہچانتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے۔

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: جو کوئی پورے اخلاص اور صفائے باطن کے ساتھ اس میں داخل ہوا جیسا کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام اس میں داخل ہوئے تو یقیناً وہ اس کے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا یہی معنی ہے: "جس نے حج کیا اور برائی کے بارے کوئی گفتگو نہ کی اور نہ ہی فسق کا مرتکب ہوا تو وہ اپنے گناہوں سے اسی طرح پاک ہو گیا جیسے اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا اور حج مبرور کی جزا سوائے جنت کے اور کوئی نہیں۔"

حسن نے بیان کیا ہے: حج مبرور یہ ہے کہ وہ دنیا سے دوری اختیار کرتے ہوئے اور آخرت میں رغبت رکھتے ہوئے واپس لوٹے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 601

2۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور یہ اشعار بھی کہے:

یا کعبة الله دعوة اللاجی　دعوة مستشعر و محتاج

اے کعبہ معظمہ! جو اللہ تعالیٰ کا گھر ہے پناہ لینے والے کے لئے دعا ہے اور شعار پہننے والے اور محتاج کے لئے جائے دعا ہے۔

ودّع احبابه و مسکنه　فجاء ما بین خائف راجی

اپنے احباب اور اپنے مکینوں کو الوداع کہہ پس (ہر کوئی) بیم و رجا کی کیفیت لئے ہوئے آیا۔

ان یقبل الله سعیه کرما　نجاء والا فلیس بالناجی

اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کے ساتھ اس کی سعی قبول فرمائی تو وہ نجات پا گیا ورنہ کوئی نجات پانے والا نہیں۔

وانت ممن تُرجی شفاعتُه　فاعطف علی وافد بن حجاج

اور تو ان میں سے ہے جن کی شفاعت کی امید رکھی جاتی ہے پس تو وافد بن حجاج پر مہربانی فرما۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ جو کوئی عمرہ قضا کے سال حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں اس میں داخل ہوا وہ امان میں آ گیا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں مَنْ غیر ذوی العقول کے لئے ہے اور یہ آیت شکار کے امان میں ہونے کے بارے ہے اور یہ شاذ ہے اور قرآن کریم میں ہے: فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ الآیہ۔

قولہ تعالیٰ: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلِلّٰهِ اس میں لام ایجاب والزام کے لئے ہے پھر اسے ارشاد باری تعالیٰ: عَلَى کے ساتھ مؤکد کیا، یہ عربوں کے نزدیک الفاظ وجوب کی تاکید لگانے والے حروف میں سے ہے۔ پس جب کوئی عربی یہ کہے: لفلان علی کذا، تو تحقیق اس نے اسے مؤکد کر دیا اور اپنے اوپر واجب کر لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بلیغ ترین الفاظ وجوب کے ساتھ حج کا ذکر کیا اپنے حق کی تاکید لگاتے ہوئے اور اس کی حرمت کی تعظیم کرتے ہوئے۔ اور اس کے فرض ہونے میں کوئی اختلاف نہیں اور یہ ارکان اسلام میں سے ایک ہے اور یہ ساری عمر میں صرف ایک بار واجب ہوتا ہے۔

اور بعض لوگوں نے کہا ہے: یہ ہر پانچ سال میں ایک بار واجب ہوتا ہے اور انہوں نے اس بارے میں حدیث بیان کی ہے اور اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے اور وہ حدیث باطل ہے، صحیح نہیں ہے اور ان کی وجوہ (اور دلائل) میں اجماع مدافعت کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں حضرت سفیان ثوری نے علاء بن مسیب سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''رب کریم فرماتا ہے بلاشبہ میں نے اپنے بندے کو وسیع اور وافر رزق عطا فرمایا ہے اور اس نے ہر چار سال میں میری طرف محروم کے لئے کوئی

شے نہیں لوٹائی۔'' یہ علاء بن مسیب بن رافع کاہلی کوفی کی مشہور حدیث ہے اور آپ محدثین کی اولاد میں سے ہیں، اور ان سے کئی ایک نے روایت کیا ہے، ان میں سے بعض نے پانچ سال کا ذکر کیا ہے اور بعض نے سند اس طرح بیان کی ہے۔ عن العلاء عن یونس بن خباب عن ابی سعید، علاوہ ازیں بھی اس میں اختلاف ہے۔

اور ملاحدہ نے حج کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: چونکہ اس میں کپڑے اتار دیئے جاتے ہیں اور یہ حیاء کے خلاف ہے اور سعی کرنا ہے اور یہ وقار کو ختم کر دیتی ہے اور بلا مقصد کنکریاں مارنا یہ خلاف عقل ہے، پس انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حج کے یہ تمام افعال باطل ہیں، کیونکہ وہ ان کی حکمت اور علت کو نہیں پہچان سکے اور وہ اس سے جاہل ہیں کہ مولیٰ کی اپنے بندے کے ساتھ یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اسے ان تمام افعال کا مقصود اور مدعیٰ بھی سمجھائے گا جس کا وہ اسے حکم دے گا اور نہ ہی یہ شرط ہے کہ بندہ ہر اس فعل کے فائدہ سے آگاہ ہو جس کا وہ مکلف ہے، بلکہ اس پر تو اطاعت کرنا متعین ہو جاتا ہے اور فائدہ کا مطالبہ اور مقصود کے بارے سوال کئے بغیر پیروی کرنا لازم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تلبیہ میں یہ الفاظ کہتے تھے لبیك حقا حقا تعبدا و رقا لبیك الہ الحق۔ (1)

اور ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: ایها الناس قد فرض الله علیکم الحج فحجوا (اے لوگو! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے پس تم حج کرو) تو ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہر سال؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، یہاں تک کہ اس نے تین بار یہ سوال کیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لو قلت نعم لوجبت و لما استطعتم (اگر میں کہہ دیتا ہاں تو یقیناً وہ (ہر سال) واجب ہو جاتا اور پھر تم اس کی استطاعت نہ رکھتے) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم مجھے اس (شے) کے بارے چھوڑ دو جو میں تمہارے لئے چھوڑ دوں کیونکہ تم سے پہلے لوگ کثرت سے سوال کرنے اور اپنے انبیاء علیہم السلام سے اختلاف رکھنے کے سبب ہی ہلاک اور برباد ہوئے ہیں۔ پس جب میں تمہیں کسی شے کے بارے میں حکم دوں تو تم اسے بجالاؤ جتنی تم استطاعت رکھتے ہو اور جب میں تمہیں کسی شے سے منع کر دوں تو تم اسے چھوڑ دو۔'' یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ اس حدیث نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ جب خطاب مکلفین پر کسی شے کی فرضیت کے بارے ان کی طرف متوجہ ہو تو اسے ایک بار کرنا ہی کافی ہوتا ہے اور وہ تکرار کا تقاضا نہیں کرتا۔ الاستاذ ابو اسحاق الاسفرائینی وغیرہ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اور یہ ثابت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے اصحاب نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہمارا حج ہمارے اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں بلکہ یہ ہمیشہ کے لئے ہے۔'' اور یہ ان کے رد کے بارے میں نص ہے جنہوں نے یہ کہا ہے۔ (حج) ہر پانچ سال میں ایک بار واجب ہوتا ہے، حالانکہ حج عربوں کے نزدیک معلوم اور ان میں مشہور تھا اور یہ ان اعمال میں سے تھا جن میں وہ اپنی منڈیوں، اپنی طاعت و فرمانبرداری اور اپنے دین ابراہیمی پر قائم رہنے میں رغبت اور دلچسپی رکھتے تھے۔ پس جب دین اسلام آیا تو انہیں اس کے بارے خطاب کیا گیا جسے وہ جانتے تھے اور وہ شے ان پر لازم کی گئی

1۔ ابن ماجہ، کتاب التلبیہ، حدیث نمبر 2910، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جسے وہ پہچانتے تھے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرض حج سے پہلے حج ادا فرمایا (1) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرفات میں وقوف کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت اور دین میں کوئی تبدیلی نہ کی جسے انہوں نے تبدیل کر لیا تھا، جس وقت قریش مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے اور کہتے تھے: ہم اہل حرم ہیں ہم اس سے نہیں نکلیں گے اور ہم مذہب میں بڑے سخت ہیں، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: جو میں جانتا ہوں اس میں عجیب ترین یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت سے پہلے دو بار حج ادا فرمایا اور آپ سے اس کے سبب فرض ساقط ہو گیا، کیونکہ آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ندا پر لبیک کہی جب انہیں یہ کہا گیا: وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ (آپ لوگوں میں حج کے بارے اعلان کر دیں۔)

الکیا الطبری نے کہا ہے: یہ بعید ہے، کیونکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت میں یہ موجود ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ پس آپ کی شریعت میں حکم خطاب کے ساتھ آپ پر اس کا واجب ہونا ضروری ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے خطاب انہیں کیا ہے جنہوں نے حج ادا نہیں کیا، یہ ایسا فیصلہ اور تخصیص ہے جس پر کوئی دلیل نہیں۔ اور اس پر یہ لازم آتا ہے کہ اس خطاب کے ساتھ اس پر حج واجب نہ ہو جس نے دین ابراہیمی کے مطابق حج کر لیا اور یہ حقیقت سے انتہائی بعید ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ کتاب وسنت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حج کی ادائیگی علی التراخی واجب ہوتی ہے نہ کہ علی الفور، یہی حضرت امام مالک کا مذہب ہے جو ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے اور یہی امام شافعی اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہما کا قول ہے اور امام ابو یوسف سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے اور متاخرین مالکیہ میں سے بعض اہل بغداد نے یہ کہا ہے کہ اس کی ادائیگی علی الفور واجب ہوتی ہے اور اس پر قدرت رکھتے ہوئے اس میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے اور یہی داؤد کا قول ہے۔ اور صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ سورہ حج میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا (الحج: 27) (اور اعلان عام کر دو لوگوں میں حج کا وہ آئیں گے آپ کے پاس پا پیادہ) اور سورہ حج مکیہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ الآیہ۔ اور یہ سورۃ غزوہ احد کے سال ۳ھ میں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۱۲ھ تک حج ادا نہیں فرمایا۔

رہی سنت! تو ضمام بن ثعلبہ سعدی کی حدیث ہے جو کہ بنی سعد بن بکر سے تھے وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ سے اسلام کے بارے سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کلمہ شہادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کا ذکر فرمایا۔ اسے حضرت ابن عباس (2)، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور ان تمام میں حج کا ذکر ہے اور یہ کہ وہ فرض قرار دیا گیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث اپنے سیاق کے اعتبار سے احسن اور اتم ہے۔ اور اس کے فرض ہونے کے وقت میں اختلاف ہے، سو بعض نے کہا ہے ۵ھ، بعض نے کہا ہے ۷ھ اور بعض نے کہا ہے اس کا وقت ۹ھ ہے اور ابن ہشام

1۔ ابن ماجہ، باب حجۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حدیث نمبر 3066، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب ما جاء فی العلم و قولہ تعالیٰ قل رب زدنی علما، حدیث نمبر 61، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے ابوعبیدہ الواقدی سے جنگ احزاب سے واپسی کے بعد غزوۂ خندق کا سال ذکر کیا ہے۔

ابن عبدالبر نے بیان کیا ہے: اس بات پر دلیل کہ حج کی ادائیگی علی التراخی واجب ہے اس پر اجماع علماء ہے کہ حج پر قدرت رکھنے والا فاسق نہیں جبکہ وہ اسے ایک یا دو سال یا اسی طرح کی کچھ مدت موخر کردے اور یہ کہ جب استطاعت رکھنے کے کئی سال بعد جب اس نے حج ادا کر دیا تو تحقیق اس نے وہ حج اپنے وقت میں ہی ادا کیا، اور تمام کے نزدیک وہ اس آدمی کی طرح نہیں جس کی نماز فوت ہوجائے یہاں تک کہ اس کا وقت نکل گیا اور پھر وقت نکلنے کے بعد وہ اسے قضا کرے اور نہ اس کی طرح ہے جس کے بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے فوت ہوجائیں اور پھر وہ اس کی قضا کرے اور نہ اس کی طرح جس نے اپنا حج فاسد کر دیا ہو اور پھر وہ اس کی قضا کرے، پس جب علماء نے اس پر اجماع کر لیا کہ جس نے اپنی استطاعت کے وقت سے کئی سال بعد حج کیا اسے یہ نہیں کہا جائے گا: تو اسے قضا کرنے والا ہے جو تجھ پر واجب تھا، تو ہم نے یقینا جان لیا کہ حج کے وقت میں وسعت رکھی گئی ہے اور یہ کہ یہ علی التراخی واجب ہوتا ہے نہ کہ علی الفور...... ابوعمر نے کہا ہے: جس نے بھی بالتراخی کا قول کیا ہے وہ اس بارے میں کوئی حد بیان نہیں کرتا، مگر صرف یہ کہ سحنون سے روایت ہے کہ ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اتنی استطاعت پاتا ہے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہے اور پھر وہ اس پر قدرت رکھنے کے باوجود بہت سے سالوں تک اسے مؤخر کر دیتا ہے کیا حج میں اس تاخیر کے سبب اسے فاسق کہا جائے گا اور اس کی شہادت رد کر دی جائے گی؟ تو انہوں نے فرمایا: نہیں اگرچہ اس کی عمر کے ساٹھ سال گزر جائیں، البتہ جب اس کی عمر ساٹھ برس سے تجاوز کر جائے گی تو اسے فاسق قرار دیا جائے گا اور اس کی شہادت رد کر دی جائے گی۔ یہ توقیف اور حد ہے اور شرع میں حدود صرف اسی سے اخذ کی جاتی ہیں جسے ان کی وضاحت کا اختیار ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اسے ابن خویز منداد نے ابن قاسم سے بیان کیا ہے، ابن قاسم وغیرہ نے کہا ہے: اگر اس نے حج کو ساٹھ برس کی عمر تک مؤخر کیا تو وہ گنہگار نہ ہوگا اور اگر اسے ساٹھ سال کی عمر کے بعد بھی مؤخر کیا تو اسے گنہگار قرار دیا جائے گا، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا(1): ''میری امت کی عمریں ساٹھ سے ستر برس کے درمیان ہیں اور وہ کم ہیں جو اس سے تجاوز کریں گے۔'' تو گویا اس عشرے میں اس پر خطاب تنگ ہو جاتا ہے۔

ابوعمر نے کہا ہے: بعض لوگوں (جیسا کہ سحنون وغیرہ) نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: معترك امتي بين الستين الى السبعين و قل من يجاوز ذالك (میری امت کی عمریں ساٹھ برس سے ستر برس تک کے درمیان ہیں اور وہ قلیل ہیں جو اس سے تجاوز کریں گے) اور اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ ایسا کلام ہے جو آپ نے اپنی امت کی اغلب عمروں کے بارے میں بیان فرمایا ہے، اگر حدیث صحیح ہے اور اس میں ستر برس تک توسیع پر دلیل موجود ہے، کیونکہ اغلباً ایسا ہی ہے اور یہ مناسب نہیں ہے اس جیسی کمزور تاویل کے ساتھ اس کو بالیقین فاسق قرار دیا جائے جس کی عدالت و امانت بالکل صحیح ہو۔ و باللہ التوفیق۔

1۔ ابن ماجہ، باب العمل والاجل، حدیث نمبر 4225، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، روایۃ بالمعنی

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ کے ساتھ خطاب عام ہے اور اس کا اطلاق تمام پر ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: ''اگرچہ لوگوں نے مطلق عمومات میں اختلاف کیا ہے مگر انہوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ یہ آیت تمام لوگوں مردوں اور عورتوں پر محمول ہے، سوائے صغیر (نابالغ) بچوں کے کیونکہ وہ بالا جماع اصول تکلیف سے خارج ہیں اور اسی طرح غلام بھی اس میں داخل نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے انہیں مطلق عموم سے خارج کر دیا ہے مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا اور غلام قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ آقا اسے اس عبادت سے اپنے حقوق کی وجہ سے روکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حق پر آقا کے حق کو بندوں کے ساتھ نرمی اور ان کی مصلحت کے لئے مقدم کیا ہے اور اس میں امت اور ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، پس ہم اس کے ساتھ تعریف نہیں کریں گے جسے ہم جانتے نہیں اور اس پر اجماع کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔''

ابن منذر نے کہا ہے: عام اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے سوائے ان کے جو ان سے جدا اور الگ رہے اور وہ ان میں سے ہیں جن کے اختلاف کی کوئی قدر و منزلت نہیں، کہ بچہ جب اپنی حالت صغر میں حج کرے اور غلام جب اپنی غلامی کی حالت میں حج کرے، پھر وہ بچہ بالغ ہو جائے اور غلام آزاد ہو جائے تو بلاشبہ ان دونوں پر حج اسلام فرض ہو گا جب وہ اس کی قدرت اور استطاعت پالیں گے۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: داؤد نے فقہاء امصار، ائمہ اثر کی غلام کے بارے میں مخالفت کی ہے اور وہ یہ کہ ان کے نزدیک وہ حج کا مخاطب ہے اور وہ جمہور علماء کے نزدیک عام خطاب سے خارج ہے جو اس ارشاد میں ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا اور اس میں دلیل اس میں تصرف کی قدرت نہ ہونا ہے (1)۔ اور یہ بھی کہ غلام کے لئے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر حج کرنا جائز نہیں ہوتا، جیسا کہ وہ جمعہ کے خطاب سے خارج ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ الآیہ (جمعہ: 9)۔ سوائے چند کے، عام علماء کے نزدیک یہی حکم ہے اور اسی طرح وہ ایجاب شہادت کے خطاب سے خارج ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا (البقرہ: 282) (اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ بلائیں جائیں۔) پس اس میں بھی غلام داخل نہیں اور جس طرح بچے کا نکلنا اس قول سے جائز ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ حالانکہ وہ بھی النَّاسِ میں سے ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بچے سے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔ اور عورت اس ارشاد سے خارج ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ حالانکہ یہ ان میں سے ہے جنہیں اسم ایمان شامل ہے اور اسی طرح مذکورہ خطاب سے غلام بھی خارج ہے اور یہ حجاز، عراق، شام اور افریقہ کے فقہاء کا قول ہے اور ان کی مثل سے ان پر تاویل کتاب کی تحریف جائز نہیں۔

اور اگر کہا جائے: جب غلام مسجد حرام میں حاضر ہو اور اس کا آقا اسے اجازت بھی دے دے تو پھر حج کیونکر لازم نہ ہو گا؟ تو جواباً یہ کہا جائے گا کہ یہ سوال اجماع پر ہے اور بسا اوقات وہ اس کی علت بیان نہیں کرتا، لیکن جب یہ حکم علی الا جماع ثابت

1۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2030، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے تو ہم نے اس کے ساتھ اس پر استدلال کیا کہ غلامی کی حالت میں اس کے حج کو حج اسلام شمار نہ کیا جائے گا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی بچے نے حج کیا پھر اس نے حج کی استطاعت پالی تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے اور جس کسی اعرابی نے حج کیا پھر اس نے ہجرت کی تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے اور جس کسی غلام نے حج کیا پھر اسے آزاد کر دیا گیا تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے۔'' ابن عربی نے کہا ہے: ''ہمارے بعض علماء نے نرمی سے کام لیا ہے اور کہا ہے: بلاشبہ غلام پر حج ثابت (لازم) نہیں اگرچہ آقا اسے اجازت دے دے کیونکہ وہ فی الاصل کافر تھا اور کافر کا حج کسی شمار میں نہیں اور پھر جب اس پر غلامی کی ضرب ہمیشہ کے لئے لگا دی گئی تو وہ حکم حج کا مخاطب ہی نہ رہا۔

یہ تین وجوہ سے فاسد ہے پس تم انہیں جان لو:

(۱) بلاشبہ ہمارے نزدیک کفار فروعات شرعیہ کے مخاطب ہیں اور اس بارے میں امام مالک کے قول میں کوئی اختلاف نہیں۔

(۲) تمام عبادات نماز، روزہ وغیرہ اس پر لازم ہوتی ہیں اس کے باوجود کہ وہ غلام ہے اور اگر وہ یہی فعل اپنی حالت کفر میں کرے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ حج بھی انہیں کی مثل ہے۔

(۳) یہ کہ کفر اسلام کے سبب ختم ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی اس کے حکم کا ختم ہونا بھی ثابت ہے۔ پس یہ واضح ہو گیا کہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس میں معتمد علیہ آقا کے حقوق کا مقدم ہونا ہے۔ واللہ الموفق۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا اس میں مِنْ بدل بعض من الکل ہونے کی بنا پر محل جر میں ہے، یہ اکثر نحویوں کا قول ہے۔

اور کسائی نے یہ اجازت بھی دی ہے کہ من حج البیت کے سبب محل رفع میں ہو اور تقدیر کلام یہ ہو ان یحج البیت من۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شرط ہے اور استطاع محل جزم میں ہے اور جواب شرط محذوف ہے یعنی من استطاع الیہ سبیلا فعلیہ الحج۔

دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا عرض کی گئی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا حج ہر سال فرض ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں بلکہ صرف ایک بار حج کرنا فرض ہے۔'' پھر عرض کی گئی! یہ سبیل کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زادراہ اور سواری'' اور انہوں نے اسے حضرت انس، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، حضرت جابر، حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہم سے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا بیان فرمایا کہ اس کے بارے پوچھا گیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اونٹ کی پشت پالے''

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کو ابن ماجہ نے بھی اپنی سنن میں نقل کیا ہے اور امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ اپنی جامع میں ذکر کی ہے اور کہا ہے: حدیث حسن۔ یہ حدیث حسن ہے۔ اور اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے کہ آدمی جب زاد

راہ اور سواری کا مالک ہو تو اس پر حج واجب ہے۔ اور ابراہیم بن یزید خوزی مکی کی قوت حفظ کے بارے میں بعض اہل حدیث نے کلام کیا ہے(1) اور ان دونوں نے اسے وکیع سے اور دار قطنی نے سفیان بن سعید سے اسے نقل کیا ہے...... اور انہوں نے کہا کہ ابراہیم بن یزید نے محمد بن عباد سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں کھڑا ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون سی شے حج کو واجب کر دیتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''زاد راہ اور سواری پر قدرت'' عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاجی کون ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: غبار آلود بالوں والا جس نے خوشبو کا استعمال ترک کر دیا ہو۔'' اور پھر ایک دوسرا کھڑا ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: العَجّ والثَّجّ۔ وکیع نے کہا ہے: عج سے مراد بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے اور ثج سے مراد قربانی کا جانور ذبح کرنا ہے، یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ زاد راہ اور سواری پر قادر ہونا حج واجب ہونے کے لئے شرط ہے ان میں حضرت عمر بن خطاب اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت حسن بصری، حضرت سعید بن جبیر، حضرت عطا، اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور یہی موقف حضرت امام شافعی، حضرت ثوری، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق، حضرت عبدالعزیز بن ابی سلمہ اور حضرت ابن حبیب رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اپنایا ہے اور اسی کی مثل عبدوس نے سحنون سے ذکر کیا ہے۔

امام شافعی نے کہا ہے: استطاعت کی دو صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے بدن کے ساتھ قدرت رکھتا ہو اور وہ اتنا مال پاتا ہو جو اسے حج کے لئے پہنچا سکے گا۔ اور دوسری یہ ہے کہ وہ اپنے بدن میں کمزور ہو وہ اپنی سواری پر ثابت نہ رہ سکتا ہو اور وہ ایسے آدمی پر قادر ہو جو اس کی اطاعت و پیروی کرتا ہو (اس میں کہ) جب وہ اسے حکم دے کہ وہ اس کی جانب سے اجرت کے ساتھ اور بغیر اجرت کے حج کرے۔ (یعنی اپنی جانب سے کسی دوسرے کو حج پر بھیج سکتا ہو)

جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ رہا وہ جو اپنے بدن کے ساتھ استطاعت اور قدرت رکھتا ہے تو اس پر کتاب اللہ کے اس ارشاد کے ساتھ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا حج فرض لازم ہوتا ہے اور جو استطاعت بالمال رکھتا ہے تو اس پر سنت کے مطابق حج فرض لازم ہوتا ہے جیسا کہ حدیث خثعمیہ آگے آرہی ہے۔

اور مستطیع بنفسہ سے مراد وہ قوی اور طاقتور آدمی ہے جسے سواری پر سوار ہونے کی مشقت کے بغیر کوئی مشقت لاحق نہ ہو، کیونکہ یہ آدمی جب زاد راہ اور سواری کا مالک ہو تو اس کی ذات پر فرض حج لازم ہو جاتا ہے اور بلاشبہ زاد راہ اور سواری دونوں کے نہ ہونے یا ان میں سے ایک کے نہ ہونے کی صورت میں اس سے حج کا فرض ساقط ہو جاتا ہے، پس اگر وہ پیدل چلنے پر قادر ہو تو وہ زاد راہ پالے یا راستے میں زاد راہ کمانے پر قادر ہو اپنے کاروبار اور پیشہ سے مثلاً نگینے اور مکے بیچنا اور حجامۃ (پچھ لگانا) یا اسی طرح کا کوئی کام، تو اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ پیدل حج کرے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ امام شافعی نے کہا ہے: مرد عورت کے مقابلہ میں کم معذور ہوتا ہے کیونکہ وہ زیادہ قوی اور طاقتور ہوتا ہے اور یہ حکم ان کے نزدیک بطریق

1۔ ابن ماجہ، باب مایوجب الحج، حدیث نمبر 2886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

استحباب ہے نہ کہ بطریق وجوب پس اگر وہ راستے میں لوگوں سے مانگنے کے سبب زادراہ پر قادر ہو تو اس کے لئے حج کرنا مکروہ ہے کیونکہ وہ لوگوں پر بوجھ اور بھاری ہو جائے گا۔

اور امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب وہ چلنے پر قادر ہو اور زادراہ پالے تو اس پر حج کرنا فرض ہے اور اگر وہ سواری کا مالک نہ ہو، البتہ وہ راستے میں چلنے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے بارے غور و فکر کی جائے گی اور اگر وہ زادراہ کا مالک ہو تو اس پر فرض حج کی ادائیگی واجب ہے اور اگر وہ زادراہ کا مالک نہ ہو لیکن وہ راستے میں اپنی حاجت کے مطابق کمانے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے بارے بھی غور و فکر کی جائے گی اور اگر وہ ایسے اہل مروّت میں سے ہو جو بذات خود کمائی نہیں کر سکتے تو اس پر واجب نہ ہوگا اور اگر وہ ان میں سے ہو جو تجارت یا کسی کاروبار کے ذریعہ اپنی کفایت اور ضرورت پوری کر سکتا ہے تو اس پر فرض حج لازم ہے اور اسی طرح اگر اس کی عادت لوگوں سے سوال کرنا اور مانگنا ہو تو اس پر بھی فرض حج لازم ہے۔

اور اسی طرح امام مالک نے چلنے کی طاقت رکھنے والے پر حج کو واجب کیا ہے، اگرچہ اس کے ساتھ زادراہ اور سواری نہ بھی ہو۔ اور یہی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، شعبی اور عکرمہ کا قول ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: اگر وہ جوان، طاقتور اور صحت مند ہو اور اس کا مال نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے کھانے کے عوض اپنے آپ کو اجرت پر دے دے یا اپنے کسی بیٹے کو یہاں تک کہ وہ اپنا حج پورا کر لے۔

تو حضرت مقاتل نے انہیں ': کیا اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس کا مکلف بنایا ہے کہ وہ بیت اللہ شریف کی طرف پیدل چل کر آئیں؟ تو انہوں نے فرمایا: اگر ان میں سے کسی کی مکہ مکرمہ میں میراث ہو کیا وہ اسے چھوڑ دے گا؟ بلکہ وہ تو اس کی طرف چلے گا اگرچہ سرین کے بل گھسٹ کر ہی آنا پڑے، اسی طرح اس پر حج بھی واجب ہوگا۔ اور انہوں نے اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا اس میں رِجَالًا بمعنی مشاۃً ہے یعنی پیدل چلتے ہوئے۔

انہوں نے کہا ہے: کیونکہ فرائض اعیان میں سے حج عبادات بدنیہ میں سے ہے، لہٰذا یہ واجب ہے کہ اس کے واجب ہونے کی شرائط میں سے نہ زادراہ ہو اور نہ ہی سواری ہو جیسا کہ نماز اور روزہ وغیرہ۔

انہوں نے کہا: اگر زادراہ اور سواری کے بارے خوزی کی حدیث صحیح ہے تو ہم نے اسے عوام الناس پر محمول کیا ہے اور ان میں سے اکثر دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے ہیں..... اور مطلق کلام کو غالب احوال پر محمول کرنا شریعت میں بہت زیادہ ہے اور کلام عرب اور اس کے اشعار میں وافر ہے۔

ابن وہب، ابن القاسم اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اس میں لوگ اپنی طاقت اپنی سہولت اور اپنی مضبوطی کی مقدار پر ہیں۔ اشہب نے مالک کو کہا: کیا وہ زادراہ اور سواری ہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں قسم بخدا، وہ نہیں ہے مگر لوگوں کی طاقت کی مقدار پر، کبھی آدمی زادراہ اور سواری پاتا ہے لیکن وہ چلنے پر قدرت نہیں رکھتا اور دوسرا پیدل چلنے کی قدرت رکھتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ جب استطاعت پائی جائے اور حج کا فرض متوجہ ہو تو کبھی ایسا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے جو حج سے روک

دیتا ہے، مثلاً قرض خواہ اسے نکلنے سے روک دے یہاں تک کہ وہ قرض ادا کر دے۔ اور اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے یا اس کے بچے ہوں اس پر ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے تو اس پر حج لازم نہیں ہوگا یہاں تک کہ ان کے لئے اتنا نفقہ ہو جو اس کے جانے سے لے کر واپس لوٹنے تک غائب رہنے کی مدت کے لئے کافی ہو، کیونکہ اہل وعیال کا یہ خرچہ تو علی الفور فرض ہے اور حج علی التراخی فرض ہے، پس عیال کو مقدم کرنا اولیٰ ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی کے لئے اتنا گناہ ہی کافی ہے کہ وہ اسے ضائع کر دے جس کی وہ کفالت کرتا ہے۔'' اور اسی طرح والدین ہیں آدمی ان پر ہلاکت اور مصیبت لانے اور ان کی مہربانیوں اور شفقتوں کا عوض اور بدلہ نہ دینے سے خوفزدہ رہتا ہے، پس اس کے لئے حج کی طرف کوئی راستہ نہیں ہے اور اگر وہ اسے شوق ومحبت اور وحشت کی وجہ سے روک لیں تو اس کی طرف توجہ نہ کی جائے گی۔

اور عورت کو اس کا خاوند روک سکتا ہے اور بعض نے کہا ہے: وہ اسے نہیں روک سکتا۔ اور صحیح قول یہی ہے کہ روکنا جائز ہے، بالخصوص جب ہم نے یہ کہا ہے کہ حج بالفور لازم نہیں ہوتا۔ اور سمندر اس کے وجوب کے مانع نہیں ہوتا جبکہ غالب گمان سلامتی کا ہو، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور وہ اپنے بارے میں یہ جانتا ہو کہ اس کا سر نہیں چکرائے گا۔ اور اگر اس پر غالب گمان ہلاکت یا سر چکرانے کا ہو یہاں تک کہ وہ نماز بھی معطل کر دے تو پھر نہیں۔ اور اگر وہ سواروں کی کثرت اور جگہ کی تنگی کے سبب سجدہ کرنے کی جگہ نہ پائے تو امام مالک نے کہا ہے: جب وہ رکوع وسجود کی استطاعت نہ رکھے مگر اپنے بھائی کی پشت پر تو پھر وہ اس پر سوار نہ ہوگا۔ پھر کہا: کیا وہ وہاں سوار ہو سکتا ہے جہاں وہ نماز نہ پڑھ سکے؟ اس کے لئے ہلاکت اور بربادی ہے جو نماز کو ترک کر دے۔ اور حج ساقط ہو جاتا ہے جب راستے میں ایسا دشمن ہو جو جانوں کو ضائع کرنے کا سبب ہو یا اموال کو لوٹتا ہو جبکہ وہ کسی مخصوص دھمکی کے ساتھ دھمکائے یا وہ کسی برباد اور ہلاک کرنے والی مقدار کے ساتھ دھمکائے اور اگر دھمکی ہلاک وبرباد کرنے کی نہ ہو تو حج کے ساقط ہونے میں اختلاف ہے۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: وہ ایک حبہ بھی نہیں دے گا اور حج کا فرض ساقط ہو جائے گا۔ اور مانگنے والے پر حج واجب ہوتا ہے جبکہ وہ اس کی عادت ہو اور اس کا ظن غالب یہ ہو کہ وہ اسے پالے گا جو اسے عطا کرے گا۔ اور بعض نے کہا ہے: اس پر واجب نہ ہوگا، اس بنا پر کہ اس میں استطاعت کی رعایت لازم ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب موانع زائل ہو جائیں اور اس کے پاس دراہم ودنانیر میں سے ایسی کوئی شے نہ ہو جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو اور اس کے پاس سامان ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ حج کے لئے اپنے سامان میں سے وہ بیچ دے جو اس حال میں بیچا جا سکتا ہے جب اس پر دین اور قرض ہو۔ اور ابن القاسم سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس کا مشکیزہ ہو اور اس کے سوا اس کا کچھ نہ ہو، کیا وہ حج اسلام کے لئے اسے بیچ دے گا اور اپنی اولاد کو چھوڑ دے گا درآنحالیکہ ان کے لئے کوئی شے نہ ہو جس کے ساتھ وہ زندگی گزار سکتے ہوں؟ انہوں نے کہا: ہاں، وہ اس پر ہے اور وہ اپنی اولاد کو صدقہ میں چھوڑ دے گا۔ لیکن صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''آدمی کے لئے گناہ کے اعتبار سے یہی کافی ہے کہ وہ اسے ضائع کر دے جس کی وہ کفالت کرتا ہے۔'' اور یہ امام شافعی کا قول ہے۔ ان کے مذہب سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ حج لازم نہیں ہوتا مگر

اس کے لئے جس کے پاس اتنے اخراجات موجود ہوں جو جانے سے لے کر لوٹنے تک کافی ہوں۔ آپ نے یہ الاملاء میں کہا ہے: اگرچہ اس کے اہل وعیال نہ ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے: رجوع کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس پر اپنے شہر کے قیام کو ترک کرنے میں کوئی بڑی مشقت نہیں ہے، کیونکہ اس میں نہ اس کے اہل ہیں اور نہ کوئی عیال اور ہر شہر (ملک) اس کے لئے وطن ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ انسان اپنے وطن سے جدائی کے سبب اسی طرح وحشت سی محسوس کرتا ہے جس طرح وہ اپنے گھر والوں کے فراق میں مضطرب رہتا ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ باکرہ عورت جب زنا کرے تو اسے کوڑے لگائے جاتے ہیں اور اسے اس کے شہر سے جلاوطن کردیا جاتا ہے چاہے وہاں اس کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔

امام شافعی نے ''الام'' میں کہا ہے: جب آدمی کا گھر اور خادم ہو اور اس کے پاس اپنے گھر والوں کے لئے اتنا خرچہ موجود ہو جو اس کی عدم موجودگی میں ان کے لئے کافی ہوجائے تو اس پر حج لازم ہوگا۔ اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ آپ نے یہ اعتبار کیا ہے کہ حج کا مال خادم اور گھر سے فالتو اور زائد ہو، کیونکہ آپ نے اسے گھر والوں کے نفقہ پر مقدم کیا ہے، گویا کہ آپ نے کہا ہے: ان تمام کے بعد (اس کے پاس حج کا مال ہو)۔

اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: اس پر لازم ہے کہ گھر اور خادم فروخت کردے اور اپنے گھر والوں کے لئے گھر اور خادم کرائے پر لے اور اگر اس کے پاس ایسا سامان ہو جس کے ساتھ وہ تجارت کرتا ہو اور اس کا نفع علی الدوام اس کی ذاتی اور اہل وعیال کی کفایت کی مقدار ہو اور جب وہ اصل مال سے کچھ خرچ کردے تو اس کا نفع مختل ہوجائے اور وہ اس کی حاجت و ضرورت کے لئے کافی نہ رہے، تو کیا اصل مال سے اس پر حج لازم ہوگا یا نہیں؟

اس میں دو قول ہیں:

پہلا قول جمہور کا ہے اور وہی صحیح اور مشہور ہے، کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر اس کی زمین ہو اس کا غلہ اسے کافی ہو رہتا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ حج میں اصل زمین فروخت کردے، پس اسی طرح سامان بھی ہے اور ابن شریح نے کہا ہے: وہ اس پر لازم نہ ہوگا اور وہ سامان کو باقی رکھے گا اور اس کے اصل سے حج نہیں کرے گا، کیونکہ اس پر حج اس مال سے واجب ہوتا ہے جو اس کی کفایت اور حاجت سے فالتو ہو۔ پس یہ گفتگو استطاعت بالبدن والمال کے بارے میں ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ مریض اور معضوب (جس کا کوئی عضو کٹا ہوا ہو) اور العضب کا معنی کاٹنا ہوتا ہے اور اسی سے تلوار کا نام عضب رکھا گیا ہے، گویا کہ جو اس حالت کو پہنچ چکا ہو کہ وہ سواری کو نہ مضبوطی سے تھامنے کی قدرت رکھتا ہو اور نہ اس پر مضبوطی سے بیٹھ سکتا ہو تو وہ اسی کی طرح ہے جس کے اعضاء کاٹ دیئے گئے ہوں، جبکہ وہ کسی شے پر قدرت نہ رکھتا ہو، علماء نے ان دونوں کے حکم میں اختلاف کیا ہے اپنے اس اجماع کے بعد کہ حج کے لئے چلنا ان دونوں پر لازم نہیں، کیونکہ حج اللہ تعالیٰ نے قدرت رکھنے والے پر فرض کیا ہے اور اس پر اجماع ہے اور مریض اور معضوب دونوں میں استطاعت اور قدرت نہیں ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: جب آدمی معضوب ہو تو اس سے حج کا فریضہ بالکل ساقط ہوجاتا ہے، چاہے وہ اس پر قادر ہو جو اس کی طرف سے مال کے عوض یا بغیر مال کے حج کرسکتا ہو اس پر حج فرض لازم نہ ہوگا۔ اور اگر اس پر حج واجب ہوگیا پھر اس کا

کوئی عضو کاٹ دیا گیا اور وہ اپاج ہو گیا تو اس سے حج کا فریضہ ساقط ہو جائے گا اور یہ جائز نہ ہوگا کہ اس کی زندگی میں کسی بھی اعتبار سے کوئی اس کی طرف سے حج کرے، بلکہ اگر وہ وصیت کرے کہ اس کی موت کے بعد اس کی طرف سے حج کیا جائے اور اس کے ترکہ کے تیسرے حصہ سے حج کیا جائے تو یہ نفل ہوگا۔ اور انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ پس اس میں یہ خبر ہے کہ اس کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو اس نے خود کوشش کی۔

پس جس نے کہا ہے: اس کے لئے اس کے سوا کسی اور نے سعی کی ہے تو اس نے ظاہر آیت کا خلاف کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ کے مطابق یہ استطاعت رکھنے والا نہیں ہے، کیونکہ حج سے مراد مکلف آدمی کا بذات خود بیت اللہ شریف کا قصد کرنا ہے، کیونکہ یہ ایک عبادت ہے اور اس سے عاجز ہونے کے ساتھ اس میں نیابت درست نہیں جیسا کہ نماز میں (نیابت درست نہیں ہوتی) اور محمد بن منکدر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ ایک حج کے سبب تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا (ایک) مرنے والے کو (دوسرا) اس کی طرف سے حج کرنے والے کو اور (تیسرا) اسے بھیجنے والے کو'' اسے الطبر انی القاسم سلیمان بن احمد نے بیان کیا ہے اور اس طرح سند بیان کی ہے حدثنا عمرو بن حصین السدوسی قال حدثنا ابو معشر عن محمد بن المنکدر۔ اور آگے انہوں نے اسے بیان کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو معشر کا نام نجیح ہے اور وہ ان کے نزدیک ضعیف راوی ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: اپاج مریض وہ جس کا کوئی عضو کٹا ہوا ہو اور شیخ کبیر جو ایسے آدمی پر قادر ہو جو اس کی بات ماننے اور پیروی کرنے کے لئے تیار ہو جب وہ اسے اپنی طرف سے حج کرنے کا حکم دے تو وہ بھی من وجہ استطاعت رکھنے والا ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ اتنے مال پر قادر ہو کہ وہ اس کے عوض ایسے آدمی کو اجرت پر لے سکے جو اس کی طرف سے حج کرے گا کیونکہ وہ اس پر حج کا فریضہ لازم کر رہا ہے اور یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے شیخ کبیر (انتہائی بوڑھا آدمی) کو فرمایا جو حج نہ کر سکے وہ ایک آدمی کو تیار کرے جو اس کی طرف سے حج کرے گا اور یہی موقف ثوری، امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، ابن مبارک، احمد اور اسحاق نے اختیار کیا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے آدمی پر قادر ہو جو طاعت و نیابت اس کے لئے پیش کرے اور وہ اس کی طرف سے حج کرے، پس امام شافعی، امام احمد اور ابن راہویہ کے نزدیک اس پر بھی حج لازم ہوگا۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ نے کہا ہے: صرف طاعت و پیروی پیش کرنے کے ساتھ کسی حال میں حج لازم نہیں ہوگا۔

امام شافعی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ بنی خثعم کی ایک عورت نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ حج اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے بندوں پر فرض ہے میں نے اپنے باپ کو انتہائی بوڑھا پایا ہے وہ سواری پر بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتا، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' اور یہ حجۃ الوداع کے موقع پر ہوا (1)۔ اور ایک روایت میں ہے: وہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے اونٹ کی پیٹھ پر سکون سے بیٹھ سکے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس کی طرف سے حج کر تیرا کیا خیال ہے اگر تیرے باپ پر قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا کر دیتی؟'' اس نے عرض کی: جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: ''پس اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے (2)''۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنا پر حج کو واجب قرار دیا کہ اس کی بیٹی نے اس کی اطاعت و پیروی کی اور اس نے اپنا آپ اس کے لئے پیش کیا کہ وہ اس کی طرف سے حج کرے گی۔ تو جب بیٹی کی پیروی کے سبب اس پر حج واجب ہے تو پھر بدرجہ اولیٰ اتنے مال پر قادر ہونے کی صورت میں حج واجب ہوگا جس کے عوض وہ کسی کو اجرت پر لے سکتا ہے۔

پھر اگر وہ طاعت کے بغیر مال اس کے لئے خرچ کرے تو صحیح یہ ہے کہ اس کا قبول کرنا اس کے لئے لازم نہیں ہے اور اس کے ساتھ حج کرنا اس کی اپنی طرف سے ہوگا اور وہ اس کے لئے مال خرچ کرنے کے سبب مستطیع شمار نہ ہوگا۔

اور ہمارے علماء نے کہا ہے: خثعمیہ کی حدیث سے مقصود (حج کو) واجب کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے مقصود والدین کے ساتھ حسن سلوک، ان کے دینی اور دنیوی مصالح کے بارے غور و فکر اور طبعاً اور شرعاً ان کے لئے جانب منفعت پر ابھارنا اور برانگیختہ کرنا ہے۔ پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کے اپنے والد کے بارے میں خیر اور نیکی کے جذبات، ظاہری فرمانبرداری، رغبت صادقہ اور اسے نیکی اور ثواب پہنچانے کی حرص کو دیکھا اور یہ کہ وہ اس کے حج کی برکت سے محروم رہنے پر اظہار تاسف کر رہی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس طرح جواب دیا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری عورت کو فرمایا جس نے یہ عرض کی: میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی لیکن وہ حج نہ کر سکی یہاں تک کہ وہ فوت ہوگئی کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس کی طرف سے حج کر، تیری کیا رائے ہے اگر تیری ماں پر قرض ہوتا کیا تو اسے ادا کر دیتی؟'' اس نے عرض کی: جی ہاں (3)۔ تو اس میں جو کچھ ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ احسانات اور مردوں کو نیکی اور خیرات کا ثواب پہنچانے کے باب سے ہے، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فعل حج کو قرضے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ اگر کوئی فوت ہو جائے اور اس پر قرض ہو تو اس کے ولی پر اسے اپنے مال سے ادا کرنا واجب نہیں اور اگر اس نے بطور احسان ادا کر دیا تو اس کی طرف سے قرض ادا ہو جائے گا۔

اور اس میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ اس حدیث میں حج اس کے باپ پر فرض نہیں جس کی تصریح اس عورت نے اپنے اس قول سے کی ہے لا یستطیع اور جو استطاعت نہیں رکھتا اس پر حج فرض نہیں ہوتا ...... اور یہ تصریح وجوب کی نفی اور فرض کے منع کے بارے میں ہے اور یہ جائز نہیں ہوتا کہ جس کی حدیث کی ابتدا میں بالیقین نفی ہو وہی حدیث کے آخر میں ظناً ثابت ہو۔

اسے آپ کا یہ قول ثابت کر رہا ہے: فدین اللہ احق ان یقضی (پس اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے) کیونکہ یہ بالاجماع اپنے ظاہر پر نہیں ہے، کیونکہ بلاشبہ بندے کا قرض ادائیگی اور قضا کے زیادہ قریب ہے اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، حدیث نمبر 1417، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ابن ماجہ، باب الحج عن المیت، حدیث 2899، ایضاً
3۔ صحیح بخاری، باب الحج والنذور... الخ، حدیث 1720، ایضاً

بالاجماع اسی سے ابتدا ہوتی ہے کیونکہ بندہ فقیر ہے اور اللہ تعالیٰ مستغنی ہے۔

ابن عربی نے یہی کہا ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک خثعمیہ کی حدیث اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: اس میں اضطراب ہے اور ابن وہب اور ابو مصعب نے کہا ہے: یہ صرف اولاد کے حق میں ہے۔ اور ابن حبیب نے کہا ہے: یہ ایسے بوڑھے کے بارے میں ہے جسے اٹھانے والا کوئی نہ ہو اور وہ حج نہ کر سکے، حج کی رخصت کے لئے ہے اور اس آدمی کے بارے میں رخصت ہے جو فوت ہو گیا اور وہ حج نہ کر سکا، کہ اس کی طرف سے اس کا بیٹا حج کرے اگرچہ وہ اسے اس بارے میں وصیت نہ بھی کرے اور یہ اس کی طرف سے جائز ہوگا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پس یہ معضوب اور اس کے ہم مثل کے بارے کلام ہے۔ اور خثعمیہ کی حدیث کو ائمہ نے نقل کیا ہے اور یہ حسن کے اس قول کی تردید کرتی ہے کہ عورت کا مرد کی جانب سے حج کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جب مکلف کے پاس ایسی خوراک نہ ہو جسے وہ راستے میں استعمال کرے گا تو اس پر حج لازم نہیں۔ اور اگر اسے کوئی اجنبی ایسا مال ہبہ کرے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو تو اسے قبول کرنا بالاجماع اس پر لازم نہیں، کیونکہ اس میں احسان کا احساس اسے لاحق ہو سکتا ہے۔ اور اگر کسی آدمی نے اپنے باپ کو مال ہبہ کیا، تو امام شافعی نے کہا ہے: اسے قبول کرنا اس کے ذمہ لازم ہے، کیونکہ آدمی کا بیٹا اس کی اپنی کمائی ہے، اس میں اس پر کوئی احسان نہیں ہے۔

اور امام مالک اور امام اعظم ابو حنیفہ نے کہا ہے: اسے قبول کرنا اس پر لازم نہیں ہے، کیونکہ اس میں حرمت ابوت کا ساقط ہونا ہے، جب کہ کہا یہ جاتا ہے قد جزاہ و قد وفا، تحقیق اس نے اسے جزا دی اور اس نے اس کے ساتھ وفا کی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور جو کوئی فرض حج کا انکار کرے اور وہ اسے واجب نہ جانے۔ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے: بے شک وہ جس نے حج کی قدرت رکھنے کے باوجود اسے ترک کر دیا تو وہ کافر ہے۔

اور ترمذی نے حارث سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو آدمی مالک ہو زاد راہ کا اور ایسی سواری کا جو اسے بیت اللہ شریف تک پہنچا سکتی ہو اور وہ حج نہ کرے تو اس پر (کوئی حرج) نہیں ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر مرے اور وہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرما رہا ہے وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے اس سند کے سوا نہیں پہنچانتے اور اس کی اسناد میں کلام ہے اور ہلال بن عبد اللہ مجہول راوی ہے اور حارث کو ضعیف قرار دیا جاتا ہے(1)'' اور اسی طرح حضرت ابو امامہ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور عبد خیر بن یزید نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان لوگوں پر

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی التغلیظ فی ترک الحج، حدیث 740، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حج فرض کیا ہے جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اور جس نے نہ کیا تو اسے چاہیے کہ وہ جس حال پر چاہے مر جائے اگر چاہے تو وہ یہودی یا نصرانی ہو یا مجوسی مگر یہ کہ اس کے لئے کوئی عذر ہو بیمار ہو یا جابر سلطان (کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہو) خبردار! جان لو نہ اس کے لئے میری شفاعت میں کوئی حصہ ہے اور نہ وہ میرے حوض پر آئے گا۔'' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے حج تک پہنچا سکتا ہو اور اس نے حج نہ کیا یا اس کے پاس اتنا مال ہو جس میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اور اس نے زکوٰۃ نہ دی تو وہ موت کے وقت رجعت (واپسی کا سوال کرے گا۔'' تو کہا گیا: اے ابن عباس! رضی اللہ عنہما بے شک ہم تو اسے کافروں کے لئے دیکھتے رہے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: میں اس بارے تم پر قرآن کریم پڑھتا ہوں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنِیْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (1) (المنافقون) (اے ایمان والو! تمہیں غافل نہ کر دیں تمہارے اموال اور نہ تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے۔ اور جنہوں نے ایسا کیا تو وہی لوگ گھاٹے میں ہوں گے۔ اور خرچ کر لو اس رزق سے جو ہم نے تم کو دیا اس سے پیشتر کہ آ جائے تم میں سے کسی کے پاس موت تو (اس وقت) وہ کہنے لگے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت کے لئے کیوں مہلت نہ دی تاکہ میں صدقہ (وخیرات) کر لیتا اور نیکوں میں شامل ہو جاتا۔)

حسن بن صالح نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: پس میں زکوٰۃ دوں گا اور میں حج کروں گا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ کسی آدمی نے آپ سے اس آیت کے بارے پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا: من حج لا یرجو ثوابا او جلس لا یخاف عقابا فقد کفر به (جس نے حج کیا اور ثواب کی امید نہ رکھی یا بیٹھا رہا اور سزا کا خوف نہ رکھا تو اس نے اس کے ساتھ کفر کیا۔)

اور حضرت قتادہ نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تحقیق میں نے ارادہ کیا کہ میں لوگوں کو شہروں کی طرف بھیجوں اور وہ ایسے آدمی پر نظر رکھیں جس کے پاس مال ہے اور اس نے حج نہیں کیا پس وہ اس پر جزیہ لگا دیں، پس اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ۔

میں کہتا ہوں: یہ انتہائی شدت اور سختی کے محل میں وارد ہوئی ہے اور اسی لئے ہمارے علماء نے کہا ہے: آیت اس معنی کو متضمن ہے کہ جو آدمی فوت ہوا اور اس نے حج نہ کیا حالانکہ وہ اس کی قدرت رکھتا تھا تو وعید اس کی طرف متوجہ ہوگی اور کسی دوسرے کا اس کی طرف سے حج کرنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ اگر غیر کا حج کرنا اس سے فرض کو ساقط کر دے تو اس سے وعید ساقط ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اگر میرا کوئی پڑوسی فوت ہوا اور اس کے پاس وسعت اور خوشحالی ہو اور اس نے حج نہ کیا تو میں نے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۖ وَ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۝۹۸ قُلْ

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ المنافقین، حدیث 3238، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

''آپ فرمایئے اے اہل کتاب! کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔
آپ فرمایئے اے اہل کتاب! تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے اسے جو ایمان لا چکا تم چاہتے ہو کہ اس راہ (راست) کو ٹیڑھا بنا دو حالانکہ تم خود (اس کی راستی کے) گواہ ہو۔ اور نہیں ہے اللہ بے خبر ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی (اے اہل کتاب!) تم کیونکر اللہ تعالیٰ کے دین سے پھرتے ہو۔ مَنْ اٰمَنَ (اسے جو ایمان لا چکا) حسن نے تُصِدون تاء کے ضمہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ قرأت کی ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ (یعنی) صَدَّ اور اَصَدَّ، مثلاً صلّ اللحمُ اور أَصَلَّ جب گوشت بدبودار ہو جائے، اور خَتم اور اَخْتَمَ بھی ہے جب تغیر اور تبدیلی آ جائے۔ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا یعنی تم اس کے لئے چاہتے ہو (یعنی تَبْغُوْنَهَا بمعنی تطلبون لها ہے) پھر اس سے لام کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ وَاِذَا كَالُوْهُمْ میں کہا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: بغيت له كذا یعنی طلبته میں نے اسے طلب کیا، چاہا۔ اور أبغيته كذا یعنی میں نے اس کی مدد کی۔ اور العوج کا معنی جھکنا اور ٹیڑھا ہونا ہے دین میں، قول میں اور عمل میں اور ہر وہ جو سیدھے راستے سے نکل جائے۔ (یہ معنی تب ہے جب عین مکسور ہو۔) اور اگر عین مفتوح ہو تو پھر معنی ہے دیوار کا ٹیڑھا ہونا اور ہر کھڑے ہونے والے شخص کا ٹیڑھا ہونا، یہ ابوعبیدہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد يتبعون الداعی لاعوج له کا معنی ہے وہ اس کی دعوت سے ٹیڑھا ہونے کی قدرت نہیں رکھتے اور عاج بالمکان و عوج کا معنی ہے (سیدھا) کھڑا ہوا اور ٹھہرا۔ اور العائج ٹھہرنے والے کو کہتے ہیں۔

شاعر کا قول ہے:

هل انتم عائجون بنا لَعَنّا نرى العَرَصاتِ أو اثر الخِيام

اس میں عائجون ٹھہرنے والے کے معنی میں ہے۔

اور الرجل الأعوج کا معنی ہے بد اخلاق آدمی اور وہ جس کا ٹیڑھا پن واضح اور ظاہر ہو اور العُوج من الخیل سے مراد وہ گھوڑ[ا] ہے جس کی ٹانگوں میں ٹیڑھا پن اور دوری ہو۔ اور اعوجية من الخيل کی نسبت ایسے گھوڑے کی طرف کی جاتی ہے جو زما[نہ] جاہلیت میں (تیز رفتار اور) دوسروں پر سبقت لے جانے والا ہوتا۔

اور کہا جاتا ہے: فرس مُحَنَّبٌ یعنی جب گھوڑے کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بغیر پھیلاؤ کے دوری ہو اور یہ مدح ا[ور] تعریف ہے اور کہا جاتا ہے: الحَنَب یعنی دونوں پنڈلیوں میں ٹیڑھا پن ہونا۔ خلیل نے کہا ہے: الشُّغْنیب جو شدت (ا[ور] قوت) سے متصف ہے اور یہ اعوجاج (ٹیڑھا پن) نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ حالانکہ تم عقلمند ہو (اور سمجھ بوجھ رکھتے ہو) اور یہ بھی کہا گیا ہے: حالانکہ تم تورات میں ا[س]

لکھے ہوئے پر گواہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا وہ دین جس کے بغیر کوئی دین قبول نہ کیا جائے گا وہ اسلام ہے، کیونکہ اس میں حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت (اور اوصاف کا بیان) ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝

''اے ایمان والو! اگر تم کہا مانو گے ایک گروہ کا اہل کتاب سے (تو نتیجہ یہ ہو گا کہ) لوٹا کر چھوڑیں گے تمہیں تمہارے ایمان قبول کرنے کے بعد کافروں میں۔''

یہ آیت ایک یہودی کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اوس اور خزرج کے درمیان اس فتنہ کو از سر نو اٹھانے کا ارادہ کیا جو ایک بار حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے ختم ہو چکا تھا پس وہ ان کے درمیان بیٹھ گیا اور انہیں شعر سنائے دونوں قبیلوں میں سے ایک نے اسے اپنی جنگ کے بارے کہا، تو دوسرے قبیلے نے کہا: تحقیق ہمارے شاعر نے فلاں فلاں دن کہا، تو گویا اس طرح ان میں اختلاف اور شدت داخل ہو گئی، تو انہوں نے کہا: آؤ ہم جنگ کو پھر سے اسی طرح شروع کر دیں جس طرح پہلے تھی۔ تو انہوں نے آواز دی: اے آل اوس۔ اور دوسروں نے پکارا: اے آل خزرج، پس وہ اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے ہتھیار اٹھا لئے اور لڑنے کے لئے صفیں باندھ لیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دونوں صفوں کے درمیان آ کر کھڑے ہو گئے اور خوب بلند آواز سے یہ آیت پڑھی۔ پس جب انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی تو وہ آپ کے لئے خاموش ہو گئے اور توجہ سے سننے لگے اور جب آپ فارغ ہوئے تو انہوں نے ہتھیار رکھ دیئے اور آپس میں ایک دوسرے کو گلے ملنے لگے اور رونے لگے، یہ حضرت عکرمہ، ابن زید اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور جس نے ایسا کیا وہ شاس بن قیس یہودی تھا، اس نے اوس اور خزرج کے خلاف سازش کی اور انہیں وہ جنگیں یاد دلانے لگا جو ان کے درمیان واقع ہوئیں تھیں اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور آپ نے انہیں نصیحت فرمائی، تو قوم نے پہچان لیا کہ یہ شیطان کا کچوکا ہے اور ان کے دشمن کا مکر ہے۔ پس انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ہتھیار پھینک دیئے اور رونے لگے اور آپس میں ایک دوسرے کو گلے ملنے لگے، پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ارشاد سنتے ہوئے اور اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا۔ مراد اوس و خزرج ہیں۔ اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یعنی شاس اور اس کے ساتھی۔ (اگر تم کہا مانو گے اہل کتاب میں سے ایک گروہ کا) يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ (تو نتیجہ یہ ہو گا کہ) وہ لوٹا کر چھوڑیں گے تمہیں تمہارے ایمان قبول کرنے کے بعد کافروں میں)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: کوئی ہماری طرف آنے والا نہ تھا جو ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ناپسندیدہ ہو، پس آپ نے ہماری طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا تو ہم رک گئے، باز آ گئے اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے معاملات کی اصلاح فرما دی۔ پس ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ کوئی شخص نہ تھا، سو میں نے

کوئی دن نہیں دیکھا جو اس دن کے اول حصہ سے زیادہ قبیح اور وحشت ناک ہو اور اس کے آخری حصہ سے زیادہ حسین اور پسندیدہ ہو۔

وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

''اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم (اب پھر) کفر کرنے لگے حالانکہ تم وہ ہو کہ پڑھی جاتی ہیں تم پر اللہ کی آیتیں اور تم میں اللہ کا رسول بھی تشریف فرما ہے اور جو مضبوطی سے پکڑتا ہے اللہ (کے دامن) کو تو ضرور پہنچایا جاتا ہے اسے سیدھی راہ تک۔''

اللہ تعالیٰ نے بطور تعجب یہ ارشاد فرمایا: وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ آیات اللہ سے مراد قرآن کریم ہے وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ اور تم میں اس کا رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: زمانہ جاہلیت میں قبیلہ اوس اور خزرج کے درمیان جنگ وجدال جاری رہا تو انہوں نے اسی کا ذکر کیا جو ان کے درمیان ہوتا تھا، نتیجتاً ان میں سے بعض نے بعض پر تلواریں سونت لیں۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لایا گیا اور اس کا تذکرہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کیا گیا تو آپ ان کی طرف تشریف لے گئے، چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا

اور اس آیت میں وہ بھی داخل ہیں جنہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں دیکھا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت میں سے جو بھی ان میں ہے وہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھنے کے قائم مقام ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ خطاب صرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام کو ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان میں تشریف فرما تھے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خطاب ساری امت کو ہو، کیونکہ آپ کے آثار وعلامات اور وہ قرآن کریم جو ہمیں عطا کیا گیا وہ ہم میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ ہی ہے اگرچہ ہم نے آپ کا مشاہدہ نہیں کیا۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس آیت میں دو واضح علم ہیں۔ ایک کتاب اللہ کا اور ایک نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ پس نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو گزر گئے اور رہی کتاب اللہ تو اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص رحمت اور نعمت کے طور پر ان کے درمیان باقی رکھا اور اس میں اس کے حلال وحرام سے متعلقہ احکام اور طاعت و معصیت سبھی کا ذکر ہے۔ وَ كَيْفَ یہ محل نصب میں ہے اور التقائے ساکنین کی وجہ سے خلیل اور سیبویہ کے نزدیک فا کو فتحہ دیا گیا ہے اور فتحہ کی وجہ یہ ہے کیونکہ فا کا ماقبل یا ہے اور یا اور کسرہ کا جمع ہونا باعث ثقل ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی طاعت کو مضبوطی سے تھامتا اور پکڑتا ہے۔ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تو اسے ضرور سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کی جاتی ہے اور اسے اس کی توفیق دی جاتی ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ کا معنی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ کا معنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑتا ہے اور وہ قرآن ہے۔ کہا جاتا ہے: أعصم به واعتصم اور تمسك و استمسك جب وہ اس کے ساتھ چمٹ جائے اور غیر کو چھوڑ کر اسے مضبوطی سے پکڑ لے۔ اور اعتصمت فلانا (یعنی) میں نے اس کے لئے وہ تیار کیا جسے وہ مضبوطی سے پکڑ سکتا ہے اور ہر وہ جو کسی شے کو مضبوطی سے پکڑنے والا ہو وہ مُعصم اور مُعْتصم ہے۔ اور جو کسی شے کو روکنے والا ہو تو وہ عاصم کہلاتا ہے۔

جیسا کہ فرزدق نے کہا ہے:

أنا ابن العاصِمينَ بنی تميم اذا ما اعظَمُ الحدثانِ نابا

اس میں عاصمین (روکنے والے) کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور نابغہ نے کہا ہے:

يظلّ من خوفه الملّاح معتصِما بالخَيزُرانة بعد الأين والنَّجَد

اس میں معتصِم مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں ہے۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

فَأشرط فيها نفسه و هو مُتعصِمٌ وألقى بأسباب له و توكّلا

پس اس نے اس میں اپنی جان کو پیش کر دیا حالانکہ وہ اسے روکنے اور بچانے والا تھا اور اس نے اسباب (و وسائل) پھینک دیئے اور توکل اپنا لیا۔

اور عصمه الطعام: یعنی کھانے نے اس سے بھوک کو دور کر دیا، عرب کہتے ہیں: عصم فلاناً الطعامُ ای منعه من الجوع۔ پس اسی لئے انہوں نے سویق (ستو) کی کنیت ابو عاصم رکھی ہے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: عرب روٹی کو عاصم اور جابر کا نام دیتے ہیں۔

جیسا کہ شعر میں ہے:

فلاتلوميني و لُومي جابرًا فجابرٌ كلّفني الهواجرا

پس تو مجھے ملامت نہ کر بلکہ تو روٹی کو ملامت کر پس روٹی نے ہی مجھے دوپہر کے وقت مشقت میں ڈال رکھا ہے۔

اور وہ اسے عامر کا نام بھی دیتے ہیں۔

کسی شاعر نے کہا:

ابو مالك يعتادني بالظّهائر يجئ فيُلقي رحلَه عند عامر

بھوک کو دوپہر کے وقت میرے پاس آنے کی عادت ہے وہ آتی ہے اور روٹی کے پاس اپنی ٹانگیں پھیلا دیتی ہے۔

ابو مالک بھوک کی کنیت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

''اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے جیسے حق ہے اس سے ڈرنے کا اور (خبردار) نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔''

اس میں ایک مسئلہ ہے۔

امام بخاری (نحاس) نے مرہ سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حق تقاته ان یُطاع فلا یُعصی وان یُذکر فلا یُنسی وأن یَشکر فلا یُکفر (1) (حق تقاته کا مفہوم یہ ہے کہ اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے اور اس کا ذکر کیا جائے اور اسے بھلایا نہ جائے اور شکر ادا کیا جائے اور ناشکری نہ کی جائے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مفہوم یہ ہے کہ آنکھ جھپکنے کی دیر بھی نافرمانی نہ کی جائے۔ اور مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس پر کون قادر ہوگا؟ اور یہ ان پر شاق گزری تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔) تو اس نے اس آیت کو منسوخ کر دیا، یہ حضرت قتادہ، ربیع، اور ابن زید سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ارشاد گرامی فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ اس آیت کا بیان ہے۔ اور معنی یہ ہے: پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ نسخ تب ہوتا ہے جب دونوں کو جمع کرنا ممکن نہ ہو اور جمع کرنا ممکن ہو تو وہ اولیٰ ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ منسوخ نہیں ہے، البتہ حَقَّ تُقٰتِهٖ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا جائے جیسے جہاد کرنے کا حق ہے۔ اور تمہیں اللہ کی راہ میں کسی لومۃ لائم (ملامت کرنے والے کی ملامت) کی پرواہ نہ ہو۔ اور تم عدل وانصاف کو قائم کرو اگرچہ وہ تمہاری ذاتوں اور تمہارے بیٹوں کے خلاف ہی ہو۔

نحاس نے کہا ہے: جب بھی آیت میں مسلمانوں پر کسی واجب کا ذکر کیا جائے کہ وہ اس پر عمل کریں تو اس میں نسخ واقع نہیں ہوتا۔ اور قول باری تعالیٰ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کا معنی ومفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

''اور مضبوطی سے پکڑ لو اللہ کی رسی سب مل کر اور جدا جدا نہ ہونا اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت (جو اس نے) تم پر فرمائی جب کہ تم تھے (آپس میں) دشمن پس اس نے الفت پیدا کر دی تمہارے دلوں میں تو بن گئے تم اس کے

1۔ ناسخ ومنسوخ للنحاس، صفحہ 299، تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 637

احسان سے بھائی بھائی اور تم (کھڑے) تھے دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تو اس نے بچا لیا تمہیں اس (میں گرنے) سے۔ یونہی بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیتیں تاکہ تم ہدایت پر ثابت رہو۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَاعْتَصِمُوْا۔ العصمۃ کا معنی ہے المنعۃ (یعنی عزت اور قوت) اور اسی وجہ سے بَذْرَقہ کو عِصمۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور بذرقہ: قافلہ کی حفاظت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ (یعنی محافظ و نگران) اور وہ یہ ہے کہ وہ قافلہ کے ساتھ ایسے افراد کو بھیجے جو اس کی ان سے حفاظت کریں گے جو اسے اذیت اور تکلیف پہنچائیں گے۔ ابن خالویہ نے کہا ہے: البذرقہ عربی زبان کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ فارسی کلمہ ہے اور عربوں نے اسے عربی بنا لیا ہے، کہا جاتا ہے: بعث السلطان بذرقۃ مع القافلۃ (سلطان نے قافلہ کے ساتھ محافظ بھیجے۔)

اور لفظ الحَبْل مشترک ہے اور لغت میں اس کا اصلی معنی یہ ہے السبب الذی یوصل بہ الی البغیۃ والحاجۃ وہ سبب جس کے ذریعہ مقصد اور حاجت تک پہنچا جاتا ہے اور حبل کا معنی حبل العاتق (کندھے کا پٹھا) بھی ہے اور حبل سے مراد ریت کا ایک لمبا اور طویل قطعہ بھی ہے اور اسی معنی میں ایک حدیث ہے: واللہ ما ترکت من حبل الا وقفت علیہ، فھل لی من حج(1) (قسم بخدا میں نے کوئی ریت کا لمبا ٹکڑا نہیں چھوڑا مگر میں نے اس پر وقوف کیا، تو کیا میرا حج ہو گیا؟)

اور حبل کا معنی رسی بھی ہے اور اس کا معنی عہد بھی ہے۔

اعشی نے کہا ہے:

واذا تُجوِّزُھَا حِبَالُ قبیلۃٍ　　اخذتْ من الأُخری الیک حِبالَھا

اس میں حبل سے مراد امان اور پناہ ہے۔

اور حبل کا معنی مصیبت بھی ہے۔

کثیر نے کہا ہے:

فلا تعجلِی یا عَزُّ اَنْ تَتَفَھَّمِی　　بِنُصْحٍ أَتَی الواشُون ام بِحُبُولِ

اس میں حبول مصائب کے معنی میں ہے۔

اور حِبَالَۃٌ کا معنی شکاری کا پھندا (اور جال) ہے۔ اور آیت میں سوائے عہد کے معنی کے کوئی معنی مراد نہیں ہے یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حبل اللہ سے مراد قرآن کریم ہے اور اسے حضرت علی اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے(2) اور حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور ابو

1۔ ابن ماجہ، باب اتی عرفۃ قبل الفجر لیلۃ جمع، حدیث نمبر 3006، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ترمذی، باب ماجاء فی فضل القرآن، حدیث نمبر 2831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

معاویہ نے ھَجَری (مراد ابراہیم بن مسلم العبدی ہے) سے، انہوں نے ابوالاحوص سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ یہ قرآن ہی حبل اللہ (اللہ کی رسی) ہے۔''

اور تقی بن مخلد نے اسی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، حدثنا یحییٰ بن عبدالحمید حدثنا ھشیم عن العوام بن حوشب عن الشعبی عن عبداللہ بن مسعود وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا فرمایا: حبل اللہ سے مراد جماعت ہے۔

اور آپ سے اور کئی دوسروں سے یہ کئی وجوہ سے مروی ہے اور تمام کا معنی باہم متقارب اور ایک دوسرے میں داخل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ الفت و محبت کا حکم ارشاد فرما رہا ہے اور فرقت و جدائی سے منع فرما رہا ہے، کیونکہ فرقت ہلاکت ہے اور جماعت واتفاق (باعث) نجات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ابن مبارک پر رحم فرمائے۔

اس نے کہا:

ان الجماعة حبل الله فاعتصموا		منه بعروة الوثقى لمن دانا

اس میں حبل اللہ سے مراد جماعت ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَفَرَّقُوْا یعنی تم اپنے دین میں جدا جدا نہ ہونا جیسا کہ یہود و نصاریٰ اپنے ادیان میں جدا جدا ہو گئے، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے اور یہ معنی مراد لینا بھی جائز ہے کہ مختلف اغراض اور خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے جدا جدا نہ ہو جانا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین کے سلسلہ میں بھائی بھائی ہو جاؤ، تو وہ ان کے لئے باہمی قطع تعلقی اور باہمی عداوت و دشمنی سے ڈھال اور روکنے کا ذریعہ بن جائے گا اور اس کا مابعد ارشاد گرامی اسی پر دلالت کرتا ہے اور وہ یہ ہے: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔

اور اس میں فروعات میں اختلاف کے حرام ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ وہ کوئی اختلاف نہیں، جبکہ اختلاف وہ ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے آپس میں محبت اور ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہونا متعذر رہو اور رہا مسائل اجتہادیہ کا حکم، تو ان میں اختلاف فرائض اور معانی شرع کی باریکیاں اور لطائف نکالنے اور مستنبط کرنے کے سبب سے ہوتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پیش آنے والے حوادث و واقعات کے احکام میں مسلسل اختلاف بھی کرتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے محبت اور الفت سے پیش آتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کا اختلاف رحمت ہے'' اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ایسے اختلاف سے منع فرمایا ہے جو جھگڑے اور فساد کا سبب ہے۔

امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہودی اکہتر فرقوں میں یا بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور عیسائی بھی اسی کی مثل (فرقوں میں تقسیم ہوئے) اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو گی۔'' ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے۔ (1)

1۔ ابن ماجہ، باب افتراق الامم، حدیث نمبر 3980، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور انہوں نے اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی نقل کیا ہے (1)۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یقیناً میری امت پر بالکل برابر برابر وہی حالات آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی آدمی اپنی ماں کے پاس اعلانیہ (برائی کے لئے) آتا تھا تو یقیناً میری امت میں سے بھی ایسا ہوگا جو اسی طرح کا فعل کرے گا اور بلاشبہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی سوائے ایک گروہ کے وہ تمام کے تمام جہنم میں ہوں گے'' صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ ایک کون سا فرقہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما انا علیہ و اصحابی جو اس (دین) پر ہوگا جس پر میں اور میرے صحابہ کرام ہیں۔ انہوں نے اسے عبد اللہ بن زیاد الافریقی کی حدیث سے عبد اللہ بن یزید عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے اور ہم اسے اس سند کے سوا سے نہیں پہچانتے۔ ابو عمر نے کہا ہے: عبد اللہ افریقی ثقہ راوی ہے، اس کی قوم نے اس کی توثیق کی ہے اور انہوں نے اس کی تعریف کی ہے اور دوسروں نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

اور ابوداؤد نے اسے اپنی سنن میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار! سنو تم سے پہلے اہل کتاب بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور یہ ملت عنقریب تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی بہتر جہنم میں ہوں گے اور ایک فرقہ جنت میں ہوگا اور وہ الجماعۃ ہے۔ بلاشبہ عنقریب میری امت سے کچھ تجارتی گروہ نکلیں گے ان کے ساتھ خواہشات اس طرح ہوں گی جس طرح الکلب (باولا کتا کاٹے کی بیماری) اپنے مریض کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اس کے بدن کی کوئی رگ اور روئی جوڑ باقی نہیں رہتا مگر وہ اس میں داخل ہو جاتی ہے۔'' (2)

اور سنن ابن ماجہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو دنیا سے اس حال میں جدا ہوا کہ اس میں اللہ تعالیٰ وحدہٗ کے بارے میں اخلاص ہو، اس کی عبادت میں کوئی اور شریک نہ ہو، وہ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرتا رہے تو وہ اس حال میں فوت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اور وہ اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جسے رسل علیہم السلام لے کر آئے اور انہوں نے اسے اپنے رب کی طرف سے پہنچایا اس سے پہلے کہ احادیث میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو اور اھواء و خواہشات میں اختلاف ہو اور اس کی تصدیق سب سے آخر میں نازل ہوئی کتاب اللہ میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَاِنْ تَابُوْا فرمایا: پس اگر وہ بتوں اور ان کی عبادت کو چھوڑ دیں وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوۃَ اور دوسری آیت میں فرمایا: فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوۃَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (التوبہ: 11) (پس اگر یہ توبہ کرلیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں دین میں۔)

انہوں نے اسے نصر بن علی جہضمی عن ابی احمد بن ابی جعفر الرازی عن الربیع بن انس عن انس رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ (3)

ابو الفرج جوزی نے کہا ہے: اگر کہا جائے یہ فرقے تو معروف ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ ہم افتراق اور اصولی فرقوں کو

1۔ سنن ترمذی، باب ما جاء فی افتراق ہذہ الامۃ، حدیث نمبر 2565، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابی داؤد، کتاب السنۃ، حدیث نمبر 3981، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　3۔ ابن ماجہ، باب فی الایمان، حدیث نمبر 68، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جانتے ہیں اور پھر فرقوں میں سے ہر گروہ کئی فرقوں میں تقسیم ہوا ہے۔ اگرچہ ہم نے ان فرقوں کے اسماء اور ان کے مذاہب کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ لیکن اصولی فرقوں میں سے یہ ہمارے لئے بالکل ظاہر ہیں حرو ریہ، قدریہ، جھمیہ، مرجئہ، رافضہ، اور جبریہ۔ اور بعض اہل علم نے کہا ہے: اصل گمراہ فرقے یہی چھ فرقے ہیں اور ان میں سے ہر فرقہ بارہ فرقوں میں منقسم ہے تو اس طرح بہتر فرقے ہو گئے۔

حرو ریہ بارہ فرقوں میں تقسیم ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلا ازرقیہ ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ہم کسی کو مومن نہیں جانتے۔ اور انہوں نے اہل قبلہ کو کافر قرار دیا سوائے ان کے جنہوں نے ان کے قول کو قبول کیا۔

(۲) اباضیۃ: انہوں نے کہا ہے: جس نے ہمارے قول کو لے لیا تو وہ مومن ہے اور جس نے اس سے اعراض کیا تو وہ منافق ہے۔

(۳) ثعلبیہ: ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی فیصلہ نہیں فرمایا اور نہ کوئی تقدیر بنائی۔

(۴) خازمیہ: انہوں نے کہا: ہم نہیں جانتے ایمان کیا ہے اور تمام مخلوق معذور ہے۔

(۵) خَلَفیہ: ان کا گمان ہے کہ مرد یا عورت میں سے جس نے بھی جہاد ترک کیا تو وہ کافر ہو گیا۔

(۶) کوزیہ: انہوں نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو مس کرے کیونکہ پاک چیز کو نجس سے نہیں پہچانا جا سکتا اور نہ کوئی اپنے ساتھ کسی کو کھانا کھلائے یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے اور غسل کرلے۔

(۷) کنزیہ: انہوں نے کہا ہے: کوئی کسی کو یہ اختیار اور گنجائش نہ دے کہ وہ اپنا مال کسی کو دے دے، کیونکہ بسا اوقات وہ مستحق نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے زمین میں جمع کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اہل حق ظاہر ہو جائیں۔

(۸) شمراخیہ: انہوں نے کہا ہے: اجنبی عورتوں کو مس کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ خوشبودار پودے (پھول) ہیں۔

(۹) اخنسیہ: انہوں نے کہا ہے: میت کو اس کی موت کے بعد کوئی خیر و شر لاحق نہیں ہوتا۔

(۱۰) حکمیہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے مخلوق کی طرف بلایا تو وہ کافر ہے۔

(۱۱) معتزلہ: انہوں نے کہا ہے: ہم پر حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کا معاملہ مشتبہ ہے لہٰذا ہم دونوں فریقوں سے بری الذمہ ہیں۔

(۱۲) میمونیہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارے اہل محبت کی رضا کے بغیر کوئی امام نہیں ہو سکتا۔

اور قدریہ بھی بارہ فرقوں میں تقسیم ہوئے۔

(۱) أحمریہ: یہ وہ فرقہ ہے جن کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ لی جانب سے عدل کی شرط میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان کے امور کا مالک بنائے اور وہ ان کے اور ان کے گناہوں کے درمیان حائل رہے۔

(۲) ثنویہ: ان کا خیال ہے کہ خیر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور شر شیطان کی طرف سے ہے۔

(۳) معتزلہ: یہ وہ ہیں جنہوں نے کہا کہ قرآن کریم مخلوق ہے اور انہوں نے [صفات] ربوبیۃ کا انکار کیا ہے۔

(۴) کَیسانیہ: انہوں نے کہا ہے: ہم نہیں جانتے کہ یہ افعال اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں یا بندوں کی جانب سے اور نہ ہم یہ

جانتے ہیں کہ کیا اس کے بعد لوگوں کو ثواب دیا جائے گا یا انہیں سزا دی جائے گی۔

(۵) شیطانیہ: ان کا کہنا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پیدا نہیں کیا ہے۔

(۶) شریکیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک کفر کے سوا تمام برائیاں مقدر ہیں۔

(۷) وھمیہ: انہوں نے کہا ہے: مخلوق کے افعال اور ان کے کلام کے لئے کوئی ذات نہیں اور نہ ہی نیکی اور بدی کے لئے کوئی ذات ہے۔

(۸) زبریہ: انہوں نے کہا ہے: ہر کتاب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی ہے اس کے مطابق عمل کرنا فرض ہے چاہے وہ ناسخ ہو یا منسوخ۔

(۹) مسعدیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ جس نے نافرمانی کی پھر توبہ کی تو اس کی توبہ قبول نہ کی جائے گی۔

(۱۰) ناکثیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت توڑ دی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

(۱۱) قاسطیہ: انہوں نے ابراہیم بن نظام کی اس کے اس قول میں اتباع اور پیروی کی ہے کہ جس نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ شے ہے تو وہ کافر ہے۔

اور جھمیہ بارہ فرقوں میں منقسم ہیں۔

(۱) معطلہ: انہوں نے خیال کیا ہے کہ ہر وہ شے جس پر انسان کا وہم واقع ہو سکتا ہے تو وہ مخلوق ہے اور یہ کہ جس نے یہ دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا جا سکتا ہے تو وہ کافر ہے۔

(۲) مریسیہ: انہوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی اکثر صفات مخلوق ہیں۔

(۳) ملتزقہ: انہوں نے یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ میں موجود ہے۔

(۴) واردیہ: انہوں نے کہا ہے: وہ آتش جہنم میں داخل نہ ہوگا جس نے اپنے رب کو پہچان لیا اور جو اس میں داخل ہوا وہ اس سے کبھی نہ نکالا جائے گا۔

(۵) زنادقہ: انہوں نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے لئے رب ثابت کرے، کیونکہ حواس کے ادراک کے بغیر اثبات نہیں ہو سکتا اور جس کا ادراک نہ ہو وہ ثابت نہیں ہو سکتا۔

(۶) حرقیہ: انہوں نے یہ گمان کیا ہے کہ کافر کو ایک بار آگ جلا دے گی پھر وہ ہمیشہ جلا ہوا باقی رہے گا اور وہ آگ کی حرارت کو نہیں پائے گا۔

(۷) مخلوقیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ قرآن مخلوق ہے۔

(۸) فانیہ: ان کا گمان ہے کہ جنت اور جہنم دونوں فناہ ہو جائیں گی اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے کہا کہ انہیں پیدا ہی نہیں کیا گیا۔

(۹) عبدیہ: انہوں نے رسل علیہم السلام کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ حکماء تھے۔

(۱۰) واقفیہ: انہوں نے کہا: نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ وہ غیر مخلوق ہے۔
(۱۱) قبریہ: یہ عذاب قبر اور شفاعت کا انکار کرتے ہیں۔
(۱۲) لفظیہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارا قرآن کا تلفظ کرنا مخلوق ہے۔
اور مرجئہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:
(۱) تارکیہ: انہوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی مخلوق پر کوئی فریضہ نہیں ہے سوائے اس کے ساتھ ایمان لانے کے، پس جو کوئی اس کے ساتھ ایمان لایا تو اسے چاہیے وہ جو چاہے کرے۔
(۲) سائبیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو آزاد چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ جو چاہیں کریں۔
(۳) راجیہ: انہوں نے کہا ہے کہ اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے کو طائع اور گناہ کرنے والے کو عاصی نہیں کہا جائے گا کیونکہ ہم یہ نہیں جانتے کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس کیا ہے۔
(۴) سالبیہ: انہوں نے کہا ہے کہ طاعت ایمان میں سے نہیں ہے۔
(۵) بہیشیہ: انہوں نے کہا ہے کہ ایمان علم ہے اور جو حق کو باطل سے اور حلال کو حرام سے نہیں پہچان سکتا تو وہ کافر ہے۔
(۶) عملیہ: ان کا کہنا ہے کہ ایمان عمل کا نام ہے۔
(۷) منقوصیہ: انہوں نے کہا ہے: ایمان نہ زیادہ ہوتا ہے اور نہ کم ہوتا ہے۔
(۸) مستثنیہ: انہوں نے کہا ہے: استثناء ایمان میں سے ہے۔ (یعنی ان شاء اللہ کہنا)
(۹) مشبّہ: انہوں نے کہا ہے: آنکھ آنکھ کی طرح ہے اور ہاتھ ہاتھ کی طرح ہے (یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے لئے جسم ثابت کرتے ہیں نعوذ باللہ من ذالک)
(۱۰) حشویہ: انہوں نے کہا ہے: تمام احادیث کا حکم ایک ہے، پس ان کے نزدیک نفل کو ترک کرنے والا فرض کو چھوڑنے والے کی طرح ہے۔
(۱۱) ظاہریہ: یہ وہ ہیں جنہوں نے قیاس کی نفی کی ہے۔
(۱۲) بدعیہ: وہ پہلا آدمی جس نے اس امت میں ان واقعات کا آغاز کیا۔
اور رافضیہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:
(۱) علویہ: انہوں نے کہا کہ رسول حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنایا گیا تھا لیکن حضرت جبریل امین نے خطا کی (اور پیغام رسالت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچا دیا)۔
(۲) امریہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کے کام میں شریک ہیں۔
(۳) شیعیہ: ان کا موقف ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصی ہیں اور آپ کے بعد آپ کے ولی ہیں۔ بلاشبہ امت نے دوسروں کی بیعت کے سبب کفر کیا ہے۔

(۴) اسحاقیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک نبوت یوم قیامت تک متصل ہے اور ہر وہ جو اہل بیت کا علم جانتا ہے تو وہ نبی ہے۔
(۵) ناؤوسیہ: انہوں نے کہا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ ساری امت سے افضل ہیں۔ اور جس کسی نے کسی غیر کو آپ پر فضیلت دی تو وہ کافر ہو گیا۔
(۶) امامیہ: انہوں نے کہا ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ دنیا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے کسی امام کے بغیر ہو، بلاشبہ امام کو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام تعلیم دیتے ہیں۔ اور جب ایک فوت ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرے کو بدل دیتے ہیں۔
(۷) زیدیہ: انہوں نے کہا ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد نمازوں میں ائمہ ہوں گے پس جب ان میں سے کوئی موجود ہو تو پھر کسی غیر کے پیچھے نماز جائز نہیں ان کے نیکوکار اور ان کے فاجر (سبھی برابر ہیں)
(۸) عباسیہ: ان کا گمان ہے کہ حضرت عباس کا کسی غیر کی نسبت خلافت کا حق زیادہ ہے۔
(۹) تناسخیہ: انہوں نے کہا ہے کہ ارواح میں تناسخ ہوتا رہتا ہے، پس جو کوئی محسن اور نیکوکار ہو اس کی روح نکلتی ہے اور ایسی مخلوق میں داخل ہو جاتی ہے جو اپنی زندگی کے ساتھ سعادت اندوز ہو رہی ہوتی ہے۔
(۱۰) رجعیہ: ان کا نظریہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے اصحاب دنیا کی طرف لوٹ کر آئیں گے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لیں گے۔
(۱۱) لاعنہ: یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت معاویہ، حضرت ابوموسیٰ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم وغیرہ پر لعن کرتے ہیں۔
(۱۲) متربصہ: یہ زاہدوں کے لباس کی طرح لباس پہنتے ہیں اور ہر زمانے میں ایک آدمی کھڑا کرتے ہیں جس کی طرف امر کی نسبت کرتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ اس امت کا امام مہدی ہے اور جب وہ فوت ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرا مقرر کر دیتے ہیں۔

پھر جبریہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:
(۱) مضطریہ: انہوں نے کہا ہے: آدمی کا کوئی فعل (اور اختیار) نہیں ہے بلکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔
(۲) افعالیہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارے لئے افعال ہیں لیکن ہمارے پاس ان کے لئے کوئی استطاعت اور قدرت نہیں ہے۔ بلاشبہ ہم چوپاؤں کی مانند ہیں کہ ہم انہیں رسی ڈال کر ہانکتے اور چلاتے ہیں۔
(۳) مفروغیہ: انہوں نے کہا ہے: تمام اشیاء پیدا کر دی گئی ہیں اور اب کوئی شے پیدا نہیں کی جائے گی۔
(۴) نجاریہ: ان کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنے فعل پر عذاب دے گا نہ کہ ان کے فعل پر۔
(۵) مناتیہ: انہوں نے کہا ہے: تجھ پر اس کے بارے عمل کرنا لازم ہے جو تیرے دل میں کھٹکے پس تو وہ کام کر جس میں تجھے بھلائی اور خیر معلوم ہو۔
(۶) کسبیہ: انہوں نے کہا ہے: بندہ نہ ثواب طلب کرے گا نہ سزا۔

(۷) سابقیہ: ان کا کہنا ہے: جو چاہے وہ عمل کرے اور جو چاہے وہ عمل نہ کرے، کیونکہ سعید کو اس کے گناہ کوئی ضرر اور نقصان نہیں پہنچا سکیں گے اور شقی اور بدبخت کو اس کی نیکی کوئی فائدہ نہ دے گی۔

(۸) حِبّیہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کی محبت کا جام پی لیا تو اس سے ارکان کی عبادت ساقط ہو گئی۔

(۹) خوفیہ: ان کا نظریہ ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی اس کے لئے یہ گنجائش نہیں کہ وہ اس سے ڈرے، کیونکہ ایک دوست اپنے دوست سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔

(۱۰) فکریہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے علم میں اضافہ کیا تو اس نے اپنی مقدار عبادت اس سے ساقط کر دی۔

(۱۱) خشبیہ: انہوں نے کہا ہے: دنیا بندوں کے درمیان برابر ہے، ان کے درمیان اس میں کوئی فضیلت نہیں جس کے لئے ان کے باپ آدم نے انہیں وارث بنایا ہے۔

(۱۲) منتیہ: انہوں نے کہا ہے: ہماری طرف سے فعل ہے اور ہمارے لئے استطاعت وقدرت ہے۔

وہ فرقے جو اس امت میں زائد ہوئے ان کا بیان عنقریب سورۃ الانعام کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سماک الحنفی کو کہا: اے حنفی، جماعت کو لازم پکڑ لے جماعت کو اختیار کر لے، کیونکہ سابقہ امتیں اپنے تفرقہ کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے تین چیزیں پسند فرماتا ہے اور تین چیزیں ناپسند فرماتا ہے: وہ تمہارے لئے پسند فرماتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور یہ کہ تم سب مل کر اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو اور وہ تمہارے لئے یہ تین چیزیں ناپسند کرتا ہے۔ قیل وقال، کثرۃ سوال اور مال کو ضائع کرنا۔''

پس اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنی کتاب اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا واجب قرار دیا ہے اور اختلاف کے وقت ان دونوں کی طرف رجوع کرنا لازم قرار دیا ہے۔ اور اس نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اعتقاداً اور عملاً کتاب وسنت کو مضبوط پکڑنے پر اجماع کریں اور یہی کلمات میں اتفاق لانے اور متفرقات کو منظم کرنے کا وہ سبب ہے جس کے ساتھ دنیا اور دین کے مصالح مکمل ہوتے ہیں اور (اسی میں) اختلاف سے بچاؤ اور سلامتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جمع اور اکٹھا رہنے کا حکم دیا ہے اور اس افتراق سے منع کیا ہے جو اہل کتابین (یہود ونصاریٰ) میں موجود تھا۔ مکمل آیت کا یہی معنی ہے اور اس میں اس اجماع کے صحیح ہونے پر دلیل بھی موجود ہے جو اصول فقہ میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کو یاد کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور سب سے عظیم اور بڑی نعمت اسلام اور اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع ہے، کیونکہ اس کے سبب عداوت اور نفرت وفرقت زائل ہو گئی اور باہمی محبت والفت پیدا ہو گئی۔ اور اس میں مراد قبیلہ اوس اور خزرج ہیں اور یہ آیت عام ہے۔

اور فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا کا معنی ہے کہ تم نعمت اسلام کے سبب دین میں بھائی بھائی ہو گئے اور قرآن کریم میں جہاں بھی ''اَصْبَحْتُمْ'' ہے وہ بمعنی صِرْتُمْ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا۔ ای صار غائرا۔

اخوان أخ کی جمع ہے اور اس کا نام أخا اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ وہ اپنے بھائی کے مذہب کا قصد و ارادہ کرتا ہے، اور شفا ہر شے کی طرف اور اس کے کنارے کو کہتے ہیں۔ اور اسی طرح شفیر بھی ہے اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ (التوبہ: 109) (وادی کے کھوکھلے دھانے کے کنارے پر)

راجز نے کہا:

نحن حضرنا للحجيج سجلة　　نابتة فوق شفاها بقلة

اس میں بھی شفا طرف اور کنارہ کے معنی میں ہے۔

اور اشفى على الشئ کا معنی ہے اشرف علیہ یعنی وہ اس پر جھانکا اور اسی سے ہے أشفى المريض على الموت یعنی مریض موت پر جھانکنے لگا (مراد یہ ہے کہ وہ قریب الموت ہو گیا) اور ما بقى منه الا شفًا ای قليل یعنی اس سے تھوڑا باقی رہ گیا۔

ابن السکیت نے کہا ہے: آدمی کے لئے اس کی موت کے وقت چاند کے لئے اس کی آخری راتوں میں اور سورج کے لئے اس کے غروب ہونے کے وقت کہا جاتا ہے: ما بقى منه الا شفاً ای قليل۔

عجاج نے کہا ہے:

و مَرْبَاء عالٍ لمن تشرّفا　　أشرفته بلا شفىً أو بشفىً

قولہ: بلا شفى۔ ای غابت الشمس یعنی مراد ہے سورج غروب ہو گیا او بشفى کا معنی ہے تحقیق اس سے تھوڑا سا باقی ہے۔ اور یہ لفظ ذوات الیاء (یائی) میں سے ہے اور اس میں ایک لغت یہ بھی ہے کہ یہ واوی ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: شفا اصل میں شَفَو ہے، اسی لئے اس کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور اس میں امالہ نہیں کیا جاتا۔ اور اخفش نے کہا ہے: جب اس میں امالہ جائز نہیں تو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ واوی کلمات میں سے ہے اور اس لئے بھی کہ امالہ یا کو واضح کرتا ہے اور اس کا تثنیہ شفوان ہے۔

مہدوی نے کہا ہے: یہ تمثیل ہے اس سے ان کا کفر سے ایمان کی طرف نکلنا مراد لیا جا رہا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۤىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

''ضرور ہونی چاہیے تم میں ایک جماعت جو بلایا کرے نیکی کی طرف اور حکم دیا کرے بھلائی کا اور روکا کرے بدی سے اور یہی لوگ کامیاب و کامران ہیں۔''

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں گفتگو اسی سورۃ میں گزر چکی ہے۔

اور مِّنْكُمْ میں مِنْ تبعیضیہ ہے اور اس کا معنی ہے کہ حکم دینے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ علماء ہوں اور تمام لوگ علماء

نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بیان جنس کے لئے ہے اور معنی ہے چاہیے کہ تم تمام کے تمام اسی طرح ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ انہیں معین کیا: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ الآیۃ (الحج: 41) (وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو۔)

اور تمام لوگوں کو قدرت نہیں دی گئی اور ابن زبیر نے پڑھا ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ویستعینون اللہ علی ما اصابھم (اور وہ اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہیں جو کچھ انہیں پہنچے) ابوبکر الانباری نے کہا ہے: یہ زیادتی ابن زبیر کی طرف سے تفسیر ہے اور یہ ان کا اپنا کلام ہے اس میں نقل کرنے والوں میں سے بعض نے غلطی کی ہے اور اس نے اسے الفاظ قرآن کے ساتھ ملا دیا ہے، جو کچھ بیان کر رہا ہوں اس کی صحت پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو میرے باپ نے مجھے اس سند سے بیان کی ہے حدثنا [حسن] بن عرفۃ حدثنا وکیع عن أبی عاصم بن ابی عون عن صبیح انہوں نے کہا: میں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اس طرح پڑھتے ہوئے سنا: وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ویستعینون اللہ علی ما اصابھم اور کوئی عقلمند اس میں شک نہیں کر سکتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس زیادتی کے قرآن میں سے ہونے کا اعتقاد نہ رکھتے تھے، کیونکہ آپ نے اسے اپنے اس مصحف میں نہیں لکھا جو امام المسلمین ہے، بلکہ آپ نے اسے وعظ و نصیحت کرنے کے لئے اور ماقبل رب العالمین کے کلام کو موکد کرنے کے لئے اس کا ذکر کیا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾

''اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور اختلاف کرنے لگے تھے اس کے بعد بھی جب آ چکی تھیں ان کے پاس روشن نشانیاں اور ان لوگوں کے لئے عذاب ہے بہت بڑا۔''

جمہور مفسرین کے قول کے مطابق مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: مراد اس امت کے مبتدع (بدعت کا ارتکاب کرنے والے) لوگ ہیں۔ اور ابوامامہ نے کہا ہے: وہ لوگ حروریہ ہیں، اور پھر یہ آیت تلاوت کی۔ اور جابر بن عبداللہ نے کہا ہے: كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ اور وہ لوگ یہود و نصاریٰ ہیں۔ جَآءَهُمْ جمع کی بنا پر مذکر ذکر کیا گیا ہے اور جَآءَتْهُمْ جماعت کی بنا پر ذکر کیا گیا ہے۔

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

''اس دن (جبکہ) روشن ہوں گے کئی چہرے اور کالے ہوں گے کئی منہ تو وہ جو سیاہ رو ہوں گے (انہیں کہا جائے

گا) کہ کیا تم نے کفر اختیار کر لیا تھا ایمان لانے کے بعد تو اب چکھو عذاب (کی اذیتیں) بوجہ اس کفر کے جو تم کیا کرتے تھے۔ اور وہ (خوش نصیب) لوگ روشن ہوں گے جن کے چہرے تو وہ رحمت الٰہی (کے سائے) میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ یعنی قیامت کے دن جب وہ اپنی قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو مومنین کے چہرے روشن اور سفید ہوں گے اور کافروں کے منہ کالے ہوں گے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نامہ اعمال پڑھنے کے وقت ہوگا جب مومن اپنا نامہ عمل پڑھے گا اور اس میں اپنی نیکیاں دیکھے گا تو وہ انتہائی خوش ہوگا اور اس کا چہرہ چمک اٹھے گا اور جب کافر اور منافق اپنا نامہ عمل پڑھیں گے اور اس میں اپنی برائیاں اور گناہ دیکھیں گے تو ان کا چہرہ سیاہ کالا ہو جائے گا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: بے شک ایسا میزان کے پاس ہوگا کہ جب اس کی نیکیاں بھاری ہو جائیں گی تو اس کا چہرہ روشن ہو جائے گا اور جب (کافر) کے گناہ بھاری ہو جائیں گے تو اس کا منہ سیاہ ہو جائے گا۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے وقت ہوگا وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ (یٰس)

اور کہا جاتا ہے: جب قیامت کا دن ہوگا تو ہر فریق کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنے معبود کے پاس جمع ہو جائیں، پس جب وہ اس تک پہنچیں گے تو پریشان اور غمزدہ ہو جائیں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے، پس مومنین، اہل کتاب اور منافقین باقی رہ جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ مومنوں کو فرمائے گا: مَنْ رَّبُّكُمْ؟ تمہارا رب کون ہے؟ تو وہ عرض کریں گے: ربنا اللہ عزوجل ہمارا رب اللہ عزوجل ہے۔ تو وہ انہیں فرمائے گا: "کیا تم اسے پہچان لو گے جب تم اسے دیکھو گے؟" تو وہ عرض کریں گے: اس کی ذات پاک ہے! جب اس نے اعتراف کر لیا تو ہم اسے پہچان لیں گے، پس وہ اس کا دیدار کرنے لگیں گے جیسے اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ اور مومنین اللہ تعالیٰ کے لئے سجدے میں گر جائیں گے اور ان کے چہرے برف کی مثل سفید ہو جائیں گے اور منافقین اور اہل کتاب باقی رہ جائیں گے، وہ سجدہ کرنے پر قادر نہیں ہوں گے تو غمزدہ ہو جائیں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے اور اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ اور اس کی قرأت میں تبیض و تسود دونوں تا کو مکسور پڑھنا بھی جائز ہے۔ کیونکہ آپ کہتے ہیں: اِبْیَضَّتْ، پس تا کو اسی طرح کسرہ دیا جاتا ہے جیسے اس میں الف کو...... اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے اور اسی کے مطابق یحییٰ بن وثاب نے پڑھا ہے اور زہری نے یوم تبیاض و تسواد پڑھا ہے۔ اور تا کو مکسور پڑھنا بھی جائز ہے اور یوم ییبیض وجوہ جمع مذکر کی بنا پر یا کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور اُقِّتَتْ کی مثل اُجُوْهٌ بھی جائز ہے۔ اور ابیضاض الوجوہ سے مراد ان کا نعمتوں کے ساتھ چمک اٹھنا اور روشن ہونا ہے اور ان کی سیاہی سے مراد وہ ہے جو دردناک عذاب میں سے ان پر چھا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اور علماء نے تعیین میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل سنت کے چہرے روشن (اور منور) ہوں گے اور اہل بدعت کے منہ سیاہ کالے ہوں گے۔

(مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کو مالک بن سلیمان ہروی غسان کے بھائی نے مالک بن انس سے انہوں نے حضرت نافع سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول باری تعالیٰ یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ کے بارے میں ارشاد فرمایا: یعنی تبیض وجوہ اھل السنۃ و تسود وجوہ اھل البدعۃ۔ اسے ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے ذکر کیا ہے۔ اور اس میں کہا ہے: یہ مالک کی حدیث میں سے منکر ہے۔

حضرت عطا نے کہا ہے: مہاجرین و انصار کے چہرے روشن ہوں گے اور بنی قریظہ اور نضیر کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ اور حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے وہ کفار ہیں اور ان کو کہا جائے گا: کیا تم نے کفر اختیار کر لیا تھا ایمان لانے کے بعد کیونکہ تم نے اس وقت اقرار کیا تھا جب تم حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے چونٹیوں کی مثل نکالے گئے تھے۔ اسے علامہ طبری نے اختیار کیا ہے: حسن نے کہا ہے: یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے۔ قتادہ نے کہا ہے: یہ مرتدین کے بارے ہے۔ عکرمہ نے کہا ہے: وہ اہل کتاب میں سے ایک قوم ہے۔ وہ اپنے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرتے تھے اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کی بھی تصدیق کرتے تھے لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ کے ساتھ کفر کیا۔ پس اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ اسے بھی زجاج نے اختیار کیا ہے۔ اور مالک بن انس نے کہا ہے: یہ اہل اھواء کے بارے ہے۔

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ یہ حروریہ کے بارے ہے۔ اور ایک دوسری خبر میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ قدریہ کے بارے ہے۔ اور ترمذی نے ابو غالب سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا: ابوامامہ رضی اللہ عنہ باب دمشق پر کھڑے کئے گئے سروں کو دیکھا (1)، تو حضرت ابوامامہ نے کہا: جہنمی کتے ہیں آسمان کی چھت کے نیچے شریر ترین مقتول ہیں، بہترین اور اچھے نیکوکار مقتول وہ تھے جنہیں انہوں نے قتل کیا تھا...... پھر آپ نے یہ آیت پڑھی یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ الی آخر الایۃ۔ میں نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کو کہا: کیا تم نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ تو انہوں نے کہا: اگر میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہوتا سوائے ایک بار یا دو بار یا تین بار کے...... یہاں تک کہ انہوں نے سات بار تک گنا...... تو میں تمہیں یہ بیان نہ کرتا۔ (امام ترمذی نے) کہا: یہ حدیث حسن ہے۔

اور صحیح بخاری میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ میں تمہارے لئے حوض (کوثر) پر پہلے موجود ہوں گا جو کوئی میرے پاس سے گزرے گا وہ وہاں سے پئے گا اور جس نے (ایک بار) پی لیا وہ کبھی پیاس محسوس نہیں کرے گا یقیناً کئی گروہ میرے پاس آئیں گے میں انہیں پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے پھر میرے اور ان کے درمیان کچھ حائل کر دیا جائے گا۔"

ابو حازم نے کہا ہے: نعمان بن ابی عیاش نے مجھے سنا اور کہا: کیا تو نے سہل بن سعد سے اسی طرح سنا ہے؟ میں نے کہا:

1۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 2926، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہاں۔ تو اس نے کہا: میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر تھا اور میں نے آپ سے سنا، وہ اس میں یہ اضافہ بیان کرتے تھے: ''تو میں کہوں گا بلاشبہ وہ تو میرے ہیں تو کہا جائے گا بلاشبہ آپ نہیں جانتے جو کچھ انہوں نے آپ کے بعد کیا ہے۔ اس کے لئے ہلاکت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری ہے جس نے میرے بعد (دین) تبدیل کر لیا۔'' (1)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اصحاب کا ایک گروہ قیامت کے دن میرے پاس حوض پر آئے گا، تو انہیں حوض سے نکال دیا جائے گا تو میں کہوں گا اے میرے پروردگار! میرے اصحاب ہیں تو وہ فرمائے گا آپ کے علم میں وہ نہیں ہے جو کچھ انہوں نے آپ کے بعد کیا ہے بلاشبہ یہ لوگ الٹے پاؤں لوٹ کر مرتد ہو گئے۔'' (2)

اس معنی میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔ پس جس نے اللہ تعالیٰ کے دین میں تغیر و تبدل کیا یا ایسی بدعت کا ارتکاب کیا جس سے اللہ تعالیٰ راضی نہ ہو اور نہ اس کے بارے اللہ تعالیٰ اجازت دے تو وہ حوض سے بھگائے جانے والوں میں سے ہوگا اور اس سے دور رہنے والوں میں سے ہوگا جن کے چہرے سیاہ ہوں گے اور ان میں سب سے زیادہ مطرود اور بعید وہ ہوگا جس نے جماعت مسلمین سے اختلاف کیا اور ان کے راستہ سے علیحدہ ہو گیا جیسا کہ خوارج اپنے مختلف فرقوں کی بنا پر اور روافض اپنی واضح گمراہی کی بنا پر اور معتزلہ طرح طرح کی خواہشات اور ہوس پرستی کی بنا پر، یہ تمام کے تمام دین میں تبدیلی لانے والے اور بدعت کا ارتکاب کرنے والے ہیں اور اسی طرح وہ ظالم جو ظلم و ستم میں، حق کو مٹانے میں اور اہل حق کو قتل اور ذلیل و رسوا کرنے میں انتہائی زیادتی کرنے والے ہیں اور وہ جو اعلانیہ گناہ کبیرہ کرنے والے ہیں اور جو معاصی اور گناہوں کو حقیر اور ہلکا سمجھنے والے ہیں اور راہ حق سے انحراف کرنے والوں، خواہش پرستوں اور بدعت کا ارتکاب کرنے والوں کی جماعت، ان تمام کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہی اس آیت سے مراد ہوں۔ اور مثال اسی طرح ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے، کسی کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں رکھا جائے گا سوائے اس انکار کرنے والے کافر کے جس کے دل میں رائی کے دانے برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔

اور ابن قاسم نے کہا ہے: کبھی اہل اھواء کے سوا بھی کوئی ایسا ہوتا ہے جو اہل اھواء کی نسبت زیادہ شریر ہوتا ہے یہ کہتے ہیں: اخلاص کی تکمیل گناہوں سے اجتناب کرنا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اس کلام میں حذف ہے یعنی فیقال لهم۔ (تو انہیں کہا جائے گا) اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ (کیا تم نے کفر اختیار کر لیا تھا ایمان لانے کے بعد) یعنی یوم میثاق کو جب انہوں نے کہہ دیا بلیٰ (ہاں تو ہمارا رب ہے) اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ یہود کے لئے ہے۔ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے ساتھ ایمان رکھتے تھے لیکن جب آپ تشریف لائے تو انہوں نے (آپ کا انکار کیا اور) آپ کے ساتھ کفر کیا۔ اور ابو العالیہ نے کہا: یہ خطاب منافقین کے لئے ہے کہا جائے گا: کیا تم نے سراً اور خفیۃً کفر کیا تھا اعلانیہ اقرار کرنے کے بعد۔ اور اہل عرب کا اس پر اجماع ہے کہ اَمَّا کے جواب میں فالانا ضروری ہے کیونکہ اس کا معنی میرے اس قول میں ہے: أما زيد فمنطلق،

1۔ صحیح بخاری، باب فی الحوض و قول تعالیٰ انا اعطیناک الکوثر، حدیث نمبر 6097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً، حدیث نمبر 6098، ایضاً

مھمایکن من شئ فزید منطلق۔

اور قول باری تعالیٰ: وَ اَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ یہ سب اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے والے اور اس کے عہد کو پورا کرنے والے لوگ ہوں گے۔ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ یعنی وہ ہمیشہ اس کی جنت اور دار عزت و کرامت میں باقی رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں انہیں میں سے بنائے اور بدعتوں اور ضلالتوں کی راہوں سے ہمیں بچائے اور محفوظ رکھے اور ہمیں ان کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کرتے رہے۔ آمین۔

تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ مَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

''یہ اللہ کی آیتیں ہیں ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو ٹھیک ٹھیک اور نہیں ارادہ رکھتا اللہ ظلم کرنے کا دنیا والوں پر۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے کام۔''

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ یہ مبتدا اور خبر ہے اور مراد قرآن کریم ہے۔ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ یعنی آپ پر جبریل امین کو نازل کرتے ہیں سو وہ آپ پر آیات پڑھتا ہے۔ بِالْحَقِّ یعنی صدق وسچائی کے ساتھ۔ اور زجاج نے کہا ہے: تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ یہ آیات جو ذکر کی گئی ہیں اللہ تعالیٰ کی حجتیں اور اس کے دلائل ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تِلْكَ بمعنی ھذہٖ ہے۔ لیکن جب یہ گزر گئیں تو اس طرح ہو گئیں گویا یہ دور اور بعید ہیں۔ لہٰذا تِلْكَ ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اٰیٰتُ اللّٰهِ، تِلْكَ سے بدل ہو۔ اور وہ نعت اور صفت نہ ہو، کیونکہ مبہم مضاف کے ساتھ نعت نہیں بن سکتا۔ وَ مَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ یعنی وہ انہیں بغیر گناہ کے عذاب نہ دے گا۔ وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ۔ مہدوی نے کہا ہے کہ اس کی ماقبل کے ساتھ وجہ اتصال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مومنین اور کافرین کے احوال کا ذکر کیا اور یہ کہ وہ دنیا والوں پر ظلم نہیں کرے گا، تو اس کے متصل بعد اپنی قدرتوں کی وسعت اور ظلم سے اپنے مستغنی ہونے کا ذکر کیا، اس لئے کہ جو کچھ زمین وآسمان میں ہے وہ سب اس کے قبضہ میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ابتدائے کلام ہے، اس نے اپنے بندوں کے لئے بیان کیا ہے کہ زمین وآسمان میں سب کا سب اسی کا ہے یہاں تک کہ وہ اسی سے سوال کریں اور اسی کی عبادت کریں اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔

كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

''ہو تم بہترین امت جو ظاہر کی گئی ہے لوگوں (کی ہدایت وبھلائی) کے لئے تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو

برائی سے اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو یہ بہتر ہوتا ان کے لئے بعض ان میں سے مومن ہیں اور زیادہ ان میں سے نافرمان ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ ترمذی نے بھز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ کی سند سے یہ روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے قول باری تعالیٰ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: "تم ستر امتوں کو مکمل کرنے والے ہو تم ان میں بہتر ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان سے زیادہ مکرم و محترم ہو" اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔(1)

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ہم لوگوں کے لئے لوگوں کی نسبت بہترین (اور نفع بخش) ہیں ہم انہیں زنجیروں کے ساتھ اسلام کی طرف کھینچ کر لا رہے ہیں (2)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس نے ان کے کام کی طرح کام کیا وہ انہیں کی مثل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہے یعنی جو ان میں سے صالحین اور اہل فضل ہیں۔ اور وہ قیامت کے دن لوگوں پر شاہد ہوں گے جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: "تم آیت میں ذکر کردہ شرائط کی بنا پر بہترین امت ہو جو لوگوں کی ہدایت و بھلائی کے لئے ظاہر کی گئی ہے۔"

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم لوح محفوظ میں ہو (3) اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم جب سے ایمان لائے ہو بہترین امت ہو۔ اور کہا گیا ہے: یہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت کے ساتھ پہلے آنے والوں کے لئے بشارت کے طور پر آئی ہے۔ سو معنی یہ ہے کہ تم اپنے سے پہلے آنے والے اہل کتاب کے نزدیک بہترین امت ہو۔ اور اخفش نے کہا ہے: مراد اہل امت، یعنی بہترین دین والے ہیں۔

اور کسی شاعر نے کہا:

حلفتُ فلم اترك لنفسك ريبةً وهل يأثَمَنْ ذو اُمَّةٍ وهو طائع

میں نے قسم کھائی سو میں نے تیری ذات کے لئے کوئی شک نہیں چھوڑا اور کیا دیندار گناہ کرے گا حالانکہ وہ طاعت شعار اور فرمانبردار ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ کان تامہ ہے اور معنی ہے تم پیدا کئے گئے اور تم بہترین امت قرار پائے گئے۔ اور خَيْرَ أُمَّةٍ حال ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: کان زائدہ ہے اور معنی ہے انتم خیر امۃ (تم بہترین امت ہو)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن من سورۃ آل عمران، جلد 2، صفحہ 125، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث 4277، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 531۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 4191، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 531

اور سیبویہ نے کہا ہے:

وَ جِیْرَانٍ لنا کانوا کِرَامٍ

(اور ہمارے عزت و اکرام والے پڑوسی ہیں) اس میں کان زائدہ ہے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا ۞ (مریم) (ہم کیسے بات کریں اس سے جو گہوارہ میں (کمسن بچہ ہے۔) اور وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِیْلًا فَكَثَّرَكُمْ (الاعراف:86) (اور یاد کرو (وہ وقت) جب تم تھوڑے تھے پھر اس نے تمہیں بڑھا دیا) اور دوسرے مقام پر فرمایا: وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ (الانفال:26) (اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے۔) اور سفیان نے میسرہ اشجعی سے، انہوں نے ابو حازم سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے تحت روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: تم لوگوں کو زنجیروں کے ساتھ اسلام کی طرف کھینچ کر لاتے ہو(1)۔ نحاس نے کہا ہے: اس کے مطابق تقدیر کلام اس طرح ہے کنتم للناس خیر امۃ تم لوگوں کے لئے بہترین امت ہو۔

اور حضرت مجاہد کے قول کے مطابق تقدیر کلام یہ ہے: کنتم خیر امۃ اذ کنتم تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر (تم بہترین امت ہو جبکہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔) اور یہ قول بھی ہے: حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت بہترین امت ہوگئی کیونکہ ان میں سے مسلمان زیادہ ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان میں عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کے لئے ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خیر الناس قرنی۔ بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جن میں مجھے مبعوث کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب قرآن کی نص سے ثابت ہو گیا کہ یہ امت تمام امتوں سے بہتر اور افضل ہے۔ ائمہ نے عمران بن حصین سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملتے ہیں (یعنی تابعین) پھر وہ جو ان کے ساتھ ملتے ہیں (یعنی تبع تابعین)''(2) (الحدیث) یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس امت کے پہلے لوگ بعد میں آنے والوں سے افضل ہیں، یہی موقف جید اور عظیم علماء نے اپنایا ہے اور یہ کہ جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اختیار کی اور آپ کو دیکھا اگرچہ عمر میں ایک ہی بار، وہ آپ کے بعد آنے والوں سے افضل ہے اور یہ کہ فضیلت صحبت کے برابر مساوی کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔

ابو عمر بن عبد البر اس طرف گئے ہیں کہ کبھی کوئی وصف صحابہ کرام کے بعد آنے والے میں اس سے افضل ہو سکتا ہے جو جملہ صحابہ کرام میں تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد: خیر الناس قرنی۔ اپنے عموم پر نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں بھی

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 531

2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل صحابہ، باب فضل الصحابہ ثم الذین یلونھم، جلد 2، صفحہ 309، اسلام آباد۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 2457، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فاضل اور مفضول دونوں قسم کے لوگ جمع تھے۔ آپ کے زمانہ میں منافقین کی وہ جماعت جو ایمان کا اظہار کرتے تھے اور وہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے جن پر یا ان میں سے بعض پر حدود قائم کی گئیں سبھی جمع تھے۔ اور آپ نے ان کے لئے ہی کہا: جو تم چور، شرابی اور زانی کے بارے میں کہتے ہو۔ اور آپ نے اپنے زمانے کے لوگوں کے سامنے فرمایا: لا تسبّوا اصحابی (تم میرے صحابہ کرام کو گالی گلوچ نہ دو۔ (1)) اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے فرمایا: لا تسبب من هو خير منك (تو اسے گالی نہ دے جو تجھ سے بہتر ہے) اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طوبى لمن رآني و آمن بي طوبى سبع مرات لمن لم يرني و آمن بي (سعادت ہے اس کے لئے جس نے مجھے دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا اور سات بار سعادت ہے اس کے لئے جس نے مجھے نہیں دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا)

اور مسند ابی داؤد الطیالسی میں عن محمد بن ابی حمید عن زید بن اسلم عن ابیه عن عمر رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت موجود ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو آپ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کون سی مخلوق ایمان کے اعتبار سے افضل ہے۔'' ہم نے عرض کی ''ملائکہ'' آپ نے فرمایا: ''ان کے بارے تو حق ہے ان کے علاوہ کون ہیں؟'' ہم نے عرض کی انبیاء علیہم السلام۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان کے بارے تو حق ہے بلکہ ان کے علاوہ کون ہے'' بعد از اں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایمان کے اعتبار سے مخلوق میں سے افضل وہ قوم ہے جو ابھی مردوں کی صلبوں میں ہے وہ میرے ساتھ ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں وہ ورق (کتاب) پائیں گے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے مطابق عمل کریں گے پس وہی ایمان کے اعتبار سے افضل الخلق ہیں۔''

اور صالح بن جبیر نے ابو جمعہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم سے کوئی بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں وہ لوگ جو تمہارے بعد آئیں گے اور دو تختیوں کے درمیان ایک کتاب پائیں گے جو کچھ اس میں ہے اس کے ساتھ وہ ایمان لے آئیں گے اور وہ میرے ساتھ ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں۔'' اور ابو عمر نے کہا ہے: ابو جمعہ صحابی ہیں اور ان کا نام حبیب بن سباع ہے اور صالح بن جبیر ثقہ تابعین میں سے ہیں۔ اور حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ تمہارے ایسے دن آنے والے ہیں کہ ان میں اپنے دین پر ثابت قدم رہنے والا انگارہ پکڑنے والے کی طرح ہوگا ان میں عمل کرنے والے کے لئے اس کی مثل عمل کرنے والے پچاس آدمیوں کا اجر ہوگا (2)'' (یعنی ان کے اجر کی مثل اسے اجر دیا جائے گا) عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ان میں سے (پچاس آدمیوں کی مثل)؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(نہیں) بلکہ تم میں سے'' (پچاس آدمیوں کی مثل)۔

ابو عمر نے کہا: بل منکم کے الفاظ سے بعض محدثین خاموش ہیں۔ اور انہوں نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے قول باری تعالیٰ: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی تاویل میں کہا ہے: جس نے تمہارے فعل کی مثل فعل کیا وہ تمہاری مثل ہے۔ احادیث کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ پہلی (روایات) خصوصیت کی بنا پر ہیں۔ واللہ الموفق۔

1۔ مسلم کتاب فضائل صحابہ، باب تحریم سبّ الصحابہ، جلد 2، صفحہ 310

2۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، حدیث نمبر 4003، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس باب کی احادیث کی توجیہ میں یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کو اس بنا پر فضیلت دی گئی ہے کیونکہ وہ لوگ کفار کی کثرت، ان کی اذیتوں پر اپنے صبر کرنے اور اپنے دین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھنے کے سبب اپنے ایمان میں غرباء تھے اور بلاشبہ اس امت کے آخر میں آنے والے لوگوں نے جب دین کو قائم کیا اور اسے مضبوطی سے تھام لیا اور جب شر، فسق، فتنہ وفساد، گناہ اور کبائر کے ظہور کے وقت وہ اپنے رب کی اطاعت وفرمانبرداری پر ثابت قدم رہے تو اس وقت وہ بھی غرباء ہو گئے اور اس وقت میں ان کے اعمال اسی طرح پاکیزہ رہے جس طرح پہلے لوگوں کے اعمال پاکیزہ تھے اور اس کی شہادت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی دیتا ہے: بدأ الاسلام غریبا و سیعود کما بدأ فطوبی للغرباء (اسلام کا آغاز ہوا درآنحالیکہ وہ غریب تھا اور عنقریب اس حالت کی طرف لوٹ جائے گا جیسے شروع ہوا تھا پس غرباء کے لئے مبارکباد اور سعادتمندی ہے (1)"۔ اور ابو ثعلبہ کی حدیث بھی اس کی شہادت دیتی ہے اور اس کی شہادت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد بھی دیتا ہے۔ "میری امت بارش کی طرح ہے یہ معلوم نہیں ہو سکتا اس کا اول بہتر ہے یا اس کا آخر" اسے ابوداؤد طیالسی اور ابو عیسیٰ ترمذی نے ذکر کیا ہے اور اسے ہشام بن عبید اللہ رازی نے مالک سے، انہوں نے زہری سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مثلُ امّتی مثل المطر لایُدْرَی أوّله خیرٌ أم اٰخرہ (2)۔ اسے دارقطنی نے مسند حدیث مالک میں ذکر کیا ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: ہشام بن عبید اللہ ثقہ راوی ہے محدثین اس میں اختلاف نہیں کرتے۔

اور روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت کے والی بنے تو آپ نے حضرت سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی طرف لکھا کہ میری طرف حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی سیرت لکھو تا کہ میں اس کے مطابق (عمل) کروں، تو حضرت سالم رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف لکھا: اگر تم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت پر عمل کیا تو پھر تم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے افضل ہو کیونکہ تمہارا زمانہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی طرح نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آدمیوں کی طرح ہیں۔ راوی کا بیان ہے: اور آپ نے اپنے زمانہ کے فقہاء کی طرف لکھا تو ان تمام نے بھی آپ کی طرف حضرت سالم رضی اللہ عنہ کے قول کی طرح ہی لکھا۔

بعض اجل علماء نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد خیر الناس قرنی کا اس ارشاد کو معارض قرار دیا ہے: خیر الناس من طال عمرہ و حسن عملہ و شر الناس من طال عمرہ و ساء عملہ (3) (لوگوں میں سے بہتر اور اچھا وہ ہے جس کی عمر طویل ہوئی اور اس کا عمل حسین وجمیل رہا۔ اور لوگوں میں سے شریر وہ ہے جس کی عمر طویل ہوئی اور اس کا عمل برا رہا) ابو عمر نے کہا: یہ احادیث اپنی اسناد کے تواتر اور حسن ہونے کے ساتھ اس امت کے اول اور اس کے آخر کے درمیان مساوات اور

1۔ جامع الترمذی، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 547، اسلام آباد۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، حدیث 3975، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 84، اسلام آباد
2۔ جامع ترمذی، کتاب الامثال باب ماجاء فی صلوات الخمس، جلد 2، صفحہ 110/577، اسلام آباد
3۔ جامع ترمذی، کتاب الزھد باب ماجاء فی طول العمر للمؤمن، جلد 2، صفحہ 56، اسلام آباد
ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الزھد باب ماجاء فی طول العمر للمؤمن، حدیث نمبر 2252، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

برابری کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور اس کا معنی وہی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ ایمان لانا اور عمل صالح کرنا ایسے زمانہ میں جو فاسد ہو چکا ہے اور اس میں اہل علم و دین کو اٹھا لیا جائے گا اور اس میں فسق اور فتنہ و فساد وافر ہو جائے گا اور مومن کو ذلیل و رسوا کیا جائے گا اور فاجر کی عزت و تکریم کی جائے گی۔ اور دین غربت کی طرف لوٹ آئے گا جیسا کہ شروع میں غریب تھا...... اور اس میں دین پر قائم رہنے والا انگارہ پکڑنے والے کی طرح ہو گا۔ پس اس وقت اس امت کا اول عمل کی فضیلت میں اس کے آخر کے ساتھ برابر ہو جائے گا، سوائے اہل بدر اور حدیبیہ کے اور جس نے اس باب کے آثار میں تدبر اور غور و فکر کیا تو اس کے لئے یہ صحیح اور سیدھی راہ ہے۔ واللہ یوتی فضلہ من یشاء۔ (اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اسے اپنا فضل عطا فرما دیتا ہے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ یہ اس امت کی مدح ہے کہ جس دین پر وہ قائم ہیں اور وہ اس کے ساتھ متصف ہیں۔ اور جب انہوں نے تبدیلی کو چھوڑ دیا اور منکر (گناہ کا عمل) پر اتفاق کر لیا تو ان سے مدح و تعریف کا اسم ختم اور زائل ہو گیا۔ اور انہیں ذم اور برائی کا نام لاحق ہو گیا...... اور وہی ان کی ہلاکت اور بربادی کا سبب بن گیا...... اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے کلام سورۃ کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ۔ یہ خبر دی ہے کہ اہل کتاب کا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانا ان کے لئے بہتر تھا اور یہ خبر دی ہے کہ ان میں مومن اور فاسق دونوں قسم کے لوگ ہیں۔ البتہ فاسق زیادہ ہیں۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝

"(کچھ) نہ بگاڑ سکیں گے تمہارا سوائے ستانے کے اور اگر لڑیں گے تمہارے ساتھ تو پھیر دیں گے تمہاری طرف اپنی پیٹھیں (اور بھاگ جائیں گے) پھر ان کی امداد نہ کی جائے گی۔"

قولہ تعالیٰ: لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى یعنی ان کا جھٹلانا تحریف کرنا اور ان کا بہتان لگانا (تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا) اور نہ ہی ان کو غلبہ حاصل ہو گا۔ یہ حسن اور قتادہ سے منقول ہے۔ اور استثنا متصل ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں سوائے معمولی ضرر اور تکلیف کے کوئی ضرر اور نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، پس الاذی مصدر کے محل میں واقع ہے اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے لئے ایک وعدہ ہے کہ اہل کتاب ان پر غالب نہ آسکیں گے اور یہ کہ ان کی ان کے خلاف مدد کی جائے گی اور انہیں ان کی طرف سے سوائے بہتان اور تحریف کی اذیت کے اور کوئی بگاڑ اور استیصال نہیں پہنچے گا اور رہا انجام (اور آخرت) تو وہ مومنین کے لئے ہی ہو گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استثنا منقطع ہے اور معنی ہے وہ بالیقین تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکیں گے، البتہ وہ تمہیں اس کے ساتھ اذیت دیں گے جو کچھ تمہیں سنائیں گے۔ مقاتل نے کہا ہے: سرداران یہود کعب، عدی، نعمان، ابو رافع، ابو یاسر، کنانہ اور ابن صوریا وہ اپنے میں سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی طرف جاتے اور انہیں ان کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے ستاتے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى (1) یعنی سوائے زبانی اذیت کے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ یہاں کلام مکمل ہو گیا۔ پھر فرمایا: وَاِنْ

1۔ اسباب النزول، صفحہ 78

يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْاَدْبَارَ اور اگر وہ تمہارے ساتھ لڑیں گے تو شکست خوردہ ہو کر بھاگ جائیں گے، یہ کلام بھی مکمل ہو گیا۔ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ یہ نیا کلام ہے اسی لئے ان میں نون ثابت ہے۔ اور اس آیت میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے معجزہ ہے، کیونکہ یہودیوں میں سے جو بھی لڑا وہ اپنی پیٹھ پھیر کر بھاگ گیا۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿١١٢﴾ لَيْسُوْا سَوَاۗءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿١١٣﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١١٤﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿١١٥﴾

''مسلط کر دی گئی ہے ان پر ذلت (ورسوائی) جہاں کہیں یہ پائے گئے بجز اس کے کہ اللہ کے عہد سے یا لوگوں کے عہد سے (کہیں پناہ مل جائے) اور یہ مستحق ہو گئے ہیں غضب الٰہی کے اور مسلط کر دی گئی ہے ان پر محتاجی، یہ اس لئے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے اللہ کی آیتوں سے اور قتل کیا کرتے تھے انبیاء کو ناحق یہ (بے باکی) اس لئے تھی کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور سرکشی کیا کرتے تھے۔ سب یکساں نہیں اہل کتاب سے ایک گروہ حق پر قائم ہے یہ تلاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی رات کے اوقات میں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔ ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روز آخرت پر اور حکم دیتے ہیں بھلائی کا اور منع کرتے ہیں برائی سے اور جلدی کرتے ہیں نیکیوں میں اور یہ لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں۔ اور جو یہ کریں گے نیک کاموں سے تو ہرگز انکار نہ کیا جائے گا اس کار خیر کا۔ اور اللہ جاننے والا ہے پرہیزگاروں کو۔''

قولہ تعالیٰ: ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ یعنی جہاں کہیں یہ پائے گئے اور یہ ملے۔ کلام مکمل ہوا۔ اور ان پر ذلت مسلط کرنے کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ یہ استثنا منقطع ہے یہ اول کا جز نہیں ہے۔ یعنی بجز ان کے جو اللہ تعالیٰ سے عہد کو مضبوط کرتے ہیں۔ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ مراد وہ ذمہ داری (معاہدہ) ہے جو لوگوں کی جانب سے ان پر ہے۔ اور النَّاسِ سے مراد حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور وہ مومنین ہیں جنہیں وہ خراج ادا کرتے ہیں اور وہ انہیں امن اور پناہ دیتے ہیں۔ کلام میں اختصار ہے اور معنی یہ ہے: الا ان یعتصموا بحبل من اللہ، پھر اس سے فعل کو حذف کر دیا گیا ہے۔

فراء نے یہی کہا ہے۔ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ یعنی وہ لوٹ آئے ہیں اللہ کے غضب کی طرف۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ

بمعنی احتملوا ہے یعنی انہوں نے اللہ کا غضب اٹھایا، برداشت کیا۔ اور لغت میں اس کا اصل معنی ہے کہ ان پر غضب لازم ہو گیا۔ اور سورۃ البقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ پھر خبر دی کہ ان کے ساتھ یہ کیوں کیا گیا، تو فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ اس کی مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ پھر خبر دی اور فرمایا: لیسوا سواء وہ سب برابر نہیں۔ اور کلام مکمل ہو گیا اور معنی یہ ہے کہ اہل کتاب اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت برابر اور یکساں نہیں (1)۔ اور ابوخیثمہ زہیر بن حرب نے بیان کیا ہے حدثنا ھاشم بن القاسم حدثنا شیبان عن عاصم عن زر عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ آپ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے [ایک رات] عشاء کی نماز مؤخر فرمائی پھر آپ مسجد کی طرف تشریف لے گئے تو دیکھا لوگ نماز کے لئے انتظار کر رہے ہیں تو آپ نے فرمایا: "بلاشبہ تمہارے سوا اہل ادیان میں سے کوئی بھی نہیں ہے جو اس وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہوں۔" فرمایا: اور یہ آیت نازل کی گئی لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ (2) ابن وہب نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ یعنی وہ جو حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ ایمان لائے۔

اور ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے جب حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، ثعلبہ بن سعیہ، اسید بن سعیہ اور اسید بن عبید اسلام لائے اور جو بھی یہود میں سے اسلام لایا، پس وہ ایمان لائے، انہوں نے تصدیق کی، اسلام کی طرف راغب ہوئے اور اس میں پختگی اور رسوخ حاصل کیا، تو یہودی علماء اور ان میں سے اہل کفر کہتے: محمد (ﷺ) کے ساتھ نہ ایمان لائے اور نہ ہی آپ کی اتباع و پیروی کی مگر ہمارے شریر لوگوں نے، اگر وہ ہمارے اچھے اور نیک لوگوں میں سے ہوتے تو اپنے آباؤ اجداد کے دین کو نہ چھوڑتے اور کسی غیر کی طرف نہ جاتے، تو ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ ارشاد نازل فرمایا (3): لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

اور اخفش نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے من اھل الکتاب ذو امۃ، ای ذو طریقۃ حسنۃ (4)۔ یعنی اچھے طریقے اور راستے والے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

و ھل یأثمن ذو اُمۃ و ھو طائع

(کیا اچھے طریقے والا گناہ کرتا ہے حالانکہ وہ اطاعت و فرمانبرداری کر رہا ہے۔)

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 295 2۔ اسباب النزول، صفحہ 79 3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 534 4۔ ایضاً

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے اور تقدیر کلام ہے من اهل الکتاب امّة قائمة و أخرى غير قائمة۔ پس پہلے پر اکتفا کرتے ہوئے دوسرے کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ابوذؤیب کا قول بھی ہے:

عصانی الیها القلبُ اِنّی لأمرهٖ مطیعٌ فما ادری أرُشْدٌ طِلابُها (1)

اس کی طرف مائل ہونے میں دل نے میرا ساتھ نہ دیا بلاشبہ میں تو اس کے حکم کا مطیع و فرمانبردار ہوں سو میں نہیں جانتا کہ اس سے (حق کا) مطالبہ کرنا ہدایت ہے (یا گمراہی)۔ تو اس میں مراد أرُشْدٌ ام غَیٌّ ہے اور اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

فراء نے کہا ہے: امّة، سواء کے سبب مرفوع ہے (2) اور تقدیر عبارت ہے: لیس یستوی امّة من اهل الکتاب قائمة یتلون آیات الله و امة کافرة۔ (اہل کتاب میں سے ایک گروہ جو حق پر قائم ہے وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں وہ اور کفر کرنے والا گروہ برابر نہیں ہیں۔)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول کئی اعتبار سے غلط ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ امّة کو سواء کے ساتھ رفع دیا گیا ہے تو اس میں لیس کے اسم کی طرف لوٹنے والی کوئی شے نہیں ہے اور رفع ایسی شے کے سبب دیا جا رہا ہے جو فعل کے قائم مقام نہیں ہے اور اسے مضمر مانا جائے گا جس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ کافر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے لہٰذا اسے مضمر ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: یہ عربوں کے اس قول کی مثل ہے: اکلونی البراغیث (3) اور ذهبوا اصحابُك۔ نحاس نے کہا: یہ غلط ہے، کیونکہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور و أکلونی البراغیث ان کا پہلے ذکر نہیں ہوا۔

اور اٰنَآءَ الَّیۡلِ اس سے مراد رات کی ساعتیں ہیں (4)۔ اس کا واحد اِنًی و أَنًی اور اِنۡیٌ ہے۔ اور یہ ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یَسۡجُدُوۡنَ بمعنی یصلون (وہ نماز پڑھتے ہیں) ہے۔

یہ فراء اور زجاج سے مروی ہے، کیونکہ تلاوت رکوع و سجود میں نہیں ہوتی۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَهٗ یَسۡجُدُوۡنَ۔ ای یصلون۔ اور سورۃ الفرقان میں ہے: وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ اور سورۃ النجم میں ہے فَاسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ وَ اعۡبُدُوۡا ۩ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد صرف معروف سجدہ ہی لیا جا رہا ہے۔ اور سبب نزول اسے رد کر رہا ہے اور یہ کہ مراد عشاء کی نماز ہے جیسا کہ ہم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے، پس بتوں کی پوجا کرنے والوں پر جونہی رات چھا جاتی ہے تو وہ سو جاتے اور موحدین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نماز عشاء کے لئے کھڑے ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جب ان کے قیام کا ذکر کیا تو فرمایا وَ هُمۡ یَسۡجُدُوۡنَ یعنی (سجدوں کے) ساتھ قیام بھی تھا۔ اور ثوری نے کہا ہے: یہ مغرب و عشاء کے درمیان کی نماز ہے (5) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قیام لیل کے بارے میں ہے۔ اور بنی شیبہ کے ایک آدمی سے روایت ہے وہ کتابیں پڑھتا تھا اس نے کہا: بلاشبہ ہم رب العالمین کے کلام میں سے ایک

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 492
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 534
5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 493

کلام پاتے ہیں۔ کیا اونٹ یا بکریاں چرانے والا گمان کرتا ہے جو کہ رات آتے ہی منفرد اور علیحدہ ہو (کر سو) جاتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو رات کے وقت قیام و سجود کرتا ہے؟ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا اقرار کرتے ہیں اور حضور نبی مکرم محمد ﷺ کی تصدیق کرتے ہیں۔ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ کہا گیا ہے کہ یہ کلام عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حضور نبی مکرم ﷺ کی اتباع و پیروی کا حکم ہے۔ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ نہی عن المنکر سے مراد آپ کی مخالفت سے منع کرنا اور روکنا ہے۔ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ یعنی وہ نیکی کے اعمال بغیر کسی بوجھ اور ثقل کے جلدی سے کرتے ہیں اس لئے کہ وہ ثواب اور اجر کی مقدار سے واقف و آگاہ ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ فوت ہونے سے پہلے اعمال کرنے میں جلدی اور تیزی کرتے ہیں۔ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ اور یہ لوگ صالحین کے ساتھ ہوں گے جنت میں اور وہ حضور نبی رحمت ﷺ کے اصحاب ہیں۔ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ اعمش، ابن وثاب، حمزہ، کسائی، حفص اور خلف نے دونوں فعلوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے، (اس لئے کہ یہ) امۃ قائمۃ کے بارے خبر ہے۔ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت ہے اور ابو عبید کی پسند ہے۔ اور باقیوں نے خطاب کی بنا پر دونوں کو تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اسے ابو حاتم نے اختیار کیا ہے اور ابو عمرو دونوں قرأتوں کو یعنی یا اور تا کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں۔ اور آیت کا معنی ہے: تم جو بھی نیک عمل کرو گے تو ہرگز تمہیں اس کے ثواب سے انکار نہیں کیا جائے گا بلکہ تمہاری قدر افزائی کی جائے گی اور اس پر تمہیں اجر و ثواب اور جزا دی جائے گی۔ (1)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۭ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

"بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہرگز نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے ذرہ بھر اور وہ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یہ اِنَّ کا اسم ہے اور اس کی خبر یہ ہے لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا مقاتل نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب میں سے مومنین کا ذکر کیا تو پھر ان کے کفار کا ذکر کیا اور وہ اس کا یہ قول ہے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور کلبی نے کہا ہے: اسے ابتداء بنایا اور فرمایا: بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے مال کی کثرت اور ان کی اولاد کی کثرت انہیں ہرگز اللہ کے عذاب سے ذرہ بھر نہیں بچا سکیں گے۔ اولاد کا ذکر خاص طور پر کیا گیا کیونکہ نسب کے اعتبار سے وہی ان کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ یہ مبتدا اور خبر ہیں اور اسی طرح هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ بھی ہے ان تمام کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 535

ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

''مثال اس کی جو وہ خرچ کرتے ہیں اس دنیوی زندگی میں ایسی ہے جیسے ہوا ہو اس میں سخت ٹھنڈک ہو (اور) لگے وہ ایک قوم کے کھیت کو جنہوں نے ظلم کیا ہو اپنے نفسوں پر پھر فنا کر دے اس کھیت کو۔ نہیں ظلم کیا ان پر اللہ تعالیٰ نے لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اس میں مَا یہ صلاحیت بھی رکھتا ہے کہ وہ مصدر یہ ہو اور یہ بھی کہ وہ بمعنی الذی ہو، اور ضمیر عائد محذوف ہو، یعنی مثل ما ینفقونہ۔ اور کمثل ریح کا معنی ہے کمثل مہب ریح (ہوا چلنے کی طرح) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: الصر کا معنی سخت ٹھنڈک ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی اصل الصریر ہے جس کا معنی آواز ہے، پس مراد شدید ہوا کی آواز ہے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ اس آگ کے بھڑکنے کی آواز ہے جو اس ہوا میں ہو۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور حدیث طیبہ میں ہے: بلاشبہ اس مکڑی کو کھانے سے منع کیا گیا ہے جسے سخت ٹھنڈی ہوا نے مار دیا ہو۔ اور آیت کا معنی ہے: کافروں کے خرچ کئے ہوئے مال کے باطل اور ضائع ہونے اور اس کے نفع بخش نہ ہونے کی مثال اس کھیتی اور فصل کی طرح ہے جسے سخت ٹھنڈی ہوا یا آگ لگی ہو اور اس نے اسے جلا کر خاکستر کر دیا ہو۔ اور اس کے مالکوں کو ذرہ بھر فائدہ نہ ہو حالانکہ وہ اس سے نفع اور فائدہ کی امید رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ان پر ظلم نہیں کیا وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ لیکن وہ خود ہی کفر و معصیت کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کے حق کا انکار کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ انہوں نے زراعت کے وقت کے بغیر اور اس کی جگہ کے بغیر کھیتی کاشت کی پس اللہ تعالیٰ نے انہیں ادب سکھایا، اس لئے کہ انہوں نے ایک شے کو غیر محل میں رکھا۔ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَ مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

''اے ایمان والو! نہ بناؤ اپنا راز دار غیروں کو وہ کسر نہ اٹھا رکھیں گے تمہیں خرابی پہنچانے میں وہ پسند کرتے ہیں جو چیز تمہیں ضرر دے، ظاہر ہو چکا ہے بغض ان کے مونہوں (یعنی زبانوں) سے اور جو چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے وہ اس سے بھی بڑا ہے۔ ہم نے صاف بیان کر دیں تمہارے لئے اپنی آیتیں اگر تم سمجھ دار ہو۔''

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی طرف میلان اور جھکاؤ رکھنے سے منع کرنے اور اس پر زجر و توبیخ کرنے کو مؤکد

کیا ہے۔ اور اس کا تعلق سابقہ اس ارشاد کے ساتھ ہے۔ ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب اور البطانۃ مصدر ہے اور اس کے ساتھ واحد اور جمع دونوں کا نام رکھا جا سکتا ہے اور بطانۃ الرجل سے مراد وہ خاص دوست اور افراد ہیں جو اس کے خفیہ معاملات پر بھی آگاہ ہوتے ہیں اور یہ اصل میں البطن سے ماخوذ ہے جو الظہر کے خلاف ہے۔ اور بطن فلان بفلان یبطن بطونا و بطانۃ جب کوئی کسی کے ساتھ خاص ہو اور اس کے اندرونی معاملات میں تہہ تک پہنچا ہوا ہو۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

اولئك خلصائی نعم و بطانتی و هم عیبتی من دون كل قریب

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس آیت کے ساتھ منع فرمایا ہے کہ وہ کفار، یہود اور اہل اھواء کو اپنے معاملات میں دخیل اور راز دار بنائیں کہ وہ آراء اور مشاورت میں ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کرے اور اپنے معاملات ان کے سپرد کر دیں۔ اور کہا جاتا ہے: کل من کان علی خلاف مذھبك و دینك فلا ینبغی لك ان تحادثه۔ یعنی ہر وہ جو تیرے مذہب اور تیرے دین کے خلاف ہے اس کے ساتھ تیرا مشاورت اور گفتگو کرنا مناسب نہیں۔

شاعر نے کہا:

عن المرء لا تسأل وسل عن قرینه فكل قرین بالمقارن یقتدی

ہر آدمی سے سوال نہ کر بلکہ اپنے ساتھی سے سوال کر پس ہر ساتھی اپنے مصاحب کی ہی اقتدی کرتا ہے اور سنن ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک کو اس کے بارے غور و فکر کرنی چاہیے جسے وہ دوست بنا رہا ہے۔''(1)

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم لوگوں کو ان کے بھائیوں (دوستوں) پر قیاس کرو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس معنی اور سبب کو بیان فرمایا جس کے لئے اس نے اس تعلق اور دوستی سے منع فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا: لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا، خبالا بمعنی فسادا ہے یعنی تمہارے فساد اور بربادی میں وہ کوئی کسر اور کمی نہیں چھوڑیں گے۔ یعنی بلا شبہ اگرچہ وہ ظاہر میں تمہارے ساتھ قتال اور جنگ نہیں کریں گے لیکن مکر و فریب اور دھوکہ دینے میں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قول باری تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان سے مراد خوارج ہیں۔'' اور روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک ذمی کو کاتب بنایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف شدید عتاب آمیز خط لکھا اور یہ آیت بھی ساتھ تحریر فرمائی۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الآداب باب من یومر ان یجالس، جلد 2، صفحہ 308۔

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی اخذ المال۔۔۔ الخ، حدیث 2300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی أخذ المال، جلد 2، صفحہ 60/513، اسلام آباد

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حساب لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور آپ کو وہ پیش کیا اور آپ کو تعجب میں ڈال دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک کتاب (تحریر) لائے اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تیرا کاتب کہاں ہے یہ کتاب لوگوں پر پڑھے؟ تو انہوں نے عرض کی: وہ تو مسجد میں داخل نہیں ہوگا۔ تو آپ نے فرمایا: کیوں! کیا وہ جنبی ہے؟ انہوں نے عرض کی: وہ نصرانی ہے، تو آپ نے انہیں خوب جھڑکا اور فرمایا۔ تو انہیں قریب نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دور کیا ہے اور تو ان کی عزت و تکریم نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل و رسوا کیا ہے اور تو انہیں امین نہ بنا جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خائن قرار دیا ہے۔ (لا تدنهم و قد اقصاهم الله ولا تكرمهم و قد اهانهم الله ولا تأمنهم قد خونهم الله)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: تم اہل کتاب کو عامل نہ بناؤ کیونکہ وہ سود اور رشوت کو حلال سمجھتے ہیں اور اپنے اموال اور اپنی رعایا پر ان لوگوں سے مدد طلب کرو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ (لا تستعملوا اهل الكتاب فانهم يستحلون الرشا واستعينوا على امور كم و على رعيتكم بالذين يخشون الله تعالى) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا گیا: یہاں حیرہ کی عیسائیوں میں سے ایک آدمی ہے اس سے بہتر لکھنے والا کوئی نہیں ہے اور نہ ہی قلم کے ساتھ اس سے اچھا کوئی لکھ سکتا ہے۔ کیا وہ آپ کی طرف سے کاتب نہ ہو جائے؟ تو آپ نے فرمایا: میں مومنین کے سوا کسی کو راز دار نہیں بناؤں گا (1)۔ پس اہل ذمہ کو کاتب بنانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کے سوا دیگر بیع و شراء کے معاملات میں سے کسی میں ان کا تصرف کرنا اور انہیں نیابت کی ذمہ داری سونپنا جائز ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس زمانے میں اہل کتاب کو کاتب اور امین بنانے کے سبب احوال بدل چکے ہیں اور وہ والیوں اور امراء کے کند ذہن اور جاہل ہونے کے سبب سردار بن گئے ہیں۔ امام بخاری نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ کوئی خلیفہ بنایا ہے مگر اس کے دو راز دان اور خواص ہیں ان میں سے ایک اسے نیکی کا حکم دیتا ہے اور اس پر برانگیختہ کرتا ہے اور دوسرا اسے شر کا حکم دیتا ہے اور اسے اس پر ابھارتا ہے پس معصوم (اور محفوظ) وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا (اور بچا لیا)۔ (2)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مشرکین کی آگ سے روشنی حاصل نہ کرو اور اپنی انگوٹھیوں میں غریب نہ لکھواؤ (3)''۔ حسن بن ابی الحسن نے اس کی تفسیر اور وضاحت کی اور فرمایا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے ارادہ یہ فرمایا ہے کہ تم اپنے معاملات میں سے کسی کے بارے مشرکین سے مشاورت نہ کرو اور اپنی انگوٹھیوں میں اسم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کندہ نہ کراؤ۔ حسن نے کہا: اس کی تصدیق کتاب اللہ میں ہے: **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ** الآیہ۔ (4)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 496

2۔ صحیح البخاری، کتاب الاحکام، جلد 2، صفحہ 1068، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث 6121، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، کتاب مسند المکثرین، باب مسند جابر بن عبد اللہ، جلد 3، صفحہ 99، مطبوعہ دار صادر 4۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 296

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مِّنْ دُوْنِكُمْ ای من سواکم (یعنی تم اپنے سوا کسی غیر کو راز دار نہ بناؤ)

فراء نے کہا: وَ يَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ بمعنی سوی ذالك۔ یعنی اس میں دُوْنَ بمعنی سوئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مِنْ دُوْنِكُمْ یعنی سیرت اور حسن مذہب میں (کسی غیر کو راز دار نہ بناؤ) اور لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا کا معنی ہے وہ ایسے معاملہ میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے جس میں تمہارے لئے فساد اور بگاڑ ہوگا۔ اور یہ بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ کی صفت کے محل میں ہے۔ کہا جاتا ہے: لا آلو جهدًا یعنی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا (کوئی کوتاہی نہیں کروں گا) اور اَلَوْتُ اَلْوًا کا معنی ہے میں نے کوتاہی کی۔

امرؤ القیس نے کہا ہے:

وما المرءُ مادامت حُشاشةُ نفسه بمدرِكِ اطرافِ الخُطُوبِ ولاآلِ

اس میں ولا آل کا لفظ مذکورہ معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور الخَبَال، الخَبْل ہے اور الخَبْل کا معنی فساد اور بگاڑ ہے اور یہ افعال، ابدان اور عقول میں ہوتا ہے۔ اور حدیث میں ہے: من أُصيب بدم أو خَبْل (1) یعنی وہ جسے ایسا زخم لگا جو عضو کو ضائع اور فاسد کر دے۔ اور الخَبْل کا معنی اعضاء کا فاسد ہونا ہے اور رَجُلٌ خَبْلٌ و مُخْتَبَلٌ (فاسد اور بگڑا ہوا آدمی) اور خَبَلَهُ الْحُبُّ (یعنی محبت نے اسے بگاڑ دیا)

اوس نے کہا ہے:

أبنی لُبَیْنَی لستُم بیَدٍ اِلاَّ یدًا مخبولَةَ العَضُدِ

یہ فاسدۃ العضد ہے۔ (یعنی کٹا ہوا فاسد بازو)

فراء نے کہا ہے:

نَظَر ابنُ سعدٍ نظرةً و بَتّ بها کانت لصُحْبك والمِطِيّ خَبالًا

اس میں بھی خبال بمعنی فساد ہے۔

اور خَبَالًا مفعول ثانی کے اعتبار سے منصوب ہے، کیونکہ الالُو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور اگر چاہے تو مصدر (یعنی مفعول مطلق) کی حیثیت سے منصوب مان لے یعنی یخبلونکم خبالا۔ اور اگر چاہے تو حرف جر کے حذف کے سبب منصوب تصور کر لے یعنی اصل میں بالخبال تھا، جیسا کہ انہوں نے کہا: اوجعته ضربا (یعنی بالضرب میں نے اسے مار کے ساتھ تکلیف دی۔) اور قول باری تعالیٰ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ میں ما مصدریہ ہے، یعنی ودّوا عنتکم یعنی وہ پسند کرتے ہیں اسے جو تم پر شاق گزرتی ہے اور العنت کا معنی مشقت ہے (2) اور اس کا معنی و مفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ یعنی تمہارے لئے عداوت اور تکذیب ان کے مونہوں

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدیات من قتل لہ قتیل فھو بالخیار بین احدی ثلاث

ایضاً، ابن ماجہ، حدیث 2613، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 3898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 537

(زبانوں) سے ظاہر ہوچکی ہے اور البغضاء بمعنی بغض ہے اور یہ حب (محبت) کی ضد ہے اور البغضاء مصدر مؤنث ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر مونہوں کا ذکر کیا ہے نہ کہ زبانوں کا یہ ان کے اپنی ان باتوں میں لغویات اور بے احتیاط گفتگو کرنے کی طرف اشارہ ہے، پس وہ اس چھپنے والے سے فوق اور اوپر تھے جس کی آنکھوں میں بغض ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس معنی کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نہی ہے "کہ آدمی اپنے بھائی کی عزت کے بارے میں اپنے منہ کو حیاء میں رکھے اس کا معنی منہ کھولنا ہے۔ کہا جاتا ہے: شحی الحمار فاہ بالنہیق (گدھے نے ہینگتے ہوئے اپنا منہ کھولا۔) اور شحی الفم نفسہ (منہ بذات خود کھل گیا) اور شحی اللجامُ فم الفرس شَحْیًا (لگام نے گھوڑے کا منہ مکمل طور پر کھول دیا۔) اور جاءت الخیل شواحی۔ یعنی گھوڑے اپنے منہ کھولے ہوئے آئے۔ اس حدیث سے جواز پر دلیل خطاب نہیں سمجھی جاسکتی کہ کوئی اپنے بھائی کی عزت میں خفیۃً داخل ہوجائے، کیونکہ باتفاق علماء وہ حرام ہے۔(1)

اور قرآن کریم میں ہے ولا یغتب بعضکم بعضا الآیہ۔ (اور تم آپس میں ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں (2)"۔ اور شحو کا ذکر بے احتیاطی اور بے تکلفی کی طرف اشارہ ہے۔ فاعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ اور اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ دشمن کی شہادت دشمن کے خلاف جائز نہیں ہوتی اور اسی طرح اہل مدینہ اور اہل حجاز نے کہا ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ سے اس کا جواز مروی ہے۔ ابن بطال نے ابن شعبان سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کسی دشمن کی شہادت اپنے دشمن کے خلاف کسی بھی شے میں جائز نہیں، اگرچہ وہ سراپا عدل ہو اور عداوت عدالت کو زائل کر دیتی ہے تو پھر کافر کی عداوت کا کیا حال ہوگا۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ یہ خبر دینا اور آگاہ کرنا ہے کہ وہ جو بغض و حسد چھپائے رکھتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جس کا وہ اپنے مونہوں سے اظہار کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قد بدا البغضاءُ پڑھا ہے۔ یعنی فعل کو مذکر ذکر کیا ہے، اس لئے کہ البغضاء بمعنی البغض ہے۔(3)

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾

"سنو! تم تو وہ (پاک دل) ہو کہ محبت کرتے ہو ان سے اور وہ (ذرا) محبت نہیں کرتے تم سے اور مانتے ہو تم سب کتابوں کو اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں: ہم ایمان لائے ہیں اور جب وہ تنہا ہوتے ہیں تو چباتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے (اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) آپ فرمائیے: مرجاؤ اپنے غصہ (کی آگ میں جل کر) یقیناً اللہ خوب جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کا"۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 496۔ 2۔ مسلم کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 397، اسلام آباد 3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 497

قولہ تعالیٰ: هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ مراد منافقین ہیں (یعنی تم تو منافقین سے محبت کرتے ہو۔) اور اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا (جب وہ تمہیں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں)۔ ابو العالیہ اور مقاتل نے یہی کہا ہے یہاں المحبۃ بمعنی مصافاۃ (یعنی خالص محبت کرنا) ہے۔ یعنی اے مسلمانو! تم تو ان کے ساتھ خالص محبت کرتے ہو اور وہ اپنے نفاق کی وجہ سے تمہارے ساتھ خالص محبت نہیں کرتے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: تم تو ان کے لئے اسلام کا ارادہ رکھتے ہو اور وہ تمہارے لئے کفر چاہتے ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان سے مراد یہود ہیں۔ اکثر (علماء) نے یہی کہا ہے۔ الکتاب اسم جنس ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس سے مراد کتابیں ہیں۔ اور یہودی بعض کے ساتھ ایمان لاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَ یَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (البقرہ:91) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے: ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر اور کفر کرتے ہیں اس کے علاوہ (دوسری کتابوں) کے ساتھ۔)

وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا یعنی کہتے ہیں: ہم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ وَ اِذَا خَلَوْا اور جب وہ اپنوں کے درمیان ہوتے ہیں عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ انامل سے مراد انگلیوں کی اطراف (یعنی پورے) ہیں۔ مِنَ الْغَیْظِ یعنی وہ تم پر شدید غصہ سے انگلیوں کے پورے چباتے ہیں اور ان کے بعض بعض کو کہتے ہیں: کیا تم ان کی طرف دیکھتے ہو یہ ظاہر ہوئے اور بہت زیادہ ہو گئے۔ اور العضّ کا مفہوم ہے شدید غصے کا اظہار کرنا (1) اس کے نفاذ کی قدرت نہ رکھتے ہوئے اور اسی معنی میں حضرت ابو طالب کا قول ہے:

یعضون غیظًا خلفنا بالاناملِ

(وہ ہمارے پیچھے شدید غصہ کے سبب انگلیوں کو چباتے ہیں۔)

اور دوسرے نے کہا ہے:

اِذَا رَأَونِی ...... أطال الله غیظهم عَضُّوا من الغیظ اطراف الأباهیم

جب انہوں نے مجھے دیکھا تو وہ اپنے انگوٹھوں کے اطراف کو غصے سے کاٹنے لگے۔ اللہ تعالیٰ ان کے غصہ میں اور اضافہ کرے۔

کہا جاتا ہے: عَضَّ یعَضُّ عَضًّا وَ عَضِیْضًا اور العُضُّ (عین کے ضمہ کے ساتھ ہو) تو معنی ہے: اس نے اہل امصار کے چوپاؤں کو چارہ ڈالا۔ مثلاً الکُسب (کمائی) اور النوی المرضوخ (توڑی ہوئی گٹھلی) اسی سے کہا جاتا ہے: أعضَّ القوم، جب ان کے اونٹ گھاس کھانے لگیں۔ اور بعیر عُضَاضِیٌّ، یعنی موٹا تازہ اونٹ گویا اسے اس طرف منسوب کیا گیا ہے اور [illegible] (عین کے کسرہ کے ساتھ ہو) تو معنی ہے: لوگوں میں سے انتہائی ہوشیار اور انتہائی چالاک۔ اور عضّ الأنامل یعنی [illegible] کو کاٹنا سے مراد ایسا فعل ہے جس پر انتہائی غصہ ہو اور آدمی اسے کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو، یا ایسے کام میں پڑنا جسے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 538

تبدیل کرنے پر آدمی قدرت نہ رکھتا ہو۔ اور یہ دانتوں کے ساتھ کاٹنا اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ قریب المرگ آدمی پر ہاتھ کو (دانتوں کے ساتھ) پکڑنا ہوتا ہے اور اسی طرح شرمندہ آدمی کا دانتوں کو ٹکرانا بھی ہوتا ہے، علاوہ ازیں غمزدہ اور پریشان حال آدمی کا زمین پر بیٹھ کر لکیریں لگانا اور کنکریوں کو گننا بھی اسی قبیلے سے ہے۔ اور یہ عض ضاد ساقطہ کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور عظ الزمان ظاء مشالہ کے ساتھ۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

وعظ زمانٍ یا بن مروان لم یَدَع　　من المال الاّمُسحَتا او مَجلّفُ

اس میں عظ زمان عض الزمان کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

الانامل کا واحد انملة (میم کے ضمہ کے ساتھ) ہے۔ اور میم کو فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے اور ضمہ زیادہ مشہور ہے۔

اور ابوالجوزاء نے جب یہ آیت تلاوت کی تو اس نے کہا: یہ اباضیہ ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ صفت قیامت تک آنے والے بہت سے اہل بدعت میں پائی جائے گی۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اگر کہا جائے، وہ کیسے نہیں مرے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو فرمائے: کُنْ (تو ہو جا) فیکون (تو وہ ہو جاتی ہے)؟ تو اس کی طرف سے دو جواب دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے..... اس بارے میں مفسرین میں سے علامہ طبری اور کثیر نے کہا ہے: یہ ان کے لئے بددعا ہے۔

یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تم فرماؤ تم مسلسل اپنے غصہ میں جلتے رہو یہاں تک کہ تم مر جاؤ۔ اور اس پر توجیہ یہ ہے کہ آپ ان کے لئے ان کے سامنے اور پیچھے بددعا کرتے رہیں بخلاف لعنت کرنے کے۔(1)

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کا معنی ہے کہ انہیں خبر دے دو کہ وہ اسے بالکل نہ پا سکیں گے جس کی آرزو اور خواہش رکھتے ہیں، کیونکہ موت اس کے قریب ہے تو اس معنی کی بنا پر دعا کا معنی زائل ہو گیا اور تقریع اور غصہ دلانے کا معنی باقی رہا اور یہ معنی مسافر بن ابی عمرو کے قول کے ساتھ بھی جاری ہوتا ہے:

و یتمنّی لی أرومتنا　　و نفقأ عین من حسدا

اور اسی معنی کی طرف یہ قول باری تعالیٰ بھی راہنمائی کرتا ہے: مَنْ كَانَ یَظُنُّ اَنْ لَّنْ یَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ فَلْیَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْیَقْطَعْ (الحج: 15) (اور جو شخص یہ خیال کئے بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کی مدد نہیں کرے گا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں تو اسے چاہیے کہ لٹک جائے ایک رسی کے ذریعے چھت سے پھر (گلے میں پھندا ڈال کر) اسے کاٹ دے۔)

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا یَضُرُّكُمْ كَیْدُهُمْ شَیْــًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۱۲۰﴾

1۔ تفسیر طبری، کتاب آل عمران، جلد 4، صفحہ 87، اسلام آباد

"(ان کا حال تو یہ ہے کہ) اگر پہنچے تمہیں کوئی بھلائی تو بری لگتی ہے انہیں اور اگر پہنچے تمہیں کوئی تکلیف تو (بڑے) خوش ہوتے ہیں اس سے اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو نہ نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا فریب کچھ بھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں (اس کا) احاطہ کئے ہوئے ہے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ، سُلَمِی نے اسے یا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے تا کے ساتھ۔ اور یہ لفظ عام ہے ہر اس شے کو شامل ہے جو اچھی ہو سکتی ہے اور بری ہو سکتی ہے۔ اور مفسرین نے جو (خِصب) شادابی (جَدْب) خشک سالی، مومنین کا اجتماع اور ان کے درمیان فرقت کا ہونا اور دیگر ان جیسے اقوال مثالیں ذکر کی ہیں اور یہ کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور آیت میں معنی یہ ہے کہ ہر وہ جس کی یہ حالت ہو کہ اس میں شدید عداوت اور حقد و کینہ ہو اور مسلمانوں پر تکالیف آنے کے وقت اسے خوشی اور مسرت ہوتی ہو وہ اس اہل نہیں کہ اسے راز دار بنایا جائے، بالخصوص جہاد جیسے اس امر عظیم میں جو کہ دنیا اور آخرت کا سرمایہ ہے۔

کسی کہنے والے نے کتنا خوب کہا ہے:

كل العداوة قد تُرجى افاقتها	الا عداوة مَن عاداك مِن حسد

ہر عداوت اور دشمنی کے ختم ہونے کی امید کی جا سکتی ہے سوائے اس کی عداوت کے جس نے تیرے ساتھ حسد کیا۔

وَ اِنْ تَصْبِرُوْا اور اگر تم ان کی اذیت رسانی پر صبر کرتے رہو (1) اور طاعت اور مومنین کی محبت و دوستی پر صبر کرتے رہو وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا کہا جاتا ہے: ضارہ یضورہ یضیرہ ضَیْرًا وَ ضَوْرًا، پس اللہ تعالیٰ نے صبر اور تقویٰ کے ساتھ ان کے ضرر اور نقصان کی نفی کی شرط بیان کی ہے اور یہ مومنین کے لئے تسلی اور ان کے دلوں کے لئے باعث تقویت ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں...... کہ حرمیان اور ابو عمرو نے لَا يَضِرْكُمْ پڑھا ہے یہ ضَارَ يَضِيْرُ سے ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول لَا ضَيْرَ ہے۔ اور دو ساکن ملنے کی وجہ سے یا کو حذف کر دیا گیا، کیونکہ جب را سے ضمہ کو حذف کر دیا گیا تو را اور یا دونوں ساکن باقی رہ گئیں لہٰذا یا کو حذف کر دیا گیا اور اسے ہی حذف کرنا اولیٰ ہے، کیونکہ اس کا ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے اور کسائی نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ضَارَهٗ يَضُوْرُهٗ سنا ہے اور انہوں نے لَا يَضُرُّكُمْ کی اجازت دی ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لَا يَضُرُرْكُمْ ہے۔ [اور کوفیوں نے لَا يَضُرُّكُمْ را کو ضمہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ ضَرَّ يَضُرُّ سے ہے۔] اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فا کو مضمر ماننے کی تقدیر پر مرفوع ہو اور معنی ہو: فلا یضرکم، (پس وہ تمہیں نقصان نہ دے گا)

اور اسی کے مطابق شاعر کا قول ہے:

مَن يفعلِ الحسناتِ اللهُ يشكرُها

(جو نیکیاں کرے گا اللہ تعالیٰ ان کی قدر افزائی فرمائے گا۔) یہ کسائی اور فراء کا قول ہے، یا یہ تقدیم کی نیت پر مرفوع ہوگا۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 539

اور سیبویہ نے کہا ہے:

انك إن يُصْرَعْ اخوك تُصْرَعُ

(بلاشبہ تو پچھاڑ دیا جائے گا اگر تیرے بھائی کو پچھاڑ دیا گیا۔)

آیت کا مفہوم یہ ہوگا لا یضرکم ان تصبروا و تتقوا (تمہارا صبر کرنا اور تمہارا ڈرنا (اور تقویٰ اختیار کرنا) تمہیں کوئی نقصان نہیں دے گا۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے جزم دی جائے اور دو ساکن جمع ہونے کی وجہ سے راء کو ضمہ دیا جائے کیونکہ وہ ضمہ کے بعد واقع ہے۔ اور اسی طرح فعل مجزوم ہونے کی بنا پر راکے فتحہ کی قرأت بھی ہے اور اجتماع ساکنین کی صورت میں فتحہ کے خفیف حرکت ہونے کی وجہ سے یَضُرَّکُم کو مفتوح پڑھا گیا ہے۔ اسے ابو زید نے مفضل عن عاصم سے روایت کیا ہے۔ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔ اور نحاس نے بیان کیا ہے: اور مفضل ضبی نے عاصم سے لَا یَضُرِّکُم گمان کیا ہے کہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے را کو کسرہ دیا گیا ہے۔

وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۗ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾

''اور یاد کرو (اے محبوب!) جب صبح سویرے رخصت ہوئے آپ اپنے گھروں سے (اور میدان احد میں) بٹھا رہے تھے مومنوں کو مورچوں پر جنگ کے لئے۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ، اِذْ میں عامل فعل مضمر ہے اور تقدیر کلام ہے: واذکر اذ غدوت، یعنی اور آپ یاد کرو (اے محبوب!) جب آپ صبح سویرے چلے۔ مِنْ اَهْلِكَ اپنے گھر سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے۔ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۗ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ یہ غزوہ احد تھا اور اسی کے بارے یہ مکمل آیت نازل ہوئی۔ اور مجاہد، حسن، مقاتل اور کلبی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: یہ غزوہ خندق کے بارے ہے اور حسن سے یہ بھی منقول ہے کہ یہ غزوہ بدر کے بارے ہے اور جمہور کا قول یہ ہے کہ یہ غزوہ احد کے بارے ہے(1) اور اسی پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ ہمت ہار دیں۔) اور یہ بلاشبہ غزوہ احد میں ہوا تھا۔ اور مشرکین نے تین ہزار افراد پر مشتمل لشکر کے ساتھ مدینہ طیبہ پر (چڑھائی کا) قصد کیا تاکہ وہ ان سے غزوہ بدر کی ناکامی اور شکست کا بدلہ و انتقام لیں، پس وہ احد پہاڑ کے نزدیک مدینہ طیبہ کے بالمقابل وادی کے کنارے جا اترے، یہ ۳ھ بارہ شوال بدھ کا دن تھا، ہجرت سے اکتیسواں مہینہ شروع ہو چکا تھا اور وہ جمعرات کے دن وہاں مقیم ہو گئے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی مدینہ طیبہ میں تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ کی تلوار میں دندانے پڑ گئے ہیں اور یہ کہ آپ کے لئے بیل ذبح کیا جارہا ہے اور یہ کہ آپ نے اپنا دست مبارک محفوظ اور مضبوط زرہ میں داخل کیا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تعبیر یہ فرمائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام کا ایک گروہ شہید کر دیا جائے گا اور یہ کہ آپ کے خاندان میں سے ایک آدمی کو بھی شہید کر دیا جائے گا اور یہ کہ محفوظ زرہ مدینہ طیبہ ہے۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 539

اسے مسلم نے نقل کیا ہے (1)۔ اور یہ سب کچھ اسی کے مطابق ہے جو کچھ اس غزوہ میں سے معروف و مشہور ہے۔ اور تبوّأ کا اصل معنی ہے گھر بنانا، (ٹھکانا بنانا) بوأتہ منزلا کہا جائے گا جب تو کسی جگہ سکونت اختیار کرے اور اسی معنی میں حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: من کذب علی متعمد افلیتبوأ مقعدہ من النار (2) (جس نے عمداً میرے بارے میں جھوٹ بولا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے) یعنی اس میں گھر بنالے۔ پس تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ کا معنی ہے آپ ان کے لئے صف بندی کی جگہیں بنا رہے تھے اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے خواب میں دیکھا جیسا کہ ایک سونے والا دیکھتا ہے گویا کہ میں پے در پے مینڈھے لا رہا ہوں اور گویا میری تلوار کی دھار ٹوٹ گئی ہے تو میں نے تعبیر یہ کی کہ میں قوم کے مینڈھے کو قتل کروں گا اور میں نے اپنی تلوار کی دھار ٹوٹنے کی تعبیر یہ کی کہ میری آل میں سے ایک آدمی شہید کر دیا جائے گا۔'' پس حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے اور رسول اللہ ﷺ نے طلحہ کو قتل کیا اور وہ (کفار کا) علمبردار تھا۔ اور موسیٰ بن عقبہ نے ابن شہاب سے بیان کیا ہے: مہاجرین کا علمبردار رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے ایک آدمی تھا تو اس نے کہا: میں ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کروں گا جو میرے ساتھ ہے، تو طلحہ بن عثمان جو کہ سعید بن عثمان لخمی کا بھائی تھا اس نے اسے کہا: اے عاصم! کیا تیرے لئے مقابلے کی طاقت ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ پس وہ آدمی اس پر تیزی سے جھپٹا اور طلحہ کے سر پر تلوار دے ماری یہاں تک کہ تلوار اس کی داڑھی پر لگی اور اس نے اسے قتل کر دیا تو علمبردار کا قتل ہونا رسول اللہ ﷺ کے خواب کی تصدیق ہے کأنی مردف کبشا۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

''جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ ہمت ہار دیں حالانکہ اللہ تعالیٰ دونوں کا مددگار تھا (اس لئے اس نے اس لغزش سے بچا لیا) اور صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے مومنوں کو۔''

اِذْ میں عامل تُبَوِّئُ یا سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ہے۔ اور دو جماعتوں سے مراد خزرج میں سے بنوسلمہ اور اوس میں سے بنوحارثہ ہیں اور یہ دونوں غزوہ احد میں لشکر کے دو پہلو تھے (3)۔ اور اَنْ تَفْشَلَا کا معنی ہے کہ وہ بزدلی کا اظہار کریں (اور ہمت ہار دیں)۔ بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا: ہمارے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا فرمایا: ہمارے دو گروہ، بنوحارثہ اور بنوسلمہ تھے اور پسند نہیں کرتے تھے کہ یہ نازل نہ ہوتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا (4) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بنوحارث، بنوخزرج اور بنونبیت تھے اور نبیت بنی اوس میں سے عمرو بن مالک تھے۔

اور فشل سے مراد بزدلی ہے، اس کا لغوی معنی یہی ہے اور دونوں گروہوں کا ارادہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ جب لشکر کے

1۔ بخاری کتاب المناقب، حدیث 3352، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ مسلم المقدمہ، جلد 1، صفحہ 7، اسلام آباد
3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 541 4۔ صحیح بخاری تفسیر سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 4192، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مدینہ منورہ سے باہر نکلنے کے بعد عبداللہ بن ابی اپنے منافق ساتھیوں سمیت واپس لوٹ آیا (تو انہوں نے بھی ارادہ کیا) لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کی حفاظت فرمائی اور یہ واپس نہ لوٹے، اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا** یعنی اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی حفاظت فرما رہا تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ انہوں نے (لشکر کے ساتھ) نکلنے سے (پیچھے) بیٹھے رہنے کا ارادہ کیا اور وہ ان میں سے صغیر (چھوٹے) تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے دلوں میں آنے والا خیال تھا جو ان کے دلوں میں پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مطلع فرما دیا تو ان کی بصیرت میں اضافہ ہو گیا اور اس بزدلی اور سستی کا مظاہرہ نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا اور ان میں سے بعض نے بعض کی مذمت کی اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چل پڑے یہاں تک کہ آپ مشرکین کے قریب جا پہنچے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار افراد کے ساتھ مدینہ طیبہ سے نکلے تھے اور پھر عبداللہ بن ابی بن سلول اپنے تین سو ساتھیوں کو ساتھ لے کر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے واپس لوٹ آیا، کیونکہ اس کی رائے سے اختلاف کیا گیا تھا جب اس نے مدینہ طیبہ میں بیٹھے رہنے اور وہیں قتال کرنے کا اشارہ دیا تھا اگر دشمن ان پر حملہ آور ہوا اور اس کی رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے موافق تھی (1) اور اکثر انصار نے اس کا انکار کیا تھا، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے ساتھ تشریف لے گئے اور ان میں سے وہ شہید ہوئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے شہادت کے ساتھ عزت و تکریم عطا فرمائی۔ امام مالک نے فرمایا ہے، غزوہ احد میں مہاجرین میں سے چار اور انصار میں سے ستر افراد نے جام شہادت نوش کیا۔

المقاعد: مقعد کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے بیٹھنے کی جگہ اور یہ مواقف کے قائم مقام ہے لیکن لفظ قعود ثبوت پر دال ہے اور بالخصوص تیر انداز ثابت قدم تھے۔ مختصراً غزوہ احد کا یہی مفہوم ہے، اس کا تفصیلی اور شافی بیان آگے آئے گا۔

اس دن مشرکین کے ساتھ سو گھوڑ سوار تھے اور ان پر خالد بن ولید سربراہ تھے اور اس دن مسلمانوں کے ساتھ کوئی گھوڑا نہ تھا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک زخمی ہوا اور پتھر کے ساتھ نچلی طرف سے دائیں جانب کے چار دندان مبارک شہید کر دیئے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک کا خود توڑ دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی امت اور دین کی جانب سے اس سے افضل و اعلیٰ جزا عطا فرمائی جو اپنے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی علیہ السلام کو اس کے صبر پر عطا فرمائی اور وہ جس نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دن اعراض کیا تھا وہ عمرو بن قمیہ لیثی اور عتبہ بن ابی وقاص تھا اور کہا گیا ہے: فقیہ محمد بن مسلم بن شہاب کا دادا عبداللہ بن شہاب وہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کو زخمی کیا تھا۔ واقدی نے کہا ہے: ہمارے نزدیک ثابت یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس کو زخمی کرنے والا ابن قمیہ تھا۔ اور جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر پتھر مار کر آپ کے دندان مبارک کو شہید کیا تھا وہ عتبہ بن ابی وقاص تھا۔ واقدی نے اپنی سند کے ساتھ نافع بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے مہاجرین میں سے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: میں احد کے دن حاضر تھا اور میں

1۔ دلائل النبوۃ، جلد 3، صفحہ 226

نے تیر دیکھے ہر جانب سے آ رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے درمیان میں تھے اور ہر تیر آپ سے پھیر دیا جاتا تھا۔
تحقیق میں نے عبداللہ بن شہاب زہری کو اس دن یہ کہتے ہوئے سنا: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر میری راہنمائی کرو، محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر میری راہنمائی کرو، اگر وہ بچ گئے تو میں نہیں بچ سکوں گا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے پہلو میں تھے کوئی بھی آپ کے ساتھ نہ تھا پھر وہ آپ سے آگے گزر گیا، تو اس بارے میں صفوان نے اسے ڈانٹ پلائی تو اس نے کہا: قسم بخدا! میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں، میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں: بلاشبہ انہیں ہم سے محفوظ رکھا گیا ہے! ہم چار آدمی نکلے اور ہم نے آپ کے قتل کا آپس میں پختہ معاہدہ کیا[لیکن ہم آپ پر راہ نہ پا سکے۔]اور ایک پتھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آ لگا یہاں تک کہ آپ گڑھے میں گر گئے، اسے ابو عامر راہب نے مسلمانوں کے لئے بطور دھوکہ اور چال کے کھودا تھا پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے پہلو کے بل گر پڑے اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سہارا دیا یہاں تک کہ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے والد مالک بن سنان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زخم سے خون چوس لیا اور آپ کے خود کے دو حلقے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ مبارک میں پیوست ہو گئے اور انہیں حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے نکالا۔ اور اپنے دانتوں کے ساتھ انہیں پکڑا تو وہ گر گئے، تو آپ نے انہیں جڑ سے توڑ دیا اور آپ رضی اللہ عنہ کو ان کا ٹوٹنا خوبصورت لگتا تھا اور اس غزوہ میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ آپ کو وحشی نے قتل کیا تھا۔ وحشی جبیر بن مطعم کا غلام تھا اور جبیر نے اس کو کہا: اگر تو نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کیا تو ہم تجھے گھوڑوں کی لگامیں تھ یں گے اور اگر تو نے علی بن ابی طالب کو قتل کیا تو ہم تجھے ایک سو اونٹنیاں دیں گے وہ سب کی سب سیاہ ہوں گی اور اگر تو نے حمزہ کو قتل کیا تو تو آزاد ہو جائے گا، وحشی نے کہا: رہے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان پر نگران اور محافظ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے کوئی بھی ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور جہاں تک علی (رضی اللہ عنہ) کا تعلق ہے تو انہیں جس نے بھی مقابلے کی دعوت دی ہے انہوں نے اسے قتل کر دیا ہے اور رہا حمزہ! تو وہ بہادر آدمی ہیں، قریب ہے کہ میرا ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو میں انہیں قتل کر دوں۔ اور وہاں ہند بھی تھی جب وحشی تیار ہوا یا وہ اس کے پاس سے گزری تو اس نے کہا: ہاں ابو دسمہ! تو (سینہ کو) ٹھنڈا کر تو تو بھی پرسکون اور ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پس وہ ایک چٹان کے پیچھے چھپ گیا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے مشرکین کی جماعت پر حملہ کر دیا، پس جب آپ اپنے حملہ سے کامیابی کے ساتھ واپس لوٹے اور وحشی کے پاس سے گزرے تو اس نے چھوٹے نیزے کے ساتھ آپ پر حملہ کر دیا اور وہ آپ کو جا لگا اور جان لیوا ثابت ہوا رحمۃ اللہ علیہ۔

ابن اسحاق نے بیان کیا ہے: پھر ہند نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چاک کر کے کلیجہ باہر نکالا اور اسے دانتوں کے ساتھ چبایا لیکن اسے نگل نہ سکی اور پھر اسے پھینک دیا پھر ایک بلند چٹان پر چڑھ گئی اور بلند آواز سے چیخ کر یہ کہا:

نحن جزیناکم بیوم بدر والحرب بعد الحرب ذات سُعُرِ

(اے مسلمانو!) ہم نے یوم بدر کا بدلہ چکا دیا اور جنگ کے بعد جنگ آگ کے شعلوں کی طرح بھڑکتی ہے:

ما کان عن عُتْبَةَ لی من صَبْرِ و لا أخی و عَمّه و بکری

مجھے (اپنے باپ) عتبہ، اپنے بھائی (ولید بن عتبہ)، اس کے چچا (شیبہ بن ربیعہ) اور اپنے پہلے بیٹے (حنظلہ بن ابی

سفیان) سے صبر نہیں آتا تھا۔

شفیت نفسی و قضیت نذری　شفیتَ وحشی غلیلَ صدری

میں نے اپنا دل ٹھنڈا کر لیا اور اپنی نذر پوری کر لی۔ اے وحشی! تو نے میرے سینے کی جلن کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔

فشکرُ وحشی علیّ عمری　حتی ترمّ اعظُمی فی قبری

پس مجھ پر ساری زندگی وحشی کا شکر یہ ادا کرنا لازم ہے یہاں تک کہ میری ہڈیاں میری قبر میں بوسیدہ ہو جائیں۔

پھر اس کا جواب ہند بنت اثاثہ بن عباد بن عبد المطلب نے دیا اور کہا:

خَزِیت فی بدر و بعد بدر　یابنت وَقاعِ عظیم الکفر

اے انتہائی گھٹیا اور پرلے درجے کے کافر کی بیٹی! تو بدر میں بھی رسوا ہوئی اور بدر کے بعد بھی۔

صبحكِ اللهُ غداةَ الفجرِ　مِلْهَاشِمِیّین الطّوال الزُّهرِ

اللہ تعالیٰ علی الصبح دراز قد اور خوش اخلاق ہاشمیوں کو تیرے پاس لے آیا:

بکلّ قَطّاعٍ حُسَامٍ یَفْرِی　حمزةُ لیثی و علیّ صقرِی

میرے شیر حضرت حمزہ اور میرے شاہین حضرت علی رضی اللہ عنہما ہر تیز کاٹنے والی تلوار کے ساتھ تمہارے سر قلم کر رہے تھے،

اذ رَامَ شیبُ وابوكِ غدری　فخضبا منه ضَواحِیَ النَّحرِ

و نذركِ السوءَ فشرّ نَذْرِ

جب شیبہ اور تیرے باپ (عتبہ) نے میرے ساتھ بدعہدی کا ارادہ کیا تو ان دونوں نے (یعنی حضرت حمزہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے) اس کے سینے کے کھلے اطراف کو لہولہان کر دیا اور تیرا بدی کی نذر ماننا بہت بری نذر ہے۔

اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر روتے ہوئے یہ اشعار لکھے:

بکت عینی و حُقّ لها بکاها　و ما یغنی البکاء ولا العَوِیل

میری آنکھ رو پڑی اور رونا اس کا حق بنتا ہے لیکن رونے اور واویلا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں:

علی أسَدِ الالٰه غداة قالوا　أحمزة ذاکم الرّجل القتیل

(میری آنکھیں) شیر خدا پر اس روز (رو پڑیں) جب لوگوں نے کہا: کیا یہ مقتول آدمی حمزہ ہیں؟

أُصیبَ المسلمون به جمیعا　هناك، و قد أصیب به الرّسول

آپ کے قتل سے سب مسلمانوں کو تکلیف پہنچی اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تکلیف پہنچی۔

أبا یَعْلَی لك الأرکان هُدّت　وأنت الماجد البَرّ الوَصُول

اے ابو یعلیٰ! (یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) آپ کے تمام اعضاء کاٹ دیئے گئے حالانکہ آپ ایک شریف، نیک اور ہر ایک سے تعلق رکھنے والے آدمی تھے۔

علیک سلامِ ربك فی جنان　مخالِطها نعیم لایزول

آپ پر آپ کے رب کی طرف سے ان جنتوں میں سلام پہنچے جن میں لازوال نعمتیں ملتی رہیں گی۔

ألا یا هاشم الأخیار صبرا　فکل فعالِکم حسن جمیل

اے قبیلہ ہاشم میں سب سے بہتر فرد صبر کر، تمہارا ہر کام نہایت حسین وجمیل ہے۔

رسولُ الله مصطبر کریم　بأمر الله ینطق اذ یقول

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم صابر اور کریم ہیں، وہ جب بھی کچھ فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ہی بولتے ہیں۔

ألا مَنْ مُبْلِغٌ عنّی لُؤیًا　فبعد الیومِ دائلَةٌ تَدُول

ارے کون شخص ہے جو میری طرف سے قبیلہ لؤی کو یہ پیغام پہنچادے کہ آج کی جنگ کے بعد ایک دوسری جنگ کی نوبت آکر رہے گی۔

و قَبْلَ الیومِ ماعرفوا و ذاقوا　وقائعنا بها یُشفی الغَلِیلُ

اور آج کی جنگ سے پہلے (غزوہ بدر میں) جو کفار نے ہمیں خوب پہچان لیا۔ اور ہمارے مقابلے کا مزہ چکھ لیا (وہ بھی پہنچا دے) اس جنگ میں ہمارے تصادم سے پیاسوں کی پیاس بجھائی جاتی رہی۔

نَسِیتم ضربَنا بقلیبِ بدر　غداةَ أتاکم الموتُ العَجِیل

قلیب بدر کے پاس تم ہماری شمشیرزنی کو بھول گئے ہو جس روز موت تمہارے پاس بڑی تیزی سے آرہی تھی۔

غداة ثوی أبوجهل صریعا　علیه الطیر حَائِمَةٌ تَجُول

جس روز ابوجہل دھڑام سے گر کر ہلاک ہو گیا اور اس کے اوپر پرندے گھوم گھوم کر آ جا رہے تھے۔

و عتبة وابنه خرّا جمیعا　و شیبةُ عضه السیف الصقیلُ

اور عتبہ اور اس کا بیٹا دونوں زمین پر گر پڑے اور شیبہ کو بھی صیقل کی ہوئی تلوار نے کاٹ کر رکھ دیا۔

و مَتْرُکْنَا أُمَیَّةَ مُجْلَعِبًا　و فی حیزومه لَدْنٌ نبیلُ

اور ہم نے امیہ کو بھی زمین پر دراز کر دیا درآنحالیکہ اس کے سینے کے نچلے حصے میں ایک بہت بڑا نیزہ داخل تھا۔

و هَامَ بنی ربیعة سائلوها　ففی اسیافنا منها فلول

اور بنی ربیعہ کی کھوپڑیوں سے پوچھو، ان کو کاٹنے کی وجہ سے ہماری تلواروں میں دندانے پڑے ہوئے ہیں۔

آلا یا هندُ فابکی لا تَمَلِّی　فَانتِ الوَالِهُ العَبْرَی الهبولُ

ارے اے ہند! اب خوب رو اور رونے سے نہ اکتا کیونکہ تو ہی شدت غم کی وجہ سے بڑے بڑے آنسو بہانے والی اور اپنے عزیزوں کو کھو دینے والی ہے۔

آلا یَا هندُ لاتُبْدِی شمَاتًا　بحمزةَ اِنَّ عِزَّکُم ذَلِیلُ

ارے اے ہند! تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر خوشی کا اظہار نہ کر کیونکہ تمہاری عزت خاک میں مل چکی ہے۔

اور آپ کی بہن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے بھی مرثیہ کہا اور وہ کتب سیرت میں مذکور ہے۔ رضی اللہ عنہم

قولہ تعالیٰ: وَ عَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ اس میں ایک مسئلہ ہے اور وہ توکل کا بیان ہے، توکل کا لغوی معنی: اظہار العجز و الاعتماد علی الغیر ہے (یعنی عجز کا اظہار کرنا اور غیر پر اعتماد کرنا) اور وَاكَلَ فلان (کہا جاتا ہے) جب کوئی کسی دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے اپنا کام ضائع کردے۔

توکل کی حقیقت میں علماء نے اختلاف کیا ہے، پس حضرت سہل بن عبداللہ سے اس کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: قالت فرقة۔ الرضا بالضمان، و قطع الطّمع من المخلوقین ایک جماعت نے کہا ہے: توکل سے مراد ضمان کے ساتھ راضی ہونا اور مخلوق سے کسی حرص اور لالچ کو ختم کرنا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: التوکل ترك الأسباب و الرکون الی مسبب الأسباب کہ توکل سے مراد اسباب کو ترک کرنا ہے اور مسبب الاسباب کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ پس جب کوئی سبب اسے مسبب سے مشغول کردے گا تو اس سے توکل کا اسم بھی زائل ہو جائے گا۔ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جنہوں نے کہا ہے کہ توکل سبب ترک کرنے کے ساتھ ہوتا ہے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت میں طعن کیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَیِّبًا (پس تم اس سے کھاؤ جو تم نے حلال طیب (مال) کمایا) تو اس میں غنیمت بمعنی کمائی ہے اور مزید ارشاد فرمایا: فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (تو یہ بھی عمل ہے)۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِنّ اللہ یُحِبُّ العبدَ المحترِفَ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ کوئی پیشہ (اور کام) کرنے والے بندے کو پسند فرماتا ہے۔) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سریہ پر قرض دیتے تھے اور آپ کے سوا کسی اور نے کہا ہے: یہ عام فقہاء کا قول ہے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کا معنی یہ ہے ھو الثقة باللہ و الایقان بأن قضاءه ماض کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پختہ یقین رکھنا اور یہ ایقان رکھنا کہ اس کی قضا اور فیصلہ نافذ ہونے والا ہے اور سعی اور محنت کرنے میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی اتباع کرنا ایسے کاموں میں جن میں اسباب ضروری ہیں مثلاً کھانا، پینا، دشمن سے احتیاط اور بچاؤ کرنا، اسلحہ تیار کرنا اور ان تمام ذرائع اور وسائل کو استعمال کرنا جن کا تقاضا اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کرتی ہے اور یہی موقف محققین صوفیہ نے اختیار کیا ہے لیکن ان کے نزدیک اسم توکل ان اسباب کے ساتھ طمانینت و راحت کے حصول اور دلوں کو ان کی طرف ملتفت کرنے کا تقاضا نہیں کرتا، کیونکہ یہ نہ تو کوئی نفع لا سکتے ہیں اور نہ کوئی ضرر دور کر سکتے ہیں، بلکہ سبب اور مسبب دونوں ہی اللہ تعالیٰ کا فعل ہیں اور سب اسی کی جانب سے اور اس کی مشیت سے ہوتا ہے اور متوکل کی جانب سے ان اسباب کی طرف جھکاؤ اور میلان واقع ہوتا ہے تو وہ اس اسم (کے مفہوم) سے نکل جاتا ہے پھر توکل کرنے والوں کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔

(۱) توکل کی قدرت رکھنے والے کی حالت! یہ تو ان اسباب میں سے کسی شے کی طرف اپنے دل کے ساتھ متوجہ ہوتا ہی نہیں اور نہ ہی وہ حکم امر کے سوا ان میں مشغول ہوتا ہے۔

(۲) قدرت نہ رکھنے والے کی حالت: اور یہ وہ ہوتا ہے جس کی توجہ ان اسباب کی طرف وقتاً فوقتاً ہو جاتی ہے مگر وہ عملی

طریقوں اور دلائل قطعیہ اور حالیہ ذوق کے ساتھ ان کو اپنے آپ سے دور رکھتا ہے، پس وہ اسی طرح کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جود و عطا کے ساتھ قدرت رکھنے والے متوکلین کے مقام پر فائز فرما دیتا ہے اور اسے عارفین کے درجات کے ساتھ ملا دیتا ہے۔

وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

''اور بے شک مدد کی تھی تمہاری اللہ تعالیٰ نے (میدان) بدر میں حالانکہ تم بالکل کمزور تھے۔ پس ڈرتے رہا کرو اللہ سے تا کہ تم (اس بروقت امداد کا) شکر ادا کر سکو۔ (عجب سہانی گھڑی تھی) جب آپ فرما رہے تھے مومنوں سے: کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہاری مدد فرمائے تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے جو اتارے گئے ہیں۔ ہاں کافی ہے بشرطیکہ تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور (اگر) آ دھمکیں کفار تم پر تیزی سے اسی وقت تو مدد کرے گا تمہاری تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔''

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ غزوہ بدر سترہ رمضان المبارک، بروز جمعہ ہجرت کے اٹھارہویں ماہ واقع ہوا، اور بدر، وہاں پانی کا ایک کنواں ہے اسی سبب سے اس جگہ کا نام بدر ہے اور شعبی نے کہا ہے: وہ پانی قبیلہ جہینہ کے ایک آدمی کا تھا اس کا نام بدر تھا (1) اور اس وجہ سے اس جگہ کا نام بدر رکھا گیا۔ پہلا معنی زیادہ اور عام ہے۔ واقدی وغیرہ نے کہا ہے: بدر غیر منقول جگہ کا نام ہے اس کا ذکر عنقریب واقعہ بدر کے ضمن میں سورۃ الانفال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور اَذِلَّةٌ کا معنی ہے بہت کم، تھوڑے، کیونکہ وہ اس دن تین سو تیرہ یا چودہ آدمی تھے (2)۔ اور ان کے دشمن کی تعداد نو سو سے ہزار تک کے درمیان تھی۔ اور اَذِلَّة ذلیل کی جمع ہے۔ اور اس مقام پر ذل کا اسم استعارۃً استعمال کیا گیا ہے، وہ اپنی ذاتوں میں تو یقیناً عزت والے اور غالب تھے لیکن اپنے دشمنوں کی طرف اپنی نسبت کے اعتبار سے اور زمین کے مختلف حصص میں بسنے والے جمیع کفار کے مقابلے میں غور و فکر کے وقت ان کی قلت اور کمی یہ تقاضا کرتی ہے کہ ان پر غلبہ پالیا جائے گا۔ اور النصر کا معنی عون (مدد کرنا) ہے، پس اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر کے دن ان کی مدد فرمائی اور ان میں مشرکین کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور اسی دن پر اسلام کی بنیاد پڑی اور یہ وہ پہلی جنگ تھی جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سترہ غزوات میں شرکت

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 542 2۔ ایضاً

فرمائی اور ان میں سے آٹھ میں باقاعدہ جنگ میں حصہ لیا(1)۔ اور اسی میں ابن اسحاق سے یہ روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے ملا اور میں نے ان سے پوچھا: کتنے غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے؟ تو انہوں نے فرمایا: انیس غزوات میں۔ پھر میں نے پوچھا: کتنے غزوات میں تم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے؟ تو انہوں نے جواباً کہا: سترہ غزوات میں۔ پھر میں نے کہا: وہ کون سا پہلا غزوہ ہے جس میں آپ شریک ہوئے؟ انہوں نے فرمایا: ذات العُسیر یا ذات العشیر(2)۔ اور یہ سب کچھ اس کے خلاف ہے جو اہل تاریخ وسیر نے کہا ہے۔ محمد بن سعد نے کتاب الطبقات میں کہا ہے: بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات ستائیس ہیں اور آپ کے سرایا چھپن ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ چھیالیس ہیں اور وہ جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتال کیا ہے وہ بدر، احد، مریسیع، خندق، خیبر، قریظہ، الفتح، حنین اور طائف ہیں۔ ابن سعد نے کہا ہے: یہ وہ ہے جس پر ہمارا اجماع ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر میں، خیبر سے واپسی پر وادی القریٰ میں اور الغابہ (شام کی طرف مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ ہے) میں قتال کیا ہے(3) اور جب یہ ثابت ہو گیا تو ہم کہتے ہیں کہ حضرت زید اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہما میں سے ہر ایک نے اس کے بارے خبر دی ہے جو اس کے علم یا اس کے مشاہدہ میں تھا۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ قول: ''پہلا غزوہ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے وہ ذات العسیر ہ ہے، یہ بھی اس کے خلاف ہے جو اہل التواریخ والسیر نے کہا ہے۔ محمد بن سعد نے کہا ہے: غزوہ عشیرہ سے پہلے تین غزوات ہوئے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس ان میں شریک ہوئے۔ اور ابن عبدالبر نے ''کتاب الدرر فی المغازی والسیر'' میں کہا ہے: پہلا غزوہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک ہوئے غزوہ ودان ہے اور یہ صفر میں واقع ہوا اور وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ پہنچے تو ماہ ربیع الاول کی بارہ راتیں گزر چکی تھیں، پھر آپ بقیہ ربیع الاول اور ۲ ھ کے صفر تک وہیں مقیم رہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مذکور صفر کے مہینے میں نکلے اور مدینہ طیبہ پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا حتیٰ کہ آپ ودان پہنچ گئے اور بنی ضمرہ سے مصالحت کر لی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کی جانب لوٹ گئے اور جنگ نہ ہوئی اور اسی کا نام غزوہ ابواء بھی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مذکورہ سال کے ربیع الثانی کے مہینے تک مدینہ طیبہ میں مقیم رہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے نکلے اور سائب بن عثمان بن مظعون کو مدینہ طیبہ پر عامل مقرر فرمایا، یہاں تک کہ آپ رَضویٰ (مدینہ طیبہ میں ایک پہاڑ ہے) کے قریب بوَاط (قبیلہ جہینہ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے۔) پہنچ گئے پھر آپ مدینہ طیبہ واپس تشریف لے گئے اور جنگ نہ ہوئی۔ بعد ازاں آپ ربیع الثانی کے بقیہ ایام اور کچھ ایام جمادی الاول کے وہیں رہے پھر آپ غزوہ کے ارادہ سے نکلے اور مدینہ طیبہ پر ابوسلمہ بن عبدالاسد کو خلیفہ مقرر کیا اور مِلل (مکہ مکرمہ کی ایک وادی ہے) کے راستے سے عسیرہ کی طرف چل دیئے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن اسحاق نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں اور حضرت علی

1۔ مسلم کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 18، قدیمی کتب خانہ کراچی

2۔ مسلم کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 118، قدیمی کتب خانہ کراچی

ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3655، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الطبقات الکبریٰ ابن سعد، کتاب ذکر عدد مغازی رسول اللہ وسرایاہ، جلد 2، صفحہ 5، دار بیروت

بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ینبع کے بطن میں ہونے والے غزوہ عشیرہ میں دونوں دوست (ایک ساتھ) تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں اترے تو ایک مہینہ تک وہیں مقیم رہے اور وہاں بنی مدلج اور ان کے حلفاء بنی ضمرہ وغیرہ کے ساتھ صلح کر لی اور ان سے عداوت ترک کر دی، تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مجھے کہا: کیا تیرے لئے ممکن ہے (اے) ابا الیقظان کہ تو ان کے پاس آئے؟ بنی مدلج کی ایک جماعت بیدار رہ کر ان کے لئے کام کر رہی ہے ہم دیکھیں وہ کیسے کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم ان کے پاس آئے اور ان کی طرف کچھ وقت تک دیکھتے رہے پھر ہم پر نیند غالب آ گئی تو ہم نے زمین کی مٹی میں کھجور کے چھوٹے درختوں کا قصد کیا اور ان میں آ کر سو گئے، پھر قسم بخدا! ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آ کر اپنے قدموں کے ساتھ جگایا، تو ہم بیٹھ گئے اور ہم اس مٹی سے لتھڑے پڑے تھے تو اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ما بالک یا ابا تراب تجھے کیا ہوا ہے اے ابا تراب! تو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے بارے خبر دی جو ہمیں پیش آیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ألا اخبرکم باشقی الناس رجلین (کیا میں تمہیں ایسے دو آدمیوں کے بارے میں نہ بتاؤں جو تمام لوگوں سے زیادہ بدبخت ہیں؟ ہم نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قوم ثمود کا احیمر جس نے (حضرت صالح علیہ السلام کی) اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں اور (دوسرا وہ) جو تجھے اے علی! اس پر مارے گا...... اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دست مبارک اپنے سر پر رکھا...... یہاں تک کہ یہ اس سے تر ہو گیا'' اور (پھر) آپ نے اپنا دست مبارک اپنی ریش مبارک پر رکھا(1)۔ پس ابو عمر نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بقیہ جمادی الاولی اور جمادی الآخرہ کی کچھ راتیں وہیں مقیم رہے اور اس میں بنی مدلج سے مصالحت کی، پھر واپس لوٹ آئے اور جنگ تک نوبت نہ آئی، پھر اس کے بعد تھوڑے ہی دنوں کے فاصلے کے ساتھ غزوہ بدر الاولی ہوا، یہ وہ تفصیل ہے جس میں اہل التواریخ والسیر کوئی شک نہیں کرتے، پس حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے خبر دی جو کچھ ان کے پاس تھا۔ واللہ اعلم۔

اور کہا جاتا ہے: ذات العسیر سین کے ساتھ بھی ہے اور شین کے ساتھ بھی اور اس پر ھا کا اضافہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: العشیرۃ۔ پھر غزوہ بدر الکبریٰ ہوا اور جو بھی اس میں حاضر ہوئے ان کے لئے فضیلت کے اعتبار سے یہ بہت بڑی اور عظیم جنگ ہے اس میں علماء کی ایک جماعت کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کے ساتھ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی مدد فرمائی اور ظاہر آیت بھی اسی پر دلالت کرتی ہے، نہ کہ غزوہ احد میں۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ ایسا غزوہ احد میں ہوا تو انہوں نے قول باری تعالیٰ: وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ سے تا قولہ تَشْكُرُوْنَ کو دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ قرار دیا ہے۔ یہ عامر شعبی کا قول ہے۔ اور لوگوں نے ان سے اختلاف کیا ہے اور روایات بالکل ظاہر اور واضح ہیں کہ ملائکہ غزوہ بدر کے دن حاضر ہوئے اور عملاً جنگ میں شریک ہوئے اور اسی کے بارے ابو اسید مالک بن ربیعہ کا قول ہے اور یہ بدر میں حاضر تھے، اگر میں اب تمہارے ساتھ بدر میں ہوتا اور میری آنکھیں سلامت ہوتیں تو میں تمہیں وہ گھاٹی دکھاتا جس سے ملائکہ ظاہر ہوئے تھے مجھے اس میں کوئی شک اور اختلاف نہیں ہے۔ اسے عقیل نے زہری عن ابی حازم سلمہ بن دینار سے روایت کیا

1۔ مسند احمد بن حنبل کتاب اول مسند الکوفیین، جلد 4، صفحہ 263، دار صادر

ہے۔ ابن ابی حاتم نے کہا ہے: اس ایک حدیث کے سوا زہری کی ابو حازم سے کوئی حدیث معروف نہیں اور ابو اسید کے بارے کہا جاتا ہے کہ آپ ہی بدری صحابہ کرام میں سے سب سے آخر میں فوت ہوئے، اسے ابو عمر نے الاستیعاب وغیرہ میں ذکر کیا ہے اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکور ہے آپ نے بیان فرمایا: غزوہ بدر کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا کہ ان کی تعداد ایک ہزار ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی تعداد تین سو انیس ہے، تو نبی مکرم قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوئے، پھر اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور اپنے رب کریم کی بارگاہ میں التجا کرنے لگے: اللّٰھم انجزلی ما وعدتَنی اللّٰھم آتِ ما وعدتنی اللھم ان تھلك ھذہ العصابۃُ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض (اے اللہ! میرے لئے وہ وعدہ پورا فرما جو تو نے میرے ساتھ کیا ہے، اے اللہ! وہ عطا فرما جس کا تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے، اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔) پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبلہ شریف کی طرف منہ کئے ہاتھ پھیلا کر مسلسل اپنے رب کریم سے دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ آپ کے کندھوں سے آپ کی چادر مبارک گر گئی، پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے، انہوں نے چادر اٹھائی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھوں پر اسے ڈال دیا، پھر پیچھے کی جانب سے آپ کو پکڑ لیا اور عرض کی: یا نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے رب کی بارگاہ میں تمہاری طرف سے مناجات کافی ہے، وہ تمہارا وہ وعدہ پورا فرمائے گا جو اس نے تمہارے ساتھ فرمایا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِیْنَ ۝ (الانفال) (یاد کرو جب تم فریاد کر رہے تھے اپنے رب سے تو سن لی اس نے تمہاری فریاد (اور فرمایا) یقیناً میں مدد کرنے والا ہوں تمہاری ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ جو پے در پے آنے والے ہیں۔) پس اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ساتھ آپ کی مدد فرمائی۔

ابو زمیل نے کہا ہے کہ مجھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اس دن مسلمانوں میں سے کوئی آدمی کسی مشرک کے پیچھے تیز دوڑ رہا تھا تو اس نے اپنے سامنے اس پر کوڑا پڑنے کی آواز اور شہسوار کی آواز سنی کہ وہ کہہ رہا ہے: أقدم حیزوم، (حیزوم آگے بڑھ) تو اس نے اپنے سامنے مشرک کی طرف دیکھا کہ وہ چت گر گیا ہے، تو اس نے اس کی طرف دیکھا کہ اس کی ناک توڑ دی گئی ہے اور اس کا چہرہ اس طرح پھاڑ دیا گیا ہے [جس طرح کوڑے کی ضرب کے ساتھ۔] پس وہ تمام کے تمام اکٹھے ہو گئے تو ایک انصاری آیا اور اس نے اس کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: صدقت ذالك من مدد السمآء الثالثۃ (تو نے سچ کہا ہے وہ تیسرے آسمان سے مدد آئی تھی) پس اس دن وہ ستر مارے گئے اور ستر قیدی بنا لئے گئے۔ آگے حدیث ذکر کی (1) اور عنقریب سورہ الانفال کے آخر میں مکمل آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ پس سنت اور قرآن نے اسی کی موافقت کی ہے جو کچھ جمہور نے کہا ہے، والحمدللہ۔

خارجہ بن ابراہیم نے اپنے باپ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام سے پوچھا: ''بدر کے دن ملائکہ میں سے کون یہ کہہ رہا تھا اقدِم حیزوم؟ تو حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے عرض کی:

1۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب الامداد بالملائکۃ فی غزوۃ بدر و اباحۃ الغنائم، جلد 2، صفحہ 93، اسلام آباد

یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ما کل اهل السماء أعرف (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام اہل آسمان کو نہیں پہچانتا۔)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا: اس اثنا میں کہ میں بدر کے کنوئیں سے پانی کا ڈول کھینچ رہا تھا کہ تیز ہوا آئی جس کی مثل میں نے کبھی نہ دیکھی تھی، پھر وہ چلی گئی۔ پھر اتنی تیز ہوا آئی کہ میں نے اس کی مثل کبھی نہ دیکھی تھی مگر وہی جو اس سے پہلے آئی تھی۔ راوی کا بیان ہے: میرا گمان ہے کہ انہوں نے ذکر کیا، پھر انتہائی تیز اور شدید ہوا آئی، پس پہلی ہوا کے وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام ہزار ملائکہ کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اترے اور دوسری ہوا کے وقت حضرت میکائیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتوں کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں جانب اترے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں جانب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور تیسری ہوا کے وقت حضرت اسرافیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بائیں جانب اترے اور میسرہ میں میں تھا۔

اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: میں نے بذات خود غزوہ بدر کے دن دیکھا کہ ہم میں سے کوئی اپنی تلوار کے ساتھ مشرک کے سر کی طرف اشارہ کرتا ہے تو تلوار اس تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا سر اس کے جسم سے کٹ کر گر پڑتا۔

اور حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ لوگ غزوہ بدر کے دن کفار کے ان مقتولوں کو پہچانتے تھے جنہیں فرشتوں نے قتل کیا تھا انہوں نے انہیں گردنوں کے اوپر ضرب لگا کر قتل کیا تھا اور پوروں پر آگ کے نشان کی مثل نشان تھے وہ اس کے ساتھ جلا دیئے گئے، یہ سب بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے: بے شک ملائکہ قتال کرتے رہے ہیں اور کفار میں ان کی ضرب کی علامت بالکل ظاہر تھی، کیونکہ جس جگہ ان کی ضرب لگی اس جگہ میں آگ بھڑک اٹھی، یہاں تک کہ ابوجہل نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو کہا: کیا تم نے مجھے قتل کیا ہے؟ بلاشبہ مجھے اس نے قتل کیا ہے جس کے گھوڑے کے سم تک میرا نیزہ بھی نہیں پہنچ سکا اگرچہ کوشش تو نے کی ہے۔ ملائکہ کی کثرت کا فائدہ یہ ہوا کہ مومنین کے دلوں کو تسکین اور راحت نصیب ہوئی اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو یوم قیامت تک مجاہدین بنا دیا، پس ہر لشکر جس نے صبر کیا اور اخلاص اپنایا فرشتے ان کے پاس آئیں گے اور ان کی معیت میں جنگ میں شریک ہوں گے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد نے فرمایا: ملائکہ نے بدر کے دن کے سوا کہیں جنگ نہیں لڑی۔ اور اس کے سوا میں وہ صرف حاضر ہوئے ہیں لیکن وہ قتال نہیں کرتے بلاشبہ وہ تعداد (میں اضافہ کا سبب) یا مددگار ہوتے ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ملائکہ کی کثرت کا فائدہ یہ ہے کہ وہ دعا کرتے رہتے ہیں اور تسبیح بیان کرتے ہیں اور وہ ان کے لئے (اجر و ثواب میں) اضافہ کا سبب بنتے ہیں جو اس دن قتال کرتے ہیں، پس اس بناء پر تو ملائکہ نے بدر کے دن بھی قتال نہیں کیا بلکہ وہ صرف ثابت قدم رہنے کی دعا کے لئے حاضر ہوئے، پہلا قول اکثر کا ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ بدر کا دن تھا، اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار کے ساتھ ان کی امداد فرمائی پھر وہ تین ہزار ہو گئے اور پھر بڑھ کر پانچ ہزار ہو گئے (1)، پس اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 542

مُّمِدَّكُمْ بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ⑨ اور بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ⑫ پس مومنین نے بدر کے دن صبر کیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو اللہ تعالیٰ نے پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ ان کی امداد فرمائی جیسا کہ ان سے وعدہ کیا تھا، پس یہ سب غزوہ بدر کے دن ہوا۔ اور حسن نے کہا ہے: پس یہ پانچ ہزار یوم قیامت تک مومنین کے لئے مدد و معاون رہیں گے۔

حضرت شعبی نے کہا ہے: بدر کے دن حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو یہ خبر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں پر شاق گزری، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ . . . تا قولہ . . . مُسَوِّمِيْنَ پس کرز کو شکست اور ہزیمت کی خبر موصول ہوئی تو اس نے اس کی کوئی مدد نہ کی اور واپس لوٹ گیا، پس اللہ تعالیٰ نے بھی پانچ ہزار کے ساتھ ان کی مدد نہ کی، بلکہ ایک ہزار کے ساتھ ان کی مدد کی گئی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن مومنین سے یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ اس کی طاعت و فرمانبرداری پر ڈٹے رہے، اور اس کے محارم سے بچتے رہے تو وہ ان کی تمام جنگوں میں مدد فرمائے گا۔ لیکن جنگ احزاب کے سوا نہ انہوں نے صبر کیا اور نہ ہی وہ محارم سے بچے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی جب انہوں نے بنی قریظہ کا محاصرہ کیا۔(1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ یہ جنگ احد کا دن تھا، اللہ تعالیٰ نے ان سے مدد کا وعدہ فرمایا بشرطیکہ انہوں نے صبر کیا پس انہوں نے صبر نہ کیا اور نہ ہی ایک فرشتے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی، اگر ان کی مدد کی جاتی تو پھر انہیں ہزیمت نہ اٹھانی پڑتی۔

عکرمہ اور ضحاک نے یہی کہا ہے (2) اور اگر کہا جائے: تحقیق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دائیں اور بائیں جانب دو آدمیوں کو دیکھا وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھے اور وہ دونوں آپ کی جانب سے انتہائی شدید جنگ لڑ رہے تھے، میں نے ان دونوں کو کبھی نہ اس سے پہلے دیکھا اور نہ ہی اس کے بعد (3) (دیکھا)۔ اس کے بارے کہا گیا ہے: شاید یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مختص ہو، اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے دو فرشتے خاص کر دیئے جو آپ کی طرف سے جنگ لڑیں گے اور یہ صحابہ کرام کے لئے امداد نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 2۔ ملائکہ کا نازل ہونا مدد و نصرت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ رب العالمین اس کا محتاج اور ضرورت مند نہیں ہے، بلکہ مخلوق اس کی محتاج ہے پس چاہیے کہ دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے اور اسی پر اعتماد اور توکل ہو، کیونکہ سبب اور بغیر سبب کے وہی ناصر اور مدد فرمانے والا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ⑧ (یٰسین) (اس کا کام کا حکم، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے) لیکن اس نے اس کے بارے خبر دی ہے تاکہ مخلوق اس کی پیروی کرے جس کا اللہ تعالیٰ انہیں حکم فرمائے ان اسباب میں سے جو پہلے گزر چکے ہیں، وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ⑫

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 542　　2۔ ایضاً، صفحہ 543

3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث 3748، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(الاحزاب) (اور آپ سنت الٰہی میں ہرگز کوئی تغیر و تبدل نہ پائیں گے) وراس طرح توکل میں کوئی نقص اور عیب پیدا نہ ہوگا، اور یہ ان کا رد ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اسباب تو ضعفاء اور کمزوروں کے لئے بنائے گئے ہیں نہ کہ اقویاء اور طاقتوروں کے لئے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام تو اقویا اور طاقتور تھے اور ان کے سوا دوسرے ضعفاء اور کمزور ہیں اور یہ بالکل واضح ہے۔ مدّ کا لفظ شر میں اور أمدّ کا لفظ خیر میں (مدد کے لئے استعمال ہوتا ہے) جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

ابوحیوہ نے مُنْزِلِيْنَ زا کو کسرہ کے ساتھ مخفف پڑھا ہے یعنی وہ مدد و نصرت اتارنے والے ہیں۔ اور ابن عامر نے کثرت کی بنا پر زا کو مشدد اور مفتوح پڑھا ہے۔ پھر فرمایا: بَلٰٓى (ہاں کافی ہے) اور کلام مکمل ہوگئی۔ اِنْ تَصْبِرُوْا یہ شرط ہے یعنی اگر تم دشمن کے مقابلے میں صبر کرو وَ تَتَّقُوْا یہ اس پر معطوف ہے، یعنی تم اس کی معصیت اور نافرمانی سے بچے رہو۔ يُمْدِدْكُمْ یہ جواب شرط ہے۔ (تو وہ تمہاری مدد کرے گا) اور مِّنْ فَوْرِهِمْ کا معنی ہے من وَجْهِهِمْ (یعنی اگر ان کی طرف سے تیزی ہو جائے) یہ عکرمہ، قتادہ اور حسن، ربیع، سدی اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: من غضبهم (یعنی اگر وہ آ جائیں اپنے غضب سے) یہ مجاہد اور ضحاک سے منقول ہے۔ وہ غزوہ احد کے دن ان حالات سے غضب میں تھے جن کا غزوہ بدر کے دن انہیں سامنا کرنا پڑا(1)۔ اور الفور کا اصلی معنی کسی شی کی طرف قصد کرنا اور اسے خوب محنت و مشقت کے ساتھ لینا ہے اور یہ ان کے اس قول سے ہے: فارت القِدر تفور فورًا و فَوَرَانًا۔ جب ہانڈی خوب ابلنے لگے اور الفور کا معنی الغَلَيان (ابلنا) ہے۔ اور فار غضبہ جب غصہ خوب بھڑک جائے (تو یہ کہا جاتا ہے) اور اس کا فعل فورہ سے ہے یعنی اس سے پہلے کہ وہ ساکن ہو۔ اور الفوارۃ جو کچھ ہانڈی میں سے ابلتا اور کھولتا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے وَ فَارَ التَّنُّوْرُ (تنور ابل گیا) شاعر نے کہا ہے:

تفور علینا قِدرُهُمْ فَنُدِيمُهَا

ہمارے خلاف ان کی ہنڈیاں ابلنے لگتی ہیں تو ہم انہیں ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مُسَوَّمِيْنَ یہ واؤ کے فتحہ کے ساتھ اسم مفعول ہے۔ اور یہ ابن عامر، حمزہ، کسائی اور نافع کی قرأت ہے یعنی جن کی علامت کے ساتھ پہچان کرائی گئی ہے۔ اور مُسَوِّمِيْنَ واؤ کے کسرہ کے ساتھ اسم فاعل ہے۔ اور یہ ابو عمرو، ابن کثیر اور عاصم کی قرأت ہے(2) اور یہ بھی سابقہ معنی کا احتمال رکھتا ہے یعنی انہوں نے علامت کے ساتھ اپنی اور اپنے گھوڑوں کی پہچان کرائی۔ علامہ طبری وغیرہ نے اس قرأت کو ترجیح دی ہے اور بہت سے مفسرین نے کہا ہے: مُسَوِّمِيْنَ یعنی وہ اپنے گھوڑے جنگ میں بھیجنے والے ہیں۔ اور مہدوی نے مُسَوَّمِيْنَ بفتح واؤ میں یہ معنی ذکر کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں کفار کے خلاف بھیجا...... اور ابن فورک نے بھی یہی کہا ہے۔ اور پہلی قرأت کے مطابق انہوں نے ملائکہ کی نشانی میں اختلاف کیا ہے۔

پس حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ سے مروی ہے کہ ملائکہ سفید عمامے باندھے ہوئے تھے اور (ان کی طرف کو) اپنے کندھوں کے درمیان چھوڑ رکھا تھا(3) (یعنی ایک لڑ کندھوں کے درمیان لٹکا رکھا تھا) اسے بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے اور مہدوی نے اسے زجاج سے بیان کیا ہے مگر حضرت جبرئیل امین علیہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 543　　2۔ ایضاً، صفحہ 544　　3۔ ایضاً

السلام حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی طرح زرد رنگ کا عمامہ باندھے ہوئے تھے اور ابن اسحاق نے اسے بیان کیا ہے۔ اور ربیع نے بیان کیا ہے کہ ان کی نشانی یہ تھی کہ وہ ابلق گھوڑوں پر سوار تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بیہقی نے حضرت سہل بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے بدر کے دن زمین و آسمان کے درمیان ابلق گھوڑوں پر کچھ چمکتے اور روشن آدمی دیکھے درآنحالیکہ وہ نشان زدہ تھے وہ قتل کر رہے تھے اور قیدی بنا رہے تھے۔ پس ان کا قول: معلَّمِین اس پر دلیل ہے کہ ابلق گھوڑے کوئی نشانی نہیں ہے، واللہ اعلم۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ان کے گھوڑوں کی دمیں اور کلغیاں کٹی ہوئی تھیں اور پیشانیوں اور دموں پر رنگ برنگی اون کے ساتھ نشان لگے ہوئے تھے۔ (1)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: بدر کے دن ملائکہ سفید اون کے ساتھ گھوڑوں کی پیشانیوں اور ان کی دموں پر نشان لگائے ہوئے تھے (2) اور عباد بن عبداللہ بن زبیر، ہشام بن عروہ اور کلبی نے کہا ہے: ملائکہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی نشانی میں نازل ہوئے وہ زرد رنگ کے عمامے باندھے ہوئے تھے درآنحالیکہ وہ ان کے کندھوں پر لٹک رہے تھے (3)۔ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے دونوں صاحبزادوں حضرت عبداللہ اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: زرد رنگ کی چادر تھی جس کو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بطور عمامہ باندھے ہوئے تھے۔

میں کہتا ہوں: اور آیت اس پر دلیل ہے..... اور یہ چوتھا مسئلہ ہے..... (۴) یعنی یہ قبائل اور لشکروں کے لئے کوئی علامت اور کوڈ بنانے پر دلالت کرتی ہے جو ان کے لئے حاکم وقت متعین کرتا ہے تا کہ ہر قبیلہ اور ہر لشکر جنگ کے وقت دوسرے سے ممتاز اور الگ رہے اور یہ آیت ابلق گھوڑوں کی فضیلت پر بھی دلیل ہے کیونکہ ملائکہ نے ان پر نزول فرمایا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی موافقت میں ملائکہ ان پر نازل ہوئے، کیونکہ وہ تھوڑا ابلق تھا اور اس کے سوا ان کے پاس کوئی گھوڑا نہ تھا، پس ملائکہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی تعظیم و تکریم میں ابلق گھوڑوں پر اترے، جس طرح حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت جبرئیل امین علیہ السلام زرد عمامہ باندھ کر نزول فرما ہوئے۔ واللہ اعلم۔

اور آیت اس پر بھی دلیل ہے..... اور یہی پانچواں مسئلہ ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ کہ اون کا لباس وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام اور صالحین نے پہنا ہے۔ اور ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ انہی کے ہیں کہ حضرت ابو بردہ نے اپنے باپ سے روایت کیا اور کہا کہ میرے باپ نے مجھے بتایا: اگر تو ہمارے ساتھ حاضر ہوتا درآنحالیکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے جب بارش ہم پر برستی تو یقیناً تو گمان کرتا کہ ہماری ہوا بھیڑوں کی ہوا کی طرح ہے (4)، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنگ آستینوں والا اون کا بنا ہوا رومی جبہ زیب تن فرمایا۔

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 297　2۔ ایضاً　3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 544

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، حدیث 3515، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب اللباس، حدیث 3551، ضیاء القرآن پبلی کیشنز ایضاً، جامع ترمذی، کتاب اللباس، جلد 1، صفحہ 209، اسلام آباد

اسے ائمہ نے روایت کیا ہے (1) اور حضرت یونس علیہ السلام نے بھی اسے پہنا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس کا مزید بیان سورۃ النحل میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا وہ جو حضرت مجاہد نے ذکر کیا ہے کہ ان کے گھوڑوں کی دمیں اور کلغیاں کٹی ہوئی تھیں تو یہ بہت بعید ہے، کیونکہ مصنف ابی داؤد میں عتبہ بن عبد سلمی سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''تم گھوڑوں کی پیشانیاں نہ کاٹو (یعنی ان کے بال نہ کاٹو) اور نہ ہی ان کی کلغیاں اور نہ ہی ان کی دمیں، کیونکہ ان کی دمیں ان کی چربی ہے اور ان کی کلغیاں ان کے لئے حرارت ہیں اور ان کی پیشانیوں میں خیر اور بھلائی رکھ دی گئی ہے۔ (2)'' پس حضرت مجاہد کا قول اس حکم توقیفی کا محتاج ہے کہ ملائکہ کے گھوڑے اس صفت پر تھے۔ واللہ اعلم۔

اور آیت رنگوں میں سے سفید اور زرد رنگ کے حسن پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ ملائکہ انہی کے ساتھ نازل ہوئے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جس نے زرد رنگ کے نعل پہن لئے اس کی حاجت پوری کر دی گئی (3)۔ ور آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے کپڑوں میں سے سفید پہنو کیونکہ وہ تمہارے بہترین اور خیر و برکت والے کپڑے ہیں اور اپنے مردوں کو سفید کپڑے میں کفن دو (4) اور رہے عمامے تو وہ عربوں کا تاج اور ان کا لباس ہے'' اور رکانہ نے روایت کیا ہے...... اس نے حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ کشتی لڑی تو حضور نبی مکرم ﷺ نے اسے پچھاڑ دیا۔

رکانہ نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: فرق ما بیننا و بین المشرکین العمائم علی القلانس (5) (کہ ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق ٹوپیوں پر عمامے باندھنا ہے) اسے ابو داؤد نے بیان کیا ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے اس کی اسناد مجہول ہے اس کے بعض راویوں کا سماع بعض سے معروف نہیں۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی لَكُمْ وَلِتَطْمَىٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۗ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِیَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْ یَكْبِتَهُمْ فَیَنْقَلِبُوْا خَآىٕبِیْنَ ﴿۱۲۷﴾

''اور نہیں بنایا فرشتوں کے اترنے کو اللہ نے مگر خوشخبری تمہارے لئے اور تا کہ مطمئن ہو جائیں تمہارے دل اس سے اور (حقیقت تو یہ ہے) کہ نہیں ہے فتح و نصرت مگر اللہ کی طرف سے جو سب پر غالب (اور) حکمت والا ہے۔ (یہ مدد اس لئے تھی) تا کہ کاٹ دے ایک حصہ کافروں سے یا ذلیل کر دے ان کو پس لوٹ جائیں نامراد ہو کر۔''

قولہ تعالیٰ: وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی لَكُمْ اس میں ہ ضمیر مدد کے لئے ہے اور وہ ملائکہ ہیں یا وعدہ ہے یا امداد ہے، اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ حدیث نمبر 350، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2180، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 344، اسلام آباد

3۔ احکام القرآن، جلد 1 صفحہ 297

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، حدیث نمبر 3380، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ جامع ترمذی، کتاب اللباس، باب العمائم علی القلانس، جلد 1 صفحہ 210، اسلام آباد۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث 1706، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس پر قول باری تعالیٰ یُمْدِدْكُمْ دلالت کرتا ہے یا پھر ضمیر تسویم (نشان لگانا) یا انزال (اتارنا) یا معنوی طور پر عدد کے لئے ہے، کیونکہ خمسۃ آلاف عدد ہے۔ وَ لِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ اس میں لام، لام کی ہے، یعنی ولتطمئن قلوبکم بہ جعلہ (تا کہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں ایسا کیا۔) اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ حِفْظًا۔ ای حفظا لها جعل ذالك (اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں کے ساتھ آراستہ کیا اور اس کی حفاظت کے لئے اسے بنایا۔)

وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی مومنین کی مدد و نصرت نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے، اس میں کافروں کی مدد داخل نہیں ہے، کیونکہ انہیں جو غلبہ حاصل ہوتا ہے وہ بلاشبہ رسوائی، برے انجام اور خسارے سے بھرا اور گھرا ہوتا ہے۔

لِیَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا (یعنی تا کہ وہ قتل کے ساتھ کافروں کا ایک حصہ کاٹ دے) اور نظم آیت اس طرح ہے: ولقد نصرکم اللہ ببدر لیقطع۔ (تحقیق اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن تمہاری مدد فرمائی تا کہ وہ کاٹ دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے وما النصر الا من عند اللہ لیقطع (مدد نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے تا کہ وہ کاٹ دے۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ یُمْدِدْكُمْ کے متعلق ہو، (یعنی وہ تمہاری مدد کرے گا تا کہ وہ کاٹ دے) اور معنی ہے: مشرکین میں سے جو بدر کے دن قتل کئے گئے، حسن وغیرہ سے یہ منقول ہے۔ سدی نے کہا ہے: یعنی اس کے ساتھ جو مشرکین غزوہ احد کے دن قتل کئے گئے اور وہ اٹھارہ آدمی تھے۔

اور یَكْبِتَهُمْ کا معنی ہے یحزنھم (یا وہ انہیں پریشان اور غمزدہ کر دے، اور المکبوت کا معنی محزون (غمگین) ہے۔ اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابوطلحہ کے پاس آئے تو ان کے بیٹے کو پریشان اور غمزدہ دیکھا۔ تو فرمایا: ''اسے کیا ہوا ہے؟'' تو عرض کی گئی: اس کا اونٹ مر گیا ہے۔ اور اس کی اصل جو کہ بعض اہل لغت نے بیان کی ہے یکبدھم ہے ای یصیبھم بالحزن والغیظ فی آکبادھم (1) (یعنی وہ انہیں غم و اندوہ اور غیظ و غضب ان کے دلوں (کلیجوں) میں پہنچائے۔) پھر دال کو تا سے بدل دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سَبَتَ رأسہ اور سبدہ میں دال کو تا سے بدلا گیا ہے یعنی اس نے اس کا سر مونڈ دیا (2)۔ کبت اللہ العدو کبتا (یہ تب کہا جاتا ہے) جب اللہ تعالیٰ دشمن کو پھیر دے اور اسے ذلیل و رسوا کر دے، اور کبدہ کا معنی ہے اصابہ فی کبدہ (یعنی اس نے اس کے دل میں تکلیف پہنچائی) کہا جاتا ہے: قد احرق الحزن کبدہ (غم نے اس کے دل کو جلا دیا) اور احرقت العداوۃ کَبِدَہٗ (دشمنی نے اس کا جگر جلا دیا۔) اور عرب دشمن کے لئے کہتے ہیں: أسود الکبد۔ (جگر سیاہ ہو گیا)

اعشی نے کہا ہے:

فما أجشمت من اتیانِ قوم　　هم الأعداءُ والأكباد سُودُ

اس میں الاکبادُ سُودٌ جگر سیاہ ہونے کے معنی میں ہے۔

گویا کہ شدت عداوت کے سبب جب جگر جل جاتا ہے تو وہ سیاہ ہو جاتا ہے اور ابو مجلز نے او یکبدھم دال کے ساتھ پڑھا

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 545　2۔ ایضاً

ہے۔ اور الخائب سے مراد وہ ہے جس کی امید ٹوٹ چکی ہو (کچھ ہاتھ نہ آئے) خاب یخیب اذا لم ینل ما طلب یعنی جو طلب کیا جب وہ اسے نہ پائے تو اس کے لئے خاب یخیب کا لفظ کہا جاتا ہے۔ اور الخیاب یعنی ایسا عیب ہے جسے وہ چھپا نہ سکتا ہو۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾

''نہیں ہے آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل چاہے تو الله ان کی توبہ قبول فرمالے اور چاہے تو عذاب دے انہیں، پس بے شک وہ ظالم ہیں۔ اور الله ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور الله بہت بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ صحیح مسلم میں موجود ہے کہ غزوہ احد میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک شہید کر دیئے گئے اور آپ کا سر زخمی کر دیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے خون صاف کرنے لگے اور فرمانے لگے: ''وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جنہوں نے اپنے نبی کا سر زخمی کر دیا اور اس کے دانت توڑ دیئے حالانکہ وہ انہیں الله تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔'' تب الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ۔(1)

ضحاک نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کے لئے بددعا کرنے کا ارادہ فرمایا تو الله تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے استیصال اور بربادی کے بارے دعا مانگنے کی اجازت طلب کی، تو جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے جان لیا کہ ان میں سے بعض عنقریب اسلام قبول کر لیں گے، چنانچہ پھر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے ان میں سے حضرت خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور عکرمہ بن ابی جہل وغیرہ افراد ہیں۔

ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چار آدمیوں کے لئے بددعا کرتے رہے، پھر الله تعالیٰ نے لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ آیت نازل فرمائی۔ اور پھر الله تعالیٰ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی ہدایت اور توفیق عطا فرما دی۔ اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔(2)

اور قول تعالیٰ: اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ کہا گیا ہے یہ لِيَقْطَعَ طَرَفًا پر معطوف ہے اور معنی ہے تاکہ وہ ان میں سے ایک گروہ کو قتل کر دے یا انہیں شکست و ہزیمت کے ساتھ ذلیل و رسوا کر دے یا ان کی توبہ قبول فرمالے یا انہیں عذاب دے۔ اور یہاں اَوْ بمعنی حتّٰی اور اِلَّا اَنْ ہے۔ امرؤ القیس نے کہا ہے:

... او نموت فنعذرا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر باب غزوہ احد، جلد 2، صفحہ 108، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی

2۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن سورۂ آل عمران، جلد 1، صفحہ 125، اسلام آباد

ہمارے علماء نے کہا ہے: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد: کیف یفلح قوم شجوا رأس نبیھم یہ بعید سمجھنا ہے اس کے لئے توفیق کو جس نے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ یہ اسے قریب کرنا ہے جسے آپ نے بعید سمجھا اور ان کے اسلام قبول کرنے میں حرص وطمع کا اظہار ہے۔

اور جب اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو طمع دلایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح عرض کی: اللھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون(1) (اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے ہیں۔) جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: گویا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھ رہا ہوں آپ انبیاء میں سے کسی نبی علیہ السلام کا ذکر فرما رہے ہیں کہ آپ کی قوم نے آپ کو مارا اور وہ اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں: ''اے میرے پروردگار! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے ہیں۔''

ہمارے علماء نے کہا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حکایت کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہ محکی عنہ ہیں اور اس پر صریح اور واضح دلیل یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید کر دیئے گئے اور آپ کا چہرہ مقدس زخمی کر دیا گیا غزوہ احد میں تو یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر انتہائی شاک گزرا تو انہوں نے عرض کی: اگر آپ ان کے لئے بددعا فرمائیں! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا بلکہ مجھے تو دعوت دینے والا اور رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے(2)، اے اللہ! میری قوم کی مغفرت فرما کیونکہ وہ نہیں جانتے۔'' گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف واقعہ احد پیش آنے سے پہلے اس کے بارے وحی کی گئی اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے لئے معین نہیں کیا اور جب آپ کو یہ واقعہ پیش آیا تو متعین ہو گیا کہ معنی یہی ہے اور اس کی دلیل وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض کلام میں اس بارے میں جو کہا ہے وہ بھی اس کی وضاحت کرتا ہے: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے بارے میں بددعا کی اور یہ کہا: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ﴿۲۶﴾ الآیہ (نوح) (اے رب! زمین پر کافروں کا کوئی گھر نہ چھوڑ۔) اور اگر آپ ہمارے خلاف اس طرح کی دعا کرتے تو ہم اپنے آخر کی طرف سے ہلاک ہو جاتے، حالانکہ آپ کی پشت کو روندا گیا، آپ کا چہرہ خون آلود کیا گیا اور آپ کے دندان مبارک شہید کئے گئے لیکن آپ نے کلمہ خیر کے سوا کچھ نہ کہا اور یہ دعا کی: رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون(3) اور آپ کا قول: اشتد غضب اللہ علی قوم کسروا رباعیۃ نبیھم(4) (اللہ تعالیٰ کا غضب شدید اور سخت ہوا اس قوم پر جنہوں نے اپنے نبی علیہ السلام کے دندان مبارک شہید کر دیئے) یہ خالصۃً اس کے لئے ہے جس نے عملاً ایسا کیا اور ہم نے اس کا نام ذکر کر دیا ہے اگرچہ اس کے بارے اختلاف ہے اور ہم نے یہ کہا کہ یہ مباشر (عمل کرنے والے) کے ساتھ خاص ہے، اس لئے کہ ان میں سے ایک جماعت نے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفطن باب الصبر علی البلاء، صفحہ 300۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث 3218، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 323، اسلام آباد 3۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد باب غزوہ احد، جلد 2، صفحہ 208

4۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 108۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3765، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسلام قبول کر لیا جو جنگ احد میں شریک ہوئے تھے اور خوب اچھی طرح اسلام لائے۔

مسئلہ نمبر 2۔ بعض علماء کوفہ نے گمان کیا ہے کہ یہ آیت اس قنوت کے لئے ناسخ ہے جو حضور نبی مکرم ﷺ صبح کی نماز کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد پڑھا کرتے تھے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو فجر کی نماز میں رکوع سے سر اٹھانے کے بعد یہ کہتے ہوئے سنا: اللّٰھم ربنا ولك الحمد فی الآخرۃ ... پھر کہا... اللّٰھم العن فلانا و فلانا پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ الآیہ۔ اسے بخاری نے نقل کیا ہے (1) اور امام مسلم نے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے یہ اس سے زیادہ مکمل اور اتم ہے (2) اور یہ نسخ کا محل نہیں ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ امر ان کے پاس نہیں ہے اور یہ کہ وہ غیب میں سے کچھ نہیں جانتے مگر وہی جو میں انہیں بتاتا ہوں اور یہ کہ تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ جسے چاہے گا اس کی توبہ قبول فرمالے گا اور جس کے لئے چاہے گا اسے جلدی عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ اور تقدیر کلام اس طرح ہے: لیس لك من الامر شیئ و للّٰہ ما فی السموات و ما فی الارض دونك و دونهم یغفر لمن یشاء و یتوب علی من یشاء (آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے نہ آپ کا ہے اور نہ ہی ان کا ہے وہ بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور جس کی چاہتا ہے توبہ قبول فرمالیتا ہے) پس اس میں کوئی نسخ نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ سے یہ بیان کیا ہے کہ تمام معاملات اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے ہوتے ہیں اس میں قدریہ وغیرہ کا رد ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ نماز فجر اور اس کے علاوہ نمازوں میں قنوت پڑھنے کے بارے علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس کوفیوں نے نماز فجر وغیرہا میں قنوت سے منع کیا ہے اور یہی مذہب لیث اور صاحب مالک یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسی کا ہے۔ اور شعبیؒ نے اس کا انکار کیا ہے اور موطا میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ کسی نماز میں قنوت نہ پڑھتے تھے (3) اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ ہمیں قتیبہ نے عن خلف عن ابی مالك اشجعی عن ابیه کی سند سے خبر دی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے قنوت نہ پڑھی اور میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے دعائے قنوت نہ پڑھی اور میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز ادا کی اور آپ نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز پڑھی اور آپ نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے بھی قنوت نہ پڑھی، پھر فرمایا: اے بیٹے! یہ بدعت ہے (4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فجر کی نماز میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام لکتاب اللہ، جلد 2، صفحہ 1091، اسلام آباد۔ ایضاً، حدیث نمبر 6800، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 4194، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ موطا امام مالک، باب القنوت فی الصبح، صفحہ 143، اسلام آباد

4۔ سنن نسائی، باب ترک القنوت، جلد 1، صفحہ 164۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی ترک القنوت، حدیث نمبر 368، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہمیشہ قنوت پڑھی جائے گی اور تمام نمازوں میں (پڑھی جائے گی) جبکہ مسلمانوں پر کوئی آفت نازل ہو۔ امام شافعیؒ اور طبری نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نماز فجر میں مستحب ہے اور یہ امام شافعیؒ سے مروی ہے اور حسن اور سحنون نے کہا ہے کہ یہ سنت ہے اور یہی علی بن زیاد کی اس روایت کا تقاضا ہے جو امام مالکؒ سے مروی ہے کہ جان بوجھ کر اسے چھوڑنے والا نماز کا اعادہ کرے گا اور علامہ طبری نے اس پر اجماع بیان کیا ہے کہ اسے چھوڑ دینا نماز کو فاسد نہیں کرتا۔ اور حسن سے منقول ہے کہ قنوت کے ترک ہو جانے میں سجدۂ سہو لازم ہے اور یہی امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ دار قطنی نے سعید ابن عبدالعزیز سے اس کے بارے بیان کیا ہے جو صبح کی نماز میں قنوت بھول گیا۔ فرمایا: وہ سہو کے دو سجدے کرے گا۔ اور امام مالک نے رکوع سے پہلے کو اختیار کیا ہے اور یہی اسحاق کا قول ہے اور یہی امام شافعیؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ کا بھی قول ہے۔ اور صحابہ کرام کی ایک جماعت سے اس بارے میں اختیار مروی ہے (یعنی چاہے تو رکوع سے پہلے پڑھے اور چاہے تو رکوع کے بعد) اور دار قطنی نے اسناد صحیح کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح کی نماز میں مسلسل قنوت پڑھتے رہے یہاں تک کہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور ابو داؤد نے مراسیل میں خالد بن ابی عمران سے ذکر کیا ہے، انہوں نے فرمایا: اس اثنا میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مضر کے خلاف دعا کر رہے تھے کہ اچانک جبرائیل امین حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ خاموش رہیے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہو گئے، پھر انہوں نے کہا: ''اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو گالی گلوچ اور لعن طعن کرنے کے لئے نہیں بھیجا، بلکہ اس نے آپ کو رحمت بنا کر مبعوث فرمایا ہے اور اس نے آپ کو عذاب کے لئے نہیں بھیجا، لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ اَوْ یُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ۔ راوی نے بیان کیا: پھر انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ دعائے قنوت سکھائی پس فرمایا: اللھم انا نستعینك و نستغفرك و نؤمن بك و نخنع لك و نخلع و نترك من یكفرك اللھم ایاك نعبد و لك نصلی و نسجد و الیك نسعی و نحفد و نرجو رحمتك و نخاف عذابك الجد ان عذابك بالكافرین ملحق۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اے ایمان والو! نہ کھاؤ سود دوگنا چوگنا کر کے اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ اور بچو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول (کریم) کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً سود کھانے سے یہ نہی قصہ احد کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: مجھے اس بارے میں روایت کردہ کوئی شے یاد نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت مجاہد نے بیان کیا ہے: وہ ایک مدت تک بیع کرتے تھے اور جب مدت مقررہ گزر جاتی تو وہ اسے مؤخر کرنے کی شرط پر ثمن میں اضافہ کر دیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا

الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً [میں کہتا ہوں] تمام گناہوں میں سے ربا کو خاص کیا گیا ہے، کیونکہ یہ وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں جنگ کی اجازت دی ہے: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (البقرہ: 279) (اور تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے) اور جنگ قتل کی خبر دیتی ہے، گویا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے: اگر تم سود سے نہ بچے تو تمہیں ہزیمت کا سامنا ہوگا اور تم قتل کر دیئے جاؤ گے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں سود چھوڑنے کا حکم دیا، کیونکہ ان کے نزدیک اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ واللہ اعلم۔ اور اَضْعَافًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور مُّضٰعَفَةً اس کی صفت ہے۔ اور اسے مُضَعَّفَةً بھی پڑھا گیا ہے۔ اور اس کا معنی ہے وہ سود جس میں عرب قرض کو دوگنا کر لیتے تھے اور طالب کہتا تھا: کیا تو ادا کرے گا یا سود دے گا؟ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور مُضَاعَفَةً یہ ایک سال کے بعد دوسرے سال دوگنا کو چار گنا کرنے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ وہ کرتے تھے، پس یہ عبارت موکدہ ان کے فعل کے انتہائی برا اور قبیح ہونے پر دلیل ہے، اسی لئے خاص طور پر تضعیف کی حالت ذکر کی گئی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو سود کے مالوں میں اور تم انہیں نہ کھاؤ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں خوفزدہ کیا (1) اور فرمایا: وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ بہت سے مفسرین نے کہا ہے یہ وعید اس کے لئے ہے جس نے سود کو حلال سمجھا اور جس نے ربا کو حلال سمجھا وہ کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے ایسے عمل سے بچو جو تم سے ایمان کو چھین لیتا ہے کہ تم (اس کے سبب) آتش جہنم کو واجب کر لو گے، کیونکہ گناہوں میں سے بعض ایسے ہیں جنہیں کرنے والا ایمان کے چھن جانے کو واجب کر لیتا ہے اور اس پر خوف کیا جانے لگتا ہے، انہیں میں سے والدین کی نافرمانی بھی ہے۔ اور اس بارے میں ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک آدمی اپنے والدین کا نافرمان تھا اسے علقمہ کہا جاتا تھا، تو موت کے وقت اسے کہا گیا کہو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، تو وہ اس پر قادر نہ ہو سکا یہاں تک کہ اس کی ماں اس کے پاس آئی اور وہ اس سے راضی ہوئی۔ اور ایسے ہی گناہوں میں سے قطع تعلقی، سود خوری اور امانت میں خیانت کرنا ہے۔ ابوبکر وراق نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اکثر اوقات موت کے وقت بندے سے ایمان نکال لیا جاتا ہے۔ پھر ابوبکر نے بیان کیا: پس ہم ایسے گناہوں میں غور و فکر کرتے رہے جو ایمان کو نکال دیتے ہیں تو ہم نے بندوں پر ظلم سے بڑھ کر تیزی کے ساتھ کسی کو ایمان نکالنے والا نہیں پایا۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ آگ (جہنم) کو پیدا کیا گیا ہے یہ جہمیہ کا رد ہے، کیونکہ معدوم تیار شدہ نہیں ہوتا۔ پھر فرمایا: وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ یعنی فرائض میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو وَالرَّسُوْلَ اور سنن میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو)

اور یہ قول بھی ہے کہ سود کی تحریم میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور تحریم کے بارے میں جو حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں پہنچایا ہے (اس میں ان کی اطاعت کرو) لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ تاکہ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔ اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 547

لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

''اور دوڑو بخشش کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے ہے اور (دوڑو) جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین جتنی ہے جو تیار کی گئی ہے پرہیزگاروں کے لئے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَسَارِعُوْٓا حضرت نافع اور ابن عامر نے واؤ کے بغیر سَارِعُوْٓا پڑھا ہے۔ اور اسی طرح اہل مدینہ اور اہل شام کے مصاحف میں ہے (1)۔ اور باقی سات نے وَسَارِعُوْٓا واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعلی نے کہا ہے: دونوں قرائتیں رائج اور صحیح ہیں، پس جنہوں نے واؤ کے ساتھ قرأت کی ہے انہوں نے جملہ کا عطف جملہ پر کیا ہے اور جنہوں نے واؤ کو چھوڑ دیا ہے وہ اس لئے ہے کہ دوسرا جملہ پہلے کے ساتھ اس طرح ملتبس ہے کہ اسے حرف عطف واؤ کی حاجت اور ضرورت ہی نہیں۔ اور المسارعة کا معنی المبادرة (جلدی کرنا، تیزی کرنا) ہے اور یہ باب مفاعلہ ہے۔ اور آیت میں حذف ہے، یعنی سارعوا الی مایوجب المغفرة و ھی الطاعة (یعنی اس عمل کی طرف تیزی سے آؤ جو مغفرت و بخشش کو واجب کر دیتا ہے اور وہ طاعت و فرمانبرداری ہے۔

حضرت انس ابن مالک اور مکحول نے وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ کی تفسیر میں کہا ہے: اس کا معنی ہے تم دوڑو تکبیر تحریمہ کی طرف اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم تیزی سے آؤ فرائض ادا کرنے کی طرف، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم جلدی سے آؤ اخلاص کی طرف۔ اور کلبی نے کہا ہے: تم سود سے توبہ کی طرف دوڑو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم میدان جنگ میں ثابت قدمی کی طرف آؤ اور ان کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔ اور آیت ان تمام کو شامل ہے اور اس کا معنی وہی ہے جو فاستبقوا الخیرات کا معنی ہے (کہ تم خیر اور نیکی کے کاموں کی طرف تیزی سے آگے بڑھو) اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ تقدیر عبارت ہے کعرض السموات والارض۔ اور مضاف محذوف ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: ما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدة۔ ای الا کخلق نفس واحدة و بعثھا۔

شاعر نے کہا ہے:

حسبت　بُغام　رَاحِلَتِی　عناقاً　　و ما ھی وَیْبَ غَیْرِکَ بالعناق

اس میں مراد صوت عناق (بھیڑ کے بچے کی آواز) ہے۔ اس کی نظیر سورۂ حدید میں ہے: وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (2) (اور جنت اس کا عرض آسمان و زمین کے عرض کی طرح ہے۔)

اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: آسمان و زمین آپس میں بعض بعض کے ساتھ ملا دیئے جائیں گے جیسا کہ کپڑوں کو پھیلایا جاتا ہے اور بعض کو بعض کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے، پس یہ جنت کا عرض ہے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 547　　2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 548

اور اس کا طول سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ اور یہ جمہور کا قول ہے۔ اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے "کہ سات آسمان اور سات زمینیں کرسی کے مقابلے میں اس طرح ہیں جیسے وہ دراہم جو زمین کے وسیع بیابان میں پھینک دیئے جائیں اور کرسی عرش کے مقابلہ میں اس انگوٹھی کی طرح ہے جو زمین کے وسیع بیابان میں پھینک دی گئی ہو۔" یہ مخلوقات سے آسمانوں اور زمین کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑی اور عظیم ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت ان تمام سے اعظم ہے۔

اور کلبی نے کہا ہے: جنتیں چار ہیں، جنة عدن، جنة المأوی، جنة الفردوس اور جنة النعیم اور ان میں سے ہر جنت زمین و آسمان کے عرض کی مثل ہے اگر وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ اور اسماعیل السدی نے کہا ہے: اگر آسمانوں اور زمین کو توڑ دیا جائے اور وہ رائی کے دانے ہو جائیں اور پھر ہر دانے کے بدلے جنت ہو تو اس کی چوڑائی زمین و آسمان کی چوڑائی کی طرح ہے۔ اور صحیح روایت میں ہے: "بے شک اہل جنت میں سے رتبہ کے اعتبار سے ادنیٰ وہ ہوگا جو تمنا کرے گا اور آرزو کرتا رہے گا یہاں تک کہ جب اس کی آرزوئیں ختم ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: لك ذالك وعشرة أمثاله (تیرے لئے وہ بھی ہے اور اس کی مثل دس اور بھی ہیں۔) اسے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، اسے مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے اور یعلی بن ابی مرہ نے بیان کیا ہے۔ میں حمص میں تنوخی سے ملا جو کہ ہرقل کی طرف سے قاصد بن کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تھا وہ شیخ کبیر تھا۔ اس نے کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ہرقل کا خط لے کر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ صحیفہ اپنی بائیں طرف والے آدمی کو دیا، پھر میں نے پوچھا: تمہارا کون وہ ساتھی ہے جو اسے پڑھے گا؟ انہوں نے کہا: معاویہ، پس تب یہ میرے صاحب کی تحریر ہے۔ بلاشبہ آپ نے لکھا ہے آپ مجھے ایسی جنت کی طرف دعوت دے رہے ہیں جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو جہنم کہاں ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "سبحان اللہ رات کہاں ہوتی ہے جب دن آ جاتا ہے۔" (1)

اور اسی طرح کی دلیل سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کے خلاف استدلال کیا جب انہوں نے آپ کو کہا: کیا تم نے اس قول کو دیکھا ہے وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ تو جہنم کہاں ہے؟ اور انہوں نے آپ کو کہا: آپ وہ لائیں جو اس سے مشابہت رکھتا ہو جو تورات میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے عرض کے سبب طول پر آگاہ فرمایا کیونکہ اغلباً طول عرض سے زیادہ ہوتا ہے اور طول جب ذکر کر دیا جائے تو وہ عرض کی مقدار پر دلالت نہیں کرتا۔ زہری نے کہا ہے: جنت کا عرض بیان کیا گیا ہے اور رہا اس کا طول تو اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (2) اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: مُتَّكِـِٕیْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ (الرحمن: 54) (وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے بستروں پر جن کے استر قنادیز کے ہوں گے۔) تو اس میں بطانة کو اس حسین ترین شے کے ساتھ متصف کیا گیا ہے جو زینت اور خوبصورتی سے جانی جاتی ہے جبکہ یہ معلوم ہے کہ ظواہر باطن کے مقابلہ میں زیادہ حسین اور اتقن ہوتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں: بلاد عریضة و فلاة عریضة یعنی وسیع شہر اور بیابان۔

شاعر نے کہا ہے:

1۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ آل عمران، جلد 1، صفحہ 318، دار القرآن بیروت
2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 548

كأنّ بلادَ الله وهْيَ عَرِيضَةٌ	على الخائف المطلوب كِفّةُ حابِلِ

اس میں وھی عریضۃ وسیع وعریض ہونے کے معنی میں ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: مقطع عرب پر کلام بطور استعارہ جاری ہے، پس جب جنت وسعت اور انفساح کے اعتبار سے انتہا کو پہنچی ہوئی ہے تو پھر اسے آسمانوں اور زمین کے عرض کے ساتھ بیان کرنا انتہائی حسین عبارت ہے، جیسا کہ تو کسی آدمی کے لئے کہتا ہے: ھذا بحر (یہ تو سمندر ہے) اور حیوانوں میں سے کسی بڑے کے لئے یہ کہتا ہے: ھذا جبل یہ پہاڑ ہے تو آیت نے عرضاً حد بیان کرنے کا قصد نہیں کیا، البتہ اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ ہر اس شے سے وسیع تر ہے جسے تم نے دیکھا ہے، اور عام علماء کا نظریہ ہے کہ جنت تخلیق کر دی گئی ہے اور یہ موجود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ اور اس کا بیان حدیث اسراء وغیرہ میں ہے جو صحیحین وغیرہما میں بیان کی گئی ہے۔

اور معتزلہ نے کہا ہے: بلاشبہ یہ دونوں (جنت اور جہنم) ہمارے وقت میں موجود نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ جب آسمانوں اور زمین کو لپیٹ دے گا تو پھر وہ جنت اور جہنم کو جہاں چاہے گا بنا دے گا، کیونکہ یہ دونوں ثواب وعقاب کے لئے دار جزا ہیں، لہٰذا احکام کا مکلف بنائے جانے کے بعد جزا کے وقت میں انہیں بنایا جائے گا، تاکہ دار التکلیف اور دار الجزاء، دنیا میں جمع نہ ہو جائیں۔ اور ابن فورک نے کہا ہے: جنت میں قیامت کے دن اضافہ کر دیا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں منذر بن سعید وغیرہ کا تعلق قائم کیا گیا ہے ان سے جنہوں نے کہا: بلاشبہ ابھی تک جنت تخلیق نہیں کی گئی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ابن فورک کا یہ قول ''کہ اس میں اضافہ کیا جائے گا'' یہ جنت کے موجود ہونے کی طرف اشارہ ہے، لیکن یہ ایسی سند کا محتاج ہے جو زیادتی کے عذر میں قطعی ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن عطیہ نے اس بارے میں سچ کہا ہے کہ جب انہوں نے کہا: جب ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے سامنے ان دراہم کی طرح ہیں جو زمین کے وسیع بیابان میں ڈال دیئے گئے ہوں اور کرسی عرش کے سامنے اس انگوٹھی کی طرح ہے جسے وسیع زمین میں رکھ دیا گیا ہے، تو جنت اب اسی حالت پر ہے جس پر وہ آخرت میں ہوگی کہ اس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی طرح ہے، کیونکہ عرش اس کی چھت ہے، یہ اس کے مطابق ہے جو صحیح مسلم میں موجود ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ چھت اپنے نیچے آنے والی ہر شے کو گھیرے ہوتا ہے اور کچھ زیادہ بھی ہوتا ہے اور جب تمام مخلوقات اس (عرش) کی نسبت ایک انگوٹھی کی طرح ہیں تو پھر کون ہے جو اس کا اندازہ لگا سکتا ہو اور اس کے طول وعرض کو جانتا ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے جو ایسا خالق ہے جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں اور نہ ہی اس کی مملکت کی وسعت کی کوئی غایت اور حد ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَ الۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۳۴﴾ۚ

''وہ (پرہیز گار) جو خرچ کرتے ہیں خوشحالی اور تنگ دستی میں اور ضبط کرنے والے ہیں غصہ کو اور درگزر کرنے

والے ہیں لوگوں سے اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ یہ ان متقین کی صفت ہے جن کے لئے جنت تیار کی گئی ہے اور ظاہر آیت یہ ہے کہ یہ فعل مندوب الیہ کے ساتھ مدح اور تعریف ہے اور السَّرَّآءِ کا معنی آسانی اور وَالضَّرَّآءِ کا معنی تنگی ہے۔

یہ ابن عباس، کلبی اور مقاتل رحمہم اللہ نے کہا ہے اور عبید بن عمیر اور ضحاک نے کہا ہے کہ السَّرَّآءِ اور الضَّرَّآءِ کا معنی خوشحالی اور تنگ دستی ہے۔ اور صحت و بیماری کی حالت میں بھی یہی کہا جاتا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ فِي السَّرَّآءِ کا معنی ہے زندگی میں اور فی الضَّرَاءِ سے مراد وہ ہے جس کی وہ موت کے بعد وصیت کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فِي السَّرَّآءِ سے مراد شادی اور ولیموں میں خرچ کرنا ہے اور فی الضراءِ سے مراد تکالیف اور ماتم میں خرچ کرنا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: فِي السَّرَّآءِ سے مراد وہ نفقہ ہے جو تمہیں خوش کرتا ہے مثلاً اولاد اور قرابتداروں پر خرچ کرنا اور ضراء سے مراد دشمنوں پر خرچ کرنا ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فِي السَّرَّآءِ سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ وہ جوان کی مہمان نوازی کرتا ہے اور اسے ہدیہ دیتا ہے اور ضراء وہ ہے جس کو وہ تکلیف میں مبتلا لوگوں پر خرچ کرتا اور اس سے ان پر صدقہ کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں۔ یہ آیت عام ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ اور یہ ایک مسئلہ ہے:

مسئلہ نمبر 2۔ اور كَظْم الغيظ کا معنی ہے غصے کو پیٹ میں لوٹانا، کہا جاتا ہے: کظم غیظه یعنی وہ اس پر خاموش رہا اور اس کا اظہار نہ کیا باوجود اس کے کہ وہ اپنے دشمن پر برسنے اور عملاً وہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

اور کظمت السقاء کا معنی ہے میں نے مشکیزہ بھرا اور اس کا منہ بند کر دیا اور الکظامة وہ شے جس کے ساتھ پانی کا راستہ بند کیا جاتا ہے اور اسی سے الکظام اس تسمہ (دھاگے) کو بھی کہا جاتا ہے جس کے ساتھ مشکیزے کا منہ بند کیا جاتا ہے اور کظم البعیر جرته جب اونٹ جگالی کو اپنے پیٹ میں لوٹا دے، اور کبھی کظم اس معنی کے لئے بولا جاتا ہے کہ وہ جگالی سے رک گیا قبل اس کے کہ وہ اسے اپنے منہ کی طرف بھیجے۔ اسے زجاج نے بیان کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: کظم البعیر و الناقة جب یہ جگالی نہ کریں۔

اور اسی سے راعی کا قول ہے:

فَأَفَضْنَ　بعد　كُظومِهِن　بجِرّة　　　من　ذی　الأبارق　اذرعين　حَقِيلا

اس میں جگالی سے رکنے کے معنی میں لفظ کظوم استعمال ہوا ہے۔

الحقیل، ایک جگہ ہے۔ اور الحقیل ایک بوٹی بھی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ گھبراہٹ اور مشقت و تھکاوٹ کے وقت ایسا کرتا ہے اور وہ جگالی نہیں کرتا۔

اعشی نے اونٹوں کو نحر کرنے والے آدمی کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا اور وہ اس سے گھبراتے ہیں:

قد　تكظم　البُزْلَ　منه　حين　تبصره　　　حتى　تَقَطَّع　فی　أجوافها　الجرر

طاقتور اونٹ بھی جب اسے دیکھتا ہے تو گھبرا جاتا ہے یہاں تک کہ جگالی اس کے پیٹ میں ہی کٹ جاتی ہے۔ (یعنی جگالی کے لئے پیٹ سے باہر کوئی شے نہیں لا سکتا۔)

اور اسی سے ہے، رجل کظیم و مکظوم جب کوئی غم واندوہ اور حزن وملال سے بھرا ہوا ہو۔

اور قرآن کریم میں ہے: وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ (یوسف) (اور سفید ہو گئیں ان کی دونوں آنکھیں غم کے باعث اور وہ اپنے غم کو ضبط کئے ہوئے تھے) اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ (القلم) (جب اس نے پکارا اور وہ غم واندوہ سے بھرا ہوا تھا) اور غیظ غضب کی اصل اور بنیاد ہے اور اکثر اوقات تو یہ دونوں لازم وملزوم ہوتے ہیں لیکن ان کے درمیان فرق ہے وہ یہ کہ غیظ جوارح (اعضاء بدن) پر ظاہر نہیں ہوتا بخلاف غضب کے کیونکہ یہ جوارح میں ایسے فعل کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے جو ضروری ہوتا ہے اسی لئے جب غضب کی نسبت الله تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مقصود وہ افعال ہوتے ہیں جو الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں ظاہر ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے غیظ کی تفسیر غضب سے کی ہے اور یہ عمدہ نہیں۔ والله اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ لوگوں کو معاف کرنا نیکی اور خیر کے افعال میں سے انتہائی عظیم فعل ہے، اس حیثیت سے کہ آدمی کے لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ معاف کر دے اور یہ کہ وہ اپنے حق کی طرف متوجہ ہو اور ہر وہ جو سزا کا مستحق ہو لیکن اسے چھوڑ دیا جائے تو تحقیق اسے معاف کر دیا گیا اور عَنِ النَّاسِ کے معنی میں اختلاف ہے پس ابو العالیہ، کلبی اور زجاج نے کہا ہے: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ سے مراد غلاموں کو معاف کرنا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: مثال کے طور پر یہ بہت اچھا ہے، کیونکہ وہ خادم ہوتے ہیں اور وہ کثرت سے غلطیاں کرتے ہیں اور ان پر قدرت آسان ہوتی ہے اور سزا کو نافذ کرنا سہل ہوتا ہے، اسی لئے مفسر نے اس کے ساتھ مثال بیان کی ہے۔ اور میمون بن مہران سے روایت ہے کہ ان کی ایک کنیز تھی وہ ایک دن ایک بڑا پیالہ لے کر آئی اس میں گرم شوربہ تھا اور آپ کے پاس کچھ مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ پس وہ گر پڑی اور شوربہ آپ پر پڑ گیا، تو میمون نے اسے مارنا چاہا تو اس لونڈی نے کہا: اے میرے آقا! آپ الله تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل کیجئے: وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ تو اس نے کہا: تحقیق میں نے کر دیا، پھر اس سے کہا: جو اس کے بعد ہے اس پر بھی عمل کیجئے وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ تو اس نے کہا: میں نے تجھے معاف کر دیا۔ پھر اس لونڈی نے کہا: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ تو میمون نے کہا: میں نے تجھ پر احسان کر دیا، پس تو الله تعالیٰ کی رضا کے لئے آزاد ہے۔ احنف بن قیس سے اسی طرح مروی ہے۔

اور حضرت زید بن اسلم نے کہا ہے: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ اور وہ لوگوں کے ظلم اور ان کی برائیوں سے درگزر کرنے والے ہیں (1)۔ یہ حکم عام ہے اور یہی آیت کا ظاہر معنی ہے اور مقاتل بن حیان نے اس آیت میں کہا ہے: ہم تک خبر پہنچی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا: ''میری امت میں سے یہ قلیل (لوگ) ہیں سوائے ان کے جنہیں الله تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ حالانکہ گزشتہ امتوں میں یہ کثیر لوگ تھے، الله تعالیٰ نے ان کی مدح اور تعریف فرمائی ہے جو غصے کے وقت بخش دیتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (الشوریٰ) (اور جب وہ غضبناک ہوتے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 549

ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں) اور غصہ پی جانے والوں کی اس قول کے ساتھ تعریف فرمائی: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ اور یہ خبر دی ہے کہ وہ انہیں ان کے اس احسان کے سبب پسند کرتا ہے۔

اور غصہ پی جانے، لوگوں سے درگزر کرنے اور غضب کے وقت نفس کا مالک ہونے کے بارے کئی احادیث وارد ہیں۔ اور یہی انتہائی عظیم عبادت اور جہاد بالنفس ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''طاقتور وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے (1)''۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید ارشاد فرمایا ہے: ''جو گھونٹ بھی آدمی پیتا ہے وہ اس کے لئے خیر اور نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں غصہ کے گھونٹ سے بڑھ کر اجر والا کوئی نہیں (2)''۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ہر شے سے زیادہ سخت اور شدید کون سی شے ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا غضب'' پھر اس نے عرض کی: کون سی شے اللہ تعالیٰ کے غضب سے نجات دلاتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو غصہ نہ کر''۔

عرجی نے کہا ہے:

وإذا غضبتَ فكن وَقُورًا كاظمًا　للغيظ تَبْصُر ما تقول و تسمع

جب تجھے غصہ آئے تو انتہائی وقار کے ساتھ غصہ پینے والا ہو جا اور اسے غور سے دیکھ جو کہہ رہا ہے اور سن رہا ہے۔

فكفى به شرفا تصبُّر ساعة　يرضى بها عنك الإله و تُرفع

پس ایک ساعت کا صبر کرنا از روئے شرف کے کافی ہے جس کے سبب تجھ سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے اور تو بلند مرتبہ کر دیا جائے اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے عفو کے بارے کہا ہے:

لن يبلغ المجدَ اقوامٌ وان شرفوا　حتىٰ يُذَلُّوا وان عَزّوا الِاَقوام

قومیں ہرگز بزرگی کو نہ پا سکیں گی اگرچہ وہ شریف ہوں یہاں تک کہ انہیں ذلیل وخوار کر دیا جائے گا اگرچہ وہ قوموں پر غالب ہوں۔

و يُشْتَموا فترى الألوانَ مُشْرِقَة　لا عفو ذُلٍّ ولكن عَفْو اِكرامِ

اور انہیں گالی گلوچ نہیں دی جاتیں اور وہ کائنات کو روشن دیکھتی ہیں ان کی یہ عفو و درگزر ذلت و رسوائی کی نہیں ہوتی بلکہ عزت و اکرام کی ہوتی ہے۔

ابوداؤد اور ابو عیسیٰ ترمذی نے حضرت سہل بن معاذ بن انس جہنی سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے غصہ پی لیا حالانکہ وہ اسے نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مخلوق کے سامنے اسے بلائے گا یہاں تک کہ اسے حور کے بارے اختیار عطا فرما دے گا کہ جسے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب باب الحذر من الغضب، جلد 2، صفحہ 903، کراچی۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 5649، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابن ماجہ کتاب الزہد باب الحلم، صفحہ 319، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4178، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چاہے لے لے۔" فرمایا یہ حدیث حسن غریب ہے۔(1)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک نداد دینے والا ندا دے گا جس کسی کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اسے چاہیے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ اور کہا جائے گا: یہ کون ہے جس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے؟ تو لوگوں سے درگزر کرنے والے کھڑے ہوں گے اور بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔" اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

اور ابن مبارک نے کہا ہے: میں منصور کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس نے ایک آدمی کو قتل کرنے کا حکم دیا، تو میں نے کہا: اے امیر المومنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: "جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک منادی ندا دے گا جس کا اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی احسان ہو تو وہ آگے بڑھے پس کوئی آگے نہیں بڑھے گا سوائے اس کے جس نے گناہ اور غلطی سے درگزر کی۔" پس یہ حکم اپنے اطلاق پر ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ان کے احسان پر ثواب عطا فرماتا ہے۔ حضرت سری سقطی نے کہا ہے: احسان یہ ہے کہ تو امکان کے وقت احسان کرے، پس ہر وقت تیرے لئے احسان ممکن نہیں ہوگا۔

شاعر نے کہا ہے:

بادِرْ بخیرٍ اذا ما کنتَ مقتدرا فلیس فی کل وقتٍ انت مقتدرُ

تو خیر اور نیکی کے عمل میں جلدی کر جب تو اس کی قدرت رکھتا ہو۔ ہر وقت میں تو اس پر قادر نہیں ہوگا۔

اور ابو العباس الجمانی نے کہا ہے اور خوب اچھا کہا ہے:

لیس فی کل ساعةٍ وأوانٍ تتھیّاُ صَنائعُ الاحسان

ہر ساعت اور ہر وقت میں احسان کرنے والا (اس کے لئے) تیار نہیں ہوتا۔

واذا اَمْکَنَتْ فبادِرْ الیھا حذَرًا من تعذُّرِ الامکانِ

اور جب امکان ہو تو پھر اس کی طرف جلدی کر اس خوف سے کہ کہیں امکان متعذر نہ ہو جائے۔ محسن اور احسان کے بارے میں قول سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

"اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کر بیٹھیں کوئی برا کام یا ظلم کریں اپنے آپ پر (تو فوراً) ذکر کرنے لگتے ہیں اللہ کا اور معافی مانگنے لگتے ہیں اپنے گناہوں کی اور کون بخشتا ہے گناہوں کو اللہ کے سوا۔ اور نہیں اصرار کرتے اس پر جو ان سے سرزد ہوا اس حال میں کہ وہ جانتے ہیں"۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب من کظم غیظاً، جلد 2، صفحہ 303، اسلام آباد۔ ایضاً، حدیث نمبر 4147، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایک صنف کا ذکر کیا ہے اور یہ پہلی صنف (کے لوگوں) سے (درجہ میں) کم ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت اور احسان کے ساتھ ان کے ساتھ ملا دیا ہے۔ اور یہ توبہ کرنے والے لوگ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عطا کی روایت میں کہا ہے: یہ آیت نبهان التمار کے بارے میں نازل ہوئی ہے...... اس کی کنیت ابو مقبل تھی...... اس کے پاس ایک حسین وجمیل عورت آئی اور اس نے اسے کھجوریں فروخت کیں اور پھر اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور اس کا بوسہ لیا اور پھر اپنے اس عمل پر نادم اور شرمندہ ہوا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

ابوداؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے فرمایا: مجھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے اور ابوبکر نے سچ کہا ہے...... کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو بندہ بھی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے پھر وضو کرتا ہے اور دو رکعت نماز ادا کرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرما دیتا ہے۔'' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ...... وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ۔۔۔ الآیہ۔

اور دوسری یہ آیت...... و من یعمل سوٓ او یظلم نفسہ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے (2) اور یہ عام ہے۔ تحقیق آیت کسی سبب خاص کے تحت نازل ہوتی ہے اور پھر وہ ان تمام کو شامل ہوتی ہے جو وہ کرے یا اس سے زیادہ فعل کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا سبب نزول یہ ہے کہ ایک ثقفی ایک غزوہ میں گیا اور اس نے اپنا ایک انصاری دوست اپنے گھر والوں کے پاس چھوڑا، تو اس نے اس میں خیانت کی کہ اس نے اسے دبوچ لیا اور وہ عورت اپنے لئے اسے دور ہٹاتی رہی لیکن اس نے اس کے ہاتھ کا بوسہ لے لیا، پھر وہ اس پر نادم ہوا تو وہ زمین میں چیختے چلاتے نکل گیا وہ اپنے فعل پر انتہائی نادم تھا اور توبہ کر رہا تھا، پس وہ ثقفی واپس آیا تو اس کی زوجہ نے اس کے ساتھی کے فعل کے بارے اسے بتایا، تو وہ اس کی تلاش میں نکل پڑا، پس وہ انصاری حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے پاس اس امید سے آیا کہ وہ ان کے پاس کوئی وسعت اور گنجائش پالے گا لیکن انہوں نے اسے خوب جھڑکا اور ڈانٹ ڈپٹ کی، پھر وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ کو اپنے فعل کے بارے میں عرض کی، تو یہ آیت نازل ہوئی (3)۔ حدیث کے مطابق عموم ہی اولیٰ اور بہتر ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہم سے زیادہ مکرم تھے، اس حیثیت سے کہ ان میں سے گناہ کرنے والے کی سزا صبح کے وقت اس کے دروازے پر

1۔ اسباب النزول، صفحہ 81

2۔ جامع الترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 202۔ ایضاً، جامع ترمذی، کتاب التفسیر من سورۃ آل عمران، حدیث 2932، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ اسباب النزول، صفحہ 82

لکھی ہوئی تھی اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے گناہ کا کفارہ اس کے گھر کی دہلیز پر لکھ دیا جاتا تھا "تو اپنی ناک توڑ دے، تو اپنا کان کاٹ لے، تو اس طرح کر"۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی اور رحمت فرماتے ہوئے اور بنی اسرائیل کے اس فعل کے عوض یہ آیت نازل فرمائی۔

اور روایت کیا جاتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابلیس رو پڑا۔ اور الفاحشۃ کا اطلاق ہر معصیت (گناہ) پر کیا جاتا ہے، حالانکہ اکثر طور پر یہ زنا کے ساتھ خاص ہے یہاں تک کہ حضرت جابر بن عبداللہ اور سدی نے اس آیت میں اس کی تفسیر زنا کے ساتھ ہی کی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ میں لفظ اَوْ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ واؤ کے معنی میں ہے اور مراد وہ (گناہ) ہیں جو کبائر میں شامل نہ ہوں۔

ذَكَرُوا اللّٰهَ اس کا معنی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی سزا کے خوف سے اور اس سے حیا کرتے ہوئے اس کا ذکر کرنے لگتے ہیں جو ضحاک نے کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بڑی پیشی کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے دل میں یہ فکر کرنے لگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے اس کے بارے پوچھے گا، اسے کلبی اور مقاتل نے بیان کیا ہے۔

اور مقاتل سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ گناہ ہو جانے کے وقت زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ یعنی وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور ہر وہ دعا جس میں یہ معنی ہو یا اس کے الفاظ ہوں تو وہ استغفار کہلاتا ہے۔ اس سورۃ کی ابتداء میں سید الاستغفار کا ذکر ہو چکا ہے اور یہ کہ اس کا وقت سحری کا ہے۔ پس استغفار عظیم ہے اور اس کا ثواب بہت بڑا ہے، حتیٰ کہ ترمذی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث ذکر کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے یہ کہا استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم و اتوب الیہ (1) تو اس کو بخش دیا جائے گا اگرچہ وہ میدان جہاد سے ہی بھاگا ہو۔"

اور مکحول نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ استغفار کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔" اور حضرت مکحول نے کہا ہے: میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ استغفار کرتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔ اور حضرت مکحول خود بھی کثیر الاستغفار تھے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: مطلوب استغفار وہ ہے جو اصرار کی گرہ کو کھول دیتا ہے اور اس کا معنی دل میں ثبت ہو جاتا ہے نہ کہ صرف زبان سے تلفظ کرنا ہے۔ پس جس نے اپنی زبان سے کہا: اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ، اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی پر مصر رہا تو اس کا یہ استغفار مزید استغفار کا محتاج ہوتا ہے اور اس کے صغیرہ گناہ کبائر کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہمارا استغفار مزید استغفار کا محتاج ہوتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ آپ یہ قول اپنے زمانے میں کہتے تھے، تو ہمارے اس زمانے میں کیفیت کیا ہوگی جس میں انسان ظلم و ستم پر منہ کے بل گرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے اور اس پر ایسا حریص ہے کہ اسے چھوڑ نہیں سکتا اور تسبیح اس کے ہاتھ

1۔ جامع ترمذی، باب فی دعاء الضیف، حدیث نمبر 3501، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں ہوتی ہے درآنحالیکہ یہ گمان کررہا ہوتا ہے کہ وہ اپنے گناہ کی اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کررہا ہے اور یہ اس کی طرف سے استہزا اور استخفاف (حقیر سمجھنا) ہے اور قرآن کریم میں ہے وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (اور تم اللہ تعالیٰ کی آیات کو تمسخر نہ بناؤ۔) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہے جو گناہوں کی مغفرت فرمادے اور ان کی سزا کو زائل کردے۔

وَ لَمْ يُصِرُّوْا یعنی جو کچھ انہوں نے کیا اس پر وہ ثابت قدم نہیں ہوجاتے اور نہ اس کا پختہ عزم کرتے ہیں۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: یعنی وہ اس پر ہمیشگی اور دوام اختیار نہیں کرتے۔ اور معبد بن صبیح نے کہا ہے: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور میری ایک جانب علی رضی اللہ عنہ تھے، پس آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا میں نے بغیر وضو کے نماز پڑھی ہے پھر آپ گئے اور وضو کیا اور پھر نماز پڑھائی۔ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ اصرار کا معنی ہے ھو العزم بالقلب علی الأمر و ترك الإقلاع عنه یعنی کسی کام پر دل سے پختہ عزم کرنا اور اس سے باز رہنے کو ترک کرنا۔ اور اسی سے صر الدنانیر ہے یعنی انہیں مضبوط باندھنا۔

حطیئہ نے گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

عوابس بالشُّعثِ الكُماۃ اذا ابتغوا　عُلَالَتها بالمُحصَدات أَصَرَّتِ

یعنی وہ اپنے دشمنوں کے خلاف ثابت قدم رہے۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الاصرار الثبوت على المعاصي۔ یعنی اصرار سے مراد گناہوں پر ثابت ہونا اور ڈٹ جانا ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

يُصِرُّ بالليل ما تخفى شواكِلُهُ　يا ويحَ كل مصِرِّ القلبِ ختّار

اس میں اصرار کا لفظ مذکورہ معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: جاہل مردہ ہے، بھولنے والا سونے والا ہے، اور گناہ کرنے والا نشے میں ہے اور اصرار کرنے والا ہلاک ہونے والا ہے اور اصرار کا معنی بار بار کرنا ہے۔ یعنی وہ یہ کہتا رہے کہ میں کل توبہ کروں گا؟ اور یہ نفس کا دعویٰ ہے، وہ آنے والے کل کیسے توبہ کرے گا جب کہ وہ اس کا مالک ہی نہ ہوگا۔

اور سہل کے سوا کسی اور نے کہا ہے: اصرار کا معنی ہے کہ وہ توبہ نہ کرنے کی نیت کرے اور جب وہ خالص توبہ کی نیت کرے گا تو اصرار سے نکل جائے گا۔ اور سہل کا قول احسن ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: لا توبة مع اصرار (یعنی (گناہ پر) اصرار کے ساتھ کوئی توبہ نہیں ہے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: توبہ پر ابھارنے والی اور اصرار کو حل کرنے والی (شے) کتاب اللہ العزیز

الغفار میں دائمی غور و فکر کرتا ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس میں جنت اور اطاعت کرنے والوں کے ساتھ وعدوں کی تفصیل ذکر کی ہے اور جو کچھ اس میں عذاب جہنم اور گنہگاروں کو ڈرانے کا بیان کیا ہے اور وہ اس پر ہمیشہ غور و فکر کرتا رہے یہاں تک کہ اس کا خوف اور امید قوی ہو جائے اور وہ رغبت رکھتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے اور یہ رغبت اور رہبت ہی خوف اور رجاء کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ وہ سزا سے خوفزدہ رہتا ہے اور ثواب کی امید رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی راہ صواب کی توفیق دینے والا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ اس پر ابھارنے والی وہ تنبیہ الٰہی ہے جس کے ساتھ وہ اسے متنبہ کرتا ہے جس کے لئے وہ سعادت کا ارادہ کرے اور گناہوں کے قبح اور ضرر کا کیونکہ وہ تو ہلاک کرنے والا زہر ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اختلاف لفظ میں ہے نہ کہ معنی میں، کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعید میں اس کی تنبیہ کے بغیر غور و فکر نہیں کرتا، پس جب بندہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ اپنے آپ کی طرف دیکھتا ہے تو وہ اپنے نفس کو ان گناہوں سے بھرا ہوا پاتا ہے جو اس نے کمائے ہیں اور ان برائیوں سے جن کا اس نے ارتکاب کیا ہے اور پھر اس کوتاہی اور سستی پر اس میں ندامت اور شرمندگی کے جذبات ابھر آتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی سزا کے خوف سے سابقہ اعمال کی مثل اعمال کرنا چھوڑ دیتا ہے تو ایسے آدمی پر یہ صادق آتا ہے کہ وہ تائب (توبہ کرنے والا) ہے اور اگر اس طرح نہ ہو تو پھر وہ معصیت پر اصرار کرنے والا ہوگا اور ہلاکت کے اسباب کو لازم پکڑنے والا ہوگا۔

سہل بن عبد اللہ نے کہا ہے: تائب کی علامت یہ ہے کہ گناہ اسے کھانے پینے سے مشغول رکھے جیسا کہ وہ تین صحابہ کرام جو غزوہ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے۔ (1)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَهُمْ يَعْلَمُونَ اس میں کئی اقوال ہیں۔ پس کہا گیا ہے: یعنی وہ اپنے گناہوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان سے توبہ کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا قول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ میں اصرار پر سزا دوں گا اور عبد اللہ بن عبید بن عمیر نے کہا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ میں اصرار پر سزا دوں گا اور عبد اللہ بن عبید بن عمیر نے کہا ہے اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالے گا۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے مغفرت طلب کی تو انہیں بخش دیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ان (چیزوں) کے بارے جانتے ہیں جو میں نے ان پر حرام کی ہیں، یہ ابن اسحاق نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس، حسن، مقاتل اور کلبی تمام نے کہا ہے: اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اصرار تکلیف دہ ہے اور اسے چھوڑ دینا سرکشی کی نسبت بہتر ہے۔ اور حسن بن فضل نے کہا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ ان کا رب ہے جو گناہ کو بخش دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: انہوں نے یہ معنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے لیا ہے وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ اپنے رب کریم سے اسے بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''بندہ ایک گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے اے اللہ! میرا گناہ بخش دے تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے ایک گناہ کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ کو معاف فرما

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث کعب ابن مالک، حدیث نمبر 4066، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دیتا ہے اور گناہ کے سبب وہ پکڑ لیتا ہے پھر وہ لوٹتا ہے اور گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور کہتا ہے: اے میرے پروردگار! میرے لئے میرا گناہ بخش دے...... پس اللہ تعالیٰ نے اسی کی مثل دوبارہ ذکر کیا اور آخر میں فرمایا: اعمل ما شئت فقد غفرت لك تو جو چاہے عمل کر میں نے تجھے بخش دیا(1)۔ اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ دوبارہ گناہ کر کے توبہ کو توڑنے کے بعد دوبارہ توبہ کرنا صحیح ہے۔

کیونکہ پہلی توبہ طاعت ہے وہ گزر چکی ہے اور صحیح ہے اور دوسرا گناہ سرزد ہونے کی وجہ سے اب وہ دوسری نئی توبہ کا محتاج ہے اور گناہ کی طرف لوٹنا اگرچہ اس کی ابتدا سے زیادہ قبیح ہے، کیونکہ گناہ کی نسبت توبہ توڑنے کی طرف ہے، تو توبہ کی طرف لوٹنا اس کی ابتدا سے زیادہ اچھا ہے، کیونکہ اس کی طرف کریم اور سخی کے دروازے کو التجا کے اصرار کے ساتھ لازم پکڑنے کی نسبت ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔

اور حدیث کے آخر میں یہ قول اِعۡمَلۡ مَا شِئۡتَ یہ امر ہے اور اس کا معنی ایک قول کے مطابق اکرام (عزت کرنا) ہے، پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے باب سے ہو جائے گا: اُدۡخُلُوۡهَا بِسَلٰمٍ (ق:34) (داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی سے) کلام کا آخر مخاطب کی حالت کے بارے خبر ہے کہ اس کے سابقہ گناہوں سے اس کی مغفرت کر دی گئی ہے اور وہ اپنے مستقبل کے کاموں میں ان شاء اللہ محفوظ ہوگا۔

آیت اور حدیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ گناہ کے اعتراف اور اس سے استغفار کرنے کا عظیم فائدہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان العبد اذا اعترف بذنبه ثم تاب الی الله تاب الله علیه(2) (بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کر لے پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔) اسے صحیحین نے روایت کیا ہے۔

اور کسی شاعر نے کہا ہے:

یستوجب العفو الفتی اذا اعترف　　بما جنی من الذنوب و اقترف

نوجوان عفو و درگزر کو واجب کر لیتا ہے جب وہ ان گناہوں کا اعتراف کرے جن کا ارتکاب اس نے کیا۔

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

أقِر بذنبك ثم اطلب تجاوُزَهُ　　ان الجحودَ جُحودَ الذَّنب ذنبان

اپنے گناہ کا اقرار کر پھر اس سے درگزر کرنے کا مطالبہ کر بلاشبہ گناہ کا انکار کرنا دو گناہ ہیں۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرو تو یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں لے جائے (ختم کر دے) اور ایک ایسی قوم لے آئے جو گناہ کریں گے اور استغفار کریں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے گا۔ (والذی نفسی بیده لو لم تذنبوا لذهب الله

1۔ مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 357، کراچی۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6953، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی باب حدیث الافک، جلد 2، صفحہ 596، اسلام آباد۔ صحیح بخاری، کتاب الشہادات، حدیث 2467، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بکم ولجاء بقوم یذنبون ویستغفرون فیغفر لھم (1)) اور اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی غفار اور تواب کا یہی فائدہ ہے۔ ہم نے اسے ''الکتاب الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ'' میں بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ گناہ وہ ہیں جن سے توبہ کی جاسکتی ہے چاہے وہ کفر ہو یا اس کے سوا کوئی اور پس کافر کی توبہ اس کا ایمان لانا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ وہ اپنے سابقہ کفر پر نادم بھی ہو، صرف ایمان لانا نفس توبہ نہیں ہے اور اگر گناہ کفر کے علاوہ ہو تو پھر یا تو وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہوگا یا وہ کسی بندے کا حق ہوگا، پس حقوق اللہ میں سے ہونے کی صورت میں توبہ کے لئے اسے چھوڑ دینا کافی ہوتا ہے، سوائے ان کے جن میں شریعت نے صرف ترک کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان میں سے بعض کی طرف قضا کی نسبت کی ہے جیسا کہ نماز اور روزہ وغیرہ۔ اور ان میں بعض وہ ہیں جن کی طرف کفارہ کی نسبت کی ہے جیسا کہ قسم توڑ دینا اور ظہار وغیرہ میں۔ اور رہے حقوق العباد تو انہیں ان کے مستحقین تک پہنچانا ضروری ہے اور اگر وہ نہ پائے جائیں تو ان کی طرف سے صدقہ کیا جائے گا۔ اور جو کوئی تنگدستی کے سبب اس کی وسعت نہ پائے جو اس کے ذمہ واجب الاداء ہے تو پھر معاف فرمانا اللہ تعالیٰ کا معمول ہے اور اس کا فضل وافر ہے، پس کتنے تبعات کا وہ ضامن بنا ہے اور اس نے سیئات کو حسنات سے بدل دیا ہے۔ عنقریب اس کا مزید بیان آئے گا۔

مسئلہ نمبر 6۔ انسان پر یہ لازم نہیں ہے کہ جب اسے اپنا گناہ یاد نہ ہو اور وہ اسے نہ جانتا ہو کہ وہ اس معین گناہ کی طرف سے توبہ کرے، بلکہ اس پر یہ لازم ہے کہ جب اسے گناہ یاد آجائے تو وہ اس سے توبہ کرلے۔ اور بہت سے لوگوں نے اس میں تاویل کی ہے جو ہمارے شیخ ابو محمد عبد المعطی الاسکندرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ امام محاسبی رحمۃ اللہ علیہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اجناس معاصی سے توبہ کرنا صحیح نہیں ہوتا اور یہ کہ ان تمام پر نادم ہونا کافی نہیں ہوتا، بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے جوارح کے ہر فعل سے اور اپنے دل کے ہر عقیدہ سے معین طور پر توبہ کرے۔ انہوں نے ان کے قول سے یہی گمان کیا ہے، حالانکہ یہ ان کی مراد نہیں ہے اور نہ ان کا کلام اس کا تقاضا کرتا ہے، بلکہ مکلف کا حکم یہ ہے کہ جب وہ اپنے افعال کا حکم پہچان لے اور معصیت کو غیر سے پہچان لے، تو اس کے لئے ان تمام سے توبہ کرنا صحیح ہے جنہیں اس نے پہچان لیا، کیونکہ اگر اس نے اپنے ماضی کے فعل کے گناہ ہونے کو نہ پہچانا تو اس کے لئے اس سے توبہ کرنا ممکن نہ ہوگا نہ انفراداً اور نہ تفصیلاً۔ اس کی مثال وہ آدمی ہے جو سود کے دروازوں میں سے کسی دروازے کو لے لیتا ہے اور وہ یہ نہیں پہچانتا کہ یہ ربوٰا ہے، پھر جب اس نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (البقرہ) (اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم (سچے دل سے) ایماندار ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے)

تو اس پر یہ تہدید انتہائی شدید ثابت ہوئی اور اس کا گمان تھا کہ وہ سود سے سالم اور محفوظ ہے، لیکن اب جب اسے سود کی حقیقت کا علم ہوا پھر وہ اپنے گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں متفکر ہوا یا اور اس نے جان لیا کہ وہ سابقہ دنوں میں سود میں

1۔ مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 355، آرام باغ کراچی

سے بہت سی چیزیں لیتا رہا ہے، تو اب اس پر صحیح ہے کہ وہ ان تمام پر نادم ہو، اس کے اوقات کی تعیین اس پر لازم نہیں۔ اور اسی طرح ان تمام گناہوں اور برائیوں کا حکم ہے جن میں وہ واقع ہوتا رہا ہے مثلاً غیبت، چغلخوری اور ان کے علاوہ وہ محرمات جن کے حرام ہونے کا اسے علم نہیں تھا، پس جب فقاہت حاصل کر لے اور اس کے کلام میں سے جو گزر چکا ہے اسے تلاش کر لے تو وہ مجموعی طور پر اس سے توبہ کر لے، اور اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے جس میں اس سے کوتاہی ہوئی ہے اس پر اظہار ندامت کرے، اور جب اس نے حلال سمجھا اسے جو اس پر ظلم تھا تو اس نے مجموعی طور پر اسے حلال قرار دیا اور اس کا نفس اپنا حق چھوڑنے کے ساتھ خوش رہا تو یہ جائز ہے، کیونکہ یہ مجہول شے ہبہ کرنے کے باب سے ہے، یہ بندے کے بخل اور اپنے حق کی طلب پر اس کی حرص کے ساتھ ساتھ ہے۔ تو پھر اس اکرم الاکرمین کے بارے کیفیت کیا ہوگی جو طاعات اور ان کے اسباب عطا فرمانے والا ہے اور صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے درگزر فرمانے والا ہے؟ ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ امام کی مراد ہے اور یہی وہ معنی ہے جس پر ان کا کلام دلالت کرتا ہے اس کے لئے جس نے اس کی تلاش کی، اور جو یہ گمان کرنے والے نے گمان کر لیا ہے کہ ندامت صحیح نہ ہوگی مگر ہر معین اور ہر معینہ حرکات و سکنات پر تو یہ تکلیف مالا یطاق کے باب سے ہے، جو شرعاً واقع نہیں ہے اگرچہ عقلاً جائز ہے، اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ یہ پہچان رکھتا ہو کہ شراب پیتے وقت اس نے کتنے گھونٹ پیئے ہیں، اور زنا کرتے وقت اس نے کتنی بار حرکت کی ہے اور حرام کی طرف چلتے ہوئے اس نے کتنے قدم چلے ہیں، اور یہ ایسی شے ہے جس کی کوئی بھی طاقت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس سے تفصیلاً توبہ کرنے کا حکم آیا ہے۔ اس بارے میں توبہ کے احکام اور اس کی شرائط کا مزید بیان سورۃ النساء وغیرہا میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ قول باری تعالیٰ: وَلَمْ يُصِرُّوْا میں اس پر واضح حجت اور قطعی دلیل موجود ہے کہ یہ اس کے لئے ہے جو کچھ اس نے زبان سے کہا، اور لسان الامۃ القاضی ابو بکر بن طیب نے کہا ہے کہ انسان کا اس کے سبب بھی مواخذہ کیا جائے گا جس پر اس نے اپنے ضمیر کو ثابت اور پختہ کر لیا اور جس برائی کا اس نے اپنے دل سے عزم مصمم کر لیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: قرآن کریم میں ہے وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۝ (الحج) (اور جو ارادہ کرے اس میں زیادتی کا ناحق تو ہم اسے چکھائیں گے دردناک عذاب)۔

اور مزید فرمایا: فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ۝ (القلم) (چنانچہ (لہلہاتا) باغ کٹے ہوئے کھیت کی مانند ہو گیا۔) پس انہیں ان کے پختہ عزم کے سبب ان کے فعل سے پہلے ہی سزا دے دی گئی اور اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور بخاری شریف میں ہے "جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر آمنے سامنے آتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں ہوں گے۔" صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس قاتل کے بارے میں تو سمجھ آئی، لیکن مقتول نے کیا کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ بھی تو اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا حریص تھا۔" (1)

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعید کو حرص کے ساتھ معلق کیا ہے اور یہ عزم اور پختہ ارادہ ہی ہے اور ہتھیار کے اظہار کو لغو کر دیا ہے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 1049، اسلام آباد

اور اس سے زیادہ نص وہ ہے جسے ترمذی نے نقل کیا ہے ابو کبشہ انماری کی حدیث سے، اور اسے صحیح مرفوع قرار دیا ہے۔ ''بے شک دنیا چار قسم کے آدمیوں کے لئے ہے ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال اور علم عطا فرمایا اور وہ اس میں اپنے رب سے ڈرتا رہتا ہے اور اس میں صلہ رحمی کرتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے حق کو جانتا ہے تو یہ افضل ترین مقام و مرتبہ پر ہوگا، اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا اور اسے مال نہ دیا اور وہ [نیت کے اعتبار سے صادق اور سچا ہو] اور وہ یہ کہتا ہو اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں اس میں فلاں آدمی کے عمل کی طرح عمل کرتا اور اس نے اس کی نیت کی تو ان دونوں کا اجر برابر ہوگا۔ اور تیسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اسے علم نہیں دیا اور وہ [اپنے مال میں بغیر علم کے تصرف کرتا ہے] اور اس میں اپنے رب سے نہیں ڈرتا، اور نہ وہ اس کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہے اور نہ ہی اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی حق جانتا ہے تو وہ اخبث اور رذیل درجہ میں ہوگا، اور چوتھا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے نہ مال عطا فرمایا اور نہ ہی علم، اور وہ کہتا ہے اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں یقیناً اس میں فلاں آدمی کے عمل کی طرح عمل کرتا اور وہی اس کی نیت ہو تو دونوں کا بوجھ برابر ہوگا۔ (1)''

اور یہ وہ ہے جس کی طرف قاضی گئے ہیں اور اسی پر عام سلف اور اہل علم فقہاء، محدثین اور متکلمین ہیں، اور اس کے خلاف جس نے یہ گمان کیا ہے کہ جس شے کا انسان قصد کرتا ہے اگرچہ وہ اس پر ثابت اور پختہ ہو جائے تو صرف ارادہ کے سبب اس کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، اس کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ اور اس کے لئے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں کوئی حجت نہیں ہے: ''جس نے گناہ کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہ کیا تو اس کے بارے کچھ نہیں لکھا جائے گا اور اگر اس کے مطابق عمل کیا تو اس پر ایک گناہ لکھا جائے گا (2)''۔ کیونکہ فلم یعملها کا معنی ہے: اور اس نے اس پر عمل کرنے کا ارادہ نہ کیا۔ اور اس کی دلیل وہ ہے جو ہم نے ذکر کی ہے، اور فان عملها کا معنی ہے: اگر اس نے اسے ظاہر کیا یا اس کا ارادہ کیا۔ اور اس کی دلیل بھی وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔ وباللہ توفیقنا۔

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿١٣٦﴾

''یہ وہ (نیک بخت) ہیں جن کا بدلہ بخشش ہے اپنے رب کی طرف سے اور جنت رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں، ہمیشہ رہیں گے اور ان میں کیا ہی اچھا بدلہ ہے کام کرنے والوں کا۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کے ساتھ گناہوں کی بخشش کو ان کے لئے لازم کیا ہے جو اپنی توبہ میں مخلص ہیں اور اپنے گناہ پر مصر نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قصہ احد کے ساتھ متصل ہو، یعنی جو بھاگے پھر توبہ کر لی اور اصرار نہ کیا تو ان کے لئے مغفرت ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

1۔ جامع الترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56، اسلام آباد، صفحہ 507، لاہور

2۔ مسلم، باب الاسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی السموات و فرض الصلوات، جلد 1، صفحہ 91، آرام باغ کراچی

الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

''گزر چکے ہیں تم سے پہلے (قوموں کے عروج وزوال کے) قاعدے پس سیر کرو زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کہ کیسا انجام ہوا (دعوت حق کو) جھٹلانے والوں کا۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کے لئے تسلی ہے، اور سنن سنة کی جمع ہے اور اس سے مراد صراط مستقیم ہے۔ (کہا جاتا ہے) فلان علی السنة یعنی فلاں سیدھے راستے پر ہے وہ خواہشات نفسانی میں سے کسی شے کی طرف جھکتا نہیں۔

ہذلی نے کہا ہے:

فلا تجزعن من سنة انت سِرْتَها فأوّل راضٍ سُنّةً مَن يَسيرها

تو اس راستے سے خوفزدہ اور پریشان نہ ہو جس پر تو چلا کیونکہ جو اس پر چلتا ہے وہ پہلے اس راستے سے راضی ہوتا ہے۔

اور سنة سے مراد وہ امام ہے جس کی اتباع اور اقتدا کی جائے، کہا جاتا ہے: سن فلان سنة حسنة و سيئة جب وہ کوئی ایسا کام کرے جس کی اقتدا اور پیروی کی جائے اس میں خیر ہو یا شر۔

لبید نے کہا ہے:

مِن معشرٍ سَنّت لهم اباؤهم ولكلّ قومٍ سنةٌ وامامها

اہل خانہ کے لئے ان کے آباء نے طریقہ مقرر کر دیا ہے اور ہر قوم کے لئے مقتدا اور ان کا امام ہے۔

اور سنة سے مراد امت، اور سنن سے مراد امم ہیں، یہ معنی مفضل سے منقول ہے۔

اور اس نے شعر کہا ہے:

ماعاينَ الناسُ من فضلٍ كفضلِهم ولا رَأوا مِثلَهم فی سالِفِ السُّنن

لوگوں نے ان کے فضل کی طرح کوئی فضل نہیں دیکھا اور نہ ان کی مثل سابقہ امتوں میں کوئی دیکھا۔

اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی اہل سنن ہیں، اور مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔

اور ابو زید نے کہا ہے: مراد امثال ہیں۔ عطا کا قول ہے: مراد شرائع ہیں۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ یعنی ہلاکت کے ساتھ ان میں گزر چکی ہیں جنہوں نے تم سے پہلے جھٹلایا ہے جیسا کہ قوم عاد اور ثمود اور العاقبة کا معنی ہے: کسی امر کا آخر یعنی انجام۔ اور یہ احد کے دن میں ہوا۔ وہ فرماتا ہے: پس میں انہیں مہلت دوں گا اور میں انہیں ڈھیل دیتا رہوں گا اور میں ان کے لئے تدبیر اپناتا رہوں گا یہاں تک کہ لکھی ہوئی تقدیر اپنی مقررہ مدت کو پہنچ جائے گی، یعنی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی نصرت و مدد کے ساتھ اور ان کے دشمن کافروں کو ہلاک کرنے کے ساتھ۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

''یہ ایک بیان ہے لوگوں (کے سمجھانے) کے لئے اور ہدایت اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کے واسطے۔''

یعنی یہ قرآن ایک بیان ہے، حسن وغیرہ سے یہ منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس قول کی طرف اشارہ ہے: قَدْ

خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ اور الموعظۃ کا معنی وعظ (نصیحت) ہے اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾

''اور نہ (تو) ہمت ہارو اور نہ غم کرو اور تمہیں سربلند ہو گے اگر تم سچے مومن ہو۔''

غزوہ احد میں مومنین کو اپنے شہداء اور زخمی ہونے والے افراد کے سبب جو تکلیف اور غم لاحق ہوا اس آیت میں اس پر انہیں حوصلہ اور تسلی دلائی جارہی ہے، اور اس میں انہیں اپنے دشمن کے خلاف جہاد پر ابھارا جارہا ہے اور انہیں عجز اور بزدلی دکھانے سے منع کیا جارہا ہے۔ پس فرمایا: وَ لَا تَهِنُوْا یعنی اے اصحاب محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کمزوری نہ دکھاؤ اور اپنے دشمنوں کے خلاف جہاد کرنے سے بزدلی کا اظہار نہ کرو اس تکلیف کی وجہ سے جو تمہیں پہنچی۔

وَ لَا تَحْزَنُوْا اور اپنی پشتوں پر غم سوار نہ کرو، اور نہ ہی اس ہزیمت اور مصیبت کے سبب غمزدہ ہو جو تمہیں پہنچی۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یعنی اگر تم میرے وعدہ کی سچائی کے ساتھ ایمان رکھتے ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اِنْ بمعنی اِذْ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب احد کے دن شکست خوردہ ہوئے پس ہم ان کے درمیان اسی طرح تھے کہ اچانک خالد بن ولید مشرکین گھوڑ سواروں کے ساتھ آ گیا، وہ چاہتا تھا کہ وہ ان پر پہاڑ کی جانب سے حملہ آور ہو اور غالب آئے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا مانگی: ''اے اللہ! وہ ہم پر غالب نہ آئے اے اللہ! تیرے سوا ہماری کوئی قوت نہیں اے اللہ! اس جماعت کے سوا اس شہر میں کوئی تیری عبادت نہیں کرے گا۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اور مسلمان تیر اندازوں کا ایک گروہ اکٹھا ہوا اور وہ پہاڑ پر چڑھ گئے اور انہوں نے مشرک گھوڑ سواروں پر تیر برسائے یہاں تک کہ انہیں شکست سے دوچار کر دیا، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (1) یعنی احد کے بعد تم ہی دشمن پر غالب رہو گے۔ پس اس کے بعد انہوں نے کوئی لشکر نہیں بھیجا مگر انہیں ہر اس جنگ میں کامیابی و کامرانی نصیب ہوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں ہوئی، اور ہر اس جنگ میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہوئی اور اس میں صحابہ کرام میں سے کوئی ایک بھی ہوا تو ظفر و فتح ان کا مقدر بنی، اور یہ تمام شہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کے عہد میں ہی فتح ہوئے، پھر ان کے ختم ہو جانے کے بعد اس طرح کوئی شہر بھی فتح نہیں ہوا جس طرح وہ اس وقت میں فتح کرتے تھے۔ اس آیت میں اس امت کی فضیلت کا بیان ہے، کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خطاب فرمایا ہے جس کے ساتھ اس نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو خطاب فرمایا ہے، کیونکہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا: اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿٦٨﴾ (طٰہٰ) (یقیناً تم ہی غالب رہو گے) اور اس امت کو فرمایا: وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اور یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی الاعلی سے مشتق ہے پس اس کی ذات پاک اور بلند ہے، اور مومنین کے لئے فرمایا: وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ

1۔ اسباب النزول، صفحہ 83-82

الظّٰلِمِيْنَ ۝

"(احد میں) اگر لگی ہے تمہیں چوٹ تو (بدر میں) لگ چکی ہے (تمہاری دشمن) قوم کو بھی چوٹ ایسی ہی اور یہ (ہار جیت کے) دن ہم پھراتے رہتے ہیں انہیں لوگوں میں اور یہ اس لئے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے اور بنالے تم میں سے کچھ شہید اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ظالموں کو۔"

قولہ تعالیٰ: اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ، قرح کا معنی زخم، چوٹ ہے اس میں کسائی اور اخفش سے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ دونوں لغتیں منقول ہیں (یعنی قَرْحٌ اور قُرْحٌ) مثلاً عَقْرٌ اور عُقْرٌ۔ اور فراء نے کہا ہے: فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی زخم ہے اور ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی زخم کا درد ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اگر احد کے دن تمہیں زخم لگا ہے تو بدر کے دن (تمہاری دشمن) قوم کو بھی اسی کی مثل زخم لگا ہے۔ اور محمد بن سمیقع نے مصدر کی بنا پر فا اور را کے فتحہ کے ساتھ قرح پڑھا ہے۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ کہا گیا ہے: یہ جنگ میں ہوتا ہے، ایک بار مومنین کے لئے ہوتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد فرمائے، اور ایک بار کافروں کے لئے ہوتی ہے جب مومنین نافرمانیاں کرنے لگیں تاکہ وہ انہیں آزمائش میں ڈالے اور ان کے گناہوں کو کم کرے، اور رہی یہ صورت کہ جب وہ نافرمانیاں نہ کریں تو پھر یقیناً اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی غالب آتا ہے۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے: نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ہم پھراتے رہتے ہیں لوگوں کے درمیان خوشی اور غم، صحت اور بیماری، اور خوشحالی اور تنگدستی کو اور الدُّوْلَةُ کا معنی ہے ایک بار۔

شاعر نے کہا ہے:

فیوم لنا و یوم علینا　و یومٌ نُساءُ و یَوْمٌ نُسَرّ

پس ایک دن ہمارے حق میں ہوتا ہے اور ایک دن ہمارے خلاف اور کبھی ہمیں اذیت دی جاتی ہے اور کبھی ہمیں خوش کیا جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اس کا معنی ہے: بلاشبہ یہ پھرنا اس لئے ہے تاکہ مومن کو منافق سے (جدا) دکھایا جائے اور ان میں سے بعض کو بعض سے ممتاز کیا جا سکے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَاۤ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا (آل عمران) اور یہ بھی کہا گیا ہے تاکہ وہ مومنین کے صبر کو جان لے، (یعنی) ایسا علم جس پر جزا واقع ہوگی جیسا کہ انہیں مکلف بنانے سے پہلے اس کا غیبی علم ہے۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ یعنی وہ تمہیں شہادت کے ساتھ تکریم اور اعزاز عطا فرمائے، یعنی تاکہ ایک قوم (جماعت) قتل کی جائے اور وہ لوگوں پر اپنے اعمال کے سبب گواہ ہو جائیں۔ اور کہا گیا ہے کہ اسی وجہ سے اسے شہید کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اسے شہید اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ جنت اس کے لئے حاضر کر دی جاتی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا نام شہید اس لئے ہے کیونکہ ان کی ارواح دارالسلام میں حاضر ہیں، کیونکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں،

اور ان کے سوا دوسروں کی ارواح جنت تک نہیں پہنچتی ہیں، پس شہید بمعنی شاہد ہے یعنی جنت کے لئے حاضر ہونے والا، آنے والے بیان کے مطابق یہی صحیح معنی ہے۔ اور شہادت کی فضیلت بہت عظیم ہے، اور تیرے لئے اس کی فضیلت میں الله تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ الآیہ (التوبہ: 111) (یقیناً الله نے خرید لی ہیں ایمانداروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لئے جنت ہے۔)

اور الله تعالیٰ کا یہ ارشاد: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (الصف) (اے ایمان والو! کیا میں آگاہ کروں تمہیں ایسی تجارت پر جو بچالے تمہیں دردناک عذاب سے (وہ تجارت یہ ہے کہ) تم ایمان لاؤ الله اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو الله کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے ...... یہی بڑی کامیابی ہے۔)

اور صحیح البستی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''شہید قتل سے اتنی ہی تکلیف پاتا ہے جتنی تم میں سے کوئی پھوڑے سے پاتا ہے (1)۔'' اور نسائی نے بیان کیا ہے کہ راشد بن سعد نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی سے روایت کیا ہے کہ کسی آدمی نے عرض کی: یا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم، مومنین کو کیا ہوا ہے کہ سوائے شہید کے انہیں اپنی قبروں میں آزمائش اور فتنہ میں ڈالا جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کے سر پر تلواروں کی چمک فتنہ اور آزمائش کے لئے کافی ہے (2)'' اور بخاری میں ہے۔ ''مسلمانوں میں سے احد کے دن جو شہید کئے گئے'' ان میں سے حضرت حمزہ، یمان، نضر بن انس، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم ہیں، عمرو بن علی نے مجھے بیان کیا ہے کہ معاذ بن ہشام نے کہا: میرے باپ نے حضرت قتادہ سے مجھے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم قبائل عرب میں سے کوئی ایسا قبیلہ نہیں جانتے جس میں انصار سے بڑھ کر شہید ہوں اور قیامت کے دن وہ ان سے زیادہ عزت والا ہو۔

حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: اور ہمیں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے کہ ان میں سے احد کے دن ستر آدمی شہید کئے گئے اور بئر معونہ کے دن ستر اور یمامہ کے دن بھی ستر (آدمی شہید کئے گئے)۔ فرمایا: بئر معونہ کا واقعہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوا، اور جنگ یمامہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسیلمہ کذاب سے لڑی گئی (3)۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو لایا گیا اور آپ کے جسم پر نیزے، تلوار اور تیر کے ساٹھ کے قریب زخم تھے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر دست مبارک پھیرنے لگے اور وہ الله تعالیٰ کے اذن سے اس طرح جڑنے اور مندمل ہونے لگے گویا وہ تھے ہی نہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ ارادہ امر کا غیر ہے۔ (یعنی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، صفحہ 206، اسلام آباد
2۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 289، اسلام آباد
3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 584، آرام باغ کراچی

دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں۔) جیسا کہ اہل السنۃ یہی کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو مومنین کے قتل سے منع کیا ہے، یعنی حضرت حمزہ اور آپ کے ساتھیوں کو رضی اللہ عنہم۔ اور ان کے قتل کا ارادہ فرمایا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کو درخت کھانے سے منع فرمایا اور کھانے کا ارادہ فرمایا پس آدم علیہ السلام اس میں واقع ہوئے۔ اور اس کے برعکس یہ ہے کہ ابلیس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا اور اس کا ارادہ نہیں کیا پس وہ اس سے رک گیا، اور اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے قول حق کے ساتھ اشارہ بھی واقع ہے: وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ (التوبہ:46) (لیکن ناپسند کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے کھڑا ہونے کو اس لئے پست ہمت کر دیا انہیں)۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تمام کو جہاد کا حکم دیا ہے، لیکن سستی، کاہلی اور سفر سے رہ جانے والے اسباب بھی پیدا فرما دیئے پس وہ پیچھے بیٹھ رہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: بدر کے دن حضرت جبرائیل امین علیہ السلام حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کو عرض کی: ”آپ قیدیوں کے بارے میں اپنے اصحاب کو اختیار دے دیجئے اگر وہ چاہیں تو قتل کر دیں اور اگر چاہیں تو اس شرط پر فدیہ لے لیں کہ آئندہ سال ان کے برابر ان میں سے قتل کئے جائیں گے تو انہوں نے کہا: ہم فدیہ لیں گے اور ہم میں سے قتل کئے جائیں گے۔“ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے (1)۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ اپنے اولیاء کی شہادت کے ساتھ پورا کر دیا اس کے بعد کہ انہیں اختیار دیا تو انہوں نے قتل کو اختیار کیا۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ مشرکین کو دوست نہیں رکھتا یعنی اگر وہ مومنین کی جانب سے کفار کو کچھ دے تو وہ انہیں پسند نہیں کرتا ہے اور اگر وہ مومنین کے سبب کچھ تکلیف پہنچائے تو بلاشبہ وہ مومنین کو دوست رکھتا ہے۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

”اور اس لئے کہ نکھارے اللہ تعالیٰ انہیں جو ایمان لائے اور مٹا دے کافروں کو۔“

اس میں تین اقوال ہیں: يُمَحِّصَ بمعنی يختبر (تاکہ وہ آزمائے) دوسرا...... يطهر (تاکہ وہ انہیں گناہوں سے پاک کرے) اس صورت میں مضاف محذوف ہے۔ معنی یہ ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو ختم کر دے جو ایمان لائے، فراء نے یہی کہا ہے اور تیسرا...... يمحص بمعنی يخلص (تاکہ وہ انہیں نکھار دے اور صاف کر دے) یہ معنی زیادہ غریب ہے۔

خلیل نے کہا ہے: کہا جاتا ہے مَحَصَ الحبلُ يَمْحَصُ مَحْصًا جب رسی کی اون کٹ جائے، اور اسی سے ہے اللّٰهم مَحِّص عنا ذنوبنا اے اللہ! ہم سے ہمارے گناہوں کو صاف کر دے (ختم کر دے) یعنی ہمیں ان کی سزا سے نجات عطا فرما۔ اور ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: میں نے محمد بن یزید عن خلیل یہ قرأت کی: التمحيص (بمعنی) التخليص ہے۔ کہا جاتا ہے: مَحَصَهُ [يمحصه] محصا جب وہ اسے نجات دلا دے، صاف کر دے، پس معنی ہوگا: اس پر ہے کہ وہ مومنین کو آزمائے تاکہ وہ انہیں ثواب عطا فرمائے اور انہیں ان کے گناہوں سے نجات دلائے۔ وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ یعنی وہ انہیں ہلاک

1۔ جامع ترمذی، کتاب السیر، جلد 1، صفحہ 190، اسلام آباد

کر کے تباہ و برباد کر دے۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَ لَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡکُمۡ وَ یَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۴۲﴾

''کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنگ میں حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے اور دیکھا ہی نہیں (آزمائش میں) صبر کرنے والوں کو۔''

اَمۡ بمعنی بل ہے۔ اور کہا گیا ہے: میم زائدہ ہے اور معنی ہے: اے وہ جو احد کے دن شکست خوردہ ہوئے کیا تم گمان رکھتے ہو کہ تم اسی طرح جنت میں داخل ہو جاؤ گے جیسے وہ داخل ہوئے جو شہید کر دیئے گئے اور انہوں نے زخم اور قتل کے درد پر صبر اختیار کیا اس کے بغیر کہ تم ان کے راستے پر چلو اور ان کے صبر کی طرح صبر کرو؟ نہیں، یہاں تک یَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡکُمۡ یعنی (تم میں سے جنہوں نے جہاد کیا اللہ تعالیٰ کے بارے) علم شہادت (حاصل کر لے) تا کہ اس پر جزا واقع ہو۔ اور معنی ہے: اور تم نے جہاد نہیں کیا کہ وہ تم سے اسے جان لے۔ اس میں لما بمعنی لم ہے اور سیبویہ نے لم اور لما کے درمیان فرق کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ لم یفعلُ، فَعَلَ کی نفی ہے، اور لَمّا یفعل، قد فَعَلَ کی نفی ہے۔ وَ یَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ یہ اَن مضمرہ کے سبب منصوب ہے، یہ خلیل سے روایت ہے، اور حسن اور یحییٰ بن یعمر نے یَعۡلَمِ الصَّابِرِیۡنَ عطف نسق کی بنا پر جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے قطع کی بنا پر رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی وھو یعلمُ۔ اور یہ قرأت عبدالوارث نے ابو عمرو سے روایت کی ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہاں واؤ بمعنی حتیٰ ہے، یعنی ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم حتی یعلم صبرھم کما تقدم آنفا۔

حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا یہاں تک کہ وہ ان کے صبر کو دیکھ لے جیسا کہ ابھی گزرا ہے۔

وَ لَقَدۡ کُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَلۡقَوۡهُ ۪ فَقَدۡ رَاَیۡتُمُوۡهُ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۱۴۳﴾

''اور تم تو آرزو کرتے تھے موت کی اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو سو اب دیکھ لیا تم نے اس کو اور تم (آنکھوں سے) مشاہدہ کر رہے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدۡ کُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ یعنی تم تو شہادت کی آرزو کرتے تھے اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو۔ اعمش نے مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُلَاقُوۡهُ پڑھا ہے یعنی قتل سے پہلے اور یہ کہا گیا ہے: اس سے پہلے کہ تم اسباب موت سے ملاقات کرو'' اور یہ اس لئے کہ ان میں سے بہت سے غزوہ بدر میں حاضر نہیں تھے تو وہ اس دن کی آرزو اور تمنا کر رہے تھے جس میں جنگ ہو گی، تو جب احد کا دن آیا تو وہ شکست کھا گئے، اور ان میں وہ بھی تھے جو مضبوط رہے اور ڈٹے رہے یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے، اور ان میں سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا انس بن نضر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ کیونکہ جب مسلمان بکھرے تو انہوں نے کہا: اے اللہ! میں تیری طرف اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں جو کچھ انہوں نے کیا ہے، اور پھر (پوری قوت کے ساتھ) لڑنے

لگے اور کہا: بلاشبہ یہاں تو جنت کی خوشبو ہے! میں اسے پالوں گا، اور لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہم نے انہیں صرف انگلیوں کے پوروں سے پہچانا تھا اور ہم نے ان کے بدن پر اسی سے زائد زخم پائے۔ ان کے بارے میں اور ان جیسے دیگر افراد کے بارے میں یہ ارشاد نازل ہوا، رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (1) (الاحزاب: 23) (ایسے جوانمرد ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا) پس یہ آیت شکست خوردہ ہونے والوں کے حق میں عتاب ہے، اور بالخصوص ان کے لئے جنہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ طیبہ سے نکلنے پر ابھارا تھا، اور اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔

اور موت کی تمنا مسلمانوں سے شہادت کی تمنا کی طرف راجع ہوتی ہے جس کا دارومدار (میدان) جہاد میں صبر و ثبات پر ہے، نہ کہ اس سے مراد کفار کا انہیں قتل کرنا ہے، کیونکہ یہ تو معصیت اور کفر ہے اور معصیت کا ارادہ کرنا جائز نہیں ہوتا۔ اور اسی بنا پر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ سے یہ التجا اور دعا کرنے پر برانگیختہ کیا جاتا ہے کہ وہ انہیں شہادت عطا فرمائے اور وہ جہاد میں صبر اختیار کرنے کی التجا کرتے ہیں اگرچہ وہ انہیں قتل تک ہی پہنچا دے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ اخفش نے کہا: یہ تکریر بمعنی تاکید ہے اس قول: فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ کے لئے، جیسا کہ اس قول میں ہے ولا طائر یطیر بجناحیه اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور تم آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہو تمہاری آنکھوں میں کوئی بیماری نہیں ہے، [جیسا کہ] تو کہتا ہے: قد رأیت کذا و کذا و لیس فی عینیك علة، (تو نے اس اس طرح دیکھ لیا ہے اور تیری آنکھوں میں کوئی بیماری نہیں۔) یعنی تو نے اسے حقیقتاً دیکھ لیا ہے، اور یہ معنی تاکید کی طرف راجع ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ اور تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دیکھ رہے ہو۔ آیت میں اضمار ہے، تقدیر کلام یہ ہے۔ فقد رأیتموه و انتم تنظرون فلم انهزمتم؟ (تحقیق تم نے اسے دیکھ لیا ہے اور تم (آنکھوں سے) مشاہدہ کر رہے ہو تو پھر تم نے شکست کیوں کھائی؟)

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝

''اور نہیں محمد (مصطفیٰ) مگر (اللہ کے) رسول گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول۔ تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید کر دیئے جائیں پھر جاؤ گے تم الٹے پاؤں (دین اسلام سے) اور جو پھرتا ہے الٹے پاؤں تو نہیں بگاڑ سکے گا اللہ کا کچھ بھی اور جلدی اجر دے گا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو۔''

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ روایت ہے کہ یہ احد کے دن مسلمانوں کے شکست کھانے کے سبب نازل ہوئی اس وقت شیطان نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، حدیث نمبر 2595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چیخ کر کہا: قد قتل محمد۔ (تحقیق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیا گیا۔) عطیہ العوفی نے کہا ہے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے: تحقیق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو موت دی گئی ہے پس تم انہیں اپنے ہاتھوں کے ساتھ دو کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں اور بعض نے کہا ہے: اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو موت دی گئی ہے تو کیا تم اس حالت پر باقی نہیں رہو گے جس پر تمہارے انبیاء رہے یہاں تک کہ تم آپ سے جا ملو۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ ارشاد نازل فرمایا: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْھَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْھَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَھُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَھُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاٰتٰىھُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا(1)۔ اس میں ما نافیہ ہے اور اس کا ما بعد مبتدا اور خبر ہے، اور ما کا عمل باطل ہو گیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرح قرأت کی ہے: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهٖ رُسُلٌ یعنی بغیر الف لام کے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس پر آگاہ فرمایا ہے کہ رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات اپنی قوم میں ہمیشہ باقی رہنے والے نہیں ہیں، اور یہ کہ اس کو مضبوطی سے تھامنا واجب ہے جو رسل علیہم السلام لے کر آئے اگرچہ رسول موت یا قتل کے سبب مفقود ہو۔ اور اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و تکریم فرمائی [آپ کے دو وصفوں] دو اسموں کے ساتھ جو دونوں آپ کے اسم سے مشتق ہیں محمد اور احمد صلی اللہ علیہ وسلم عرب کہتے ہیں: رَجُلٌ محمود و محمد جب اس کے خصائل حمیدہ کثیر ہوں۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

الی الماجد القرمِ الجواد المحمّد

تحقیق یہ معنی سورۃ الفاتحہ میں گزر چکا ہے۔

اور عباس بن مرداس نے کہا ہے:

یا خاتم النُّبآءِ انك مُرسَل بالخَیْر كلُّ هُدَی السَّبِیْلِ هُدَاكا

اے خاتم الانبیاء! بلاشبہ آپ خیر و بھلائی کے ساتھ بھیجے گئے ہیں ہر راہ ہدایت آپ ہی کی ہدایت ہے۔

ان الاله بنَی علیك محبّة فی خلقه و مُحمّدًا سمّاكا

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں تجھ پر محبت کی بنیاد رکھی ہے اور تیرا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم رکھا ہے۔

پس یہ آیت شکست کھانے والوں کے عتاب کا تتمہ ہے، یعنی ان کے لئے شکست کھانا نہیں ہے اگرچہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید کر دیئے جائیں، اور نبوت موت کو دور نہیں کر سکتی، اور ادیان انبیاء علیہم السلام کی موت سے زائل نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور آپ کی جرأت پر سب سے بڑھ کر دلیل ہے، کیونکہ

1۔ اسباب النزول، صفحہ 83

شجاعت اور جرأت کی تعریف اور حد مصائب و آلام آنے کے وقت دل کا ثابت رہنا ہے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت سے بڑی اور کوئی مصیبت نہیں۔ جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے، پس اسی وقت آپ کی شجاعت اور آپ کا علم ظاہر ہوا۔ لوگوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے، ان میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی (معاملہ) مخفی رکھا، اور معاملہ مضطرب ہو گیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے ساتھ اس حقیقت کو ظاہر کیا جب آپ اپنی رہائش گاہ سنح سے آئے۔

بخاری میں اسی طرح ہے(1) اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی زوجہ جو کہ خارجہ کی بیٹی تھی، کے ساتھ عوالی میں تھے، تو لوگ کہنے لگے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے بلکہ یہ انہیں حالات میں سے ایک حالت ہے جو وحی لیتے وقت آپ پر طاری ہوتی تھی۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور آپ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس سے (کپڑا) اٹھایا اور آپ کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور دو بار کہا: انت اکرم علی اللہ من ان یمیتک (آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس سے زیادہ معزز اور مکرم ہیں کہ وہ آپ کو موت دے)

قسم بخدا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد کے ایک کونے میں کہہ رہے تھے: قسم بخدا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے، اور نہ وہ فوت ہوں گے یہاں تک کہ منافقین میں سے بہت سے لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے اور منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا: من کان یعبد اللہ فان اللہ حی لم یمت، و من کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ تو زندہ ہے وہ فوت نہیں ہوا۔ اور جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو فوت ہو چکے ہیں، وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ''گویا میں نے تو یہ آیت اس دن کے سوا پڑھی ہی نہیں (2)۔'' اور انہوں نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا جو پہلے انہوں نے کہا تھا۔ اسے وائلی ابو نصر عبید اللہ نے اپنی کتاب ''الابانۃ'' میں ذکر کیا ہے: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس وقت سنا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی گئی اور آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر تشریف فرما ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پہلے شہادت دی اور کہا: امابعد! میں نے کل تمہیں ایک بات کہی تھی اور وہ اس طرح نہ تھی جیسے میں نے کہی تھی۔ اور قسم بخدا! میں نے وہ بات جو تمہیں کہی اسے اس کتاب میں نہیں پایا جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور نہ ہی اس عہد میں پایا جو عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، البتہ میں یہ امید کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہیں گے یہاں تک کہ آپ ہمارے بعد آئیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1165، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 118، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1615، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے..... آپ کے کہنے کی مراد یہ تھی کہ آپ ﷺ کو موت آخر میں آئے گی..... پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کے لئے اپنی پسند کو تمہاری پسند پر ترجیح دی، اور یہ وہ کتاب ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کی راہنمائی فرمائی پس تم اسے پکڑ لو تم ہدایت پا جاؤ گے اس کی طرف جو رسول اللہ ﷺ نے راہنمائی فرمائی۔(1)

وائلی ابونصر نے کہا: وہ بات جو انہوں نے کہی پھر اس سے رجوع کر لیا وہ یہ ہے "کہ حضور نبی مکرم ﷺ فوت نہیں ہوئے اور وہ ہرگز فوت نہیں ہوں گے یہاں تک کہ لوگوں کے ہاتھ اور ان کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے اور انہوں نے یہ اس عظیم صدمہ کی وجہ سے کہا جو انہیں لاحق ہوا اور انہیں فتنہ اور منافقین کے ظہور کا خدشہ ہوا، اور جب انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قوت یقین کا مشاہدہ کیا، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھا: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ اور اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ اور وہ جو انہوں نے اس دن کہا..... تو یہ آگاہ ہوئے اور یہ بات (ان کے ذہن میں) راسخ ہو گئی۔ اور انہوں نے کہا: گویا میں نے یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی سے سنی ہی نہیں۔ اور لوگ یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے مدینہ طیبہ کی گلیوں میں نکل پڑے، گویا یہ آیت کبھی نازل نہیں ہوئی مگر اسی دن (2)۔ اور آپ ﷺ کا وصال بلا اختلاف پیر کے دن ہوا، اسی وقت میں جس میں آپ ﷺ ہجرت کے وقت مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تھے جس وقت دھوپ خوب سخت ہو چکی تھی، اور آپ ﷺ کو منگل کے دن دفن کیا گیا، اور یہ قول بھی ہے کہ بدھ کی رات کو (آپ کو دفن کیا گیا)(3)

صفیہ بنت عبد المطلب نے رسول اللہ ﷺ کا مرثیہ کہتے ہوئے کہا:

أَلَا يَا رَسُوْلَ اللهِ كُنْتَ رَجَاءَنَا　　وَ كُنْتَ بِنَا بَرًّا وَ لَمْ تَكُ جَافِيَا

خبردار! یا رسول اللہ ﷺ آپ ہماری امید تھے اور آپ ہمارے محسن تھے اور کبھی اعراض نہ برتتے تھے۔

وَ كُنْتَ رَحِيْمًا هَادِيًا وَ مُعَلِّمًا　　لِيَبْكِ عَلَيْكَ الْيَوْمَ مَنْ كَانَ بَاكِيَا

اور بڑے مہربان، راہبر اور معلم تھے چاہیے کہ آج کے دن آپ پر ہر رونے والا روئے۔

لَعَمْرُكَ مَا أَبْكِي النَّبِيَّ لِفَقْدِهِ　　وَ لٰكِنْ لِمَا أَخْشَى مِنَ الْهَرْجِ آتِيَا

تیری عمر کی قسم میں نبی مکرم ﷺ کے مفقود ہونے کے سبب نہیں رووں گی البتہ جب مجھے کسی حرج اور مصیبت آنے کا خدشہ ہوگا۔

كَأَنَّ عَلَى قَلْبِي لِذِكْرِ مُحَمَّدٍ　　وَمَا خِفْتُ مِنْ بَعْدِ النَّبِيِّ الْمَكَاوِيَا

گویا میرے دل پر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر ہے اور مجھے نبی مکرم ﷺ کے بعد کسی گالیاں دینے والے کا کوئی خوف نہیں۔

أَفَاطِمُ صَلَّى اللهُ رَبُّ مُحَمَّدٍ　　عَلَى جَدَثٍ أَمْسَى بِيَثْرِبَ ثَاوِيَا

میں چھوڑتی ہوں اللہ تعالیٰ پر جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا رب ہے کہ وہ اس قبر پر رحمتیں نازل فرمائے جو یثرب میں آباد ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6679، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث 1165، ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1298، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فِدًی لرسولِ اللہ اُمّی و خالتی و عمی و آبائی و نفسی و مالیا

رسول اللہ ﷺ پر میری ماں، میری خالہ، میری پھوپھی، میری جان اور میرا مال سبھی نثار ہوں۔

صدَقتَ و بلّغتَ الرسالۃ صادقا و مت صلیبَ العود أبلَجَ صافِیا

آپ نے سچ بولا اور پیغام رسالت کو صداقت کے ساتھ پہنچایا اور آپ نے لکڑی کی صلیب کو ختم کر دیا اور خوب صاف کر دیا۔

فلو أن رب الناس أبقی نبینا سعِدنا، و لکن أمرہ کان ماضِیا

پس اگر رب العالمین ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو باقی رکھتا تو ہماری سعادت مندی تھی لیکن اس کا امر فیصلہ کن ہے۔

علیك من اللہ السلام تحیۃً و أدخِلت جناتٍ من العَدْن راضِیا

آپ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے صلوٰۃ وسلام ہو اور آپ کو جنات عدن میں داخل کیا جائے اس حال میں کہ آپ راضی اور خوش ہوں۔

أری حسبنا أیتمتہ و ترکتہ یُبَکّی و یدعو جدہ الیوم ناعِیا

میں دیکھ رہی ہوں آپ نے ہی ہمارے حسب کو مکمل کیا ہے اور اسے رلاتے ہوئے چھوڑ دیا ہے اور آج یہ دور اپنے دادا کو پکار رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی تدفین کو کیوں مؤخر کیا گیا حالانکہ آپ نے اہل بیت کو اپنی میتوں کی تدفین کو مؤخر کرنے پر کہا: ''اپنے مردوں کی تدفین میں جلدی کرو اور تم ان میں تاخیر نہ کرو'' (1)۔ تو اس کا جواب تین طرح سے دیا گیا ہے۔

(۱) ایک تو وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ کے وصال فرمانے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین اتفاق نہ تھا۔

(۲) اس لئے کہ وہ اس مقام اور جگہ کو نہ جانتے تھے جہاں وہ آپ کو دفن کریں۔ پس ایک جماعت نے کہا: جنت البقیع میں دفن کیا جائے اور دوسرے گروہ نے کہا: مسجد میں، اور ایک قوم نے کہا: آپ کو روکا جائے گا یہاں تک کہ آپ کو اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی طرف اٹھا لیا جائے، یہاں تک کہ عالم اکبر (مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں) نے کہا: میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ما دفن نبی الا حیث یموت (کسی نبی کو دفن نہیں کیا جاتا مگر اسی جگہ جہاں اس کا وصال ہوتا ہے) اسے ابن ماجہ اور مؤطا وغیرہما نے بیان کیا ہے۔ (2)

(۳) وہ اس اختلاف میں مشغول ہو گئے جو مہاجرین وانصار کے درمیان بیعت کے بارے میں واقع ہوا، پس وہ اس میں غور و فکر کرتے رہے یہاں تک کہ معاملہ واضح ہو گیا اور کام منظم ہو گیا اور حالات پرسکون ہو گئے، اور خلافت اپنے نصاب میں پختہ ہو گئی پس انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی، پھر دوسرے دن ان میں سے ایک جماعت نے برضا و رغبت

1۔ ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 108، کراچی۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1474، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجنائز، صفحہ 212، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1616، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دوسری بیعت کی، پس اللہ تعالیٰ نے آپ کے سبب مرتدین کے فتنہ سے نجات دلائی اور آپ کے سبب دین کو تقویت حاصل ہوئی، والحمد للہ رب العالمین۔ پھر اس کے بعد انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کیا اور آپ کے دفن کے بارے میں غور و فکر کی تب انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غسل دیا اور آپ کو کفن پہنایا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس میں اختلاف ہے کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز جنازہ پڑھی گئی یا نہیں، پس بعض نے کہا ہے: کسی نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز جنازہ نہیں پڑھی بلکہ ہر ایک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگتا رہا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اس سے اشرف و اعلیٰ ہے کہ آپ پر نماز جنازہ پڑھی جائے۔ اور علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ کلام ضعیف ہے، کیونکہ سنت یہی ہے کہ آپ پر نماز جنازہ میں کھڑے ہو کر درود پاک پڑھا جائے گا، جیسا کہ آپ پر دعا میں درود پاک پڑھا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہے: اللّٰھم صلّ علی محمد الی یوم القیامۃ (اے اللہ! حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یوم قیامت تک رحمتیں نازل فرما۔) اور یہ ہمارے لئے بھی باعث نفع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی، کیونکہ وہاں کوئی امام نہ تھا۔ اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ وہ جو انہیں فرض نماز پڑھا رہا تھا وہی اس نماز میں ان کی امامت کراتا رہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انفرادی طور پر نماز پڑھی، کیونکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آخری عہد تھا، چنانچہ انہوں نے چاہا کہ ہر کوئی آپ کی مخصوص برکتیں حاصل کر لے نہ کہ وہ ان میں کسی غیر کے تابع ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن ماجہ نے اسناد حسن بلکہ صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے اور اس میں ہے: جب لوگ منگل کے دن آپ کی تجہیز سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے گھر میں چارپائی پر رکھا گیا، پھر لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گروہ در گروہ داخل ہوئے اور آپ پر صلوٰۃ (درود) پڑھتے رہے، حتیٰ کہ جب وہ فارغ ہوئے تو انہوں نے عورتوں کو وہاں حاضری کا موقع دیا، یہاں تک کہ جب وہ فارغ ہوئیں تو پھر بچوں کو حاضری کی اجازت دی گئی، اور کسی نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لوگوں کی امامت نہیں کرائی۔ اس حدیث کو انہوں نے نصر ابن علی جہضمی سے اس سند کے ساتھ بیان کیا ہے أنبانا وھب بن جریر حدثنا أبی عن محمد بن اسحاق قال حدثنی حسین ابن عبد اللہ عن عکرمۃ عن ابن عباس، الحدیث بطولہ۔ (1)

مسئلہ نمبر 5۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد حالات کی تبدیلی کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو آپ کی آمد سے ہر شے منور و روشن ہو گئی، اور جس دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدینہ طیبہ میں وصال ہوا تو وہاں کی ہر شے تاریک ہو گئی۔ اور ہم نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہاتھ نہیں جھاڑے یہاں تک کہ ہم نے اپنے دلوں کا انکار کر دیا۔

ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے (2) اور کہا ہے: محمد بن بشار، عبد الرحمن بن مہدی، سفیان نے عبد اللہ بن دینار سے اور

1۔ ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 118۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1616، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 119۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1620، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اپنی عورتوں کے ساتھ کلام کرنے اور دل لگی کرنے سے بچتے تھے اس خوف سے کہ کہیں ہمارے بارے میں قرآن نہ نازل ہو جائے، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو پھر ہم کلام کرنے لگے۔ (1)

اور ام سلمہ بنت ابی امیہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسند روایت ہے (کہ انہوں نے کہا) لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو کسی نمازی کی نظر اپنے قدموں سے تجاوز نہ کرتی تھی۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا (عہد) آیا تو لوگوں میں سے جب کوئی نماز کے لئے کھڑا ہوتا تو ان میں سے کسی کی نظر پیشانی رکھنے کی جگہ سے تجاوز نہ کرتی، پھر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا (عہد) آیا تو لوگوں کی حالت یہ تھی کہ ان میں سے جب کوئی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا تو کسی کی نظر قبلہ کی سمت سے نہ پھرتی، پھر جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (کا عہد) آیا تو فتنے برپا ہو گئے اور لوگ نماز میں دائیں بائیں متوجہ ہونے لگے۔ (2)

قولہ تعالیٰ: **اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ** اس میں **اَفَاۡئِنْ مَّاتَ** شرط ہے اور **اَوْ قُتِلَ** اس پر معطوف ہے اور **انْقَلَبْتُمْ** جواب شرط ہے اور حرف استفہام حرف جزا پر داخل ہے کیونکہ شرط اسی کے ساتھ منعقد ہے اور یہ ایک جملہ اور ایک خبر ہو گیا ہے اور معنی یہ ہے: أفتنقلبون علی اعقابکم ان مات أو قتل؟ (کیا تم الٹے پاؤں (دین اسلام سے) پھر جاؤ گے اگر آپ انتقال فرما جائیں یا آپ کو شہید کر دیا جائے) اور اسی طرح (حکم ہے) ہر استفہام کا جو حرف جزا پر داخل ہو، کیونکہ وہ اپنے محل میں نہیں ہوتا، اور اس کا محل یہ ہے کہ وہ جواب شرط سے پہلے ہو۔ اور قول باری تعالیٰ: **انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ** ایک تمثیل ہے، اور اس کا معنی ہے: تم اپنے ایمان کے بعد کفار کی طرف لوٹ جاؤ گے، حضرت قتادہ وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور یہ اس کے بارے کہا جاتا ہے جو اس حالت کی طرف لوٹ آئے جس پر وہ پہلے تھا انقلب علی عقبیبه۔ اور اسی معنی میں نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں انقلاب (لوٹنے) سے مراد شکست کھانا ہے، اور یہ حقیقت ہے نہ کہ مجاز۔ اور یہ قول بھی ہے اس کا معنی ہے تم نے مرتدین کا فعل کیا ہے اگرچہ یہ ردۃ (مرتد ہونا) نہیں۔

قولہ تعالیٰ: **وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا** (اور جو الٹے پاؤں پھرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا) بلکہ اپنی ذات کا نقصان کرے گا اور مخالفت کے سبب اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اسے کوئی طاقت نفع نہیں دے سکتی اور نہ کوئی معصیت اسے کوئی نقصان اور ضرر پہنچا سکتی ہے۔

وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (اور اللہ تعالیٰ جلدی اجر دے گا شکر کرنے والوں کو) یعنی وہ جنہوں نے صبر کیا اور جہاد کیا اور شہید کر دیئے گئے۔ اور **وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ** قول باری تعالیٰ: **فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا** کے بعد آیا ہے اور یہ وعدہ کا وعید کے ساتھ اتصال ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 119۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1621، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابن ماجہ کتاب الجنائز، صفحہ 119، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1623، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَ سَنَجْزِی الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

''اور نہیں ممکن کہ کوئی شخص مرے بغیر اللہ کی اجازت کے۔ لکھا ہوا ہے (موت کا) مقررہ وقت اور جو شخص چاہتا ہے دنیا کا فائدہ، ہم دیتے ہیں اس کو اس سے اور جو شخص چاہتا ہے آخرت کا فائدہ ہم دیتے ہیں اسے اس میں سے اور ہم جلدی اجر دیں گے (اپنے) شکرگزار بندوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا یہ جہاد پر ابھارنا ہے اور اس پر آگاہ کرنا ہے کہ موت لازم اور ضروری ہے اور ہر انسان مقتول ہو یا غیر مقتول وہ مرنے والا ہے جب وہ اپنی (موت کی) لکھی ہوئی مقررہ مدت تک پہنچ جائے کیونکہ مُّؤَجَّلًا کا معنی الی أجل (مقررہ مدت تک) ہے۔ اور بِاِذْنِ اللّٰهِ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی قضا اور اس کی تقدیر سے۔ اور كِتٰبًا مصدر کی بنا پر منصوب ہے یعنی کتب اللہ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا۔ (اللہ تعالیٰ نے موت کا مقررہ وقت لکھ دیا ہے۔) اور أجل الموت سے مراد وہ وقت ہے جو اللہ تعالیٰ سبحانہ کے علم میں ہے، کہ زندہ کی روح اس کے جسم سے جدا ہوگی، اور جب بندہ قتل کیا جاتا ہے تو ہم جان لیتے ہیں کہ وہی اس کی موت کا مقررہ وقت ہے، اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے: اگر اسے قتل نہ کیا جاتا تو وہ زندہ رہتا۔ اور قول باری تعالیٰ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا پر دلیل فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾ (النحل) (پس جب آجاتی ہے ان کی (مقررہ) میعاد تو نہ وہ ایک لحہ پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ آگے ہو سکتے ہیں) اور فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ (العنکبوت:5) (تو (وہ سن لے) کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا وقت ضرور آنے والا ہے) اور لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ (الرعد) (ہر میعاد کے لئے ایک نوشتہ ہے)

اور معتزلی کہتا ہے: موت کا وقت متقدم اور متاخر ہوتا رہتا ہے اور یہ کہ جسے قتل کر دیا جائے وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک ہو جاتا ہے اور اسی طرح ہر وہ حیوان جو ذبح کر دیا جائے تو وہ بھی اپنے مقرر وقت سے پہلے ہلاک ہو گیا، اسی لئے قاتل پر ضمان اور دیت واجب ہوتی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ کوئی نفس اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک نہیں ہوگا۔ اس کا مزید بیان سورہ الاعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس میں علم کے لکھنے اور اسے مدون کرنے پر دلیل موجود ہے اور اس کا بیان سورہ ''طہٰ'' میں اس قول کے تحت آئے گا۔ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا (ثواب الدنیا) سے مراد غنیمت ہے۔ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے غنیمت کی طلب میں مرکز کو چھوڑ دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ہر اس کے بارے میں عام ہے جس نے آخرت کی بجائے صرف دنیا کا ارادہ کیا، اور معنی یہ ہے: ہم اس میں سے اسے وہ دیں گے جو اس کے لئے حصہ مقرر کیا گیا ہے اور قرآن کریم میں ہے: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (الاسراء:18) (جو لوگ طلبگار ہیں صرف دنیا کے ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (ان میں سے) جسے چاہتے ہیں۔) وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ

الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا یعنی ہم اسے اس کے عمل کی جزا عطا فرمائیں گے، اسی طرز پر الله تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ جس کے لئے چاہے گا نیکیاں دوگناہ کر دے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حضرت عبدالله بن جبیر رضی اللہ عنہ اور آپ کے وہ ساتھی ہیں جو مرکز پر ڈٹے رہے یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے۔

وَ سَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ یعنی ہم انہیں ابدی ثواب عطا فرمائیں گے جو ان کے لئے ترک انہزام پر جزا اور بدلہ ہوگا اور یہ سابقہ بیان کی تاکید ہے کہ آخرت میں انہیں مزید عطا کیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ سَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ اور ہم انہیں دنیا میں رزق عطا کریں گے تاکہ یہ وہم نہ کیا جائے کہ شکر گزار اپنے مقسوم سے محروم کر دیا جاتا ہے اس میں سے جسے کافر پالیتا ہے۔

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ ۚ فَمَا وَ هَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ۝۱۴۶ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۝۱۴۷

''اور کتنے ہی نبی گزرے ہیں کہ جہاد کیا ان کے ہمراہ بہت سے الله والوں نے سو نہ ہمت ہاری انہوں نے بوجہ ان تکلیفوں کے جو پہنچی انہیں الله کی راہ میں اور نہ کمزور ہوئے اور نہ انہوں نے ہار مانی اور الله تعالیٰ پیار کرتا ہے (تکلیفوں میں) صبر کرنے والوں سے۔ اور نہیں تھی ان کی گفتگو بغیر اس کے کہ کہا انہوں نے اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے گناہ اور جو زیادتیاں کیں ہم نے اپنے کام میں اور ثابت قدم رکھ ہمیں اور فتح دے ہم کو قوم کفار پر۔''

قولہ تعالیٰ: وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ زہری نے بیان کیا ہے: غزوہ احد کے دن شیطان نے چیخ کر کہا: قتل محمد (محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل کر دیئے گئے) تو اس سے مسلمانوں کی ایک جماعت شکست خوردہ ہوگئی۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: میں پہلا آدمی تھا جس نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا، میں نے خود کے نیچے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کو چمکتے ہوئے دیکھا، تو میں نے اپنی بلند آواز کے ساتھ پکار کر کہا: یہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف اشارہ فرمایا کہ تو خاموش رہ۔ پس الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ ۚ فَمَا وَ هَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا الآیہ۔ اور كَاَیِّنْ بمعنی کم ہے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا ہے: یہ ای ہے اس پر کاف تشبیہ داخل ہوا اور اس کے ساتھ اسے بنایا گیا۔ پس یہ کلام میں کم کے معنی میں ہے۔

اور اسے مصحف میں نون کے ساتھ لکھا گیا ہے، کیونکہ یہ ایک کلمہ ہے اسے اپنے اصل سے نقل کیا گیا ہے پس اس کے معنی کے تغیر کی وجہ سے اس کے لفظ کو بھی بدل دیا گیا ہے، پھر اس کا استعمال کثیر ہے اور عرب تو اس کے ساتھ کھیلتے رہے اور انہوں

نے اس میں قلب اور حذف کا تصرف کیا ہے۔ اور اس میں چار لغات ہیں جن کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔ ابن کثیر نے اسے وکائن، وکاعِن کی مثل فاعل کے وزن پر پڑھا ہے اور اس کی اصل کَیٔ ہے پھر یا کو الف سے بدل دیا گیا جیسا کہ یَیْأس میں تبدیل کیا گیا اور کہا گیا ہے یاءَس۔

شاعر نے کہا ہے:

وَ كَائِنْ بالأَباطِحِ من صَدِيقٍ يَرَانِي لَوْ أُصِبْتُ هو المُصَابَا

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

وَ كَائِن رَدَدْنَا عنكم مِن مُدَجَّجٍ يَجِيءُ أمامَ الرَّكْبِ يَرْدِي مُقَنَّعَا

اور ایک اور نے کہا ہے:

وَ كَائِن فِى المَعاشِرِ من أُنَاسٍ أخوهم فَوْقَهم وهُم كِرامُ

مذکورہ تمام اشعار میں وکائن فاعل کے وزن پر پڑھا گیا ہے۔

اور ابن محیصن نے وکَئِنْ پڑھا ہے یعنی مہموز مقصور ہے جیسا کہ وَکَعِن اور یہ کَائِنْ سے بنایا گیا ہے اور اس کے الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور اس سے وَکَأْیِن بھی ہے جیسا کہ وکَعْیِنْ اور یہ کَیٍّ مخفف کا مقلوب ہے۔ اور باقیوں نے وَکَأَیِّن کَعَیِّنْ کی مثل تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی اصل ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

كَعَأَيِّنْ مِنْ أُنَاسٍ لم يزالوا أخوهم فوقهم و هُمُ كِرامُ

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

كَأَيِّنْ أَبَدْنا من عدوٍ بِعِزِّنَا و كَائِنْ أَجَرْنا من ضَعِيفٍ و خائفٍ

اور اسے دولغتوں کے درمیان جمع کر دیا گیا ہے: کَأَیِّنْ وَ کَائِنْ، اور ایک پانچویں لغت ہے کَیْئِنْ جیسا کہ کَیْعِنْ گویا یہ کَیِّئٍ سے مخفف ہے اور کَأَیِّنْ کا مقلوب ہے۔ علامہ جوہری نے سوائے دولغتوں کے کوئی ذکر نہیں کی: کائِنْ مثلاً کاعِنْ، اور کَأَیِّنْ مثلاً کَعَیِّنْ، آپ کہتے ہیں کَأَیِّنْ رجلا لقیتُ، اس میں رجلاً تمیز کی بنا پر کَأَیِّنْ کے بعد منصوب ہے۔ اور آپ یہ بھی کہتے ہیں: کَأَیِّنْ مِن رجل لقیت، کَأَیِّنْ کے بعد مِن داخل کرنا نصب کی نسبت اکثر اور عمدہ ہے۔ اور بِکَأَیِّنْ تبیع ھذا الثوب؟ معنی بکم تبیع ہے۔ (تم یہ کپڑا کتنے میں بیچو گے)۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

و كَائِنْ ذَعَرْنَا من مَهَاةٍ وَرَامِحٍ بِلَادُ العِدَا لَيْسَتْ له بِبِلادِ

اس میں کَأَیِّنْ بمعنی کم استعمال ہو رہا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: ابو عمرو نے وقف کیا ہے اور وکَأَیٍّ بغیر نون کے پڑھا ہے، کیونکہ یہ تنوین ہے اور سورہ ابن مبارک نے

کسائی سے اسے روایت کیا ہے۔ اور باقیوں نے خط مصحف کی اتباع کرتے ہوئے نون کے ساتھ وقف کیا ہے۔ اور آیت کا معنی مومنوں کو تشجیع دلانا اور انبیاء علیہم السلام کے بہترین متبعین میں سے جو پہلے گزر چکے ہیں ان کی اقتداء اور پیروی کرنے کا حکم دینا ہے، یعنی کثیر انبیاء علیہم السلام ہیں جن کے ساتھ بہت سے اللہ والوں کو شہید کیا گیا یا انبیاء علیہم السلام میں سے کثیر شہید کر دیئے گئے اور ان کی امتیں مرتد نہیں ہوئیں، یہ دو قول ہیں: پہلا حسن اور سعید بن جبیر کا ہے۔ حسن نے کہا ہے: کوئی نبی کسی جنگ میں کبھی شہید نہیں کیا گیا(1)۔ اور ابن جبیر نے کہا ہے: ہم نے نہیں سنا کہ کوئی نبی علیہ السلام جنگ میں شہید کر دیا گیا ہو(2)۔ اور دوسرا قول حضرت قتادہ اور عکرمہ سے منقول ہے۔ اس قول کی بنا پر قُتِلَ پر وقف کرنا جائز ہے، اور یہ قرأت (قُتِلَ) نافع، ابن جبیر، ابو عمرو اور یعقوب کی ہے۔ اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت ہے اور ابو حاتم نے اسے ہی اختیار کیا ہے، اور اس میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ قُتِلَ صرف نبی پر واقع ہو رہا ہے، اور اس صورت میں قُتِلَ پر کلام کی تکمیل ہو جاتی ہے اور کلام میں اضمار ہوگا یعنی و معه ربيون كثير، جیسا کہ کہا جاتا ہے: قُتِلَ الامیرُ معه جیش عظیم، یعنی و معه جیش عظیم۔ اور خرجتُ معی تجارة، ای و معی۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قتل نبی علیہ السلام اور اس کے ساتھ اللہ والوں کو بھی شامل ہو، اور کلام کی توجیہ یہ ہوگی کہ ان میں سے بعض شہید کر دیئے گئے جو اس (نبی علیہ السلام) کے ساتھ تھے، عرب کہتے ہیں: قتلنا بنی تمیم و بنی سلیم، (یعنی) ان میں سے بعض قتل کر دیئے گئے۔ اور قول باری تعالیٰ: فَمَا وَهَنُوْا ان میں سے ماقبی کی طرف راجع ہوگا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول نزول آیت کے ساتھ زیادہ مشابہت اور زیادہ مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم شہید نہیں کئے گئے، بلکہ آپ کے ساتھ آپ کے صحابہ کرام کی ایک جماعت شہید کی گئی۔ اور کوفیوں اور ابن عامر نے قٰتَلَ پڑھا ہے۔

اور یہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے، اور اسے ابو عبید نے اختیار کیا ہے۔ اور کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے جب ان کی مدح اور تعریف کی جنہوں نے جہاد کیا تو جو شہید کر دیئے گئے وہ بھی اس میں داخل ہو گئے۔ اور جب مدح ان کی ہو جو شہید کر دیئے گئے تو پھر ان کے سوا باقی اس میں داخل نہ ہوئے، پس قٰتَلَ اعم(3) اور زیادہ قابل مدح ہے، اور رِبِّيُّوْنَ را کے کسرہ کے ساتھ جمہور کی قرأت ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت را کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے را کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس میں تین لغات ہیں۔ اور رِبِّيُّوْنَ سے مراد بہت سی جماعتیں ہیں، یہ حضرت مجاہد، قتادہ، ضحاک اور عکرمہ سے منقول ہے(4)، ان کا واحد رُبِّی را کے ضمہ اور اس کے کسرہ کے ساتھ ہے، یہ رُبّہ کی طرف منسوب ہے یہ را کے کسرہ کے ساتھ بھی ہے اور را کے ضمہ کے ساتھ بھی۔ اور اس کا معنی ہے جماعت، گروہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الرِّبِّيُّوْنَ سے مراد اُلوف کثیرہ (یعنی کئی ہزار) ہیں(5)۔ اور ابن زید نے کہا ہے: الربيون سے مراد اتباع و پیروی کرنے والے ہیں(6)۔ پہلا معنی لغت میں زیادہ معروف ہے، اور اسی معنی میں (کپڑے کا) وہ ٹکڑا ہے جس میں جوئے کے تیر جمع

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 562 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً

کئے جاتے ہیں اسے رَبَّۃٌ اور رُبَّۃ کہا جاتا ہے۔ اور رِبَاب سے مراد وہ قبائل ہیں جو جمع ہوں۔ اور ابان بن ثعلب نے کہا ہے: الرِّبِّی دس ہزار ہیں۔ اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد صبر کرنے والے علماء ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ، ربیع اور سدی نے کہا ہے: اس سے مراد الجمع الکثیر (بہت بڑا اجتماع) ہے۔

حسان نے کہا ہے:

واذا مَعْشَرٌ تَجَافَوْا عن الحق　　حَمَلْنَا علیهم رُبِّیا

جب لوگ حق سے دور ہو گئے تو ہم نے ان پر جمع کثیر کو مسلط کر دیا۔

اور زجاج نے کہا ہے: یہاں دو قرآتیں ہیں رُبِّیُّوْنَ را کے ضمہ کے ساتھ اور رِبِّیُّوْنَ را کے کسرہ کے ساتھ، رہا رُبِّیُّوْنَ تو اس کا معنی ہے جماعت کثیرہ اور کہا جاتا ہے: دس ہزار۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رَبِّیُّوْنَ را کے فتحہ کے ساتھ یہ رب کی طرف منسوب ہے۔ خلیل نے کہا ہے: الرِّبِّیُّ ان بندوں میں سے ایک جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ڈٹے رہے اور صبر کیا اور وہی ربانیون ہیں ان کی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی معرفت، عبادت اور الوہیت کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: **فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ،** وَهَنُوْا وہ کمزور ہو گئے، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ الوهن کا معنی ہے خوف کے سبب ہمت اور قوت کا ٹوٹ جانا۔ اور حسن اور ابو السمال نے وَهِنُوْا ھا کے کسرہ اور ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ابو زید سے منقول ہیں۔ وهن الشئ یَهِن وهنا۔ اور أوهنته أنا و وَهَّنْتُهٗ اس کا معنی ہے میں نے اسے کمزور کر دیا۔ اور الواهنۃ کا معنی ہے پسلیوں کا نیچے آنا اور ان کا چھوٹا ہونا اور الوهن من الابل سے مراد اونٹ کا بوجھل اور موٹا ہونا ہے اور الوهن سے مراد رات کی وہ ساعت بھی ہے جو گزر جاتی ہے، اور اسی طرح المَوْهن بھی ہے۔ اور أَوْهَنَّا یعنی ہم اس ساعت میں ہو گئے، مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے نبی کے شہید ہونے کی وجہ سے یا ان کے قتل کی وجہ سے جو ان میں شہید کر دیئے گئے ہمت نہ ہاری یعنی ان کے باقی رہنے والوں نے ہمت نہ ہاری، پس اس میں مضاف محذوف ہے۔ **وَمَا ضَعُفُوْا** اور وہ اپنے دشمن کی وجہ سے کمزور نہیں ہوئے۔ **وَمَا اسْتَكَانُوْا** یعنی (انہوں نے ہار نہ مانی) اس تکلیف اور مصیبت کی وجہ سے جو انہیں جہاد میں پہنچی۔ اور الاستکانۃ کا معنی ذلت اور خضوع ہے (یعنی نہ وہ جھکے اور نہ عجز کا اظہار کیا) اور اس کی اصل واسْتَكَنُوْا، افتعلوا کے وزن پر ہے، پھر کاف کے فتحہ میں اشباع کیا گیا تو اس سے الف پیدا ہوا۔

اور جنہوں نے اسے کَوْن سے بنایا ہے تو پھر یہ استفعلوا کے وزن پر ہے۔ (یعنی باب استفعال ہے) اور پہلا آیت کے معنی سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ اور فَمَا وَهْنُوْا وَ مَا ضَعْفُوْا ھا اور عین کے سکون کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور کسائی نے ضَعَفُوا عین کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی اس کے بعد کہ ان میں سے کچھ شہید کر دیئے گئے یا ان کے نبی علیہ السلام کو شہید کر دیا گیا یہ کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ بھاگے نہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو موت پر

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 562

پیش کر دیا، اور انہوں نے مغفرت طلب کی تاکہ ان کی سوت گناہوں سے توبہ ہو جائے اگر انہیں شہادت عطا فرما دی جائے، اور انہوں نے ثابت قدم رہنے کی التجا کی یہاں تک کہ وہ شکست خوردہ نہ ہوئے، اور اپنے دشمنوں کے خلاف فتح و نصرت کی دعا مانگی۔ اور انہوں نے ثبات بالاقدام کو خاص کیا نہ کہ دیگر اعضائے بدن کو اس لئے کہ اعتماد اور انحصار انہی پر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: اے اصحاب محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تم نے اس طرح کیوں کیا اور کہا؟ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا اور انہیں نصرت، فتح، دنیا میں مال غنیمت اور آخرت میں مغفرت عطا فرمائی جب وہ اس کی طرف چلے گئے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے مخلص، توبہ کرنے والے، سچ بولنے والے اور اپنے دین کی مدد و نصرت کرنے والے بندوں کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرتا ہے۔ جو اس کے دشمنوں کے مقابلے میں اس کے سچے وعدہ اور سچے قول کے ساتھ ثابت قدم رہتے ہیں۔ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ یعنی (اللہ تعالیٰ ان سے پیار اور محبت کرتا ہے) جو جہاد میں صبر اختیار کرتے ہیں اور بعض نے وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس میں قول کو کَانَ کا اسم بنایا گیا ہے، سو اس کا معنی ہوگا و ما کان قولهم الا قولهم (اور ان کی کوئی گفتگو نہ تھی سوائے اس قول کے) رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا (اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے) اس میں مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ وَ اِسْرَافَنَا اور جو زیادتیاں ہم نے کی ہیں مراد کبیرہ گناہ ہیں۔ اور اسراف کا معنی ہے: الافراط فی الشیٔ و مجاوزة الحد یعنی کسی شے میں زیادتی کرنا اور حد سے تجاوز کرنا۔ اور صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگتے تھے اللّٰهم اغفرلی خطیئتی و جهلی و اسرافی فی امری و اما انت أعلم به مِنّی (1) (اے اللہ! میری خطائیں، میری جہالت (میری عدم علم) میری اپنے معاملے میں زیادتی اور وہ جسے تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے میری مغفرت اور بخشش فرما۔) اور آگے حدیث ذکر کی (2)۔ چنانچہ انسان پر لازم ہے کہ وہ اس دعا پر عمل کرے جو کتاب اللہ اور صحیح سنت میں ہے اور اس کے سوا کو چھوڑ دے اور یہ نہ کہے: میں اس طرح پسند کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام اور اپنے اولیاء کے لئے پسند فرمایا اور انہیں تعلیم دی کہ وہ کیسے دعا مانگیں۔

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

”تو دے دیا ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا ثواب (یعنی کامیابی) اور عمدہ ثواب آخرت کا (یعنی نعیم جنت اور لذت وصل) اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے نیکوکاروں سے۔“

قولہ تعالیٰ: فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کر دیا ثَوَابَ الدُّنْيَا یعنی دشمنوں کے خلاف مدد و نصرت اور ان پر فتح و کامرانی وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ یعنی جنت اور جحدری نے فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ پڑھا ہے یعنی یہ ثواب سے ماخوذ ہے۔ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوت، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللّٰهم اغفرلی الخ، حدیث نمبر 5919، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعوات والتعوذ باب فی الادعیة، جلد 2 صفحہ 349، اسلام آباد

ایضاً صحیح بخاری، کتاب الدعوات، حدیث نمبر 5919، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

''اے ایمان والو! اگر پیروی کرو گے تم کافروں کی تو وہ پھیر دیں گے تمہیں الٹے پاؤں (کفر کی طرف) تو تم لوٹو گے نقصان اٹھاتے ہوئے۔ بلکہ اللہ حامی ہے تمہارا اور وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے۔''

جب اللہ تعالیٰ نے ان کی اقتدا کا حکم دیا جو انبیاء علیہم السلام کے انصار و معاونین میں سے پہلے گزر چکے ہیں تو کافروں کی طاعت و پیروی سے ڈرایا، کافروں سے مراد مشرکین عرب یعنی ابوسفیان اور اس کے ساتھی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مراد منافقین ہیں انہوں نے مومنین کو ہزیمت کے وقت یہ کہا: تم اپنے آباء واجداد کے دین کی طرف لوٹ آؤ (1)۔ يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ یعنی وہ تمہیں کفر کی طرف پھیر دیں گے۔ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ تو تم لوٹو گے اس حال میں کہ تم خسارے اور نقصان میں ہو گے۔ پھر فرمایا: بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار اور تمہارا محافظ ہے اگر تم اس کی اطاعت کرو گے۔ اور بَلِ اللّٰهَ نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، تقدیر عبارت یہ ہے بل واطیعوا اللہ مولاکم۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

''ابھی ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں رعب اس لئے کہ انہوں نے شریک بنالیا اللہ کے ساتھ اس کو جس کے لئے نہیں اتاری اللہ نے کوئی دلیل اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے اور بہت بری جگہ ہے ظالموں کی۔''

اسی کی مثل ہے وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ ابن عامر اور کسائی نے الرُّعُب عین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور الرُّعْب کا معنی خوف ہے، کہا جاتا ہے: رَعَبْتُه رُعْبا و رُعُبًا، فهو مرعوب۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ الرعب مصدر ہو اور الرُّعُب اسم ہو۔ اور اس کی اصل الملاء سے ہے (بھرنا) کہا جاتا ہے: سَيل راعب يملأ الوادی (یعنی ایسا سیلاب جو وادی کو بھر دے) اور رعبت الحوض کا معنی ہے میں نے حوض کو بھر دیا۔

اور آیت کا معنی ہو گا: ہم عنقریب مشرکین کے دلوں کو خوف اور گھبراہٹ سے بھر دیں گے۔ اور سختیانی نے سَيُلْقِيْ یاء کے ساتھ پڑھا ہے، اور باقیوں نے نون عظمت کے ساتھ پڑھا ہے۔

سدی وغیرہ نے کہا ہے: جب ابوسفیان اور مشرکین احد کے دن مکہ مکرمہ کی طرف متوجہ ہو کر چلے وہ چلتے رہے یہاں تک کہ جب وہ کچھ راستہ طے کر چکے تو نادم اور شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے: ہم نے کہا ہے وہ کتنا برا ہے! ہم نے انہیں قتل کیا ہے یہاں تک کہ جب بکھرے ہوئے چند افراد کے سوا کوئی باقی نہیں رہا تو ہم نے انہیں چھوڑ دیا ہے، واپس چلو اور انہیں مکمل طور پر ہلاک کر دو۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 263

پس جب انہوں نے اس کا عزم وارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب اور خوف ڈال دیا یہاں تک کہ انہوں نے جو قصد کیا تھا اس سے رجوع کر لیا(1)۔ اور القاء درحقیقت اجسام میں استعمال کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ (اور اس نے تختیاں پھینکیں) فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ عِصِيَّهُمْ (الشعراء:44) (تو انہوں نے پھینک دیں اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں میدان میں) فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ (پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا) شاعر نے کہا ہے:

فالقتْ عصاها واستقرّ بها النّوَى

پس اس نے اپنا عصا پھینکا اور اس کے ساتھ گھر ساکن ہو گیا۔

پھر کبھی مجازی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے، اور اس ارشاد میں: وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ (طٰہٰ:39) (اور (اے موسیٰ) میں نے پرتو ڈالا تجھ پر محبت کا اپنی جانب سے) اور القی علیك مسألة (اور اس نے تجھ پر سوال کیا ہے۔)

قولہ تعالیٰ: بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ یہ علت بیان ہو رہی ہے، یعنی ان کے دلوں میں رعب ڈالنے کا سبب ان کا شرک کرنا ہے، اور یہ ما مصدریہ ہے اور کہا جاتا ہے: اَشْرَكَ بِهٖ یعنی اس نے اس کے غیر کو اس کے مساوی قرار دیا تاکہ وہ اسے شریک بنا لے۔

قولہ تعالیٰ: مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا سلطان سے مراد حجۃ اور بیان ہے، اور عذر اور برہان (دلیل) ہے، اسی وجہ سے والی کو سلطان کہا گیا ہے، کیونکہ وہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی حجت ہوتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: یہ سلیط سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد وہ ہے جس سے چراغ روشن کئے جاتے ہیں، اور وہ تلوں کا تیل ہے۔

جیسا کہ امرؤالقیس نے کہا ہے:

أمَالَ السَّلِيطَ بالذُّبَال المُفَتَّلِ

پس سلطان (دلیل) کے ساتھ حق کے اظہار اور باطل کو مٹانے میں روشنی اور نور حاصل کیا جاتا ہے اور کہا گیا ہے: السّلیط کا معنی حدید (لوہا) ہے اور السّلاطَة کا معنی الحدّة (غضب) ہے اور السلاطة تسلیط سے ہے اور اس کا معنی قہر اور غلبہ ہے اور سلطان اسی سے ہے، اس میں نون زائدہ ہے۔ پس سلطان کا اصل معنی قوت ہے، کیونکہ قوت کے ساتھ اسی طرح غلبہ پایا جاتا ہے جس طرح دلیل کے ساتھ غلبہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اور السلیطة کا معنی ہے شور وشغب اور چیخ و پکار کرنے والی عورت۔ اور سلیط سے مراد فصیح اللسان آدمی ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ کسی دین میں بھی بتوں کی عبادت ثابت نہیں، اور اس کے جواز پر عقلی دلیل بھی کوئی نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے انجام اور ان کے لوٹنے کی جگہ کے بارے خبر دی اور فرمایا: وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ (اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے) پھر اس کی مذمت بیان کی اور فرمایا: وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ اور المثوى، مراد وہ جگہ ہے جس میں انہیں رکھا جائے گا، کہا جاتا ہے: ثَوِىَ يَثْوِي ثَوَاءً اور الماوی: اس سے مراد ہر وہ جگہ ہے جس کی طرف کوئی شے رات یا دن کے وقت لوٹ کر آتی ہے۔

1۔ اسباب النزول، صفحہ 83

وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَ عَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِیَبْتَلِیَكُمْ ۚ وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۵۲﴾

''اور بے شک سچ کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ جبکہ تم قتل کر رہے تھے کافروں کو اس کے حکم سے یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے (رسول کے) حکم کے بارے میں اور نافرمانی کی تم نے اس کے بعد کہ اللہ نے دکھا دیا تھا تمہیں جو تم پسند کرتے تھے۔ بعض تم میں سے طلبگار ہیں دنیا کے اور بعض تم میں سے طلبگار ہیں آخرت کے پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ان کے تعاقب سے تاکہ آزمائے تمہیں اور بے شک اس نے معاف فرما دیا تم کو اور اللہ تعالیٰ بہت فضل و کرم فرمانے والا ہے مومنوں پر۔''

محمد بن کعب قرظی نے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوہ احد کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف مراجعت فرما ہوئے اس حال میں کہ انہیں تکلیف اور اذیت پہنچی تھی تو بعض نے بعض کو کہا: کہاں سے یہ اذیت ہمیں پہنچی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ فتح و نصرت کا وعدہ فرمایا تھا! تب یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ اور یہ وہ ہے کہ انہوں نے مشرکوں کے علمبردار کو قتل کیا اور اس کے بعد علم پر ان میں سے سات افراد کو قتل کیا، اور ابتداء میں مسلمانوں کو کامیابی و کامرانی حاصل ہوئی مگر یہ کہ وہ مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اور بعض تیر اندازوں نے بھی مال غنیمت کی طلب میں اپنا مرکز چھوڑ دیا اور وہی ناکامی کا سبب بن گیا۔ بخاری نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب احد کا دن تھا اور ہمارا مشرکین سے آمنا سامنا ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیر اندازوں میں سے کچھ لوگوں کو (ایک درہ میں) بٹھایا اور ان پر حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا اور آپ نے انہیں فرمایا: ''تم اپنی جگہ کو قطعاً نہ چھوڑنا [اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم ان پر غالب آگئے ہیں تو تم اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا] اور اگر تم انہیں دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آ رہے ہیں تو پھر بھی تم ان کے خلاف ہماری مدد نہ کرنا۔'' راوی کا بیان ہے کہ جب جنگ ہوئی اور مسلمانوں نے انہیں شکست سے دوچار کر دیا حتیٰ کہ ہم نے عورتوں کی طرف دیکھا وہ بڑی تیزی سے پہاڑ کی طرف بھاگ رہی ہیں، اور انہوں نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑے اوپر اٹھائے ہوئے ہیں اور ان کے پازیب ظاہر دکھائی دے رہے ہیں تو وہ کہنے لگے: مال غنیمت لوٹ لو مال غنیمت لوٹ لو۔ تو حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: ٹھہر جاؤ، رک جاؤ! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم سے عہد نہیں لیا کہ تم اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا، لیکن وہ چلے گئے پس جب وہ ان کی طرف آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں کو پھیر دیا (2) اور مسلمانوں میں سے ستر افراد شہید کر دیئے گئے۔ پھر ابو سفیان بن حرب ایک بلند جگہ سے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 565۔ ایضاً، اسباب النزول، صفحہ 83

2۔ بخاری کتاب المغازی باب غزوہ احد، حدیث نمبر 3737، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہمارے اوپر جھانکا اور اس نے کہا: کیا قوم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب نہ دینا'' یہاں تک کہ اس نے تین بار پکارا۔ پھر اس نے کہا: کیا قوم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟ تین بار اس نے یہ پوچھا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب نہ دینا'' پھر اس نے کہا: کیا قوم میں عمر [بن خطاب] ہیں؟ اس نے یہ بھی تین بار پوچھا۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب نہ دینا'' پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا: یہ سب لوگ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے آپ پر ضبط نہ رکھ سکے اور کہا: اے اللہ تعالیٰ کے دشمن! تو نے جھوٹ بولا ہے! اللہ تعالیٰ نے تجھے باقی رکھا ہے تا کہ وہ اس طرح تجھے ذلیل ورسوا کرے، تو اس نے کہا: اُعل ھبل: اے ھبل تو بلند ہو گیا (غالب آ گیا) یہ جملہ اس نے دوبارہ کہا۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب دو'' تو صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم کیا کہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم کہو اللہ اعلیٰ و اجل'' اللہ تعالیٰ بلند و برتر اور بزرگ ہے۔

ابوسفیان نے کہا: لنا عزّٰی و لا عزّٰی لکم (ہمارے لئے تو عزّٰی ہے اور تمہارے لئے کوئی عزّٰی نہیں) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب دو'' صحابہ نے عرض کی: ہم کیا کہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو آپ نے فرمایا: تم کہو اللّٰہُ مولانا و لا مولیٰ لکم۔ اللہ تعالیٰ ہمارا مولیٰ ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ نہیں۔ ابوسفیان نے کہا: آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے، اور جنگ تو ڈول کی مانند ہے (یعنی اس کا نتیجہ کبھی ایک فریق کے حق میں ہوتا ہے کبھی دوسرے فریق کے حق میں جس طرح ڈول میں پانی کبھی زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کم) بلاشبہ تم قوم میں ایسے مقتول پاؤ گے جن کا مثلہ کر دیا گیا ہے میں نے اس کے بارے حکم نہیں دیا لہٰذا تم مجھے برا نہ کہنا(1)۔ اور بخاری اور مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: میں نے احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں اور بائیں جانب دو آدمی دیکھے وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شدید ترین جنگ لڑ رہے تھے اور حضرت سعد سے ایک روایت میں ہے، ان دونوں پر سفید لباس تھا میں نے ان دونوں کو نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا اور نہ بعد میں۔ مراد حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت میکائیل علیہ السلام ہیں (2)۔ اور دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: یقاتلان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشدّ القتال ما رأیتھما قبل ذالك الیوم ولا بعدہ۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ملائکہ نے مسلمانوں کی معیت میں اس دن جنگ نہیں لڑی، اور نہ اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد سوائے یوم بدر کے۔ علامہ بیہقی نے کہا ہے: حضرت مجاہدؒ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ملائکہ نے احد کے دن اس قوم کی طرف سے جنگ نہیں لڑی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اور وہ اس حکم پر قائم نہیں رہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا۔

اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان سے صبر وتقویٰ کی شرط پر وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی مدد کرے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔ اور وہ اس نے پورا کر دیا، اور جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی کی

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی باب غزوہ احد وقول اللہ تعالیٰ، جلد 2، صفحہ 579، قدیمی کتب خانہ کراچی
ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 3737، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 252، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث 3748، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور انہوں نے اپنی صفوں کو چھوڑ دیا اور تیر اندازوں نے بھی اس عہد کو ترک کر دیا جو رسول اللہ ﷺ نے ان سے لیا تھا کہ وہ اپنی جگہ کو ہرگز نہ چھوڑیں، اور انہوں نے دنیا کا ارادہ کیا تو ان سے ملائکہ کی مدد اٹھالی گئی، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ تو اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچ کر دیا اور انہیں فتح دکھا دی، اور جب انہوں نے نافرمانی کی تو اس کے بعد ان پر آزمائش اور بلا کو مسلط کر دیا۔

اور عمر بن اسحاق نے کہا ہے: جب احد کا دن تھا وہ رسول اللہ ﷺ سے بکھر گئے اور حضرت سعد آپ کے سامنے تیر پھینک رہے تھے اور ایک نوجوان انہیں تیر پکڑا رہا تھا جب بھی کوئی تیر چلا جاتا تو وہ تیر انہیں دیتا۔ اور کہتا: اے ابا اسحاق! تیر چلاؤ۔ پس جب فارغ ہوئے انہوں نے دیکھا وہ جوان کون ہے؟ تو نہ انہوں نے اسے دیکھا اور نہ اسے پہچانا۔ محمد بن کعب نے کہا ہے: جب مشرکوں کا علمبردار قتل ہو گیا اور ان کا جھنڈا گر گیا، تو اسے عمرۃ بنت علقمہ حارثیہ نے اٹھایا تھا۔

اس بارے میں حضرت حسان کہتے ہیں:

فلولا لواءُ الحارثية أصبحوا　　يباعُون في الأسواق بيْعَ الجلائب

پس اگر عمرہ حارثیہ کا جھنڈا نہ ہوتا تو انہیں بازاروں میں سامان تجارت کی طرح فروخت کر دیا جاتا۔

اور تَحُسُّوْنَهُمْ کا معنی ہے تم انہیں قتل کر رہے تھے اور تم ان کا نام و نشان مٹا رہے تھے۔

شاعر نے کہا ہے:

حَسَسْناهم بالسَّيف حَسًّا فأصبحت　　بقيَّتهم قد شُرِّدُوا او تَبَدَّدُوْا

ہم نے تلوار کے ساتھ ان کا نام و نشان مٹا دیا ہے پس ان کے بقیہ رہنے والوں کو بھگا دیا گیا ہے یا وہ بکھر گئے ہیں۔

اور جریر نے کہا ہے:

تحُسُّهم السيوف كما تَسامَى　　حريق النار في الأجم الحصيد

اس میں بھی تَحُسُّهُمْ کلی طور پر ختم کر دینے اور نام و نشان مٹا دینے کے معنی میں ہے۔

ابوعبید نے کہا ہے: الحَسّ کا معنی ہے قتل کے ساتھ ہلاک و برباد کر دینا(1)، کہا جاتا ہے: جراد محسوس جب سردی اسے قتل اور تباہ کر دے۔ اور البرد مَحَسَّةٌ للنبت یعنی سردی نباتات کو جلا کر ختم کر دینے والی ہے۔ اور سَنَةٌ حَسُوس یعنی خشک سالی ہر شے کو کھا جاتی ہے۔ رؤبہ نے کہا ہے:

اذا شكونا سَنَةً حَسُوسا　　تاكل بعد الأخضر اليَبِسَا

جب ہم شکوہ کرتے خشک سالی کا جو کہ سبزی کے بعد خشکی کو بھی کھا جاتی ہے اور اس کی اصل الحس سے ہے جس کا معنی ہے حاسہ کے ساتھ کسی شے کا ادراک کرنا۔ پس حَسَّهٗ کا معنی ہے اس نے اس کی حس کو قتل کے سبب ختم کر دیا۔ بِاِذْنِهٖ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم سے یا اس کی قضا اور امر سے۔ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ یعنی جب تم بزدل ہو گئے اور تم کمزور ہو گئے۔ کہا جاتا ہے: فَشِلَ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 566

یَفْشَلُ فھو فَشِلٌ و فَشْل۔ اور حَتّٰی کا جواب محذوف ہے ای حتّٰی اذا فشلتم امتُحِنتم۔ (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے تو تم امتحان میں ڈال دیئے گئے) اور اس کی مثل جائز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ (الانعام: 35) فافعل۔ (تو اگر آپ سے ہو سکے تو تلاش کر لو کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی آسمان میں (تو اس پر چڑھ جاؤ)

اور فراء نے کہا ہے: حَتّٰی کا جواب وَ تَنَازَعْتُمْ ہے اور واؤ مقحمہ زائدہ ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَ نَادَيْنٰهُ ای نادیناہ (یعنی اس میں بھی واؤ مقحمہ زائدہ ہے) اور امرؤ القیس نے کہا ہے:

فلمّا أجزنا ساحَةَ الحَيّ وانتَحَى ای انتَحی

اس میں بھی واؤ زائدہ ہے۔ اور ان کے نزدیک وَ عَصَيْتُمْ میں بھی واؤ کو مقحمہ قرار دینا جائز ہے۔ یعنی حتی اذا فشلتم و تنازعتم عصیتم۔ (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے (رسول کے) حکم کے بارے میں تو تم نے نافرمانی کی۔) اور اس بنا پر اس میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی حتی اذا تنازعتم و عصیتم فشِلتم (یہاں تک کہ جب تم جھگڑنے لگے اور تم نے نافرمانی کی تو تم بزدل ہو گئے۔)

اور ابو علی نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ جواب صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ ہو، اور ثُمَّ زائدہ ہو، اور تقدیر کلام یہ ہو حتی اذا فشلتم و تنازعتم و عصیتم صرفکم عنھم (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے اور تم نے نافرمانی کی تو اس نے تم کو ان سے پھیر دیا۔)

اور بعض نحویوں نے اس کے زائدہ ہونے میں شاعر کا قول بیان کیا ہے:

أراني اذا ما بِتُّ بِتّ على هَوًى　　فثُمّ اذا أصبحتُ اصبحتُ عاديا

اور اخفش نے اس کے زائدہ ہونے کو جائز قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ (التوبۃ: 118) (یہاں تک کہ جب تنگ ہو گئی ان پر زمین باوجود کشادگی کے اور بوجھ بن گئیں ان پر ان کی جانیں اور جان لیا انہوں نے کہ نہیں کوئی جائے پناہ اللہ سے مگر اسی کی ذات۔ تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بکرم ہوا۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حَتّٰی بمعنی الٰی ہے اور اس وقت اس کا کوئی جواب نہ ہو گا، یعنی صدقکم اللہُ وعدہ الی اَن فشلتم، (اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دیا یہاں تک کہ تم بزدل ہو گئے) یعنی وہ وعدہ ثابت قدم رہنے کی شرط کے ساتھ تھا۔ اور تَنَازَعْتُمْ کا معنی ہے اختلفتم (تم اختلاف کرنے لگے) یعنی اس وقت تیر اندازوں میں سے بعض نے کہا: ہم غنائم کو جا ملیں گے (یعنی مال غنیمت جمع کریں گے) اور بعض نے کہا: بلکہ ہم تو اسی جگہ ثابت قدم رہیں گے جہاں ثابت رہنے کا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے۔

مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ یعنی وہ غلبہ جو احد کے دن مسلمانوں کو ابتدائی مرحلہ میں ہی حاصل ہو گیا، اور یہ اس وقت

حاصل ہوا جبکہ مشرکین کا علمبردار پچھاڑ (قتل کر) دیا گیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، اور اسے جونہی قتل کیا گیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب منتشر ہو گئے اور وہ متفرق گروہوں میں بٹ گئے اور انہوں نے دشمن پر شدید حملے کئے یہاں تک کہ انہوں نے انہیں اپنے ساز و سامان سے محروم کر دیا۔ اور مشرک گھوڑ سواروں نے مسلمانوں پر تین بار حملہ کیا ہر بار تیروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا گیا پس وہ مغلوب ہو کر واپس لوٹے اور مسلمانوں نے حملہ کیا اور انہوں نے ان کو خوب قتل کیا۔ پس جب پچاس تیر اندازوں نے یہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بھائیوں کو فتح عطا فرمادی ہے تو انہوں نے کہا: قسم بخدا! ہم یہاں کسی کام کے لئے نہیں بیٹھے رہیں گے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے دشمن کو ہلاک کر دیا ہے اور ہمارے بھائی مشرکوں کے لشکر میں ہیں۔ اور ان میں سے کچھ گروہوں نے کہا: ہم کیونکر ٹھہرے رہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست سے دوچار کر دیا ہے؟ چنانچہ انہوں نے اپنے ان مقامات کو چھوڑ دیا جن کے بارے میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ انہیں قطعاً نہ چھوڑیں۔ اور وہ آپس میں جھگڑا کرنے لگے اور بزدل ہو گئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی پس گھوڑ سوار تیز رفتاری کے ساتھ قتال کرتے ہوئے ان میں آ پہنچے۔ آیت کے الفاظ ان کے لئے زجر و توبیخ کا تقاضا کرتے ہیں، اور ان کو جھڑکنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مدد و نصرت کی مبادی کو دیکھ لیا تھا، پس ان کے لئے یہ جاننا واجب تھا کہ فتح و نصرت کی تکمیل ثابت قدم رہنے میں ہے نہ کہ انہزام میں، پھر جھگڑے کا سبب بیان کیا اور فرمایا: مِنۡكُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الدُّنۡیَا تم میں سے بعض دنیا یعنی مال غنیمت کے طلبگار ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ہم نہیں جانتے تھے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کوئی دنیا اور اس کے ساز و سامان کی خواہش رکھتا ہے یہاں تک کہ احد کا دن آ گیا (تب ہمیں اس کا احساس ہوا) وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الۡاٰخِرَةَ اور تم میں سے بعض آخرت کے طلبگار ہیں (1) اور وہ وہ ہیں جو اپنے مرکز میں ثابت قدم رہے، اور انہوں نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بارے میں اپنے امیر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ سے کوئی مخالفت نہ کی، اور خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل نے ان پر حملہ کر دیا، اس وقت یہ دونوں کافر تھے اور انہوں نے آپ کو اپنے باقی ساتھیوں سمیت شہید کر دیا۔ رحمہم اللہ۔

اور یہ عتاب ان کے ساتھ ہے جنہوں نے اپنے مقام کو چھوڑا نہ کہ ان کے ساتھ جو ثابت قدم رہے کیونکہ جو ثابت رہے وہ تو ثواب کے ساتھ کامیاب و کامران تھے، اور یہ اسی طرح ہے جیسے جب کسی قوم پر عام عذاب نازل ہو تو نیکوکار اور بچے بھی ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن جو ان پر نازل ہوا وہ عذاب اور سزا نہیں ہوتی بلکہ ان کے لئے اجر و ثواب کا سبب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ صَرَفَكُمۡ عَنۡهُمۡ لِیَبۡتَلِیَكُمۡ (پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ان کے تعاقب سے تاکہ تمہیں آزمائے) یعنی اس کے بعد کہ تم ان پر غلبہ حاصل کر چکے تھے تمہیں ان سے ناکامی کے ساتھ واپس لوٹا دیا اور یہ اس پر دلیل ہے کہ معصیت اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اور معتزلہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے پھر تم واپس لوٹ آئے، انصرفتم، پس اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اضافت کافروں کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب اور خوف نکالنے کے اعتبار سے ہے مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالنے کے لئے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: یہ انہیں کوئی فائدہ نہیں دیتا، کیونکہ کافروں کے دلوں سے رعب اور خوف نکالنا یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کو

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 566

حقیر سمجھنے لگیں قبیح اور برا ہے اور ان کے نزدیک بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبیح (فعل) واقع ہو، تو پھر اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ کا کوئی معنی باقی نہ رہے گا۔ اور یہ قول بھی ہے: صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ کا معنی ہے اس نے تمہیں ان کی طلب اور تعاقب کا پابند نہیں بنایا۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اس نے تمہیں معصیت اور مخالفت کے بعد ہلاک اور تباہ نہیں کیا۔ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب تمام کے لئے ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ان تیراندازوں کے لئے ہے جنہوں نے اس حکم کی مخالفت کی جو انہیں دیا گیا۔ اسے نحاس نے اختیار کیا ہے اور اکثر مفسرین نے کہا ہے: اس آیت کی نظیر یہ قول ہے: ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ (البقرہ:52) (پھر بھی درگزر فرمایا ہم نے تم سے) وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اور اللہ تعالیٰ عفو و مغفرت کے ساتھ مومنوں پر فضل و کرم فرمانے والا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی بھی جگہ ایسی مدد نہیں کی گئی جیسی احد کے دن مدد کی گئی، فرمایا: اور ہم نے اس کا انکار کیا، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میرے اور اس کے درمیان جس نے انکار کیا یہ کتاب اللہ ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ یوم احد کے بارے فرماتا ہے: وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ الحس سے مراد قتل کرنا ہے۔ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَ عَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِیَبْتَلِیَكُمْ ۚ وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ بلاشبہ اس سے مراد تیرانداز ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ایک جگہ میں کھڑا کیا پھر ارشاد فرمایا: ''تم ہماری پشتوں کی حفاظت کرو پس اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم قتل کر رہے ہیں تو تم ہماری مدد نہ کرنا اور اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم مال غنیمت اکٹھا کر رہے ہیں تو تم ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا۔'' پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کامیاب ہو گئے اور مشرکین کے لشکر کو مباح قرار دیا تو تمام تیرانداز واپس لوٹ آئے اور لشکر میں داخل ہو گئے اور مال غنیمت لوٹنے لگے، تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی صفیں جڑ گئیں، پس وہ اس طرح ہو گئے اور آپ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کا جال بنایا...... اور وہ آپس میں مل گئے (یعنی خلط ملط ہو گئے) پس جب تیراندازوں نے اس درہ کو خالی کر دیا جس میں وہ تھے تو گھوڑ سوار اسی راستے سے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر داخل ہو گئے اور بعض نے بعض کو مارا اور آپس میں خلط ملط ہو گئے۔ اور مسلمانوں میں سے بہت سے لوگ شہید ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے لئے ابھی دن کی ابتدا تھی یہاں تک کہ مشرکین کے سات یا نو علمبردار قتل کر دیئے گئے اور مسلمان پہاڑ کی طرف چلے گئے، اور وہ وہاں تک نہ پہنچے جسے لوگ الغار کہتے ہیں، بلاشبہ وہ مہراس (جبل احد کے ساتھ پانی کا چشمہ) کے نیچے رہے اور شیطان چیخ اٹھا: قتل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کر دیا گیا) اور اس میں کوئی شک نہ کیا گیا کہ وہ حق اور سچ ہے۔ پس ہم اسی طرح رہے اور ہم آپ کے شہید ہونے کے بارے شک نہ کرتے تھے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو سعدوں (حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ) کے درمیان ہم پر ظاہر ہوئے جب آپ چلے تو ہم آپ

کو اپنے قدموں کی طرف جھکنے کے سبب پہچان گئے۔ تو ہم اتنا خوش ہوئے گویا ہمیں (اس میں سے) کوئی مصیبت پہنچی ہی نہیں جو مصیبت ہمیں آئی تھی۔ راوی نے بیان کیا: پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری طرف چڑھے اور آپ فرما رہے تھے: اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا شدید غضب ہو جنہوں نے اپنے نبی کے چہرہ کو خون آلود کیا(1)''۔ اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: مسلمانوں میں سے سب سے پہلے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچانا تھا، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ کی آنکھوں سے پہچانا تھا جو خود کے نیچے سے روشن اور ظاہر تھیں تو میں نے اپنی بلند آواز سے ندا لگائی: اے مسلمانوں کے گروہ! تمہیں بشارت ہو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں آپ تشریف لا چکے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری طرف اشارہ کیا کہ تو خاموش رہ۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُنَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٥٣﴾

''یاد کرو جب تم دور بھاگے جا رہے تھے اور مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے کسی کو اور رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بلا رہے تھے تمہیں پیچھے سے پس اللہ نے پہنچایا تمہیں غم کے بدلے غم تاکہ تم نہ غمگین ہو اس چیز پر جو کھو گئی ہے تم سے اور نہ اس مصیبت پر جو پہنچی ہے تمہیں اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔''

اِذْ قول باری تعالیٰ: وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ کے متعلق ہے۔ عام قرأت تُصْعِدُوْنَ تا کے ضمہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور ابو رجا العطاردی، ابو عبدالرحمٰن سلمی، حسن اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم نے تا اور عین دونوں کو مفتوح پڑھا ہے(2) یعنی تَصْعَدُوْنَ الجبل (تم پہاڑ پر چڑھ رہے تھے)۔ ابن محیصن اور شبل نے اذ یصعدون ولا یلوون دونوں فعلوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن نے تلون ایک واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوبکر بن عیاش نے عاصم سے ولا تُلْوُوْنَ تا کو ضمہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور یہ لغت شاذہ ہے، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: اصعدت (کہا جائے گا) جب تو اپنے چہرے کو پھیرتے ہوئے گزر جائے، اور صعدت (کہا جاتا ہے) جب تو پہاڑ یا کسی اور پر چڑھے، بلند ہو(3)۔

پس الاصعاد کا معنی ہموار زمین میں اور وادیوں اور گھاٹیوں کے بطن میں چلنا ہے اور الصعود کا معنی پہاڑوں، چھتوں، سیڑھیوں اور راستوں پر چڑھنا اور بلند ہونا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان کا پہاڑ پر چڑھنا وادی میں چلنے کے بعد ہو، پس تُصْعِدُوْنَ اور تَصْعَدُوْنَ دونوں قرأتوں کے مطابق معنی صحیح ہوگا۔

حضرت قتادہ اور حضرت ربیع نے بیان کیا ہے کہ وہ احد کے دن وادی میں چلے۔ اور حضرت ابی کی قرأت اِذْ تُصْعِدُوْنَ فِي الْوَادِي ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ احد میں فرار ہو کر چڑھے۔ نتیجتاً دونوں قرأتیں صحیح ہیں، اس دن شکست کھانے والے چلنے اور چڑھنے والے تھے۔ واللہ اعلم۔

مبرد اور قتبی نے کہا ہے: اصعد کا معنی ہے جب وہ جانے میں خوب دور ہو جائے(4)، پس اصعاد زمین میں خوب دور

1۔ المستدرک علی الصحیحین، کتاب تفسیر باب آل عمران، جلد 2، صفحہ 325-324، دار الکتب العلمیہ

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 567	3۔ ایضاً	4۔ ایضاً

چلے جانے کو کہتے ہیں اور یہ بلندی کی جانب خوب چڑھنے کی طرح ہے۔
شاعر نے کہا ہے:

الا أيهذا السائلي أين أصعدت فإن لها من بطن يثرب موعدا

خبردار! اے مجھ سے سوال کرنے والے تو کہاں دور چلا گیا ہے کیونکہ اس کے لئے وادی یثرب جائے وعدہ ہے۔
اور فراء نے کہا ہے: اصعاد کا معنی سفر کو شروع کرنا اور اس کا آغاز کرنا ہے اور انحدار کا معنی سفر سے واپس لوٹنا ہے، کہا جاتا ہے: اصعدنا من بغداد الی مکۃ والی خراسان اور اسی کے مشابہ جبکہ ہم اس کی طرف نکلیں اور سفر شروع کر دیں۔
اور انحدرنا جب ہم واپس لوٹیں۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے:

قد كنتِ تبكين على الاصعاد فاليوم سُرّحتِ و صاح الحادي

اس میں اصعاد سفر شروع کرنے کے معنی میں ہے۔
اور مفضل نے کہا ہے: صعد، اصعد اور صعّد تینوں کا معنی ایک ہے (1) اور تلودن کا معنی ہے تعرجون و تقیمون، یعنی تم میں سے بعض بعض کی طرف متوجہ نہیں ہوتے بھاگتے ہوئے (یعنی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تک نہیں۔) کیونکہ کسی شے کی طرف متوجہ ہونے والا اس کی طرف اپنی گردن کو موڑتا ہے یا اپنی سواری کی لگام کو موڑتا ہے۔ عَلٰٓی اَحَدٍ مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، کلبی نے یہی کہا ہے۔ وَّ الرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْٓ اُخْرٰىكُمْ ای فی اخرٰکم (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں پیچھے سے بلا رہے تھے) کہا جاتا ہے: جاء فلان فی آخر الناس أُخرة الناس و أُخری الناس و أُخریات الناس (یعنی فلاں لوگوں کے آخر میں آیا، پیچھے آیا) اور بخاری میں ہے اُخْرٰىكُمْ آخر کم کی تانیث ہے: عمرو بن خالد، زہیر اور ابو اسحاق نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے سنا انہوں نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احد کے دن کچھ لوگوں پر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا اور وہ بھاگ کر آ گئے جبکہ ان کے پیچھے رہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو بلاتے رہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سوائے بارہ افراد کے کوئی باقی نہ رہا (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ پکار منکر (گناہ) کو تبدیل کرنے کے لئے تھی، کیونکہ یہ محال ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منکر جو کہ بھاگنا ہے کو دیکھیں اور پھر اس سے منع نہ کریں۔
میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس بنا پر ہے کہ انہزام معصیت ہو اور اس طرح ہے نہیں، اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔
قولہ تعالیٰ: فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لغت میں غم کا معنی ہے التغطیۃ (ڈھانپنا) غممت الشئ کا معنی ہے میں نے اسے ڈھانپ لیا۔ اور یوم غمّ و لیلۃ غمّۃ (کہا جاتا ہے) جبکہ دن اور رات دونوں تاریک ہوں اور اسی سے غم الھلال بھی ہے جب چاند دکھائی نہ دے، اور غَمّنِي الأمر يغمّني (کام نے مجھے ڈھانپ لیا [یعنی مجھ پر غالب آ گیا])
حضرت مجاہد اور قتادہ وغیرہما نے کہا ہے: پہلا غم تو مقتول ہونا اور زخمی ہونا تھا، اور دوسرا غم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 567
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ والرسول یدعوکم، جلد 2، صفحہ 655، اسلام آباد

کی خبر نے ان میں اضطراب پیدا کر دیا، جبکہ شیطان نے اس کے بارے چیخ کر کہا۔ اور بعض نے یہ کہا ہے: پہلا غم وہ ہے جو فتح وکامرانی اور مال غنیمت ان سے کھو گیا اور دوسرا وہ جو قتل اور ہزیمت کا انہیں سامنا ہوا۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ پہلا غم ہزیمت ہے، اور دوسرا ابو سفیان اور خالد بن ولید کا ان پر پہاڑ سے جھانکنا ہے۔ پس جب مسلمانوں نے ان کی طرف دیکھا تو اس نے انہیں غمزدہ کر دیا، اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ ان پر جھانک رہے ہیں اور وہ انہیں قتل کریں گے پس اس نے انہیں وہ کچھ بھلا دیا جو انہیں حاصل ہوا تھا، تو اس وقت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ دعا مانگی: اللّٰھم لا یعلن علینا (اے اللہ! کوئی ہم پر غالب نہ آئے) جب کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس بنا پر بِغَمٍّ میں با بمعنی علیٰ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اپنے باب (اصل معنی) پر ہے اور معنی یہ ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنی مخالفت کے سبب غمزدہ کیا پس اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں غم پہنچایا اس غم کے بدلے جو ان کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پہنچایا گیا۔ اور حسن نے کہا ہے: فَاَثَابَكُمْ غَمًّا پس اللہ تعالیٰ نے تمہیں احد کے دن غم پہنچایا بِغَمٍّ اس کے بدلے جو غم بدر کے دن مشرکین کو پہنچا۔ اور غم کو ثواب کا نام دیا گیا ہے جس طرح کہ گناہ کی جزا کو ذنب کا نام دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہ پر آگاہ کر دیا پس وہ اس کے سبب اس مصیبت میں مشغول ہو گئے جو انہیں پہنچی تھی۔ قولہ تعالیٰ: لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ اس میں لام قول باری تعالیٰ: وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ کے متعلق ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ کے متعلق ہے یعنی یہ غم اس غم کے بعد تھا تاکہ تم غمگین نہ ہو اس پر جو مال غنیمت تم سے کھو گیا، اور نہ اس مصیبت پر جو ہزیمت اور شکست کی صورت میں انہیں پہنچی۔

پہلا قول زیادہ اچھا ہے اور قول باری تعالیٰ: مَاۤ اَصَابَكُمْ میں مَا محل جر میں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لا صلہ ہے۔ یعنی لکی تحزنوا علی ما فاتکم و ما اصابکم عقوبۃ لکم علی مخالفتکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ (تاکہ تم اس پر غمگین نہ ہو جو تم سے (مال غنیمت) کھو گیا اور جو مصیبت تم کو پہنچی اس بنا پر کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مخالفت کی)

اور یہ اس قول کی مثل ہے: مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (الاعراف: 12) ای ان تسجد (کس چیز نے روکا تجھے اس سے کہ تو سجدہ کرے جب میں نے حکم دیا تجھے) اور اس قول کی مثل ہے لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ (الحدید: 29) ای لیعلم (تم پر یہ خصوصی کرم اس لئے کیا تاکہ جان لیں اہل کتاب) یہ مفضل کا قول ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ سے مراد یہ ہے کہ تم پر لگاتار غم آئے تاکہ تم اس کے بعد غنائم کے بارے میں (کسی فکر میں) مشغول نہ ہو۔ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ اس میں تحذیر اور وعید کا معنی ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۤىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَاۤىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

''پھر اتاری اللہ تعالیٰ نے تم پر غم واندوہ کے بعد راحت (یعنی) غنودگی جو چھا رہی تھی ایک گروہ پر تم میں سے اور ایک جماعت ایسی تھی جسے فکر پڑا ہوا تھا (صرف) اپنی جانوں کا بدگمانی کر رہے تھے اللہ کے ساتھ بلا وجہ عہد جاہلیت کی بدگمانی، کہتے: کیا ہمارا بھی اس کام میں کچھ دخل ہے آپ فرمایئے: اختیار تو سارا اللہ کا ہے چھپائے ہوئے ہیں اپنے دلوں میں جو ظاہر نہیں کرتے آپ پر۔ کہتے ہیں: (اپنے دلوں میں) اگر ہوتا ہمارا اس کام میں کچھ دخل تو نہ مارے جاتے ہم یہاں (اس بے دردی سے) آپ فرمایئے کہ اگر تم (بیٹھے) ہوتے اپنے گھروں میں تو ضرور نکل آتے۔ (وہاں سے) وہ لوگ، لکھا جا چکا ہے جن کا قتل ہونا اپنی قتل گاہوں کی طرف (یہ سارے مصائب اس لئے تھے) تاکہ آزمالے اللہ تعالیٰ جو کچھ تمہارے سینوں میں (چھپا) تھا اور صاف کردے جو (میل کچیل) تمہارے دلوں میں تھا اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے سینوں کے رازوں کا۔''

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا، اَمَنَةً اور اَمْنٌ دونوں مساوی اور ہم معنی ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَمَنَةً (راحت) اسباب خوف کے ساتھ ہوتی ہے، اور امن خوف نہ ہونے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور یہ (اَمَنَةً) منصوب ہے۔ اَنْزَلَ کے سبب، اور نُّعَاسًا اس (اَمَنَةً) سے بدل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے مفعول لہ کی بنا پر نصب دی گئی ہے، گویا کہ یہ کہا ہے: انزل علیکم للأمنة نعاسا، (پھر تم پر راحت کے لئے غنودگی اتاری)۔ ابن محیصن نے اَمْنَةً میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے احد کے دن ان غموں کے بعد مومنین پر غنودگی کے ساتھ فضل واحسان فرمایا یہاں تک کہ ان میں سے اکثر سو گئے، بلاشبہ سوتا وہی ہے جو امن وسکون میں ہوتا ہے اور خوفزدہ آدمی سو نہیں سکتا۔ بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمارے اوپر غنودگی اور نیند طاری ہوگئی احد کے دن حالانکہ ہم اپنی صفوں میں تھے، انہوں نے بیان کیا: پس میری تلوار میرے ہاتھ سے گرنے لگتی تو میں اسے اٹھا لیتا اور کبھی وہ گر جاتی اور میں اسے اٹھا لیتا۔ (1)

يَغْشٰى اسے تا اور یا دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اگر یا کے ساتھ ہو تو ضمیر کا مرجع نعاس ہوگا، اور اگر تا کے ساتھ ہو تو ضمیر کا مرجع امنۃ ہوگا۔ اور الطائفۃ کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے۔ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ مراد منافقین ہیں یعنی معتب بن قشیر اور اس کے ساتھی، وہ مال غنیمت کے طمع اور مومنین کے خوف میں نکلے تو نیند ان پر طاری نہ ہوئی اور وہ اپنی حاضری پر تاسف کرنے لگے، اور وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے اور وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ کا معنی ہے اس نے انہیں غم پر ابھارا

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب قولہ اَمَنَةً نُّعَاسًا، جلد 2، صفحہ 655

اور غم وہ ہے جس کا قصد کیا گیا، کہا جاتا ہے: أهمني الشئ یعنی وہ میرا غم اور فکر ہے اور أمر مهم: انتہائی سخت اور شدید معاملہ۔ اور اهمني الأمر۔ أمر نے مجھے غم اور اضطراب میں ڈال دیا، اور هَمَّنِي کا معنی ہے اذابني اس نے مجھے پگھلا دیا۔ اور وَ طَآئِفَةٌ میں واؤ حالیہ ہے اور بمعنی اذ ہے۔ یعنی اذ طائفةٌ یظنون جبکہ ایک جماعت بدگمانی کرنے لگی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا امر باطل ہے اور یہ کہ ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ ظَنَّ الجاهلية یعنی اہل جاہلیت کی بدگمانی۔ اور اس سے مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔

يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ اس میں لفظ استفہام ہے اور اس کا معنی انکار ہے، یعنی ما لنا شئ من الامر، (ہمارا اس کام میں کوئی دخل نہیں) یعنی خروج کے معاملہ میں، بلاشبہ ہمیں تو بالاکراہ نکالا گیا ہے، اور اس پر ان کی طرف سے بطور خبر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا (اگر ہمارا اس کام میں کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں (اس بے دردی سے) نہ مارے جاتے۔) حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس دن ہم پر نیند طاری کر دی گئی، اور میں معتب بن قشیر کا قول سن رہا تھا حالانکہ مجھ پر نیند غالب آ رہی تھی وہ کہہ رہا تھا: اگر ہمارا اس کام میں کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں (اس بے دردی کے ساتھ) نہ مارے جاتے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کے قول کا معنی یہ ہے ہمیں اس کامیابی میں سے کچھ حاصل نہیں ہوا جس کا وعدہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ابو عمرو اور یعقوب نے كُلُّهٗ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ یہ مبتدا ہے اور لِلّٰهِ اس کی خبر ہے۔ اور پھر پورا جملہ اس کی خبر ہے۔ اور یہ اس قول کی طرح ہے: وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ (الزمر: 60) (اور روز قیامت آپ دیکھیں گے انہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے اس حال میں کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے)

اور باقیوں نے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ان الأمر اجمع لله، اور یہ تاکید ہے اور یہ احاطہ اور عموم میں اجمع کے معنی میں ہے، اور اجمع صرف تاکید کے لئے ہی ہوتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ امر کی صفت ہے اور اخفش نے کہا ہے: یہ بدل ہے یعنی مدد و نصرت اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے وہ جسے چاہتا ہے اس کی مدد کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے رسوا کر دیتا ہے، اور جویبر نے ضحاک سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اس سے مراد تقدیر کو جھٹلانا ہے (2) اور یہ اس لئے کہ انہوں نے اس بارے میں کلام کیا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ یعنی اچھی اور بری تقدیر سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ یعنی وہ چھپائے ہوئے ہیں اپنے دلوں میں شرک، کفر اور تکذیب۔ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ وہ جو تمہارے لئے ظاہر نہیں کرتے۔ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا یعنی (اگر ہمارا اس کام میں کچھ دخل ہوتا) تو ہماری جماعت قتل نہ کی جاتی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: منافقین کہتے اگر ہماری عقل ہوتی تو ہم اہل مکہ کے ساتھ جنگ کے لئے نہ نکلتے، اور نہ ہمارے سردار قتل کئے جاتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ جواب لوٹایا اور کہا: قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 568　2۔ ایضاً، صفحہ 569

لَبَرَزَ آپ فرمائیے: اگر تم اپنے گھروں میں (بیٹھے) ہوتے تو (وہاں سے) ضرور نکل آتے (وہ لوگ) الَّذِيْنَ كُتِبَ جن کے بارے لکھا جا چکا ہے (یعنی جن کا مقدر بنا دیا گیا ہے) علیھم القتل، قتل یعنی لوح محفوظ میں۔ الی مضاجعھم یعنی اپنی قتل گاہوں کی طرف۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کتب علیھم القتل یعنی ان پر قتال (جنگ) فرض کیا گیا ہے پس اسے قتل سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ اسے اس کی طرف پھیر دیا گیا ہے۔

ابو حیوہ نے لَبُرِّزَ با کے ضمہ اور را کی شد کے ساتھ پڑھا ہے بمعنی یُجعل یخرج (انہیں نکال لیا جائے گا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اے منافقین! اگر تم پیچھے رہ جاتے تو تم اس کے علاوہ کسی دوسرے میدان جنگ کی طرف نکل پڑتے اس میں تم قتل کر دیئے جاؤ گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آزمالے گا جو کچھ سینوں میں چھپا ہوا ہے اور اسے مومنین کے لئے ظاہر کر دے گا۔

اور قول باری تعالیٰ وَ لِيَبْتَلِيَ میں واؤ مقحمہ ہے جیسا کہ اس قول میں ہے: وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ یعنی لیکون۔ اور اس فعل کو حذف کر دیا گیا ہے جو لام کَیْ کے ساتھ ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے وَ لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَ لِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ اللہ تعالیٰ نے تم پر قتال اور جنگ مقدر کر دی ہے اور احد کے دن اس نے تمہاری مدد نہیں کی تاکہ وہ تمہارے صبر کو آزمائے۔ اور تم سے تمہارے گناہ معاف کر دے اگر تم توبہ کرو اور مخلص ہو جاؤ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لِيَبْتَلِيَ کا معنی ہے تاکہ وہ تمہارے ساتھ مختبر کا معاملہ کرے۔ اور بعض نے کہا ہے: تاکہ تم سے مشاہدہ واقع ہو جس کا اسے غیباً علم ہے۔ اور کہا گیا ہے: یہ مضاف کے حذف کی بنا پر ہے اور تقدیر عبارت ہے لِيَبْتَلِيَ اولیاء اللہ تعالیٰ۔ تاکہ وہ اولیاء اللہ کو آزمالے۔ اور تمحیص کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ یعنی سینوں میں خیر و شر میں سے جو ہے (اللہ اسے جانتا ہے) اور یہ قول بھی ہے: کہ ذات الصدور سے مراد سینے ہی ہیں، کیونکہ ذات الشئ سے مراد اس کی اپنی ذات ہی ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾

"بے شک وہ لوگ جو پیٹھ پھیر گئے تھے تم سے اس روز جب مقابلہ میں نکلے تھے دونوں لشکر تو پھسلا دیا تھا انہیں شیطان نے بوجہ ان کے کسی عمل کے اور بے شک (اب) معاف فرما دیا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں یقیناً اللہ بہت بخشنے والا نہایت حلم والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا یہ جملہ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا کی خبر ہے۔ اور مراد وہ ہیں جو مشرکین سے احد کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے یہی منقول ہے۔ حضرت سدی نے کہا ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو ہزیمت کے وقت مدینہ طیبہ کی طرف بھاگ گئے نہ کہ وہ جو پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ اس قوم کے ان معین افراد کے بارے ہے جو اپنی ہزیمت کے وقت میں تین دن تک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہے اور پھر لوٹ گئے۔ اور اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ کا معنی ہے شیطان نے ان کے پھسلنے کا تقاضا کیا اس طرح کہ انہیں ان کی گزشتہ خطائیں یاد دلائیں، تو وہ ثابت رہنے پر مجبور ہو گئے تاکہ وہ قتل نہ کر دیئے جائیں۔ اور بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا کا یہی معنی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: اسْتَزَلَّهُمُ کا معنی ہے۔ اس نے انہیں پھسلاہٹ پر ابھارا، یہ باب استفعال ہے اور الزلة سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی خطا اور گناہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زَلَّ اور اَزَلَّ دونوں کا معنی ایک ہے۔ پھر کہا گیا: انہیں اخلاص کے ساتھ توبہ کرنے سے پہلے قتال (جنگ) پر مجبور کیا گیا تو اسی وجہ سے وہ پیٹھ پھیر گئے۔ یہ پہلے قول کی بنا پر ہے۔ اور دوسرے قول کے مطابق یہ ہے کہ انہوں نے مرکز کو چھوڑ کر اور مال غنیمت کی طرف مائل ہو کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی۔

اور حسن نے کہا ہے: مَا كَسَبُوْا (یعنی اس کے عوض) جو انہوں نے ابلیس کا قول قبول کیا جو اس نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا۔ اور کلبی نے کہا ہے: شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال آراستہ اور مزین کئے اور یہ قول بھی ہے کہ انہزام معصیۃ نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے مدینہ منورہ میں قلعہ بند ہونے کا ارادہ کیا، پس دشمن نے ان میں اپنا طمع اور حرص ختم کر دی جب انہوں نے یہ سن لیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہ کہا جانا بھی جائز ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پکار کو اس خوف کی وجہ سے سنا ہی نہیں جس خوف اور ڈر میں وہ مبتلا تھے۔ اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ دشمن کی تعداد کئی گناہ زیادہ تھی۔ کیونکہ وہ سات سو تھے اور دشمن کی تعداد تین ہزار تھی۔ اور ایسی حالت میں بھاگنا جائز ہوتا ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھاگنا خطا اور گناہ ہے جو جائز نہیں ہے۔ اور شاید انہیں یہ وہم بھی ہو گیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ ان میں سے پہلا قول احسن ہے۔ المختصر اگر معاملہ کو ثابت شدہ گناہ پر محمول کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما دیا ہے۔ اور اگر اسے انہزام جائز پر محمول کیا جائے تو آیت ان کے بارے میں ہے جو ہزیمت سے بہت دور ہیں اور اتنی مقدار پر زائد ہے جو جائز قرار دی گئی ہے۔ ابو اللیث سمرقندی نصر بن محمد بن ابراہیم نے کہا ہے: خلیل بن احمد، سراج، قتیبہ، ابو بکر بن غیلان نے جریر سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے مابین گفتگو ہوئی، تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: کیا تم مجھے برا بھلا کہتے ہو حالانکہ میں بدر میں حاضر تھا اور تم حاضر نہ تھے، اور میں نے درخت کے نیچے بیعت کی تھی (یعنی بیعت رضوان میں میں حاضر تھا۔) اور تم نے بیعت نہیں کی۔ اور احد کے دن تم نے بھی پیٹھ پھیرنے والوں کے ساتھ پیٹھ پھیر لی تھی۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب دیتے ہوئے فرمایا: جہاں تک تمہارا یہ قول ہے کہ میں بدر میں حاضر تھا اور تم حاضر نہ تھے، تو میں کسی ایسے کام سے غائب نہیں ہوا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاضر ہوئے ہوں، مگر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی بیمار تھی اور میں ان کے پاس ان کی تیمارداری کے لئے رہا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے مسلمانوں کے حصص کے ساتھ برابر کا حصہ دیا اور رہا بیعت الشجرہ کا مسئلہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے مشرکین مکہ کے پاس بطور سفیر بھیجا تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ پر مارا اور فرمایا ھذہ لعثمان یہ عثمان کے لئے ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دایاں اور آپ کا بایاں میرے دائیں اور بائیں سے میرے لئے انتہائی بہتر ہے اور رہا یوم الجمع (احد کا دن) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ تو میں بھی ان میں شامل ہو گیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔ نتیجتاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دلیل سے غالب آ گئے۔ (1)

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل صحابہ، باب مناقب عثمان بن عفان، جلد 1، صفحہ 523، اسلام آباد

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ معنی صحیح ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے انہوں نے بیان کیا: عبدان، ابوحمزہ نے عثمان بن موہب سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: ایک آدمی آیا اور اس نے بیت اللہ شریف کا حج کیا تو اس نے ایک قوم کو وہاں بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس نے پوچھا: یہ بیٹھنے والے لوگ کون ہیں؟ تو لوگوں نے بتایا: یہ قریش ہیں۔ اس نے پوچھا: شیخ کون ہے؟ انہوں نے بتایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، پس وہ ان کے پاس آیا اور کہا: میں ایک شے کے بارے تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کیا مجھے بتاؤ گے؟ اس نے کہا: میں تجھے اس گھر کی حرمت کی قسم دیتا ہوں، کیا تم یہ جانتے ہو کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ احد کے دن فرار ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ پھر اس نے کہا: کیا آپ ان کے بارے یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ بدر کے دن بھی میدان سے غائب تھے وہ اس میں حاضر نہیں ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔

پھر اس نے پوچھا: کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ بیعت رضوان سے بھی پیچھے رہ گئے اور اس میں حاضر نہ ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ راوی نے کہا: پس اس آدمی نے نعرہ تکبیر بلند کیا، تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آؤ میں تجھے بتاؤں اور جن امور کے بارے تو نے مجھ سے سوال کیا ہے میں تیرے لئے اس کی وضاحت کروں، جہاں تک احد کے دن آپ کے فرار کا تعلق ہے تو میں یہ شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا ہے اور رہا بدر سے ان کے غائب ہونے کا معاملہ! تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی تھی اور وہ بیمار تھیں تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: اِنَّ لک اَجرَ رجل ممن شَهِد بدرا و سهمه (بلاشبہ تمہارے لئے اس آدمی کے برابر اجر اور (مال غنیمت سے) حصہ ہے جو غزوہ بدر میں حاضر ہوئے۔) اور جہاں تک بیعت رضوان سے غائب ہونے کا تعلق ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ اگر بطن مکہ میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے زیادہ عزت والا کوئی موجود ہوتا تو یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی جگہ اسے بھیجتے، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکہ مکرمہ کی طرف جانے کے بعد بیعت رضوان ہوئی، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کے بارے میں فرمایا ھذہ ید عثمان یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا اور فرمایا: ھذہ لعثمان یہ بیعت عثمان کے لئے ہے۔ اب اسے تو اپنے ساتھ لے جا۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ کا آدم علیہ السلام کی توبہ کو قبول کرنا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے فحج آدم موسٰی۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام دلیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ اور وہ اس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل کھانے کے سبب اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو جنت سے نکلنے پر زجر و توبیخ اور ملامت کریں، تو حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں فرمایا: کیا تم مجھے ایسے کام پر ملامت کرتے ہو جسے اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے چالیس سال پہلے میرا مقدر بنا دیا تھا(2) اور اللہ تعالیٰ نے میری توبہ قبول فرمائی ہے اور جس

1۔ صحیح بخاری کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 581، اسلام آباد

2۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب کلم اللہ موسیٰ تکلیما، جلد 2، صفحہ 119، اسلام آباد۔ مسلم کتاب القدر، باب تحاج آدم موسیٰ، جلد 2، صفحہ 335۔ کراچی ایضاً صحیح بخاری، کتاب القدر، حدیث نمبر 6124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی توبہ قبول ہو جائے تو اس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا اور جس کا کوئی گناہ نہ ہو تو اسے ملامت نہیں کی جا سکتی، اور اسی طرح وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ معاف فرما دے اور بلا شبہ وہ یہ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے اور اس کی خبر سچی ہے۔ اور ان دو کے سوا توبہ کرنے والے گنہگار اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے بھی ہیں، پس وہ اس پریشانی اور خوف میں ہوتے ہیں کہ ان کی توبہ قبول نہ کی جائے، اور اگر قبول کر لی جائے تو بھی خوف ان پر غالب ہوتا ہے کیونکہ انہیں اس کے بارے علم نہیں ہوتا۔ فاعلم۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾

"اے ایمان والو! نہ ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جنہوں نے کفر اختیار کیا اور جو کہتے تھے اپنے بھائیوں کو جب وہ سفر کرتے کسی علاقہ میں یا ہوتے تھے جہاد کرنے والے کہ اگر وہ ہوتے ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے تاکہ بنائے اللہ تعالیٰ اس (خیال باطل) کو حسرت (کا باعث) ان کے دلوں میں اور (درحقیقت) اللہ ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا مراد منافقین ہیں۔

وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ یعنی جو نفاق میں یا نسب میں (ان کے بھائی تھے) اور ان سرایا میں گئے جنہیں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بئر معونہ کی طرف بھیجا (انہیں کہتے تھے) لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا (اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے) تو اس میں مسلمانوں کو ان کی مثل قول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِذَا ضَرَبُوْا یہ زمانہ ماضی کے لئے ہے، یعنی اذ ضربوا، (جب انہوں نے سفر کیا) کیونکہ کلام میں شرط کا معنی ہے اس حیثیت سے کہ الَّذِيْنَ مبہم غیر موقت ہے، پس اِذَا، اِذْ کے محل میں واقع ہے۔ جیسا کہ ماضی جزا میں مستقبل کے محل میں واقع ہوتی ہے۔ اور ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ کا معنی ہے انہوں نے زمین میں سفر کیا اور تجارت یا دیگر کاموں کے لئے چلے اور مر گئے۔ اَوْ كَانُوْا غُزًّى یا وہ جہاد میں گئے اور قتل کر دیئے گئے۔ اور الغُزَّى جمع منقوص ہے اس کا لفظ حالت رفعی اور جری میں تبدیل نہیں ہوتا، اور ان کا واحد غازٍ ہے، جیسا کہ راکع کی جمع رُکَّع، صائم کی جمع صُوَّم، نائم کی جمع نُوَّم، شاہد کی جمع شُهَّد، اور غائب کی جمع غُيَّب ہے۔ اور جمع میں غُزَاةٌ بھی جائز ہے جیسا کہ قُضَاةٌ اور غُزَّاء مد کے ساتھ بھی مثلاً ضُرَّاب اور صوّام اور کہا جاتا ہے: غَزِيٌّ، الغَزَاة کی جمع ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

قل للقوافل والغزيّ اذا غزوا

اس میں الغزيّ الغزاة کی جمع کے طور پر مذکور ہے۔

اور زہری سے روایت ہے کہ انہوں نے غُزًى تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور اَلْمُغْزِيَةُ ایسی عورت جس کا خاوند جہاد پر ہو۔

اور اَتَانٌ مُغْزِیَۃٌ یعنی ایسی گدھی جس کا بچہ مؤخر ہو جائے (پیچھے ہو جائے) اور پھر اسے نکالا جائے۔ اور اَغْزَتِ النَّاقَۃُ جب اس کی جان تنگ ہو جائے۔ اور اَلْغَزْوُ کا معنی ہے کسی شے کا قصد و ارادہ کرنا۔ اور المَغْزٰی سے مراد مقصد ہے۔ اور غزو کی طرف نسبت کی وجہ سے غَزَوِیٌّ کہا جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ یعنی ان کے گمان اور ان کے قول کو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں باعث حسرت بنادے۔ اور لام قول باری تعالیٰ قَالُوْا کے متعلق ہے۔ یعنی تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے گمان کو بنادے کہ اگر وہ نہ نکلتے تو قتل نہ کئے جاتے حَسْرَۃٌ اس کا معنی ندامت ہے۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ اور حسرت کا مفہوم ہے کھو جانے والی شے پر اظہار افسوس کرنا جس تک پہنچنا مقدر نہ ہو۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فواحسرتی لم اقضِ منھا لُبَانتی و لم اتمتّع بالجوار و بالقُرُب

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ محذوف سے متعلق ہے اور معنی ہے تم ان کی مثل نہ ہو جاؤ۔

تاکہ اللہ تعالیٰ بنائے اس قول کو ان کے دلوں میں (باعث) حسرت کیونکہ ان کا نفاق ظاہر ہو چکا ہے اور یہ قول بھی ہے اس کا معنی ہے تم ان کی تصدیق نہ کرو اور نہ تم ان کی طرف متوجہ ہو، پس یہی ان کے دلوں میں حسرت ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: ''تاکہ اللہ تعالیٰ اسے ان کے دلوں میں حسرت بنائے قیامت کے دن کیونکہ اس دن وہ رسوائی اور ندامت میں ہوں گے اور اس دن مسلمان نعمتوں اور کرامت میں ہوں گے۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ یعنی اللہ تعالیٰ ہی اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ اسے زندہ رکھے جو جنگ کے لئے نکلتا ہے اور اسے مار دے جو اپنے اہل خانہ میں مقیم اور ٹھہرا ہوا ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ اسے یا اور تا دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہو جانا اور اس میں مرجانا تمام دنیا سے بہتر ہے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

''اور واقعی اگر تم قتل کئے جاؤ راہ خدا میں یا تم مرجاؤ تو اللہ کی بخشش اور رحمت (جو تمہیں نصیب ہوگی) بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ اور اگر تم مر گئے یا مارے گئے تو اللہ کے حضور جمع کئے جاؤ گے۔''

جواب الجزاء محذوف ہے، اور یہ جواب قسم کے سبب اس سے مستغنی ہے اور جواب قسم اس قول میں ہے: لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ اور جواب قسم کے سبب مستغنی ہونا اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ اس کے لئے صدر کلام (ضروری) ہے، اور اس کا معنی ہے۔ لِيَغْفِرَنَّ لكم وہ ضرور بہ ضرور تمہاری مغفرت فرما دے گا۔

اور اہل حجاز کہتے ہیں: مِتُّمْ، میم کے کسرہ کے ساتھ جیسا کہ نِمْتُمْ ہے۔ یہ مَاتَ يَمَاتُ سے ماخوذ ہے جیسا کہ خِفتُ يَخَافُ ہے۔ اور سُفلیٰ مُضَرَ کہتے ہیں: مُتُّمْ، یہ میم کے ضمہ کے ساتھ ہے جیسا کہ صُمْتُمْ، اور یہ مات یموت سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ

تیرا قول: کان یکون اور قال، یقول۔ یہ کوفیوں کا قول ہے۔ اور یہ اچھا ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ یہ وعظ و نصیحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قول کے ساتھ نصیحت کی ہے، یعنی تم جنگ سے بھاگو نہیں اور نہ اس سے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے، بلکہ تم اس کی سزا اور اس کے دردناک عذاب سے بھاگو، کیونکہ تمہیں اس کی طرف لوٹنا ہے اور اس کے سوا کوئی بھی تمہارے لئے نہ نقصان اور ضرر کا مالک ہے اور نہ ہی نفع کا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

''پس (صرف) اللہ کی رحمت سے آپ نرم ہو گئے ہیں ان کے لئے اور اگر ہوتے آپ تندمزاج سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے تو آپ درگزر فرمایئے ان سے اور بخشش طلب کیجئے ان کے لئے اور صلاح مشورہ کیجئے ان سے اس کام میں اور جب آپ ارادہ کرلیں (کسی بات کا) تو پھر توکل کرو اللہ پر بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے۔''

ما صلہ ہے اس میں تاکید کا معنی ہے، ای فبرحمة، جیسا کہ اس قول میں ہے: عَمَّا قَلِيْلٍ۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ۔ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ۔ اور یہ علی الاطلاق زائدہ نہیں ہے، بلکہ اس پر زائدہ ہونے کا اطلاق سیبویہ نے کیا ہے اس حیثیت سے کہ اس کا عمل زائل ہو چکا ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: ما نکرہ ہے اور با کے سبب محل جر میں ہے وَرَحْمَةٍ اس سے بدل ہے۔ اور آیت کا معنی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب احد کے دن پیٹھ پھیرنے والوں سے نرمی کی اور ان سے کوئی سختی نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ آپ نے یہ رویہ اللہ تعالیٰ کی خاص عطا کردہ توفیق کے ساتھ اختیار کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مَا استفہامیہ ہے اور معنی یہ ہے: پس کتنی رحمت ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کہ آپ ان کے لئے نرم ہو گئے ہیں، تو یہ بطور تعجب ہے۔ اور اس میں حقیقت سے دوری ہے، کیونکہ اگر اس طرح ہوتا تو یہ فَبِمَ بغیر الف کے ہوتا۔ لِنْتَ یہ لَانَ يَلِيْنُ لِيْنًا وَلَيَانًا فتحہ کے ساتھ سے ماخوذ ہے۔ اور اَلْفَظُّ الْغَلِيْظُ کا معنی ہے خشک مزاج۔ فَظِظْتَ تَفَظُّ فَظَاظَةً و فَظَاظًا فَاَنْتَ فَظٌّ۔ (تو تندخو ہے) اس کی مونث فَظَّةٌ ہے اور جمع اَفْظَاظٌ ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں سے یہ ہیں کہ نہ آپ تندخو ہیں، نہ سخت دل اور نہ ہی بازاروں میں ساتھیوں کے ہمراہ بیٹھنے والے ہیں۔ (1)

مفصل نے اشعار کہے ہیں جن سے فظ کے مذکر ہونے کا ثبوت ملتا ہے:

و لیس بفظ فی الأدانی والأولی ۔۔۔ یؤمون جدواہ ولکنہ سَهْلُ
و فظ علی أعداءہ یحذرونہ ۔۔۔ فسطوتہ حتف و نائلہ جزل

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، حدیث نمبر 1981، ایضاً، کتاب التفسیر، حدیث نمبر 4461، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ان میں لفظ فظٌّ دونوں جگہ مذکر ذکر ہوا ہے۔

اور ایک دوسرے شاعر نے اس کے مونث ہونے کے بارے کہا ہے:

أموت من الضُرِ فی منزلی و غیری یموت من الکِظّة

و دُنْیا اتجودُ علی الجاهلین و هی علی ذِی النُهَی فَظّه

اس میں لفظ فظة مونث ذکر کیا گیا ہے۔

اور غِلظُ القلب سے مراد چہرے پر تیوری چڑھانا ہے (اور کرخت چہرے کے ساتھ کسی کی طرف متوجہ ہونا ہے) رغائب سے بہت کم متاثر ہونا اور شفقت و رحمت کا بہت کم ہونا ہے۔

اور اسی کے بارے شاعر کا قول ہے:

یُبْکَی عَلَیْنَا ولا نَبْکِی علی أحَدٍ لنحن أغْلَظُ اکبادًا من الابل

ہم پر رویا جائے گا اور ہم کسی پر نہیں روئیں گے یقیناً ہم اونٹ سے زیادہ سخت دل ہیں۔

اور لَا نْفَضُّوا کا معنی ہے لتفرّقوا، (تو وہ بکھر جاتے) فضضتهم فانفضوا، یعنی میں نے انہیں منتشر کیا پس وہ منتشر ہو گئے، اور اسی بارے میں ابوالنجم کا قول ہے۔

وہ اونٹ کا وصف بیان کرتا ہے:

مستعجلات القیض غیر جُرد ینفَضّ عنهن الحَصَی بالصَمْد

الفض کا اصل معنی توڑنا ہے، اور اسی سے ان کا یہ قول ہے: لایَفْضُضِ اللہ فَاکَ۔

(اللہ تیرے منہ کو سلامت رکھے "یعنی نہ توڑے") اور اس کا معنی ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ کی نرمی نہ ہوتی تو حیا (خجالت) اور خوف انہیں تمہارے قریب آنے سے روکتا اس کے بعد کہ وہ پیٹھ پھیر چکے تھے۔

قولہ تعالیٰ: **فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ**۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کاموں کا حکم فرمایا ہے جو انتہائی تدریج کے ساتھ اور آہستہ آہستہ ہیں۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا کہ آپ انہیں معاف فرما دیں جو خاص کر آپ کو متبعین کی طرف سے اذیت پہنچی ہے، پس جب وہ اس درجہ میں ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے اس فعل کے بارے مغفرت طلب کریں جو متبعین سے صادر ہوا، جب وہ اس درجہ میں ہو گئے تو وہ اس اہل ہو گئے کہ امور میں ان سے مشورہ لیا جائے، اہل لغت نے کہا ہے: الاستشارة عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: شُرتُ الدابة و شوّرتها جب تو اس کے بارے دوڑنے وغیرہ کی خبر جان لے۔ اور وہ جگہ جس میں گھوڑے دوڑتے ہیں اسے مشوار کہا جاتا ہے۔ اور کبھی ان کے اس قول سے ہوتا ہے: شُرتُ العسلَ واشترتُه فهو مَشُور و مُشتار جیسا تو اسے اپنی جگہ سے لے لے، عدی بن زید نے کہا ہے:

فی سَمَاعٍ یَأذَنُ الشَّیخُ لہ وحدیثٍ مثلِ مَا ذِیّ مُشَارِ

اس میں مشار مذکور معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: شوریٰ (مشاورت) قواعد شریعت اور پختگی احکام میں سے ہے، جو اہل علم اور اہل دین سے مشاورت نہیں کرتا تو اس کا معزول ہونا واجب ہے۔ یہ ایسا حکم ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے مومنین کی مدح اور تعریف کی ہے: وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ۔

اعرابی نے کہا ہے: ما غُبِنْتُ قَطُّ حتی یُغْبَنَ قومی، (مجھ سے کبھی غبن اور دھوکہ نہیں کیا گیا مگر یہ کہ میری قوم سے دھوکہ کیا جائے۔) کہا گیا: یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تو اس نے کہا: میں کوئی کام بھی نہیں کرتا یہاں تک کہ میں ان سے مشاورت کرلوں۔ اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: حکمرانوں پر علماء سے ان معاملات میں مشورہ کرنا واجب ہے جنہیں وہ نہیں جانتے اور امور دین میں سے جن میں انہیں مشکل درپیش ہو اور فوجی ماہرین سے ان امور میں جو جنگ سے تعلق رکھتے ہیں اور لوگوں کے سرداروں سے ان امور میں سے جو مصالح سے تعلق رکھتے ہیں اور کتاب، وزراء اور عمال کے سربراہوں سے ان امور میں جو شہروں کے مصالح، منافع اور ان کی آبادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے: ماندم من استشار (جس نے مشاورت کی وہ نادم اور شرمندہ نہیں ہوا) اور یہ بھی کہا جاتا ہے: جو اپنی رائے پر اترایا وہ گمراہ ہوگیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ یہ آیت کاموں میں اجتہاد اور امکان وحی کے ساتھ ظنوں کو لینے کے جواز پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو اس بارے میں اجازت عطا فرمائی ہے اور اہل تاویل نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس میں اپنے اصحاب سے مشاورت کریں، پس ایک گروہ نے کہا ہے: یہ جنگوں کی تدبیر کے بارے میں ہے، دشمن کے ساتھ آمنا سامنا ہونے کے وقت کے بارے ہے اور اپنے نفوس کو مطمئن اور پاکیزہ رکھنے کے لئے اور اپنی اقدار کو بلند کرنے کے لئے اور اپنے دین پر جمع کرنے کے لئے (مشاورت ہے) اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ساتھ آپ کو ان کی رائے سے غنی کردیا ہے۔ یہ حضرت قتادہ، ربیع، ابن اسحاق، اور شافعی رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے۔ امام شافعی نے کہا ہے: یہ اس قول کی طرح ہے والبکر تُستامَرُ (باکرہ عورت سے اس کے دل کی پاکیزگی کے لئے اجازت لی جائے گی)۔ (مشاورت کی جائے گی۔) یہ اس لئے نہیں کہ یہ واجب ہے۔ اور مقاتل، قتادہ اور ربیع رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: عربوں کے سرداروں سے جب کسی معاملہ میں مشاورت نہ کی جاتی تو وہ ان پر شاق اور گراں گزرتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو حکم ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے معاملات میں مشاورت کریں، کیونکہ یہ ان کے لئے انتہائی مہربانی اور کرم ہے اور ان کے حسد و کینہ کو بہت دور کرنے والا ہے (1) اور ان کے دلوں کو پاک کرنے والا ہے۔ پس جب آپ ان سے مشاورت کریں گے تو وہ اپنے لئے آپ کی عزت و تکریم کو پہچان جائیں گے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: یہ اس بارے میں ہے جس میں کوئی وحی نازل نہ ہوئی ہو۔ حضرت حسن بصری اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہما سے یہی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فی المشورۃ، جلد 2، صفحہ 343، اسلام آباد

مروی ہے، ان دونوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو مشاورت کا حکم اس لئے نہیں دیا کہ آپ کو ان کی رائے کی حاجت اور ضرورت ہے(1)، بلکہ مراد یہ ہے کہ آپ انہیں مشاورت کی فضیلت سے آگاہ فرمائیں اور تا کہ آپ کے بعد آپ کی امت اس کی اقتدا اور پیروی کرے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت میں ہے: وَ شَاوِرْهُمْ فی بعض الأمر (اور آپ بعض معاملات میں ان سے مشاورت کریں۔)

اور کسی کہنے والے نے کتنا اچھا کہا ہے:

شاوِر صديقك في الخفيّ المشكل واقبِلْ نصيحَةَ ناصِحٍ متفضلِ

مشکل اور مخفی کاموں میں اپنے دوست سے مشورہ کر اور مہربان نصیحت کرنے والے کی نصیحت کو قبول کر۔

فاللّه قد اوصَى بذاكَ نبيّه في قولِه شَاوِرهُمْ وَ تَوَكَّل

پس اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے اپنے نبی ﷺ کو نصیحت فرمائی ہے اپنے اس ارشاد میں کہ آپ ان سے مشاورت کریں، اور توکل اختیار کریں۔

مسئلہ نمبر 4۔ مصنف ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: المستشار مؤتمنٌ(2) جس سے مشورہ لیا جائے اسے اس پر امین بنایا جاتا ہے۔ علماء نے کہا ہے: مستشار کی تعریف یہ ہے کہ اگر مشورہ احکام کے بارے میں ہو تو وہ عالم اور دیندار ہو اور سوائے عاقل کے ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ حسن نے کہا ہے: کسی آدمی کا دین مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کی عقل مکمل نہ ہو۔ اور جب اس سے مشورہ لیا جائے تو اس صفت سے متصف ہو اور وہ اصلاح کی پوری کوشش کرے اور وہ اپنی جدوجہد اور صلاحیت صرف کرے اور پھر اشارۃً خطا واقع ہو جائے تو اس پر کوئی تاوان نہیں۔ خطابی وغیرہ نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ دنیوی امور میں مستشار کی تعریف یہ ہے کہ وہ عاقل ہو، تجربہ کار ہو اور مشورہ طلب کرنے والے سے محبت کرنے والا ہو۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

شاور صديقَك في الخفِي المُشْكل

(تو مشکل اور مخفی کام میں اپنے دوست سے مشورہ کر۔) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور دوسرے نے کہا ہے:

و اِنْ بَابُ أمرٍ عليك التوىٰ فَشَاوِر لبيبًا و تعصِهِ

اور اگر کسی کام کا دروازہ تجھ پر بند ہو جائے تو کسی دانا اور عقلمند سے مشورہ کر لے اور تو اس کی نافرمانی نہ کر۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 572، دار فکر بیروت

2۔ جامع ترمذی، کتاب الاستیذان والآداب، باب ان المستشار مؤتمن، حدیث 2747، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور مشاورت برکت ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما ندم من استشار ولا خاب من استخار (وہ نادم نہ ہو گا جس نے مشورہ کیا اور وہ خائب و خاسر نہ ہو گا جس نے استخارہ کیا۔) اور حضرت سہل بن سعد الساعدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے: ''کوئی بندہ کبھی مشورہ کے سبب شقی اور بد بخت نہیں ہوا اور کوئی رائے کے استغنا کے ساتھ سعید اور خوش بخت نہیں ہوا۔'' اور بعض نے کہا ہے: اس سے مشاورت کر جو امور کا تجربہ رکھتا ہو، کیونکہ وہ تجھے اپنی ایسی رائے دے گا جو اس پر انتہائی مہنگی واقع ہو گی اور تو اسے مفت حاصل کر لے گا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لئے مجلس شوریٰ مقرر فرمائی، حالانکہ یہ بہت بڑا اور اہم مسئلہ تھا۔ امام بخاری نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ائمہ کرام اہل علم امناء سے امور مباحہ میں مشاورت کرتے تھے تاکہ آسانی اور سہولت کے ساتھ وہ ان پر عمل پیرا ہو سکیں (1)۔ حضرت سفیان ثوری نے بیان کیا ہے: چاہیے کہ تمہارے مشیر متقی اور امانتدار ہوں اور ایسے ہوں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوں۔ اور حسن نے کہا ہے: قسم بخدا! جو قوم آپس میں مشورہ کرتی ہے تو جو وہاں حاضر ہوتے ہیں وہ ان کی راہنمائی افضل کی طرف کر دیتے ہیں۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی قوم نہیں جن کا مشورہ ہو اور ان کے ساتھ احمد یا محمد نامی آدمی بھی حاضر ہو اور وہ اسے اپنے مشورہ میں شامل کریں مگر اسے ان کے لئے پسند کر لیا جائے گا۔''

مسئلہ نمبر 6۔ شوریٰ کی بنیاد اختلاف آراء پر ہے اور مشورہ لینے والا اس اختلاف میں غور و فکر کرتا ہے اور ایسے قول کو دیکھتا ہے جو کتاب و سنت کے زیادہ قریب ہو اگر اس کے لئے ممکن ہو۔ اور جب اللہ تعالیٰ اس میں سے جہاں تک چاہے راہنمائی فرما دے تو وہ اس پر پختہ ہو جائے اور اسے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے نافذ کر دے، کیونکہ مطلوب تک پہنچنے کی یہی انتہائی کوشش ہے اور اس آیت میں اسی کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ جب آپ کسی کام کا ارادہ کریں تو اس میں لگ جائیں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کریں، نہ کہ آپ ان کی مشاورت کا ارادہ کریں۔ اور عزم سے مراد ایسا امر ہے جس میں خوب غور و فکر کی گئی ہو اور اسے مہذب بنا دیا گیا ہو، وہ بغیر نظر و فکر کے صرف رائے سے عزم نہیں بن سکتا، مگر عرب کے بہادروں کے بارے طویل قصائد کے قطعہ میں۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

اذا ھم القی بین عینیہ عزمہ و نکب من ذکر العواقب جانبا

جب وہ قصد کرتا ہے تو اپنے عزم کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے اور ہم انجام کے ذکر کو ایک جانب ڈال دیتے ہیں۔

و لم یستشر فی رأیہ غیر نفسہ و لم یرض إلا قائم السیف صاحبا

اور وہ اپنی رائے میں اپنے سوا کسی سے مشورہ نہیں کرتا اور تلوار اٹھانے والے کے سوا کسی ساتھی سے راضی نہیں ہوتا۔

اور نقاش نے کہا ہے: العزم اور الحزم دونوں کا معنی ایک ہے، حاء کو عین سے بدلا گیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ، جلد 2، صفحہ 1095، اسلام آباد

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ خطا ہے، اور حزم سے مراد کسی کام میں عمدہ اور گہری غور وفکر کرنا اور اس کی کانٹ چھانٹ کرنا (یعنی مہذب بنانا) ہے اور اس میں خطا سے بچنا اور احتیاط کرنا ہے۔

اور العزم سے مراد کام کرنے کا قصد کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ پس مشاورت اور جو اس کے معنی میں ہے وہ حزم ہے اور عرب کہتے ہیں: قد أَحْزِمُ لو أَعْزِمُ (میں احتیاط برتوں گا اگر میں قصد کروں گا) اور امام جعفر الصادق اور جابر بن عبداللہ نے فَاِذَا عَزَمْتُ تا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ عزم کی نسبت اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف کی ہے کیونکہ وہی اس کی ہدایت اور توفیق عطا فرمانے والا ہے، جیسا کہ اس نے کہا ہے: وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال: 17) (اور اے محبوب!) نہیں پھینکی آپ نے (وہ مشت خاک) جب آپ نے پھینکی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی۔)

اور کلام کا معنی ہے یعنی میں نے آپ کا قصد کیا ہے اور میں نے آپ کو توفیق دی ہے اور میں نے آپ کی راہنمائی کی ہے فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (سو آپ اللہ تعالیٰ پر توکل کیجئے) اور باقیوں نے تا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مہلب نے کہا ہے: اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کے حکم سے اس کی پیروی کی ہے اور فرمایا ہے: ”کسی نبی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اپنے ہتھیار پہننے کے بعد پھر انہیں اتارے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما دے (1)“ یعنی اس کے لئے مناسب نہیں کہ جب وہ عزم کر لے تو پھر اس سے پھر جائے، کیونکہ اس سے اس توکل کو توڑنا لازم آتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عزیمت کے ساتھ شرط قرار دیا ہے۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ہتھیار پہننے کا اشارہ احد کے دن نکلنے کی طرف ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت کے ساتھ مشرف و مکرم فرمایا اور وہ مومنین صلحاء تھے جو غزوہ بدر میں حاضر نہ ہو سکے تھے: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ ہمارے دشمن کی طرف نکلئے، یہ عزیمت پر دال ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قعود (مدینہ منورہ میں ہی رہنے) کا اشارہ کیا اور اسی طرح عبداللہ بن ابی نے بھی اسی کا اشارہ دیا اور اس نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہیں مقیم رہیے اور لوگوں کے ساتھ ان کی طرف نہ نکلئے، پس اگر وہ ٹھہر گئے تو وہ بری مجلس کے ساتھ ٹھہریں گے اور اگر وہ ہماری طرف مدینہ طیبہ میں آئے تو ہم فناؤں اور گلیوں کے دھانوں پر ان سے جنگ لڑیں گے اور عورتیں اور بچے ٹیلوں پر چڑھ کر ان پر پتھر پھینکیں گے، قسم بخدا! اس شہر میں دشمن نے کبھی بھی ہمارے ساتھ جنگ نہیں لڑی مگر ہم اس پر غالب آئے اور جب بھی ہم اس سے نکل کر دشمن کی طرف گئے تو وہ ہم پر غالب آئے۔ جن کا ذکر ہم نے کیا ہے انہوں نے اس رائے کا انکار کر دیا اور انہوں نے لوگوں کو تشجیع دلائی اور جنگ کی طرف دعوت دی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جمعہ پڑھائی اور نماز کے بعد اپنے کاشانۂ اقدس میں تشریف لے گئے اور اپنے ہتھیار پہنے۔ نتیجتاً وہ قوم نادم ہوئی اور انہوں نے کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کیا ہے، پس جب آپ ہتھیار پہن کر ان کی طرف تشریف لائے تو انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، اگر آپ کی خواہش ہے تو یہیں ٹھہر جائیں کیونکہ ہم آپ کو مجبور کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کسی نبی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ جب وہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، جلد 2، صفحہ 1095

اپنے ہتھیار پہن لے تو پھر انہیں قتال کرنے سے پہلے اتار دے۔''(1)

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ توکل کا معنی عجز کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا ہے اور اس کا اسم التکلان ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: اتکلت علیہ فی امری (میں نے اپنے کام میں اس پر اعتماد کیا ہے) اور اس کی اصل اِوْ تکلت ہے واؤ کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا سے بدلا گیا ہے، پھر یا کو تا سے بدل دیا گیا اور پھر اسے تا افتعال میں مدغم کر دیا گیا۔ اور کہا جاتا ہے: وَ کلتہ بامری توکیلاً (میں نے اسے اپنے کام کا وکیل بنایا) اس کا اسم وَ کالۃ ہے واؤ مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی۔

علماء نے توکل کے بارے میں اختلاف کیا ہے، متصوفہ میں سے ایک گروہ نے کہا ہے: اس کا مستحق صرف وہ ہوتا ہے جس کے دل میں غیر اللہ یعنی درندے یا کسی اور شے کا خوف نہ ہو، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ضمان کی وجہ سے رزق کی تلاش میں سعی اور جدوجہد کرنا چھوڑ دے۔ اور عام فقہاء نے کہا ہے: وہ جس کا ذکر قول باری تعالیٰ: وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ کے تحت ہو چکا ہے۔ اور وہی صحیح ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے، حالانکہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام خوفزدہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے اپنے اس قول میں خبر دی ہے لَا تَخَافَا اور فرمایا ہے: فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ (طٰہٰ) (موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔ ہم نے فرمایا (اے کلیم!) مت ڈرو۔) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اپنے اس قول سے خبر دی ہے: فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ (ھود: 70) (پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ نہیں بڑھ رہے کھانے کی طرف تو اجنبی خیال کیا انہیں اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے۔ فرشتوں نے کہا ڈریئے نہیں) پس جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام خوفزدہ ہوئے۔ تو یہ دونوں مثالیں تیرے لئے کافی ہیں..... تو ان دونوں کے سوا کا ڈرنا تو بدرجہ اولیٰ ہے۔ اور اس معنی کا بیان آگے آئے گا۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

''اگر مدد فرمائے تمہاری اللہ تعالیٰ تو کوئی غالب نہیں آ سکتا تم پر اور اگر وہ (ساتھ) چھوڑ دے تمہارا تو کون ہے جو مدد کرے گا تمہاری اس کے بعد۔ اور صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔''

قولہ تعالیٰ: اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ یعنی تم اسی پر توکل کرو کیونکہ اگر وہ تمہاری مدد فرمائے اور تمہارے دشمن سے تمہاری حفاظت کرے تو تم ہرگز مغلوب نہ ہو گے۔ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ اور اگر وہ اپنا تعاون تمہارے ساتھ چھوڑ دے۔ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ یعنی اس کے بعد کوئی بھی تمہاری مدد نہ کرے گا، یعنی اس کے تمہیں چھوڑنے کے بعد، کیونکہ اس نے فرمایا ہے: وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ اور الخذلان کا معنی ہے مدد اور تعاون چھوڑ دینا۔ اور المخذول: جسے چھوڑ دیا گیا ہو، جس کی پرواہ نہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 540

کی جائے۔ اور خذلت الوحشیة یعنی وحشی جانور چراگاہ میں اپنے بچے کے پاس ٹھہر گیا اور اس نے اپنے ساتھ والے جانوروں کو چھوڑ دیا، پس وہی خذول ہے۔

طرفہ نے کہا ہے:

خذول تُراعِی رَبْرَبًا بِخمیلة — تناولُ اطرافَ البَرِیرِ و تَرْتَدِی

اور یہ بھی کہا ہے:

نظرت الیك بعین جاریة — خَذَلت صواحبها علی طِفْلِ

اس نے تیری طرف جاری آنکھ کے ساتھ دیکھا اور اس نے بچے کے سبب اپنے ساتھ والے جانوروں کو چھوڑ دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ مقلوب میں سے ہے، کیونکہ جب اسے چھوڑ دیا جائے تو یہ مخذولہ ہوتی ہے، اور تخاذلت رجلاہ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ دونوں (ٹانگیں) کمزور ہو چکی ہوں۔ اور کسی نے کہا: و خَذُولِ الرِّجل مِن غیرِ کَسَحٍ (آدمی کی کمزوری جو بغیر عاجزی کے ہو) اور رجل خُذَلة ایسے آدمی کو کہا جاتا ہے جو ہمیشہ ساتھ چھوڑتا رہتا ہو۔ واللہ اعلم۔

وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَ مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾

''اور نہیں ہے کسی نبی کی یہ شان کہ خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرے گا تو لے آئے گا (اپنے ہمراہ) خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن پھر پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔''

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب احد کے دن تیر اندازوں نے اپنے مرکز کو خالی کیا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس خوف سے کہ مسلمان مال غنیمت کے والی بن جائیں گے اور انہیں کوئی شے بھی نہیں دی جائے گی، تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم میں زیادتی نہیں کریں گے، پس تمہارا کوئی حق نہیں ہے کہ تم انہیں متہم کرو۔ اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض غزوات میں لشکر بھیجے پھر ان کے آنے سے پہلے مال غنیمت حاصل کر لیا، پس اسے لوگوں میں تقسیم کر دیا اور لشکریوں کے لئے تقسیم نہ کیا۔ (یعنی انہیں کوئی حصہ نہ دیا) تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر بطور عتاب یہ آیت نازل فرمائی: وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَ مَنْ يَّغْلُلْ یعنی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ بعض کو حصہ دے اور بعض کو چھوڑ دے۔ اور اس قول کی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور حضرت ابن عباس نے بھی، عکرمہ، ابن جبیر وغیرہم نے کہا ہے کہ یہ آیت ایک سرخ کپڑے کے سبب نازل ہوئی جو بدر کے دن مال غنیمت میں سے گم ہوا (1)، تو وہ لوگ جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ان میں سے بعض نے کہا: شاید حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لے لیا ہو، پس یہ آیت نازل ہوئی اسے ابوداؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (2)

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 574

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحروف والقراءات، حدیث 3457، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن عطیہ نے کہا ہے: کہا گیا ہے یہ قول مومنین کی جانب سے تھا انہوں نے یہ گمان نہیں کیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول منافقین کی جانب سے تھا اور یہ روایت بھی ہے کہ گم ہونے والی شے تلوار تھی۔ یہ اقوال بیان کئے جاسکتے ہیں اس بنا پر کہ قرأت یَغُلَّ یا کے فتحہ اور غین کے ضمہ کے ساتھ ہو۔

ابوصخر نے محمد بن کعب سے روایت کیا ہے وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ فرمایا: یہ آیت کہہ رہی ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ میں سے کوئی شے چھپائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں لام منقولہ ہے، یعنی و ما کان نبیٌّ لِیَغُل، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ ای ما کان اللہ لیتخذ ولدا (یعنی نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ کسی کو بیٹا بنا لے۔) (تو اس میں بھی لام منقولہ ہے۔) اور یُغَلَّ یعنی یاء کے ضمہ اور غین کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور ابن السکیت نے کہا ہے: [ہم نے غنیمت کے بارے میں نہیں سنا مگر غَلَّ غُلولاً، اور اسی طرح بھی پڑھا گیا ہے] وما كَانَ لِنَبِيٍّ اَن يُغَلَّ وَيُغَلَّ۔ فرمایا: یَغُلَّ کا معنی ہے یخون خیانت کرنا اور یُغَلَّ کا معنی ہے یُخَوَّنُ اور یہ لفظ دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے ان میں سے ایک یُخَانُ ہے، یعنی وہ شے جو مال غنیمت سے لی جاتی ہے اور دوسرا یُخَوَّن ہے۔ یعنی جسے غلول کی طرف منسوب کیا جاتا ہے: پھر کہا جاتا ہے ہر وہ جس نے کوئی شے چھپ کر لے لی تو اس نے غَلَّ يَغُلُّ غُلُوْلاً کا ارتکاب کیا۔ ابن عرفہ نے کہا ہے اس کا نام غُلول اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس سے ہاتھوں کو باندھ دیا گیا ہے، یعنی روک دیا گیا ہے۔

اور ابو عبید نے کہا ہے: الغُلول (خیانت) مال غنیمت کے ساتھ ہی خاص ہے اور ہم اسے نہ خیانت گمان کرتے ہیں اور نہ ہی کینہ اور حقد۔ اور جو اس کی وضاحت کرتا ہے کہ اسے خیانت کہا جائے وہ اَغَلَّ يُغِلَّ ہے اور اسے حقد کہا جائے اس کے لئے غَلَّ يَغِلَّ کسرہ کے ساتھ ہے، اور اسے غُلول کہا جائے وہ غَلَّ يَغُلُّ غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور غَلَّ البَعِيرُ بھی ہے۔ [يَغَلَّ غَلَّةً] بھی ہے جب وہ اپنا کثیر پانی پورا نہ کرے۔ اور اَغل الرجل کا معنی ہے آدمی نے خیانت کی۔ النمر نے کہا ہے:

جزى الله عنّا حَمزةَ ابنة نوفل جزاءَ مُغِلٍّ بالأمانة كَاذِبِ

اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے حمزہ بنت نوفل کو جزا دے (جیسا کہ) امانت میں خیانت کرنے والے جھوٹے کی جزا۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: لا اِغلالَ ولا اسلالَ (1) یعنی نہ کوئی خیانت ہے اور نہ کوئی سرقہ (چوری) ہے (2) اور کہا جاتا ہے: لا رشوةَ (اور نہ ہی کوئی رشوت ہے۔)

اور شریح نے کہا ہے: خیانت کرنے والے کے سوا کسی مستعیر (ادھار لینے والا) پر ضمان نہیں ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تین (چیزیں) ہیں جن پر مومن کا دل حقد و کینہ نہیں کرتا (3)۔'' جس نے اسے فتحہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کا معنی حقد اور کینہ ہے۔ اور غَلَّ [بمعنی دَخَل] کبھی متعدی ہوتا ہے اور کبھی متعدی نہیں ہوتا کہا جاتا ہے:

1۔ سنن ابی داود، کتاب الجہاد، حدیث 2385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 300

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسك باب الخطبة يوم النحر، صفحہ 226، وزارت تعلیم، اسلام آباد

ایضاً، ابن ماجہ، کتاب فضائل اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم باب من بلغ علما، حدیث 225، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

غَلَّ فلان المفاوز، یعنی فلاں جنگل میں داخل ہوا اور اس کے وسط تک پہنچا۔ اور غَلَّ من المغنم غلولا، یعنی اس نے مال غنیمت میں خیانت کی۔ اور غل الماء بین الأشجار (تب کہا جاتا ہے) جب پانی درختوں میں داخل ہو جائے (جاری ہو جائے)، ان تمام میں یَغُلَّ غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: الغُلُول کا لغوی معنی یہ ہے کہ وہ مال غنیمت سے کوئی شے لے لے اور اسے اپنے ساتھیوں سے چھپا لے اور اسی سے تغلغل الماء فی الشجر بھی ہے جبکہ پانی اس میں داخل ہو جائے اور الغلل کا معنی درخت کی جڑوں میں جاری پانی ہے، کیونکہ وہ درختوں کو چھپانے اور ڈھانپنے والا ہوتا ہے۔

جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

لعب السُّیُول به فأصبح ماؤه　　غَلَلاً یُقطِع فی اصول الخِرْوع

اور اس سے غِلالہ اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو کپڑوں کے نیچے پہنا جاتا ہے اور الغالُّ، اس سے مراد درختوں والی ہموار زمین ہے۔ اور سلم اور طلع کے درخت اگنے کی جگہ کو غال کہا جاتا ہے اور غال بھی ایک بوٹی ہے۔ اور اس کی جمع غُلّان غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور بعض لوگوں نے کہا ہے: یُغَلَّ کا معنی ہے یوجد غالاً۔ (اسے غال پایا جاتا ہے)، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: احمدت الرجل وجدته محمودًا یعنی میں نے فلاں آدمی کی تعریف کی (تو) میں نے اسے محمود پایا) اس تاویل کی بنا پر یہ قرأت یَغُلَّ یا کے فتحہ اور غین کے ضمہ کے ساتھ ہی کی طرف راجع ہوتی ہے اور یُغَلَّ کا معنی جمہور اہل علم کے نزدیک اس طرح ہے لیس لأحد أن یَـ ـہ یعنی کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مال غنیمت میں خیانت کرے۔

پس آیت میں مقصود لوگوں کو مال غنیمت میں خیانت کرنے سے روکنا اور منع کرنا ہے۔ اور اس پر وعید سنانا ہے۔ اور جس طرح یہ جائز نہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کی جائے اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ آپ کے سوا کسی اور سے خیانت کی جائے، لیکن ذکر خاص طور پر آپ کا کیا گیا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خیانت کرنا از روئے وقوع کے زیادہ شدید اور سخت ہے اور از روئے بوجھ اور ثقل کے بہت بڑی اور بھاری ہے، کیونکہ آپ کی موجودگی میں معصیت کا ارتکاب کرنا بہت بڑا جرم ہے کیونکہ آپ کی عزت و توقیر کرنا لازم ہے اور ایسے والی جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ہوں تو ان کے لئے بھی عزت و توقیر میں سے حصہ ہے۔ اور کہا گیا ہے: یَغُلَّ کا معنی ہے نبی علیہ السلام نے کبھی بھی خیانت نہیں کی اور مقصود نہی نہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یعنی وہ اس (خیانت کی ہوئی شے) کے ساتھ آئے گا درآنحالیکہ وہ اسے اپنی پیٹھ اور گردن پر اٹھائے ہوئے ہوگا۔ اور وہ اسے اٹھانے اور اس کے بوجھ کے سبب کبڑا ہوگا اور اس کی آواز سے خوفزدہ ہوگا اور تمام کے سامنے اس کی خیانت کا اظہار کر کے اسے زجر و توبیخ کی جائے گی، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور یہی وہ رسوائی ہے جس میں اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والے کو واقع کرے گا اور یہ اس رسوائی اور ذلت کی مثل ہے جس میں وہ دھوکہ دینے اور عہد توڑنے والے کو واقع کرے گا، اس طرح کہ اس کی سرین (بیٹھنے کی جگہ) کے پاس اس کے عذر اور خیانت کی مقدار جھنڈا نصب کیا جائے گا (1) اور اللہ تعالیٰ نے یہ سزائیں مقرر کی ہیں ان کے بارے جن کا انسان اس سے عہد

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجزیۃ، حدیث نمبر 2950، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرتا ہے اور وہ اسے سمجھتے ہیں۔

کیا آپ شاعر کے اس قول کی طرف نہیں دیکھتے:

أَسُمَیَّ وَیْحَكِ هل سَمِعتِ بِغَدْرَةٍ　　رُفِعَ اللواءُ لنا بها فی المَجْمَعِ

اے سُمیّ تیری ہلاکت ہو کیا تو نے غدر اور خیانت کے بارے سنا ہے کہ ہمارے لئے اس کے سبب جمع ہونے کی جگہ (میدان حشر) میں جھنڈا کھڑا کیا جائے گا۔

عرب لوگ معاہدہ توڑنے والے کے لئے جھنڈا بلند کرتے تھے اور اسی طرح جرم کرنے والے کو اس کی جنایت سمیت پھرایا جاتا تھا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور غلول (خیانت) کا ذکر کیا اور اسے بہت بڑا (جرم) قرار دیا اور اس کے امر کو عظیم اور شدید قرار دیا پھر فرمایا: ''میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر اونٹ اپنی آواز نکال رہا ہو گا وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر گھوڑا اپنی آواز نکال رہا ہو گا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں۔ تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اس کی گردن پر بکری اپنی آواز نکال رہی ہو گی تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر ایک آدمی چیخ و پکار کر رہا ہو گا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں۔ تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر لکھے ہوئے کاغذ حرکت کر رہے ہوں گے (مراد وہ کاغذ ہیں جن پر اس کے ذمے واجب الاداء حقوق لکھے ہوں گے) اور وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھ تک (پیغام) پہنچا دیا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر سونا چاندی ہو گا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا۔ (1)'' اور ابو داؤد نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مال غنیمت پاتے تھے تو آپ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیتے تو وہ لوگوں میں اعلان کر دیتے اور وہ اپنے غنائم لے کر آ جاتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا خمس نکالتے تھے اور اسے تقسیم کر دیتے، پس ایک دن اعلان کے بعد ایک آدمی بالوں کی رسی لے کر آیا اور اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ اس مال میں سے تھی جو ہم نے غنیمت کے طور پر حاصل کیا ہے۔ تو آپ

1۔ مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 123-122، قدیمی کتب خانہ کراچی۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، حدیث نمبر 2844، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کیا تو نے بلال کو سنا ہے وہ تین بار اعلان کرتا ہے؟" اس نے عرض کی: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: "تجھے کس نے روکا ہے کہ تو اسے لے کر آئے؟" تو اس نے معذرت پیش کی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "خبردار! تو قیامت کے دن اس کے ساتھ آئے گا اور میں اسے تجھ سے قبول نہ کروں گا۔" (1)

بعض علماء نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن اس بوجھ کا عوض پورا پورا دیا جائے گا جیسا کہ دوسری آیت میں کہا ہے: وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ۗ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝ (الانعام) (اور وہ اٹھائے ہوئے ہیں اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر ارے کتنا برا بوجھ ہے جسے وہ اٹھائے ہوئے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے: خبر امر کے مشہور ہونے پر محمول ہے، یعنی وہ قیامت کے دن آئے گا اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ اس کے امر کی تشہیر کرے گا جیسا کہ تشہیر کی جاتی ہے اگر اس نے اونٹ کو اٹھایا اس کی آواز ہوگی یا گھوڑا اٹھایا (تو) اس کی آواز ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حقیقت سے مجاز اور تشبیہ کی طرف عدول ہے اور جب کلام حقیقت اور مجاز کے درمیان دائر ہو تو حقیقت اصل ہے جیسا کہ کتب اصول میں ہے۔ تحقیق نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حقیقت کے بارے خبر دی ہے "شادی کے بعد عطر نہیں ہے"۔ اور کہا جاتا ہے: بے شک جس نے دنیا میں کسی شے کی خیانت کی قیامت کے دن جہنم میں اس کی تمثیل بنائی جائے گی پھر اسے کہا جائے گا: اس کی طرف اترو اور اسے پکڑلو، پھر وہ اس کی طرف اترے گا۔

پس جب وہ اس تک پہنچے گا تو اسے اٹھالے گا، یہاں تک کہ جب دروازے تک پہنچے گا تو اس سے جہنم کے نچلے حصے کی طرف گر جائے گا، پھر وہ اس کی طرف لوٹ آئے گا اور اسے پکڑ لے گا، جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا اسی طرح ہوتا رہے گا اور کہا جاتا ہے: "وہ اس کے ساتھ آئے گا جس کی اس نے خیانت کی" یعنی قیامت کے دن وہ خیانت اور غلول اس پر شہادت دیں گے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء نے بیان کیا ہے: غلول (خیانت کرنا) کبائر میں سے ایک کبیرہ گناہ ہے اور اس پر دلیل یہ آیت اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جو ہم نے ذکر کی ہے کہ وہ اسے اپنی گردن پر اٹھائے گا۔ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدعم کے بارے میں فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے بے شک وہ چادر جو خیبر کے دن اس نے مال غنیمت سے اٹھائی اور وہ تقسیم میں شامل نہ ہوئی یقیناً وہ اس پر آگ بھڑکائے گی، فرمایا: پس جب لوگوں نے یہ سنا تو ایک آدمی ایک یا دو تسمے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ایک یا دو تسمے بھی آگ میں سے ہیں" اسے موطا نے نقل کیا ہے (2)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد: والذی نفسی بیدہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیانت کرنے والے پر نماز (جنازہ) پڑھنے سے انکار کرنا غلول (خیانت) کے بہت بڑا ہونے اور اس میں بہت بڑا گناہ ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ کبائر میں سے ہے، اور یہ آدمیوں کے حقوق میں سے ہے اور اس میں نیکیوں اور بدیوں کے بارے میں قصاص ضروری ہے، پھر اس کے مالک کی مرضی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول: شِراكٌ اَوْ شِراكانِ من نار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول کی مثل ہے: اَدُّوا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 15، اسلام آباد

2۔ موطا امام مالک، کتاب الجہاد، صفحہ 475، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث 3908، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الخِیاط و المخیط (1) (دھاگہ اور سوئی ادا کرو) اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ غزوہ میں تقسیم سے پہلے تھوڑا اور زیادہ مال لینا حلال نہیں ہے، مگر وہ جس پر تمام کا اجماع ہو جائے مثلاً جنگ کی زمین میں کھانے کی اشیاء، ایندھن کی لکڑیاں اور شکار وغیرہ۔

اور زہری سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: دشمن کی زمین میں امام کی اجازت کے بغیر کھانے کی کوئی شے نہیں لی جائے گی۔ اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے، کیونکہ آثار اس کے خلاف ہیں جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ حسن نے کہا ہے: رسول اللہ ﷺ کے اصحاب جب کوئی شہر یا قلعہ فتح کرتے تھے تو ستو، آٹا، گھی اور شہد کھا لیا کرتے تھے۔ اور ابراہیم نے کہا ہے: وہ دار الحرب میں دشمن کی زمین سے خمس نکالنے سے پہلے کھانے کی اشیاء اور جانوروں کا چارہ وغیرہ لے لیا کرتے تھے۔ اور عطا نے کہا ہے: لشکری سریہ میں ہوتے تھے اور وہ گھی کے مشکیزے، شہد اور طعام پاتے تھے اور انہیں کھاتے تھے اور جو کچھ باقی رہ جاتا وہ اسے اپنے امام کے پاس لوٹا دیتے تھے اور جماعت علماء کا نظریہ یہی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس حدیث میں اس پر دلیل ہے کہ غلول کرنے والے کا سامان جلایا نہیں جائے گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس آدمی کا سامان نہیں جلایا جس نے چادر اٹھائی تھی اور نہ ہی آپ نے اس موتیوں والے کا سامان جلایا تھا جس پر آپ نے نماز جنازہ چھوڑ دی تھی، اگر اس (خیانت کرنے والے) کا سامان جلانا واجب ہوتا تو آپ ﷺ یقیناً اس پر عمل کرتے، اور اگر آپ ایسا کرتے تو یقیناً وہ حدیث میں نقل کیا جاتا (2)۔ اور رہی وہ روایت جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''جب تم کسی آدمی کو پاؤ اس حال میں کہ اس نے (مال غنیمت میں) خیانت کی ہو تو تم اس کا ساز و سامان جلا دو اور اسے مارو (3)''۔ تو اسے ابوداؤد اور ترمذی نے صالح بن محمد بن زائدہ کی حدیث سے روایت کیا ہے اور یہ ضعیف راوی ہے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

ترمذی نے کہا ہے: میں نے اس حدیث کے بارے محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا: بلاشبہ اسے صرف صالح بن محمد نے روایت کیا ہے اور وہ ابو واقد اللیثی ہے اور وہ منکر الحدیث ہے اور ابوداؤد نے بھی اس سے روایت کیا ہے اس نے کہا ہے: ہم نے ولید بن ہشام کی معیت میں جنگ لڑی اور ہمارے ساتھ سالم بن عبداللہ بن عمر اور عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہم بھی تھے۔ پس ایک آدمی نے سامان (غنیمت) میں خیانت کی۔ پس ولید نے اس کے سامان کے بارے حکم دیا اور اسے جلا دیا، اور اسے پھرایا گیا اور اسے اس کا حصہ بھی نہ دیا۔ ابوداؤد نے کہا ہے: یہ دونوں حدیثوں میں سے زیادہ صحیح ہے۔ اور عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے (مال غنیمت میں) خیانت کرنے والے کا سامان جلا دیا اور انہوں نے اسے مارا (4)۔

1۔ ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2319، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث 2335، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث 2837، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ابی داؤد، کتاب الجہاد باب فی عقوبۃ الغال، جلد 2، صفحہ 15، اسلام آباد۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 2338، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2340، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابوداؤد نے کہا ہے: اور اس میں علی بن بحر نے ولید سے یہ زیادہ کیا ہے..... ولم اسمعه منه (اور میں نے اسے اس سے نہیں سنا)..... و منعوه سهمه (اور انہوں نے اسے اپنے حصہ سے روک دیا) ابوعمر نے بیان کیا ہے: اس حدیث کے بعض راویوں نے کہا ہے: اور تم اس کی گردن ماردو اور اس کا ساز وسامان جلادو۔ اور یہ حدیث صالح بن محمد کے اردگرد گھومتی ہے اور یہ راوی ان میں سے نہیں ہے جنہیں حجت بنایا جاسکتا ہے۔

اور تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے کسی ایک کے ساتھ (1)۔'' اور یہ روایت غلول کی صورت میں قتل کی نفی کرتی ہے۔ اور ابن جریج نے ابوالزبیر سے، انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خیانت کرنے والے، چھیننے والے اور اچک کر لے جانے والے پر قطع (ید) نہیں ہے (2)۔'' اور غال (مال غنیمت سے مال اٹھانے والا) لغت میں خائن (خیانت کرنے والا) ہی ہے اور شریعت نے اس سے جب قطع ید کی نفع کردی ہے تو پھر قتل کی نفی بدرجہ اولیٰ ہوگی۔

اور امام طحاوی نے کہا ہے: اگر صالح کی مذکورہ حدیث صحیح ہو تو پھر یہ احتمال ہے کہ اس وقت یہ مالوں میں سزا ہو، جیسا کہ زکوٰۃ کا انکار کرنے والے کے بارے میں فرمایا: ''بے شک ہم زکوٰۃ اور اس کے مال کا نصف حصہ لیں گے، (کیونکہ) یہ اللہ تعالیٰ کے حقوق اور واجبات میں سے ایک حق اور واجب ہے (3)۔'' اور اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے چھپائے ہوئے اونٹ کے گم ہونے کی صورت میں کہا ہے: اس میں اس (اونٹ) کا تاوان بھی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل (اونٹ) بھی ہے (4)۔ اور اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے لٹکے ہوئے پھل کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اس میں اس کی دو مثل تاوان ہے اور سزا کے کوڑے بھی ہیں (5)۔ یہ سب روایات منسوخ ہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ جب کسی آدمی نے مال غنیمت سے خیانۃً کچھ لے لیا اور پھر وہ پایا گیا تو وہ اس سے لے لیا جائے، اور اسے ادب سکھایا جائے اور تعزیری سزا دی جائے۔ اور امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام لیث رحمہم اللہ علیہم کے نزدیک یہ ہے کہ اس کا سامان نہیں جلایا جائے گا۔ اور امام شافعی، لیث اور داؤد نے کہا ہے: اگر وہ نہی کو جانتا ہو (یعنی اگر اسے یہ معلوم ہو کہ ایسا کرنا ممنوع ہے) تو اسے سزا دی جائے گی۔ اور امام اوزاعی نے کہا ہے: (مال غنیمت میں) خیانت کرنے والے کا تمام سامان جلا دیا جائے گا سوائے اس کے ہتھیار اور ان کپڑوں کے جو وہ پہنے ہوئے ہو اور اس کی زین کے، اور اس کی سواری اس سے نہیں چھینی جائے گی، اور نہ ہی وہ شے جلائی جائے گی جو خیانۃً اٹھائی گئی اور امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہما کا قول

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 1016، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 6370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 175، اسلام آباد۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 3817، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 2580، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ باب فی زکوٰۃ السائمۃ، جلد 1، صفحہ 221، اسلام آباد
4۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللقطۃ، حدیث نمبر 1460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ ابی داؤد، ایضاً، حدیث نمبر 1455، ایضاً

ہے، اور حسن نے یہی کہا ہے، مگر یہ کہ وہ حیوان یا مصحف ہو (تو پھر یہ سزا نہیں دی جائے گی۔) اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما دونوں نے غلول کرنے والے کو مارا اور اس کا سامان جلا دیا۔ ابن عبدالبر نے بیان کیا ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ غلول کرنے والے کا کجاوہ اور اس کا سامان سب جلا دیا جائے گا ان میں سے مکحول اور سعید بن عبدالعزیز ہیں۔ اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے ان کی دلیل صالح مذکور کی حدیث ہے۔ اور ہمارے نزدیک وہ ایسی حدیث ہے جس کے ساتھ تیر اکشی حرمت کو ختم کرنا ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی حکم کو نافذ کرنا (ثابت ہوتا ہے) کیونکہ اس کے معارض ایسے آثار ہیں جو اس کی نسبت زیادہ قوی ہیں۔ اور جو موقف امام مالک اور آپ کے متبعین نے اس مسئلے میں اختیار کیا ہے وہ نظر وفکر اور اثر کے صحیح ہونے کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ بدنی سزا میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب مختلف نہیں ہے، اور رہی مالی سزا تو انہوں نے اس ذمی کے بارے میں کہا ہے جو شراب کسی مسلمان کو فروخت کرتا ہے کہ مسلمان کے پاس شراب کو بہا دیا جائے گا، اور ذمی سے بطور سزا ثمن چھین لئے جائیں گے تاکہ وہ مسلمانوں کو شراب کی فروخت نہ کرے تو اس بنا پر یہ کہنا جائز ہے کہ مال میں سزا دینا جائز ہوتا ہے۔ تحقیق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ دودھ بہا دیا جس میں پانی ملایا گیا تھا۔

مسئلہ نمبر 7۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ (مال غنیمت سے) خیانۃً مال لینے والے کے لئے لازم ہے کہ وہ تمام مال جو بطور خیانت اس نے اٹھایا اسے لوگوں کے منتشر ہونے سے پہلے تقسیم کرنے والے کے پاس لوٹا دے اگر وہ اس تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ پالے، اور بلاشبہ جب اس نے ایسا کر لیا تو یہی اس کی توبہ ہوگی اور گناہ سے بچ نکلنے کا ذریعہ ہوگا۔ اور جب اہل لشکر منتشر ہو جائیں اور وہ اس تک نہ پہنچ سکے تو جو کچھ اس کے ساتھ کیا جائے گا اس میں اختلاف ہے، علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: وہ اس کا خمس امام کو دے دے اور باقی صدقہ کر دے گا۔ یہ امام زہری، مالک، اوزاعی، لیث اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم کا مذہب ہے، اور حضرات عبادہ بن صامت، معاویہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے مذہب سے مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ یہ دونوں یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ مال صدقہ کر دیا جائے جس کے مالک کا علم نہ ہو، اور یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے غیر کا مال صدقہ کرنا درست نہیں۔ ابوعمر نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ایسی صورت میں ہے جب اس کے مالک کو پانا، اس تک پہنچنا یا اس کے ورثا تک پہنچنا ممکن ہو، اور اگر ان میں سے کوئی شے بھی نہ ہو تو اس صورت میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی صدقہ کرنے کو مکروہ نہیں قرار دیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ لقطہ (گری ہوئی چیز جو مل جائے) کو صدقہ کرنا جائز ہے جبکہ پہلے اس کی تشہیر کی جائے اور اس کے مالک کا علم نہ ہو سکے، اور پھر اس کے بارے یہ حکم لگایا ہے کہ اگر وہ (مالک) آ جائے ..... تو اسے اجرت اور ضمان کے درمیان اختیار دیا جائے گا، اور اسی طرح غصب کی ہوئی شے کا حکم بھی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

اور غلول کے علیحدہ ذکر میں اس پر دلیل ہے کہ مال غنیمت میں تمام غانمین (لشکری) شریک ہیں، پس کسی کے لئے یہ

حلال نہیں کہ وہ اس میں سے کوئی شے دوسرے (کی اجازت) کے بغیر لے، پس جس نے بھی اس میں سے کوئی شے غصب کی تو بالاتفاق اسے تادیبی سزا دی جائے گی، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اگر کسی نے کسی لونڈی کے ساتھ وطی کی یا نصاب کے برابر (دس درہم) مال چوری کیا تو اس پر حد قائم کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے اور ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ اس پر قطع ید نہ ہوگی۔

مسئلہ نمبر 9۔ عمال کے ہدایا اور تحائف بھی غلول میں سے ہیں، اور آخرت میں ذلت و رسوائی کے اعتبار سے اس کا حکم غلول کرنے والے کے حکم کی طرح ہے۔ ابوداؤد نے اپنی سنن میں (1) اور مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابوحمید الساعدی سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ازد کے ایک آدمی کو صدقہ وصول کرنے پر عامل مقرر کیا اسے ابن اللتبیہ کہا جاتا تھا [ابن سرح نے ابن الاتبیہ کہا ہے]، پس وہ آیا اور اس نے کہا: یہ تمہارے لئے ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر فرمایا: ''عامل کو کیا ہو گیا ہے جسے ہم بھیجتے ہیں اور وہ آکر یہ کہتا ہے یہ تمہارے لئے ہے اور یہ (مال) مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے خبردار سنو! وہ اپنی ماں یا اپنے باپ کے گھر بیٹھا رہے اور پھر دیکھے کیا اسے کوئی ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں، تم میں سے کوئی بھی ان میں سے جو شے بھی لائے گا قیامت کے دن وہ اس کے ساتھ آئے گا اگر وہ اونٹ ہوا تو اس کی آواز ہوگی، اور اگر وہ گائے ہوئی تو اس کی آواز ہوگی اور اگر وہ بکری ہوئی تو وہ اس کی آواز نکالے گا۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ بلند فرمائے یہاں تک کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی دیکھ لی۔ پھر آپ نے کہا:...... اللّٰھم ھل بَلّغتُ اللّٰھم ھل بلغت (2) (اے اللہ! کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے اے اللہ! کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے؟)

اور ابوداؤد نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: ''جسے ہم کسی عمل پر عامل مقرر کرتے ہیں تو ہم اس کے لئے مناسب وظیفہ مقرر کر دیتے ہیں پس اس کے بعد اس نے جو کچھ لیا تو وہ غلول (خیانت) ہوگا۔'' (3)

اور انہوں نے حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساعی (عامل) بنا کر بھیجا۔ اور پھر فرمایا: ابا مسعود! تو جا اور میں تجھے قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ تیری پشت پر صدقہ کے اونٹوں میں سے کوئی اونٹ آئے اور وہ اپنی آواز نکال رہا ہو کہ تو نے اسے بطور خیانت حاصل کیا تھا'' انہوں نے عرض کی: تب میں نہیں جاؤں گا، آپ نے فرمایا: ''سو میں تجھے مجبور نہ کروں گا (4)۔'' جو روایت ابوداؤد نے ہی مستورد بن شداد سے نقل کی ہے اس نے ان احادیث کو مقید کر دیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جو ہمارا عامل ہو اسے چاہیے کہ وہ بیوی حاصل کر لے (یعنی نکاح کر لے) اور اگر اس کے پاس خادم نہ ہو تو وہ خادم حاصل کر لے اور اگر اس

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفیئ، حدیث 2557، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث 6639، ایضاً

2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 123، قدیمی کتب خانہ کراچی۔ ایضاً سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفیئ، جلد 2، صفحہ 53، اسلام آباد

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفیئ، جلد 2، صفحہ 52، اسلام آباد 4۔ ایضاً صفحہ 53، اسلام آباد

کے پاس مسکن (رہنے کے لئے گھر) نہ ہو تو رہائش گاہ بنالے (1)"۔ فرمایا پس ابوبکر نے بیان کیا ہے: مجھے خبر دی گئی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے اس کے سوا کچھ لیا تو وہ غلول کرنے والا اور سارق (چوری کرنے والا) ہے۔" واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ کتب کو ان کے مالکوں سے روک کر رکھنا بھی غلول میں سے ہے، اور ان کے علاوہ دیگر چیزیں بھی ان کے معنی میں داخل ہیں۔ زہری نے کہا ہے: کتب کی خیانت سے بچ، پرہیز کر۔ تو انہیں کہا گیا: کتب کا غلول کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: انہیں ان کے اصحاب سے روک کر رکھنا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تاویل میں کہا گیا ہے: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ یعنی نبی کی شان نہیں ہے کہ وہ بطور رغبت یا رہبت یا مداہنت کے وحی میں سے کوئی شے چھپالے۔ اور وہ اس لئے کہ قرآن کریم میں ان کے دین کے عیب بیان کئے گئے ہیں اور ان کے معبودان باطلہ کو جو برا کہا گیا ہے وہ اسے ناپسند کرتے تھے۔ تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ اسے لپیٹ دیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، محمد بن بشار نے اسے بیان کیا ہے اور ہم نے اس کے بارے جو ابتدا میں بیان کیا ہے وہ جمہور کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اس کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔

أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

"تو کیا جس نے پیروی کی رضائے الٰہی کی اس کی طرح ہوسکتا ہے جو حقدار بن گیا ہے اللہ کی ناراضگی کا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بہت بری پلٹنے کی جگہ ہے۔ لوگ درجہ بدرجہ ہیں اللہ کے ہاں اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے جو وہ کرتے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ یعنی جو غلول کو ترک کرنے کا اور جہاد پر صبر کرنے (ڈٹے رہنے) کا ارادہ کرتا ہے۔ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ (اس کی طرح ہوسکتا ہے) جو کفر یا غلول یا جنگ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیٹھ پھیرنے کا ارادہ کرتا ہے وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ یعنی اس کا ٹھکانا جہنم ہے، یعنی اگر اس نے توبہ نہ کی یا اللہ تعالیٰ نے اسے معاف نہ کیا۔ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ یعنی لوٹنے کی جگہ بہت بری ہے۔ اور رِضْوَانُ کو را کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے جیسا کہ عُدْوان اور عِدْوان۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی پیروی اور اتباع کی وہ اس کی طرح نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا حقدار بن گیا ہے۔ کہا گیا ہے: هُمْ دَرَجٰتٌ متفاوتۃ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے درجات اور منازل مختلف ہیں، پس جس نے رضائے الٰہی کی پیروی کی اس کے لئے عزت و کرامت اور ثواب عظیم ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا حقدار بن گیا اس کے لئے ذلت، رسوائی اور دردناک عذاب ہے اور هُمْ دَرَجٰتٌ کا معنی ہے ذوو درجات (وہ صاحب درجات ہیں) یا علی درجات (وہ درجات پر ہیں) اوفی درجات (یا وہ درجات میں ہیں) یا لھم درجات (یا ان کے لئے درجات ہیں) اور اہل نار بھی درجات والے ہیں، جیسا کہ فرمایا: و جدتہ فی غمرات من النار

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفیئ، جلد 2، صفحہ 53-52، اسلام آباد

فاخرجتہ الی ضَحضَاح(1) (میں نے اسے آگ کی تکالیف میں پایا تو میں نے اسے تھوڑے سے پانی کی طرف نکال دیا۔)

پس مومن اور کافر درجہ میں برابر اور مساوی نہیں ہوں گے، پھر مومنین بھی مختلف ہوں گے، پس ان میں سے بعض بعض سے بلند رتبہ پر ہوں گے اور اسی طرح کفار بھی۔ اور درجہ کا معنی رتبہ ہے اور اسی سے الدّرَجِ ہے (لکھا جانے والا کاغذ) کیونکہ اسے درجہ بدرجہ لپیٹا جاتا ہے۔ اور جہنم کے مراتب میں مشہور درکات ہیں۔

جیسا کہ فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء:145) (بے شک منافقین جہنم کے نیچے والے درکہ (گڑھے) میں ہوں گے) پس جس نے غلول نہیں کیا اس کے لئے جنت میں درجات ہوں گے اور جس نے غلول کیا اس کے لئے جہنم میں درکات ہوں گے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے: جہنم کی کئی منازل ہیں اور ان میں سے ہر منزل کو درک اور درک کہا جاتا ہے اور درک نیچے کی طرف ہوتا ہے اور درج اوپر، بلندی کی جانب ہوتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۶۴﴾

''یقیناً بڑا احسان فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جب اس نے بھیجا ان میں سے ایک رسول انہیں میں سے پڑھتا ہے ان پر اللہ کی آیتیں اور پاک کرتا ہے انہیں اور سکھاتا ہے انہیں قرآن وسنت۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر ان پر اپنے احسان عظیم کو بیان فرمایا ہے اور اس میں احسان کرنے کے معنی میں کئی اقوال ہیں: ان میں ایک یہ ہے کہ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کا معنی ہو بَشَرٌ مثلهم۔ یعنی آپ ان کی مثل بشر ہیں۔ پس جب دلائل واضح ہیں کہ آپ ان کی مثل بشر ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ای منهم۔ یعنی آپ ان میں سے ہیں۔

پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشرف و مکرم ہوئے ہیں پس یہ بھی ایک احسان ہے اور یہ قول بھی ہے: مِّنْ اَنْفُسِهِمْ تاکہ وہ آپ کی حالت کو پہچان سکیں اور ان پر آپ کا طریقہ اور سنت مخفی نہ رہے۔ اور جب ان میں آپ کا مقام یہ ہے تو وہ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قتال اور جنگ کریں اور قطعاً آپ سے دور نہ بھاگیں۔ اور قرأت شاذہ میں مِّنْ اَنْفُسِهِمْ فا کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی آپ ان میں اشرف و اعلیٰ (خاندان) میں سے ہیں، کیونکہ آپ بنی ہاشم میں سے ہیں اور بنو ہاشم قریش سے افضل ہیں اور قریش بقیہ عربوں سے افضل ہیں اور عرب غیر عربوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔

لفظ مومنین عام ہے اور اس کا معنی عرب میں خاص ہے، کیونکہ عرب قبائل میں سے کوئی قبیلہ نہیں ہے مگر اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنم دیا ہے اور ان کی آپ کے ساتھ نسبت موجود ہے، سوائے بنی تغلب کے کیونکہ وہ نصاریٰ تھے اور اللہ تعالیٰ نے نصرانیت کی میل سے آپ کو پاک صاف رکھا اور اس تاویل کا بیان اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 115، اسلام آباد

(الجمعہ:2) (وہی (اللہ) جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں ایک رسول انہیں میں سے)

اور ابو محمد عبدالغنی نے بیان کیا ہے کہ ابواحمد البصری، احمد بن علی بن سعید القاضی، ابوبکر المروزی، یحییٰ بن معین، ہشام بن یوسف نے عبداللہ بن سلیمان نوفلی سے انہوں نے زہری سے، انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ آیت لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ صرف عرب والوں کے لئے ہے(1) اور دوسروں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے تمام کے تمام مومنین مراد لئے ہیں (2)۔ اور مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کا معنی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے ایک ہیں اور انہیں کی مثل بشر ہیں اور بلاشبہ آپ وحی کے سبب ان سے ممتاز ہیں اور یہی معنی اس ارشاد کا ہے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (التوبۃ:128) (بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک برگزیدہ رسول تم میں سے)۔ اور مومنین کو ذکر کے ساتھ اس لئے خاص کیا ہے کیونکہ وہی آپ سے نفع اٹھانے والے ہیں، پس ان پر احسان عظیم تر ہوا۔

اور قول باری تعالیٰ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ میں يَتْلُوْا۔ رَسُوْلًا کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اس کا معنی ہے یقرءُ (وہ پڑھتا ہے) اور تلاوت بمعنی قراءت ہے۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ کا معنی ہے: لقد کانوا من قبل محمد تحقیق وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تھے، اور یہ بھی کہا ہے کہ اِنْ بمعنی مَا ہے اور خبر میں لام بمعنی الا ہے یعنی وَ مَا کانوا من قبلُ الا فی ضلالٍ مُّبِيْنٍ (وہ اس سے پہلے نہ تھے مگر کھلی گمراہی میں) اور اسی کی مثل یہ آیت بھی ہے وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ یعنی و ما کنتم من قبلہ الا من الضالین (اور تم اس سے پہلے نہ تھے مگر کھلی گمراہی میں) اور یہ کوفیوں کا مذہب ہے اور اس آیت کا معنی سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾

''کیا جب پہنچی تمہیں کچھ مصیبت حالانکہ تم پہنچا چکے ہو (دشمن کو) اس سے دگنی تو تم کہہ اٹھے کہاں سے آ پڑی یہ مصیبت؟ فرمائیے! یہ تمہاری طرف سے ہی آئی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس میں الف استفہام کے لئے ہے اور واؤ عطف کے لئے۔ مُّصِيْبَةٌ اس سے مراد غلبہ ہے قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا یعنی بدر کے دن تم اس سے دگنی پہنچا چکے ہو، اس طرح کہ تم نے ان میں سے ستر افراد قتل کئے اور ستر کو تم نے قیدی بنایا۔ اور قیدی مقتول کے حکم میں ہوتا ہے، کیونکہ قید کرنے والا اگر چاہے تو اپنے قیدی کو قتل کر سکتا ہے، یعنی تم نے انہیں بدر کے دن اور احد کے دن بھی ابتدا میں شکست سے دو چار کیا اور اس میں تم نے تقریباً بیس افراد قتل کئے، (گویا) تم نے ان میں سے دونوں دنوں میں افراد قتل کئے اور انہوں نے تم سے احد کے دن (کچھ افراد) شہید کئے۔

قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا یہ شکست اور قتل (کی مصیبت) ہمیں کہاں سے آ پہنچی ہے، حالانکہ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ رہے ہیں اور ہم

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 577 2۔ ایضاً

مسلمان ہیں اور ہم میں نبی مکرم ﷺ بھی ہیں اور وحی بھی ہیں اور وہ مشرک ہیں۔ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ (فرمایئے یہ تمہاری طرف سے ہی آئی ہے) یعنی تیر اندازوں کی مخالفت کے سبب اور کوئی قوم نہیں ہے جس نے اپنے نبی علیہ السلام کی جنگ میں اطاعت و فرمانبرداری کی مگر ان کی مدد کی گئی، کیونکہ جب وہ اطاعت کرتے ہیں تو پھر وہ الله تعالیٰ کا گروہ ہے اور الله تعالیٰ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے اور حضرت قتادہ اور ربیع بن انس نے کہا ہے: مراد ان کا حضور نبی کریم ﷺ سے مدینہ طیبہ سے (دشمن کے مقابلے کے لئے) باہر نکلنے کا سوال کرنا ہے اس کے بعد کہ آپ ﷺ وہاں مقیم رہنے کا ارادہ فرما چکے تھے اور آپ ﷺ نے یہ تاویل اس خواب کی فرمائی تھی جس میں آپ نے اسے محفوظ قلعہ دیکھا تھا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس سے مراد ان کا بدر کے دن (قیدیوں کے) قتل پر فدیہ لینے کو اختیار کرنا ہے(1)، حالانکہ انہیں کہا گیا تھا اگر تم نے قیدیوں کے بدلے فدیہ لیا تو ان کی تعداد کے برابر تم سے لوگ شہید کئے جائیں گے۔ اور بیہقی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: حضور نبی مکرم ﷺ نے بدر کے دن قیدیوں کے بارے میں فرمایا: ''اگر تم چاہو تو انہیں قتل کر دو اور اگر تم چاہو تو ان کا فدیہ لے لو اور تم نے فدیہ سے مفاد حاصل کیا اور تم میں سے ان کی تعداد کے برابر شہید کر دیئے گئے۔'' اور سترھویں نمبر پر آخر میں شہید ہونے والے صحابی حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ تھے انہیں جنگ یمامہ میں شہید کیا گیا۔ پس مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ کا معنی پہلے دو قولوں کے مطابق بذنوبکم (یعنی تم اپنے گناہوں کے سبب اس مصیبت میں مبتلا ہوئے ہو) اور آخری قول کے مطابق باختیارکم (یعنی یہ مصیبت تمہارے اپنے اختیار کے سبب آئی ہے۔)

وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِیَعْلَمَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَ لِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَ قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ یَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِیْمَانِ ۚ یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾

''اور وہ مصیبت جو پہنچی تھی تمہیں اس روز جب مقابلہ کو نکلے تھے دونوں لشکر تو وہ الله کے حکم سے پہنچی تھی اور (مقصد یہ تھا کہ) دیکھ لے الله تعالیٰ مومنوں کو۔ اور دیکھ لے جو نفاق کرتے تھے اور کہا گیا ان سے آؤ لڑو الله کی راہ میں یا بچاؤ کرو (اپنے شہر کا) بولے اگر ہم جانتے کہ جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہاری پیروی کرتے وہ کفر سے اس روز زیادہ قریب تھے بہ نسبت ایمان کے کہتے ہیں اپنے منہ سے (ایسی باتیں) جو نہیں ہیں ان کے دلوں میں اور الله تعالیٰ خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔''

یعنی (وہ مصیبت) جو احد کے دن قتل، زخم اور ہزیمت کی صورت میں پہنچی۔ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ تو وہ الله تعالیٰ کے علم میں تھی۔ اور یہ بھی کہا ہے: وہ الله تعالیٰ کی قضا اور تقدیر کے ساتھ پہنچی۔ قفال نے کہا ہے: پس وہ الله تعالیٰ کے تمہارے اور ان کے درمیان

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 577

معاملہ آزاد چھوڑنے کے سبب پہنچی، نہ کہ اس نے اس کا ارادہ کیا اور یہ معتزلہ کی تاویل ہے۔ اور فَبِاِذْنِ اللّٰهِ میں فا داخل ہے کیونکہ مَا بمعنی الذی ہے۔ یعنی وہ مصیبت جو تمہیں اس دن پہنچی جب دونوں لشکر مقابلے کے لئے نکلے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور قضا سے پہنچی۔ پس کلام شرط کے معنی کے مشابہ ہو گیا، جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے: الذی قام فله درهم (جو کھڑا ہوا تو اس کے لئے ایک درہم ہے) وَ لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا یعنی تاکہ وہ (مومنین اور منافقین کو) الگ الگ کر دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تاکہ مومنین کا ایمان جنگ میں ان کے ثابت قدم رہنے کے ساتھ ظاہر ہو جائے اور تاکہ منافقین کا کفران کے (مصیبت پر) خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ ظاہر ہو جائے پس وہ اسے جان لیں گے۔ اور قول باری تعالیٰ نَافَقُوْا ۚ وَ قِيْلَ لَهُمْ سے اشارہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ان ساتھیوں کی طرف ہے جو اس کی معیت میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد و نصرت سے واپس لوٹ گئے تھے اور وہ تین سو تھے اور ان کے پیچھے عبداللہ بن عمرو بن حرام انصاری اور ابو جابر بن عبداللہ بھی چلے، تو آپ نے انہیں فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے نبی کو نہ چھوڑو اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال کرو یا بچاؤ کرو اور اسی طرح کی بات کہی۔ ابن ابی نے آپ کو کہا: میں نہیں جانتا تھا کہ جنگ ہوگی اور اگر ہم جانتے کہ جنگ ہوگی تو یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہوتے۔ پس جب عبداللہ ان سے مایوس ہو گیا تو اس نے کہا: (اے) اللہ کے دشمنو! تم جاؤ پس اللہ تعالیٰ اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے مستغنی کر دے گا۔ اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلا گیا اور شہید کر دیا گیا رحمۃ اللہ علیہ۔(1)

قول باری تعالیٰ: اَوِ ادْفَعُوْا کے معنی میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے پس سدی اور ابن جریج وغیرہما نے کہا ہے: تم ہماری تعداد میں اضافہ کرو اگرچہ تم ہمارے ساتھ مل کر جنگ نہ کرو۔ تو یہ دشمن کو روکنے اور اسے دور ہٹانے کا (سبب بن) جائے گا(2)، کیونکہ تعداد جب بڑھ جائے تو دشمن کو دور ہٹانے اور دفاع کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: میں نے جنگ قادسیہ کے دن حضرت عبداللہ بن ام مکتوم الاعمیٰ کو دیکھا وہ زرہ پہنے ہوئے ہیں اور اس کی اطراف کھینچ رہے ہیں اور ان کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا جھنڈا ہے، تو ان کو کہا گیا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو معذور نہیں قرار دیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! لیکن میں اپنی ذات کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کر رہا ہوں۔ اور انہی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں میرا وجود کیسا ہے؟(3)

اور ابو عون انصاری نے کہا ہے: اَوِ ادْفَعُوْا کا معنی ہے رابطوا (سرحد کے پاس دشمن کے مقابلے میں پڑاؤ ڈالو) اور یہ معنی پہلے کے قریب ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ مقابلے میں پڑاؤ ڈالنے والا دفاع کرنے والا ہی ہوتا ہے، کیونکہ اگر سرحد پر پڑاؤ ڈالنے والوں کی جگہ نہ ہو تو یقیناً وہاں تک دشمن آ جائے۔ اور مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اَوِ ادْفَعُوْا یہ جنگ کی طرف دعوت ہے از روئے حمیت کے، کیونکہ آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کرنے کی دعوت دی اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہوگا۔

پس جب آپ نے دیکھا کہ وہ اس پر نہیں آ رہے تو آپ نے ان پر ایک ایسی وجہ پیش کی جو انہیں غضب دلائے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 539-538　2۔ معالم التنزیل، جلد، صفحہ 578　3۔ محرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 539

اور خودداری کو ابھارے۔ یعنی یا سرحدوں کا دفاع کرتے ہوئے قتال کرو۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ قزمان نے کہا ہے: قسم بخدا! میں نے قتال نہیں کیا مگر اپنی قوم کی عزوشرف اور محاسن ومفاخر کی وجہ سے۔ اور کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ انصار میں سے کسی نے کہا احد کے دن جب اس نے قریش کو دیکھا: تحقیق میں نے سواری کو وادی قناۃ کی کھیتیوں میں چھوڑ دیا، کیا بنی قیلہ کی کھیتیاں چرالی جائیں گی۔ اور ہم باہم نہیں لڑیں گے؟ اور معنی یہ ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں نہیں لڑتے تو اپنی جانوں اور عزت کو بچانے کے لئے لڑو۔

قولہ تعالیٰ: هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ یعنی انہوں نے اپنا حال بیان کردیا اور اپنے پردے چاک کر دیئے اور اپنے نفاق کو ظاہر کردیا ہر اس کے لئے جو یہ گمان رکھتا تھا کہ وہ مسلمان ہیں، پس وہ ظاہر حال میں کفر کے زیادہ قریب ہو گئے، اگرچہ وہ فی الحقیقت کافر تھے اور قولہ تعالیٰ: يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ یعنی انہوں نے ایمان ظاہر کیا اور کفر کو چھپا کر رکھا۔ اور افواہ (مونہوں) کا ذکر بطور تاکید ہے، جیسا کہ یہ قول ہے يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

"جنہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے بارے میں حالانکہ وہ خود (گھر) بیٹھے تھے کہ اگر وہ ہمارا کہا مانتے تو نہ مارے جاتے آپ فرمایئے ذرا دور تو کر دکھاؤ اپنے آپ سے موت کو اگر تم سچے ہو۔"

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اس کا معنی ہے لأجل اخوانهم یعنی اپنے بھائیوں کے واسطے اور یہ وہ شہداء تھے جو قبیلہ خزرج میں سے قتل کئے گئے تھے اور وہ نسب اور مجاورت کے اعتبار سے بھائی تھے نہ کہ دین کے اعتبار سے۔ یعنی انہوں نے ان شہداء کے بارے میں کہا: اگر وہ بیٹھے رہتے مدینہ طیبہ میں تو نہ مارے جاتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا، یعنی یہ منافقین کی جانب سے ان کے بارے یہ اشکال اور اشتباہ ہے، وہ لوگ جو شہید کر دیئے گئے ہیں کہ اگر وہ ہمارا کہا مانتے، تو وہ نہ قتل کئے جاتے۔

اور قول باری تعالیٰ: لَوْ اَطَاعُوْنَا اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ قریش کی طرف نہ نکلتے۔

اور قولہ تعالیٰ: وَ قَعَدُوْا یعنی انہوں نے یہ قول کیا اس حال میں کہ وہ خود جہاد سے رک کر (گھروں میں) بیٹھے ہوئے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ ان کا رد کیا: قُلْ فَادْرَءُوْا یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ انہیں فرما دیجئے: اگر تم سچے ہو تو اپنے آپ سے موت کو دور کر دکھاؤ۔ اور الدرء کا معنی الدفع (دور کرنا) ہے اس سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ احتیاط اور ڈر تقدیر سے نہیں بچا سکتے۔ اور یہ کہ مقتول اپنی اجل کے ساتھ ہی مارا جاتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور جس کے بارے اس نے خبر دی ہے وہ بالیقین ہو کر رہنے والا ہے۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ جس دن یہ کہا گیا اس دن ستر منافقین فوت ہوئے۔ اور ابولیث سمرقندی نے کہا ہے: میں نے سمرقند کے بعض مفسرین کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے جب یہ آیت قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ نازل ہوئی تو اس دن منافقین میں سے ستر افراد مرے۔

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِیْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

''اور ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ وہ جو قتل کئے گئے ہیں اللہ کی راہ میں وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس (اور) رزق دیئے جاتے ہیں۔ شاد ہیں ان (نعمتوں) سے جو عنایت فرمائی ہیں انہیں اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اور خوش ہو رہے ہیں بسبب ان لوگوں کے جو ابھی تک نہیں آ ملے ان سے ان کے پیچھے رہ جانے والوں سے کہ نہیں ہے کوئی خوف ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ جو کچھ احد کے دن ہوا وہ امتحان تھا جو منافقین کو صادق (سچ بولنے والے) سے ممتاز اور الگ کرتا ہے، تو پھر اس نے یہ بیان فرمایا کہ جو شکست خوردہ نہیں ہوئے اور شہید کر دیئے گئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ معزز اور زندہ ہیں۔ اور یہ آیت شہداء احد کے بارے میں ہے اور یہ قول بھی ہے کہ یہ بئر معونہ کے شہداء کے بارے نازل ہوئی ہے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ یہ تمام شہداء کے بارے میں عام ہے۔ اور مصنف ابی داؤد میں اسناد صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب میدان احد میں تمہارے بھائی شہید کئے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں کے پیٹوں میں رکھ دیا جو جنت کی نہروں پر آتے ہیں ان کے پھلوں میں سے کھاتے ہیں اور سونے کی ان قندیلوں میں رہتے ہیں جو عرش کے سائے میں معلق ہیں پس جب انہوں نے اپنا کھانا، پینا اور آرام کی جگہ کو اچھا پایا تو انہوں نے کہا: کون ہماری جانب سے ہمارے بھائیوں کو یہ پیغام پہنچائے گا کہ ہم جنت میں زندہ ہیں اور ہم رزق دیئے جا رہے ہیں تاکہ وہ جہاد سے کنارہ کشی اختیار نہ کریں اور نہ وہ جنگ کے وقت بزدل بنیں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا میں تمہاری جانب سے انہیں یہ پیغام پہنچا دوں گا۔''...... آپ نے فرمایا...... پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا (2)... الی آخر الآیات۔

اور بقی بن مخلد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مجھے ملے اور فرمایا: ''اے جابر! کیا ہے مجھے کہ میں تجھے ٹیڑھا ہونے والا اور مغموم دیکھ رہا ہوں؟ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میرے والد محترم شہید کر دیئے گئے اور انہوں نے پیچھے اہل وعیال بھی چھوڑے اور ان پر قرض بھی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تجھے اس (حالت) کے بارے بشارت نہ دوں جس میں اللہ عزوجل نے تیرے باپ سے ملاقات کی ہے؟'' میں نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللہ أحیا اباك و کلمه کفاحاً و ما کلم احد قط الامن

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 399۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3781، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 341۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 2158، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وراء حجاب فقال لہ یا عبدی تمن اعطك قال یا رب فردنی الی الدنیا فاقتل فیك ثانیۃ فقال الرب تبارك و تعالٰی انہ قد سبق منی انہم (الیہا) لا یرجعون قال یا رب فأبلغ من ورائی (اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ کو زندہ کیا اور اسے بلا حجاب شرف کلام عطا فرمایا اور کسی نے بھی کبھی بلا حجاب کلام نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا اے میرے بندے! تو اپنی آرزو اور تمنا پیش کر میں تجھے وہ عطا کروں گا تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار! تو مجھے دنیا کی طرف لوٹا دے تاکہ میں تیری راہ میں دوبارہ قتل کیا جاؤں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا یہ تو پہلے ہو چکا ہے۔ بلاشبہ وہ اس کی طرف نہیں لوٹائے جائیں گے تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار! تو ان تک یہ خبر پہنچا دے جو میرے پیچھے ہیں) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الآیہ (1)۔ اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور ترمذی نے جامع میں نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

اور وکیع نے سالم بن افطس سے اور انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے: وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ فرمایا: جب حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما شہید ہوئے اور انہوں نے وہ دیکھا جو خیر میں سے انہیں عطا کیا گیا تو انہوں نے کہا: کاش ہمارے بھائی اس خیر (اور انعام) کو جانتے جو ہمیں پہنچا ہے تاکہ جہاد میں ان کی رغبت (اور شوق) بڑھ جاتا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہاری طرف سے ان تک اسے پہنچا دوں گا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِیْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۱﴾ اور ابوالضحٰی نے کہا ہے: یہ آیت خاص (2) اہل احد کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور پہلی حدیث اس قول کے صحیح ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: یہ شہداء بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ چودہ افراد تھے آٹھ انصار میں سے تھے اور چھ مہاجرین میں سے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بئر معونہ کے شہداء کے بارے میں نازل ہوئی ہے (3) اور ان کا قصہ مشہور ہے اسے محمد بن اسحاق وغیرہ نے ذکر کیا ہے اور دوسروں نے کہا ہے: بے شک شہداء کے اولیاء (ورثاء) کو جب خیر و برکت اور فرحت و سرور حاصل ہوتا تو وہ افسوس کرتے اور کہتے: ہم تو نعمتوں اور خوشیوں میں ہیں اور ہمارے باپ، ہمارے بیٹے اور ہمارے بھائی قبروں میں ہیں (4)، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے غم اور کرب کو دور کرنے کے لئے اور انہیں اپنے شہداء کے حال کی خبر دینے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: الختصر اگرچہ یہ احتمال ہے کہ نزول مجموعی سبب کے ساتھ ہو اللہ تعالیٰ نے اس میں شہداء کے بارے خبر دی ہے کہ وہ زندہ ہیں جنت میں رزق دیئے جاتے ہیں اور لامحالہ وہ مر چکے ہیں اور ان کے اجسام مٹی میں ہیں اور ان کی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 206۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 185، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 399، دار الکتب العلمیۃ بیروت 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ارواح زندہ ہیں جیسا کہ تمام مومنین کی ارواح اور انہیں قتل کے وقت سے جنت میں رزق دیئے جانے کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے یہاں تک کہ گویا ان کے لئے دنیوی حیات دائمی ہوگی۔

تحقیق علماء نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے اور وہ معنی جس پر عظیم علماء ہیں وہ وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے اور وہ یہ کہ شہداء کی حیات محقق اور ثابت شدہ ہے پھر ان میں سے کچھ کہتے ہیں: ارواح ان کی طرف ان کی قبروں میں لوٹائی جاتی ہیں اور وہ نعمتوں سے شاد کام ہوتے ہیں، جیسا کہ کفار کو ان کی قبروں میں زندہ کیا جاتا ہے اور انہیں عذاب دیا جاتا ہے اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: انہیں جنت کے پھلوں سے رزق دیا جاتا ہے، یعنی وہ اس کی ہوا پاتے ہیں حالانکہ وہ اس میں نہیں ہوتے (1)۔

اور ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ یہ مجاز ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جنت میں راحت و سکون اور نعمتوں کے مستحق ہیں۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: ماماتت فلان (فلاں نہیں مرا) یعنی زندہ اسے یاد کرتا رہا۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے:

موتُ التقی حیاۃٌ لافناءَ لها قدمات قوم وهم فی الناس احیاء

متقی کی موت ایسی حیات ہے جس کے لئے فنا نہیں تحقیق قوم مر چکی ہے حالانکہ وہ لوگوں میں زندہ ہیں۔

پس معنی یہ ہے کہ انہیں اچھی تعریف کے ساتھ نوازا جاتا ہے اور دوسروں نے کہا ہے: ان کی ارواح سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں اور وہ جنت میں رزق دیئے جاتے ہیں اور وہ کھاتے ہیں اور انتہائی آسودہ اور عمدہ حالت میں رہتے ہیں۔ اقوال میں سے یہی صحیح ہے، کیونکہ دلیل نقلی کے مطابق جو صحیح ہے وہی واقع ہونے والا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث اختلاف کو اٹھا رہی ہے اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اسے مسلم نے بیان کیا ہے اور ہم نے اس بارے میں واضح اور تفصیلی ذکر کتاب التذکرۃ بأحوال الموتی و امور الآخرۃ میں کیا ہے۔ والحمد للہ۔

تحقیق ہم نے وہاں ذکر کیا ہے کہ شہداء کتنے ہیں اور یہ کہ ان کا حال مختلف ہے اور رہے وہ جنہوں نے شہداء کے بارے میں یہ تاویل کی ہے کہ وہ زندہ ہیں اس معنی میں کہ وہ عنقریب زندہ کئے جائیں گے تو یہ انتہائی بعید از حقیقت ہے اور قرآن و سنت اس کا رد کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: بَلْ اَحْيَآءٌ ان کی حیات پر دلیل ہے اور یہ کہ وہ رزق دیئے جاتے ہیں اور رزق نہیں دیا جاتا مگر زندہ کو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے لئے ہر سال میں غزوہ کا ثواب لکھا جاتا ہے اور وہ ہر جہاد کے ثواب میں شریک ہوں گے جو بھی ان کے بعد یوم قیامت تک ہوگا کیونکہ وہ حکم جہاد پر عمل پیرا ہوئے (اور یہ سنت قائم کی) اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا (المائدہ: 32) (اسی وجہ سے (حکم) لکھ دیا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جس نے قتل کیا کسی انسان کو۔) اس کا بیان وہاں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کیونکہ ان کی ارواح یوم قیامت تک عرش کے نیچے رکوع و سجود کرتی رہیں گی ان زندہ مومنین کی ارواح کی طرح جو وضو کی حالت پر رات گزارتے ہیں۔

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 400، دار الکتب العلمیہ بیروت

اور یہ قول بھی ہے کیونکہ شہید قبر میں بوسیدہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے زمین کھا سکتی ہے۔ اور ہم نے اس کا ذکر بھی التذکرہ میں کیا ہے۔ اور یہ کہ زمین انبیاء علیہم السلام، شہداء، علماء، نیکوکار اور مخلص موذن اور حفاظ قرآن کو نہیں کھا سکتی۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب شہید حکماً زندہ ہے تو اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے، جیسا کہ وہ زندہ جس میں قوت حس موجود ہو (اس پر نماز نہیں پڑھی جاتی۔ علماء نے شہداء کے غسل اور ان پر نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے یہ کہا ہے کہ تمام شہداء کو غسل دیا جائے اور ان پر نماز جنازہ بھی پڑھی جائے، سوائے اس کے جو خالصۃً دشمن کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے میدان جنگ میں قتل ہو جائے، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم انہیں ان کے خون سمیت دفن کر دو'' مراد احد کا دن ہے۔ اور آپ نے انہیں غسل بھی نہ دلایا، اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔

ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہداء احد کے بارے حکم ارشاد فرمایا کہ ان سے ہتھیار اور زرہیں اتار لی جائیں اور انہیں خون اور ان کے کپڑوں سمیت دفن کر دیا جائے (2) اور اسی کے مطابق امام احمد، اسحاق، اوزاعی، داؤد بن علی، فقہاء امصار کی جماعت، اہل حدیث اور ابن علیہ نے کہا ہے۔ اور حضرت سعید بن مسیب اور حسن نے کہا ہے: انہیں غسل دیا جائے گا۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا ہے: شہداء احد کو ان کی کثرت کی وجہ سے غسل نہیں دیا گیا اور (اسی زیادتی نے) اس سے مشغول رکھا۔ ابوعمر نے کہا ہے: حضرت سعید اور حسن کے اس قول کے مطابق عبیداللہ بن حسن عنبری کے سوا فقہاء امصار میں سے کسی نے بھی قول نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے شہداء احد کو غسل نہ دینے کی یہ علت ذکر کی ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا ولی اور وارث تھا جو اس کے ساتھ مشغول ہو کر اس کے معاملات کو سرانجام دے سکتا تھا۔ اس میں علت...... واللہ اعلم...... وہ ہے جو فی دمائھم والی حدیث میں ہے۔ ''کہ وہ (خون) قیامت کے دن کستوری کی خوشبو کی طرح ہوگا(3)۔'' تو اس سے ظاہر ہوا کہ (غسل نہ دینے کی) علت شغل نہیں ہے جیسا کہ اس نے کہا ہے جس نے اس بارے میں کہا اور نہ ہی اس مسئلہ کا قیاس اور نظر و فکر میں کوئی دخل ہے، بلکہ یہ تو خالصۃً اس اثر کی اتباع اور پیروی کا مسئلہ ہے جسے تمام نے شہداء احد کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہیں غسل نہیں دیا گیا۔ بعض متاخرین نے جنہوں نے حسن کا مذہب اختیار کیا ہے انہوں نے شہداء احد کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: انا شھید علی ھولاء یوم القیامۃ میں قیامت کے دن ان پر شہادت دوں گا) فرمایا(4): یہ ان کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے اور یہ کہ اس میں ان کے سوا کوئی اور شریک نہ ہوگا۔ ابوعمر نے کہا ہے: یہ شذوذ سے مشابہت رکھتا ہے اور ان کے غسل کو ترک کرنے کے بارے قول زیادہ اولیٰ ہے،

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 179۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 91۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1503، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 393۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2593، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیونکہ وہ شہداء احد اوران کے علاوہ دوسروں کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی کو اس کے سینہ یا اس کے حلق میں تیر مارا گیا اور وہ فوت ہو گیا تو وہ جیسے تھا اسی طرح اسے کپڑے میں لپیٹ دیا گیا۔ فرمایا: اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔(1)

مسئلہ نمبر 3۔ رہی شہداء پر نماز جنازہ! تو اس کے بارے میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت امام مالک، لیث، امام شافعی، امام احمد اور داؤد رحمۃ اللہ علیہم اس طرف گئے ہیں کہ ان پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہداء احد میں سے دو آدمیوں کو ایک کپڑے میں جمع کرتے تھے پھر آپ فرماتے: ''ان میں سے قرآن کریم زیادہ جمع کرنے والا کون ہے؟'' پس جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کر دیا جاتا تو آپ اسے لحد میں آگے رکھتے اور آپ نے فرمایا میں قیامت کے دن ان پر شہادت دوں گا۔''

اور آپ نے انہیں ان کے خون سمیت دفن کرنے کا حکم دیا اور انہیں غسل نہ دیا گیا اور نہ ان پر نماز جنازہ پڑھی گئی (2)۔ اور کوفہ، بصرہ اور شام کے فقہاء نے کہا ہے: ان پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور انہوں نے بہت سے آثار روایت کئے ہیں ان میں سے اکثر روایات مرسل ہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور تمام شہداء احد پر نماز جنازہ پڑھی۔(3)

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ شہید کو جب زندہ اٹھا لیا جائے اور وہ میدان جنگ میں نہ مرے اور کچھ دیر زندہ رہے اور کچھ کھائے تو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا گیا۔

اور علماء نے اس بارے اختلاف کیا ہے جسے ظلماً قتل کیا گیا جیسا کہ وہ جسے خارجیوں اور ڈاکوؤں وغیرہ نے قتل کر دیا ہو، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: ہر وہ جسے ظلماً قتل کیا گیا اسے غسل نہ دیا جائے لیکن اس پر اور ہر شہید پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور یہی قول تمام اہل عراق کا ہے۔ اور انہوں نے بہت سے صحیح طرق سے زید بن صوحان سے روایت کیا ہے اور یہ جنگ جمل میں شہید ہوئے تھے۔ تم مجھ سے کپڑے نہ اتارنا اور نہ ہی مجھ سے خون کو دھونا۔ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے کہ انہوں نے زید بن صوحان کے قول کی مثل ہی کہا ہے اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جنگ صفین میں شہید کئے گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں غسل نہیں دیا۔ اور امام شافعی کے دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے (شہید کو) دیگر تمام مردوں کی طرح غسل دیا جائے گا سوائے اس کے جسے اہل حرب نے قتل کیا ہو اور یہی امام مالک کا قول ہے۔ امام مالک نے کہا ہے: اسے غسل نہیں دیا جائے گا جسے کفار نے قتل کیا اور وہ میدان جنگ میں ہی فوت ہو گیا۔ اور ہر وہ مقتول جو میدان جنگ میں قتل نہ کیا گیا ہو...... لیکن اسے کفار نے قتل کیا ہو ...... تو اسے غسل دیا جائے گا اور اس پر نماز جنازہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 91۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 2726، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 92۔ ایضاً صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1257، ایضاً

3۔ صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1258، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پڑھی جائے گی اور یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ باغیوں کے مقتول کو غسل نہیں دیا جائے گا اور امام مالک کا قول زیادہ صحیح ہے، بلاشبہ مردوں کو غسل دینا اجماع اور تمام کے نقل کرنے سے ثابت ہے۔ پس ہر میت کو غسل دینا واجب ہے سوائے اس کے جسے اجماع یا سنت ثابتہ نے (اس حکم سے) خارج کیا ہو۔ و باللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 5۔ دشمن جب صبح کے وقت کسی قوم پر ان کے گھروں میں حملہ کر دے اور انہیں اس کے بارے علم نہ ہو اور وہ ان میں سے بعض کو قتل کر دے تو کیا ان کا حکم میدان جنگ میں قتل ہونے والوں کے حکم کی طرح ہوگا یا عام مردوں کے حکم کی مثل، یہ مسئلہ ہمیں قرطبہ میں پیش آیا (اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ ہمارے پاس لائے) دشمن ...... اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے۔ نے تین رمضان المعظم ۶۲۷ ھ کی صبح کو حملہ کیا لوگ اپنے گھروں میں ابھی غفلت میں تھے، تو اس نے بعض کو قتل کر دیا اور بعض کو قید کر لیا، ان افراد میں سے جنہیں شہید کیا گیا میرے والد رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، تو میں نے اپنے شیخ المقری الاستاذ ابوجعفر احمد المعروف بابی حجۃ سے (یہ مسئلہ) پوچھا تو انہوں نے فرمایا، انہیں غسل بھی دو اور ان پر نماز جنازہ بھی پڑھو، کیونکہ تمہارے والد میدان جنگ میں دو لشکروں کی صفوں کے درمیان شہید نہیں کئے گئے۔ پھر میں نے اپنے شیخ ربیع بن عبد الرحمن بن احمد بن ربیع بن ابی سے پوچھا تو انہوں نے کہا: بلاشبہ اس کا حکم میدان جنگ میں قتل ہونے والے کا ہی حکم ہے، پھر میں نے قاضی الجماعۃ ابا الحسن علی بن قطرال سے پوچھا اور ان کے پاس فقہاء کی ایک جماعت موجود تھی تو انہوں نے جواب دیا: اسے غسل دو اور کفن پہناؤ اور اس پر نماز جنازہ پڑھو، میں نے اسی طرح کیا۔ پھر اس کے بعد ''البقرۃ'' وغیرہا میں اس مسئلہ پر (صحیح طرح) واقف ہوا جو کہ ابوالحسن اللخمی کی کتاب ہے اور اگر میں اس سے پہلے اس پر واقف ہو جاتا تو میں انہیں غسل نہ دیتا اور میں انہیں خون سمیت انہی کپڑوں میں دفن کر دیتا۔

مسئلہ نمبر 6۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہونے اور اس میں شہادت پانے کا ثواب عظیم اور بہت زیادہ ہونے پر دلالت کرتی ہے یہاں تک کہ یہ گناہوں کو مٹا دیتی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہونا ہر شے کو مٹا دیتا ہے سوائے قرض کے اسی طرح مجھے جبریل امین علیہ السلام نے ابھی بتایا ہے (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ دین (قرض) کا ذکر اس پر تنبیہ ہے کہ وہ حقوق بھی اسی کے معنی میں ہیں جو مذمت سے متعلق ہیں۔ مثلاً غصب، باطل طریقے سے مال لینا، عمداً کسی کو قتل کرنا اور زخمی کرنا اور دیگر ایسے امور جو ان کے تابع ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک قرض کی نسبت زیادہ اولیٰ ہے کہ اسے جہاد کے سبب نہ بخشا جائے کیونکہ وہ زیادہ شدید اور سخت ہے اور ان تمام میں قصاص نیکیوں اور برائیوں کے ساتھ ہے جیسا کہ اس بارے میں سنۃ ثابتہ وارد ہیں۔

عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اللہ تعالیٰ بندوں کو یا فرمایا لوگوں کو اٹھائے گا، ہمام کو شک ہے (کہ آپ نے لفظ العباد کہا یا الناس کہا) اور اپنے دست مبارک کے ساتھ شام کی طرف اشارہ کیا ...... ننگے بدن، غیر مختون اور بُہم۔ ہم نے عرض کی: بُہم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ان کیساتھ کوئی شے نہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 135

ہوگی۔ پس انہیں ایسی آواز کے ساتھ ندا دی جائے گی جسے ہر قرب و بعد والا سنے گا میں بادشاہ ہوں، میں حاکم (اور) حساب لینے والا ہوں اہل جنت میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ وہ جنت میں داخل ہو درآنحالیکہ اہل نار میں سے کوئی اسے ظلم کے عوض طلب کر رہا ہو اور اہل نار میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ وہ جہنم میں داخل ہو درآنحالیکہ اہل جنت میں سے کوئی اسے ظلم کے عوض طلب کر رہا ہو حتیٰ کہ ایک تھپڑ ہی ہو۔ راوی نے کہا ہم نے عرض کی: کیسے ممکن ہوگا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آئیں گے ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون۔

آپ نے فرمایا: ''نیکیوں اور برائیوں کے ساتھ (1)'' اسے حارثہ بن ابی اسامہ نے نقل کیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہوں اور نہ ہی ساز و سامان۔ تو آپ نے فرمایا: ''بلاشبہ میری امت میں سے مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نمازیں، روزے اور زکوٰۃ وغیرہ (نیک اعمال) ساتھ لے کر آئے گا اور پھر ایک (آدمی) آئے گا (اور کہے گا) اس نے گالیاں دی ہیں (دوسرا آئے گا اور کہے گا) اس نے تہمت لگائی ہے (ایک اور آئے گا اور کہے گا) اس نے اس کا مال کھایا ہے، (ایک اور آ کر کہے گا) اس نے اس کا خون بہایا ہے۔ (ایک اور آ کر کہے گا) اس نے اسے مارا ہے۔ پس اسے اس کی نیکیوں میں سے دی جائیں گی اور دوسرے کو بھی اس کی نیکیاں دی جائیں گی پس اگر اس کی نیکیاں جو کچھ اس کے ذمہ ہے وہ پورا ہونے سے پہلے ختم ہو گئیں تو پھر ان کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے جائیں گے پھر اسے آتش جہنم میں پھینک دیا جائے گا (2)۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیا جائے پھر اسے زندہ کیا جائے، پھر اسے قتل کیا جائے، پھر اسے زندہ کیا جائے پھر اسے قتل کیا جائے درآنحالیکہ اس پر قرض ہو تو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا یہاں تک کہ اس کی طرف سے ادا کر دیا جائے۔ (3)'' اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ مؤمن کا نفس اس کے ساتھ معلق ہے جو اس پر قرض ہے۔ (4)'' اور احمد بن زہیر نے کہا ہے کہ انہوں نے حضرت یحییٰ بن معین سے اس حدیث کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ صحیح ہے۔ اور اگر کہا جائے یہ تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ بعض شہداء قتل کے وقت سے جنت میں داخل نہ ہوں گے اور نہ ان کی ارواح پرندے کے پیٹ میں ہوں گی جیسا کہ تم نے ذکر کیا ہے اور نہ ہی وہ اپنی قبور میں ہوں گے، تو پھر وہ کہاں ہوں گے؟ تو ہم نے کہا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شہداء کی ارواح جنت کے دروازے کے ساتھ ایک نہر پر ہوں گی اسے بارق کہا جاتا ہے۔ ان پر ان کا رزق صبح و شام جنت سے نکالا جاتا ہے (5)۔''

1۔ المستدرک، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 475، حدیث نمبر 3638
2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 320،
3۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 53
4۔ شعب الایمان فی قبض الیدیان الأحوال المعرفۃ، جلد 4، صفحہ 401، حدیث نمبر 5543
5۔ مسند احمد بن حنبل، مسند عبداللہ بن عباس، جلد 1، صفحہ 266

شاید یہ وہی ہوں۔ واللہ اعلم۔ اسی وجہ سے امام ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: یہ طبقات اور مختلف احوال ہیں جن کا مجموعہ یہ ہے کہ وہ رزق دیئے جاتے ہیں۔

اور امام ابو عبداللہ بن محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی نے اپنی سنن میں حضرت سلیم بن عامر سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ''سمندر کا ایک شہید خشکی کے دو شہیدوں کی مثل ہے اور سمندر میں (دو آدمی جس کا) سر چکرا رہا ہو وہ خشکی میں اس کی طرح ہے جو اپنے خون میں لت پت ہو اور جو دو موجوں کے درمیان ہو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں دنیا سے منقطع ہونے والے کی طرح ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کو قبض کرنے کے لئے ملک الموت کو مقرر فرمایا ہے سوائے سمندر میں شہید ہونے والوں کے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی ارواح کو خود قبض کرتا ہے اور خشکی کے شہید کے تمام گناہوں کی مغفرت فرما دیتا ہے سوائے قرض کے اور سمندر میں شہید ہونے والے کے تمام گناہ اور قرض بھی بخش دیتا ہے (1)۔''

مسئلہ نمبر 7۔ وہ قرض جس کے سبب مقروض کو جنت سے روک دیا جائے گا...... واللہ اعلم ...... وہ وہ ہے جس کو پورا کرنے کے لئے اس نے مال چھوڑا اور اس کے بارے وصیت نہ کی ہو یا وہ ادائیگی پر قادر ہو لیکن اس نے ادا نہ کیا اس نے اسراف یا بیوقوفی کی بنا پر قرض لیا اور مر گیا اور اسے ادا نہ کیا۔ اور رہا وہ آدمی جس نے واجب حق کو پورا کرنے کے لئے فاقہ کشی اور تنگ دستی کی وجہ سے قرض لیا اور مر گیا اور اس نے اسے ادا کرنے کے لئے کچھ نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت سے نہیں روکے گا ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ سلطان وقت پر فرض ہے کہ وہ اس کی طرف سے اس کا قرض ادا کرے، چاہے تو جملہ صدقات میں سے یا غارمین کے حصہ سے یا اس مال فیٔ سے جو مسلمانوں کو (صلح کے ساتھ) کہیں سے حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرض یا عیال (محتاج) چھوڑی تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ہے اور جس نے مال چھوڑا تو وہ اس کے ورثاء کے لئے ہے (2)۔'' ہم نے اس باب کی مزید وضاحت کتاب ''التذکرہ'' میں کی ہے۔ والحمدللہ۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ اس میں مضاف محذوف ہے تقدیر عبارت ہے عند کرامۃ ربھم۔ اور یہاں عِنۡدَ غایت قرب کا تقاضا کرتا ہے، پس یہ ''لدی'' کی طرح ہے۔ اسی وجہ سے اس کی تصغیر نہیں بنائی گئی کہ کہا جائے! عُنَيۡد، یہ سیبویہ نے کہا ہے۔ تو یہ غایت قرب (عندیہ) کرامت کے اعتبار سے ہے نہ کہ مسافت اور قرب کے اعتبار سے۔ اور يُرۡزَقُوۡنَ سے مراد وہ رزق ہے جو عرف میں معروف ہے اور جس نے کہا ہے: اس سے مراد حیات الذکر ہے اس نے کہا ہے کہ انہیں ثنا جمیل (اچھی تعریف) کا رزق دیا جاتا ہے۔

اور پہلا معنی حقیقت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ارواح جس حالت میں جنت کی ہواؤں، خوشبوؤں، نعمتوں اور اس کی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 204۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 2767، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 176

ایضاً، صحیح بخاری، باب من تکفل عن میت دینا فلیس لہ ان یرجع، حدیث 2133، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرحت وانبساط میں چلتی ہیں تو وہ ان چیزوں کا ادراک رکھتی ہیں جو ارواح کے لائق اور مناسب ہوتی ہیں، ان میں سے جن میں نفع اٹھایا جاسکتا ہے اور ان کے سبب زندہ اور بلند رہا جاسکتا ہے۔ اور رہیں لذات جسمانیہ تو ان ارواح کو جب ان کے اجساد کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ ان تمام نعمتوں سے پوری ہو جائیں گی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کی ہیں۔ اور یہ اچھا قول ہے، اگرچہ اس میں مجاز کی نوع بھی ہے، اور یہ اس کے موافق ہے جو موقف ہم نے اختیار کیا ہے۔ والموفق الا لہ اور فَرِحِيْنَ۔ يُرْزَقُوْنَ کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اور کلام میں أحیاء کی صفت ہونے کی بنا پر ''فرحون'' بھی جائز ہے اور یہ فرح بمعنی سرور سے ماخوذ ہے۔ اور اس آیت میں فضل سے مراد وہی مذکورہ نعمتیں ہیں۔ اور ابن السمیقع نے فَارِحِين کو الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ الفرِہ اور الفارِہ، الحَذِر اور الحاذِر، الطَمِع اور الطامِع اور البَخِلُ اور الباخِل۔ نحاس نے کہا ہے: غیر قرآن میں اس کا رفع پڑھنا جائز ہے، کیونکہ یہ احیاء کی صفت ہوسکتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اس کا معنی ہے جو فضل میں ان سے نہیں آملے، اگرچہ ان کے لئے فضل (اور مرتبہ) ہے۔ اور (يَسْتَبْشِرُوْنَ) کی اصل البشرۃ سے ہے، کیونکہ انسان جب فرحت وانبساط میں ہوتا ہے تو خوشی اور سرور کا اثر اس کے چہرے میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور سدی نے کہا ہے: شہید کے پاس ایک کتاب لائی جاتی ہے جس میں اس کے بھائیوں میں سے اس کے پاس آنے والوں کا ذکر ہوتا ہے، تو وہ خوش ہو جاتا ہے جیسا کہ اہل غائب دنیا میں اس کے آنے کے ساتھ خوش ہوتا ہے(1)۔

اور حضرت قتادہ، ابن جریج اور ربیع وغیرہ نے کہا ہے: ان کا خوش ہونا یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارے وہ بھائی جنہیں ہم نے دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑا وہ اپنے نبی کی معیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کر رہے ہیں اور شہید ہو رہے ہیں پس وہ بھی ہماری طرح کی عزت وکرامت پا رہے ہیں، پس وہ اسی کے سبب مسرور اور خوش ہو رہے ہیں(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ لوگ ابھی پیچھے سے انہیں نہیں ملے ان کے لئے خوشی کے اظہار سے اشارہ تمام مومنین کی طرف ہے اگرچہ وہ قتل نہ کئے جائیں، کیونکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر وثواب کو دیکھتے ہیں تو انہیں یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ دین اسلام ہی وہ حق ہے جس پر اللہ تعالیٰ اجر وثواب عطا فرمائے گا، پس وہ اپنے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے اس فضل واحسان پر خوش ہوتے ہیں جو اس نے انہیں عطا فرمایا ہے اور وہ مومنین کے لئے بھی خوش ہوتے ہیں کہ نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اس معنی کو زجاج اور ابن فورک نے اختیار کیا ہے(3)۔

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿171﴾

''خوش ہو رہے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل پر اور (اس پر) کہ اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا اجر ایمان والوں کا۔''

یعنی وہ خوش ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے جنت پر۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت (کے

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 219
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 541، دار الکتب العلمیہ
3۔ ایضاً

حصول) پر (خوش ہو رہے ہیں) وَ فَضْلٍ یہ بیان کی زیادتی کے لئے ہے اور فضل بھی نعمت میں داخل ہے، اور اس میں اس (نعمت) کے وسیع ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ وہ نعمت دنیا کی نعمتوں کی طرح نہیں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نعمت کے بعد فضل کا ذکر بطور تاکید ہوا ہے، ترمذی نے حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہید کی چھ خصلتیں ہیں، اسی طرح ترمذی میں ہے اور ابن ماجہ میں ''ست'' (چھ) ہیں اور یہ تعداد میں سات ہیں۔ اس کی پہلی ہی بار (خون کا قطرہ زمین پر گرتے وقت) مغفرت کر دی جاتی ہے اور وہ جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھ لیتا ہے اور اسے عذاب قبر سے بچا لیا جاتا ہے اور وہ بڑی گھبراہٹ سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے سر پر یاقوت سے بنا ہوا وقار کا تاج رکھا جائے گا جو دنیا اور اس کی جملہ نعمتوں سے بہتر (اور ذی قدر) ہوگا اور حورعین میں سے بہتر کے ساتھ اس کی شادی کی جائے گی اور اس کے ستر رشتہ داروں کے حق میں اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔'' فرمایا یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے (1) اور یہی نعمت اور فضل کی تفسیر ہے۔

اور اس معنی میں آثار بہت زیادہ ہیں اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: تلواریں جنت کی چابیاں ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے شہداء کو پانچ کرامات کے ساتھ عزت و شرف عطا فرمایا ہے، اس نے ان کے ساتھ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کو مشرف نہیں فرمایا اور نہ ہی مجھے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی ارواح ملک الموت نے قبض کی ہیں اور وہی عنقریب میری روح بھی قبض کرے گا اور رہے شہداء تو ان کی ارواح اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ساتھ قبض کرتا ہے جیسے چاہتا ہے اور ان کی ارواح پر ملک الموت علیہ السلام کو مسلط نہیں کرتا اور دوسری یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو وصال کے بعد غسل دیا گیا ہے اور مجھے بھی وصال کے بعد غسل دیا جائے گا لیکن شہداء کو غسل نہیں دیا جاتا اور نہ انہیں دنیوی پانی کی حاجت اور ضرورت ہے اور تیسری یہ کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو کفن دیئے گئے ہیں اور مجھے بھی کفن دیا جائے گا اور شہداء کو کفن نہیں دیا جائے گا بلکہ انہیں انہی کے کپڑوں میں دفن کیا جاتا ہے اور چوتھی یہ کہ انبیاء علیہم السلام جب فوت ہوئے تو انہیں اموات کا نام دیا گیا اور جب میرا وصال ہوگا تو کہا جائے گا قد مات (آپ فوت ہو گئے ہیں) لیکن شہداء کو موتی کا نام نہیں دیا جاتا اور پانچویں یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو قیامت کے دن شفاعت کا اختیار دیا جائے گا اور میری شفاعت بھی قیامت کے دن ہوگی لیکن شہداء ہر روز ان کے بارے میں شفاعت کرتے ہیں جن کی وہ شفاعت کر سکتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَّ اَنَّ اللّٰهَ کسائی نے اسے الف کے کسرہ کے ساتھ اِنَّ پڑھا ہے اور باقیوں نے نصب کے ساتھ، (2) پس جنہوں نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے (تو اس کے مطابق) اس کا معنی یہ ہے یستبشرون بنعمة من الله و یستبشرون بأن الله لا یضیع أجر المؤمنین (وہ خوش ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت پر اور اس پر وہ خوش ہو رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مومنین کا

1۔ جامع ترمذی، فضائل الجہاد، جلد 1، صفحہ 200-199۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب فضل الشہادۃ فی سبیل اللہ، حدیث 2788، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 401

اجر ضائع نہیں کرتا) اور جنہوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ ابتدائے کلام میں آنے کی بنا پر ہے اور اس کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے وَاللّٰہُ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۷۲﴾ۚ

''جنہوں نے لبیک کہا اللہ اور رسول کی دعوت پر اس کے بعد کہ لگ چکا تھا انہیں (گہرا) زخم ان کے لئے جنہوں نے نیکی کی ان میں سے اور تقویٰ اختیار کیا اجر عظیم ہے۔''

اَلَّذِیْنَ مبتدا ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے، اور اس کی خبر مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل جر میں ہو، اس صورت میں یہ الْمُؤْمِنِیْنَ سے یا بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا سے بدل ہوگا۔ اسْتَجَابُوْا یعنی اَجَابُوْا ہے اور اس میں سین اور تا دونوں زائدہ ہیں۔ اور اسی معنی میں یہ قول بھی ہے۔

فلم یستجبه عند ذاك مُجیبُ

(پس اس وقت جواب دینے والے نے جواب نہ دیا)

اور صحیحین میں حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے کہا: مجھے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: تیرا باپ ان میں سے تھا جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہی اس کے بعد کہ انہیں گہرا زخم لگ چکا تھا یہ مسلم کے الفاظ ہیں (1)۔

اور انہی کی وساطت سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: اے میرے بھانجے! تیرے دونوں باپ...... یعنی حضرت زبیر اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما...... ان میں سے تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہی اس کے بعد کہ انہیں گہرا زخم لگ چکا تھا اور انہوں نے فرمایا: جب مشرک میدان احد سے واپس لوٹے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو وہ مصیبت اور اذیت پہنچی جو انہیں پہنچی تو آپ کو خوف لاحق ہوا کہ (ممکن ہے) وہ واپس پلٹ آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کون ان کے مقابلہ کی دعوت پر لبیک کہے گا تاکہ یہ جان لیں کہ ہمارے پاس قوت ہے؟'' پس حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما ان ستر افراد میں تھے جو اس کے لئے تیار ہوئے، چنانچہ یہ اس قوم کے پیچھے نکلے اور انہیں اپنی آواز پہنچائی اور اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس لوٹے۔ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو غزوہ حمراء الاسد میں پیش آیا۔ اور یہ مدینہ طیبہ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اور وہ اس طرح ہوا کہ جب اتوار کا دن تھا اور یہ غزوہ احد کا دوسرا دن تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں میں مشرکین کا پیچھا کرنے کا اعلان کیا اور فرمایا: ''ہمارے ساتھ صرف وہی نکلے گا جو کل اس میں حاضر تھا۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مومنین میں سے دو سو آدمی اٹھے۔ بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''کون ان کے پیچھے جائے گا؟'' تو ان میں سے ستر آدمی تیار ہوئے۔ فرمایا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 282۔ ایضاً صحیح بخاری، باب الذین استجابوا للہ والرسول، حدیث نمبر 3769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ان میں حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما بھی تھے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے (1)، یہاں تک کہ آپ حمراء الاسد پہنچ گئے، دشمن کو ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کے لئے، ان میں ایسا بھی تھا جو زخم لگنے کے سبب شدید تکلیف میں تھا وہ چلنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا اور وہ کوئی سواری بھی نہ پاتا تھا اور کبھی گھوڑے پر سوار ہوتا تھا اور یہ تمام کے تمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پیروی اور جہاد کی رغبت میں تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی عبد الاشہل کے دو آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ دونوں زخم لگنے کے سبب انتہائی کمزور اور نحیف تھے، ان میں سے ایک اپنے دوسرے ساتھی پر ٹیک اور سہارا لگا کر چلتا تھا اور یہ دونوں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے، پس جب حمراء الاسد پہنچے، تو نعیم بن مسعود ان سے ملا اور اس نے انہیں یہ خبر دی کہ ابو سفیان ابن حرب اور جو قریش کے افراد اس کے ساتھ ہیں وہ لشکر جرار کی صورت میں اکٹھے ہیں اور انہوں نے اپنی رائے کو اس پر پختہ کر لیا ہے کہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف لوٹ کر آئیں اور وہاں کے باسیوں کو ہلاک و برباد کر دیں، تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کے بارے خبر نہیں دی ہے: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ اور اسی اثنا میں کہ قریش اس رائے پر جمع ہو چکے تھے کہ اچانک ان کے پاس معبد الخزاعی آ گیا اور قبیلہ خزاعہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف اور آپ کی نصیحتوں کا راز داں تھا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا حال اور جس کیفیت پر وہ تھے اسے دیکھ چکا تھا اور جب اس نے قریش کے واپس پلٹنے کے عزم کو دیکھا تاکہ وہ اہل مدینہ کو تباہ و برباد کر دے تو اسے اس کا خوف لاحق ہو گیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور آپ کے اصحاب کے لئے اس کے اخلاص نیت نے اسے اس سے برانگیختہ کیا کہ وہ قریش کو ڈرائے چنانچہ اس نے انہیں کہا: میں نے ابھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو حمراء الاسد کے مقام پر بہت بڑے لشکر کی صورت میں چھوڑا ہے اور جو کوئی ان سے پیچھے رہ گیا تھا وہ بھی ان کے ساتھ جمع ہو چکا ہے اور وہ تم پر (غصہ سے) جلے ہوئے ہیں، پس تم بچ جاؤ بچ جاؤ! پس میں تجھے اس سے روک رہا ہوں، قسم بخدا! جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس نے مجھے اس پر ابھارا ہے کہ میں اس کے بارے کچھ اشعار لکھوں۔

اس (ابو سفیان) نے پوچھا: تو نے کیا کہا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں نے کہا ہے:

كَادَتْ تُهَدُّ مِنَ الْأَصْوَاتِ رَاحِلَتِيْ　　اِذْ سَالَتِ الْأَرْضُ بِالْجُرْدِ الْأَبَابِيْلِ

قریب تھا کہ میری سواری کا جانور لشکروں کے شور و غل کی ہولناکی کی وجہ سے گر پڑتا جب زمین پر جوق در جوق کم مو گھوڑوں کا سیلاب آ گیا۔

تُرْدِي بِأُسْدٍ كِرَامٍ لَا تَنَابِلَةٍ　　عند اللِّقَآءِ ولا مِيْلٍ مَعَاذِيل

جو ایسے ذی شان شیروں کو اٹھائے دوڑ رہے تھے جو مقابلہ کے وقت نہ سست اور بزدل ہوں گے اور نہ ہتھیاروں سے خالی ہوں گے۔

فَظَلْتُ عَدْوًا اُظُنُّ الْاَرْضَ مَائِلَةً　　لَمَّا سَمَوْا بِرَئِيس غير مَخْذُول

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 584۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 3769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جب وہ گھوڑے ایک ایسے سردار کے ساتھ بلند ہوئے جو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا گیا تھا۔

تو میں تیز دوڑنے لگا، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین جھکی جا رہی ہے۔

فقلتُ وَيْلَ ابنِ حرب مِنْ لَقَائِكُمْ　　اِذَا تَغَطْمَطَتِ الْبَطْحَاءُ بالخيل

میں نے کہا تمہاری ملاقات سے ابوسفیان بن حرب کے لئے ہلاکت ہے جب وادی بطحاء گھوڑوں سے تھرتھرا اٹھے گی۔

انی نَذِيْرٌ لأهل البَسْلِ ضَاحِيَةً　　لِكُلِّ ذی إِرْبَةٍ منهم و معقولِ

بے شک میں سورج کی دھوپ میں چمکنے والی سرزمین کے رہنے والوں (یعنی قریش مکہ) میں سے ہر صاحب عقل و دانش کو ڈرانے والا ہوں۔

مِنْ جَيْشِ اَحْمَدَ لا وخش قَنَابِلُهُ　　و لَيْسَ يُوْصَفُ ما اَنْذَرْتُ بِالْقِيلِ (1)

(سیدنا) احمد (مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لشکر سے جو سست اور کوتاہ قد نہیں ہیں اور جس بات سے میں نے ڈرایا ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

پس اس طرح اس نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو واپس لوٹا دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور وہ ڈرتے ہوئے تیزی کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ آئے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے ہمراہ اس حال میں مدینہ منورہ کی طرف لوٹے کہ آپ کی مدد و نصرت فرمائی گئی تھی۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ اس میں سوء سے مراد قتال اور رعب ہے (آل عمران: 174) (''ان کے عزم و توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ'' واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ چھوا ان کو کسی برائی نے) اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ کی معیت میں نکلنے کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اجازت عطا فرمادی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی کہ اس واپس پلٹنے کے ساتھ انہیں اجر عظیم حاصل ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ یہ غزوہ ہے۔''

یہی جمہور نے اس آیت کی تفسیر کی ہے اور حضرت مجاہد اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہما کا قول شاذ ہے ان دونوں نے کہا ہے: بے شک یہ آیت اس قول میں سے ہے: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ ...... تا قولہ ...... عَظِيْمٍ ﴿﴾ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدر صغریٰ کی جانب خروج کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نکلے ابوسفیان کے اس وعدہ کے مطابق جو اس نے میدان احد میں کیا تھا، کیونکہ اس نے کہا تھا: آنے والے سال ہمارا مقابلہ میدان بدر میں ہوگا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم جواباً کہو: ہاں (ہمیں منظور ہے۔) پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں بہت بڑی منڈی لگی ہوئی تھی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو دراہم عطا فرمائے۔'' اور آپ بدر کے قریب جا پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نعیم بن مسعود اشجعی آیا اور اس نے آپ کو خبر دی کہ قریش جمع ہو چکے ہیں اور آپ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے آئے

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 224

ہوئے ہیں وہ اور جوان کی طرف منسوب ہیں، پس اس وجہ سے مسلمان خوفزدہ ہو گئے، لیکن انہوں نے کہا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ پس وہ چلتے رہے یہاں تک کہ بدر میں پہنچ گئے۔ اور وہاں کسی ایک کو بھی نہ پایا۔ اور انہوں نے منڈی اور بازار لگا ہوا پایا پس انہوں نے اپنے دراہم کے ساتھ کچھ چمڑہ اور سامان تجارت خریدا اور واپس لوٹ گئے۔ اور انہوں نے کوئی جنگ اور مکر نہ پایا اور اپنی تجارت میں نفع کمایا، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ یعنی ان تجارات میں فضل و احسان کے ساتھ واپس لوٹے (1)۔ واللہ اعلم۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾

''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کہا انہیں لوگوں نے کہ بلاشبہ کافروں نے جمع کر رکھا ہے تمہارے لئے (بڑا سامان اور لشکر) سو ڈرو ان سے (اس دھمکی نے) بڑھا دیا ان کے (جوش) ایمان کو اور انہوں نے کہا: کافی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ اور وہ بہترین کارساز ہے۔''

اس قول باری تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس حضرت مجاہد، مقاتل، عکرمہ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ (کہنے والا) نعیم بن مسعود اشجعی تھا (2)۔ یہ لفظ عام ہے اور اس کا معنی خاص ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ یعنی (الناس سے مراد) حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ سدی نے کہا: وہ ایک اعرابی تھا جس کے لئے اس کام پر اجرت مقرر کی گئی تھی۔ اور ابن اسحاق اور ایک جماعت نے کہا ہے: الناس سے مراد عبد القیس کے سواروں کا قافلہ ہے، وہ ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو اس نے انہیں مسلمانوں کی طرف ایک سازش کے تحت بھیجا تا کہ وہ انہیں اس سے باز رکھیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الناس سے مراد منافقین ہیں۔ سدی نے کہا ہے: جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب ابوسفیان کی مقرر کردہ میعاد کے مطابق بدر الصغریٰ کی طرف چلنے کے لئے تیار ہوئے تو ان کے پاس منافقین آئے اور انہوں نے کہا: ہم تمہارے وہی ساتھی ہیں جنہوں نے تمہیں ان کی طرف نکلنے سے منع کیا تھا اور تم نے ہماری تجویز نہ مانی تھی اور پھر انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں میں آ کر قتل کیا اور وہ کامیاب ہوئے اور اگر تم ان کے پاس ان کے گھروں میں گئے تو تم میں سے کوئی ایک بھی واپس لوٹ کر نہیں آئے گا۔ تو انہوں نے کہا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ (ہمیں اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے) اور ابو معشر نے کہا ہے: اہل تہامہ میں سے قبیلہ ہذیل کے کچھ لوگ مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب نے ابوسفیان کے بارے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا: قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ تحقیق کافروں نے تمہارے لئے بہت بڑا لشکر جمع کر رکھا ہے۔ فَاخْشَوْهُمْ پس تم ان سے ڈرو اور تم ان سے بچو، کیونکہ تمہارے پاس ان کے مقابلے کی طاقت نہیں ہے۔ اس باب میں ان اقوال کی بنا پر ہی الناس جمع ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا یعنی لوگوں کے قول نے از روئے ایمان کے ان میں اضافہ کر دیا، یعنی اپنے دین کے بارے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 543، دار الکتب العلمیہ　　2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 402

میں تصدیق اور یقین، اپنی مدد و نصرت پر پختہ وثوق اور قوت و جرأت اور استعداد کے اعتبار سے ان میں اضافہ ہو گیا۔ پس ان معنی کی بنا پر ایمان میں زیادتی سے مراد اعمال میں زیادتی ہے۔ علماء کا ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کے بارے میں اختلاف ہے اور اس بارے میں کئی اقوال ہیں اور اس بارے میں عقیدہ یہ ہے کہ نفس ایمان جو کہ ایک تاج ہے اور کسی بھی شے کی ایک تصدیق ہے بلاشبہ یہ مفرد معنی ہے جب یہ حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی زیادتی اور اضافہ داخل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس میں سے کوئی شے باقی رہ جاتی ہے جب یہ زائل ہو جائے۔ پس کچھ باقی نہ رہا سوائے اس کے کہ زیادتی اور کمی ایمان کے متعلقات میں ہوتی ہے نہ کہ اس کی ذات میں۔ پس علماء کی ایک جماعت نے یہ موقف اپنایا ہے کہ ایمان ان اعمال کے اعتبار سے زیادہ یا کم ہوتا ہے جو اس سے صادر ہوتے ہیں، بالخصوص بہت سے علماء اسم ایمان کا اطلاق طاعات پر کرتے ہیں، اس وجہ سے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایمان کے ستر سے کچھ زائد باب ہیں ان میں سے اعلیٰ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا ہے اور ان میں سے ادنیٰ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا ہے(1)'' اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور مسلم نے یہ اضافہ بھی ذکر کیا ہے: ''اور حیاء ایمان کا ایک شعبہ ہے(2)''۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ایمان دل میں ایک سفید نقطہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جب بھی ایمان میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ نقطہ بڑھ جاتا ہے اور آپ کا قول لُمَظَة اس کے بارے اصمعی نے کہا ہے: نقطہ اور اس کی طرح کی سفیدی ہے اور اسی سے کہا گیا ہے: فرس المظ جب گھوڑے کے ہونٹ میں سفیدی ہو اور محدثین کہتے ہیں لَمظة فتحہ کے ساتھ۔ البتہ کلام عرب میں یہ ضمہ کے ساتھ ہے، مثلاً شُبهة، دهمة اور حُمرة۔ اور اس میں ان کے خلاف حجت اور دلیل ہے جو ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ کیا آپ انہیں دیکھ نہیں رہے وہ کہتے ہیں جب بھی ایمان بڑھتا ہے تو وہ نقطہ بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ سارا دل سفید ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح نفاق دل میں ایک سیاہ نقطہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب بھی نفاق بڑھتا ہے تو دل سیاہ ہوتا ہے یہاں تک کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور ان میں سے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ایمان عرض ہے اور یہ دو زمانوں میں ثابت نہیں رہتا اور یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صلحاء کے لئے یکے بعد دیگرے قائم رہتا ہے، پس مومن کے دل میں اس کی امثال کے لگاتار اور تسلسل کے ساتھ قائم رہنے کے اعتبار سے اور بالدوام اس کے موجود رہنے کے اعتبار سے یہ بڑھتا ہے۔ اور مومن کے دل پر لگاتار اور مسلسل غفلتیں پڑنے کے سبب یہ کم ہو جاتا ہے، اس کی طرف ابو المعالی نے اشارہ کیا ہے۔

اور یہ معنی حدیث شفاعت میں موجود ہے، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اسے مسلم نے نقل کیا ہے(3)۔ اس میں ہے: ''پس مومنین عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہمارے بھائی روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے تو انہیں کہا جائے گا جنہیں پہچانتے ہو نکال لاؤ پس ان کی صور آتش جہنم پر حرام کر دی جائیں گی اور خلق کثیر نکال لی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 86۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث 2539، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 47
3۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے گی دراں حالیکہ اسے آگ نصف پنڈلی اور اس کے گھٹنے تک پکڑے ہوئے تھی پھر وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا ہے تو رب کریم فرمائے گا لوٹ کر جاؤ اور جس کے دل میں تم ایک دینار برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ چنانچہ وہ بہت سی مخلوق کو نکالیں گے پھر وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے ان میں سے کوئی ایک بھی اس میں نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا ہے پھر رب کریم فرمائے گا: تم لوٹ کر جاؤ اور تم جس کے دل میں نصف دینار کے برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے نکال لو چنانچہ وہ خلق کثیر کو نکالیں گے پھر عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے اس میں ان میں سے کوئی بھی نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا، پھر رب کریم فرمائے گا: تم لوٹ جاؤ اور جس کے دل میں تم ذرہ برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ (1)۔'' اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس حدیث میں ایمان سے مراد دلوں کے اعمال ہیں، مثلاً نیت، اخلاص، خوف اور نصیحت اور ان کے مشابہ اعمال۔ اور ان کا نام ایمان رکھا ہے کیونکہ یہ محل ایمان میں ہیں یا ایمان سے مراد عادت عرب کے مطابق تسمیۃ الشئ باسم الشئ ہے جبکہ یہ اس کے مشابہ اور مجاور ہو یا یہ اس کے سبب ہو۔ اس تاویل کی دلیل شفاعت کرنے والوں کا وہ قول ہے جو انہوں نے ان لوگوں کو نکالنے کے بعد کہا جن کے دلوں میں ذرہ برابر بھی خیر اور نیکی ہوگی: لم نذر فیھا خیرا (ہم نے اس میں کوئی خیر نہیں چھوڑی) باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد ان میں سے جمع کثیر کو نکالے گا جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے ہیں اور وہ قطعاً یقیناً مومن ہیں اور اگر وہ مومن نہ ہوتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں نہ نکالتا۔

پھر اگر وہ وجود اول معدوم ہو جائے جس پر اس کی مثل مرتب ہوتا ہے تو یہ نہ زیادتی ہے اور نہ نقصان۔ اور اس کا اندازہ حرکت میں لگایا گیا ہے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے علم مفرد پیدا کیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل یا امثال کی معلومات پیدا کیں تو اس کا علم زیادہ ہوا اور اگر اللہ تعالیٰ امثال کو معدوم کر دے تو وہ کم ہو گیا، یعنی زیادتی زائل ہو گئی اور اسی طرح جب اس نے حرکت کو پیدا کیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل یا امثال کو پیدا کیا۔

اور علماء کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ ایمان کی زیادتی اور کمی یہ ادلہ کے اعتبار سے ہے، پس ایک کے پاس دلائل زیادہ ہوتے ہیں تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: یہ ایمان میں زیادتی ہے، اس کے معنی کے مطابق...... کئی اقوال پر...... انبیاء علیہم السلام کو دوسری مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے، کیونکہ وہ اسے وجوہ کثیرہ سے جانتے ہیں اور وہ ان وجوہ سے کہیں زیادہ ہیں جن کے سبب مخلوق اسے جانتی ہے اور یہ قول آیت کے مقتضیٰ سے خارج ہے، کیونکہ یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں زیادتی ادلہ کے اعتبار سے ہو۔

اور ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ ایمان میں زیادتی حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فرائض واخبار کے نزول کے اعتبار سے ہے اور گزرے ہوئے زمانے میں جہالت کے بعد ان کی معرفت کے اعتبار سے ہے اور بلاشبہ یہی ایمان کی زیادتی ہے، پس اس بارے میں یہ قول کہ ایمان زیادہ ہوتا ہے یہ قول مجازی ہے اور اس تعریف پر اس میں کمی کا تصور نہیں کیا جا سکتا،

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 103

بلکہ معلوم کی طرف اضافت کے اعتبار سے اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ فاعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ یعنی انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور حسب یہ احساب سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی کفایت ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

فتملأ بيتنا إقطا و سمنا　　و حسبك من غنى شبع وري

اس میں حَسْبُكَ کا معنی ہے تیرے لئے کافی ہے۔

بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے یہ اس وقت کہا جب انہیں آگ میں پھینکا گیا اور حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس وقت کہا جب انہیں لوگوں نے کہا: بے شک کافر تمہارے لئے بہت سے لوگوں کو (لشکر جرار کو) جمع کئے ہوئے ہیں (1)۔ واللہ اعلم۔

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾

''(ان کے عزم و توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ) واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ چھوا ان کو کسی برائی نے اور پیروی کرتے رہے رضائے الٰہی کی اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔''

ہمارے علماء نے کہا ہے: جب انہوں نے اپنے امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا اور اپنے دلوں سے اس پر اعتماد کر لیا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں چار طرح کی جزا عطا فرمائی: (یعنی) نعمت، فضل، برائی کو ان سے پھیر دینا اور رضا کی پیروی کرنا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رضا عطا فرمائی اور وہ ان سے راضی ہو گیا۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

''یہ تو شیطان ہے جو ڈراتا ہے (تمہیں) اپنے دوستوں سے پس نہ ڈرو ان سے بلکہ مجھ سے ہی ڈرا کرو اگر تم مومن ہو۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یخوفکم اولیاءہ یعنی وہ تمہیں ڈراتا ہے اپنے دوستوں کے ساتھ یا اپنے دوستوں سے (2)، اس سے حرف جر (با یا من) حذف کر دیا گیا ہے اور فعل کو اسم کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور اسے (اسم کو) نصب دی گئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا، ای لِيُنْذِرَكُمْ بِبَاْسٍ شَدِيْدٍ (تا کہ وہ تمہیں ڈرائے شدید قوت کے ساتھ) یعنی وہ مومن کو کافر سے ڈراتا ہے۔ اور حسن اور سدی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ اپنے منافق دوستوں کو ڈراتا ہے، تا کہ وہ مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے سے بیٹھ جائیں (3) اور رہے اللہ تعالیٰ کے دوست تو وہ اس سے نہیں ڈرتے جب وہ انہیں ڈرائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ یہ جو تمہیں کفار کے اجتماع سے ڈرا رہا ہے وہ انسانی

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 655　　2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 403　　3۔ ایضاً، جلد 1-2، صفحہ 404

شیطانوں میں سے ایک شیطان ہے، چاہے وہ نعیم بن مسعود ہو یا کوئی اور، اس اختلاف کی بنا پر جو پہلے گزر چکا ہے۔ فَلَا تَخَافُوْهُمْ یعنی تم ان کافروں سے نہ ڈرو جن کا ذکر اس قول میں کیا گیا ہے: اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ یا (ھم ضمیر) اولیاء کی طرف لوٹ رہی ہے اگر تو کہے کہ معنی یہ ہے وہ تمہیں اپنے دوستوں کے ساتھ ڈراتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ خَافُوْنِ یعنی میرا حکم چھوڑنے میں تم مجھ سے ڈرو اگر تم میرے وعدہ کی تصدیق کرتے ہو اور کلام عرب میں خوف سے مراد گھبراہٹ ہے۔ اور خَاوَفَنِي فلان فَخُفْتُه (ڈرنے میں فلاں نے مجھ سے مقابلہ کیا تو میں اس پر ڈرنے میں غالب آ گیا) یعنی میں اس کی نسبت زیادہ ڈرا۔ اور الخوفاء ایسا جنگل جس میں پانی نہ ہو۔ اور کہا جاتا ہے: ناقةٌ خَوْفاء یعنی ایسی اونٹنی جس کا دودھ خشک ہو جائے اور الخافةُ مراد چمڑے کا وہ تھیلا ہے جس میں شہد حاصل کیا جاتا ہے۔ (یا چمڑے کا وہ لباس جو شہد اتارتے وقت پہنا جاتا ہے)

حضرت سہل بن عبداللہ نے بیان کیا ہے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے پاس بعض صدیقین جمع ہوئے اور پوچھا: خوف کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا: تو امن وسکون نہ پائے یہاں تک کہ تو امن والی جگہ پر پہنچ جائے۔ حضرت سہل نے کہا ہے: حضرت ربیع بن خثیم جب لوہار کی بھٹی کے پاس سے گزرتے تو اس کو ڈھانپ دیا جاتا تھا، تو حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اس بارے بتایا گیا تو آپ نے فرمایا: جب وہ وہاں پہنچیں تو مجھے آگاہ کرنا۔ پس وہ وہاں پہنچے تو لوگوں نے آپ کو اطلاع دی، چنانچہ آپ وہاں آئے اور اپنا ہاتھ ان کی قمیص میں داخل کیا تو آپ نے ان کی (دل کی) حرکت کو بڑا تیز اور بلند پایا تو فرمایا: میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ تمہارے اہل زمانہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا وہ ہے کہ وہ اس سے ڈرے کہ اللہ تعالیٰ اسے سزا دے گا چاہے دنیا میں یا آخرت میں اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے: ڈرنے والا وہ نہیں ہے جو رو رہا ہو اور اپنی آنکھیں پونچھ رہا ہو بلکہ ڈرنے والا وہ ہے جو اسے چھوڑ دے جس کے بارے وہ خوف رکھتا ہو کہ اس سے اسے عذاب دیا جائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کر دیا ہے کہ وہ اس سے ڈریں چنانچہ ارشاد فرمایا: وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اور فرمایا وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ (البقرہ) (اور صرف مجھی سے ڈرا کرو) اور مومنین کی خوف کے سبب مدح کرتے ہوئے فرمایا: يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ (النحل: 50) (ڈرتے ہیں اپنے رب کی قدرت سے) اور ارباب اشارات کی خوف کے بارے میں کئی عبارات ہیں جن کا مرجع وہ ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

الاستاذ ابو علی الدقاق نے کہا ہے: میں ابوبکر بن فورک رحمۃ اللہ علیہ کی عیادت کرنے کے لیے گیا، پس جب انہوں نے مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، تو میں نے ان سے کہا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت اور شفا عطا فرمائے گا، تو انہوں نے مجھے کہا: کیا تو یہ گمان کر رہا ہے کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں؟ بلاشبہ میں تو موت کے بعد والی کیفیت سے ڈر رہا ہوں۔ اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھ سکتے اور میں جو سن رہا ہوں وہ تم نہیں سن سکتے۔ آسمان چرچرا رہا ہے اور اس کے لئے لازم کیا گیا ہے کہ وہ چرچرائے اس میں چار انگلیاں رکھنے کے برابر بھی کوئی جگہ نہیں ہے مگر اس میں فرشتے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہوئے اپنی

پیشانی رکھے ہوئے ہیں قسم بخدا! اگر تم جان لو جو میں جانتا ہوں تو یقیناً تم بہت تھوڑا ہنسو اور تم بہت زیادہ رو۔ اور تم بستروں پر عورتوں سے لطف اندوز نہ ہو اور یقیناً تم دشوار گزار گھاٹیوں کی جانب نکل جاؤ جہاں تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع اور عاجزی کرتے ہوئے دعا مانگو قسم بخدا! میں تو یہ پسند کرتا ہوں کہ میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا ہے(1)۔" اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: حدیث حسن غریب (یہ حدیث حسن غریب ہے) اور اس سند کے علاوہ اور سے روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: لَوَدِدْتُ أَنِّي كُنْتُ شَجَرَةً تُعْضَدُ، (2) واللہ اعلم۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ ۚ إِنَّهُمْ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۗ يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٦﴾

"اور (اے جان عالم) نہ غمزدہ کریں آپ کو جو جلدی سے کفر میں داخل ہوئے ہیں بے شک یہ لوگ نہیں نقصان پہنچا سکتے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ نہ رکھے ان کے لئے ذرا حصہ آخرت (کی نعمتوں) سے اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ یہ ایک قوم تھی جو اسلام لائے اور پھر مرتد ہو گئے مشرکین کے خوف سے، تو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم مغموم ہو گئے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ اور کلبی نے کہا ہے: اس سے مراد منافقین اور یہود کے سردار ہیں، انہوں نے کتاب میں موجود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو چھپالیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے: جب اہل کتاب ایمان نہ لائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ شاق گزرا، کیونکہ لوگ ان کی طرف دیکھتے اور یہ کہتے: بلاشبہ یہ اہل کتاب ہیں، پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول حق ہوتا تو یقیناً یہ آپ کی اتباع اور پیروی کرتے، پس یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا يَحْزُنْكَ حضرت نافع کی قرأت میں یاء مضموم اور زا مکسور ہے، جہاں بھی واقع ہو سوائے (سورۃ) انبیاء کے لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ۔ کیونکہ اس میں یا مفتوح اور زا مضموم ہے(3)۔ اور ابو جعفر نے اس کا برعکس کیا ہے۔ ابن محیصن نے تمام جگہوں پر یا کو ضمہ کے ساتھ اور زا کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی تمام نے یا کو فتحہ اور زا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ حَزَنَنِي الْأَمْرُ يَحْزُنُنِي اور أَحْزَنَنِي بھی ہے اور یہ قلیل لغت ہے اور دونوں میں سے پہلی افصح ہے، نحاس نے یہی کہا ہے۔

اور شاعر نے أحزن کے بارے کہا ہے:

مَضَى صَحْبِي وَأَحْزَنَنِي الدِّيَارُ

(میرے ساتھی چلے گئے اور گھروں نے مجھے غمزدہ کر دیا)

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 319۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 55	3۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 404،

اور عام قرأت یُسَارِعُوْنَ ہے اور طلحہ نے یُسْرِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ پڑھا ہے۔

حضرت ضحاک نے کہا ہے: مراد کفار قریش ہیں (1)۔ اور ان کے سوا نے کہا ہے: وہ منافق ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ وہی ہیں جن کا ذکر ہم نے پہلے کر دیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ تمام کفار کے لئے عام ہے۔ اور ان کا تیزی کے ساتھ کفر میں جانا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مظاہرہ کرنا ہے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: کافر کے کفر پر غمزدہ ہونا طاعت ہے، لیکن حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے کفر پر بہت زیادہ غمزدہ ہوتے تھے، تبھی آپ کو اس سے منع کر دیا گیا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ (فاطر: 8) (پس نہ گھلے آپ کی جان ان کے لئے فرط غم سے) اور فرمایا: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ (الکھف) (تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ ایمان نہ لائے اس قرآن کریم پر افسوس کرتے ہوئے۔)

اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ملک اور اس کی سلطنت اور اقتدار میں سے کسی شے کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، یعنی ان کے کفر کے سبب کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان روایات میں نقل کی ہے جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے میرے بندو! بلاشبہ میں نے ظلم اپنی ذات پر حرام قرار دیا ہے اور میں نے اسے تمہارے درمیان بھی حرام قرار دیا ہے پس تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم تمام کے تمام گمراہ ہو سوائے ان کے جنہیں میں نے ہدایت دی پس تم مجھ سے ہدایت طلب کرو میں تمہیں ہدایت عطا فرماؤں گا۔ اے میرے بندو! تم تمام کے تمام بھوکے ہو سوائے اس کے جسے میں نے کھانا کھلایا پس تم مجھ سے کھانا طلب کرو میں تمہیں کھانا کھلاؤں گا (یعنی رزق عطا فرماؤں گا) اے میرے بندو! تم تمام کے تمام ننگے ہو سوائے ان کے جنہیں میں نے لباس پہنایا پس تم مجھ سے لباس کا مطالبہ کیا کرو تا کہ میں تمہیں لباس پہناؤں۔

اے میرے بندو! بلاشبہ تم رات دن گناہ اور خطائیں کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو بخش دیتا ہوں پس تم مجھ سے مغفرت طلب کرو میں تمہاری مغفرت فرما دوں گا۔ اے میرے بندو! بلاشبہ تم میرے نقصان تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے کوئی نقصان پہنچاؤ اور تم میرے نفع تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے کوئی نفع پہنچاؤ۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول، تمہارے آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن تمام تم میں سے ایک انتہائی متقی دل رکھنے والے آدمی کی کیفیت پر ہوں تو اس طرح وہ میرے ملک میں کسی شے کا کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن سارے کے سارے ایک فاجر ترین دل رکھنے والے آدمی کی کیفیت پر ہوں تو وہ میرے ملک اور اقتدار میں کسی قسم کی کمی اور نقصان نہیں کر سکتے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور تمہارے آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن ایک ہی سرزمین میں کھڑے ہو جائیں اور وہ مجھ سے سوال کریں اور میں ہر انسان کو اس کی طلب اور حاجت کے مطابق عطا کروں تو جو کچھ

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 405

میرے پاس ہے اس میں کمی واقع نہ ہوگی مگر اسی طرح جیسے سوئی کمی کرتی ہے جب اسے سمندر میں داخل کیا جائے۔ اے میرے بندو! بلاشبہ یہ تمہارے اعمال ہیں میں انہیں تمہارے لئے شمار کرتا رہتا ہوں پھر میں تمہیں ان کا پورا پورا اجر دوں گا پس جو کوئی خیر اور نیکی پائے تو اسے چاہئے کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور جو کوئی اس کے سوا پائے تو وہ اپنے نفس کے سوا کسی کو ملامت نہ کرے (1)۔'' اسے مسلم نے اپنی صحیح میں اور ترمذی وغیرہما نے روایت کیا ہے اور یہ عظیم حدیث ہے اس میں طوالت ہے تمام کی تمام لکھی جاتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا کا معنی ہے یعنی وہ اولیاء اللہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے جب وہ ان کی مدد ترک کر دیں جبکہ اللہ تعالیٰ ان کا ناصر اور مددگار رہے (2)۔

قولہ تعالیٰ: يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ حظا کا معنی حصہ ہے اور الحظ کا معنی النصیب والجدّ (حصہ) ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان احظّ من فلان، وھو محظوظ۔ فلاں فلاں کی نسبت حصہ کا زیادہ حق رکھتا ہے اور اسے حصہ دیا گیا ہے اور حظ کی جمع خلاف قیاس أحاظ آتی ہے۔ ابو زید نے کہا ہے: کہا جاتا ہے جل حظیظ ای جدید جب وہ رزق میں حصہ دار ہو۔ اور حَظِظْت فی الأمر أحَظ۔ میں نے کام میں خوب حصہ لیا۔ بسا اوقات حظّ کی جمع أحُظا بھی آتی ہے۔ (معنی یہ ہے) اللہ تعالیٰ جنت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں رکھے گا، اور یہ اس بارے میں نص ہے کہ خیر اور شر اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہوتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾

''بے شک جنہوں نے خرید لیا کفر کو ایمان کے عوض میں ہرگز نقصان نہ پہنچا سکیں گے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا اسے تاکید کے لئے مکرر لایا گیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی ایمان کو کفر کے ساتھ تبدیل کرنا اور کفر کے عوض اسے بیچنا یہ اس کی بری تدبیر میں سے ہے، (اور اس کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکیں گے) پس اسے اس کی اطاعت نہ کرنے کا کوئی خوف نہیں ہے اور نہ ہی اس کی تدبیر کا کوئی خوف ہے اور شَيْـًٔا دونوں آیتوں میں مصدر کی جگہ واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، گویا کہ یہ فرمایا: لن یضروا اللہ ضررا قلیلا ولا کثیرا (وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز تھوڑا یا زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے) اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ با کو حذف کرنے کی تقدیر پر منصوب ہو، گویا کہ فرمایا: لن یضروا اللہ بشئ۔

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 319۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء فی صفۃ اوانی الحوض، حدیث 2419، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 405

لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

''اور نہ خیال کریں جو کفر کر رہے ہیں کہ ہم جو مہلت دے رہے ہیں انہیں یہ بہتر ہے ان کے لئے صرف اس لئے ہم تو انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ اور زیادہ کر لیں گناہ اور ان کے لئے عذاب ہے ذلیل و خوار کرنے والا۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ املاء سے مراد عمر کا طویل ہونا اور زندگی کا کشادہ اور خوشحال ہونا ہے اور معنی یہ ہے: وہ لوگ خیال نہ کریں جو مسلمانوں کو خوفزدہ کر رہے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرنے پر قادر ہے اور بلاشبہ وہ انہیں طویل عمریں عطا کر رہا ہے تاکہ وہ معاصی اور گناہ کے اعمال کریں اس لئے نہیں کہ وہ ان کے لئے باعث خیر و نفع ہے اور کہا جاتا ہے: اَنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ سے مراد وہ فتح اور کامیابی ہے جو انہوں نے غزوہ احد میں حاصل کی وہ ان کے نفسوں کے لئے باعث خیر و نفع نہیں، بلکہ وہ اس لئے ہے تاکہ وہ سزائیں اور اضافہ کر لیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: کوئی نیکوکار اور فاجر نہیں ہے مگر موت اس کے لئے بہتر اور باعث خیر ہے، کیونکہ اگر وہ نیکوکار ہو تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ۔

اور اگر وہ فاجر ہو تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا (1) (ہم تو انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ گناہ اور زیادہ کر لیں) ابن عامر اور عاصم نے لَا يَحْسَبَنَّ یا کے ساتھ اور سین کے نصب کے ساتھ قرأت کی ہے (2)۔ اور حمزہ نے تا کے ساتھ اور سین کو منصوب پڑھا ہے (3) (یعنی لا تحْسَبَنَّ) اور باقیوں نے یا کے ساتھ اور سین کو مکسور پڑھا ہے، پس جنہوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کے مطابق الذین فاعل ہے۔ یعنی کفار خیال نہ کریں۔ اور اَنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اور ما بمعنی الذی ہے، اور ضمیر عائد محذوف ہے، اور خیر، أن کی خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ما مقدر ہو اور فعل مصدر ہو، اور تقدیر کلام اس طرح ہو ولا یحسبن الذین کفروا أن املاءنا لھم خیر لانفسھم۔ (اور کافر لوگ خیال نہ کریں کہ ہمارا ان کو مہلت دینا ان کے لئے بہتر ہے) اور جنہوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے تو اس میں فاعل ضمیر خطاب ہے، اور (مخاطب) حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور الذین کو تحسب کا مفعول اول ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے اور أن اور اس کا مابعد الذین سے بدل ہے، اور یہ قائم مقام دو مفعولوں کے ہو جائے گا جیسا کہ یہ بدل نہ ہونے کی صورت میں قائم مقام ہے۔ اور ان اور اس کا مابعد تحسب کا مفعول ثانی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، کیونکہ اس باب میں مفعول ثانی ہی معنی میں اول ہوتا ہے، کیونکہ حسب اور اس کے اخوات مبتدا اور خبر پر داخل ہوتے ہیں۔ پس تقدیر کلام ہو گی: ولا تحسبن أنما نملی لھم خیر۔ یہ زجاج کا قول ہے اور ابوعلی کا قول ہے: اگر یہ صحیح ہوتا تو کہتا خیراً یعنی نصب کے ساتھ، کیونکہ أنّ، الذین کفروا سے بدل ہو جائے گا، تو گویا یہ کہا: لا تحسبن املاء الذین کفروا خیرا (یعنی تم کافروں کی مہلت کو بہتر اور خیر خیال نہ کرو) تو اس میں قولہ خیراً حسب کے لئے مفعول ثانی ہے۔ تب یہ جائز نہیں ہے کہ لا تحسبن تا کے ساتھ پڑھا جائے مگر اس صورت میں کہ أنما میں إنّ کو کسرہ دیں اور خیرا کو نصب دیں (4)، اور حمزہ سے یہ مروی نہیں ہے اور حمزہ کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 546، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 545　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 545

قرأت تا کے ساتھ ہے، نتیجتاً یہ قرأت صحیح نہ ہوگی۔

اور فراء اور کسائی نے کہا ہے: حمزہ کی قرأت تکریر کی بنا پر جائز ہے، اس کی تقدیر عبارت ہے ولا تحسبن الذین کفروا، ولا تحسبن أنما نملی لھم خیر، پس اس میں أن دوسرے تحسب کے لئے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے، اور یہ اور جس نے عمل کیا ہے (مراد عامل تحسب ہے) وہ پہلے تحسب کا مفعول ثانی ہے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: یہ اس کے زیادہ قریب ہے جو زجاج نے بدل کے دعویٰ میں ذکر کیا ہے، اور قرأت صحیح ہے، جبکہ ابو علی کا مقصود زجاج کو غلط قرار دینا ہے۔ نحاس نے کہا ہے اور ابو حاتم نے گمان کیا ہے کہ یہاں حمزہ کی قرأت تا کے ساتھ ہے، اور ان کا قول: ولا یحسبن الذین یبخلون لحن (غلطی) ہے جائز نہیں ہے۔ اور اس پر ان کی اتباع ایک جماعت نے کی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ کوئی شے نہیں ہے، جیسا کہ اس کا ترکیبی بیان پہلے گزر چکا ہے اور نقلاً قرأت کا صحیح ہونا اور اس کا ثابت ہونا بھی گزر چکا ہے اور یحییٰ بن وثاب نے اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ یعنی دونوں جگہ پر ان کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے کہا ہے: یحییٰ کی قرأت اچھی ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: حسبت عمرا ابوہ خالد (اس میں عمرا مفعول اول اور ابوہ خالد مفعول ثانی ہے۔) ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے احنف سے سنا ہے وہ ان کو مکسور ذکر کرتے ہیں اور اس سے قدریہ کے لئے استدلال کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان میں سے تھے اور وہ تقدیم و تاخیر پر معمول کرتے ہیں ولا یحسبن الذین کفروا انما نملی لھم لیزدادوا اثما انما نملی لھم خیر لانفسھم۔

بیان کیا: میں نے جامع مسجد میں ایک مصحف میں دیکھا انہوں نے اس میں ایک حرف زائد کیا تھا تو وہ اس طرح ہو گیا انما نملی لھم ایمانا پس اس کی طرف یعقوب القاری نے دیکھا تو غلطی واضح ہوگئی چنانچہ انہوں نے اسے مٹا دیا۔ اور یہ آیت قدریہ مذہب کے بطلان میں نص ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ ان کی عمروں کو طویل کرتا ہے تاکہ وہ معاصی کا عمل کر کے کفر میں اضافہ کریں، اور اس کی امثال لگاتار دل پر مرتب ہوتی ہیں، جیسا کہ اس کی ضد جو کہ ایمان ہے اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: کوئی نیکوکار نہیں اور نہ ہی کوئی فاجر ہے مگر موت اس کے لئے بہتر اور باعث خیر ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْۤا اِثْمًا اور یہ آیت پڑھی۔ وما عند الله خیر للابرار (1) اسے رزین نے روایت کیا ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۱۷۹

"نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ چھوڑے رکھے مومنوں کو اس حال پر جس پر تم اب ہو جب تک الگ الگ نہ کر

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 233

دے پلید کو پاک سے اور نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ آگاہ کرے تمہیں غیب پر البتہ اللہ (غیب کے علم کے لئے) چن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے اجر عظیم ہے۔"

ابوالعالیہ نے کہا ہے: مومنین نے عرض کی کہ انہیں ایسی علامت اور نشانی عطا کی جائے جس کے ساتھ وہ مومن اور منافق کے درمیان فرق کر سکیں، تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ الآیہ (1)۔ اس آیت کا مخاطب کون ہیں؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ضحاک، مقاتل، کلبی اور اکثر مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اس میں خطاب کفار اور منافقین کو ہے (2)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی شان نہیں ہے کہ وہ مومنوں کو اس حال پر چھوڑے رکھے جس حال پر کفر، نفاق اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عداوت میں سے تم اب ہو۔ کلبی نے کہا ہے: اہل مکہ میں سے قریش نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: ہم میں سے ایک آدمی کے بارے میں آپ گمان کرتے ہیں کہ وہ آتش جہنم میں ہے، اور یہ کہ جب اس نے ہمارا دین چھوڑ دیا اور تمہارے دین کی اتباع و پیروی کر لی تو تم نے کہا یہ اہل جنت میں سے ہے! پس اس کے بارے ہمیں بتلائیے یہ کہاں سے ہوا؟ اور اس کی بھی خبر دیجئے ہم میں سے کون تمہارے پاس آئے گا؟ اور کون تمہارے پاس نہیں آیا؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ یعنی کفر اور نفاق میں سے جس حال پر تم ہو۔ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (یہاں تک کہ وہ پلید کو پاک سے الگ الگ کر دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب مشرکین کو ہے اور قول باری تعالیٰ: لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ میں مومنین سے مراد وہ ہیں جو ابھی صلبوں اور رحموں میں ہیں ان میں سے جو ایمان لائیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہاری اس اولاد کو جن کے لئے ایمان کا حکم ہے اس حال پر چھوڑ دے جس حال پر شرک میں سے اب تم ہو، یہاں تک کہ وہ تمہارے اور ان کے درمیان تفریق کر دے گا، اور اس بنا پر وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ نیا کلام ہوگا۔ اور یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین کا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ خطاب مومنین کو ہے (3)، یعنی اور اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ دے اے گروہ مومنین! اس حال پر جس پر تم اب ہو کہ مومن اور منافق باہم مخلوط اور ملے جلے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تمہارے درمیان آزمائش اور (احکام کا) پابند بنا کر تفریق ڈال دے کہ تم پلید منافق اور پاک مومن کو پہچان لو۔ اور اللہ تعالیٰ نے دونوں فریقوں کو احد کے دن الگ الگ کر دیا۔ یہ قول اکثر اہل معانی کا ہے۔ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ (اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی شان کہ تمہیں غیب پر مطلع کرے) اے گروہ مومنین! یعنی نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی شان کہ وہ تمہارے لئے منافقین کو معین کر دے تاکہ تم انہیں پہچان لو، البتہ وہ انہیں تمہارے لئے احکام کا پابند بنا کر اور آزمائش میں ڈال کر ظاہر کر دے گا، اور پھر وہ احد کے دن ظاہر ہو گئے، کیونکہ منافقین پیچھے رہ گئے اور انہوں نے مسلمانوں کی تکلیف اور اذیت پر خوشی کا اظہار کیا، پس تم اس سے پہلے اس غیب کو نہ جانتے تھے، پس اب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 405　2۔ ایضاً، جلد 1-2، صفحہ 407　3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 546، دار الکتب العلمیہ

اور آپ کے اصحاب کو اس پر آگاہ فرمادیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ لِيُطْلِعَكُمْ کا معنی ہے یعنی اور اللہ تعالیٰ کی شان نہیں ہے کہ وہ تمہیں اس سے آگاہ کرے جو ان سے ہوگا۔ پس قول باری تعالیٰ: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ اس قول کے مطابق (سابقہ کلام سے) متصل ہے، اور پہلے دونوں قولوں کی بنا پر منقطع ہے اور وہ یہ کہ کفار نے جب کہا: ہماری طرف وحی کیوں نہیں کی گئی؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ یعنی اس پر جو نبوت کا مستحق ہوتا ہے کہ وحی تمہارے اختیار (اور پسند) کے مطابق ہو(1)۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ البتہ اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے یعنی منتخب فرمالیتا ہے مِنْ رُّسُلِهٖ اپنے رسولوں میں سے اپنے غیب پر اطلاع اور آگاہی کے لئے مَنْ يَّشَآءُ جسے چاہتا ہے۔ کہا جاتا ہے طلعت علی کذا اور اطلعت علیہ (میں اس پر آگاہ ہوا) اور اطلعت علیہ غیری (میں نے اس پر اپنے سوا دوسرے کو آگاہ کیا) پس یہ لازم اور متعدی (دونوں طرح استعمال ہوتا ہے) اور حَتّٰى يَمِيْزَ مَيَّزَ سے تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اور اسی طرح سورۃ الانفال میں ہے۔ اور یہی حمزہ کی قرأت ہے۔ اور باقیوں نے يَمِيْزَ تخفیف کے ساتھ مازیمیز سے پڑھا ہے۔ کہا جاتا ہے: مزت الشی بعضہ من بعض امیزہ میزا، اور میزتہ تمییزا (میں نے ایک شے کے بعض کو بعض سے الگ الگ کر دیا)

ابو معاذ نے کہا ہے: مزت الشیٔ امیزہ میزا (کہا جاتا ہے) جب تو دو چیزوں کو الگ الگ کرے، اور اگر اشیاء زیادہ ہوں تو تو کہے گا: فرقت بینہما، یعنی یہ تخفیف کے ساتھ ہوگا، اور اسی سے فرق الشعر (بالوں کی مانگ) بھی ہے اور اگر ایک شے کو دو سے زیادہ حصوں میں تقسیم کرے تو کہے گا: فرقتہ تفریقا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کہ اسی سے امتاز القوم ہے، یعنی ان کے بعض بعض سے جدا ہو گئے الگ ہو گئے، اور یکاد یتمیز کا معنی ہے یتقطع (قریب ہے کہ وہ کٹ جائے) اور اسی کے ساتھ اس قول باری تعالیٰ کی تفسیر بیان کی گئی ہے: تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (الملک: 8) (ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مارے غضب کے پھٹا چاہتی ہے) اور حدیث میں ہے: من ماز اذی من الطریق فہولہ صدقۃ (جس نے راستے سے تکلیف دہ چیز دور کی تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے۔)

قولہ تعالیٰ: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ کہا جاتا ہے کہ کفار نے جب رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ آپ انہیں ان کے بارے بتائیں جو ان میں سے ایمان لائیں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ یعنی تم ایسے کاموں میں مشغول نہ ہو جو تمہارا مقصود نہیں ہیں، بلکہ تم ایسے کام میں مشغول ہو جو تمہارا مقصود ہے (اور تمہارے لئے نفع بخش ہے) اور وہ ایمان لانا ہے۔ فَاٰمِنُوْا یعنی تم تصدیق کرو۔ یعنی تم پر تصدیق کرنا واجب اور لازم ہے نہ کہ اطلاع غیب کی طرف جھانکنا(2) (اور اس سے آراستہ ہونا لازم ہے) وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (اور اگر تم ایمان لائے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے اجر عظیم یعنی جنت ہے اور ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی حجاج بن یوسف ثقفی کے پاس نجومی تھا، پس حجاج نے اپنے ہاتھ میں چند کنکریاں لیں اور ان کی تعداد معلوم کر لی اور پھر نجومی کو کہا: میرے ہاتھ میں کتنی ہیں؟ پس اس نے حساب لگایا اور نجومی اس تعداد تک پہنچ گیا، پھر حجاج نے اسے غافل رکھا اور کچھ کنکریاں ہاتھ میں لیں اور انہیں گنا نہیں اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 546، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضا

پھر نجومی کو کہا: میرے ہاتھ میں کتنی ہیں؟ پس اس نے حساب لگایا اور اس میں غلطی اور خطا کی، پھر اس نے حساب لگایا اور پھر غلطی کی۔ پس اس نے کہا: اے امیر! میرا خیال ہے کہ جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے تو اس کی تعداد کو نہیں جانتا؟ اس نے کہا (ہاں) نہیں جانتا۔ تو اس نے پوچھا: ان دونوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس نے جواب دیا: اگر تو نے اسے گنا ہوتا تو یہ غیب کی تعریف سے نکل جاتا، اور میں حساب لگاتا تو اس تک پہنچ جاتا اور چونکہ تجھے اس کی تعداد معلوم نہیں اس لئے یہ غیب ہے، اور غیب الله تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ باب سورۃ الانعام میں عنقریب آئے گا ان شاء الله تعالیٰ۔

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾

"اور ہرگز نہ گمان کریں جو بخل کرتے ہیں اس میں، جو دے رکھا ہے انہیں الله تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے کہ یہ بخل بہتر ہے ان کے لئے، بلکہ یہ بخل بہت برا ہے ان کے لئے طوق پہنایا جائے گا انہیں وہ مال جس میں انہوں نے بخل کیا قیامت کے دن، اور الله کے لئے ہے میراث آسمانوں اور زمین کی اور الله تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے خبردار ہے۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ اس میں الَّذِيْنَ محل رفع میں ہے اور مفعول اول محذوف ہے۔ خلیل، سیبویہ اور فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے البخل خیرا لھم، یعنی بخل کرنے والے یہ گمان نہ کریں (کہ) بخل ان کے لئے بہتر ہے (1) اور چونکہ یبخلون بخل پر دلالت کر رہا ہے اس وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا ہے، اور یہ اس قول کی طرح ہے: من صدق کان خیرا له ای کان الصدق خیرا له (جس نے سچ بولا وہ سچ اس کے لئے بہتر ہے۔)

اور اسی سے شاعر کا قول ہے:

اذا نُهِيَ السَّفِيه جَرَى اليه وخالَفَ والسَّفِيهُ الى خِلافِ

پس معنی ہے: جری الی السفه، پس سفیه سفه پر دلالت کرتا ہے۔

(جب سفیہ (احمق) کو منع کیا گیا تو وہ اسی کی طرف چلا اور اس نے مخالفت کی اور سفیہ خلاف کی طرف گیا۔)

اور رہی حمزہ کی قرأت تا کے ساتھ تو وہ (حقیقت سے) بہت دور ہے، نحاس نے یہی کہا ہے اور اس کا جواز اس صورت میں ہے کہ تقدیر عبارت یہ ہو: لا تحسبن بخل الذین یبخلون هو خیرا لهم (2)۔ (تو ان لوگوں کے بخل کے بارے جو بخل کرتے ہیں گمان بھی نہ کر کہ وہ ان کے لئے بہتر ہے۔)

زجاج نے کہا ہے: یہ وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ کی مثل ہے (3) (یعنی مضاف محذوف ہے) اور قول باری تعالیٰ: هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ میں

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 236 2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 236 3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547

ھُوَ بصریوں کے نزدیک ضمیر فاصلہ ہے اور کوفیوں کے نزدیک یہی ضمیر عماد ہے۔ نحاس نے کہا ہے: عربی میں مبتدا خبر ہونے کی حیثیت سے ھُوَ خَیْرٌ لَّھُمْ بھی جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ یعنی البخل شرلھم (بخل ان کے لئے بہت برا ہے) اور سَیُطَوَّقُوْنَ میں سین وعید کی سین ہے، یعنی سوف یطوقون (انہیں طوق پہنایا جائے گا)، مبرد نے یہی کہا ہے۔ یہ آیت مال، انفاق فی سبیل اللہ، اور فرض زکوٰۃ کی ادائیگی میں بخل کرنے کے بارے نازل ہوئی ہے(1) اور یہ اس ارشاد کی طرح ہے: وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الآیہ (التوبہ: 34)

تاویل کرنے والوں کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے ان میں سے حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، ابووائل، ابو مالک، سدی اور شعبی رضی اللہ عنہم ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ کا معنی وہ ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موجود ہے(2) کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی قیامت کے دن وہ اس کے لئے اژدھا کی شکل بنا دیا جائے گا اس کی آنکھوں پر دو سیاہ نشان ہوں گے قیامت کے دن اسے اس کا طوق پہنایا جائے گا پھر وہ اسے اپنے دونوں جبڑوں کے ساتھ پکڑ لے گا اور پھر کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ (کنز) ہوں...... پھر یہ آیت تلاوت فرمائی...... وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ الآیۃ۔(3)

اسے نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور ابن ماجہ نے اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، آپ نے فرمایا: ''کوئی بھی جو اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، قیامت کے دن اس کے لئے اسے ایک زہریلے اژدھا کی شکل بنا دیا جائے گا یہاں تک کہ اس کی گردن میں اس کے ساتھ طوق پہنایا جائے گا'' پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم پر کتاب اللہ میں سے اس کا مصداق یہ آیت پڑھی وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ الآیہ (4)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی ذی رحم (رشتہ دار) نہیں ہے جو اپنے ذی رحم کے پاس آتا ہے اور اس سے اس فضل و احسان (مراد مال) میں سے کچھ مانگتا ہے جو اس کے پاس ہے پس وہ اس کے بارے اس پر بخل کرتا ہے، مگر قیامت کے دن اس کے لئے جہنم سے ایک اژدھا نکالا جائے گا جو زبان (باہر نکال کر) ادھر ادھر پھیر رہا ہوگا تاکہ اسے اس کا طوق پہنائے (5)'' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: بلاشبہ یہ آیت اہل کتاب اور ان کے بخل کے بارے میں اس کے بیان سے جو کچھ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جانتے تھے نازل ہوئی (6)۔ اور حضرت مجاہد، اور اہل علم کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے۔ اور اس تاویل پر سَیُطَوَّقُوْنَ کا معنی ہے عنقریب وہ اس کی سزا برداشت کریں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً

3۔ سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 343۔ ایضاً صحیح بخاری، باب اثم مانع الزکاۃ، حدیث 1315، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 129۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1773، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 2، صفحہ 322، حدیث نمبر 2343　　6۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547، دار الکتب العلمیہ

گے جو انہوں نے آپ کے ساتھ بخل کیا اور یہ طاقۃ سے ماخوذ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ (البقرہ: 184) (اور جو لوگ اسے مشکل سے ادا کر سکیں) اور یہ تطویق سے ماخوذ نہیں ہے(1)۔ اور حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: سَيُطَوَّقُوْنَ کا معنی ہے کہ ان کے لئے قیامت کے دن آگ کا طوق بنایا جائے گا(2) اور یہ پہلی تاویل کے ساتھ یعنی سدی کے قول کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے اعمال کو ان کے ساتھ چمٹا دیا جائے گا جیسا کہ طوق گردن کے ساتھ چمٹ جاتا ہے، کہا جاتا ہے: طُوِّقَ فلان عملَه طَوقَ الحمامة، فلاں کو اس کے عمل کا طوق پہنایا گیا کبوتری کے طوق کی طرح، یعنی اسے اس کا عمل چمٹا دیا گیا۔ اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (الاسراء: 13) (اور ہر انسان کی (قسمت کا) نوشتہ اس کے گلے میں ہم نے لٹکا رکھا ہے۔)

اور اسی معنی میں ابوسفیان کے لئے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے:

أبلِغْ أبا سفيان عن أمرٍ عواقبُه ندامه

تو ابوسفیان کو اس امر کا پیغام پہنچا دے جس کا انجام ندامت اور شرمندگی ہے۔

دار ابن عمك بعتها تقضي بها عنك العرامه

تو نے اپنے چچا کے بیٹے کا گھر بیچ دیا ہے اس کے عوض تجھ سے تاوان لیا جائے گا۔

و حليفكم بالله رب الناس مجتهد القسامة

اور قسم ہے اللہ کی جو لوگوں کا رب ہے تمہارا حلیف قسامہ کی کوشش کر رہا ہے۔

اذهب بها اذهب بها طُوِّقْتَها طَوْق الحمامه

تو اسے لے جا تو اسے لے جا تجھے کبوتری کے طوق کی طرح اس کا طوق پہنایا جائے گا۔

اور یہ دوسری تاویل کے مطابق جاری ہوتا ہے۔ بُخْل اور بَخَل کا لغت میں معنی یہ ہے کہ انسان کا اس حق کو (ادا کرنے) سے باز رہنا جو (حق) اس پر واجب ہو۔

پس جو کوئی اس سے باز رہا جو اس پر واجب نہیں ہوتا تو وہ بخیل نہیں ہے، کیونکہ اس پر مذمت نہیں کی جاتی ہے۔ اور اہل حجاز کہتے ہیں: يَبْخلون وقد بَخَلوا، (وہ بخل کرتے ہیں اور تحقیق انہوں نے بخل کیا۔ اور تمام عرب کہتے ہیں: بَخِلُوْا يَبْخَلُوْنَ۔

اسے نحاس نے بیان کیا ہے۔ اور بَخِلَ يَبْخَلُ بُخْلًا وَ بَخَلًا، یہ ابن فارس سے منقول ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ تیسرا مسئلہ بخل کے ثمرہ اور اس کے فائدہ کے بارے میں ہے۔ اور اس کے بارے روایت کیا گیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو فرمایا: تمہارا سردار کون ہے؟ انہوں نے عرض کی جد بن قیس اس بنا پر کہ اس میں بخل ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اور کون سی بیماری (عیب) ہے جو بخل سے بڑھ کر ہو'' (یعنی جو بخل سے زیادہ قبیح ہو) انہوں نے عرض کی: وہ کیسے یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپ نے فرمایا: ''ایک قوم ساحل سمندر کے قریب اتری پس وہ اپنے بخل کے

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 409 2۔ ایضاً

سب اپنے پاس مہمانوں کے آنے سے تنگ اور مجبور ہو گئے تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ ہم میں سے مردوں کو چاہیے کہ وہ عورتوں سے دور فاصلے پر رہیں تا کہ مرد عورتوں کے دور ہونے کے سبب مہمانوں کے سامنے معذرت کریں، اور عورتیں مردوں کے دور ہونے کے سبب ان سے معذرت کریں، پس انہوں نے ایسا کر لیا اور اسی طرح ان پر طویل وقت گزر گیا نتیجتاً مرد مردوں کے ساتھ اور عورتیں عورتوں کے ساتھ (استمتاع کے لئے) مشغول ہو گئے (1)۔'' اسے الماوردی نے کتاب ''ادب الدنیا والدین'' میں ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ بخل اور شح میں اختلاف ہے، کیا یہ دونوں ایک معنی میں ہیں یا دو معنوں میں۔ چنانچہ کہا گیا ہے: البخل الامتناع من اخراج ما حصل عندك (بخل سے مراد اس شے کو دینے اور نکالنے سے باز رہنا ہے جو تیرے پاس موجود ہو) اور الشح! الحرص علی تحصیل ما لیس عندك (شح سے مراد اس شے کو حاصل کرنے کی حرص رکھنا ہے جو تیرے پاس موجود نہیں۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شح سے مراد وہ بخل ہے جس کے ساتھ حرص بھی ہو۔ اور یہی صحیح ہے اس روایت کے مطابق جسے مسلم نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے دن اندھیرے اور تاریکیاں ہے اور شح (بخل) سے بچو کیونکہ اس نے انہیں تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا ہے اس نے انہیں اس پر ابھارا ہے کہ وہ اپنے خون بہائیں اور اپنی محارم کو حلال سمجھیں (2)'' اور یہ ارشاد ان کے قول کی تردید کرتا ہے جنہوں نے کہا کہ بخل واجب کو روکنا (اور اسے ادا نہ کرنا) ہے اور شح مستحب کو روکنا ہے۔ کیونکہ اگر شح مستحب کو روکنا ہوتا تو وہ اس عظیم اور شدید وعید کے تحت داخل نہ ہوتا، اور شدید مذمت وہی ہے جس میں دنیا اور آخرت کی ہلاکت ہو۔

اور اس معنی کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں اڑنے والا غبار اور جہنم کا دھواں ایک مسلمان آدمی کے نتھنوں میں ہمیشہ کے لئے جمع نہیں ہو سکتا اور نہ ہی شح (بخل) اور ایمان ایک مسلمان آدمی کے دل میں ہمیشہ جمع رہ سکتے ہیں (3)۔'' اور یہ اس پر دلیل ہے کہ شح مذمت میں بخل سے زیادہ شدید ہے، مگر بلاشبہ ایسی روایات بھی موجود ہیں جو ان دونوں کے مساوی اور برابر ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول ہے...... آپ سے پوچھا گیا: أیکون المؤمن بخیلاً؟ کیا مومن بخیل ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: لا نہیں۔

اور الماوردی نے کتاب ''ادب الدنیا والدین'' میں ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کو کہا: ''تمہارا سردار کون ہے؟'' انہوں نے عرض کی: جد بن قیس اس بنا پر کہ اس میں بخل ہے، الحدیث۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے باقی رہنے اور اپنی بادشاہی کے دائمی ہونے

1۔ المستدرک، معرفۃ الصحابۃ، جلد 3، صفحہ 242، حدیث نمبر 4965　　2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2

3۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 55

کی خبر دی ہے اور یہ کہ وہ ابد میں اسی طرح ہے جیسے وہ ازل میں تھا اور وہ العالمین سے غنی (اور بے نیاز) ہے، پس وہ زمین کا وارث ہوگا اپنی مخلوق کے فنا ہونے کے بعد اور ان کی املاک زائل اور ختم ہونے کے بعد، پس املاک اور اموال باقی رہیں گے لیکن ان کا دعویٰ کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ تو یہ مخلوق کی عادت اور عرف کے مطابق وراثت کے جاری ہونے کی طرح ہی یہ (حکم) جاری ہوگیا، حالانکہ حقیقت میں یہ میراث نہیں ہے، کیونکہ حقیقت میں وارث وہ ہے جو کسی (ایسی) شے کا وارث بنتا ہے جس کا وہ اس سے قبل مالک نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ تو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک ہے، تمام آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، اور زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب اسی کا ہے، اور اموال اپنے مالکوں کے پاس عاریۃً (ادھار) ہیں، پس جب وہ مرتے ہیں تو عاریہ کو اس کے اس مالک کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جس کا وہ اصل میں ہوتا ہے اور اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَیْهَا الآیہ (مریم: 40) (یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے اور ہماری طرف ہی سب لوٹائے جائیں گے۔)

اور دونوں آیتوں میں معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم ارشاد فرمایا ہے کہ وہ خرچ کریں اور وہ بخل نہ کریں اس سے قبل کہ وہ مر جائیں اور وہ اسے بطور میراث اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ جائیں، اور انہیں کوئی نفع نہ دے گا سوائے اس کے جو انہوں نے خرچ کر دیا۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿۱۸۲﴾ۚ

"بے شک سنا اللہ نے قول ان (گستاخوں) کا جنہوں نے کہا اللہ مفلس ہے حالانکہ ہم غنی ہیں ہم لکھ لیں گے جو انہوں نے کہا نیز قتل کرنا ان کا انبیاء کو ناحق (بھی لکھ لیا جائے گا) اور ہم کہیں گے کہ (اب) چکھو آگ کے عذاب (کا مزہ) یہ بدلہ ہے اس کا جو آگے بھیجا ہے تمہارے ہاتھوں نے اور یقینا اللہ تعالیٰ نہیں ظلم کرنے والا اپنے بندوں پر۔"

قولہ تعالیٰ: لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ اللہ تعالیٰ نے کفار بالخصوص یہود کے قول کی قباحت (اور برائی) ذکر فرمائی۔ اور اہل تفسیر نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (البقرہ: 245) (کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن) تو یہودیوں میں سے ایک گروہ نے کہا...... ان میں سے حیی بن اخطب تھا، یہ حسن کے قول کے مطابق ہے اور حضرت عکرمہ وغیرہ نے کہا ہے: وہ فنحاص بن عازوراء تھا...... اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ (1) (بے شک اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم غنی (اور دولت مند) ہیں وہ ہم سے قرض مانگ رہا ہے۔ بلاشبہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 548، دار الکتب العلمیہ

انہوں نے اپنے ضعفاء اور کمزوروں پر اظہار برتری کے طور پر سنانے کے لئے یہ کہا، نہ کہ وہ اس کا اعتقاد رکھتے تھے، کیونکہ وہ اہل کتاب تھا۔ لیکن انہوں نے اس قول کے ساتھ کفر کیا، کیونکہ انہوں نے اس سے اپنے ضعفاء کو اور مومنین میں سے کمزور لوگوں کو شک میں ڈالنے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کا ارادہ کیا۔ یعنی یہ کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق فقیر اور مفلس ہے، کیونکہ اس نے ہم سے قرض کا مطالبہ کیا ہے۔ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا یعنی ہم انہیں اس پر جزا اور بدلہ دیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم انہیں ان کے اعمال ناموں میں لکھ لیں گے، یعنی ہم کراماً کاتبین کو ان کا قول لکھ لینے اور ثابت رکھنے کا حکم دیں گے تا کہ وہ قیامت کے دن اپنے انہیں اعمال ناموں میں اسے پڑھیں جو انہیں دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ یہ ان کے خلاف حجت کو اور پختہ اور مؤکد کرنے والا ہو جائے گا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ (الانبیاء) (اور ہم اس کے لئے (اس کے عملوں کو) لکھنے والے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لکھنے سے مقصود محفوظ رکھنا ہے، یعنی ہم اسے محفوظ رکھیں گے جو انہوں نے کہا تا کہ ہم انہیں بدلہ اور جزا دیں، اور مَا قَالُوْا میں مَا، سَنَكْتُبُ کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

اور اعمش اور حمزہ نے سیکتب پڑھا ہے۔ یعنی یا کے ساتھ تو اس صورت میں ما، اسم ما لم یُسم فاعلہ (نائب الفاعل) ہوگا۔ اور حمزہ نے اس میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت کا اعتبار کیا ہے: وَ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ یعنی ہم ان کے انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے کے عمل کو لکھ لیں گے، یعنی ان کے قتل کے ساتھ رضامند ہونے کو۔ اور ان سے مراد ان کے اسلاف کا انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا ہے، لیکن جب وہ اس پر راضی اور خوش ہیں تو اس کی اضافت ان کی طرف کرنا صحیح ہے۔ ایک آدمی نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کو اچھا اقدام قرار دیا تو حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کہا: تو بھی ان کے خون میں شریک ہے، پس آپ نے رضا بالقتل کو قتل ہی قرار دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بہت بڑا مسئلہ ہے، اس حیثیت سے کہ رضا بالمعصیت معصیت ہوتی ہے۔ ابوداؤد نے عرس بن عمیرہ الکندی سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب تو نے زمین میں خطا اور گناہ کا عمل کیا تو جو وہاں حاضر تھا اس نے اسے ناپسند کیا..... اور ایک بار فرمایا پس اس نے اس کا انکار کیا..... تو وہ اس کی طرح ہے جو وہاں موجود نہ تھا اور جو وہاں سے غائب تھا لیکن اس نے اسے پسند کیا تو وہ اس کی طرح ہے جو وہاں موجود اور حاضر تھا(1)۔'' اور یہ نص ہے۔ قولہ تعالیٰ: بِغَيْرِ حَقٍّ اس کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ وَ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ یعنی جہنم میں ان کو کہا جائے گا یا موت کے وقت یا حساب کے وقت یہ کہا جائے گا۔ پھر یہ قول یا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوگا یا فرشتوں کی جانب سے، دونوں قول ہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ویقال ہے۔ اور الحریق شعلہ نکالنے والی آگ کا اسم ہے، اور النار کا لفظ شعلہ نکالنے والی اور شعلہ نہ نکالنے والی آگ دونوں کو شامل ہے۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ یعنی وہ عذاب ان گناہوں کے عوض ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور الایدی کو ذکر کے ساتھ اس لئے خاص کیا گیا ہے تا کہ وہ فعل کے بذات خود کرنے پر دلالت کرے، کیونکہ کبھی فعل کی نسبت انسان کی طرف

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، جلد 2، صفحہ 241

کردی جاتی ہے اس معنی میں کہ اس نے وہ کام کرنے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے یُذَبِّحُ اَبْنَاءَهُمْ اور اَیْدِیَکُمْ اصل میں اَیْدِیکُم تھا ضمہ کو یا پر ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

اَلَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ ﴿۱۸۴﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ تحقیق اللہ (تعالیٰ) نے اقرار لیا ہے ہم سے کہ ہم نہ ایمان لائیں کسی رسول پر یہاں تک کہ وہ لائے ہمارے پاس ایک قربانی کھا لے اس کو آگ آپ فرمایئے آ چکے تمہارے پاس رسول مجھ سے پہلے بھی دلیلوں کے ساتھ اور اس (معجزہ) کے ساتھ بھی جو تم کہہ رہے ہو تو کیوں قتل کیا تھا تم نے انہیں اگر تم سچے ہو۔ اگر یہ جھٹلاتے ہیں آپ کو تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) بے شک جھٹلائے گئے رسول آپ سے پہلے جو لائے تھے معجزات اور صحیفے اور روشن کتاب۔''

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ محل جر میں ہے اور یہ اس اَلَّذِیْنَ سے بدل ہے جو اس قول باری تعالیٰ میں ہے لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا یا یہ لِلْعَبِیْدِ کی صفت ہے یا مبتدا کی خبر ہے، یعنی ھم الذین قالوا۔ اور کلبی وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت کعب بن اشرف، مالک بن صیف، وہب بن یہوذا، فنحاص بن عازوراء اور ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور آپ سے کہا: کیا آپ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہماری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے، حالانکہ اس نے ہم پر کتاب نازل کی ہے اور اس میں ہم سے عہد کیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جو گمان کرتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یہاں تک کہ وہ ہمارے پاس قربانی لائے جسے آگ کھا لے، پس اگر تم ہمارے لئے وہ (دلیل) لے آئے تو ہم آپ کی تصدیق کر لیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ تورات میں ہے، لیکن مکمل کلام یہ ہے۔ یہاں تک کہ تمہارے پاس حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم آ جائیں پس جب وہ دونوں تمہارے پاس آئیں تو ان دونوں کے ساتھ بغیر قربانی کے ایمان لاؤ۔

اور یہ قول بھی ہے: قربانی دینے والوں کا امر ثابت اور قائم تھا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبان پر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ ان میں سے نبی علیہ السلام قربانی ذبح کرتے تھے اور دعا مانگتے تھے تو پھر سفید سی آگ نازل ہوتی، اس کی آواز ہوتی اور وہ گھیر لیتی، اس کا دھواں نہ ہوتا، اور وہ قربانی کو کھا جاتی۔ پس یہ قول یہود کی طرف سے دعویٰ ہے، اور جب وہاں استثنا ہوئی یا نسخ تو انہوں نے اسے چھپا دیا، اور وہ اس سے اپنے استدلال میں سرکشی اور تکبر کرنے والے تھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ان کے دعویٰ کو باطل کرنے میں دلیل قاطع ہیں، اور اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی۔

اور جس کا صدق ثابت ہو اس کی تصدیق بھی ثابت ہوتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت قائم کرتے ہوئے فرمایا: قُلْ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ فرما دیجئے: قَدْ جَآءَكُمْ اے گروہ یہود! آ چکے تمہارے پاس رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِي بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ (رسول مجھ سے پہلے بھی دلیلوں کے ساتھ اور اس (معجزہ) کے ساتھ جو تم کہہ رہے ہو) یعنی قربانی فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (تو کیوں قتل کیا تھا تم نے انہیں اگر تم سچے ہو) یعنی حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت شعیا علیہم السلام اور وہ تمام انبیاء علیہم السلام جو قتل کر دیئے گئے اور تم ان کے ساتھ ایمان نہ لائے۔ اس سے مراد ان کے اسلاف ہیں (1)۔ اور یہی وہ آیت ہے جسے عامر الشعبی رحمۃ اللہ علیہ نے تلاوت کیا، اور اس کے ساتھ اس پر حجت قائم کی جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کو اچھا قرار دیا جیسا کہ ہم نے اسے بیان کر دیا ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو قاتل کا نام دیا ہے اس لئے کہ وہ اپنے اسلاف کے اس فعل پر راضی تھے، اگرچہ ان کے درمیان تقریباً سات سو برس کا فاصلہ اور فرق تھا۔ اور القربان سے مراد قربانی، صدقہ، اور عمل صالح میں سے وہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ فعلان کے وزن پر ہے اور القربۃ سے ماخوذ ہے۔ اور یہ اسم اور مصدر ہو سکتا ہے، پس اسم کی مثال سلطان اور برہان ہے۔ اور مصدر کی مثال عدوان اور خسران ہے اور عیسیٰ بن عمر بقربان قاف کے ضمہ کی اتباع میں را کو ضمہ کے ساتھ پڑھتے تھے (2)، جیسا کہ ظلمۃ کی جمع میں ظُلُمات اور حُجرۃ کی جمع میں حُجُرات کہا گیا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے اور آپ کی غمخواری کرتے ہوئے فرمایا: فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ اگر یہ جھٹلاتے ہیں آپ کو (تو یہ کوئی نئی بات نہیں) تحقیق آپ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے گئے جو دلائل کے ساتھ آئے تھے۔ وَالزُّبُرِ یعنی اور لکھی ہوئی کتابیں۔ اور زبر یہ زبور کی جمع ہے اور یہ کتاب ہے۔ اور اس کی اصل زبرت ای کتبت سے ہے یعنی میں نے لکھا۔ اور ہر زبور پس وہ کتاب ہے۔

امرؤ القیس نے کہا ہے:

لِمَنْ طَلَلٌ ابصرتُہ فشجانِی کخط زبور فی عسیبِ یمانی

اس میں بھی زبور سے مراد کتاب ہے۔

اور انا أعرف تَزْبِرَتِي ای کتابتی۔ یعنی میں اپنی کتابت (لکھائی) کو پہچانتا ہوں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زبور زبر بمعنی زجر (جھڑکنا) سے ماخوذ ہے (3)۔ اور زبرتُ الرجلَ کا معنی ہے میں نے آدمی کو جھڑکا (ڈانٹ پلائی) اور زبرت البئر کا معنی ہے میں نے کنوئیں کو پتھروں سے بنایا۔ اور ابن عامر نے بالزُّبُرِ وَ بِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ دونوں کلموں کو با کی زیادتی کے ساتھ پڑھا ہے (4) اور اسی طرح اہل شام کے مصاحف میں ہے۔

وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ یعنی واضح اور روشن کتاب لے کر آئے، یہ تیرے اس قول سے ہے: أنرت الشئ أنيره، یعنی میں نے

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 441
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 549، دار الکتب العلمیہ
3۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 411
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 549، دار الکتب العلمیہ

اسے واضح اور روشن کر دیا۔ کہا جاتا ہے: نار الشئی و أنارہ و نورہ و استنارہ یہ ہم معنی ہیں، اور ان دونوں میں سے ہر ایک لازم اور متعدی ہے۔ اور زبر اور کتاب کو جمع کیا...... حالانکہ یہ دونوں بھی ہم معنی ہیں...... اس لئے کہ ان دونوں کے الفاظ مختلف ہیں اور ان کی اصل وہی ہے جیسے ہم نے ذکر کر دی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

''ہر نفس چکھنے والا ہے موت کو اور پوری مل کر رہے گی تمہیں تمہاری مزدوری قیامت کے دن پس جو شخص بچا لیا گیا آتش (دوزخ) سے اور داخل کیا گیا جنت میں تو وہ کامیاب ہو گیا اور نہیں یہ دنیوی زندگی مگر ساز و سامان دھوکہ میں ڈالنے والا''

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب الله تعالیٰ نے بخل کرنے والوں اور ان کے کفر کے بارے ان کے اس قول میں خبر دی: اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ اور مومنین کو ان کی اذیت پر صبر کرنے کے بارے اپنے اس قول میں حکم ارشاد فرمایا لَتُبْلَوُنَّ الآیہ...... (تو پھر) بیان کیا کہ وہ ختم ہو جانے والی چیزوں میں سے ہے اور وہ ہمیشہ نہیں رہے گا، کیونکہ دنیا کی انتہا اور اختتام قریب ہے اور قیامت کا دن یوم جزا (بدلے کا دن) ہے۔ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ یہ ذوق سے ماخوذ ہے اور یہ (موت) ایسی شے ہے جس سے انسان کو پناہ نہیں، اور نہ ہی اس سے کوئی حیوان الگ اور جدا ہے (یعنی ہر ذی روح کو موت آنا یقینی ہے۔)

امیہ بن ابی الصلت نے کہا:

من لم یمت عبطة یمت هرمًا　　　للموت كأس والمرُ ذائقها

جو عین عالم شباب میں نہیں مرتا اسے بڑھاپے میں موت آ جاتی ہے موت تو (شراب سے بھرا ہوا) ایک جام ہے اور آدمی اس کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

الموت باب و كل الناس داخله　　　فليت شعري بعد الباب ماالدار

موت ایک دروازہ ہے اور تمام لوگ اس سے داخل ہونے والے ہیں اے کاش مجھے علم ہوتا اس دروازے کے بعد گھر کون سا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ عام قرأت ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ اضافت کے ساتھ ہے اور اعمش، یحییٰ اور ابن ابی اسحاق نے ذائقة الموت یعنی ذائقةٌ کو تنوین کے ساتھ اور الموت کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکہ موت کے بعد تو کوئی ذائقہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 550، دار الکتب العلمیہ

نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ اسم فاعل کی دو قسمیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بمعنی ماضی ہو۔ اور دوسری یہ کہ وہ بمعنی استقبال ہو، پس اگر تو پہلا معنی مراد لے گا تو اس میں تو صرف مابعد کی طرف اضافت ہی ہے، جیسے تیرا یہ قول ہے: هذا ضَارِبُ زيدٍ امس اور قَاتِلُ بكرٍ امس، کیونکہ اسے اسم جامد کے قائم مقام رکھا جاتا ہے اور وہ علم ہے، جیسے غلامُ زیدٍ اور صاحب بکرٍ۔

شاعر نے کہا ہے:

الحافِظُو عورةِ العشيرة لايأ　تيهم من وَرَائهم وَكَفُ

(اس میں الحافظو اسم مابعد کی طرف مضاف ہو کر استعمال ہو رہا ہے۔)

اور اگر دوسرا معنی مراد لیں تو جر جائز ہے اور نصب اور تنوین کی بھی یہی صورت ہے اور یہی اصل ہے، کیونکہ یہ (اسم فاعل) قائم مقام فعل مضارع کے ہوتا ہے اور اگر فعل غیر متعدی ہو، تو پھر یہ متعدی نہیں ہوتا جیسے قائم زید اور اگر وہ متعدی ہو تو تو اسے متعدی بنائے اور اس کے ساتھ نصب دے اور یہ کہے: زيدٌ ضَاربٌ عمروا بمعنی يضرب عمروا۔ اور تخفیف کے لئے تنوین کا حذف اور اضافت جائز ہوتی ہے۔

جیسا کہ المراز نے کہا ہے:

سَلِّ الهمومَ بكل مُعطِي رأسه　فاج مُخالِطِ صُهبةٍ مُتَعَيِّس

مُغتَالِ أحبُلِه مبينٍ عُنُقُه　فى مَنْكِبٍ زَيَنَ المُطِيَّ عَرَنْدَسِ

تنوین کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے اور اصل میں: معط رأسَه تنوین اور نصب کے ساتھ ہے، اور اس کی مثل قرآن کریم میں بھی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اور یہ اس کی مثل نہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ پھر تو جان کہ موت کے کچھ اسباب اور اس کی کچھ علامات ہیں، پس بندۂ مومن کی موت کی علامات میں سے پیشانی پر پسینہ کا آنا ہے۔ اسے نسائی نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بندۂ مومن پیشانی کے عرق آلود ہونے کے ساتھ فوت ہوتا ہے (1)۔'' اور ہم نے اسے ''التذکرہ'' میں بیان کیا ہے اور جب وہ قریب المرگ ہو تو اسے شہادت کی تلقین کی جائے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لقنوا موتاکم لا الہ الا اللہ (2) (اپنے مرنے والوں کو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تلقین کرو) تاکہ یہ اس کا آخری کلام ہو اور اس کی زندگی کا اختتام کلمہ شہادت کے ساتھ ہو، اور اس پر بار بار اس کا اعادہ نہ کیا جائے تاکہ وہ پریشان اور تنگ نہ ہو جائے۔

اور اس وقت سورۂ یٰسین پڑھنا مستحب ہوتا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: اقرءوا يس على موتاکم (3) (اپنے مرنے والوں پر یٰسین پڑھو) اسے ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔ اور علامہ الآجری نے کتاب النصیحہ میں حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما من ميت يقرء عنده سورة يس الاهون

1۔ سنن نسائی، الجنائز، جلد 1، صفحہ 259　2۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 300

3۔ سنن ابی داؤد، الجنائز، جلد 2، صفحہ 89

علیہ الموت (1) (جس مرنے والے کے پاس سورہ یٰسین پڑھی جاتی ہے اس پر موت آسان کر دی جاتی ہے) پس جب روح قبض کی جاتی ہے اور نگاہ روح کی اتباع اور پیچھا کرتی ہے...... جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے اور یہ صحیح مسلم میں ہے ..... اور عبادات اٹھ جاتی ہیں اور پابندی (تکلیف) ختم ہو جاتی ہے، تو زندوں پر کچھ احکام لازم ہوتے ہیں، ان میں سے اس کی آنکھیں بند کرنا، اور اس کے نیک اور صالح بھائیوں دوستوں کو اس کی موت کی خبر دینا ہے، اور ایک قوم نے اسے مکروہ کہا ہے اور کہا ہے یہ موت کی خبر اور اعلان ہے، اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، ہم نے اسے کسی دوسرے مقام پر بیان کیا ہے اور ان احکام میں سے غسل و دفن کے ساتھ اس کی تیاری کرنا بھی ہے تا کہ اس میں تغیر اور تبدیلی نہ آجائے، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قوم سے کہا جنہوں نے اپنی میتوں کو دفن کرنے میں تاخیر کی: عجلوا بدفن جیفتکم اپنے مردوں کو دفن کرنے میں جلدی کرو) اور مزید فرمایا: اسرعوا بالجنازة الحدیث (جنازہ لے جانے میں جلدی کرو) اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور رہا میت کے غسل کا مسئلہ تو یہ سوائے شہید کے تمام مسلمانوں کے لئے سنت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ میت کو غسل دینا واجب ہے۔ قاضی عبدالوہاب نے یہی کہا ہے۔ اور پہلا کتاب کا مذہب ہے، اور ان دونوں قولوں پر علماء کا عمل ہے اور اختلاف کا سبب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے جو آپ نے ام عطیہ کو اپنی بیٹی زینب کو غسل دینے کے بارے میں فرمایا، جیسا کہ وہ مسلم میں موجود ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ حضرت ام کلثوم تھیں، جیسا کہ ابوداؤد کی کتاب میں موجود ہے: ''تم انہیں تین یا پانچ یا اس سے زیادہ بار غسل دینا اگر تم اسے دیکھو (2)'' الحدیث۔ یہ حدیث علماء کے نزدیک میت کو غسل دینے کے بارے میں اصل ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ اس امر سے مراد غسل کا حکم بیان کرنا ہے کہ وہ واجب ہے اور بعض نے کہا ہے: اس سے مقصود غسل کی کیفیت کی تعلیم ہے لہٰذا اس میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو غسل کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ان رایتنّ ذالك دلالت کرتا ہے اور یہ امر کے ظاہر کو وجوب سے نکالنے کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ان کی نظر و فکر کے سپرد کر دیا۔

ان کو کہا گیا: اس میں یہ بعد اور دوری ہے، کیونکہ تمہارا اِنْ رَایتنّ کو امر کی طرف لوٹانا، یہ فہم میں جلدی آنے والا نہیں ہے بلکہ یہ بالفور اس شرط کو مذکورہ (مفہوم کے) اقرب کی طرف لوٹانے کا ذریعہ ہے، اور وہ ''اس سے اکثر اور زیادہ ہے'' یا پھر اعداد میں تخییر کی طرف لوٹاتا ہے۔

المختصر اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ میت کو غسل دینا مشروع ہے شریعت میں اس پر عمل کیا گیا ہے اسے (کبھی) نہیں چھوڑا جائے گا اور اس کا طریقہ غسل جنابت کے طریقہ کی طرح ہے جیسا کہ معروف ہے۔ اور بالاجماع ایک میت کو غسل دینے میں سات بار غسل سے تجاوز نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ اسے ابو عمر نے بیان کیا ہے۔ اگر ساتویں بار غسل دینے کے بعد اس سے کوئی شے خارج ہو تو صرف اس مخصوص جگہ کو دھو ڈالا جائے گا، اور اس کا حکم جنبی کے حکم کی طرح ہے جبکہ اسے غسل کے بعد

1۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 4، صفحہ 32

2۔ سنن ابی داؤد، الجنائز، جلد 2، صفحہ 92۔ ایضاً صحیح بخاری، باب غسل المیت و وضوئه بالماء والسدر، حدیث نمبر 1175، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حدث لاحق ہو جائے، جب میت کے غسل سے فارغ ہو جائے تو اسے اس کے کپڑوں میں کفن دو اور وہ یہ ہیں۔
عام علماء کے نزدیک کفن دینا واجب ہے، پس اگر اس کا مال ہو تو پھر عام علماء کے نزدیک اس کے رأس المال سے کفن دیا جائے گا، مگر طاؤس نے یہ کہا ہے کہ اس کا مال تھوڑا ہو یا زیادہ اس کے تیسرے حصہ سے ہی کفن دیا جائے گا۔
اور اگر میت ان میں سے ہو کہ اس کا نفقہ اس کی زندگی میں ہی کسی اور کے ذمہ لازم ہو مثلاً آقا کے ذمہ..... اگر وہ غلام ہو ..... یا باپ یا خاوند یا بیٹے کے ذمہ، تو بالاتفاق (کفن) ان پر ہی ہوگا، پھر بیت المال پر یا مسلمانوں کی جماعت پر کفن کفایہ ہوگا اور وہ شے جو اس میں سے تعیین فرض کے ساتھ متعین ہو جاتی ہے وہ ستر عورت (شرمگاہ کو ڈھانپنا) ہے اور اگر اس میں فالتو اور اضافی کپڑا ہو لیکن وہ سارے بدن کو نہ ڈھانپ سکتا ہو تو پھر اس کے چہرہ کی تکریم میں اس کے سر اور چہرہ کو ڈھانپا جائے گا اور اس کے محاسن کی تبدیلی میں سے جو ظاہر ہوا سے ڈھانپ دیا جائے اور اس میں اصل حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے، کیونکہ انہوں نے احد کے دن ایک کمبل چھوڑا جب آپ کے سر کو ڈھانپا جاتا تو آپ کے پاؤں اس سے نکل جاتے، اور جب آپ کے پاؤں کو ڈھانپا جاتا تو آپ کا سر باہر نکل جاتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اسے ان کے سر پر ڈال دو اور ان کے پاؤں پر اذخر (گھاس) رکھ دو (1)۔'' اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔
اور تمام علماء کے نزدیک کفن میں کپڑوں کا طاق (وتر) ہونا مستحب ہے، اور تمام کا اس پر اجماع ہے کہ اس میں کوئی مخصوص حد نہیں ہے اور پھر کپڑوں کا سفید ہونا مستحب ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: البسوا من ثیابکم البیاض فانھا من خیر ثیابکم و کفنوا فیھا موتاکم (2) (تم اپنے سفید کپڑے پہنو کیونکہ یہ لباس تمہارے کپڑوں میں سے بہترین ہے اور اسی میں تم اپنے مردوں کو کفن دو) اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سحول کے بنے ہوئے روئی کے تین سفید کپڑوں میں کفن دیا گیا اور کسی اور رنگ کے کپڑے میں بھی کفن دینا جائز ہے مگر یہ کہ وہ خالص ریشم یا اون ملا ریشمی کپڑا نہ ہو۔ اور اگر ورثاء کفن میں بخل سے کام لیں تو پھر ان پر جمعہ اور عیدین کے دنوں میں پہنے جانے والے لباس کی مثل کپڑا لازم کر دیا جائے گا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا کفن احدکم اخاہ فلیحسّن کفنہ (3) (جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اچھے کپڑے میں کفن دے) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ مگر یہ کہ وہ اس سے کم کے بارے وصیت کرے۔ اور اگر اس نے اسراف (فضول خرچی) کی وصیت کی تو کہا گیا ہے: (ضرورت سے) زائد میں (اس کی وصیت) باطل ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ثلث میں نافذ ہوگی۔ (لیکن) پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے وَلَا تُسْرِفُوْا (اور تم فضول خرچی نہ کرو) اور ابوبکر نے کہا ہے: بے شک یہ میت کے بدن سے نکلنے والی پیپ کے لئے ہے۔ اور جب وہ اس کے غسل اور اسے کفن پہنانے سے فارغ ہو جائے اور اسے چارپائی پر رکھ دیا جائے اور اسے آدمی اپنے کندھوں پر اٹھائیں تو اس کا حکم یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس کے لئے حکم تیز چلنے کا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسرعوا بالجنازۃ فان تلک

1۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 305۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1197، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابی داؤد، الطب، جلد 2، صفحہ 185
3۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 306

صالحۃ فخیر تقدمونھا الیہ وان تکن غیر ذالک فشرٌ تضعونہ عن رقابکم(1) (تم میت کو لے کر تیز چلو پس اگر وہ نیک اور صالح ہے تو اچھا اور بہتر ہے تم اسے اس تک جلدی پہنچا دو گے اور اگر وہ اس کے سوا ہے تو وہ برا ہے تم اسے جلدی اپنی گردنوں سے اتار دو گے)(2) اس طرح نہیں ہے جیسا کہ آج جاہل لوگ آہستہ آہستہ لے کر چلتے ہیں، اور بار بار راستے میں ٹھہرتے ہیں، اور ایسی سر اور آواز کے ساتھ قرآن کریم کی قرآت کرتے ہیں جو حلال نہیں ہے اور وہ بھی جائز نہیں ہے جو مصری شہروں کے لوگ اپنے مردوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ نسائی نے روایت کیا ہے کہ محمد بن عبد الاعلی نے ہمیں خبر دی ہے انہوں نے کہا کہ خالد نے اور اسے عیینہ بن عبد الرحمن نے خبر دی ہے اور کہا ہے کہ مجھے میرے باپ نے بتایا ہے کہ میں حضرت عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے جنازہ میں حاضر ہوا اور زیاد نکل کر چار پائی کے آگے آگے چلنے لگا اور عبد الرحمن کے خاندان کے لوگ اور ان کے موالی چار پائی اٹھا کر اپنی ایڑیوں پر چل رہے تھے اور کہتے تھے: آہستہ آہستہ، اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے: پس وہ رینگ رینگ کر چل رہے تھے (یعنی انتہائی آہستہ رفتار سے) یہاں تک کہ جب ہم مربد کا کچھ راستہ طے کر چکے تو ہمیں پیچھے سے خچر پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آ کر ملے۔ پس جب آپ نے انہیں وہ کرتے ہوئے دیکھا تو ان پر اپنے خچر سے حملہ کر دیا اور ان پر کوڑا برسایا اور فرمایا: تم چھوڑ دو! قسم ہے سب سے مکرم و محترم ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس کی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے اور ہم میت کو لے کر دوڑتے چلے جاتے تھے تو اس سے قوم خوش ہو گئی (3)۔

اور ابو ماجدہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا ہم نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازہ کے ساتھ چلنے کے بارے پوچھا: تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ دوڑ کی چال سے ذرا کم ہو اگر وہ میت نیک اور صالح ہوئی تو بہتر ہے اسے اس تک جلدی پہنچا دیا جائے گا اور اگر وہ اس کے سوا ہوئی تو پھر اہل نار سے دور رہو (4)۔'' الحدیث۔ ابو عمر نے کہا ہے: اس مسئلہ میں جس پر علماء کی جماعت ہے (وہ یہ ہے) کہ عام عادت سے چال تھوڑی تیز ہو، اور تیزی ان کے نزدیک آہستہ چال سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور ایسی تیزی جو ان کمزور اور ضعیف لوگوں کے لئے باعث مشقت ہو جو جنازہ کے پیچھے چل رہے ہیں وہ مکروہ ہے اور حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: میت کو لے کر تھوڑا آہستہ چلو (لیکن) یہود و نصاریٰ کی طرح رینگ رینگ کر نہ چلو۔ اور ایک قوم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں الاسراع کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد دفن میں جلدی کرنا ہے نہ کہ چلنے میں، اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ و باللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور رہی میت پر نماز جنازہ تو یہ جہاد کی طرح واجب (فرض) علی الکفایہ ہے۔ یہی علماء کا مشہور مذہب ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر کا بھی، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے بارے میں فرمایا: قوموا فصلّوا علیہ (تم اٹھو اور اس پر نماز پڑھو) اور اصبغ نے کہا ہے: نماز جنازہ سنت ہے اور انہوں نے امام مالک سے روایت کیا ہے، اس بارے میں مزید بیان سورۃ براۃ میں آئے گا۔

1۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 307-306

2۔ صحیح بخاری، باب السرعۃ بالجنازہ، حدیث 1231، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، الجنائز، جلد 1، صفحہ 271

4۔ ابو داؤد، باب الاسراع بالجنازہ، حدیث 2769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 7۔ میت کو مٹی میں دفن کرنا، اس میں چھپانا اور اسے مٹی کے ساتھ ڈھانپ دینا یہ واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ (المائدہ:31) (پس بھیجا اللہ نے ایک کوا کھودتا تھا زمین کو تا کہ دکھائے اسے کہ کس طرح چھپائے لاش اپنے بھائی کی)

اس آیت کے تحت قبر بنانے کا حکم اور جو کچھ اس میں سے مستحب ہوتا ہے اور اس میں میت کو رکھنے کی کیفیت ذکر کی جائے گی اور اس پر مسجد بنانے کا حکم سورۃ ''الکہف'' میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

پس یہ مردوں سے متعلقہ احکام ہیں اور وہ جو زندوں پر ان کے لئے واجب ہوتے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مردوں کو گالیاں نہ دو کیونکہ وہ اس تک پہنچ چکے ہیں جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے (1)۔'' اسے مسلم نے روایت کیا ہے، اور سنن نسائی میں آپ ہی سے روایت ہے کہ ام المومنین نے فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مرنے والے کا ذکر برائی کے ساتھ کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنے ہلاک ہونے والوں کا ذکر نہ کرو مگر خیر اور بھلائی کے ساتھ (2)۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ پس مومن کا اجر ثواب ہے، اور کافر کا اجر عقاب (سزا) ہے دنیا میں نعمتوں اور آزمائش و مصائب کو اجر اور جزا میں شمار نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ فنا ہونے والی ہیں۔ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ پس جسے آتش جہنم سے دور رکھا گیا۔ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ اور اسے جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہ اس کے ساتھ کامیاب ہو گیا جس کی وہ آرزو اور تمنا رکھتا ہے اور اس سے وہ نجات پا گیا جس سے وہ ڈرتا ہے۔ اور اعمش نے زید بن وہب سے، انہوں نے عبدالرحمن بن عبد رب الکعبہ سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من سرہ ان یزحزح عن النار و ان یدخل الجنۃ فلتأتہ منیتہ و ھو یشھد ان لا الہ الا اللہ و ان محمدا رسول اللہ و یاتی الی الناس الذی یحب ان یوتی الیہ (3) (جسے یہ بات خوش کرتی ہے کہ اسے آتش جہنم سے دور رکھا جائے اور اسے جنت میں داخل کیا جائے تو چاہئے کہ اس کی موت اسے اس حال میں آئے کہ وہ شہادت دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اور وہ لوگوں کے پاس وہ (شے) لے کر آئے جسے وہ پسند کرتا ہے کہ وہ اس کے پاس لائی جائے۔) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت میں کوڑے (برابر) جگہ دینا اور اس میں موجود تمام چیزوں کی نسبت بہتر ہے اگر تم چاہو تو یہ پڑھ لو فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ۔ (4)

وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ یعنی دنیا مومن کے ساتھ مکر کرتی ہے اور اسے دھوکہ دیتی ہے اور وہ اس کے طویل

1۔ سنن نسائی، الجنائز، جلد 1، صفحہ 274۔ ایضاً صحیح بخاری، باب ماینھی من سب الاموات، حدیث 1306، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ ایضاً

3۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد، البر والصلۃ، جلد 8، صفحہ 340، حدیث نمبر 13669

4۔ المستدرک التفسیر، جلد 2، صفحہ 327، حدیث نمبر 3170۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن من رسول اللہ، حدیث 2939، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عرصہ تک باقی رہنے کا گمان کرنے لگتا ہے حالانکہ دنیا فانی ہے۔ اور متاع سے مراد ہر وہ شے ہے جس سے لطف اندوز ہوا جائے اور اس سے نفع اٹھایا جائے، جیسا کہ کلہاڑا، ہانڈی اور پیالہ پھر یہ زائل اور ختم ہو جاتا ہے اور اس کی ملکیت باقی نہیں رہتی۔ اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے۔

حسن نے کہا ہے: جیسا کہ سرسبز و شاداب نباتات اور بچیوں سے دل بہلانا اس کا کوئی حاصل اور نتیجہ نہیں۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ چھوڑا ہوا ساز و سامان ہے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں سمیت برباد اور تباہ ہو جائے، لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اس سامان سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے اتنا لے لے جتنی وہ استطاعت رکھتا ہے۔

تحقیق کسی نے کتنا خوب اور اچھا کہا ہے:

هی الدار دار الأذی والقذی و دار الفناء و دار الغِیَرْ

یہ (دنیا) اذیتوں اور تکلیفوں کا گھر ہے اور یہ فناہ ہونے والا اور تکبر و نخوت کا گھر ہے۔

فلو نِلتَها بحذافِیرِها لَمُتَّ ولم تقض منها الوَطَرْ

پس اگر تو اسے مکمل طور پر بھی پالے تو یقیناً تجھے موت آئے گی اور تیرا مطلوب حاصل نہ ہوا ہوگا۔

أیامن یؤمّل طول الخلود و طُولُ الخلود علیه ضَرَرْ

اے وہ جو اس سے طویل آرزوئیں وابستہ رکھتا ہے اس پر ہمیشہ کی آرزو رکھنا باعث ضرر ہے۔

اذا انت شِبْت و بان الشباب ولا خیر فی العیش بعد الکِبَرْ

جب تو بوڑھا ہو جائے گا اور جوانی ڈھل جائے گی تو پھر بڑھاپے کے بعد زندگی میں کوئی مزہ اور خیر نہیں۔

اور **الْغَرُوْرِ** (عین کے فتحہ کے ساتھ) اس کا معنی شیطان ہے، وہ لوگوں کو جھوٹے وعدوں اور تمناؤں کے ساتھ دھوکہ دیتا ہے، ابن عرفہ نے کہا ہے: غرور سے مراد وہ شے ہے جسے تو ظاہراً دیکھے تو تو اسے پسند کرے، اور اس کا باطن مکروہ (ناپسندیدہ) یا مجہول ہو۔ اور شیطان غرور ہے، کیونکہ وہ نفس کی محبت پر ابھارتا ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ برا ہوتا ہے۔ فرمایا: اس سے بیع الغَرَر بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بیع کا ظاہر اسے دھوکہ دیتا ہے اور باطن مجہول ہوتا ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِیْۤ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِیْرًا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝۱۸۶

''یقیناً تم آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اور یقیناً تم سنو گے ان سے جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا اذیت دینے والی بہت باتیں اور اگر تم (ان دل آزاریوں پر) صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔''

یہ خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو ہے اور معنی یہ ہے: تم آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تمہارا امتحان لیا جائے

گا اپنے مالوں میں مصائب کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی تکلیف کے ساتھ اور تمام شرعی پابندیاں لگانے کے ساتھ۔ اور جانوں میں آزمائش موت، امراض میں مبتلا کرنے اور دوست احباب کے فوت ہونے کے ساتھ ہوتی ہے چونکہ مالوں کے سبب مصائب زیادہ ہوتے ہیں اس لئے پہلے ذکر اموال کا فرمایا وَلَتَسْمَعُنَّ اگر کہا جائے: لَتُبْلَوُنَّ میں واؤ کیوں ثابت رہی اور وَ لَتَسْمَعُنَّ سے کیوں حذف کر دی گئی، تو جواب یہ ہے کہ لَتُبْلَوُنَّ میں واؤ کا ماقبل مفتوح ہے پس اسے التقاء ساکنین کی وجہ سے حرکت دے دی گئی، اور حرکت بھی ضمہ دی گئی اس لئے کہ یہ واؤ جمع ہے، اور اس کا حذف کرنا جائز نہیں کیونکہ اس کے ماقبل کی حرکت اس پر دلالت نہیں کرتی، اور وَ لَتَسْمَعُنَّ میں واؤ کو حذف کر دیا گیا کیونکہ اس کے ماقبل کی حرکت اس پر دلالت کر رہی ہے۔ (اور وہ حرکت ماقبل کا ضمہ ہے) اور لَتُبْلَوُنَّ میں واؤ کو ہمزہ سے بدلنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس کی حرکت عارضی ہے، نحاس وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور واحد مذکر کے لئے کہا جائے گا: لَتُبْلَيَنَّ یا رَجُلُ اور تثنیہ کے لئے: لَتُبْلَيَانِّ یا رجلان اور جمع مذکر کے لئے لَتُبْلَوُنَّ کہا جائے گا، اور اس کا سبب نزول یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کو یہ کہتے ہوئے سنا: اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ (1) اس نے یہ کلمات قرآن کریم کا رد کرتے ہوئے اور اس کو حقیر سمجھتے ہوئے اس وقت کہے جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے تھپڑ دے مارا، اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آپ کی شکایت کی تب یہ آیت نازل ہوئی۔ کہا گیا ہے کہ وہ کہنے والا فنحاص یہودی تھا، یہ عکرمہ سے مروی ہے۔

اور زہری نے کہا ہے: وہ کعب بن اشرف تھا اس کے سبب یہ آیت نازل ہوئی، وہ شاعر تھا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی ہجو کرتا تھا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کفار قریش کو جمع کرتا تھا، اور مسلمان عورتوں کے ذکر سے اپنے قصیدہ کو مزین کرتا تھا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی طرف حضرت محمد بن مسلم رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں کو بھیجا اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ کتب سیر اور صحیح اخبار میں اس کا قتل مشہور ہے، اور اس کے سوا بھی اقوال ہیں (2)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہاں یہودی اور مشرک تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام بہت زیادہ اذیت ناک باتیں سنتے تھے۔ اور صحیحین میں ہے (3) کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابن ابی کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گدھے پر سوار تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی تو ابن ابی نے کہا: جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اگر وہ سچ ہے تو آپ اس کے ساتھ ہماری مجالس میں ہمیں تکلیف اور اذیت نہ دیں! آپ اپنی سواری کی طرف لوٹ جائیں پس جو آپ کے پاس آئے تو اس پر اسے بیان کیجئے اور اس نے اپنی ناک پکڑ لی تاکہ گدھے کا غبار اس تک نہ پہنچے، تو ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپ ہماری مجالس میں تشریف لائیے کیونکہ ہم اسے پسند کرتے ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 550، دارالکتب العلمیہ

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 551، دارالکتب العلمیہ۔ ایضاً صحیح بخاری، باب قتل کعب بن الاشرف، حدیث نمبر 3731، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 4200، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ مشرک جو ابن ابی کے پاس موجود تھے وہ اور مسلمان باہم گالی گلوچ کرنے لگے، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل انہیں خاموش کراتے رہے یہاں تک کہ وہ خاموش ہو گئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس عیادت کے لئے تشریف لے گئے وہ بیمار تھے اور فرمایا: ''کیا تم نے وہ سنا ہے جو فلاں نے کہا ہے؟'' تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی: آپ اسے معاف فرما دیجئے اور اس سے درگزر کیجئے، قسم ہے اس کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی ہے بالیقین اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس حق کے ساتھ بھیجا ہے جو (آپ پر) نازل ہوا ہے، حالانکہ اس شہر کے باسیوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ اسے تاج پہنائیں اور اسے سردار بنالیں، تو جب اللہ تعالیٰ نے اسے اس حق کے ساتھ رد کر دیا ہے جو آپ کو اس نے عطا فرمایا ہے تو اس کے سبب وہ تنگ اور پریشان ہے، اسی لئے اس نے وہ کیا ہے جو آپ نے دیکھا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے درگزر فرمائی، اور پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت قتال کے نازل ہونے سے پہلے ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے صبر اور تقویٰ کو مستحب قرار دیا اور یہ خبر دی کہ یہ عزم الامور (ہمت کے کاموں) میں سے ہے اور اسی طرح بخاری میں (1) سیاق حدیث میں ہے کہ یہ آیت قتال کے نازل ہونے سے پہلے ہوا، اور اظہر یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں، کیونکہ احسن انداز میں اور نرمی کے ساتھ جھگڑنا، مجادلہ کرنا ہمیشہ مستحب رہا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ آپ پر قتال کا حکم نازل ہو چکا تھا آپ یہود کے ساتھ صلح کرتے تھے اور ان سے نرمی برتتے تھے، اور منافقین سے درگزر فرماتے تھے، اور یہ بالکل بین اور ظاہر ہے اور عزم الامور کا معنی کاموں کا مضبوط اور پختہ اور سخت ہونا ہے۔ اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ٘ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا١ؕ فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ۝۱۸۷

''اور یاد کرو جب لیا اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ ان لوگوں سے جنہیں کتاب دی گئی کہ تم ضرور کھول کر بیان کرنا اسے لوگوں سے اور نہ چھپانا اس کو تو (الٹا) انہوں نے پھینک دیا اس وعدہ کو اپنی پشتوں کے پیچھے اور انہوں نے خرید لی اس کے عوض تھوڑی سی قیمت سو بہت بری ہے وہ چیز جو وہ خرید رہے ہیں۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یہ یہود کے ذکر کے ساتھ متصل ہے، کیونکہ انہیں حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانے اور آپ کی شان کے بیان اور وضاحت کرنے کا حکم دیا گیا، تو انہوں نے آپ کی نعت اور تعریف کو چھپا لیا۔ پس یہ آیت ان کے لئے زجر و توبیخ ہے، پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ ان کے لئے اور دوسروں کے لئے عام خبر ہے۔ حضرت حسن اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت ہر اس کے بارے میں ہے جسے کتاب میں سے کسی شے کا علم دیا گیا پس جو کسی شے کا عالم ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس کی تعلیم دے، اور تم علم چھپانے سے بچو کیونکہ یہ

1۔ صحیح بخاری، التفسیر، جلد 2، صفحہ 256-255

ہلاکت ہے (1) اور حضرت محمد بن کعب نے کہا ہے: کسی عالم کے لئے یہ حلال نہیں ہوتا کہ وہ اپنے علم پر خاموش رہے اور نہ کسی جاہل کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جہالت پر خاموش رہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ الآیہ۔ اور ارشاد فرمایا: فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل) (پس دریافت کرلو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے۔)

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ نے کتاب کا علم رکھنے والوں سے وعدہ نہ لیا ہوتا تو میں تمہیں کوئی شے نہ بتاتا، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ (2)

اور حضرت حسن بن عمارہ نے کہا ہے: میں حضرت زہری رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اس کے بعد کہ انہوں نے حدیث بیان کرنا ترک کر دیا تھا، تو میں نے انہیں اپنے دروازے پر پالیا، میں نے عرض کی: اگر آپ مناسب خیال کرتے ہیں تو مجھے حدیث بیان فرمائیے۔

تو انہوں نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ میں نے حدیث بیان کرنی چھوڑ دی ہے؟ میں نے عرض کی: یا آپ مجھے حدیث بیان کریں اور یا میں تم سے حدیث بیان کروں گا۔ انہوں نے فرمایا: تم مجھے بیان کرو۔ تو میں نے کہا: مجھے حکم ابن عتیبہ نے یحییٰ بن جزار سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اللہ تعالیٰ نے جاہلوں سے وعدہ نہیں لیا کہ وہ تعلیم حاصل کریں بلکہ اس نے علماء سے وعدہ لیا ہے کہ وہ علم سکھائیں۔ انہوں نے فرمایا: پھر انہوں نے مجھے چالیس احادیث بیان فرمائیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ میں ھا ضمیر حضور نبی رحمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے اگرچہ آپ کا ذکر جاری نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ (ضمیر) کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے، اور اس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کا بیان داخل ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ کتاب میں ہے۔ اور فرمایا: وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ یہاں تَكْتُمُنَّهٗ نہیں فرمایا کیونکہ یہ حال کے معنی میں ہے۔ یعنی تم اسے بغیر چھپائے کھول کر بیان کرتے ہو۔ اور ابو عمرو اور عاصم نے ابوبکر اور اہل مکہ کی ایک روایت میں لَتُبَیِّنُنَّهٗ خطاب کی حکایت کے طور پر تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ کیونکہ وہ غائب تھے (3)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے واذ اخذ الله میثاق النبیین لیبیننه پڑھا ہے اور قولہ تعالیٰ: فَنَبَذُوْهُ ان لوگوں کی طرف لوٹتے ہوئے آرہا ہے جن کو انبیاء علیہم السلام نے کھول کر بیان کر دیا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لَیُبَیِّنُوْنَهٗ بغیر نون تاکید ثقیلہ کے ہے اور اَلنَّبْذُ کا معنی پھینکنا ہے اور اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ یہ پھینکنے میں اظہار مبالغہ ہے، اور اسی سے وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِیًّا ہے۔ اور اس کا بیان بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا کا معنی و مفہوم بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے لہٰذا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ بھی پہلے گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 252　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 551، دار الکتب العلمیہ　3۔ ایضاً

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

''ہرگز آپ یہ خیال نہ کریں کہ جو لوگ خوش ہوتے ہیں اپنی کارستانیوں پر اور پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ایسے کاموں سے جو انہوں نے کئے ہی نہیں تو ان کے متعلق یہ گمان نہ کرو کہ وہ امن میں ہیں عذاب سے ان کے لئے ہی تو دردناک عذاب ہے۔''

یعنی (وہ عذاب سے امن میں نہیں ہیں) اس فعل کے سبب جو انہوں نے غزوہ سے پیچھے رہ جانے اور گھر میں ہی بیٹھے رہنے کا کیا اور انہوں نے اس کے بارے عذر پیش کر دیئے۔ صحیحین میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں منافقین میں سے کچھ لوگ تھے کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ کے لئے تشریف لے جاتے تو وہ آپ سے پیچھے رہ جاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنے بیٹھے رہنے پر خوش ہوتے، اور جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لاتے تو آپ کے پاس عذر پیش کرتے اور حلف دے دیتے، اور یہ چاہتے اور پسند کرتے کہ ان کی تعریف کی جائے ایسے کاموں سے جو انہوں نے نہیں کئے، تو یہ آیت نازل ہوئی: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا الآیہ (1)۔

اور صحیحین میں یہ بھی ہے (2) کہ مروان نے اپنے دربان کو کہا: اے رافع! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس جا اور انہیں یہ کہہ کہ اگر ہم میں سے ہر آدمی اس سے خوش ہو جو کچھ اسے عطا کیا گیا ہے اور یہ پسند کرے کہ اس کی اس کام کے عوض تعریف کی جائے جو اس نے نہیں کیا (اور اس پر) وہ عذاب دیا جائے تو یقیناً ہم تمام عذاب دیئے جائیں گے۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تمہیں کیا ہے اس آیت کے ہوتے ہوئے بلاشبہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل کی گئی ہے۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ اور لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کسی شے کے بارے پوچھا تو انہوں نے اسے چھپا لیا، اور انہوں نے آپ کو کسی اور شے کے بارے بتایا اور نکل گئے حالانکہ انہوں نے آپ کے سامنے ظاہر یہ کیا کہ انہوں نے آپ کو اسی کے بارے خبر دی ہے کہ جس کے بارے آپ نے ان سے پوچھا ہے اور اس پر انہوں نے آپ سے تعریف کی بھی خواہش کی، اور اس پر وہ بہت خوش ہوئے جو انہوں نے آپ سے اس شے کو چھپانے کا فعل کیا، اور جس کے بارے آپ نے ان سے پوچھا (4)۔

اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: یہ آیت بنی اسرائیل کے ان علماء کے بارے نازل ہوئی ہے جنہوں نے حق کو چھپایا، اور

1۔ صحیح بخاری، التفسیر، جلد 6، صفحہ 656۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 4201، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 4202، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 552، دار الکتب العلمیہ

4۔ ایضاً

وہ اپنے بادشاہوں کے پاس ایسی چیزوں کا علم لے کر آتے تھے جو ان کے ساتھ ان کے باطل نظریات میں موافقت کرتا تھا، وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (اور انہوں نے اس کے عوض تھوڑی سی قیمت خرید لی) یعنی اس کے عوض انہوں نے وہ دنیا خرید لی جو بادشاہوں نے انہیں عطا کی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے اس کے بدلے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں دین کے بارے فساد برپا کیا اور ضحاک نے کہا ہے: یہود بادشاہوں کو کہتے تھے بلاشبہ ہم اپنی کتاب میں پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آخری زمانہ میں ایک نبی مبعوث فرمائے گا اور اس کے ساتھ (سلسلۂ) نبوت ختم ہو جائے گا، پس جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو بادشاہوں نے ان سے پوچھا: کیا یہی وہ نبی ہے جس کا ذکر تم اپنی کتاب میں پاتے ہو؟ تو یہودیوں نے بادشاہوں کے اموال میں حرص اور لالچ رکھنے کی بنا پر کہا: وہ اس کے سوا ہے، (یعنی یہ وہ نہیں ہے) تو بادشاہوں نے انہیں خزانے عطا کر دیئے، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا یعنی وہ خوش ہوتے ہیں اس جھوٹ سے جو انہوں نے بادشاہوں کے سامنے بولا یہاں تک کہ انہوں نے دنیوی ساز و سامان حاصل کر لیا(1)۔ پہلی حدیث دوسری حدیث کے مقتضیٰ کے خلاف ہے اور یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس آیت کا نزول دونوں سببوں کی بنا پر ہو کیونکہ وہ دونوں ایک ہی زمانہ میں جمع تھے اور یہ دونوں فریقوں کا جواب ہو۔ واللہ اعلم۔

اور آپ کا قول: واستحمدوا بذالك اليه کا معنی ہے انہوں نے آپ سے مطالبہ اور خواہش کی کہ ان کی تعریف کی جائے اور مروان کا قول: لئن كان كل امرئ منا الخ اس پر دلیل ہے کہ عموم کے لئے مخصوص صیغے ہیں، اور یہ کہ الَّذِيْنَ ان میں سے ہے(2)۔ اور یہ یقینی اور قطعی بات ہے جس نے اسے قرآن و سنت سے سمجھا۔

اور قولہ تعالیٰ: وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہے نہ کہ پیچھے رہنے والے منافقین کے بارے میں، کیونکہ وہ کہتے تھے: ہم دین ابراہیم پر ہیں حالانکہ وہ آپ کے دین پر نہ تھے، اور وہ کہتے تھے: ہم نماز، روزے اور کتاب والے ہیں، وہ اس سے ارادہ رکھتے تھے کہ اس کے سبب ان کی تعریف کی جائے، اور الذین، یحسبن بالیاء سے فاعل ہے۔ اور یہی نافع، ابن عامر، ابن کثیر اور ابو عمرو کی قراءت ہے، یعنی خوش ہونے والے یہ گمان نہ کریں کہ ان کی خوشی انہیں عذاب سے نجات دلانے والی ہے، اور کہا گیا ہے کہ پہلا مفعول محذوف ہے اور وہ انفسھم ہے۔ اور دوسرا بِمَفَازَةٍ ہے۔ اور کوفیوں نے تَحْسَبَنَّ تا کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ گمان نہ کریں کہ خوش ہونے والے عذاب سے امن میں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ تا اور با کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور یہ تاکید کے لئے دوبارہ مذکور ہے۔ اس کا پہلا مفعول هُمْ ضمیر ہے، اور دوسرا مفعول محذوف ہے، اور وہ کذالك ہے، اور فا عاطفہ ہے یا زائدہ ہے اس بنا پر کہ دوسرا فعل پہلے سے بدل ہے۔ ضحاک اور عیسیٰ بن عمر نے تا کے ساتھ اور با

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 256

4۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 258

کوضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی فَلَا تَحْسَبُنَّهُمْ اور مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو خطاب ہے۔ اور مجاہد، ابن کثیر، ابوعمرو اور یحییٰ بن یعمر نے یا کے ساتھ اور با کو ضمہ (1) کے ساتھ فارحین سے خبر بناتے ہوئے پڑھا ہے۔ یعنی فلا یَحْسَبُنَّ انفسهم، (اور وہ اپنے آپ کو گمان نہ کریں)، بِمَفَازَةٍ یہ مفعول ثانی ہے۔ اور فَلَا یحسبنم تاکید ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الذین، یَحْسَبَنَّ سے فاعل ہے۔ اور اس کے دونوں مفعول محذوف ہیں کیونکہ یحسبنهم اس پر دال ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

بأيّ كتاب أم بأية آية　　ترى حبّهم عارًا عليّ و تحسبُ

اس میں ایک مفعول کے ذکر کے سبب دوسرے مفعول کے ذکر کی ضرورت نہ رہی، اور بمفازۃ مفعول ثانی ہے، اور یہ پہلے فعل سے بدل ہے اور اس نے اس سے بدل ہونے کے سبب اس کے دونوں مفعولوں کے ذکر سے غنی کر دیا ہے، اور فا زائدہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کبھی یہ افعال ملغی آتے ہیں جملہ مفیدہ کے حکم میں نہیں ہوتے۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

و ما خِلْتُ أبقى بيننا من مودّة　　عِراض المَذَاكِي المُسْنِفاتِ القلائِصَا

المَذَاکِی سے مراد وہ گھوڑا ہے جس پر اس کے دانت نکلنے کے بعد ایک سال یا دو سال گزر جائیں اس کا واحد مُذَکٌّ ہے، جیسا کہ اونٹوں میں سے مُخْلِف ہوتا ہے، اور مثال میں یہ جَرِی المذکیات غلاب (یعنی طاقتور گھوڑے غالب آتے ہیں) اور المسنفات اسم مفعول ہے۔ کہا جاتا ہے: سنفت البعير أسنفه سَنَفًا جب تو اونٹ کا اسی کی رسی کے ساتھ تنگ کس لے اور تو اس پر سوار ہو۔

اور أسنف البعيرَ لغة سنفه کی مثل ہے، اور اسنف البعير بنفسه جب اونٹ چلنے کے لئے اپنا سر اوپر اٹھائے، یہ کبھی متعدی ہوتا ہے اور کبھی متعدی نہیں ہوتا۔ اور عرب اونٹ پر سوار ہوتے تھے اور گھوڑے سے اجتناب کرتے تھے، اور وہ کہتے تھے: الحرب لا تُبقي مودّةً (جنگ محبت کو باقی نہیں رکھتی۔)

اور کعب بن ابی سلمی نے کہا ہے:

أرجو و آمل أن تدنو مَوَدّتُها　　وما اخالُ لَدَيْنَا منكِ تنويلُ

میں امید اور آرزو رکھتا ہوں کہ اس کی محبت قریب ہو اور میں یہ خیال نہیں کرتا کہ تیری طرف سے ہمارے پاس کوئی بخشش اور عطا ہو۔

جمہور قراء سبعہ وغیرہم نے أَتَوْا الف مقصورہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اس کے عوض جو وہ جھوٹ اور کتمان (چھپانا) میں سے لائے۔ اور مروان بن حکم، اعمش اور ابراہیم نخعی نے آتوا مد کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ بمعنی اعطوا ہے۔ (یعنی جو انہوں نے دیا (مراد جو انہوں نے برتاؤ کیا)

اور سعید ابن جبیر نے أُوتُوا صیغہ مجہول کی صورت میں قرأت کی ہے، بمعنی أُعطوا اور المفازة بمعنی المنجاة (جائے

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 417

نجات) ہے، یہ مفعلۃ کے وزن پر فاز یفوز سے ہے جب کوئی نجات پا جائے، یعنی وہ نجات پانے والے نہیں۔ اور خوف اور ڈر کی جگہ کو اچھی فال لینے کے طور پر مفازۃ کا نام دیا گیا ہے، اصمعی نے یہی کہا ہے (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیونکہ یہ موت کی جگہ ہے اور ہلاکت کا ظن غالب ہے، عرب کہتے ہیں فوّز الرجل جب آدمی مر جائے۔ ثعلب نے کہا ہے: میں نے ابن اعرابی کے سامنے اصمعی کا قول بیان کیا تو اس نے کہا: انہوں نے خطا کی ہے۔ مجھے ابو المکارم نے کہا ہے: اسے مفازۃ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ جس نے اسے طے کر لیا وہ کامیاب ہو گیا (2)، نجات پا گیا اور اصمعی نے کہا ہے: لدیغ (جس کو ڈس لیا جائے) کو بطور اچھی فال کے سلیم کا نام دیا گیا ہے (3)۔ ابن اعرابی نے کہا ہے: کیونکہ وہ اس تکلیف اور مصیبت سے بچ نکلنے والا ہے جو اسے پہنچی ہے (4) اور یہ بھی کہا گیا ہے آپ انہیں عذاب سے کہیں دور جگہ میں گمان نہ کریں، کیونکہ فوز (کامیابی اور نجات) مکروہ (عذاب اور تکلیف) سے دور ہونا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾

''اور اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

یہ ان کے خلاف استدلال اور حجت ہے جنہوں نے یہ کہا ہے: اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ اور ان کی تکذیب ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے آپ خوش ہونے والوں کے بارے یہ گمان نہ کریں کہ وہ عذاب سے نجات پا جائیں گے، کیونکہ ہر شے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، اور وہ قدرت رکھنے والے رب کے قبضہ میں ہیں، پس یہ پہلے کلام پر معطوف ہے، یعنی بلاشبہ وہ اس کے عذاب سے نجات نہیں پا سکتے، وہ انہیں پکڑ لے گا جب چاہے گا۔ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر قادر ہے، اس پر بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖۗ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۱۹۴﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 553، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

دِيَارِهِمْ وَ أُوذُوا فِي سَبِيلِي وَ قٰتَلُوا وَ قُتِلُوا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ۫ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۗ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِينَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُونَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۗ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اصْبِرُوا وَ صَابِرُوا وَ رَابِطُوا ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۲۰۰﴾

’’بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں (بڑی) نشانیاں ہیں اہل عقل کے لئے۔ وہ عقل مند جو یاد کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور تسلیم کرتے ہیں) اے ہمارے مالک! نہیں پیدا فرمایا تو نے یہ (کارخانہ حیات) بے کار۔ پاک ہے تو (ہر عیب سے) بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے۔ اے ہمارے رب! بے شک تو نے جسے داخل کر دیا آگ میں تو رسوا کر دیا تو نے اسے اور نہیں ہے ظالموں کا کوئی مددگار۔ اے ہمارے رب! سنا ہم نے منادی کرنے والے کو کہ بلند آواز سے بلاتا تھا ایمان کی طرف (اور کہتا تھا) کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر تو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے مالک! پس بخش دے ہمارے گناہ اور مٹا دے ہم سے ہماری برائیاں اور (اپنے کرم سے) موت دے ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ۔ اے ہمارے رب! عطا فرما ہمیں جو وعدہ کیا تو نے ہمارے ساتھ اپنے رسولوں کے ذریعے اور نہ رسوا کر ہمیں قیامت کے دن۔ بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ تو قبول فرمالی ان کی التجا ان کے پروردگار نے (اور فرمایا) کہ میں ضائع نہیں کرتا عمل کسی عمل کرنے والے کا تم سے خواہ مرد ہو یا عورت بعض تمہارا جز ہے بعض کی تو وہ جنہوں نے ہجرت کی اور نکالے گئے اپنے وطن سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور (دین کے لئے) لڑے اور مارے گئے تو ضرور میں مٹا دوں گا ان (کے نامۂ عمل) سے ان کے گناہ اور ضرور داخل کروں گا انہیں باغوں میں بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں۔ (یہ) جزا ہے (ان کے اعمال حسنہ کی) اللہ کے ہاں اور اللہ ہی کے پاس بہترین ثواب ہے۔ (اے سننے والے!) نہ دھوکہ میں ڈالے تجھے چلنا پھرنا ان کا جنہوں نے کفر کیا ملکوں میں۔ یہ لطف اندوزی تھوڑی مدت کے لئے ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ لیکن وہ جو ڈرتے رہے اپنے رب سے ان کے لئے باغ ہوں گے رواں ہوں گی ان کے نیچے ندیاں (وہ متقی) ہمیشہ رہیں گے ان میں یہ

تو مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے اور جو (ابدی نعمتیں) اللہ کے پاس ہیں وہ بہت بہتر ہیں نیکوں کے لئے۔ اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس پر جو اتارا گیا تمہاری طرف اور جو اتارا گیا ان کی طرف عاجزی (اور نیازمندی) کرنے والے ہیں اللہ کے لئے نہیں سودا کرتے اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر۔ یہ وہ ہیں جن کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ اے ایمان والو! صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلہ میں) اور کمر بستہ رہو (خدمت دین کے لئے) اور (ہمیشہ) اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو جاؤ۔''

اس میں پچیس مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اس کا معنی سورۃ البقرہ میں کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کا اختتام ان آیات میں نظر و استدلال کے حکم کے ساتھ کیا، کیونکہ یہ پیدا نہیں ہو سکتے مگر اسی کی جانب سے جو حی و قیوم ہے قدرت والا ہے، پاک ہے، سلامت و محفوظ ہے (ہر عیب اور کمزوری سے) اور کل جہاں سے بے نیاز اور غنی ہے، تاکہ ان کا ایمان یقین کے ساتھ مستند ہو جائے نہ کہ فقط تقلید (پر اس کا انحصار ہو)۔

لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ یعنی ان کے لئے نشانیاں ہیں جو اپنی عقلوں کو دلائل میں غور و فکر کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: جب یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی آپ اٹھے نماز پڑھنے لگے، تو اتنے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے وہ آپ کو نماز کے بارے (مراد جماعت کے لئے) عرض کرنے لگے، تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روتے ہوئے دیکھا تو عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا آپ رو رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیئے ہیں! تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے بلال! کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ تحقیق اللہ تعالیٰ نے مجھ پر آج کی رات یہ آیت نازل فرمائی ہے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ پھر آپ نے فرمایا: اس کے لئے ہلاکت ہے جس نے اسے پڑھا اور اس میں غور و فکر نہ کیا (1)۔''

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے بیان کیا ہے، نیند سے بیدار ہونے والے کے لئے مستحب ہے کہ وہ اپنے چہرے پر (ہاتھ) پھیرے، اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدا کرتے ہوئے ان دس آیات کی قرأت سے اپنے قیام کا آغاز کرے، یہ صحیحین اور دیگر کتب میں ثابت ہے اور اس کا بیان آگے آئے گا۔ پھر وہ نماز ادا کرے جو اس کے ذمہ فرض ہے، تو اس طرح وہ تفکر اور عمل دونوں کو جمع کر لے گا، اور یہی افضل عمل ہے جیسا کہ اس کا بیان اس کے بعد اسی آیت میں آئے گا۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر رات سورہ ''آل عمران'' کی آخری دس آیات پڑھتے تھے، اسے حافظ ابو نصر وائلی سجستانی نے کتاب ''الابانہ'' میں سلیمان بن موسیٰ عن مظاہر بن اسلم مخزومی عن المقبری عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے اور سورہ کی ابتدا میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس نے آل

1۔ الکشاف، جلد 1، صفحہ 453، مکتب الاعلام الاسلامی۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ الفتح، حدیث نمبر 4460، حدیث عائشہ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عمران کی آخری آیات ہر رات پڑھیں اس کے لئے پوری رات قیام کرنے کا ثواب لکھ دیا گیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ اللہ تعالیٰ نے تین ہیئتیں ذکر فرمائی ہیں انسان اپنے غالب معاملات میں ان سے خالی نہیں ہوتا، تو گویا کہ یہ کیفیات اس کے جملہ اوقات کو محیط ہیں۔ اور اس معنی کے مطابق ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ علی کل أحیانہ۔ (1)

اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ پس اس میں بیت الخلا میں اور دوسرے مقامات پر ہونا بھی داخل ہے، حالانکہ علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے، اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما، ابن سیرین اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے اسے جائز قرار دیا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عطا اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہما نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ آیت اور حدیث کے عام ہونے کی بنا پر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ حضرت نخعی نے کہا ہے: بیت الخلا میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ اوپر چڑھ جاتا ہے۔ اس کا معنی ہے کہ ملائکہ اس ذکر کو لے کر بلندیوں کی جانب چڑھ جاتے ہیں اس حال میں کہ وہ ان کے صحف میں لکھا ہوتا ہے، پس مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ (ق) (نہیں نکالتا اپنی زبان سے کوئی بات مگر اس کے پاس ایک نگہبان (لکھنے کے لئے) تیار ہوتا ہے) اور مزید فرمایا: وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ (الانفطار) (حالانکہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں جو معزز ہیں (حرف بحرف) لکھنے والے ہیں) اور اس لئے بھی کہ اللہ عزوجل نے اپنے بندوں کو ہر حال میں ذکر کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور کوئی استثنیٰ نہیں کی۔ پس فرمایا: اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ (الاحزاب) (یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو کثرت سے) مزید فرمایا: فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ: 152) (سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا) اور پھر فرمایا: اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝ (الکہف) ((تو ہمارا یہ دستور ہے کہ) ہم ضائع نہیں کرتے کسی کا اجر جو عمدہ اور (مفید) کام کرتا ہے) پس یہ سب عام ہے۔ پس ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ماجور ہوگا اور اسے ثواب دیا جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور ابو نعیم نے ذکر کیا ہے کہ ابوبکر بن مالک، عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم نے ہمیں بیان کرتے ہوئے کہا کہ مجھے میرے باپ (مراد احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ) نے بتایا کہ وکیع نے بیان کیا کہ سفیان نے عطا بن ابی مروان سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا (کہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: "اے میرے پروردگار! کیا تو قریب ہے کہ میں تیرے ساتھ سرگوشی کروں یا تو بعید ہے کہ میں تجھے ندا دوں تو رب کریم نے فرمایا: یا موسیٰ أنا جلیس من ذکرنی (اے موسیٰ! علیہ السلام میں اس کا ہمنشین ہوتا ہوں جو میرا ذکر کرے) عرض کی: اے میرے رب! بلاشبہ ہم تو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں (اور اس میں) ہم تجھے اس سے برتر اور عظیم تر سمجھتے ہیں کہ ہم اس میں تیرا ذکر کریں۔۔ رب کریم نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ عرض کی: وہ جنابت اور قضائے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 162۔

حاجت کی حالت ہے۔ رب کریم نے فرمایا: یا موسیٰ اذکرنی علی کل حال (☆) (اے موسیٰ! تو ہر حال میں میرا ذکر کر۔) اور جنہوں نے اسے مکروہ قرار دیا ہے ان کے نزدیک کراہیت کا سبب یا تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس سے بلند اور منزہ ہے کہ وہ ایسی جگہوں میں کیا جائے جن میں اس کے ذکر سے اعراض برتا گیا ہے جیسے کہ حمام میں قرآن کریم کی قرأت کا مکروہ ہونا، یا پھر کراماً کاتبین پر اس بناء پر رحم کھانا ہے کہ وہ انہیں غلاظت اور نجاست کی جگہ پر اتارے تا کہ وہ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو لکھیں۔ واللہ اعلم۔

اور قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا ترکیب کلام میں حال ہونے کی بنا پر یہ منصوب ہیں۔ وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ یہ بھی حال کے محل میں ہے، یعنی بمعنی و مضطجعین ہے۔ اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: دعانا لجنبه او قاعدا او قائما اس میں ترتیب پہلی آیت کے برعکس ہے، بمعنی دعانا مضطجعا علی جنبه۔ (اس نے ہم سے دعا مانگی اس حال میں کہ وہ اپنے پہلو کے بل لیٹے ہوئے تھا۔)

مفسرین کی ایک جماعت جن میں سے حسن وغیرہ ہیں وہ اس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قول يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ آخر تک اس میں ذکر سے مراد نماز ہے، یعنی وہ نماز ضائع نہیں کرتے، پس وہ عذر کی حالت میں بیٹھ کر یا اپنے پہلوؤں کے بل لیٹ کر نماز پڑھتے ہیں (1)۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ (النساء: 103) (جب تم ادا کر چکو نماز تو ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے))

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول میں اس کا بیان آ رہا ہے اور جب آیت نماز کے بارے میں ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نماز پڑھتا ہے کھڑے ہو کر، اور اگر وہ استطاعت نہ رکھے تو بیٹھ کر اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو پھر اپنے پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھتا ہے، جیسا کہ حضرت عمران بن حصین سے ثابت ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے بواسیر تھی تو میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نماز کے بارے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تو کھڑے ہو کر نماز پڑھ، اور اگر تو اس کی استطاعت نہ رکھے تو بیٹھ کر، اور اگر تو اس کی استطاعت بھی نہ رکھے تو پھر پہلو کے بل لیٹ کر (نماز پڑھ لے۔) (2)'' اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے وصال سے ایک سال پہلے نفل نماز بیٹھ کر ادا فرماتے تھے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔ اور نسائی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چار زانو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے (3)۔ ابو عبد الرحمن نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اس حدیث کو روایت کیا ہو سوائے ابو داؤد خضری کے اور وہ ثقہ راوی ہے اور اس حدیث کو خطا گمان کرتا ہوں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے مریض اور بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی نماز کی کیفیت اور اس کی ہیئت میں اختلاف کیا ہے، پس ابن عبد الحکم نے مالک سے ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے قیام میں چار زانو بیٹھ سکتا ہے، البویطی نے امام شافعی سے یہی بیان کیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 554، دار الکتب العلمیہ

2۔ سنن ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 87۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1212، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، فی قیام اللیل و تطوع ... 245 ☆ حلیۃ الاولیاء، ابو نعیم، جلد 8، صفحہ 42

ہے۔ اور جب وہ سجدہ کرنے کا ارادہ کرے تو وہ جس قدر طاقت رکھتا ہو وہ سجدہ کرنے کی تیاری اور کوشش کرے، فرمایا: اسی طرح نفل پڑھنے والے کا حکم بھی ہے۔ اور اسی طرح ثوری کا قول بھی ہے، اور اسی طرح لیث، امام احمد، اسحاق، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور امام شافعی نے مزنی کی روایت میں کہا ہے: وہ اپنی ساری نماز میں تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھ سکتا ہے۔ اور یہی امام مالک اور ان کے اصحاب سے روایت کیا گیا ہے، پہلا قول مشہور ہے اور یہی مدونہ کا ظاہر ہے (1) اور امام اعظم ابوحنیفہ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھے گا، اور اسی طرح وہ رکوع اور سجود بھی کرے گا۔

مسئلہ نمبر 5۔ فرمایا: اگر وہ بیٹھنے کی استطاعت نہ رکھے تو وہ اپنے پہلو کے بل یا اپنی پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے یہ اسے اختیار ہے، یہی مدونہ کا مذہب ہے اور ابن حبیب نے ابن قاسم سے بیان کیا ہے کہ وہ اپنی پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے، اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹ کر (اور اگر اس پر قادر نہ ہو) تو پھر اپنے بائیں پہلو پر لیٹ کر نماز پڑھے۔ اور ابن المواز کی کتاب میں اس کے برعکس ہے، (یعنی) وہ اپنے دائیں پہلو پر نماز پڑھے ورنہ اپنے بائیں پہلو پر نماز پڑھے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے۔ اور سحنون نے کہا ہے: وہ دائیں پہلو پر نماز پڑھے گا جس طرح اسے اپنی لحد میں رکھا جائے گا، اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو پھر اپنی پیٹھ پر لیٹ کر نماز پڑھ لے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر بائیں پہلو پر نماز پڑھے گا (2)۔ اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: جب وہ چت لیٹ کر نماز پڑھے تو اس کے دونوں پاؤں قبلہ سمت ہوں گے اور امام شافعی اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ اپنے پہلو پر نماز پڑھے گا اور اس کا چہرہ قبلہ کی طرف ہوگا۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور اگر وہ مرض کم ہونے کی وجہ سے قوی اور طاقتور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نماز میں ہو، تو اس کے بارے ابن القاسم نے کہا ہے: وہ اپنی باقی نماز میں کھڑا ہو جائے گا اور اپنی پہلی نماز پر ہی اس کی بنا کرے گا، یہی قول امام شافعی، زفر اور طبری رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے صاحبین یعقوب اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے اس کے بارے میں کہا ہے: جس نے ایک رکعت لیٹ کر نماز پڑھی پھر وہ تندرست ہو گیا وہ اپنی نماز نئے سرے سے پڑھے گا۔ اور اگر وہ بیٹھ کر رکوع و سجود کر رہا ہے پھر وہ تندرست ہو جائے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق وہ اسی پر بنا کرے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق وہ بنا نہ کرے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب کسی نے کھڑے ہو کر نماز شروع کی پھر وہ اشارے کی حد تک پہنچ گیا تو اسے بنا کر لینی چاہیے، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی مروی ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے مریض کے بارے میں کہا ہے جو رکوع اور سجود کی استطاعت نہ رکھتا ہو حالانکہ وہ کھڑا ہونے اور بیٹھنے کی قدرت رکھتا ہو کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے گا اور رکوع کے لئے اشارہ کرے گا اور جب سجدہ کرنے کا ارادہ کرے تو بیٹھ جائے اور سجود کے لئے اشارہ کرے، اور یہی امام ابو یوسف کا قول ہے اور امام شافعی کے قول کا قیاس ہے، اور امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: وہ بیٹھ کر نماز پڑھے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ اور جہاں تک تندرست لیٹ کر پڑھنے والے کی نماز کا تعلق ہے تو عمران بن حصین کی حدیث سے یہ ز

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 554، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً

یادتی مروی ہے جو کسی اور کی روایت میں موجود نہیں، اور وہ یہ ہے صلاۃ الراقد مثل نصف صلاۃ القاعد(1) (لیٹ کر پڑھنے والے کی نماز بیٹھ کر پڑھنے والے کی نماز کے نصف کی مثل ہے۔) ابوعمر نے کہا ہے کہ جمہور اہل علم نفلی نماز لیٹ کر پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے، اور وہ حدیث ہے جسے حسین المعلم کے سوا کسی نے روایت نہیں کیا اور وہ حسین ابن ذکوان ہے جس نے عبداللہ بن بریدہ سے اور انہوں نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی سند اور متن میں حسین پر ایسا اختلاف کیا گیا ہے جو اس کے بارے توقف کو ثابت کرتا ہے، اور اگر یہ صحیح ہے تو میں نہیں جانتا اس کی وجہ کیا ہے، پس اگر اہل علم میں سے کسی ایک نے ایسے آدمی کے لئے نفل نماز لیٹ کر پڑھنے کی اجازت دی ہے جو بیٹھنے پر قادر ہو یا قیام پر قادر ہو تو پھر اس کی وجہ یہی زیادتی ہے جو اس حدیث میں ہے اور یہی اس کی حجت اور دلیل ہے جس نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اگر انہوں نے ایسے آدمی کے لئے جو بیٹھنے یا کھڑا ہونے پر قادر ہو لیٹ کر نفل نماز پڑھنے کے مکروہ ہونے پر اجماع کیا ہے، تو پھر حسین کی یہ حدیث یا غلط ہے یا پھر منسوخ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جو خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے اس پر استدلال کرتے ہیں کہ تبدیل ہونے والے کے لئے تبدیل کرنے والے کا ہونا ضروری ہے، اور اس تبدیلی لانے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ قدرت کاملہ رکھتا ہو، اور اس کا اختیار ہو کہ وہ رسل علیہم السلام مبعوث فرمائے، پس اگر وہ کوئی رسول مبعوث فرمائے اور اس کی صداقت پر ایک معجزہ کے ساتھ دلیل بھی بیان کردے تو پھر کسی کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ تحقیق ہم نے وینذ کہن کا معنی بیان کر دیا ہے اور اس سے مراد یا تو زبان کا ذکر ہے یا پھر فرضی اور نفلی نماز ہے، تو اللہ تعالیٰ نے دوسری عبادت کو ان میں سے ایک پر دوسری عبادت کے ساتھ عطف کیا ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں اور اس کی مخلوقات میں غور و فکر کرنا اور لوگوں کی اس جماعت میں غور و فکر کرنا جو بکھری ہوئی ہے، تا کہ ان کی بصیرت میں اضافہ کرے:

و فی کل شئ لہ آیۃ تَدُلُّ علی أَنَّهُ واحدُ

اور ہر شے میں اس کے لئے نشانی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ یکتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یَتَفَكَّرُوْنَ کا حال پر عطف ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ منقطع ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے اور فکر کا معنی ہے: تردد القلب فی الشئ (کسی شے میں دل کا متردد ہونا) کہا جاتا ہے: تفکر، اور رجل فکیر یعنی ایسا آدمی جو بہت زیادہ فکر کرنے والا ہو۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم کے پاس سے گزرے وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں غور و فکر کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تفکروا فی الخلق ولا تتفکروا فی الخالق فانکم لا تقدرون قدرہ(2) (تم مخلوق میں غور و فکر کرو

1۔ صحیح بخاری، تقصیر الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 150۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ کنز العمال، التفکر، جلد 3، صفحہ 108، حدیث نمبر 5706

اور خالق میں غور و فکر نہ کرو کیونکہ تم اس کی قدرت اور عظمت (کو پہنچاننے) کی قدرت نہیں رکھتے۔) بلاشبہ تفکر مخلوقات میں غور و فکر کرنا اور ذہن کو اس میں گھمانا ہے جیسا کہ فرمایا: وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت سفیان ثوری نے مقام کے پیچھے دو رکعتیں پڑھیں، پھر اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا، اور جب ستاروں کو دیکھا تو آپ پر غشی طاری ہو گئی، اور انتہائی حزن و غم اور فکر کی وجہ سے پیشاب میں خون بہنے لگا۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس اثنا میں کہ آدمی اپنے بستر پر لیٹا ہوا ہو اور وہ ستاروں اور آسمان کی طرف دیکھے اور پھر یہ کہے اشهد ان لك ربا و خالقا اللّٰهم اغفرلی فنظر الله اليه فغفرله (1) (میں شہادت دیتا ہوں کہ تمہارا رب اور خالق ہے اے اللہ! میری مغفرت فرما پس اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر (رحمت) فرماتا ہے اور اسے بخشش دیتا ہے۔)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاعبادة كتفكر (2) (فکر کرنے کی طرح کوئی عبادت نہیں) اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ نے فرمایا: تفكر ساعة خير من عبادة سنة (3) (ایک ساعت کی غور و فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے)

اور ابن القاسم نے حضرت امام مالک سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا زیادہ تر عمل کیا تھا؟ تو انہوں نے بتایا: ان کا اکثر عمل غور و فکر میں مشغول رہنا تھا۔ تو ان سے پوچھا گیا: کیا آپ تفکر کو اعمال میں سے ایک عمل گمان کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، یہ تو یقین ہے۔ حضرت ابن مسیب سے ظہر اور عصر کے درمیان نماز کے بارے پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا: یہ عبادت نہیں ہے، بلاشبہ عبادت اس عمل سے بچنا اور دور رہنا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، در تفکر (غور و فکر کرنا) اللہ تعالیٰ کے امر میں داخل ہے۔

اور حسن نے بیان کیا ہے: ایک ساعت کی غور و فکر رات بھر قیام کرنے سے بہتر ہے، حضرت ابن عباس اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے (4)۔

اور حسن نے کہا ہے: فکر کرنا مومن کا آئینہ ہے جس میں وہ اپنی نیکیوں اور اپنی برائیوں کو دیکھتا ہے۔ اور ان میں سے جن میں وہ غور و فکر کرتا ہے آخرت کے خوف ہیں مثلاً حشر و نشر، جنت اور اس کی نعمتیں، اور جہنم اور اس کا عذاب اور یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ ابو سلیمان دارانی رضی اللہ عنہ نے پانی کا برتن اٹھایا تاکہ آپ رات کی نماز کے لئے وضو کریں اور ان کے پاس ایک مہمان بھی تھا، تو اس نے آپ کو دیکھا کہ جب اپنا ہاتھ کوزے کے دستے پر رکھا تو اسی طرح غور و فکر کرتے ہوئے کھڑے رہے یہاں تک فجر طلوع ہو گئی، تو اس نے ان سے کہا: اے ابا سلیمان یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: جب میں نے اپنا ہاتھ کوزے کے دستے پر رکھا تو میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں غور و فکر کرنے لگا اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ۝ (المومن) (جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، انہیں گھسیٹ کر لے جایا جائے گا) تو میں اپنی حالت کے بارے میں سوچنے لگا میں طوق سے ملوں گا اگر قیامت کے دن میری گردن میں ڈال دیا گیا، پس میں یہی سوچتا رہا یہاں تک

1۔ الکشاف، جلد 2، صفحہ 454
2۔ تاریخ ابن عساکر، جلد 4، صفحہ 221، دار المسیرہ بیروت
3۔ الاسرار المرفوعة الاخبار الموضوعة، صفحہ 175، حدیث نمبر 114
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 555، دار الکتب العلمیہ

کہ صبح ہوگئی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ''یہ خوف کی انتہا ہے، اور امور میں بہتر میانہ روی ہے، اور امت کے علماء وہ نہیں ہیں جو اس راستے پر جحت ہیں، اللہ تعالیٰ کی کتاب کا علم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے معانی اس کے لئے پڑھنا اور سیکھنا جو سمجھ سکتا ہو اور اس کے لئے نفع کی امید کی جاسکتی ہو اس سے افضل ہے'' ابن العربی نے کہا ہے: لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ دونوں عملوں میں سے کون سا افضل ہے فکر کرنا یا نماز پڑھنا، صوفیہ کا نظریہ یہ ہے کہ فکر کرنا افضل ہے، کیونکہ اس کا پھل اور نتیجہ معرفت ہے اور یہ مقامات شرعیہ میں سے افضل مقام ہے۔

اور فقہاء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ نماز افضل ہے، کیونکہ حدیث طیبہ میں اس پر برانگیختہ کرنا، اس کی طرف دعوت دینے اور اس کی ترغیب دلانے کا ذکر موجود ہے اور صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ نے ایک رات اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر گزاری، اور آپ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کے وقت اٹھے اور آپ نے اپنے چہرہ اقدس سے نیند جھاڑی پھر سورہ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھیں، اور لٹکے ہوئے مشکیزے کے پاس کھڑے ہوئے اور خفیف سا وضو فرمایا اور پھر تیرہ رکعتیں نماز ادا فرمائی (1)، الحدیث۔ تم پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے تم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عمل کی طرف دیکھو تو یہ مخلوقات میں تفکر اور پھر اس کے بعد آپ کی نماز کی طرف متوجہ ہونے کا مجموعہ ہے، اور یہی وہ سنت ہے جس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ پس رہا صوفیہ کا طریقہ کہ ان میں سے ایک شیخ دن، رات اور مہینہ فکر کرنے والا ہوتا ہے وہ سست اور ڈھیلا نہیں پڑتا لیکن یہ طریقہ راہ صواب سے بہت دور ہے عام انسان کے لائق اور مناسب نہیں ہے اور نہ آدمی اس پر مسلسل عمل پیرا رہ سکتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے باپ نے مجھے بعض علماء مشرق سے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ میں ایک رات مصر کی مسجد الاقدام میں تھا، میں نے عشاء کی نماز پڑھی تو میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اپنے اوپر ہر طرف سے کمبل لپیٹ کر لیٹا ہوا ہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی، اور ہم نے اس رات نماز (تہجد) پڑھی، پس جب صبح کی نماز کھڑی ہوئی تو وہ آدمی اٹھا، قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے لوگوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھی۔ میں نے یہ اس کی بہت بڑی جرأت قرار دی کہ اس نے بغیر وضو کے نماز پڑھ لی ہے، چنانچہ جب میں نماز سے فارغ ہوا اور وہ باہر نکلا تو میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا تا کہ میں اسے نصیحت کروں، پس جب میں اس کے قریب ہوا تو میں نے اسے یہ شعر کہتے ہوئے سنا:

مسجّی الجسم غائب حاضر منتبه القلب صامت ذاکر

جسم کو ڈھانپنے والا غائب بھی ہے اور حاضر بھی اس کا دل بیدار ہے وہ خاموش بھی ہے اور ذاکر بھی۔

منقبض فی الغیوب منبسط کذاك من کان عارفا ذاکر

وہ غیب کے پردوں میں سمٹنے والا بھی ہے اور پھیلنے والا بھی اسی طرح وہ ہوتا ہے جو عارف ذاکر ہو۔

یَبیتُ فی لیلِه أخا فِکَرٍ فهو مَدَی اللیل نائمٌ ساهر

1۔ صحیح بخاری، التفسیر، جلد 2، صفحہ 651۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 177، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ اپنی رات فکر کرتے ہوئے گزار دیتا ہے پس وہ رات کے وقت سونے والا جاگ رہا ہوتا ہے۔
انہوں نے بیان کیا: پس میں جان گیا کہ یہ ان میں سے ہے جو فکر کے ساتھ عبادت کرتے ہیں تو پھر میں اس سے واپس چلا گیا(1)۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا یعنی وہ عرض کرتے ہیں: تو نے کسی شے کو عبث اور بے کار پیدا نہیں کیا، بلکہ تو نے اسے اپنی قدرت اور اپنی حکمت پر بطور دلیل پیدا کیا ہے اور باطل کا معنی زائل ہونے والی اور ختم ہونے والی ہے۔

اور اسی سے لبید کا قول ہے:

الا کل شئ ما خلا اللہ باطل

خبردار جان لو! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے فناہ ہونے والی اور ختم ہونے والی ہے۔ اس میں باطل بمعنی زائل ہے۔
اور بَاطِلًا کو نصب دی گئی ہے کیونکہ وہ مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی اصل میں خلقاً باطلاً ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حرف جر کے حذف ہونے کی بنا پر منصوب ہے، یعنی یہ ما خلقتہا للباطل تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ مفعول ثانی ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور خلق بمعنی جعل ہوگا۔ سُبْحٰنَكَ نحاس نے موسیٰ بن طلحہ سے مسند روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سبحان اللہ کے معنی کے بارے عرض کی گئی، تو آپ نے فرمایا: تنزیہ اللہ عن السوء (2) (ہر عیب اور کمزوری سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا۔) اس کے بارے مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔
فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اور ہمیں جہنم کے عذاب سے پناہ عطا فرما، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ (اے ہمارے رب بے شک تو نے جسے آگ میں داخل کر دیا) تو تو نے اسے ذلیل و رسوا کر دیا۔ اور مفضل نے کہا ہے: تو تو نے اسے ہلاک و برباد کر دیا۔

اور انہوں نے یہ شعر بھی کہا ہے:

أخزى الإلٰهُ مِن الصَّلِيبِ عَبِيدَه　　واللابِسِين قَلَانِس الرهبانِ

اللہ تعالیٰ نے صلیب سے اپنے بندوں کو ہلاک کیا ہے حالانکہ وہ راہبوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں اور بعض نے کہا ہے (کہ اَخْزَيْتَهٗ کا معنی ہے) تو نے اسے رسوا کر دیا ہے اور تو نے اسے دور کر دیا ہے، کہا جاتا ہے: أخزاہ اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دور کر دیا اور اسے ہلاک کر دیا۔

اور اس سے اسم الخِزْیُ ہے۔ ابن السکیت نے کہا ہے: خَزِيَ يَخْزَى خِزْيًا جب کوئی کسی آزمائش اور مصیبت میں پڑ جائے، واقع ہو جائے۔ اصحاب وعید نے اس آیت سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے: جسے آتش جہنم میں داخل کیا جائے گا (اس کے بارے میں یہ کہنا مناسب ہوگا) کہ وہ مومن نہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ فرماتا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 555، دار الکتب العلمیہ
2۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، الاذکار، جلد 10، صفحہ 102، حدیث نمبر 16849۔

ہے: یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ (التحریم:8) (اس روز رسوانہیں کرے گا اللہ تعالیٰ (اپنے) نبی کو اوران لوگوں کو جو آپ کے ساتھ ایمان لائے) اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے مردود ہے، کیونکہ اس پر دلائل قائم ہیں کہ جس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا اس سے ایمان کا اسم زائل نہ ہوگا۔ (یعنی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا مومن باقی رہتا ہے۔) جیسا کہ اس کے بارے کچھ گزر چکا ہے اور کچھ آگے آئے گا۔ لہٰذا قول باری تعالیٰ: مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ سے مراد وہ ہے جو ہمیشہ جہنم میں رہے گا(1)، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: تدخل تخلد کا مقلوب ہے(2)، اور ہم اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح اہل حروراء نے کہا۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں خاص ہے جنہیں آگ سے نہیں نکالا جائے گا(3)، اسی لئے یہ فرمایا ہے: وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ یعنی کفار کا کوئی مددگار نہیں ہے اور اہل معانی نے کہا ہے: الخزی یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ حیاء کے معنی میں ہو، کہا جاتا ہے: خَزِیَ یَخْزَی خِزَایَةً جب وہ شرم اور حیا محسوس کرے، فھو خذیان (شرمندہ ہونے والا)۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

خِزَایَةٌ أدرکته عِنْدَ جَوْلَتِه	من جانب الحَبْلِ مخلوطا بها الغضبُ

اس میں خزایۃ شرم وحیاء کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

پس اس دن خزی المومنین سے مراد تمام اہل ادیان کے سامنے ان کا دخول نار میں شرم وحیاء محسوس کرنا ہے یہاں تک کہ وہ اس سے باہر نکل آئیں۔ اور خزی للکافرین سے مراد اللہ تعالیٰ کا انہیں بغیر موت کے جہنم میں ہلاک اور برباد کرنا ہے اور مومنین مرجائیں گے، تو اس طرح دونوں فریق جدا جدا ہو گئے۔ صحیح سنت میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اسی طرح ثابت ہے، اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہ پہلے بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اس میں منادی سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس ہے، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے(4)۔ اور حضرت قتادہ اور محمد بن کعب القرظی نے کہا ہے: اس سے مراد قرآن ہے، کیونکہ ان تمام نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سماع نہیں کیا(5)۔ اس قول کی دلیل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والے جنوں کے بارے میں خبر دی ہے جبکہ انہوں نے کہا: اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ یَّهْدِیْۤ اِلَى الرُّشْدِ (الجن:) (کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے راہ دکھاتا ہے ہدایت کی) اور پہلے قول والوں نے جواب دیا اور کہا: جنہوں نے قرآن کریم سنا گویا انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی، اور یہ معنوی طور پر صحیح ہے۔

اور اَنْ اٰمِنُوْا میں أن حرف جر حذف ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے، یعنی یہ اصل میں بِأن آمِنُوا ہے۔ اور کلام میں تقدیم وتاخیر ہے، یعنی سمعنا منادیا للایمان ینادی، یہ ابوعبیدہ سے منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لام بمعنی الی ہے۔ یعنی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 556، دار الکتب العلمیہ	2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 418	3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 262
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 556، دار الکتب العلمیہ	5۔ ایضاً

لِلْاِیْمَانِ سے مراد الی الایمان ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (المجادلہ: 8) اور یہ ارشاد گرامی: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ؕ (الزلزلۃ: 5) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا (الاعراف: 43) یعنی مراد الی هذا ہے، اور اس کی مثالیں کثیر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام اجل ہے یعنی مراد لأجل الایمان ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا یہ دعا میں تاکید اور مبالغہ ہے اور دونوں لفظوں کا معنی ایک ہے، کیونکہ غفر اور کفر دونوں کا معنی ستر (ڈھانپنا اور چھپانا) ہے۔ و توفنا مع الابرار یعنی ہمیں موت دے نیکیاں کرنے والے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ، یعنی ان کے گروہ اور زمرہ میں، ابرار کی واحد برٌّ اور بارٌّ ہے اور اس کی اصل الاتساع (وسعت ہونا) سے ہے۔ فکان البرّ متسع فی طاعۃ اللہ و متسعۃ لہ رحمۃ اللہ۔ یعنی گویا کہ نیکی کرنے والا اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت میں وسیع ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے لئے وسیع ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ یعنی علی السنۃ رسلك (اے ہمارے رب! ہمیں وہ عطا فرما جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانوں سے ہمارے ساتھ وعدہ فرمایا۔) یعنی یہ وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ (یوسف: 82) ای اهل القریۃ کی مثل ہے۔ اعمش اور زہری نے تخفیف کے ساتھ رُسْلِكَ پڑھا ہے (1)، اور اس سے مراد وہ ہے جو کچھ مومنین کے لئے انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کے استغفار کرنے کے بارے ذکر کیا گیا ہے، اور ملائکہ زمین میں رہنے والوں کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور وہ مراد ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی دعا مومنین کے لئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے لئے استغفار کرنے کے بارے ذکر کیا گیا ہے۔ وَ لَا تُخْزِنَا یعنی تو ہمیں عذاب نہ دے، اور تو ہمیں ہلاک نہ کر اور تو ہمیں رسوا نہ کر، اور تو ہمیں ذلیل نہ کر، اور تو ہمیں دور نہ کر اور تو ہمیں قیامت کے دن ناپسند نہ کر۔ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ اگر کہا جائے: ان کے اس قول کی وجہ کیا ہے ربنا واتنا ما وعدتنا علی رسلك حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا، تو اس کے جواب کی تین وجوہ ہیں:

(۱) بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والوں کے ساتھ جنت کا وعدہ فرمایا ہے، پس انہوں نے سوال کیا کہ وہ ان میں سے ہو جائیں جن کے ساتھ یہ وعدہ کیا گیا ہے نہ کہ ان کے ساتھ جس سے رسوائی، ذلت اور سزا کا وعدہ کیا گیا ہے۔

(۲) کہ انہوں نے یہ دعا عبادت اور خضوع کی جہت پر مانگی، اور دعا عبادت کا مغز ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ (الانبیاء: 112) (آپ نے عرض کی میرے رب فیصلہ فرما دے (ہمارے درمیان) حق کے ساتھ) اگرچہ وہ حق کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔

(۳) انہوں نے یہ التجا کی کہ انہیں وہ کچھ جلدی عطا کیا جائے جو دشمن کے خلاف ان کی مدد و نصرت کا وعدہ ان کے ساتھ کیا گیا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے بارے میں یہ بیان ہے، کہ انہوں نے دین کے غلبے کے لئے یہ التجا کی۔ واللہ اعلم۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 556، دار الکتب العلمیہ

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس سے اللہ تعالیٰ نے کسی عمل پر ثواب کا وعدہ فرمایا ہے تو وہ بطور رحمت کے اس کے لئے اسے پورا کرے گا اور جس کے لئے کسی عمل پر سزا کا وعدہ کیا ہے تو اس میں اس کا اختیار اور مرضی ہے (1)۔'' عرب وعدہ خلافی پر مذمت کرتے ہیں اور وعید خلافی میں مدح اور تعریف کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے کسی نے کہا ہے:

ولا یرھَبُ ابن العم ما عِشتُ صَولَتِی　　ولا اختَفِی من خشیَۃ المتھدِّد

ابن العم کو کوئی خوف نہ ہوگا جب تک میں رعب وسطوت کے ساتھ زندہ رہا اور میں کسی ڈرانے والے کے خوف سے نہیں چھپتا۔

وانّی متی أوعدتُہ او وعدتہ　　لَمخلِفُ ایعادِی و مُنجِزُ مَوعِدِی

اور میں نے جب اسے دھمکایا یا اس سے وعدہ کیا تو وہ میری وعید کے خلاف کرتا ہے اور وعدہ کو پورا کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ پس ان کے رب نے ان کی دعا کو قبول کرلیا۔

حسن نے کہا ہے: وہ مسلسل کہتے رہے ربنا ربنا (اے ہمارے رب، اے ہمارے رب) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمالی۔

اور امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: جسے کوئی مہم درپیش ہو (یا کسی کو غم لاحق ہو) تو وہ پانچ مرتبہ کہے ربنا تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے نجات عطا فرمادے گا جس سے وہ ڈر رہا ہے اور وہ جو چاہے اسے عطا فرمادے جس کا وہ ارادہ رکھتا ہے آپ سے عرض کی گئی: یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: اَنِّیْ یہ اصل میں بأنّی تھا۔ اور عیسیٰ بن عمر نے اِنّی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی پس کہا: انی۔ (2) اور حاکم ابو عبد اللہ نے اپنی صحیح میں حضرت ام سلمہ سے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے بارے میں کسی شی کے ساتھ عورتوں کا ذکر نہیں کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى الآیہ (3) اور اسے ترمذی نے بیان کیا ہے اور مِنْ تاکید کے لئے داخل ہے، کیونکہ اس سے پہلے حرف نفی ہے۔ اور کوفیوں نے کہا ہے: یہ تفسیر کے لئے ہے اور اس کا حذف

1۔ مسند ابو یعلی، مسند انس بن مالک، جلد 3، صفحہ 180، حدیث نمبر 3303　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 557، دار الکتب العلمیہ

3۔ المستدرک، التفسیر، جلد 2، صفحہ 328، حدیث نمبر 3174۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب من سورۃ النساء، حدیث 2949، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ اس معنی کے لئے داخل ہے جو اس کے بغیر کلام ادا نہیں کر سکتی اور اسے حذف کیا جا سکتا جب یہ نفی کی تاکید کے لئے ہوتا۔ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ یہ مبتدا خبر ہے۔ یعنی تمہارا دین ایک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم میں سے بعض بعض کی جز ہیں ثواب میں، احکام میں، اور مدد و نصرت اور اسی طرح کے دیگر معاملات میں اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: تمہارے مرد طاعت میں تمہاری عورتوں کی مثل ہیں، اور تمہاری عورتیں طاعت (وعبادت) میں تمہارے مردوں کے مشابہ ہیں، اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ (التوبہ: 71) (نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔) اور کہا جاتا ہے: فلان منی، یعنی فلاں میرے مذہب اور میرے اخلاق پر ہے۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: فَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی جنہوں نے اپنے وطنوں کو چھوڑا اور مدینہ طیبہ کی طرف چلے گئے۔ وَاُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ اور وہ اللہ عزوجل کی طاعت و عبادت کے سبب اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ وَقٰتَلُوۡا اور انہوں نے میرے دشمنوں کے خلاف جنگ کی۔ وَقُتِلُوۡا اور میری راہ میں قتل کر دیئے گئے۔ ابن کثیر اور ابن عامر نے پڑھا ہے وقاتلوا و قتلوا(1) کثرت کی بنا پر۔ اور اعمش نے قرأت کی ہے وقتلوا و قاتلوا کیونکہ واؤ اس معنی پر دلالت نہیں کرتی کہ دوسرا پہلے کے بعد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کلام میں قد مضمر ہے یعنی قتلوا و قد قاتلوا۔

اور اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

تصابی　و　أمسی　علاه　الکبر

یہ اصل میں و قد علاہ الکبر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: و قد قاتل من بقی منهم (جو ان سے باقی بچا اس نے قتال کیا۔) عرب کہتے ہیں: قتلنا بنی تمیم، ہم نے بنی تمیم کو قتل کیا، اور بلاشبہ ان میں سے بعض قتل کئے گئے اور امرؤالقیس نے کہا ہے: فإن تقتلونا نقتلكم (پس اگر تم ہمارے ساتھ لڑو گے تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے)

اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے و قتلوا و قتلوا بغیر الف کے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ یعنی میں آخرت میں ان پر ان کے گناہوں کو چھپا دوں گا، پس میں انہیں ان کے سبب زجر و توبیخ نہ کروں گا اور نہ ان پر انہیں کوئی سزا دوں گا۔ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ بصریوں کے نزدیک یہ مصدر مؤکد ہے، کیونکہ "میں انہیں ضرور داخل کروں گا ایسے باغات میں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی" کا معنی یہ ہے میں انہیں ضرور ضرور ثواب عطا کروں گا۔ کسائی نے کہا ہے: یہ قطعاً منصوب ہے اور فراء نے کہا ہے: یہ بطور تفسیر منصوب ہے۔ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ یعنی یہ اچھی جزا ہے اللہ تعالیٰ کے پاس اور اس سے مراد وہ (اجر و ثواب) ہے جو عامل کی طرف اس کے عمل کی جزا کے طور پر لوٹے گا، اور یہ ثاب یثوب سے ہے۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِى الۡبِلَادِ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے اور مراد امت ہے (2) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ خطاب تمام کو ہے اور وہ اس طرح کہ مسلمانوں نے کہا: یہ کفار ہیں ان کے لئے سامان تجارت بھی ہے اور اموال بھی اور ان کا ملکوں میں گھومنا پھرنا بھی ہے، اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم بھوک سے ہلاک

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 557، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 558

ہو گئے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی تمہیں ان کا سلامتی کے ساتھ اپنے سفروں میں گھومنا پھرنا دھوکہ میں نہ ڈالے۔ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ یعنی ان کا یہ گھومنا پھرنا تھوڑی مدت کے لئے ہے۔ اور یعقوب نے نون ساکنہ کے ساتھ یَغُرَّنْكَ پڑھا ہے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

لا يَغُرَّنْكَ عِشَاءٌ ساكِنٌ قَدْ يُوَافِي بِالْمنيَّاتِ السَّحَرْ

اس میں بھی لا یَغُرَّنْكَ نون ساکنہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ﴿۴﴾ (المومن) (پس نہ دھوکہ میں ڈالے تمہیں ان لوگوں کا (بڑے کروفر سے) آنا جانا مختلف شہروں میں) اور متاع سے مراد وہ شے ہے جس سے جلدی نفع حاصل کیا جاسکتا ہو، اور اس کا نام قلیل اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ (سامان دنیا) فناہ ہونے والا ہے، اور ہر فناہ ہونے والی شے اگرچہ کثیر ہو وہ قلیل ہوتی ہے۔ اور صحیح ترمذی میں مستورد فہری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے انہوں نے بیان کیا ہے: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''آخرت میں دنیا کی مثال اس طرح ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی انگلی سمندر میں ڈالے، پھر وہ اس (پانی) کی طرف دیکھے جو وہ اس کے ساتھ نکالتا ہے'' (یعنی اس انگلی کے ساتھ لگنے والے پانی کو جو نسبت سمندر کے ساتھ ہے وہی دنیا کو آخرت کے ساتھ ہے) کہا گیا ہے: کہ اس حدیث میں لفظ یرجع یا اور تا دونوں کے ساتھ ہے۔ (حدیث طیبہ کے الفاظ یہ ہیں)

ما الدنيا في الآخرة الا مثل ما يجعل احدكم اصبعه في اليم، فلينظر بما ذا يرجع۔(1)

وَبِئْسَ الْمِهَادُ یعنی کتنا برا وہ ٹھکانا جو انہوں نے اپنے کفر کے سبب اپنے لئے بنایا ہے اور جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جہنم میں سے ٹھکانا بنایا ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ اس آیت میں اور اس طرح کی دیگر آیات میں مثلاً قول باری تعالیٰ: اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ الآیہ (آلعمران: 178) (کہ ہم جو مہلت دے رہے ہیں انہیں یہ بہتر ہے ان کے لئے) وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۚ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾ (القلم) (اور میں نے (سردست) انہیں مہلت دے رکھی ہے میری (خفیہ) تدبیر بڑی پختہ ہے۔) اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ (المومنون) (کیا یہ تفرقہ باز خیال کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مدد کر رہے ہیں مال و اولاد کی کثرت سے) سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ (الاعراف) (تو ہم آہستہ آہستہ پستی میں گرا دیں گے انہیں اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا) اس پر دلیل موجود ہے کہ کفار پر دنیا میں کوئی انعام نہیں کیا گیا، کیونکہ حقیقی نعمت وہ ہے جو دنیا اور آخرت کے ضرر کی آمیزش سے پاک ہو، اور کفار کی نعمتوں میں درد و آلام اور عذاب و سزا کی آمیزش ہے، پس یہ اس آدمی کی طرح ہیں جس کے سامنے کسی کی طرف سے شہد کا حلوہ رکھا جائے جس میں زہر کی آمیزش ہو، پس اگرچہ کھانے والا لطف اندوز ہو لیکن اسے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس پر انعام کیا گیا، کیونکہ اس میں اس کی جان کی ہلاکت ہے۔ علماء کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے اور یہی شیخ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور ان میں سے ایک جماعت سیف السنۃ ولسان الامۃ القاضی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2245، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابو بکر نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انہیں نعمتیں عطا کی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: نعمت کا اصل نَعمة بفتح النون سے ہے، اور اس کا معنی ہے خوشحال زندگی، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ (الدخان) (اور بہت سارا ساز و سامان جس سے وہ عیش کیا کرتے تھے) کہا جاتا ہے: دقیق ناعم، جب آٹا بہت باریک پسا ہوا ہو اور اچھے طریقے سے گوندھا جا سکتا ہو۔ یعنی معنی صحیح ہو، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار پر اور تمام مکلفین پر واجب قرار دیا ہے کہ وہ اس کا شکر ادا کریں اور فرمایا ہے: فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ (اعراف: 69) (پس تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کرو) یعنی شکر ادا کرنے کے لئے۔ اور فرمایا واشکروا اللہ (اور تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو) اور شکر صرف نعمت پر ہی ہوتا ہے۔

اور فرمایا: وَ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (القصص: 77) (اور احسان کیا کر (غریبوں پر) جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے) یہ خطاب قارون کو ہے۔ اور ارشاد فرمایا: وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً (النحل: 112) (اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال وہ یہ کہ ایک بستی تھی جو امن (اور) چین سے (آباد) تھی۔) پس اللہ تعالیٰ نے متنبہ فرمایا کہ اس نے انہیں دنیوی نعمتیں عطا فرمائیں تو انہوں نے ان کا انکار کر دیا۔ اور مزید فرمایا: يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا (النحل: 83) (وہ پہچانتے ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو (اس کے باوجود) وہ انکار کرتے ہیں اس کا) اور مزید فرمایا: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (فاطر: 3) (اے لوگو! یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو اس نے تم پر فرمائی۔) یہ (حکم) کفار اور دوسروں کے لئے عام ہے۔ لیکن جب کوئی کسی دوسرے کو کھانا پیش کرے جس میں زہر کی آمیزش ہو تو فی الحال اس نے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا، کیونکہ اس نے اسے خالص زہر نہیں پلائی، بلکہ اس نے اسے حلاوۃ (مٹھاس) میں چھپا دیا، لہٰذا یہ بعید نہیں کہ یہ کہا جائے: تحقیق اس نے اس پر انعام کیا، اور جب یہ ثابت ہو گیا تو پھر نعمت کی دو قسمیں ہیں نفع پہنچانے والی نعمتیں، اور دفاع کرنے والی نعمتیں، پس نفع بخش نعمتیں وہ ہیں جو فنون لذات میں سے ان تک پہنچیں، اور دفاع کرنے والی نعمتیں وہ ہیں جو ان سے طرح طرح کی آفات کو پھیر دیں، تو اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے کفار کو دفاع کی نعمتیں عطا فرمائیں یہ ایک قول ہے، اور وہ یہ کہ ان سے درد و آلام اور بیماریوں کو دور ہٹا دیا گیا، اور ان کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو نعمت دینیہ عطا نہیں فرمائی۔ والحمد للہ۔

مسئلہ نمبر 19۔ قولہ تعالیٰ: لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ یہ استدراک ہے اس کلام کے بعد جس میں نفی کا معنی پہلے گزر چکا ہے، کیونکہ سابقہ کلام کا معنی یہ ہے کہ ان کے لئے ملکوں کے چکر کاٹنے اور گھومنے پھرنے میں کوئی بڑا فائدہ نہیں ہے، لیکن متقی لوگوں کے لئے بہت بڑا نفع ہے اور ہمیشہ کی بقا ہے۔ لٰكِنِ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور یزید بن قعقاع نے لکن نون کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ قولہ تعالیٰ: نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ بصریوں کے نزدیک نُزُلًا ثوابًا کی مثل ہے اور کسائی کے نزدیک یہ مصدر ہو گا۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ مفسر ہے۔ اور حسن اور نخعی نے نُزُلًا کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ دو ضمے ثقیل ہوتے ہیں اور باقیوں نے اسے ثقیل قرار دیا ہے، اور النُّزُلُ سے مراد وہ شے ہے جو مہمان کے لئے تیار کی جاتی ہے۔ نزیل کا معنی

مہمان ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

نَزِیلُ القومِ اعظمُہُم حقوقا　　و حقُّ اللهِ فی حقِّ النزیلِ

قوم کا مہمان حقوق کے اعتبار سے ان سب سے بڑھ کر ہے اور مہمان کے حق میں اللہ تعالیٰ کا حق بھی ہے۔

اس کی جمع انزال ہے اور حظ نزیل کا معنی اکٹھ اور اجتماع ہے اور النزل کا معنی بھی کثرت اور زیادتی ہے، کہا جاتا ہے، طعام کثیر النزل و النزُل۔ (وافر مقدار کھانا)

مسئلہ نمبر 21۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید النزل...... واللہ اعلم...... وہی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ثوبان مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث سے اس عالم کے قصہ میں آیا ہے جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: اس دن لوگ کہاں ہوں گے جس دن زمین کو غیر ارض سے اور آسمانوں کو بدل دیا جائے گا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ پل کے قریب اندھیرے میں ہوں گے۔'' تو اس نے پوچھا: لوگوں میں سے پہلے کس کو اجازت ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مہاجرین فقراء کو'' یہودی نے کہا: ''ان کا کیا تحفہ ہوگا جب وہ جنت میں داخل ہوں گے؟ آپ نے فرمایا ''مچھلی کے جگر کی کثیر مقدار''۔ پھر پوچھا: اس کے بعد ان کی غذا کیا ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ان کے لئے جنت کا وہ بیل ذبح کیا جائے گا جو اس کی اطراف سے کھاتا رہتا ہے۔'' پھر عرض کی: اس پر ان کا مشروب کیا ہوگا؟ فرمایا: ''جنت کے ایک چشمہ سے (وہ سیراب ہوں گے) جس کا نام سلسبیل ہے (1)'' اور آگے حدیث ذکر کی۔ اہل لغت نے کہا ہے: التحفة سے مراد وہ شے ہے جسے پھلوں وغیرہ میں سے انسان بطور ہدیہ اور تحفہ پیش کرتا ہے اور طرف سے مراد اس کے محاسن اور لطف اندوز ہونے کی جگہیں ہیں۔ اور یہ اس مفہوم کے مطابق ہے جو ہم نے نزل کے بیان میں ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم

اور زیادۃ الکبد سے مراد جگر کا ٹکڑا ہے جو انگلی کی طرح ہو۔ ہروی نے کہا ہے: **نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ** یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ثواب ہے۔ اور بعض نے کہا ہے اس کا معنی رزق ہے۔ **وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ** ﴿۱۹۸﴾ اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس نیکوکاروں کے لئے ہے وہ اس سے بہتر ہے جس کے ساتھ کفار دنیا میں لوٹ پوٹ (اور لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں)۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 22۔ قولہ تعالیٰ: **وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ** الآیہ۔ حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت انس، حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب وہ فوت ہوا اور حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے اس کی موت کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو ارشاد فرمایا: قوموا فصلوا علی اخیکم النجاشی (اٹھو اور اپنے بھائی نجاشی کی نماز جنازہ ادا کرو) تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں حکم ارشاد فرما رہے ہیں کہ ہم حبشہ کے کافروں میں سے ایک بڑے کافر پر نماز جنازہ پڑھیں (2)، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی **وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ**

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 146　　2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 609

مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِمْ حضرت ضحاک نے کہا ہے: وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِمْ سے مراد تورات اور انجیل ہیں۔ اور قرآن کریم میں ہے: اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَہُمْ مَّرَّتَیْنِ (القصص: 54) (یہ لوگ ہیں جنہیں دیا جائے گا ان کا اجر دو مرتبہ)

اور صحیح مسلم میں ہے: ''تین قسم کے (لوگ) ہیں جنہیں دوبارا اجر دیا جائے گا... پھر بیان فرمایا... اہل کتاب میں سے ایسا آدمی جو اپنے نبی علیہ السلام کے ساتھ ایمان لایا پھر اس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لے آیا اور آپ کی اتباع و پیروی کی اور آپ کی تصدیق کی تو اس کے لئے دو اجر ہوں گے (1)۔'' اور آگے حدیث ذکر کی اور نجاشی پر نماز کے بارے بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے اور غائب میت پر نماز جنازہ کے بارے علماء کا اختلاف بھی گزر چکا ہے لہٰذا اسے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

حضرت مجاہد، ابن جریج، اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: یہ آیت اہل کتاب میں سے ایمان لانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی، اور یہ عام ہے اور نجاشی ان میں سے ایک ہے۔ اور اس کا نام اصحمہ تھا اور وہ عربی میں عطیہ ہے (2) اور خٰشِعِیْنَ کا معنی ہے عجز و انکساری کرنے والے۔ اور ترکیب کلام میں یہ یؤمن میں مضمر ضمیر سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اِلَیْہِمْ یا اِلَیْکُمْ کی ضمیر سے حال ہے اور جو کچھ آیات میں ہے وہ بالکل بین اور واضح ہے۔ اور پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 23۔ قولہ تعالیٰ: یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا الآیہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کا اختتام ایسی نصیحت کے ساتھ کیا ہے جسے یہ دسویں آیت متضمن ہے اور یہ ان نصیحتوں میں سے ہے جو دنیا میں دشمنوں پر غالب آنے اور اخروی نعمتوں کے ساتھ کامیاب ہونے کو جامع ہے، اور طاعات پر ڈٹے رہنے اور شہوات سے اجتناب کرنے پر برانگیختہ کیا ہے اور صبر کا معنی رکنا ہے اور سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مصابرہ کا حکم دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ مصابرہ کا معنی ہے دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جانا اور صبر میں ان پر غالب آنا، زید بن اسلم نے یہی کہا ہے (3)، اور حسن نے کہا ہے: پانچ نمازوں کی ادائیگی پر ثابت قدم رہنا اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہمیشہ نفس کی مخالفت کرنا شہوات کی پیروی میں کہ وہ ان کی طرف دعوت دیتا ہے اور یہ ان سے دور ہے اور حضرت عطا اور قرظی نے کہا ہے: تم اس وعدہ پر ثابت قدم رہو جو تم سے کیا گیا ہے یعنی تم مایوس اور نا امید نہ ہو اور وسعت و خوشحالی کا انتظار کرو (4)، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''صبر کے ساتھ کشادگی اور وسعت کا انتظار کرنا عبادت ہے (5)۔'' اس قول کو ابو عمر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ اور پہلا قول جمہور کا ہے۔

اور اسی کے مطابق عنترہ کا قول ہے:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 86۔ ایضاً صحیح بخاری، باب تعلیم الرجل امتہ واہلہ، حدیث نمبر 95، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 559، دار الکتب العلمیہ　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

5۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 197

فلم أَرَحَيًا صابروا مثل صبرِنا ولا كافحوا مثلَ الّذين نُكافِحُ
میں نے کوئی زندہ نہیں دیکھا جنہوں نے ہمارے صبر کی مثل صبر کیا ہو اور نہ ہی (وہ دیکھے ہیں) جنہوں نے ان کی مثل کا دفاع کیا ہو جن کا دفاع ہم کرتے ہیں۔

ان کے قول صابروا مثل صبرنا کا معنی ہے وہ میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہے اور ان میں کوئی بزدلی اور کمزوری ظاہر نہ ہوئی۔ اور مکافحة کا معنی ہے، جنگ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونا اور بالمقابل ہونا، اسی لئے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ رَابِطُوْا کے معنی میں اختلاف ہے۔ پس جمہور الامہ نے کہا ہے: تم اپنے دشمن کے سامنے مختلف حیلوں کے ساتھ کمر بستہ رہو، یعنی تم جنگ کے لئے اس طرح تیار رہو جس طرح تمہارا دشمن اس کی تیاری کرتا ہے، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (1) (اور گھوڑے باندھنے کے ساتھ)

اور مؤطا میں امام مالک نے حضرت زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھا اور اس میں روم کے لشکر کا ذکر کیا اور اس کا جوان سے خوف اور خطرہ تھا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف لکھا: اما بعد، جہاں کہیں بندہ مومن پر اللہ تعالیٰ شدید تکلیف اور پریشانی نازل کرتا ہے تو اس کے بعد اسے اللہ تعالیٰ کشادگی بھی عطا فرما دیتا ہے، کیونکہ ایک تنگی دو آسانیوں پر ہرگز غالب نہیں آسکتی، اور اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۔ (2)

اور ابوسلمہ بن عبد الرحمٰن نے بیان کیا ہے: یہ آیت ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کے بارے میں ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی غزوہ نہ تھا جس میں لشکر سرحدوں پر آمنے سامنے بیٹھتے ہوں، اسے حاکم ابوعبداللہ (3) نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور ابوسلمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: ”کیا میں تمہاری اس پر راہنمائی نہ کروں جس کے سبب اللہ تعالیٰ خطاؤں کو مٹا ڈالتا ہے، اور درجات کو بلند فرماتا ہے (وہ) مشقت اور مصائب میں اچھے طریقہ سے وضو کرنا ہے، اور مساجد کی طرف کثرت سے چل کر جانا ہے، اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا ہے پس تم پر اسے پکڑنا لازم ہے“ آپ نے اسے تین بار فرمایا، اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: صحیح قول یہ ہے کہ رباط کا معنی الملازمة فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ کو لازم پکڑنا) ہے۔ اس کی اصل ربط الخیل (گھوڑا باندھنا) سے ہے، پھر اسلام کی سرحدوں میں سے کسی سرحد کو ہر لازم پکڑنے والے کا نام مرابط رکھ دیا گیا ہے، چاہے وہ گھوڑ سوار ہو یا پیدل ہو۔ اور یہ لفظ الربط سے ماخوذ ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد فذالکم الرباط بلاشبہ یہ رباط فی سبیل اللہ کے ساتھ تشبیہ ہے۔ اور رباط کا لغوی معنی وہی پہلا ہے، اور یہ اس قول کی طرح ہے: لیس الشدید

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 559، دار الکتب العلمیہ
2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجہاد، صفحہ 464
3۔ المستدرک، التفسیر، جلد 2، صفحہ 329، حدیث نمبر 3177
4۔ مؤطا امام مالک، قصر الصلوٰۃ فی السفر، صفحہ 145

بالصرعة (1) (طاقتور پچھاڑ دینے کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا) اور اس قول کی طرح ہے: لیس المسکین بھذا الطواف (2) (اس چکر لگانے کے ساتھ مسکین ثابت نہیں ہوتا) اسی طرح کے اور اقوال بھی ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان کا قول ''رباط کا لغوی معنی وہی پہلا ہی ہے'' یہ مسلم نہیں ہے، کیونکہ خلیل بن احمد ائمہ لغت میں سے ایک ہیں اور ثقہ ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: رباط کا معنی سرحدوں کو لازم پکڑنا اور ان پر بیٹھے رہنا ہے اور نماز کے لئے مواظبت اختیار کرنا بھی ہے۔ پس اس سے ثابت ہو گیا کہ نماز کا انتظار کرنا بھی حقیقتاً رباط کا لغوی معنی ہی ہے، جیسا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ اور اس سے زیادہ وہ ہے جو شیبانی نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: ماءٌ مترابطٌ ای دائم لاینزح۔ یعنی ماء مترابط اس ہمیشہ رہنے والے پانی کو کہا جاتا ہے جو ختم نہ ہوتا ہو، اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے اور یہ لغۃً رباط کے اس کے سوا معنی کی طرف متعدی ہونے کا تقاضا کرتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کیونکہ اہل عرب کے نزدیک مرابطہ کسی شے پر ایسی گرہ لگانا ہے جو کھل نہ سکتی ہو، پس یہ اس کی طرف راجع ہے جس پر آدمی ڈٹ جائے اور صبر کرے، اور وہ دل کو اچھی نیت پر اور جسم کو فعل طاعت پر روک لینا اور لگا لینا ہے۔ اور اس کا عظیم تر اور اہم ترین معنی الله تعالیٰ کی راہ میں (جہاد کے لئے) گھوڑے کو باندھنا (تیار کرنا) ہے۔ جیسا کہ اس پر قرآن کریم میں نص موجود ہے: ومن رباط الخیل اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور نفس کو نمازوں پر لگانا اور متوجہ کرنا ہے جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے، اسے حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور شادی کے بعد خوشبو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ولا عِطرَ بعد عَرُوسٍ۔

مسئلہ نمبر 24۔ فقہاء کے نزدیک المرابط فی سبیل وہ ہے جو سرحدوں میں سے ایک سرحد کو معین کر لیتا ہے تاکہ وہ اس کی حفاظت کے لئے ایک مدت تک اس پر ثابت قدم رہے، اور اسے محمد بن مواز نے بیان کیا ہے [اور اسے روایت کیا ہے] اور رہے وہ لوگ جو سرحدوں پر اپنے اہل وعیال کے ساتھ ہمیشہ رہتے ہیں وہیں وہ آباد ہوتے ہیں اور وہیں کاروبار کرتے ہیں، پس اگر وہ وہاں محفوظ ہوں تو وہ مرابطین میں سے نہیں ہیں۔ ابن عطیہ نے یہی کہا ہے (3)۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: رباط کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت یہ ہے کہ سرحد مامون اور محفوظ ہوتی ہے اور وہاں اہل وعیال کے ساتھ سکونت اختیار کرنا جائز ہوتا ہے اور اگر وہ مامون و محفوظ نہ ہو تو پھر جائز ہے کہ وہ اپنے آپ کو تو وہیں کمربستہ رکھے بشرطیکہ وہ جنگ لڑنے والوں میں سے ہو، اور وہ اپنے اہل وعیال کو وہاں منتقل نہ کرے تاکہ ایسا نہ ہو کہ دشمن غالب آ جائے اور وہ قید کر لے اور غلام بنا لے۔ والله اعلم۔

مسئلہ نمبر 25۔ رباط کی فضیلت میں کثیر احادیث موجود ہیں، ان میں سے وہ ہے جسے امام بخاری نے حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الله تعالیٰ کی راہ میں ایک دن سرحد پر (حفاظت کے لئے) رہنا الله تعالیٰ کے نزدیک دنیا و مافیہا سے بہتر ہے (4)۔'' اور صحیح مسلم میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں

1۔ صحیح مسلم، البر والصلۃ والادب، جلد 2، صفحہ 326　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 333

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 560، دار الکتب العلمیہ

4۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 405۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2678، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''ایک دن اور ایک رات سرحد پر ثابت قدم رہنا ایک مہینہ روزے رکھنے اور قیام کرنے سے بہتر ہے اور اگر وہ فوت ہو گیا تو اس کا وہ عمل جاری رہے گا جو وہ کر رہا تھا اور اس کا رزق بھی اسے عطا کیا جائے گا اور شیاطین سے محفوظ رکھا جائے گا (1)۔''

ابو داؤد نے اپنی سنن میں حضرت فضالہ بن عبید سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر میت کا عمل ختم کر دیا جاتا ہے سوائے مرابط (سرحد پر ثابت قدم رہنے والے) کے کیونکہ اس کا عمل یوم قیامت تک بڑھتا رہے گا اور وہ قبر کے فتنہ سے مامون و محفوظ رہے گا (2)''۔ ان دونوں حدیثوں میں اس پر دلیل موجود ہے کہ رباط ان افضل ترین اعمال میں سے ہے جن کا ثواب موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے، جیسا کہ حضرت علا بن عبدالرحمن کی حدیث میں ہے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعوله (3) (جب آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل اس سے منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین کے (اور) سوائے صدقہ جاریہ کے یا اس علم کے جس سے نفع اٹھایا جاتا ہے یا نیک اور صالح بچے کے جو اس کے لئے دعا کرتا ہو) یہ حدیث صحیح ہے اور اسے روایت کرنے میں مسلم منفرد ہیں اور بلاشبہ صدقہ جاریہ، نفع دینے والا علم اور وہ صالح بیٹا جو اپنے والدین کیلئے دعا کرتا ہے یہ (اعمال) صدقات کے ختم ہونے، علم ضائع ہو جانے، اور بیٹے کی موت کے سبب منقطع ہو جاتے ہیں۔ اور رباط کا اجر یوم قیامت تک کئی گناہ کر دیا جاتا ہے، کیونکہ نماء کا معنی سوائے دو گناہ کرنے کے اور کوئی نہیں ہے، اور یہ کسی سبب پر موقوف نہیں کہ اس کے منقطع ہونے کے سبب یہ بھی منقطع ہو جائے، بلکہ یہ یوم قیامت تک اللہ تعالیٰ کی جانب سے دائمی فضل ہے۔ اور یہ اس لئے کہ نیکی کے تمام اعمال پر قدرت تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب دشمن سے امن و سلامتی حاصل ہو اور دین کے نور کی حفاظت اور شعائر اسلام کو قائم کرنے کے سبب دشمن سے مکمل تحفظ اور بچاؤ حاصل ہو اور یہ وہ عمل ہے جس پر ثواب جاری رہتا ہے (اور) یہ ان اعمال صالحہ میں سے ہے جو وہ کرتا رہتا ہے، اسے ابن ماجہ نے صحیح اسناد کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من مات مرابطا في سبيل الله اجرى عليه اجر عمله الصالح الذين كان يعمل و اجرى عليه رزقه و امن من الفتان و بعثه الله يوم القيامة امنا من الفزع (4) (وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے فوت ہو گیا تو اس پر اس کے اس عمل صالح کا اجر جاری رہتا ہے جو وہ کرتا ہے اور اس پر اس کا رزق بھی جاری رکھا جاتا ہے اور اسے شیاطین سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اٹھائے گا اس حال میں کہ وہ گھبراہٹ سے پر امن اور محفوظ ہو گا۔) اس حدیث میں ایک دوسری قید ہے اور وہ ہے حالت رباط میں موت کا آ جانا۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 142
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 338
3۔ صحیح مسلم، کتاب الوصیۃ، جلد 2، صفحہ 41
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 203

ہے: ''جس نے ایک رات اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے گزاری تو وہ اس کے لئے ہزار (دن اور) رات کے روزوں اور قیام کی مثل ہے(1)۔''

اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمانوں کے خوفزدہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن رمضان المبارک کے مہینے کے علاوہ پورے اخلاص کے ساتھ سرحد کی حفاظت کے لئے کمر بستہ ہونا اجر و ثواب میں ایک سال کے روزوں اور قیام کی عبادت سے زیادہ اور افضل ہے اور رمضان المبارک کے مہینے میں ایک دن مسلمانوں کے خوف کی صورت میں پورے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحد پر ڈٹ جانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر و ثواب میں ایک ہزار برس کے روزوں اور قیام کی عبادت سے افضل اور زیادہ ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے اسے صحیح سالم اپنے گھر والوں کی طرف لوٹا دیا تو اس پر ہزار برس کے گناہ نہیں لکھے جائیں گے اور اس کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کے لئے رباط کا اجر قیامت کے دن تک جاری رکھا جائے گا(2)۔'' یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ رمضان المبارک کے مہینے میں ایک دن (دشمن کے مقابلے میں) سرحد پر ڈٹ جانا دائمی ثواب کے حصول کا سبب بنتا ہے اگرچہ وہ اسی حال میں مرجائے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک رات پہرہ دینا ایک آدمی کے اپنے گھر میں ہزار برس روزے رکھنے اور قیام کرنے سے افضل ہے (ان میں) ایک سال تین سو ساٹھ دن کا ہے اور ایک دن ہزار برس کا ہے۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں: ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کرنے کے بارے میں بھی یہ موجود ہے کہ وہ بھی رباط ہے۔ اور نمازوں کا انتظار کرنے والے کو وہی فضیلت حاصل ہو سکتی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے ابو نعیم الحافظ نے روایت نقل کی ہے کہ سلیمان بن احمد، علی بن عبدالعزیز، حجاج بن منہال دوسری سند ابوبکر بن مالک، عبداللہ بن احمد بن حنبل نے بیان کیا ہے کہ مجھے میرے باپ نے بتایا اور کہا کہ مجھے حسن بن موسیٰ نے بیان کیا ہے کہ حماد بن سلمہ نے ثابت بنانی سے اور انہوں نے ابو ایوب ازدی سے، انہوں نے نوف بکالی سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات مغرب کی نماز پڑھائی اور ہم نے بھی آپ کی معیت میں نماز پڑھی پس پیچھے رہ گیا جو پیچھے رہا اور واپس لوٹ گیا جو لوٹ گیا (یعنی کچھ لوگ وہیں پیچھے رہ گئے اور کچھ اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے) پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز عشاء کے لئے تثویب کرنے سے پہلے تشریف لائے۔

پس آپ اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے آئے حالانکہ لوگ آپ کے پاس حاضر تھے اور آپ نے سبابہ انگلی کے ساتھ آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انتیس گنے اور اپنا کپڑا اپنے گھٹنوں سے اوپر چڑھا لیا اور آپ کہنے لگے: ''اے مسلمانوں کے گر

1۔ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 2755، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً۔ ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2759، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تمہیں بشارت ہو یہ تمہارا رب ہے اس نے آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھول دیا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ملائکہ پر اظہار فخر کر رہا ہے وہ کہہ رہا ہے اے میرے ملائکہ! تم میرے ان بندوں کی طرف دیکھو یہ ایک فریضہ ادا کر چکے ہیں اور دوسرے کا انتظار کر رہے ہیں (1)۔'' اور اسے حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے اور انہوں نے مطرف بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ نوف اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما دونوں اکٹھے ہوئے تو نوف نے تورات سے (یہ) بیان کیا اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث بیان کی۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی تمہیں بغیر تقویٰ کے جہاد کے بارے حکم نہیں دیا گیا۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تاکہ تم فلاح و کامرانی کے امیدوار ہو جاؤ۔ کہا گیا ہے: کہ لعل بمعنی لکی (تاکہ) ہے اور فلاح بمعنی بقاء (باقی رہنا) ہے۔ یہ سب سورۃ البقرہ میں مکمل طور پر گزر چکا ہے۔

تمت بالخیر

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل و احسان سے آج مورخہ ۲۲ جنوری ۲۰۰۷ء بمطابق ۲ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ بروز پیر دس بجے شب سورہ آلعمران کی تفسیر کا ترجمہ اختتام پذیر ہوا۔ یہ بندہ پر تقصیر اپنے کریم رب کی بارگاہ میں سراپا التجا ہے کہ اے میرے کریم پروردگار! اس کرم اور عنایت کو بار بار فرمانا، اپنی توفیقات سے نوازتے رہنا، اور تادم واپسیں اپنی بندگی کا ذوق، اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کا شرف، اور اپنے دین متین کی خدمت کی سعادت سے بہرہ ور فرمائے رکھنا۔ امین بجاہ نبیك الکریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ثم الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین و علی آلہ و اصحابہ اجمعین برحمتك یا ارحم الراحمین۔

محمد انور مگھالوی

1۔ حلیۃ الاولیاء، طبقات الاصفیاء، جلد 6، صفحہ 54، مکتبۃ الخانجی مصر

کتابِ رشد و ہدایت کی ہمہ گیر آفاقی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے

نور و سرور اور جذبہ حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مبنی آیات احکام کی مفصل وضاحت

اردو زبان میں پہلی مرتبہ

تفسیر احکام القرآن 7 جلد

مولانا محمد جلال الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ

آیات احکام کا مفصل لغوی و تفسیری حل، امہاتِ کتبِ تفسیر کی روشنی میں مفسرین کی تصریحات کے مطابق پیش کیا گیا۔

یہ تفسیر طلباء، علماء، وکلاء، ججز اور عوام و خواص کے لئے قیمتی سرمایہ

آج ہی طلب فرمائیں

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت قاضی ثناءاللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف کی زیرنگرانی

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

تفسیر مظہری 10 جلد

زیورطباعت سے آراستہ ہوکر منظرعام پر آچکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز